جامعہ

ادارہ اجتماعیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ماہوار رسالہ

مکتبہ جامعہ دہلی

تصانیف

پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم۔ اے

سیاست کی پہلی کتاب قیمت ۴ر

اجتماعی زندگی کی ابتداء ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸ر

ہندوستان کا دیہی قرض ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴ر

مسئلہ آبادی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴ر

ملنے کا پتہ
مکتبہ جامعہ
دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

جامعہ

زیرادارت : پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۳۱	جنوری ۱۹۳۹ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

سنہ ۱۹۳۸ء

ممالکِ غیر

زمانے کی رفتار مہینہ اور سال کی پابند نہیں، اور انسانی زندگی کی تحریکوں اور انقلابوں میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ایک سال دوسروں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتا ہو، خصوصاً جب وہ گذر جائے، اور ہم اس سے اتنی دور ہو جائیں کہ ان واقعات کا صحیح مطالعہ کر سکیں جو کہ اس میں پیش آئے اور اگلے پچھلے کا رشتہ جوڑ سکیں ۱۹۳۸ء میں بہت کچھ ہوا جس کا ہمیں ایک سال پہلے گمان بھی نہ تھا، لیکن اس وقت غور کیجئے تو جو کچھ ہوا اس کا ہونا لازمی تھا، اور ہمیں کافی علم ہوتا تو شاید ہم ستاروں کے دیکھے بغیر بتا سکتے کہ یہ ہونے والا ہے۔

یورپی سیاست میں اس سال جرمنی کا آسٹریا پر اور اس کے سات مہینے بعد چکوسلوواکیا کے جرمن علاقوں پر قبضہ اور اس قبضے کے لئے جو تیاریاں کی گئیں اور چالیں چلی گئیں سب سے نمایاں حیثیت رکھتی ہیں، لیکن یہ سب کچھ علامت ہے ایک کہیں زیادہ ہنگامہ خیز تحریک کی جو ۱۹۳۶ء میں شروع ہوئی تھی اور اس سال تکمیل کو پہنچی۔ یہ تحریک ہے ان قوموں کی جنہیں صلح نامہ ورسائی کی دفعات میں گرفتار کیا گیا تھا آہستہ آہستہ اپنے بندھنوں کو توڑنا اور "اجتماعی تحفظ" کے اس گھروندے کو ڈھا دینا جسے انگریزی اور فرانسیسی سیاست نے ۱۹۱۹ء میں بنا کر کھڑا کیا تھا اور بین الاقوامی اتحاد کا نام دیا تھا۔

اصل میں تو یہ بہت پہلے ظاہر ہو گیا تھا کہ یہ اتحاد محض انگلستان اور فرانس کے اتحاد کا بڑا نام ہے اور ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کے بے آبرو اور بے مصرف ہو جانے سے دنیا کے لئے کوئی خاص خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ جنگ کے جو امکانات اب ہیں وہ پہلے بھی تھے، اس لئے کہ بین الاقوامی اتحاد کبھی کمزور کو زبردست کے پنجے سے بچا نہیں سکا، اور اگر فرانس اور انگلستان کا اتحاد عمل یورپ کی ڈگمگاتی ناؤ کے لئے سہارا تھا

تو وہ اب بھی موجود ہے۔ جنگ کی جو خاص تیاری اس سال دیکھی گئی ہے اس کا ارادہ پہلے ہی کیا جا چکا تھا، اس لئے کہ لوگ کچھ اسی سال منطق کے اس پھیر میں نہیں پڑ گئے ہیں کہ جنگ سے بچنے کے لئے لڑنے کی طاقت چاہیئے، ایسی طاقت کہ جسے دیکھ کر دوسرا ہم سے لڑنے کی ہمت نہ کر سکے مگر ہم اسے ہر وقت مار مٹانے کی دھمکی دے سکیں اور مجبور ہو جائیں تو ایسا کر کے بھی دکھا دیں۔ جنگ کی تیاریوں کے باوجود سنہ ۱۹۳۸ء میں اگر کوئی بات ثابت ہو گئی ہے تو یہ کہ یورپ کی کوئی قوم لڑنا نہیں چاہتی، اور جب تک کہ نہ لڑنے میں کسی ایسے نقصان کا اندیشہ نہ ہو کہ جس پر جنگ کی تباہی اور بربادی کو ترجیح دی جا سکے اس وقت تک لڑائی چھڑنے کا کوئی خطرہ نہیں۔ انگلستان اپنی آبرو، فرانس کی آبرو اور سیاسی تعلقات دونوں اس کی خاطر قربان کر چکا ہے اور ابھی بہت سی قربانیوں کی گنجائش باقی ہے۔

جرمنی صلح نامہ ورسائی میں سب سے زیادہ نقصان جرمنی نے اٹھایا تھا اور اس کی تلافی کا مطالبہ کرنے کا حق سب سے زیادہ اسی کو ہے۔ اسی وجہ سے وہ سنہ ۱۹ء کی سیاسی تعمیرات کو مسمار کرنے اور تازہ عمارتوں کی بنیاد رکھنے میں سب سے آگے آگے ہے۔ اس نے اب یہ اصول منوا لیا ہے کہ وسطی یورپ کی سیاسی تنظیم میں اس کی خواہش اور ارادے کا خیال کیا جائے گا نہ کہ انگلستان کے معاہدوں اور فرانس کے رسمی تعلقات کا، اور آسٹریا کے پورے ملک اور چکوسلواکیہ کے سڈٹین علاقوں کو اپنی ریاست میں شامل کر کے اس نے بڑی حد تک اپنی قوم کی ایک پرانی خواہش پوری بھی کر لی ہے کہ یورپ میں جتنے جرمن نسل اور جرمن زبان بولنے والے ہوں وہ سب ایک سیاسی نظام کے ماتحت ہوں۔ ابھی مشرقی فرانس، جنوبی ڈنمارک، شمالی اور مغربی پولینڈ، ہنگری، سوئستان اور شمالی اٹلی میں جرمن زبان بولنے والے موجود ہیں جو جرمن قوم میں شامل ہونے اور نازی حکومت کی رعایا بننے کا شرف حاصل نہیں کر سکے ہیں، لیکن جہاں کہیں موقع ہے اس کی تحریک ابھی سے شروع کر دی گئی ہے، اور نازی سیاست جدھر بھی سینگ سمائے گھس جانے پر تیار بیٹھی ہے۔ ڈنمارک میں سازشیں ہو رہی ہیں، میمل غالباً سنہ ۱۹۳۹ء کے شروع میں جرمنی سے ملحق ہو جائے گا، پولینڈ نے جرمنی کی مخالفت کا ارادہ ظاہر کیا تو اس کے مغربی علاقوں کا چھن جانا کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ ہنگری کے جرمن بڑی تیزی کے ساتھ نازی اصولوں کے معتقد اور اس کے طرز عمل کے پیرو بن رہے ہیں، اور مسولینی رات کو کبھی سوچتا ہوگا کہ

جرمنی کے سیاسی فلسفے کی زد میں اٹلی کے چند شمالی ضلع بھی آجاتے ہیں تو اس کی نیند اچاٹ ہو جاتی ہوگی۔ سوئٹزرلینڈ ابھی خاص خطرے میں نہیں ہے، اور فرانس سے جرمنی نے وعدہ کر لیا ہے کہ اس کی سرحد کو تقدیر کا لکھا سمجھے گا۔ لیکن یہ وعدہ سیاسی وعدہ ہے، اور یہ تقدیر سیاسی مصلحت اور تدبیر۔

معاشیات کے ماہر کچھ کھسیانے پن اور کچھ اعتراض کے شوق میں ہر ہٹلر کی ہر کامیابی کو ایک مغالطہ ثابت کرتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آسٹریا کے شامل ہو جانے سے جرمنی کی تجارتی اور صنعتی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں اور اسے کوئی مالی یا صنعتی فائدہ نہیں ہوا۔ سوا اس کے کہ لکڑی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ مل گیا۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ سڈٹین علاقوں پر قبضہ ہو جانے سے اگرچہ چکوسلوواکیا کہیں کا نہیں رہ گیا لیکن جرمنی کو ایسے صنعتی کارخانے اور ذخیرے ملے جن کی خود جرمنی میں افراط ہے اور وہ کانیں اور زرخیز زمینیں جن کی اسے سخت ضرورت ہے چکوسلوواکیا کے پاس ہی رہیں۔ یہی اعداد و شمار کے ماہر نقشے بنا کر اور حساب لگا کر دکھا دیتے ہیں کہ جرمنی کی بہت کم ضروریات ہیں جو بلقان میں مہیا ہو سکتی ہیں، لیکن جرمنی کی بلقان کے ملکوں سے تجارت برابر بڑھ رہی ہے، اور ایسا کوئی ملک نہیں ہے جس کے مجموعی لین دین کا تہائی سے کم حصہ جرمنی سے ہو۔ اس سلسلے میں آخری معاہدہ جرمنی اور رومانیہ کے درمیان وسط دسمبر میں ہوا جس کی رو سے رومانیہ کی درآمد میں جرمنی کا حصہ پچاس فی صدی اور برآمد میں تینتیس فی صدی ہوگا۔ جرمنی اور بلقان کے تعلقات کو ماہروں کی متعصب نظروں سے نہیں بلکہ صاف صاف دیکھئے تو یقین ہو جاتا ہے کہ جرمنی کا بلقان پر تسلط ہو گیا ہے اور بلقان والے چاہیں بھی تو جرمنی سے اپنا تجارتی رشتہ توڑ نہیں سکتے۔ اس کے برعکس ان کی ہر ایسی کوشش انھیں زیادہ اُلجھا دیتی ہے۔ فرانس اور فرانس سے بھی زیادہ انگلستان کے سرمایہ دار تجارت کو سیاست پر قربان کر کے بلقان میں اپنا سرمایہ لگائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انھیں ایسا مال خریدنا ہوگا جس کی انھیں ضرورت نہیں، اور برطانیہ سے تو اس کی ساری نوآبادیاں بگڑ جائیں گی، اس لئے کہ بلقان میں وہی قدرتی پیداوار حاصل ہوگی جسے برطانیہ نوآبادیوں سے خریدنے کا معاہدہ کر چکا ہے۔

اب سمجھ لینا چاہئے بلقان میں جرمنی کے لئے میدان صاف ہو گیا ہے۔ دریائے ڈینیوب کی آمد و رفت پر اسے پورا اختیار ہے اور ادھر مغرب میں ٹریسٹ کی بندرگاہ اور بحر ایڈریاٹک کے ذریعے اسے بحر روم میں

پہنچنے کا ایسا رستہ مل گیا ہے جو اس کے تجارتی تسلط کو بہت ہی پائدار کر دے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ مشرق قریب میں کیا کرتا ہے۔ ترک ابھی تک اس کے لین دین کے جال میں اس طرح نہیں پھنسے ہیں جیسے کہ بلقان کے ملک، لیکن انگریزی سرمایہ داروں کی بے پروائی یا کوتہ اندیشی کا یہی حال رہا جو کہ اب ہے تو ترک کو جرمنی سے تعلقات بڑھانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔ اس سال کئی مہینوں کی کوشش کے بعد انگلستان کے تجارتی بورڈ نے انھیں ۳ لاکھ پاؤنڈ کا تجارتی قرضہ دینا منظور کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ترک اتنے کا مال تجارتی بورڈ کی ضمانت پر خرید سکتے ہیں، لیکن ترکوں نے اس کے ساتھ جرمنی سے بھی معاہدہ کیا ہے، اور ان کے یہاں کی پیداوار اور قدرتی ذخیروں میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا جرمنی کے سوا کوئی خریدار نہیں۔ جرمنی نے ایران سے بھی لین دین شروع کیا ہے، ایران سے جرمنی جانے والی آمد و رفت سے بڑھ کر ۱۹۳۷ء ہی میں بارہ فی صدی ہو گئی تھی اور جرمنی سے جانے والا مال چھ سے بڑھ کر پندرہ فی صدی۔ پچھلے دو سال کے اعداد و شمار معلوم نہیں ہیں، لیکن اتنا معلوم ہے کہ ہرہٹلر نے رضا شاہ کو جرمنی آنے کی دعوت دی ہے اور شاید وہ اس دعوت کو منظور بھی کر لیں۔

تو اس سال تک سمجھنا چاہئے کہ جرمنی نے صلح نامہ ورسائی کو پوری طرح نیست و نابود کر دیا ہے، اور اسی سلسلے میں تجارت کو بلقان اور مغربی ایشیا کی طرف بڑھانے کے لئے رستہ بالکل صاف کر لیا ہے۔ سیاست میں اب وہ ٹٹول رہا ہے کہ کدھر بڑھنے میں سب سے کم رکاوٹیں ہوں گی۔ نوآبادیوں کی واپسی کا معاملہ برطانیہ کی وزارت خارجہ تک نہیں پہنچا ہے تو برطانیہ کے ایوان عام میں اور ساری دنیا کے اخباروں میں تو اس کا چرچا ہو ہی گیا ہے، اور اب روس کے جنوب مغربی صوبہ اکرائن پر جرمنی کے قبضہ کرنے کا ذکر بھی چھڑ گیا۔ آخر ستمبر کی میونخ کانفرنس کے بعد جو امید تھی کہ جرمنی اور برطانیہ کے درمیان دوستی کی طرح ڈال دی گئی ہے اور اس کا امکان ہو گیا ہے کہ مسٹر چیمبرلین کی صلح پسندی ہرہٹلر کے جوش کو تھوڑا بہت ٹھنڈا کر سکے گی اس کا بھی مغالطہ نہیں رہا۔ جرمن اخبار برطانیہ کو ایسی اُلٹی سیدھی سنا رہے ہیں کہ برطانیہ کانوں میں روئی ڈالے بغیر صلح پسندی کے موجودہ مسلک پر قائم نہیں رہ سکتا۔

اٹلی | یورپ کی سیاست کا محور اٹلی اور جرمنی کا اتحاد ہے، لیکن اب آثار اس کے نظر آرہے ہیں کہ جرمنی

کی حکمت عملی اس کا محور ہوگی اور اٹلی کی سیاست بس اس پر پالش کر کے کبھی اسے فولادی اور کبھی لکڑی کا بنا ہوا ظاہر کرتی رہے گی۔ روم برلن کا محور ۱۹۳۶ء میں قائم ہوا، اور دیکھنے میں اب بھی بہت مضبوط ہے، لیکن اس میں اٹلی کو برابر نقصان ہوتا رہا ہے اور اب بھی کسی طرح کے فائدے کی صورت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ مسولینی شروع میں جرمنی اور آسٹریا کے مل جانے کا مخالف تھا، اور ۱۹۳۴ء میں جب اس کا اندیشہ ہوا تو اس نے فوراً انگلستان اور فرانس سے وہ اتحاد کیا جو سٹریزا کا محاذ کہلاتا ہے اور جس کا مقصد جرمنی کے امڈتے ہوئے حوصلوں کو دبانا تھا۔ حبش کی جنگ ہوئی اور اٹلی کی برطانیہ اور فرانس سے بگڑ گئی تو ہٹلر نے مسولینی کا ساتھ دیا۔ مگر اس دوستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسولینی کو آسٹریا ہٹلر کے حوالہ کرنا پڑا، چکوسلوواکیا کا معاملہ بھی اسی کے حق میں طے کرانا پڑا اور اب بحر اڈریاٹک، بلقان اور مجبوری حیثیت سے مشرقی بحر روم جرمنی کے لئے خالی کرنا پڑا ہے۔ مسولینی کا جو اندازہ تھا کہ وہ جرمنی کی ہمدردی اور مدد حاصل کر کے ہسپانیہ اور مغربی بحر روم کی سیاست اور تجارت پر قبضہ کر سکے گا وہ اگر غلط نہیں تو صحیح بھی نہیں نکلا ہے، جرمنی کو ہسپانیہ کے معاملات سے جو دلچسپی تھی وہ اس سال کے اندر ختم ہوگئی ہے اور اب اٹلی کو وہی مل سکے گا جو وہ اپنے زور بازو سے حاصل کرے۔

دراصل اٹلی کا مفاد نہ جرمنی سے بالکل مل جانے میں ہے نہ برطانیہ اور فرانس سے، اس کا مفاد دونوں فریق سے سودا کرنے اور اپنے جغرافی مقام سے فائدہ اٹھانے میں ہے۔ یعنی اس کا کام صرف دغابازی اور دھونس سے چل سکتا ہے۔ وہ اپنے دوست جرمنی سے ڈرتا ہے، برطانیہ سے سمجھوتا کرنا چاہتا ہے اور اس سال اپریل میں کیا بھی ہے، لیکن سیدھے منہ بات کرنا گوارا نہیں کرتا، اور ابھی اس نے فرانس سے نوآبادیوں کے مسئلے پر جھگڑا شروع کیا ہے جس میں کوئی تعجب نہیں اگر اس کی نیت فرانس سے دوستی کرنا ہو۔ جرمنی نے نوآبادیوں کے معاملے میں اٹلی کا ساتھ نہیں دیا ہے، اگر فرانس کی حالت ایسی نازک ہے کہ اگر اٹلی اپنے ہی بل بوتے پر فرانس سے بھڑ جانے کی ٹھان لے تو بھی کوئی حیرت کی بات نہ ہوگی۔

فرانس | فرانس میں ۱۹۳۶ء میں قومی محاذ کی یعنی سوشلسٹ پارٹیوں کی حکومت قائم ہوئی۔ یہ انتہا پسندی کا عروج تھا، اور اس کے بعد سے رفتہ رفتہ اعتدال پسندی کی طرف میلان بڑھتا گیا۔ فرانس کے

ایوان عام میں بہت سی چھوٹی بڑی پارٹیاں ہیں جن کے اصول مبہم ہیں اور نام غلط فہمی پیدا کرتے ہیں۔ سوشلسٹ انتہا پسندی کا ردعمل یہ نہیں ہوا کہ نری سرمایہ داروں کی وزارت بنے، بلکہ جب کبھی ایک وزارت ٹوٹی اور دوسری بنی تو اس میں اعتدال پسند وزیروں کی تعداد بڑھ گئی، اور اس سال کے دوران میں سوشلسٹ اور کمیونسٹ وزارت سے بالکل خارج کر دئے گئے ہیں۔ قومی محاذ کی وزارتیں اس سبب سے ناکامیاب ہوئیں کہ سرکاری بنک نے ان کی مخالفت کی اور ایوان نے مالی معاملات میں انھیں ضروری اختیارات دینے سے انکار کر دیا۔ اس سال اعتدال پسند وزارتوں کے لئے یہ دشواری رہی کہ مزدوران کی مخالفت کرتے رہے، اور اس وقت بھی اس سے باز نہ آئے جب کہ دشمن کے حملے کا خطرہ تھا۔ ظاہر ہے اس کا فرانس کی خارجی سیاست پر بہت برا اثر پڑا، اور جرمنی اور آسٹریا کے اتحاد اور چکوسلواکیا کی تقسیم کے موقعوں پر ملک کی حالت ایسی تھی کہ برطانیہ کی خوشامد کرنے، جرمنی کا غصہ اتارنے کے لئے پرانی سیاست کو بغیر ماتم کئے دفن کرنے اور دوستوں کے ساتھ دشمنوں کی طرح پیش آنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ فرانس کی سیاسی حیثیت اب دوسرے درجے کی ریاستوں کی سی ہو گئی ہے، حیثیت کے ساتھ اس کی تجارت بھی بہت گھٹ گئی ہے، اور اگر اس سال کی کارگذاری اور کیفیت معیار مانی جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب فرانس میں دم نہیں رہا ہے۔

برطانیہ | نقصان برطانیہ نے بھی بہت اٹھایا ہے، مگر آبرو نہیں کھوئی ہے۔ برطانیہ نے ایک طرف مزدوروں میں دل کھول کر گذارے تقسیم کرکے اور دوسری طرف بڑے پیمانے پر جنگ کی تیاری کرکے ملک کو بے چینی اور فساد سے محفوظ کر لیا ہے اور وہاں کوئی اندرونی مخالفتیں نہیں ہیں کہ جنھیں دیکھ کر غیر لوگ برطانیہ کو کمزور سمجھ بیٹھیں۔ برطانیہ کی دشواری ایک تو سرکاری ملازموں کی بے پروائی، ٹھیکیداروں کی بے ایمانی اور کارخانوں کی سستی ہے، اور دوسرے مسٹر چیمبرلین کا بڑھاپا اور ان کی یہ عادت کہ وہ اپنے ارادوں کو راز بنا کر دل میں رکھتے ہیں اور کسی کو اس لائق نہیں سمجھتے کہ اس سے پوری بات کہیں۔ سرکاری ملازموں کی بے پروائی اور ٹھیکیداروں کی بے ایمانی کی قلعی اس وقت کھلی جب زہریلی گیس سے بچانے والے توبڑوں کے کارآمد ہونے پر بحث چھڑی، اور پھر پچھلے ستمبر میں جب جرمنی کا ہوائی حملے کرنے کا خطرہ بہت قریب نظر آرہا تھا

اور یہ راز فاش ہو گیا کہ اگر جرمنی نے حملے کر دئے تو لندن کو بمباری سے بچانے کا کوئی انتظام نہ کیا جا سکے گا لیکن جمہوری حکومتیں اور خاص طور سے برطانوی حکومت خطروں کی پیش بندی کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہے، اور یہ کمزوری کی علامت نہیں ہے۔ کارخانوں کا ناکافی اور سست ہونا، جس کا ثبوت اس سے ملا کہ برطانیہ نے پانچ سو ہوائی جہاز بنانے کا ٹھیکہ امریکہ کی ایک کمپنی کو دیا ذرا تعجب کی بات ہے، اور اس سے اس عام خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ ابھی تک انگریز یہی نہیں کہ لڑنا نہیں چاہتے بلکہ چاہیں بھی تو لڑ نہیں سکتے۔

یہ بھی کچھ ناممکن نہیں کہ حکومت کے کارکنوں اور سامان جنگ کے کارخانوں کی سستی برطانوی وزارت کی روح رواں مسٹر چیمبرلین کی پالیسی کا عکس ہو۔ مسٹر چیمبرلین کا خیال ہے کہ اس وقت یورپ کی جو قومیں روٹھی ہیں ان کو منانا چاہئے، اور جنگ کی تیاری کا چرچا اس خیال سے نہیں کیا جا رہا ہے کہ برطانیہ جلد سے جلد لڑنے کے لئے تیار ہو جائے بلکہ وہ نتیجہ ہے سرمایہ داروں کو روپیہ، مزدوروں کو کام اور شہریوں کو اطمینان دلانے کی خواہش کا، تاکہ مسٹر چیمبرلین فراغت کے ساتھ روٹھی قوموں کو منانے کی مناسب تدبیریں کر سکیں۔ ابھی تک اس سلسلے میں اتنا کیا جا سکا ہے کہ جرمنی کو مارچ میں آسٹریا اور اکتوبر میں سڈیٹن علاقے دلوائے گئے اور اٹلی سے اپریل میں سمجھوتا کر لیا گیا۔ مسٹر چیمبرلین کو پورا یقین ہے کہ جرمنی لڑائی نہیں چاہتا، صلح و آشتی سے پنچوں کے سامنے اپنا مطالبہ پیش کر کے اپنا حق وصول کرنا چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ چکوسلوواکیا کے جھگڑے میں پنچ بنے، ہر ہٹلر سے دو مرتبہ روبرو گفتگو کرنے کے لئے جرمنی پہنچے اور اگلے سال کے شروع میں مسولینی سے ملاقات کرنے کے لئے روم جانے والے ہیں۔ مسولینی نے اب تک جب کبھی برطانیہ سے دوستی کی خواہش ظاہر کی تو تھوڑے ہی دنوں کے اندر گالیاں بھی دیں، جرمن اخبار میونچ کانفرنس کے بعد سے برطانیہ کی عیب جوئی کر رہے ہیں اور کبھی کبھی بے تکلف گالیاں بھی دیتے ہیں لیکن مسٹر چیمبرلین کے نزدیک اس سے صرف یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مسولینی اور ہٹلر دونوں مزاج کے ذرا تیز ہیں، مگر دل سے صلح کے خواہشمند ہیں اور ان کے ساتھ سلیقے اور صبر سے بات کی گئی تو دونوں راہ پر آ جائیں گے۔

معلوم نہیں مسٹر چیمبرلین سلیقے سے بات کرنے کے کیسے موقعے نکالنے کی فکر میں ہیں، بظاہر تو انکی

پالیسی اب تک "عزت کے ساتھ پسپائی" کی صورت اختیار کرتی رہی ہے۔ اور اگر ان کا یہ خیال صحیح ہو کہ جرمنی اور اٹلی لڑنا نہیں چاہتے تب بھی اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ دونوں کا فائدہ جنگ کی دھمکیاں دینے میں ہے، اور وہ یہ دھمکیاں اس خلوص کے ساتھ دیتے ہیں کہ نہ جانے کب ان کا جوش بے قابو ہو جائے اور وہ ایسا کچھ کر گذریں کہ پھر لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔ بے شک مسٹر چیمبرلین نے پچھلے ستمبر میں یورپ کو ایک جنگ عظیم کے خطرے سے بچا لیا، لیکن انھوں نے ہر ہٹلر اور سولینی دونوں کو یقین دلا دیا ہے کہ وہ جتنا بھی مانگیں انھیں مل جائے گا اگر وہ مسٹر چیمبرلین کے یہ ذہن نشین کر سکے کہ ان کا مطالبہ پورا نہ کیا گیا تو جنگ چھڑ جائیگی۔ مسٹر چیمبرلین فرانس کی سرحد کو برطانیہ کی سرحد مانتے ہیں، اس لئے کہ ان کے پیر و مرشد مسٹر بولڈون کہہ گئے ہیں کہ برطانیہ کی سرحد دریائے رائن پر ہے، اگر وہ یورپ کی کسی اور ریاست کو سلامت رکھنے کی خاطر اپنی نیند خراب کرنا نہیں چاہتے۔ جرمنی مشرقی سوستان، شمالی اٹلی، شمالی اور مغربی پولینڈ اور جنوب مغربی روس پر قبضہ کرلے تو ان کی بلا سے، جنوبی افریقہ کو جرمنی کی جو نوآبادیاں جنگ عظیم کے بعد ملی تھیں وہ بھی شاید مسٹر چیمبرلین جرمنی کو دلوا دیں۔ مگر ہٹلر کی ہوس اس سے بھی پوری نہ ہوئی تو پھر؟ اور اٹلی نے مغربی بحر روم اور فرانس کی افریقی نوآبادیاں مانگیں تب؟ انگلستان کی طاقت بڑی ہے تو اس کی سرحد بھی ہزاروں میل لمبی ہے، اور روٹھی ہوئی قوموں کو منانے کی پالیسی مورچے کا کام نہیں دے سکتی۔

فلسطین | برطانوی سیاست کا بھانڈا شاید کبھی اس طرح سے نہ پھوٹا ہوگا جیسے کہ فلسطین میں۔ اپنی غرض پوری کرنے کے لئے جو متضاد وعدے برطانوی مدبروں نے لڑائی کے زمانہ میں کئے تھے ان کا اب یہ نتیجہ نکلا ہے کہ فلسطین میں کسی فریق سے پوری بات نہیں کہی جا سکتی۔ اور یہ کوشش بھی کامیاب نہیں ہوئی ہے کہ اصول اور وعدوں کو بالائے طاق رکھ کر اور جو کچھ ہو چکا تھا یعنی فلسطین میں جتنے یہودی آباد ہو چکے تھے اور ملک پر حقدار ہونے کا جو خیال دنیا بھر کے یہودیوں میں پھیل چکا تھا اسے صحیح اور ضروری تسلیم کرکے سرکاری کمیشنوں کے ذریعے مسئلے پر نئے سرے سے غور کیا جائے اور ایک عقلاً درست نظام قائم کیا جائے جسے دونوں فریق منظور کر لیں یا منظور کرنے پر مجبور کئے جا سکیں۔ اس سال جو کمیشن بھیجا گیا تھا اس نے فلسطین کو تقسیم کرنے کی تجویز کو رد کر دیا ہے اور اب برطانیہ کا ارادہ ہے کہ ایک گول میز کانفرنس کرکے عربوں اور یہودیوں کو اس نئے

میدان میں لڑائے اور پنچ بن کر ان کے درمیان فیصلہ کرے۔

گول میز کانفرنس کی تجویز ہندستانی سیاست کی گتھیاں سلجھانے کے لئے بہت کارآمد نکلی تھی، لیکن عرب اور ہندستانی میں بڑا فرق ہے۔ عرب غدار ہندستان کی انگریزی حکومت کے مسلمان خادموں کی طرح نہ تو مذہب کی آڑ لے سکتے ہیں نہ نوکریاں دلوا کر غداری کو قوم پروری کا رنگ دے سکتے ہیں۔ فلسطین کی بدامنی کو دور کرنے کے لئے بیس پچیس ہزار فوج کی مستقل ضرورت ہے جسے ہر وقت چوکنا رہنا پڑے گا، اور یہ فوج بھی نہ ریلوں کو چلا سکے گی، نہ سڑکوں کو جیسا کہ چاہئے محفوظ رکھ سکے گی، یہ اگر عرب باغیوں کو پکڑنے میں پولیس کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہوگی تو عام آبادی کو اس کے قواعد پریشان کرتے رہیں گے اور عربوں میں یہ احساس بڑھتا رہے گا کہ ایک غیر قوم نے ان کی آزادی چھین لی ہے اور ان کی عزت بھی چھین رہی ہے۔ عربوں کی جان بازی سے عاجز آ کر برطانوی حکومت سوچ رہی ہے کہ فلسطین کی حکومت بالکل فوج کے حوالے کر دے۔ ایسا کیا گیا تو انشاء اللہ فلسطین بہت جلد آزاد ہو جائے گا۔

انگریز فلسطین کو اپنے لئے بھڑوں کا چھتا نہ بننے دیتے اگر یہ مسئلہ مقامی ہوتا، اور جیسا کہ وہ کہتے ہیں انھیں صرف عربوں اور یہودیوں کے درمیان انصاف کرنا ہوتا۔ برطانیہ کو عربوں سے کبھی لگاؤ نہ تھا اور انگلستان کے یہودیوں سے اس وقت قرضہ لینے کی ضرورت نہیں، برطانوی انصاف پرستوں کے مدنظر دراصل ایسا انتظام ہے کہ جو انھیں مشرقی بحر روم میں ایک بڑا فوجی مرکز بنانے کا موقع دیدے، تاکہ وہ نہر سوئز پر قبضہ رکھ سکیں، بحر روم میں تجارت چاہے جو کوئی کرے، رعب برطانیہ کا ہو، اور جرمنی خشکی کے رستے ترکی، ایران اور افغانستان تک اپنی تجارت اور سیاسی تعلقات کا جال پھیلا دے تب بھی برطانوی سلطنت کا مرکزی رستہ خطرے میں نہ پڑے۔ دوسرے پہلو سے دیکھئے تو ساری دنیا کے یہودیوں کا فلسطین میں دل لگا ہے، اور چونکہ یہ یہودی ساہوکار اور سرمایہ دار ہی نہیں بلکہ بہتیرے اخباروں کے مالک ہیں، یہ برطانیہ کو بہت بدنام کر سکتے ہیں۔ اسی طرح امریکہ میں بہت سے عیسائی عرب ہیں جو باغیوں کو روپیہ دے رہے ہیں اور برلن میں عربوں نے ایک مرکز قائم کیا ہے جہاں سے وہ روپیہ اور سامان جنگ شام کی طرف سے فلسطین بھجواتے ہیں۔ یہ عملی مدد کے ذریعے ہیں۔ ان کے علاوہ مصر، حجاز، شام اور عراق کے عربوں کی عام رائے برطانیہ پر دباؤ ڈال رہی ہے، اور

کوئی فیصلہ جو فلسطین کے عربوں کو انصاف کے خلاف معلوم ہو اس پر یہ سب بھی احتجاج کریں گے۔ اب دیکھنا ہے کہ گول میز کانفرنس کس طرح اس معمے کو حل کرتی ہے۔

ہسپانیہ کی خانہ جنگی ہسپانیہ کی خانہ جنگی سال بھر جاری رہی اور نہ جانے کب تک جاری رہے گی۔ ہسپانی "حکومت" اب آخری مورچے پر لڑ رہی ہے، جسے "باغی" کسی طرح فتح نہیں کر پاتے۔ اب تک عدم مداخلت کی جو تشریح کی گئی اس سے حکومت کے ملئے ہزاروں دشواریاں پیدا ہوئیں اور جنرل فرینکو کو ہر طرح سے مدد پہنچتی رہی۔ لیکن اب جنرل فرینکو کے خیرخواہ یا توان کی مدد کرتے کرتے تھک گئے ہیں یا جس امید میں انھوں نے مدد کی تھی وہ پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ جرمنی کے وزیر خارجہ ہر فون رِبن ٹروپ نے فرانس کے وزیر خارجہ کو یقین دلایا ہے کہ ہسپانیہ میں چار ہزار سے زیادہ جرمن سپاہی نہیں، اور وہ بھی لڑتے نہیں ہیں بلکہ پیچھے سے سہارا دے رہے ہیں۔ مسولینی نے برطانیہ کو اپنی نیک نیتی کا یقین دلانے کے لئے دس ہزار سے اوپر اٹیلین سپاہی واپس بلالئے ہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ اب بھی بہت سے اٹیلین سپاہی جنگ میں شریک ہیں اور فرینکو کے پاس سامان بھی بہت بھیجا جارہا ہے۔ سامان تو بہت کارآمد ہے، جس کا ثبوت ان بم کے گولوں سے ملتا ہے جو بارسیلونا کے شہر میں گرتے ہیں اور معصوموں کا خون کرتے ہیں، لیکن سنا گیا ہے کہ جب کبھی اٹلی کی طرف سے فرینکو پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ کچھ کرکے نہیں دکھاتے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ اس کا سبب اٹیلین سپاہیوں کا نکما پن ہے۔ اور اس میں شک بھی نہیں کہ ابھی تک اٹیلین سپاہیوں کی تعریف کسی نے نہیں کی ہے۔

ہسپانیوں کی طبیعت اور مزاج کچھ ایسا ہے کہ ان کی غیروں سے کبھی بنتی نہیں، اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر وہ افواہیں جو بہت دنوں سے پھیل رہی ہیں کہ قومی مزاج کی بدولت اٹلی اور فرینکو کا اتحاد پھیکا ہوتا چلا جاتا ہے صحیح ہوں، اور مسولینی کے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہوگیا ہو کہ فرینکو اٹیلین سپاہیوں کے بل پر لڑائی جیتے گا اور پھر اٹلی کا جس طرح کہ چاہئے احسان ماننے سے انکار کردے گا۔ اس میں شک نہیں کہ لڑائی ختم ہونے پر فرینکو کی سیاست پلٹا کھائے گی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی ہسپانیہ میں اتنی غرضیں اٹکی ہیں کہ وہ اسے بہت کچھ خوشی سے دینے پر تیار ہوجائیں گے، مسولینی جو کچھ دینا تھا دے چکا ہے اور اب اس کے مانگنے کی باری آئی ہے۔ غالباً اس کے مطالبے ایسے ہوں گے جنھیں منظور کرنے میں فرینکو تامل کرے گا اور

برطانیہ اور فرانس پورا زور لگائیں گے کہ وہ انھیں منظور نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مسولینی نے اتنا سب داؤں لگانے کے بعد بھی انگریزوں سے سمجھوتا کیا ہے، اور ان کے ذریعے سے بھی اپنا حق محفوظ کرانے کی گنجائش رکھی ہے، برطانیہ جس بات پر راضی ہو جائے اس کے خلاف فرانس کی کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوگی۔

چین اور جاپان کی جنگ | ہسپانیہ کی طرح چین پر بھی سیاست کے گدھ منڈلا رہے ہیں اور نہ جانے کب تک منڈلاتے رہیں گے۔ کیونکہ یہاں بھی ہر فریق کا اندازہ غلط ثابت ہو رہا ہے اور دونوں کی ضد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ جاپان نے یہ جنگ اس یقین کے ساتھ شروع کی تھی کہ چینی حکومت میدان میں مقابلہ کرنے کے لئے فوجیں تیار نہ کر سکے گی، چین کے سرمایہ دار، زمین دار اور ان سے بھی زیادہ وہ لوگ جو اطمینان سے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں جاپانی حکومت کا خیر مقدم کریں گے اور کہیں زبردستی اور کہیں اتحاد عمل اس کی ہر مشکل آسان کر دے گا۔ لیکن چینیوں نے بہت جم کر مقابلہ کیا، متواتر شکستیں کھانے کے باوجود چینی حکومت کا قوم میں اثر و اقتدار بڑھتا رہا، سرمایہ دار جاپانیوں کی ہوس، زمیندار دیہاتیوں کے غصے اور غدار قوم پرستوں کے انتقام سے ڈر کر بڑی حد تک جاپانی حکومت سے الگ رہے ہیں، اور چینی فوجوں نے قزاقانہ جنگ کا طریقہ اختیار کر کے جاپانیوں کو اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ اس وسیع علاقے کو جو انھوں نے فتح کر لیا ہے اپنا کہہ سکیں۔ لیکن دوسرے پہلو سے دیکھئے تو جاپانی فوج نے ہر مورچہ فتح کیا ہے، آہستہ آہستہ چینی حکومت اور فوج کو جنوب مغرب کی پہاڑوں میں بند کر دیا ہے اور انھیں وہاں اتنے عرصے تک بند رکھ سکتی ہے کہ اخلاقی اطمینان اور قومیت کے جوش کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہ رہ جائے۔ جاپانی قوم کی تنظیم ایسی ہے اور اس میں ایثار کا مادہ اس افراط سے ہے کہ ان لوگوں کی پیشین گوئی جو یہ کہتے تھے کہ جاپان کا دیوالہ نکل جائے گا یقیناً غلط ثابت ہوگی۔ جاپانیوں کا عزم اور استقلال بھوک کے پیٹ سے ڈرنے والا نہیں۔

لیکن چین بھی بالکل بے بس یا لاوارث نہیں۔ چینی حکومت کو اس کی امید نہ تھی کہ جاپان کا میدان جنگ میں مقابلہ کیا جا سکے گا، اور چینیوں میں قومیت کا جذبہ اس طرح بیدار ہو گیا ہے کہ جنگ کے نتیجے کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اب چین کے تمام بڑے شہر اور آباد علاقے جاپانیوں کے قبضے میں ہیں، اور سوا اس کے کہ دیہات میں جاپانی حکومت کا نہ اثر پھیلا ہے اور نہ زور چلتا ہے، چینی اپنی شکست سے انکار نہیں کر سکتے۔

لیکن جاپان کسی کو دوست بنانا جانتے ہی نہیں، اور ان کی سیاست ذرا ذرا سی بات پر غرانے اور دانت دکھانے لگتی ہے، اس لئے چینیوں کی یہ عداوت بہت دنوں تک قائم رہے گی، اور موجودہ چینی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تب بھی جاپانیوں کو سارے ملک میں فوج رکھنا اور اس پر اتنا روپیہ خرچ کرنا ہوگا جو ان کی آمدنی کو کھا جائیگا اور غالباً سرمایہ دار بھی اتنے مطمئن نہ ہو سکیں گے کہ چین میں جتنا کہ چاہیئے سرمایہ لگائیں۔ چینی حکومت کا خاتمہ بھی جلد ہوتا نظر نہیں آتا۔ اب روس اس پر مجبور ہے کہ اسکی مدد کرے اور دوسری قومیں بھی جاپانیوں کی ہوس دیکھ کر اسی طرف مائل ہو رہی ہے۔

تجارت کا اصول یہ ہے کہ ہر طرح اپنے فائدے کی فکر کرے، اور اسی سبب سے انگریز اور امریکن جن کا کروڑوں کا سرمایہ چین میں لگا ہے اپنے کارخانوں اور کاروبار کو جہاں تک ممکن تھا بچاتے اور جنگ کے خاتمے کا انتظار کرتے رہے۔ اس کا کوئی امکان تھا نہیں کہ لڑائی میں چینی جیت جائیں، اور اب تک کوئی چینی حکومت ملک میں اتنا انتظام نہیں کر سکی ہے کہ تجارت اطمینان سے اپنا کام کر سکے، اس لئے انگریز اور امرکی سرمایہ داروں نے اپنی ہمدردی ضائع نہیں کی، اور چین کی مدد کرنے کے بجائے جاپان سے ہر طرح بنائے رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن جاپان نے اب صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ چین کا دروازہ بین الاقوامی تجارت کے لئے کھلا رکھنے پر راضی نہیں، اور جاپانی سیاست اور تجارت کا تعلق اتنا گہرا ہے کہ چین میں جاپانی حکومت قائم ہو گئی تو یہی نہیں کہ آزاد تجارتی مقابلے کی مطلق گنجائش نہ رہے گی بلکہ ہر طرح سے جاپانی تجارت کو فائدہ اور باقی تمام قوموں کو نقصان پہنچانے کی منظم کوشش کی جائے گی، یہاں تک کہ اور تمام قوموں کی تجارت چین کو چھوڑ بھاگے۔ یہ صورت حال دیکھ کر برطانیہ اور امریکہ اب نئے سرے سے اپنے نفع نقصان کا حساب لگا رہے ہیں اور کوئی تعجب نہیں اگر چین کی مدد کرنے کے سوا انھیں اپنا نقصان پورا کرنے کی کوئی تدبیر نہ سوجھے۔

انگلستان کے لئے یہ بات خاص طور سے خطرناک ہے کہ جاپانی سیاست نفع نقصان کا حساب نہیں لگاتی، ضد کرتی ہے اور اپنی قوم کے محاسبے سے بالکل نہیں ڈرتی۔ انگلستان نے منچوکو پر جاپان کا قبضہ ہو جانے دیا۔ اس امید سے کہ کچھ دنوں کے لئے جاپان کا پیٹ بھر جائے گا۔ لیکن جاپان سیر نہ ہوا

اور چین پر منہ مارا۔ اس پر بھی انگلستان نے چوں نہیں کی، مگر جاپان کی ہوس کا وہی عالم ہے۔ اب انگلستان کو ایک تو اس کی شکایت ہے کہ چین میں اس کا جو کاروبار تھا وہ ختم کیا جا رہا ہے اور دوسرے اس کا خوف کہ جاپان نے چین کو بالکل فتح کر لیا تو وہ اور پاؤں پھیلائے گا۔ اور پھیلائے گا تو کدھر؟ آسٹریلیا کی طرف، ایشیا کے جنوب مشرقی جزیروں کی طرف، ہندچینیا کی طرف، یا پھر برما میں، جس کی سرحد چین سے ملی ہوئی ہے اور جو خام مال اور قدرتی ذخیروں کا ایک بے مثل خزانہ ہے۔ اب انگریز جاپانیوں کی مخالفت نہ کریں تو کیا کریں؟ زبردست ظالم کی سیاست اسی طرح اپنی جڑ کاٹتی ہے۔ جاپان کی ہوس حد سے گذر نہ جاتی تو مانچوکو کی طرح چین بھی اس کا تھا اور مشرقی ایشیا کی فرماں روائی بھی۔ اسی معاملے کو مگر دوسرے پہلو سے دیکھئے تو قدرت اپنا کام بنا رہی ہے۔ اعتدال کی مصلحت ظلم کی سمجھ میں آ جائے تو دنیا میں انصاف کا نام تک باقی نہ رہیگا۔

ہندوستان

صوبائی خود مختاری

ہندوستان کے تمام خود مختار صوبوں کے لئے ۱۹۳۸ء کا سال تعمیری کاموں اور اصلاحی کوششوں کا سال تھا۔ لیکن کانگریسی صوبوں میں خصوصیت کے ساتھ کام کو زیادہ یکسوئی، اطمینان اور حوصلہ مندی کے ساتھ کیا گیا۔ اس کے کئی وجوہ تھے۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ گیارہ صوبوں میں سے سات صوبوں میں کانگریسی حکومت قائم ہوگئی تھی اور باقی صوبوں میں پنجاب کو چھوڑ کر، کانگریس کی حیثیت ایسی تھی کہ اتحادی حکومت کے بنانے کا اسے موقع تھا۔ چنانچہ بعد میں آسام میں مکمل طور پر اور سندھ میں نامکمل طور پر کانگریسی حکومت بنا بھی لی گئی۔ بنگال کی غیر کانگریسی اتحادی وزارت کو کئی موقعوں پر نازک دوروں سے گذرنا پڑا اور اب بھی اس کا امکان ہے کہ وہاں کانگریس کی اتحادی حکومت قائم ہو جائے۔ ہندوستان کے آٹھ صوبوں میں اپنی پارٹی کی طاقت کو دیکھ کر قدرتی طور پر اعتماد کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ اسمبلیوں سے باہر کانگریس کی طاقت اور بھی زیادہ مستحکم بنیاد پر قائم تھی۔ کانگریس کے جتنے کارکن اور رہنما اسمبلیوں کے اندر کام کر رہے تھے ان سے زیادہ قابل زیادہ منضبط، زیادہ مخلص، زیادہ آزمودہ، زیادہ معرکہ پسند اور زیادہ ٹھوس کام کرنے والے کارکن اور رہنما اسمبلیوں سے باہر کانگریس کی طاقت کو مضبوط بنانے میں مصروف تھے۔ درحقیقت کانگریس کی اصلی قوت اسمبلیوں سے باہر تھی اور اسمبلیاں صرف اس باہر کی قوت کو مضبوط بنانے کے لئے اور اس کے اغراض اور احکام کی پورے طور پر پابند اور مطیع ہو کر کام کر رہی تھی۔ کانگریسی حکومتیں صرف اس لئے بنائی گئی تھیں تاکہ باہر کا کام اچھی طرح کیا جا سکے اور اس میں حکومت کی مخالفت کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو سکے۔

چنانچہ کانگریس نے اس زمانے میں ہر ضلع، ہر تحصیل اور بہت سے گاؤں میں اپنے نہایت مخلص، معتمد اور ایثار پیشہ کارکنوں کا جال پھیلا دیا۔ کانگریس نے دراصل دو متوازی مشینوں کے ذریعے سے اپنے تعمیری کام

کو چلایا۔ ان میں سے ایک مشین کے کل پرزے اس کے اپنے بنائے ہوئے تھے جن پر اسے مکمل اور آخری اختیار حاصل تھا اور جن پر وہ پورے طور پر اعتماد کرسکتی تھی اور دوسری مشین کے کل پرزے وہ تھے جو حکومت برطانیہ کی طرف سے اسے دئے گئے تھے۔ جو ۱۹۳۵ء کے دستور ہند کی دفعات کے اندر رہ کر تو کانگریسی وزراء کی اطاعت کرسکتے تھے لیکن اس سے باہر ان کی وفاداریاں بھروسہ کے لائق نہیں تھیں۔ اس لئے جہاں تک اپنے تعمیری کام اور عوام میں اپنا رسوخ بڑھانے کے سلسلہ میں، کانگریسی حکومت، اس دوسری جماعت سے مدد لے سکتی تھی وہاں تک تو اس نے ان کی مدد لی۔ لیکن اس سے زیادہ پروپیگنڈا کرنے اور حکومت برطانیہ کے سامنے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے کانگریس نے اپنی نجی مشین کے کل پرزوں کو استعمال کیا اور دیہاتوں میں جاکر ضلع اور صوبہ کی کانفرنسیں منعقد کیں جن میں لاکھوں کی تعداد میں کسان شریک ہوئے اور جن کی اہمیت اور اثر صوبہ کے وزیروں کی شرکت کی وجہ سے بہت زیادہ بڑھ گیا۔

پھر زمینداروں اور مل کے مالکوں کے خلاف جن میں سے اکثر کانگریس کی مخالفت کرتے رہے تھے زبردست مظاہرے اور ہڑتالیں ہوئیں لیکن اس سلسلے میں زمینداروں اور مل کے مالکوں کو کانگریس نے بالکل مایوس نہیں کیا بلکہ تھوڑا سا پریشان کرکے تحفظ کا اطمینان دلادیا تاکہ وہ بالکل بددل ہوکر پورے طور پر برطانیہ کے طرفدار نہ بن جائیں۔

ملک کی دیسی زبانوں اور انگریزی کے اخباروں کی بھی سرپرستی کی گئی۔ ان میں سے بہت سے اخبار تو پہلے سے ہی کانگریس کے حامی تھے اور بہت سے اس زمانے میں حامی بن گئے باہر کے ملکوں میں بھی خصوصاً برطانیہ میں پروپیگنڈے کا معقول انتظام کیا گیا۔

ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کا ایک بڑا گروہ چونکہ کانگریس کے ساتھ ابتدا سے رہا ہے اور ملک کی صنعتوں کی ترقی کے ساتھ جس کی کانگریس زبردست حامی ہے، اپنے مفاد کو وابستہ سمجھتا ہے اس لئے کانگریس کو مالی دشواریوں کا سامنا کبھی نہیں کرنا پڑتا۔ پھر اس زمانے میں تو کانگریس کو صوبوں کے آمدنی کے وسائل پر بھی پورا اقتدار حاصل ہوگیا۔ اس لئے مالی وسائل کی طرف سے کانگریس کو پورے طور پر بے فکری رہی۔

اس کے علاوہ بین الاقوامی صورت حال کی نزاکت اور حکومت برطانیہ کی پریشانیاں بھی کانگریسی

حکومت کے لئے ایک برکت ثابت ہوئیں۔ جنگ کا خطرہ برابر قائم رہا اور برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کو مطمئن، پُر امن اور دوست رکھنے کی پالیسی پر پوری طرح عمل ہوتا رہا۔ اس زمانے میں برطانیہ کی برابر یہ خواہش رہی کہ ہندوستان میں ایک ایسی طاقتور جماعت برسر اقتدار رہے جس سے ضرورت کے وقت سمجھوتہ کیا جا سکے تاکہ سمجھوتہ کے بعد ہر طرح کے خطروں اور اندیشوں کی طرف سے اس کے اشتراک عمل کی وجہ سے اطمینان ہو جائے۔

یہ تمام وجوہ ایسے تھے جن کی بنا پر کانگریسی حکومتیں بہت سے ان کاموں کو جرأت اور حوصلہ کے ساتھ کر سکیں جن کو کرنے میں دوسرے صوبوں کی حکومتوں کو کانگریس کی رہنمائی کے بغیر یا تو پس و پیش ہوا یا اگر ہمت کر کے شروع کیا تو بعد میں سخت مخالفتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

صوبوں کی حکومتوں کی کچھ کارگذاریاں تو ایسی ہیں جن کی نوعیت منفی ہے ؎

مرا بہ خیر تو امید نیست بد مرساں

اور کچھ ایسی جن کی نوعیت اثباتی ہے۔ پہلی کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ان باتوں کو نہیں ہونے دیا جن سے صوبوں کی خود مختاری کم یا ختم ہو سکتی تھی اور دوسری کا یہ کہ انھوں نے ایسے کام کیے جن سے واقعی رعایا کی حالت میں پہلے کے مقابلہ میں بہتری پیدا ہوئی ہے۔

منفی کارناموں میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ ان حکومتوں نے ۱۹۳۵ء کے دستور ہند کی ان دفعات کو جن کا تعلق "تحفظات" سے تھا عملاً بے کار کر دیا۔ پندرہ سولہ مہینہ میں ایک مرتبہ بھی گورنر کو اپنے "خاص اختیارات" یا "اختیار تمیزی" کو استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ نہ تو اقلیتوں کے تحفظ کے سلسلہ میں نہ انڈین سول سروس یا کسی دوسری سروس کے کسی ممبر کے لئے۔ قانون اور امن کی حفاظت اور فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام بھی وزیروں نے خود ہی کر لی اور اس کام کے لئے ان اختیارات کے استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جو ان سے پہلے برطانوی حکومت خود ان کے خلاف استعمال کیا کرتی تھی۔ اس پر کانگریس کا انتہا پسند طبقہ کانگریسی وزیروں اور کانگریس کے برسر اقتدار رہنماؤں سے جنھوں نے ان کی تائید کی سخت ناراض بھی ہو گیا ہے۔ لیکن گورنر کو بہر حال اپنے اس تحفظی اختیار کو استعمال

کرنے سے محروم رکھا گیا۔ ممکن ہے گورنر اپنی جگہ پر خوش ہو کہ اس ناخوش گوار کام سے مجھے نجات ملی اور جس کام کو مجھے بہ اکراہ کرنا پڑتا وہ ان لوگوں نے اپنی خوشی سے کر دیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر محرومی کا یہ سلسلہ اسی طرح کچھ سالوں تک اور چلتا رہا تو یہ روایت قائم ہو جائے گی کہ گورنر کو جو اختیارات دیئے گئے ہیں وہ استعمال کرنے کے لیئے نہیں ہیں بلکہ محض نمائشی ہیں جیسے ہاتھی کے دانت ہوتے ہیں، جو بظاہر تو بہت بڑے اور خوف ناک معلوم ہوتے ہیں لیکن ان سے کاٹنے اور چبانے کا کام کبھی نہیں لیا جاتا۔ یہ تو وزارتوں کا منفی کارنامہ ہوا۔

اثباتی کارناموں کا جہاں تک تعلق ہے ۱۹۳۵ء کے دستوری قانون کے ماتحت صوبوں کی حکومتوں کے اختیارات بہت محدود ہیں۔ مالیات کو مرکزی حکومت اور صوبوں کی حکومت کے درمیان اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ اس کا توازن قائم نہیں رہا ہے۔ آمدنی کے ترقی کرنے والے ذرائع مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہیں جو ملک کی آمدنی کے ایک بڑے حصہ کو صرف فوجوں پر اور سرکاری قرضوں کے سود کی ادائگی پر صرف کر دیتی ہے جس کی وجہ سے قومی تعمیر کے تمام شعبے پیاسے رہ جاتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ کانگریسی حکومتیں شراب نوشی کو بند کرنے کا عہد کر چکی ہیں اور لگان کے اس غیر معمولی بوجھ کو بھی ہلکا کرنا چاہتی ہیں جو چھوٹے زمینداروں اور کسانوں کو پیسے ڈال رہا ہے۔ ان کے اختیارات کے محدود ہونے کا اندازہ صوبہ مدراس کی مثال کو سامنے رکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ اس صوبہ کی کل آمدنی سترہ کروڑ ہے اس میں سے ۴½ کروڑ روپیہ نشہ کی چیزوں کی فروخت سے اور ۴ کروڑ زمین کی مال گزاری سے وصول ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں مصارف کو وسیع کرنے کی گنجائش جس قدر کم ہے وہ ظاہر ہے۔ صوبہ کی حکومتیں اپنے کاموں کو نئے ٹیکس لگا کر ہی چلا سکتی ہیں لیکن جب تک ملک کی پوری مالی اور معاشی عمارت کو نئے سرے سے تعمیر نہ کیا جائے۔ امیروں پر غریبوں سے نسبتاً زیادہ ٹیکس نہ لگایا جائے، تباہ کن فوجی اخراجات کو گھٹا کر نصف نہ کیا جائے اور سول ملازموں کی بڑی بڑی تنخواہوں اور غیر دولت آفریں قرضوں کے سود کو کم نہ کیا جائے، اس وقت تک قومی تعمیر کے محکموں کی ترقی اور توسیع کا امکان بہت کم ہے۔

لیکن ان محدود اختیارات کے باوجود صوبہ کی وزارتیں جو کچھ کر سکتی تھیں اس کے لئے پوری کوشش کر رہی ہیں۔ سب صوبوں میں زمین کے لگان اور مالگذاری کو کم کرنے اور کسانوں کو زیادہ حقوق دینے کے

لئے قوانین بنائے گئے ہیں۔ صوبہ یو۔پی۔ اور صوبہ بہار کے لئے یہ مسئلے خاص طور پر بہت اہم بن گئے تھے۔ صوبہ بہار میں تو زمینداروں اور کسانوں میں اس معاملہ میں ایک سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ یو۔پی۔ میں بھی اس قسم کے سمجھوتہ کی کوشش کی گئی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکی۔ اسی طرح کسانوں کو قرضہ کے بوجھ سے نجات دلانے، کم شرح سود پر روپیہ حاصل کرنے، مال کو اچھی قیمت پر فروخت کرنے اور دوسری سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے بھی قوانین بنائے گئے ہیں۔ صوبہ پنجاب میں ان قوانین کا بڑا چرچا رہا۔ حکومت کے مخالفوں نے ان کو "کالے قوانین" اور حکومت کے حامیوں نے "سنہرے قوانین" کے نام سے موسوم کیا۔ اصلاح دیہات کی طرف بھی توجہ کو بڑھا دیا گیا ہے۔ دیہی اور گھریلو صنعتوں کی ترقی اور امداد کے کام سے بھی زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ مل کے مزدوروں کے فائدہ کے لئے بھی قوانین بنائے گئے ہیں۔ مزدوروں کی انجمن کی طرف سے بمبئی کے تجارتی تنازعات کے قانون کی بڑی مخالفت اس بنا پر کی گئی کہ اس میں مل کے مالکوں کے ساتھ رعایت کی گئی ہے۔ مزدوروں نے اس کے خلاف ایک اسٹرائک کرنا چاہا جس کی کانگریسی حکومت نے سخت مخالفت کی۔ بڑی صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے بھی ایک صنعتی تنظیم کمیٹی کا کانگریس کی طرف سے تقرر کیا گیا ہے جس کے جواہر لال جی چیرمین ہیں۔ اس کا مقصد ایک طرف تو یہ ہے کہ ملک میں جو چند بڑی صنعتیں قائم ہو چکی ہیں مثلاً پارچہ بافی، شکر سازی، جوٹ، لوہا اور فولاد اور قوت محرکہ پیدا کرنے والی صنعتیں ان کو پوری ترقی دی جائے اور دوسری طرف ایسی صنعتیں جیسے موٹر کار، وزنی مشینری اور وزنی کیمیاوی صنعتیں وغیرہ ان کو شروع کیا جائے۔ بنیادی صنعتوں کی طرف بھی جن پر تمام بڑی، درمیانی اور چھوٹی صنعتوں کا انحصار ہوتا ہے خاص طور پر توجہ کی جائے۔

اس کے علاوہ تعلیم کی اصلاح کی کوشش کو بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں ذاکر حسین کمیٹی کی سفارشوں کے مطابق بہت سے صوبوں میں ٹریننگ اسکول اور تجربے کے مدرسے قائم کر دئے گئے ہیں بالغوں کی تعلیم کی طرف بھی توجہ بڑھا دی گئی ہے۔ ثانوی تعلیم کی نئی تنظیم کے لئے بھی کمیٹیاں کام کر رہی ہیں۔ لیکن وسائل کی کمی کی بنا پر ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔

کانگریسی صوبوں میں یہ جانتے ہوئے کہ ہمارے اختیارات بہت محدود ہیں اور موجودہ حالات

میں کسی بڑی اصلاح کا کرنا ممکن نہیں ہے خاص طور پر اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ زیادہ تر ان ہی کاموں کی طرف توجہ کی جائے جن سے پرانے ساتھیوں کی رفاقت اور وفاداری کو مضبوط کیا جا سکے اور نئے لوگوں کو زیادہ تعداد میں اپنا طرفدار بنایا جا سکے اور یہ سب اس لئے کیا گیا تاکہ جب نئے انتخابات ہوں یا حکومت سے جنگ کرنا پڑے تو زیادہ لوگوں کی ہمدردی اور امداد حاصل ہو سکے۔ سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں کو رہا کر دیا گیا، بہت سی کتابوں سے امتناعی احکام اٹھا لئے گئے ہیں۔ ضبط شدہ جائدادوں کی واپسی کا مسئلہ بھی زیر غور رہا۔ سیاسی فضا میں بہت زیادہ آزادی محسوس کی جانے لگی۔ کانگریسی جماعت کا ہر فرد محسوس کرنے لگا کہ حکومت میری ہے۔ ہم چشموں میں اعزاز اور مالی فائدہ بھی حاصل ہوا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے کانگریس کو اپنے مقصد میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ اگرچہ بعض صوبوں میں مثلاً سی۔ پی۔ میں کانگریسی کارکنوں کے ذاتی اختلافات کی وجہ سے کانگریس کے بعض پرانے اور نہایت مخلص کارکن اس سے علیحدہ بھی ہو گئے لیکن ان کی مخالفت کو بہت کم اہمیت حاصل ہوئی۔

اگر برطانوی سیاست دانوں کا کانگریس کو عہدے دینے سے مقصد یہ تھا کہ کانگریس کے لوگوں میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی اور ذاتی خودغرضیاں ترقی پا جائیں گی تو ان کو یقیناً مایوسی ہوئی ہوگی۔ خودغرضی کی چند مثالوں کو اگر نظرانداز کر دیا جائے تو بصورت مجموعی کانگریس کا ڈسپلن نہایت قابل تعریف نظر آئے گا۔ حکومت اور اقتدار کی حالت میں ان کی یکجہتی اور وفاداری کسی اعتبار سے بھی جنگ اور آزمائش کے زمانہ سے کم ثابت نہیں ہوئی۔ بلکہ ڈسپلن کی گرفت اس زمانہ میں اتنی سخت ہو گئی کہ جس سے مخالفوں کو یہ اعتراض کرنے کا موقع ملا ہے کہ کانگریس کا ارادہ ڈکٹیٹر شپ قائم کرنے کا ہے۔ کانگریس کی ہائی کمانڈ صوبوں کے معاملات میں غیر ضروری مداخلت کرتی ہے اور وزیروں کو آزادی کے ساتھ کام کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ وزارتوں کو صرف اپنی اسمبلی کے ممبروں اور اپنے منتخب کرنے والوں کو جواب دہ ہونا چاہیئے اور ان پر کسی دوسرے شخص یا جماعت کا کوئی خارجی دباؤ نہ پڑنا چاہیئے۔ وزارتیں اپنے صوبہ کی رہنما خود ہیں ان کی رہنمائی یا نگرانی کرنے کا حق، صوبوں کی کسی جماعت مثلاً صوبہ کانگریس کمیٹی یا باہر کی کسی جماعت یعنی آل انڈیا کانگریس کمیٹی، ورکنگ کمیٹی یا پارلیمنٹری بورڈ کو نہیں پہنچتا۔ اس کے جواب میں کانگریس کی طرف سے یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ہماری

جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے ہم پورے ہندوستان کی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ ہم اتحاد و یک جہتی کو سب سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم اسمبلیوں میں کام کرنے کے لئے نہیں گئے ہیں بلکہ اسمبلیوں کو ایک محاذِ جنگ بنانے کے لئے گئے ہیں۔ ہمارا مقصد مکمل آزادی حاصل کرنا ہے اور ہمارے تمام کام اسی اعلیٰ مقصد کے پابند ہیں اور اس اعلیٰ تر مقصد کی مصلحتوں اور ضرورتوں کا فیصلہ وہی لوگ بہتر طریقہ پر کر سکتے ہیں جو اسمبلیوں سے باہر تمام ہندوستان کو آزاد کرانے کی تجویزوں اور منصوبوں پر غور کر رہے ہیں اور جن کو پوری قوم کا اعتماد اور اعتبار حاصل ہے۔

فیڈریشن ۱۹۳۵ء کے دستور کے مرکزی حصہ یعنی وفاقی حصہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش اس سال بھی برابر جاری ہیں۔ ریاستوں کے حکمرانوں سے حکومت ہند مشورے کرتی رہی۔ گاندھی جی کی لارڈ لوتھین، ویسرائے اور میور ہیڈ وغیرہ سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ویسرائے کئی مہینہ تک انگلستان میں بھی رہے۔ کانگریس بھی اس طرف سے غافل نہیں رہی۔ تجویزیں اور منصوبے بناتی رہی۔ بیانات اور قرار دادیں شائع کرتی رہی۔ بھولا بھائی اور جواہر لال صورت حال کا مطالعہ کرنے کے لئے انگلستان بھی گئے۔ مسٹر ستیہ مورتی نے بھی اپنی پرانی عادت کے مطابق اعتدال پسند لوگوں کے نقطہ نگاہ کی وضاحت کر دی۔ سوبھاش چندر بوس صدر کانگریس نے اعتدال پسندی کے خلاف احتجاج کے طور پر استعفیٰ دینے کی دھمکی دی۔ ریاستوں میں ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے لئے جو تحریکیں چل رہی تھیں ان کے ساتھ کانگریس نے اخلاقی ہمدردی کا اظہار کیا اور بالواسطہ امداد بھی کی جس سے بہت سی ریاستوں میں ان تحریکوں نے بڑی قوت اختیار کر لی۔ گولیاں چلیں جلائی گئیں۔ بڑے پیمانہ پر گرفتاریاں ہوئیں۔ تحریک کو دبانے کے لئے اور مختلف کارروائیاں اختیار کی گئیں۔ لیکن یہاں بھی کانگریس نے وہی رویہ اختیار کیا جو اس نے صوبوں میں زمینداروں اور مل کے مالکوں کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ یعنی وہ رعایا کو کچھ حقوق دلا کر حکمرانوں کو مطمئن کرنا چاہتی ہے کہ اگر وہ ذمہ دار حکومت قائم کرکے اپنی ریاستوں میں کانگریسی یا قومی خیال کی وزارت کے قائم ہونے میں رکاوٹ نہ ڈالیں گے تو ان کے حکمرانی کے حق کا کانگریس تحفظ کریگی۔ ویسرائے نے اپنی کلکتہ کی تقریر میں فیڈریشن کو بلا کسی ترمیم کے جلد نافذ کرنے کی طرف اشارہ کیا جس کے جواب میں کانگریس کی طرف سے تری پورہ کانگریس کے بعد سول نافرمانی شروع کرنے کی دھمکی دی گئی ہے۔

کانگریس اور مسلم لیگ کانگریس اور لیگ کے تعلقات اس پورے زمانہ میں نہایت ناخوشگوار رہے۔ ابتدا میں الزامی شکایتوں اور گفتگوئے مصالحت کا وہی غیر نتیجہ خیز سلسلہ جاری رہا جو اس سے پہلے کے دو سالوں میں جاری رہ چکا تھا۔ پھر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر سے جناح نہرو خط کتابت کو کسی شخص نے اڑا کر شائع کر دیا۔ اس کا کچھ دنوں تک چرچا رہا۔ پھر دوبارہ گفتگوئے مصالحت شروع ہوئی جس میں مہاتما گاندھی اور سوبھاش چندر بوس نے مسٹر جناح سے گفتگو کی۔ مسلم لیگ کی طرف سے کانگریس کی زیادتیوں، بدعنوانیوں اور بدنیتوں کے خلاف احتجاج ہوتے رہے۔ پھر بھی لوگوں کو یہ امید رہی کہ ممکن ہے لیگ اور کانگریس کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو جائے لیکن سال کے اخیر میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنی ایک قرارداد کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لئے اس سلسلہ کو ختم کر دیا۔ اور اب اس نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ لیگ کی معرفت نہیں بلکہ براہ راست مسلم عوام سے رابطہ پیدا کرے گی اور اس کے لئے زیادہ منظم طور پر کوشش کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

لیگ کی مقبولیت اس زمانہ میں مسلم عوام میں بڑھتی رہی۔ جہاں کہیں لیگ کے جلسے ہوئے یا جلوس نکالے گئے بہت بڑی تعداد میں لوگ ان میں شریک ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود سندھ میں لیگ کی وزارت قائم کرنے میں مسٹر جناح کو ناکامی ہوئی۔ اسی طرح آسام میں سر سعد اللہ کی لیگی وزارت جسے در اصل یورپین اور مسلمانوں کی اتحادی وزارت کہنا چاہیئے (کچھ مسلمانوں کے کانگریسی پارٹی میں مل جانے کی وجہ سے ختم ہو گئی۔ بنگال کی لیگی اتحادی وزارت کے بارے میں بھی جو یورپینوں کے اتحاد کی وجہ سے قائم ہے کئی دفعہ ٹوٹنے کی افواہیں مشہور کی گئیں لیکن ابھی تک تو وہ سخت جان ثابت ہوئی ہے اگرچہ ایک دفعہ ٹوٹ کر دوبارہ بن چکی ہے اور اس کے کچھ مسلمان ممبر کانگریس کی پارٹی سے جا ملے ہیں۔ اسمبلیوں کے مسلمان ممبروں کا سندھ، آسام اور بنگال میں اس طرح مسلم لیگ سے علیحدہ ہو جانا لیگ کی مضبوطی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اس سے اس کے نظام کی اندرونی کمزوری کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ لیگ (جو اپنے آپ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کہتی ہے) کانگریس کے خلاف ہے پھر بھی مسلمان، کانگریس کے ساتھ معاملہ اور ساز باز کرتے رہے خصوصًا سندھ جیسے صوبہ میں جہاں مسلمان ۷۱ فی صدی کے قریب ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے اندر مسلم لیگ کے لئے بہت بڑی دعوت فکر و عمل موجود ہے۔

صنعتوں کے لئے تنظیمی کمیٹی | اکثر وہ چیزیں جو قریب ہونے کی وجہ سے دوسری چیزوں کے مقابلہ میں بہت بڑی نظر آتی ہیں جب دور ہٹ جاتی ہیں تو زیادہ بڑی نہیں رہتیں۔ یہی حال واقعات کا بھی ہے۔ ہندو مسلم اختلافات کے واقعات جن سے آج کل اخباروں کے صفحے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں یا کسانوں اور زمینداروں مل کے مالکوں اور مزدوروں اور کابینہ کے وزیروں اور اسمبلی کے ممبروں کے وہ جھگڑے جنھیں بہت نمایاں جگہ دی جاتی ہے ہو سکتا ہے کہ بجائے خود آئندہ کے مورخ کو دریا کے سطح کی محض ہلکی لہریں نظر آئیں جو ہوا کے جھونکے کے ساتھ پیدا ہوتی اور مٹتی رہتی ہیں اور گہری اور تختہ الٹ دینے والی موجیں وہ ثابت ہوں جو اس وقت نگاہ سے چھپی ہوئی اندر ہی اندر اپنا کام کر رہی ہیں ہمارا خیال یہ ہے کہ گذشتہ سال کے واقعات میں صنعتی تنظیمی کمیٹی کے تقرر کو بھی یہی حیثیت حاصل ہے۔ اس کمیٹی کی کوششوں کے زیر اثر ہندوستان کی زندگی میں جو تبدیلیاں واقع ہوں گی ان کا اثر ان تبدیلیوں سے کئی گنا زیادہ بڑا ہوگا جو کسانوں کے لئے قوانین بنا کر اس وقت کی جا رہی ہیں۔ ہندوستان کے حقیقی مسئلہ کا تعلق تقسیم دولت سے اتنا نہیں ہے جتنا پیدائش دولت سے ہے۔ کسانوں کے لئے جو قوانین بنائے گئے ہیں ان سے زمینداروں کا ممکن ہے بہت کچھ نقصان ہو جائے لیکن ان سے کسانوں کے پلّہ کچھ زیادہ نہیں پڑے گا۔

گذشتہ اکتوبر میں دہلی میں جب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جو اجلاس ہوا تھا اس کے ختم ہو جانے کے بعد مسٹر گیری وزیر صنعت مدراس کی دعوت پر تمام کانگریسی صوبوں کے صنعتی وزراء کی ایک کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔ اس کانفرنس کے سامنے سوال یہ رکھا گیا تھا کہ آیا مختلف صوبوں میں بڑے پیمانہ کی نئی صنعتوں مثلاً موٹر سازی کی صنعت وغیرہ کو حکومتوں کی مربیانہ سرپرستی میں فوراً شروع کرا دیا جائے یا صوبوں کے باہمی مقابلہ اور ملک کے سرمایہ کے مسرفانہ استعمال کا سدّ باب کرنے کے لئے ایک مناسب منصوبہ پہلے سے بنا لیا جائے تبادلہ خیال کے بعد معلوم ہوا کہ معاملات اتنے سادہ اور سہل نہیں ہیں کہ ان کا فیصلہ ایک دو جلسوں کی عام گفتگو سے ہو جائے اس کے لئے ایک باقاعدہ کمیٹی بنانے کی ضرورت ہے جس میں فنی اور مالی ماہروں کا شامل کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ ایک کمیٹی بنا دی گئی۔ اور اس کمیٹی کا پہلا جلسہ گذشتہ دسمبر میں جواہر لال جی کی صدارت میں بمبئی میں ہوا۔ اور اب اس کی طرف سے ایک ہمہ گیر سوال نامہ شایع کیا گیا ہے۔

صدمات | گذشتہ سال چار عزیز ہستیوں کی موت کے صدمات کو ہمیں برداشت کرنا پڑا یعنی ڈاکٹر اقبال مرحوم مختاری

مصطفیٰ کمال پاشا مرحوم، مولانا شوکت علی مرحوم اور بیگم انصاری مرحومہ۔

ڈاکٹر اقبال | ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ اور شاعری کا دنیائے اسلام اور انسانیت پر جو بیش بہا احسان ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ اسے کبھی بھی بھلایا جا سکے۔ نئی نسلیں آتی رہیں گی اور اس کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتی رہیں گی اور اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کرتی رہیں گی۔ ڈاکٹر اقبال کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ فوت ہو گئے غلطی ہے۔ وہ مرے نہیں بلکہ دائمی زندگی انھوں نے حاصل کر لی۔ ہم سب کے دل پہلے کی طرح اب بھی ان کے کلام کی لطافتوں اور بلندیوں سے معمور ہیں اور ہم میں سے ہر شخص حسب استعداد و حیثیت ان سے لطف اور فیض حاصل کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔

غازی کمال پاشا | غازی کمال پاشا ہرچند ہندوستانی نہیں تھے اور ہندوستان کے واقعات میں ان کی وفات کا تذکرہ بعض لوگوں کو شاید عجیب معلوم ہوگا لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے خلافت کی تحریک کے زمانہ میں ترکی کی مملکت صوبہ مدراس سے بھی زیادہ قریب رہ چکی ہے اور ترکی کی سیاست ہندوستان کی سیاست سے کچھ اس طرح گھل مل گئی تھی کہ ترکی کے ہیرو مصطفیٰ کمال کو ہندوستان کا ہیرو کہنا غلط نہیں ہے۔ چنانچہ جس طرح ہندوستان کے طول و عرض میں غازی مصطفیٰ کمال کے انتقال کا ماتم کیا گیا ہے اس سے اس بات کا پورا ثبوت بھی ملتا ہے ترکی کی مملکت کو زوال اور تباہی سے نکال کر ترقی اور استقلال کی راہ پر لگانے میں مصطفیٰ کمال کا جو حصہ ہے وہ اتنا مشہور ہے کہ اس کے لئے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مملکت ترکی اسلامی دنیا اور انسانیت اپنے اس محسن کی یاد کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

مولانا شوکت علی | مولانا شوکت علی کی موت ایک نہایت قریب ترین عزیز کی موت ہے مسلم عوام کے دل جس طرح علی برادران کی طرف کھنچتے تھے ویسے کسی دوسرے رہنما کے لئے کبھی نہیں کھنچے۔ علی برادران کی پرانی ہر دلعزیزی خلافت تحریک کے بعد بہت کچھ ختم ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود آج بھی مسلم لیگ کے لئے مولانا شوکت علی ایک نہایت زبردست ستون تھے اور کانگریسی امیدواروں کے خلاف مسلم لیگ کو جو کامیابیاں ضمنی انتخاب میں ہوئی ہیں ان کا سہرا بہت بڑی حد تک مولانا شوکت علی مرحوم کے سر ہے۔ مولانا شوکت علی نے اپنی پوری زندگی ایک وسیع القلب انسان کی حیثیت سے گذاری۔ انھوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ کرکٹ کے بہترین کھلاڑیوں میں سے تھے۔ اولڈ بائے کی حیثیت سے علی گڑھ سے ان کا تعلق برابر قائم رہا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے چندہ اکٹھا کیا۔ ترکی پر جب

جنگ بلقان اور طرابلس کے سلسلہ میں مصیبت نازل ہوئی تو بے چین ہو گئے اپنی اعلیٰ سرکاری ملازمت سے استعفٰی دے دیا۔ اس ہمدردی کی وجہ سے چھندواڑہ میں نظر بند کر دیے گئے۔ جنگ عظیم کی شکست کے بعد جب ترکی کے حصہ بخرے کئے گئے اور مقامات مقدسہ پر غیر مسلموں کا اثر بڑھنا شروع ہوا تو ان کی طبیعت اور بھی زیادہ متاثر ہوئی۔ خلافت تحریک کو شروع کیا اور سب بڑے پیمانہ پر چلایا وہ ان ہی جیسے عظیم الجثہ اور عظیم المرتبت شخص کا کام تھا۔ اس کے بعد بھی اسلامی ممالک کی سیاسیات اور ان کی فلاح وبہبود سے ان کی دلچسپی آخری دم تک قائم رہی۔ مرحوم صاف دل اور صاف گو آدمی تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے لیکن زمانہ ایسا ناساز گار رہا کہ ان کی یہ دلی تمنا ان کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی۔

بیگم انصاری | بیگم انصاری مرحومہ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی رفیقہ حیات ہونے کی وجہ سے قوم کی عزت ومحبت کا مسکن تھیں مرحومہ کے دل میں بھی قوم، ملت اسلامی اور انسانیت کی محبت اتنی ہی زیادہ تھی جتنی ڈاکٹر انصاری مرحوم میں تھی۔ مرحومہ نے ڈاکٹر انصاری کی غیر طبی کتابوں کا قیمتی ذخیرہ جامعہ ملیہ کو عطا فرمایا تھا اور چین کو جو طبی مشن روانہ کیا گیا ہے اسے ڈاکٹر انصاری کے آپریشن کے اوزار عنایت فرمائے تھے۔

خدا ان مرحوموں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

ہندوستان میں اسلامی تہذیب

(از پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن))

تہذیب کا لفظ ہمارے زمانے کی عجائبات میں سے ہے۔ ہر تعلیم یافتہ مہذب ہونے کا یقین رکھتا ہے، ہر قوم اپنا فرض سمجھتی ہے کہ اپنی تہذیب کی قدر کرے اور دنیا سے اس کی قدر کرائے۔ لیکن تہذیب کے معنی پوچھئے تو ہر شخص اس کی ایسی تشریح کرتا ہے کہ جس سے اس کا اپنا مذاق، اپنے خیالات، اپنا رہن سہن تہذیب کا لب لباب معلوم ہوتا ہے، اور قومیں اپنی تہذیب کے گن گاتی ہیں تو اس سے ان کا مطلب ہوتا ہے کہ ان کی طاقت بہت بڑھ گئی ہے، اور سیاست اور جنگ میں جتنی ان کو کامیابی ہوتی ہے اتنی ہی وہ سمجھتی ہیں کہ ان کی تہذیب پھیلی۔ خالص علمی نقطۂ نظر سے غور کیجئے تو تہذیب کا مفہوم یا تو اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ اس کی صحیح تعریف ممکن نہیں، اور یا اتنا تنگ کہ اس کے وجود ہی کا یقین نہیں رہتا۔

اسلامی تہذیب کی تعریف کرنا اور بھی مشکل ہے، کہ یہ کسی قوم اور کسی زمانے کی تہذیب نہیں، اس کا پھیلاؤ ایسا رہا ہے اور اسے اتنی مختلف مزاج اور معاشرت رکھنے والی جماعتوں نے قبول کیا ہے کہ اس کی خصوصیات بیان کرنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا یہ بتانا کہ دنیا کی سطح کیسی ہے۔ اس کی ایک مجموعی شکل ہے بھی اور نہیں بھی ہے، اس کی جڑیں ہمیشہ حقیقت کی زمین کو مضبوط پکڑے رہی ہیں تو اس کی چوٹی ہمیشہ عالم خیال میں رہی ہے، اس نے پلٹے کھائے ہیں، زور باندھا ہے، وہ ابھری بھی ہے اور گری بھی ہے، اس نے کبھی مذہب کا دامن پکڑا تو کبھی سیاست کا، کبھی دوسروں کے اثر کو جیسے جان کر مٹایا، کبھی اسے شراب کی طرح پی گئی، کبھی انا ولا غیری کا دم مارا، کبھی شکر کی طرح گھل گئی، فضا کی ایک کیفیت بن کر نظر سے اوجھل ہو گئی، دن کا اجالا اور رات کا سکون بن کر زندگی میں گم ہو گئی۔ لیکن مسلمانوں کی تاریخ کا اتار چڑھاؤ ایسا رہا ہے کہ ہر زمانے کے لوگ مذہب اور تہذیب کے مفہوم پر غور کرتے رہے ہیں،

اس وقت اگر ہم بیٹھ کر سوچیں تو ہم بھی اسلامی تہذیب کا ایک خاکہ تیار کر سکتے ہیں، اور ممکن ہے بناتے بناتے ہم ایسا کچھ بنالیں کہ جو چاہے زبان سے بیان نہ ہوسکے، دل میں گھر ضرور کر لیگا۔

ایک بات کا خیال ہم کو خاص طور پر رکھنا ہوگا، اور وہ یہ کہ اسلامی تہذیب نے کبھی اپنے اور غیر کے درمیان کوئی دیوار کھڑی نہیں کی، مسلمانوں کو کبھی نرالے اور انوکھے بننے کا شوق نہ ہوا، اور ہماری تاریخ میں کوئی ایسا دور نہ ملے گا جب مسلمانوں کی زندگی میں ایسی عجیب یا غیر معمولی خصوصیتیں تھیں کہ جن پر فوراً نظر پڑتی، اور جو آسانی سے بیان کر دی جائیں۔ اس کے برعکس ہماری تہذیب کا میلان ہمیشہ پھیلنے، دوسری تہذیبوں سے اثر لینے اور ان پر اپنا اثر ڈالنے کی طرف تھا، اور اس میلان کو ہم نے اس قدر صحیح، اچھا اور اپنے وجود کے لئے ایسا لازمی سمجھا کہ ہم نے کبھی اس کا حساب لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ ہم نے کتنا دیا اور کتنا لیا۔ ہم اس کا حساب لگانے کی کوشش بھی کرتے تو شاید کامیاب نہ ہوتے، اس لئے کہ ہم نے اپنی تہذیب کی کہیں قلم بھی نہ لگائی بلکہ ایسی طرح ملے جیسے کہ شکر اور پانی۔ یورپ والے اب صدیوں کی حجت کے بعد ماننے لگے ہیں کہ مسلمانوں نے دنیا کے علم کو بہت بڑھایا اور پھیلایا۔ لیکن یہ دعویٰ اب بھی شاید ہی کوئی تسلیم کرے کہ بول چال کی زبانوں کو ادبی زبانیں بنانا مسلمانوں کی ایک خاص خدمت تھی۔ ہماری تہذیب کا اثر روحانی، ذہنی اور جسمانی تندرستی کی طرح تھا جو کہ خود محسوس نہیں ہوتی جس کی کیفیت بیان کیجئے تو خود ستائی معلوم ہوتی ہے، اور جس کے موجود نہ ہونے یا ضائع ہو جانے کا غم بھی اکثر نہیں کیا جاتا، اس لئے کہ خود فریبی انسانیت کی گھٹی میں ملی ہوئی ہے۔

اسلامی تہذیب میں نمایاں ظاہری علامتیں خاص طور پر اس وجہ سے پیدا نہیں ہوسکیں کہ مذہب اسے ہمیشہ ہموار کرتا رہا، اسلام، بجائے اس کے کہ تہذیب کی خلعت پہن کر الگ عزت کے مقام پر بیٹھ جائے، خود تہذیب کے مقام کو بدلتا اور اس کی حیثیت کو بدگمانی کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس طرح وہ کبھی تہذیب کے ہم معنی، یعنی تہذیب میں گرفتار نہ ہوا، مسلمان کبھی اتنے مہذب نہ ہوسکے کہ اسلام سے غافل ہو جائیں، ان کا دین ان کی دنیا کو جھنجھوڑتا رہا، جیسے کوئی استاد نیند کے ماتے شاگرد کو۔

اس وقت بھی اگر آپ دیکھئے تو تہذیب ابھی انگریزی حکومت کا سہارا لیکر اور مغرب کی علمی ترقیوں کی قسمیں

کھا کر، مذہب کو نیچا دکھانے کی کوشش کر چکی ہے اور کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ ہم دوسری قوموں کی طرح مذہب کو چھوڑ کر تہذیب کو پکڑ نہیں سکتے، اس وجہ سے ہم دوسروں سے کم سمجھے جاتے ہیں اور ہماری ہنسی بھی اڑائی جاتی ہے۔ لیکن تہذیب کے ناعاقبت اندیش فدائیوں کی ضد میں ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم صرف مذہب کو جانتے ہیں تہذیب کو نہیں جانتے، اس لئے کہ پھر ہمیں ہر موجودہ تہذیب سے قطع تعلق کر کے بالکل صحیح قرآنی تعلیم کی بنیاد پر ایک نئی اور سب سے الگ زندگی کی طرح ڈالنا ہوگی۔ یہ ممکن تو بیشک ہے، اور کوئی تعجب نہیں کہ ہماری زندگی میں آگے چل کر ایسا کوئی انقلاب ہو جو موجودہ تہذیب کی عمارت کو ڈھا کر کوئی نئی عمارت اس کی جگہ پر کھڑی کرے۔ لیکن ایسا انقلاب پیدا کرنا ہمارے بس کی بات نہیں، اس لئے ہمارے واسطے یہی زیادہ مناسب ہے کہ ہم مذہب اور تہذیب کو الگ سمجھیں، مذہب کو تہذیب کی روح اور عمل کا معیار مانیں اور اس کی آرزو دل میں رکھیں کہ یہ دونوں مل کر ایک ہو جائیں۔ اس لئے اگر میں اسلامی تہذیب کی خصوصیات بیان کرتے وقت عقیدوں کا ذکر جتنا کہ آپ کے خیال میں ہونا چاہیئے نہ کروں تو اس سے آپ یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ میں عقیدے کی اہمیت کو نظرانداز کر رہا ہوں۔ یہاں بحث صرف تہذیب سے ہے، مذہب سے نہیں، اور جو عقیدے مشترک ہیں، یعنی تہذیب میں قریب قریب اسی شکل میں پائے جاتے ہیں جیسے کہ مذہب میں، انھیں میں نے تہذیب میں شامل سمجھا ہے۔

تہذیب کے مفہوم اور عالم اسلام کی وسعت اور رنگارنگی کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلامی تہذیب کی چھ سات خصوصیتیں سب سے پہلے میرے خیال میں آتی ہیں۔ سب سے بڑا مرتبہ انسانیت کے اس تصور کا ہے جو اس تہذیب کی جان ہے، وہ تصور کہ جس نے انسانیت کے امتیازات کو نسل، مذہب اور مقام کا پابند نہیں رکھا، جس نے مسلمان کو آزادی دیدی کہ جس ملک کو چاہے اپنا وطن بنائے، جو زبان چاہے بولے، اور ہر نسل اور مذہب کے آدمیوں کے لئے اس کی صورت نکالی کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر رہیں۔ مسلمانوں میں آپس کی عداوتیں تھیں، لیکن یہ یا تو سیاسی تھیں یا مذہبی، تہذیبی نہیں تھیں اور انھوں نے کسی کو انسانیت سے محروم نہیں کیا۔ ہماری تہذیب کی اس خصوصیت کی سب سے اچھی مثال وہ رویہ ہے جو ہم نے یہودیوں کے ساتھ اختیار کیا، جنھیں کسی نسل اور کسی مذہب کے لوگ

اپنے ساتھ رکھنا گوارا نہیں کرتے تھے اور جن سے اب تک ایسی نفرت برتی جاتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ وہ یہودی جو مسلمانوں کے سائے میں رہے طبیعت اور اخلاق کے لحاظ سے یورپ کے یہودیوں سے مختلف یا بہتر نہیں تھے، لیکن انھیں ہمارے دین نے اہل کتاب کی حیثیت دیکر سچی رواداری کا مستحق بنایا، اور ہماری تہذیب نے انکو خدمت اور ترقی میں شریک ہونے کا پورا موقع دیا۔ یہودی تو خیر سامی نسل کے اور ایک خدا کو ماننے والے تھے، اسلامی تہذیب نے بت پرستوں کو بھی انسانیت کے کسی حق سے محروم نہیں کیا اور ان کی گمراہی کو انھیں حقیر یا ذلیل سمجھنے کا بہانہ نہیں بنایا۔

انسانیت کے بعد اسلامی تہذیب کی دوسری بڑی خصوصیت عقلیت ہے، یعنی وہ جگہ جو اس کے معیار زندگی میں عقل سلیم کو دی گئی۔ جس طرح ہم ہر آدمی کی صورت رکھنے والے کو آدمی مانتے ہیں ویسے ہی ہمارا ہمیشہ یہ عقیدہ رہا ہے کہ انسان کو اپنی طبیعت اور اپنے عمل میں توازن قائم رکھنا چاہیے، ایسا توازن کہ جو ایمان کو قائم اور مضبوط رکھے مگر انسان کو ضعیف الاعتقاد اور اوہام پرست نہ بننے دے، جو شوق اور مہارت کی سچی اور پوری قدر کرے مگر ضبط بے اعتدالی اور انتہا پسندی کو فوراً پہچان لے، جو انسانی زندگی کو عقیدے اور عقل کا پابند رکھے مگر رسم اور عادت کا غلام نہ ہو جانے دے۔ تہذیب کی اس خصوصیت نے مسلمانوں کو جہاں تک کہ اخلاقاً صحیح ہے آزاد کر دیا، ان کی آمد و رفت اور میل جول پر کوئی قید نہیں لگائی، جب کبھی وہ رسم رواج میں گرفتار اور عادت سے مجبور ہونے لگے تو ان کے سائنرہائی کی ایک تدبیر پیش کر دی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کی طبیعت اور ذہن میں ایک لوچ پیدا کر دی کہ جس کی بدولت وہ اپنی زندگی کو ماحول سے بہت جلد ہم آہنگ کر سکتے تھے۔ اسی عقلیت نے مسلمانوں کے دل میں تجربے اور احساسات کی اتنی وسعت رکھی کہ وہ منطق کے پھیر میں نہیں آتے، اور اگر کبھی آئے بھی تو بہت جلد اس سے نکل بھی گئے۔ اسی نے دنیداری کو ریاضت سے روکا، دنیاداری کو بے لگامی سے، اور نعمت کی قدر اور عذاب کے خوف کے دو رنگ ملا کر نہ جانے کیسی کیسی دلکش تصویریں بنائیں۔

مسلمانوں میں عقلیت پیدا نہ ہوتی اور قائم نہ رہتی اگر اسلام نے بہت بیّن طور پر میانہ روی اور اعتدال کی تعلیم نہ دی ہوتی۔ لیکن اسلامی تہذیب کی تاریخ دیکھئے تو علم اور عقیدے کے میدان میں عقلیت ان

لوگوں نے نہیں برتی جو کہ دینی علوم کے حامل تھے بلکہ ان لوگوں نے جنھیں خالص علمی شوق تھا یا وہ جن پر سیاسی ذمہ داریاں تھیں۔ اس کے برخلاف ہماری تہذیب کی تیسری خصوصیت، مساوات، ہرگز قائم نہ رہتی اگر وہ ہمارے دین میں شامل نہ ہوتی، اور اسے برتے بغیر مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا۔ مساوات کا عقیدہ ایسا ہے کہ جس سے سیاست اور دولت دونوں ہمیشہ بیزار رہی ہیں اور انھوں نے اسے مٹانے کی ہر طرح کوشش کی مگر اتنی کامیاب نہ ہوئیں کہ مساوات کے خلاف کوئی نظیر یا سند قائم ہو جائے۔ ابھی مساوات کا بھروسا صرف مذہب پر ہے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ مذہب کا حکم بہت صاف اور واضح ہے، اور اسی کے ساتھ انسانیت کی قدر بھی اس طرح ہماری تہذیب میں شامل ہو گئی ہے کہ سیاست اور دولت چاہے جیسا نشہ پلا دیں، جذبۂ دینی کا ایک گھونٹ اس کا توڑ کر دیتا ہے، یا انسانیت کی قدر نشے کو آہستہ آہستہ اتار دیتی ہے۔

اسلام نے آدمیت کو معیار مانا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ملت اور جماعت کے احساس کو بھی لازمی ٹھیرایا ہے۔ بظاہر تو یہ ایک طرح کا تضاد ہے، لیکن اگر آپ یہ یاد رکھیے کہ انسانیت محض ایک تصور ہے اور حقیقت میں انسانی آبادی جماعتوں پر مشتمل ہے، اور ابھی تک زبان، خیالات، معاشرت اور ماحول میں ایسی یکسانی پیدا کرنے کی کوئی صورت نہیں نکلی ہے کہ جو دنیا کی تمام قومی حد بندیوں کو توڑ کر انسانوں کو ایک جماعت بنا دے، تو یہ سمجھ جانا کچھ دشوار نہیں کہ مسلمانوں کو ایک ملت بنے رہنے کی تاکید کیوں کی گئی۔ اسلامی تہذیب کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے ملت کے احساس کو خاص تقویت پہنچائی، اور سیاست تو مساوات کی طرح ملت کے تصور کو بھی ہمیشہ اپنی مصلحت کے خلاف سمجھتی رہی۔ لیکن سیاست کا کچھ بس نہ چلا، اور تہذیب کو اس پر مطمئن ہونا پڑا کہ ملت اور انسانیت کے درمیان صلح قائم رکھے، جو کہ بذات خود ایک بڑی مشکل خدمت تھی اور بہت خوبی سے انجام دی گئی۔

اسلامی تہذیب کی جو خصوصیتیں میں نے اب تک بیان کی ہیں ان میں سے عقلیت مسلمانوں میں کمیاب ہو گئی ہے، اس لئے کہ مسلمان کئی سو برس سے اس کو مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں، اور اگر وہ کسی حد تک موجود ہے تو صرف اس لئے کہ اس کے دشمن اسے اسلام سے خارج نہیں کر سکے ہیں۔ اسلامی

تہذیب کی دو اور خصوصیتیں ہیں جو اس وقت مسلمانوں میں نہیں ملتیں، بلکہ یورپ میں اور ان کا ذکر میں صرف اس سبب سے کررہا ہوں کہ ایک زمانے میں اسلامی تہذیب کو رونق انھیں سے تھی اور ہم اب بھی چاہیں تو یورپ کی تقلید کئے بغیر اپنی تہذیب کے ان بجھے ہوئے چراغوں کو جلا کر اپنی محفل کو روشن کر سکتے ہیں۔ اسلامی تہذیب کی ان خصوصیتوں میں سے پہلی یہ تھی کہ علم حاصل کرنا انسانیت کا فرض ٹھہرایا گیا، اور اس کا یقین دلایا گیا کہ علم کی بدولت ہر طرح کی ترقی ممکن ہے، انسان ترقی کرتا رہا ہے اور آئندہ ترقی کرتا رہے گا۔ یہ دعویٰ اس زمانے میں بڑا انقلاب انگیز تھا جب ساری دنیا میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسان کامل علم اور کامل معصومیت کی حالت سے آہستہ آہستہ گرتا رہا ہے اور عیبوں کی تاریکی میں گھرتا رہا ہے۔ اب یورپی قوموں کے علمی کرشموں کو دیکھتے ہوئے اس دعوی میں کوئی وزن نہیں رہ گیا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی جماعت میں اب بھی وہ انقلاب انگیز ہو سکتا ہے، اس لئے کہ مسلمانوں کے نزدیک اب سارا علم قرآن میں بند ہے اور قرآن کو وہ غلاف میں بند رکھتے ہیں۔

علم کے لئے جستجو، شک، تجربہ لازمی ہے، اور جس زمانے میں علم کی مشعل اسلامی تہذیب کے ہاتھ میں تھی، اس نے علم کو ہر طرح کی آزادی دی، اور علم کے شیدائیوں نے ایسی رواداری برتی اور ایسے صدمے بھی اٹھائے کہ جس کی مثال صرف یورپ کے دور جدید کی ابتدا میں ملتی ہے۔ یورپ میں اب علم اصولاً بالکل آزاد ہے، لیکن وہ سیاسی اور تہذیبی تعصبات سے خالی نہیں، اور اس نے دین سے ایسی سرد مہری اور عداوت برتی ہے کہ جس سے اخلاق کو بہت نقصان پہنچا ہے اور خود علم کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ مسلمانوں میں دینی علوم کے نمائندے خالص علم کے نمائندوں سے جھگڑتے اور ان سے اور کسی طرح بس نہ چلا تو مارپیٹ کر کے اپنی برتری تسلیم کرائی۔ یہ سمجھئے انسانی کمزوری تھی، ورنہ جس علوم کی پرورش اسلامی تہذیب کی گود میں ہوئی وہ خودسر اور انتشار انگیز نہ تھے، انھوں نے نہ عقیدے کی جڑ کاٹی نہ حق بات کہنے سے جھجکے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دینی اور دنیاوی علوم کی ہم آہنگی قائم رہی، اور انسان کی صحیح نشو و نما اور ترقی کے لئے دونوں کی ضرورت تسلیم کی جاتی رہی۔

آخر میں آپ اجازت دیں تو میں اسلامی تہذیب کی ایک اور خصوصیت کا ذکر کر دوں جس کا یقین

کرنا اس زمانے کی فضا کو دیکھتے ہوئے بہت مشکل ہے۔ وہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے بہت سی غیر تہذیبوں کی پرورش کی، صرف اس سیاسی مصلحت کے اشارے پر نہیں جو دنیا کو کاٹ کر مسلم اور غیر مسلم کے دو حصوں میں تقسیم کرنا اپنے لئے مفید سمجھتی تھی، بلکہ تہذیبی باغبانی کے ایسے شوق میں کہ جس نے نفع نقصان کا حساب رکھنا اپنی توہین سمجھا، اور صرف اپنے چمن کی رنگارنگی کو دیکھتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض محقق جنھیں اسلامی تہذیب کی خوبیاں تسلیم کرنا منظور نہیں، یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کے فروغ کا زمانہ مسلمانوں کے سوا اور ہر تہذیب کے فروغ کا زمانہ تھا، اور اسلامی تہذیب مختلف قومی اور مقامی تہذیبوں کا ایک مجموعی نام ہے۔

اسلامی تہذیب ان تمام خصوصیات کو جو میں نے بیان کی ہیں ساتھ لیکر ہندستان آئی۔ وہ ہاتھ میں تلوار لیکر نہیں آئی، جیسا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے، بلکہ تجارت کا مال یا سیاحت کا شوق یا خدمت کے حوصلے لیکر آئی۔ اس کا پہلا مرکز جنوبی ہندستان کی بندرگاہیں تھیں، جہاں سے وہ آہستہ آہستہ ملک کے اندر پھیلی۔ شمالی ہندستان میں وہ شمال مغرب کی تجارتی شاہ راہ سے آئی، مگر پھر امیر محمود غزنوی کے حملوں کی گرد و غبار میں وہ اسی طرح غائب ہو گئی جیسے کہ خوشبو کسی آندھی میں۔ لیکن امیر محمود کے ساتھ استاد البیرونی کا بھی ہندستان میں آنا ہوا، اور غالباً تہذیب کے کسی سچے قدرداں کو یہ ماننے میں تامل نہ ہوگا کہ ان کی کتاب الہند تہذیب کی ایسی خدمت ہے کہ جو سلطان محمود کی پیدا کی ہوئی عداوتوں کی تلافی کر سکتی ہے۔ بہرحال، عداوتیں اور لڑائیاں تاریخ ہی میں زندہ رہیں، نسل انسانی انھیں بہت جلد بھول گئی، اور ہندستان کا قریب کے ملکوں سے تعلق بڑھتا ہی رہا۔ بارہویں صدی کے آخر میں، جب محمد غوری کی فتوحات نے شمالی ہندستان میں مسلمانوں کی حکومت کے لئے میدان صاف کر دیا تو شیخ معین الدین چشتی بھی ہندستان تشریف لائے اور انھوں نے خدمت اور تبلیغ کا کام اسی شہر سے شروع کیا جو کہ سب سے ممتاز راجپوت سلطنت کا مرکز تھا، اور جس پر قبضہ کرنے کے لئے ہندو مسلمان دونوں اپنا خون بہا چکے تھے۔

مسلمان جب ہندستان میں آئے تو ہندستانیوں میں سیاسی حس بہت کم تھا، مگر مذہبی حس بہت قوی تھا، اور اسی وجہ سے ہم اسلام کا ردعمل سب سے پہلے ہندستان کی مذہبی زندگی میں دیکھتے ہیں۔ آٹھویں اور نویں صدی میں شری شنکر آچاریہ کی اصلاحی تحریک نے مقدس کتابوں کو وہی رتبہ دیا جو کہ ہم قرآن کو دیتے ہیں، یعنی

ان کو الہامی مانا، اوران کی نسبت یہ دعویٰ کیا کہ وہ حرف بحرف صحیح ہیں اوران میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ اسی تحریک نے بدھ متیوں، جینیوں جوگیوں اور برہمنوں کی تعلیمات کو چھ درشن، یعنی حقیقت سے روشناس ہونے کے چھ مختلف مگر برابر کی قدر رکھنے والے طریقے ٹھہراکر عقائد کے اس انتشار کو دور کیا جواب تک پایا جاتا تھا، اور دینی تعلیم میں جو یک جہتی اس طرح سے پیدا کی گئی تھی اسے بدھ متیوں سے جاترا، یعنی زیارت کا رواج اور جینیوں سے اہمسا کا عقیدہ لیکر اور مضبوط کیا۔ امیر محمود نے جب ہندستان پر حملے کئے تو میدان جنگ میں ان کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ تھا، لیکن اسلام اور اسلامی تہذیب کی طاقت آزمانے کے لئے ہندو دھرم اور ہندو جاتی، یعنی ملت موجود تھی، اور بعد کو جو تحریکیں اٹھیں وہ انھیں کی کشمکش کا نتیجہ تھیں۔

میں یہاں پر ان اثرات پر تفصیل سے بحث نہیں کر سکتا جو اسلامی تہذیب نے ہندستانیوں کی ذہنیت پر ڈالے، لیکن یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ انسانیت اور مساوات کے جو پختہ عقیدے وہ اپنے ساتھ لائی تھی انھوں نے ذات کے اس تصور کو جو یہاں ایک اٹل قانون بن گیا تھا فلسفے اور مذہب سے نکال باہر کیا، اگرچہ رواج کو بدل نہ سکی، اس نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان اتحاد عمل کی صورت پیدا کی، جسے دونوں کے مذہب نہیں تو مذہبی منطق گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بھگتی کے طریقوں کو، اپنشدوں کے فلسفے کو، ہندستان کی موسیقی اور فنون لطیفہ کو ایسا سراہا، صنعتوں کی اس طرح دل کھول کر سرپرستی کی اور ہندو معاشرت میں جو کچھ ضروری معلوم ہوا اس کو ایسی خوشی سے اختیار کیا کہ اسلامی تہذیب بہت جلد ہندستانی تہذیب بن گئی۔ ہندستان میں رواج کی اتنی قدر ہے کہ اسلامی تہذیب نے بہت کیا اگر معقولیت کے تصور کو قائم رکھا، اور زندگی اور معاشرت میں نمایاں طور پر نہیں تو کم از کم شاعری میں اسے ہر اور مسلک پر بھاری کر دیا۔ دنیاوی علوم کا نہ یہاں شوق پھیلا نہ انھیں کوئی ترقی دی جا سکی، لیکن تعلیم کا ایک نصاب اور شائستگی کا ایک ایسا معیار عام کر دیا گیا کہ جس نے تہذیب کو زوال سے بچایا اور ہر علم، فن اور ہنر کی قدر قائم رکھی۔

لیکن ہندستان کی اسلامی تہذیب کے ماننے والوں میں سے تمام ہندو اور بہت سے مسلمان اس کی شکایت کرتے رہے کہ اس تہذیب نے ہندستان میں گھر تو بنا لیا ہے مگر مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز مٹانے اور اسلام سے اپنا رشتہ توڑنے پر تیار نہیں، معمولاً پوری رواداری برتتی ہے مگر کبھی کبھی اسلام کو حقیقت کا

واحد مظہر کہہ کر ہر غیر فلسفے اور عقیدے سے منہ پھیر لیتی ہے۔ کبیر صاحب کے کلام میں یہ شکایت اکثر ملتی ہے، اور غالباً وہی اکیلے نہیں بلکہ اور جتنے غیر مسلم مصلح ہندستان میں پیدا ہوئے وہ سب اپنے آپ کو مسلمان کہتے اگر مسلمانوں نے انسانیت اور مساوات سے عقیدت رکھنے کے باوجود مومن اور مشرک کے فرق پر زور نہ دیا ہوتا اور اگر وہ گوشت کھانا چھوڑ دیتے۔ لیکن اسلام مومن اور مشرک کے فرق کو نظر انداز کرکے پھیلایا جاتا تو یقیناً اس کی کایا پلٹ ہو جاتی، وہ یہاں کے مذہبی فرقوں میں سے ایک فرقہ بن جاتا، علم، معقولیت اور فطرت کا سکھایا ہوا مذہب نہ رہتا بلکہ رسم رواج اور قدامت پرستی پر بھروسا کرتا، مسلمانوں کے سامنے کوئی معیار نہ رہتا اور ان کی اصلاح کی کوئی صورت نہ ہوتی۔ اس میں نقصان صرف مسلمانوں کا نہ ہوتا بلکہ ہندستان کا بھی ہوتا، اس لئے کہ انسانیت، عقلیت، مساوات ایسے تصور نہیں ہیں کہ ایک مرتبہ دل میں سما جائیں تو پھر وہاں سے نکلنے کا نام نہ لیں۔ تنگ نظری، جہالت، اوہام پرستی، بزرگوں کی پوجا، دولت کی پوجا، اصل میں تو یہ ہیں جو انسان کی طبیعت کو روگ کی طرح لگ جاتے ہیں یا گرد کی طرح دل کے آئینے پر جم جاتے ہیں اور بڑی مشکل سے دور ہوتے ہیں۔ ملت اسلامی کو غیر مسلموں سے الگ رکھنے، مومن اور مشرک کے فرق کو ضد کرکے قائم رکھنے اور شرعی قانون کو برابر حکومت کے اختیار اور رسم رواج کے اثر سے باہر اور بالاتر قرار دینے کے باوجود بھی آپ دیکھیے تو ہماری معاشرت اسلامی قانون سے بہت منحرف ہو گئی ہے، ہم نے عورتوں کے سارے حق مار لئے ہیں، برادری اور ذات کو دیکھ کر شادی بیاہ کرتے ہیں، نوکروں کو اپنے ساتھ کھلاتے نہیں، اپنا سا پہناتے نہیں، اپنے برتنوں میں پانی نہیں پینے دیتے۔ اخلاق کو اور جو نقصان ہوا ہے اس کا کوئی ذکر ہی نہیں۔

انگریزی حکومت قائم ہونے سے پہلے ہماری معاشرت ہندو معاشرت کے رنگ میں رنگ گئی تھی، لیکن قرآن کی تعلیم کا معیار موجود تھا۔ انگریزی حکومت اور اس سے بھی زیادہ انگریزی تعلیم نے ہم کو ایک ایسے پھیر میں ڈال دیا ہے کہ جس سے نکل جائیں تو سمجھیے جان بچی۔ آپ مانیں یا نہ مانیں، سچ تو یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کی دو بڑی خصوصیتیں، عقلیت اور علم کی پیاس ہمیں ورثے میں نہیں ملیں بلکہ یورپی قوموں کو، اور اسی ورثے کی بدولت انھوں نے اتنی ترقی کی ہے کہ اب ساری دنیا ان کی ہو گئی ہے۔ اب یورپی

تہذیب کے سب سے کارگر ہتھیار یہی ہیں، اور ہم اسلامی تہذیب کو بچا نہیں سکتے جب تک کہ ہم اپنے اندر یہ دونوں صفتیں پھر سے پیدا نہ کریں۔ ہمارے دیس کے بھائیوں نے، جنھوں نے اسلامی تہذیب کے بہت سے اثرات قبول نہیں کئے تھے اور جواب اس سے انکار کرتے ہیں کہ ان کا ہندستان کی مشترک تہذیب میں کوئی حصہ تھا، یورپی تہذیب کو اپنا کر بظاہر ہم سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ ان میں آزاد خیالی ہے جو موجودہ معیار کے لحاظ سے ہر مہذب آدمی میں ہونا چاہیے مگر مسلمانوں میں عام طور پر نہیں ہے، وہ ملّت اور ملّت کے قانون کو چھوڑ کر جمہور بن گئے ہیں اور جمہوری طریقے پر معاشرتی قانون بناتے ہیں اور بناتے رہنا چاہتے ہیں، ہم نہ اپنے دین کو چھوڑتے ہیں نہ اپنے شرعی قانون کو، نہ ملّت کے خیال کو اور نہ اسلامی تہذیب کی محبت کو۔ اگر ہم نے یہ مسلک خالی ضد میں اختیار کیا ہوتا تو معاملہ بہت آسان ہوتا۔ اور ہمارے لئے اس کی کوشش کرنا کہ تعلیم جلد پھیلے اور جہالت دور ہو کافی ہوتا۔ مشکل تو یہ ہے کہ دنیا میں اور ملک میں ہماری حیثیت کچھ بھی ہو ہماری کوئی سنے یا نہ سنے، بات ہم ٹھیک کہتے ہیں، کہ تہذیب اور معاشرت کو مذہب کا سہارا چاہیے، علم کو راہ پر رکھنے کے لئے عقیدہ چاہیے، سیاست کو قابو میں رکھنے کے لئے ملت کا احساس، انسانیت کا معیار اور اخلاق اور مذہب کی فرماں روائی چاہیے۔ ہم عقلیت کے نام سے عقل کی پرستش نہیں کرنا چاہتے، بندے سے رشتہ جوڑنے کی خاطر خدا سے رشتہ توڑنا نہیں چاہتے، آدمی بننا چاہتے ہیں مگر ایسی تہذیب نہیں چاہتے کہ جس کا دیوتا نفس پرستی ہو۔ ہماری مشکل وہی ہے کہ جو ہمیشہ سے آدمیت کی مشکل رہی ہے۔

اسلامی تہذیب کا معیار میانہ روی اور اعتدال ہے، اس لئے آپ کو تعجب نہ ہونا چاہیے اگر میں عرض کروں کہ اس وقت ہمارا فرض یہ ہے کہ اپنے دل سے ضد اور غصہ بالکل نکال دیں اور ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں کہ ہندستان میں اسلامی تہذیب کو سلامت رکھنے کے لئے ہم کو کیا ہونا چاہیے اور کیا کرنا چاہیے۔

ظاہر ہے اسلامی تہذیب کی بقا کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ہمیں اس کے صحیح اور اچھے ہونے کا پورا یقین ہو، ہم دل سے مانتے ہوں کہ انسانیت قوم اور نسل پرستی پر غالب آئے گی، معقولیت اور اعتدال پسندی کا مسلک ایک نہ ایک دن ہمیں اوہام پرستی اور جہالت اور انتہاپسندی کی بھول بھلیوں سے

باہر پہنچا دے گا، علم ایک طرف انسانی زندگی کو آسان کرتا اور دوسری طرف نجات کی راہ کو صاف دکھاتا رہیگا۔ لیکن یہ تو اسلامی تہذیب کا نصب العین ہے' اسے بغیر سمجھے مان لینے اور زبانی عقیدت سے ہم حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کن اجزا سے بنا ہے' اور پھر انھیں کو اپنے عمل میں یکجا کر کے حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہئے۔ اس لئے آپ اجازت دیں تو میں اس وقت کے چند عام رجحانات پر بحث کر کے اپنا مطلب صاف کر دوں۔

میں اسے بالکل صحیح اور بہت اچھا سمجھتا ہوں کہ مسلمان اس وقت اس پر اصرار کر رہے ہیں کہ وہ ایک ملت اور ایک تہذیبی جماعت ہیں، کیونکہ یہ دینی اور تہذیبی آئین کو محفوظ رکھنے کے لئے لازمی ہے لیکن مجھے کسی طرف اسلامی ملت اور تہذیب کے تصور کو غیر مسلموں کیا خود مسلمانوں کے لئے مفید اور ان کی ترقی کا ذریعہ بنانے کی خواہش اور کوشش نظر نہیں آتی۔ ملت کا احساس سمجھئے چند دنوں کا مہمان ہے اگر وہ ملت کے افراد میں سچی محبت، خدمت کا شوق اور خدمت کی استعداد پیدا نہ کرے بلکہ افراد کی خود غرضیوں کے لئے ایک آڑ یا ان کے نکمے پن کے لئے بہانہ بنا رہے۔ انسانیت کے جس معیار کو ہم مانتے ہیں وہ تو یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنوں کی ہر ضرورت پوری کر کے دوسروں پر احسان کرنے کے موقع نکالیں' ہماری ملت کے افراد اپنا حق وصول کر کے اس قدر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ فرض ادا کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ یہی سبب ہے کہ دوسری جماعتیں ہماری اجتماعی اغراض پر بھی ذاتی اغراض کا شبہ کرتی ہیں' اور ہم اپنی ملت کا الگ وجود تسلیم کرانا چاہتے ہیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم جمہوریت کے آداب برتنے سے انکار کرتے ہیں۔

حقیقت میں ہم جس چیز کا مطالبہ کرتے ہیں وہ نہ ہمیں کوئی دے سکتا ہے نہ ہم سے لے سکتا ہے ہم اگر خدمت کا وہ حق ادا کریں جسے ہمارے دین نے عبادت کا مرتبہ دیا ہے۔ علم حاصل کرنے اور پھیلانے کا فرض جیسا کہ چاہئے انجام دیں تو ہماری ملت خود بخود بنی رہے گی، اور اس کے خادموں کے سامنے ہمارا دینی اور تہذیبی نصب العین بھی رہے گا، جس کی قدر دراصل تجربہ اور انسانی طبیعت اور زندگی کی اونچ نیچ سے واقفیت پیدا کرتی ہے۔ اُس زمانے میں جب کہ جہالت اور اوہام پرستی ہم کو گھیرے ہوئے تھی اور ہمیں

ڈر تھا کہ ہم اس میں گم ہو جائیں گے، مومن اور مشرک کے فرق کو نظروں کے سامنے رکھنا ضروری تھا، اس وقت جبکہ غیر مسلموں میں تعلیم پھیل رہی ہے، وہ رسمیں توڑی جارہی ہیں جنھوں نے زندگی کو جکڑ لیا تھا اور عقل کی اتنی قدر بڑھ گئی ہے کہ مذہب بھی کہیں کا نہیں رہا ہے تو ہمارا اس پر اصرار کرنا کہ ہم سب سے الگ ہیں خود ہمارے آئین کے خلاف پڑ سکتا ہے۔ ہماری تہذیب کی قابل قدر خصوصیات بڑی حد تک عام تہذیب میں شامل ہو گئی ہیں، اب ہماری ملت صرف اس طرح ملت بنی رہ سکتی ہے کہ وہ اپنے افراد کی زندگی اور عمل میں وہ فضیلت ظاہر کرے جو اسے اسلام کی بدولت حاصل ہے۔

اسلام نے میانہ روی اور اعتدال کی جو تعلیم دی ہے وہ ہمارے لئے مصلحت اندیش ہونا لازمی کر دیتی ہے۔ ہمارے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ اپنی بھلائی کی فکر کریں، ہمارے ذمے تو اسلام کی تبلیغ کرکے، یعنی اس کی تعلیم کو ہر تعلیم سے زیادہ موثر اور مفید ثابت کرکے دنیا کو نجات کا راستہ دکھانا ہے۔ یہ مقصد بغض، حسد، کینے اور ضد سے حاصل نہیں ہو سکتا، تنگ نظری، خود غرضی اور خوف آپ اپنے پیر پر کلھاڑی مارتا رہتا ہے۔ ہم میں تو نوع انسانی کی ایسی سچی خیر خواہی ہونا چاہیئے کہ جو دھوکا کھائے اور باز نہ آئے، جو صدمے اٹھانے سے اور پختہ ہو۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو ہمیں کم از کم اپنوں پر اعتبار ہونا چاہیئے، اور ہر شخص کو جو بظاہر خلوص کے ساتھ خدمت کا ارادہ رکھتا ہو سہارا دینا چاہیئے۔ وہ جہاد جو اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کی آخری تدبیر ہے اس وقت لڑ کر نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت کا صحیح جہاد تو ایسی مصلحت اندیشی ہے جو افراد کی استعداد کو ملت کی شیرازہ بندی کا ذریعہ بنائے، اور قوم کی خدمت کو ملت کے الگ وجود کا سہارا۔ ظاہر ہے کہ اس میں خطرے بہت ہیں، لیکن اسلامی تہذیب تو خطروں میں پلی ہے۔ اور اس کا کیا علاج ہے کہ مشیت ایزدی نے قدر اسی چیز کی بڑھائی ہے جو مشکل سے ہاتھ آئے اور آسانی سے ضائع ہو جائے۔ اسلامی تہذیب کی بقا کا مصلحت اندیشی پر منحصر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں جب قدرت کو موتی جیسی دولت رکھنے کے لئے سیپ کے نازک سینے کے سوا کچھ نہ ملا ہو۔

مُسلم لیگ اور ملّت کی تنظیم

(ذیل کے مضمون کے مصنف اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ اگر کسی بزرگ کو ان سے اختلاف ہو یا موضوع کے کسی اور دوسرے پہلو کو نمایاں کرنا چاہتے ہوں تو ہم نہایت خوشی کے ساتھ ان کے خیالات کو اپنے رسالہ میں شائع کریں گے۔)

مسلمانوں کے انتشار کی موجودہ حالت میں ان مسلمانوں کو بہت زیادہ قابل الزام سمجھا جاتا ہے جو مسلم لیگ میں شریک ہو کر اس کی طاقت کو نہیں بڑھاتے یہانتک کہ لیگ کے بعض انتہا پسند حامی انھیں غدار کے نام سے موسوم کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔ لیکن غدار کون ہے؟ آیا وہ غدار ہیں جو مسلمانوں کی جماعت (مسلم لیگ) کو چھوڑ کر ہندوؤں کی جماعت (کانگریس) سے مل گئے ہیں یا وہ ہیں جو لیگ میں رہتے ہوئے مسلمانوں کو یورپینوں کا غلام رکھنا چاہتے ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب دینا سہل نہیں ہے۔ مسلمانوں کے مفاد کے پیش نظر ممکن ہے بہت سے وہ لوگ جو لیگ سے باہر ہو گئے ہیں یا باہر رہنا پسند کرتے ہیں آخر میں اتنے زیادہ غدار ثابت نہ ہوں جتنے وہ لوگ جو لیگ میں شامل ہیں مجھے اس بات سے انکار نہیں ہے کہ لیگ میں بہت سے نہایت مخلص اور ایثار پسند لوگ بھی شامل ہیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ لیگ پر ایسے لوگوں کو پورے طور پر اقتدار حاصل نہیں ہے۔ ان کے دست و بازو ان کے قابو سے باہر ہیں۔ ان کے ساتھیوں اور پیروؤں کی وفاداریاں بٹی ہوئی ہیں۔ ایک طرف وہ اپنے انگریز آقاؤں کو بھی خوش رکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف اسلام کو بھی ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے ؎

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

کیا مسلمانوں کی اپنی سیاست کوئی نہیں ہے؟ کیا وہ دوسروں کی سیاست کے پابند ہو کر ان کے ہاتھ میں کٹ پتلی کی طرح ناچنے کے لئے مجبور ہیں؟ کیا مسلمانوں کی زندگی محض اس لئے ہے کہ وہ کبھی انگریز کبھی ہندو

فرقہ پرست، ورکبھی دیسی ریاستوں کے آلہ کار بنتے رہے ہیں؟ کیا ان کا کوئی واضح سیاسی نصب العین ایسا نہیں ہے جس کی روشنی میں وہ اپنی پارٹی، اور اپنی وزارتیں بنا سکیں اور جب اپنے اس مقصد کو حاصل ہوتا نہ دیکھیں تو نہ یورپینوں کی امداد سے اپنی وزارت بنائیں نہ ہندوؤں کی امداد سے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کا مقصد محض وزارت بنانا نہ ہو بلکہ کام کرنا ہو اور جب کام کرنے کا موقع نہ دیکھیں تو وزارت سے بھی کنارہ کش رہیں۔ اگر جاہ طلبی اور نفع اندوزی زندگی کا واحد نصب العین نہیں ہے تو کیوں ایسی مفاہمتیں کی جاتی ہیں جن سے اپنی اور قوم کی آبروریزی ہوتی ہے اور دوسرے لوگ بات کرنے تک کے روادار نہیں ہوتے۔

مضبوط سیاسی پارٹیاں سال دو سال کی ہنگامہ خیزیوں میں نہیں بنتیں محض زوردار تقریروں اور تحریروں اور بڑے بڑے جلسوں اور جلوسوں کی کثرت سے نہیں ہو جاتیں۔ ان کے حضور میں قوم کے عزیز ترین افراد کو اپنے جان و مال کی گراں بہا قربانیاں پیش کرنا ہوتی ہیں۔ ان کو برسوں تک مسلسل خاموشی، سچائی اور استقامت کے ساتھ پسینہ اور خون سے سینچنا پڑتا ہے۔ اپنا عیش و آرام، اپنی دولت اور عزت سب کو محفوظ بھی رکھا جائے اور پائدار اور ذی اثر سیاسی پارٹی بھی بنا لی جائے۔ دوسرے ملکوں میں جہاں آزادی حاصل کی جا چکی ہے ممکن ہے ایسا ہو سکتا ہو۔ ہندوستان میں بھی ممکن ہے ایسی پارٹیاں اپنی طرح کی دوسری پارٹیوں کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہوں لیکن کانگریس کا مقابلہ اس طرح نہیں کیا جا سکتا ؎

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں
ایں خیال است و محال است و جنوں

یہ سب کچھ میں کانگریس کی حمایت کے سلسلہ میں نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ اس ہمدردی کی بنا پر لکھ رہا ہوں جو مسلم لیگ کے ساتھ مجھے لفظ "مسلم" کے لگے ہوئے ہونے کی وجہ سے ہے اور جس کی بنا پر اس کی ہر ناکامی سے میرے دل پر ایک چوٹ لگتی ہے ؎

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہماری ہمسایہ ہندو قوم اپنے لئے ایک نصب العین کو طے کر چکی ہے۔ وہ نصب العین ہے ہندوستانی

قوم کی آزادی جس کا مفہوم ان کے نزدیک تمدنی نقطۂ نگاہ سے یہ ہے کہ اکثریت کے تمدن کا یعنی ہندوؤں کے تمدن کا جو اتفاق سے ملکی تمدن بھی ہے اقتدار قائم کیا جائے۔ اس میں مسلمانوں کے کسی جداگانہ تمدن کی کہیں گنجائش نہیں ہے۔ مسلمانوں کو جداگانہ جماعت کی شکل میں کہیں نمائندگی نہیں دی جاسکتی۔ انفرادی طور پر البتہ ہندو تمدن کی ہمہ گیریوں میں ان کے لئے جگہ نکالی جاسکتی ہے اور انھیں جذب کیا جاسکتا ہے۔ انھیں ودیامندر نام کے سرکاری مدرسوں میں پڑھنا چاہیئے۔ انھیں سنسکرت آمیز ہندی کو سرکاری زبان کے طور پر قبول کرنا چاہیئے۔ انھیں بندے ماترم کے فرقہ وارانہ گیت کو قومی گیت بنانا چاہیئے۔ انھیں وشنو نگر نام کے عارضی شہر میں کانگریس کے اجلاسوں میں شرکت کرنی چاہیئے انھیں پوتر وشنو بھوجن کو کانگریس کے بھوجن بھنڈار میں کھانا چاہیئے۔ غرضکہ ہر جگہ انھیں ہندو تمدن کی برتری کے آگے سر جھکانا چاہیئے اور یہ اس لئے کہ ہندوستان کی سلطنت کی وارث انگریزوں کے بعد ہندو قوم بننے والی ہر ہندو قوم ہی انگریزوں سے لڑکر ان کی حکومت کو چھین رہی ہے۔ وہی آہستہ آہستہ ملک کی تمام طاقت کی جگھوں پر قبضہ کرتی جارہی ہے اور اس کا کوئی دوسرا مقابل اور حریف نہیں ہے۔ ملکی آزادی اور ہندو تمدن کے اقتدار کے معاملہ میں ہندوؤں کے درمیان کوئی باہمی اختلاف نہیں ہے۔ اس میں کمیونسٹ، تشدد پسند اور دہشت انگیز غیر کانگریسی اور کانگریسی سوشلسٹ۔ آئینی کانگریسی اور غیر آئینی کانگریسی، نیشلسٹ کانگریسی اور لبرل، مہا سبھائی اور آریہ سماجی، سکھ، بودھ، جین۔ سناتن دہرم والے سب شامل ہیں۔

ملکی اور تمدنی آزادی کے اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے ہندو قوم نے کئی مورچے تیار کئے ہیں۔ ان میں ایک مورچے سے دوسرے کو تقویت پہنچتی ہے اور ان سب مورچوں میں کانگریسی مورچہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

اگر آج کانگریس اور حکومت برطانیہ سے فیڈریشن کے معاملہ پر جنگ شروع ہوجائے تو پہلا مورچہ جس پر حکومت برطانیہ کو فوراً قبضہ کرنا ہوگا وہ کمیونسٹوں، تشدد پسندوں اور دہشت انگیزوں کا مورچہ ہوگا۔ آزادی کی لڑائی کے یہ لوگ ہراول ہیں۔ ان میں سے کمیونسٹوں کو جو سرے سے کسی مذہب کو ہی نہیں مانتے مسلمانوں کے تمدنی نصب العین سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ لوگ ہندو ازم سے تو تھوڑی بہت مفاہمت کر بھی سکتے ہیں اس لئے کہ ہندو ازم اتنا مذہب نہیں ہے جتنا رہنے سہنے کا ایک طریقہ ہے اور اس میں ملحد اور خدا پرست سب کی

کھپت ہو سکتی ہے۔ مگر اسلام سے وہ کسی طرح بھی مفاہمت نہیں کر سکتے۔ رہے تشدد پسند اور دہشت انگیز یہ لوگ کالی دیوی کی پوجا کرنے والے کٹر مذہبی دیوانے ہوتے ہیں۔

ان لوگوں کو گرفتار کرنے کے بعد دوسرا مورچہ جس پر برطانوی حکومت کو حملہ کرنا ہوگا وہ کانگریسی سوشلسٹوں کانگریس کے نوجوان انتہا پسندوں، کسان سبھاؤں اور مزدور سبھاؤں کا ہوگا کیونکہ ان کو اگر آزاد رکھا گیا تو یہ واقعی نہایت خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد تیسرا مورچہ اسمبلیوں کا ہوگا۔ کیونکہ گورنر کی مندرجہ بالا تشدد کی پالیسی سے وزرا اور اسمبلی کے ممبران اختلاف کریں گے، مستعفی ہو جائیں گے۔ اس سے ایک زبردست کھلبلی اور ابتری پیدا ہو جائے گی۔ قومی زندگی میں اول درجہ کی بحرانی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور مجموعی طور پر یہ بڑا انقلاب انگیز واقعہ ہوگا۔

اس کے بعد چوتھا مورچہ سب سے زبردست اور طاقتور مورچہ ہوگا۔ دیہات کی، ضلع کی، صوبہ کی کانگریس کمیٹیاں، آل انڈیا کانگریس کمیٹی، ورکنگ کمیٹی، رضاکاروں کی انجمنیں، سیوادل سب حکومت کی مخالفت پر آمادہ ہو جائیں گی اور سب کو غیر قانونی قرار دینا ہوگا۔ اخباروں کی ضمانتیں ضبط کرنا ہوں گی چھاپہ خانوں کی نگرانی کرنی ہوگی۔ ریلوں، لاریوں کی دیکھ بھال کرنا ہوگی۔ سول نافرمانی شروع ہوگی۔ گرفتاریوں کی بھرمار ہوگی۔ لاٹھی چارج ہوگا۔ گولی چلے گی چند روز تک بڑا ہنگامہ رہنے کے بعد تمام ایسے لوگ جو تحریک میں براہ راست شرکت کریں گے سرکاری قید خانوں میں پہنچا دئے جائیں گے۔

اب اس کے بعد ایسے مورچے ہوں گے جن پر ہاتھ ڈالنے میں حکومت کو تامل ہوگا کیونکہ یہ براہ راست لڑنے والے لوگ نہیں ہوں گے۔ مثلاً آل انڈیا اسپنرس ایسوسی ایشن۔ آل انڈیا ولیج انڈسٹریز ایسوسی ایشن آل انڈیا ہریجن سیوک سنگھ، ہندی پرچارنی سبھائیں، ودیا مندر، وردھا اسکیم کے ماتحت پرائمری اسکول، گرام سدھار کی سبھائیں — یہ بالکل تعمیری کام کرتی ہیں جو قانون کی زد میں نہیں آتے لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں یہ ہیں وہ پکے کانگریسی عقائد رکھتے ہیں۔ فرض کیجئے ان پر بھی برطانوی حکومت اپنی نگرانی قائم کر دیتی ہے۔

اب اس کے بعد ان لوگوں کا نمبر آئے گا جو زمانہ ساز، منافق، عیار، اور چالاک ہیں۔ حکومت سے بھی بگاڑنا نہیں چاہتے۔ جان اور مال کی بھی کوئی قربانی کرنا نہیں چاہتے کسی قسم کا کوئی اور دوسرا ایثار کرنا بھی نہیں چاہتے

لیکن پھر بھی قومی نصب العین کو بالکل ہاتھ سے دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ان میں یونیورسٹیوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ سرکاری اعلیٰ عہدیدار، وکیل، ڈاکٹر، انجنیئر، پروفیسر، اخبار نویس، ساہوکار، دوکانداروں کے مالک، کالجوں اور اسکولوں کے طلبا طبقہ متوسط کے بہت سے لوگ اور دوسرے پڑھے لکھے لوگ شامل کئے جا سکتے ہیں جب تک کانگریس غیر قانونی نہیں ہوتی ان میں سے بہت سوں کی وابستگیاں کانگریس کے ساتھ رہتی ہیں لیکن جب کانگریس غیر قانونی ہو جاتی ہے تو ان کی وابستگیاں کانگریس سے منتقل ہو کر لبرل فیڈریشن، ہندو مہا سبھا، آریہ سماج کی طرف چلی جاتی ہیں۔ اور یہ لوگ آئینی طور پر اور وفاداری کا دعوے کرتے ہوئے کم و بیش انہی مطالبوں کو پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں جن کو کانگریس غیر آئینی طریقہ پر پیش کر رہی تھی اس کے علاوہ یہ اپنی وفاداری کا معاوضہ تنخواہوں رشوتوں اور دوسری رعایتوں کی شکل میں بھی طلب کرنا شروع کر دیتے ہیں اور حکومت کے لئے وبال جان بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ جیل میں تو نہیں جائیں گے لیکن حکومت کو اپنے خود غرضی کے مطالبوں سے عاجز کر ڈالیں گے ایک طرف تشدد کی پالیسی کی دماغی الجھن اور مالی پریشانی اور دوسری طرف ان "خیر خواہ" لوگوں کی "انعام طلبی"۔ غرضکہ یہ محاذ جنگ بھی حکومت کے لئے سخت پریشان کن ثابت ہوگا۔

پھر عورتوں کا محاذ جنگ ان سب کے علاوہ ہے۔ عورتوں پر یہ پابندی بھی نہیں ہے کہ ان کا تعلق کن سے طبقہ اور جماعت سے ہے۔ تحریک کے زمانے میں یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جن خاندانوں کے مرد "وفادار" اور "خیر خواہ" ہوتے ہیں ان کی بیویاں اور لڑکیاں پوشیدہ اور کھلے طور پر قومی تحریک کی امداد کی طرف مائل نظر آتی ہیں۔ عورتوں کی شرکت سے جنگ میں ایک عجیب دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ان کے خلاف جبر و تشدد کیا جاتا ہے تو تمام ملک میں سنسنی پھیل جاتی ہے۔ مردوں کی غیرت اور حمیت جوش میں آتی ہے اور احتجاج کے طور پر تحریک کو تقویت پہنچنے لگتی ہے۔

جب تحریک اس منزل پر پہنچتی ہے اور حکومت کا جبر و تشدد انتہائی حد پر ہوتا ہے تو اس وقت بہت سے سیاسی کام خفیہ طور پر کئے جانے لگتے ہیں۔ ان کی وجہ سے حکومت کی گھبراہٹ روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اپنے افسروں اور ملازموں، فوج اور پولیس کے آدمیوں سب پر سے اعتبار اور اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ ہر طرف خطرہ نظر آنے لگتا ہے۔ پھر اگر بین الاقوامی صورت حال خراب ہو اور ملکی لوگوں کے تعلقات غیر ملکیوں سے

خصوصاً دشمن ملکوں سے ہوں تو خوف دہراس اور بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ کوئی آدمی بھروسہ کے لائق نظر نہیں آتا۔ غرضکہ جنگ کا یہ نقشہ ہے جس کو نظر کے سامنے رکھ کر کانگریس اپنی سیاسی اور تمدنی آزادی کے مطالبوں کو برطانیہ کے سامنے منظوری کے لئے پیش کرتی ہے۔ اور ان نتائج اور عواقب کا ڈر ہے جس کی وجہ سے سرکار برطانیہ، کانگریس سے لڑائی مول لینے سے ہچکچاتی ہے اور جہاں تک ممکن ہے کانگریس کے مطالبوں کو خاموشی کے ساتھ منظور کر لیتی ہے۔

خصوصاً اب جب کہ آٹھ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوگئی ہیں، کانگریس سے جنگ کرنے میں حکومت برطانیہ کو اور بھی زیادہ پس وپیش ہوگا۔ اب حکومت برطانیہ اپنے سول، پولس اور فوج کے ملازموں اور وفادار "جی حضوریوں" پر اتنا اعتماد نہیں کر سکتی جتنا پہلے کیا کرتی تھی۔ پہلے ان کے تصور میں بھی کبھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ کانگریسی خیال کے لوگ حکومت کی گدی کے بھی مالک بن سکتے ہیں لیکن اب تو وہ اپنی آنکھوں سے کلکٹر اور پولس کپتان کو کانگریسی وزیروں کے سامنے مؤدب کھڑا ہوا دیکھ چکے ہیں اور اب ان کے لئے یہ خیال کرنا بالکل قدرتی بات ہے کہ کل پھر کانگریس والے برسر اقتدار ہو جائیں گے اور ان کے ساتھ جو زیادتیاں کی جائیں گی ان کا دل کھول کر بدلہ لے سکیں گے۔ اس لئے سرکار برطانیہ اور کانگریس کی اس لڑائی میں وہ غیر جانبدار رہنے کو ہی بہتر اور افضل سمجھیں گے اور اگر خیر خواہی دکھانا ضروری ہی سمجھیں گے تو عاقبت اندیشی کا یہ تقاضا ہوگا کہ آنے والی حکومت کے ساتھ خیر خواہی کریں تاکہ پوری زندگی امن چین سے بسر ہو اور ملک کے لوگوں میں بھی غدار اور وطن فروش نہ کہلائیں۔

یہ تو کانگریس کی طاقت کا حال ہوا لیکن اب سوال یہ ہے کہ مسلم لیگ کے پاس اپنے مطالبوں کے منوانے کے لئے کون سی طاقت ہے۔ آیا اس کے قومی مطالبہ میں بھی اسی طرح کی کوئی ہمہ گیری اور یک جہتی پائی جاتی ہے اور پوری مسلم قوم اس کے ساتھ بھی اسی طرح شریک ہے جیسی کانگریس کے ساتھ ہے۔ اس کے پاس بھی لڑنے کے لئے اتنے ہی جنگ کے محاذ موجود ہیں جتنے کانگریس کے پاس ہیں۔ اس کے یہاں بھی مخلص ایثار پسند، ذی علم، معاملہ فہم اور عوام کو منظم کرنے والے رہنماؤں کی اتنی ہی کثرت ہے کہ وہ گاؤں گاؤں میں ان کو بکھیر دے اور ان کی وفاداری، انضباط پسندی اور اطاعت شعاری پر پوری طرح بھروسہ کر سکے کہ جب کبھی مرکز

سے کسی قسم کا کوئی حکم انہیں دیا جائے گا۔ وہ اس کی پابندی کریں گے اور اس کے پورا کرنے میں کسی قربانی کے پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ کیا اس نے بھی اپنے نوجوان کارکنوں میں استقلال، جفاکشی، سادگی اور احتیاجات کی کمی کی وہی اعلیٰ صفات پیدا کر دی ہیں جو کانگریس کے کارکنوں کی ایک عام خصوصیت ہیں۔ کیا اس نے بھی ایسے ہی تعمیری کام شروع کر رکھے ہیں جیسے کہ کانگریس نے اور ہندوؤں کے دوسرے مذہبی اور تمدنی اداروں نے عام طور پر شروع کر رکھے ہیں۔ کیا اس کی قوم میں بھی مخیر اور باہمت دولتمندوں کی ایسی ہی کثرت ہے۔ کیا اس کو بھی سرمایہ داروں کی ایسی ہی مالی امداد اور سرپرستی حاصل ہے جیسی ہندوؤں کے ہر ادارے کو ملی ہوئی ہے۔ کیا اس کے رضاکاروں کی فوج بھی ایسی ہی تربیت یافتہ اور منظم ہے جیسی کانگریس کی ہے۔ کیا اس کے یہاں بھی عورتوں میں اتنی ہی بیداری پھیل چکی ہے کیا وہ بھی مردوں کے ساتھ اسی طرح دوش بدوش قومی تحریک کے کاموں میں دلچسپی لیتی ہیں جیسی ہندوؤں میں۔ کیا مسلمانوں کے یہاں بھی لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ہزاروں کی تعداد میں ایسے ہی نہایت اچھے قومی مدرسے، کلب، انجمنیں، اکھاڑے، ورزشی تعلیم گاہیں وغیرہ ہیں جیسی کہ ہندوؤں کے یہاں پائی جاتی ہیں کیا مسلمانوں نے بھی کئی نسلوں کے ایثار، دوراندیشی، کفایت شعاری اور خوش انتظامی سے وہ جائدادیں، ملیں، کارخانے اور کاروبار شروع کئے ہیں جو ہندوؤں نے کر رکھے ہیں۔ کیا انہیں بھی نئی نسل کی فلاح و بہتری کی اتنی ہی فکر ہے جتنی ہندوؤں کو ہے۔ کیا ان کے تعلیم یافتہ طبقہ نے بھی جاہل عوام سے رابطہ اور میل اتنا ہی بڑھا لیا ہے، ان کے دکھ درد میں اتنے ہی شریک ہونے لگے ہیں جتنے ہندو ہوتے ہیں۔

جب یہ سب کچھ نہیں ہے تو پھر کس بل بوتہ پر اپنا مطالبہ پیش کیا جاتا ہے اور اس کی منظوری کی توقع قائم کی جاتی ہے؟

چاہتے سب ہی کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم

جس وقت ہم دادِ عیش و عشرت دیتے رہے دوسرے محنت اور تکلیف اٹھا کر اور عاقبت اندیشی اور اعلیٰ مقصد کو سامنے رکھ کر آگے بڑھنے میں مصروف رہے۔ جیسا آدمی بوتا ہے ویسا ہی کاٹتا ہے۔ جو چیز ہمیں خود اپنی محنت سے حاصل کرنا چاہیئے وہ کوئی دوسرا شخص ہم کو کیسے عطا کر سکتا ہے اور بفرضِ محال اگر عطا بھی کرے

تو ہماری غیرت اور حمیت اسے کیسے قبول کرنا گوارا کر سکتی ہے۔

مسلم لیگ کی طرف سے جو شکایتیں کانگریس سے کی جاتی ہیں وہ دراصل خود اپنی ذات سے کرنا چاہیں اور کانگریس سے محاسبہ کرنے کی جگہ خود اپنے نفس سے محاسبہ کرنا چاہیئے۔ جب ہم یہ کرنا شروع کر دیں گے تو ہم کو نہ تحفظات کی ضرورت ہوگی نہ اپنے مطالبوں کو قبول کرانے کے لئے درخواستیں دینے کی۔ نہ صلح کی گفتگو کے موقع ڈھونڈنے کی اور نہ سول نافرمانی اور جنگوں کے اعلانات کرنے کی۔

مسلم لیگ اگر ہندوؤں سے جنگ کا ارادہ رکھتی ہے تو اسے اپنی طاقت اور اپنے دشمن کی طاقت کا پورا پورا اندازہ کر لینا چاہیئے۔ نہ تو دشمن کو حقیر اور بے چارہ سمجھنا چاہیئے نہ خود اپنی طاقت کا بے جا گھمنڈ کرنا چاہیئے۔ جنگیں چاہے وہ پر امن اور آئینی ہوں چاہے خونی اور انقلابی ۔۔ ذرائع اور وسائل کا مطالبہ کرتی ہیں اور سرمایہ داری کے موجودہ دور میں جس کے پاس جتنے زیادہ وسائل ہوتے ہیں اتنا ہی زیادہ وہ اپنے دشمنوں پر غالب آسکتا ہے۔ اگر پہلے حملہ کو جھیل لیا جائے تو پھر معاملہ دم کا اور مقابل حریف کو تھکا کر زیر کرنے کا رہ جاتا ہے کون سا حریف میدان میں زیادہ دیر تک ٹھہر سکتا ہے۔ کون جنگ کے نقشہ کو بہتر طریقہ پر ترتیب دے سکتا ہے کس میں پیش بینی، موقع شناسی اور مصلحت اندیشی زیادہ ہے۔ کون حملے اور پسپائی کے اوقات کو بہتر سمجھتا ہے کون کمزور جگہ کو پہچان کر حملہ کر سکتا ہے۔ کس کی نظر بنیادوں پر ہے اور کس کی فروعات پر ۔۔ یہ تمام عناصر ہیں جو جنگ کی کامیابی اور ناکامی پر اثر ڈالتے ہیں۔ قومیں جنگوں کے لئے خاموشی کے ساتھ برسوں تک تیاری کرتی ہیں۔ تیار نہیں ہوتیں تو بہت سی توہینوں، ذلتوں اور نقصانوں کو صبر کے ساتھ برداشت کر لیتی ہیں۔ رضاکاروں کو بھرتی کیا جاتا ہے۔ ان میں جفاکشی اور اطاعت شعاری پیدا کی جاتی ہے۔ آلات حرب کھٹے کیے جاتے ہیں۔ ان کے استعمال کی مشق کرائی جاتی ہے۔ فوجی افسروں کی تربیت کا خاص طور پر انتظام کیا جاتا ہے۔ جنگ کا ایک پورا فن اور علم ہوتا ہے اور اس سے پوری طرح وہی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جن کے وسائل زیادہ ہوتے ہیں۔ یہاں محض جسمانی طاقت اور بے خوفی کام نہیں دیتی بلکہ دولت علم اور عقل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ابی سینا کے مقابلہ میں اٹلی، سرحد کے مقابلہ میں برطانیہ، چین کے مقابلہ میں جاپان اپنی تعداد کی کثرت یا اپنی جسمانی طاقت اور بے خوفی کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوئے بلکہ اس لئے کامیاب

ہوئے ہیں کہ ان کے یہاں علم، فنی مہارت، تنظیم اور دولت کے وسائل زیادہ تھے، پھر دوسری قوموں سے معاہدے کئے جاتے ہیں، حملہ اور مدافعت کی صورت میں امداد کے وعدے لئے جاتے ہیں اور اس طرح اپنی طاقت کو بڑھایا اور حریف کی طاقت کو کمزور کیا جاتا ہے۔ سوئیڈیٹن جرمنوں کو چیکوسلوویکیا میں اس لئے کامیابی ہوئی کہ ان کی پشت پناہی کے لئے نازی جرمنی کی پوری مسلح اور منظم طاقت موجود تھی۔ کیا لیگ نے بھی جنگ کا اعلان کرنے سے پہلے اپنے آپ کو لڑائی کے لئے اسی طرح تیار کرلیا ہے یا ہماری حالت دیکھ کر لوگوں کا دل یہ کہنے کو چاہتا ہے ؎

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

سنہ ۱۹۲۰ء کی خلافت تحریک کے زمانہ میں مسلمانوں نے جو ایثار کئے تھے اس کا قصہ آج کل اکثر دوہرایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک فاضل اور مخلص اہل قلم جناب عبدالوحید خاں صاحب بی۔ اے نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب "مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ" کے نام سے تصنیف فرمائی ہے جو ابھی حال میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں دکھلایا گیا ہے کہ کس طرح سنہ ۱۹۲۰ء کی جنگ میں سیاسی فضا پر مسلمان پورے طور پر چھائے ہوئے تھے اور نصب العین کے لئے قربانیاں کرنے میں زیادہ پیش پیش تھے۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے اور "ہسٹری آف دی کانگریس" کے مصنف نے اس حقیقت کو چاہے کتنا ہی نظرانداز کیوں نہ کیا ہو لیکن تاریخ کے اس کھلے ہوئے کارنامہ پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ اس کے بعد آزادی کی دوسری تحریک میں بھی مسلمانوں کی قربانیاں کچھ کم نہیں رہی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ جب سیاست کی رہنمائی مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی تو کانگریس کے سیاسی پلیٹ فارم سے یہ لوگ کس طرح خارج کردئے گئے اور اغیار کا اس پر کس طرح قبضہ ہوگیا۔ ان کی سب قربانیاں کس طرح پانی پر بنائی ہوئی نقش کی طرح مٹ گئیں اور برادران وطن نے کیوں کر تمام سیاسی زندگی پر اپنا اجارہ قائم کرلیا اور تمام کارگذاری کے دعویدار خود بن بیٹھے۔

یہ مسلمانوں کی بدنصیبی کی وہ داستان ہے جسے بیان کرتے ہوئے بہت دکھ ہوتا ہے اس زمانہ میں واقعی مولانا شوکت علی مرحوم گاندھی جی کو اپنی جیب میں ڈالے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک گھوما کرتے تھے "گاندھی جی کی جے" علی برادران نے بلوائی، علی برادران نے اپنی مردانہ جرأت اور بے خوفی اور مسخر کرنے والی شخصیت

جہاں سے امداد مل رہی تھی۔ اسے بھی بند کر دیا۔ ترکوں نے جب خلافت کو ختم کرنے کا اعلان کیا تو ساری عمارت
بالکل ہی بیٹھ گئی۔ جو کارکن خلافت کے جھنڈے کے نیچے تعلیم اور سرکاری ملازمتوں کو چھوڑ کر جمع ہوئے تھے وہ
کچھ دن تک تو سختیاں جھیلتے رہے لیکن زندگی کے معیار چونکہ بلند تھے عادتیں بگڑی ہوئی تھیں۔ طبیعتوں میں عیش
پسندی تھی ذہنیت جاگیردارانہ تھی جس طبقہ سے عمر بھر کے تعلقات تھے اس میں ظاہری ٹھاٹھ کی بڑی قدر تھی اور یہ
لوگ ہم چشموں کی نگاہوں میں اپنے متعلقین اور خود اپنے آپ کو حقیر کرنا نہ چاہتے تھے۔ لہذا ایک ایک کرکے کھسکنا
شروع ہوئے کسی نے فرقہ پرور اور رجعت پسند تحریکوں کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر دیا۔ کسی نے اپنی وکالت
اور بیرسٹری دوبارہ شروع کی۔ کسی نے ریاستوں میں ملازمت ڈھونڈی۔ کسی نے انشورنس یا ایجنسی وغیرہ کی قسم کا کوئی
اچھا کاروبار شروع کیا جو مخلص اور مستقل مزاج تھے وہ گوشہ گمنامی میں عسرت اور کس مپرسی کی زندگی بسر کرنے لگے
وکالت، سرکاری ملازمتوں اور تعلیم گاہوں کو جن مسلمانوں نے عدم تعاون کے زمانہ میں چھوڑا تھا وہ معمولی قابلیت
کے لوگ نہ تھے اگر ان کی زندگی کا معیار بلند نہ ہوتا اور کچھ نجی وسائل آمدنی ان کے پاس ہوتے۔ اگر وہ مستقل مزاج
اور عقیدہ کے پکے ہوتے تو ضرور مسلم قوم کی اصلاح اور تعمیر کے کاموں میں لگے رہتے اور ان رہنماؤں کی کوششوں
سے مسلمانوں کی وہ بیداری جو سرسید کے زمانہ سے شروع ہوئی تھی اور ۱۹۲۰ء میں انتہائی نقطہ عروج تک پہنچ گئی
تھی مستحکم بنیاد پر قائم ہو جاتی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اس کے برعکس ہندو تعلیم گاہوں سے جن اساتذہ اور طلبہ نے بغیر اپنی پرانی تعلیم گاہوں کو اجاڑے
اور ویران کئے ہوئے عدم تعاون کیا تھا وہ سب قومی تعمیر کے کاموں میں لگ گئے۔ وہ خود اپنے خاموش
انداز میں نہایت اچھے رہنما ثابت ہوئے اور انھوں نے اپنے جیسے اور ہزاروں رہنما اور کارکن تیار کئے
جو ملک کے طول و عرض میں پھیل گئے اور پتہ مار کر کام کرنے لگے۔ آل انڈیا چرخہ سنگھ کی شاخیں انھیں لوگوں نے
ہر شہر اور تحصیل میں پھیلا دیں۔ سینکڑوں آشرم ملک میں کھول دئے جو ایک طرح سے کانگریس کی چھاؤنیاں بن گئیں۔
دور بینی، عاقبت اندیشی امید اور اعتقاد کے ساتھ کام کرتے رہے۔ ملک کی بگڑی ہوئی فضا سے بد دل اور مایوس
نہیں ہوئے۔ قومی کام کے ایثار کو چھوڑ کر زندگی کے نفع بخش کاروبار میں نہیں لگے بلکہ صبر و استقلال کے ساتھ قومی تعمیر
اور تنظیم کے کام میں لگے رہے۔ ہندو سبھا، شدھی اور سنگھٹن کا زور ہوا۔ کانگریس کا بازار کچھ مندا بھی پڑ گیا لیکن بصورت

مجموعی ہندو سوسائٹی ان کے لئے سازگار ثابت ہوئی۔ ساہوکاروں یا طبقہ متوسط کے دوسرے آزاد لوگوں سے مثلاً وکیلوں ڈاکٹروں وغیرہ سے ان کا یا تو ذاتی تعلق تھا یا اپنے رفیقوں کے ذریعہ سے یہ تعلق پیدا ہو گیا۔ ہندو عورتوں کی تعلیم، بیداری اور قومی تحریکوں سے دلچسپی نے بھی ان کا بہت ساتھ دیا۔ ایثار اور خلوص کے ساتھ جب کام کئے گئے تو عام طور پر اعتبار و اعتماد بڑھتا رہا اور کام کے کرنے میں مالی مشکلات کبھی مانع نہ ہوئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس کی طاقت کی تنظیم برابر بڑھتی رہی۔

اگر مسلمانوں میں علی برادران کے ساتھ ایک گاندھی جیسا ٹھنڈے دل کا کام کرنے والا بھی ہوتا اور ان کی پشت پناہی کے لئے دولتمند تعلیم یافتہ اور بیدار مغز لوگوں کی ایسی ہی کثرت ہوتی جیسی گاندھی اور ان کے رفیقوں کے ساتھ تھی اور ان کی زندگی میں فضول خرچیاں اور ہنگامہ پسندیاں بہت زیادہ نہ ہوتیں مختصر یہ کہ مسلمانوں میں اتنے ہی بنئے ہوتے جتنے ہندوؤں میں تھے تو ہمیں یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔ بنئیے اور خانصاحب کا مقابلہ جیسا زندگی کے اور دوسرے تمام میدانوں میں ہو رہا تھا سیاسی زندگی میں بھی ہوا اور جس طرح خانصاحب نے اپنی جائدادیں اور زمینداریاں بنئے کے حوالے کی تھیں اسی طرح سیاسی اقتدار بھی بنئیے کو سونپ دیا۔ ایک طرف خود ہماری داخلی کمزوری، دوسری طرف حکومت کی یہ کوشش کہ مسلمانوں کے مہرہ کو اپنی سیاسی چالبازیوں کے لئے استعمال کرے اور تیسری طرف مہا سبھا کی اشتعال انگیز مسلم دشمنی اور خود مسلمانوں کی گرم مزاجی اور غصہ میں آپے سے باہر ہو جانے کی عادت — ان سب نے مل ملا کر مسلمانوں کی سیاسی زندگی کو بالکل نکما کر دیا۔ مہا سبھا اور حکومت برطانیہ کی عیاریوں اور مکاریوں کے ہاتھ میں مسلمان بالکل کھلونا بن گئے۔ کانگریس سے علیحدہ ہو کر جلد بازی اور غصہ میں دوسری انتہا پر پہنچ گئے۔ اپنے سارے پچھلے قول اور فعل بھول گئے۔ بازیگروں کی طرح قلابازیاں کھانے لگے اور کانگریس کے نیک دل پرانے ہندو رفیقوں میں اپنا جو کچھ تھوڑا بہت اعتبار اور اعتماد رکھتے تھے اس کو بھی کھو بیٹھے۔ کانگریس روز بروز ہندو ادارہ بنتی گئی اور مسلمانوں میں روز بروز فرقہ پرور لیڈروں کی آواز اور ان کا اقتدار موثر ہو گیا۔ جن نوجوانوں کے اندر علی برادران نے آزادی کی نئی لگن پیدا کی تھی ان کی زندگی کا انجام ان حالات میں نہایت عبرتناک ہوا۔ اعلیٰ نصب العینوں کی طرف سے ان کے دلوں میں ایک طرح کا تمسخر اور حقارت سی پیدا ہو گئی۔ زندگی کی بلند قدروں کے تصور دھندلے ہو گئے ان کے دل کا آئینہ

گرد آلود ہوگیا۔ وہ مطلب پرست اور جاہ پسند بن گئے۔ کچھ جاکر ریاستوں میں ملازم ہوگئے۔ کچھ تجارت کرنے لگے کچھ اور اسی طرح کی بے اثر زندگی بسر کرنے لگے۔ جو لوگ مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی جگہ پر قائم رہے ان کا اثر بھی مسلمانوں میں صفر کے برابر ہوگیا۔ اسی بکھرے ہوئے شیرازہ کے کچھ اجزا ایسے جو کانگریس کی قیادت میں آج مسلم عوامی ملاپ کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور جو آج علی برادران اور خلافت کے زمانے کے ان اسلامی نصب العینوں کو جنھوں نے ان کے دماغ کی ساخت اور تربیت میں بڑا زبردست حصہ لیا ہے لغو اور دور از کار سمجھنے لگے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے نفس کو فریب دینے کے لیے سوشلزم کے خوش آیند نصب العین میں پناہ لی ہے اور اپنے آپ کو اس دھوکہ میں رکھ کر کہ ہم سوشلزم کے حصول کے لئے کام کر رہے ہیں فی الحقیقت ہندو اقتدار اور ہندو برتری کے کاموں میں مصروف ہیں۔ ان میں سے اکثر نے یہ چاہا تھا بلکہ پوری کوشش کی تھی کہ انھیں مسلمانوں کے درمیان کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ لیکن مسلمانوں کے اداروں پر جن سرکار پرست اور خود غرض لوگوں کا قبضہ تھا۔ انھوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے انھیں موزوں نہیں سمجھا۔ ان کے پرانے ریکارڈ سے خوف کھایا اور انھیں مسلمانوں کے درمیان رہ کر کام کرنے اور اپنی جوانی کی بے اعتدالیوں اور لغزشوں کی اصلاح کرنے کے موقع سے محروم کر دیا۔ چنانچہ ہار کر اور مجبور ہو کر انھوں نے کانگریس کا رخ کیا۔ کانگریس کے بیدار مغز رہنماؤں نے ان کی اہلیت کو تاڑ لیا۔ جوان قابل، تندرست مستعد وجیہ، مقرر، مصنف انتہائی ایثار کے لئے آمادہ۔ کس بات کی ان لوگوں میں کمی تھی۔ ہندو قوم میں بھی ان کی ٹکر کے آدمی کم نکلتے تھے۔ انھوں نے اپنے کام سے انھیں لگایا اور اب وہ جن سے مسلمان بجا طور پر بہت کچھ توقعات قائم کر سکتے تھے، جن کی تربیت اسی مقصد کے لئے ہوئی تھی اغیار کی مرضی کے پابند ہو کر کام کر رہے ہیں ؎

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

جو علی برادران کے فیض صحبت سے سیراب ہوئے تھے اور جو ان کی امیدوں کا ملجا اور ماوا تھے آج اسی پودے کو جڑ سے اکھاڑنے کے درپے ہیں جس کو وہ دونوں عمر بھر سینچتے رہے تھے اب ان نوجوانوں کا

خلوص اور ایثار کسی اور ہی نصب العین کے لئے وقف ہو چکا ہے ؎

دفا آموختی از ما بہ کار دیگراں کر دی

ربودی گوہرے از ما نثار دیگراں کر دی

غرضکہ مسلمانوں کی سیاسی زندگی کی یہ دردناک کہانی ہے اور اس کی ذمہ داری دوسروں پر کم اور خود اپنے اوپر بہت زیادہ ہے۔ ہمیں اپنی گمراہیوں اور بداعمالیوں کا اعتراف کرنا چاہیئے اور صدق دل سے توبہ اور استغفار کر کے آئندہ کے لئے سعادت اور نیکی کے راستہ کو اختیار کرنا چاہیئے۔ کام بہرحال پتہ مار کر برسوں بلکہ نسلوں تک کرنے کا ہے۔

جو لوگ انقلاب اور سوشلزم کو مسلمانوں کی راہ نجات سمجھتے ہیں ان کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ راہ اور سب راہوں سے زیادہ کٹھن ہے۔ انقلاب باتیں بنانے سے نہیں ہو جاتا اس کے لئے بڑی صبر آزما اور خاموش کوششیں کرنا پڑتی ہیں۔ بڑی زبردست قربانیاں کرنا ہوتی ہیں اور انقلاب کے بعد سوشلزم قائم کرنے کا کام اور بھی زیادہ ہمت فرسا اور جانگسل ہوتا ہے۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ ہندوستان میں یہ کام بھی بنیوں کی رہنمائی کے بغیر نہیں چل سکے گا۔ گاندھی جی اور ان کے چیلوں نے (جن میں بنیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے) بنیا قوم میں تیاگ اور سیوا کی شکتیوں کو ترقی دے کر ان کے اقتدار کی وسعت کے لئے ایک بڑا میدان پیدا کر دیا ہے کہ اب سوشلزم کے میدان میں بھی کوئی دوسرا شخص ان کا حریف نہیں بن سکتا۔ تخریب میں تو ممکن ہے دوسرے لوگ ان سے بازی لے جائیں غالباً اسی مصلحت کے پیش نظر گاندھی جی نے سرحدیوں سے دوستی کی ہے لیکن جب تعمیر کا وقت آئے گا تو بنیوں کی اس گاندھی زاد نسل کی رہنمائی پھر دوبارہ قبول کرنا پڑے گی۔ یہی لوگ بڑی بڑی ملیں، پاور ہاؤس اور اسٹور کھڑے کریں گے اور ان کو کم ترین لاگت پر چلانے کا انتظام کر سکیں گے۔

لہٰذا بیسویں صدی کے ہندوستان میں جب تک عملی زندگی کا اس سے بہتر کوئی نمونہ پیدا نہ ہو گا، گاندھی کے بتائے ہوئے طریقوں میں ہمارے لئے بہت کچھ سیکھنے اور اختیار کرنے کے لئے موجود ہے۔ کانگریس کا موجودہ اقتدار دراصل کسی ادنیٰ چیز کا اعلیٰ چیز پر اقتدار نہیں ہے بلکہ تنظیم، کفایت

شعاری، عاقبت اندیشی، جفاکشی، جذبہ خدمت اور استقامت کا اقتدار فضول خرچی، ناعاقبت اندیشی، آرام طلبی، خودغرضی تلون مزاجی اور عدم تنظیم پر ہے۔ ہم نے اپنی اسلامی خصوصیات کو چھوڑ دیا دوسروں نے انہیں قبول کیا یہی وجہ ہے کہ وہ برسراقتدار ہیں ؎

عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور — مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور
تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں — طور موجود ہے لیکن کوئی موسیٰ ہی نہیں

لہذا ہمیں ہنگامہ پسند کارکنوں کی جگہ خاموش مخلص اور ایثار پسند کارکن زیادہ تعداد میں تیار کرنا چاہیئے انھیں تنظیم دینا چاہیئے ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغان کا کام ایسا ہے کہ جس میں ہماری ہمت اور حوصلہ کے لئے بہت بڑا میدان موجود ہے۔ اس میں اگر ہم کامیاب ہوئے تو اپنی بہت سی محرومیوں اور مایوسیوں کی تلافی کر سکیں گے۔

اوپر جو کچھ باتیں عرض کی گئی ہیں ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے حوصلے کو توڑا جائے اور ان میں جو بیداری اور جوش اس وقت پیدا ہوا ہے اسے دبایا یا ٹھنڈا کیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ انھیں بھڑکنے کی جگہ آہستہ آہستہ سلگتے رہنا سکھایا جائے انھیں تنظیم کے ایسے کاموں کو شروع کرنے کے لئے مائل کیا جائے جو دیر تک چلنے والے ہوتے ہیں جن سے قوم میں سچی اور مستقل قوت پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں ہنگامہ پسند کارکنوں کی جگہ خاموش مخلص اور ایثار پسند کارکن زیادہ سے زیادہ تعداد میں تیار کرنا چاہیں۔ انھیں تنظیم دینا چاہیئے مسلمان مردوں اور عورتوں میں اصلاح اور ترقی کا جذبہ پیدا کرنا چاہیئے۔ ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغان کے کام ایسے ہیں کہ جن میں ہماری ہمت اور حوصلہ کے لیے بہت بڑا میدان موجود ہے ان میں اگر ہم کامیاب ہوئے تو اپنی بہت سی محرومیوں اور مایوسیوں کی تلافی کر سکیں گے۔

کانگریس کا مسلمانوں پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ وہ مسلم لیگ سے موجودہ حالت میں سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ میری خدا سے یہ دعا ہے کہ کانگریس مسلم لیگ کے ساتھ ابھی بہت دن تک اور کوئی سمجھوتہ نہ کرے خوب اچھی طرح مسلم لیگ کے خلوص، صداقت، مستقل مزاجی اور اس کے اس دعوے کا کہ وہ مسلمانوں کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔ امتحان کر لے یہ واقعہ اور حقیقت ہے کہ مسلم لیگ نے ابھی تک اپنے آپ کو اس بات کا مستحق ثابت نہیں کیا ہے کہ اسے اور صرف اسے مسلمانوں کی طرف سے کانگریس کے ساتھ گفتگو کرنے کا حق حاصل ہو۔ اسے مسلم

عوام سے رابطہ اور ان کی پرخلوص خدمت کرکے اپنے اس دعوے کو تسلیم کرانا ہوگا۔ میں کانگریس کے کارکنوں کے رویہ کو نہایت معقول اور مناسب سمجھتا ہوں اور مسلم عوام سے براہ راست رابطہ پیدا کرنے کا جو فیصلہ انھوں نے کیا ہے اسے بالکل حق بجانب سمجھتا ہوں۔ مسلم لیگ اگر مسلمانوں کی سچی اور پرخلوص خدمت کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے تو اسے اس بات سے ناراض نہ ہونا چاہیئے بلکہ خدمت اور ایثار کے میدان میں کانگریس کا مقابلہ کرکے یہ دکھانا چاہیئے کہ صحیح معنوں میں مسلمانوں کی حقیقی بہی خواہ وہی ہے اسے مسلمانوں کے درمیان کام کرنے میں کانگریس پر ہر قسم کی فوقیت حاصل ہے۔ اگر اس کے باوجود کانگریس اس پر بازی لے جانے میں کامیاب ہوسکتی ہے تو پھر حقیقتاً کانگریس کو ہی مسلمانوں کی نمائندگی کا حق حاصل ہوگا، لیگ کو نہیں۔ میں کانگریس کے کارکنوں کو ان کے فیصلہ پر صدق دل سے مبارکباد دیتا ہوں اور انھیں خوش آمدید کہتا ہوں اور مسلم لیگ والوں سے میری یہ خواہش ہے کہ اگر ان میں ہمت ہے تو وہ اس چیلنج کو قبول کریں۔ لیکن ان کے سب طریقے خلوص اور خدمت پر مبنی ہونے چاہیئں۔ اشتعال انگیزی، منافرت خیزی، فتنہ پروری اور سازش سے انھیں پرہیز کرنا چاہیئے کیوں کہ ان باتوں سے ممکن ہے وقتی کامیابی ہوجائے لیکن مسلم عوام کو وہ زیادہ دن تک دھوکے میں نہ رکھ سکیں گے صحیح راستہ کٹھن اور دشوار گذار ضرور ہے لیکن کامیابی کا سیدھا راستہ وہی ہے ؎

تو آگ میں جل اور خاک میں مل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر، بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

پاکستان

(مضمون نگار صاحب اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے)

سب سے پہلے میں اس بات کو بتا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میں نہ تو پاکستان کی تحریک کا مبلغ ہوں نہ اس کا دشمن۔ میری حیثیت ایک طالب علم کی ہے جس کے مطالعہ کا موضوع جماعتی مسائل ہیں۔ ہندوستان کے جہاں اور بہت سے مسئلے ہیں مثلاً محکومی کا مسئلہ، غریبی کا مسئلہ، جہالت کا مسئلہ، چھوت اچھوت کا مسئلہ وہاں ایک نہایت اہم مسئلہ اس ملک کی دو مذہبی جماعتوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کا بھی ہے۔ کچھ دنوں سے ایسے لوگ بھی پیدا ہوتے جا رہے ہیں (جن میں غیر مسلم بہت سے ہیں اور مسلمان بہت تھوڑے ہیں) جو سرے سے اس مسئلہ کی اہمیت سے ہی انکار کرنے لگے ہیں لیکن پھر بھی مسلمانوں کی غالب اکثریت اور غیر مسلموں کی ایک خاصی وسیع، ذی اثر اور ذمہ دار تعداد کے لئے یہ مسئلہ ابھی تک بڑی اہمیت رکھتا ہے جس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے بڑے بڑے رہنما، اخبار اور مصنف اس مسئلہ کے تصفیہ کے سلسلہ میں اپنی پوری توجہ اور قیمتی وقت اکثر صرف کرتے رہتے ہیں۔

اس مسئلہ کے حل بہت سے پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً مسلم عوام سے براہ راست رابطہ، مسلم لیگ اور کانگریس سے مفاہمت، برطانیہ کے کمیونل ایوارڈ کو اپنی موجودہ صورت میں قائم رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ مسئلہ کے ان حلوں میں ایک حل اور بھی ہے جسے پاکستان کے تصور یا تحریک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس بات کا اعتراف میں شروع ہی میں کئے لیتا ہوں کہ میرا مطالعہ ابھی بہت سرسری اور نامکمل ہے اس کی بنیاد پر کوئی قطعی نتیجہ اخذ کرنا میں سخت غیر ذمہ دارانہ جسارت سمجھتا ہوں اس لئے اگر میرے بیان سے آپ کو کوئی واضح ہدایت یا رہنمائی نہ ملے تو آپ کو اس سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ بھی میری طرح ایک طالب علم کی حیثیت سے اس تجویز کے مختلف پہلوؤں کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کریں اور میری یہ کوشش ہوگی کہ میں اپنے اس مختصر مضمون میں آپ کے سوچنے اور غور کرنے کے لئے کچھ سوالات پیش کر سکوں

اس سلسلہ میں پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان سے کیا مراد ہے؟ چودھری رحمت علی صاحب ایک بزرگ ہیں جو غالباً کیمبرج میں ایک عرصہ سے مقیم ہیں۔ ان کو پاکستان کی تحریک کا لیڈر بتلایا جاتا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق پاکستان اس خیالی علاقہ کا نام ہے جس میں پنجاب، کشمیر، سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان شامل ہیں۔ اور جس علاقہ کو آج ہم ہندوستان کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ ان کے نزدیک ایسے دو غیر ہم آہنگ اور متضاد عناصر کا مجموعہ ہے جو زیادہ عرصہ تک یکجا نہیں رہ سکتے۔ چودھری رحمت علی صاحب نہیں چاہتے کہ ہندوستان کا لفظ پاکستان پر بھی حاوی ہو۔ بلکہ ان کے خیال میں پاکستان کو علیحدہ کرنے کے بعد جو علاقہ بچے گا اسی کے لئے ہندوستان کی اصطلاح کا استعمال کرنا صحیح اور جائز ہوگا۔

اصل میں پاکستان کے تصور کی ابتدا کا سہرا علامہ اقبال مرحوم کے سر ہے۔ علامہ موصوف نے اپنے صدارتی خطبہ میں جو آل انڈیا مسلم لیگ ۱۹۳۰ء کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں پڑھ کر سنایا گیا تھا مسلمانوں کے سامنے ایک جداگانہ مسلم ہندوستان کا نصب العین پیش کیا تھا۔ اس کے لئے انھوں نے پاکستان کا لفظ تو استعمال نہیں کیا تھا لیکن مفہوم ان کا کم و بیش کچھ اسی قسم کا تھا۔ عام طور پر تو اپنے اس خطبہ میں انھوں نے مسلم کانفرنس کے مطالبات کی حمایت کی تھی۔ اور ایک ایسے فیڈریشن کے قبول کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا تھا جس میں پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کو قائم رکھا جائے اور فاضل اختیارات (Residuary powers) صوبہ کی حکومتوں کے ہاتھ میں رہیں۔ لیکن اسی خطبہ میں ضمنی طور پر "مسلم ہندوستان" کی تجویز کی طرف بھی لوگوں کو متوجہ کیا تھا۔ ان کے اس مجوزہ "مسلم ہندوستان" میں کشمیر شامل نہیں تھا اور جن علاقوں کو شامل کیا گیا تھا ان میں بھی یکسانیت کے اصول کو حکم بنا کر رد و بدل کی جا سکتی تھی۔

لیکن چودھری رحمت علی صاحب کی تجویز میں زیادہ صفائی اور قطعیت پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اس تجویز کو تحریک کا جامہ پہنایا اور اس کے نصب العین کو مبہم رکھنا مصلحت کے خلاف سمجھا۔

بہرحال یہ تو پاکستان کے تخیل کی ابتدا اور اصل کا بیان ہوا۔ اب دوسرا سوال یہ ہے کہ اس تجویز کی تائید میں دلیلیں کیا کیا پیش کی جاتی ہیں؟ چونکہ یہ تحریک کیمبرج یونیورسٹی سے نکلی ہے۔ اس لئے اس کی تائید میں علمی یا کم سے کم علمی نما دلیلوں کی کمی نہیں ہے۔ جیالوجی، انتھراپالوجی، ایتھنالوجی، زبانوں کے علم، مذہبوں کے علم، تاریخ، فلسفہ، اعداد

وشمار، اجتماعیات، سیاسیات معاشیات۔ اخلاقیات غرضکہ تمام علوم کی خدمات مستعار لے کر اس تحریک کے جواز میں دلیلیں پیش کی جارہی ہیں پھر تعلیم یافتہ نوجوانوں کے علاوہ عام مسلمانوں میں اس تحریک کو مقبول اور قابل فہم بنانے کے لئے روزمرہ کے مشاہدوں، تجربوں، تعصبوں، شکایتوں اور بے اطمینانیوں کو بھی پوری طرح نمایاں اور بیدار کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ یہ کام ابھی تک بڑے پیمانہ پر اور منظم طریقہ پر شروع نہیں ہوا ہے لیکن اس نے بہرحال لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کردیا ہے۔

کچھ دن ہوئے اخبار زمیندار لاہور کے بنگال نمبر میں ایک بزرگ چودھری وہاب الدین صاحب نے جیالوجی اور تاریخ کے واقعات کو سامنے رکھ کر پاکستان کے سوال پر بحث کی تھی اور اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ پاکستان ہندوستان سے الگ ایک مستقل وجود رکھتا ہے۔ میں ان کی تحقیقات کی صحت کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ موجودہ زمانے میں ذرایع آمدورفت اور وسائل خبررسانی کی ترقی کے بعد ملکوں کی طبعی تقسیموں اور طبقات الارض کی تفریقوں کی اہمیت بہت کم ہوگئی ہے۔ اب جن باتوں کو دیکھا جاتا ہے وہ یہ ہوتی ہیں کہ آیا پختہ سڑکیں ریلیں، ڈاک خانے، تار گھر ٹیلیفون بندرگاہیں، ہوائی مستقر اتنی تعداد میں موجود ہیں جن سے ایک ملک کے دو علاقوں کے جغرافیائی فاصلہ کا کم کرنا ممکن ہے یا یہ صورت نہیں ہے۔ اگر ہے تو جغرافیہ اور طبقات الارض کی ساخت کے فرق کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں کلکتہ سے پشاور تک اور بمبئی سے دہلی لاہور پشاور، کوئٹہ اور کراچی تک آمدورفت کی جن سہولتوں کو ترقی حاصل ہوچکی ہے اس کے بعد یہ کہنا کہ یہ علاقے ایک دوسرے سے قدرتی طور پر جدا ہیں صحیح نہیں ہے۔ قدرت نے ممکن ہے ان دونوں علاقوں کو الگ الگ پیدا کیا ہو لیکن انسان نے اس قدرتی خلیج کو ہموار کردیا ہے۔ اس لئے جیالوجی کی اس دلیل کو تو میرے خیال میں بحث سے خارج ہی کردیا جائے تو مناسب ہے۔

اسی طرح نسل کے اختلاف کی دلیل کو بھی اس بحث میں لانا مناسب نہیں ہے کیونکہ جہاں تک میری واقفیت ہے خالص نسل رکھنے والے لوگوں کا وجود دنیا میں کہیں نہیں ملتا۔

اب رہے دوسرے تمام اختلاف ان میں میری رائے میں مذہب کے اختلاف کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ ہمارے ملک ہندوستان میں اسی کے فرق کی وجہ سے دوسرے تمام اختلافات یعنی زبان،

تاریخ، تمدن، معاشرت، فلسفہ ادب، سیاست وغیرہ کے اختلافات پیدا ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا مذہب کے اختلاف کو پاکستان کی تحریک کے جواز میں ایک مضبوط دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب کے سلسلہ میں ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے کچھ اعداد و شمار آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

پاکستان کے جو نقشے میری نظر سے گذرے ہیں ان میں چونکہ دہلی کے صوبہ کو بھی پاکستان میں شامل کیا گیا ہے۔ اس لئے میں نے صوبہ دہلی کی آبادی کے اعداد کو بھی پاکستان کے اعداد میں شامل کر لیا ہے۔ ان اعداد کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کے صوبہ کی مجموعی آبادی ۴ کروڑ ہے جس میں سے ڈھائی کروڑ کی آبادی مسلمانوں کی ہے اور ڈیڑھ کروڑ ہندوؤں کی۔ مسلمانوں میں میں نے عیسائیوں، یہودیوں، زرتشتیوں، پاکستان کے قبائلی مذہبوں اور متفرق چھوٹے چھوٹے اور لامعلوم مذہبوں کو بھی شامل کر لیا ہے کیونکہ میرا خیال تھا کہ ان کا کوئی خاص تعلق ہندوؤں سے نہیں ہے اور یہ پاکستان کے مسلمانوں کے ساتھ رہنا شاید زیادہ پسند کریں گے۔ لیکن اگر انہیں نہ بھی شامل کیا جائے تو مسلمانوں کی اوپر لکھی ہوئی تعداد میں صرف نو دس لاکھ کا فرق کرنا پڑے گا جس سے ہماری دلیل پر کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا۔ ہندوؤں کی مجموعی آبادی پاکستان میں ڈیڑھ کروڑ ہے اور اس تعداد میں سکھ جین اور بدھ بھی شامل ہیں۔ سکھوں کی تعداد بجائے خود ۴۲ لاکھ کے قریب ہے۔ اس حساب سے مسلمانوں کی آبادی کا تناسب مجوزہ پاکستان میں ۶۲ فی صدی کے قریب ہوگا اور ہندوؤں کا ۳۸ فی صدی اس سے یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ جہاں تک ایک صوبہ میں مسلمانوں کی ایک خاص بڑی اکثریت کے حاصل کرنے کا سوال ہے وہ تو اس انتظام سے حاصل ہو جائے گی۔ لیکن اب اس کے بعد بہت سے اور سوال کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ ہم یہ اکثریت کیوں حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ کیا اس لئے کہ ہم اپنی اس مذہبی اکثریت کے وسیلہ سے جمہوری طرز حکومت میں مخصوص طور پر مسلمانوں کے فائدہ اور اسلامی شریعت کے مطابق قوانین پاس کرانا چاہتے ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی قوانین اور مسلمانوں کے فائدہ سے ہمارا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی حکومت کو مذہبی حکومت اور مسلمانوں کے طبقہ کو امتیازی مراعات اور حقوق رکھنے والا طبقہ بنانا چاہتے ہیں۔ کیا ہماری ریاست میں غیر مسلموں کو مسلمانوں کے برابر حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔ کیا سول اور فوجی ملازمتوں

میں ان کو بھرتی نہیں کیا جائے گا؟ اگر کیا جائے گا تو کیا اسلامی مقاصد کے پورا کرنے میں غیر مسلم عہدہ داروں اور سپاہیوں پر بھروسہ کیا جا سکے گا۔ اگر بھروسہ نہ کیا گیا تو کیا فوجی خدمت انجام نہ دے سکنے کے معاوضہ میں ان سے کوئی خاص ٹیکس جزیہ کی قسم کا لیا جائے گا۔ اب اگر فرض کیجئے کہ ہم خالص اسلامی حکومت مذہب اسلام کے اعلیٰ اصولوں کے مطابق قائم کرنا چاہتے ہیں تو پھر سوال یہ ہے کہ کیا غیر مسلم آبادی مسلمانوں کی مذہبی آزادی اور اپنی مذہبی غلامی کو خوشی سے گوارا کرے گی۔ کیا ایسی صورت میں وہ پاکستان میں شامل ہونے کے لئے آمادگی کا اظہار کرے گی اور اگر وہ آمادہ نہیں ہوئی تو پھر کیا انہیں زبردستی پاکستان میں شامل کیا جائے گا یا انہیں پاکستان سے نکال باہر کیا جائے گا۔ چار کروڑ کی مجموعی آبادی سے ڈیڑھ کروڑ کی آبادی کو نکالنا کیا کوئی آسان کام ہے۔ کس قسم کا دباؤ ڈال کر ان سے اپنے مطالبات منوائے جائیں گے۔ جب تک برطانوی حکومت کو ہماری سیاست میں اقتدار حاصل ہے کیا یہ ممکن ہو سکے گا کہ برطانیہ کی اخلاقی ہمدردی اپنے لئے حاصل کر لی جائے۔ کیا لیگ آف نیشنس اور ایشیا کے اسلامی ممالک کی اخلاقی ہمدردی کا دباؤ ڈالا جائے گا۔ بہرحال یہ سوال سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے لائق ہیں۔ کیونکہ اگر مسلمانوں کی آزادی کے معنی یہ ہوئے کہ غیر مسلموں کی آبادی ختم ہو جائے تو اس سے موجودہ معیار اخلاق کے مطابق انسانیت اور انصاف کا خون ہوگا؟ اگر اس کے باوجود ہم کو برطانیہ جمعیت اقوام اور اسلامی ممالک کی ہمدردی حاصل ہو بھی گئی تو یقیناً ہندوستان کے ۲۴ یا ۲۵ کروڑ ہندو تو اپنے ہم مذہبوں کی قربانی کو اطمینان قلب کے ساتھ نہ دیکھ سکیں گے اور وہ یا تو براہ راست اپنے ہم مذہبوں کی اخلاقی، مالی اور مادی مدد کریں گے یا ان کے حق میں اس سے بھی زیادہ سخت قسم کی مداخلت کے لئے آمادہ ہوں گے یا اس کا بدلہ دوسری طرح لیں گے یعنی ان ڈھائی کروڑ مسلمانوں پر جو پنجاب یا بنگال میں نہیں ہیں اور جو ان کی اکثریت کے صوبوں میں محکومانہ زندگی بسر کر رہے ہوں گے ظلم کرنا شروع کریں گے اور انہیں ہندو راج کا پوری طرح مزہ چکھائیں گے۔

اس سے اگر قطع نظر بھی کر لی جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ ہماری اسلامی حکومت غیر مسلموں کے ساتھ بہت حسن سلوک کے ساتھ پیش آئے گی۔ انہیں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ سب حقوق دے گی اور ہم آہنگی اور رواداری کے ساتھ زندگی بسر کرے گی تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہمارا مقصد مشترکہ

فائدہ ہے تو اس کے لئے خاص طور پر مسلمانوں کی اکثریت قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک ایسی جماعت کیوں نہ بنائی جائے جو مشترکہ فائدہ کے کاموں کو مل جل کر انجام دے پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے پاکستان کی اسکیم بناتے وقت شریک ہونے والے صوبوں کے تمام مسلمانوں کے جذبات اور مفاد کو بھی ہم نے اپنی نظر کے سامنے رکھا ہے یا نہیں پنجاب کی فرقہ وارانہ فضا میں تو بلاشبہ مسلمانوں میں پاکستان کے جذبہ کو پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن مجھے شبہ ہے کہ سرحدی صوبہ کے مسلمان خاص طور پر اور کشمیر سندھ اور بلوچستان کے مسلمان عام طور پر پنجاب کے ساتھ شریک ہونا پسند کریں گے۔

فرض کیجئے کہ سب کام منصوبہ کے مطابق ہو گیا اور کسی معجزہ کے ذریعہ پاکستان کی ریاست وجود میں آگئی اور یہاں مسلمانوں کے حسب منشار حکومت بھی قائم ہو گئی لیکن اس سے تو ۹ کروڑ مسلمانوں میں صرف ۲ یا ۳ کروڑ مسلمانوں کا مسئلہ حل ہوگا۔ بقیہ ۵ یا ۶ کروڑ مسلمانوں کا مسئلہ کس طرح حل کیا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں سے پونے تین کروڑ مسلمان بنگال میں ہیں اور بنگال میں ان کی تقسیم اس طرح پر ہے کہ اگر وہ جنوب مغربی بنگال کے چند اضلاع کو بنگال سے خارج کر دیں تو ان کی اکثریت بھی پاکستان جیسی بنائی جا سکتی ہے لیکن وہاں بھی ہندوؤں کی اسی مخالفت کا سامنا کرنا ہوگا جس کے اندیشہ کا اظہار پنجاب کے سلسلہ میں کیا جا چکا ہے۔ یہاں بھی ایک طویل خانہ جنگی کے شروع ہونے کا خطرہ ہے۔ جس میں بہت سی قیمتی جانوں اور مال کا نقصان برداشت کرنا پڑے گا لیکن میں ایسی صورت حال کا تصور کر سکتا ہوں جب اس کے علاوہ کوئی چارہ کار ہی باقی نہ رہے۔ اور بنگال کے مسلمانوں کو مجبوراً یہ تمام طریقے اختیار کرنا پڑیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کامیاب ہونے کے بعد مسلمان طاقت کے نشہ میں مست نہ ہوں بلکہ انصاف اور رواداری کا سلوک ہندوؤں کے ساتھ کر سکیں۔ لیکن ہمیں بہت احتیاط کے ساتھ قدم اٹھانے کی ضرورت ہے کیونکہ دنیا میں غیر ضروری فتنہ دشر سے زیادہ سنگین کوئی دوسرا جرم نہیں ہے۔ ہمیں امن کے تمام وسائل اور ذرائع کا پورے طور پر پہلے جائزہ لینا چاہیئے اور جب تک ہم کو اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ صلح کا کوئی دروازہ ہمارے لئے کھلا ہوا نہیں ہے ہمیں لڑائی اور جنگ کی طرف ہرگز قدم نہ اٹھانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اپنی طاقت کا بھی ہمیں صحیح اندازہ اور احساس ہونا چاہیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں ہم اپنے حریف کو کمزور سمجھ کر نقصان پہنچانے کا حوصلہ کریں اور اس کو نقصان پہنچانے کی جگہ الٹا خود اپنا نقصان کریں۔

بہرحال اگر ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھنے کے بعد ہم نے بنگال اور پاکستان کے مسلمانوں کے مسئلہ کا

کوئی حل نکال بھی لیا تو بھی تقریباً ۲ ½ کروڑ مسلمانوں کے تحفظ کا مسئلہ باقی رہے گا۔ یہ مسلمان وہ ہیں جو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں جن کے پاس زمینداریاں بھی ہیں، جن کے پاس سرمایہ بھی ہے، جن کے ذاتی گھر اور جائدادیں بھی ہیں۔ جن کے ذاتی کاروبار بھی ہیں جن کی مسجدیں ہیں جن کی مذہبی درسگاہیں ہیں۔ اور ان میں یو.پی کا صوبہ خصوصاً ایسا صوبہ ہے جو اسلامی تمدن و تہذیب کا گہوارہ رہ چکا ہے۔ جہاں مسلم یونیورسٹی ہے۔ جہاں ندوہ کا مدرسہ ہے۔ دیوبند اور سہارن پور کے مدرسے ہیں۔ تاج محل ہے اردو کے بولنے والے ہیں اور ہزاروں دوسری اسلامی یادگاریں ہیں۔ اسی طرح مسجدوں، اسلامی مدرسوں اور اسلامی یادگاروں سے اور مسلمانوں کے قبرستانوں سے ہندوستان کا کونہ کونہ آباد ہے۔ کیا ہم ان ڈھائی کروڑ مسلمانوں کو بالکل ان کے حال پر چھوڑ دیں گے۔ کیا ہم اسلام کی مجموعی جمعیت اور قوت بڑھانے کے لئے ایک مجموعی محاذ قائم نہیں رکھیں گے؟ کیا ہم ان سے کہیں گے کہ وہ ہجرت کر کے پاکستان یا بنگال میں جا بسیں۔ لیکن اس سے جو پیچیدہ معاشی مسائل پیدا ہوں گے اور آبادی کا دباؤ زمین پر پڑے گا اس کے لئے ہم کیا کریں گے۔

ان سوالوں کے علاوہ چند اور عملی اور مادی مشکلات بھی ہیں جن کو ہمیں نظرانداز نہ کرنا چاہیئے۔ سرحدی صوبہ، بلوچستان اور سندھ اپنے موجودہ ذرائع دولت کے ذریعہ اپنی حکومت کا خرچ خود پورا نہیں کر سکتے۔ سندھ کے متعلق تو خیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیس پچیس سال میں شاید وہ اپنی حکومت کے خرچ کو چلانے کے قابل ہو جائے گا لیکن سرحدی صوبہ اور بلوچستان کے لئے ایسا کہنا مشکل ہے۔ سرحدی صوبہ اور بلوچستان کے لوگوں کی معاشی زندگی کو مرکزی حکومت کے خرچ سے بہت کچھ تقویت پہنچتی ہے۔ اسی طرح پنجاب کے جو لوگ ہندوستان کی فوج میں اس وقت ملازم ہیں انھیں ہندوستان کی دولت کا ایک خاصا بڑا حصہ مل جاتا ہے۔ کیا جب پاکستان کی ریاست ہندوستان کی ریاست سے الگ ہو کر اپنی زندگی شروع کرے گی وہ اپنے اس مالی نقصان کو محسوس نہیں کرے گی پنجاب کے ہزاروں ٹھیکیدار، تاجر، بڑھئی لاری والے اور دوسرے کام کرنے والے لوگ ایسے ہیں جو پنجاب سے ہندوستان آتے ہیں اور یہاں سے دولت کما کر پنجاب کی دولت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اب تو سب لوگ ایک ہی ریاست کے افراد ہیں لیکن اگر پاکستان اور ہندوستان دو علیحدہ علیحدہ ریاستیں ہو گئیں تو کیا اس صورت میں ہندوستان غیر ملکوں کے آزادانہ داخلہ کو اپنے ملک میں روا رکھے گا۔ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے

وسائل دولت ابھی غیر ترقی یافتہ حالت میں ہیں جب ان کو ترقی دی جائے گی تو پاکستان کی دولت میں اتنا اضافہ ہو جائے گا کہ وہ پاکستان کو خوش حال اور فارغ البال بنانے کے لئے کافی ہو گا لیکن محض قدرتی وسائل ہونا تو صنعتی ترقی کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ قدرتی وسائل تو افغانستان میں بھی بہت اچھے ہیں لیکن قدرتی وسائل کے ساتھ سرمایہ تنظیم اور ماہر مزدوروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا پاکستان کے رہنے والے ہندوستان کے ان صوبوں کے ماہروں اور سرمایہ داروں سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے جنھیں صنعتی کاروبار میں نصف صدی سے زیادہ کا تجربہ ہے؟

لیکن ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے حامی اپنی تمدنی اور مذہبی ترقی اور آزادی کو ان تمام مادی فایدوں سے زیادہ اہم سمجھتے ہوں۔ اس صورت میں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذہبی ترقی کے لئے میدان پورے ہندوستان میں شامل رہنے کی صورت میں زیادہ ہے یا علیحدہ ہو جانے کی صورت میں۔ اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے مذہب کا پیغام ہندوستان کے ایک ایک فرد تک پہنچے تو آپ کو ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہیئے۔ ان کے دکھ سکھ میں شریک ہونا چاہیئے۔ انھیں اپنے مذہب کی اعلیٰ تعلیمات کا نمونہ اپنی زندگی میں ظاہر کر کے دکھانا چاہیئے۔ اس کا موقع ہندوستان میں شامل رہنے کی صورت میں زیادہ ہے یا ہندوستان سے الگ ہو جانے کی صورت میں۔

پھر ہمیں موجودہ زندگی کے تلخ حقایق اور واقعات کو بھی نگاہ کے سامنے سے نہ ہٹانا چاہیئے کشمیر پر مہاراجہ کشمیر کا قبضہ ہے پٹیالہ پر مہاراجہ پٹیالہ کا راج ہے اسی طرح پنجاب کی اور ریاستوں پر راجاؤں کا قبضہ ہے۔ سکھوں کا برطانوی فوج میں بہت عمل دخل ہے۔ ہندوؤں کا پاکستان کے سرمایہ پر قبضہ ہے۔ یہ لوگ نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ اور دنیا سے واقف ہیں۔ پروپیگنڈا کی مشین پر بھی ان کا قبضہ ہے۔ خیر ان سب کو بھی اپنے سے کمزور سمجھ لیجئے لیکن برطانوی شہنشاہیت کو کیا کیجئے گا۔ اگر اس کو آپ کا یہ انتظام پسند نہ آیا یا ایسی شرائط پر اس نے اسے منظور کیا جو آپ کے لئے ہندوؤں کی غلامی سے بھی بدتر ثابت ہوئیں تو پھر شیخ چلی کے یہ تمام منصوبے خاک میں مل جائیں گے اپنے اس مطالبہ کو منوانے کے لئے آپ کے پاس کون سی طاقت ہے۔ کیا آپ چوکھی جنگ لڑ سکتے ہیں۔ ہندوستانی ریاستوں سے بھی۔ ہندوؤں سے بھی سکھوں سے بھی سرکار پرست مسلمانوں سے بھی اور خود سرکار برطانیہ

کوئی حل نکال بھی لیا تو بھی تقریباً ۲½ کروڑ مسلمانوں کے تحفظ کا مسئلہ باقی رہے گا۔ یہ مسلمان وہ ہیں جو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جن کے پاس زمینداریاں بھی ہیں، جن کے پاس سرمایہ بھی ہے، جن کے ذاتی گھر اور جائدادیں بھی ہیں۔ جن کے ذاتی کاروبار بھی ہیں، جن کی مسجدیں ہیں، جن کی مذہبی درسگاہیں ہیں۔ اور ان میں یو۔پی کا صوبہ خصوصاً ایسا صوبہ ہے جو اسلامی تمدن و تہذیب کا گہوارہ رہ چکا ہے۔ جہاں مسلم یونیورسٹی ہے۔ جہاں ندوہ کا مدرسہ ہے۔ دیوبند اور سہارنپور کے مدرسے ہیں۔ تاج محل ہے اردو کے بولنے والے ہیں اور ہزاروں دوسری اسلامی یادگاریں ہیں۔ اسی طرح مسجدوں، اسلامی مدرسوں اور اسلامی یادگاروں سے اور مسلمانوں کے قبرستانوں سے ہندوستان کا کونہ کونہ آباد ہے۔ کیا ہم ان ڈھائی کروڑ مسلمانوں کو بالکل ان کے حال پر چھوڑ دیں گے۔ کیا ہم اسلام کی مجموعی جمعیت اور قوت بڑھانے کے لئے ایک مجموعی محاذ قائم نہیں رکھیں گے؟ کیا ہم ان سے کہیں گے کہ وہ ہجرت کرکے پاکستان یا بنگال میں جا بسیں۔ لیکن اس سے جو پیچیدہ معاشی مسائل پیدا ہوں گے اور آبادی کا دباؤ زمین پر پڑے گا اس کے لئے ہم کیا کریں گے۔

ان سوالوں کے علاوہ چند اور عملی اور مادی مشکلات بھی ہیں جن کو ہمیں نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ سرحدی صوبہ، بلوچستان اور سندھ اپنے موجودہ ذرائع دولت کے ذریعہ اپنی حکومت کا خرچ خود پورا نہیں کر سکتے۔ سندھ کے متعلق تو خیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیس پچیس سال میں شاید وہ اپنی حکومت کے خرچ کو چلانے کے قابل ہو جائے گا لیکن سرحدی صوبہ اور بلوچستان کے لئے ایسا کہنا مشکل ہے۔ سرحدی صوبہ اور بلوچستان کے لوگوں کی معاشی زندگی کو مرکزی حکومت کے خرچ سے بہت کچھ تقویت پہنچتی ہے۔ اسی طرح پنجاب کے جو لوگ ہندوستان کی فوج میں اس وقت ملازم ہیں انہیں ہندوستان کی دولت کا ایک خاصا بڑا حصہ مل جاتا ہے۔ کیا جب پاکستان کی ریاست ہندوستان کی ریاست سے الگ ہو کر اپنی زندگی شروع کرے گی وہ اپنے اس مالی نقصان کو محسوس نہیں کریگی پنجاب کے ہزاروں ٹھیکیدار، تاجر، بڑھئی لاری والے اور دوسرے کام کرنے والے لوگ ایسے ہیں جو پنجاب سے ہندوستان آتے ہیں اور یہاں سے دولت کما کر پنجاب کی دولت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اب تو سب لوگ ایک ہی ریاست کے افراد ہیں لیکن اگر پاکستان اور ہندوستان دو علیحدہ علیحدہ ریاستیں ہو گئیں تو کیا اس صورت میں ہندوستان غیر ملکیوں کے آزادانہ داخلہ کو اپنے ملک میں روا رکھے گا۔ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے

وسائل دولت ابھی غیر ترقی یافتہ حالت میں ہیں جب ان کو ترقی دی جائے گی تو پاکستان کی دولت میں اتنا اضافہ ہو جائے گا کہ وہ پاکستان کو خوش حال اور فارغ البال بنانے کے لئے کافی ہوگا لیکن محض قدرتی وسائل ہونا تو صنعتی ترقی کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ قدرتی وسائل تو افغانستان میں بھی بہت اچھے ہیں لیکن قدرتی وسائل کے ساتھ سرمایہ تنظیم اور ماہر مزدوروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا پاکستان کے رہنے والے ہندوستان کے ان صوبوں کے ماہروں اور سرمایہ داروں سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے جنھیں صنعتی کاروبار میں نصف صدی سے زیادہ کا تجربہ ہے؟

لیکن ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے حامی اپنی تمدنی اور مذہبی ترقی اور آزادی کو ان تمام مادی فایدوں سے زیادہ اہم سمجھتے ہوں۔ اس صورت میں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذہبی ترقی کے لئے میدان پورے ہندوستان میں شامل رہنے کی صورت میں زیادہ ہے یا علیحدہ ہو جانے کی صورت میں۔ اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے مذہب کا پیغام ہندوستان کے ایک ایک فرد تک پہنچے تو آپ کو ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہیئے۔ ان کے دکھ سکھ میں شریک ہونا چاہیئے۔ انھیں اپنے مذہب کی اعلیٰ تعلیمات کا نمونہ اپنی زندگی میں ظاہر کر کے دکھانا چاہیئے۔ اس کا موقع ہندوستان میں شامل رہنے کی صورت میں زیادہ ہے یا ہندوستان سے الگ ہو جانے کی صورت میں۔

پھر ہمیں موجودہ زندگی کے تلخ حقایق اور واقعات کو بھی نگاہ کے سامنے سے نہ ہٹانا چاہیے کشمیر پر مہاراجہ کشمیر کا قبضہ ہے پٹیالہ پر مہاراجہ پٹیالہ کا راج ہے اسی طرح پنجاب کی اور ریاستوں پر راجاؤں کا قبضہ ہے۔ سکھوں کا برطانوی فوج میں بہت عمل دخل ہے۔ ہندوؤں کا پاکستان کے سرمایہ پر قبضہ ہے۔ یہ لوگ نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ اور دنیا سے واقف ہیں۔ پروپیگنڈا کی مشین پر بھی ان کا قبضہ ہے۔ خیر ان سب کو بھی اپنے سے کمزور سمجھ لیجئے لیکن برطانوی شہنشاہیت کو کیا کیجئے گا۔ اگر اس کو آپ کا یہ انتظام پسند نہ آیا یا ایسی شرائط پر اس نے اسے منظور کیا جو آپ کے لئے ہندوؤں کی غلامی سے بھی بدتر ثابت ہوئیں تو پھر شیخ چلی کے یہ تمام منصوبے خاک میں مل جائیں گے اپنے اس مطالبہ کو منوانے کے لئے آپ کے پاس کون سے طاقت ہے۔ کیا آپ چوکھی جنگ لڑ سکتے ہیں۔ ہندوستانی ریاستوں سے بھی۔ ہندوؤں سے بھی سکھوں سے بھی سرکار پرست مسلمانوں سے بھی اور خود سرکار برطانیہ

سے بھی۔ اگر آپ میں ہمت ہے تو میں آپ کو مبارک باد دوں گا اور مرحبا کہوں گا لیکن پھر بھی میرا آپ کو مشورہ یہی ہوگا کہ ملک کی تعمیری کاموں میں اس ہمت اور طاقت کو صرف کیجئے۔ بھائی کے ہاتھ سے بھائی کا خون، اور اس کی خرابی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ اپنے ان تعمیری کاموں سے آپ پنجاب کشمیر سرحدی صوبہ بلوچستان اور سندھ ہی کو نہیں سارے ہندوستان کو پاکستان بنالیں گے۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو میں یہی کہوں گا کہ اگر آسمان تک اڑنے کی طاقت نہیں ہے تو جہاں تک آپ کی رسائی ہوسکے وہاں تک اڑ سکے۔

غرضکہ ان تمام مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر میں پاکستان کی تحریک کو ایک مایوسی کے علاج سے تعبیر کرتا ہوں اگر سمجھوتہ اور مفاہمت کی کوئی صورت باقی نہ رہے تب تو مجبوراً مسلمان اس کو اختیار کرسکتے ہیں اور اس کے لئے جتنی بھی قربانیاں کرنا پڑیں ان کو انھیں گوارا کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر سمجھوتہ کی ذرا سی بھی امید انھیں کہیں نظر آئے تو انھیں امن اور محبت کی راہ کو چھوڑ کر فتنہ و فساد کی راہ کو اختیار نہ کرنا چاہیئے۔ میں ذاتی طور پر سمجھوتہ سے مایوس نہیں ہوں۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ موجودہ خراب فضا کو دیکھ کر بالکل مایوس ہوگئے ہوں ان کو بھی میرا مشورہ یہی ہوگا کہ پاکستان کی پرخطر راہ کو اختیار کرنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر وہ اپنا اطمینان کرلیں کہ آیا واقعی صلح اور امن کے تمام راستے بند ہوگئے ہیں۔ خصوصاً مسلم نوجوانوں کو میرا مشورہ یہی ہوگا کہ وہ اپنی زبان سے جلد بازی میں کوئی ایسی بات نہ نکالیں جس سے ہندوستان کی موجودہ خراب فضا میں اور زیادہ تکدّر اور ناگواری پیدا ہو۔ ہمیں جیکوسلوویکیہ کی حالت سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے اور اقلیتوں کو چاہے ان کا تعلق مسلمانوں سے ہو چاہے ہندوؤں اور سکھوں سے حقیر اور بے ضرر نہ سمجھنا چاہیئے۔ ہر قوم پر مشکل اور مصیبت کے وقت آتے رہتے ہیں۔ خصوصاً ہندوستان کے لئے جس نے ابھی اپنی آزادی کی ابتدائی منزلیں بھی طے نہیں کی ہیں اس قسم کی مشکلوں کے بہت سے وقت آئیں گے اور اقلیتوں کو خوش رکھنے کی پالیسی طویل مدت کے مصالح کو اگر سامنے رکھا جائے آخر میں سب کے لئے زیادہ نفع بخش ثابت ہوگی۔ ہندوستان میں ہندو مسلمان ایک عرصہ سے بھائیوں کی طرح رہ رہے ہیں۔ بھائیوں میں اب نفاق نہ پیدا ہونا چاہیئے اور ایک بھائی کو دوسرے بھائی کو مجبور نہ کرنا چاہیئے کہ وہ روٹھ کر اپنا گھر الگ بسانے کی فکر کرے۔

بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کا مسئلہ

(از جناب طفیل احمد صاحب متعلم جامعہ)

ہندوستان میں غیر مسلموں کی تعداد بحیثیت مجموعی اکثریت میں ہے اور مسلمانوں کی تعداد اقلیت میں لیکن اگر ہندوستان کی صوبائی تقسیم کو فرداً فرداً دیکھا جائے تو ہم کو بعض صوبے ایسے بھی ملیں گے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ جیسے صوبہ بنگال۔ پنجاب۔ سرحد اور سندھ اس وقت میں آپ حضرات کے سامنے صرف صوبہ بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کا کچھ حال بیان کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں پر مسلمانوں کی اکثریت تو ضرور ہے لیکن بہت ہی معمولی۔

ان دو صوبوں میں مسلمانوں کی تھوڑی سی اکثریت نے نہ صرف بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کو بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو کشمکش و پیچ میں ڈال رکھا ہے۔

اس مسئلہ کے پہلو تو بہت سے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً معاشی پہلو۔ مذہبی پہلو وغیرہ۔ لیکن یہاں جس پہلو سے میں خاص طور پر بحث کرونگا وہ ان صوبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کا اور ان کی نشستوں کا سوال ہے۔ کیونکہ یہی وہ چیز ہے جس کے ذریعہ سے اور تمام مسائل کا بھی حل ہو سکے گا۔

قبل اس کے کہ میں آپ کے سامنے ان کی نمائندگی یا نشستوں کا ذکر کروں وہاں کی آبادی آپ کے سامنے ہونی ضروری ہے تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

بنگال | بنگال میں برطانوی علاقہ کی آبادی چار کروڑ چھیاسٹھ لاکھ پچانوے ہزار پانسو چھتیس ہے جس کی فرقہ وارانہ تفصیل یہ ہے۔

(۱)	مسلمان	۲,۵۲,۱۰,۸۰۲	۵۴ فی صدی
(۲)	ہندو	۲,۰۲,۰۳,۵۲۷	۴۳ر۳ "
(۳)	دیگر	۱۲,۸۱,۳۰۷	۲ر۷ "

دیگر میں عیسائی اور دیگر قبائلی لوگ شامل ہیں۔

بنگال میں مسلمانوں کو تمام آبادی کے مقابلہ میں ۴ فی صدی کی چھوٹی سی اکثریت حاصل ہے لیکن یہ اکثریت تمام صوبہ میں برابر برابر تقسیم نہیں ہے۔ بلکہ کہیں کہیں ہندوؤں کی بھی اکثریت ہے۔

بنگال میں کل ۲۸ اضلاع ہیں جن میں سے مشرقی بنگال کے ۱۴ اضلاع ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کا غلبہ ہے۔ اور چار اضلاع ایسے ہیں جہاں کسی فرقہ کو خاص طور پر اقتدار نہیں ہے۔ لیکن ان میں سے ۳ اضلاع میں مسلمان سب سے بڑی واحد جماعت میں ہیں اور باقی دس اضلاع ایسے ہیں جن میں غیر مسلموں کا غلبہ ہے۔ اور یہ بیشتر مغربی بنگال میں پائے جاتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو نقشہ بنگال)

پنجاب پنجاب کی آبادی کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

کل آبادی	۲,۰۶,۸۵:۲۴	
مسلمان	۱,۱۴,۵۴,۳۲۱	۵۵:۳ فیصدی
ہندو	۶۵,۷۹,۲۶۰	۳۱:۸ "
سکھ	۲۲,۹۴,۲۰۷	۱۱:۱ "
دیگر (خصوصاً عیسائی)	۳,۷۶,۲۳۶	۱:۸ "

یہاں مسلمانوں کو تمام آبادی کے مقابلہ میں ۵ فی صدی اور کچھ کی چھوٹی سی اکثریت حاصل ہے لیکن یہ اکثریت بنگال کی طرح تمام صوبہ میں برابر برابر منقسم نہیں ہے۔ بلکہ کہیں کہیں ہندوؤں کی بھی اکثریت ہے۔

پنجاب میں کل ۲۹ اضلاع ہیں ان میں ۱۵ اضلاع ایسے ہیں جن میں مسلمانوں کا غلبہ ہے۔ اور دو اضلاع ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہے۔ تین اضلاع ایسے ہیں جن میں کسی فرقہ کو خاص طور پر اقتدار نہیں ہے۔ لیکن مسلمان سب سے بڑی واحد جماعت ہے۔ بقیہ صرف ۹ اضلاع ہیں جو سب پنجاب کے مشرق اور جنوب مشرق میں پائے جاتے ہیں" جہاں ہندوؤں کا غلبہ ہے (ملاحظہ ہو نقشہ پنجاب)

بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی کی اس تقسیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر وہ شرائط موجود رہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔ تو ان دونوں صوبوں میں اپنی اکثریت کو قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں کو نہ تو جداگانہ حلقۂ انتخاب کی ضرورت ہے اور نہ نشستوں کے تحفظ کی۔ یہی نہیں بلکہ ان دونوں کا اختیار کرنا مسلمانوں کے لئے سم اعظم حضرت رساں

ہے۔ کیونکہ جداگانہ انتخاب اور نشستوں کے محفوظ ہونے کی صورت میں وہ صرف مقررہ نشستوں پر قبضہ کر سکتے ہیں، حالانکہ مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب اور عدم تعین نشست کی صورت میں یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستوں پر قبضہ کرلیں۔ چنانچہ نہرو کمیٹی رپورٹ میں قابل وثوق اعداد وشمار پیش کرکے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ مسلمان پنجاب میں ۷۰ فی صدی تک اور بنگال میں ۵۹ فی صدی تک نشستوں پر قبضہ کر سکتے ہیں۔

پھر اگر حقیقت یہ ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان کیوں ان تحفظات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور کیوں اپنی اکثریت کو جو زیادہ ہو سکتی ہے معرض خطر میں ڈال کر کم رکھنے پر مصر ہیں۔ اس سوال کا جواب دینے کے لئے ان شرطوں کے سمجھنے کی ضرورت ہے جن کی موجودگی میں یہ صورت ممکن ہو سکتی ہے۔ وہ شرائط حسب ذیل ہیں۔

(۱) پہلی شرط تو یہ ہے کہ علاقہ وار نمائندگی ہو۔ اور ہر بالغ مرد وعورت کو حق رائے دہندگی حاصل ہو اور جائداد اور تعلیم پر ووٹ کے حق کو منحصر نہ کیا جائے۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کی بالغ آبادی کا تناسب دوسرے فرقوں کی بالغ آبادی سے کم نہ ہو۔

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ مسلمان اپنے افلاس یا قرض کی وجہ سے کسی غیر مسلم کے ناجائز اثر میں دبے ہوئے نہ ہوں۔ اور اپنی رائے کو آزادانہ طور پر استعمال کر سکیں۔

(۴) چوتھی شرط یہ ہے کہ مسلمانوں میں سیاسی بیداری۔ معاملہ فہمی۔ ہوشیاری اور چالاکی اتنی ہو کہ جتنی غیر مسلمانوں میں ہے۔ تاکہ وہ اپنی رائے کے حق کو صحیح طور پر اپنے فائدے کے واسطے استعمال کر سکیں اور دوسروں کے دھوکہ اور فریب میں نہ آئیں۔

(۵) پانچویں شرط یہ ہے کہ مسلمانوں میں مذہب کا رشتہ اتنا مضبوط ہو کہ وہ دوسرے تمام ایسے جذبوں اغراض اور مفاد پر غالب ہو سکے جو غیر مسلمانوں کے ساتھ اشتراک عمل کے محرک بن سکتے ہیں۔

(۶) چھٹی شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کی عورتوں میں بھی اسی قدر آزادی، بیداری اور تعلیم پائی جائے جتنی غیر مسلم عورتوں میں پائی جاتی ہے۔ تاکہ وہ بھی اپنی حق رائے دہندگی سے مساوی طور پر فائدہ اٹھا سکیں۔

مذکورہ بالا چند شرطیں ہیں جن کا پورا ہونا ضروری ہے۔ لیکن چونکہ یہ شرطیں فی الحال پوری نہیں ہوتیں۔ اس لئے بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کو اندیشہ ہے کہ اگر جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب نہ رکھے گئے اور مسلمانوں

کے واسطے نشستیں محفوظ نہ کی گئیں تو مسلمان ووٹروں پر ساہوکار اور زمیندار اپنا ناجائز دباؤ ڈال کر ان کو لالچ اور دھوکہ دے کر ان کے ووٹوں کو بے اثر کر کے اور مسلمان عورتوں کے پردے اور جہالت سے فائدہ اٹھا کر غیر مسلم امیدوار کو منتخب کرائیں گے۔ اور ان صوبوں میں مسلمان اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جائیگی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں صوبوں میں عموماً اور بنگال میں خصوصاً مسلمانوں کی تعلیمی، مالی اور معاشرتی حالت نہایت ردی اور ابتر ہے۔ مذہبی احساس کی بھی ان میں بہت زیادہ کمی ہے یہ لوگ بہت بھولے، سیدھے اور سادے ہیں۔ ان کو اپنا مطلب پورا کرنے کے لئے چالاک اور مکار ساہوکار اور زمیندار جس طرح چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔

اس لئے ان صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے معنی یہ ہیں کہ ایک جاہل مفلس اور بیوقوف آبادی کو مکار اور دولت مند لوگوں کے ناپاک مقاصد کا آلۂ کار بننے سے بچایا جائے اور ان کو اپنی ذاتی اور انفرادی ترقی اور فلاح و بہبود کا موقع دیا جائے۔

اگر اس اصول کو مشعل ہدایت بنا لیا جائے تو پھر ان دونوں صوبوں کے بے بس مسلمانوں کو خود اپنے ہم مذہب مسلمانوں سے بھی بچانا ضروری ہوگا۔ جو ان سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں اور جو اتنے ہی دلیر اور بے باک ہیں جتنے کہ خود غیر مسلم ہیں۔

اسی طرح بہت سے غیر مسلم بھی ہمیں ملیں گے جو اپنے غیر مسلم ہم مذہبوں کی مکاریوں اور چالاکیوں کا ایسا ہی شکار بنے ہوئے ہیں جیسے مسلمان ان کا شکار ہیں۔ اس واسطے آخر میں اس مسئلہ پر مذہبی نقطۂ نگاہ سے نہیں بلکہ سیاسی اور معاشی نقطۂ نگاہ سے غور و فکر کرنا پڑیگا۔ جب مسئلہ کو اس روشنی میں دیکھا جاتا ہے تو ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ان صوبوں میں دراصل معاشی مسائل کو ہی اہمیت حاصل ہے اور حقوق کا مسئلہ دراصل معاشی بنیاد پر طے کرنا ہی زیادہ پسندیدہ اور مناسب صورت ہے۔ کیونکہ اس قسم کے مطالبوں سے جو فوائد حاصل ہوں گے ان سے تمام عوام یکساں طور پر مستفید ہو سکیں گے اور چونکہ مسلمان عوام کی ان صوبوں میں اکثریت ہے اس واسطے ان کا فائدہ اور اقتدار قدرتی طور پر ان صوبوں میں زیادہ ہو جائے گا۔ اور ساہوکار اور زمیندار جن میں سے بیشتر غیر مسلم ہیں وہ نقصان میں رہیں گے۔

*

ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی نصب العین

(ذیل کے مضمون میں جس کے مصنف اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک نئے سیاسی نصب العین کو پیش کیا گیا ہے۔ اس قسم کے مضمونوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ابھی تک اپنے سیاسی مقصد کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر پائے ہیں۔ یاران تیز گام محمل تک پہنچ گئے ہیں اور لیلائے مقصود کو حاصل کر چکے ہیں لیکن ہم صحرا کی ویرانیوں میں حیران و سرگشتہ کھڑے ہوئے راستہ کو ڈھونڈ رہے ہیں)

تحریک ترک موالات کی ناکامی اور خصوصاً نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد ہی مسلمانوں میں جو کچھ بھی سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے تھے وہ سمجھ چکے تھے کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ کانگریس کی قومیت پرستی کے پیچھے کون جذبہ کار فرما ہے۔ ان میں سے بہتوں نے کانگریس سے کھلم کھلا علیحدگی اختیار کر لی اور مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کی طرف اپنی کوشش کو پھیر دیا لیکن وقت کی فضا ناموافق تھی۔ مسلمانوں میں ابھی تک نہ تو صحیح سیاسی شعور پیدا ہوا تھا اور نہ مسلمان عوام ان خطرات سے آگاہ ہوئے تھے۔ جو اس نام نہاد قومی ادارے کی پالیسی میں مضمر تھے۔ اس لئے ان رہنماؤں کی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ مسلمانوں کا انتشار علیٰ حالہٖ قائم رہا اور دوسری طرف کانگریس نے حکومت کے سامنے اپنی زبردست تنظیم اور پیہم ایثار و عمل کا ایسا ناقابل انکار ثبوت پیش کیا کہ برطانوی حکومت کو سمجھ لینا پڑا کہ بغیر اس جماعت کو ساتھ لئے ہندوستان میں حکومت کی مشین کو چلانا ناممکن ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ حکومت کو اپنے اختیارات کا ایک حصہ صوبہ جاتی خود مختاری کی صورت میں عوام کے نمایندوں کے حوالے کرنا پڑا۔ حالات نے رخ بدلا اور وہی سیاسی جماعت جو اس وقت تک حکومت سے برسرِ پیکار تھی اب اقتدار و طاقت کی مالک بن بیٹھی۔ کانگریس کا مفاد بھی اسی میں تھا کہ برطانوی حکومت سے زیادہ بگاڑ نہ ہو اور اختیارات کی جو قسط مل رہی تھی اس کو لے کر مزید قوت و تصرف کے لئے راہ نکالے۔ چنانچہ انتخابات کے بعد ہندوستان کے سات صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہو گئیں ابھی تک

مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ کانگریس کی طرف امید کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور سمجھتا تھا کہ قومی حکومت کے تحت مسلمانوں کو اپنی حالت کے سدھارنے کا موقع ملے گا لیکن زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ کانگریس کی پالیسی اپنی اصلی شکل وصورت میں ظاہر ہونے لگی۔ اب تو مسلمان چونکے ہوئے اور ان کی جو توقعات کانگریسی حکومتوں سے وابستہ تھیں ان پر پانی پھر گیا انھوں نے پہلی بار اپنے سیاسی انتشار اور جماعتی تنظیم کے فقدان کا نتیجہ دیکھ لیا۔ ان حالات کا اثر بھلا کہاں تک نہ ہوتا۔ مسلم لیگ جو اس وقت تک گوشہ گمنامی میں پڑی ہوئی تھی پھر زندہ کی گئی اور بہت تھوڑے عرصہ میں مسلمانوں کی بڑی اکثریت اس کے حلقہ اثر میں آگئی۔ فی زمانہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور اسی کی عملی جدوجہد پر مسلمانوں کے مستقبل کا بہت کچھ انحصار ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ بحیثیت مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کے سامنے اس وقت کیا نصب العین ہے اور ہمارے قومی حوصلوں کو کہاں تک پورا کر سکتا ہے۔ بظاہر لیگ کے سامنے بجز اس کے اور کوئی نصب العین نہیں معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کی جائے۔ یہاں مفاد کا لفظ صرف مادی فوائد کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد آبادی کے تناسب سے ہو یا ممکن ہو تو اور زیادہ۔ اسمبلیوں اور میونسپلٹیوں میں مسلمان کافی تعداد میں موجود ہوں۔ ان کی زبان اور رسم الخط کانگریسی حکومتوں کے دستبرد سے محفوظ رہے۔ ان کے تمدنی مظاہر جوں کے توں برقرار رہیں اور جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں خالص مسلم لیگی وزارتیں قائم ہو جائیں۔ لیکن کیا ان مقاصد کا حصول بجائے خود مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کر دے گا۔ اور ان کا کھویا ہوا وقار اور ان کی گئی ہوئی عظمت انھیں پھر دلا دے گا۔ اگر نہیں اور اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے تو کیا مسلمانوں کو بس اس سے زیادہ کچھ مطلوب نہیں ہے کہ انھیں چند عہدے حاصل ہو جائیں اور اسمبلی میں ان کی نشستیں محفوظ ہو جائیں بے شک مسلمانوں کی اکثریت کا رجحان دیکھتے ہوئے تو یہی کہنا پڑے گا کہ وہ اس سے زیادہ اور کسی چیز کے طلبگار نہیں ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی معاشی پستی دور ہو گئی اور اقتدار و حکومت کے خزانے میں سے انھیں کچھ حصہ مل گیا تو بس ان کی زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا۔ لیکن درحقیقت وہ ایک سخت مغالطہ میں مبتلا ہیں ان کی نظروں کے سامنے زندگی کا وہ نظریہ ہے جس میں صرف مادی قدریں اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم

کی ترقی محض معاشی فلاح اور استحکام سے عبارت ہے۔ انھوں نے اس امر پر غور نہیں کیا ہے کہ یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان معاشی حیثیت سے ترقی کر جائیں۔ اقتدار و اختیارات کے خزانے میں حصہ دار ہو جائیں لیکن ان کی ہیئت قومی تبدیل ہو جائے ان کے افکار و نظریات غیر اسلامی ہو جائیں اور اس طرح رفتہ رفتہ غیر محسوس طریقہ پر وہ متحدہ ہندوستانی قومیت میں جذب ہو جائیں۔ ایسی حالت میں ان کی معاشی ترقی اور سیاسی اقتدار کیا کام آئے گا۔ ہمارے لئے تو سیاسی اقتدار اور معاشی استحکام بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔ ہمیں تو یہ چیزیں صرف اس لئے درکار ہیں کہ ہم اپنی انفرادی اور قومی زندگی کو غیر اسلامی تصورات کی آمیزش سے بچا سکیں۔ ہمارا انتہائی مقصد تو یہ ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے خالص اسلامی ماحول پیدا کر سکیں۔ دولت و ثروت کے وسائل اور اقتدار حکومت کی باگ ہمیں اس عظیم مقصد کے لئے مطلوب ہے اور اگر ہمیں یہ وسائل حاصل بھی ہو جائیں لیکن ہماری اصلی غرض و غایت پوری نہ ہو تو ہمارے لئے یہ سب کچھ محض بیکار ہو۔

اس لئے مسلمانوں کی کسی جماعت کا یہ نصب العین رکھنا کہ بس ہمیں اپنی آبادی کے تناسب سے ملک کے سیاسی اقتدار میں اپنا حصہ مل جائے یا جن صوبوں میں ہماری اکثریت ہے وہاں مسلمان وزارتیں قائم ہو جائیں در اصل ایک بڑی غلطی ہے جس سے کوئی بھی صحیح الخیال مسلمان متفق نہیں ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا جواب یہ دیا جائے کہ ہمارے مقاصد میں یہ بھی تو شامل ہے کہ ہماری زبان اور رسم الخط اور ہماری تمدنی آزادی برقرار رہے لیکن عرض یہ ہے کہ تمدنی آزادی کا جو تخیل ہمارے مدبرین اور سیاست دان حضرات کے نظروں کے سامنے ہے ہم کو اس سے اختلاف ہے وہ سمجھتے ہیں کہ تمدن نام ہے طرز زندگی، طریق معاشرت، زبان اور آداب و رسوم کا حالانکہ یہ سب تمدن کے مظاہر ہیں نہ کہ اس کی حقیقی روح۔ اسلامی تمدن تو در اصل ایک خاص ذہنیت اور زندگی کے ایک خاص زاویہ نگاہ کا نام ہے یہ ممکن ہے کہ ہماری زبان اور رسم الخط محفوظ رہے۔ ہمارے رسم و رواج میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو۔ ہماری مسجدیں اور خانقاہیں آراستہ و پیراستہ رہیں لیکن ان مختلف تمدنی مظاہر کے پیچھے جو روح کارفرما ہے جن نظریات و افکار نے اس مخصوص تمدن کی تشکیل کی ہے جس طریق فکر اور نظریۂ حیات پر اس تمدن کی بنیاد رکھی گئی ہے وہی بدل جائے۔ اس کو مٹا دیا جائے اور یہ وہ چیزیں ہیں جن کے بدلنے کے بعد ہماری تہذیب و معاشرت ہماری زبان اور ہمارا رسم الخط ہر چیز خود بخود بغیر کسی خارجی کوشش کے بدل جائے گی۔ کیونکہ جب وہ ذہن باقی نہیں رہا جس نے تمدن کی اس عمارت کو بنایا تھا تو ضرور ہے کہ عمارت کا نقشہ بھی بدل جائے گا۔ پھر اس پر بھی غور کر لینا چاہیئے

کہ یہ تمدنی روح، یہ نظریات و افکار، یہ طریق فکر اور مخصوص ذہنیت محسوسات میں سے نہیں ہیں جن کا بدلنا اور تماشا ہی ہماری آنکھیں دیکھ سکیں گی۔ یہ چیزیں تو بتدریج غیر محسوس طریقہ سے بدلتی ہیں اور جب ان میں کامل تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے تب جا کر کہیں ان کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی زندگی کا ایک ہی مقصد اور ایک نصب العین ہونا چاہیئے اور یہ وہ کہ ہمارا مستقل قومی وجود جن معنوی خصوصیات سے عبارت ہے وہ نہ صرف باقی رہیں بلکہ انہیں نشو و ارتقا کی راہ پر لگایا جائے۔ بالفاظ دیگر ہمارے ذہن اسلامی ذہن ہوں، ہمارے افکار و نظریات کی بنیاد مذہبی ہو اور ہماری قوم میں اسلامی روح بیدار ہو جائے۔

یہ تو ہمارا اصلی مقصد ہماری زندگی کی غرض و غایت اور ہماری اجتماعی کوششوں کا محور ہو لیکن اب سوال یہ ہے کہ سیاسیات میں ہمارا مقصد کیا ہونا چاہیئے اور حصول مقصد کے لئے بحیثیت ایک مستقل جماعت کے مسلمانوں کے کیا مطالبات ہونے چاہئیں آج تک ہمارے مطالبات جیسا میں عرض کر چکا ہوں۔ اس حد سے آگے نہیں بڑھے کہ آبادی کے تناسب سے ہماری نشستیں اسمبلیوں اور میونسپلٹیوں میں برقرار رہیں اور ہماری زبان اور رسم الخط کا تحفظ کیا جائے۔ لیکن جیسا ثابت کیا جا چکا ہے یہ ہماری جماعتی بقا کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ اب صرف دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمیں کامل تہذیبی خود مختاری (Cultural autonomy) حاصل ہو جائے۔ اور دوسرے یہ کہ ہم اپنا علیحدہ ملی وطن قائم کریں جہاں ہم اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہیں حکومت کریں کلچرل آٹانومی یا تہذیبی خود مختاری کے معنی یہ ہیں کہ مرکزی اسمبلی اور صوبہ جاتی اسمبلی کے متوازی مسلمانوں کی علیحدہ اسمبلیاں ہوں۔ جنھیں ان تمام امور میں قانون سازی کے کامل اختیارات دئے جائیں جن کا تعلق مسلمانوں سے ہے۔ اسی طرح معاشرت اور معیشت کے مختلف دائروں میں جو جھگڑے پیدا ہوتے ہیں ان کے فیصلہ کے لئے مسلمانوں کی علیحدہ عدالتیں قائم ہوں اور ان معاملات میں جن کا تعلق ہمارے تمدن یا معاشرت سے ہے ہمیں کسی دوسری عدالت کے سامنے جانا نہ پڑے۔ ہمارے مدارس علیحدہ ہوں اور تعلیم پر جس قدر روپیہ حکومت خرچ کرے آبادی کے تناسب سے اس کا ایک جزو مسلمانوں کے لئے وقف ہو جس کو مسلمانوں کے نمائندے جس طرح چاہیں صرف میں لائیں بظاہر ان دو صورتوں میں پہلی صورت یعنی کلچرل آٹانومی زیادہ آسان اور قابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو اس میں بعض ایسے نقائص ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف مسلمانوں کو دشواریاں

پیش آئیں گی بلکہ ہندوستان کی دیگر اقوام بھی اس کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گی۔

۱۔ اس پر سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ تہذیبی خودمختاری یا کلچرل اٹانومی کے حقدار صرف مسلمان ہی نہیں ہیں بلکہ یہ حق تو ہر قوم کا ہے کہ وہ اپنی تہذیب معاشرت اپنی زبان اور اپنی قومی ہیئت کو دوسری قوموں میں ختم ہونے سے بچائے اس لئے جب مسلمان اس کا مطالبہ کر سکتے ہیں تو کیا وجہ عیسائی پارسی سکھ اور دیگر اقوام اس حق سے محروم رہیں۔ کیونکہ کلچرل اٹانومی کی اساس تو اس عقیدہ پہ ہے کہ ہر قوم جو ایک مخصوص تہذیب و تمدن رکھتی ہے اس کا حق رکھتی ہے کہ اپنی بقاء و حفاظت کے لئے ضروری اختیارات حاصل کرے۔

۲۔ دوسری دشواری یہ ہے کہ کلچرل اٹانومی کے حصول کے بعد مسلمانوں اور ہندوستان کی دیگر اقوام میں باہمی تعاون اور یکجہتی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ کیونکہ جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھوں میں ہوگی تو ضرور ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی ذہنیت ایک خاص ڈھانچہ میں ڈھل جائے۔ ہم جس غرض کے لئے کلچرل اٹانومی کے طالب ہیں وہ یہی ہے کہ ہمارے افراد قوم اپنے افکار و اعمال، اپنے ذہن و دماغ اور کردار و سیرت کے لحاظ سے سچے مسلمان ہو جائیں۔ ظاہر حالت میں مسلمانوں کی ذہنیت اور ہندوستان کی دوسری قوموں کی ذہنیت میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔ ہمارے اصول تمدن کچھ اور ہوں گے ان کے کچھ اور ہمارے تصورات و افکار اور ان کے نظریات متضاد نہ سہی مختلف تو ضرور ہوں گے۔ ہم جس راہ پر چلنا چاہیں گے ان کو اس سے گریز ہوگا حکومت و سیاست کی جو شکل ہمیں پسند ہوگی ضروری نہیں کہ انہیں بھی قبول ہو۔ غرضیکہ جب صورت حال یہ ہو تو ہم میں اور ان میں عملی اور فکری تصادم ناگزیر ہوگا۔ کیا ان حالات میں ہم اور وہ کامل اتفاق و یکجہتی سے حکومت کی مشینری چلا سکیں گے۔ اس کے لئے بڑے وسیع ظرف اور بڑی بے مثال رواداری کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ ہماری راہ اسلام کی راہ ہوگی جو دنیا کی تمام راہوں سے جدا اور مختلف ہے۔

۳۔ ایک اور قابل غور امر یہ ہے کہ کلچرل اٹانومی کے حصول کے بعد اپنے اندرونی معاملات کی حد تک تو ہم آزاد و خودمختار رہیں گے لیکن خارجی پالیسی کی تشکیل میں ہمارا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ کیا مسلمان اس کو پسند کریں گے کہ ہندوستان کی خارجی پالیسی میں ان کے رجحانات اور ان کی مرضی کو کوئی دخل نہ ہو۔ فرض کیجئے کہ ہندوستان پر حصول آزادی کے بعد سامراجی ذہنیت چھا جائے اور یہ کوئی تعجب خیز چیز نہ ہوگی کیونکہ قومیت کا عروج اپنی

انتہا پر سامراج کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور ہندوستان جیسے ملک میں تو اس کا امکان اور زیادہ قوی ہے جہاں آبادی کی اس قدر کثرت ہے اور پیدائش دولت کے وسائل اس قدر وافر ہیں۔ پھر ایسی صورت میں کیا مسلمان اس کو گوارا کر لیں گے کہ ان کا ملک قریب کی اسلامی سلطنتوں کے خلاف صف آرا ہو یا اسلامی سلطنتوں کے خلاف نہ سہی دنیا کے کسی اور ملک کے خلاف ظلم اور ناانصافی کی جنگ پر ہماری حکومت آمادہ ہو تو کیا مسلمان خاموشی کے ساتھ اس کو برداشت کر لیں گے۔

ان تمام مشکلات کا لحاظ کرتے ہوئے میری حقیر رائے میں مسلم وفاق کا نظریہ بہت زیادہ آسان اور قابل قبول ہے۔ کیونکہ مسلم وفاق کے قیام سے آئے دن کے ہندو مسلمانوں کے جھگڑوں کا بالکل خاتمہ ہو جائیگا ہر قوم اپنی اپنی حکومت کے تحت بالکل آزاد ہوگی مسلمانوں کا وجود ہندوستانی قومیت کی راہ میں رکاوٹ نہ پیدا کرے گا۔ پھر ہندو مسلمان اپنے اپنے تخیلات کے مطابق بغیر کسی دشواری یا تصادم کے زندگی بسر کر سکیں گے ہندوؤں کے تمام قومی حوصلے اور آرزوئیں جواب محض مسلمانوں کی وجہ سے تشنہ ہیں اس وقت اپنی تکمیل کے لئے کوئی رکاوٹ نہ پائیں گی۔ ہندو آزاد ہوں گے کہ پراچین بھارت میں رامائن اور مہابھارت کا زمانہ پھر زندہ کر دیں اور مسلمانوں کو اختیار ہوگا کہ وہ ایک بار پھر خیر القرون کا منظر عملی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر دیں اس لئے مسلمانوں کے پیش نظر یہی مقصد ہونا چاہیئے کہ ان کے تین ٹکڑے علیحدہ کر دئے جائیں۔ شمال مغرب میں پنجاب کشمیر۔ سرحدی صوبہ سندھ اور بلوچستان، مشرق میں بنگال اور آسام۔ جنوب میں ریاست حیدرآباد۔ مگر یہ چیزیں یوں حاصل ہونے والی نہیں ہے۔ اس کے لئے ہمیں جان و مال کی قربانی کرنا پڑے گی اس کے لئے صبر و استقلال عزم راسخ اور بڑا ایثار درکار ہے۔ ہمیں اپنی تمام قوتیں مجتمع کرنا ہوں گی۔ افتراق و انتشار دور کرنا ہوگا اور سب سے بڑا کام یہ کرنا ہوگا کہ قریب کی اسلامی سلطنتوں کی ہمدردی حاصل کریں۔

نہیں معمولی جانور بھی تقریباً اسی طرح سیکھتے ہیں۔ ایک کتے کو لکڑیوں کے کٹھرے میں بند کیجئے اگر اس سے پہلے کتا ایسے حالات سے دوچار نہیں ہوا ہے تو وہاں پر گھبرائے گا، چیخے گا، بھونکے گا، اور چاروں طرف دوڑ کر نکلنے کا راستہ ڈھونڈے گا چنانچہ خاصی کشمکش کے بعد وہ باہر آنے کا راستہ تلاش کرے گا اور باہر نکل جائیگا۔ اس نئی تکلیف دہ صورت سے بچنے کے لئے کتے نے جو نیا طریقہ سوچا ہم اسے کتے کا سیکھنا کہیں گے کیونکہ اب اگر دوبارہ اسی کتے کو کسی لکڑی کے کٹھرے میں بند کر دیا جائے تو اسے اس میں سے نکلنے میں آسانی ہوگی اور وہ آسانی کے ساتھ گذشتہ تجربے کو دہرائے گا۔ در اصل یہ نیا تجربہ کتے کا سیکھنا ہے۔ جہاں تک سیکھنے کے عمل کا تعلق ہے انسان اور جانوروں پر اس کا اثر یکساں پڑتا ہے۔ مگر مدارج کے اعتبار سے دونوں میں بہت بڑا فرق بھی ہے۔ نسل انسان میں اس اعتبار سے جس قدر ہمہ گیری اور وسعت پائی جاتی ہے اس کا عشر عشیر بھی جانوروں میں نہیں ہوتا۔ ذہنی وسعتیں تو درکنار اگر جانور اور انسان کی اعصابی ساخت کا موازنہ کیا جائے تو دونوں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ یہ ضرور ہے کہ بعض جانوروں کے بچے پیدا ہوتے ہی بھاگنے لگتے ہیں اور بعض چند گھنٹوں میں اپنی خوراک تک خود تلاش کر لیتے ہیں جیسے مرغی کا بچہ انڈے کے خول سے نکلتے ہی ادھر ادھر بھاگنے لگتا ہے۔ اور دانہ دنکا چگنے لگتا ہے ؎

"مرغک از بیضہ بروں آید و روزی طلبد   آدمی زادہ ندارد خبر از عقل و ہوش"

مگر انسان کا بچہ مرغی کے بچے سے اپنی نشو و نما کے ارتقائی منازل کے اعتبار سے بہت مختلف ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے جانوروں کی ارتقاء کے منازل بہت تھوڑے ہیں۔ اس لئے ان کی نئی پود کو ان کے پورا کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ اس میں اس زندگی سے تطابق کی صلاحیت بہت کچھ پیدائش کے وقت ہوتی ہے جیسے مرغی کے بچے کی حالت میں ہم نے دیکھا۔ اس قسم کے جانوروں میں ارتقائی منازل کے بڑھانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس لئے ان کی پیدائشی صلاحیتیں محدود مگر پختہ حالت میں ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے انسان کے بچے کی صلاحیتیں ناپختہ ہوتی ہیں۔ اس لئے بعض لوگ اس غلط نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انسان کا بچہ تو چکنی مٹی کے مانند ہوتا ہے۔ ایک شخص اسے جس طرح چاہے موڑ سکتا ہے اور یہ لوگ اس غلط استنباط کے ماتحت بچے کے نشو و نما کے قوانین پر غور نہیں کرتے اور بچوں کے رجحانات اور میلانات معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے اس

لئے علم کو ایک طرفہ معاملہ سمجھ کر بچے پر نسل انسانی کے گذشتہ تجربات کا بوجھ برابر لادتے جاتے ہیں۔ علم کو آسان کرنے کے لئے وہ بچوں کے سامنے اس کے مختلف حصّوں کو منطقی ترتیب کیساتھ پیش کرتے ہیں۔ جو بیشتر صورتوں میں بچوں کے لئے صرف بامعنی علامات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ بچہ نشوونما کی جس منزل میں ہوتا ہے اس میں وہ مجرّد علامات کے مخفی معنوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے علاوہ بچہ اس عمر میں اس طرح چیزوں کو الگ الگ مضامین یا معلومات کی حیثیت سے دیکھنے کا عادی نہیں ہوتا معلّم یا مربّی اس حکمتِ عملی کے مفروضہ کی بنا پر بچے کی نامی شخصیت سے چشم پوشی کرتا ہے اور سماج کی طرف سے ٹھپہ لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے خیال میں جس طرح بھی ممکن ہو سماجی نقطۂ نظر کو جلد سے جلد بچہ پر تھوپ دیا جائے۔ جب سے مدرسہ اور سماج میں رشتہ ٹوٹ گیا ہے اس وقت سے تو تعلیم اور بھی رسمی ہوگئی۔ اب تو صرف مضامین کو مضامین کی اور کتاب کو کتاب کی حیثیت سے پڑھا دینے کا رواج ہو چلا ہے۔ یہ چیز اگر بڑی عمر کے بچوں کی تعلیم تک مخصوص ہوتی جن کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ معلومات کو مجرد طور پر سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں) یا مضامین کو الگ الگ پڑھ کر بھی ان کو سمجھنے کی اور زندگی میں برتنے کی صلاحیت رکھ سکتے ہیں تو بھی جواز کی ایک صورت ہوتی۔ مگر یہاں تو بچے اور بڑے میں کوئی امتیاز ہی مدّنظر نہیں رکھا جاتا۔

البتہ ماہرین تعلیم اس لوچ کی اہمیت کو دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ اس کو ارتقائی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور انسان کا مطالعہ نامی حیثیت سے کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ انسان کا بچہ شروع میں عاجز و ناتواں اور اپنی زندگی کے لئے دوسروں کی دیکھ بھال اور پرورش کا محتاج ہوتا ہے تاہم اس میں پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت دوسرے جانوروں کی نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے یعنی وہ ابتدائی عمر میں اگرچہ بالفعل عاجز و ناتواں ہوتا ہے مگر بالقوی وہ اپنے اندر بڑھنے اور ترقی کرنے کے بہت امکانات رکھتا ہے۔ انسان کی ابتدائی عمر کی یہ بے بسی اور خامی اس کو بڑھنے اور ترقی کرنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ انسان اپنے جسمانی مشاغل میں اپنے اعصاب اور رگ پٹھوں کے ذریعہ بوجھ اٹھانے والے قلی سے لے کر ایک باکمال مصوّر تک کا کام کر سکتا ہے۔ اعصاب اور رگ پٹھوں کا یہ لوچ انسان کو مختلف قسم کے کام کرنے کے امکانات پر قدرت بخشتا ہے۔ بظاہر یہ خامی اس لوچ اور وسعت پذیری کے ساتھ انسان

کے لئے قدرت کی طرف سے ایک بیش قیمت عطیہ ہے۔ یہی حالت ذہن کے امکانی وسعتوں اور نشو ونما کی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان عمر کے تھوڑے سے عرصے میں ایک طرف نسل انسانی کے گذشتہ تجربات کا سرمایہ حاصل کرنے پر قدرت رکھتا ہے اور دوسری طرف اس تمدنی ورثہ کی بنیاد پر ذاتی تجربے سے دوسرا ارتقا رکھنے کا حوصلہ کرتا ہے۔ اگر انسان پیدائش سے چند پختہ عادتیں اور مہارتیں لے کر آتا تو اس میں اتنی وسعت پذیری نہ ہوتی اور انسانی تمدن اس قدر مالا مال نہ ہوتا۔

انسان کے بچے کی نامی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت کی جائے۔ اور یہ کام صحیح طور پر اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم ان عوامل کو سمجھنے کی کوشش کریں جو اس کی تعلیم اور تربیت میں کار فرما ہوتے ہیں یعنی یہ کہ بچہ کس طرح سیکھتا ہے۔ گذشتہ سطر میں مختلف مثالوں کے ذریعہ اس بات کو واضح کر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان نئی ضرورتوں سے کس طرح تطابق پیدا کرنا سیکھتا ہے۔ تطابق یا سیکھنے کا مسئلہ ایک ہمہ گیر مسئلہ ہے۔ یہ کئی حیثیتوں سے حل کا محتاج ہے۔ اگر انسان کی تمدنی تاریخ پر غور کیا جائے تو صاف طور پر معلوم ہو جائے گا کہ انسان نے اپنی بقا کے لئے کس طرح اپنے ماحول کے خلاف جدوجہد اور دنیا کو بالآخر اپنے لئے پر امن بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس نے تسخیر فطرت کر کے دنیا کو وحشت اور تاریکی کی گھٹا سے نکالا ہے۔ اقبال اس حقیقت کو محاورہ مابین خدا و انسان کے عنوان سے یوں بیان کرتا ہے ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم

بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم

من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

تبدیلی اور ترقی کی اس صورت کو انسان کی نامی فطرت اور زمانہ کی نیرنگیوں نے ممکن کر دیا ہے ایک طرف نسل انسانی میں خود بدلنے کی صلاحیت ہے یعنی عمر کی مختلف منزلوں میں وہ مختلف ضرورتیں رکھتا ہے اور ہر ضرورت کے لئے اسے نیا تطابق یا توازن ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ اور پھر دنیا ایک حالت پر نہیں رہتی۔ وہ انسان کے سامنے نئے نئے مسائل، نئی نئی مشکلات اور نئی نئی ضرورتیں پیش کرتی رہتی ہے انسان کو اپنی زندگی

برقرار رکھنے اور اچھے طریقہ پر رہنے کے لیے تطابق کرنا پڑتا ہے چنانچہ نئی دشواریوں میں ان کے حل کے طریقے نکالنا انسان کی شخصی اور جماعتی تعلیم و تمدن اور ترقی کی بنیاد ہے۔ جس فرد یا قوم نے زندگی سے تطابق کرنا نہیں سیکھا وہ زندگی سے محروم رہی۔ یہاں تطابق کا صرف سلبی پہلو مراد نہیں ہے کہ " زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" بلکہ یہ بھی ہے کہ " زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز" یعنی زمانے اور فطرت کے قوانین کا لحاظ رکھتے ہوئے انسان اپنی نسلی بقا کے لیے اس میں اپنی طرف سے اپنی ضروریات کے مطابق برابر تصرف کرتا ہے۔ اس تصرف کی تکمیل یافتہ صورت کو ہم انسان کا "علم" یا "تمدن" کہتے ہیں۔

اب ہم تطابق یا سیکھنے کے عمل کو نفسیاتی طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں یعنی یہ کہ ہم کسی چیز کو سیکھتے کیسے ہیں۔ مثال کے طور پر بچہ یہ کیسے سیکھتا ہے کہ ایک ہاتھ میں پانچ انگلیاں ہیں۔ اس طرح سیکھنے میں ہوتا یہ ہے کہ بچہ کئی موقعوں پر یہ دیکھتا ہے کہ جہاں پر ایک ہاتھ کی انگلیوں کے گننے کا ذکر آتا ہے وہاں پر ۵ کا عدد لازمی طور پر آتا ہے۔ وہ خود بھی ایک ' دو کر کے گنتا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ایک ہاتھ میں پانچ انگلیاں ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کہ بچہ شروع میں ۵ کے ہندسے اور ۵ کے عدد کے تصور میں صحیح ربط نہ سمجھ سکے۔ ۵ کے لفظ کا اطلاق ۴ چیزوں پر کرے یا ۴ کے ہندسے کا اطلاق ۵ کے عدد پر کرے۔ مگر جیسے جیسے وہ مختلف مواقع پر ۵ کے لفظ کو ۵ اشیاء کے سلسلے میں دیکھے گا۔ ویسے ویسے ۵ کے لفظ اور ۵ اشیاء کا ربط اس کے ذہن میں واضح ہوتا جائیگا۔ اور جب بھی پانچ انگلیاں بچے کے سامنے گننے کے لیے پیش کر دی جائیں گی۔ وہ فوراً اس کا جواب ۵ دے گا۔ اور ربط یا تعلق کا نام سیکھنا ہے یہ ربط صرف حافظہ کے ذریعہ قائم نہیں رہتا بلکہ جسمانی ربط و تنظیم کی بھی اس طرح کی صورتیں انسان کی عملی زندگی میں پیش آتی ہیں۔ مثلاً ایک آدمی کو تیرنا سیکھنا ہے وہ دریا میں کود جاتا ہے لیکن وہ پانی میں اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتا۔ جتنا جتنا وہ اوپر ابھرنے کی کوشش کرتا ہے اتنا ہی تہ کی طرف بیٹھتا جاتا ہے۔ اب ایک آدمی اسے تھوڑا سا سہارا دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ پانی میں توازن قائم رکھنے کے لیے آدمی کو ہاتھ پیر خاص ترتیب سے ہلانے اور دھڑ کو خاص طور پر رکھنے کی ضرورت ہے۔ وہ آدمی آہستہ آہستہ اپنے اس دوست کی نصیحتوں پر عمل کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ خود اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے کے تجربے سے اسے اندازہ ہوتا جاتا ہے کہ کیا کرنا چاہیے۔ اس طرح کئی دن تک برابر وہ مشق کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک

کہ بالآخر وہ توازن حاصل کرتا ہے۔ اور بے تکلف تیرنے لگ جاتا ہے یعنی اس طرح تیرنے میں جسم کے مختلف حصوں کا تعامل سیکھتا ہے۔ اب جب وہ دریا میں کودتا ہے بغیر کسی سابقہ یا ابتدائی تجربے یا اناڑی پن کے بے تکلف اپنے جسم کو سنبھالتا ہے۔ اب یہ اس کا علم یا سیکھنا ہو گیا۔ کیونکہ وہ اس کی جسمانی مہارتوں کا ایک لازمی حصہ ہو گا۔ اس اعتبار سے ہمارا علم یا سیکھنا "مہارت" ہے جسے ہم بغیر کسی تکلف کے مناسب موقع پر برت سکیں۔ بائیسکل چلانا سیکھنے کی صورت میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اناڑی جس وقت بائیسکل چلاتا ہے، وہ چلاتے وقت بہت گھبرایا ہوا ہوتا ہے وہ ایک وقت میں کئی چیزوں کو دیکھتا ہے۔ سڑک پر چلتا ہے۔ سڑک پر جتنے موقعوں پر خطرے ہوتے ہیں ان سب کے متعلق سوچتا ہے۔ خود پیڈل چلانا اور ہینڈل کو تھامے رکھنا ان تمام چیزوں کا خیال رکھتا ہے۔ مگر جیسے جیسے وہ مشق کرتا ہے اس کا کام آسان ہوتا جاتا ہے۔ وہ اب پیڈل چلانے اور ہینڈل تھامنے کے خیال سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ بائیسکل پر سنبھل کر بیٹھنا سیکھتا ہے۔ اب وہ صرف راستے پر چلنے والوں کا خیال رکھتا ہے اور تھوڑی سی توجہ سے وہ نہایت صفائی اور آسانی سے سائیکل چلانے لگتا ہے۔ غرض ہم جس قدر کسی عمل کو کرتے ہیں اسی قدر وہ عمل ہمارے لئے آسان اور بے ارادہ ہو جاتا ہے۔ حافظہ کے تعلق سے ہم اس عمل کو اور بھی صاف طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ ہم بچپن سے زبان اس طرح سیکھتے ہیں کہ ہمارے سامنے جب کوئی چیز پیش کی جاتی ہے تو اس کا کوئی نام ہوتا ہے یا جو عمل ہوتا ہے اس کے لئے کوئی نہ کوئی لفظ ہوتا ہے۔ اس طرح کسی شئے یا عمل اور اس کے ساتھ کسی نام یا آواز کو متعلق سمجھنے سے ہم زبان سمجھتے ہیں۔ مثلاً ہم ایک چھوٹا پرندہ دیکھتے ہیں۔ لوگ اس کو چڑیا کہتے ہیں۔ کئی موقعوں پر ہمارے ذہن میں لفظ چڑیا اور چڑیا (پرندہ) کا ربط قایم ہوتا ہے۔ اس لئے جب بھی ہم چڑیا کو دیکھیں گے تو خود بخود چڑیا کا لفظ ہمارے ذہن میں دوڑ جائے گا۔ اگر ہم اسے ذہن سے نکالنے کی بھی کوشش کریں تب بھی ہم اس کو نہیں بھول سکیں گے۔ اس صورت میں چڑیا کی صورت ایک موقع ہے اور اس کے نام کا تصور جوابی عمل ہے۔ اس موقع اور جوابی عمل کا نام سیکھنا ہے۔ اس کو زیادہ واضح کرنے کے لئے گونگے اور بہروں کی مثال کو لیجئے۔ بالکل بہرہ آدمی کیوں گونگا ہوتا ہے؟ اس کو ہم موقع یا تحریک اور جوابی عمل سے اس طرح واضح کر سکتے ہیں کہ اگر بہرے آدمی کی زبان میں

کوئی خاص جسمانی نقص نہ ہو تو وہ بیشتر اس لئے گونگا ہوتا ہے کہ وہ کسی شئے اور مقررہ صورت کا تعلق نہیں سمجھتا ہے کیونکہ وہ شئے کو دیکھتا ہے۔ اس کو اپنے طور پر وہ دوسری چیزوں سے ممیز کرتا ہے۔ مثلاً وہ چڑیا اور طوطے میں تمیز کر سکتا ہے مگر وہ چڑیا کے لئے چڑیا کا لفظ اور طوطے کے لئے طوطہ کا لفظ نہیں بول سکتا۔ اس لئے کہ وہ ان پرندوں کے سلسلے میں ناموں کے سننے پر قدرت نہیں رکھتا۔ چنانچہ اس اصول کی بنا پر بہرے گونگے بچوں کے لئے اسکول کھولے گئے ہیں۔ ان میں وہ پڑھنا سیکھ جاتے ہیں۔ البتہ وہ جس آلے سے اشیا اور تحریری صورتوں میں تعلق سیکھتے ہیں یا بالفاظ دیگر پڑھنا سیکھتے ہیں تو ان کا تعلق کرنے یا (سیکھنے) کا آلہ مختلف ہوتا ہے یعنی بجائے وہ کان سے سننے کے آنکھوں سے استاد کے ہونٹوں کی حرکات کو دیکھتا ہے۔ اور ان حرکات کے موافق تختہ سیاہ پر الفاظ کو پہچاننے اور بولنے لگتا ہے۔

انسان اس طرح تحریک (موقع یا ضرورت) اور جوابی عمل سے جو کچھ ربط قائم کرتا ہے یا سیکھتا ہے۔ یہ ربط کوئی الگ حیثیت نہیں رکھتے۔ اگر سیکھنے کے یہ جوڑ الگ الگ مفرد اینٹوں کی حیثیت رکھتے تو ان سے انسان کا علمی قصر ہرگز تعمیر نہ ہو سکتا۔ جس طرح ہم سماج کے معاملہ میں دیکھتے ہیں کہ جب ایک نسل دنیا میں تصرف و تجربہ کر کے فنا ہو جاتی ہے تو دوسری نسل جو اس کی جگہ لیتی ہے وہ کم و بیش گذشتہ نسل کے تجربات کو بنیاد بنا کر ان میں نئے نئے تصرفات کرتی ہے۔ اور اس طرح نئے نئے حقایق کا کھوج لگاتی ہے۔ وہ پھر اپنی جگہ پر نئی نسل کے ان تازہ حقایق کو پرانے نسلی تجربے کے ساتھ پیش کرتی ہے اور نئی نسل ان کو سیکھ کر اپنے طور پر اپنے دور میں اس میں اضافہ کرتی ہے۔ اور نسلوں کا یہ تجربی تسلسل تمدن کو مالا مال کرتا جاتا ہے۔ اسی طرح انسان اپنی انفرادی حیثیت سے بھی چھوٹے پیمانے پر یہی عمل کرتا ہے۔ وہ رات دن جو کچھ سیکھتا جاتا ہے وہ اس کا جزو علم ہو جاتا ہے انسان کے علاوہ دوسرے جانور بھی چھوٹے پیمانے پر اسی طرح سیکھتے ہیں۔ مگر ان کے عقلی و ذہنی قوا اس قدر تربیت یافتہ نہیں ہوتے کہ کسی چیز کو زیادہ دیر تک یاد رکھ سکیں۔ اور اگر یاد رکھنے کے سلسلے میں بعض جانور مثلاً کتا کوئی غیر معمولی صلاحیت بھی دکھائے تب بھی وہ عقلی طور پر کسی تجربے سے اس طرح پر نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا کہ وہ آئندہ کے لئے کسی نئے تجربے میں ان سے مدد لے سکے۔ اس بات کو ہم اپنے روزمرہ کے مشاہدے سے جانتے ہیں۔

سیکھنا اور عادات:۔ آدمی کی زندگی اپنے انتخابی اعمال کی وجہ سے منظم اور مربوط ہوتی ہے جب وہ کسی نئے موقع سے تطابق حاصل کرتا ہے یا اس کے لئے جوابی عمل ڈھونڈھنے سے مجبور ہو جاتا ہے تو پھر اس کے لئے کئی طرح کے جوابی عمل اختیار کرتا ہے۔ جیسے ہم نے تیرنے والے کی مثال میں دیکھا۔ اور جب آزمانے کے بعد ان میں سے چند جوابی اعمال تطابق میں مدد دیتے ہیں تو ان کو دوسرے جوابی اعمال پر ترجیح دیتا ہے۔ اور دوسرے جوابی اعمال کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس طرح وہ نئے مواقع سے ترجیحی اعمال کے ذریعہ نیا تطابق حاصل کرتا ہے اور جب تطابق میں مزید سعی اور کوشش کو دخل نہیں ہوتا تو پھر ہم اس کو عادت کہتے ہیں۔ اور اس عادت کے ذریعہ ایک طرف تو ہم گذشتہ تجربات کو محفوظ رکھتے ہیں اور دوسری طرف نئے تجربے کے لئے اس کو بطور اساس کے استعمال کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو ہم بیڈمنٹن اور ٹینس کی مثال سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بیڈمنٹن کا ایک کھلاڑی بلّہ لے کر میدان میں جاتا ہے۔ اسے سابقہ واقفیت صرف اس قدر ہے کہ ہاتھ کو اوسط درجے کے لوگوں کی طرح جو بیڈمنٹن نہ جانتے ہوں۔ ہلا سکتا ہے۔ کلائی کو بھی آسانی کے ساتھ گھما سکتا ہے۔ اب وہ بیڈمنٹن سیکھتے وقت ہاتھ کے اس لوچ سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ بلّہ پکڑتا ہے اور مخالف طرف سے چڑیا کے آنے کا انتظار کرتا ہے جب چڑیا آتی ہے تو اسے زمین پر گرنے سے پہلے بلّہ سے مار کر واپس کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک آدھ مرتبہ چڑیا جال میں پھنس جاتی ہے اور کبھی میدان کے باہر گر جاتی ہے۔ مگر جب اپنے رگ و پٹھوں پر قدرت حاصل کر کے کھلاڑی کو خاص طریقہ پر بلّہ چلانے کی مشق ہو جاتی ہے تو پھر وہ مہارت حاصل کرتا ہے اور بغیر کسی خاص تکلف اور اہتمام کے حسب منشا چڑیا کو مخالف طرف بھیجنے پر قدرت پا جاتا ہے۔ نو آموزی کی حالت میں اب تک جو کام بہت اہتمام و احتیاط سے کرتا تھا اب ذرا سی توجہ سے اس کام کو عادتاً کرنے لگتا ہے۔ اب یہی کھلاڑی کرکیٹ شروع کرتا ہے بہت سی ابتدائی منزلیں جو ایک کرکیٹ کے کھلاڑی کو طے کرنی پڑتی ہیں اس کو نہیں کرنا پڑتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بیڈمنٹن کے بہت سی آموختہ حرکات یا جسمانی لوچ کو اس نئے کھیل میں استعمال کر سکتا ہے۔ اور اسے ایک اناڑی کھیلنے والے کے مقابلے میں جس نے پہلے کرکیٹ

کے قسم کا کوئی کھیل نہ کھیلا ہو، کرکٹ سیکھنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔ یہی حال تمام پیشوں اور مہارتوں کا بھی ہے ہر ایک آدمی کی شخصیت سیکھنے اور تجربے کے بعد بدل جاتی ہے۔ اس کا نقطۂ نظر اور طرز عمل بھی بدل جاتا ہے ہر ایک تجربے کے بعد وہ دوسرے تجربے کو جو پہ اپنے تجربے پر منحصر ہوتا ہے، نئی روشنی میں لیتا ہے۔ یہ بات انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ اور اسی کی بنا پر اس میں بدلنے اور تطابق کی بہت سی صلاحیتیں رکھی گئی ہیں۔

صرف ان معنوں میں جو موقع اور جوابی عمل کے رشتوں کی صورت پذیری انسانی علم کی تشکیل کے سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ کیونکہ انسان جو کچھ سیکھتا ہے وہ صرف وقتی ضرورتوں کو پورا کرنے تک محدود نہیں ہوتا بلکہ جس طرح انسان کی زندگی نمو پذیر ہوتی ہے اسی طرح اس کی شخصیت اور اس کا علم بھی نمو پذیر ہوتا ہے۔ بلکہ جیسے جیسے اس کے تجربے بڑھتے جاتے ہیں ویسے ہی ویسے نئے نئے تجربے کرنے کا شوق بھی بڑھتا جاتا ہے۔ اور جذبات کی بلندی، احساسات کی لطافت اور نظر کی وسعت میں بھی برابر اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ اپنے ماحول میں نئے نئے تصرفات کرتا ہے نئی نئی ہم آہنگیاں پیدا کرتا ہے۔ نئے نئے قدر ڈھونڈھتا ہے۔ وہ آج ترقی کی جس بلندی سے چیزوں کو دیکھتا ہے کل اس سے زیادہ بلندی پر پہنچ کر اس کا نقطۂ نظر مختلف ہو جاتا ہے۔ اپنے کام کی اور دنیا کے کام کی حیثیت اس کی نظروں میں مختلف ہو جاتی ہے۔ اس کا معیار بدل جاتا ہے اور اس بدلے ہوئے معیار کے مطابق وہ اپنے کام میں نیا تصرف کرتا ہے۔ اس تصرف سے وہ نیا اثر قبول کرتا ہے اور اس نئے اثر کے ماتحت وہ کوئی نیا کام یا تصرف کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے سماجی اور طبعی ماحول میں اصلاح اور تصرف کرکے اس کے ذریعہ اپنے ذات کی تعمیر کرتا رہتا ہے۔ اس مسلسل تعمیر کا نام تعلیم ہے۔ غرض سیکھنے سے مراد چند مہارتیں یا تطابق کی چند مخصوص شکلیں نہیں ہوتیں بلکہ اس کا اثر سیکھنے والے کی ساری شخصیت پر ہوتا ہے۔ وہ خاص قسم کی عادتیں یا مہارتیں تو ضرور حاصل کرتا ہے مگر وہ عادتوں یا مہارتوں کا غلام نہیں بنتا بلکہ اگر اس کے سیکھنے میں ربط ہے اور اس کی شخصیت میں ہم آہنگ نمو پذیری پائی جاتی ہے تو وہ اپنی مہارتوں کو اپنے نصب العین تک پہنچنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اور

جب وہ نصب العین کی کسی ایک منزل پر پہنچ جاتا ہے تو دوسری منزل اس کے سامنے اور صاف طور پر نمایاں ہو جاتی ہے۔ اور اس کی دلکشی قریب پہنچنے پر مزید دعوتِ عمل دیتی ہے۔ اسی طرح وہ برابر آگے بڑھتا جاتا ہے اور اپنی کوشش ناتمام سے اپنی ذات کی تشکیل میں مصروف رہتا ہے۔ اقبال نے حقیقت اس طرح بیان کی ہے :۔

۵ چوں نظر قرار گیرد بنگار خوبروئے — آں زماں دلے من پے خوب تر نگارے

زشرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے — سر منزل ندارم کہ بمیرم از قرارے

تعلیم یا سیکھنے کے لازمی عناصر کیا ہیں؟ تعلیم کے مفروضہ مفہوم کے ماتحت ہم تعلیمی عناصر کو ایک عام خاکہ میں محدود کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہمیں تعلیمی عمل سمجھنے میں آسانی ہو۔ تعلیم میں گذشتہ مفہوم کے ماتحت ہم تین عناصر کو لے سکتے ہیں۔ (۱) قدرتی ماحول (۲) معاشرتی ماحول اور (۳) انسان کی ذات۔ ان تینوں عناصر کے باہمی اثرات کی وجہ سے علم کی تشکیل ہوتی ہے۔ قدرتی ماحول سے مراد وہ تمام کائنات ہے جس میں انسان تصرف کر کے اپنی ضروریات اور ارادوں کو پورا کرتا ہے۔ اور جس کی مدد سے وہ اپنی تمام تمدنی تعمیر کو ترقی دیتا ہے۔ معاشرتی ماحول سے مراد وہ طبقہ ہے جن کے اثر سے وہ زندگی کی قدروں کو طے کرتا ہے اس میں صرف موجودہ نسل شامل نہیں ہے بلکہ وہ گذرے ہوئے لوگ بھی داخل ہیں جن کے اثر سے کسی کام کے یا چیز کے اچھے برے ہونے کا فیصلہ کرتا ہے اور تیسرے انسان کی ذات خود انسان کی ذات کو ہم یہاں ان صلاحیتوں کی بنا پر دیکھتے ہیں جس میں سیکھنے یا بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ تطابق حاصل کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اور جو ایک ترقی پذیر مغز کا مالک ہے۔ لیکن چونکہ ہماری زندگی اس قدر پیچ دار ہو گئی ہے کہ بچے کے لئے قریب قریب یہ بات ناممکن ہو گئی ہے کہ وہ ۲۰، ۲۲ سال کے عرصے میں تمدن کی موجودہ سطح پر پہنچ جائے۔ اس لئے جماعت کی طرف سے اس کی کو پورا کرنے کے لئے خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ اس مخصوص اہتمام کو جس کے ذریعہ متمدن زندگی سے تطابق کو آسان کرنے میں مدد ملتی ہے "مدرسہ" کا نام دیا گیا ہے اور جس کے ذریعہ یہ اہتمام کیا جاتا ہے وہ بھی مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اور وہ "استاد" کہلاتا ہے تطابق حاصل کرنے کے لئے انسانی تجربات کو مختلف منزلوں میں حسبِ ضرورت محدود کیا گیا ہے

اس مجموعہ کا نام "نصاب" رکھا گیا ہے۔ اگر ہم ان کو اپنے مفروضہ عناصر کی روشنی میں دیکھنا چاہیں تو ہم ان کو یوں سمجھ سکتے ہیں :-

(۱) طالب علم مختلف مگر خام صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے جو ذہنی اور جسمانی لحاظ سے نمو پذیر شخصیت رکھتا ہے۔

(۲) استاد معاشرتی ماحول کا ایک فرد ہے جو بچہ کو اس کی نشو ونما کے قوانین کی روشنی میں اس کی مخصوص ضروریات کے مطابق اپنے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں مدد دیتا ہے۔

(۳) مدرسہ ایک مثالی دنیا ہے جس میں بچہ اپنے بننے والے نئے معاشرے کے ساتھ رہتا ہے۔ اور استاد کی مدد سے نسلی تجربات سے روشناس ہوتا ہے۔ اگر استاد معاشرے کی طرف سے صحیح رہنمائی نہیں کرتا تو تعلیم ناقص اور اگر مدرسہ مثالی اور تجربی دنیا نہیں ہے تو بچے کو اچھا شہری نہیں بنا سکتا۔ اس لئے تعلیم ناقص اس اعتبار سے تعلیم نام ہے اس عمل کا جس میں سیکھنے والا اپنے ماحول کو سمجھنے اور برتنے کے لئے اپنی محدود صلاحیت کو کام میں لاتا ہے، اور استاد یا مربی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تدریجی طور پر اس کے تجربات و مشاغل پر نسلی تجربات و مشاغل کو اس طرح تعمیر کرے کہ جس کے ذریعے بچہ کی انفرادی اور شخصی زندگی کی تعمیر ہو اور وہ بڑا ہو کر قومی قصر کا ایک مضبوط ستون بنے۔

ہندوستان کی بنیادی صنعتوں کا مسئلہ

(از ڈاکٹر دی۔ ایس۔ ڈوبے۔ ایم۔ ایس سی۔ پی۔ ایچ ڈی بنارس ہندو یونیورسٹی)

بنیادی یا کلیدی صنعتوں کی اصطلاح ایسی صنعتوں کے لئے استعمال کی جاتی ہے جو قوم کے لئے نہایت ضروری ہوتی ہیں۔ اور جن کی پیداواریں اکثر دوسری صنعتوں میں استعمال کی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں کلیدی صنعتوں کے شروع کرنے کے سلسلے میں تین باتیں ہیں جن کے بارے میں غور کرنا ضروری ہے :۔

(۱) ایسی صنعتیں جو ملکی تحفظ کے لئے لازمی ہیں

(۲) ایسی صنعتیں جن کی پیداوار کی ضرورت اکثر صنعتوں کے لئے رہتی ہے۔

(۳) ایسی صنعتیں جن کی وجہ سے ملکی پیدائش دولت کے کام کو بہت ترقی ہو جائے گی۔

دوسرے ملکوں میں مندرجہ ذیل کو کلیدی صنعتوں میں شامل کیا جاتا ہے۔

(۱) دھاتوں سے متعلق صنعتیں :۔ بھٹیہ لوہا اور فولاد اور ان کے میل والی پیداواریں امن اور جنگ کے زمانے میں تقریباً ہر صنعت کی ترقی کے لئے لوہا ناگزیر ہے۔ دوسری اور تمام دھاتیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔

(۲) بجلی کی وزنی مشینیں :۔ بجلی کی اس ترقی کے زمانے میں بجلی کی طاقت کو پیدا کرنے والے کارخانوں کی ضرورت اتنی بڑھ گئی ہے کہ اس کا شمار بھی کلیدی صنعت میں کیا جانے لگا ہے۔

(۳) قوت محرکہ کے پیدا کرنے کے لئے وزنی مشینیں :۔ اس میں انجن، موٹر، ہوائی جہاز، دخانی جہاز، زراعتی مشینیں اور قوت محرکہ کے پیدا کرنے والی دوسری مشینیں۔ اس صنعت کی کئی نہایت وسیع شاخیں ہیں۔

(۴) وزنی کیمیاوی صنعتیں :۔ اس صنعت کی اہم شاخیں تیزاب اور القلی، رنگ اور کیمیاوی کھادیں ہیں۔ دنیا کے دوسرے زراعتی ملکوں میں ان کھادوں کی تیاری کو بہت زبردست اہمیت حاصل ہے۔

دوسری صنعتیں جن کی وجہ سے قومی پیدائش دولت کا کام بہت زیادہ بڑھایا جا سکتا ہے اور جن کی

پیداوار یں قوم کی ترقی کے لئے لازمی ہیں وہ شکر، ربر، کیمیا دی کھاد وغیرہ ہیں (کیمیا دی کھاد کی صنعت کا شمار دز نی کیمیا وی صنعتوں میں بھی کیا جا چکا ہے۔ لیکن چونکہ اس کی اہمیت ہندوستان کے لئے بہت زیادہ ہے اس لئے اس کو ایک جداگانہ عنوان کے ماتحت درج کرنا بھی ضروری ہے)

ان صنعتوں کے لئے جس قدر سرمایہ کی ضرورت ہے وہ کئی کروڑ کے لگ بھگ ہوتا ہے اور ان کی پیداوار یں تمام ہندوستان کے فائدہ کے لئے ہیں لیکن چونکہ صنعت کا محکمہ صوبائی اختیار میں ہے اس لئے اگر انھیں تمام ہندوستان کے مفاد کو سامنے رکھ کر قائم کیا جائے گا تو سب صوبوں میں خوب تعاون عمل پیدا ہو سکے گا۔ ان صنعتوں کے شروع کرنے کے لئے جس سرمایہ کی ضرورت ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ بغیر مناسب تعاون عمل کے ان کا قائم ہونا بہت مشکل ہوگا یہ معلوم کرکے خوشی ہوتی ہے کہ کانگریس کے ارباب حل وعقد نے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور صنعتی وزیروں کی ایک کانفرنس ان مسائل کو سوچنے کے لئے عنقریب ہونے والی ہے امید ہے کہ اس کانفرنس سے عملی فائدہ کی کوئی صورت نکل سکے گی۔ اس کانفرنس کے غور کے لایق جو سوالات ہو سکتے ہیں ان میں سے کچھ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ ہندوستان کے لئے کلیدی صنعتیں کیا ہیں؟ ملک کے لئے ان کی اہمیت کا سوال۔ ان کے شروع کرنے لئے موزوں ترین جگہ اور ان کی مختلف صوبوں میں تقسیم۔

۲۔ ان بڑی صنعتوں کو جاری کرنے کے لئے جن ابتدائی تحقیقاتوں کی ضرورت ہے ان کا مسئلہ اور ان ابتدائی تحقیقاتوں کی مالی امداد کا مسئلہ اور تمام دوسری ابتدائی تفصیلات۔

۳۔ ان صنعتوں کے لئے سرمایہ اکٹھا کرنے کا سوال اور ان پر ریاست یا نجی ایجنسیوں یا دونوں کی نگرانی کا سوال

۴۔ ان صنعتوں میں اندرونی اور بیرونی مقابلہ کا سوال اور اس کو روکنے کے ذرائع اور طریقے مثلاً محصول درآمد کی ایک مشترکہ تامینسی پالیسی اور دوسری مناسب داخلی نگرانیاں

۵۔ موجودہ بڑی صنعتوں کے تعاون عمل کا سوال اور ان کو امداد دینے کے ذرائع اور طریقے

اگر ان مسائل کا تصفیہ وزرا کی کانفرنس میں ہو جائیگا تو ہمیں امید ہے کہ ہم ایک مستحکم بنیاد پر اپنا کام شروع

کر سکیں گے۔

مندرجہ بالا مسائل میں جہاں تک پہلے مسئلہ کا تعلق ہے یہ مناسب ہوگا کہ کانفرنس فنی ماہروں معاشیات کے ماہروں اور سیاسی ماہروں کی ایک کمیٹی کا تقرر کر دے اور یہ لوگ ان صنعتوں کے سلسلے میں کچے مال اور دوسری فنی تفصیلات کے نقطہ نگاہ سے اس مسئلہ کو سوچ لیں اور ان صنعتوں کے معاشی پہلوؤں کا خاکہ تیار کر لیں اور قومی تحفظ کی روشنی میں اس پالیسی کو جسے اختیار کرنا ہوگا طے کر لیں۔

نہایت اہم صنعتیں جنھیں اس وقت اختیار کیا جا سکتا ہے حسب ذیل ہیں :۔

۱۔ بجلی کی وزنی مشینوں کی تیاری

۲۔ قوت محرکہ کی وزنی مشینوں کی تیاری مثلاً بھاپ اور تیل کے انجن۔ قوت محرکہ کو پیدا کرنے والی مشینیں اور ان کے متعلقات، قوت محرکہ کے پیدا کرنے کے دوسرے ذرائع، زراعتی مشینیں اور ہندوستان میں جو صنعتیں اچھی طرح قائم ہیں مثلاً شکر، پارچہ بافی وغیرہ کی صنعتیں ان کے لئے مشینیں۔

۳۔ وزنی کیمیاوی صنعت۔ اس میں مندرجہ ذیل خاص عنوانات شامل ہیں :۔

(الف) ہندوستانی کچے مال سے تیزاب اور القلی بنانا۔

(ب) کول تار کے رنگوں کا بنانا

(ج) فاسفیٹ اور پوٹاس کے کھادوں کا بنانا۔

ہوا سے نائٹروجن کے مرکبات حاصل کرنے کی صنعت میں ایسے کھادوں کا تیار کرنا جس میں نائٹروجن موجود ہو اس کو زراعت کی ترقی میں اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ اس کے لئے ایک جداگانہ صنعت ہونا چاہیے۔ دہاتوں کی صنعتوں میں لوہے اور فولاد کے علاوہ المیونم کی تیاری کو آئندہ بڑی اہمیت حاصل ہوگی۔ ان کے علاوہ، الکوہل، ربر اور ہتیاروں اور گولی بارود وغیرہ کی تیاری کی طرف بھی توجہ کرنا ضروری ہے۔

ان میں سے بعض صنعتوں کے بارے میں اس بات کو صراحت کے ساتھ بتلایا جا سکتا ہے کہ ان کا محل وقوع کہاں ہونا چاہیے لیکن دوسری صنعتوں کے بارے میں محل وقوع کا فیصلہ کرنے کے لئے بہت کافی مواد کو اکٹھا کرنا پڑے گا۔ کیمیاوی کھادوں کی صنعت اس قدر زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ اسے تو جہاں جہاں

سہولتیں موجود ہوں سب صوبوں میں شروع کر دینا چاہیئے۔

راقم الحروف کے نزدیک یہ مناسب ہوگا کہ جب ایک دفعہ ان صنعتوں کے بارے میں فیصلہ ہو جائے اور انھیں ماہروں کی ایک کمیٹی ابتدائی تحقیقات کے بعد مختلف صوبوں کو سپرد کر دے تو بعد کی مفصل تحقیقات کو خود صوبے انجام دیں۔ اور اس مفصل ابتدائی تحقیقات کے لئے جس روپے کی ضرورت ہو اسے متعلقہ صوبے خود اپنے بجٹ سے فراہم کریں۔ صوبے کی حکومتوں کو چاہیئے کہ تمام باریک سے باریک جزئیات کے بارے میں نہایت مکمل تحقیقات کرائیں۔ پھر اس تمام اسکیم کو ایسے ماہرین کی جمعیت تمام ہندوستان کے لئے وقیع ہے تنقیدی نگاہ سے دیکھیں۔

اور بعد میں غیر ملکوں کے بہترین ماہر بھی اس کی جانچ کریں۔ اس کے بعد جو آخری اسکیم تیار ہو اسے بغیر کسی چیز کو اتفاقات پر چھوڑے ہوئے اختیار کیا جائے۔ ہر ایک صوبہ کی حکومتوں کو ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ روپے تک اس قسم کے مکمل مطالعہ کے لئے صرف کرنا ہوگا لیکن متحکم بنیاد پر کھڑے ہونے کے لئے اس طرح روپیہ لگانا مناسب ثابت ہوگا۔ اگر حکومت کی طرف سے چلائی ہوئی کوئی اسکیم آخر میں ناکام ہوئی تو اس سے ملک کا حوصلہ بہت پست ہو جائیگا اور صنعتی ترقی رک جائے گی۔ ان تفصیلی تحقیقاتوں میں کچے مال کے وسائل، معاشی کارخانوں کے پیمانے، ان کے مناسب محل وقوع۔ پیدائش کی لاگت، جتنے مجموعی سرمایہ کی ضرورت ہے اس کے اعداد، امکانی، خارجی اور داخلی مقابلہ، اس مقابلہ کو روکنے کی تدبیر اور ہر دوسری ممکن تفصیل پر مکمل بحث ہونا چاہیئے۔ یہ سب کام صوبوں کو کرنا چاہیئے اور اس کے لئے صوبہ کے بجٹ سے رقم نکالنا چاہیئے۔ صنعت کے محکموں کو ۱۵ اور ۲۰ لاکھ کے درمیان جو امداد دی جاتی ہے اس کے پیش نظر تو ۵۰ ہزار سے لے کر ایک لاکھ تک رقم نکالنا عملاً ممکن ہو سکے گا۔

رہا سوال ان صنعتوں کی مالی ضرورتیں پوری کرنے اور ان کی نگرانی کا تو حکومتوں کے لئے ان صنعتوں کی پوری ذمہ داری لینا تو مشکل ہوگی کیونکہ ترقی کی موجودہ حالت میں ضروری تجربہ کار لوگوں کی ان کے یہاں بہت کمی ہے۔ لیکن اس کے برعکس ان کلیدی صنعتوں کو جن سے پوری قوم متاثر ہوتی ہے ایک نجی سرمایہ دار کے رحم و کرم پر چھوڑنا بھی خطرناک ہے۔ قوم کو بصورت مجموعی اپنی پالیسی کے منوانے

کا حق حاصل ہوتا ہے ۔ راقم الحروف کے نزدیک موجودہ حالات میں بہترین انتظام یہ ہو سکتا ہے کہ سرمایہ نجی طور پر جمع کیا جائے اور گورنمنٹ سرمایہ داروں کے لگائے ہوئے سرمایہ پر تین یا چار فیصدی منافع کی ضمانت کر لے بشرطیکہ سات یا آٹھ فی صدی سے جتنا زیادہ منافع ہوگا وہ مقررہ تناسب کے ساتھ (نصفا نصف) ریاست اور کمپنی کے درمیان تقسیم کر لیا جایا کرے گا۔ حکومت کی نمائندگی کمپنی کے ڈائرکٹروں کے بورڈ میں ایک خاص تناسب مثلاً ۳۳ فی صدی تک ہوگی ۔ اگر سوشلسٹ رجحانات غالب ہو جائیں تو ایک شرط یہ بھی بڑھائی جا سکتی ہے کہ حکومت کو ۲۵ یا ۳۰ سال کے بعد پورے کارخانے کو خریدنے کا حق حاصل رہے گا۔ اس انتظام سے آئندہ کی طبقاتی جنگ کا بھی سدباب ہو جائے گا اور موجودہ زمانہ میں صنعتی ترقی کو بھی شروع کیا جا سکے گا۔ موجودہ انتظام کے مطابق اگر ہر صوبہ کو اپنی مفروضہ صنعتوں کے لئے ۵ کروڑ کے قریب سرمایہ کی ضرورت ہوئی تو ضمانت کئے ہوئے کمترین سود کی رقم ۳ فی صدی کے حساب سے ۱۵ لاکھ اور ۴ فیصدی کے حساب سے ۲۰ لاکھ روپیہ ہوگی اگر صنعت کو نہایت مکمل ابتدائی تحقیقات کے بعد شروع کیا جائے گا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ صنعت ۳ فی صدی منافع نہ دے سکے۔ اس لئے اگرچہ ضمانت کئے ہوئے سود کے لئے ۱۵ یا ۲۰ لاکھ روپیہ کا بجٹ میں حفظ ماتقدم کرنا پڑے گا لیکن عملی طور پر حقیقتاً حکومت کو یہ رقم صرف نہیں کرنا پڑے گی یہ بھی ممکن ہے کہ دو یا تین سال کے بعد جب کہ صنعت پوری طرح پر قائم ہو جائے گی اور بیرونی اور اندرونی مقابلہ محصول درآمد اور دوسرے قوانین کے ذریعہ قابو حاصل کر لیا جائے گا تو منافع پر اس طرح کی نگرانی رکھی جا سکتی ہے کہ حکومت کو ۸ فی صدی کے زیادہ کے منافع پر ایک اچھی خاصی آمدنی حاصل ہو سکے ۔ اس کمترین منافع کی ضمانت کے لئے ایک مستقل فنڈ کو بھی شروع کیا جا سکتا ہے تاکہ اگر حکومت کو پہلے دو تین سالوں میں نقصان اٹھانا پڑے تو اس کی تلافی بعد کے چند سالوں کے فائدہ سے ہو جائے اور یہ بہت زیادہ اغلب ہے کہ دس سال تک جاری رہنے کے بعد اس فنڈ سے حکومت کو خاصی آمدنی ہونا شروع ہو جائے گی ۔ اس لئے موجودہ حالات میں بھی صوبہ کی حکومتیں نہایت اطمینان کے ساتھ ۱۵ لاکھ روپیہ کے منافع کی ضمانت کرنے کے لئے وقف کر سکتی ہیں ان کلیدی صنعتوں کی پالیسی مقرر کرتے وقت قومی تحفظ اور عوام کے فایدہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اگر ضرورت

ہو تو ان سے بعض صنعتوں کو ملکی تحفظ کے بجٹ سے امداد دی جا سکتی ہے۔

جن صنعتوں کے لئے ملک میں کافی کچا مال موجود ہے اور مصنوعہ مال کے کافی منڈی ہے ان کی ناکامی کا صرف ایک ہی سبب ہو سکتا ہے یعنی بیرونی اور ملکی مقابلہ۔ بیرونی مقابلہ واقعی ایک سخت خطرہ ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے ہمیں تیار رہنا چاہیئے۔ اگر اس بیرونی مقابلہ کو روکا جائے تو ان صنعتوں کی کامیابی یقینی ہے۔ اس بیرونی مقابلہ کے روکنے کے سلسلے میں سب سے اہم عنصر ہماری محاصل درآمد کی پالیسی ہے جو فی الحال ہمارے ہاتھ میں مکمل طور پر نہیں ہے فیڈریشن میں جو اختیارات منتقل کئے جا رہے ہیں ان کے بارے میں چاہے جس قدر بھی اختلاف رائے ہو ایک بات بہر حال یقینی ہے کہ اگر تمام صوبوں اور ریاستوں کے نمائندے متفق ہو جائیں اور ان کا متفق ہونا ممکن ہے کیونکہ اس معاملہ میں صوبوں اور ریاستوں کے مفاد یکساں ہیں تو ہم ملک کے محاصل درآمد کی پالیسی پر اختیار حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لئے وزراء کی اس کانفرنس کو اس بات کا فیصلہ کرنا چاہیئے کہ ہر صوبہ کی حکومت ہر ممکن طریقہ سے جن میں محاصل درآمد کے ذریعہ تائیں بھی شامل ہے کم سے کم دس سال تک ان کلیدی صنعتوں کا تحفظ کرے گی۔ اگر تمام صوبوں کی حکومتیں اس محاصل درآمد کی پالیسی کے رشتہ میں اپنے آپ کو منسلک کرلیں گی تو قیمتوں میں اس قدر کی پیشی کرنا ممکن ہوگا کہ اس کے ذریعہ صنعت کو کامیاب بنایا جا سکیگا صوبوں کے لئے اس قسم کا ارادہ کرنے میں کوئی دشواری نہ ہونا چاہیئے۔

جہاں تک اندرونی مقابلہ کا سوال ہے اس کا امکان بہت کم ہے کیونکہ سرمایہ کی اتنی زیادہ ضرورت ہے کہ نجی سرمایہ داروں کے لئے حکومت کی امداد کے بغیر صنعتوں کا شروع کرنا مشکل ہوگا اس کے علاوہ حکومت نہایت آسانی کے ساتھ ملکی قوانین بنا کر ان پر نگرانی رکھ سکتی ہے۔ لیکن ایک اور بھی خطرہ ہے جس سے تحفظ ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ کہیں غیر ملکی کمپنیاں جن کے پاس سرمایہ بہت زیادہ ہے اپنی بڑی صنعتوں کو اس ملک میں شروع نہ کردیں اور اندرونی مقابلہ کا سبب بن جائیں۔ اگر موجودہ دستور کے اندر رہتے ہوئے ہم انھیں ان صنعتوں کو شروع کرنے سے باز نہ رکھ سکیں تو ہم یہ کرسکتے ہیں ہیں کہ کچے مال کے ذرائع پر اپنا اجارہ قائم کرلیں تاکہ ان غیر ملکی کمپنیوں کے لئے مقابلے کی صنعتیں کھولنے

کے لئے ان ذرائع پر قبضہ پانا ممکن نہ ہو سکے۔ اس کے علاوہ ایسے قوانین جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے اندر رہتے ہوئے بنائے جا سکتے ہیں بنائے جائیں اور ان سے غیر ملکی کارخانوں کو قدرتی ذرائع پر قبضہ کرنے سے محروم کیا جا سکے۔ اس تمام مسئلہ پر صفائی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے اور اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی جس میں سیاسی اور فنی ماہر شامل ہوں بنائی جا سکتی ہے۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ غیر ملکی سرمایہ داروں کو ہماری صنعتوں پر قبضہ حاصل کرنے کی اجازت نہ دی جائے نہیں تو آزادی محض مذاق ہو کر رہ جائے گی اور غیر ملکی قوموں کو اپنے تجارتی مفاد کے تحفظ کی آڑ میں ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کے بہانے ملتے رہیں گے۔

ابتدا میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں بڑی غیر ملکی کمپنیوں کی جن کو ان کاموں کا بہت کافی تجربہ حاصل ہے امداد لینا پڑے۔ تجارت اور معاشی زندگی میں بین الاقوامی رقابت آج کل اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ کسی نہ کسی قوم سے اس قسم کی مدد لینا ناممکن نہیں ہوگا کیونکہ ہندوستان کی اس صنعتی ترقی سے زیادہ تر برطانوی تجارت پر اثر پڑیگا جہاں سے موجودہ زمانے میں ہم اپنی مجموعی درآمد کا پچاس فی صدی حصہ حاصل کرتے ہیں۔ جن صنعتوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کے لئے نہایت قابل اعتماد اور خوب مستحکم کمپنیوں سے مدد لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ لیکن جو مدد بھی لی جائے وہ ہماری اپنی شرائط کے مطابق ہونا چاہیئے۔

کچھ بڑی بڑی صنعتیں ایسی ہیں جن میں بالکل ویسا ہی کچا مال استعمال کیا جاتا ہے جیسے دوسرے ملکوں میں۔ ان کے لئے ہمیں صرف اتنا کرنا ہوگا کہ ان دوسرے ملکوں کے طریقوں اور مشینوں کو اپنے ملک میں منتقل کریں۔ ان صنعتوں کے شروع کرنے میں کسی تحقیقات علمی کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہاں کی ہر چیز ان سے بالکل مشابہ ہے البتہ مزدوروں کی اہلیت کارکردگی میں فرق ہے سو اس کا لحاظ رکھا جا سکتا ہے۔

پھر کچھ صنعتیں ایسی ہیں جن کا کچا مال ہمارے یہاں یورپ سے کچھ مختلف ہے تو ان کے لئے ہمیں ان طریقوں میں کچھ تبدیلیاں کرنا ہوں گی جو دوسرے ملکوں میں رائج ہیں۔ اس کے لئے مقامی تحقیقات علمی کی ضرورت ہوگی اور جب اس قسم کی تحقیقات علمی کر لی جائے گی تب ہی ان صنعتوں کو شروع کرنا ممکن ہو سکے گا۔
لیکن صنعتوں کی ایک تیسری قسم بھی ہے جو ملک کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں لیکن جس کے

سے لئے ویسا معمولی کچا مال موجود نہیں ہے جیسا دوسرے ملکوں میں پایا جاتا ہے۔ ان کے لئے ایسے دوسرے کچے مال ڈھونڈنا ہوں گے جو دوسرے ملکوں کے کچے مال کا بدل بن سکیں گے۔ اس کے لئے بہت زیادہ تحقیقات علمی کی ضرورت ہوگی۔

پہلی قسم کی صنعتوں کے شروع کرنے میں تو کوئی دشواری نہ ہونا چاہیئے۔ اسی طرح دوسری قسم کی صنعتوں کو بھی تھوڑی سی تحقیقات علمی کے بعد شروع کیا جاسکتا ہے۔ البتہ تیسری قسم کی صنعتوں کے لئے مکمل تحقیقات کی ضرورت ہوگی اور تحقیقات کا کام مختلف صوبوں کی انسٹیٹیوں اور افراد کو سپرد کیا جاسکتا ہے تاکہ اس قومی کمزوری کا ازالہ کیا جا سکے اور ملک کو اس کی تمام اہم ضرورتوں کے لئے اپنا کفیل خود بنایا جا سکے۔

اگر ان تمام چیزوں کا فیصلہ ہو جائے تو ہم اپنے ملک کی صنعتی عمارت کو ٹھوس بنیاد پر تعمیر کر سکتے ہیں۔ اگر ہم ایک معقول پنجسالہ منصوبہ تیار کریں اور اسی پورے جوش کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں تو درآمد کو ساٹھ یا ستر فی صدی تک کم کیا جاسکتا ہے اور ملک کو تمام اہم ضرورتوں کے لئے اپنا کفیل خود بنایا جاسکتا ہے اس کے علاوہ اس قسم کی صنعتوں کی ترقی سے جیسے کیمیاوی کھاد کی صنعت سے ہماری زراعتی پیداوار میں بہت کچھ اضافہ ہوسکتا ہے۔ اور اس پالیسی پر عمل کرنے سے ہوسکتا ہے کہ قومی پیدائش دولت میں آئندہ پانچ سالوں میں تقریباً تین ارب روپیہ کا اضافہ ہو جائے۔ دو ارب روپیہ کا زراعت میں اور ایک ارب روپیہ کا صنعت میں اور یہ کانگریسی حکومتوں کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

ہندوستان میں آبادی کا مسئلہ

(از جناب پی ۔ کے ۔ وٹل صاحب)

ہندوستان کی آبادی کی ترقی کے اعداد و شمار سے ہر شخص واقف ہے۔ ۱۸۷۱ء میں جب پہلی مردم شماری ہوئی تھی اس ملک کی آبادی ۲۵ کروڑ چالیس لاکھ تھی ۱۹۲۱ء میں انفلوئنزا کی وبا کے فوراً بعد آبادی کی تعداد ۳۱ کروڑ ۹۰ لاکھ ہوگئی تھی ۱۹۳۱ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۳۴ کروڑ ۳۰ لاکھ ہوگئی تھی اور اب اگر صحت عامہ کے کمشنر نے جو تخمینہ کیا ہے اسے صحیح مان لیا جائے تو ہماری آبادی برما کو شامل کرنے کے بعد ۳۸ کروڑ سے کم نہ ہوگی ۱۹۴۱ء تک جبکہ نئی مردم شماری کی جائے گی توقع ہے کہ آبادی بڑھ کر ۴۰ کروڑ تک پہنچ جائے گی۔

۱۸۷۱ء سے ۱۹۲۱ء تک یعنی پچاس سال کی مدت میں آبادی کے اضافہ کی شرح اعشاریہ آٹھ سالانہ ہوتی تھی ۱۹۲۱ء کے بعد سے یہ شرح ایک فی صدی سالانہ سے کچھ زائد ہوتی ہے۔ یورپ اور ایشیا کے اور بھی بہت سے ملک ایسے ہیں جن کی آبادی کے اضافہ کی شرح اور آبادی فی مربع میل ہندوستان کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ ان میں جاپان کی مثال خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے۔ دوسری مثال برطانیہ عظمیٰ کی ہے اگرچہ اس کی شرح اضافہ ۱۹۲۱ء کے بعد سے کم ہوگئی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس اضافہ کی وجہ سے کون سے فوری مسائل پیدا ہوتے ہیں؟ ہندوستان کے موت وحیات کے اعداد و شمار جو شخص بھی مطالعہ کرتا ہے اسے ملک کے اندر شرح اموات کی کثرت کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے ہم انسانوں کی ایک کثیر تعداد کو پیدا کرتے ہیں جن کی ایک بڑی تعداد بلوغت کی عمر تک پہنچنے سے پہلے مرجاتی ہے اور ایسی تعداد جو خاصی بوڑھی عمر تک پہنچتی ہے بہت کم ہوتی ہے۔ پیدا ہونے والے ہر سو اشخاص میں سے ۵۴ پانچ برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے مرجاتے ہیں۔ مغربی یورپ کے ملکوں میں صرف چودہ یا پندرہ اشخاص اس طرح مرتے ہیں۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ ہمارا سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ شرح اموات کو کم کیا جائے۔ اس وقت یہ ۲۴

فی ہزار ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ گھٹ کر ۱۲ فی ہزار ہو جائے کہ یہی تقریباً جاپان کی بھی شرح ہے اگرچہ مغربی ملکوں کے معیار کے مقابلہ میں یہ بھی زیادہ ہے کیونکہ وہاں ۱۲ فی ہزار کو معقول شرح سمجھا جاتا ہے۔ اس مقصد کو کس طرح حاصل کیا جائے؟

صحت عامہ کو ترقی دینے سے بلاشبہ اس سمت میں ایک قدم اٹھایا جا سکتا ہے اور صوبوں کی حکومتوں کو چاہیئے کہ بیماریوں کو روکنے اور ختم کرنے کے لئے حفظان صحت کے محکموں پر زیادہ روپیہ خرچ کریں۔ لیکن اگر آبادی کے اندر بیماریوں کی مدافعت کے لئے زندگی اور قوت موجود نہ ہو اور ان کی پرورش ایسے ماحول میں ہو جو انسانی جسم کی تندرست نشو و نما کے لئے ناموزوں ہے تو حفظان صحت کے محکمے اپنے تمام نیک ارادوں اور حکومت کا زیادہ سے زیادہ روپیہ خرچ کرنے کے باوجود بھی کچھ نہ کر سکیں گے۔

اس سلسلہ میں یورپ میں جو تجربات کئے گئے ہیں وہ ہمارے لئے بہت سبق آموز ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ شرح اموات کی یورپ کے ملکوں میں بھی اتنی ہی کثرت تھی جتنی ہمارے ملک میں ہے۔ ان ملکوں میں شرح پیدائش بھی اتنی ہی زیادہ تھی جتنی ہمارے یہاں ہے۔ پھر ایک زمانہ آیا جب شرح پیدائش گھٹنے لگی۔ عین اسی وقت شرح اموات میں بھی کمی ہونا شروع ہو گئی۔ اس لئے میرا یہ خیال یہ ہے کہ کوشش کو دونوں سمتوں میں شروع کرنا ہوگا اور اسی طریقہ پر عمل کرکے ہم اپنی شرح اموات کو گھٹا کر ۱۲ فی ہزار کی شرح پر لا سکیں گے صحت عامہ کی ترقی پر زیادہ روپیہ صرف کرنا ہوگا لیکن اس کے ساتھ ساتھ شرح پیدائش کو بھی گھٹانا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ شرح پیدائش ۳۵ فی ہزار سے گھٹ کر ۲۰ فی ہزار ہو جائے۔ اگر ایسا ہو جائے گا تو بچوں کی اموات کی موجودہ خوفناک کثرت اور زچگی کی حالت میں نوجوان ماؤں کی اموات کی کثرت دونوں کم ہو جائیں گی۔

ہماری شرح اموات کی زیادتی کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کے آدمیوں کی عمریں مغربی یورپ کے ملکوں بلکہ جاپان کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی ہیں۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے ساتھ جو متوقع عمر کی رپورٹ شائع کی گئی تھی اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بچے کی متوقع زندگی پیدائش کے وقت صرف ۲۷ سال اور بچی کی صرف ۲۶½ سال ہوتی ہے۔ جاپان میں یہی عمر مردوں کے لئے ۴۴ سال اور عورتوں کے لئے ۴۳ سال ہوتی ہے۔ انگلستان میں مردوں کے لئے ۵۹ سال اور عورتوں کے لئے ۶۳ سال ہوتی ہے۔

اس ضمن میں آبادی اور غذا کی رسد کا جو باہمی تعلق ہے اس کا مطالعہ کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس سلسلہ میں دو باتیں ہیں جن کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ آیا ہماری غذا کی رسد آبادی کی ترقی کے ساتھ بڑھ رہی ہے یا نہیں اور دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا غذا کی جو مقدار موجود ہے وہ ہمارے آدمیوں کے لئے ایک معقول معیار زندگی قائم رکھنے کے لئے کافی ہے یا نہیں ہے۔ دوسرے سوال کے جواب دینے کے لئے تو کافی مواد موجود نہیں ہے اور جو جواب دئے جاتے ہیں ان میں اندازے سے بہت زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ لیکن اس بات کے تسلیم کرنے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ہماری آبادی کو کافی غذا میسر نہیں آتی۔ پروفیسر رادھا کمل مکرجی نے تخمینہ کیا ہے کہ ۱۹۳۱ء میں ہماری غذا کی کمی کی مقدار بحساب ۲ ہزار آٹھ سو کلاری فی آدمی فی یوم اکتالیس ارب نوے کروڑ کلاریز تھی اور ہندوستان میں آج ۴ کروڑ ۸۰ لاکھ آدمیوں کے لئے غذا موجود نہیں ہے۔

پہلے سوال (یعنی آبادی کے اضافہ اور غذا کی مقدار کے اضافہ کی نسبتی شرح) کا جہاں تک تعلق ہے اعداد وشمار زیادہ موجود ہیں اگرچہ یہ بھی اتنے زیادہ بھروسہ کے لائق اور مکمل نہیں ہیں جیسے مغربی ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس بات میں کسی اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہے کہ مجموعی مزروعہ رقبہ یا رقبہ زیر اجناس خوردنی نے آبادی کے اضافہ کا ساتھ نہیں دیا ہے۔ البتہ پیداوار کی مقدار کے بارے میں یہ ضرور کہا جاتا ہے کہ زراعت کی مجموعی پیداوار نیز غذا کی پیداوار میں آبادی کے مساوی ترقی ہوتی رہی ہے۔ لیکن یہ ترقی جو کچھ ہوئی ہے وہ ادنیٰ قسم کے اناج میں ہوئی ہے اور گیہوں کی پیداوار میں مسلسل کمی نظر آتی ہے۔ جب ہم اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں کہ گذشتہ بیس سالوں میں پالتو جانوروں کی تعداد میں تقریباً ۱۵ فی صدی کا اضافہ ہوگیا ہے اور ادنیٰ اناج کے کھانے میں پالتو جانور بھی شریک ہوتے ہیں تو اس کے ماننے میں کوئی شبہ کا موقع نہیں رہتا کہ ہماری غذا کی مقدار میں آبادی کے اضافہ کی نسبت سے خاصی بڑی کمی واقع ہوگئی ہے۔

اب صرف یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ روزگار کی موجودہ صورت حال کیا ہے۔ روزگار کے خاص ذرائع زراعت اور صنعت ہیں۔ صنعت کے ذریعہ سے جن لوگوں کو روزگار ملتا ہے ان کا تناسب مردم شماری میں گھٹتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس زراعت پر بسر کرنے والے لوگوں کا تناسب بڑھ رہا ہے۔

اور چونکہ مزروعہ رقبہ میں اضافہ، آبادی کے اضافہ کے متناسب نہیں ہے اس لئے زراعت پیشہ آبادی کے
پاس رقبہ فی کس برابر کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ افسوس ہے کہ زراعتی رقبہ مقبوضہ کی وسعت کے بارے میں اعداد
موجود نہیں ہیں اور اس لئے یہ صحیح صحیح بتانا ممکن نہیں ہے کہ ملک میں غیر فائدہ بخش رقبات مقبوضہ میں کتنا
اضافہ ہوا ہے۔ اس کے بارے میں معلومات کی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ اسی وقت ہم یہ کہ سکیں گے کہ زمین
کس حد تک آبادی کے دباؤ کو برداشت کرنے کی اہلیت رکھتی ہے یا نہیں رکھتی۔ لیکن اس بات کا یقین عام
طور پر پھیلتا جا رہا ہے کہ زراعت کا کام نفع بخش نہیں رہا ہے اور مقبوضہ رقبے روز بروز غیر فائدہ بخش ہوتے
چلے جا رہے ہیں۔ کھیتی کے لئے فراہمی اصل کی جتنی تجویزیں ہیں اور کاشتکار کو قرضے کے بارے نجات دلانے
کے جتنے منصوبے ہیں ان کی کامیابی نفع بخش مقبوضہ رقبوں کی موجودگی پر منحصر ہے۔

اس کے بعد میں اس کا تخمینہ کرنا چاہتا ہوں کہ ملک میں کتنا روزگار موجود ہے۔ اعداد و شمار کے
موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہ کام بہت مشکل ہے۔ لیکن میں نے حال میں اس قسم کی ایک کوشش کی تھی۔ میں
نے سنہ ۱۹۰۱ء، سنہ ۱۹۱۱ء، سنہ ۱۹۲۱ء، سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے نقشوں سے کچھ اعداد لیے تھے اور ان کو مندرجہ
ذیل طریقہ پر بے روزگاری کے دریافت کرنے کے لئے استعمال کیا تھا:۔

مردوں کی مجموعی آبادی میں سے میں نے صفر سے دس اور ساٹھ اور ساٹھ سے زائد عمر تک کے مردوں
کو منہا کر دیا اس سے روزگار سے لگنے کے قابل مردوں کی تعداد معلوم ہو گئی۔ اس میں سے پھر میں نے ان
مردوں کی تعداد کو گھٹا دیا جو دس سے ساٹھ کی عمر تک تو تھے لیکن معذور تھے مثلاً پاگل، اندھے، بہرے، گونگے
وغیرہ۔ مردم شماری کے اعداد سے کام نہ کرنے والے مردوں کی تعداد کو بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس میں
سے میں نے صفر سے دس اور ساٹھ اور ساٹھ سے زائد عمر کے لوگوں کو منہا کر دیا۔ اس کے علاوہ میں نے
ان مردوں کو بھی منہا کر دیا جن کی عمر تو دس اور ساٹھ کے درمیان تھی لیکن جو معذور تھے اس طرح کام نہ کرنے
والی تندرست آبادی کے اعداد حاصل ہو گئے۔ دس سے ساٹھ تک کی عمر کے تندرست کام نہ کرنے والے
مردوں کا جو تناسب دس سے ساٹھ تک کی عمر کی مجموعی مردوں کی آبادی سے تھا اس سے فی صدی بے روزگاری
کا علم حاصل ہو گیا۔ چنانچہ یہ فرض کرنے کے بعد کہ یہ طریقہ قابل اعتماد ہے تمام ہندوستان کے لئے اعداد حسب

حسب ذیل ہوتے ہیں :۔

مردم شماری کا سال	بے روزگاری کا تناسب فی صدی
سنہ ۱۹۰۱ء	۱۱ء ۷
سنہ ۱۹۱۱ء	۱۶ء ۷
سنہ ۱۹۲۱ء	۱۰ء ۳
سنہ ۱۹۳۱ء	۱۴ء ۲

ان اعداد سے بے روزگاری میں مسلسل اضافہ نظر آتا ہے۔ ممکن ہے اس طریقہ سے حقیقی بے روزگاری کا صحیح علم حاصل نہ ہو سکے لیکن کم سے کم بے روزگاری کے اندازہ کرنے کے لئے اس طریقہ کو بالکل بے کار نہیں کہا جا سکتا۔ اوپر کے اعداد کے دیکھنے سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ عین اس وقت جب کہ آبادی میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا بے روزگاری میں بھی مسلسل اضافہ کا سلسلہ جاری تھا۔

غرض کہ آبادی کے مسئلہ کے مندرجہ بالا خاص پہلوؤں میں کچھ پہلوؤں پر مزید تحقیقات کی ضرورت ہے لیکن کچھ ایسے ہیں کہ جن کے بارے میں فوری کارروائی شروع کی جا سکتی ہے اور کرنا چاہیئے۔

زرعی قرضداری اور حیدرآباد کے نئے قوانین

(از جناب محمد احمد سبزواری بی اے (عثمانیہ)

زراعت جو ہندوستان کے ہر صوبہ اور ریاست کا اہم پیشہ ہے اور جس پر ملک کی ۷۰ فیصد آبادی کا دارومدار ہے اس کی اصلاح و ترقی سب سے اہم ہے، مگر ہماری زراعت متعدد خرابیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ مختلف خرابیاں ایک دوسرے سے اس قدر مل جل گئیں ہیں کہ ان کا تجزیہ کرنا بہت مشکل ہے، زرعی ترقی اس وقت تک ناممکن ہے تاوقتیکہ زراعت کی اصلاح کے لئے کوئی ایسا جامع خاکہ تیار نہ کیا جائے جو تمام شعبوں پر حاوی ہو، تاکہ بہ یک وقت خرابیوں کا انسداد ہوکر مجموعی حیثیت سے زراعت کو فائدہ ہو رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری صدر اعظم ریاست حیدرآباد نے اس نکتہ کو سمجھ کر ریاست حیدرآباد کی زرعی ترقی کے لئے ایک جامع زرعی پروگرام ترتیب دینے کا تہیہ کیا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے زرعی منڈیوں کے قیام کے لئے ایک قانون نافذ کیا گیا، تاکہ کاشتکاروں کو بے ضابطہ منڈیوں میں جو نقصان پہنچتا ہے اس سے محفوظ رکھا جائے، اس قانون کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ برطانوی ہند کے قانون کی طرح صرف روئی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ اسکا اطلاق تمام زرعی پیداواروں پر ہوتا ہے۔ محکمہ زراعت کو وسعت دی گئی، اس کے تحت متعدد مزروعے اور تجربے خانے قایم کئے گئے، جہاں زرعی پیداواروں، فصلوں کی بیماریوں، مویشیوں کی بیماریوں اور علاج معالجے کی جانب خاص طور پر توجہ کی جاتی ہے، چنانچہ اس وقت تک چاول، مونگ پھلی، نیشکر وغیرہ کی مقامی اعلیٰ قسمیں دریافت ہو چکی ہیں، اور ان کے تخموں کو ملک میں رواج دینے کی کوشش جاری ہے،

فصلوں کی بعض بیماریوں کے علاج بھی معلوم کئے گئے ہیں۔ حال ہی میں معلومات عامہ کی ایک اطلاع سے معلوم ہوا ہے کہ محکمہ نے مویشیوں کی بعض بیماریوں کے نئے طریق علاج دریافت کئے ہیں جو اس قدر آسان اور ارزاں ہیں کہ ایک معمولی کاشتکار بھی ان کی قیمت برداشت کر سکتا ہے۔ دیہات سدھار کے سلسلہ میں ایک مرکزی بورڈ قائم ہے جو کونسل کے اراکین، متعلقہ محکموں کے معتمدین، رنظما، امداد باہمی کے رجسٹرار، مارکٹنگ آفیسر اور سنٹرل کوآپریٹیو یونین کے نمائندہ پر مشتمل ہے۔ اس کے تحت اضلاع میں ضلع واری اور تعلقوں میں تعلقہ داری کمیٹیاں بنائی گئیں ہیں۔ جن میں غیر سرکاری مقامی لوگ بھی شریک کئے جاتے ہیں۔ مرکزی بورڈ ایک عام اسکیم بناتی ہے اور ذیلی کمیٹیاں اسکو عملی جامہ پہناتی ہیں۔ مختلف مقامات پر دیہی تنظیم کے مرکز قائم ہیں، نمائشوں، مظاہروں، تقریروں اور طلسمی فانوسوں کے ذریعہ کاشتکاروں میں تبلیغ کی ہر ممکنہ کوشش کی جاتی ہے حال میں کاشتکاروں کو قرضہ کے بار سے نجات دلانے، موروثی قرضوں کی تنسیخ کرانے اور ان کی زمینوں کو ساہوکاروں کے قبضے میں جانے سے روکنے کے لئے تین دستور العمل نافذ کرکے برطانوی ہند کے ان صوبوں کے لئے بڑی اچھی مثال قائم کی ہے، جہاں آج کل ساہوکاروں پر بعض پابندیاں عائد کرنے کے سلسلہ میں قوانین زیر غور ہیں۔ یہاں بہاؤنگر کی طرح سارا زرعی قرضہ معاف نہیں کیا گیا۔ کیونکہ صرف قرضہ معاف کر دینے سے کاشتکار کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، وہ از سر نو قرض لے گا اور پرانے حالات پھر عود کرآئیں گے، دراصل حقیقی اصلاح یا تو ان خرابیوں کو مستقل طور پر دور کرنا ہے جن کی بدولت قرض لیا جاتا ہے اور اس میں مزید اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یا ایسے ادارے قائم کرنا ہیں جو آئندہ ان کو زمین یا فصلوں کی ضمانت پر طویل مدت کے لئے قرض دے سکیں، چنانچہ اول الذکر خرابی کو دور کرنے کے لئے نئے قوانین بنائے گئے جن کا تفصیلی ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے، دوسری خرابی کے لئے ایک مرکزی زمین گروی بنک کی تجویز زیر غور ہے، نیز اسٹیٹ بنک کے قیام کا مسئلہ بھی زیر بحث ہے، ان دونوں اداروں کے قیام سے ملک اور بالخصوص کاشتکاروں کو بڑا فائدہ ہوگا۔

نئے قوانین کا ذکر کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ کیوں زرعی قرضداری نے موجودہ زمانہ میں اتنی شدت اختیار کر لی ہے، زراعت میں قرضہ کی کیوں ضرورت ہوتی ہے، ملک میں

قرض دینے والے کون سے ادارے ہیں، نیز ساہوکاری طریق میں کیا خرابیاں ہیں جن کے انسداد کے لئے قانون بنانے کی ضرورت ہوئی، ذیل میں ان ہی باتوں کی مختصر تشریح کی گئی ہے۔

تاریخی پس منظر | ہندوستانی گاؤں جس زمانہ میں خود کفالت کے دور میں تھے، زراعت کے لئے کسی خاص قرضہ کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ کاشتکاروں کی ضروریات معمولی اور ادنیٰ تھیں، اکثر و بیشتر چیزیں خود پیدا کر لیا کرتے تھے، مثلاً گیہوں، جوار، مکی، نخود، دھان، دالیں وغیرہ، معمولی ترکاریاں مثلاً بیگن، اروی، کدو، لوکی، ہلدی، مرچ، ادرک، پیاز، لہسن گھر کے خرچ کے لئے کھیتوں میں پیدا کر لیا جاتا تھا۔ وہ خود روئی اگلتے، ان کی عورتیں سوت کاتتی، اور گاؤں کا جولاہا کپڑا بن دیتا تھا، اگر رنگنے کی ضرورت ہو تو گاؤں کا رنگریز مقامی رنگوں سے کپڑا یا سوت رنگ دیتا تھا، لوہار اور بڑھئی آلات زراعت اور گھر کی ضروریات کی چیزیں تیار کرتے، کمہار برتن بناتا، چمار جوتے تیار کرتا، حجام، دھوبی، سقہ، بھنگی، دائی، بھوئی اور دوسرے کمین اپنی مفوضہ خدمات انجام دیتے تھے۔ روپیہ دینے کی ضرورت کسی کو پیش نہ آتی تھی ہر ایک کو فصل پر غلہ دیا جاتا تھا، چراگاہوں کا رقبہ کافی تھا اس وجہ سے چارہ کی افراط تھی اور مویشیوں کی حالت اچھی تھی، دودھ، دہی، مکھن اور گھی خوب پیدا ہوتا تھا اور سب گاؤں ہی میں رہتا تھا۔ پیشہ ور گڈریے اچھی قسم کی نسلیں پیدا کرتے اور کاشتکاروں کو اچھے مویشی مہیا کر دیتے، یہی لوگ بھیڑوں کے اون سے کمبل بنتے تھے۔ اور کبھی اپنی خدمات یا اشیا کے معاوضہ میں نقد روپیہ طلب نہ کرتے بلکہ فصل پر غلہ لیا کرتے تھے۔ گو اس زمانہ میں بھی ساہوکاروں کا طبقہ موجود تھا جو جنس یا نقد کی شکل میں قرضہ دیتا تھا لیکن نہ تو قرضہ کی تعداد زیادہ ہوتی تھی، اور نہ شرح سود اتنی اعلیٰ، پھر وہ کسان کو اس طرح دبا بھی نہ سکتا تھا جیسا کہ آج کل ہوتا ہے کیونکہ گاؤں میں پنچایتیں موجود تھیں جو گاؤں کے تمام معاملات کا تصفیہ کیا کرتی تھیں ان کے فیصلے موجودہ عدالتوں سے بالکل مختلف ہوتے تھے، ان مختلف اسباب کی بنا پر اس زمانہ میں زرعی قرضداری کا سوال پیچیدہ اور شدید نہ تھا۔

اب گاؤں کا قدیم نظام بدل رہا ہے، کاشتکار کی ضروریات میں نسبتاً اضافہ ہو گیا ہے، اس کی اکثر ضروریات گاؤں میں پوری نہیں ہوتیں، اشیا سے اشیا کا لین دین موقوف ہو گیا، زر کی ضرورت

پیدا ہونے لگی اشتراک خاندان اور اجتماعی مفادات کے رجحانات کی جگہ انفرادیت اور معاشی آزادی لے رہی ہے کسان اپنی پیداوار کا ایک حصہ بین الاقوامی بازاروں کے لئے اگانے لگا ہے۔ جہاں کی قیمتوں پر اسکے گاؤں کی فصلوں کی اچھائی یا بُرائی کا کوئی اثر نہیں پڑتا، پنچائتیں ختم ہوگئیں، ان کی جگہ شہروں میں عدالتیں قائم ہوئیں، چھوٹے چھوٹے معاملات کے لئے شہروں میں آنے کی ضرورت ہونے لگی، آنے جانے کے مصارف وکیل اور دوسرے لوگوں کو محنتانہ یا نذرانہ ادا کرنے کی ضرورت ہونے لگی، ان مزید اخراجات کے باوجود یہ یقین نہیں کہ عدالت میں حقیقی انصاف ہوگا کیونکہ جج کو حقیقی اور سچی باتوں کا علم نہیں ہوتا وہاں کارروائی اور ثبوت پر فیصلہ ہوتا ہے، پنچائتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا وہاں پنچ فریقین سے واقف ہوتے تھے اور سارے واقعات کا علم ہوتا تھا اس لئے فیصلے صحیح ہوتے تھے۔ وسائل نقل و حمل کے تیز رفتار ذرائع نے جہاں بعض سہولتیں پیدا کیں وہیں کاشتکار کے اخراجات میں بھی اضافہ کیا، نیز ان ذرائع سے وقت کی جو بچت ہوتی ہے اس سے اسکو کوئی فائدہ نہیں، گویا ان سب باتوں کا مطلب یہ ہے کہ اب قرض لینے کے مواقع زیادہ پیدا ہوگئے ہیں، اسی وجہ سے چند سالوں سے زرعی قرضہ کے مسئلہ نے ساری دنیا میں اہمیت اختیار کرلی ہے۔ بالخصوص زرعی پیداواروں کی قیمتوں میں تخفیف سے اس مسئلہ کی شدت میں مزید اضافہ ہوا۔ ہندوستان میں اس لئے بھی اس کی اہمیت ہے کہ یہاں کے کسان اَن پڑھ، ناواقف، غیر منظم مفلس مسرف، حساب وکتاب سے ناواقف ہیں، ان کی ساکھ یا اعتبار بہت ہی کم ہے۔

قرضہ کی ضرورت موجودہ زمانہ میں کاروبار اپنی ذاتی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے نہیں کئے جاتے، کپڑے کے کارخانے کا مالک ہر سال ہزاروں گز کپڑا اس لئے تیار نہیں کرتا کہ وہ یا اس کا خاندان اس کو استعمال کرے گا۔ بالکل یہی حال زراعت کا ہے، اب کسان اس لئے کاشت کرتا ہے کہ اپنی پیداواروں کے معاوضہ میں ضروریات کی دوسری چیزیں خریدے گویا اب دونوں کاموں کا مقصد عالمی طلب کو پورا کرنا ہے۔ صنعت ہو یا تجارت دونوں میں قرض کی ضرورت ہے جس طرح صنعت میں سرمایہ قرض لیکر جمع کیا جاتا ہے اسی طرح زراعت کے لئے بھی قرض سے حاصل شدہ سرمایہ کی ضرورت ہے، بلکہ زراعت میں تو قرض کی ضرورت اس لئے اور زیادہ ہو جاتی ہے کہ یہ انفرادی پیشہ ہے صنعت میں چند افراد مل کر کچھ سرمایہ جمع کرتے ہیں مگر

زراعت میں یہ سہولت بھی نہیں، پھر یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اکثر و بیشتر کسانوں کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی مقبوضہ اراضی کی ضروریات عمدگی سے پوری کرسکیں، اچھی زراعت کے لئے سرمایہ ناگزیر ہے، کیونکہ اگر سرمایہ کی کمی سے آلات و اوزار یا مویشی محدود ہوں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ کسان اپنی طاقتوں کے بڑے حصہ کو ضائع کر رہے ہیں۔

زراعت میں مختلف کاموں کے لئے قرض لیا جاتا ہے۔ عام طور پر ماہرین زرعی نے قرضہ کی تین صورتیں بتائی ہیں، پہلے قلیل مدت کے قرضے ہیں جن میں روزمرہ کے مصارف یا کسی خاص فصل کے اخراجات شامل ہوں، ان کی مدت ۹، ۱۰ ماہ تک ہوتی ہے، دوسرے متوسط مدت کے قرضے، ان کا کسی خاص فصل سے تعلق نہیں ہوتا، ان کی میعاد ایک سال سے تین سال تک ہوتی ہے، تیسرے طویل مدت کے قرضے ہیں، ان کا مقصد مستقل ترقیات و اصلاحات اراضی ہے، مختلف ملکوں میں اپنے مقامی حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی مدت مختلف ہے، مگر ہندوستان میں ان کی میعاد کا اوسط ۲۰ سال ہے۔

قرض دینے والے ادارے | ہندوستان میں اول تو ویسے ہی بنکوں کی کمی ہے، جو بنک ہیں وہ تجارتی ہیں اور شہروں میں قائم ہیں، اور شہریوں ہی سے تجارتی تعلقات رکھتے ہیں، تجارتی بنکوں کے لئے زراعت پیشہ لوگوں سے کاروبار کرنا مشکل بھی ہے، بنک سے کاروبار کرنے کے لئے تھوڑی بہت واقفیت اور تعلیم کی ضرورت ہے جو ہمارے یہاں کم و بیش مفقود ہے، کاشتکار کی ساکھ بہت ہی کم ہے، اس کے پاس ضمانت کے لئے زمین، مویشی اور فصل کے موقع پر پیداوار ہوتی ہے، بنک جن کا یہ اصول ہے کہ اپنے اثاثوں کو بوقت ضرورت زر نقد میں تبدیل کرا سکیں ان چیزوں کی ضمانت پر قرض نہیں دے سکتے، پھر کاشتکار کو چھوٹی چھوٹی رقموں کی ضرورت ہوتی ہے جو سال بھر تک پھیلی رہتی ہے۔ بنکوں کے لئے ان رقموں کا حساب رکھنا اور انفرادی طور پر کاشتکار سے کاروبار کرنا آسان کام نہیں، جب ان کے سامنے تجارت کے دوسرے آسان راستے کھلے ہوتے ہیں تو ان کو کیا ضرورت کہ خواہ مخواہ خطرہ اور مصیبت کے کاموں میں اپنا روپیہ پھنسائیں، دراصل زرعی اغراض کے لئے قرض دینے والے خاص بنک ہوتے ہیں مگر ملک میں ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔

۱۹۰۴ء میں جب انجمن ہائے امداد باہمی کا پہلا قانون نافذ ہوا تو اس سے یہ امید کی گئی تھی کہ وہ زرعی قرضداری کے مسئلہ کا کوئی حل تلاش کریگا، لیکن یہ نئی تجویز بری طرح ناکام ہوئی دراصل غلطی ابتدا میں ہوئی امداد باہمی کو آپس کے اشتراک سے قائم ہونا چاہئیے تھا، پہلے لوگوں میں اس کا احساس ہوتا پھر انجمنیں قائم کی جاتیں، مگر ہندوستان میں ایسا نہیں ہوا، حکومت نے قانون کے ذریعہ یہ جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی، حکومت کی جانب سے جو لوگ اس کام کی تبلیغ کے لئے مقرر کئے گئے وہ ایک طرف تو اسکے صحیح اصولوں سے ناواقف تھے دوسرے انھوں نے اپنی کارگذاری دکھانے کے لئے انجمن قائم کرنا شروع کر دیں، بجائے "خوبی" کے "تعداد" پر غور ہونے لگا، صوبوں میں ایک قسم کا مقابلہ شروع ہو گیا اور انجمنوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ عمارت تو پہلے ہی سے اندر سے کھوکھلی تھی مگر اوپر کی لیپ پوت نے عیب کو چھپا رکھا تھا، مگر ۱۹۳۱ء میں کساد بازاری کی وجہ سے زمینوں اور پیداواروں کی قیمتیں گرنے لگیں تو سارا بھرم کھل گیا۔ بہرحال گوناگوں نقائص، کاشتکاروں کی ناواقفیت، اور چھوٹے چھوٹے عہدہ داروں کی بداعمالیوں کے سبب سے یہ تحریک ملک میں کچھ زیادہ سرسبز نہو سکی ۵۰ سال کے عرصہ میں صرف ۸ فیصد آبادی اس سے متاثر ہوئی، اور جو امیدیں اس سے وابستہ کی گئی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔

حقیقی معنوں میں ملک کی زراعت کے لئے سرمایہ فراہم کرنے والا طبقہ ساہوکاروں کا ہے، کم و بیش ہر گاؤں میں ساہوکار کا وجود ناگزیر ہے، ان کا کاروبار بہت وسیع ہے، کاروبار کی وسعت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ہندوستان اور بالخصوص پنجاب میں سب سے زیادہ انکم ٹیکس ادا کرنے والا یہی طبقہ ہے۔ ہندوستانی زرعی قرضہ کی بڑی تعداد ان ہی سے حاصل کی گئی ہے، اس لئے وہ تعریف کے مستحق ہیں کہ وہ ایک ایسے شعبہ کی مدد کر رہے ہیں جس کی طرف سے سب لاپروا ہیں۔ وہ بلاشبہ ایسے کم ساکھ والوں کو قرض دیتے ہیں جن کو کہیں سے قرض نہیں مل سکتا، وہ پیدا آور بلکہ زیادہ تر غیر پیدا آور دونوں ہی کاموں کے لئے قرض دیتے ہیں، وہ وقت پر ان کی مدد کرتے ہیں، اس میں بھی شک نہیں کہ ان کا کچھ روپیہ ڈوب جاتا ہے، بعض لوگ ان کا روپیہ واپس نہیں کرتے، لیکن ان سب باتوں کے باوجود ساہوکار

ابھی تک اس شعبہ میں اپنا روپیہ لگا رہے ہیں خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ حقیر نقصانات ان کے کثیر منافع کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے، اور واقعہ بھی یہی ہے ساہوکار اپنی ترکیبوں، چالوں اور حیلا لاکیوں سے مطالبات خطیر سے کہیں زیادہ رقم وصول کرتے ہیں، ان کو گاؤں میں اجارہ حاصل ہے، کاشتکار مجبور ہے کہ وہ ان سے قرض لے کیونکہ اور کوئی ذریعہ موجود نہیں، اس طرح ان کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے اور یہ من مانی شرطیں ان سے منوا سکتے ہیں، مختصر یہ کہ ساہوکار کاشتکاروں کا مخفی اور بین دونوں طرح استحصال کرتے ہیں۔ ان کے کاروبار میں کیا نقائص ہیں، اور وہ کس طرح کاشتکاروں کا استحصال کرتے ہیں ان کو ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔

مہاجنی کاروبار کے نقائص (۱) جو رقم قرض دیتے ہیں اس پر بہت اعلیٰ شرح سود وصول کرتے ہیں، مسٹر ایس، ایم بھروچہ جن کو ریاست حیدرآباد میں زرعی قرضہ کی تحقیقات کرنے پر مامور کیا گیا تھا بتلاتے ہیں کہ ریاست میں ۱۵ سے ۴۰ فیصد تک شرح عام ہے، مجھے حال میں ایک موضع کی معاشی تحقیق کا موقع ملا تو موضع کی شرح سود ۱۸ سے ۷۵ فیصد تک معلوم ہوئی، نیز اچھے اور عمدہ ساکھ والے کاشتکاروں کو کم شرح پر قرض دیتے ہیں، معمولی اور غریب کاشتکاروں سے بہت زیادہ شرح سود وصول کرتے ہیں۔

(۲) اپنی قرض دی ہوئی رقموں پر سود در سود وصول کرتے ہیں، اس طرح رقم بہت آسانی سے دوگنی چوگنی ہو جاتی ہے۔ مجھے دوران تحقیقات میں متعدد ایسے واقعات معلوم ہوئے جن میں رقم اصل سے بہت بڑھ گئی تھی مثلاً ایک مسلمان نے ۱۸ فیصد کے حساب سے سو روپیہ قرض لیا، ۵۰ روپیہ ادا کرنے کے بعد وہ مرگیا دس سال کے بعد جب اس کے بیٹے نے پرانا حساب کیا تو رقم ۴۴۴ ہوگئی تھی۔ ساہوکار نے متوفی کے بیٹے کو دو سو روپیہ قرض دیکر ۴۴۵ روپیہ کا کاغذ لکھوالیا۔

(۳) جنس میں بھی اعلیٰ شرح سود اور سود مرکب کا طریقہ رائج ہے، ساہوکار اپنے موکلوں کو جنس کی شکل میں تخم یا کھانے کے لئے غلہ دیتا ہے، جتنا غلہ دیا جاتا ہے فصل پر اس کا ڈیوڑھا یا دگنا وصول کیا جاتا ہے اسکو "ناگ" کا طریقہ کہتے ہیں۔ مجھے ایک واقعہ معلوم ہوا کہ کاشتکار نے نصف من غلہ قرض لیا، ۵ سال کے عرصہ میں وہ ۵ من غلہ دے چکا ہے مگر ابھی اس کو ۴ من غلہ دینا باقی ہے۔

(۴) مہاجن کو اجارہ حاصل ہے، اجارہ کا لازمی نتیجہ قیمت کی زیادتی ہے، چنانچہ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جب کاشتکار اس کے پاس قرض لینے جاتے ہیں تو پہلے وہ صاف انکار کر دیتا ہے کہ اس کے پاس روپیہ نہیں ہے، کئی روز مزید اصرار کے بعد رقم کی تعداد پوچھتا ہے، اور تعداد کو زیادہ بتاتا آخر ۲-۴ روز گذرنے کے بعد معاملہ کا تصفیہ ہوتا ہے، دراصل اس ٹال مٹول سے وہ کاشتکار کی ضرورت کی اہمیت کا اندازہ کرتا ہے تاکہ اس لحاظ سے اپنی شرطیں منوا سکے۔

(۵) شرح سود پیشگی وصول کر لیتا ہے، مثلاً اس نے کسی کو ۱۰۰ روپیہ ۶ ماہ کے لئے ۱۰ فیصد پر قرض دیئے لیکن دراصل وہ اس کو ۹۰ روپیہ ادا کرتا ہے اس طرح گویا وہ شرح میں مزید ½ ۲ فیصد کے قریب اضافہ کر دیتا ہے۔

(۶) ساہوکار کاشتکار سے قرض دیتے وقت یہ وعدہ لے لیتا ہے کہ وہ فصل پر غلہ اسی کو فروخت کرے گا، اس طریقہ کو "لدونی" کا طریق کہا جاتا ہے، اس سے کاشتکار کو بڑا نقصان ہوتا ہے۔ فصل کے موقع پر پیداواروں کی قیمت ایک نہیں رہتی، پہلے قیمت زیادہ ہوتی ہے مگر جب فصلیں کٹ کٹ کر بازار میں آنے لگتی ہیں تو ان کی قیمت میں کمی ہونے لگتی ہے اور جب سارا غلہ بازار میں آ جاتا ہے تو قیمت بہت کم ہو جاتی ہے۔ اب جن کاشتکاروں کی فصل پہلے تیار ہو جائے ان کو بازار میں اچھی قیمت مل سکتی ہے مگر ساہوکار کے یہاں یہ نہیں ہوتا، وہ فصل پر غلے کو تول یا ناپ کر لے لیتا ہے اور حساب ڈیڑھ دو ماہ بعد ہوتا ہے، ساہوکار موسم کی سب سے کم قیمت پر غلہ خریدتا ہے اور اس قیمت میں سے بھی ۸ سے ایک روپیہ فی من تک "حق ساہوکاری" وضع کرتا ہے۔

(۷) کاشتکار سونے، چاندی کی چیزیں، مویشی، مکان، اور زمین رہن رکھکر بھی قرض لیتے ہیں، زمین کے علاوہ دوسری چیزوں پر ان کی مالیت کے لحاظ سے ۴۰ یا ۵۰ فیصد قرض ملتا ہے، اور جب اصل وسود شے کی مالیت کے برابر ہو جاتا ہے تو یہ چیز ساہوکار کی ہو جاتی ہے، زمین کی صورت میں یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ اگر رقم ایک مدت معینہ میں ادا نہ ہو تو زمین ساہوکار کی ہو جائے گی، اس طریق کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمین کاشتکاروں کے قبضہ سے نکل کر ساہوکاروں کے پاس جانے لگتی ہے، مسٹر برو جینے

۲۱۲ مواضعات میں تحقیقات کرکے بتایا ہے کہ دس لاکھ ایکڑ مزروعہ زمین میں سے تقریباً ۲ لاکھ ایکڑ مکفول ہو چکی ہے اور ایک لاکھ ۲ ہزار ایکڑ کاشتکاروں کی ملکیت سے نکل کر قرض خواہوں کے قبضہ میں جا چکی ہے۔[۵]

(۸) بعض ساہوکار جو ساہوکارہ کے علاوہ غلہ اور اشیا کا لین دین بھی کرتے ہیں، دو آدمیوں کے درمیان واسطہ کا کام کرتے ہیں، مثلاً الف کو ب کو کچھ دینا ہے، تو وہ (الف) اپنے ساہوکار کو چٹھی لکھ دیتا ہے کہ میرے حساب میں ب کو اتنی رقم ادا کردو، اب ساہوکار ب کو نقد رقم بہت کم دیتا ہے، بلکہ اپنی دوکان کی اشیا اس کو فروخت کرتا ہے، اس طرح ایک جانب اعلیٰ شرح سود ملتی ہے دوسری جانب مال گراں قیمت پر فروخت ہوتا ہے۔

(۹) دوکان داری کرنے والے ساہوکار غلے کے معاوضہ میں بھی اشیا فروخت کرتے ہیں، ساہوکار غلہ کو تولنے کے لئے غلط اوزان استعمال کرتے ہیں، نیز غلہ لانے والے ادنیٰ ذاتوں کے مزدور ہوتے ہیں اس لئے غلہ کچھ صاف نہیں ہوتا، اور ساہوکار مٹی، بھوسہ، اور کنکر کے نام سے کچھ حصہ اور الگ کردیتے ہیں۔ اس طرح سیر بھر غلہ خریدنے کے بعد ۹ یا ۱۰ چھٹانک کی قیمت کا گراں مال ان کو دیتے ہیں۔

(۱۰) چھوٹی مقداروں کے تولنے میں ترازو کی ڈنڈی مار کر فروخت کرتے ہیں، ڈنڈی مارنے سے کتنا فرق ہوتا ہے اس کا صحیح اندازہ مشکل ہے کیونکہ یہ ہاتھ کی صفائی، مشاقی، انگوٹھے کی سختی، اور ترازو کی ڈنڈی کی لنبائی پر منحصر ہے مگر اندازہ ہے کہ سیر بھر میں ۲ چھٹانک سے ۳ چھٹانک تک بل رہتا ہے۔

(۱۱) بڑی مقداروں کے تولنے یا ناپنے میں غلط قسم کے اوزان استعمال کرتے ہیں، اس طرح کافی فرق ہو جاتا ہے۔

(۱۲) ایک چیز کے مختلف بھاؤ رکھتے ہیں، مثلاً نقد اور اُدھار کے بھاؤ میں فرق رہتا ہے، تھوک

---

[۵] "حیدرآباد میں زرعی قرضداری" از ایس ایم بھروچہ، گورنمنٹ سنٹرل پریس، حیدرآباد دکن ۱۳۴۷ف صفحہ ۴۳

اور خردہ فروشی کا بھاؤ الگ ہوتا ہے، طویل اور کم مدت ادھار کے لئے قیمتیں الگ ہیں، اس طریقے سے بعض اشیا کی قیمتوں میں ۳۰، ۵، ۳ فیصد کا فرق ہو جاتا ہے۔

(۱۳) گاؤں کے مقامی بازاروں پر اپنا قبضہ رکھتے ہیں، باہر سے اگر کوئی آدمی مال خریدنے آئے تو بھاؤ بگاڑنے اپنا مال اس کو فروخت کرنے، یا اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، ایک مرتبہ کا زخم خوردہ دوبارہ گاؤں کا رُخ نہیں کرتا اور بازار پر ان کا قبضہ بحال رہتا ہے۔

یہ چند اجاگر نقائص تھے، مگر ان کے علاوہ اور چھوٹی چھوٹی خرابیاں بھی ان کے کاروبار میں موجود ہیں مثلاً حسابات میں اس طرح الٹ پھیر کرتے ہیں کہ کاشتکار کو نقصان ہوتا ہے، سادہ کاغذ پر انگوٹھے کا نشان لیکر بعد میں اس میں زائد رقم درج کر لیتے ہیں۔ حساب کتاب میں ایسے ہندسے استعمال کرتے ہیں جن کو دوسرے نہ سمجھ سکیں، کبھی "گرہ کھلائی" کے نام سے کچھ رقم بطور تحفہ طلب کرتے ہیں، اپنے موکلوں سے مفت خدمت لیتے ہیں، ان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ دودھ، دہی، مکھن، گھی، ایندھن، ترکاری یا اسی قسم کی دوسری چیزیں بلا معاوضہ مہیا کیا کریں۔

نقائص کو دور کرنے کی تدابیر | ان مختلف خرابیوں نے کاشتکار، اور مجموعی حیثیت سے زراعت کو اس قدر تباہ کر دیا ہے کہ کاشتکار سال بھر محنت کرتا ہے مگر سال کے بڑے حصہ میں اس کو فاقہ یا نیم فاقہ کرنا پڑتا ہے۔ نہ اس کے پاس ڈھنگ کے کپڑے ہیں اور نہ سلیقہ کا مکان، دوسری رسمی ضروریات کا تو ذکر ہی کیا۔ ساہوکاروں نے کاشتکاروں کی زمینوں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ اور ان کو زرعی مزدور بنا دیا جب کوئی خرابی انتہائی صورت اختیار کر لیتی ہے تو اس کے خلاف جذبات مشتعل ہوتے اور ہنگامے اور فساد شروع ہو جاتے ہیں، چنانچہ ۱۸۵۵ء میں سنتال کا بلوہ، ۱۸۷۵ء میں دکن کا بلوہ، اور ۱۸۹۱ء میں اجمیر کا بلوہ اسی کی مثالیں ہیں، دکن کا بلوہ بہت شدید تھا، اور حکومت کو ۱۸۷۵ء میں اس کی تحقیقات کے لئے ایک کمیشن مقرر کرنا پڑا۔ جس نے کاشتکاروں کے ہنگاموں کو حق بجانب قرار دیا، اسکی سفارشات پر ۱۸۷۹ء میں قانون امداد کاشتکاران دکن نافذ ہوا، مگر یہ صرف انتہائی صورتوں کی مثالیں تھیں مگر جب کچھ عرصہ سے مختلف کمیٹیوں اور افراد نے زرعی حالات کی تحقیقات کی طرف توجہ شروع کی تو یہ تمام خرابیاں منظر عام پر آنے لگیں، اور

اس بات کی ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ ان کا انسداد کیا جائے۔

اصلاح کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں، یا تو مروجہ طریقہ کو اڑا کر اس کی جگہ کوئی دوسرا نیا طریقہ رائج کیا جائے جس میں یہ خرابیاں نہوں، یا پھر موجودہ طریقہ میں کچھ اصلاح کی جلسئے، واقعہ یہ ہے کہ ساہوکاری طریق کو گوناگوں خرابیوں کے باوجود بالکل اڑایا نہیں جاسکتا، کیونکہ زراعت اس کے بل بوتے پر چل رہی ہے، کاشتکار بھینس ہے اور ساہوکار جونک، بھینس جانتی ہے کہ تالاب میں جونکیں ہیں جو پانی میں داخل ہوتے ہی لپٹ کر خون پینا شروع کردیں گی مگر وہ تالاب کو چھوڑ نہیں سکتی اور جونکیں اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ اگر بھینس کو جونکوں سے محفوظ رکھنا ہے تو ایسے پختہ حوضوں کی تعمیر ضروری ہے جن میں جونکیں نہوں، یا اگر یہ ممکن نہو تو کم از کم ایسی دوائیں یا طریقے استعمال کئے جائیں جن کی وجہ سے جونکیں سست اور کمزور ہو جائیں تاکہ بھینسوں کو کم نقصان پہنچا سکیں، کاشتکار ساہوکاروں کی مکاریوں اور چالاکیوں سے واقف ہے مگر وہ مجبور ہے، اور کوئی ذریعہ اس کے سامنے نہیں اس لئے وہ ان ہی سے امداد حاصل کرتا ہے اگر اس کو ساہوکاروں کے پھندے سے نکالنا ہے تو ایسے اداروں کا قیام بہت ضروری ہے جو صحیح اصولوں پر ان کی مدد کرسکیں۔ مگر ملک میں جس پیمانہ پر ان نئے اداروں کی ضرورت ہے ان کا قیام فی الوقت ممکن معلوم نہیں ہوتا، اب دوسری صورت یہی رہجاتی ہے کہ مروجہ طریقہ کے نقائص اور خرابیوں کو حتی الامکان دور کرنے کی کوشش کی جائے، ریاست حیدرآباد کے پیش نظر یہی صورت ہے، دوسری صورت کو وہ اختیار کرچکی ہے۔ ۷ر جون ۱۳۴۵ھ کو تین دستورالعمل یعنی مصالحت قرضہ، قرض دہندگان اور انتقال اراضی نافذ ہو چکے ہیں۔

دستورالعمل مصالحت قرضہ کا مقصد کاشتکاروں کو موروثی اور قدیم قرضہ سے نجات دلانا ہے، کیونکہ اس کا بار اتنا سخت ہے کہ موجودہ حالات میں اس کو برداشت نہیں کیا جاسکتا، اور تاوقتیکہ یہ بار کم نہو آئندہ ترقی کی امید نہیں رکھی جاسکتی۔ اس قانون کی رو سے ایسی کمیٹیوں کی تشکیل ہوگی جو قرضہ کی مصالحت کرائینگی ان کا صدر سرکاری آدمی ہوگا اور اسکے علاوہ دو یا زائد نامزد شدہ اشخاص ہوں گے، جو قرضدار یا قرض خواہ اپنے قرضہ کا تصفیہ کرانا چاہے گا اس کو کمیٹی کے سامنے ایک درخواست پیش کرنا ہوگی،

درخواست پر ٹکٹ لگانے کی ضرورت نہیں، درخواست کنندوں کو یہ بتانا پڑے گا کہ وہ قرض ادا کرنے کے قابل نہیں ہے یا اس کا قرض وصول نہیں ہو رہا ہے نیز قرضہ کی تاریخ، اصل، شرح سود، اپنے اثاثوں اور ذمہ داریوں کی تفصیلات بھی درج کرنا ہوگی، مصالحت قرضہ کی درخواست صرف ایسے کاشتکار دے سکیں گے جن کی سالانہ مالگذاری ۵۰۰ روپیہ یا اس سے کم ہو، کمیٹی فریقین کی شہادتیں سننے کے بعد اس رقم کا تعین کرے گی جو قرضدار کو ادا کرنا ہے، نیز دوران ادائی میں شرح سود کا بھی تعین کریگی، اگر کوئی کاشتکار تصفیہ شدہ قرضہ کو ادا کرنے میں تساہل سے کام لے تو رقم مذکور اس سے مالگذاری کی باقیات کی صورت میں وصول کی جائے گی۔

قرض دہندگان کا دستورالعمل صوبہ مدارس، اور برار و متوسط کے قوانین کو پیش نظر رکھکر بنایا گیا ہے ۱۳۴۶ف میں یہ قانون بطور امتحان اضلاع اورنگ آباد و عثمان آباد میں نافذ کیا گیا، وہاں اس کے نتائج بڑے اچھے رہے، اور اب اس کو پوری ریاست میں نافذ کر دیا گیا ہے۔

اس قانون کی رو سے ساہوکاروں پر حسب ذیل پابندیاں عاید کی گئیں ہیں۔

(۱) ساہوکاروں کے لئے رجسٹری کرانا اور اجازت نامہ حاصل کرنا ضروری ہے۔

(۲) عطا شدہ اجازت نامہ صرف ایک ضلع کے لئے کارآمد ہوگا، اگر کام دو یا کئی اضلاع میں ہو تو ہر ضلع کے لئے علیحدہ علیحدہ اجازت نامہ حاصل کرنا ہوگا۔ اس کی فیس ۸ روپیہ ہوگی، ۴ سال کے بعد اس کی تجدید لازمی ہے۔

(۳) حسابات کے اندراجات میں وہی ہندسے استعمال کئے جائیں جو استعمال کردہ زبان میں معمولی طور پر مستعمل ہوں۔

(۴) صحیح شرح سود کا اندراج۔

(۵) قرضہ کی ادائی جو بشکل جنس ہوتی ہو اس کی قیمت، نیز زر اصل، سود، محسوب کردہ رقم کی مقدار الگ الگ بتانا پڑے گی۔

(٦) ہر سال فرد حساب وقت ذیل کے ایک ماہ کے اندر اندر قرضدار کے پاس بھیج دی جائیگی۔

جو قانون کے مطابق نہوں۔

یہ قوانین جن مقاصد کو پیش نظر رکھکر وضع کئے گئے ہیں اور ان سے جن خرابیوں کا انسداد اور جن فوائد کی توقع ہے انکی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، حکومت حیدرآباد تعریف کی مستحق ہے کہ اس نے زرعی اصلاح کے لئے ایک منظم قدم اٹھایا مگر کسی خرابی کے متعلق قانون بناکر یہ سمجھ لینا کہ کلیتہً اسکا انسداد ہوگیا صحیح نہیں ہوسکتا، دنیا اس معیاری اخلاق سے ابھی بہت دور ہے، حقائق و مشاہدات کو نظرانداز کردینا ایک نقاد کا کام نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان قوانین کا مقصد کاشتکاروں کی امداد، اور ان کو ساہوکاروں کے ظلم و ستم سے بچانا ہے، مگر جب تک کاشتکاروں کی حالت سقیم ہے اور ساہوکاروں کو گاؤں میں اجارہ حاصل ہے اس وقت تک نہ تو قرضہ لینے سے روکا جاسکتا ہے اور نہ ساہوکار کی من مانی شرائط کا انسداد کیا جاسکتا ہے، ساہوکار قانونی گرفت سے بچنے کے لئے مختلف ترکیبیں ڈھونڈ سکتے ہیں، اور کاشتکار اپنی مجبوریوں سے تنگ آکر ان کو تسلیم کرسکتے ہیں۔ مثلاً وہ کاشتکار سے وہی قدیم اعلیٰ شرح سود وصول کریں، رجسٹر میں سرکاری شرح درج کریں باقی سود زر اصل میں شامل کردیں، یا ایک زمین جس کی مدت رہن ۲۰ سال ہوچکی ہو اسکو ایک نئے رہن نامہ کی صورت میں اپنے کسی عزیز کے نام منتقل کردیں، ظاہر ہے کہ ایسی صورتوں میں قانون یا حکومت کچھ نہیں کرسکتی، نیز کسی قانون کی صحیح خامیوں کا اندازہ اسوقت تک نہیں ہوسکتا جبتک کہ اس کو نافذ ہوئے کچھ عرصہ نہ گذر گیا ہو، اس لئے اب جبکہ قوانین کو نافذ ہوئے چھ ماہ کے قریب ہورہے ہیں اس بات کی ضرورت ہے کہ حکومت کی جانب سے ایسی تحقیقات عمل میں لائی جائیں جن سے معلوم ہوسکے کہ کاشتکاروں کو ان سے کیا فائدہ پہنچ رہا ہے، اور حکومت کا حقیقی منشا کس حد تک پورا ہورہا ہے۔

یہودیوں کا مستقبل

(از خواجہ احمد صاحب فاروقی، بی۔اے)

نازیت نے یہودیوں کے ساتھ جو ناروا سلوک برتا ہے وہ تاریخ حاضرہ کی ایک بڑی المناک داستان ہے۔ ہروان راتھ کے قتل کی پاداش میں ان جور وظلم میں اور اضافہ ہوگیا ڈاکٹر گائبلس کی ایک جنبش قلم سے چودہ ہزار یہودی گرفتار کر لئے گئے ان کے تمام معابد، مدارس، تھیٹر، سینما اور رقص گاہیں بند کر دی گئیں، ان کی دکانیں لوٹ لی گئیں اور ٹیکسوں کی بھرمار سے ان کے اوپر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ اور جب امریکہ اور انگلستان نے جرمنی کے اس سفاکانہ اور بے رحمانہ طرز عمل پر آواز بلند کی تو ریش (Reich) نے یہ اعلان کر دیا کہ ہمیں امید ہے کہ دنیا اس یہود نوازی سے باز آئے گی، اگر اپنی خاطر نہیں تو کم از کم ان یہودیوں کی خاطر، جو ابھی جرمنی کی سرزمین میں زندہ سلامت ہیں۔

آخر وہ کیا اسباب ہیں جن کی بنا پر نازی دیوتا اپنے ناخن وچنگال کو یہودیوں کے خون سے رنگین کرنا چاہتا ہے اور وہ کیا وجوہات ہیں جنھوں نے یہودیوں کی موجودگی ریش کے لئے ناگوار اور قابل نفرت بنادی ہے۔ یہ سوالات اپنی اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔

تمام دنیا میں ایک کروڑ پچاس لاکھ یہودی آباد ہیں اور ان میں سے تقریباً دو تہائی روس، پولینڈ، رومانیہ اور جنوبی مشرقی یورپ میں بستے ہیں۔ جرمنی اور اسٹریا میں بھی یہود دشمنی شروع ہونے سے قبل دس لاکھ کے قریب یہودی آباد تھے۔ برطانیہ عظمیٰ میں یہودیوں کی تعداد ۳ ½ لاکھ سے زائد ہے اور ممالک متحدہ میں ان کی آبادی تقریباً ۳ لاکھ ہے لیکن وہاں کی سوسائٹی کے لئے وہ بالکل بھی خطرہ کا سبب نہیں سمجھے جاتے۔ یورپ کے جنوبی اور جنوب مشرقی علاقوں میں یہودیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جس کا سبب ان کی گذشتہ تاریخ میں پوشیدہ ہے۔ ان کی وضع اور ان کی ذہنیت بھی دوسرے باشندوں سے مختلف ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہاں یہودیوں کا مسئلہ سب سے زیادہ نازک ہے لیکن جرمنی میں ان کا معاملہ

اس قدر نازک نہ ہونا چاہیئے تھا جہاں ان کی تعداد نسبتاً کم ہے اور جہاں کی قومی اور سیاسی زندگی میں انھوں نے نمایاں اور قابل وقعت حصہ لیا ہے۔ اسی طرح اسٹریا میں بھی ان کے معاملات پیچیدہ ہونے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی اور حقیقت یہ ہے کہ نازی تسخیر سے پہلے اسٹریا میں یہودی باہمی اشتراک اور امن و آشتی کی زندگی گذار رہے تھے۔

جرمنی کی یہودیوں سے منافرت حسب ذیل اسباب پر مبنی ہے:۔

ہٹلر ایسی حکومت مطلقہ قائم کرنا چاہتا ہے جو لوگوں کے ذہن وضمیر خیالات اور حسیات پر بھی قابو حاصل کئے ہو۔ ان کے دماغ اور جسم دونوں حکومت کے اشارہ پر مستعد ہوں لیکن یہودی اگر کسی کے آگے انتہائی عجز و نیاز کے ساتھ سرنگون ہو سکتے ہیں تو وہ صرف ان کا مذہب ہے۔ ان کے امیال و عواطف، جذبات اور وجدان صرف موسیٰ ہی کی تعلیم کے تابع ہو سکتے ہیں اور کسی کے نہیں۔ یہ گویا نازیت اور یہودیت کا بنیادی فرق ہے جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان خلیج دن بدن وسیع ہوتی جاتی ہے۔

دوسرے ہٹلر کا یہ ایمان اور راسخ عقیدہ ہے کہ جرمن خالص آرین قوم ہیں اور ان میں غیر آریہ کی آمیزش ان کی تمام بلند خصوصیات کو تباہ کر لینے کے مترادف ہے، اس لئے وہ یہودیوں سے اختلاط اور میل جول قطعاً نہیں چاہتا۔ ہٹلر کی کوئی دلیل اس سے زیادہ حماقت مآب نہیں ہو سکتی اس لئے کہ جرمن اور یہودی دونوں مخلوط اقوام سے متعلق ہیں لیکن بعض وقت حماقت بھی اہم اور قابل غور ہو جاتی ہے خصوصاً اس وقت جبکہ کوئی ڈکٹیٹر اسے "جز و ایمان" بنا لے۔

ہٹلر بحیثیت آمر جرمنی کے مجمع کی نفسیات سے خوب واقف ہے وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے کہ مجمع کو اکسانے کے لئے کوئی چیز ہدف ملامت ہونا چاہیئے اسی وجہ سے اس نے ملک کی تمام خرابیوں اور برائیوں کی ذمہ داری دو چیزوں پر رکھ دی ہے۔ ایک اشتراکیت پر دوسری یہودیوں پر۔ یہودی ملک میں بڑی معزز جگہوں پر فائز تھے۔ یہ بات جرمنوں کو ناگوار تھی لیکن سب سے بڑی ناگواری کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے بہت سے یہودیوں کے مقروض تھے، ان وجوہات کی بنا پر

نازیوں نے یہ پروپگنڈا شروع کیا کہ جو چیز جرمن قومیت کی اندر ہی اندر جڑ کاٹ رہی ہے وہ یہودیوں کی قوم ہے اور جب تک اس مسموم عضو کو دور نہیں کیا جائے گا ملک کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

ہٹلر کو بین الاقوامیت سے نفرت ہے وہ اشتراکیت قومی کا قائل ہے وہ یہ چاہتا ہے کہ جرمنوں کے لئے جرمنی ہی ابتدا ہو اور انتہا۔ وہ کسی پر تکیہ نہ کرے اور خود اپنی ضرورتوں کو پورا کر سکے لیکن یہ اصول یہودیوں کی ذہنیت سے متصادم ہوتا ہے۔ یہودی طبعاً بین الاقوامی ہیں ان کی تجارت دولت اور ثروت کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔

یہ دلائل یہود دشمنی کے جواز کے لئے زیادہ وقیع نہیں معلوم ہوتے لیکن جرمنی کی زود اعتقاد دنیا اسی منطق سے ہانکی جا رہی ہے۔ یہ طے ہے کہ نازیت اپنے آپ کو یہودیوں کے مطابق نہیں کر سکتی اور نہ یہودی ہی فطرتاً اپنے آپ کو نازیت کے مطابق کر سکتے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دونوں میں کسی قسم کی مصالحت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے کہ ہر دو اقوام میں سوائے منافرت کے اور کوئی غرض مشترک ہے ہی نہیں؟

بالفور اعلان سے بہت سے یہودیوں کی توقعات وابستہ تھیں اور انھیں امید ہو چلی تھی کہ شاید ان کا مستقبل درخشاں ہو جائے لیکن اسی کے ساتھ کچھ ایسے بھی یہودی تھے جنھوں نے رائل کمیشن کی سفارشات کو بہ نظر استحسان نہیں دیکھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ تقسیم فلسطین ان کے درد کا مداوا نہیں ہو سکتا، ہر یہودی کے لئے اپنی برسوں کی جگہ چھوڑنا اور وہاں جا کر بسنا ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس طریقہ سے ان حکومتوں کو اپنی طرف سے مشکوک کر لینا ہے جن کے سایۂ عاطفت میں وہ عرصہ سے رہتے چلے آئے ہیں۔ اس لئے کہ یہ حکومتیں ہر وقت یہ سمجھیں گی کہ یہ لوگ جب چاہیں گے ہجرت کر دیں گے اور ان لوگوں کی ہمدردی بھی فلسطین اور اس ملک کے درمیان ہی رہے گی۔ اس لئے انھوں نے یہی سوچا کہ یہودیوں کے لئے بجائے ایک حکومت کے ہو کر رہنے کے یہی اچھا ہے کہ وہ متعدد حکومتوں کے وفادار ہو کر رہیں اور بجائے "قوم" بننے کے "فرقہ" ہی بنے رہیں۔ اس لئے کہ پہلی صورت خطرہ اور اندیشہ سے خالی نہیں، اور اس میں طرح طرح کی عملی دشواریاں بھی ہیں اس کے علاوہ انھیں یہ بھی خیال

تھا کہ فلسطین میں کوئی یہودی حکومت اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ کوئی دوسری بڑی حکومت اس کے سہارے کے لئے نہ ہو۔ اور یہ امداد دوسری حکومتوں کی نگاہ میں کھٹکے گی اس لئے کہ ان کی یہودی رعایا کی ہمدردیاں اس "محافظ" حکومت کے ساتھ ہو جاویں گی، اس کے علاوہ یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ تمام دنیا کے ایک کروڑ یہودی فلسطین کی اسی چھوٹی سی ریاست میں جا کر بس جاویں جو ان کے لئے کبھی کافی نہیں ہو سکتی۔

لیکن باوجود اس کے بالفور کا اعلان ہوتے ہی ہزاروں یہودی فلسطین پہنچ گئے اور اسے اپنا وطن بنا لیا۔ یہودی مہاجرین کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ عرب اکثریت کو ان سے خطرہ محسوس ہونے لگا اور انھوں نے بجا طور پر ان کی آمد اور سکونت پر احتجاج کیا لیکن یہودی جن کے پاس اثر بھی تھا اور دولت بھی برابر آتے رہے۔ زراعت کے لئے زمین خریدتے رہے اور رہائش اختیار کرتے رہے، انھوں نے یروشلم میں ایک یونیورسٹی تعمیر کی اسے نئے ساز و سامان اور جدید آلات سے آراستہ کیا اور سائنٹفک ذرائع سے فلسطین کے مادی وسائل میں اضافہ کر دیا، لیکن یہ جو کچھ کیا گیا وہ غریب عربوں کے حقوق غصب کر کے کیا گیا اور ظاہر ہے کہ یہ وہ لوگ کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ بقول راغب بے فلسطین میں ایک عرب بھی ایسا نہیں ہے جو بالفور کے اعلان کی مخالفت کرنے کے لئے اپنی جان سے دریغ کرے۔

— برطانیہ فلسطین میں ہوائی مستقر بنانا چاہتی ہے اس لئے اسے ہمدرد، یہودیوں کی آمد ناگوار نہیں ہوئی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے عرب بغاوت پر آمادہ ہو گئے، جو اب بھی باوجود بالفور اعلان کے مسترد ہو جانے کے جاری ہے۔ برطانیہ کے سامنے بڑی دقتیں ہیں۔ حبش کی فتح سے اطالیہ کے وسائل میں اضافہ ہو گیا ہے اور بحر روم میں اس کا اقتدار دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اور اب فرینکو کی فتح سے اس کے امکانات اور بھی قوی ہیں، مسولینی بحر روم کے مشرقی علاقوں میں برطانیہ کے لئے دقتیں پیدا کرنا چاہتا ہے اور اس کی یہ بھی خواہش ہے کہ فلسطین کے عربوں کو ہمیشہ کے لئے انگریزوں سے متنفر کر دیا جائے تاکہ اسے اپنے قدم جمانے کا موقع ملے اس کی عرب نواز پالیسی کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔

برطانیہ کی پالیسی پر امریکہ اور برطانیہ کے یہودیوں کا اثر بہت کام کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ لیبر پارٹی

کے بیشتر افراد عربوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔ میجر اٹلی (ــــــــــــــــ) لیبر پارٹی کے لیڈر عربوں کے سخت مخالف ہیں لیکن باوجود اس کے برطانیہ نے کوئی فیصلہ کن پالیسی اختیار نہیں کی ہے۔ وہ یہودیوں کو بھی رکھنا چاہتی ہے اور عربوں کو بھی خفا کرنا نہیں چاہتی۔ اس لئے اس نے یہودیوں کے "قومی وطن" کے قیام میں کافی پابندیاں عائد کیں، ان کے داخلہ کی تعداد معین کر دی، اس کے بعد تقسیم ملکی کے ذریعہ ان کی جائے سکونت کو محدود کرنا چاہا۔ لیکن عربوں کی مخالفت بدستور جاری رہی۔ اور وہ اعلان بلفور کی منسوخی پر تلے رہے۔ آخرکار ۱۰ نومبر کو پارلیمان برطانیہ نے اسے مسترد کر دیا اور وڈ ہیڈ کمیشن کی سفارشات کو منظور کر لیا گیا لیکن لندن کانفرنس جو حال میں منعقد ہونے والی ہے اس کی کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے اس لئے کہا جاتا ہے کہ فلسطین کا مسئلہ ہنوز طے ہونے کے لئے باقی ہے۔

جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے ان کے قومی وطن کا تخیل اگر بروئے کار آبھی جائے تو ان کے لئے زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ جگہ کی تنگی کا سوال بدستور باقی رہتا ہے پھر یہ کچھ معقول بات نہیں معلوم ہوتی کہ تمام یہودیوں کو ان ملکوں سے کھدیڑ کر جہاں کہ وہ برسوں سے وفاشعاری کے ساتھ رہتے آئے ہیں۔ فلسطین میں بھر دیا جائے اور تمام دنیا کے دروازے ان کے اوپر بند کر دئے جائیں۔

اسٹریا کے وہ یہودی جن کو آمر جرمنی نے ان کی آن میں نکال باہر کیا، ان کی آہ و بکا ڈینوب کے ساحل پر ایک عالم نے سنی لیکن کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا اقوام یورپ ایک عرصہ سے یہودیوں کے مسئلہ پر غور کر رہی تھیں لیکن (EVIAN) کانفرنس کا بھی نشستند گفتند و برخاستند سے زیادہ کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ زبانی جمع خرچ اور "ریزولیوشن" فرمائی" ایک عرصہ سے جاری ہے اور اب راتھ کے قتل کے جرم میں جو وحشیانہ سلوک یہودیوں کے ساتھ برتا گیا ہے اس کے اوپر رزوولٹ (ــــــــــــ) سے لیکر زیلینڈ تک ہر شخص آتش بداماں نظر آتا ہے لیکن اس سے ہٹلر کے طرز عمل میں ذرہ برابر تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ وہ مکّے کا جواب مکّے سے دینے کے لئے آمادہ ہے اور نازی پریس اس کی ہمنوائی کے لئے موجود ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ دوسرے ممالک اگر یہودیوں کے ساتھ رحم کر سکتے ہیں تو کریں اور انھیں بھر لیں ورنہ یوں ہی رہنے دیں، یورپ کے ممالک ان مظلومین سے اظہار ہمدردی تو کرتے ہیں لیکن ان بے روزگاروں کو اپنے ملک

میں گھساتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ مبادا ان کی معاشی مشکلات میں اضافہ ہو جائے۔ ابھی تک صرف انگلستان اور ہالینڈ دو ملک ایسے ہیں جنھوں نے انھیں جائے پناہ دی ہے اور ان کی مشکلات رفع کرنے کی کوشش کی ہے انگلستان میں ۱۹۳۲ء سے لے کر اب تک گیارہ ہزار یہودی داخل کئے جا چکے ہیں اور ان کی رہائش کا بندوبست برطانوی مستعمرات میں کیا جا رہا ہے۔ مسٹر چیمبرلین کی یہ بھی کوشش ہے کہ کسی طرح جرمنی کے تمام یہودیوں کو جائے پناہ مل جائے لیکن یہ کام اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک کہ دوسرے ملک تھوڑی سی قربانی کرنے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہودیوں کا اگر کوئی فلسطین کے علاوہ دوسرا قومی وطن بن سکتا ہے تو وہ سلطنت برطانیہ یا جنوبی امریکہ میں ممکن ہے لیکن یہ تجربہ بھی اگر کیا گیا تو فلسطین کی طرح ناکامیاب رہے گا اس لئے کہ وہی دقتیں وہاں بھی پیش آئیں گی کوئی رہتی ہوئی قوم کسی "غیر" کی مداخلت اور شرکت آسانی سے قبول نہیں کرے گی۔

یہودی شاید دنیا کی سب سے زیادہ مظلوم قوم ہے۔ جور وظلم کی برداشت نے ان کے اندر محنت کا مادہ پیدا کر دیا ہے اور مستقبل کی تلخیوں کے خیال نے ان میں کفایت شعاری کی عادت پیدا کر دی ہے۔ ان کے پاس دولت کی فراوانی ہے اور علمیت کی بھی کمی نہیں۔ ان کی قوم کے بہت سے اشخاص دنیا کے ممتاز ترین افراد میں شمار کئے جاتے ہیں اس لئے شاید اگر کوئی ملک انھیں داخل کرنے پر آمادہ ہو اور وہ وہاں وفا شعار باشندوں کی حیثیت سے رہنے پر راضی ہوں تو وہ حکومت یا ملک خسارہ میں نہیں رہ سکتا۔

یہودیوں کے سامنے اب صرف دو صورتیں ہیں:- یا تو وہ اپنی ایک علیحدہ قومی حکومت قائم کریں اور اپنی بقا کی وہی کوشش کریں جو دوسری حکومتیں کرتی ہیں یا پھر دوسرے ملکوں کے وفا شعار باشندے ہو کر رہیں: پہلی صورت کے ناممکن العمل ہونے پر جو صیہونیت کے مطالبہ کو پورا کرتی ہے اوپر صفحات میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ اب رہی دوسری صورت وہ یقیناً مناسب اور معقول ہے۔ یہودیوں نے لبرل زمانہ میں یہی راستہ اختیار کیا تھا اور اب بھی ان کے لئے یہی راستہ

خطرہ سے خالی اور صاف نظر آتا ہے لیکن اس کے لئے ضرورت ہے کہ وہ فلسطین کو بجائے سیاسی امیدوں کا آماجگاہ بنانے کے اپنا مقدس مذہبی مرکز بنائیں جیسا کہ وہ اسے صدیوں سے سمجھتے آئے ہیں۔ اب رہی وہ بڑی آبادی جو بعض ملکوں میں صدیوں سے ظلم و ستم کا شکار ہو رہی ہے اور آج بھی حقارت کی نگہ سے دیکھی جاتی ہے اسے چاہیئے کہ اقوام متعلقہ کے مشورہ سے ان ملکوں سے اٹھا کر دوسرے ملکوں میں بانٹ دیا جائے جہاں کہ وہ جاں نثار باشندوں کی حیثیت سے رہیں اور دوسرے یہودیوں سے جو چیز ان کا رشتہ قائم کرنے والی ہو وہ سیاسی غرض نہ ہو بلکہ مذہب ہو جس کو آج تک انھوں نے اپنے سینہ سے لگا رکھا ہے۔

تعلیمی دُنیا

(از جناب عبد الغفور صاحب ایم اے (علیگ)

ٹریننگ اسکول ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گذشتہ ایام میں ہندوستانی تعلیمی سنگھ کی صدارت کے فرائض انجام دینے واردھا تشریف لے گئے تھے۔ وہاں انھوں نے ٹریننگ اسکول واردھا کے اساتذہ کو مخاطب کرتے ہوئے ذیل کے الفاظ میں انھیں استاد کے فرائض سے آگاہ کیا ممکن ہے جو مشکلات آپ کو دیہی علاقوں میں کام کرتے ہوئے پیش آئیں آپ کو گھبرا دیں گاؤں کی گندگی۔ جہالت۔ بیماریاں۔ غربت۔ افلاس اور نکبت کس کے پائے استقلال کو ڈگمگا نہ دے گی؟ مگر آپ کا سچا امتحان وہی ہوگا۔ اگر باوجود ان مصیبتوں کے آپ اپنے مشن میں لگے رہے تو ایک دن فتح اور کامیابی آپ کے قدموں کو چوم لے گی۔ اگر بچوں کی تربیت کرتے ہوئے آپ والدین کی تعلیم کو نظر انداز کر دیں گے تو میں کہوں گا کہ آپ کا بلند مقصد مکمل نہیں ہو سکا۔ میری دلی خواہش یہ ہے کہ جتنی جلد ہو سکے آپ اپنے گاؤں کے سچے خادم بن جائیں۔ آپ کی مخالفت بھی کی جائے گی۔ تاہم آپ کو اپنا مقدس کام صبر آزما حالات میں چلاتے رہنا ہوگا

"استاد کو دل و دماغ کی بہت سی خوبیوں کی ضرورت ہے۔ آپ کو اس بات سے مکدر نہ ہونا چاہیئے کہ بچہ جلد جلد سبق یاد نہیں کرتا۔ نہ ہی آپ کی یہ خواہش ہونا چاہیئے کہ بچہ آپ کی غلامانہ پیروی کرے۔ تمام بچوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھالا نہیں جا سکتا۔ ایک اچھا استاد وہی ہے۔ جو بچے کی شخصیت کی عزت کرتا ہے۔ جسے پورا یقین ہے کہ ہر بچے میں کچھ انجانی خوبیاں ہوتی ہیں جو شاید کسی نہ کسی دن ظاہر ہو جائیں اور ملک میں غیر متوقع بھلائی کا موجب بن جائیں۔ اگر ایک باغبان گلاب کی جگہ سورج مکھی کا پودا لگا دے تو وہ ناقابل معافی غلطی کرتا ہے۔ ایک اچھے باغبان کے دل میں ہر پودے اور ہر پھول کے لئے خاص جگہ ہے۔ وہ ہر پودے کی محبت بھرے دل سے آب یاری کرتا ہے ہر پودے کے لئے اس کی یہی کوشش ہے کہ وہ رنگین تر پھول پیدا کرے۔

"اسے اس قدرتی اصول کا اچھی طرح پتہ ہے کہ مختلف قسم کے پودے مختلف پھول دیتے ہیں۔ اور باغ کی رونق ان کے تنوع اور رنگوں کی دلفریب تبدیلی سے ہی ہے۔

پس ایک اچھا استاد بچے کی عزت کرے گا۔ اس کی شخصیت کا خاص لحاظ رکھے گا۔ کیونکہ اسے پورا یقین ہے کہ بچے کی شخصیت کی مکمل اٹھان میں ہی زندگی کی کامیابی کا راز پنہاں ہے'

مرکزی تعلیمی بورڈ دہلی | مرکزی تعلیمی بورڈ دہلی نے ڈاکٹر ذاکر حسین کمیٹی کی رپورٹ کے متعلق ایک سب کمیٹی بنائی تھی جس کے صدر مسٹر کھیر وزیر اعظم بمبئی تھے۔ بورڈ نے کمیٹی کی رپورٹ کو منظور کر لیا ہے کھیر کمیٹی نے وار دھا اسکیم کے بنیادی اور جزدی اصول کو مان لیا ہے۔ بورڈ نے اس پر اثبات کرتے ہوئے ایک طرفہ اضافہ کیا ہے کہ چونکہ یہ اسکیم وڈ۔ ایبٹ رپورٹ سے ملتی جلتی ہے لہٰذا اس کی تائید ہونا چاہئے ہمیں ڈر ہے کہ بورڈ کے ممبروں نے شاید دونوں رپورٹوں کا مقابلہ نہیں کیا۔ وڈ ایبٹ کی محکمانہ سفارشات کو واردھا رپورٹ سے وہی نسبت ہے جو اعلان آزادی کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ سے۔

تعلیمی سنگھ کا اجلاس | تعلیمی سنگھ کا ششماہی اجلاس نومبر کے آخر میں واردھا میں ہوا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے صدارت کے فرائض انجام دئے۔ سکرٹری نے رپورٹ میں بتلایا کہ اب تک اسکیم کے ماتحت پانچ مرکز کھولے گئے ہیں۔ جامعہ ملیہ۔ واردھا۔ پٹنہ۔ بنارس اور سری نگر کشمیر۔ سنگھ کی علمی کارگزاریوں کے سلسلہ میں انھوں نے بیان کیا کہ اساتذہ کی ہینڈ بک چھپنے کو ہیں اور تین بنیادی حرفتوں کے متعلق رسالے بھی تیار ہو چکے ہیں۔

"نئی تعلیم" | نئی تعلیم کے نام سے یکم جنوری ۱۹۳۹ء کو ایک تعلیمی ماہنامہ کا آغاز ہو جائے گا جس کا اردو ایڈیشن جامعہ سے اور ہندی ایڈیشن واردھا سے چھپا کرے گا۔

صوبوں کی حکومتیں اور واردھا اسکیم | اسی۔ پی کی حکومت کا دعویٰ ہے کہ انکے یہاں واردھا اسکیم سب سے جلد اور سب سے بڑے پیمانہ پہ جاری ہوگی فی الحال اس اسکیم کے ماتحت سو ایک استاد والے مدرسہ کھولے جائیں گے۔ اس مقصد کے لئے اساتذہ واردھا ٹریننگ مرکز میں نئی تعلیم کے بنیادی حرفوں اور اصولوں کی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔

اس سال محکمہ تعلیم کے انسپکٹر اور دوسرے افسروں کو بھی یہی تربیت دی جائے گی اور اس طریق پر ایک قلیل مدت میں پورے محکمے میں نئی تعلیم کی روح پھونک دی جائے گی۔ حکومت آسام نے بھی اپنے تعلیمی افسروں کو نئی تربیت دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

واردھا اسکیم کی عام مقبولیت کا پتہ ایک تجویز سے چلتا ہے جو پچھلے دنوں یو۔ پی نان گزیٹیڈ تعلیمی افسروں کی

انجمن نے اپنے اجلاس منعقدہ فتح گڈھ میں منظور کی انجمن نے نئی تعلیم کا پرزور الفاظ میں خیر مقدم کیا اور اعلان کیا ہے کہ وہ اپنی طرف سے بنیادی حرفتوں کے لئے ایک منضبط نصاب تیار کرے گی۔ اس کام کے لئے پانچ اساتذہ نے اپنی خدمات بھی پیش کی ہیں۔

اردو ہندی | ۱۸ دسمبر کو اردو ڈے ملک کے مختلف حصوں میں منایا گیا۔ الہ آباد میں سرتیج بہادر سپرو نے صدارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے زبان کے جھگڑے کا بہت ٹھنڈے دل کے ساتھ تذکرہ کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اردو کے متعلق تین چار سال سے جو رویہ لوگوں نے اختیار کر لیا ہے اس سے مجھے انتہائی تکلیف اور رنج ہے ہندوؤں کا اردو کی اٹھان میں بڑا حصہ ہے۔ اردو ایک غیر منقسمہ جائداد ہے اور اگر ہندو اردو کو تباہ کر رہے ہیں تو وہ اپنی جائداد کو تباہ کر رہے ہیں آخر میں انھوں نے تنبیہ کی کہ زبان کے جھگڑے کی وجہ سے قومیں اور سلطنتیں تباہ و برباد ہو گئی ہیں۔ قوم کا سب سے گرانقدر ورثہ اس کی زبان اور تمدن ہے اگر زبان تباہ ہو گئی تو قومی زندگی سے بھی ہاتھ دھولینا چاہیئے۔

اردو ہندی کی بحث میں ریورنڈ سی ایف اینڈریوز نے ایک شاخسانہ اٹھایا ہے اور وہ جنوبی ہند کی زبانوں کا ہے جو دراوڑی اصل سے ہیں۔ الہ آباد میں تقریر فرماتے ہوئے آپ نے کہا ہندوستان کی عام زبان ٹکسالی سکہ ہونا چاہیئے جس سے بوقت ضرورت ہر جگہ کام لیا جا سکے یہ ہر جگہ روزمرہ استعمال کی چیز تو نہیں ہو سکتی جنوبی ہند میں ہندوستانی کے خلاف جذبات بھڑکے ہوئے ہیں۔ اس لئے شمالی ہند کو چاہیئے کہ ہندوستانی لغت کی تدوین میں جنوبی زبانوں کا خاص لحاظ رکھے اور بعض عام الفاظ ان زبانوں سے بھی اس کی لغت میں شامل ہونا چاہئیں۔

ہندی کانفرنس راجی نے تجویز منظور کی ہے کہ تمام ہندی بولنے والے صوبوں کو ایک کر دیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری آنکھوں پر سیاسی عینک چڑھی ہوئی ہے۔ ہمارا تنفس ایک زہریلی تعصب کی فضا میں جاری ہے۔ اور ہمارے کانوں میں سیاسی نعروں کے سوا عقل و انصاف کی مدھم گر صاف آواز کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

دیہی علاقوں میں یونیورسٹی کی نوآبادیاں |

مسٹر محمد امام صاحب نے میسور یونیورسٹی کی سینیٹ میں ایک تجویز پیش کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ یونیورسٹی کی طرف سے

سے دیہی علاقے میں ایک نوآبادی قائم کی جائے۔ اس نوآبادی میں طلبا رہیں گے اور وہ دیہات کی سماجی اور اقتصادی زندگی کا محض علم کے محفوظ مینار سے ہی مطالعہ نہیں کریں گے بلکہ مردانہ وار غربت جہالت اور بےکسی کے اس سمندر میں کود پڑیں گے جس میں ہندوستان کے گاؤں اور ان کی معاشی زندگی بھی چلی جا رہی ہے۔ مغربی ممالک میں تعلیمی نوآبادی کی تحریک پچھلی صدی سے جاری ہے۔ اوکسفورڈ۔ اور برمنگھم اور مانچسٹر وغیرہ میں اس قسم کے ادارے مخلص قومی کارکنوں نے قائم کئے تھے جو آج بھی کامیابی سے چل رہے ہیں۔

میسور یونیورسٹی کی طرف سے ایک اور تجویز بھی انٹر یونیورسٹی بورڈ میں پیش کی جانے والی ہے جس کی رو سے مادری زبان ابتدائی درجے سے لے کر کالج تک ذریعہ تعلیم قرار دی جائے گی انٹر یونیورسٹی بورڈ ایک حد تک بہت اعتدال پسند ادارہ ہے اور اس کے سکریٹری نے پچھلے سال آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے موقعہ پر اسی تجویز کی بےحد مخالفت کی تھی۔ ان کے بھاری بھرکم گرکھونڈے دلائل کے باوجود یہ تجویز کانفرنس کے ہر جلسے میں برابر منظور ہوتی چلی آئی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ اب یہ "کفر و الحاد" کا سیلاب جو ان کے محفوظ "نشیمن" کے در و بند توڑتا چلا آ رہا ہے کیسے رک سکے گا۔

<u>انگلستان میں ہندوستانی طلبا</u>: ۳۷-۱۹۳۶ء میں ولایت میں ہندوستانی طلبا کی تعداد ۱۸۰۵ تھی اگر ہم ہر ایک طالب علم کا خرچ ۱۵۰ پاؤنڈ سالانہ لگائیں۔ اور ہر طالب علم کے قیام کے تین سال کے اخراجات کا حساب کریں تو پورا خرچ آٹھ لاکھ بتیس ہزار پانچ سو پاؤنڈ ہوتا ہے۔ اور ۱۵۰ پاؤنڈ سالانہ کا تخمینہ بھی کم ہی ہے۔ اوکسفورڈ اور کیمبرج میں تو لوگ ۲۵۰ بلکہ ۳۰۰ پاؤنڈ سالانہ سے کم خرچ نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ لکھوکھا روپیہ ولایت کی جہازی کمپنیوں کو کرایہ کی مد میں بھی چلا جاتا ہے۔ اور اس "ولایت یاترا" کے بعد مبلغ علم معلوم۔ ہندوستان کے دہقان کا یہ خونِ گرم ولایت کے برفیلی فضا کو گلف اسٹریم کی طرح گرما دیتا ہے مگر مفلوک الحال ہندوستان میں جائدادوں کی قرقیاں۔ ایک یا دو نو وقت کے فاقے تباہ و برباد شرفا چھوڑ جاتا ہے۔ ڈاکٹر کوئیل رپورٹ کے مرتب کرنے والے کے الفاظ میں بیشتر اوقات یہ طلبا اپنے قیام انگلستان سے کسی قسم کا علمی فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ اکثر حالات میں جسم کے لحاظ سے ڈھانچہ اور دماغ کے لحاظ سے ایک کھوکھلا پول لے کر واپس آتے ہیں۔"

<u>شانتی نکیتن کا سالانہ اجلاس</u>: دسمبر کے آخیر ہفتہ میں شانتی نکیتن کا سالانہ جلسہ ادارے کے مشہور و معروف آم کے باغ میں ہوا۔ اس

موقعہ پر ڈاکٹر ٹیگور نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنے احساسات کا اظہار کیا۔

"جب میں نے پہلے پہل یہاں ایک استاد کی زندگی شروع کی تو میری نگاہ میں کوئی انقلاب انگیز مقصد نہ تھا ویسے تو مدرس کی زندگی ہمارے ملک میں زندگی سے خالی اور بے کیف ہوتی ہے لیکن میں نے اپنے ذمہ بچوں کو پڑھانے کا کام ہنسی خوشی لیا کیونکہ مجھے اس کام میں مسرت تھی اور نسل انسانی کی اس محبت آمیز خدمت میں ایک کیف سرمدی۔ اس ادارے کو قائم کرنے سے میرا مقصد تحصیل علم کے لئے خوشگوار فضا مہیا کرنا تھا وہ فضا جو ذہن اور روح کے تمام قوا کی بہترین اور ہم آہنگ نشو ونما میں مدد ومعاون ہوتی ہے۔ میں نے ان سب متلاشیان حق کو جن کی روحیں ایسی فضا کے لئے بیتاب ہیں دعوت عام دی کہ وہ آکر اکتساب فیض کریں۔ مگر افسوس ہے میری دعوت پر اس جوش اور بلند آہنگی سے لبیک نہیں کہی گئی جس کی مجھے امید تھی"

اخیر میں ڈاکٹر ٹیگور نے بقول من از بیگانگان ہرگز نہ نالم۔ کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد' ان نزدیکان بے بصر کی شکایت کی جو نزدیک رہتے ہوئے بھی شانتی نکیتن کی حسین جذبے کو پا نہ سکے اور ان دوران با بصیرت کی تعریف کی جنھوں نے مہینوں کی مسافت کا فاصلہ طے کر کے اس ادارے میں زندگی کی نئی رَو دوڑتی ہوئی دیکھی۔

ٹیگور اپنے معترضین کی ایک مرتبہ نہیں بلکہ بہت مرتبہ شکایت کر چکے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہندوستان کا وہ ادارہ جو بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے جو اس کشمکش اور ذہنی بےچینی کے دور میں بھی شانتی اور باہمی اخوت کا علم بردار ہے اس طبقے کی ہرزہ سرائی سے محفوظ نہ رہ سکا جس کے لئے ہر جدت بدعت ہے۔

روورش پیکٹ | پچھلے دنوں الہ آباد میں انڈین ہسٹری کانگریس کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا جس میں روورش پیکٹ کو متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔ اس پیکٹ کا مقصد یہ ہے کہ مختلف اقوام اور ملتیں آپس میں ایک مقدس عہد کریں کہ وہ ہر حالت میں فنون لطیفہ اور سائنس کے اداروں۔ تاریخی یادگاروں وغیرہ کی حفاظت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں گی

پروفیسر روورش ایک بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں اور ان کے ادبی اور آرٹ کے شاہکار مختلف ممالک کے عجائب خانوں کی زینت ہیں۔ ان کو چینی اور سنٹرل ایشیا کے تاریخی نوادر اور عہد عتیق کی یادگاروں سے خاص

دلچسپی ہے۔ ان کا دل اس ہیبتناک المیہ سے بے حد متاثر ہوا ہے جو جاپان چین کے اسٹیج پر ہاوٹزر مشینوں اور توپوں کی دھلانے والی گونج کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ ۔۔ چین۔ بدنصیب چین اپنے ادبی۔ آرٹ کے خزانے کو یوں چھپائے چھپائے لئے پھرتا ہے جیسے کہ ننھی چڑیا اپنے بچوں کو دونوں پروں کے نیچے۔ اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ چمٹا لیتی ہے اور ہوا میں عقاب کی برق صفت تیزی ماں اور بچے دونوں کو اچک لینے کے لئے تیار ہے۔ اس معاہدہ کا۔ یہی مقصد ہے کہ اس قسم کے شاہکار جو نسل انسانی کے لئے ازلی مسرت کا خزینہ ہیں کسی نہ کسی طرح محفوظ ہو جائیں اب تک ۲۱ ممالک۔ بہت سی انجمنیں اور سوسائٹیاں اور دو بین الاقوامی کانگریسیں اس عہد نامہ پر صاد کر چکی ہیں۔

ڈانسزیو | ڈانسزیو (D'Annunzio). اٹلی کا مشہور معروف ڈراما نویس۔ ناولسٹ شاعر۔ لیڈر۔ سپاہی ایک لحاظ سے فاشزم کا موجد ہے۔ اس کے اصول۔ اس کا تخیل اس کا نعرہ۔ اس کے امتیازات۔ اس کا سلام مسولینی کے ہتھوڑے کی چوٹ سے نہیں نکلے۔ بلکہ ایک شاعر کے دل اور ایک شاعر کے رنگین تخیل سے۔ ایک موسیقی کے ساز سے جس کی دکھتی ہوئی رگیں کلینشو، شیر فرانس' اور لائڈ جارج' ویلز کے جادوگر نے بے طرح چھیڑ دی تھیں

ڈانسزیو ایک تخیل پسند ادیب تھا مگر اس کا دل ہمیشہ "پئے خوبتر نگارے" تڑپتا تھا جنگ عظیم سے پہلے اس کا نام شہرت کے آسماں پر چاند بن کر چمک اٹھا تھا۔ مگر اس کے دل میں طاقت اور قوت کی ایک بے پناہ خواہش موجود تھی۔ اور جب اُسنے فیوم (   ) پر اپنا رومانی مارچ کر کے قبضہ کر لیا تو اس کا مقصد اپنے زندگی میں ایک نیا باب کھولنے کا تھا فیوم میں ہی اس نے اپنا رومن سلام ایجاد کیا۔ وہی طریقہ جسے پہلے مسولینی اور پھر ہٹلر نے اختیار کیا۔ لطیفہ یہ ہے کہ یہ سلام اس نے شاید کسی پرانے مجسمے یا دیواروں کے نقوش سے نقل کر لیا تھا رومن لوگوں کا یہ طریقہ نہ تھا سلطنت روما کے زمانے میں آزاد شہری ملاقات کے وقت ہاتھ ملاتے تھے اور محض غلام لوگ اس طرح ہاتھ اٹھاتے تھے جو نازی یا فاشسٹ طبقے کا طریقہ ہے۔

دانسزیو نے ہی وہ دلچسپ اور موثر طریق گفتگو ایجاد کیا جسے مسولینی نے خوبصورتی سے اپنا لیا۔ آج مسولینی بھی (پیازا ڈی وینیزیا) کے چھجے پر کھڑا ہو کر فولادی لہجے میں ویسے ہی پکارتا ہے جیسے دی نسزیو نے فیوم میں ایکٹ کیا تھا۔

دی نسزیو چھجے سے پکار کر کہتا تھا۔ فیوم کس کا ہے"؟

نیچے سے اس کے رضا کار سپاہی ہم آہنگی سے جواب دیتے "ہمارا"

"دوبارہ قیوم کا شاعر ڈکٹیٹر" اور اٹلی کس کا ہے ؟"

جواب میں مجمع چلاتا "کہتا" "ہمارا"

اس 'ہمارا' کی لفظی ترکیب نے اس مجمع میں اور وہاں سے پھیل کر کل اٹلی میں ایک قومی عصبیت۔ جارحانہ اقدامات۔ ایک خطرناک جذبہ خودی کا مرض پیدا کر دیا۔ اور وہی قوم جو میزینی اور گیری بالڈی کی قیادت میں قربانی اور جذبہ ایثار کا نمونہ تھی اب بہیمیت اور درندگی کا مجسمہ بن کر رہ گئی۔

مسز پرل بک ۱۹۳۸ء سال ادب کا نوبل انعام مسز پرل بک (Mrs. Pearl Buck) کو ملا ہے جو ایک مشہور و معروف امریکی ناول نویس ہے۔ اور سچ پوچھئے تو یہ 'امریکی' کی صفت ان کے نام کے ساتھ آج کل کی قومی عصبیت کا تحفہ ہے۔ مسز بک اپنی تعلیم و تربیت اور اپنی تصانیف کے ماحول۔ اپنی دلچسپیوں اور ہمدردیوں کے لحاظ سے خالصتہً چینی ہیں! ایک مسلمان کے لئے یہ امر کوئی تعجب کی چیز نہیں۔ بقول ہر ملک ملکِ ماست کہ ملک خدائے ماست۔ اس کی علمی۔ سیاسی اور اقتصادی زندگی میں جغرافی حدود۔ رنگ اور قوم کی تمیز کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے

مسز بک کے والد عیسائی مبلغ تھے اور ان کی پیدائش چین کے پرانے شہر (یوچو) میں ہوئی ان کا بچپن شہر چیانگ کیانگ کے ایک بنگلے میں گذرا جو ایک پہاڑی پر واقع تھا اور جہاں سے ایک گنجان آباد شہر اور ایک بہتے دریا کی آوازیں فاصلے کے مدھم کر دینے والے اثرات کی وجہ سے عجب دلفریبی لئے ہوئے پہنچی تھیں۔ ان کی دایہ ایک چینی بڑھیا تھی جو ان کے خاندان کے ہمراہ ۱۸ سال رہی اور اکثر بچپن میں جب ننھی پرل اس کے گھٹنے سے سر ٹیک کر بیٹھ جاتی تو وہ اسے تائی پنگ بغاوت کے ہولناک قصے سناتی۔ بچوں میں جنگ اور خونریزی۔ بہادری اور جانفروشی کے واقعات سے نفسیاتی دلچسپی ہوتی ہے۔ اور بچپن کے وہی تاثرات مسز بک کی مشہور تصانیف (The Good Earth) میں ظاہر ہوئے۔

۱۷ سال کی عمر تک انھوں نے چین میں ہی تعلیم پائی اور اس کے بعد امریکہ کے ایک کالج میں داخل ہو گئیں سند حاصل کرنے کے بعد وہ پھر چین میں واپس ہو گئیں اور دو سال کے بعد انھوں نے ایک امریکی مبلغ جان بک سے شادی کر لی اور ان کے ساتھ وہ شمالی چین میں چلی گئیں۔ وہاں کا پانچ سالہ قیام ان کے اپنے الفاظ میں ان

کی زندگی کا سب سے معنی خیز اور سخت ترین دور ہے اور یہاں انھیں چینی زندگی اور رسم و رواج کے مطالعہ کرنے کا سب سے اچھا موقعہ ملا۔

ناول نویسی شروع کرنے سے پہلے انھوں نے ایک تجرباتی دور گذارا۔ انھوں نے سب چینی ناول پڑھ ڈالے اور چین کے قدیم ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ مگر ان کا سب سے دلچسپ اور بار آور مطالعہ خود چینی زندگی تھی۔ جو اپنے تنوع، خاموش حسن اور انتہائی غربت میں ان کے دروازے کے باہر پھیلی ہوئی تھی وہ زندگی جس میں ہر مصیبت کے لئے ایک معنی خیز تبسم ہے جس میں ہر سیاہ گھٹا کے لئے ایک منور کرنے والی بجلی موجود ہے۔ وہ زندگی جس کا سب سے مجلّے آئینہ اس کا اپنا ادب ہے اور جس کا ایک ہمدردانہ عکس مسز بک کے ناول ہیں۔

ادارۂ معارف اسلامیہ اس مرتبہ ادارۂ معارف اسلامیہ کا سالانہ جلسہ عربک کالج دہلی میں منعقد ہوا استقبالیہ کمیٹی کے صدر سر عبدالرحمٰن سابق وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے اپنی تقریر میں نظام حیدرآباد کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے مالی امداد سے ادارے کی علمی سرگرمیوں کی قدر فرمائی ہے اس کے بعد سر شاہ سلیمان وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی نے ایک بلیغ خطبے میں اسلامی علوم و فنون کے بنیادی اصولوں پر روشنی ڈالی۔ مسلمانوں کا تخیل بلند، ان کا نقطۂ نگاہ محققانہ ان کا طریقہ سائنٹفک تھا ان کے لئے علم کا مقصد خدمت تھا اور آج ہلاکت ہے۔ اختتام پر انھوں نے ادارے کی توجہ دو اہم مقاصد کی طرف مبذول کی۔ پہلا مقصد تو موجودہ مغربی علوم و فنون کو اپنی زبان میں ڈھالنا اور دوسرے انگریزی ترجموں کے ذریعے دنیا کو فنون اسلامی کے بیش بہا خزینے سے روشناس کرانا۔ آخر میں علمی اور فنون لطیفہ کے نوادر کی نمائش کا افتتاح کیا گیا۔

ہمیں امید ہے کہ ادارہ اپنی مفید علمی اور ادبی سرگرمیوں کو برابر جاری رکھے گا۔ ہندوستان میں اسلامی تمدن کو روشناس کرانے کی جتنی آج ضرورت ہے شاید کبھی نہ ہوئی ہوگی اور اگر مسلمان اس مسئلہ پر غور کریں کہ انھوں نے عالم اسلامی کیا محض ہندوستان کے اسلامی تمدن کو دنیا کے سامنے پیش کرنے

کے لئے کیا کچھ کیا ہے تو ہماری گردنیں شرم سے جھک جائیں گی۔ امید ہے ادارہ معارف اسلامیہ اپنی سرگرمیوں کو محض علمی تحقیقات اور اہل علم کی دلچسپیوں تک ہی محدود نہیں رکھے گا بلکہ عوام کے لئے بھی اس قسم کا ادب مہیا کر سکے گا۔ جو ہر مسلمان کے دل میں ایک جائز جذبۂ افتخار پیدا کرے اور دوسری اقوام کے دل میں اس شاندار تمدن کے لئے ایک جذبۂ عزت۔

جامعہ

زیر ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۳۱	فروری ۱۹۳۹ء	نمبر ۲

فہرست مضامین

سائنس کی تعلیم

(از ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب صدیقی۔ ایم اے (کینٹب) پی ایچ ڈی (لیپزگ) پروفیسر جامعہ عثمانیہ)

اس مختصر مضمون میں کوشش کی جائے گی کہ سائنس کی جو تعلیم ہندوستان میں دی جاتی ہے اس پر تنقیدی نظر ڈال کر معلوم کیا جائے کہ اس تعلیم میں کیا نقائص ہیں اور انھیں کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔

اکثر علوم اور خصوصاً سائنس میں جو ترقی گذشتہ ایک سو سال کے دوران میں ہوئی ہے اس کے تفصیلی ذکر کی آج ضرورت نہیں۔ اس امر سے ہر تعلیم یافتہ شخص کم و بیش واقف ہے کہ علوم و فنون کے عمارتوں کی جو بنیادیں بابلی مصری چینی، ہندوستانی، اور عرب قوموں نے ڈالی تھیں وہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ بلند ہوتی چلی گئیں اور اب آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ لیکن اس سے بہت کم لوگوں کو واقفیت ہے کہ ان سر بفلک عمارتوں کی بنیادیں اس قدر کمزور تھیں کہ اگر بروقت ان کو مستحکم نہ کیا جاتا تو شاید اب ان عمارتوں کا نشان بھی نظر نہ آتا۔ سائنس کی بنیادوں کے متعلق اس تحقیق و تجسس کا نتیجہ ہے کہ ان کے بنیادی اصولوں میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ جو نتیجے پہلے بدیہی تھے اب ان کے ثبوت کی تلاش ہے۔ جو تعریفیں پہلے کافی سمجھی جاتی تھیں اب وہ مہمل قرار دی جاتی ہیں۔ جو مسئلے کسی زمانے میں انتہائی اہمیت رکھتے تھے وہ اب کہیں گوشۂ گمنامی میں پڑے ہیں۔ ریاضیات میں کبھی ضابطوں اور ان کے استعمال پر زور دیا جاتا تھا۔ اب ان کو یاد رکھنے کی کوئی فکر نہیں کرتا بلکہ طریقۂ استدلال پر توجہ مرکوز رہتی ہے۔ طبیعیات میں پہلے "خواص مادہ" کے مضمون کی بہت اہمیت تھی اور اب جوہری طبیعیات کا موضوع اہم ترین سمجھا جاتا ہے۔ علم کیمیا کا مرکز ثقل غیر نامیاتی کیمیا سے ہٹ کر نامیاتی اور طبیعی کیمیا کی طرف آگیا ہے باقی دوسرے علوم کا بھی یہی حال ہے۔

ان واقعات کی روشنی میں آپ ہماری درس گاہوں کو ملاحظہ فرمائیے۔ اکثر طلبا کو مدرسہ اور کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد بھی اپنے مضمون کے بنیادی اصولوں سے کماحقہٗ واقفیت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ خود نفس مضمون کے متعلق ان کی معلومات وہیں ختم ہو جاتی ہیں جہاں سے نیا دور شروع ہوتا ہے۔ گذشتہ سو سال کے دوران میں

جو ترقی ہوئی ہے اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے۔ اور اگر انھوں نے کبھی کسی عام فہم کتاب کو پڑھا ہے کوئی پبلک لکچر سنا ہے تو زیادہ سے زیادہ چند نئے ناموں سے واقف ہو جاتے ہیں اور انھیں اصطلاحوں کے بل بوتے پر اپنے دوست احباب پر رعب جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ان نئے اصطلاحوں کے تشریح اور ثبوت سے قطع نظر اگر ان کی تعریف ہی پوچھئے تو وہ صحیح طور پر نہیں بیان کر سکتے۔ مثلاً آج کل آپ اکثر اصحاب کی زبان پر نااقلیدسی ہندسہ، چار ابعاد، اور جوہری مرکزہ اور اسی قسم کے بیسیوں الفاظ پائیں گے حالانکہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں سے کتنے حضرات ان الفاظ کے حقیقی معنوں سے بھی واقف ہیں۔

اس جہالت اور ناواقفی کا ذمہ دار ہم ان بے چارے طالب علموں کو نہیں ٹھیرا سکتے جو ہندوستانی نظام تعلیم کے مشق ستم ہیں۔ زمانہ تعلیم کا اکثر و بیشتر حصہ کہنہ اور متروکہ معلومات کے بہم پہنچانے میں صرف کر دیا جاتا ہے اور جدید ترین معلومات تک پہنچنے کی کبھی نوبت نہیں آتی۔ اس کے دو بڑے وجوہات ہیں جو شاید ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ اول تو نصاب تعلیم میں تحدید کر دی جاتی ہے کہ کسی مضمون کے متعلق فلاں چیزیں پڑھائی جائیں گی اور انھیں پر امتحان لیا جائے گا۔ نصاب بنانے والے اپنی دانست میں یہ سمجھتے ہیں کہ اگر جدید ترین معلومات بھی ان میں شامل کر دی جائیں تو وقت کافی نہیں ہوگا اور پھر ایسے پڑھانے والے بھی نہیں ملیں گے جو مدرسوں اور کالج کی مختلف منزلوں پر ان جدید معلومات سے بخوبی واقف ہیں۔ دوسری طرف پڑھانے اور پڑھنے والوں کو یہ فکر رہتی ہے کہ مقررہ نصاب کسی طرح ختم ہو جائے اور امتحان کے وقت زیادہ سے زیادہ تعداد میں طلبہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوں۔ اس لئے نہ تو طالب علم ہی کی خواہش ہوتی ہے کہ نصاب کے باہر جدید معلومات حاصل کریں اور نہ استاد ہی انھیں ایسی ترغیب دلاتے ہیں۔ بلکہ بعض وقت تو یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر اتفاق سے کسی طالب علم میں بلند پروازی کا رحجان ہو تو استاد اس کو پکڑ کر پھر اس کنج قفس میں بٹھا دیتے ہیں۔ اب چونکہ انھیں امتحانوں کے فارغ التحصیل طلبہ آگے چل کر مدرس یا لکچرار ہوتے ہیں اس لئے ان میں نئی معلومات مفقود ہوتی ہیں اور اسی فقدان کی شکایت منصاب تعلیم بنانے والے حضرات کیا کرتے ہیں۔ غرض کہ علت و معلول کا یہ دائرہ پورا ہو جاتا ہے اور یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ جس کو چاہیں علت قرار دیں اور جس کو چاہیں معلول۔

سائنس کی تعلیم میں اس نقص کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ نہ صرف قیمتی وقت بلکہ اس سے زیادہ قیمتی

دماغ مشکل اور پیچیدہ مشقوں اور سوالوں کے حل کرنے میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ بد قسمتی سے یہ رجحان دوسرے علوم کی بہ نسبت علم ریاضی میں بہت زیادہ ہے، اور انگلستان کے مدرسوں اور کالجوں سے ہندستان میں داخل ہوا ہے۔ براعظم یورپ کے دوسرے ملکوں اور امریکہ میں یہ رجحان بہت کم ہے۔ اس کے متعلق کوئی طویل بحث کرنے کی بجائے میں صرف ایک ذاتی واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کروں گا جو شاید اس بحث سے زیادہ موثر ثابت ہو۔ کیمبرج یونیورسٹی سے ریاضیات کا ٹرائی پاس ختم کرنے کے بعد میں لائپ زک یونیورسٹی میں تحقیقاتی کام کے سلسلہ میں ٹھیرا ہوا تھا۔ یہاں پروفیسر ہائی زن برگ کی وجہ سے طبیعیات کا ڈپارٹمنٹ بہت مشہور تھا اور بہت سے ممالک سے پروفیسر وغیرہ آئے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ جبکہ سیمینار کے سلسلہ میں سب لوگ جمع تھے امریکہ کے ایک پروفیسر نے مجھ سے تذکرۃً دریافت کیا کہ میں نے اس سے قبل کیا تعلیم پائی ہے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں کیمبرج سے ریاضیات کا ٹرائی پاس ختم کر کے آیا ہوں تو انھوں نے بہت حیرت سے دریافت کیا کہ "کیا آپ واقعی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ٹرائی پاس کے سوالوں کو حل کرنے کے بعد بھی آپ کا دماغ صحیح و سالم ہے"

حاصل یہ کہ سائنس کی تعلیم میں جو وقت بے فائدہ مشقوں اور سوالات کی تعلیم میں صرف کیا جاتا ہے اگر بنیادی اصولوں کی تشریح ان کا ایک دوسرے سے تعلق جدید سائنس میں ان کی اہمیت وغیرہ کی توضیح میں لگایا جائے تو مفید تر نتائج پیدا ہوں گے اور طلبہ میں خود غور و فکر کی عادت پیدا ہوگی۔ یہ نہیں کہ سوالات کو چند قاعدوں کی مدد سے میکانی طور پر حل کر دیں، اور ان میں یہ احساس بھی نہ ہو کہ کوئی جواب فی نفسہٖ مہمل یا مضحکہ خیز تو نہیں ہے۔ حال ہی کا واقعہ ہے کہ ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کے امتحان میں میں نے ایک سوال دیا تھا کہ اگر ایک موٹر کی قیمت بمبئی میں ساڑھے تین ہزار کلدار اور ریلوے کا کرایہ ۱۵۰ روپیہ کلدار ہو اور حیدرآباد میں ۵ روپیہ فی صدی کے حساب سے کروڑگیری ادا کرنی پڑے اور یہاں کا ایجنٹ ۲۰ فی صدی نفع لے کر فروخت کرے تو خریدار کو سکہ عثمانیہ میں کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی جب کہ شرح تبادلہ ۱۰۰ روپے کلدار کے لئے ۱۱۵ روپیہ ۱۴ آنے سکہ عثمانیہ ہو اس سوال کے جواب میں بعض امیدواروں نے لاکھوں روپیہ قیمت نکالی اور ایک برخوردار نے تو غضب کر دیا کہ دو کروڑ سے زیادہ روپیہ جواب میں حاصل کئے۔ آپ خود اندازہ فرمائیے کہ میٹرک کے طالب علم کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ایسا جواب مہمل ہے اور وہ جواب کو برقرار رکھتا ہے۔

میں نے طالب علمی کے زمانے میں کسی فارسی کتاب میں ایک مقولہ پڑھا تھا کہ اگر کسی وعظ کا اثر سامعین پر نہ ہو تو یہ سامعین کا قصور نہیں بلکہ واعظ کا قصور سمجھو کہ اس نے مضمون کو اس طرح نہیں بیان کیا جو دل نشین ہو۔ میری دانست میں یہ مقولہ حرف بہ حرف صحیح ہے اور طلبہ اور عوام الناس میں سائنس اور ریاضی کی طرف سے جو دہشت بیٹھی ہوئی ہے اس کے ذمہ دار صرف اساتذہ ہیں جو مضمون کو اس قدر خشک اور غیر دلچسپ بناتے ہیں کہ طالب علم کو خواہ مخواہ ایک قسم کی منافرت پیدا ہوتی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سائنس وریاضی کے ادق سے ادق مسائل کو بھی دلچسپ بنانا ممکن ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لئے خود استاد کو بھی کافی مہارت ہونی چاہیئے۔ ہندوستان کے ابتدائی مدارس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ابتدائی جماعتوں کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ مدرس مہیا نہیں کئے جاتے حالانکہ تعلیم کی یہی وہ منزل ہے جو سب سے زیادہ کٹھن ہے۔ میری رائے میں کوئی مدرس چاہے وہ جماعت صغیر یا اول کو پڑھاتا ہو بی اے ٹرینڈ سے کم نہیں ہونا چاہیئے مڈل اور میٹرک کے مدرسین کم از کم ایم اے اور ایم ایس سی ہونے چاہئیں۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں آپ اس شرط کو نکال دے سکتے ہیں لیکن ہر معلم کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا لازمی ہے۔ کسی مضمون کو وہی شخص آسان بنا سکتا ہے یا دلچسپ طریقہ پر سمجھا سکتا ہے جو اس کے ہر پہلو پر پوری طرح حاوی ہو۔ اگر آپ ایک میٹرک کامیاب شخص کو پڑھانے بٹھائیں تو ظاہر ہے کہ وہ سوائے اس کے کہ کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس کو دہرا دے اور کیا کر سکتا ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے سخت افسوس ہوا کہ ایک ایسے مدرسہ میں جو یورپین اداروں کی نگرانی میں ہے اور جہاں طلبہ سے تقریباً ۱۵ روپیہ ماہانہ فیس لی جاتی ہے بعض ایسے استاد سینیئر کیمبرج کی جماعت کو پڑھاتے ہیں جو خود بھی صرف سینیئر کیمبرج کامیاب ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جو تنخواہیں اس وقت ابتدائی جماعت کے مدرسین کو دی جاتی ہیں ان تنخواہوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ مدرس نہیں مل سکتے۔ لوکل فنڈ کے بعض مدارس کے متعلق مجھے ذاتی علم ہے کہ استادوں کی تنخواہیں پندرہ بیس روپیوں سے زیادہ نہیں جو دوسرے محکموں میں چپراسیوں کو ملتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ معقول مشاہرے دے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ مدرسین کو ابتدائی مدارس میں بھیجا جائے جیسا کہ یورپ اور امریکہ میں ہوتا ہے تاکہ ہندوستان کے طلبا کی بنیادی تعلیم بھی ان غیر ممالک کے طلبہ کی طرح مستحکم ہو سکے۔ تعلیم ہی ایک ایسا ادارہ ہے جو کسی قوم کو بناتا

ہے اور اس کے لئے کسی ملک کو بجٹ میں عدم گنجائش کا عذر نہیں ہونا چاہیئے۔ دوسرے شعبوں کی گنجائش سے اس کمی کو بہرحال پورا کرنا ضروری ہے۔

اب تعلیم کے مضامین پر غور کیجئے تو جیسا میں نے اوپر بیان کیا ہے اعلیٰ تعلیم کے ختم ہونے پر بھی جدید معلومات تک پہونچنے کی نوبت نہیں آتی۔

غالباً ارباب تعلیم یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ تعلیم کی اس قلیل مدت میں جو ایم اے کامیاب کرنے پر ختم ہوتی ہے کسی سائنس کے جدید ترین اصول نہیں بتلائے جا سکتے لیکن ایک تو فرانس، جرمنی اور امریکہ کے نظام تعلیم سے اس وہم کے خلاف ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے خود ہر یونیورسٹی میں غور کیا جا سکتا ہے کہ میٹرکولیشن سے لے کر ایم۔ اے تک یعنی ۹ سال کے دوران میں کیا کچھ نہیں بتایا جا سکتا بشرطیکہ بہت سے فرسودہ مضامین اور لایعنی تفصیلات کو چھوڑ دیا جائے اور بے فائدہ مشقوں اور سوالوں میں وقت ضائع نہ کیا جائے علوم ریاضی اور طبیعیات کے لئے جن سے مجھے تھوڑی بہت واقفیت ہے میں نے چند دنوں قبل تفصیلی نصاب بنا کر بتلایا تھا کہ ۹ سال میں ان علوم کے جدید ترین اصول بتائے جا سکتے ہیں اور پھر طالب علم کے لئے چھوڑ دیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے رجحان اور مذاق کے مطابق ان میں سے کسی ایک شاخ کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کرے۔ یہ نہیں کہ ریاضیات کے ایک ایم۔ اے کامیاب طالب علم کو تفرق اور تکمل کی وہی تعریفیں معلوم ہوں جو ڈھائی سو سال قبل نیوٹن اور لائب نٹز نے کی تھیں اور یہ معلوم ہی نہ ہو کہ جدید ریاضی میں ان میں کب کا انقلاب ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرے سائنسوں سے واقفیت رکھنے والے حضرات اپنے اپنے سائنس کے متعلق اسی قسم کی مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔

اس طرح وقت ضائع کرنے کی بجائے جدید تحقیقات کے بنیادی اصول طالب علم کے سامنے تعلیم ختم کرنے سے قبل ہی پیش کر دئے جائیں تو وہ نسبتاً کم عمر میں اپنے مضمون کے انتہائی مدارج سے واقف ہو کر اس عمر میں جبکہ انسان کا دماغ پوری قوت کے ساتھ کام کرتا ہے اپنی اپنی تحقیقات میں مصروف ہو جائیں گے جدید سائنس کی تاریخ شاہد ہے۔ کہ تقریباً تمام بڑے انکشافات اور اہم ترین ایجادات ابتدائی عمر میں ہی ہوتے ہیں اور تحقیقاتی کام کرنے کا بہترین زمانہ جوانی کا ہے۔ پروفیسر آئن سٹائن نے نظریہ اضافیت کا انکشاف

۲۶ برس کی عمر میں کیا تھا۔ پروفیسر بوہر نے کوانٹم نظریہ کا انکشاف ۲۸ برس کی عمر اور پروفیسر ہائی زن برگ نے کوانٹم میکانکس کا انکشاف ۲۵ برس کی عمر میں کیا۔ پروفیسر لوئی ڈے بروگلی کی عمر اپنے اہم ترین انکشاف کے وقت ۳۱ برس، پروفیسر شروڈنگر کی عمر ۳۹ برس اور پروفیسر ڈیراک کی عمر ۲۶ برس تھی۔ یہ سب علما اپنے مضمون کے ماہر اور نوبل انعام یافتہ ہیں۔ ان کے علاوہ گذشتہ چند سال کے دوسرے نوبل انعام یافتہ مثلاً یورلے انڈرسن، ڈی بائی وغیرہ بھی مقابلتہً کم عمر ہیں۔ یہ اسی نظام تعلیم کا نتیجہ ہے کہ جامعہ سے فارغ التحصیل ہونے سے قبل طالب علم اپنے مضمون کے جدید ترین تحقیقات سے نہ صرف واقف ہوتے ہیں بلکہ خود بھی اسی پایہ کی تحقیقات کرسکتے ہیں۔"

اس لئے ضروری ہے کہ ہماری جامعات کے میٹرک سے لے کر ایم اے تک تمام نصابوں کو بنیادی طور پر بدل دیا جائے۔ یوں تو ہر چند سال کے بعد کسی قدر تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے لیکن ایک فرسودہ مضمون کی بجائے دوسرے فرسودہ مضمون کو رکھنے سے کوئی اصولی فائدہ نہیں حاصل ہوتا۔ اب محض ردوبدل کا زمانہ نہیں بلکہ ایک انقلاب کی ضرورت ہے کہ پورا نصاب تعلیم مکمل طور پر بدل دیا جائے۔ اس ضمن میں ایک غلط فہمی کو بھی رفع کردینا ضروری ہے جو ہماری قومی زندگی پر ایک نہایت بدنما دھبہ ہے۔ ایک خاص طبقہ میں آج کل جامعہ عثمانیہ کی تعلیم اور یہاں کے تعلیم یافتہ طلبا کی مذمت کرنا فیشن میں داخل ہوگیا ہے۔ ہم ان لوگوں کے سامنے علی الاعلان کہتے ہیں کہ بے شک ہماری تعلیم میں نقائص ہیں اور ایسے نقائص ہیں جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں لیکن یہ نقائص صرف جامعہ عثمانیہ سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ جیسا میں نے اوپر بیان کیا ہے ہندوستان اور انگلستان کی تمام یونیورسٹیوں میں پائے جاتے ہیں۔ گذشتہ سات سال کے عرصہ سے میں کلکتہ، مدراس، الہ آباد، پنجاب وغیرہ دوسری یونیورسٹیوں کا مسلسل ممتحن رہا ہوں اور ڈاکٹر آف سائنس سے لے کر بی۔ ایس سی اور بی اے (آنرز) تک تمام ڈگریوں کے لئے امتحان لیتا ہوں۔ میں ہمارے ان کرم فرما ناقدین کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ وہ ان بیرونی جامعات کے مقابلہ میں جامعہ عثمانیہ میں کوئی غیر معمولی نقص نہیں پائیں گے جو کچھ بھی نقص ہیں وہ موجودہ نظام تعلیم اور نظام امتحان کے ساتھ ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔

اس نظام تعلیم کا ایک اور نقص یہ ہے کہ موہوم افادیت کے خیال سے تعلیم کے اصلی مقصد کو نظر انداز

کر دیا جاتا ہے اور ستم ظریفی یہ کہ اس قربانی کے باوجود حقیقی افادیت بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کی تشریح کے لئے یہاں صرف مٹرکیولیشن کے علم ہندسہ کی تعلیم پر روشنی ڈالی جائے گی۔ میٹرک کے لازمی ریاضی کے نصاب میں عملی ہندسہ رکھا گیا ہے جس میں صرف مختلف شکلوں کا بنانا سکھایا جاتا ہے اور ان عملوں کے ثبوت کے متعلق کچھ نہیں کہا جاتا۔ ان مسئلوں پر غور کیجئے تو ان میں سادہ ترین مسئلوں جیسے ایک خط کے دو مساوی حصے کرنے کے مسئلہ کے علاوہ پیچیدہ ترین مسئلے بھی شامل ہیں۔ اب ہر سمجھ دار شخص یہ دریافت کر سکتا ہے کہ اگر افادیت ہی کسی مضمون کے پڑھانے یا چھوڑ دینے کا معیار ہو تو ان عملی مسئلوں کا طالب علم کو آئندہ زندگی میں کیا فائدہ ہوتا ہے۔ ۹۹ فی صدی میٹرک کامیاب طلبہ کو یہ کب ضرورت پڑتی ہے کہ ایک ایسا دائرہ بنائیں جو ایک دئے ہوئے نقطہ میں سے گذرے اور دو دئے ہوئے خطوں کو مس کرے۔ افادیت کا تو یوں خاتمہ ہوا۔ دوسری طرف آپ طالب علم کی مشکلات پر غور فرمائیے۔ ثبوت یا طریقہ استدلال سے تو وہ بالکل واقف نہیں ہوتا کہ ان کی بنا پر عمل کو خود نکال سکے اس لئے اس کو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ طریقہ عمل کو زبانی یاد کرے اور امتحان میں بجنسہ دہرا دے۔

اس سوال پر کہ ریاضیات کے ابتدائی اصول سے واقفیت طلبہ کے ذہن و قوت استدلال کی تربیت کے لئے اور ان کو ایک مفید شہری بنانے کے لئے ضروری ہے یا نہیں ارباب اقتدار اور ارباب تعلیم ایک مرتبہ کامل غور و خوض کے بعد تصفیہ کرلیں اور اگر پڑھانا ہی ضروری سمجھا جائے تو پھر ان علوم کو اسی طریقہ سے پڑھانا چاہئے جو ان کے لئے ناگزیر ہے۔ علم ہندسہ کو بغیر ثبوت اور استدلال کے پڑھانا قطعی مہمل ہے اور یہ استدلال میٹرک کے طلبہ کی طاقت سے باہر بھی نہیں۔ اگر وقت کے ناکافی ہونے کا سوال ہے تو زیادہ حصہ پڑھانے کی ضرورت نہیں چند مسئلوں پر اکتفا کیا جا سکتا ہے۔

کالج کی تعلیم میں بھی بعض وقت اہم مسئلوں کے ثبوت غیر تشفی بخش طور پر دئے جاتے ہیں اور بنیادی مفہوم اور اصول جن پر سارے مضمون کا دارمدار ہوتا ہے اچھی طور پر نہیں سمجھائے جاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبا ضابطوں کی مدد سے پیچیدہ سوال تو حل کر لیتے ہیں لیکن خود نفس مضمون کو واضح طور پر نہیں بیان کر سکتے۔ گذشتہ ہفتہ ہی کا واقعہ ہے کہ ایک بیرونی یونیورسٹی کے ایم ایس سی امتحان کے پرچوں

کو جانچتے وقت مجھے اس قسم کی افسوس ناک مثالوں سے سابقہ پڑا تھا۔

ہماری یونیورسٹیوں میں یہ بھی عیب ہے کہ اعلیٰ جماعتوں میں طریقۂ تعلیم تقریباً اسی قسم کا ہے جو مدرسوں میں رائج ہے حالانکہ اس منزل پر کتابی تعلیم کی بہ نسبت خود طلبہ کے لکچروں اور مباحثوں کو زیادہ اہمیت دی جانی چاہیئے۔ یہ طریقہ سیمینار اور COLLOGUIUM کے نام سے مشہور ہے اور جرمنی و فرانس میں اس کا بہت رواج ہے۔ اس سے ایک طرف طلبہ کو جدید تحقیقات سے واقفیت اور مہارت ہوتی ہے تو دوسری طرف ان میں خود تحقیق و تجسس کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ یوں بھی حال حال تک ہمارے پاس یونیورسٹی کا مقصد اولین یہی سمجھا جاتا تھا کہ طلبہ کو نصابی تعلیم دے کر امتحان پاس کرایا جائے اور پھر ڈگری عطا کی جائیں۔ تحقیقاتی کام کا اگر کہیں کچھ انتظام تھا بھی تو اس کی اہمیت دوسرے درجہ پر تھی۔ شکر ہے کہ اب اس طرف بھی قدم اٹھنے لگا ہے اگرچہ اب بھی اس کی حقیقی اہمیت کے موافق اس کا انتظام نہیں ہوتا۔ چنانچہ اب بھی اکثر یونیورسٹیوں میں کتب خانے اور تجربہ خانے سائنٹفک طور پر منظم نہیں ہیں۔ تحقیقاتی رسالوں اور کتابوں کے منگوانے کی بہ نسبت درسی کتابوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ مثلاً ریاضی اور طبیعیات کے رسالوں کو لیجیے ان علوم کے زیادہ نہیں تو کم از کم پچاس بہترین رسالے دنیا کے مختلف مقاموں سے نکلتے ہیں ہندوستان کے شاذونادر ہی کتب خانے ایسے ہوں گے جہاں آٹھ دس سے زیادہ رسالے موجود ہوں۔ بعض جگہ پیسوں کی کمی کا عذر ہے تو بعض جگہ یہ کہا جاتا ہے کہ انگریزی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کے رسالے بہت کم لوگ پڑھ سکتے ہیں۔ جو لوگ پیسے نہ ہونے کا عذر پیش کرتے ہیں وہ دوسری نمائشی چیزوں کے لئے دل کھول کر خرچ کرتے ہیں اور جو دوسری زبانوں سے ناواقفی کا عذر کرتے ہیں وہ خود انگریزی رسالوں اور کتابوں کی طرف بھی کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ اصلی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کی اہمیت سے ناواقف ہیں اور نہیں جانتے کہ آئندہ نسلوں کے لئے مواد کی عدم موجودگی کی وجہ سے تحقیقاتی کام میں کس قدر دشواریاں پیش آئیں گی۔

پھر بعض مقاموں پر جو فنڈ کی نام نہاد کی کمی کے باعث اہم رسالے یا کتابیں فراہم نہیں کر سکتے بعض دوسری کتابوں اور رسالوں کی اس قدر افراط ہوتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا آخر اس کا کیا مصرف ہوگا۔ مثال

کے طور پر ایک رسالہ "نیچر" ہی کو لیجئے یہ انگریزی کا ایک مشہور رسالہ ہے جو لندن سے ہر ہفتہ نکلتا ہے اور یوں سمجھئے کہ سائنٹفک نیوز ایجنسی کا کام دیتا ہے۔ یعنی چونکہ دوسرے رسالے ماہانہ سہ ماہی شائع ہوتے ہیں۔ اور ان میں طویل تحقیقی مضامین کے چھپنے کے لئے عرصہ لگتا ہے اس لئے محض ان انکشافات کا اعلان مختصر طور پر نیچر میں کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں بعض کتابوں کے تبصرے اور سائنٹفک مجلسوں کی مختصر روداد بھی شائع ہوتی ہے۔ کسی شخص کے لئے اس رسالہ کو ایک آدھ گھنٹہ سے زیادہ پڑھنے کی ضرورت نہیں لیکن ہندوستان میں اکثر مقاموں پر صرف یونیورسٹی کے حدود کے اندر کم از کم نصف درجن کاپیاں اس رسالہ کی آتی ہیں جس کا چندہ تقریباً ۲ گنی دینا پڑتا ہے حالانکہ صرف ایک کاپی بھی ساری یونیورسٹی کے ضروریات کے لئے کافی ہے اس کی بچت سے دوسرے رسالے منگوائے جا سکتے ہیں جو بدرجہا زیادہ اہم ہیں۔

اسی ایک رسالہ کا ذکر تمثیلاً کیا گیا ہے ایسی بہت سی دوسری مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے درمیان اشتراک عمل نہیں ہوتا اور ہر شعبہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنانا چاہتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ تمام مشترکہ دلچسپیوں کے رسالے اور کتابیں یونیورسٹی یا خود شہر کے مرکزی کتب خانہ میں منگوائی جائیں۔ ان میں نیچر، فلاسفیکل میگزین، رائل سوسائٹی کے پروسیڈنگ، پیرس اکاڈیمی کے پروسیڈنگ وغیرہ شامل رہیں۔ جو رسالے صرف خاص موضوع پر ہوں اس شعبہ کے کتب خانہ میں منگوائے جائیں اور ہر اہم رسالہ ضرور منگوا لیا جائے چاہے اس کی نسبت سے فرنیچر کی مد میں یا انتظامی مصارف میں یا بالآخر اساتذہ کی تنخواہوں میں کمی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ یہ رسالے الماریوں کی زینت ہی نہ رہیں بلکہ حتی الامکان ان کا استعمال کیا جائے۔ اس کے لئے اول تو خود اساتذہ کو ان سے واقف ہونا چاہیئے۔ پھر وہ طلبہ کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ چونکہ ہر فرد کے لئے اس کا موقع نہیں ہے کہ ہر ایک تحقیقی مضمون کو تفصیل سے پڑھ کر سمجھ سکے اس لئے مناسب ہوگا کہ اپنے مذاق اور دلچسپی کے مطابق ہر استاد ایک مضمون کا انتخاب کرے اور حال میں اس مضمون کے متعلق مختلف رسالوں میں جو تحقیقی مقالے شائع ہوئے ہیں ان کا خلاصہ سیمینار میں بیان کرے۔ اس ضمن میں چند مضمون اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ کے سپرد کئے جا سکتے ہیں تاکہ وہ ان کے متعلق مواد فراہم کریں اور اچھی طرح مہارت حاصل کرنے کے بعد سیمینار میں لکچر دیں۔ اس طریقہ سے طلبہ کے معلومات اور تجربہ میں بہت اضافہ ہوگا اور تحقیقی کام کی طرف

بے حد ترغیب ہوگی۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے درمیان MIGRATION SYSTEM رائج کیا جائے یعنی اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ کو یہ اجازت دی جائے کہ وہ چند میقاتیں بیرونی جامعات میں دوسرے اساتذہ کی زیر نگرانی کام کرسکیں۔ اس سے ان کو نہ صرف مختلف ماہرین کے معلومات سے مستفید ہونے کا موقع ملے گا بلکہ تعلیم کے متعلق مختلف تحریکوں سے بھی واقفیت ہوجائے گی جرمنی میں یہ طریقہ عام طور پر رائج ہے اور طلبہ کے خیالات کی وسعت اور پختگی میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔

لیکن ہر طالب علم کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے وطن کے علاوہ مختلف مقاموں میں تحصیل علم کر سکے اس لئے ضرورت ہے کہ مختلف جامعات آپس میں یہ انتظام کریں کہ ایک جگہ کے اساتذہ وقتاً فوقتاً دوسری جامعہ میں ایک یا دو میقاتوں تک لکچر دیتے رہیں۔ اس سے اساتذہ اور طلبہ دونوں کو بے حد فائدہ ہوگا۔ اگر یہ انتظام اس طریقہ پر کیا جائے کہ مثلاً مدراس سے ایک پروفیسر کلکتہ جائے اور کلکتہ سے ایک پروفیسر مدراس آئے تو میرے خیال میں زیادہ انتظامی دقتیں بھی نہیں ہوں گی۔ اور اگر ایسی دقتیں ہوں بھی تو انھیں کسی نہ کسی طرح حل کرنی چاہیئے۔ محض مشکلات کے خوف سے کسی اہم اسکیم کو پس پشت ڈال دینا تدبیر کی علامت نہیں ہے۔

حضرات اس مختصر مضمون میں سائنس کی تعلیم کے متعلق چند خیالات نمونۃً آپ کی خدمت میں پیش کئے گئے ہیں جو کم و بیش دوسرے علوم کے متعلق اسی طرح صحیح ہیں۔ آج کل نہ صرف ہماری ریاست میں بلکہ کل ہندوستان میں تعلیم کی تنظیم جدید پر غور ہو رہا ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ مختلف پہلوؤں سے اس مسئلہ پر بحث کی جائے۔

بہت سی اہم باتیں وقت کی تنگی کے سبب یہاں چھوٹ گئی ہیں جو کسی آئندہ موقع پر تفصیلی معلومات کے ساتھ پیش کی جائیں گی۔

زمین اور آبادی

(از جناب محمد عاقل صاحب ایم۔ اے۔ استاد معاشیات)

زمین اور آبادی میں جو گہرا تعلق ہے اسے کم و بیش ہر شخص سمجھتا ہے۔ زمین کے بغیر کوئی آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔ زندہ رہنے کے لئے کھانے کپڑے اور مکان کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ تینوں چیزیں زمین سے ہی براہ راست یا بالواسطہ حاصل کی جاتی ہے۔ زمین میں بیج بویا جاتا ہے تو اس سے کھانے کے لئے اناج ترکاری اور پھل ملتے ہیں۔ کپڑے بنانے کے لئے روئی اور دوسرے ریشہ دار پودے تیار کئے جاتے ہیں جانوروں کو زمین پر ہی چراتے اور پالتے ہیں تب ان سے دودھ، گھی، گوشت کھالیں حاصل کی جاتی ہیں اور ان سے بوجھ اٹھانے اور کھینچنے کا کام لیا جاتا ہے۔ زمین کی مٹی سے مکانات بنا کر کھڑے کئے جاتے ہیں اور لوہا تانبا اور دوسری دہاتیں نکالی جاتی ہیں۔ غرضکہ زمین کے ایسے ہی بے شمار اور فائدے ہیں جن سے آبادی کے زندہ رہنے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زمین میں بصورت مجموعی کس قدر آبادی کے پرورش کرنے کی وسعت اور گنجائش پائی جاتی ہے۔ اس سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا تو مشکل ہے۔ کیونکہ زمین کے سب حصے ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ کچھ زمینیں آدمیوں کے لئے مفید ہوتی ہیں کچھ غیر مفید۔ کچھ زمینیں پتھریلی پہاڑی ہوتی ہیں کچھ دلدلی۔ کچھ میں جنگلات کثرت سے لگے ہوتے ہیں کچھ بالکل خشک ریگستان ہوتی ہیں۔ کچھ زرخیز ہوتی ہیں کچھ بنجر ہوتی ہیں۔ کچھ معدنیات سے پر ہوتی ہیں کچھ خالی اور بے کار ہوتی ہیں۔ کچھ کے فائدے کا علم لوگوں کو ہوتا ہے اور کچھ ایسی ہوتی ہیں جن کے فائدے سے لوگ ناواقف ہوتے ہیں۔ لیکن ہر زمین کو محنت کے ذریعہ کم و بیش مفید بنایا جا سکتا ہے اور جتنا انسان کی ایجاد اور اختراع کی قوتوں میں اضافہ ہوتا ہے اتنی ہی آدمی کی محنت آسان ہوتی جاتی ہے اور پرانی بے کار زمینوں کو کارآمد اور زرخیز بنانے کا کام سہل ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے زمین میں آدمیوں کو پرورش کرنے کی جس قدر گنجائش ہے وہ کوئی قائم اور دائم چیز نہیں ہے

بلکہ علوم و فنون کی ترقی اور تنزل کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ ہمیں ہر عہد کے سرمایہ علم و فن کا لحاظ کرتے ہوئے زمین کی وسعت اور گنجائش کا فیصلہ کرنا ہوگا۔

لیکن چند ظاہری باتیں ایسی ہیں جن سے آبادی اور زمین کے توازن کا کچھ نہ کچھ پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر ہم کسی ملک میں یہ دیکھیں کہ وہاں کے لوگوں کی عمریں اوسطاً زیادہ ہوتی ہیں۔ ان کے قد و قامت سے توانائی، اور تندرستی ظاہر ہوتی ہے۔ چہرے تر و تازہ اور شاداب ہوتے ہیں۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں ان کی تندرستیاں عموماً اچھی رہتی ہیں اور عمر کے زیادہ حصہ میں ان میں کام کرنے کی چستی، ولولہ، امنگ اور اہلیت پائی جاتی ہے تو ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ ان کی زمین آبادی کی ترقی کے لئے موزوں اور مناسب ہے[1] اگر صورت حال اس کے برعکس نظر آئے تو ہمیں اس کے خلاف نتیجہ نکالنا چاہیئے۔ خلاصہ اس تمام بحث کا یہ ہے کہ اگر زندگی کو قائم رکھنے والے اسباب، زندگی کو ختم کرنے والے اسباب کے مقابلہ میں زیادہ ہوں تو ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ فطری ماحول آبادی کی ترقی کے لئے موافق ہے اور یہ نہ ہو تو سمجھنا چاہیئے مخالف ہے۔

جن مفکرین نے آبادی اور زمین کے تعلقات پر غور و فکر کیا ہے وہ زمین کی وسعت اور گنجائش کے بارے میں دو مختلف نتیجوں پر پہنچے ہیں جن سے معاشیات کے ماہروں کے دو گروہ بن گئے ہیں ایک گروہ کو ہم یاس مشربوں یعنی ایسے لوگوں کا گروہ کہہ سکتے ہیں جو زمین کی گنجائش کی کمی اور قدرتی وسائل دولت کی قلت

---

[1] یہاں میرے اس بیان سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ میں آبادی کے لئے صرف زمین کو ہی ایک تنہا ذریعہ معاش سمجھتا ہوں اور تجارت و صنعت، اور علمی پیشوں کو جن کے لئے زمین کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ بعض ملک ایسے ہو سکتے ہیں جو تجارت اور صنعت یا علمی پیشوں یا دوسری ذاتی خدمات کے ذریعہ اپنی آبادی کے معیار زندگی کو ایک بلند سطح پر قائم رکھ سکتے ہیں لیکن اس سے زمین کی بنیادی اہمیت ان ملکوں کیلئے بھی زائل نہیں ہو جاتی۔ انھیں اپنی تجارت کے لئے سامان اور خریدار، اپنی صنعتوں کیلئے کچا مال، اپنے علمی پیشوں اور ذاتی خدمتوں میں مصروف رہنے والے لوگوں کے لئے غذا، اگر اپنے ملک کی زمین سے نہیں تو کسی نہ کسی دوسرے ملک کی زمین سے ضرور حاصل کرنا پڑتی ہے۔ نو آبادی کے حاصل کرنے کیلئے سامراجی ملکوں میں جو کشمکش جاری ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایسی صورت میں زمین اور آبادی کا مسئلہ صرف ایک ملک تک محدود نہیں رہتا کئی ملکوں بلکہ پوری دنیا پر پھیل جاتا ہے۔ لیکن زمین اور طبعی ماحول پر انسانوں کا بصورت مجموعی جو انحصار ہے اس کی اہمیت بہر حال باقی رہتی ہے۔ اس سے آبادی اور زمین کے مقابلہ کو وسیع رقبہ پر پھیلا کر تھوڑی مہلت حاصل کی جا سکتی ہے لیکن اس مقابلہ کو سرے سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔

کو آبادی کی ترقی کے راستہ میں حایل دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ زمین سے جتنی پیداوار حاصل ہو سکتی ہے اس کی مقدار محدود ہے اور انسانی آبادی میں اضافہ اس کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے دنیا کے سب لوگوں کو زمین کی پیداوار سے جی بھر کے فائدہ اٹھانے کا موقع کبھی بھی نہ مل سکے گا۔

دوسرا گروہ امید پروروں یعنی معاشیات کے ایسے ماہروں کا ہے جو انسانی ترقی کے بارے میں نہایت خوش آئند توقعات رکھتے ہیں۔ وہ زمین کی پیداوار کی کمی کو موجودہ افلاس اور زبوں حالی کا سبب قرار نہیں دیتے بلکہ وہ اس کا الزام غیر مساوی تقسیم دولت اور دوسری معاشری اور سیاسی خرابیوں پر رکھتے ہیں۔

آیئے ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ ان دونوں گروہوں کے عقائد کا مطالعہ کریں۔ پہلے یاس مشربوں کو لیجئے۔ اس گروہ کا سردار اور امام مالتھس ہے جس نے سب سے پہلے ان لوگوں کے پُرجوش حوصلوں کو سرد کرنے کی کوشش کی جو چاہتے تھے کہ دولت کی معقول تقسیم سے دنیا میں خوش حالی اور فارغ البالی کے دور سعید کا آغاز کریں اور دنیا کو بہشت کا ایک نمونہ بنا دیں۔ اس نے ان لوگوں کو تبلایا کہ تمھاری یہ تمام تمنائیں اور آرزوئیں ایک سودائے خام سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ زمین کی پیداوار اور آبادی کے جو اٹل قوانین ہیں وہ تمھاری تمام کوششوں کو ضرور بالضرور برباد کر ڈالیں گے۔ آبادی کے اضافہ کا یہ قانون ہے کہ وہ دونی چوگنی آٹھ گنی بڑھتی ہے لیکن زمین کی پیداوار میں اضافہ ایک دو تین کی نسبت سے ہوتا ہے۔ آبادی اور غذا کے اضافہ کی رفتار میں جو کثیر فرق ہے اس سے غذا اور آبادی کا توازن بگڑتا رہتا ہے جس سے لوگوں میں غذا کے حاصل کرنے کے لئے کشمکش جاری ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانا ملتا ہے کچھ کھانے سے محروم رہتے ہیں اور جب کبھی یہ توازن بہت زیادہ بگڑ جاتا ہے وبائیں پھیلتی ہیں۔ قحط سالی پیدا ہوتی ہے۔ خانہ جنگیاں اور بین الاقوامی لڑائیاں ہوتی ہیں۔ غرضکہ فتنہ و فساد اور تکلیف و مصیبت کا دور دورہ جاری ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بہت سے آدمی مرجاتے ہیں۔ یا مارے جاتے ہیں اور اس طرح غذا اور آبادی کا بگڑا ہوا توازن دوبارہ برابر ہو جاتا ہے اس کے بعد پھر یہی سلسلہ ازسرنو شروع ہو جاتا ہے۔ جو قومیں عقلمند اور عاقبت اندیش ہوتی ہیں وہ کوشش کرتی ہیں کہ اپنی آبادی کو حد سے زیادہ نہ بڑھنے دیں اور زیادہ اولاد کو قصداً و ارادتاً پیدا نہیں ہونے

دیتیں اور اپنی اس پیش بینی کی وجہ سے قدرتی مصیبتوں سے نجات حاصل کر لیتی ہیں اور جو ایسا نہیں کرتیں یا نہیں کر پاتیں انھیں وقتاً فوقتاً قدرت کی ان اصلاحی کوششوں کا مقابلہ کرنا اور اپنی ناعاقبت اندیشیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

مالتھس کے بعد رکارڈو نے زمین کی پیداوار کے بارے میں اپنا قانون پیش کیا جس سے مالتھس کے نظریہ آبادی کی جو خامی تھی وہ رفع ہوگئی۔ مالتھس اس بات کو وضاحت کے ساتھ بیان نہ کرسکا تھا کہ زمین کی پیداوار میں اضافہ تیزی کے ساتھ کیوں نہیں ہوتا۔ اس کی اس کسر کو رکارڈو نے پورا کردیا۔ اس نے لوگوں کے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر اس بات کو ثابت کیا کہ جب ایک ہی زمین پر زیادہ محنت اور لاگت لگائی جاتی ہے تو چاہے محنت اور لاگت پہلے کے برابر ہی لگائی جائے لیکن اس سے زمین کی پیداوار میں پہلے کے برابر اضافہ نہیں ہوتا بلکہ پہلے کی نسبت سے کم اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً پہلے اگر ایک روپے کی لاگت لگانے سے پیداوار میں ایک من کا اضافہ ہوا تھا تو بعد میں ایک روپیہ لگانے سے پون من کا اضافہ ہوگا اور چاہے لاگت کو برابر ایک ہی روپیہ سے ہم بڑھاتے جائیں لیکن پیداوار کا نیا اضافہ ہر پچھلے اضافہ کے مقابلہ میں گھٹتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ ایک حد ایسی بھی آسکتی ہے کہ ایک روپیہ کی مزید لاگت لگانے کے باوجود پیداوار میں کوئی مزید اضافہ نہ ہو۔ رکارڈو نے اپنے اس نظریے کا نام قانون تقلیل حاصل رکھا تھا۔

جب لوگوں نے رکارڈو کے اس قانون تقلیل حاصل کو مالتھس کے قانون آبادی کے ساتھ ملا کر دیکھا تو ان کے نزدیک زمین اور آبادی کا مسئلہ بالکل صاف ہوگیا۔ انھوں نے کہا آبادی کے بڑھنے سے اس میں شک نہیں کام کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے اور ہر نیا شخص ایک منھ کے ساتھ دو ہاتھ لے کر بھی پیدا ہوتا ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ منھ تو اتنی ہی غذا طلب کرتا ہے جتنی پہلے آدمیوں کے لئے ضروری تھی لیکن بعد کے آدمیوں کے ہاتھ پہلے آدمیوں کے ہاتھوں کے مقابلہ میں زمین سے کم غذا حاصل کر پاتے ہیں۔ نئے کام کرنے والے جب زمین پر کام شروع کرتے ہیں تو ہر چند وہ پرانے کام کرنے والوں کے برابر محنت کرتے ہیں لیکن پھر بھی انھیں پرانے کام کرنے والوں کے مقابلہ میں زمین سے غذا کی کم مقدار حاصل ہوتی ہے۔ اسے فطرت کا بخل کہیے جو چاہے کہیے لیکن یہ اپنی جگہ پر ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس لئے اگر آبادی زیادہ بڑھے گی تو لوگوں کے افلاس اور پریشان حالی میں بھی ضرور اضافہ ہوگا۔ مالتھس اور رکارڈو

کے بعد جان اسٹوارٹ مل نے اس نظریے کو ضروری ترمیم اور اصلاح کے بعد اور زیادہ بہتر شکل میں پیش کیا اور بعد میں مارشل نے اسے اور بھی زیادہ پسندیدہ شکل دے دی جس کی تائید ہے۔ ایم کینس اور کیمبرج اسکول کے دوسرے ماہرین معاشیات نے جاری رکھی۔

اس یاس پسند گروہ کے مقابلہ میں جو انسانی ترقی کے امکانات کو محدود سمجھتا ہے دوسرا گروہ امید پروروں کا ہے جن کا کہنا ہے کہ انسانوں کی مرفہ الحالی اور معاشی ترقی پر قدرت کی طرف سے کوئی پابندی عاید نہیں کی گئی ہے۔ وہ اپنے دعوے کی تائید میں کہتے ہیں کہ زمین کی زرخیزی میں پچھلے زمانے میں اضافہ ہوا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ کاشت کے نئے طریقوں کے دریافت ہو جانے سے نئی نئی زمینیں زیر کاشت لائی جا رہی ہیں۔ پھر نئے ملکوں میں زرخیز زمینیں افراط کے ساتھ موجود ہیں۔ دوسری طرف آبادی میں اضافہ اس قدر تیزی سے نہیں ہو رہا ہے جس کا اندیشہ مالتھس اور اس کے پیرووں نے کیا تھا۔ ایجاد و اختراع کی جن نئی قوتوں کو انسان نے اپنے قبضے میں کر لیا ہے ان کے ذریعہ کثیر سے کثیر آبادی کے لئے مرفہ الحالی کے وسائل فراہم کئے جا سکتے ہیں۔ آج جہاں کہیں بھی افلاس اور پریشاں حالی نظر آتی ہے اس کا اصل سبب آبادی کی کثرت نہیں ہے بلکہ اس کے اسباب دوسرے ہیں۔ آبادی کی کثرت افلاس کا نتیجہ ہے اس کا سبب نہیں ہے۔ مالتھس نے اپنے زمانے میں انگلستان کو ضرورت سے زیادہ آباد بتلایا تھا اور تلقین کی تھی کہ انگلستان کو یا تو عاقبت اندیشی سے کام لے کر اپنی تعداد کو گھٹانا چاہیئے ورنہ قحط سالی، وبا اور خانہ جنگی کے پھیلنے کا اندیشہ ہے جس سے آبادی کو قدرت کی طرف سے جبراً کم کر دیا جائے گا۔ لیکن انگلستان کی آبادی کم ہونے کی جگہ دن دونی اور رات چوگنی بڑھتی رہی اور اس کثیر آبادی کے لئے امریکہ کی زائد پیداوار سے غذا اور اپنی ملکی پیداوار سے سامان آسائش فراہم ہوتے رہے۔ انگلستان کی موجودہ آبادی کثرت تعداد کے باوجود آج جس قدر خوش حال نظر آ رہی ہے اتنی مالتھس کے زمانہ میں نہیں تھی حالانکہ اس وقت آبادی آج کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ پھر یہ بات انگلستان تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ تمام یورپ اور امریکہ کے متعلق یہی بات کہی جا سکتی ہے۔ یورپ اور امریکہ اور دنیا کے زیادہ تر ملکوں کے سامنے آبادی کی زیادتی کا مسئلہ آج اس قدر اہم نہیں ہے جتنا آبادی کی کمی کا ہے۔

ایشیا کے چند ملکوں کو اگر چھوڑ دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے سیاسی رہنما اس وقت آبادی کو کم کرنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس کے برعکس آبادی بڑھانے کی تدبیریں نکال رہے ہیں۔ غرضیکہ اس قسم کے واقعات اور مشاہدات تھے جنھوں نے امید پرور گروہ کو مالتھس اور کارڈو کی مخالفت پر آمادہ کیا تھا۔ اس گروہ کے ابتدائی علمبرداروں میں کیری ہملٹن وغیرہ کے نام لائق ذکر ہیں۔ بعد میں ہنری جارج نے بھی ان کے نظریوں کی مخالفت میں حصہ لیا اور موجودہ زمانے میں ایڈورڈ کینن اور ان کے شاگرد ڈالٹن اور رابنس اور لنڈن اسکول آف اکنامکس کے دوسرے معاشی ماہروں نے مالتھس کے نظریے کے مقابلہ میں نئے حالات کو سامنے رکھ کر ایک نیا نظریہ یعنی نظریہ آبادی متناسب (OPTIMUM THEORY OF POPULATION) پیش کیا ہے۔

اس نظریے کے حامیوں کے نزدیک آبادی کی محض تعداد چاہے وہ کتنی ہی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو خطرناک چیز نہیں ہے۔ وہ آبادی کے اضافہ سے نہیں گھبراتے۔ جس چیز کو وہ خطرناک سمجھتے ہیں وہ غیر متوازن آبادی ہے یہ غیر متوازن آبادی تعداد کی کمی کی حالت میں بھی پائی جا سکتی ہے۔ اور تعداد کی زیادتی کی حالت میں بھی۔ اس کا تعلق محض تعداد سے نہیں ہے بلکہ تعداد کی طلب سے ہے۔ یہ ممکن ہے کہ عہد جہالت اور وحشت میں آج کی آبادی کے مقابلہ میں صرف ایک بٹہ ایک لاکھ آبادی پائی جاتی ہو لیکن پھر بھی دنیا ضرورت سے زیادہ آباد نظر آتی ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ آج سے پانسو سال بعد دنیا میں آج کے مقابلہ میں پچاس گنا آبادی زیادہ ہو اور پھر بھی دنیا ضرورت سے کم آباد معلوم ہو۔ آبادی کی تعداد بجائے خود مطلق طریقہ پر کوئی معیار نہیں بن سکتی بلکہ اسے طریقہ پیداوار اور نظام معیشت سے نسبت دینے کی ضرورت ہے اور آبادی کی جس تعداد کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کا امکان پیدا ہو سکے وہی مناسب ترین آبادی ہے اور اسی کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ آبادی کے بڑھنے کا امکان طریقہ پیداوار دولت اور انسانی ایجاد واختراع کی ترقی کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ چیزیں چونکہ بدلتی رہتی ہیں اس لئے آبادی کی انتہائی حد بھی ایک جگہ قائم نہیں رہتی وہ بھی بدلتی رہتی ہے۔ مسٹر کار سانڈرس بھی اسی نقطہ خیال کے حامی ہیں۔ انھوں نے دنیا کی آبادی کو نسلوں کے اعتبار

سے تقسیم کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یورپی نسل کے لوگ جہاں جہاں آباد ہیں وہاں آبادی کا رجحان کمی کی طرف ہے اور بعض ملکوں میں فی الحال اور بعض میں اب سے دس سال بعد اور بعض میں بیس سال یا اس سے زاید مدت میں آبادی کی یہ کمی ملک کے وسائل کو ترقی دینے کے لیے ناکافی ثابت ہوگی۔ صرف چین، ہندوستان اور چند دوسرے غیر یورپی ملک ایسے ہیں جن کی آبادی میں ترقی کی طرف رجحان پایا جاتا ہے اور ان کے قدرتی وسائل، طریقہ پیداوار دولت اور معیشت کی موجودہ تنظیم کا لحاظ کرتے ہوئے اندیشہ کیا جا سکتا ہے کہ ان ملکوں میں آبادی کی کثرت کا مسئلہ آئندہ سالوں میں ایک خطرناک صورت اختیار کرے گا۔ یہاں ہم ہندوستان کے مسئلہ آبادی کا ذرا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کریں۔

(۲)

ہندوستان کے مسئلہ آبادی کے دو پہلو ہیں۔ پہلا پہلو تو یہ ہے کہ آیا ہندوستان میں اس وقت آبادی گنجائش سے زیادہ ہے یا نہیں اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ صورت حال قائم اور جاری رہنے والی ہے یا ختم ہونے والی ہے۔ پہلے پہلو کا بالواسطہ ثبوت تو امراض اور اموات کے اعداد پیش کر کے دیا جا سکتا ہے اور بلاواسطہ ثبوت غذا کی رسد کا تخمینہ کر کے۔ اگر اس تخمینہ سے یہ ثابت ہو کہ غذا ناکافی ہے اور دوسرے ملکوں سے مصنوعہ اشیا یا خدمات کے معاوضہ میں غذا کی فراہمی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو ہندوستان کی آبادی کو بساط اور گنجائش سے زیادہ کہا جائے گا اس کے بعد دوسرا سوال یہ ہوگا کہ آیا یہ صورت حال قائم رہنے والی ہے یا ختم ہونے والی یہ صورت حال دو ہی صورتوں میں ختم ہو سکتی ہے یا تو یہ ہو کہ وسائل غذا میں آبادی کے مقابلہ میں زیادہ تیزی سے اضافہ ہو یا پھر یہ ہو کہ آبادی تیزی کے ساتھ گھٹنا شروع کر دے۔ اب آیئے ان سوالوں کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کیا جائے۔

کسی ملک کی آبادی اور اس کی زمین میں جو باہمی تعلق پایا جاتا ہے اس کی نوعیت کا اگر پتہ چلانا ہو تو اس کی سہل ترین صورت یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اس ملک میں لوگوں کی عمر اوسطاً کیا ہوتی ہے یعنی جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ کتنی مدت تک زندہ رہتے ہیں۔ ہر ملک میں کچھ بچے تو ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں کہ اسی پچاسی برس کی عمر تک پہنچتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو چالیس پچاس سال سے آگے نہیں بڑھتے اور کچھ پیدا ہونے کے

دو تین دن بعد ہی مر جاتے ہیں۔ لیکن ان مختلف عمروں تک پہنچنے والوں کے تناسب ہر ملک میں مختلف ہوتے ہیں۔ طویل عمر تک پہنچنے کا انحصار بچے کی قوت حیات پر ہوتا ہے۔ بچے کی قوت حیات پر نسل اور وراثت کا بھی اثر پڑتا ہے۔ لیکن زیادہ اہم اثر گرد و پیش کے حالات کا پڑتا ہے۔ زندگی کی ترقی کے لئے پہلی ضرورت کافی اور مناسب غذا کھلی اور صاف ہوا میں ورزش اور جسم کا آرام ہے۔ دوسری ضرورت سردی گرمی اور دوسرے مخالف موسمی اثرات سے بچاؤ کی تدبیریں ہیں۔ تیسری ضرورت زندگی کے دشمن جو جراثیم اور امراض ہیں ان سے جسم کو محفوظ رکھنا ہے اور چوتھی ضرورت یہ ہے کہ اگر ان ابتدائی مدافعانہ تدبیروں کے باوجود کوئی شخص امراض کا شکار ہو جائے تو اس کے علاج کا معقول انتظام موجود ہو۔ اگر یہ سب چیزیں فراہم ہو جائیں تو پھر بچہ کے لئے زیادہ عمر تک زندہ رہنے کی توقع بہت بڑھ جاتی ہے۔

یوں تو انسان فانی ہے اور پیدا ہونے کے بعد مرنا بھی ضروری ہے لیکن جتنے زیادہ دن تک اس اٹل تقدیر کو ٹالا جا سکے اتنی ہی انسان کی کامیابی ہے۔ دنیا کے مہذب ملکوں نے اس سلسلہ میں جو معیار قائم کئے ہیں وہ ہمارے لئے ایک نمونہ اور مثال ہیں۔ ڈنمارک میں پیدائش کے وقت بچوں کے زندہ رہنے کی توقع اوسطاً ۷۰ برس کی جاتی ہے۔ انگلستان اور ویلز میں ۶۵ سال تک جرمنی میں پچاسی سال تک اور فرانس میں ۶۴ سال تک۔ لیکن ہندوستان میں جو بچے پیدا ہوتے ہیں ان کے جینے کی توقع اوسطاً ۳۲ سال کی ہوتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب بچے صرف ۳۲ سال تک جیتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ بہت سے بچے کم عمری اور نوجوانی میں مر جاتے ہیں اور بہت کم اسی پچاسی سال تک کی عمر تک پہنچ پاتے ہیں اور اگر اوسط نکالا جائے تو لوگوں کی عمروں کا اوسط ۳۲ سال سے زیادہ نہیں ہوتا۔

سوال یہ ہے کہ اس افسوسناک حالت کے کیا وجوہ اور اسباب ہیں؟ کیا ہمارے بچوں کا بیج کمزور ہوتا ہے انھیں اپنے والدین سے بہت کم قوت حیات کا ترکہ ملتا ہے۔ کیا ماں کے پیٹ میں انھیں مناسب غذا اور آرام نہیں ملتا۔ کیا پیدا ہونے کے بعد بچے کو اس کی ماں ایسا دودھ نہیں پلا سکتی جو اس کی قوت حیات کو مضبوط کر سکے۔ کیا دودھ چھوٹنے کے بعد بچپنے کے نازک دور میں بچوں کی غذا ان کی دیکھ بھال اور نگہداشت کا جو بند و بست ہونا چاہیئے وہ نہیں ہوتا۔ کیا ان کی نشو و نما اور ترقی کا سلسلہ ابتدا میں ہی رک جاتا ہے۔ کیا

امراض کے مقابلہ کرنے اور ان کو رفع کرنے کی قوت ان میں پیدا نہیں ہوتی۔ سردی گرمی کو برداشت نہیں کرسکتے موسم کا ذرا سا تغیر ان کے نظام جسم میں ابتری پیدا کر کے انھیں بیمار ڈال دیتا ہے۔ کھانسی بخار، ملیریا، انفلوئنزا، ٹائیفائیڈ، تپ دق، ہیضہ، چیچک، پلیگ وغیرہ کے وہ شکار رہتے ہیں۔ عورتیں زچگی کی حالت میں بخار میں مبتلا ہو کر مرجاتی ہیں، یہ سوالات ہیں جو پیدا ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں ہر شخص اپنے ذاتی تجربے سے اس بات کی شہادت پیش کرسکتا ہے کہ درحقیقت ہمارے بدنصیب ملک میں صورت حال ایسی ہی ہے۔ ہماری ملک کی شرح اموات ۲۹ فی ہزار ہے۔ معاشیات کے ماہروں نے ایک اوسط ملک کے لئے کمترین شرح اموات ۱۵ فی ہزار قرار دی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کی شرح اموات اس اوسط سے ۲ ½ گنا زیادہ ہے۔ پھر جب مختلف عمروں کی موتوں پر نظر کی جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں بچوں کی شرح اموات تمام مہذب ملکوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ جتنے بچے پیدا ہوتے ہیں ان میں سے تقریباً ⅕ ایک برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے مرجاتے ہیں، اور اموات کی کل شرح میں بچوں کی موتوں کا تناسب ⅕ ہے۔ شہروں میں خصوصیت کے ساتھ حالت نہایت افسوسناک ہے۔ مثلاً بمبئی میں ایک ہزار پیدا ہونے والے بچوں میں سے ۵۵۶ بچے بچپنے میں ہی مرجاتے ہیں ؎

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

برخلاف اس کے لندن میں ایک ہزار بچوں میں صرف ۹۰ بچے بچپنے کی عمر میں مرتے ہیں ؎

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

ایک زمانہ تھا جب یورپ کے ملکوں میں بھی ہندوستان کی طرح شرح اموات بہت زیادہ تھی لیکن اسی صدی کے دوران میں وہاں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔

ہمارے یہاں بچے پیدا بہت ہوتے ہیں۔ ہماری شرح پیدائش ۳۴ فی ہزار ہے۔ معاشیات کے ماہروں نے ایک اوسط ملک کے لئے زیادہ سے زیادہ شرح پیدائش ۳۵ فی ہزار مقرر کی ہے ہم اس لحاظ سے اس معیار کے بہت قریب ہیں۔ لیکن ہماری شرح اموات چونکہ بہت زیادہ یعنی ۳۰ فی ہزار ہے اس لئے

باقی رہنے والے بچوں کا تناسب پانچ فی ہزار سے زیادہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری مجموعی آبادی میں اضافہ ہماری شرح پیدائش کے تناسب سے نہیں ہوتا۔

طبی تحقیقات کا کام کرنے والے عالموں کی جو آل انڈیا کانفرنسیں ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۶ء میں ہوئی تھیں ان میں دونوں مرتبہ ایک رزولیوشن ایک ہی طرح کے الفاظ میں بجنسہ منظور کیا گیا تھا۔ اس رزولیوشن کا خلاصہ یہ تھا:۔

"اس کانفرنس کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ ہر سال ایسے امراض سے جن کا تدارک ممکن ہے، ہندوستان میں تقریباً پچاس ساٹھ لاکھ آدمی مرجاتے ہیں۔ جو لوگ امراض میں مبتلا ہو کر اچھے ہو جاتے ہیں ان کی محنت سے اوسطاً فی شخص دو تین ہفتہ تک ملک محروم رہتا ہے۔ لوگوں کے کام کی اہلیت میں امراض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے جو کمی واقع ہوتی ہے وہ بیس فی صدی سے ہرگز کم نہیں ہوتی۔ پیدا ہونے کے بعد جو بچے جوان ہو کر دولت کماتے ہیں ان کا تناسب پچاس فی صدی سے زیادہ نہیں ہے حالانکہ نہایت آسانی سے اسے اسی یا نوے فی صدی کیا جاسکتا ہے۔ کانفرنس کا یہ عقیدہ ہے کہ اوپر جو تخمینے پیش کئے گئے ہیں ان میں اعداد کو مبالغہ کے ساتھ پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ واقعی صورت حال اس سے کہیں زیادہ خراب ہے اور ہندوستان کو ہر سال اربوں روپیہ کا نقصان قابل علاج بیماریوں کی وجہ سے اٹھانا پڑتا ہے اور ان کی وجہ سے کروڑوں آدمی غیر ضروری درد اور تکلیف، رنج اور مصیبت میں مبتلا رہتے ہیں۔"

یہ ان لوگوں کی رائے ہے جو طبی تحقیقات کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور اس میں کسی اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہے کہ موجودہ صورت حالات نہایت افسوسناک ہے۔ اب آئیے اس کے بنیادی سبب کا بھی پتہ لگایا جائے۔

اس کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا سبب غذا کی کمی ہے۔ لوگوں کو مناسب غذا کافی مقدار میں نہیں ملتی۔ نوعمری کی شادی اور والدین کی کمزوریوں کی وجہ سے اس میں شک نہیں اولاد کی قوت حیات پر برا اثر پڑتا ہے لیکن اگر بچے کی تربیت اور نگہداشت ابتدا سے ہی اچھی طرح سے کی جائے تو بڑی حد تک اس

اثر کو زائل کیا جا سکتا ہے اور چند نسلوں میں کمزور بچوں کی جگہ طاقتور بچے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے پہلا اور نہایت اہم سوال کافی اور مناسب غذا کا ہے۔ بچوں کے لئے اچھا اور بہت سا دودھ چاہیئے۔ ماں کا دودھ گائے کا دودھ بھینس کا دودھ نوجوانوں اور بالغوں کے لئے مکھن گھی، دودھ، اناج، ترکاری پھل، انڈا، گوشت شکر اور شہد چاہیئے۔ یہ چیزیں مہیا کر دیجئے آپ کے بچوں کی شرح اموات کم ہو جائے گی، آپ کے جوان امراض سے محفوظ ہو جائیں گے۔ ان کی کارگذاری کی اہلیت میں اضافہ ہوگا۔ ان میں مقابلہ کا اور سابقت کا ولولہ اور امنگ پیدا ہوگی۔ وہ آگے بڑھیں گے اپنے معاملات کا خود بندوبست کریں گے۔ دوسری قوموں میں عروج و امتیاز حاصل کریں گے۔ ساری دنیا ان پر رشک کرے گی۔ وہ اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک عذاب نہیں بنیں گے بلکہ رحمت اور محبت کے فرشتے بن سکیں گے۔ اپنے معاملات کا خود بندوبست کریں گے اور دوسری قوموں میں عروج و امتیاز حاصل کریں گے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ مناسب اور کافی غذا کہاں سے دی جائے۔ غذا کا ذخیرہ زمین میں دفن ہے۔ زمین کو کھود کر اور نباتات کی نشو و نما اور پختگی کے لئے فطرت کی طرف سے جو مدت مقرر کی گئی ہے اس کا انتظار کر کے اسے حاصل کیا جاتا ہے اس لئے غذا کے اس ذخیرے کو زمین سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے چاہے یہ زمین اپنے ملک کی ہو چاہے دوسرے ملکوں کی۔ دوسرے ملکوں کو ان کی غذا کے رسد کے معاوضہ میں دینے کے لئے کچھ سامان یا اہلیت اپنے پاس موجود ہونا چاہیئے تب ہی دوسرے ملک خوشی سے اپنی غذا کے ذخیرے میں ہمیں شریک کریں گے ورنہ ہمیں اپنے ملک کے غذا کے ذخیرے پر ہی قناعت کرنا پڑے گی۔

ہندوستان کی آبادی چونکہ زیادہ تر زراعت پیشہ ہے اس لئے یہاں کے لوگ اپنی غذا کی چیزیں اپنے ملک کی زمین سے ہی حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ پتہ لگانا ہے کہ ہندوستان میں آج کیا صورت حال ہے۔ کیا یہاں کی زمین اپنی آبادی کو کافی مقدار میں غذا دے رہی ہے یا دے سکتی ہے یا نہیں دے رہی ہے اور نہیں دے سکتی ہے۔ شرح اموات اور امراض کی حالت کا جو بیان اوپر کیا گیا ہے اس سے تو یہ بات بالواسطہ ثابت ہوتی ہے کہ ہندوستان میں غذا کی رسد کافی نہیں ہے۔ لیکن یہ شہادت قطعی نہیں ہے

کیونکہ دوسرے اسباب بھی ایسے ہو سکتے ہیں جو تندرستی اور زندگی کے قیام اور ترقی میں حائل ہوں۔ لوگ جاہل اور بے تمیز ہو سکتے ہیں۔ حفظان صحت کے سیدھے راستے کو چھوڑ کر گمراہی میں مبتلا ہو سکتے ہیں لیکن میرا یہ دعوے ہے کہ ہندوستان میں یہ تمام باتیں ثانوی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس ملک میں ابتدائی اہمیت غذا کی کمی کو حاصل ہے اور اس کا ثبوت میں ابھی پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر شاہ اور مسٹر کھمباٹا نے ۱۹۲۲ء میں اپنی مشترکہ کتاب ویلتھ اینڈ ٹیکس ایبل کیپے سٹی آف انڈیا شائع کی تھی۔ اس کتاب میں پروفیسر شاہ نے ایک طرف تو ہندوستان میں غذا کی جو سالانہ پیداوار ہے اس کا تخمینہ کیا تھا۔ اس میں ہر قسم کے اناج اور غذاؤں کا لحاظ رکھا گیا تھا اور دوسری طرف یہ دیکھا تھا کہ کمترین خوراک جو ہندوستان کی آبادی کے لئے ضروری ہے اس کی کیا مقدار ہے۔ اس خوراک کا تخمینہ اس طرح کیا گیا تھا کہ پہلے تو سرکاری طور پر مختلف موقعوں پر جو کمترین غذا ایک آدمی کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہے اس کے اعداد کو جمع کیا گیا۔ مثلاً ہندوستان کی جیلوں میں قیدیوں کو جو روزانہ خوراک دی جاتی ہے۔ بمبئی کے صوبہ میں قحط سالی کے زمانہ میں جو خوراک ایک ایک آدمی کو تقسیم کی گئی۔ ہندوستانی فوج میں اور ملاحوں کو حکومت کی طرف سے جو راشن دیا جاتا ہے ان کے اعداد جمع کئے گئے۔ پھر بمبئی کے مزدور جس قدر غذا اوسطاً کھاتے ہیں تحقیقات کے بعد اس کے اعداد جمع کئے گئے۔ پھر یورپ کے مزدور جس قدر غذا کھاتے ہیں اس کے اعداد لئے گئے اور ان سب کا اوسط نکال کر ایک اوسط آدمی کی غذا کا تخمینہ کیا گیا۔ پھر مردوں کے اس اوسط سے عورتوں اور بچوں کی خوراک کے لئے ایک اوسط مقرر کیا گیا اور پھر تمام ہندوستان کے لوگوں کے لئے اوسطاً جس قدر کم سے کم غذا چاہیئے اس کا تخمینہ کیا گیا۔ اس باقاعدہ تحقیقات کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ کمترین غذا کی جتنی ہندوستان کے لوگوں کو ضرورت ہے اس کے مقابلہ میں انہیں جو غذا اس وقت مل رہی ہے وہ چالیس فی صدی کم ہے۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو ہندوستان کے ہر تین آدمیوں میں سے ایک آدمی بالکل بھوکا رہے۔ یا تینوں آدمی ایک تہائی بھوکے رہیں عموماً دوسری ہی صورت پر عمل ہوتا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی عام طور پر فاقہ زدہ نظر آتے ہیں اور ان کی قوت حیات اور بیماریوں کو دفع کرنے کی قوت بہت کم ہوتی ہے۔

اس قسم کے تخمینے اور لوگوں نے بھی کیے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ لایق ذکر ڈاکٹر ڈوبے کا تخمینہ ہے لیکن نتیجہ کے لحاظ سے ان میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ یہ ایک صاف اور کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہندوستانیوں کی غذا کی رسد ان کی ضرورت کے مقابلہ میں ناکافی ہے۔ بچوں کو کمزور اور فاقہ زدہ ماؤں کا دودھ پینا پڑتا ہے۔ جانوروں کا دودھ بھی مناسب چارہ نہ ملنے کی وجہ سے کمزور ہوتا ہے اور اس کی مجموعی رسد بھی بہت قلیل ہے جس کی وجہ سے ہر شخص اس سے فائدہ نہیں اٹھاسکتا۔ غلہ اور اناج جن کے بغیر گذر کی کوئی صورت ہی نہیں ہے وہ بھی کافی مقدار میں نہیں ملتے۔ اس کے علاوہ تندرستی کو قائم رکھنے کے لئے جن دوسری چیزوں کی ضرورت ہے مثلاً ترکاری، شکر، مکھن، گھی، انڈا، گوشت، پھل یہ چیزیں تو صرف چند خوش نصیب لوگوں کو میسر آتی ہیں باقی تمام تر آبادی ان چیزوں سے محروم رہتی ہے۔ نتیجہ اس کا شرح اموات کی کثرت اور بیماریوں کی اس ہمہ گیری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جن کے بارے میں اعداد اوپر درج کئے جا چکے ہیں۔

غرضکہ جو کچھ اب تک بیان کیا گیا اس سے یہ بات تو صاف ہوگئی کہ ہندوستان کی زمین یہاں کی آبادی کے لئے جتنی چاہیئے اتنی غذا پیدا نہیں کر رہی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کا کیا علاج ہے صحت اور زندگی کے قائم رکھنے کے لئے جو دوسری چیزیں چاہیئے انھیں تو فی الحال چھوڑیے۔ صرف غذا کے مسئلہ کو لیجیئے۔ غذا کی کمی کئی طریقوں سے دور کی جاسکتی ہے۔ پہلا طریقہ تو یہ ہوسکتا ہے کہ غذا کی رسد کو بڑھایا جائے۔ غذا کی رسد بڑھانے کی تین صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ خود اپنے ملک میں جتنی غذا پیدا ہوتی ہے اس کی مقدار بڑھائی جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ملک سے باہر جو غذا جاتی ہے اُسے روکا جائے اور تیسری صورت یہ ہے کہ باہر کے ملکوں سے غذا اپنے ملک میں منگائی جائے۔ ان تدبیروں سے تو ملک کے اندر غذا کی مقدار کو بڑھایا جاسکتا ہے لیکن دوسرا طریقہ توازن پیدا کرنے کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ غذا کھانے والوں کی تعداد کو کم کیا جائے یعنی آبادی کو گھٹایا جائے۔ آبادی کو دو طرح سے کم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو اس طرح کہ اپنے ملک کی زائد آبادی کو دوسرے کم آباد ملکوں میں بھیجا جائے اور دوسرے اس طرح کہ نئی اولاد پیدا کرنا بند کیا جائے تاکہ جو بوڑھے اور بیمار مرتے جائیں ان کی جگہیں اس وقت تک خالی رہیں

جب تک آبادی اور غذا میں توازن نہ پیدا ہو جائے۔ تیسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ملک میں صنعتوں کو ترقی دی جائے۔ ملک کی صنعتی پیداوار کو بڑھایا جائے۔ باہر کے ملکوں کی مصنوعات منگانا بند کیا ہے تاکہ ان ملکوں کی مصنوعات کے معاوضہ میں ملکی غذا کی جو مقداریں باہر بھیجنا پڑتی ہیں وہ نہ بھیجنا پڑیں اپنے ملک سے دوسرے ملکوں کو مصنوعات روانہ کی جائیں اور اپنی مصنوعات کے معاوضہ میں ان ملکوں سے اشیاء غذا حاصل کی جائیں۔ چوتھا اور آخری طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ اوپر جتنے طریقے بتلائے گئے ہیں ان سب کو جمع کیا جائے اور سب کو بہ یک وقت اختیار کیا جائے۔

آیئے ان تدبیروں میں سے ایک ایک کو الگ الگ لے کر دیکھیں کہ یہ کس حد تک مفید اور قابل عمل ہیں

پہلی تدبیر یہ ہے کہ ملک میں جتنی غذا پیدا ہوتی ہے اس کی مقدار بڑھائی جائے۔ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ موجودہ طریقہ کاشت کو جاری رکھتے ہوئے اجناس خوردنی کے تناسب کو بڑھایا جائے اور اجناس غیر خوردنی کے تناسب کو گھٹایا جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ زراعت کو عام طور پر وسعت دی جائے اور اس طرح کسانوں کی قوت خرید کو بڑھایا جائے تاکہ بعد میں وہ جو چاہیں خرید سکیں۔

آیئے پہلے پہلی صورت کو لیں۔ ہندوستان میں اجناس خوردنی کا تناسب ۸۰ فی صدی ہے اور اجناس غیر خوردنی کا تناسب ۲۰ فی صدی ہے۔ اجناس غیر خوردنی عموماً تجارتی اجناس ہیں اس لئے ان کی کاشت عموماً بہتر قسم کی زمینوں پر کی جاتی ہے۔ اگر ان کی کاشت کو بند کر دیا جائے تو غذا کی رسد میں کم سے کم ۲۰ فی صدی کا ضرور اضافہ ہو سکتا ہے۔ لیکن کسان کا مقصد محض اپنی غذا کی رسد بڑھانا نہیں ہے بلکہ کسان کو لگان وغیرہ ادا کرنے کے لئے نقد رقم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کسان تجارتی فصلوں کو اس لئے بوتا ہے کہ ان کے بونے سے اسے نقد رقم حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر وہ ان کی کاشت بند کرے گا تو زمیندار اور سرکار کا مطالبہ ادا کرنے میں ضرور اسے دشواری پیدا ہو گی اور اسے اپنے کھیت تک سے بے دخل ہونا پڑے گا۔ اس لئے کسان کے لئے موجودہ حالات میں یہ طریقہ کچھ زیادہ مفید نہیں معلوم ہے

ہوتا۔

اب دوسرے طریقے یعنی زراعت کی عام ترقی کو لیجئے۔ اس سلسلہ میں ترقی کی گنجائش ہے لیکن بہت زیادہ نہیں ہے۔ زراعتی ترقی کے لئے پہلی ضرورت آبپاشی کا انتظام ہے۔ ہندوستان کے کل رقبہ میں سے تقریباً ⅕ حصہ کی آبپاشی کی جاتی ہے باقی ⅘ رقبہ کی فصلیں برسات کے رحم و کرم پر چھوڑ دی جاتی ہیں۔ بارش مناسب موقع پر اور کافی مقدار میں ہو جائے تو فصل اچھی ہو جاتی ہے ورنہ فصل خراب ہو جاتی ہے۔ بارش کے غیر یقینی ہونے سے ملک کی پیداوار کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کا تخمینہ کسی حالت میں کروڑوں اور اربوں روپیوں سے کم نہیں ہے۔ لیکن آبپاشی کا انتظام ہر جگہ ممکن نہیں ہے اور جہاں ممکن ہے وہاں آبپاشی کے ذرائع کو تعمیر کرنے میں بہت زیادہ سرمایہ لگانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ہندوستان کے جتنے رقبہ پر آبپاشی ہوتی ہے اس میں تقریباً آدھا تو ایسا رقبہ ہے جس کی آبپاشی سرکاری نہروں اور تالابوں کے ذریعہ ہوتی ہے اور آدھے کی پرائیویٹ ذرائع سے۔ سرکاری نہروں وغیرہ سے کل مزروعہ رقبہ کے صرف ⅒ حصہ کی آبپاشی ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی ان کے بنانے میں حکومت کو ایک ارب ۴۶ کروڑ کا سرمایہ لگانا پڑا تھا یعنی فی ایکڑ ۴۰ روپیہ کا سرمایہ۔ پھر یہ سرمایہ اس وقت لگانا پڑا تھا جب پانی کی بہم رسانی کے ایسے ذرائع موجود تھے جن سے آسانی کے ساتھ فائدہ اٹھانا ممکن تھا۔ اب ایسے ذرائع بہت کم باقی رہ گئے ہیں۔ اس لئے آبپاشی میں مزید اضافہ کروڑوں روپیہ صرف کئے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔

زراعتی ترقی کے لئے دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ کسانوں کی جوت میں کافی بڑے رقبہ ہوں۔ کسانوں کی جوت میں اس وقت جو رقبے ہیں وہ بہت مختصر ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں بنگال میں جو لوگ کھیتی کا کام کرتے تھے ان کی جوت میں اوسطاً ۲.۲ ایکڑ کا رقبہ تھا۔ ہندوستان کے دوسرے بڑے صوبوں میں اس رقبہ کا اوسط ۳ ایکڑ ہوتا تھا۔ بمبئی سرحدی صوبہ اور پنجاب میں البتہ یہ رقبہ اوسطاً ساڑھے دس ایکڑ ہوتا تھا۔ یہ رقبے اتنے مختصر ہیں کہ ان پر مشین اور دوسرے جدید سائنٹیفک طریقوں کا استعمال نفع کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ آبادی کے اضافہ اور صنعتوں کی کمی کی وجہ سے کسانوں کی جوت میں جو رقبے ہیں

وہ نسل بعد نسل گھٹتے چلے جارہے ہیں اور جب تک آبادی نہ گھٹے یا صنعتیں اور دوسرے پیشے آبادی کی ایک کثیر تعداد کو اپنے اندر جذب نہ کریں اس وقت تک زراعت کی ترقی میں یہ چیز بہت زیادہ حایل رہیگی حکومت کی طرف سے قوانین بناکر اور امداد باہمی کی انجمنیں قائم کرکے کسان کے کھیتوں کے انتشار کو رفع کرنے کی تدبیریں کی جارہی ہیں لیکن اس میں بھی روپیہ کا خرچ زیادہ ہے۔

زراعتی ترقی کے اور دوسرے کاموں کے لئے بھی روپیہ کی ضرورت ہے مثلاً اچھے بیج، اچھے کھاد، اچھے اوزار، اچھے بیل، جانوروں اور کیڑوں سے فصل کی محافظت، پودوں کی بیماریوں کا علاج، جتائی، بوائی، نرائی کے نئے طریقوں کی تعلیم، ایک مقررہ معیار کی یکساں پیداوار حاصل کرنا، پیداوار کو اچھے نرخ پر ملکی اور غیر ملکی منڈیوں میں فروخت کرنا، نئی نفع بخش فصلوں کی کاشت، مکھن، شہد، مرغی اور گوشت کی پیداوار بڑھانا۔ نئی زمین کو کاشت میں لانا۔ ان سب کاموں کے لئے ابتدا میں سرمایہ لگانے کی ضرورت ہے۔ اور ان کے بارے میں جو علمی تحقیقات ہوچکی ہیں ان سے واقفیت کی ضرورت ہے۔ غرضکہ ان طریقوں سے غذا کی پیداوار اسی صورت میں بڑھائی جاسکتی ہے جب زیادہ سرمایہ، زیادہ دماغی اور جسمانی محنت اور زیادہ تنظیم سے کام لیا جائے۔

اوپر جو باتیں بیان کی گئیں ان سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ ہندوستان میں غذا کی پیداوار بڑھائی جاسکتی ہے لیکن آسانی سے نہیں بلکہ زیادہ سرمایہ اور محنت صرف کرنے کے بعد جتنی زیادہ غذا کی ضرورت ہوگی اس نسبت سے بہت زیادہ سرمایہ اور محنت خرچ کرنا پڑے گی۔ ہندوستان نیا ملک نہیں ہے بلکہ یہاں ہزاروں برسوں سے زمین پر مسلسل کاشت ہوتی چلی آرہی ہے۔ اس لئے یہاں قانون تقلیل حاصل کا عمل جاری ہے اور جب تک اجناس خوردنی کی قیمتوں میں ترقی نہ ہو زمین میں نفع کے ساتھ سرمایہ اور محنت کی زیادہ مقدار نہیں لگائی جاسکتی۔

غذا کی رسد بڑھانے کی اس صورت کو تو ہم نے دیکھ لیا۔ اب آیئے دوسری صورت کو لیں یعنی یہ دیکھیں کہ ملک سے باہر جو غذا جاتی ہے اسے ہندوستان کے لوگوں کے لئے باہر جانے سے کس حد تک روکا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی بات جو قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ اشیاء غذا کی مجموعی

پیداوار کا جو حصہ برآمد کیا جاتا ہے وہ بہت کم ہے اور برابر کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے اب اشیاء غذا کی برآمد کو بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں رہی ہے۔ کھانے کی چیزوں کی برآمد کو قانوناً بند کرنے سے ملک کے لوگوں کو فائدہ پہنچنا یقینی نہیں ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس صورت میں کسان اپنے نفع کی خاطر ان چیزوں کا بونا ترک کر کے تجارتی فصلیں بونا شروع کر دیں اس سے معلوم ہوا کہ یہ دوسری تدبیر بھی غذا کی رسد نہیں بڑھا سکتی۔

اب تیسری تدبیر کو لیجیے یعنی باہر کے ملکوں سے زیادہ غذا اپنے ملک میں منگائی جائے۔ باہر کے ملکوں سے غذا اسی وقت منگائی جا سکتی ہے جب ملک کے اندر ضروری قوت خرید موجود ہو۔ قوت خرید آمدنی کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہندوستان کی اوسط آمدنی جس قدر کم ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ آمدنی اور قوت خرید زیادہ ہوتی تو ملک میں بھی زراعت کو خاصی ترقی دی جا سکتی تھی اور باہر سے بھی کھانے کی چیزیں منگائی جا سکتی تھیں۔ یورپ کے صنعتی ملک اپنی تمام غذا اپنے ملک میں پیدا نہیں کرتے بلکہ دوسرے ملکوں سے منگاتے ہیں۔ ان کے پاس چونکہ دوسرے ملکوں کو اپنی مصنوعات غذا کے معاوضہ میں دینے کے لئے موجود ہوتی ہیں اس لئے وہ ایسا کرتے ہیں۔ ہمارے پاس چونکہ باہر بھیجنے کے لئے مصنوعات نہیں ہیں اس لئے ہمارے لئے باہر سے کھانے کی چیزیں منگانا ممکن نہیں ہیں۔ ہم ہمیشہ انگلستان کے مقروض رہتے ہیں اور اس قرض کی ادائگی کے سلسلہ میں سالانہ ہمیں اپنے ملک کی کھانے کی چیزیں اور کچا مال ولایت بھیجنا پڑتا ہے۔ جب صورت یہ ہے تو ہم کیسے دوسرے ملکوں سے کھانے کی چیزیں منگا سکتے ہیں۔

غرضکہ غذا کی رسد بڑھانا بہت مشکل ہے اب توازن کے پیدا کرنے کی دوسری صورت یہ رہ جاتی ہے کہ آبادی کو کم کیا جائے۔ آبادی کو جیسا میں نے ابھی بیان کیا دو طرح کم کیا جا سکتا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ملک کی زیادہ آبادی کو دوسرے کم آباد ملکوں میں منتقل کیا جائے اور دوسری یہ ہے کہ فنی اولاد پیدا کرنا بند کیا جائے۔ ہندوستان سے دوسرے ملکوں کو آبادی کے منتقل کر دینے کے امکانات بہت کم ہیں۔ دنیا میں بہت سے نئے ملک اور نو آبادیاں ایسی ہیں جن میں اگر ہندوستانی منتقل کر دئے

جائیں تو اس سے ان ملکوں اور ہندوستان دونوں کا فائدہ ہو۔ لیکن ان سب ملکوں نے ہندوستانیوں کے داخلہ کے خلاف سخت امتناعی قوانین جاری کر رکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی مہاجرین کی تعداد بہت کم ہے اور ہندوستان کی بڑھی ہوئی آبادی کو ہجرت سے بہت کم فائدہ پہنچنے کی امید رکھنا چاہیئے۔

آبادی کے کم کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نئی اولاد پیدا کرنا کم کیا جائے بلاشبہ یہی طریقہ ہندوستانیوں کے لئے اس وقت سب سے زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اگر ہندوستانی اپنی شرح پیدائش کو کم نہیں کریں گے تو اوپر لکھے ہوئے سب علاجوں کو اختیار کرنے کے باوجود کوئی بہتر نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ ہندوستان کی آبادی میں ہر دسویں سال جزائر برطانیہ کی مجموعی آبادی کے برابر محض اضافہ ہو جاتا ہے یہ یقیناً ایک نہایت تشویش ناک امر ہے۔ ترقی کی یہی رفتار قائم رہی تو چاہے ہم ملک کے چپہ چپہ پر انگلستان، جرمنی اور جاپان کی طرح صنعتیں کیوں نہ قائم کر دیں اور زراعت کو چاہے کیسی ہی ترقی کیوں نہ دیں ہماری حالت کبھی بہتر نہ ہو سکے گی۔ اس لئے اولاد کی پیدائش کو گھٹانا ایک لازمی اور قطعی فرض ہو گیا ہے۔ لیکن اس بات کا عام احساس پیدا کرنا اور لوگوں کے تعصبات اور رسم ورواج کا مقابلہ کرنا بہت دشوار کام ہے۔ پھر ضبط نفس کے علاوہ جو دوسرے مانع اولاد طریقے تبلائے جاتے ہیں ان کے خلاف مذہبی معتقدات کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ پھر مالی اعتبار سے بھی یہ طریقے غریبوں کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ اس لئے ان سے آبادی میں کسی فوری کمی کی توقع کرنا مناسب نہیں ہے لیکن ضبط نفس کی تعلیم کو جہاں تک مذہب اور اخلاقیات کی حدود میں رہتے ہوئے ممکن ہو پھیلانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ لوگوں میں پیش بینی اور عاقبت اندیشی کے جذبہ کو پیدا کرنا چاہیئے۔ شادی کی عمر کو بڑھا دینا چاہیئے بچے کو دودھ پلانے کی مدت کو طویل کر دینا چاہیئے۔ دل بہلانے کے دوسرے مشغلوں مثلاً مطالعہ کتب اور فنون لطیفہ سے رغبت پیدا کرانا چاہیئے غریبوں اور بے کسوں کی امداد، خدمت خلق کے اور دوسرے کاموں، روزہ اور نماز کی طرف بھی لوگوں کو مائل کرنا چاہیئے کہ ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر۔

اس کے بعد آخری طریقہ ملک میں صنعتوں کو ترقی دینے کا رہ جاتا ہے۔ اس میں جو گنجائش ہے اس کے بارے میں ہندوستان کے مفکروں اور معاشیات کے ماہروں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ہندوستان

یں صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے بہت سی قدرتی سہولتیں موجود ہیں۔ مصنوعہ مال کے لئے ایسے گاہک آج بھی موجود ہیں جو باہر کے مال کو خرید کر اپنی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ ایک طرف تو ان خریداروں کو ملکی مال کا گاہک بنایا جا سکتا ہے اور دوسری طرف جب یہاں کی کثیر آبادی کو روزگار سے لگایا جائے گا اور ان کی قوت خرید کو بڑھایا جائے گا تو خریداروں کی تعداد اور بھی زیادہ بڑھ جائے گی۔ خریداروں کی اس ترقی سے ملکی صنعتیں خوب ترقی پائیں گی اور روزگار اور قوت خرید میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا۔

لیکن صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے بڑے سرمایہ، بامہارت مزدوروں، منتظموں اور حکومت کی اعانت اور مربیانہ سرپرستی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک یہ سہولتیں فراہم نہیں ہوں گی، صنعتی ترقی کی رفتار بہت سست رہے گی۔ اس کے علاوہ اور دوسرے سوالات بھی ہیں جو اس سلسلہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو شروع کیا جائے گا یا اوسط اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کو۔ بڑے پیمانہ کی صنعتوں میں مزدوروں کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے زیادہ تر کام مشینیں ہی انجام دیتی ہیں۔ اس لئے اگر بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو شروع کیا گیا تو ان کے ذریعہ سے ہندوستان کی موجودہ کثیر آبادی کے بہت کم حصہ کے لئے روزگار نکل سکے گا۔ اس وقت بڑے پیمانہ کی منظم صنعتوں میں ہندوستان کی آبادی کا صرف ایک فی صدی حصہ لگا ہوا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کا شمار دنیا کے بڑے صنعتی ملکوں میں آٹھویں درجہ پر ہوتا ہے۔ اگر ہندوستان میں منظم اور بڑے پیمانہ کی صنعتوں کے ترقی پا جانے سے یہاں کی پیداوار آج کے مقابلے میں دوگنی ہو گئی (جو ترقی کی خاصی تیز رفتار ہوگی) تو اس سے زیادہ سے زیادہ تقریباً ایک فی صدی آبادی کے لئے اور روزگار فراہم ہو سکے گا۔ لیکن ہندوستان میں آبادی کے محض اضافہ کی رفتار ایک فی صدی سالانہ ہے۔ اس لئے اگر آبادی کا موجودہ اضافہ جاری رہا تو ہمیں ہر سال ان کے لئے روزگار فراہم کرنے کے واسطے اپنی موجودہ بڑے پیمانہ کی صنعتوں کے برابر نئی صنعتیں کھولنا ہوں گی۔ لیکن بڑے پیمانہ کی صنعتوں کی ترقی کو اسی وقت تک جاری رکھا جا سکتا ہے جب ان کے بنائے ہوئے مال کے لئے ایک وسیع منڈی موجود ہو۔ اگر کچے مال اور معدنیات کی رسد کے محدود ہونے کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو صنعتی ترقی کی اس رفتار کے لئے جس کو بحث کی خاطر ہم نے اوپر فرض کر لیا ہے ایک ایسی وسیع منڈی کی ضرورت ہوگی جس کے لئے ایک دنیا تو کیا ہماری جیسی کئی دنیائیں

بھی ناکافی ہوں گی۔ ہمارا ملک بہت بڑا ہے لیکن پھر بھی صنعتی ترقی کی اس رفتار کا حریف ہونا غالباً اس کے لئے از بس مشکل ہوگا اور موجودہ حالات میں جب کہ ہر ملک خود کفالتی نظام کے چکر میں ہے ہمیں اپنے آپ کو ملکی منڈی تک ہی محدود رکھنا ہوگا۔

اس سے قطع نظر بڑے پیمانہ کی صنعتوں کی ترقی سے چھوٹی صنعتوں کو نقصان پہنچتا ہے اور جتنے آدمیوں کو روزگار بڑی صنعتوں میں ملتا ہے اس کے مقابلہ میں بہت زیادہ آدمی چھوٹی صنعتوں کے ختم ہوجانے کی وجہ سے روزگار سے محروم ہوجاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بڑے پیمانہ کی صنعتوں کی ترقی سے بہت سی بنیادی اور ضمنی صنعتوں کو ترقی دینا بھی ضروری ہوجاتا ہے۔ لیکن بصورت مجموعی آبادی کے لئے روزگار میں بہت زیادہ اضافہ کی امید رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔

پھر ان غیر ملکی صنعتوں کو جن کا مال اس وقت ہندوستان میں فروخت ہوتا ہے۔ ملکی صنعتوں کی ترقی سے جو نقصان پہنچے گا اس کے اثرات بھی ناگوار صورت اختیار کرسکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان ملکوں میں ہماری پیداوار کی موجودہ برآمد بند ہوجائے اور ہمارے ملک کے کسانوں اور کچا مال پیدا کرنے والوں کو جو فائدے اب حاصل ہوتے ہیں نہ ہوسکیں۔ ملکی صنعتوں کی ترقی سے ان کے مال کے لئے ملکی طلب ضرور پیدا ہوگی لیکن وہ شاید ان کے نقصان کی تلافی نہ کرسکے۔ اس کے علاوہ اس کے سیاسی نتائج بھی خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔ جن ملکوں کی صنعتوں کو ہماری ملکی صنعتوں کی ترقی سے نقصان پہنچے گا ممکن ہے وہ زور اور زبردستی فتنہ انگیزی اور فساد کے ذریعہ ہماری صنعتی ترقی کو روکنا چاہیں۔ بہرحال جہاں بڑے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی کے فائدے ہیں وہاں اس کی ان نقصانوں اور خامیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور روزگار مہیا کرنے کی جو اہلیت ان میں پائی جاتی ہے اس کے محدود ہونے کا تو ہمیں شروع سے ہی اعتراف کرلینا چاہیئے۔

لیکن ہوسکتا ہے کہ صنعتوں کی ترقی کے ساتھ علمی پیشوں اور دوسری خدمتوں کے لئے ہمارے ملک میں زیادہ گنجائش نکل آئے اور گھریلو اور چھوٹی صنعتیں بھی آرائش وزیبائش اور فنون لطیفہ کے سلسلہ میں جاری رہ سکیں، زراعت اور اس کے ضمنی اور متحدہ پیشوں کو بھی ہم خوب ترقی دے لیں اور ہماری غیر ملکی

تجارت میں بھی کوئی کمی واقع نہ ہو۔ ہم بہت سی مصنوعہ یا نیم مصنوعہ چیزیں باہر کے ملکوں سے بھی منگانا جاری رکھیں۔ اگر ایسا ہوا تو اس سے سب طبقوں کی خوش حالی میں عام طور پر اضافہ ہوگا اور لوگوں کی آمدنیوں کے ساتھ غذا کی زیادہ مقداریں خود اپنے ملک کے اندر اور باہر کے ملکوں سے خریدی جاسکیں گی۔

چوتھا اور آخری علاج میں نے یہ تبلایا تھا کہ ان سب علاجوں کو جمع کر دیا جائے اور سب کو ایک ہی وقت میں اختیار کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ اتنا اہم اور تشویشناک ہوگیا ہے کہ اس کے لئے کوئی ایک واحد علاج اب کافی نہیں ہو سکتا۔ مختلف مورچوں سے اس پر حملہ کرنے کی ضرورت ہے جب ہی اس کو کامیابی کے ساتھ حل کرنے کی امید کی جاسکتی ہے۔

کیا مزدوروں کی معاشیات سرمایہ داروں کی معاشیات سے مختلف ہے؟

(ذیل میں ہم ایک نہایت اہم اور دلچسپ بحث کی ابتدا کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ معاشیات کے وہ اصول جو ملکیت ذاتی، مقابلہ اور آزادانہ کاروبار کی مفروضہ بنیادوں پر تعمیر کیے گئے تھے، سرمایہ دارانہ معیشت کے علاوہ اور دوسری قسم کی معیشتوں پر بھی منطبق کیے جا سکتے ہیں یا نہیں۔ آجر کے نفع کی جگہ مزدور کے مفاد کو، نفع کی جگہ رفع احتیاجات کو اگر معاشیات کا مرکز بنایا جائے تو آیا اس صورت میں اسی طرح کا معاشیات کا علم تعمیر ہوگا جیسا راسخ العقیدہ ماہرین معاشیات پیش کرتے ہیں یا نتیجہ اس سے کچھ مختلف برآمد ہوگا۔ ہم معاشیات کے اصول سے دلچسپی رکھنے والے بزرگوں کو ایک عام دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس موضوع پر جامعہ کے صفحات میں اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار فرمائیں۔ مدیر)

معاشیات ایک اجتماعی علم ہے یعنی یہ بے جان فطرت یا نباتی اور حیوانی دنیا یا تنہا انسانوں کی زندگی کے مظاہر سے بحث نہیں کرتا بلکہ ان تعلقات سے بحث کرتا ہے جو انسانوں کے درمیان جماعت میں باہم مل کر رہنے سے پیدا ہوتے ہیں۔

جماعتی تعلقات کی وابستگیاں کتنی اہم ہوتی ہیں یہ ہر شخص جانتا ہے۔ انسان کے ارتقا کی ابتدائی منزلوں میں بھی انسان کے بارے میں جماعت سے الگ رہنے کا تخیل قائم کرنا ممکن نہیں ہے۔ انسان کے متعلق یہ ٹھیک کہا گیا ہے کہ وہ جماعتی حیوان ہے۔

لیکن انسان کے جماعتی تعلقات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ایک طرف خاندانی تعلقات ہوتے ہیں، پھر ایسے سیاسی تعلقات ہوتے ہیں جو مختلف جماعتوں اور طبقوں کی کشمکش سے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ایسے تعلقات ہوتے ہیں جو آدمیوں کے تمدنی میل جول سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ان تمام تعلقات سے علم المعیشت میں بحث نہیں کی جاتی۔ اس کے مطالعہ کا دائرہ بہت محدود ہے۔ یہ صرف ایسے جماعتی تعلقات کا مطالعہ کرتا ہے

جو آدمیوں میں جماعتی پیداوار کے پیدا اور تقسیم کرنے کے سلسلہ میں پیدا ہوتے ہیں اور جن کا نام دولت آفرینی کے تعلقات رکھا جاتا ہے۔

جس طرح آدمیوں کا جماعت سے باہر تصور کرنا ناممکن ہے ایسے ہی کسی ایسے شخص کا تصور بھی ناممکن ہے جو جماعت میں رہتے ہوئے دوسرے آدمیوں سے دولت آفرینی کے تعلقات نہ رکھتا ہو۔ ان حالتوں میں بھی جب لوگ براہ راست پیدائش دولت میں کوئی حصہ نہیں لیتے، یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ ان میں دولت آفرینی کے کوئی تعلقات (اگر دولت آفرینی کو اس کے دسیع مفہوم میں استعمال کیا جائے) نہیں ہیں۔ کیونکہ ہر شخص کو کھانا، پینا، پہننا یا کسی نہ کسی دوسری شکل میں اپنی ضرورتوں کو پورا کرنا ہوتا ہے اور جس حد تک یہ کرنا پڑتا ہے اس حد تک دولت آفرینی کے تعلقات بھی ان لوگوں سے پیدا کرنے پڑتے ہیں جو اپنی محنت سے اس کو اپنی ضرورتیں پورا کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ذرائع دولت آفرینی (زمین فیکٹری اور ورکشاپ) پر قبضہ کر کے ایک آدمی بغیر محنت کئے زندہ رہ سکے لیکن دوسرے آدمیوں کی محنت کی موجودگی اور دولت کی پیدائش اور تقسیم کے تعلقات پیدا کئے بغیر آدمی کا زندہ رہنا قطعاً ناممکن ہے۔

لیکن کیا علم المعیشت دولت آفرینی کے جتنے تعلقات لوگوں کے درمیان پیدا ہوتے ہیں ان سب کا مطالعہ کرتی ہے؟

مثال کے طور پر قدرتی معیشت یا خاندانی زندگی معیشت کو لیجئے جس میں اپنی ساری ضرورتوں کو خود اپنے حلقہ میں محدود رہ کر پورا کیا جا سکتا ہے اور جس میں دوسری معیشتوں سے تعلقات پیدا نہیں کئے جاتے یہاں دولت آفرینی کے تعلقات کی ایک خاص نوعیت ہوتی ہے۔ اس میں محنت کی مشترکہ تنظیم اس طرح پر کی جاتی ہے کہ اس سے عورتوں، مردوں، بالغوں اور بچوں میں ایک طرح کی تقسیم عمل تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن سب خاندان کے کھیا کی مرضی کے پابند ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہاں تعلقات میں تنظیم خاندان کے بزرگ کی شعوری منشاء اور مرضی کے مطابق ہوتی ہے۔ وہ سب سے پہلے اپنے خاندان کی ضرورتوں کا تخمینہ کرتا ہے پھر اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے کہ زمین کے کتنے حصہ میں جوار، باجرا بونا چاہیئے کتنے میں مکہ گیہوں وغیرہ وغیرہ۔ پھر یہ تعلقات اتنے سہل اور آسان ہوتے ہیں کہ ان کے لئے کسی خاص مطالعہ یا علم بنانے کی ضرورت

نہیں ہوتی۔

اسی طرح ایک کمیونسٹ جماعت کو لیجئے جس کی بنیاد سوویٹ یونین میں پڑ رہی ہے۔ ایسی جماعت میں تمام اراکین اپنی ضرورتیں پورا کرنے کے لئے مشترکہ طور پر محنت کر کے اپنے آپ کو مصروف رکھیں گے اور ان کی یہ مصروفیت ایک منصوبہ کی پابند ہوگی اور اس کی تشکیل وہ ادارہ کرے گا جو اس معاشی اتحاد کی مشترکہ مرضی کا اظہار کرے گا۔ یہ ادارہ پہلے کمیونسٹ سوسائٹی کی ضرورتوں کا تخمینہ کرے گا اور اس تخمینہ کی بنیاد پر معیشت کے مختلف شعبوں اور کاروبار کی مختلف شاخوں میں محنت کو تقسیم کرے گا۔ اوزاروں اور اشیاء خام کو بھی بلا کسی مبادلہ یا خرید و فروخت کے منصوبہ کے مطابق ہی تقسیم کیا جائے گا اسی طرح غیر مصنوعہ اشیاء بھی منصوبہ کے مطابق ان کارخانوں میں بھیجی جائیں گی جو انہیں مصنوعہ شکل دیتے ہیں۔ مصنوعہ شکل حاصل کرنے کے بعد وہ سرکاری گوداموں میں پہنچ جائیں گی اور سوسائٹی کے تمام کارکنوں کے درمیان ان کی احتیاجات کے مطابق تقسیم کر دی جائیں گی۔ اسی طرح جماعتی تنظیم اور اس کی شعوری نگرانی کے ذریعہ آدمیوں کی ضرورتوں اور ان کی پیدائش دولت میں منصوبہ کے ماتحت مطابقت پیدا ہو جائے گی۔

یوں تو زرعی قدرتی معیشت اور کمیونسٹ معیشت میں بہت زبردست اختلاف ہے لیکن ایک بات ایسی ہے جس میں یہ دونوں مشترک ہیں اور وہ یہ ہے کہ دونوں کی تنظیم اور نگرانی شعوری انسانی مرضی کے ذریعہ کی جاتی ہے۔

اب اس کے مقابلہ میں جدید سرمایہ کی معیشت کو لیجئے یہ تمام انفرادی نجی کاروباروں کا مجموعہ ہوتی ہے اور موجودہ سرمایہ دارانہ ملکوں میں بڑے بڑے سرمایہ کے کاروبار کے ساتھ ساتھ جس میں ہزاروں مزدور ملازم رکھے جاتے ہیں بے شمار چھوٹے چھوٹے کاروبار ملتے ہیں جن میں لاکھوں کاریگر اور کروڑوں کسان نجی طور پر کام کرتے رہتے ہیں۔ ان بے شمار چھوٹے بڑے کاروبار کی نگرانی کسی ایک واحد شعوری مرضی کے مطابق نہیں ہوتی ان کا کوئی نگرانی کرنے والا مرکز نہیں ہوتا جو پہلے سے انسانی ضرورتوں کا اندازہ کرے اور پیدائش کے مختلف شعبوں میں ان ضرورتوں کے مطابق محنت کو تقسیم کرے۔ ہر انفرادی آجر اندھا دھند کام کرتا ہے۔ اسے اس بات کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا کہ جن اشیاء کو وہ پیدا کر رہا

ہے ان کی کتنی طلب ہو گی یا یہ کہ اس کے علاوہ اور کتنے آدمی اسی چیز کے پیدا کرنے میں لگے ہوئے ہیں
وہ سب سے بے تعلق ہو کر صرف اپنے نجی مفاد کو سوچتا ہے اور جماعت کے مجموعی مفاد کی اسے بالکل
پرواہ نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ من مانا نظام پیدا ہوتا ہے جسے سرمایہ دارانہ جماعت کے مزاج سے
تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

اس قسم کی نزاجی جماعت کیسے زندہ رہ سکتی ہے۔ ایسی جماعت میں انسانی ضرورتوں اور پیدائش
دولت میں توازن کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام جماعت میں ان غیر منظم تعلقات
کی نگرانی کچھ قوانین کے ذریعہ ضرور ہوتی ہے لیکن ان قوانین کا عمل اندھا دھند طریقہ پر ہوتا ہے۔ اس
میں معاشی کام میں شریک ہونے والوں کی مرضی اور شعوری جدوجہد کا کوئی دخل نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ اس
میں اور منظم جماعت میں (وہ کسانوں کی خاندانی جماعت ہو چاہے مستقبل کی کمیونسٹ جماعت) نمایاں فرق
نظر آتا ہے۔ علم المعیشت میں ان ابتدائی قوانین سے بحث کی جاتی ہے جو سرمایہ دارانہ معیشت میں دولت
آفرینی کے تعلقات کی نگرانی کرتے ہیں۔

جہاں تک کافی بالذات اور کمیونسٹ معیشت میں شعوری انسانی مرضی کا دخل ہے ان کے
مظاہر میں ہم کو علم المعیشت کے مطالعہ کے لئے مواد نہیں مل سکتا۔ کمیونسٹ سوسائٹی کے دولت آفرینی
کے تعلقات کے لئے جو ابتدائی فطری معیشت سے یقیناً بہت زیادہ پیچیدہ ہوں گے غالباً ایک
خاص علم کی ضرورت ہوگی لیکن وہ علم معیشت کا علم نہیں ہوگا۔

سرمایہ دارانہ معیشت کے ساتھ سوویٹ معیشت کے قوانین کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ
ہوگا۔ سوویٹ معیشت کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ یہ حالت ارتقا میں ہے۔ اس میں منصوبہ والی اور
نزاجی دونوں خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اس میں سادہ اشیائی تعلقات سے لے کر نجی سرمایہ دارانہ
تعلقات تک سب قسم کی چیزیں ملتی ہیں۔ ان عناصر کی وجہ سے ہمارے سامنے بہت سے مسائل پیدا
ہوتے ہیں مثلاً سوویٹ معیشت میں سرمایہ دارانہ معیشت کے قوانین کا ابھی تک کتنا عمل دخل موجود ہے
منصوبہ والی اور نزاجی صنعت میں وہاں کس قسم کے تعلقات پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کی نسبتی اہمیت کیا

ہے۔ ان کے ارتقا کا کیا رجحان ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام مسائل میں نہ صرف بہت زیادہ نظری دلچسپی پائی جاتی ہے بلکہ ان میں سے بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کا تعلق سوویٹ مملکت کے بعض معرکتہ الآرا مسائل سے ہے۔ اس مطالعہ سے ہمیں نہ صرف ارتقائی اور درمیانی دور کے قوانین کا علم حاصل ہوگا بلکہ جماعتی تعمیر کے کام میں بھی ہم شعوری طور پر حصہ لے سکیں گے۔ اس کے برعکس سوویٹ معیشت اور سرمایہ دارانہ معیشت کے مقابلہ سے ہمیں علم المعیشت کے بنیادی تخیلات کے سمجھنے میں بھی بہت مدد ملے گی۔

آخر میں یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ علم المعیشت سرمایہ دارانہ جماعت کے نہایت اہم مفادوں سے تعلق رکھتی ہے اس لئے اس کے تمام نظری نتائج اور مفروضات میں طبقہ دارانہ ذہنیت کارفرما نظر آتی ہے۔ ہمیں علم المعیشت کو مزدوروں کے طبقہ کے نقطۂ نگاہ سے بھی مطالعہ کر کے دیکھنا چاہیئے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہمیں واقعات کو اپنے حسب دل خواہ توڑ مروڑ کر پیش کرنا چاہئے۔ سرمایہ داری کا ارتقا ناگزیر طریقہ پر ہمیں مزدور طبقہ کی فتحمندی کی طرف لے جا رہا ہے۔ اس کا بہترین ثبوت مزدور طبقہ کی روس میں فتح ہے۔ اس لئے مزدوروں کے طبقہ کو خالی الذہن ہو کر معروضی طریقہ پر سرمایہ دارانہ جماعت کے ارتقا کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اس ارتقا کے قوانین کے مطالعہ کے بعد مزدوروں کا طبقہ اپنی پالیسی اور جنگ کے طریقوں کو بہتر طریقہ پر تنظیم دے سکے گا اور کمیونسٹ سوسائٹی کے پیدا ہونے میں جن مصائب اور تکالیف کا اب سامنا کرنا پڑ رہا ہے انھیں کم کر سکے گا۔ پرولتاریہ کے مفاد اگرچہ برسر اقتدار سرمایہ دار جماعت سے بنیادی طور پر مختلف ہیں لیکن جہاں تک معاشری ارتقا اور کل انسانیت کے مفاد کا تعلق ہے وہ اس سے بالکل ہم آہنگ ہیں۔

دنیا کے مختلف اور تغیر پذیر تمدن

دنیا کے مختلف علاقوں میں لوگوں کے طرز زندگی میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ ان کے مکانات، ان کے لباس، ان کے مراسم، ان کی حکومتیں اور ان کی تفریحیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں یعنی ان مختلف علاقوں کا تمدن ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ یورپ کے علاقہ کا تمدن ایک قسم کا ہے تو ایشیا کا دوسرے قسم کا۔ اسی طرح شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ کے تمدن اور طرح کے ہیں۔ افریقہ کا اور بھی مختلف ہے۔

ان بڑے علاقوں کے علیحدہ علیحدہ ملکوں کو اگر لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا تمدن و معاشرت بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ فرانسیسی تمدن جرمنوں کے تمدن سے یا اسپین، اٹلی یا سوویستان کے تمدنوں سے مختلف ہے۔ حالانکہ ان سب ملکوں کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں۔ اسی طرح ایشیا میں چینی اور جاپانی جو ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں ان کی معاشرت بہت مختلف ہے۔ ہر ملک کی زبانیں مختلف ہوتی ہیں۔ کھانا پکانے اور مکان بنانے کا انداز مختلف ہوتا ہے اور تفریحوں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ہر ملک کا تمدن مختلف ہے۔

دنیا کے لوگوں کے تمدن میں یوں تو بہت سے اختلافات ہیں لیکن اگر ان کے فرق کو دو عنوانوں کے ماتحت دیکھا جائے تو صورت حال کے سمجھنے میں بہت مدد ملے گی یعنی (۱) صنعتی تمدن اور (۲) زراعتی تمدن۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ صنعتی تمدن کی ایک بہت اچھی مثال ہے۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر شہروں میں رہتے ہیں۔ قوت محرکہ سے چلنے والی مشینوں سے بہت زیادہ کام لیتے ہیں۔ سامان کو اٹھانے اور منتقل کرنے کے لئے بھی مشینوں کا استعمال کرتے ہیں اور خبر رسانی کے لئے بجلی کا۔ دستکاری تقریباً بالکل غائب ہوگئی ہے یہاں تک کہ کھیتی کا کام بھی مشینوں کی مدد سے ہی کیا جاتا ہے۔

لیکن کرۂ زمین کے دوسرے حصوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے تمدن کو زراعتی کہا جاتا ہے۔

یہ گاؤں میں رہتے ہیں۔ ان کے یہاں فیکٹریاں بہت کم ہوتی ہیں انجن اور مشین تقریباً بالکل نہیں ہوتے۔ انسانوں یا جانوروں کے ہاتھ پاؤں یا ہوا اور پانی کی چکیوں کی مدد سے یہ اپنے سب کام کرتے ہیں باہر کے لوگوں سے یہ بہت کم تجارت کرتے ہیں اور ریلوں یا موٹروں سے تقریباً ناواقف ہوتے ہیں۔

غرضکہ تمدن کی یہ دو خاص قسمیں ہیں۔ دنیا کی ایک ارب نوے کروڑ آبادی ستر ملکوں میں پھیلی ہوئی ہے ان سب ملکوں کا مطالعہ کرنا تو مشکل ہے۔ البتہ ان ملکوں میں سے چند کو منتخب کرکے یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ ان میں سے کن میں زراعتی تمدن پایا جاتا ہے اور کن میں صنعتی تمدن۔ کون سے ملک زراعتی تمدن کو چھوڑ کر صنعتی تمدن کو اختیار کر چکے ہیں اور کون سے اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ دنیا کا کوئی ملک بھی ایک حالت پر قائم نہیں ہے۔ تبدیلی کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اس لئے ہمیں مطالعہ کرتے وقت اس مستقل تبدیلی کو اپنے سامنے رکھنا ہوگا۔

ہم گیارہ ملکوں کا مطالعہ کریں گے جن کو مندرجہ ذیل عنوانات کے ماتحت جمع کیا جا سکتا ہے۔

I امریکہ اور یورپ کے طاقتور صنعتی ممالک

(۱) برطانیہ عظمیٰ

(۲) فرانس

(۳) جرمنی

(۴) ریاست ہائے متحدہ امریکہ

II یورپ کا ایک تغیر پذیر زراعتی ملک

(۱) روس

III ایشیا کا ایک ایسا ملک جو نہایت تیزی سے صنعتی ملک بن رہا ہے

(۱) جاپان

IV ایشیا کے تغیر پذیر زراعتی ممالک

(۱) ہندوستان

(۲) چین

V جنوبی امریکہ کے تغیر پذیر زراعتی ممالک

(۱) ارجنٹائن

(۲) برازیل

(۳) چلی

ہم نے ان گیارہ ملکوں کو تین وجوہ کی بنا پر مطالعہ کے لئے منتخب کیا ہے:۔

(۱) ان کی مجموعی آبادی ایک ارب ساڑھے بائیس کروڑ ہوتی ہے یعنی کرۂ زمین کی کل آبادی کی تقریباً دو تہائی ان کے رہنے سہنے کے طریقوں سے واقفیت کے معنی یہ ہیں کہ کرۂ زمین کی آبادی کے ایک بہت بڑے حصہ کی معاشرت کا حال معلوم ہو گیا۔

(۲) ان گیارہ ملکوں میں دنیا کی خاص خاص نسلوں اور خاص خاص تمدنوں کے تقریباً سب ہی لوگ شامل ہیں ان کی مناسب نمائندگی ان کے ذریعہ سے ہو جاتی ہے۔ اس لئے ان کے مطالعہ سے ہمارے لئے کل کرۂ زمین کے تمدن کا مطالعہ کرنا ممکن ہو سکے گا۔

مثلاً برطانیہ عظمیٰ فرانس، جرمنی اور ریاست ہائے امریکہ دنیا کی چار بڑی صنعتی قومیں ہیں۔ جس طرح ان ملکوں میں صنعتی طرز معاشرت کو گذشتہ زمانے میں ترقی حاصل ہوئی ہے اس سے اس بات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کے دوسرے حصوں میں موجودہ زمانہ میں کس طرح صنعتی طرز معاشرت کی ترقی ہو رہی ہے۔ اس لئے ان چار ملکوں کو صنعتی ملکوں کا نمائندہ سمجھنا ٹھیک ہے۔

اسی طرح روس کے ذریعہ مشرقی اور وسطی یورپ کی ایک بہت بڑی آبادی کی زندگی میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے مشرقی ملکوں کی زندگی کا اندازہ چین اور ہندوستان کے زراعتی تمدنوں کا مطالعہ کر کے کیا جا سکتا ہے۔

(۳) تیسری وجہ ان کے منتخب کرنے کی یہ ہے کہ ان گیارہ ملکوں کو ہمارے زمانہ میں نہایت اہمیت حاصل ہے اور آئندہ رہنے کی امید ہے۔ ان کے رقبہ کی وسعت، ان کی آبادی کی کثرت اور ان کے قوت محرکہ کے ذرایع اور وسائل کی روز افزوں ترقی ان سب باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو دنیا کے اور تمام دوسرے

ملکوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے اور رہے گی۔ چنانچہ برطانیہ عظمیٰ، فرانس، جرمنی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے یورپ کے طرز معاشرت کو دنیا میں پھیلانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ روس کے قبضہ میں دنیا کی ایک بہت کثیر آبادی ہے اور اس کا علاقہ ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستان چین اور جاپان بھی جدید دنیا سے اب تک الگ تھلگ تھے اب اس کے معاملات میں بہت اہم حصہ لینے لگے ہیں ارجنٹائن، برازیل اور چلی امریکہ کے جنوبی براعظم کے نہایت ممتاز ممالک ہیں۔ ان میں گذشتہ چند سالوں میں اس قدر تیزی کے ساتھ تبدیلی ہوئی ہے کہ اب وہ تمام دنیا کے لئے بہت بڑی مقداروں میں غذا فروخت کرنے لگے ہیں۔

یہ گیارہ ملک ایسے ہیں جن سے ہمیں آئندہ بہت زیادہ واسطہ پڑے گا۔ اس لئے ان کے تمدن کو سمجھنا ہمارے لئے نہایت ضروری ہے۔

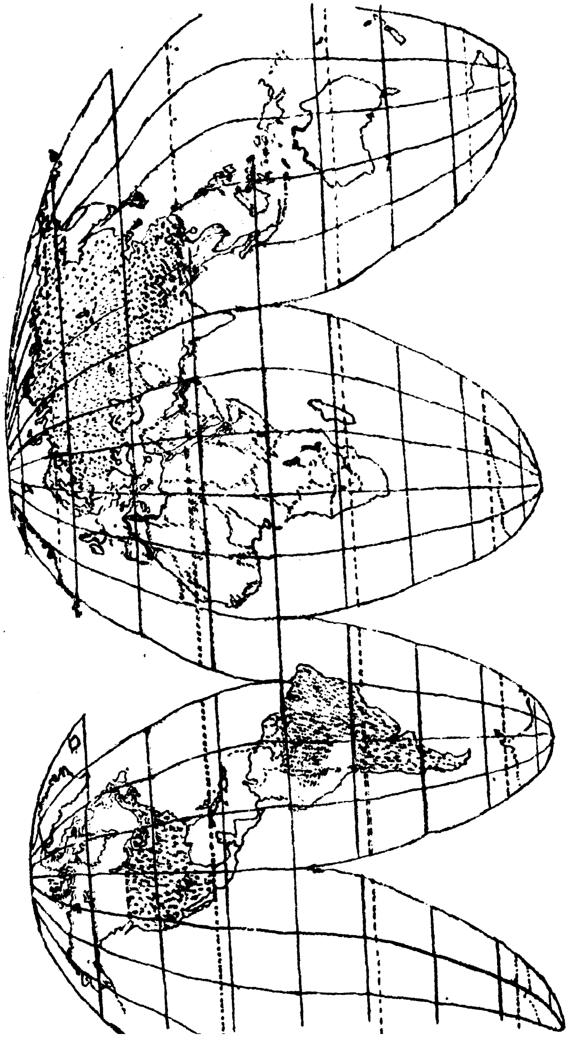
دنیائے جدید کے ان تغیر پذیر تمدنوں کو سمجھنے کے واسطے ان کی تاریخ کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔ ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ ابتدائی زمانہ میں ان کی کیا حالت تھی۔ کون سے اثرات تھے جن کی وجہ سے ان میں تبدیلی کا سلسلہ شروع ہوا اور ان کی موجودہ خصوصیات کیا ہیں۔ یہ اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ آج کرۂ زمین پر جہاں کہیں بھی لوگ آباد ہیں ان کی معاشرت میں تبدیلی کا سلسلہ جاری ہے۔ مغربی یورپ کے ملک گذشتہ سو سالوں سے زراعتی تمدن کو چھوڑ کر صنعتی تمدن اختیار کر رہے ہیں اور اب کچھ سالوں سے مشرقی یورپ، جنوبی افریقہ، اور جنوبی امریکہ کے لوگ بھی صنعتی تمدن کو اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح مشرق بعید اور ہندوستان میں کام کرنے کے طریقوں، نقل و حمل اور خبر رسانی کے وسائل اور معاشری زندگی میں نہایت تیزی کے ساتھ تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ اس لئے ان تمدنوں کی تاریخ کا مطالعہ جس سے مختلف زمانوں میں ان کے طرز معاشرت کا باہمی مقابلہ کیا جا سکے نہایت ضروری ہے۔

اس مطالعہ کو زیادہ مناسب طریقہ پر اس طرح شروع کیا جا سکتا ہے کہ ابتدا میں عہد وسطیٰ کی زندگی کا ایک عام خاکہ پیش کر دیا جائے یعنی یہ بتلایا جائے کہ صنعتی انقلاب سے پہلے یورپ اور ایشیا میں عام طور پر کیسا صورت حال تھی۔ پھر اس کے بعد الگ الگ ملکوں کو لے کر یہ دیکھا جائے کہ ۱۷۵۰ء کے بعد سے کس طرح انھوں

سے زراعتی تمدن کو چھوڑ کر صنعتی تمدن کو اختیار کیا اور آج بھی اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

(باقی آئندہ)

(نوٹ، ذیل کے نقشہ میں دنیا کے ان ملکوں کو جن کے بارے میں حالات بیان کئے جائیں گے نقطے لگا کر ظاہر کیا گیا ہے۔



پبلک زندگی کی اخلاقی صفات

(از جناب محمد عاقل صاحب)

ہر شخص کو دنیا میں دو طرح کی زندگیاں بسر کرنی پڑتی ہیں۔ ایک اس کی نجی یا پرائیویٹ زندگی ہوتی ہے اور دوسری اس کی عام یا پبلک زندگی۔ نجی زندگی کا تعلق اس کی خاص اپنی ذات سے قریب کے دوستوں اور رشتہ داروں سے ہوتا ہے اور باہر کے لوگ اس سے واقف نہیں ہوتے لیکن پبلک زندگی پر سب لوگوں کی نظر ہوتی ہے اور اس کا اثر سب لوگوں پر پڑتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنی نجی زندگی میں بہت سچا، نیک اور دوسروں کے لئے قربانی کرنے والا ہو۔ اپنے ماں باپ، بیوی بچوں، عزیز اور دوستوں کے حقوق کو نہایت اچھائی کے ساتھ پورا کرتا ہو لیکن اس کی پبلک زندگی گندی اور ناپاک ہو۔ پبلک زندگی کے فرائض کو وہ ٹھیک طرح سے انجام نہ دیتا ہو اس کی محبت اور وفاداری صرف چند لوگوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہو۔ خاندانی کشش، قبیلے، فرقے اور جماعت کی محبت نے اسے متعصب اور جانب دار بنا دیا ہو۔ صرف اپنے چھوٹے حلقہ کے فرائض، ایمانداری سے پورا کرنا، وہ ضروری سمجھتا ہو اور باقی سب لوگوں کے ساتھ اس کا برتاؤ دشمنوں جیسا ہو۔ ان کو لوٹنے مارنے، ان کو نقصان پہنچانے، ان کو دھوکہ فریب دینے کے لئے وہ ہر وقت تیار رہتا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا شخص نہایت ایثار اور قربانی سے کام کر رہا ہو۔ اپنی ذات کی بھلائی اس کے سامنے بالکل نہ ہو بلکہ صرف اپنے عزیزوں اور دوستوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے وہ ہر قسم کے چھل فریب، بے ایمانی اور دغا بازی کا ارتکاب کر رہا ہو۔ ایسے شخص کا جرم سنگین تو نہیں رہے گا۔ لیکن پھر بھی وہ مجرم ہے۔ اس لئے کہ اس نے اعلیٰ وفاداری کے مقابلہ میں ادنیٰ وفاداری کو ترجیح دی۔ نجی فائدہ کے لئے پبلک فائدہ کو قربان کیا

"نجی فائدہ اور پبلک فائدہ" کے اس فرق کی طرف ہم ہندوستانیوں کو اس وقت خاص طور پر دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں پنچایتی حکومت قائم کرنے کا ہم فیصلہ کر چکے ہیں ہمیں اختیارات بل چکے

ہیں اور بہت جلد اور زیادہ اختیارات ملنے کی امید ہے۔ لیکن ہر حق کے ساتھ ایک فرض، ہر اختیار کے ساتھ ایک ذمہ داری پیدا ہوتی ہے۔ جو حقوق ہمیں ملے ہیں انھیں اپنے ذاتی اثرات دولت اور اقتدار کے بڑھانے کا ایک ذریعہ نہ بنانا چاہیئے بلکہ کل قوم کے فائدے اور خدمت کو ہمیشہ نظر کے سامنے رکھنا چاہیئے۔ بہت آسانی سے یہ ممکن ہے کہ ہم اپنے یا اپنے دوستوں اور عزیزوں کے نفع کے لیے اپنے اختیارات کو استعمال کرنا شروع کر دیں۔ لیکن یہ بات زیادہ دنوں تک نبھ نہیں سکتی۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ ہم اگر ایسا کریں گے تو دوسرے بھی ایسا ہی کریں گے اور اگر سب نے یہی کیا تو کیسی افراتفری مچے گی۔ کیسا فساد برپا ہوگا۔ لوگ ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو جائیں گے اور پنچایتی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

جو فرائض شہریوں پر عاید ہوتے ہیں انھیں ہم الگ الگ عنوانوں کے ماتحت آج بیان کرنا چاہتے ہیں پہلے ہم ووٹروں کو لے کر دیکھیں گے کہ ان کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ پھر ہم مجالس قانون ساز کے ممبروں کے فرائض کو لیں گے پھر سیاسی جماعتوں کے فرائض کا بیان کریں گے اس کے بعد جماعت عاملہ اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کے فرائض کو دیکھا جائے گا۔ اور اخیر میں ادنیٰ عہدہ داروں کے جو پبلک فرائض ہیں ان کا بیان کیا جائے گا جس ریاست کے سب شہری اپنے فرض کو پہچانتے ہیں اس کی خوش حالی اور پائداری یقینی ہے۔ اور جس ریاست کے شہریوں میں پبلک زندگی کی اخلاقی خوبیاں غائب ہیں اس کی بنیاد گویا ریت پر رکھی گئی ہے اور ایسی ریاست زیادہ دن قائم نہیں رہ سکتی۔

سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ ووٹروں کو اپنی پبلک زندگی میں کون سی اخلاقی صفات پیدا کرنی چاہییں، جن سے ان کا شمار اچھے شہریوں میں کیا جا سکے۔ ہر ووٹر کو اپنی رائے دینے کے حق کو ایک مقدس فرض سمجھنا چاہیئے۔ اسے رشتہ داری، ذات، برادری، فرقہ، مذہب ان سب باتوں سے ہٹ کر یہ دیکھنا چاہیئے کہ جس شخص کو میں ووٹ دے رہا ہوں۔ اس میں واقعی اس بات کی قابلیت ہے یا نہیں کہ وہ سب لوگوں کے مفاد کی صحیح نمائندگی مجلس قانون ساز میں کر سکے۔ کیا وہ منتخب ہونے کے بعد رعایا کے لئے اچھے قانون ان کی بھلائی کی اور بہتری کے لئے اچھی تجویزیں اور منصوبے سوچ سکے گا اور انھیں عملی جامہ پہنا سکے گا یا نہیں۔ اگر جواب "ہاں" ہو تو اسے اس امیدوار کو ووٹ دینا چاہیئے ورنہ ہرگز ووٹ نہ دینا چاہیئے۔ اکثر ووٹروں کو دیکھا

گیا ہے کہ وہ اپنی ذات برادری یا مذہب کے لوگوں کو چاہے ان میں قابلیت ہو یا نہ ہو ووٹ دینا پسند کرتے ہیں۔ پھر یہاں تک بھی غنیمت ہے بہت سے لوگ رشوت لے کر ووٹ دیتے ہیں یا زمیندار ساہوکار یا کسی بدمعاش غنڈے کی دھمکیوں سے ڈر کر بھیڑ بکری کی طرح ووٹ دینے کی جگہ جاتے ہیں اور دھمکی دینے والے جسے کہتے ہیں اسے ہی چپکے سے ووٹ دے کر لوٹ آتے ہیں۔ یہ بڑی سخت نادانی اور گمراہی ہے ایسا کرنے سے وہ اپنے پاؤں میں خود اپنے ہاتھ سے کلہاڑی مارتے ہیں۔ جو لوگ دھمکی اور لالچ دے کر ان کے ووٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں ظاہر ہے وہ ان کے دوست نہیں ہو سکتے۔ ان سے بھلائی کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی وہ ضرور دھوکا دیں گے۔ اسی طرح پبلک معاملات میں نجی دوستی اور مروت بھی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ نالایق آدمی خود بھی ذلیل ہوتا ہے اور اپنے دوستوں اور حامیوں کو بھی ذلیل کرتا ہے اس لئے ووٹ دیتے وقت عقل و تمیز سے کام لینا چاہیئے اور جس شخص کی طرف داری کے لئے دل گواہی دیتا ہو جس کی طرف سے ضمیر مطمئن ہو اسی کو ووٹ دینا چاہیئے۔ چاہے اس میں اپنے جان اور مال کا نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ جو لوگ امیدواری کے لئے کھڑے ہوتے ہیں وہ اکثر جانے بوجھے ہوتے ہیں ان کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی پچھلی زندگی میں پبلک کی خدمت کے کون کون سے کام کئے ہیں۔ یہ ایماندار اور سمجھ دار ہیں یا بے ایمان اور بے وقوف۔ اس لئے جان بوجھ کر غلط آدمی کی حمایت کرنا سخت فرض ناشناسی ہے۔ اس سے جہاں تک ہو بچنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں ایک سوال پارٹی کا پیدا ہوتا ہے۔ مغرب کے تمام ملکوں میں سیاسی پارٹیاں بنی ہوئی ہیں اور رعایا کے تمام لوگ کسی نہ کسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور پارٹی جس کو کہتی ہے اس کو ووٹ دیتے ہیں کسی پارٹی میں شامل ہونے کے بعد تو اس پارٹی کا حکم ماننا فرض ہے۔ لیکن پارٹی میں شریک ہونے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیئے کہ پارٹی کے مقاصد کیا ہیں۔ آیا مقاصد ایسے ہیں کہ جن سے ملک اور قوم کا فائدہ ہوتا ہے یا نہیں۔ پھر جو پارٹی کے لیڈر ہیں ان کا پچھلا کارڈ بھی دیکھنا چاہیئے کہ انھوں نے ملک اور قوم کی خاطر کیسی کیسی قربانیاں کی ہیں وہ لوگ سمجھ دار اور دور اندیش ہی یا یوں ہی خواہ مخواہ کی شورش مچاتے ہیں۔ ان سب باتوں کا اطمینان کر لینے کے بعد پارٹی کے فیصلہ پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور جب تک

پارٹی کے ممبر ہیں جو پارٹی کہے ویسے ہی کرتے رہنا چاہیئے۔ اس میں فائدہ زیادہ اور نقصان کم ہے۔ کیونکہ پنچایتی نظام میں ہر آدمی اگر الگ الگ اپنی مرضی کے مطابق کام کرانا چاہتا ہے تو اس کے لئے کوئی کام کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن پارٹی بنانے سے بڑی سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لئے پارٹیاں قائم کی جاتی ہیں۔ لیکن اس بات کی ہر شخص کو ہر وقت آزادی حاصل ہے کہ جب تک چاہے ایک پارٹی کا ممبر رہے اور جب چاہے اس سے علیحدہ ہو جائے اگرچہ اچھا آدمی تو وہی سمجھا جاتا ہے جو بات کو ایک دفعہ سوچ سمجھ کر طے کرے اور پھر اخیر وقت تک جب تک صورت حال واقعی ناقابل برداشت نہ ہو جائے اپنی بات پر اڑا رہے پھر دوسری بات جو قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ووٹر کا کام امیدوار کو ووٹ دینے کے بعد ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کا یہ بھی فرض ہے کہ اپنے چنے ہوئے ممبروں کے کام کی دیکھ بھال بھی کرتا رہے اور ان سے جواب طلب کرتا رہے جب کوئی ممبر اپنے فرض کو ٹھیک طرح پورا نہ کرے تو اس کے خلاف خوب پروپگنڈا کرے اور آئندہ کے لئے اس کا چنا جانا ناممکن بنا دے۔ اگر ووٹر اپنے فرائض کو اس طرح پورا کریں تو ممبروں سے خوب اچھا کام لیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد دوسرا سوال مجالس قانون ساز کے ممبروں کے فرائض کا ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ اپنے حلقہ کی ضرورتوں خواہشوں اور تمناؤں کا خوب غور سے مطالعہ کریں۔ اپنے ووٹروں کی بھلائی اور بہتری کی تجویزیں اور منصوبے سوچیں اور اس کے لئے قانون بنوائیں۔ لیکن ایسا کرتے وقت انھیں خودغرضی سے کام نہ لینا چاہیئے اپنے حلقے کی بھلائی کی اور بہتری کی خاطر دوسرے حلقہ کے لوگوں کی حق تلفی نہیں کرنی چاہیئے بلکہ ایسے کام سوچنا چاہیئیں جس سے سارے ملک اور قوم کا فائدہ ہو۔ اگر کوئی ایسا موقع ہو جس میں اپنے حلقہ کا تو تھوڑا فائدہ ہوتا ہو لیکن اس تھوڑے فائدے کی خاطر سارے ملک کا بڑا نقصان ہو رہا ہو تو اس وقت ممبر کو دلیری اور ہمت کے ساتھ اپنے حلقہ کے فائدہ کو کل قوم کے فائدہ کے لئے قربان کر دینا چاہیئے۔ لیکن اکثر ممبر اپنے ان فرائض کو نہیں پہچانتے یا قصداً پورا کرنا نہیں چاہتے۔ وہ ووٹروں کو رشوت دے کر انھیں ڈرا اور دھمکا کر منتخب ہوتے ہیں اور چنے جانے کے بعد اپنی جیب گرم کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ جیسے انھوں نے دوسرے سے ووٹ خریدا تھا ایسے ہی یہ دوسرے کے ہاتھ ووٹ بیچنا چاہتے ہیں۔ جو ٹھیکیدار ساہوکار

یا کارخانہ دار انھیں روپیہ دیتے ہیں ان کے فائدہ کے لئے۔ قانون بنواتے ہیں ان کے ہاتھ میں بکے ہوئے ہوتے ہیں یا اگر حکومت اپنی طرف داری کے لئے ان کا ووٹ چاہتی ہے تو یہ اس کے بدلے میں اپنے عزیزوں رشتہ داروں کو ملازمت دلوانا چاہتے ہیں خود کمیٹیوں کے ممبر بننا اور بڑے بڑے بھتے کمانا چاہتے ہیں یا حکومت کے اثر سے اور سیکڑوں دوسرے فوائد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے چننے والے حلقے کو خوش کرنے کے لئے کوئی ایسی بات کہتے اور کرتے ہیں جس سے ان کی واقعی خدمت یا کل قوم کی خدمت تو نہیں ہوتی لیکن اس حلقہ کے لوگوں میں جو دینی جذبات اور تعصبات پائے جاتے ہیں ان کی البتہ تسکین ہو جاتی ہے فرقہ وارانہ جذبات کو اور طبقہ وار کشمکش کو بھڑکانے والی تقریریں اور غیر ذمہ دار تنقیدوں سے یہ ووٹروں میں مقبولیت حاصل کرنا چاہتے ہیں یہ کسی پارٹی کے وفادار نہیں ہوتے۔ ان کی ہر جائیوں جیسی مثال ہوتی ہے آج ایک پارٹی کا ساتھ دیا۔ جب دوسری پارٹی نے عہدے یا مالی فائدہ کا لالچ دیا تو دوسری پارٹی میں مل گئے۔ ایسے لوگ پبلک اور قوم کے بڑے دشمن ہیں اور ہرگز اس بات کے مستحق نہیں ہیں کہ ان کو دوبارہ منتخب کر کے بھیجا جائے۔

اس کے بعد تیسری جگہ جہاں پنچایتی نظام کی کامیابی کے لیئے اخلاقی صفات کا ہونا ضروری ہے۔ وہ سیاسی پارٹی ہے دنیا کی تمام پنچایتی حکومتوں میں پارٹیاں بنی ہوئی ہیں اور ان پارٹیوں کے ذریعہ تمام کام چلائے جاتے ہیں۔ پارٹیاں اگر اصول کے مطابق بنیں۔ اگر وہ اپنا ایک پروگرام طے کریں کہ ہم کو عہدہ ملا تو ہم رعایا کے لئے یہ یہ بھلائی کے کام کریں گے تو یہ اپنا کام بہت خوبی کے ساتھ کر سکتی ہیں۔ اور عہدہ نہ ملنے کی حالت میں یہ نہایت ایمانداری اور معقولیت کے ساتھ حکومت کے کاموں پر تنقید بھی کر سکتی ہیں جس سے حکومت کی بہت سی یک طرفہ پالیسیوں کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر پارٹیاں کسی اصول کے مطابق نہ بنائی جائیں بلکہ چند سیاسی لیڈر اور بد معاش یا بے ایمان زمیندار سرمایہ دار اپنے نفع کی خاطر ان کے ڈھونگ کو قائم رکھیں اور بے وقوف ایمان دار لوگوں کو اپنے جال میں پھانسے رہنے کے لئے چالیں چلتے رہیں یا لالچ اور دھمکی سے لوگوں کو اپنا طرف دار بنائے رکھیں تو ایسی پارٹیاں رحمت کی جگہ لعنت اور خدائی قہر و عذاب بن جاتی ہیں۔ ان کی وجہ سے تمام ملک میں بے ایمانی، ریاکاری، فریب اور دغابازی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔

کمزوروں اور بے وقوفوں کے ساتھ ظلم ہوتا ہے۔ ملک کے انقلابی ترقی پاتی ہے۔ ملک کے باہر جنگ کے امکانات پیدا ہوتے ہیں دوسرے ملکوں کی آزادی چھینی جاتی ہے اور تمام دنیا ایک عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے یہ لوگ تمام مقدس جذبات کو اپنے ناپاک ارادوں کے پورا کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ خاندان کی محبت مذہب کی عقیدت وطن پرستی، انسانیت دوستی ان سب اعلیٰ جذبات کو وہ اپنے گندے مقاصد کا آلہ کار بناتے ہیں۔ مزدوروں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی کو فوج اور جنگ کے تباہ کرنے والے سامانوں کی خریداری پر صرف کرتے ہیں۔ لٹریچر، تاریخ، فلسفہ، سائنس کوئی چیز ان کے زہریلے اثر سے محفوظ نہیں رہتی اور دنیا بالکل دوزخ کا ایک نمونہ بن جاتی ہے۔ پارٹی کی ایسی تنظیم افراد کی آزادیوں اور حقوق کے لئے سخت مہلک ثابت ہوتی ہے۔ کسی شخص کو آزادی کے ساتھ رائے دینے کا موقع نہیں رہتا۔ اخبار، پلیٹ فارم سب پر پارٹی کا قبضہ ہوتا ہے اور پارٹی کا یہ ظلم سخت سے سخت مطلق العنان حکمرانوں کے ظلم سے بھی بازی لے جاتا ہے۔ عوام کو چاہیئے کہ ایسی پارٹیوں کو کبھی نہ بننے دیں اور ابتدا میں ہی ختم کر ڈالیں اور اگر اتفاق سے یہ اقتدار حاصل کرلیں تو اپنی پوری اجتماعی قوت سے کام لے کر ان کو توڑ کر چکنا چور کر دیں ان کی جگہ ایسی پارٹیاں بنائیں جو پارٹی ہونے کے باوجود کل ریاست بلکہ تمام انسانیت کے مفاد کو سب باتوں پر مقدم رکھیں۔ اپنے ملک و قوم کے مفاد کے خاطر دوسری قوموں کی جائز آزادیوں کو نہ چھینیں بلکہ جہاں کہیں مظلوم قومیں نظر آئیں ان کی آزادی اور خود مختاری تہذیب و ترقی کو اپنی زندگی کا ایک مقدس مشن بنالیں۔

پارٹی کے بیان کے سلسلہ میں ریاست کا دوسرا ادارہ جس میں خاص طور پر اخلاقی صفات ہونا ضروری ہیں وہ جماعت عاملہ اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار ہیں۔ ان پر حکومت کے تمام انتظام کا دارومدار ہوتا ہے۔ پالیسیاں چاہے کیسی ہی اچھی کیوں نہ مقرر کی جائیں لیکن اگر جماعت عاملہ اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں میں اپنے فرائض کا صحیح احساس اور وطن قوم اور انسانیت کی خدمت کا پورا جذبہ نہ ہوگا تو یہ پالیسیاں کبھی کامیاب اور سرسبز نہ ہوسکیں گی۔ اعلیٰ عہدہ داروں کی نیت میں سیری ہونا چاہیئے۔ جاہ و عزت اور مال و دولت کا ان کو بھوکا نہ ہونا چاہیئے۔ ان میں ایک ٹیم کی طرح مل کر کام کرنے کی صلاحیت ہونا چاہیئے، ان میں حکم دینے اور حکم ماننے کی قابلیت ہونی چاہیئے۔ انھیں رشوت اور اس قسم کے تمام

غیر قانونی منافع سے بالاتر ہونا چاہیئے انھیں حکومت کے زمانے میں تجارت صنعت اور زراعت کے کاروبار سے اپنی عملی دلچسپیوں کو ختم کر دینا چاہیئے، ورنہ ہو سکتا ہے کہ اپنے سیاسی اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا لالچ انھیں آجائے۔ اگر یہ ہوا تو حکومت چوروں گرہ کٹوں اور ڈاکوؤں کی حکومت ہو جاتی عموماً جماعت عاملہ اور اعلیٰ عہدہ داروں کو گمراہ اور بے ایمان کرنے کا سبب بے ایمان سیاسی پارٹیاں ہوتی ہیں۔ اگر سیاسی پارٹیاں ایمان دار ہوں اور اپنے فرائض کی بجا آوری میں مستعد ہوں تو جماعت عاملہ اور عہدہ دار کبھی بے ایمانی نہیں کر سکتے۔

آخر میں ہمیں ادنے عہدہ داروں کی اخلاقی صفات کو دیکھنا چاہیئے۔ یہی لوگ ہیں جو درحقیقت حکومت کے کاروبار کو چلاتے ہیں۔ جو حکومت کے ہاتھ پاؤں کان اور آنکھیں ہوتے ہیں یہ اگر کوتاہی کریں ان میں اگر اپنے پبلک فرض کا احساس نہ ہو۔ ان میں اگر عزت نفس، ضمیر کی صداقت، اور اپنے عہدہ کے وقار اور تمکنت کی پاس داری نہ ہو تو سارے نظام کے چوپٹ ہو جانے کا اندیشہ رہے۔ پولس کانسٹبل، پٹواری، نہر کا امین مدرس اور منشی فوج کا سپاہی اور ان کے چھوٹے چھوٹے افسر ہی درحقیقت حکومت کے ستون ہوتے ہیں۔ اگر یہ ستون کمزور اور کھوکھلے ہیں تو حکومت کی عمارت بھی کبھی مضبوط اور پائدار نہیں ہو سکتی ان میں اخلاقی صفات کا ہونا سب سے زیادہ مقدم ہے۔ اعلیٰ عہدہ دار آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ پارٹیاں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں لیکن ان لوگوں کی جماعت قائم رہتی ہے۔ ان کی روایات مسلسل اور یکساں رہتی ہیں دو ٹروں کے بعد ریاست کے نظام میں بنیادی حیثیت انھیں لوگوں کی ہے اور ریاست کی تندرستی اور طاقت کا انحصار انھیں کے اوپر ہے۔ ان میں اعلیٰ اخلاقی صفات کا پیدا کرنا گویا کل قوم کی اخلاقی حالت کو سدھارنا ہے۔ ان میں جذبہ خدمت، ایمان داری اور احساس فرض پیدا ہو جائے تو ریاست کی ترقی کی ایک سب سے بڑی رکاوٹ کا ازالہ ہو جائے۔ اور اگر یہ بگڑے ہوئے ہوں تو آوے کا آوا بگڑ جائے۔ ان کی اصلاح کی صورتیں یہ ہو سکتی ہیں کہ اعلیٰ عہدہ دار اپنے عمل سے اچھی مثال ان کے سامنے رکھیں برائی کی سخت گیری سے گرفت اور بھلائی کی قدر دانی کریں۔ لٹریچر اور تعلیم میں ایک عام اخلاقی فضا پیدا کی جائے اور ملازموں کو معقول تنخواہیں دی جائیں تاکہ بغیر بے ایمانی کے ان کا گذر چل سکے۔

غرضکہ پنچایتی نظام کی کامیابی کے لئے پبلک زندگی میں ووٹر سے لے کر حاکم اعلیٰ تک سب میں عمدہ اخلاقی صفات کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

آخر میں ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا خاص طور پر ضروری ہے۔ نجی فائدہ اور پبلک فائدہ، ادنیٰ وفاداری اور اعلیٰ وفاداری جن کے فرق کو میں نے بیان کیا تھا ان کے کئی درجے ہو سکتے ہیں۔ ہمیں ہمیشہ تنگ کے مقابلہ میں کشادہ ادنےٰ کے مقابلہ میں اعلیٰ کو ترجیح دینا چاہیئے۔ ذرائع آمد و رفت کی ترقی نے تمام قوموں اور ملکوں کو ایک ہی رشتہ میں پرو دیا ہے۔ ساری دنیا ایک برادری، خاندان بن گئی ہے دنیا کے سب رہنے والے جسم کے مختلف حصے بن گئے ہیں۔ اب یہ ممکن نہیں ہے کہ دنیا کا ایک حصہ مصیبت میں مبتلا ہو تو اس کا اثر دنیا کے دوسرے حصوں پر نہ پڑے۔ اس لئے تمام ایسی پالیسیاں جن میں تنگ نظری سے کام لے کر فرقوں، نسلوں، مذہبوں اور قوموں کی ادنےٰ محبتوں کو ابھارنے کی کوشش کی جاتی ہے اور انسانیت کی اعلیٰ محبت اور اس کی صلح و آشتی کو قربان کیا جاتا ہے۔ چلنے والی چیزیں نہیں ہیں فتنہ و فساد سے جتنا دوسروں کو نقصان پہنچے گا اتنا ہی خود اپنی ذات کو بھی پہنچے گا اس لئے تمام انسانوں کو مل کر اور متحد ہو کر سائنس کی تحقیقات سے مدد لینے اور فطرت کی قوتوں پر اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کی جگہ دنیا سے بیماری، غریبی، گندگی بدصورتی بے علمی اور ناسمجھی کو دور کرنا چاہیئے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے دوپاؤں کے انسان نما رندوں کو واقعی انسان بنایا جاسکتا ہے۔

تقریر اور اخبار

(از جناب محمد عاقل صاحب)

دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں جن کا لوہا آدمیوں کو ماننا پڑتا ہے۔ ایک سنڈے مسٹنڈے دیو جیسے قوی ہیکل پہلوان کو دیکھ کر خواہ مخواہ رعب پڑتا ہے۔ اس کی جسمانی قوت کے سامنے سب لوگ کمزور بے بس معلوم ہوتے ہیں۔ ہم اس کی طاقت کو پسند کرتے ہیں اور اس کی تعریف کرتے ہیں۔ ہم اسے دوست بناتے ہیں تاکہ اس کی طاقت سے فائدہ حاصل کر سکیں اور اس کی دشمنی سے ڈرتے ہیں کہ کہیں اس کی طاقت ہمارے خلاف استعمال نہ ہو۔ ہماری ہڈیوں کا چکنا چور، ہمارے بدن کو لہولہان نہ کردے۔ ہمارے روٹی کپڑے اور مکان، ہمارے زرومال اور اندوختے کو ہم سے نہ چھین لے۔ اپنی جسمانی قوت سے ایک طاقتور شخص اپنی مرضی کے مطابق لوگوں سے کام کراتا اور اپنی مرضی کے خلاف کام کرنے سے روکتا ہے۔ غرضکہ رہنمائی اور سرداری کی سب سے پہلی اور سب سے پرانی صفت جسمانی قوت ہے۔ اس کے بعد اور قوتیں بھی پیدا ہوتی ہیں جن سے کچھ لوگ دوسروں کے مقابلہ میں سربلند اور ممتاز ہو جاتے ہیں۔ مثلاً علم کی طاقت ہے کہ اس سے آدمی ہوا، بھاپ، بجلی سے کام لے کر اپنی طاقت کو بہت بڑھا لیتا ہے اور سب لوگوں سے جس طرح چاہتا ہے، ناچ نچاتا اور ناک رگڑواتا ہے۔ تو جیسے دنیا کی ان چیزوں کو طاقت حاصل ہے ویسے ہی تقریر اور اخبار بھی دنیا کی دو بڑی طاقتیں ہیں۔

پہلے تقریر کو لیجیے۔ تقریر آواز کے زیروبم، لہجہ کے اُتار چڑھاؤ کی کرشمہ سازی ہے۔ آواز میں ایک قوت ہوتی ہے۔ شیر کی دہاڑ، بادل کی گرج، بجلی کی کڑک سے ایک ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ مور کی چنگھاڑ، کوئل کی کوک، اور پپیہے کی پی کہاں میں ایک درد اور کیفیت ہوتی ہے جو دل کو فوراً اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ انسان کی آواز میں یہ سب چیزیں جمع کی جا سکتی ہیں۔ ایک وقت میں اسے کڑک اور گرج بھی بنایا جا سکتا ہے اور دوسرے وقت میں آہ اور کراہ بھی۔ ایک وقت میں اس میں نفرت اور حقارت

بھی بھری جا سکتی ہے اور دوسرے وقت میں پریم اور محبت بھی۔ ایک وقت میں کسی کام کے کرانے کے لئے جتنی ترغیب اور تحریص کی ضرورت ہے وہ سب اس میں جمع کی جا سکتی ہے اور دوسرے وقت میں کسی کام سے روکنے کے لئے جتنی کراہیت اور بیزاری پیدا کرنا ضروری ہے وہ سب پیدا کی جا سکتی ہے۔ غرضکہ انسانی آواز کی قوت اس کی جسم کی قوت سے بھی بہت بڑی ہے۔ جسم کی قوت سے ایک وقت میں ایک آدمی زیادہ سے زیادہ تین چار آدمیوں پر غالب آسکتا ہے۔ لیکن آواز کا جادو جہاں تک آواز پہنچ سکتی ہے سب کو اپنے اثر میں لا سکتا ہے۔

جس شخص کی آواز میں لوچ، بلندی اور کڑاکا ہوتا ہے، جس کے پاس الفاظ کا اچھا ذخیرہ ہوتا ہے وہ بڑے مجمع کے دل موہ لیتا ہے اور سیاسی زندگی میں اس کی رہنمائی کو لوگ ماننے لگتے ہیں۔ جس جماعت کے ساتھ وہ شامل ہو جاتا ہے اس کی کامیابی یقینی سمجھی جاتی ہے۔ عوام اس کے لفظوں پر ناچتے ہیں۔ جب چاہتا ہے انھیں ہنسا دیتا ہے جب چاہتا ہے رلا دیتا ہے۔ جب چاہتا ہے انھیں محبت سے بھر دیتا ہے اور جب چاہتا ہے نفرت سے۔ جب چاہا انھیں ابھار کر قتل و غارت گری پر آمادہ کر دیا اور جب چاہا ان میں امن و سکون کی تمنا پیدا کر دی۔ عوام کے دل اس کے ہاتھ میں ایک ستار کے تاروں کی طرح ہوتے ہیں جن پر جس قسم کا راگ جب چاہتا ہے چھیڑ دیتا ہے اور دنیا میں ایک ہنگامہ برپا کئے رہتا ہے۔ دنیا کی بہت سی بڑی بڑی جنگیں، بڑے بڑے انقلاب، بڑی بڑی تعمیری اور تہذیبی کوششیں مقرروں کی آواز کی ہی کرشمہ سازیاں ہیں۔ پرانے زمانے میں شاعر جب تحریر کا رواج عام نہیں ہوا تھا اپنی خطابت کی قوت سے ہی مشہور ہوا کرتے تھے اور ہمارے ملک کے شاعروں میں تو یہ بات آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ان ملکوں میں جہاں پرانے زمانے میں پنچایتی حکومت قائم تھی (مثلاً یونان اور روم میں) خطابت کو سیاسی زندگی میں بڑی زبردست اہمیت حاصل تھی اور آج بھی ہماری سیاسی زندگی میں تقریر کی اہمیت کو سب تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے دنیا کے مذہبی دور میں منبر و محراب سے ہی کام لیا جاتا تھا اور اس کے ذریعہ ہزاروں گمراہوں کو نیکی کا راستہ اور ہزاروں نیک لوگوں کو گمراہ کیا جاتا تھا۔ آج بھی ایک مذہبی مبلغ کے لئے مقرر ہونا بہت ضروری ہے۔ خوش بیان وکیلوں کی پیروی سے مقدمے عدالتوں میں جیتے جاتے ہیں۔ سفیروں اور ایلچیوں کی تقریروں سے دو حکومتوں کے درمیان تعلقات

اچھے یا برے کرائے جا سکتے ہیں۔ سیاسی رہنماؤں اور مدبروں کی تقریروں سے حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ نئی نسلوں میں تعلیم پھیلانے کا ذریعہ بھی تقریر ہی ہوتی ہے اور ایک فصیح معلم کا درجہ بہت بڑا سمجھا جاتا ہے۔ غرضکہ تقریر کی حکومت کا حلقہ بہت وسیع ہے اور اس کی طاقت بہت زبردست ہے۔

لیکن خطابت کی حریف ایک دوسری طاقت بھی ہے جسے صحافت کہتے ہیں۔ اسے چھاپہ کی ایجاد نے پیدا کیا ہے۔ چھاپہ کی ایجاد سے پہلے ایک شخص کے لکھے ہوئے کو صرف ایک شخص ہی پڑھ سکتا تھا۔ ایک سے زیادہ آدمیوں کے لیے پڑھنا ممکن نہیں تھا۔ سوائے اس صورت کے کہ لکھی ہوئی تحریر کو مجمع میں سنایا جائے جس میں تحریر اور تقریر دونوں جمع ہو جاتی تھیں۔ تحریر کے حلقہ کو بڑھانے کے لیے لوگ اپنی لکھی ہوئی چیزوں کی نقل کرا کے تقسیم کرتے تھے لیکن یہ کام بہت مشکل، مہنگا اور دیرطلب ہوتا تھا۔ اپنی تحریر کو ہر دفعہ نقل کرانے میں پہلے کے برابر محنت کرنا پڑتی تھی اور کاتب کی غلطیوں کی صحت ضروری تھی۔ لیکن چھاپہ کی ایجاد نے اس کام کو بہت سہل بنا دیا ہے۔ چھاپہ کا علم تو آدمیوں کو بہت پرانے زمانے سے ہے۔ مہر ایک طرح کی چھاپ ہے جس کا استعمال نہایت قدیم زمانہ میں مثلاً سمیروں کے یہاں شروع ہو گیا تھا۔ اسی طرح سکہ بھی چھپی ہوئی چیز ہے۔ جاہل آدمیوں نے ہر عہد میں دستخط کے لیے لکڑی یا دھات کی مہروں کا استعمال کیا ہے۔ چین میں دوسری صدی عیسوی میں نہایت مشہور تصنیفوں کی طباعت شروع ہو گئی تھی لیکن اچھی سیاہی اور مناسب کاغذ کی دقتوں کی وجہ سے چھاپہ کی ایجاد سے لوگ پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ یورپ میں پندرھویں صدی عیسوی تک باقاعدہ چھپائی شروع نہیں کی جا سکی تھی۔ اور اخبار جو ہمارے زمانے کی سب سے بڑی طاقت ہے اس کی عمر دو سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔

موجودہ زمانے میں پنچایتی حکومت بڑے بڑے ملکوں میں صرف پریس کی ترقی کی وجہ سے ممکن بن سکی ہے۔ قدیم یونان کی پنچایتی حکومت جس کے کام کی آج تک بڑی دھوم ہے، صرف چھوٹے شہروں تک محدود تھی۔ یونان کے شہری صرف گفتگو اور تقریر کے ذریعہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بناتے اور ان کو کاموں کے کرنے یا نہ کرنے کے لیے آمادہ کرتے تھے۔ جن لوگوں کو تقریر میں مہارت حاصل ہوتی تھی وہ رعایا کے رہنما بن جاتے تھے اور جو وہ چاہتے تھے رعایا اسی کے مطابق اپنی رائے دیتی تھی۔ ان کا سیاسی اثر بہت بڑھ جاتا تھا اور یہی لوگ عملاً حکومت کرتے تھے۔ روم میں ہر چند شہریت کے حق کو وسیع اور عام کر دیا گیا تھا لیکن اس سے

فائدہ صرف وہی لوگ اٹھا سکتے تھے جو روم کے قریب رہتے تھے باقی سب لوگ عملاً شہری حق سے محروم تھے۔

پنچایتی حکومت کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کو سیاسی واقعات سے باخبر رکھا جائے تمام مسائل سے واقفیت اور دلچسپی پیدا کرائی جائے۔ وقت کے وقت جو نئے سیاسی مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں رعایا اور پارلیمنٹ کے ممبروں کو فوراً ان کی اطلاع دی جائے۔ ملک کے رہنماؤں کی ان مسائل کے بارے میں جو رائے ہے اس سے بھی سب کو واقف کرایا جائے۔ مختلف پالیسیوں کی طرفداری یا مخالفت میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ سب رائے دینے والوں کے سامنے رکھا جائے۔ رعایا کے زیادہ سے زیادہ افراد کو غور و فکر اور بحث و مباحثہ میں شریک کیا جائے۔ لوگ پہلے واقعات کا پورا علم حاصل کریں اور پھر ان پر اپنی رائے اور مرضی کا اظہار کریں۔ جب تک پریس کو ترقی نہیں ہوئی تھی ان سب کاموں کو کرنے کے لئے صرف تقریر کا ایک موثر ذریعہ موجود تھا۔ روم میں نقیب عوام کی مجلس کے منعقد ہونے کا اعلان کرتے تھے یا عام گذرگاہوں پر ہاتھ سے لکھے ہوئے اشتہار چپکا دئے جاتے تھے۔ جہاں تک آدمی کی آواز کو جلد سے جلد پہنچایا جا سکتا تھا۔ وہی پنچایتی حکومت کی حد بن جاتی تھی۔ کیونکہ آواز سننے والے لوگ ہی پنچایتی کارروائی میں شریک ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پنچایتی حکومتوں کا رقبہ اس زمانے میں بہت چھوٹا ہوا کرتا تھا۔

لیکن پریس اور وسائل خبر رسانی کی ترقی نے اخبار، پوسٹرس، ہینڈبل کے ذریعہ بڑے بڑے ملکوں بلکہ ساری دنیا کو ایک کر دیا ہے۔ اب ایک خبر کو ایک وقت میں ساری دنیا میں مشتہر کیا جا سکتا ہے اور ساری دنیا والوں کی رائے کا اس کے بارے میں پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

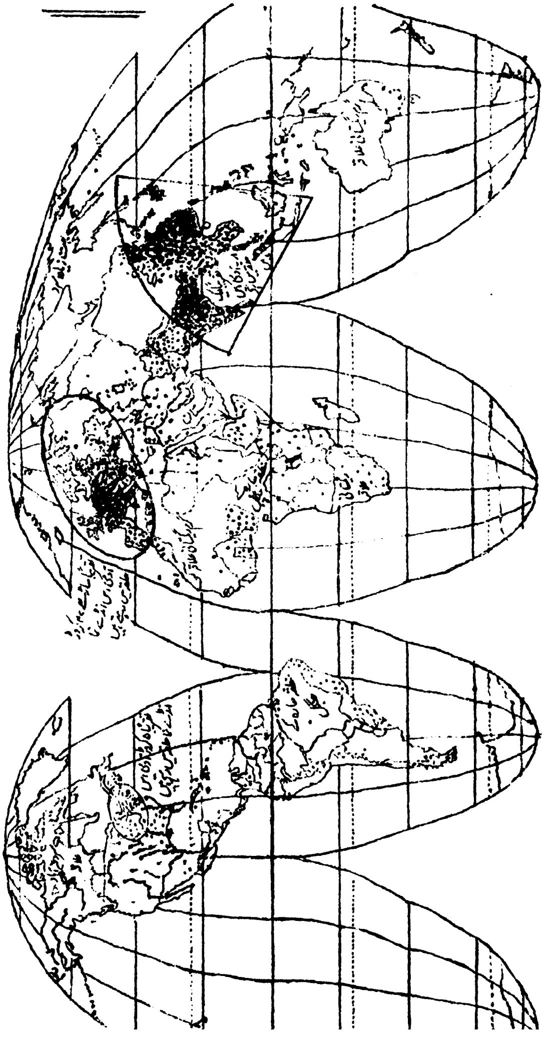
پریس کی اس ترقی نے اخبار کے ایڈیٹروں اور مالکوں کی اہمیت کو بہت بڑھا دیا ہے۔ کیونکہ اخبار صرف خبریں ہی شائع نہیں کرتے بلکہ بعض ترتیب دیتے اور ان کے بارے میں اپنی رائے بھی ظاہر کرتے ہیں بعض خبروں اور رایوں کو دبا بھی لیتے ہیں اور بعض کو نمایاں اور بعض کو کم نمایاں جگہ دیتے ہیں۔ ان تمام ذریعوں سے وہ لوگوں کو اپنی رائے کے مطابق کام کرنے یا نہ کرنے کی طرف مائل کر سکتے ہیں۔ پھر چونکہ ایک ترقی یافتہ اخبار تعلیم یافتہ ملکوں میں گاؤں گاؤں اور محلہ کے ہر شخص تک پہنچتا ہے اس لئے اس کی بات کے سننے والے بہت ہوتے ہیں۔ مقرر اخبار کی امداد کے بغیر صرف چھوٹے چھوٹے مجمعوں کو اپنا ہم خیال بنا سکتا

ہے۔ ایک مجمع کے سامنے وہ ایک دن تقریر کرتا ہے دوسرے دن کسی دوسرے محلہ یا گاؤں یا شہر میں اسے تقریر کے لئے جانا پڑتا ہے۔ اس لئے وہ اپنی تقریر کا اثر لوگوں پر روزانہ نہیں ڈال سکتا۔ لیکن اخبار روزانہ اپنے پڑھنے والوں کو جو ہر گاؤں اور ہر محلے میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اپنا خیال سمجھا سکتا ہے۔ مقرر اور اخبار میں اگر ان بن ہو جائے تو اخبار کی کامیابی کا امکان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے آج کل اخبار کی طاقت مقرروں سے بھی زیادہ زبردست ہوگئی ہے۔ ان کی خوشنودی سے بڑے فائدے اور ان کی خفگی سے بڑے نقصان اٹھانا پڑتے ہیں۔

طاقت اپنی جگہ پر نہ اچھی چیز ہے نہ بری۔ یہ ایک غیر اخلاقی صفت ہے۔ اس کی اچھائی اور برائی کا انحصار اس کے استعمال کے طریقہ پر ہوتا ہے۔ ایک قوی شخص اپنی قوت کو کمزور کی مدد کے لئے بھی استعمال کر سکتا ہے اور اس کے دبانے اور نقصان پہنچانے کے لئے بھی۔ اس لئے طاقت کو ہر جگہ بالکل آزاد اور خود مختار نہیں چھوڑنا چاہیئے بلکہ اس پر ایسی پابندیاں عاید کرنا چاہیئں جس سے اس کی بھلائی کے امکانات ترقی پاسکیں اور اس کی برائی کو روکا جا سکے۔ ایک زمانے میں تقریر اور تحریر کی آزادی کو ایک مسلمہ حقیقت کا مرتبہ ملا ہوا تھا اور ہر ترقی پسند تحریک کے مطالبات میں انھیں پہلی صف میں جگہ دی جاتی تھی۔ لیکن یہ زمانہ وہ تھا جب بہت سے اخبار نکلتے تھے اور صرف چند اشخاص نے اخبار کی ملکیت پر اجارہ حاصل نہیں کیا تھا۔ مگر اب اخباروں کا چلانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں رہی ہے۔ اس کی کامیابی کے لئے بہت بڑے سرمایہ کی ضرورت ہونے لگی ہے اور جس شخص کے پاس جتنا زیادہ سرمایہ ہوتا ہے وہ اپنے حریف کو اتنے ہی جلد ختم کر سکتا ہے۔ پھر آج کل اخبار کی کامیابی کے لئے خبروں اور تنقیدوں کے پڑھنے والوں کی ہمدردی اور خوشنودی کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی ہے۔ کیونکہ دواؤں، تفریحوں اور دوسرے اشتہاروں کی آمدنی سے اخبار پڑھنے والوں کی ناپسندیدگی کے باوجود اخباروں کو چلایا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اخبار کے مالک اور ایڈیٹر ملک کے نہایت خیر خواہ لوگوں کی مخالفت کے باوجود اپنے ذاتی فائدے یا اپنے دوستوں کے فائدہ کے لئے ایک نقصان رساں پالیسی کی تبلیغ واشاعت کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح مقرر بھی اپنی طاقت سے ناجائز فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن اگر انھیں ریڈیو کی جدید ایجاد کی حمایت حاصل نہ ہو تو اخبار کے مقابلہ میں ان سے جو نقصان پہنچ سکتا ہے وہ

بہت ہی کم ہے۔

دنیا کے لئے یہ مسئلہ واقعی بہت اہم ہے کہ وہ اپنی بڑھتی ہوئی طاقت کو کس طرح استعمال کرے کہ اس کا نقصان کم اور فائدہ زیادہ ہو۔ ہماری تمام تہذیب و ترقی کا انحصار اسی مسئلہ کے معقول حل پر ہے



دنیا کی آبادی کی تقسیم

(نوٹ) اس نقشہ کا ہر نقطہ دس ہزار آدمیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ نقشہ میں جو حلقے بنائے گئے ہیں ان میں دنیا کی ۵/۸ آبادی بستی ہے۔ دنیا کی کل آبادی ایک ارب نوے کروڑ ہے ان حلقوں میں ایک ارب پچاس کروڑ آدمی بستے ہیں۔

امریکہ کا دستورِ اساسی

(از محمد عاقل صاحب)

امریکہ کے دستور کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی خصوصیت اس کی جمہوریت ہے۔ یعنی حکومت کے ہر شعبہ میں عوام کی رائے اور مرضی کو پورا پورا دخل ہے۔ طرح طرح سے کوشش کی گئی ہے کہ حکومت کے کاروبار میں تمام رعایا زیادہ سے زیادہ شریک ہو سکے۔ مقامی اداروں میں یہ کوشش سب سے زیادہ کامیاب ہے۔ ریاستوں میں اس سے کم اور قومی حکومت میں اس سے بھی کم۔ ایسا قدرتی طور پر ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ مقامی اداروں میں تو ہر شہری حکومت کے کاروبار میں براہ راست شرکت کر سکتا ہے لیکن ریاست کے کاموں میں رقبہ کی وسعت اور تعداد کی کثرت کی وجہ سے ہر شخص براہ راست حکومت کے کاموں میں حصہ نہیں لے سکتا۔ قومی حکومت کے کام میں شریک ہونے کا موقع لوگوں کو اور بھی کم ملتا ہے۔

اس دستور کی دوسری خصوصیت اس کی لامرکزیت ہے یعنی قومی حکومت کے اختیارات بہت محدود ہیں اور ریاستوں اور مقامی اداروں کے اختیارات اور آزادیاں وسیع ہیں۔ امریکہ کا قومی دستور فیڈرل یا وفاقی دستور کہلاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ امریکہ کا قومی اتحاد مکمل نہیں ہے بلکہ نامکمل ہے۔ امریکہ کی ریاستوں نے متحد ہو کر اپنے سارے اختیارات مرکزی حکومت کو سپرد نہیں کئے ہیں بلکہ صرف ان اختیارات کو مرکزی حکومت کو سونپا ہے جن کا ذکر دستور میں صراحتاً موجود ہے اور باقی ہر قسم کے اختیار کو انھوں نے اپنے لئے محفوظ رکھا ہے۔ دستور کی اس خصوصیت سے بھی پہلی خصوصیت یعنی جمہوریت کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ مرکزی حکومت کو چونکہ جمہور سے براہ راست تعلق نسبتاً کم ہے اس لئے اس کے اختیارات بھی محدود کر دئے گئے ہیں۔

(۳) امریکہ کے دستور کی تیسری خصوصیت "تقسیم اختیارات" ہے یعنی جماعت قانون ساز، جماعت عاملہ اور عدالت تینوں کو ایک دوسرے کے اثر سے آزاد رکھا گیا ہے۔ جماعت عاملہ کے اراکین اور عدالت

کے حاکموں کا تقرر، جماعت قانون ساز کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ تینوں رعایا کی طرف سے منتخب کئے جاتے ہیں۔ اس خصوصیت سے بھی جمہوریت کو ترقی ہوتی ہے۔ کیونکہ جماعت عاملہ جس قانون کو چاہے جماعت قانون ساز میں پاس نہیں کرا سکتی۔ نہ عدالت سے اپنے حسب منشار فیصلہ کرا سکتی ہے۔ اسی طرح جماعت قانون ساز اور عدالت بھی ایک دوسرے پر اور جماعت عاملہ پر ناجائز دباؤ نہیں ڈال سکتے۔ نہ ان تینوں کی ملی بھگت سے رعایا پر ظلم و ناانصافی عرصہ تک جاری رکھی جا سکتی ہے۔

امریکہ کے دستور کی چوتھی خصوصیت (Initiative) (Referendum) اور (Recall) کے اختیارات ہیں جن کے ذریعہ امریکہ کی بعض ریاستوں کی رعایا کو حق حاصل ہے کہ اپنے منتخب کئے ہوئے نمایندوں کی موجودگی کے باوجود خود براہ راست قانون سازی کے کام میں شریک ہو سکتی ہے۔ (Initiative) سے مراد یہ ہے کہ رعایا کی ایک مقررہ تعداد اگر چاہے تو کسی قانون کو اپنے نمایندوں کی معرفت نہیں بلکہ خود براہ راست مجلس قانون ساز میں پیش کر سکتی ہے (Referendum) سے مراد یہ ہے کہ بعض قوانین خصوصاً ایسے جن سے دستور اساسی میں ترمیم و تنسیخ کرنا منظور ہوتی ہے ان کے آخری فیصلہ کے لئے رعایا سے براہ راست ووٹ لیا جاتا ہے اور رعایا کی اکثریت کے ووٹ سے وہ منظور یا نامنظور کئے جاتے ہیں۔ (Recall) کا یہ مطلب ہے کہ اگر کسی منتخب شدہ افسر سے رعایا کی اکثریت ناخوش ہو جائے تو اس شخص کی مدت تقرر کے ختم ہونے سے پہلے رعایا اس کو برطرف کر سکتی ہے۔

امریکہ کے دستور کی نمایاں خصوصیات بیان کرنے کے بعد اب ہم دستور کی موجودہ شکل کو دیکھتے ہیں سب سے پہلے ہم ریاستوں کے دستور اساسی کا مطالعہ کرتے ہیں کیونکہ تاریخی حیثیت سے یہ زیادہ قدیم اور جس زمانہ میں قائم کی گئی تھیں اس عہد کے جمہوری خیالات کو نہایت تکمیل کے ساتھ ظاہر کرتی ہیں۔

ہر ریاست کے دستور میں ذیل کے اجزائے حکومت پائے جاتے ہیں:۔

(۱) سب سے اول اس کا ایک دستور اساسی ہوتا ہے جسے اس کے تمام شہریوں نے بنایا ہے اور جس میں ترمیم اور تنسیخ ان کے ووٹ کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔

(۲) دوسرے دو ایوانوں کی ایک مجلس قانون ساز۔ ان دونوں ایوانوں کے ارکین کا انتخاب ایک

سے چار سال کی مدت کے لئے تمام بالغ آبادی کرتی ہے اعلیٰ ایوان کا نام سینیٹ ہوتا ہے اور اس کا حلقہ انتخاب زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ دونوں ایوانوں کے ارکین کو تنخواہیں ملتی ہیں۔ دونوں کے اختیارات تقریباً مساوی ہوتے ہیں۔ گو اکثر ریاستوں میں بجٹ پر بحث پہلے ایوان ادنیٰ میں ہوتی ہے اور پھر سینیٹ میں۔ بعض ریاستوں میں عہدہ داروں کا تقرر گورنر سینیٹ کی رائے معلوم کرنے کے بعد کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ریاستوں میں جب اعلیٰ افسروں پر فرائض منصبی ٹھیک طریقہ پر انجام نہ دینے کے الزام میں مقدمہ چلایا جاتا ہے تو سینیٹ کو عدالت کے فرائض بھی انجام دینا پڑتے ہیں۔

(۳) ریاستوں کی حکومت کا تیسرا جزء گورنر ہے جسے عموماً دو سال کے لئے تمام شہری منتخب کرتے ہیں۔ گورنر جماعت عاملہ کا اعلیٰ افسر ہوتا ہے اور مجلس قانون ساز کے پاس کئے ہوئے قوانین کو مسترد کرنے کا حق رکھتا ہے لیکن اگر دونوں ایوانوں کی دو تہائی اکثریت اس قانون کو دوبارہ پاس کردے تو اس کا یہ حق زائل ہوجاتا ہے۔

(۴) ریاستوں کی حکومت کا چوتھا جزء انتظام کرنے والے افسر ہوتے ہیں جن میں سے بعض تو علیحدہ علیحدہ کام کرتے ہیں اور بعض بورڈ بنا کر۔ ان کا انتخاب ہوتا ہے اور یہ کم مدت کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں۔ یہ افسر صرف قانون کے پابند ہوتے ہیں اور مجالس قانون ساز کے اثر سے آزاد ہوتے ہیں گورنر بھی صرف چند معاملات میں ہی ان کی نگرانی کرتا اور انھیں ہدایت دے سکتا ہے ورنہ یہ بیشتر رعایا کو براہ راست جواب دہ ہوتے ہیں۔

(۵) ریاستوں کی حکومت کا پانچواں جزء ادنیٰ افسر ہوتے ہیں جنھیں یا تو گورنر مقرر کرتا ہے یا مجلس قانون ساز یا اعلیٰ افسر اور ان کے بورڈ۔

(۶) ریاستوں کی حکومت کا چھٹا جزء جج ہوتے ہیں جنھیں یا تو کل ریاست کے لئے سب شہری منتخب کرتے ہیں یا مقامی علاقوں کے لئے مقامی لوگ منتخب کرتے ہیں۔ ان کے تقرر کی مدت بھی عموماً مختصر ہوتی ہے ان عہدہ داروں کی تنخواہیں عموماً کم ہی ہوتی ہیں۔

یہ تو ریاستوں کی حکومت کا حال ہوا۔ لیکن امریکہ کے اپنے والوں کو تین مختلف قسم کی حکومتوں کے احکام ماننا ہوتے ہیں۔ وفاقی حکومت، ریاستوں کی حکومت، اور مقامی حکومت یعنی لوکل سلف گورنمنٹ آئیے اب مقامی حکومتوں یا لوکل سلف گورنمنٹ کا مطالعہ کریں۔

امریکہ کی جمہوری حکومت نہایت مکمل شکل میں اسی جگہ نظر آتی ہے۔ امریکہ کے سیاسی اداروں کی جو لوگ بہت تعریف کرتے ہیں وہ اپنی مقامی اداروں کو دیکھ کر کرتے ہیں۔ مقامی حکومت کی مختلف علاقوں میں مختلف شکلیں ہیں۔ شمال مشرق میں کچھ اور شکل ہے، شمال مغرب میں کچھ اور۔ اسی طرح جنوب اور وسط مشرق اور وسط مغرب کی شکلیں بھی مختلف ہیں۔ شمال مشرق یعنی نیو انگلینڈ کے علاقہ میں قدیم وضع کی ٹاؤن شپ پائی جاتی ہے جن میں ہر سال قصبہ کی تمام آبادی کا ایک جلسہ ہوتا ہے اور اس میں سالانہ آمد و خرچ کا حساب پیش کیا جاتا ہے۔ گذشتہ سال کے Selectmen یعنی عہدہ داروں سے ہر شخص کو جواب طلب کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے اور نئے عہدہ داروں یعنی سرپنچوں کا انتخاب سب شہریوں کے ووٹ سے کیا جاتا ہے۔ ٹاؤن شپ سے زیادہ وسیع رقبہ کاؤنٹی کا ہوتا ہے اور یہ ہندوستان کے ڈسٹرکٹ بورڈوں کی طرح بڑی سڑکوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں اور اپنے علاقوں کے ججوں کا بھی انتخاب کرتی ہیں۔ جنوبی ریاستوں میں ٹاؤن یا ٹاؤن شپ نہیں ہوتیں بلکہ وہاں حکومت کی ابتدا کاؤنٹی سے ہوتی ہے۔ کاؤنٹی کے افسروں کا انتخاب بھی تمام شہری براہ راست کرتے ہیں۔ وسطی اور مغربی ریاستوں میں ٹاؤن شپ اور کاؤنٹی دونوں پائی جاتی ہیں۔ لیکن امریکہ کے تمام علاقوں کی مقامی حکومتوں میں یہ بات مشترک ہے کہ ان سب میں حکومت کے معاملات کا تصفیہ تمام شہری براہ راست خود ہی کرتے ہیں۔ افسروں کا تقرر مرکزی حکومتیں نہیں کرتیں بلکہ لوگ انھیں خود منتخب کرتے ہیں اور وہ اپنی رعایا کو براہ راست جواب دہ ہوتے ہیں۔ مقامی معاملات میں مرکزی حکومت کی مداخلت کو بالکل پسند نہیں کیا جاتا۔ شہروں کے انتظام میں بھی جمہوری نظام سے پوری طرح کام لیا جاتا ہے۔

اب اخیر میں ہم قومی یا فیڈرل حکومت کے دستور اساسی کو بیان کرتے ہیں۔ یہ تیسری حکومت ہے جس کے احکام امریکہ کے رہنے والوں کو ماننے پڑتے ہیں۔ فیڈرل یا قومی حکومت کے اجزا حسب ذیل ہیں :-

(۱) سب سے اول قومی کانگریس یعنی مجلس قانون ساز جس کے دو ایوان ہوتے ہیں۔ پہلے ایوان یعنی (House of Representatives) کے ارکین کا انتخاب دو سال کے لئے ہوتا ہے اور ہر بڑے ضلع کا ایک ایک نمائندہ منتخب کر کے بھیجا جاتا ہے۔ ریاست کے انتخاب میں حصہ لینے کے جو لوگ مستحق ہوتے ہیں وہی لوگ اس انتخاب میں بھی حصہ لے سکتے ہیں۔ جنوب کی اکثر ریاستوں میں حبشیوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ دوسرے ایوان کا نام سینیٹ ہے اور اس میں ہر ریاست کی طرف سے دو نمائندے چھ سال کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ سینیٹ کے نمائندوں کی ایک تہائی تعداد کا انتخاب ہر دوسرے سال ہوتا ہے۔ ابتدا میں قومی سینیٹ کے ارکین کو ریاستوں کی مجالس قانون ساز منتخب کر کے بھیجا کرتی تھیں۔ لیکن ۱۹۱۲ء سے ہر ریاست کے شہری براہ راست انہیں منتخب کر کے بھیجنے لگے ہیں۔ سینیٹ کا کام یہ بھی ہے کہ پریسیڈنٹ جن افسروں کا تقرر کرتا ہے یہ ان کے تقرر کی منظوری دیتی ہے۔ اس کے علاوہ غیر ملکوں سے جو معاہدے کئے جاتے ہیں ان کی منظوری کے لئے سینیٹ کے دو تہائی ووٹ حاصل کرنا ضروری ہیں اعلیٰ افسروں پر بددیانتی یا غفلت بہ کارمنصبی کے سلسلہ میں جو مقدمے چلائے جاتے ہیں۔ ان کے لئے سینیٹ عدالت کا کام انجام دیتی ہے۔

(۲) قومی حکومت کا دوسرا جز پریسیڈنٹ ہے جو جماعت عاملہ کا اعلیٰ افسر ہوتا ہے اور اسے چار سال کے لئے وہ لوگ منتخب کرتے ہیں جنہیں خاص طور پر اسی کام کے لئے ہر ریاست کے شہری چنتے ہیں۔ ان انتخاب کرنے والے لوگوں کی تعداد (House of Representatives) کے ارکان کی تعداد کے برابر ہوتی ہے لیکن چونکہ انتخاب کے وقت انہیں اپنے منتخب کرنے والوں سے یہ وعدہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ منتخب ہو کر اسی امیدوار کے حق میں ووٹ دیں گے جسے ان کے منتخب کرنے والے پسند کرتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا درست ہے کہ عملی طور پر پریسیڈنٹ کا انتخاب امریکہ کی کل بالغ آبادی ہی کرتی ہے۔ پریسیڈنٹ کو اختیار ہوتا ہے کہ ان قوانین کو جنھیں کانگریس نے منظور کیا ہے مسترد کر دے۔ لیکن اگر دونوں ایوان اس قانون کو دوبارہ دو تہائی اکثریت کے ساتھ پاس کر دیں تو پھر یہ مسودہ قانون پریسیڈنٹ کی مخالفت کے باوجود قانونی جامہ پہن لیتا ہے۔

(۳) قومی حکومت کا تیسرا جز عدالت ہوتی ہے جس میں سپریم کورٹ اور وہ تمام فیڈرل کورٹ شامل ہیں جو قانون کے ذریعہ وجود میں آئیں۔ ججوں کا تقرر عمر بھر کے لئے پریسیڈنٹ، سینیٹ کی منظوری حاصل کرنے کے بعد

کرتا ہے۔ صرف سینیٹ کے سامنے مقدمہ چلا کر ان کو علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ ادنے فیڈرل کورٹ ملک کے ہر حصہ میں قائم ہیں اور ان کے فیصلوں کی اپیلیں سپریم کورٹ میں کی جاتی ہیں۔

امریکہ کے دستور کا حال جو ابھی بیان کیا گیا ہندوستان کے لئے خاص طور پر دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ ہم بھی ہندوستان میں ایک فیڈرل یا وفاقی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن امریکہ کے وفاق کی بنیادیں مضبوط ہیں کیونکہ اس کے مقامی اداروں میں جمہوریت نہایت مکمل شکل میں پائی جاتی ہے۔ پہلے وہ اپنا ایک علیٰحدہ مستقل وجود رکھتے تھے اور بعد میں مل کر انھوں نے وفاق کی شکل اختیار کی۔ لیکن ہندوستان کی حکومت ایک طویل عرصہ سے منفرد اور مرکزیت پسند رہ چکی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں جمہوریت اوپر سے چھن چھن کر نیچے پہنچ رہی ہے۔ ہمارے یہاں آل انڈیا ادارے تو سیاسی حیثیت سے خاصے ترقی یافتہ ہیں لیکن مقامی ادارے ابھی تک مرکزی اداروں کے اشاروں پر کام کرتے ہیں۔ ان میں ذاتی ذمہ داری کا احساس پیدا نہیں ہوا ہے۔ ان میں ابھی تک حکومت خود اختیاری نے پوری طرح جڑ نہیں پکڑی ہے۔ امریکہ کی صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہاں قومی حکومت میں جمہوریت کے اجزا نسبتاً کم نظر آتے ہیں اور ریاستوں میں بہت زیادہ۔ مثلاً مرکزی سینیٹ کے اراکین کے تقرر کی مدت طویل یعنی چھ سال ہے۔ ریاستوں کی سینیٹ کی صرف دو سال۔ فیڈرل جج عمر بھر کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں ریاستوں کے جج مختصر مدت کے لئے۔ فیڈرل حکومت کے افسروں اور ججوں کا تقرر پریسیڈنٹ کرتا ہے لیکن ریاستوں میں ان کا انتخاب رعایا خود کرتی ہے۔

ہم بھی اگر ہندوستان میں اپنی دستوری حکومت کو مضبوط بنیاد پر قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں عوام کی سیاسی تعلیم اور جمہوری تنظیم کے لئے مقامی اداروں کی ترقی اور اصلاح کی سب سے زیادہ کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔

غریبی

(محمد عاقل صاحب)

جارج برنارڈ شا نے اپنے ایک ڈرامے میں جس کا نام میجر باربرا ہے غریبی کی ایک نہایت بھیانک تصویر کھینچی ہے۔ اس کے ڈرامے کا ایک کیرکٹر سوال کرتا ہے "کیا غریبی ایک جرم ہے؟" دوسرا کیرکٹر جواب دیتا ہے "سنگین ترین جرم! تمام دوسرے جرم اس کے مقابلہ میں نیکیاں ہیں۔ تمام دوسری بے عزتیاں اس کے مقابلے میں عروج اور کامرانی کے اعلیٰ مراتب ہیں۔ غریبی، بڑے شہروں پر ایک بلا کی طرح چھا جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے ہیبت ناک وبائیں پھیلتی ہیں۔ جو لوگ اس کو دیکھ، سن یا سونگھ سکتے ہیں ان کی روحیں فوراً مردہ ہو جاتی ہیں۔ جسے ہم جرم کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ وہ صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ کہیں قتل ہو گیا کہیں چوری۔ کہیں دھول دھپا ہو گیا کہیں گالی گلوج۔ ان سب کا کوئی دیر تک باقی رہنے والا اثر نہیں ہوتا۔ یہ زندگی کی معمولی بیماریاں یا حادثے ہیں۔ لیکن لاکھوں غریب، گندے آدھے بھوکے ننگے جو لوگ ہوتے ہیں وہ ہمارے جسم اور روح کو برابر زہر دیتے رہتے ہیں۔ وہ سماج کی تمام خوشیوں کو مٹا ڈالتے ہیں۔ وہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم اپنی آزادیوں کو قربان کر دیں اور ایسی غیر فطری سختیوں اور بے رحمیوں کا انتظام کریں جن کی وجہ سے غریب لوگ ہمارے خلاف کبھی سر نہ ابھار سکیں اور اپنے ساتھ ہمیں بھی تباہی اور ذلت کے گہرے گڑھے میں نہ گھسیٹ لیں جرائم سے صرف بے وقوف ڈرتے ہیں۔ ہم سب کو جس چیز کا خوف ہے وہ غریبی ہے۔"

اسی ڈرامے میں ایک اور جگہ وہ لکھتا ہے "جب ہم ایک شخص کو کنگال دیکھتے ہیں اور دل میں سوچتے ہیں کہ کنگال ہے تو ہوا کرے ہمیں اس سے کیا، تو ہم ان نتیجوں کی طرف دھیان نہیں دیتے جو ہماری اس بے توجہی اور لاپرواہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہم جب ایک شخص کو کنگال رہنے دیتے ہیں تو گویا ہم اسے اجازت دیتے ہیں کہ وہ کمزور، جاہل، بیماریوں کا سوتا، بدصورتی اور گندگی کی ایک ڈراؤنی مورت بن جائے۔ ہم اسے اس بات کا پروانہ دیتے ہیں کہ وہ کمزور ہڈی والے بچوں کی نسل کو بڑھائے۔ وہ بازار میں اپنی محنت

کا معاوضہ کم طلب کرے اور اپنے ساتھیوں کو بھی اپنی طرح کم اجرت پر کام کرنے کے لئے مجبور کرے۔ وہ ہمارے صاف اور ستھرے شہروں کو اپنے گندے اور کم حیثیت گھروندوں کے ذریعہ زہر اور جراثیم کا خزانہ بنا سکے ہم اس کی لڑکیوں کو اس بات کا اختیار دیتے ہیں کہ وہ ہمارے نوجوانوں کو گندی بیماریوں میں مبتلا کر سکیں اور اس کے لڑکے اپنے باپ کی غریبی کا بدلہ اس طرح لیں کہ قوم کی مردانہ خصوصیات کو تپ دق کے مریضوں جیسی شکلیں بنا کر، بزدلی، بدنصیبی، منافقت، سیاسی نااہلیت اور ظلم اور خوراک کی کمی کے اور جس قدر بھی دوسرے نتائج ہو سکتے ہیں ان سب میں تبدیل کر دیں۔"

برنارڈ شا کے ڈرامے کے ان دو اقتباسوں سے غریبی کی خرابیوں کا ایک اندازہ کیا جا سکتا ہے غریبی دنیا میں ہمیشہ سے رہی ہے لیکن پرانے زمانے میں غریبوں کے مسئلہ کو وہ اہمیت حاصل نہیں تھی جو آج کل اسے حاصل ہے۔ موجودہ زمانے میں سائنس کی نئی نئی ایجادوں، علم کی بے شمار ترقیوں اور جمہوری اصولوں کے عام رواج نے انسانوں کی امنگوں اور حوصلوں کو بہت بڑھا دیا ہے۔ جو چیزیں قدیم زمانے میں نادر اور کمیاب سمجھی جاتی تھیں اب ان کا شمار زندگی کی معمولی ضرورتوں میں ہونے لگا ہے۔ دولت کے پیدا کرنے کے امکانات کو خوب ترقی ہو گئی ہے۔ اب پرانی محرومیاں اور مجبوریاں باقی نہیں رہی ہیں بلکہ اب تو شکایت اس بات کی کی جاتی ہے کہ دولت کی پیداوار ضرورت سے زیادہ ہو گئی ہے۔ گیہوں گوشت، لوہا، کوئلہ، تانبا، ربر اور معدنی تیل کے پیدا کرنے والے یہی رونا روتے رہتے ہیں کہ انھیں اپنے مال کے لئے خریدار نہیں ملتے۔ یہی حال موٹر کاروں، گراموفونوں، سینے کی مشینوں، ریڈیو وغیرہ بنانے والوں کا ہے۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ مال بہت زیادہ بن گیا ہے۔ غرض ایک طرف تو کھلیان بھرے ہوئے نظر آتے ہیں، گوداموں اور دوکانوں میں مال کے انبار لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ پکے ہوئے کھیتوں میں خریداروں کے نہ ملنے کی وجہ سے ہل چلا دئے جاتے ہیں، چائے کی پیٹیوں کو سمندر میں ڈبو دیا جاتا ہے، گوشت کا کھاد بنا دیا جاتا ہے اور دوسری طرف ان بدنصیبوں اور محروموں کا مجمع ہوتا ہے جو دولت کے اس تمام انبار کو دیکھتا ہے لیکن اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس مجمع میں کچھ اپاہج، معذور، نااہل اور نالائق لوگ بھی شامل ہوتے ہیں لیکن ان میں زیادہ تر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو تندرست، توانا، جفاکش، اوسط درجہ کی ذہانت، مہارت اور کیرکٹر رکھنے

والے ہوتے ہیں۔ انھیں اگر کام کا موقع دیا جاتا تو یہ ہرگز کسی دوسرے شخص کے مقابلہ میں بیٹھے نہ رہتے اور اپنی محنت سے دولت کی مقدار میں ضرور اضافہ کرتے لیکن یہ لوگ موجودہ معاشی اور معاشرتی نظام میں بے کار رہنے یا کم اجرت پر کام کرنے یا حکومت سے بے روزگاری کی امداد یا اسی قسم کی کوئی اور مدد لے کر زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ ان کی آمدنی بہت کم ہوتی ہے اور یہ لوگ باوجود اس کے کہ انھیں چیزوں کی ضرورت یا خواہش بہت زیادہ ہوتی ہے پھر بھی ان سے محروم رہتے ہیں۔ ایک طرف دولت کی مقدار کو بڑھانے کے لئے نہایت کثیر امکانات کا موجود ہونا اور مال بنانے والوں کا یہ شکایت کرنا کہ مال ضرورت سے زیادہ پیدا ہوگیا ہے اور دوسری طرف غریبی ضرورت اور محرومی ـــ یہ بیسویں صدی کا وہ پیچیدہ معمہ ہے جس کا فوری اور قابل اطمینان حل سوچنا ہماری نسل کے لئے نہایت ضروری ہوگیا ہے۔

آبادی کا ایک کثیر حصہ اس مال سے جو موجود ہے کیوں فائدہ نہیں اٹھا سکتا اس سوال کا نہایت سہل جواب جس پر سب متفق ہو سکتے ہیں تو یہ ہے کہ اس کے پاس خریدنے کی قوت نہیں ہوتی۔ وہ جب بازار میں جاتا ہے تو اس کی جیب خالی ہوتی ہے۔ لیکن اس کی جیب کیوں خالی ہوتی ہے اس کے پاس خریدنے کی قوت کیوں نہیں ہوتی اس کے جواب بہت سے ہو سکتے ہیں اور اس میں رائے کا اختلاف بھی خوب پیدا ہو سکتا ہے۔ قوت خرید کی کمی یورپ کے ترقی یافتہ صنعتی ملکوں میں بھی پائی جاتی ہے اور ایشیا کے زراعتی اور پس ماندہ ملکوں میں بھی۔ یہ آزاد اور خود مختار ملکوں میں بھی ملتی ہے اور محکوم نو آبادیوں میں بھی قوت خرید کی کمی کا جو لوگ شکار ہوتے ہیں ان میں کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو زندگی کی کشمکش میں کامیاب ہونے کے لئے پیدائشی طور پر ناموزوں ہوتے ہیں یعنی ایسے لوگ جن کے جسم یا دماغ پیدائشی طور پر کمزور یا ناقص ہوتے ہیں یا کسی اور وجہ سے یہ لوگ اپاہج معذور اور نااہل بن جاتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد مجموعی طور پر بہت زیادہ نہیں ہوتی۔ زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو نسلی، پیدائشی یا طبعی طور پر تو نااہل نہیں ہوتے بلکہ اپنے حالات اور ماحول کی خرابی کی وجہ سے اپنی قوت خرید کو بڑھانے میں ناکامیاب رہتے ہیں۔

پھر حالات کی خرابی بھی مختلف قسم کی ہو سکتی ہے۔ مثلاً ہندوستان کی مثال کو اگر سامنے رکھا جائے

تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہاں کی غریبی ساری دنیا سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ اس ملک میں دولت کے قدرتی وسائل بہت کثیر تعداد میں موجود ہیں لیکن پھر بھی لوگ غریب ہیں اور ان کی قوت خرید کی کمی کا رونا تمام دنیا روتی رہتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ملک کے لوگوں کے لئے کیوں یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی قوت خرید کو بڑھا کر دولت کے اس انبار سے فائدہ اٹھائیں جسے خریداروں کے نہ ملنے کی وجہ سے ضائع کر دیا جاتا ہے۔ اس سوال کے جواب میں لوگ بہت سی باتوں کو پیش کرتے ہیں کوئی کہتا ہے یہاں مذہبیت کا بڑا زور ہے۔ یہاں کے لوگوں کو دنیا کی چیزوں کا بالکل شوق نہیں ہے۔ یہ تو سب اللہ والے اور مہاتما ہیں۔ یہ تو دوسرے جنم یا عاقبت کی خوشیوں کی فکر میں رہتے ہیں اور اس دنیا کی زندگی کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ اس لئے دولت پیدا کرنا ہی نہیں چاہتے کوئی کہتا ہے کہ اس ملک کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔ اتنی بڑی آبادی کا پالنا ہندوستان کے لئے ناممکن ہے۔ جو کچھ پیدا ہوتا ہے اسے آدھا پیٹ بھر کر سب لوگ کھا لیتے ہیں۔ کسی اور چیز کے خریدنے کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں بچتا۔ کوئی کہتا ہے یہاں کے کسانوں کو ملک کے زیادہ تر حصہ میں پانچ مہینہ سے نو مہینہ تک بے کار رہنا پڑتا ہے۔ کوئی کہتا ہے یہاں کی آدھی آبادی یعنی عورتیں کام ہی نہیں کرتیں۔ کوئی نو عمری کی شادی ملیریا، مقدمہ بازی کے شوق وغیرہ کو ہندوستان کی غریبی کا سبب قرار دیتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ لوگ اپنی آمدنی کو عقلمندی کے ساتھ صرف کرنا نہیں جانتے۔ انھیں مناسب غذا کا علم نہیں ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ملک کی دولت جو باہر جاتی ہے اس کا پورا معاوضہ مادی شکل میں ملک کو نہیں ملتا۔ یہ کام چونکہ عرصہ سے جاری ہے اس لئے ملک غریب ہوتا جا رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے حکومت کی طرف سے صنعتوں کو ترقی دینے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ غرض یہ مختلف اسباب ہندوستان کی غریبی کے بیان کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے سب میں تھوڑی بہت سچائی ضرور ہے۔ لیکن معاشی زندگی نے موجودہ زمانہ میں جو شکل اختیار کر لی ہے اس کو نظر کے سامنے رکھتے ہوئے ہندوستان کے غریبی کے مسئلہ کو زیادہ وسیع نقطہ نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ سرمایہ داری کی ترقی نے تمام ملکوں کی معاشی زندگی کو ایک ڈوری میں پرو دیا ہے۔ اب کسی ایک ملک کی غریبی کے مسئلہ پر سارے دنیا سے الگ تھلگ سمجھ کر غور نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً جو لوگ ہندوستان کی زیادتیٔ آبادی کی شکایت کرتے ہیں انھیں جاننا چاہیئے کہ ہندوستان اب صرف اپنی زراعتی پیداوار پر زندگی گذارنے کے لئے مجبور

نہیں رہا ہے۔ کل دنیا کی پیداوار اس کا پیٹ بھرنے کے لئے موجود ہے۔ دنیا کی مجموعی پیداوار موجودہ زمانے میں اتنی بڑھ گئی ہے یا اسے نہایت آسانی کے ساتھ اتنا بڑھایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی آبادی کو بصورت مجموعی ضرورت سے زیادہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے۔ امریکہ، کناڈا، آسٹریلیا اور بہت سے دوسرے زرخیز علاقے ایسے ہیں جہاں کی آبادی ضرورت سے زیادہ نہیں ہے بلکہ ضرورت سے کم ہے۔ یورپ کے بہت سے ملکوں کی آبادی یا گھٹ رہی ہے یا ایک جگہ پر قائم ہے۔ دنیا کی منڈیاں ملکی نہیں رہی ہیں بلکہ عالمگیر ہو گئی ہیں اور ان منڈیوں میں غذا کی چیزوں کی قیمتیں بڑھ نہیں رہی ہیں بلکہ گھٹ رہی ہیں۔ اس لئے اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ہندوستان کی زراعتی پیداوار یہاں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے کافی نہیں ہے تو بھی اس سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ ہندوستان کی آبادی کے لئے غذا کا مہیا کرنا مشکل یا ناممکن ہے۔ مسئلہ صرف قوت خرید کے پیدا کرنے کا ہے۔

جب اس نقطۂ نگاہ سے ہندوستان کے کروڑوں غریبوں کے مسئلہ کو دیکھا جاتا ہے تو اس ملک کے غریبوں کا مسئلہ تمام دنیا کے غریبوں کے مسئلہ کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ جو بات دوسرے ملکوں کے غریبوں کی قوت خرید کے اضافہ میں رکاوٹ ڈالتی ہے وہی ہندوستان کی غریبی کو دور کرنے میں بھی حائل ہے۔ چاہے مشرق ہو چاہے مغرب، چاہے صنعتی حیثیت سے ترقی یافتہ ملک ہوں چاہے زراعت پیشہ پس ماندہ ملک — مسئلہ ہر جگہ یہی ہے کہ اگر دنیا سائنس کی ایجادوں، علم کی ترقیوں اور دولت کے اضافہ کے غیر محدود امکانات سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے تو اسے اپنی معاشی اور سماجی تنظیم میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرنا ہوں گی جو نئے حالات اور نئے مطالبوں کے مطابق ہوں۔ ہماری موجودہ سماجی اور معاشی تنظیم سائنس کی ترقیوں کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ سائنس اور سماجی تنظیم کا باہمی اختلاف اور معاشی تنظیم کا اندرونی تضاد روز بروز زیادہ پیچیدہ اور خطرناک شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ہماری سماجی تنظیم ہماری معاشی ترقی کو بالکل اسی طرح روکنا چاہتی ہے جیسے کوئی شخص ایک تندرست بچے کی قدرتی نشوونما کو ایک لوہے کا شکنجہ کس کر روکنے کی کوشش کرے۔

موجودہ معاشی اور سماجی تنظیم میں پیدائش دولت کا پورا انتظام آجروں اور ان کے ساہوکاروں کے فائدہ کے لئے چلایا جاتا ہے۔ اس میں قصداً اور ارادتاً عوام کی بہبودی کے مقصد کو نظر کے سامنے نہیں رکھا جاتا بلکہ

آجیروں اور سرمایہ داروں کے نفع کا خیال سب سے پہلے کیا جاتا ہے۔ مزدور کی اجرت یا اس کا روزگار سے لگا رہنا یا آبادی کی عام مرفہ الحالی اور بہبودی یہ چیزیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں جس وقت سرمایہ دار جن کے ہاتھ میں معاشی تنظیم کی نگرانی ہوتی ہے یہ دیکھتے ہیں کہ کسی کام میں ان کو نفع ملنے کا امکان باقی نہیں رہا ہے وہ فوراً اس کام کو بند کر دیتے ہیں۔ ان کو اس بات کی بالکل پروا نہیں ہوتی کہ ان کے اس فیصلہ کا اثر جماعت پر کیا ہوگا، کتنی پریشاں حالی، مصیبت اور تکلیف میں لوگ مبتلا ہو جائیں گے۔ انھیں تو صرف اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ ان کی حساب کی کتابوں میں مزدوروں کی اجرت، کچے مال کی قیمت اور دوسری لاگتوں کو منہا کرنے کے بعد نفع کی رقم باقی بچتی ہے یا نہیں اگر یہ نفع باقی نہیں بچتا ہے تو ان کے نزدیک پیدائش دولت کا مقصد حاصل نہیں ہوا۔ اگر قیمتوں کی کمی کی وجہ سے وہ اپنے نفع کو کم دیکھتے ہیں تو قیمتوں کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں اور چونکہ قیمت رسد اور طلب کی کمی اور بیشی کے ساتھ بڑھتی گھٹتی ہے اس لئے اپنی قیمتوں کے بڑھانے کے لئے انھیں اپنی اشیا کی رسد میں مصنوعی کمی پیدا کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اور پیداوار کے ضائع کرنے کی وہ صورتیں اختیار کی جاتی ہیں جن کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس ذاتی نفع کے لالچ میں یہ خود غرض لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ جو مزدور ان کے کارخانوں میں کام کرتے ہیں وہی چیزوں کے خریدار بھی ہوتے ہیں۔ اگر وہ ان کی اجرتوں کو گھٹاتے یا انھیں برطرف کرتے ہیں تو اپنے خریداروں کی قوت خرید کو کم کرتے اور اپنے مال کی بکری میں خود ہی دشواری پیدا کرتے ہیں۔ دولت کی جماعتی پیدائش اور اس پر انفرادی قبضہ زیادہ دنوں تک ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ جماعتی پیدائش کے لئے جماعتی تصرف ضروری ہے اور جماعت کے مفہوم میں کسی ایک طبقہ یا ملک کی آبادی شامل نہیں ہے بلکہ کل دنیا کی آبادی پر یہ بات صادق آتی ہے۔ دولت کو بڑے پیمانہ پر پیدا کرنے کا کام جب شروع کر دیا جاتا ہے تو پھر گاہکوں کی تلاش صرف ایک ملک تک محدود نہیں رکھی جاتی بلکہ ساری دنیا کی آبادی کو اس کے حلقہ میں شامل کرنے کا حوصلہ کیا جاتا ہے لیکن اس میں کامیابی اسی صورت میں ممکن ہے جب سب ملکوں کے لوگوں کے لئے روزگار مہیا کرکے ان کی قوت خرید میں اضافہ کیا جائے۔ پوری دنیا کی خوش حالی ایک دوسرے کے ساتھ قریبی طور پر وابستہ ہو گئی ہے۔ اب یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک طبقہ یا ملک تو خوش حال رہے اور دوسرے پہلے کی طرح غریب کے غریب رہیں۔ سب کو مل کر کام کرنا اور سب کو ایک ساتھ گرنا یا ابھرنا ہے۔ پیدائش

دولت کی تنظیم کے کام کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے خود غرض لوگوں کے ہاتھ سے نکالا جائے اور ان لوگوں کے ہاتھ میں دیا جائے جو ذاتی نفع کے لئے نہیں بلکہ خدمت کے جذبہ کے ماتحت کام کریں اور ان کا مقصد چند افراد کی مرفہ الحالی اور بہبودی نہ ہو بلکہ ان کا نصب العین کل جماعت انسانی کی بہبودی ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ لوگ خدمت کے جذبہ کے ماتحت اتنا ہی سخت اور مسلسل کام ایک عرصہ تک خلوص کے ساتھ جاری رکھ سکیں جتنا وہ نفع ذاتی کے لالچ کے ماتحت جاری رکھتے ہیں؟ کیا ان میں وہ نظم، ڈسپلن اور مستعدی پیدا کی جا سکتی ہے جو بڑے پیمانہ پر کام چلانے کے لئے ضروری ہے؟ یہ انسانی سیرت اور نفسیات کے پوشیدہ امکانات کا سوال ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں اگرچہ ان کی تعداد ابھی بہت زیادہ نہیں ہے جو بے غرض خدمت اور ایثار و قربانی کی زندگی کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ عمر بھر جاری رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد کو تعلیم و تربیت اور ماحول کو پورے طور پر بدل دینے سے کس حد تک بڑھایا جا سکتا ہے یہ تجربہ سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔

بے روزگاری

(محمد عاقل صاحب)

بے روزگاری کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں یہ جاننا چاہیئے کہ کن لوگوں کا شمار بے روزگاروں میں کیا جاتا ہے ہندوستان کے نوجوانوں کو یونیورسٹی کی ڈگریاں لینے کے بعد چونکہ اب یقینی طور پر سرکاری نوکریاں نہیں ملتیں اور کسی دوسرے پیشہ سے لگنے کے لئے نہ ان کی تربیت ہوتی ہے اور نہ ان کے پاس اس کے وسائل ہوتے ہیں اس لئے اس ملک میں بے روزگاری کا مطلب عام طور پر تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے روزگاری لیا جاتا ہے۔ یا پھر یہ لفظ کسانوں کی بے کاری کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں سال پانچ مہینہ سے نو مہینہ تک کاشتکاروں کو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بے کار بیٹھا رہنا پڑتا ہے۔ اس زمانہ میں اگر وہ کسی معقول کام سے لگ سکیں تو ان کی آمدنی بڑھ سکتی ہے۔ لیکن چونکہ ان کے پاس کوئی کام کرنے کے لئے نہیں ہوتا اس لئے ان کا شمار بھی بے روزگاروں میں کیا جاتا ہے بے روزگاری کی اس صورت کی طرف ہندوستان کے رہنماؤں نے خاص طور پر توجہ کرنا شروع کردی ہے اور دیہی اور گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے کی تحریکیں چلائی جارہی ہیں۔

لیکن بے روزگاری کے جس مسئلہ کا دنیا میں چرچا ہے اور جو بڑے بڑے عالموں کو چکر میں ڈالے ہوئے ہے اس کا تعلق تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے روزگاری یا کاشتکاروں کی چند مہینوں کی بے روزگاری سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق صنعتی مزدوروں کی بے روزگاری سے ہے۔

آیئے اس سلسلہ میں لگے ہاتھ یہ بھی دیکھ لیں کہ آدمی روزگار سے کیوں لگنا چاہتا ہے۔ قدرت نے دنیا کا کارخانہ کچھ اس وضع کا بنایا ہے کہ محنت کئے بنا آدمی کو اس کی ضرورت کی چیزیں میسر نہیں آتیں۔ روزگار (یعنی محنت مزدوری کرنے کا وسیلہ یا موقع) آدمی صرف اس لئے ڈھونڈتا ہے کہ اسے آمدنی حاصل ہو اور وہ چین اور آرام سے زندگی بسر کرسکے۔ کھانے کو مناسب غذا ملے، رہنے کو مکان ملے، پہننے کو ایسا کپڑا ملے جو

جسم کو ڈھانپ سکے۔ سردی گرمی سے بچا سکے اور صفائی اور سلیقہ کے جس معیار کا اس کے طبقہ میں چلن ہے اُسے پورا کر سکے اور اسی طرح کی اور دوسری آرام اور راحت کی چیزیں اپنے لئے حاصل کر سکے۔ کچھ لوگ دنیا میں ایسے بھی ہیں جو خود محنت نہیں کرتے اور دوسروں سے محنت کرا کے آمدنی حاصل کرتے ہیں۔ انھیں ہم یہاں بحث میں لانا نہیں چاہتے۔ انھیں اگر چھوڑ دیا جائے تو پھر ہر ملک میں آبادی کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی رہے گی جسے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے محنت اور روزگار کی تلاش کرنا پڑتی ہے۔

اب چونکہ آدمی کا پیٹ ہر روز غذا مانگتا ہے اور اس کی ضرورتیں اسے روزانہ ستاتی رہتی ہیں۔ اس لئے ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے روزگار کو بھی مستقل ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اگر روزگار مستقل نہ ہوا — ایک دن تو محنت مزدوری مل گئی اور دوسرے دن کام نہ ملا — تو ایک دن تو آدمی کی ضرورتیں پوری ہو جائیں گی لیکن دوسرے دن فاقہ کی نوبت آجائے گی۔ اور اگر کہیں یہ بےکاری کئی دن تک جاری رہی پھر تو آدمی کا جینا مشکل ہو جائے گا۔

دنیا کے اکثر ملکوں کی حکومتیں رعایا کے لئے روزگار فراہم کرنا اپنے فرائض میں داخل نہیں سمجھتیں اس لئے ان ملکوں میں چند سرکاری اور غیر سرکاری مستقل ملازموں کو چھوڑ کر محنت کرنے والی بقیہ آبادی کے لئے روزگار مستقل اور یقینی نہیں ہوتا۔ لوگ عمر بھر کے لئے ملازم نہیں رکھے جاتے بلکہ صرف اس وقت تک کے لئے ملازم رکھے جاتے ہیں۔ جب تک ان کی محنت سے کارخانہ کے مالک کو نفع ملتا رہتا ہے۔ جس دن یا جس لمحہ کارخانہ کے مالک کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مزدور کے رکھنے میں اس کا کوئی نفع نہیں ہے وہ اسی وقت اس کو برطرف کر دیتا ہے۔ اس کے بعد مزدور کہاں جائے۔ کیا کرے۔ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ کس طرح پالے کارخانہ کے مالک کو اس سے کچھ سروکار نہیں رہتا۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس خرابی کا کوئی علاج ممکن نہیں ہے؟ کیا مزدوروں کے لئے روزگار کو یقینی اور مستقل نہیں بنایا جا سکتا؟ کیا انھیں بھی دوسرے سرکاری ملازموں کی طرح مستقل طور پر ملازم نہیں رکھا جا سکتا تاکہ یہ سکون اور اطمینان کے ساتھ کام کرتے رہیں اور کام کے معاوضہ سے اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کریں؟ کیا ہر مزدور کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ سرکار سے روزگار کا مطالبہ کرے اور جب اس کے لئے روزگار مہیا نہ ہو سکے تو

حکومت اس کی کفالت کی ذمہ دار بن جائے؟

ان سوالوں کا جواب دینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ موجودہ نظام میں مزدوروں کا روزگار کیوں یقینی نہیں ہوتا۔ اس کے جواب میں موجودہ صنعتی نظام کی تین خرابیوں کو پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) اس کی پہلی خرابی تو یہ ہے کہ مختلف پیشوں کے ماہروں میں پورا توازن اور اشتراک عمل پیدا نہیں کیا جا سکتا

(۲) اس کی دوسری خرابی یہ ہے کہ آئندہ کی مانگ کا ٹھیک اندازہ نہیں کیا جا سکتا

(۳) اس کی تیسری خرابی یہ ہے کہ اس نظام میں روزگار کے چڑھاؤ اور اُتار کا ایک مستقل چکر برابر چلتا رہتا ہے

سب سے پہلے پہلی خرابی کو لیجئے یعنی مختلف تجارتوں کے ماہروں میں توازن اور اشتراک عمل نہیں پایا جانا۔ صنعتوں کی نئی تنظیم کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اس میں تقسیم عمل کو خوب ترقی ہوگئی ہے ایک مال کو ایک تنہا آدمی تیار نہیں کرتا بلکہ ہزاروں ماہر مل کر اسے تیار کرتے ہیں۔ اور ہر ماہر اپنی اپنی جگہ پر اس مال کے صرف ایک حقیر حصہ کو تیار کرتا ہے اور تیار کر کے اگلے ماہر کے سپرد کر دیتا ہے جو اپنے کام کا حصہ پورا کر کے اسے پھر آگے بڑھا دیتا ہے۔ ان کاموں میں کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جو ایک ہی کارخانہ کے مالک کی نگرانی اور انتظام میں کئے جاتے ہیں۔ ان میں تو توازن اور اشتراک عمل پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جو مختلف مالک اپنے اپنے کارخانوں میں کراتے ہیں اور اپنی بنائی چیز کو مصنوعہ مال کی شکل میں بازار میں فروخت کرتے ہیں۔ ایسے کاموں میں باہمی توازن قائم نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً سوتی کپڑے کو لیجئے کپاس کے پیدا کرنے والے، کپاس کو اوٹنے اور روئی کی گانٹھیں بنانے والے، روئی کو گودام میں اکٹھا کرنے والے اسے ریل اور جہاز پر لاد کر دوسرے علاقوں میں بھیجنے والے اس کا سوت کاتنے والے اس کو بننے اور رنگنے والے کارخانے بالکل علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اور وہ اپنے جداگانہ مالکوں کی نگرانی میں مال تیار کراتے اور منڈی میں پہنچاتے رہتے ہیں۔ انہیں سوتی کپڑے کے آخری خریداروں یا اپنے ذاتی مال کے خریداروں کی مانگ اور اپنے حریفوں کی پیداوار کا کوئی پختہ علم نہیں ہوتا۔ اس امید پر کہ ہمارا مال تو بک ہی جائے گا وہ ایک طرح سے جوا کھیلتے رہتے ہیں اور چونکہ ہر شخص کو کارخانہ کھولنے کی آزادی ہے اس لئے اکثر ایسا ہوتا

ہے کہ کبھی کپاس کے کھیت زیادہ بو دیے جاتے ہیں، کبھی روئی اوٹنے اور گانٹھ بنانے کے کارخانے زیادہ بن جاتے ہیں، کبھی روئی کے گودام زیادہ تعمیر کر دیے جاتے ہیں، کبھی روئی کے تاجروں کی دکانیں زیادہ کھل جاتی ہیں، کبھی ریل کی واگنیں اور جہاز زیادہ بن جاتے ہیں، کبھی روئی کے کاتنے والے کارخانے زیادہ ہو جاتے ہیں کبھی روئی کو بننے والے۔ غرضیکہ جب یہ تناسب بگڑتا ہے تو بہت سے کارخانے یا تو بند کر دیے جاتے ہیں یا انہیں اپنے کام کو بہت گھٹانا پڑتا ہے اور دونوں صورتوں میں آفت مزدوروں پر آتی ہے اور انہیں بلا کسی ذاتی خطا اور قصور کے برطرف کر دیا جاتا ہے۔ پھر چونکہ تقسیم عمل کی ترقی کی وجہ سے مزدوروں کو کام کے صرف ایک مخصوص حصہ میں مہارت پیدا ہو جاتی ہے اس لئے وہ پرانے زمانے کی طرح ذاتی طور پر لوگوں کی ضرورت کی چیزیں بنا کر بازار میں فروخت نہیں کر سکتے نہ دوسرے پیشہ کے کاموں میں آسانی سے لگ سکتے ہیں، مجبوراً ان میں سے اکثر کو تھوڑے یا زیادہ عرصہ کے لئے بے روزگار ہو جانا پڑتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک دوسرا سبب پورے اشتراک عمل کے نہ ہونے کا یہ بھی ہوتا ہے کہ صنعت کے طریقے بھی بہت جلد جلد بدلتے رہتے ہیں۔ نئی مشینیں، نئی اشیاء خام، نئی منڈیاں، تنظیم کے نئے نئے طریقے برابر دریافت ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن مزدوروں میں چونکہ پرانے قسم کی مہارت پائی جاتی ہے اس لئے وہ نئے کام کے لئے اگر بالکل بے کار نہیں تو بہت کم مفید رہ جاتے ہیں اور انہیں نئے طریقوں سے واقفیت پیدا کرنے میں کچھ وقت صرف کرنا پڑتا ہے اور اس عرصہ کے لئے بے روزگاری کا شکار بننا پڑتا ہے۔

یہ تو مختلف تجارتوں کے ماہروں میں مناسب اشتراک عمل نہ ہونے کی وجہ سے جو بے روزگاری پیدا ہوتی ہے اس کی مثالیں ہوئیں۔ اب موجودہ نظام کی دوسری خرابی کو لیجئے یعنی اس نظام میں آئندہ کی مانگ کا ٹھیک اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

تقسیم عمل کے اس پیچیدہ نظام میں جس کا ذکر میں نے ابھی کیا، چیزیں خریداروں کی فرمائش پر پیدا نہیں کی جاتیں بلکہ خریداروں کی مانگ کے بارے میں پیش بینی سے کام لے کر چیزوں کو پیدا کیا جاتا ہے یعنی چیزیں پہلے بنائی جاتی ہیں اور ان کے خریدار بعد میں پیدا ہوتے ہیں۔ کارخانوں کے مالک ایسا کرنے کے لئے بالکل مجبور ہوتے ہیں۔ وہ کسی خاص آدمی کی فرمائش پوری کرنے کیلئے چیزیں نہیں بناتے بلکہ وہ لاکھوں خریداروں

کے لئے ایک ہی قسم کی چیزیں تیار کرتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک کارخانہ کے مالک نے اس بات کا پیشگی اندازہ کیا کہ فلاں قسم کے سوٹ کا کپڑا اس کے گاہکوں میں خوب بک سکتا ہے تو اسے سوت کے اس کپڑے کو بڑے پیمانہ پر تیار کرنے کے لئے پہلے اپنی فیکٹری کے لئے ایک بڑی عمارت کھڑی کرنی ہوگی، کارخانے کے لئے مشین تیار کرانا ہوگی، کپڑے کے لئے اون یا روئی پیشگی فراہم کرنا ہوگی اور ہزاروں قسم کی اور دوسری چیزیں جن کی کپڑے کی تیاری میں ضرورت ہوتی ہے ان سب کو پہلے ہی سے فراہم کرنا پڑے گا تب کہیں جا کر یہ کپڑا تیار ہوگا۔ اب اگر اتفاق سے اس کا اندازہ غلط ہو یا جس وقت کام شروع کیا گیا تھا اس وقت کے حالات کے مطابق تو صحیح تھا لیکن اب کپڑے کی تیاری کے بعد ریشم کے ایک اور کپڑے کے بازار میں آجانے کی وجہ سے وہ اندازہ غلط ہو گیا تو اس کا مال گوداموں میں بھرا رہے گا اور بازار میں نہ بک سکے گا یا بکے گا تو لاگت سے کم دام پر فروخت ہوگا۔ جب مال بازار میں نہ بکے گا تو یا تو اسے کارخانہ بند کرنا پڑے گا یا اپنی پیداوار کو گھٹانا پڑے گا۔ دونوں صورتوں میں اسے اپنے مزدوروں کو برطرف کرنا پڑے گا اور بیچارے بغیر کسی خطا اور قصور کے بے روزگاری کا شکار ہو جائیں گے۔

موجودہ نظام صنعت کی جن دو خرابیوں کو اوپر بیان کیا گیا ان کی وجہ سے تو بے روزگاری صرف خاص خاص کارخانوں کے مزدوروں تک محدود رہتی ہے۔ لیکن تیسری خرابی یعنی کاروبار کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے بے روزگاری کا اثر بہت دور دور تک پھیل جاتا ہے۔ ہر دسویں برس یا اس کے آس پاس کے سالوں میں پلیگ، ہیضہ یا انفلوئنزا کی وباؤں کی طرح بے روزگاری کی وبا بھی پھیلتی ہے اور لاکھوں کروڑوں مزدور بغیر اپنے کسی ذاتی قصور کے خواہ مخواہ بے روزگار ہو جانے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ در اصل یہی بے روزگاری ہے جس کے اسباب اور علاج ڈھونڈنے سے بڑے بڑے عالم معذور نظر آتے ہیں اور جو اپنے نتیجوں کے لحاظ سے انسانی جماعت کا ایک نہایت مشکل مسئلہ بن گئی ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ روزگار کی ترقی کے زمانے میں تو کاروبار کی خوب گرم بازاری ہوتی ہے۔ مزدوروں کی خوب مانگ ہوتی ہے۔ کام بہت ہوتا ہے اور مزدور کم۔ ان کو طرح طرح کے لالچ دئے جاتے ہیں۔ ان کی اجرتیں بڑھائی جاتی ہیں۔ حوصلہ مندی اور امید کا دور دورہ ہوتا ہے۔ ہر طرف چہل پہل ہوتی ہے۔ روپیہ خرچ کرنے کے ہزاروں

نئے نئے طریقے نگاہ کے سامنے ہوتے ہیں۔ ادھار پر قسطوں پر چیزیں فروخت کی جاتی ہیں۔ نقد قیمت کی ادائگی کا کوئی مطالبہ نہیں کیا جاتا بلکہ ضرورت بے ضرورت ساہوکار اپنی طرف سے روپیہ ادھار دینے کے لئے ہمیشہ تیار نظر آتا ہے۔

لیکن یکبارگی عین اس وقت جب اس کا کوئی سان گمان بھی نہیں ہوتا آسمان سے غیبی گولہ گرتا ہے بنک فیل ہو جاتے ہیں۔ کارخانے بند ہو جاتے ہیں' مزدور برطرف کر دئے جاتے ہیں جو باقی رہتے ہیں ان کی اجرتوں میں تخفیف کی جاتی ہے' مزدوری کی تلاش میں جہاں کہیں جاؤ کورا جواب ملتا ہے کہیں سے قرض نہیں ملتا مجبوراً زندگی کے رہنے سہنے کے طریقوں کو بدلنا پڑتا ہے۔ گھر کا سامان فروخت کیا جاتا ہے۔ اپنا پیٹ کاٹ کر بچوں کا پیٹ بھرا جاتا ہے۔ خوراک لباس اور علاج کی کمی سے بیماری اور موت کی شرح بڑھتی ہے۔ بھیک مانگنا پڑتی ہے۔ بے شرم اور بے رحم بننا پڑتا ہے۔ عورتیں آوارگی کے پیشے اختیار کرتی ہیں' مرد چور اور ڈاکو بن جاتے ہیں ۔ ایمان داری کے ساتھ کام کرنے کی عادت چھوٹ جاتی ہے۔ ایسے زمانہ میں جو اولاد پیدا ہوتی یا والدین کے ساتھ رہتی ہے وہ بھی بدترین اخلاقی خرابیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ نیک دل لوگ مزدوروں کی انجمنیں اور حکومتیں بے روزگاروں کی امداد کرنے لگتی ہیں۔ ان کے لئے عارضی طور پر سرکاری تعمیر کے کام شروع کر کے روزگار کی صورت نکالی جاتی ہے انہیں وظیفے دئے جاتے ہیں اور دعا کی جاتی ہے کہ مصیبت کا یہ زمانہ کسی طرح جلد ختم ہو جائے۔

آہستہ آہستہ کساد بازاری ختم ہوتی ہے۔ کاروبار میں دوبارہ تیزی پیدا ہونے لگتی ہے۔ پھر وہی پرانی ہماہمی اور چہل پہل نظر آنے لگتی ہے اور کاروبار کے وہی پرانے طریقے پھر زندہ ہو جاتے ہیں اور یہ چکر اسی طرح چلتا رہتا ہے۔

لیکن بے روزگاری کا یہ دور کچھ خرابیوں کا ایسا ترکہ بھی چھوڑ جاتا ہے جن کی حیثیت مستقل ہوتی ہے اور جن کو لاعلاج سمجھنا چاہیئے۔ کچھ مزدور مناسب غذا اور آرام کے نہ ملنے سے ایسی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں مثلاً تپ دق وغیرہ جو ہمیشہ کے لئے ان کو کام کرنے سے مجبور کر دیتی ہیں کچھ مزدوروں کا دل کام کی طرف سے ہمیشہ کے لئے اچاٹ ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ مستقل طور پر آوارہ اور جرائم پیشہ بن جاتے ہیں۔ بچوں اور نوجوانوں پر خاص طور پر اس زمانہ کے اثرات بہت خراب پیدا ہوتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ صنعتی نظام کی ان خرابیوں کا کوئی علاج ممکن نہیں ہے؟

ہم نے صنعتی نظام کی جن خرابیوں کا ابھی ذکر کیا ہے ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیادہ تر انتظام کی خرابیاں ہیں۔ تقسیم عمل کی ترقی نے لوگوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر انحصار کریں اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہ بنائیں۔ بلکہ نجی طور پر کاروبار کو شروع کرنے کی جو آزادی لوگوں کو اس وقت ملی ہوئی ہے اس کی وجہ سے بہت بدانتظامی پیدا ہوتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سب لوگوں کو ایک مرکزی نگرانی کے ماتحت لایا جائے تاکہ ایک مناسب منصوبے اور پلین (PLAN) کے مطابق معاشی زندگی کے سب شعبوں کی تنظیم کی جا سکے۔ گاہکوں کی مانگ کا پہلے صحیح اندازہ کیا جائے اور مال اتنا ہی بنایا جائے جس کی کھپت ہو سکے۔ پھر مختلف کارخانوں کی متعلقہ پیداواروں میں بھی ایک باہمی تناسب پیدا کیا جائے تاکہ کسی چیز کے زیادہ یا کسی کے کم پیدا ہونے سے گڑبڑی پیدا نہ ہو۔ اسی طرح ملک کے زر اور اعتبار کے نظام کو بھی اس طرح چلانے کی ضرورت ہے کہ ایک مرتبہ کاروبار کی خوب چہل پہل اور دوسری مرتبہ کاروبار میں بالکل ابتری پیدا نہ ہو بلکہ کاروبار ہمیشہ ہم آہنگی کے ساتھ چلتا رہے اور اس میں مسلسل ترقی جاری رہے۔ (اس اقتباس سے [illegible] کیا گیا)

یہ سب کام ظاہر ہے ایک ایسا با اقتدار ادارہ ہی اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے جس کا حکم ماننے کے لئے سب لوگ مجبور ہوں یعنی یہ کام ریاست اور حکومت کے کرنے کا ہے۔ لیکن چونکہ حکومت کا انتظام چلانے والے لوگ بھی انسان ہی ہوتے ہیں اور انسان کے اندازے کا ہمیشہ صحیح ہونا اور اس کے منصوبوں کا پورا ہونا بالکل یقینی نہیں ہوتا اس لئے حکومت کے افسروں کے غلط تخمینوں کے اثرات سے رعایا کو محفوظ رکھنے کے لئے بے روزگاروں کی امداد کو حکومت کے فرائض میں لازمی طور پر داخل کر دیا جائے۔ آج کل جس طرح کارخانوں کے مالکوں کے غلط تخمینوں کا خمیازہ بے چارے مزدوروں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔ اس کا تدارک جس قدر جلد ممکن ہو سکے کرنا ضروری ہے۔

بنک

(محمد عاقل صاحب)

کاروبار شروع کرنے اور چلانے کے لئے تھوڑی بہت پونجی کی ضرورت قریب قریب ہر شخص کو ہوتی ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اپنا پورا کام اپنے روپیہ سے ہی چلا سکتے ہوں۔ اکثر صورتوں میں لوگوں کے پاس یا تو روپیہ بالکل نہیں ہوتا یا جتنا چاہیئے اتنا نہیں ہوتا۔ مثلاً کسان کو اپنا کام چلانے کے لئے ہل، بیل اور بیج کی ضرورت ہے۔ جب تک فصل تیار ہو اور بکے اس وقت تک کے لئے کھانے کو اناج، پہننے کو کپڑا اور دوسری ضرورتیں پوری کرنے کے لئے روپیہ چاہیئے۔ دکان دار کو کاروبار پھیلانے کے لئے سامان چاہیئے کارخانے کے لئے کچے مال مشین اور مکان کی ضرورت ہے۔ پھر مزدوروں کو مزدوری دینے، بنے ہوئے مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے اور ایسے ہی اور بہت سے دوسرے کاموں کے لئے روپیہ کی ضرورت رہتی ہے۔ روپیہ وقت پر مل جاتا ہے تو کام بن جاتا ہے۔ کاروبار میں اچھا نفع ہوتا ہے۔ نہیں تو نفع بہت کم ہوتا ہے یا گھاٹا رہتا ہے یا کاروبار بالکل بیٹھ جاتا ہے۔ روپیہ کی ضرورت اکثر صورتوں میں اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ لوگ اس وقت جتنا روپیہ لیتے ہیں آئندہ اس سے زیادہ ادا کرنے کا وعدہ کر لیتے ہیں اور کاروبار سے جو نفع ہونے والا ہوتا ہے اس کا ایک حصہ خوشی سے روپیہ قرض دینے والوں کو ادا کرنے کے لئے راضی ہو جاتے ہیں۔

دوسری طرف ایسے بھی بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو جتنا روپیہ کماتے ہیں وہ سب خرچ نہیں کر ڈالتے بلکہ اس میں سے کچھ بچا کر رکھ لیتے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو ایسے ہوتے ہیں جو اپنی پونجی بڑھانے کے لئے روپیہ نہیں بچاتے بلکہ فوراً خرچ کرنے کی جگہ آہستہ آہستہ عاقبت اندیشی کے ساتھ خرچ کرنے کے لئے روپیہ پس انداز کرتے ہیں۔ ان کا مقصد دوسروں کو قرض دینا نہیں ہوتا بلکہ خود قرض کی بلا اور مصیبت سے بچنا ہوتا ہے مگر کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کو قرض دینے کے لئے روپیہ بچا کر رکھتے ہیں اور اس سے جو نفع حاصل ہوتا ہے اس سے اپنی پونجی بڑھاتے ہیں پھر ان میں بھی کچھ لوگ تو چھوٹے پیمانے پر لین دین کا کام کرتے ہیں اور اپنے کسی دوسرے مستقل پیشہ کے ساتھ لین دین کے کام کو بھی ملا لیتے ہیں اور کچھ نسبتاً بڑے پیمانہ پر کام کرتے

ہیں اور لین دین کے کام کو ہی اپنا مستقل پیشہ بنا لیتے ہیں اور صرف لین دین ہی کی دکان کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان آخر الذکر لوگوں کو جن کا مستقل پیشہ لین دین ہوتا ہے بنکر اور ان کی دکان یا کوٹھی کو بنک کہتے ہیں۔

ہندوستان میں بنک کی ترقی کی تاریخ کا جب مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں نہایت پرانے زمانے میں بنک کا کاروبار شروع ہو گیا تھا۔ اس کی شہادت موجود ہے کہ قرض دینے کا کام ویدوں کے عہد میں یعنی اب سے تقریباً چار ہزار سال پہلے بھی کیا جاتا تھا لیکن اس زمانے میں کسی جماعت نے اس کام کو مستقل پیشہ کی حیثیت سے اختیار نہیں کیا تھا لیکن پانچویں صدی قبل مسیح سے ایسے پیشہ ور بنکروں کے بارے میں پکی شہادتیں ملنا شروع ہو جاتی ہیں جو روپیہ قرض دیتے تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ ہنڈیاں روانہ کرتے تھے۔ ان بنکروں کو سریٹھی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ بدھ عہد کے مشہور تجارتی مرکزوں یعنی چمپا، راجہ گریہا، سراوستی، کوسامبی اور آونتی میں بہت سے نہایت با اثر سریٹھی یعنی بنکر رہا کرتے تھے۔ یہ لوگ صرف بیوپاریوں کو ہی قرض نہیں دیتے تھے بلکہ ان تاجروں کو بھی جو سمندری سفر کر کے غیر ملکوں کو جاتے تھے یا جو جنگلوں میں قیمتی جڑی بوٹیوں کی تلاش میں نکلتے تھے روپیہ فراہم کرتے تھے۔ بادشاہوں کو بھی جنگ اور مالی پریشانی کے وقت یہ لوگ روپیہ قرض دیتے تھے۔ کوٹلیا کے ارتھ شاستر میں یہ بتلایا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کتنی شرح سود لی جا سکتی ہے۔ دھرم شاستروں میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے۔ ارتھ شاستر اور دھرم شاستروں کے بیان میں فرق صرف اتنا ہے کہ ارتھ شاستر میں کسی خاص ذات کے لئے ساہوکاری کے پیشہ کو مخصوص نہیں کیا گیا ہے لیکن دھرم شاستروں میں یہ پیشہ صرف دیشوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

چھٹی صدی عیسوی سے سولھویں صدی عیسوی تک بنک کے کاروبار کا کوئی مسلسل حال نہیں ملتا۔ البتہ بارھویں صدی عیسوی میں ہنڈیوں کے رواج کی شہادت ملتی ہے۔ اس کے بعد مسلمان مورخوں کی تصنیفوں مثلاً برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں ملتانیوں اور صرافوں کا نام آتا ہے جو نہ صرف تجارتی مرکزوں کو روپیہ فراہم کرتے تھے بلکہ ابتدائی مسلمان بادشاہوں کو روپیہ کی جو ضرورت ہوتی تھی اسے بھی پورا کرتے تھے۔ مغلوں کے عہد میں آئین اکبری اور ٹیورنیر کے سفر نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیسی

ساہوکار روپئے کے لین دین کا کام بہت بڑے پیمانہ پر کرتے تھے اوران کے کاروبار میں درشنی اور میعادی ہنڈیوں کو بہت اہمیت حاصل تھی حکومت کی طرف سے ان ساہوکاروں کو محصل، خزانچی اور صراف کے عہدوں پر مقرر کرنے کا رواج بھی بہت عام ہوگیا تھا اور قدرتی طور پران کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا تھا سترھویں اور اٹھارویں صدی کے جگت سیٹھوں کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اثر و اقتدار کے لحاظ سے دنیا کے بڑے سے بڑے بنک کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

لیکن انگریزی سلطنت کے قائم ہونے سے دیسی بنکروں کی اہمیت کم ہونا شروع ہوگئی اور مغربی طرز کے بنک ہندوستان میں قائم ہونے لگے لیکن ابھی تک ہندوستان میں مغربی طرز کے بنکوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ دیسی بنکوں، ساہوکاروں صرافوں اور مہاجنوں سے لین دین کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے اور دیہاتوں میں خصوصیت کے ساتھ ان کا ہی پورا عمل دخل رہتا ہے۔ اس کے علاوہ جو لوگ مغربی طرز کے بڑے بنکوں سے براہ راست لین دین نہیں کر سکتے ان کے لئے بھی دیسی ساہوکار دلال اور درمیانی آدمی کا کام انجام دیتے ہیں۔

مغربی طرز کے بنکوں اور دیسی بنکوں میں فرق یہ ہے کہ دیسی بنک کا کام چھوٹے پیمانہ پر ہوتا ہے اور مغربی بنک کا بڑے پیمانہ پر۔ دیسی بنک اور ساہوکار زیادہ تر اپنے ذاتی یا خاندانی سرمایہ سے کام کرتے ہیں اور مغربی طرز کے بنک مشترکہ سرمایہ سے اپنا کام چلاتے ہیں۔ دیسی بنک میں امانتیں رکھنے کا رواج یا تو بالکل نہیں ہوتا یا بہت کم ہوتا ہے اور جو امانتیں رکھی جاتی ہیں ان میں بھی ایسی امانتیں جن پر بیاج دیا جائے بہت کم ہوتی ہیں یعنی ان امانتوں کو کاروبار میں لگانے کی اجازت نہیں ہوتی بلکہ صرف حفاظت کے لئے رکھائی جاتی ہیں۔ مغربی طرز کے بنکوں میں امانتوں کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے اور لوگ امانتوں پر بیاج بھی چاہتے ہیں اس لئے یہاں امانتوں کو کاروبار میں بھی لگایا جا سکتا ہے۔

بنک کے بارے میں ان ابتدائی باتوں کو بیان کرنے کے بعد اب ہم دیکھیں گے کہ بنک کے کام کیا کیا ہوتے ہیں۔ مغربی طرز کے بنکوں کے دو نہایت اہم کام ہوتے ہیں۔ ان کا پہلا کام تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا کاروبار چلانے کے لئے لوگوں کا روپیہ امانت رکھتے ہیں اور ان کا دوسرا کام یہ ہوتا ہے کہ یہ کاروباری لوگوں کی مختلف ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے بنک سے روپیہ قرض دیتے ہیں۔ ان کے اور دوسرے بھی کام ہوتے ہیں لیکن یہ کام نہایت

اہم اور ضروری ہیں۔ بنکوں کو اپنے ان کاموں سے نفع اس طرح ملتا ہے کہ یہ کم شرح سود پر روپیہ امانت رکھتے ہیں اور زیادہ شرح سود پر کاروباری لوگوں کو قرض دیتے ہیں اب ہم ان دونوں کاموں کے بارے میں ذرا تفصیل کے ساتھ کچھ باتیں بیان کریں گے۔

جو لوگ اپنا روپیہ بنک میں امانتاً رکھنا چاہتے ہیں بنک والے ان کے لئے عموماً دو طرح کے حساب کھولتے ہیں ایک کو امانت کا حساب کہتے ہیں اور دوسرے کو چالو حساب کہتے ہیں امانت کے حساب سے روپیہ واپس لینے کے لئے امانت رکھنے والے کو ایک ہفتہ، ایک مہینہ تین مہینہ یا چھ مہینہ پہلے اطلاع دینی ہوتی ہے جس سے یہ فائدہ ہے کہ بنک امانت کا روپیہ اطمینان سے کاروبار میں لگائے رکھتا ہے اور اطلاع ملنے پر ضروری رقم کاروبار سے نکال کر واپسی کے واسطے مہیا کر لیتا ہے اور وقت آنے پر ادا کر دیتا ہے۔ امانت کے حساب کا روپیہ واپس لینے کے لئے چونکہ کچھ عرصہ قبل اطلاع دینی شرط ہے اس لئے اسے دوسرے لوگوں کو اطمینان سے قرض دیا جا سکتا ہے اور جو کچھ بہ طور سود بنک کو حاصل ہو اس کا ایک حصہ امانت کی رقم جمع کرنے والے کو بھی دیا جاتا ہے۔ اور اطلاع کی میعاد جس قدر وسیع ہو امانت کے حساب کا روپیہ زیادہ مستقل کاروبار میں لگ سکتا ہے اور امانت رکھنے والے کو زیادہ شرح سود دی جا سکتی ہے۔

دوسرا حساب چالو حساب کہلاتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جمع کیا ہوا روپیہ واپس لینے کے واسطے پہلے سے کوئی اطلاع دینی ضروری نہیں جس وقت جتنا چاہیں روپیہ واپس لے سکتے ہیں چونکہ چالو حساب کے لئے روپیہ کی کثیر مقدار کو ادائگی کے واسطے ہر وقت تیار رکھنا پڑتا ہے اور اس کا کاروبار میں لگانا خلاف احتیاط ہے اس لئے اس حساب میں جمع کرنے والوں کو بنک کوئی سود نہیں دیتے۔ مگر چالو کھاتے میں بھی لوگ بہ کثرت اس وجہ سے روپیہ جمع کرتے ہیں کہ اول تو اس کی حفاظت کی فکر سے آزاد ہو جاتے ہیں دوسرے بنک مفت خزانچی کا کام دیتا ہے اور روپیہ کے لین دین میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔

چالو کھاتے میں روپیہ جمع کرنے والوں کا تو اس سے فائدہ سمجھ میں آگیا لیکن بنک کو خود چالو حساب کھولنے سے کیا فائدہ ہے اس کا بیان کرنا باقی رہا۔ امانت کے حساب میں روپیہ تو بنک اس لالچ سے لیتے ہیں کہ اس سے کاروبار چلا کر سود پاتے ہیں جس کا ایک حصہ جمع کرنے والے کو دے کر باقی خود اڑاتے ہیں مگر

چالو حساب تو سوا بے کار پڑے رہنے یا واپس ہونے کے اور کسی کام آتا ہی نہیں اور نہ اس پہ بنک کو کچھ سود ملتا ہے پھر وہ خواہ مخواہ کی اس دردسری کو اپنے ذمہ کیوں لیتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چالو حساب کا سب روپیہ بے کار نہیں پڑا رہتا بلکہ صرف ایک حصہ بے کار رہتا ہے اور باقی کاروبار میں لگا دیا جاتا ہے۔ اگر یہ بات ٹھیک ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کاروبار میں روپیہ لگا دینے کے بعد چالو حساب رکھنے والوں کے مطالبوں کو بنک کس طرح پورا کرتا ہے اس کا اندازہ چیک کے اصول کو سمجھنے سے ہوگا۔ جو لوگ بنک کے چالو کھاتے میں روپیہ جمع کرتے ہیں انھیں روپیہ واپس لینے کے لئے بنک سے مطبوعہ فارموں کی کاپیاں ملتی ہیں جن کی باقاعدہ خانہ پری کر کے حسب ضرورت رقم واپس لی جاتی ہے۔ یہی فارم چیک کہلاتے ہیں۔

چیک روپیہ جمع کرنے والوں کی طرف سے بنک کے نام ایک حکم ہوتا ہے کہ ہمارے حساب میں سے فلاں رقم ہم کو یا فلاں شخص کو یا حامل ہذا کو ادا کر دو۔ بنک چیک لکھنے والے کی تحریر اور دستخط سے اس کی صحت کا اطمینان کرکے اور چیک کی پشت پر روپیہ لینے والے کے دستخط کرا کے لکھی ہوئی رقم ادا کرتا اور چیک بطور رسید رکھ لیتا ہے۔ اب روپیہ جمع کرنے والے کی سہولت کا اندازہ کیجئے اس کو صرف ایک چیکوں کی کتاب رکھنا پڑتی ہے اور جب جتنا روپیہ لینا یا کسی کو دینا منظور ہو فوراً بنک کے نام چیک لکھ دیتا ہے اور اس کا کام بن جاتا ہے۔

کسی ملک میں بنک کے رواج ہونے کے معنی یہ ہیں کہ لوگ اپنا پس انداز کیا ہوا روپیہ بنک میں رکھیں۔ جو لوگ خود کوئی کاروبار چلانا نہیں چاہتے وہ تو اپنا روپیہ بطور امانت جمع کرتے ہیں تاکہ سود بھی ملتا رہے مگر جو لوگ کاروبار میں مصروف ہیں وہ بھی اپنا روپیہ بنک کے چالو کھاتے میں رکھتے ہیں۔ بنک بلا معاوضہ ان کا خزانچی بن جاتا ہے اور چیک کے ذریعہ روپیہ کی ادائگی اور وصول یابی میں بے حد سہولت ہوتی ہے۔

اگر ایک سادہ مثال سامنے رکھی جائے تو بات جلد سمجھ میں آجائے گی۔ فرض کرو کسی شہر میں صرف ایک بنک ہے اور وہاں کے سب تاجر چالو کھاتے میں اپنی اپنی طرف سے کافی رقمیں جمع کر دیتے ہیں۔ اب ان میں سے کوئی اپنے پاس سے کسی کو نقد رقم ادا نہیں کرے گا بلکہ جب کوئی کسی کو روپیہ دینا چاہے گا اس کے لئے چیک لکھ دے گا جس کے پیش کرنے پر درج کی ہوئی رقم بنک ادا کر دے گا۔ لیکن بنک سے نقد

روپیہ لینے کی نوبت کم آئے گی۔ کیونکہ ان تاجروں میں سے جن کا بنک کے چالو کھاتہ میں حساب کھلا ہے جب کوئی کسی کے لئے چک لکھے گا تو لکھی ہوئی رقم ایک کے حساب سے دوسرے کے حساب میں منتقل کر دی جائے گی یعنی چک لکھنے والے کی طرف سے ادائگی اور چک پانے والے کی طرف سے وصول یابی بنک کے حساب وکتاب میں درج کر دی جائے گی اور یہ سب تحریری کارروائی ہوگی اور بنک کے نقد روپیہ پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے گا۔ صرف چک میں لکھی ہوئی رقم اس کے لکھنے والے کے حساب سے خارج کر کے اس کے پانے والے کے حساب میں درج ہو جائے گی۔ اس طرح پر یہ سب تاجر لاکھوں روپیہ کی تجارت کرتے رہیں گے مگر بہت کم روپیہ نقد استعمال کرنے کی نوبت آئے گی صرف چکوں کی رقمیں بنک کے رجسٹروں میں ادھر سے ادھر گھومتی رہیں گی۔

اب اگر بنک ایک کی جگہ دو یا زائد ہوں اور ان میں آپس میں یہ سمجھوتہ ہو جائے کہ ایک بنک دوسری بنک کے چکوں کو قبول کرتا رہے گا تو اول تو بہت سے چکوں کی رقم برابر ہونے کی وجہ سے حساب بیباق ہو جائے گا اور اگر کچھ زائد مطالبہ باقی رہیگا تو صرف اتنا ہی ایک دوسرے کو ادا کرنا پڑے گا۔

اس سے پتہ چلا کہ بنک امانت کے حساب کے کل روپیہ اور چالو کھاتہ کے ایک حصہ کو طرح طرح کے کاروبار میں لگا کر خوب سود وصول کر سکتے ہیں۔ لیکن انھیں اس بات کی عموماً احتیاط کرنا پڑتی ہے کہ چالو کھاتہ کا روپیہ ایسے کاروبار میں نہ لگایا جائے جس کے وصول ہونے میں دیر لگنے کا اندیشہ ہو ورنہ لوگوں کا اعتبار جاتا رہے گا اور بنک کا دیوالہ نکل جائے گا۔

اب تک تو ہم نے یہ بات بیان کی کہ اپنے کاروبار کو پھیلانے کے لئے بنک روپیہ کہاں سے حاصل کرتے ہیں اس سلسلہ میں ہم نے بتلایا کہ ایک تو امانت کے حساب میں بنک اپنے یہاں روپیہ جمع کرتے ہیں دوسرے چالو کھاتے میں جمع کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تیسرا کھاتہ سونگ بنک کے حساب کا بھی ہوتا ہے۔ چوتھے ایسی رقمیں بھی ہوتی ہیں جو بنک کی معرفت لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا چاہتے ہیں بنک کے پاس لوگوں کا زیور وغیرہ بھی حفاظت کیلئے رکھا جاتا ہے یا روپیہ کمپنی کے حصہ خریدنے اور دوسرے مختلف کاروبار میں لگانے کے لئے آتا رہتا ہے۔ بہرحال یہ تو اس کی آمدنی کے مختلف ذرایع ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا

چاہیئے کہ بنک کس قسم کے کاروبار میں اپنا روپیہ لگاتا ہے یعنی کن لوگوں کو کن کن شرطوں کے ساتھ روپیہ قرض دیتا ہے۔

جن کاموں میں بنک روپیہ لگا سکتے ہیں وہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ان مختلف کاموں کی وجہ سے بنکوں کے نام بھی الگ الگ ہو گئے ہیں۔ جو بنک زمین کو رہن رکھ کر بہت برسوں کے لئے روپیہ قرض دیتے ہیں وہ رہنی بنک کہلاتے ہیں۔ جو زراعت کی ضرورت کے لئے روپیہ دیتے ہیں اور یہ روپیہ بھی زیادہ مدت کے لئے دیا جاتا ہے وہ زراعتی بنک کہلاتے ہیں۔ جو نئے صنعتی کارخانوں کے قائم کرنے یا پرانے کارخانوں کے پھیلانے کے لئے روپیہ دیتے ہیں وہ صنعتی بنک کہلاتے ہیں اور جو تجارت کی آسانی یعنی مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے یا مال کو ایک وقت بچا کر دوسرے وقت بیچنے کے لئے روپیہ دیتے ہیں وہ تجارتی بنک کہلاتے ہیں ان کے علاوہ اور بھی بنک ہوتے ہیں جیسے رہنی بنک امداد باہمی کے بنک مبادلہ کے بنک، ہنڈیوں کے دلال، بٹہ گھر، قبولیت گھر وغیرہ۔

بہر حال ان بنکوں میں جن بنکوں کی بہت زیادہ کثرت ہے اور جو ایک حد تک ان میں سے بہت سے کاموں کو اپنے اصل کام کے ساتھ ملا بھی سکتے ہیں وہ تجارتی بنک ہیں۔ ان بنکوں میں اپنے گاہکوں کو قرض دینے کی عام صورت یہ ہوتی ہے کہ جو تاجر بھروسہ کے ہوتے ہیں ان کی ہنڈیاں بٹہ کے ساتھ خریدی جاتی ہیں۔ ہنڈی، بٹہ، سکارنا اور خریدنا یہ اصطلاحیں ایسی ہیں جنھیں لوگ عام طور پر جانتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کو سمجھانا ضروری تھا مگر گنجائش کی تنگی کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہے۔

اوپر کی تمام بحث سے یہ ظاہر ہوا کہ کس طرح بنک کے ذریعہ سے روپیہ بچانے والے اور روپیہ قرض لینے والے بنک کی معرفت ایک دوسرے سے نزدیک آجاتے ہیں اور فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن ہمارے دیس ہندوستان میں بنک بہت کم ہیں جبکہ امریکہ میں بنکوں کی تعداد ۱۹۲۱ء میں ۲۲ ہزار ۱۷ تھی ہندوستان میں صرف ۸۰۰ بنک پائے جاتے تھے۔ امریکہ کے بنک میں امانتیں فی کس ایک ہزار ۳۴۲ روپیہ کی تھیں لیکن ہندوستان میں یہ رقم صرف ساڑھے چھ روپیہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں صنعت و حرفت تجارت اور زراعت نے جتنی چاہیئے اتنی ترقی نہیں کی ہے جو کچھ میں نے اس وقت بیان کیا اسے بنک کے کام کی صرف ایک جھلک سمجھئے بہر حال پھر کبھی اس سے زیادہ بہتر اور مفصل طریقہ پر سنئے گا۔

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

ایک زمانہ تھا جب ہر ملک کی سیاست کا اپنا الگ چشمہ یا دریا تھا، جو کسی ایک طرف اپنے خاص زور سے بہا کرتا تھا اب دنیا نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ یہ سب دریا مل کر ایک بہت بڑا دھارا بن گئے ہیں جس کے کناروں پر سمجھئے ہم سب آباد ہیں۔ کبھی یہ دھارا خاموشی سے چلتا ہے کبھی کناروں کی ٹکر یا پانی کے زور سے اس میں بھنور پیدا ہو جاتے ہیں اور پھر دنیا کا وہی حال ہوتا ہے جو آدمی کے گلے میں پھندا پڑ جانے سے جب تک یہ بھنور رہتا ہے، لوگ بہت پریشان رہتے ہیں اس لئے کہ دریا کا بہاؤ بہت تیز ہو جاتا ہے اس کے کنارے کٹ کٹ کر گرنے لگتے ہیں اور پوری بستیوں کے بہ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

اس وقت سیاست کے دریا میں دو بھنور ہیں ایک تو ہسپانیہ اور دوسرا چین ان کے علاوہ ایک اور بھنور تیزی کے ساتھ بنتا دکھائی دیتا ہے، اور وہ پولینڈ کی آئینی آبادی کا معاملہ ہے بارسلونا کی فتح کے بعد سمجھئے کہ ایک گرہ تو کھل گئی یعنی ہسپانیہ کی خانہ جنگی اب ختم ہونے کو ہے اس سے لوگوں کو اطمینان ہونا چاہئے تھا لیکن لوگوں کو دیکھئے اور زیادہ گھبرائے ہوئے ہیں۔ شاید چین کی لڑائی ختم ہو تب بھی لوگ خوشی منانے کے بجائے اپنی اپنی خیر منائیں گے۔ یہ بات تو الٹی ہے مگر بے سبب نہیں

ہسپانیہ میں اب تک دو فریق ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے اور یورپ کی بعض قومیں اس لڑائی میں حصہ لے رہی تھیں بعض الگ تھیں۔ اب جنرل فرانکو جیت گئے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ساتھیوں کی جیت ہوئی۔ ایک معاملہ جو اب تک ہسپانیہ کا معاملہ تھا۔ یورپی سیاست کا بہت ہی نازک مسئلہ بن گیا ہے۔ جنرل فرانکو کی خواہش تھی کہ تھوڑا تھوڑا ملک فتح کریں اور کمیونزم کے فساد سے پاک کر کے پھر آگے بڑھیں اس طریقہ میں ایک خاص فائدہ یہ بھی تھا کہ جنگ کی حالت قائم رہتی جنرل فرانکو کے تمام اختیارات محفوظ رہتے

ان کی پارٹی ان کے قابو میں رہتی۔ اور توپوں کے سوا سب کا منھ بند رہتا۔ لیکن یہ طریقہ سنور مسولینی کی مصلحت کے خلاف تھا انھیں ہسپانیہ بھیجنے کے لئے سپاہی مل جاتے تھے اٹلی میں جو سامان جنگ تیار ہوتا رہتا ہے اس کی نکاسی کی ایک صورت بھی تھی مگر اس طرح کے لین دین کی ایک حد ہوتی ہے اور سنور مسولینی نے اب محسوس کیا کہ وہ بہت کچھ دے چکے ہیں اور دام وصول کرنے کا وقت آگیا ہے اس وجہ سے انھوں نے فرینکو پر زور ڈال کر بارسلونا فتح کر دیا اور اب یورپ والے اس فکر میں ہیں کہ دیکھئے وہ کیا مانگتے ہیں اور انھیں کیا دینا پڑتا ہے جنرل فرینکو تو خیر ان کے قرض دار ہیں اور انھیں کی مدد سے جیتے ہیں وہ جو کچھ دینے پہ تیار ہوں کم ہے لیکن ان کے پاس دینے کو کیا ہے پھر دوسری مشکل یہ ہے کہ وہ جو کچھ دیں گے اس پہ فرانس انگلستان کو اعتراض ہوگا یہی سوچ کر سنور مسولینی نے پہلے ہی سے ٹیونس کورسکا اور جبوتی کا لمبا چوڑا اور مرنجاں مرنج مطالبہ پیش کر دیا ہے فرینکو کی مدد کرنے سے سنور مسولینی کو ہرگز یہ حق نہیں ہو جاتا کہ فرانس کے پاس جو کچھ ہے اسے چھین لیں۔ لیکن اس وقت ان کی فوجیں ہسپانیہ میں ہیں فرینکو سے ان کی گاڑھی دوستی ہے میجارکے جزیرے پر ان کا قبضہ ہے اور ایک اندھا دھند مطالبہ کرتے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ کہیں سے کچھ مار ضرور لیں یہ کسی کو معلوم نہیں کہ اصل میں وہ کیا چاہتے ہیں اور اگر اس وقت کوئی برطانیہ اور فرانس کی وزارت خارجہ کو ٹھیک ٹھیک بتا دے کہ سینور مسولینی کیا ارادے رکھتے ہیں تو اسے اچھا خاصا انعام مل سکتا ہے۔ سینور مسولینی نے فرانس کو گھیر لیا ہے لیکن وہ فرانس سے اکیلے لڑ نہیں سکتے اور سب جانتے ہیں کہ وہ ہٹلر کے سہارے کے بغیر کسی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے اس لئے لوگوں کو ہر ہٹلر کی اس تقریر کا جو ۳۰ جنوری کو ہوئی بہت انتظار تھا۔ مگر وہ اپنی پچھلی کرامات بیان کر کے رہ گئے یہ نہیں بتایا کہ اب کون سے کرشمے دکھائیں گے اور وہ بتاتے بھی کیوں۔ ہماری آپ کی طرح وہ بھی جانتے ہیں کہ ایسی باتیں پہلے سے بتائی نہیں جاتیں۔ اصل میں ہر ہٹلر خود اس تاک میں ہیں کہ سنور مسولینی کچھ کر بیٹھیں تو اس سے مناسب فائدہ اٹھایا جائے اسی خیال سے وہ سنور مسولینی کو برابر شہ دے رہے ہیں جرمن اخبار اس وقت سے جبکہ مسولینی کو رسیکا ٹیونس اور جبوتی کا مطالبہ پیش ہوا ہے یہ کہ رہے ہیں کہ اٹلی کو اس کا حق ملنا چاہیئے۔ فرانس کے وزیر خارجہ موسیو بونے کے دریافت کرنے پر انھیں یہ بتایا گیا کہ جرمنی کا ان سے ابھی شروع دسمبر میں جو معاہدہ ہوا ہے اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ جرمنی ہر جھگڑے میں فرانس

کا ساتھ دے گا اور اس میں کوئی شک نہ ہونا چاہیئے کہ جرمنی کو ہمدردی اٹلی سے ہے اس جواب سے فرانسیوں کو مایوسی ضرور ہوئی لیکن اس کا بھی خیال رکھئے سینور مسولینی بھی پھنس گئے ہیں یعنی انھیں بہت جلد طے کرنا ہوگا کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور اسے جلد سے جلد وصول کرنے کی تدبیر کرنا ہوگی ان کی فوجیں اب چھ دو مہینے سے زیادہ ہسپانیہ میں رہیں تو ہسپانی خود بگڑ جائیں گے اور اگر یہ فوجیں ہٹائی گئیں تو پھر فرانس اور انگلستان پر کسی دھمکی کا اثر نہ ہوگا۔ انگلستان سے اس وقت ان کی جو دوستی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ کسی طرح معاملے کو ایسی صورت دی جائے کہ اٹلی اور فرانس دو مخالف فریق اور برطانیہ ان کے درمیان پنچ بن جائے اس کوشش میں ہر ہٹلر اپنی طرف سے یہ کر رہے ہیں کہ اٹلی کے مطالبوں کے ساتھ جرمن کی نوآبادیوں کا مطالبہ بھی پیش کر دیا ہے، اس امید میں کہ برطانیہ اپنی گردن سے پھندا نکال کر فرانس کے گلے میں ڈال دے گا یہ ہو گیا تو پھر کیا، کہتے ہیں بڑی موٹی اسامی پھنسے گی۔

لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔ فرانس میں موسیو بونے اور انگلستان میں سر سموئل ہور نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ جنگ کے لئے تیار ہیں، ایسے تیار کہ دنیا کی کوئی ریاست انھیں شکست نہیں دے سکتی۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی جتا دیا گیا ہے کہ لڑائی ہوئی تو برطانیہ اور فرانس کے درمیان پورا اتحاد عمل ہوگا۔ فرانس اور برطانیہ کے ان اعلانوں سے منشا یہ ہے کہ سینور مسولینی احتیاط سے قدم بڑھائیں اور اس کے علاوہ وہ اس کو ہر ممکن کوشش کریں گے کہ دو تین مہینے تک لڑائی کی کوئی صورت پیدا نہ ہو اس عرصے میں انھیں امید ہے کہ جنرل فرانکو سمجھ جائیں گے کہ اگر وہ اپنے قرضے کی ادائگی سے اور سینور مسولینی کے پنجے سے چھوٹنا چاہتے ہیں تو انھیں برطانیہ اور فرانس کے سامنے جھکنا چاہیئے یہ چال خود جنرل فرینکو کو نہ سوجھی تو ان کی پارٹی کے لوگ انھیں سوجھا دیں گے بشرطیکہ انھیں موقعہ ملا اور برطانیہ اور فرانس انھیں اس کا پورا موقعہ دینا چاہتے ہیں۔ وہ اس میں کامیاب ہوئے تو سنیور مسولینی کی بڑی جگ ہنسائی ہوگی اور ان کی سیاست ایسی ڈبکی کھائےگی کہ پھر شاید ابھر نہ سکے ان کی چار برس کی جوڑ توڑ کے باوجود جرمنی اور آسٹریا کا اتحاد ہو گیا۔ اس کی ہاں میں ہاں ملانے کے بدلے جرمنی نے اٹلی کو جنوب مشرقی یورپ سے کھسکا دیا۔ اور ہسپانیہ میں بھی چپکے چپکے ایسا سودا کیا کہ اسے بہت کچھ مل گیا اور اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں کیا جاسکتا اب سمجھئے سنیور مسولینی کو آخری موقعہ ہے۔ وہ کچھ

مارے گئے تو خیر ورنہ پھر انھیں یا تو حکومت اور سیاست سے علیحدہ ہونا پڑے گا جو کہ ان کے لئے موت سے بھی بدتر ہے، یا کسی طرح قلابازی کھا کر جرمنی کا پہلو چھوڑ برطانیہ کی گود میں پہنچنا ہوگا مسٹر چمبرلین تو گود پھیلائے چھتری لگائے گھومتے ہی ہیں وہ سنور مسولینی کو بڑے شوق سے گود میں بٹھائیں گے۔

ہر ہٹلر کی سیاست کا حال یہ ہے کہ وہ ایسی کایا پلٹ کے لئے بھی تیار ہیں مغربی یورپ میں کہیں داؤ نہ چلا تو وہ مشرق میں کہیں پرواز کریں گے کئی سال ہوئے انھوں نے پولینڈ سے تعلقات بڑھا کر اسے فرانس اور برطانیہ سے علیحدہ کیا اور روس سے بچنے کے لئے ایک آڑ بنایا یہ دوستی اب تک قائم ہے پولینڈ اور جرمن کے سفیروں اور وزیروں کی ملاقاتیں اب پہلے سے بھی زیادہ ہوتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ جرمن سیاست نے پولینڈ کو ہنگری سے خفا کر دیا ہے، اور ہنگری کو سلوواکیا سے ابھی کچھ دن ہوئے لڑا بھی دیا۔ تاکہ مشرقی چیکوسلواکیا جو میونخ کانفرنس کے بعد سے کارپیتھو یوکرائن کہلاتا ہے نہ ہنگری میں شامل ہو سکے اور نہ پولینڈ میں۔ اور یہ دونوں آپس میں اسے بانٹ بھی نہ سکیں شمال میں جرمنی کا میمل کے شہر پر قبضہ ہونے والا ہے اور ایسا ہو گیا تو پولینڈ بالکل جرمنی کے قابو میں ہو جائے گا لطف تو یہ ہے کہ جرمنی روس سے بھی سمجھوتا کرنے والا ہے اور اس کے لئے زمین تیار کرنے کی غرض سے اس نے کہا ہے کہ وہ اپنے معاہدوں کے ان حصوں کو جن میں کومیونزم کے خلاف جنگ کرنے کی نیت ظاہر کی گئی ہے ملتوی قرار دے گا یعنی جرمنی کی تحریک پر اٹلی اور جاپان اور حال ہی میں ہنگری نے کومیونزم کے خلاف جو اتحاد کیا ہے اس کا ڈنک نکل جائے گا روس اور پولینڈ کے درمیان تو ایک معاہدہ ابھی ہو چکا ہے جرمنی اس میں شریک ہو جائے گا اور کسی سے بگاڑے بغیر روس سے بنائے گا۔

اس میں بھید یہ ہے کہ ہر ہٹلر یوکرائن کے اس حصے کو اپنے چنگل میں کرنا چاہتے ہیں جو جنگ عظیم کے بعد پولینڈ میں شامل ہو گیا تھا اور یوکرائن کے دو حصے اور ہیں جن میں ایک روسی ریاست میں ہے اور دوسرا رومانیہ میں ملا دیا گیا ہے پولینڈ کے یوکرائنی تعداد میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہیں حکومت ان کے ساتھ واقعی بہت برا برتاؤ کرتی ہے اگرچہ ۔۔۔ جب اسے یوکرائنی علاقہ دیا گیا تھا تو پولینڈ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ یوکرائنوں کو سوراج دے گا اس نے پوری کوشش کی ہے کہ یوکرائنی سوراج کے قابل نہ رہیں۔ ان

کے اسکول بند کر دیئے ہیں انہیں ملازمتوں سے الگ رکھا ہے۔ اور انہیں کسی جہت اور کسی طرح کی آزادی کے لائق نہیں مانا ہے ایسے ظلم کی مخالفت کی جائے تو اسے کون غلط یا برا کہہ سکتا ہے۔ اور ہر ہٹلر اگر اکرائن کا حق دلوانا اپنے ذمے لے لیں تو ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا ابھی تک وہ کھلم کھلا کچھ نہیں کہہ رہے ہیں لیکن پچھلے دسمبر میں پولینڈ کی پارلیمنٹ میں اکرائنی سوراج کا ایک بل پیش ہو چکا ہے جن میں قریب قریب وہی مطالبے ہیں جو چکوسلواکیا کی جرمن آبادی کی طرف سے شروع شروع میں ہر ہنلائن نے کئے تھے اوکرائنی قوم بڑی بہادر اور جنگجو ہے اگر کہیں لڑائی چھڑ گئی تو پھر کیا ہے ہر ہٹلر پنچ بن جائیں گے اور یا تو کسی کو صلح کرانے کے لئے بھیج کر جیسا کہ مسٹر چیمبرلین نے لارڈ رنسی کو بھیجا تھا یا پولینڈ پر دباؤ ڈال کر ویسا ہی فیصلہ کرینگے۔ جیسا کہ مسٹر چیمبرلین نے چکوسلواکیا کے معاملے میں کرایا تھا برطانیہ اور فرانس جنہوں نے چکوسلواکیا کو بچانے کی کوشش نہیں کی بھلا پولینڈ کی خاطر کیوں کچھ کریں گے رہا روس سو اس کو تو برطانیہ اور فرانس ایسا دھتکار چکے ہیں کہ وہ ان کے پاس نہ پھٹکے گا۔ اور پولینڈ کے قبضے سے اوکرائن نکل گیا تو اس میں اس کا اتنا نقصان نہیں جتنا کہ جرمنی سے لڑنے میں پولینڈ سے دوستی قائم رکھنے میں جرمنی کا فائدہ یہ ہے کہ لڑائی کی نوبت نہ آئے گی پولینڈ پر ویسا ہی دباؤ ڈالا جا سکے گا جیسا کہ برطانیہ اور فرانس نے چکوسلواکیا پر ڈالا تھا اور جرمن کے لئے نتیجہ اتنا ہی مفید ہوگا

جہاں سیاست کی اتنی گہری چالیں چلی جا رہی ہوں وہاں بازی کا بگڑ جانا اور مخالفوں کا ایک دوسرے سے لڑ جانا کچھ مشکل نہیں۔ لیکن وہی لوگ جو جنگ کی پیشین گوئیاں کرتے ہیں یہ بھی کہتے ہیں کہ فروری مارچ کے مہینے لڑنے کے لئے موزوں نہیں۔ آپ شاید اس سے مطمئن نہ ہوں ہمارے خیال میں تو یہ دو مہینے بھی غنیمت ہیں دنیا بہتیروں کو اتنی مہلت بھی نہیں دیتی۔

مطبوعات موصولہ

۱۔ مذہبی کتابیں

حسن بیان | یہ قرآن پاک کا ترجمہ ہے جو جناب غلام حسن نیازی صاحب پشاوری نے خواجہ کمال الدین صاحب مرحوم کی فرمائش پر کیا تھا۔ اس میں مطالب قرآن بھی مختصر طور پر شامل ہیں۔

فلسفہ تعلیم اسلام (جلد اول) | از جناب سید حمید صاحب شاہی امام جامع مسجد دہلی۔ مصنف نے اس کتاب کے سبب تالیف کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے "ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس کے مطالعہ سے عقاید واحکام اسلامیہ کے خط وخال کی رعنائی، علوم حاضرہ اور کشفیات جدیدہ کی روشنی میں۔ زیادہ روشن اور زیادہ واضح نظر آنے لگے"۔

۱۔ پاک زندگی
۲۔ صلوٰۃ وسلام | از مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علما ہند۔ رسالہ "صلوٰۃ وسلام" مولانا کی ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ مقدس ومطہر میں درود وسلام پیش کرنے کے سلسلہ میں کی گئی تھیں اور رسالہ "پاک زندگی" مولانا کے تین مضامین (فطرت سلیمہ، حیات طیبہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف کا مجموعہ ہے۔

تراجم علمائے حدیث ہند جلد اول | مؤلف جناب ابو یحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی اس میں "خاندان ولی اللہی دہلی وعلمائے دہلی وصوبہ یوپی مرحومین وموجودین کے تراجم ہیں اس کتاب کے لئے علامہ سید سلیمان ندوی صاحب نے مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔

اسلام اور عروج سائنس وتمدن | مصنفہ مولوی عبدالکریم صاحب بی۔ اے۔ ایم۔ ایل۔ سی ترجمہ شیخ عبدالمجید صاحب بی۔ اے۔ اس رسالہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ "اسلام ترقی سائنس کا جو تمدن کا جزو لاینفک ہے مانع نہیں ہے .... عہد سلف کے مسلمان، جدید سائنس وتمدن کے رہنما اور مصلح ہیں۔ زمانہ مابعد میں اسلامی دنیا پر جو ذہنی جمود

طاری ہوگیا .... اس کے اسباب چند تاریخی واقعات ہیں .... اسلامی عقائد و تعلیمات کسی صورت میں اس سیاسی زوال و معاشرتی پستی کے ذمہ دار نہیں"۔

ایمان مرکزی سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور کا آرگن۔ "سیرت کمیٹی کی آخری غرض یہ ہے کہ تمام دنیا کی قوموں اور زبانوں میں حضور کے حالات کی اشاعت کی جائے"۔ سیرت کمیٹی کی کارگذاریاں نہایت اہم اور شاندار ہیں۔ قاضی عبدالمجید صاحب قریشی سکرٹری سیرت کمیٹی کا یہ بیان ہے کہ کمیٹی نے اپنا تمام کام چندہ لینے کی بجائے اخبار ایمان اور کتب سیرت کی آمدنی سے انجام دئے ہیں اور اس آمدنی میں سے دس ہزار روپیہ نقد فقط تبلیغ اسلام کے لئے وقف کیا ہے۔

قادیانی قول و فعل | مؤلفہ جناب سلاح الدین محمد الیاس برنی صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ الیاس برنی صاحب کی مشہور تالیف "قادیانی مذہب" کے جواب میں "بشارت احمد" ایک کتاب شائع ہوئی تھی اس کی تنقیح کے سلسلہ میں یہ کتاب تالیف کی گئی ہے۔

قواعد عربی (حصہ اول) | از مولوی حکیم محمد ہبۃ اللہ صاحب لکچرار عربی گورنمنٹ سٹی کالج حیدر آباد دکن یہ کتاب حیدر آباد کی جماعت ہائے پنجم و ششم کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس میں انگریزی خواں طلبہ کی آسانی و سہولت کو خاص طور پر مدنظر رکھا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ طلبہ کو عربی گرامر سے بجائے وحشت کے انس پیدا ہو۔

تفسیر سورۂ والتین | تالیف جناب مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ ترجمہ جناب امین احسن صاحب اصلاحی۔

اسلامی ڈائری | قریشی بک ہاؤس ایجوکیشنل بک سیلر اور پبلشر گورو بازار امرتسر نے اسے شایع کیا ہے۔ "اس میں حضور سرور کائنات کی پاکیزہ سوانح حیات خلفائے راشدین، ائمہ اربعہ، مجاہدین اسلام کے حالات زندگی موجودہ اسلامی سلطنتوں کے حالات اور دنیائے اسلام کی آبادی بلحاظ ملک وطن کے علاوہ اتحاد اسلامی اور اصلاح ملک کے لئے مضامین درج کئے گئے ہیں"۔

۲۔ سیاسی کتابیں

مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل | از میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) مدیر ہمایوں لاہور۔ یہ میاں صاحب کی وہ تقریر ہے جس کا بیشتر حصہ انجمن حمایت اسلام کی طلائی جوبلی کی تقریب پر پڑھا گیا تھا۔ بہت عالمانہ تقریر ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے اس کے اندر بہت کچھ پیام امید اور درس عمل موجود ہے۔

مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ | از جناب عبدالوحید خاں صاحب بی۔ اے۔ اس کتاب میں ہندوستان کی اسلامی سیاست کی مفصل تاریخ "مسلم لیگ" کے نقطۂ نگاہ کو سامنے رکھ کر پیش کی گئی ہے۔ ہندوستان کی سیاسیات حاضرہ کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔

انتخاب جداگانہ کا تاریخی خلاصہ | مرتبہ محمد امین صاحب زبیری اس رسالہ میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۳۶ء تک ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کو ان مسلمان نوجوانوں کے لئے مرتب کیا گیا ہے جن کی آرا و افکار کا رجحان ایسی سیاست کی طرف ہو جاتا ہے جو بظاہر نہایت خوش آیند اور دلپذیر ہوتی ہے لیکن اس میں مسلمان قومیت کا پتہ تو نہیں ہوتا۔"

مسلمانان ہند کی سیاست وطنی | مرتبہ جناب محمد امین صاحب زبیری۔ اس کتاب میں رسالہ "انتخاب جداگانہ کا تاریخی خلاصہ" کو زیادہ تفصیل کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے اور مسلمانان ہند کی اسّی سال کی سیاسی تاریخ کو مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

گفتگوئے مصالحت | اس رسالہ میں اختر بک ڈپو بمبئی نے اس خط و کتابت کو شائع کیا ہے جو مسٹر محمد علی جناح نے پنڈت جواہر لال نہرو اور گاندھی جی کے ساتھ ۱۹۳۸ء میں جاری رکھی تھی۔ رسالہ کے آخر میں مسلمانان ہند کے چودہ مطالبات اور ان کی تاریخ بھی ضمیمہ کے طور پر درج کر دی گئی ہے۔

متحدہ قومیت اور اسلام | از مولانا سید حسین احمد صاحب صدر المدرسین دار العلوم دیوبند قومیت اور وطنیت کے سلسلہ میں مولانائے موصوف اور علامہ اقبال مرحوم کے درمیان جو بحث چھڑی تھی یہ رسالہ اسی بحث کی ایک کڑی ہے۔ اس رسالہ کے بارے میں مولانا کا ارشاد ہے کہ اکثر مقامات پر ابحاث کو کلیات کی صورت میں پیش

کیا گیا ہے۔ مگر دراصل ان کا تعلق جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم کے مفصل بیان اور جناب مدیر احسان کی تحریر سے ہے۔"

۳۔ دیوان اور نظموں کے انتخابات

ریاض رضوان | یہ جناب ریاض خیرآبادی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب ۲۰۲ صفحات پر مشتمل ہے اور حضرت ریاض کی غزلیات اور دیگر اصناف سخن کا ایک جامع مجموعہ ہے۔ اس میں ملک کے ممتاز لوگوں کی تقریظ، پیش لفظ، تقریب مقدمہ اور اعتراف اور آخر میں ضمیمہ بھی شامل ہیں۔

۱۔ اشعار میر
۲۔ اشعار ذوق | از جناب عبدالمنان صاحب بیدل ایم۔ اے عظیم آبادی پروفیسر گورنمنٹ کالج پٹنہ۔ ان دو کتابوں میں میر اور ذوق کے منتخب کلام کو پیش کیا گیا ہے۔ دونوں کے لئے بیدل صاحب نے نہایت جامع مقدمہ تصنیف فرمایا ہے۔ "اشعار میر" میں ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب صدر شعبہ عربی و فارسی و اردو کا "تعارف" بھی شامل کیا گیا ہے۔

دیوان بیدر | مرتبہ جناب محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکچرار اردو مدراس یونیورسٹی۔ یہ مدارس یونیورسٹی اسلامیک سیریز کی دوسری کتاب ہے اور اس میں شاہ میر محمدی صاحب بیدر کے دیوان کو ڈیڑھ پونے دو سو برس کے گمنامی کے بعد ملک سے دوبارہ روشناس کرایا گیا ہے۔ دیوان کے ساتھ محوی صاحب کا مقدمہ بھی شامل ہے۔

نذر ولی | از طالبات جامعہ عثمانیہ۔ اس میں اردو کے مشہور شاعر ولی اورنگ آبادی کے بارے میں جماعت ایم۔ اے کی طالبات کے مضامین کو جمع کیا گیا ہے۔

گریہ و تبسم | یہ صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش کے کلام کا مجموعہ ہے اور "ادارہ ادبیات اردو" جامعہ عثمانیہ کے سلسلہ مطبوعات کی پندرھویں کڑی ہے۔

۱۔ ماہر القادری کے سو شعر
۲۔ آہ کے سو شعر | "آہ کے سو شعر" نہایت دیدہ زیب طریقہ پر شائع کئے گئے ہیں۔ ماہر صاحب کے شعروں کا انتخاب بھی خوب کیا گیا ہے۔

۴- افسانے

فاؤسٹ | مترجمہ جناب شاہد احمد صاحب بی اے آنرز دہلوی۔ یہ بیٹر پسٹن اور ہنری سے درج کی ایک کہانی کا ترجمہ ہے

سعیٔ ناکام | از ا۔ س۔ یہ ایک کم عمر مؤلفہ عزیزہ امنۃ الرفیق کے ترجمہ کئے ہوئے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں بینز اینڈرسن کے ان چند افسانوں کا ترجمہ کیا گیا ہے جو بچوں کے لئے خاص طور پر دلچسپ ہیں۔

شہزادہ زرتاش | از جناب سید حمید علی صاحب۔ یہ ایک دلچسپ افسانہ ہے جسے دارالاشاعت پنجاب لاہور نے شائع کیا ہے۔

بالشتیوں کی دنیا | از جناب سید فخرالدین صاحب رکن ادارہ "ہند"۔ یہ انگریزی زبان کی مشہور کتاب "گلیورس ٹریول" کا ترجمہ ہے۔

۵- متفرق کتابیں

مکاتیب مہدی | مرتبہ جناب مہدی بیگم صاحبہ یہ اردو زبان کے بلند پایہ انشا پرداز ایم۔ مہدی حسن مرحوم کے خطوط کا مجموعہ ہے اس کتاب کے لئے مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے دیباچہ تحریر فرمایا ہے۔

مخزن اخلاق | از مولانا رحمت اللہ صاحب سبحانی۔ اس کتاب میں "ساڑھے پانچ ہزار ادبی و اخلاقی اقوال و اسباق" کو جمع کیا گیا ہے۔

تحریک ترقی مملکت آصفیہ | از جناب خواجہ حمید احمد صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) جشن سیمیں مبارک کی تقریب کے سلسلہ میں نواب سہراب نواز جنگ انجہانی کے ورثا نے حیدرآباد کی ہمہ جہتی فلاح و بہبود کی تدابیر کے عنوان پر مضمون لکھنے کے لئے پانچ سو روپیہ کا انعام مقرر کیا تھا۔ خواجہ حمید صاحب کے مضمون کو اس انعامی مقابلہ میں کامیابی ہوئی تھی اسی مضمون کو کتابی شکل میں شایع کیا گیا ہے۔

جدید اردو ادب کا بانی (سر سید احمد خاں) | از جناب محمد ابو اللیث صاحب صدیقی البدایونی۔ بی۔ اے۔ آنرز (علیگ) اس رسالہ میں سر سید کی تصنیفی زندگی کے مختلف ادوار کو پیش کیا گیا ہے۔

طب قدیم اور طب جدید | از جناب حکیم محمد اسمٰعیل صاحب اس میں طب یونانی اور طب ڈاکٹری کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

ہٹلر اعظم | از پروفیسر چندر شیکھر شاستری۔ سیاسی لٹریچر کمپنی دہلی نے اس کتاب کو شایع کیا ہے۔ اس میں نہایت تفصیل کے ساتھ جرمنی کے زمانہ قدیم سے اواخر ۱۹۳۷ء تک کی تاریخ اور جرمنی کی موجودہ سیاسی حالات درج ہیں آخر میں ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۸ء تک کے اہم واقعات ڈائری کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔ جرمن الفاظ کے صحیح تلفظ کے لئے بھی ایک گلاسری درج کر دی گئی ہے۔

بھگت سنگھ | از جناب دیاکشن گنجور صاحب۔ اس میں سردار بھگت سنگھ کی زندگی کے واقعات درج کئے گئے ہیں۔ اچاریہ نریندر دیو ایم۔ ایل۔ اے۔ نے اس کا مقدمہ لکھا ہے۔

ہندوستان کی اقتصادی تاریخ | از خواجہ عبدالمجید صاحب۔ اس مختصر کتاب میں ہندوستان کی اقتصادی تاریخ بیان .... کی گئی ہے۔ فہرست مضامین کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔ تمہید سیاست مدن زراعت بیشہ ملک، ہندو عہد کے اقتصادیات، اور مسلمانوں کی حملہ آوری، بحری تجارت کا حال اور مقامات روم کی تجارت، عربوں کی بحری تجارت، مسلمانوں کے زمانہ کی تجارت، سکہ اور تبادلہ، یورپین قوموں کا ابتدائی دور ۱۹۵۷ء (؟ ؟) کے بعد کی تجارت، حکومت کا تجارت کے ساتھ طرز عمل، تجارت اور توازن (؟) ان عنوانات پر نہایت سرسری بحث کی گئی ہے۔ زبان اچھی ہے۔

تعلیم بالغان | از ایس۔ ایم۔ شاہ ولی بیبنی بی۔ اے آنرز ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ۔
یہ بالغوں کو تعلیم دینے کا نیا قاعدہ ہے۔ جس کا تجربہ بہت سے لوگوں پر مختلف جگہوں پر کیا جا چکا ہے اور مصنف کا دعویٰ ہے کہ نہایت کامیاب ثابت ہوا ہے اس کے ذریعہ سے دو مہینے کے عرصے میں بالغ اردو پڑھنا سیکھ لیتے ہیں۔ اس کے تیار کرنے میں مصنف کے قول کے مطابق بالغوں کی نفسیات کو خاص طور پر سامنے رکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب | از آغا محمد اشرف صاحب ایم۔ اے ڈون اسکول دہرہ دون۔ یہ ایک کہانی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک ڈاکٹر صاحب نے کس طرح عزت نگر میں بالغوں کے لئے اسکول کھولا اور آہستہ آہستہ سارے گاؤں کی کایا پلٹ دی۔ صاحبزادہ سعید الظفر خاں صاحب سابق پرنسپل کتاب کی تقریب کے سلسلہ میں لکھتے ہیں "آغا محمد اشرف اپنی زبان کی سلاست لہجہ کی شیرینی، بے ساختہ پن، ظرافت اور چلتے وقت تمام ہندوستان

کے سننے والوں سے "آداب عرض" کہنے کی وجہ سے بے حد ہر دل عزیز تھے صاحبزادہ صاحب کے اس بیان سے ہم بھی متفق ہیں۔ آغا صاحب کی تصنیف کی ہوئی کتاب سے ان کی ریڈیو کی خصوصیات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی نے اس مختصر کتابچہ کو شایع کیا ہے۔

دیومالا از سید ابن حسن صاحب جارچوی ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ یہ سلسلہ تعلیم بالغاں کی کتاب نمبر ۲ ہے جسے حالی پبلشنگ ہاؤس "کتاب گھر" اردو بازار دہلی نے شایع کیا ہے۔ اس میں دیوؤں کے قصے بیان کئے گئے ہیں جو بہت دلچسپ ہیں۔ زبان بھی بہت اچھی ہے۔

کسان رت مصنفہ سید مطلبی سید فرید آبادی۔ یہ ایک منظوم "ڈراما یا سانگ" ہے۔ اور غالباً دہلی کے آس پاس کے دیہاتوں میں سانگ لکھنے کا جو طریقہ رائج ہے اسی کے انداز میں اسے لکھا گیا ہے۔ سید مطلبی صاحب شمالی ہندوستان کی دیہاتی شاعری کے بارے میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لئے جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس کے بارے میں بجا طور پر یہ توقع قائم کی جا سکتی ہے کہ شمالی ہندوستان کے "عوام" تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جاننے والے یا بالکل ان پڑھ "لوگوں کے لئے اس میں ضرور بہت زیادہ دلچسپی کا سامان ہوگا لیکن جن لوگوں کے ذوق خواص اور تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے ادب تیار کرنے کی وجہ سے بگڑ گئے ہیں ان کے لئے یہ کتاب شاید زیادہ دلچسپی کا باعث نہ ہوگی۔

نوجوان اور مفلسی فلسفہ جدید از سید صابر حسین صاحب جعفری ایم۔ اے ایل ایل بی مرشد آباد ہاؤس۔ گولہ گنج۔ لکھنؤ۔ اس دلچسپ کتاب کا "ڈیڈیکیشن" مایوس آرزوؤں کے نام" کیا گیا ہے۔ "اظہار" سے کتاب کی ابتدا ہوئی ہے۔ اس کے بعد "تعارف" ہے۔ اور پھر ۲۴ جون ۱۹۳۶ء سے ۳ مئی ۱۹۳۵ء تک کی ڈائری ہے۔ اس کتاب کا بحث تعلیم یافتہ نوجوان کی سخت زندگی اس کے تلخ تجربات اس کے جذبات اور احساسات کا سفاکانہ خون ہے۔" "ادائگی مطلب کے لئے صاف زبان استعمال کی گئی ہے جو عوام الناس کی روزمرہ بول چال سے بیشتر مشابہت رکھتی ہے۔"

یہاں ناموزوں نہ ہوگا اگر "اظہار" کی عبارت کو بجنسہ نقل کر دیا جائے:۔

"نوجوانی اور مفلسی ان کا جمع ہونا ایک نئے فلسفہ کی تخلیق کا سبب ہوتا ہے جوانی کی ابلتی ہوئی

خواہشیں اور مفلسی کی تاریک مایوسی' جب ہم آغوش ہوتی ہیں تو نقاب پوش حقیقت تھرتھرانے لگتی ہے اور زندگی اپنے فطری انداز میں رقص کرتی نظر آتی ہے۔

"نوجوان کا ابلتا ہوا شباب' پُرارمان سینہ' بڑھتے ہوئے قدم' مفلسی کی سردی' بدبو اور بدہیئتی۔ لڑکھڑاہٹ' نقاہت اور مایوسی میں تبدیل نہیں کرسکتیں بلکہ اس کے گرد ایک رومانی ماحول پیدا کر دیتی ہیں جس میں خودی پُروقار انداز میں بڑھتی اور پھیلتی ہے۔

"تہذیب اور تمدن کی بڑھتی دنیا میں افسردہ تمنائیں' مایوس آرزوئیں' "مایوس سکون" کی متلاشی نہیں ہوتیں بلکہ جرأت سے اپنے ماحول کو اپنی سخت اور کھُردری کاوشوں سے اپنے مطابق بدلنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔

کیا اچھا ہو کہ اس کتاب کو سمجھ دار اور سوچنے کے عادی دماغ ہی پڑھیں۔"

صحیفہ عشق | از علامہ اخلاق دہلوی' ایچ' یو' کے۔ پی۔ اے۔ یو۔" ادبی سوسائٹی نئی دہلی ملتانی ڈھانڈا۔ اس رسالے میں عشق کے رموز اور اسرار کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اقبال کی شاعری | مرتبہ جناب عبدالمالک صاحب آروی۔ یہ وہ مقالہ ہے جو یوم اقبال کی تقریب میں ۹ر جنوری ۱۹۳۸ء کو شاہ آباد اردو لائبریری کے جلسے میں پڑھا گیا تھا۔

مرثیہ اقبال | از جناب اسد ملتانی صاحب۔ مرثیہ کے چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:۔

وہ شعر و فلسفہ کا بحر بیکراں اقبال ——— جنونِ عشق و محبت کا رازداں اقبال

وہ فلسفے میں خودی کا پیامبر اقبال ——— وہ شاعروں میں حقیقت کا ترجماں اقبال

وہ جسم قوم میں مثل دماغ و دیدہ و دل ——— وہ روح فطرت اسلام کی زباں اقبال

یہ مانتا ہی نہیں دل کہ پا گیا ہے وفات ——— ؟

نہیں نہیں' کبھی اقبال مر نہیں سکتا ———

اگرچہ آج جہاں سے گذر گیا اقبال
جو کام کرنے کو آیا تھا کر گیا اقبال

۶۔ رسالے

ادب لطیف سالنامہ | نہایت پاکیزہ ادبی مضامین کا دیدہ زیب اور دلنواز مجموعہ، چودھری برکت علی بی۔اے اور میرزا ادیب بی۔اے کی ادارت میں مکتبہ اردو لاہور سے شایع ہوا ہے۔

رہنمائے تعلیم لاہور تپ دق نمبر | تپ دق کے بارے میں اس نمبر میں نہایت مفید معلومات کو جمع کیا گیا ہے۔

ایشیا | یہ سہ ماہی رسالہ جناب ساغر نظامی صاحب کی ادارت میں ادبی مرکز میرٹھ سے نہایت آب و تاب کے ساتھ شایع ہوتا ہے۔ ہندوستانی ادب، مشرقی تہذیب اور مشرق کی انقلابی روح کا علمبردار ہے۔

سب رس (دکن نمبر) | ادارہ ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ کا ماہنامہ جس کے اس نمبر کو دکن کے ماضی وحال کے متعلق دلچسپ اور اہم تاریخی معلومات کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔

جامعہ

زیر ادارت: پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۳۱	مارچ ۱۹۳۹ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

قیمت سالانہ صہ	پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس دہلی	فی پرچہ ۸ر

ہندوستانی ریاستوں کا مسئلہ اور فیڈریشن

(ذیل کے مضمون میں دیسی ریاستوں اور فیڈریشن کے مسئلہ سے متعلق واقعات اور اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں...... تنقید اور تعمیری تجاویز کو کسی اور صحبت کے لئے ملتوی رکھا گیا ہے۔ اسی طرح وفاقی مالیات کی مبسوط بحث کو بھی کسی دوسرے موقع کے لئے ملتوی کر دیا گیا ہے)

ہندوستان کے مسئلہ کا کوئی بیان اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جا سکتا جب تک اس میں ہندوستانی ریاستوں کا حال بھی شامل نہ کیا جائے۔ ہندوستان کے مجموعی رقبہ میں تقریباً ۷ لاکھ مربع میل یعنی کل رقبہ کے ایک تہائی سے زیادہ ہندوستانی ریاستوں کے حدود میں شامل ہے۔ یہ ریاستیں برطانیہ کے زیر حکومت نہیں ہیں بلکہ برطانیہ کی باجگزار ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً ۷۰۰ ہے اور ان میں ہر قسم کی ریاستیں شامل ہیں ــــ ایک طرف اگر حیدر آباد اور کشمیر کی بڑی ریاستیں ہیں (جن میں سے ہر ایک انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ سے زیادہ بڑی ہے)، تو دوسری طرف ایسی ریاستیں بھی ہیں جن کا رقبہ صرف چند ایکڑ ہے اور ان کے مالک یا حصہ دار ایسے چھوٹے چھوٹے سردار ہیں جن کو عدالت کا حق بھی نہیں دیا گیا ہے۔ مگر بصورت مجموعی ریاستوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

ہندوستانی ریاستوں کی کمیٹی نے جس کا تقرر دسمبر ۱۹۲۷ء میں اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ ہندوستانی ریاستوں اور حکومت بالادست کے تعلقات کی تحقیقات کرے اور برطانوی ہندوستان اور ریاستوں کے مالی اور معاشی مسائل کے بارے میں اپنی سفارشات پیش کرے ۱۹۲۷ء میں اپنی رپورٹ تیار کی اور یہاں جو حالات بیان کئے گئے ہیں ان سے زیادہ کے مطالعہ کے لئے اسی رپورٹ سے رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔

کمیٹی نے ہندوستانی ریاستوں کو جس حالت میں وہ آج موجود ہیں مندرجہ ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم کیا ہے :-

ریاست کی نوعیت	تعداد	رقبہ مربع میلوں میں	آبادی	آمدنی
۱- ایسی ریاستیں جن کے حکمراں اپنے ذاتی حق کی بنا پر ایوان راجگان کی رکن ہیں	۱۰۸	۵ لاکھ ۱۴ ہزار ۸۸۶	۵ کروڑ ۹۸ لاکھ ۴۷ ہزار ۱۸۶	۴۲ کروڑ ۱۶ لاکھ
۲- ایسی ریاستیں جن کی نمائندگی ایوان راجگان میں انھیں کے رتبہ کے ۱۲ رکن کرتے ہیں......	۱۲۷	۷۶ ہزار ۸۴۶	۸۰ لاکھ ۴ ہزار ۱۱۴	۲ کروڑ ۸۹ لاکھ
۳- چھوٹی ریاستیں جاگیریں وغیرہ	۳۲۷	۶ ہزار ۴۰۶	۸ لاکھ ایک ہزار ۶۷۴	۷۴ لاکھ

حیدرآباد کا رقبہ ۸۲ ہزار ۷۰۰ مربع میل ہے اور آبادی ایک کروڑ ۴۴ لاکھ ہے یعنی تقریباً برطانیہ عظمیٰ کے برابر ہے اور پرتگال یا آسٹریا کے مقابلہ میں اس کی آبادی دوگنی ہے۔ حیدرآباد ریاست کی آمدنی تقریباً ۸½ کروڑ روپیہ سالانہ ہے۔ انتہائی شمال میں کشمیر کی ریاست کا رقبہ حیدرآباد کے برابر ہے اور اس کی آبادی ۳۶ لاکھ ہے۔ جنوب میں میسور کی آبادی ۶۷ لاکھ ہے اور رقبہ ۳۰ ہزار مربع میل سے کچھ کم ہے گویا یہ آئرش فری اسٹیٹ سے رقبہ میں بڑی اور آبادی میں دوگنی ہے۔ اور زیادہ جنوب میں ٹراونکور اور کوچین کی بہت زیادہ آباد ریاستیں ہیں جن میں علی الترتیب ۵۱ لاکھ اور ۱۲ لاکھ کی آبادی ہے۔ بڑودہ کے گائکوار کا علاقہ بمبئی کے شمال میں کئی منتشر علاقوں پر مشتمل ہے اور اس کی آبادی ۲۴ لاکھ ہے۔ ہندوستان کے نقشوں میں جو زرد رنگ نظر آتا ہے (یعنی کل رقبہ کا ⅖) وہ برطانوی علاقہ نہیں ہے بلکہ وہ ریاستوں کا علاقہ ہے۔ نگاہ کو سب سے بڑا مسلسل غیر برطانوی علاقہ راجپوتانہ کا نظر آتا ہے لیکن راجپوتانہ میں بھی میں بہت سی جدا جدا ریاستیں شامل ہیں۔ ان میں حروف تہجی کی ترتیب سے چند قابل ذکر ریاستیں یہ ہیں۔ الور، اودے پور، بندی، بیکانیر، ٹونک، جودھ پور، جے پور، کوٹہ اور زیادہ مشرق میں گوالیار ہے

جس کی آبادی پینتیس ۳۵ لاکھ ہے۔ سنٹرل انڈیا ایجنسی میں بھوپال، اندور، اور چھا اور ریوا مانوس نام ہیں۔ راجپوتانہ کے جنوب مغرب میں اور ساحل کے حاشیہ پر بہت بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا اجتماع نظر آتا ہے جو سب ویسٹرن اسٹیس ایجنسی (کچھ اور کاٹھیاواڑ) میں شامل ہیں جن میں زیادہ مشہور بہاؤنگر، کچھ، جوناگڑھ اور ناوانگر کی ریاستیں ہیں۔ ۵۶۲ ریاستوں کی میزان میں ۲۸۶ سے زاید کاٹھیاواڑ اور گجرات میں ہیں۔ پنجاب میں پٹیالہ سکھوں کی خاص ریاست ہے جو ہمالیہ کے دامن سے شروع ہو کر شملہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ آگے مغرب میں بھاول پور کی مسلمان ریاست ہے۔ بلوچستان میں خان قلات کی ریاست ہے جو کل ملک کے ۱/۲ حصہ پر حاوی ہے۔ بمبئی میں کولھاپور کی بڑی مرہٹہ ریاست ہے۔ یو۔پی میں رام پور اور بنارس کی بڑی ریاستیں ہیں جن میں آخر الذکر کو موجودہ شکل ۱۹۱۱ء میں دی گئی ہے۔ بنگال اور آسام میں کوچ بہار، تری پورہ اور منی پور کی ریاستیں ہیں۔

ہم نے اس فہرست میں رقبہ کی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا ہے اور اس میں بہت سی اہم ریاستیں بھی موجود نہیں ہیں۔ لیکن جو مثالیں دی گئی ہیں ان سے یہ بات ثابت ہو سکے گی کہ ان میں سے خاص خاص ریاستیں تعداد میں کس قدر زیادہ اور مختلف ہیں۔

ہندوستانی ریاستوں کی خصوصیات ہندوستانی ریاستوں میں جغرافی، معاشی اور سیاسی حالات کا نہایت نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان میں سے بہت سی ریاستیں برطانوی ہندوستان سے قریبی طور پر وابستہ ہیں۔ وسائل آمد و رفت ریاستوں کی حدود میں سے گذرتے ہیں۔ بمبئی سے دہلی تک کے سفر میں سفر کا بڑا حصہ ہندوستانی ریاستوں کے حدود میں صرف ہوتا ہے۔ برطانوی ہندوستان اور ریاست کی حدیں طبعی خصوصیات نہیں رکھتیں۔ ان میں نسل اور زبان کا فرق بھی نہیں پایا جاتا۔ مثلاً سکھ پنجاب کی ریاستوں سے زیادہ پنجاب کے صوبہ میں پائے جاتے ہیں۔ مرہٹے مرہٹہ راجوں کے مقابلہ میں بمبئی کے صوبہ میں زیادہ ہیں۔ اس کے برعکس کناری زبان بولنے والی بیشتر آبادی میسور کے مہاراجہ کے ماتحت ہے اور قلیل تر آبادی مدراس اور بمبئی کے احاطوں کے کچھ حصوں میں رہتی ہے۔

ان ریاستوں کی حکومت بھی بہت مختلف ہے۔ ۳۰ ریاستوں میں مجلس قانون ساز ہے جس کا کام محض

مشاورتی ہے۔ ۔ ۴۰ میں ہائی کورٹ ہیں۔ ۳۴ نے عدالت کو عاملہ سے جدا کر لیا ہے۔ ریاست کے انتظام کے طریقوں میں بھی بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ ریاستیں بہت ترقی یافتہ ہیں کچھ بہت پس ماندہ ہیں لیکن ایک بات تمام ریاستوں میں مشترک ہے کہ وہ برطانیہ علاقہ میں شامل نہیں ہیں اور ان کی رعایا برطانوی رعایا نہیں ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے جو تعلقات حکومت بالا دست سے ہیں، ان کا تعین معاہدہ یا کسی تحریری دستاویز یا رواج اور سمجھوتہ کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ لیکن ان تعلقات کی صورت چاہے جو بھی ہو لیکن خارجی معاملات اور ان کے علاقہ کے تحفظ کی آخری ذمہ داری تاج برطانیہ کی ہی ہے۔ ۴۰ ایسی ریاستیں ہیں اور یہ سب کی سب بڑی اہمیت رکھتی ہیں جن کے تعلقات حکومت بالا دست سے باقاعدہ معاہدوں کے ذریعہ قائم ہیں۔ زیادہ تر ریاستوں کے تعلقات سندوں کے ذریعہ قائم ہیں۔ سند سے مراد حکومت بالا دست کی طرف سے بعض مراعات یا حقوق و اختیارات کا تسلیم کرنا ہے۔ بقیہ جتنی ریاستیں ہیں ان کے مرتبہ کو بھی کسی نہ کسی شکل میں تاج برطانیہ نے تسلیم کر لیا ہے۔

حکومت بالادست سے تعلقات ہر ریاست اپنے اندرونی معاملات کا انتظام خود کرتی ہے، اپنے قوانین خود بناتی ہے اور اپنے محاصل کو خود ہی عاید، وصول اور خرچ کرتی ہے۔ ہر ریاست میں بلا استثنا ایک برطانوی ریذیڈنٹ یا ایجنٹ ہوتا ہے جس کا کام حکمرانوں کو مشورہ دینا اور برطانوی ارباب حل و عقد کو معاملات کی رپورٹ بھیجنا ہوتا ہے۔ تاج برطانیہ کو سخت بد انتظامی کی حالت میں یا ایسے حالات میں جہاں اس کی ضرورت ہو ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کا حق حاصل ہے لیکن ایسی صورتوں میں حکومت بالادست، حکمراں کے خاندان کے حقوق، ریاست کے حدود کے تحفظ اور ہندوستان کے امن و امان کو عموماً ملحوظ نظر رکھتی ہے۔ بٹلر کمیٹی نے حکومت بالادست کے اختیارات کو تشریح کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ہندوستانی راجاؤں کی طرف سے مطالبہ تھا کہ حکومت بالادست کے اختیارات کو وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ چیز ریاست مانی نہ رہیں اور اس پر عملدر آمد کرانے کے لئے ایک باقاعدہ مشینری بنا دی جائے۔ لیکن بٹلر کمیٹی نے حکومت بالادست کے اختیارات کو فارمولا کی شکل میں بیان کرنا ناممکن خیال کیا اور ریاستوں کو مشورہ دیا کہ ان کی عدم وضاحت میں ہی ریاستوں

کا فائدہ ہے۔

ایک دوسرے مسئلہ کے بارے میں بھی بٹلرکمیٹی نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔راجاؤں کی طرف سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ حکومت بالا دست کو جو حقوق معاہدوں کے ذریعہ ملے ہوئے ہیں ان کو اسے ایسے لوگوں کو سپرد نہ کرنا چاہیئے جن پر اس کا کوئی اختیار نہ ہو مثلاً کسی ایسی ہندوستانی حکومت کو جو ہندوستانی مجلس قانون ساز کو جواب دہ ہو۔ہندوستان میں اگر ڈومنین طرز کی حکومت قائم ہوئی تو اس کا انحصار نئے اور تحریری دستور پر ہوگا۔اس لئے راجاؤں کو اس نئی حکومت کی نگرانی میں بغیر ان کی رضامندی حاصل کئے شامل نہ کیا جائے۔

ریاست کی حکومتوں کی طرف سے حکومت بالادست کو خراج وغیرہ

کچھ ریاستیں تاج برطانیہ کو خراج ادا کرتی ہیں جس کی رقم مختلف حالات میں بدلتی رہتی ہے اس سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ ہندوستان کی حکومت کی آمدنی میں شامل کی جاتی ہے۔یہ خراج بعض صورتوں میں تو علاقہ کے تبادلہ یا واپسی کی شرائط کی وجہ سے پیدا ہوا ہے یا حکومتوں کے مطالبوں کے تصفیہ کی وجہ سے۔لیکن زیادہ تر صورتوں میں اس کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ ریاستوں کو پہلے فوج رکھنا پڑتی تھی جس کی ذمہ داری بعد میں انھوں نے ترک کر دی اور اس کے معاوضہ میں روپیہ دینا شروع کردیا۔ایسی بھی مثالیں ہیں جن میں ایک ماتحت ریاست ریاست بالادست کو خراج ادا کرتی ہے مثلاً کاٹھیاوار اور گجرات کی بہت سی ریاستیں بڑودہ کو خراج ادا کرتی ہیں اور گوالیار، وسط ہند کی بعض ریاستوں سے خراج وصول کرتی ہے۔

اکثر ریاستیں جو اندرون ملک میں ہیں اپنے حدود پر درآمد برآمد کے محصول لگاتی ہیں البتہ میسور کا شمار اہم مستثنیات میں ہے۔اکثر ریاستوں میں مال گذاری کے بعد آمدنی کا دوسرا بڑا ذریعہ درآمد اور برآمد کے محصول ہوتے ہیں۔ان درآمد اور برآمد کے محاصل کی میزان بصورت مجموعی ۳½ کروڑ روپیہ سالانہ کے قریب ہوتی ہے۔اپنے حدود پر محصول عاید کرنا بادشاہت کی علامت ہے اس لئے اس بات پر ریاستیں زور دینا چاہتی ہیں۔

ریاست کے خارجی معاملات جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں تمام تر تاج برطانیہ کے ہاتھ میں ہیں۔

اس لئے بین الاقوامی معاملات میں ہندوستانی ریاستوں کے علاقہ کی حیثیت بالکل برطانوی علاقہ سے مشابہ ہے اور ان کی رعایا کی وہی حالت ہے جو برطانوی رعایا کی ہے۔ کوئی ہندوستانی ریاست سیاسی یا سرکاری گفت و شنید کسی غیر ملکی حکومت سے نہیں کرسکتی۔ ہندوستان اس میں شک نہیں انجمن اقوام کا رکن ہے اور جنیوا میں اس کی نمایندگی ایک ایسا وفد کرتا ہے جس میں عام طور پر ہندوستانی ریاست کا ایک حکمراں بھی شامل ہوتا ہے۔

کئی وجوہ کی بنا پر برطانوی چھاؤنیاں ہندوستانی ریاستوں مثلاً سکندرآباد، بنگلور اور مہو میں رکھی گئی ہیں۔

حکومت ہند، ہندوستان کی حفاظت کے سلسلہ میں ریاستوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ جہاں تک ان کی مالی حالت اجازت دے وہ اپنی سرکاری فوجیں رکھیں تاکہ وہ ہندوستان کی فوج کے ساتھ بیرونی حملوں اور اندرونی بلووں کے موقعوں پر اشتراک عمل کرسکیں۔ ان کے معائنہ کرنے والے عملہ کی تنخواہ حکومت ہند ادا کرتی ہے۔

ریاستیں اپنی پولس کے لئے خود ذمہ دار ہیں۔

وقتاً فوقتاً تاج برطانیہ اور ریاستوں کی حکومت کے درمیان، ریاستوں کے علاقوں میں خاص مراعات حاصل کرنے کے لئے معاملات طے پاتے رہتے ہیں۔ مثلاً ریاست کے ان ٹکڑوں میں جہاں سے ہوکر ریل گذرتی ہے حکومت ہند اپنے سول اور فوجداری قانون پر عملدرآمد کرتی ہے۔ مگر کچھ سرکاری ریلیں ایسی ہیں جو اہم راستوں پر نہیں ہیں ان پر ریاستوں کی عملداری کو قائم رہنے دیا گیا ہے۔ اس کی مثال جودھ پور اور بیکانیر کی لائن ہے۔ مندرجہ بالا انتظام کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو برطانوی ہندوستان میں گرفتار کیا جائے اور اس پر یہ الزام لگایا جائے کہ اس نے ہندوستانی ریاست میں ریلوے کے جرم کا ارتکاب کیا ہے تو وہ اپنی بریت کے لئے یہ عذر پیش نہیں کرسکتا کہ اس نے جرم کا ارتکاب برطانیہ کے علاقہ کے حدود میں نہیں کیا ہے۔ اسی قسم کے سمجھوتے چھاؤنی اور بعض اوقات برطانوی ریذیڈنسی کے بارے میں بھی موجود ہیں حکومت ہند یہ مطالبہ کرسکتی ہے کہ یورپین برٹش رعایا کا مقدمہ ریاستوں کی

عدالتوں میں نہ چلایا جائے۔ ایسے مقدمے یا تو ہندوستانی ریاستوں میں جو برطانوی عدالتیں قائم ہیں ان میں پیش کئے جاتے ہیں یا برطانوی ہندوستان کی عدالتوں میں بھیجے جاتے ہیں۔

جہاں تک پوسٹ اور ٹیلیگراف کا تعلق ہے، برطانوی ٹیلیگراف کا انتظام ہر جگہ پھیلا ہوا ہے اکثر ریاستوں میں اسی قسم کے سمجھوتے ڈاک خانوں کے متعلق بھی ہیں لیکن پندرہ ریاستوں کے اپنے علیحدہ ڈاک خانے ہیں اور ان میں سے پانچ نے باقاعدہ معاہدہ کیا ہے جس کے ذریعہ یہ برطانوی محکمہ ڈاک کے ساتھ اشتراک عمل کرتی ہیں۔

صرف آٹھ ایسی ریاستیں ہیں جن کی اپنی جداگانہ ٹکسالیں ہیں جہاں روپیہ سازی کا کام کیا جاتا ہے۔ باقی ریاستوں کی ٹکسالوں میں صرف تانبے کے سکے بنائے جاتے ہیں یا چاندی اور سونے کے سکے خاص خاص تقریبوں کے موقع پر بنائے جاتے ہیں۔

چیمبر آف پرنسس (ایوان راجگان) مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ میں حکمرانوں کے مشترکہ معاملات کے بارے میں ان کی مشترکہ رائے اور مشورہ کا علم حاصل کرنے کے لئے کئی تجویزیں پیش کی گئی تھیں لیکن رپورٹ کے شائع ہونے سے پہلے اس تخیل کو کوئی عملی اور مستقل جامہ نہیں پہنایا جا سکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۹ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں ایوان راجگان کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ دراصل ایکٹ میں ریاستوں کے بارے میں کوئی اشارہ تک نہیں کیا گیا تھا۔ اگرچہ دیسی ہندوستان کو برطانوی ہندوستان سے علیحدہ ایک چیز ظاہر کیا گیا تھا۔ ایوان راجگان ۸ فروری ۱۹۲۱ء کو ایک شاہی اعلان کے ذریعہ قائم کیا گیا۔ ڈیوک آف کناٹ نے دہلی کے قلعہ میں مغل بادشاہوں کے دیوان عام میں جلسہ کیا اور اس میں ملک معظم کی طرف سے یہ اعلان کیا کہ وہ ہندوستان کے راجاؤں کے حقوق اور مراعات کو قائم اور برقرار رکھیں گے۔

ایوان راجگان کی ساخت ایوان راجگان میں سب سے پہلے تو ایسی ۱۰۸ ریاستوں کے حکمراں ہیں جو اپنے ذاتی حق کی بنا پر ایوان کے رکن ہیں۔ یہ ایسے راجہ ہیں جن کو گیارہ یا زائد توپوں کی سلامی کا حق خاندانی طور پر ملا ہوا ہے۔ ان میں ایسے راجہ بھی شامل ہیں جنھیں وئیسرائے کی رائے میں مکمل یا عملاً مکمل اختیارات

ریاست کے اندرونی انتظام کے ملے ہوئے ہیں۔ ایوان میں اس کے علاوہ بارہ اراکین اور ہوتے ہیں جنھیں ایسی ۱۲۷ ریاستوں کے راجہ چنتے ہیں جو اوپر کی ریاستوں میں شامل نہیں ہیں۔ ان نمایندوں کا انتخاب یہ راجہ یکجا جمع ہوکر کرتے ہیں۔ وائسرائے اس ایوان کا پریسیڈنٹ ہے اور اراکین میں ایک چانسلر اور ایک پرو چانسلر کا انتخاب سالانہ ہوتا رہتا ہے۔ ایوان کا ایک نہایت اہم ادارہ اس کی اسٹینڈنگ کمیٹی یا مجلس انتظامیہ ہے جس کے سات ارکان ہوتے ہیں جس میں چانسلر اور پرو چانسلر شامل ہوتے ہیں۔ اس مجلس انتظامیہ کا کام وائسرائے کو ایسے مسائل پر مشورہ دینا ہوتا ہے جن کے بارے میں وائسرائے ان سے مشورہ طلب کرتا ہے۔ "نیز یہ وائسرائے کے سامنے ایسے مسائل بھی پیش کرتے ہیں جن کا اثر ہندوستانی ریاستوں پر عام طور پر پڑتا ہے یا بصورت مجموعی تمام ریاستوں پر پڑتا ہے یا برطانوی ہندوستان اور ریاستوں دونوں پر پڑتا ہے۔"

ایوان راجگان کے اختیارات | ایوان راجگان ایک غور کرنے والا' مشورہ دینے والا ادارہ ہے اس کو کوئی انتظامی اختیار ملا ہوا نہیں ہے۔ اس کے اجلاس دہلی کے کاونسل ہاؤس کے اس عالیشان ہال میں ہوتے ہیں جو اس کے لئے خاص طور پر تعمیر کرادیا گیا ہے۔ اس کے دستور کا جو اہم حصہ ہے اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں :-

"ریاستوں کے انفرادی معاہدوں اور ان کے اندرونی معاملات' مہاراجاؤں اور سرداروں اور ان کی ریاستوں اور ان کے خاندان کے افراد کے انفرادی حقوق' مفادات' مراعات' اختیارات' مراعات اور شاہانہ حقوق اور حکمرانوں کے انفرادی اعمال وافعال پر ایوان میں کوئی مباحثہ نہیں کیا جائے گا۔

"ایوان کے قیام سے وائسرائے یا گورنر جنرل کے ساتھ کسی ریاست کے جو تعلقات اور مقررہ روابط ہیں ان کو کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور نہ ایوان کی کسی سفارش پر کسی ریاست کے حقوق یا عمل کی آزادی کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچے گا۔"

دستور کی ان دفعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایوان راجگان کے قیام سے کسی ریاست کے ساتھ

تاج برطانیہ کے جو انفرادی تعلقات تھے ان پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ حکومت ہند کے محکمہ سیاسی کا وسیرائے بذات خود انچارج ہے اور یہی وہ محکمہ ہے جو ہندوستانی ریاستوں کے معاملات کا فیصلہ کرتا ہے۔ مانٹیگو چیمسفورڈ کی سفارشات کے بموجب اکثر اہم ریاستوں کو مرکزی حکومت سے براہ راست وابستہ کر دیا گیا ہے اور اس کی وجہ سے اکثر صورتوں میں صوبوں کی حکومتوں کے اختیارات گورنر جنرل کو منتقل ہو گئے ہیں۔ اکثر بڑے راجہ وسیرائے سے براہ راست ملاقات اور خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ حکومت ہند کے محکمہ سیاسی میں زیادہ تر برطانوی افسر رکھے جاتے ہیں اور ان کا انتخاب انڈین سول سروس اور ہندوستانی فوج سے کیا جاتا ہے۔ ان سیاسی افسروں کو ریزیڈنٹ کا نام دیا جاتا ہے۔ ہر ایجنسی میں یعنی راجپوتانہ، وسط ہند، ریاست ہائے پنجاب، ریاست ہائے مغربی، ریاست ہائے مدراس اور بلوچستان میں ایک اے۔ جی۔ جی یا ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل ہوتا ہے جس کے ماتحت بہت سے افسر ہوتے ہیں جو اکثر ایک ایک ریاست یا کئی ریاستوں کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں۔ محکمہ سیاست کا حاکم پولیٹکل سکریٹری ہوتا ہے جو ریاستوں کے معاملات میں وسیرائے کا مشیر ہوتا ہے۔

ایوان راجگان کی دستوری اہمیت تاج برطانیہ اور ریاستوں کے تعلقات کی تاریخ میں ایوان راجگان کا قیام ایک اہم منزل کا درجہ رکھتا ہے۔ کیونکہ اس سے اس ابتدائی پالیسی کی تنسیخ ہوتی ہے جس کی رو سے تاج برطانیہ جہاں تک ممکن ہوتا تھا ہندوستانی ریاستوں کو مشترکہ مشوروں اور مشترکہ عملی کوششوں سے باز رکھا کرتی تھی اور ہر ریاست کے ساتھ انفرادی حیثیت سے تعلقات قائم کرنا پسند کرتی تھی۔ یوں تو ایوان راجگان کے قیام سے پہلے ہی اس اصول کو ترک کرنا شروع کر دیا گیا تھا اور راجگان آپس میں مشورے کرنے لگے تھے۔ لیکن ان مشوروں کو قانونی صورت جو اس سے پہلے حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ایوان راجگان کے قیام سے اس چیز کو قانونی اور منتقل شکل مل گئی۔ ایوان کے ذریعہ ایسے اہم معاملات پر جن کا تعلق ریاستوں اور تاج برطانیہ کے تعلقات یا دوسرے برطانوی ہند کے معاملات سے ہوتا ہے ریاستیں باہم آزادی سے تبادلہ

خیال کرسکتی ہیں۔ باوجود اس کے کہ بعض اہم ریاستیں مثلاً حیدرآباد اور میسور اس سے الگ رہی ہیں پھر بھی سترہ سالوں میں اس کا کام خصوصاً اس کی مجلس منتظمہ کا کام دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریاستوں میں اشتراک عمل نے خاصی ترقی کرلی ہے۔ لیکن سائمن کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس ترقی کو اتنا کافی نہیں سمجھا تھا کہ جس کی بنا پر آل انڈیا فیڈریشن کی طرف قدم اٹھایا جا سکے۔ اس سلسلہ میں لارڈ اردن نے ۱۹۲۹ء میں اپنے خیالات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا تھا:-

"میری یہ رائے ہے اور میں اسے پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا کہ آئندہ کے لئے جو تجاویز بھی بنائی جائیں ان میں پالیسی اور انصاف کا یہ تقاضا ہے کہ ہندوستان کے راجگان کی آزادانہ منظوری کا حاصل کرنا لازمی سمجھا جائے۔ ایسی تجویزوں سے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معاہدے جن کو راجگان نہایت پختہ سمجھتے آئے ہیں آسانی کے ساتھ توڑے جا سکتے ہیں مسئلہ کا حل قریب نہیں بلکہ دور ہو جائے گا۔"

اوپر درج کئے ہوئے واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اول گول میز کانفرنس کے منعقد ہونے سے پہلے تک والیان ریاست کا آل انڈیا فیڈریشن میں شریک ہونا بہت مشتبہ تھا لیکن پہلی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے والیان ریاست کو بھی دعوت دی گئی اور اس کانفرنس کے دوران میں والیان ریاست کو وزیر اعظم مسٹر ریمزی میکڈانلڈ نے کچھ ایسی باتیں سمجھائیں جن سے وہ آل انڈیا فیڈریشن میں شریک ہونے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ انھیں غالباً یہ باور کرایا گیا تھا کہ تمہاری اندرونی خود مختاری میں کسی قسم کا فرق نہیں آئے گا البتہ فیڈریشن میں شریک ہو کر تم ایسے مسائل پر جو تمہارے لئے اور برطانوی ہندوستان کے لئے مشترک ہیں اور جن پر اب دلیسرائے کو اختیارات بالادست حاصل ہیں اپنی مرضی اور رائے کو ایک آل انڈیا کنزرویٹو پارٹی بنا کر موثر طریقہ پر استعمال کرسکو گے۔ والیان ریاست کو ایک عرصہ سے اس بات کی شکایت تھی کہ حکومت بالادست من مانے طریقہ پر ریاست کے معاملات میں اپنے اختیارات بالادست کا استعمال کرتی ہے اور ان کے حقوق کو مسترد کررہی ہے جو انھیں ان معاہدات اور اعلانات کے ذریعہ حاصل تھے جو ملک معظم کی جانب سے وقتاً فوقتاً کئے گئے تھے۔ انھوں نے بٹلر کمیٹی کے سامنے اپنے اس مطالبہ کو رکھا تھا کہ پیرامونٹسی

کی مداخلت کی حد بندی اور تعریف وتحدید کردی جائے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ برطانوی ہندوستان میں پارلیمنٹ ذمہ دار حکومت قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے لیکن ان کی سرگرم کوششوں کے باوجود اور قانونی مشورے کے لئے کثیر رقم صرف کرنے کے بعد بھی بٹلر کمیٹی نے انھیں صرف یہ مشورہ دیا تھا کہ حکومت بالادست کے اختیارات کی عدم وضاحت میں ہی ان کا فائدہ زیادہ ہے اس کے خلاف والیان ریاست نے احتجاج کیا لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ پہلی گول میز کانفرنس میں انھوں نے اس امید کے ساتھ شرکت کی تھی کہ اپنے اس مطالبہ کو پارلیمنٹ کے سامنے رکھ سکیں گے۔ چنانچہ والیان ریاست نے اس موقع پر جو تقریریں کیں ان سے اس بات کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ ذیل میں ان کی چند تقریروں کے اقتباس درج کئے جاتے ہیں:۔

مہاراجہ بیکانیر:۔ "معاہدات سے روسا ہند کے جو حقوق پیدا ہوتے ہیں ان کی زیادہ وضاحت کے ساتھ تحدید کرنے کی ضرورت ہے۔ روسا اور ریاستیں اس امر کو معلوم کرنے کی فطرتاً خواہش مند ہیں کہ ان کا کیا مقام ہے"........ "یہ ایک کھلی ہوئی شکایت ہے کہ ہمارے معاہداتی حقوق پر دست درازیاں ہوئی ہیں"........ "وہ زمانہ گزر چکا جب کہ ایسے اہم معاملات کا تصفیہ کوئی ایک حکومت یک طرفہ طور پر کر لی تھی۔ لہٰذا ہم ایسی عدالت اعلیٰ کے قیام کو بہت بڑی اہمیت دیتے ہیں جس کو ان تمام نزاعی امور کی سماعت اور فیصلہ کا اختیار ہو جو معاہدات کے تحت ہمارے حقوق و فرائض کے سلسلہ میں پیدا ہوتے ہیں"۔

مہاراجہ الور:۔ "ہم جدید اختیارات کے متلاشی نہیں بلکہ ہم ان معاہدات کی پابندی چاہتے ہیں جن کو ملکہ وکٹوریہ اور انگلستان کے تمام شاہان مابعد اور پارلیمنٹ اور زمانہ حاضر کے دلبیرائے کے متعدد اعلانات اور تقریروں نے قابل احترام بنا دیا ہے۔ سیاسی عملدرآمد کے موقع پر ہمارے معاہدات کے مقدس حدود میں مداخلت کی گئی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ حقوق جو معاہدات سے باہر ہیں اور جو ہماری رضامندی اور بعض وقت ہمارے علم واطلاع کے بغیر حاصل کر لیے گئے ہیں از سرنو معرض بحث میں لائے جائیں اور باہمی رضامندی سے تصفیہ پائیں، ورنہ ہمارے معاہدات بے معنی

سمجھے جائیں گے........ ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے کہ عملدرآمد کے وقت مقدس معاہدات کی پابندی کی جائے۔"

مہاراجہ پٹیالہ:۔ "ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ سوائے مشترکہ امور کے دیگر معاملات میں ہم اپنی اندرونی خود مختاری کو بحال و برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور برطانوی ہند کی حکومت کی مداخلت کو (عام اس سے کہ برطانوی ہند کا دستور کچھ بھی ہو) روا نہیں رکھیں گے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ برطانوی ہند اپنے معاملات میں ہماری مداخلت کی روادار نہیں........ دنیا میں کوئی ایسا وفاق آج تک نہیں بنا جس میں وفاق میں شریک ہونے والی ریاستوں کو ان کے حقوق کا ابتدا ہی میں علم نہ ہو جہاں تک ہندوستانی ریاستوں کا تعلق ہے یہ حقوق ابھی تک مشکوک ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ ہمارے حقوق معاہدات اور سند نامہ جات پر مبنی ہیں اور تاج سے ہمارا تعلق ایک قابل تعین رشتہ ہے جس کے شرائط رضامندی پر مبنی ہیں۔ بٹلر کمیٹی نے ہماری رائے پر اعتراض کیا ہے۔ کیا ہمارے مشیران قانون جو انگلستان کے قابل ترین قانون داں ہیں حق بجانب ہیں یا ارکان بٹلر کمیٹی۔ تاوقتیکہ ہم واقف نہ ہو جائیں کہ شرکت وفاق سے کیا کیا حقوق اور ذمہ داریاں پیدا ہوتی ہیں ہم کیوں کر شریک وفاق ہو سکتے ہیں؟ پس جب ہم شرکت وفاق پر آمادگی اور رضامندی کا اظہار کر رہے ہیں تو کیا ہمیں یہ کہنے کا استحقاق نہیں ہے کہ شرکت سے پہلے ہمارے حقوق کا تعین ہو جائے"

نواب صاحب بھوپال:۔ "یہ کہا گیا ہے کہ برطانوی ہند کی آزادی کا تخیل اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ دیسی ریاستیں بھی آزاد نہ ہوں۔ میں اس خیال سے بالکل متفق ہوں........ ایک آزاد دیسی ریاست کے یہ معنی ہیں کہ پیراماؤنٹسی کے اس نظریہ کا خاتمہ کر دیا جائے جو ہمارے معاہدات کے خلاف ریاست ہائے ہند اور حکومت برطانیہ کے مابین پیدا کر دیا گیا ہے اور جس کو زمانہ حاضر میں اس قدر رواج دیا گیا ہے........ ایوان روسا نے بٹلر کمیٹی کی رپورٹ کے خلاف کھلے الفاظ میں احتجاج کیا ہے۔ ہم اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہمارے وہ دعوے جن کو رپورٹ مذکور نے مسترد کر دیا ہے تفصیلی تحقیقات کے بعد جس کے

کہ وہ مستحق ہیں باقاعدہ طور پر فیصل نہ ہوں۔ بٹلر کمیٹی کی رپورٹ کی اشاعت کے بعد حکومت ہند نے "ریاستوں سے تعلقات" کے عنوان سے جو یک طرفہ بیان شائع کیا ہے اس سے روسا ہند بے حد غیر مطمئن ہیں .... ایک ایسی غیر جانبدارانہ عدالت ثالثی کی ضرورت ہے جو ان امور کا فیصلہ کرے جو ریاستوں اور تاج کے عہدہ داروں کے مابین تصفیہ طلب ہوں"

اوپر کے تمام اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیرامونٹسی اور معاہداتی تعلق وہ حقوق ہیں جن کی طرف سے وفاق میں شریک ہونے سے پہلے ریاستیں مطمئن ہو جانا چاہتی ہیں۔ مسٹر مانٹیگو سابق سکریٹری آف اسٹیٹ کے دورۂ ہند کے بعد سے والیان ریاست نے انفرادی اور اجتماعی طور پر مسئلہ پیرامونٹسی کو حل کرنے کی پیہم کوشش کیں۔ برطانوی اور یورپین مقننین سے مشورے حاصل کیے اور ایوان راجگان نے مختلف قراردادوں کے ذریعہ اس خطرہ کو روکنے کی کوشش کی۔ آخر میں گول میز کانفرنس کی ہر سہ میقاتوں میں پر زور مطالبہ کیا کہ تاوقتیکہ اس مسئلہ کا تشفی بخش حل نہ ہو جائے وہ شرکت وفاق سے قاصر رہیں گی۔

ان ساری کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت برطانیہ نے یہ طے کیا کہ پیرامونٹسی کا اثر و نفاذ مختلف ریاستوں کے حق میں مختلف حیثیت رکھتا ہے اس لئے ہر ریاست فرداً فرداً اس مسئلہ کے متعلق حکومت ہند سے گفت و شنید کا آغاز کرے۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء کا جو قانون ہند بنایا گیا ہے اس میں وفاق کے قیام کو ریاستوں کی اختیاری شرکت کا پابند رکھا گیا ہے اور ہر ریاست کو فرداً فرداً دستاویز شرکت تیار کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ جب ایسی ریاستیں فیڈریشن میں شامل ہونا قبول کریں گی جن کے حکمراں کم سے کم ۱۰۴ اراکین کونسل آف اسٹیٹ کے لئے منتخب کرنے کے مجاز ہیں اور جن کی مجموعی آبادی تمام ریاستوں کی کل آبادی کی کم سے کم نصف ہے تب ہی آل انڈیا فیڈریشن وجود میں آسکتا ہے ورنہ نہیں۔

اس اعتبار سے والیان ریاستہائے ہند اپنی مرضی سے ہی وفاق ہند میں شامل ہو سکتی ہیں انھیں مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ جدید دستور اپنی طرف سے کسی ریاست کو وفاق میں شریک

نہیں کرتا۔ بلکہ اس میں صرف ریاستوں کی شمولیت کا طریق کار اور اس کے نتائج ظاہر کر دئے گئے ہیں۔ یہ ریاستوں کی مرضی پر ہے کہ چاہیں تو وفاق میں شامل ہوں نہ چاہیں تو نہ ہوں۔

وثیقہ شمولیت میں وہ تمام امور درج کر دئے جائیں گے جن پر کوئی والیٔ ریاست وفاقی حکومت کا اختیار تسلیم کرنے کے لئے رضامند ہوگا اور اس اختیار پر جو حد بندی وہ قائم کرنا چاہے گا وہ بھی معرض تحریر میں آجائے گی۔

ان وثیقوں کو تاج نامنظور کر دے گا جو اس کی رائے میں وفاق کے اصولوں کے منافی ہوں گے لیکن جب ایک مرتبہ وثیقہ قبول کر لیا جائے گا تو پھر وہ وفاقی حکومت کے عاملانہ اور قانون سازی کے اختیارات کے لئے فیصلہ کن لفظ بن جائے گا۔

وفاقی حکومت قائم ہو جانے کے بعد جو ریاستیں وفاق میں اس وقت تک شامل نہ ہوئی ہوں گی وہ گورنر جنرل کی وساطت سے ملک معظم کی خدمت میں شمولیت کے لئے درخواستیں پیش کریں گی۔ مگر بیس برس کا عرصہ گذرنے کے بعد ایسی کوئی درخواست نہیں بھیجی جا سکے گی تاوقتیکہ وفاقی ایوان علیحدہ علیحدہ گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے یہ ایڈریشن نہ دیں کہ ملک معظم فلاں ریاست کو وفاق میں شامل کر لیں۔ ملک معظم کے وہ اختیارات جو گورنر جنرل مع کونسل ان کی طرف سے ریاستوں میں استعمال کرتا ہے فیڈریشن کے قائم ہو جانے کے بعد تاج کو منتقل ہو جائیں گے۔ گویا ایک طرف تو تاج کا تعلق برطانوی ہند اور وفاق سے ہوگا اور دوسری طرف ریاستوں سے۔ پہلے تعلق کے امور گورنر جنرل کے ذمے ہوں گے دوسرے کے نمایندہ ملک معظم کے سپرد ہوں گے۔ ملک معظم ایک ہی شخص سے دونوں کام بھی لے سکتا ہے۔

فیڈریشن کے قیام کے سلسلہ میں قانون حکومت ہند کی چند متعلقہ دفعات کا خلاصہ ذیل میں درج کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

دفعہ ۵ (۱) اگر پارلیمنٹ کے دونوں ایوان ایک ایڈریس اس مضمون کا پیش کریں اور اگر وہ شرط جس کا ابھی ذکر کیا جائے گا پوری ہو جائے تو ملک معظم شاہی اعلان کے ذریعہ اس بات کو ظاہر

کر سکتے ہیں کہ فلاں تاریخ سے تاج برطانیہ کی ماتحتی میں فیڈریشن آف انڈیا کے نام سے مندرجہ ذیل کو متحد کیا جاتا ہے :۔

(الف) صوبے جنھیں آئندہ سے گورنروں کے صوبے کہا جائے گا۔

(ب) ہندوستانی ریاستیں جنھوں نے فیڈریشن میں شامل ہونا قبول کر لیا ہے یا جو بعد میں شامل ہونا قبول کریں گی۔ اور جو فیڈریشن اس طرح قائم ہو گی اس میں وہ صوبے بھی شامل ہوں گے جو آئندہ سے چیف کمشنر کے صوبے کہلائیں گے۔

(۲) جس شرط کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایسی ریاستیں فیڈریشن میں شامل ہونا قبول کر لیں :۔

(الف) جن کے حکمراں کم سے کم ۵۲ اراکین کونسل آف اسٹیٹ کے لئے چننے کے مجاز ہوں اور

(ب) جن کی مجموعی آبادی کل ریاستوں کی آبادی کی کم سے کم نصف ہو۔

دفعہ (۶) (۱) جب ملک معظم کسی ریاست کے تیار کئے ہوئے دستاویز شرکت کو قبول کریں گے تو سمجھا جائے گا کہ وہ ریاست فیڈریشن میں شامل ہو گئی ہے۔

ریاست کے لئے فیڈریشن میں شامل ہونے کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ :۔

(الف) ملک معظم، گورنر جنرل، فیڈرل لیجسلیچر، فیڈرل کورٹ اور دوسرے فیڈرل اداروں کو اپنے علاقہ میں ان فرائض کو پورا کرنے دے گی جنھیں وہ فیڈریشن کے سلسلہ میں اور دستاویز شرکت کے معاہدہ کے مطابق اس کے علاقہ میں انجام دینا چاہیں گے۔

(ب) اس پابندی کو قبول کرے گی کہ دستاویز شرکت کی حد تک قانون حکومت ہند کی دفعات کو اپنے علاقہ میں نافذ کرنے کی ضمانت کرے گی۔

(۲) دستاویز شرکت میں ان امور کو بیان کیا جائے گا جن کے بارے میں والی ریاست اس بات کو قبول کرے گا کہ فیڈرل لیجسلیچر اس کی ریاست کے لئے قانون بنا سکتی ہے اور اس میں اگر ضرورت

سمجھی جائے گی تو ان حدود کا بھی ذکر ہوگا جس کی فیڈرل لیجسلیچر ریاست کے لئے قوانین بناتے وقت یا اپنے اختیارات عاملہ کو استعمال کرتے وقت پابند ہوگی۔

(۳) (دستاویز شرکت میں ترمیم کے بارے میں)

(۴) اس دفعہ میں جو کچھ درج ہے، اس کا یہ مطلب کسی طرح نہیں لیا جا سکتا کہ ملک معظم کسی دستاویز شرکت یا اس کی ترمیم کو منظور کرنے کے لئے پابند ہیں سوائے اس صورت کے کہ وہ اس کو قبول کرنا مناسب خیال کریں یا یہ کہ اس دفعہ سے ملک معظم کو اس بات کا اختیار مل گیا ہے کہ وہ کسی ایسی دستاویز شراکت کو منظور کر سکتے ہیں جس کی شرائط اس ایکٹ میں درج کی ہوئی فیڈریشن کی اسکیم کے منافی ہوں۔

لیکن اس میں یہ شرط ضرور ہے کہ اگر ملک معظم نے کسی دستاویز کی شرائط کو قبول کر لیا ہو تو فیڈریشن کے قائم ہو جانے کے بعد اس دستاویز کی یا اس کی شرائط کی صحت میں شبہ اور سوال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی اور اس ایکٹ پر عمل درآمد اس خاص ریاست کے لئے دستاویز شراکت کی شرائط کے مطابق ہی ہوگا۔

دفعہ (۷) (۱) اس ایکٹ کی شرائط کے ماتحت فیڈریشن کے عاملانہ اختیارات ملک معظم کی طرف سے گورنر جنرل براہ راست یا ماتحت افسروں کے ذریعہ انجام دے گا، لیکن اس دفعہ سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ فیڈرل لیجسلیچر کو ماتحت افسروں کو اختیارات عطا کرنے سے منع کیا گیا ہے نہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ موجودہ ہندوستانی قانون نے جو حق کسی عدالت یا جج یا افسر کو یا کسی مقامی یا کسی دوسرے صاحب اقتدار شخص کو دے رکھا ہے وہ گورنر جنرل کو منتقل ہو جائے گا۔

دفعہ (۸) (۱) اس ایکٹ کے ماتحت فیڈریشن کے عاملانہ اختیارات میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں:-

(الف) وہ تمام معاملات جن کے بارے میں فیڈرل لیجسلیچر کو قانون بنانے کا اختیار ملا ہوا ہو (ملاحظہ ہو ضمیمہ صفحہ)

(ب) ملک معظم کی طرف سے بحری، بری اور ہوائی فوجوں کا بھرتی کرنا اور ملک معظم کی ان فوجوں

پر جن کا ہندوستان کی فوجوں میں شمار ہے حکومت کرنا۔

(ج) ان حقوق اور اختیارات کا استعمال جن کا قبائلی علاقوں کے لئے استعمال کرنے کا حق ملک معظم کو معاہدہ، عطیہ، رواج، رواداری یا کسی اور دوسرے طریقہ پر ملا ہوا ہے۔

لیکن شرط یہ ہے کہ

(i) یہ اختیار سوائے اس صورت کے کہ جہاں ایکٹ میں اس بات کا صراحت کے ساتھ ذکر ہو صوبوں کے ان معاملات پر نہیں ہے جن کے بارے میں صوبوں کی مجلس قانون ساز کو قانون بنانے کا اختیار ملا ہوا ہے۔

(ii) یہ اختیار سوائے اس صورت کے کہ جہاں ایکٹ میں اس بات کا صراحت کے ساتھ ذکر ہو فیڈریشن میں شامل ہونے والی ریاستوں کے معاملات پر نہیں ہے اور ان معاملات میں بھی جن کے لئے فیڈرل مجلس قانون ساز کو ریاست کے لئے قانون بنانے کا اختیار ملا ہوا ہے، اس اختیار کا استعمال ہر ریاست میں ان حدود کا پابند ہوگا جن کا ذکر وثیقہ شمولیت میں ریاست نے کیا ہوگا۔

(۲) اس ایکٹ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے باوجود فیڈریشن میں شامل ہونے والی ریاست کے عاملانہ اختیار ان معاملات میں جن کے قوانین بنانے کا فیڈرل لیجسلیچر کو اختیار ہوگا حسب سابق باقی رہیں گے سوائے ان صورتوں کے جہاں فیڈریشن کے عاملانہ اختیارات ایسے ہوں گے کہ وفاقی قانون کے مطابق ان سے ریاست کے حکمران کے اختیارات کا ازالہ ہو جائے گا۔

دفعہ (۹) گورنر جنرل کو اپنے فرائض کے پورا کرنے کے سلسلہ میں مدد اور مشورہ دینے کے لئے (سوائے ان صورتوں کے کہ جہاں وہ اس ایکٹ کے ماتحت اپنے فرائض کو اپنے اختیار تمیزی سے پورا کرے گا) وزیروں کی ایک کونسل ہوگی جن کی تعداد دس سے زیادہ نہ ہوگی۔

لیکن شرط یہ ہے کہ اس دفعہ میں جو کچھ درج ہے اس کی بنا پر گورنر جنرل کو کسی معاملہ میں جہاں اسے اس ایکٹ کے ماتحت اپنی انفرادی رائے کے استعمال کرنے کا حق دیا گیا ہے، انفرادی

رائے کے استعمال کرنے کی ممانعت نہیں ہوگی۔

دفعہ (۱۰) (۱) وزرا کا انتخاب اور ان کو طلب گورنر جنرل خود ہی کرے گا انھیں قسم بھی دہی دلائے گا اور جب تک اس کی خوشی ہوگی وہ انھیں اپنا وزیر بنائے رکھے گا۔

(۲) جو وزیر چھ مہینے تک مسلسل فیڈرل لیجسلیچر کے دونوں ایوانوں میں سے کسی ایک کا ممبر نہیں ہوگا وہ جب یہ مدت گذر جائے گی وزیر نہ رہ سکے گا۔

(۳) وزیروں کی تنخواہیں فیڈرل لیجسلیچر وقتاً فوقتاً مقرر کرتی رہے گی اور جب تک فیڈرل لیجسلیچر انھیں مقرر نہ کرے گی یہ کام گورنر جنرل کرتا رہے گا۔

لیکن شرط یہ ہے کہ کسی وزیر کی تنخواہ اس کے دوران ملازمت میں بدلی نہیں جاسکتی۔

(۵) وزرا کے انتخاب، طلب اور برطرف کرنے اور ان کی تنخواہ کے مقرر کرنے کے سلسلہ میں گورنر جنرل کی ذمہ داریاں اس کی اختیار تمیزی کی پابند ہوں گی۔

دفعہ (۱۱) گرجوں کے معاملات، مدافعت اور معاملات خارجہ کے بارے میں (فیڈریشن اور ملک معظم کے ڈومینینس سے باہمی تعلقات کو چھوڑ کر) گورنر جنرل اپنے فرایض کو اپنے اختیار تمیزی سے پورا کرے گا۔ اسی طرح قبائلی علاقوں کے بارے میں بھی وہ اپنے فرائض اور تعلق کو اسی طرح پورا کرے گا۔

دفعہ (۱۲) (۱) اپنے فرائض کے پورا کرنے کے سلسلہ میں گورنر جنرل کی مندرجہ ذیل خاص ذمہ داریاں ہوں گی:-

(الف) ہندوستان کے امن و امان کو برہم کرنے والے خطروں کا تدارک

(ب) فیڈرل گورنمنٹ کے مالی استحکام اور اعتبار کا تحفظ

(ج) اقلیتوں کے جایز مفاد کا تحفظ

(د) جو لوگ پبلک سروسوں میں ہیں یا رہ چکے ہیں ان کے یا ان کے متعلقین کے ان حقوق کی ضمانت جو اس ایکٹ کے ماتحت انھیں دئے یا ان کے لئے محفوظ کئے گئے ہیں اور ان کے قانونی

مفاد کا تحفظ۔

(ہ) سلطنت متحدہ میں آباد برطانوی رعایا کے خلاف اگر کوئی نقصان رساں امتیازی برتاؤ کیا جائے تو اس کا تدارک عاملانہ اختیارات سے کرنا

(و) سلطنت متحدہ برطانیہ یا برما سے برآمد ہونے والے مال کے خلاف اگر امتیازی یا تعزیری محصول لگائے جائیں تو ان کا تدارک کرنا۔

(ز) ہندوستانی ریاستوں کے حقوق اور ان کے حکمرانوں کے حقوق و اعزازات کا تحفظ کرنا۔

(۲) جہاں کہیں گورنر جنرل کی خاص ذمہ داریوں کا سوال پیدا ہوگا گورنر جنرل اپنے فرائض کو اپنی انفرادی رائے کے مطابق پورا کرے گا۔

دفعہ (۱۸) (۱) ایک فیڈرل لیجسلیچر ہوگی جس میں ملک معظم کی نمایندگی گورنر جنرل کریں گے اور دو ایوان ہوں گے جنھیں کونسل آف اسٹیٹ اور فیڈرل اسمبلی کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔

(۲) کونسل آف اسٹیٹ میں برطانوی ہندوستان کے ۱۵۶ اور ہندوستانی ریاستوں کے ۱۰۴ نمایندوں سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ فیڈرل اسمبلی میں برطانوی ہندوستان کے ۲۵۰ اور ہندوستانی ریاستوں کے ۱۲۵ سے زیادہ نمایندہ نہیں ہوں گے۔

(۳) برطانوی ہندوستان کے نمایندے کو رائے دینے کی اہلیت رکھنے والے لوگ اس ایکٹ میں دئے ہوئے نقشہ نمبر ایک حصہ اول کے مطابق منتخب کرکے بھیجیں گے۔ ریاستوں کے نمایندوں کا انتخاب اور تقرر ایکٹ میں دئے ہوئے نقشہ نمبر ایک حصہ دوم کے مطابق کیا جائے گا۔

دفعہ (۹۹) اس ایکٹ کے اندر رہتے ہوئے فیڈرل لیجسلیچر تمام ہندوستان یا اس کے ایک حصہ یا فیڈریشن میں شریک کسی ریاست کے لئے قانون بناسکتی ہے اور صوبہ کی لیجسلیچر صرف صوبہ یا اس کے ایک حصہ کے لئے بنا سکتی ہے۔

دفعہ (۱۰۰) (۱) فیڈرل لیجسلیچر کو قوانین بنانے کا اختیار ان تمام معاملات کے بارے میں ملا ہوا ہے

جن کا ذکر ایکٹ کے ساتویں نقشہ کی پہلی فہرست میں کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو ضمیمہ صفحہ ۲۵۰

(۲) فیڈرل لیجسلیچر کو قوانین بنانے کا حق صوبوں کے ساتھ ان مشترکہ معاملات کے بارے میں بھی ملا ہوا ہے جن کا ذکر ایکٹ کے ساتویں نقشہ کی تیسری فہرست میں کیا گیا ہے۔

دفعہ (۱۰۱) اس ایکٹ کی کسی بات سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ فیڈرل لیجسلیچر کو فیڈریشن میں شریک کسی ریاست کے لئے وثیقہ شراکت کے علاوہ اور دوسرے معاملات کے لئے بھی قانون بنانے کا حق ملا ہوا ہے۔

دفعہ (۱۲۲) صوبہ اور فیڈریشن میں عاملانہ اختیارات کو اس طرح استعمال کیا جائے گا کہ ان سے فیڈرل لیجسلیچر کے قوانین کے لئے ان صوبوں اور ریاستوں میں جن میں یہ نافذ کئے جائیں عزت اور احترام پیدا ہو۔

دفعہ (۱۲۵) (۱) والیان ریاست یا ان کے افسروں کو فیڈرل لیجسلیچر کے ان قوانین کو جو معاہدے یا ریاست کے وثیقہ شراکت کی رو سے ان کی ریاست کے لئے بنائے جا سکتے ہیں اپنے علاقہ میں نافذ کرنا ہوگا۔

(۲) اس دفعہ کے ماتحت جو معاہدے ہوں گے ان میں گورنر جنرل کو یہ اختیار بھی دیا جائے گا کہ وہ اپنے اختیار تمیزی سے اس بات کی طرف سے اپنا اطمینان کرتا رہے کہ ریاست میں جس قانون کے نافذ کیے جانے کا معاہدہ ہوا ہے اس پر عمل درآمد فیڈرل حکومت کی پالیسی کے مطابق ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر اسے اطمینان نہ ہو تو اپنے اختیار تمیزی سے کام لیتے ہوئے وہ ایسی ریاست کے نام جن ہدایتوں کو ضروری اور مناسب سمجھے روانہ کر سکتا ہے۔

دفعہ (۱۲۸) (۱) ہر فیڈریشن میں شریک ریاست اپنے عاملانہ اختیارات کا استعمال اس طرح کرے گی جس سے فیڈریشن کے عاملانہ اختیارات کو جہاں تک وہ فیڈرل لیجسلیچر کے مطابق اس ریاست میں جاری کئے جا سکتے ہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔

(۲) اگر گورنر جنرل کو یہ معلوم ہو کہ فیڈریشن میں شریک کسی ریاست کا رئیس اپنے فرائض کو پورا

نہیں کر رہا ہے تو گورنر جنرل اپنے اختیار تمیزی سے کام لے کر والی ریاست کی معروضات سننے کے بعد اس کے نام جو مناسب سمجھے ہدایتیں جاری کر سکتا ہے۔

لیکن شرط یہ ہے کہ اگر کسی معاملہ میں فیڈریشن کے عاملانہ اختیارات کا مسئلہ بجائے خود بحث میں آجائے تو اس صورت میں یہ معاملہ فیڈریشن یا والیٔ ریاست کی طرف سے فیڈرل کورٹ کے فیصلہ کے لئے پیش کیا جا سکتا ہے۔

دفعہ (۲۸۵) اس ایکٹ میں جو کچھ درج کیا گیا ہے اس کی بنا پر ریاستوں سے متعلق تاج برطانیہ کی جو ذمہ داریاں یا حقوق ہیں ان میں کوئی فرق نہیں آتا البتہ فیڈریشن میں شریک ریاستوں کے لئے یہ حقوق اور ذمہ داریاں ان ریاستوں کے وثیقہ شراکت کی پابند ہوں گی۔

دفعہ (۲۸۶) (۱) اگر ملک معظم کے نمائندہ کو ریاستوں سے متعلق اپنے فرائض منصبی پورا کرنے کے سلسلہ میں مسلّح فوجوں کی امداد کے لئے درخواست کرنا پڑے گی تو گورنر جنرل کا فیڈریشن کے عامل کے فرائض انجام دینے کے سلسلہ میں یہ فرض ہوگا کہ اس درخواست کے مطابق مسلّح فوجوں کا استعمال کرے۔ لیکن ان فوجوں کو اس طرح استعمال کرنے کے سلسلہ میں جو خالص زائد خرچ ہوگا اسے ملک معظم کا وہ خرچ سمجھا جائے گا جو تاج برطانیہ کے فرائض انجام دینے کے سلسلہ میں کیا گیا۔

(۲) گورنر جنرل اس دفعہ کے ماتحت اپنے فرائض کو پورا کرنے کے لئے اپنے اختیار تمیزی سے کام لے گا۔

دفعہ (۲۸۷) ریاستوں سے متعلق تاج برطانیہ کے جو فرائض ہیں ان کے بارے میں ملک معظم کا نمائندہ یہ انتظام کر سکتا ہے کہ صوبہ کے گورنر اور اس کے وہ افسر جو صرف صوبہ کے معاملات کے سلسلہ میں کام کرتے ہیں تاج برطانیہ کے مندرجہ بالا فرائض کو بھی انجام دینے لگیں۔

ضمیمہ

قانون حکومت ہند کی وفاقی مدات

(۱) ملک معظم کی برّی، بحری اور فضائی افواج جن کے خرچ کا بار ہندوستان کے فوجی محکمہ کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اور ایسی افواج جن کی بھرتی ہندوستان میں کی جائے لیکن اس میں وہ فوجیں جو ہندوستانی ریاستوں یا صوبہ کی حکومتوں کی مسلح پولس کے لئے بھرتی کی جائیں شامل نہ ہوں گی — اس کے علاوہ تمام ایسی مسلّح افواج جو ملک معظم کی افواج تو نہیں ہیں لیکن جو ملک معظم کی ان بحری، برّی اور فضائی افواج کے ساتھ وابستہ ہیں اور جن کا خرچ ہندوستان کا فوجی محکمہ برداشت کرتا ہے — مرکزی محکمہ تفتیش۔ مدافعت، معاملات خارجہ یا دیسی ریاستوں کے سلسلہ میں فرائض منصبی کو پورا کرنے کے لئے حفظ ماتقدم کے طور پر لوگوں کو حراست میں رکھنا۔

(۲) بحری، بری اور فضائی افواج کے لئے سرکاری تعمیرات — چھاؤنیوں کی لوکل سلف گورنمنٹ (اس میں ہندوستانی ریاستوں کے چھاؤنیوں کے علاقہ شامل نہیں ہیں) — ان علاقوں میں اور برطانوی ہندوستان میں مکانوں کی گنجائش کی نگرانی کرنا اور ان علاقوں کی حد بندی کرنا۔

(۳) خارجی معاملات۔ دوسرے ملکوں سے معاہدے اور سمجھوتے کرنا — ملک سے خارج کرنا جس میں ملک معظم کے دوسرے مقبوضات کے مجرموں کا حوالہ کرنا بھی شامل ہے۔

(۴) گرجے کے معاملات جس میں یورپینوں کے قبرستان بھی شامل ہیں۔

(۵) کرنسی، سکہ سازی اور زر قانونی۔

(۶) فیڈریشن کا قرضہ عامہ۔

(۷) ڈاک اور ٹیلیگراف جس میں ٹیلیفون، وائرلیس، براڈ کاسٹنگ اور اسی قسم کے دوسرے ذرائع رسل و رسائل بھی شامل ہیں۔ ڈاک خانہ کے سیونگس بنک۔

(۸) فیدریشن کی سرکاری ملازمتیں اور فیڈرل پبلک سروس کمیشن

(۹) وفاقی پنشنیں یعنی ایسی پنشنیں جو فیڈریشن کی طرف سے واجب الادا ہوں گی یا فیڈریشن کی آمدنی سے ادا کی جائیں گی۔

(۱۰) تعمیرات، زمینیں، مکانات جو ملک معظم کے قبضہ میں فیڈریشن کے سلسلہ میں ہوں گے (یہ بحری، برّی، اور ہوائی فوج کی تعمیرات کے علاوہ ہوں گے) لیکن جو جائداد صوبہ میں واقع ہوگی وہ صوبہ کے قانون کی پابند ہوگی سوائے اس صورت کے کہ فیڈریشن اس کے بارے میں اپنا کوئی قانون خاص طور پر بنائے۔ رہیں فیڈریشن میں شریک ریاستوں کی ایسی جائدادیں جن پر پٹہ یا معاہدہ کی بنا پر قبضہ کیا گیا ہے سو وہ پٹہ یا معاہدہ کی شرائط کی پابند ہوں گی۔

(۱۱) امپیریل لائبریری، انڈین میوزیم۔ امپیریل جنگی میوزیم۔ وکٹوریہ میموریل یا اسی قسم کا کوئی اور ادارہ جس کی نگرانی اور خرچ فیڈریشن کے ہاتھ میں ہو۔

(۱۲) مندرجہ ذیل مقاصد کے لئے جو فیڈرل ایجنسیاں اور ادارے قائم کیے جائیں:۔ یعنی تحقیقات علمی، پیشہ اور فن کی تعلیم یا خاص علوم کی ترقی کے لئے۔

(۱۳) بنارس ہندو یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

(۱۴) سروے آف انڈیا۔ جیولوجیکل، بوٹانیکل اور زوآلجیکل سرویز آف انڈیا۔ فیڈرل میٹی اور ولاجیکل محکمے۔

(۱۵) قدیم اور تاریخی آثار۔ آثاری مقامات اور باقیات

(۱۶) مردم شماری

(۱۷) ہندوستان میں داخلہ، ترک سکونت یا اخراج اس میں ان لوگوں کی نقل و حرکت

کی نگرانی بھی شامل ہے جو ہندوستان میں سکونت کی وجہ سے برطانوی رعایا نہیں بن سکے ہیں جو فیڈریشن میں شریک ریاستوں کی رعایا ہیں یا جو سلطنت متحدہ میں سکونت رکھنے والی برطانوی رعایا ہیں۔ ہندوستان سے باہر کے ملکوں کی زیارت اور حج۔

(۱۸) بندرگاہ کا قرنطینہ۔ ملاحوں کے اسپتال اور بندرگاہوں کے قرنطینہ سے متعلق اسپتال۔

(۱۹) کروڑگیری کے ان حدود کے اندر و باہر درآمد و برآمد جن کی تعریف و تحدید فیڈرل گورنمنٹ کردے۔

(۲۰) وفاقی ریلیں۔ بہت چھوٹی ریلوں کو چھوڑکر باقی سب ریلوں میں مندرجہ ذیل باتوں کی نگرانی:۔ تحفظ جان و مال کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ کرایہ اور محصول۔ اسٹیشن اور سروس ٹرمنل کے محاصل۔ مسافر اور مال کا منتقل کرنا۔ مسافر اور مال کے لئے ریلوے کے منتظموں کی ذمہ داری ۔ چھوٹی ریلوں کے لئے تحفظ جان و مال اور ان ریلوں پر سفر کرنے والے مسافروں اور مال کے لئے منتظموں کی ذمہ داری۔

(۲۱) سمندری سفروں کے لئے جہازوں کو بھرنا اور جہازرانی جس میں جوار بھاٹے کی امید پر جہاز بھرنا اور جہازرانی کرنا بھی شامل ہے۔ محکمہ بحر کے اختیارات کے حدود۔

(۲۲) بڑی بندرگاہ یعنی ان بندرگاہوں کی حدبندی اور ان کے بااختیار افسروں کے اختیارات اور دستور کا تعین۔

(۲۳) آبی حدود سے باہر ماہی گیری اور ذخائر ماہی

(۲۴) فضائی بیڑہ اور فضائی جہازرانی۔ ایروڈروم کا قائم کرنا۔ فضائی آمدورفت اور ایروڈروم کی نگرانی۔

(۲۵) روشنی کے مینارے جس میں روشنی کے جہاز، اشارہ کرنے والی روشنیاں اور بحری ہوائی جہازوں کے تحفظ کے لئے دوسرے انتظامات شامل ہیں۔

(۲۶) ہوا اور سمندر میں مسافروں اور مال کا لے جانا

(۲۷) کاپی رائٹ، ایجادیں، ڈیزائن، ٹریڈ مارک اور مال کے امتیازی نشانات

(۲۸) چیک، ہنڈیاں، پرامیسری نوٹ اور اسی طرح کے دوسرے آلات اعتبار

(۲۹) ہتیار، آتشین ہتیار، بارود۔

(۳۰) پھٹنے والی چیزیں۔

(۳۱) افیون جہاں تک اس کی کاشت کا، افیوں سازی کا یا برآمد کے لئے فروخت کرنے کا تعلق ہے۔

(۳۲) پٹرولیم اور دوسرے مائیات اور اشیا جن کو خطرناک حد تک آتشگیر سمجھا جاتا ہے جہاں تک ان کے قبضے، ذخیرہ رکھنے اور منتقل کرنے کا تعلق ہے۔

(۳۳) کارپوریشنز یعنی تجارتی کمپنیوں کا بنانا، ان کی نگرانی اور ان کے کاروبار کو ختم کرنا۔ اس میں ساہوکارے، بیمہ اور کاروبار کے لئے روپیہ فراہم کرنے والی کمپنیاں شامل ہیں۔ لیکن فیڈریشن میں شریک ریاستوں کی وہ کمپنیاں شامل نہیں ہیں جو ریاستوں کی نگرانی اور ملکیت میں ہیں اور جن کا کاروبار صرف ریاست کے اندر محدود ہے۔ یا امداد باہمی کی انجمنیں اور ایسی کمپنیاں جو تجارتی ہوں یا نہ ہوں جن کے مقاصد صرف ایک واحد تک محدود نہیں ہیں۔

(۳۴) صنعتوں کی ترقی اگر فیڈرل قانون کے ذریعہ صنعتوں کو ترقی دینا مفاد عامہ کے مصالح کے مطابق سمجھا جائے۔

(۳۵) معدنوں اور تیل کے چشموں کی حفاظت اور ان کے مزدوروں کی نگرانی۔

(۳۶) معدنوں اور تیل کے چشموں اور معدنی ترقی کی نگرانی جس حد تک مفاد عامہ کے پیش نظر اور فیڈرل قانون کے ماتحت ان کو فیڈرل نگرانی میں لانا مصلحت کے مطابق ہو۔

(۳۷) بیمہ کے بارے میں قانون اس بیمہ کو مستثنیٰ کرنے کے بعد جسے فیڈریشن میں شریک ریاستیں انجام دیں۔ بیمہ کے کاروبار کی نگرانی فیڈریشن میں شریک ریاستوں کے کاروبار کو مستثنیٰ کرنے کے بعد۔ سرکاری بیمہ اس بیمہ کو مستثنیٰ کرنے کے بعد جو فیڈریشن میں شریک ریاستیں کریں یا جسے

صوبوں میں پراونشل قانونی فہرست میں شامل کر کے یا دونوں قانونی فہرستوں میں بہ یک وقت شامل کر کے صوبوں کی طرف سے کیا جائے۔

(۳۸) ساہوکارہ یعنی کمپنیوں کی طرف سے جو ساہوکارے کا کاروبار کیا جائے اس سے وہ کمپنیاں مستثنیٰ ہیں جن کی نگرانی یا ملکیت فیڈریشن میں شریک ریاستوں کو حاصل ہے اور جو صرف ان ریاستوں کی حدود کے اندر ہی اپنا کام کرتی ہیں۔

(۳۹) کسی دوسرے گورنر یا چیف کمشنر کے صوبہ میں برطانوی ہندوستان کے کسی حصہ کی پولس کے حدود اور اختیارات کی توسیع لیکن اس کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ کسی ایک حصہ کی پولس دوسرے حصہ میں اس صوبہ کی حکومت یا چیف کمشنر کی مرضی کے بغیر اپنے حدود اور اختیارات کو وسعت دے سکے۔ ایک واحدے کی پولس کے حدود اور اختیارات کی توسیع ریلوے کے علاقوں کے دوسرے واحدوں تک۔

(۴۰) اس قانون اور اس کے ضمن میں جو دوسرے آرڈر ان کونسل بنائے جائیں ان کی نگرانی میں وفاقی مجلس قانون ساز کے انتخابات۔

(۴۱) وفاقی وزراء کونسل آف اسٹیٹ کے پریسیڈنٹ، وائس پریذیڈنٹ، فیڈرل اسمبلی کے اسپیکر اور ڈپٹی اسپیکر کی تنخواہیں۔ فیڈرل مجلس قانون ساز کے ممبروں کی تنخواہیں، بھتّے اور حقوق۔ اور جہاں تک اس قانون کا حصہ دوم اجازت دیتا ہے ان اشخاص کو سزا دینا جو مجلس قانون ساز کی کمیٹیوں کے سامنے شہادت دینے یا دستاویزیں پیش کرنے سے انکار کریں۔

(۴۲) اس فہرست میں جو امور درج ہیں ان کی خلاف ورزی کے الزامات

(۴۳) فہرست میں جو امور درج ہیں ان کے سلسلہ میں تحقیقاتیں اور اعداد و شمار

(۴۴) کروڑگیری کے محاصل جس میں برآمد کے محاصل بھی شامل ہیں

(۴۵) تمباکو اور دوسری اشیاء پر جو ہندوستان میں بنائی جائیں یا پیدا کی جائیں محاصل اکسائز لیکن ان میں مندرجہ ذیل شامل نہیں ہیں :-

(i) الکوہل کے ایسے مشروبات جو انسانی صرف کے لئے تیار کئے جائیں

(ii) افیوں، بھنگ اور دوسری نشہ آور دوائیں اور منشیات اور غیر نشہ آور دوائیں

(iii) دوا اور سنگار کے لئے ایسی تیار کی ہوئی چیزیں جن میں الکوہل موجود ہو یا ایسی کوئی چیز ہو جس کا اوپر (ii) میں تذکرہ کیا گیا ہے۔

(۴۶) کارپوریشن ٹیکس

(۴۷) نمک

(۴۸) سرکاری لاٹریاں

(۴۹) نیچورالائیزیشن

(۵۰) ہندوستان کے اندر کسی ایک گورنر یا چیف کمشنر کے صوبہ سے دوسرے صوبہ کے لئے نقل سکونت

(۵۱) اوزان کے معیار کا تعین

(۵۲) رانچی کا یوروپینوں کے لئے دماغی ہسپتال

(۵۳) فہرست میں درج کئے ہوئے جملہ امور کے بارے میں وفاقی عدالت کے علاوہ باقی تمام عدالتوں کے حدود اور اختیارات کا تعین اور اس حد تک جس کی قانون کے نویں حصہ میں صراحت کے ساتھ اجازت ہے وفاقی عدالت کے حدود کی توسیع اور اس کو مزید اختیارات کا عطا کرنا۔

(۵۴) زراعتی آمدنی کے علاوہ باقی تمام آمدنیوں پر محصول

(۵۵) زراعتی زمین کو چھوڑ کر افراد اور کمپنیوں کی باقی تمام جایدادوں کی قیمت پر محصول۔ کمپنیوں کے سرمایہ پر محصول۔

(۵۶) زراعتی زمین کے علاوہ باقی سب طرح کے ترکہ اور وراثت پر محصول

(۵۷) ہنڈیوں، چکوں، پرامیسری نوٹ، بل آف لیڈنگ، اعتبار ناموں، بیمہ کی پالیسیوں، عبوضی

اور رسیدوں پر اسٹامپ کے محاصل کی شرحیں۔

(۵۸) ریل یا ہوا سے جو مسافر یا مال لے جائے جائیں ان پر ٹرمنل ٹیکس۔ ریلوے محصولوں اور کرایوں پر محصول۔

(۵۹) اس فہرست میں درج کئے ہوئے امور پر فیس لیکن اس میں عدالت کی فیس شامل نہیں ہیں۔

غازی مصطفےٰ کمال پاشا

(از جناب محمد سرور صاحب استاذ تاریخ و اسلامیات جامعہ)

(یہ مضمون اس جلسہ میں سنایا گیا تھا جو غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی تعزیت کے لئے جامعہ میں منعقد کیا گیا تھا)

پرسوں جمعرات کی صبح کو ایک طویل علالت کے بعد غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے انتقال فرمایا، ان کی موت کا صدمہ کون ہے جس نے محسوس نہ کیا ہو، ان کے عقیدت مند، ان کے بہت سے کاموں کو سراہنے والے اور بعض پر اعتراض کرنے والے ان کے مخالفین اور ان کے سخت دشمن سب کے سب اس حادثہ سے متاثر ہیں، کوئی زیادہ متاثر ہے اور کوئی کم، دنیا کے حالات سے خبر رکھنے والا کوئی انسان ایسا نہ ہوگا جس نے مصطفےٰ کمال پاشا کی وفات کی خبر سنی ہو اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز شخصیت کا نقشہ نہ کھچ گیا ہو، مصطفےٰ کمال کو ماننے والے بہت سے تھے اور ان کو ناپسند کرنے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ لیکن مرحوم کی بڑائی یہ ہے کہ ان کے دوست تو عقیدت کیش تھے ہی ان کے سخت سے سخت دشمن بھی ان کی عظمت کے معترف ہیں ان کے کام اہم تھے اور بڑے کاموں کا انکار مشکل ہوتا ہے، اور یہی وہ صفت ہے جس کے کمال کا مظہر مصطفےٰ کمال کی ذات ہے۔

مصطفےٰ کمال پیدا ہوئے تو ترکی قوم مر رہی تھی۔ ان کی پرورش کا زمانہ قوم کی زندگی اور موت کی کشمکش میں گذرا جوان ہوئے تو قوم اس جان ہار کشمکش سے نڈھال ہو کر موت کی راہ تک رہی تھی اس نازک وقت میں مصطفےٰ کمال نے قوم کو سنبھالا اس کے مردہ جسم میں نئی روح ڈالی اس کی موت کو زندگی سے بدلا، اور نئی روح کو نیا قلب دیا، وہ بوڑھی قریب المرگ قوم اب جوان ہے اور آج جب وہ مر گئے تو اپنے پیچھے ایک زندہ اور توانا قوم چھوڑ گئے ہیں۔

عثمانی ترک ریوڑ چراتے چراتے بادشاہ بن گئے۔ سلطان سلیم اور سلیمان کا دور ان پر ایسا بھی گزرا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی سات زمین اور سات سمندر ان کے قبضہ میں تھے زمانہ بدلا تو یہ بھی بدل گئے سلاطین عیاشی میں پڑ گئے، فوج بے سری رہ گئی۔ علم و تدبیر کے مالک خواہشات کے غلام بن کر رہ گئے، عوام بے چارے بے زبان تھے۔ حکومت نااہلوں کے ہاتھ میں تھی ظلم و جبر جس کا شعار تھا اور کمزور بری طرح پیسے جاتے تھے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں وطن پروروں کی ایک جماعت نے اپنی قوم کی بری حالت کو درست کرنے کی کوشش کی تھی۔ شروع شروع میں تو ان کی مساعی کامیاب ہوگئیں، لیکن جب سلطان خلیفہ بنا تو اس نے اپنے ان دوستوں کی قیود کو گراں جانا اور ایک ایک کر کے اصلاح کے سب کام روک دئے اور وطن پروروں کے لیڈر مدحت پاشا کو بری طرح قتل کرا دیا۔ اس کے بعد یہ ظالم سلطان ۳۳ برس تک برسر اقتدار رہا اس طویل زمانہ میں کون ظلم تھا جو اٹھا نہ رکھا گیا ہو، ضمیر و زبان کی آزادی جرم تھی۔ رشوت اور خوشامد حکومت کا دستور تھا نااہل لوگ بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والے قتل ہوتے یا جلا وطن۔ تعلیم گاہیں بند کر دی گئیں۔ آزادی پیدا کرنے والی کتابیں ملک میں نہ آ سکتی تھیں۔ رعایا تباہ تھی۔ کوئی غیرت مند نوجوان جاسوسوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ تھا۔ ملک کی اس گری ہوئی حالت کو دیکھ کر یورپی حکومتوں نے سلطنت کے حصے بخرے کرنے شروع کئے، مصر برطانیہ نے دبالیا، ٹیونس فرانس نے بلقان کی ریاستیں ایک ایک کر کے آزاد ہوگئیں۔ روس آئے دن قسطنطنیہ پر چڑھ دوڑتا تھا۔ خود سلطنت کے اندر جو عیسائی اقلیتیں تھیں وہ یورپی حکومتوں کی شہ پاکر ہر وقت آمادۂ فساد رہتی تھیں۔ سلطنت دیوالیہ ہو چکی تھی۔ قرضے لے لے کر حکومت کا کاروبار چلایا جاتا۔ اور ہر نئے قرض دینے والے کو ملک کا کوئی نہ کوئی انتظامی شعبہ سونپ دیا جاتا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ سلطنت میں جو اجنبی آباد تھے وہ ملک کے قوانین سے بالا تھے۔ ان کی سرزدریاں نہ ترکی پولیس روک سکتی تھی اور نہ ترکی حکومت ان کو سزا دے سکتی تھی، وہ ٹیکسوں سے محفوظ تھے اور اگر ان میں سے کسی کو ذرا سی تکلیف پہنچ جاتی تو اس کی حکومت ترکی کو اعلان

جنگ دینے پر اتر آتی۔ استبداد اور ذلت کی اس سے بڑھ کر کونسی حد ہو سکتی ہے۔ سلطان عبدالحمید کے یہ تو مظالم تھے لیکن وہ ظل اللہ کے نام سے پوجا جاتا تھا۔ محراب منبر سے اس کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگی جاتی تھیں، مذہبی طبقے ان مظالم کی تائید میں تھے اور اطاعتِ خلیفہ کو اطاعت اللہ قرار دیتے تھے۔

اس ظلم و جور ذلت اور بے بسی کی فضا میں مصطفےٰ کمال نے آنکھیں کھولیں باپ کا سایہ بچپن ہی سے سر سے اٹھ گیا تھا ماں نے مذہبی تعلیم دلوانے کی کوشش کی لیکن مصطفےٰ کمال کی سرکش طبیعت استاد کی سختی کی متحمل نہ ہو سکی چنانچہ وہ بھاگ نکلا کچھ زمانہ ننھیال میں آوارگی میں گذرا پھر ایک فوجی مدرسہ میں داخلہ ہوا اور بھگوڑا طالب علم اس مدرسہ میں آکر سب سے قابل اور محنتی بن گیا مدرسہ سے فارغ ہو کر مصطفےٰ قسطنطنیہ کے فوجی کالج میں پہنچا اور اپنی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے اپنے ساتھیوں میں نہایت عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

نوجوان مصطفےٰ نے عجیب طبیعت پائی تھی اپنے ساتھیوں سے بہت کم تعلق رکھتا تھا اکثر خاموش رہتا سرکشی کا یہ حال تھا کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا نہ کسی کو دوست بنانا پسند کرتا اور نہ کسی کا دوست بنتا۔ ریاضی سے بہت لگاؤ تھا زندگی کے ہیجانی لمحوں میں کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا۔ لیکن واقعیت پسند کو جذبات کی یہ حرکت اچھی نہ لگتی بے چینی کا زمانہ تھا نوجوان کے خیالات میں انقلاب ہو رہے تھے، حکومت کی سختیاں اس انقلاب کی دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکانے کا کام کر رہی تھیں۔ نوجوان گروہ ملک کی تباہی اور قوم کی ذلت سے بیزار اور اصلاحِ حال کے لئے بے قرار تھا باتیں قانون نے بند کر دی تھیں لیکن دلوں پر بہر حال پابندیاں عائد نہ کی جا سکتی تھیں۔ برملا بات کہنے کی اجازت نہ تھی لیکن چوری چھپے کی سرگوشیوں کو بھلا کون روک سکتا تھا۔ جہاں چند پڑھے لکھے جمع ہو جاتے قوم کی بدحالی اور حکومت کے ظلم و جور کا ذکر ہوتا سازشیں کی جاتیں خفیہ جماعتیں بنتیں اور انقلاب ان تمام روگوں کا علاج تجویز کیا جاتا قسطنطنیہ کا فوجی کالج بھی اس رو سے نہ بچ سکا۔

مصطفےٰ کمال کی سیاسی زندگی کا آغاز ان خفیہ جماعتوں سے ہوا وہ اور اس کے ساتھی اساتذہ کی نظر سے دور انقلاب کے منصوبے سوچتے تجویزیں بناتے اور حکومت کا تختہ الٹنے کی طرحیں ڈالتے

تھے ان کی یہ سرگرمیاں بہت دنوں تک پوشیدہ نہ رہ سکیں اور راز افشا ہو گیا مصطفےٰ اور اس کے ساتھی پکڑ لئے گئے۔ مقدمہ چلا قصور ثابت تھا۔ سلطان نے رحم کھایا کسی سخت سزا دینے کے بجائے اسے وطن سے دور کر دیا۔ فوج میں لفٹننٹ بنا کر دمشق بھیج دیا۔ یہاں آ کر اسے اپنی سیاسی جدوجہد کے لئے زیادہ آزادی ملی۔ وطن نامی انجمن بنائی گئی اور فوج کے نوجوان افسروں کو اس میں شریک کیا گیا۔ اسی سلسلہ میں مصطفےٰ سلطنت کے یورپی صوبہ سالونیکا میں گیا حکومت کے جاسوسوں کو بھی اس کی خبر مل گئی اور مصطفےٰ بڑی مشکل سے گرفتار ہوتے ہوتے بچ گیا۔ خوش قسمتی سے کچھ عرصہ بعد یہ دمشق سے تبدیل ہو کر سالونیکا پہنچ گئے جو اس وقت انقلابی جماعتوں کا مرکز تھا اور مصطفےٰ کمال انجمن اتحاد و ترقی کے سرگرم رکن بن گئے اور انور اور جمال کے دوش بدوش کام کرنے لگے۔ ۱۹۰۸ء میں انجمن اتحاد و ترقی نے سلطان کو مجبور کر دیا کہ وہ ملک میں دستوری حکومت قائم کرے پارلیمنٹ بنائی گئی۔ اور ترکی نے استبداد کا جوا اپنے گلے سے اتار پھینکا۔ عبدالحمید نے اپنا اقتدار بحال کرنے کی پھر کوشش کی تو انھیں معزول کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ بوڑھے سیاست داں برطرف ہوئے۔ اور انجمن ترقی و اتحاد کے نوجوان سلطنت کی باگ ڈور کے مالک بنے۔

یہ نیا دور شروع ہی ہوا تھا کہ اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا ترک بے بس تھے فوج کی کوئی کل درست نہ تھی سمندری بیڑہ بھی نہ تھا کہ طرابلس کو مدد بھیجی جا سکتی۔ انور اور مصطفےٰ کسی نہ کسی طرح کر کے طرابلس پہنچے۔ عربوں کی مدد سے حملہ آوروں کو رد کنے کی کوشش کی لیکن یہ جنگ شروع ہی تھی کہ بلقانی ریاستوں نے قسطنطنیہ پر ہلہ بول دیا ترک تیار نہ تھے لڑے تو وہ عزور لیکن ہر محاذ پر شکست کھائی جن پر برسوں حکومت کی تھی ان کے ہاتھوں سے ترکوں نے ذلتوں پر ذلتیں اٹھائیں ہزاروں گھر تباہ ہوئے ترک آبادی تلوار اور آگ کی مدد سے بلقان سے ختم کی گئی انور اور مصطفےٰ طرابلس سے واپس وطن پہنچے اور ترکی کے تاریخی شہر ایڈریانوپل کی شکست سے جو دھبہ لگا تھا کم سے کم ان دونوں کی ہمتوں کو اس کی کالک کو دور کرنے میں بڑا کام کیا آخر بڑی مشکلوں کے بعد جنگ کی آگ بجھائی۔ اب سلطنت کی سیاہ و سپید کے مالک انور طلعت اور جمال تھے نام کو پارلیمنٹ تھی لیکن در اصل سلطنت

کے یہ تینوں کرتا دھرتا ہے انھوں نے مصطفےٰ کمال سے جان بوجھ کر اعراض برتا اور اسے صوفیا کی ترکی سفارت کے ساتھ ملحق کر دیا۔ مصطفےٰ جیسی سرکش طبیعت اس حق تلفی کو کیوں محسوس نہ کرتی۔ لیکن ملک میں انور طلعت اور جمال کی ہوا بندھ گئی تھی اور قوم ان کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔ یہ سرکش طالب علم جو ملّا کی سختی سے بھاگا تھا جس کو سلطان عبدالحمید کے مظالم نے کالج ہی میں باغی بنا دیا تھا اور جس نے فوجی افسر ہونے کے بعد اس انقلابی تحریک کو اپنی جان پر کھیل کر منظم کیا تھا اور پھر طرابلس اور بلقان میں بہت سے معرکے سر کئے تھے اب اپاہج بنا کر صوفیہ میں ڈال دیا گیا۔ سرکشی۔ بغاوت، بے چینی اقدام ہمت اور ولولوں کے جذبات کی تسکین سے محروم ہو کر معلوم نہیں مصطفےٰ کمال کے دل میں ان تینوں کے خلاف نفرت اور بغض کی آگ کتنی سخت بھڑکی ہوگی پنجرہ میں بند شیر غصہ میں اکڑ کیا کچھ نہیں کرتا۔ مصطفےٰ کمال کو دل کی یہ آگ کسی نہ کسی طرح سے ٹھنڈی کرنی ہی پڑی۔

۱۹۱۲ء میں جنگ عظیم چھڑی اور ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا مصطفےٰ کمال انور سے خفا تھے جرمنوں سے انھیں نفرت تھی۔ جنگ زوروں پر ہو رہی تھی اور مصطفےٰ کمال تھے کہ بے بس دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے۔ حکومت کو انھوں نے اپنی خدمات پیش کیں اور دوستوں سے بھی کہلوایا۔ لیکن انور جو اب وزیر جنگ تھے انھیں صوفیہ ہی میں رکھنے پر مصر رہے ۱۹۱۵ء میں مصطفےٰ کمال سخت بیمار ہوئے، موت اور زندگی کی کشمکش میں گرفتار قسطنطنیہ پہنچے بیماری دہی تھی جس نے آج ۲۳ برس کے بعد ان کی جان لے کر چھوڑی قسمت اچھی تھی موت کے منہ سے بچ نکلے اور صحت یاب ہوئے تو انھیں درہ دانیال کی حفاظت پر متعین کیا گیا۔ برطانوی فوجیں پوری طاقت سے درہ دانیال پر حملہ کر رہی تھیں اور اگر ان کا یہ حملہ کامیاب ہوتا تو جنگ ۱۹۱۵ء ہی میں ختم ہو جاتی۔ ترکی کے راستے روس کو اپنے حلیفوں سے مدد مل جاتی تو وہ یوں اتنی آسانی سے جرمنی کے ہاتھوں نہ مرتا ادھر فرانس کے محاذ پر جرمن فوجوں کا زور کم ہو جاتا اور لڑائی ۱۹۱۸ء تک طول نہ کھینچتی مصطفےٰ کمال کی بے نظیر شجاعت اور مہارت کیا تھی ایک معجزہ تھا کہ ترکوں کی بے بس اور تھکی ہوئی قوم نے دنیا کی سب سے زبردست سلطنت کو شکست دی اور انگریزوں کو مجبوراً درہ دانیال سے پسپا ہونا پڑا۔ اب ترکی کے بچے بچے کی زبان پر مصطفےٰ کمال کا نام تھا۔ لیکن حکومت کے

مختار مطلق اپنے اس حریف کو آگے نہ بڑھنے دیتے تھے۔ جنگ کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ لیکن اب جرمنوں کے قدم پیچھے ہٹنے لگے تھے۔ ترک ہر محاذ پر شکست کھا رہے تھے عربوں نے بغاوت کر دی تھی عراق اور فلسطین کی طرف سے برطانوی فوجیں بڑھی چلی آ رہی تھیں انور کے تمام منصوبے ایک ایک کر کے ختم ہو رہے تھے اس نازک وقت میں سلطان کی طرف سے مصطفےٰ کمال کو پروانہ ملا کہ فلسطین کے محاذ جنگ پر روانہ ہو جاؤ۔ یہ سمجھ گئے کہ حریف درہ دانیال کے عظمت کے چاند کو اس شکست سے گہن لگانے کے درپے ہیں فلسطین پہنچے تو حالت دگرگوں ہو چکی تھی دشمن کا روکنا نا ممکن ہو گیا تھا انھوں نے ادھر اُدھر سے ہٹنا شروع کیا فلسطین چھوڑا دمشق چھوڑا حلب کے ایک دروازے سے نکلے تو دوسرے دروازے سے انگریزی فوجیں اور باغی عرب داخل ہوئے۔ فتح کے نشے میں سرمست ہو کر آگے بڑھ جانا آسان ہے لیکن پے در پے شکستوں اور پیہم پسپائیوں کے بعد فوج کے اوسان بحال رکھنا مصطفےٰ کمال ہی کا کام تھا پیچھے ہٹتے ہٹتے یہ موجودہ ترکی کی سرحد پر پہنچ گئے اس جگہ پہنچ کر انھوں نے کہا کہ اب کوئی قدم پیچھے نہیں اٹھے گا وطن مقدس کی سرزمین دشمنوں کے قدموں سے ناپاک نہیں ہونے دی جائے گی لیکن اس وقت عارضی صلح کا اعلان ہوا جنگ رک گئی اور مصطفےٰ کمال واپس قسطنطنیہ بلا لئے گئے

سلطان وحید الدین نے اپنے بچاؤ کے لئے برطانیہ کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ دشمنوں کی ظفرمند فوجیں قسطنطنیہ پر قابض تھیں۔ اور ان کے جنگی جہاز ابنائے باسفورس میں لنگر انداز تھے قوم عدیلوں کی جنگ سے پہلے ہی بدحال تھی اس چار برس کی مصیبت نے اس کی زندگی کا آخری خطرہ خون بھی ختم کر ڈالا ہر طرف مایوسی تھی بڑے بڑے ہمت ہار چکے تھے انجمن اتحاد و ترقی کا تو کوئی نام لینے والا بھی نہ تھا۔ پرانے عافیت پسند سیاست داں پھر برسر اقتدار آ گئے تھے مصطفےٰ کمال نے سلطان وحید الدین کا دل ٹٹولا لیکن وہ راضی بہ تقدیر ہو چکے تھے پرانے سیاست دانوں کو سمجھایا کہ یوں ہمت ہار دینا ترکی کو دشمنوں کا تر نوالہ بنا دینا ہے عارضی صلح سے مطمئن ہو کر خاموش بیٹھ جانا دشمنوں کو نگل جانے کی دعوت دینا ہے لیکن ان کی بات کسی نے نہ سنی لیکن نوجوان موجود تھے جن کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑ رہا تھا۔ مصطفےٰ نے ان لوگوں کو یکجا کیا۔ ان کی آگ کو ہوا دی یہ نوجوان سر جوڑ کر بیٹھے اور قوم کو موت

سے بچانے کے لئے دار و سونچے گے۔ مصطفےٰ کمال کے دل میں تو یہ خیالات تھے لیکن ان کی زبان بالکل بند تھی سلطان نے ان کی خاموشی سے دھوکا کھایا۔ اور انھیں مشرقی مقبوضات کا قائد اعلیٰ بنا کر انگورہ کی سمت روانہ کیا تاکہ وہ عارضی صلح کے مطابق فوج کو برخاست کرکے ہتھیار جمع کریں مصطفےٰ کمال کو یہ موقع خدا نے دیا۔ اور انھوں نے فوجوں کو برخاست کرنے کی بجائے ان کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ اپنے گرد لوگوں کو جمع کیا انھیں بتایا کہ اگر ہم نے اس وقت اپنے آپ کو فاتح دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تو ہمارا حشر بہت برا ہوگا۔ یہ پکار جادو کی تاثیر رکھتی تھی تھکے ہارے تازہ دم ہو گئے جن کی ہمتیں بالکل جواب دی چکی تھیں وہ مرنے مارنے پہ تل گئے۔ سلطنت کی ہر سمت سے جوق در جوق لوگ آنے لگے۔ فوجی افسر پرانے سپاہی ماہر۔ اخبار نویس شاعر ادیب جس کو موقعہ ملا مصطفےٰ کی طرف کھنچا چلا آیا۔

سلطان وحید الدین چونکا اور اتحادی گھبرائے لیکن مصطفےٰ کمال ان کے چنگل سے نکل چکا تھا۔ وعدہ وعید اور دھمکیوں سے اس تیز بیں شخص کو بہلانا آسان نہ تھا۔ سلطان نے اتحادیوں کے کہنے میں آکر انھیں اور ان کے ساتھیوں کو باغی قرار دیا۔ شیخ الاسلام نے انھیں کافر بنایا۔ خلیفہ کے جاں نثار اور اسلام کے سپرہا ان مجاہدوں کی سرکوبی کے لئے قسطنطنیہ سے روانہ کئے۔ کہ عین اسی وقت درسائی کے عہدنامہ کا اعلان ہوا۔ اس کی رو سے ترکی کے سب عربی صوبے اس سے چھین لئے گئے قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ تسلیم کیا گیا۔ سمرنا کا علاقہ یونانیوں کو بخشا گیا اور انگورہ کے لق و دق صحرا ترکی قوم کے نذر ہوئے اس خبر نے مصطفےٰ کمال کی قوت کو جو ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ ترک قوم زخمی شیر کی طرح جھپٹ پڑی اور مصطفےٰ کمال کی تحریک مستحکم بنیادوں پر قائم ہو گئی سواس کے مقام پر ترکی اسمبلی کی بنیاد رکھی گئی اور خلیفہ کے احکامات کو اس بنا پر ماننے سے انکار کر دیا کہ وہ دشمنوں کے ہاتھ میں اپنے آپ کو دے چکا ہے۔

یونانی سمرنا پر قابض ہوئے تو اسے تباہ و برباد کر دیا۔ وہاں سے یہ لوگ آگے بڑھے۔ برطانیہ کی شہ تھی۔ یونانی اسپائرہ کے خواب سنا رہے تھے۔ بڑھتے بڑھتے اور ترکی فوجوں کو ہٹاتے یہ نئے پایہ تخت انگورہ تک کے سامنے پہنچ گئے سقاریہ کے میدان میں ترک اور یونانی ایک دوسرے کے

مقابل ہوئے ۱۲ دن کی سخت جنگ کے بعد ترکوں کو فتح حاصل ہوئی ترکوں نے سمرنا تک کا علاقہ ان کے وجود سے پاک کر دیا۔ اب ترک قسطنطنیہ کی طرف بڑھے اور برطانوی فوجوں کے روبرو ترک سپاہی کھڑے نظر آئے لائڈ جارج برطانیہ کے وزیر اعظم تھے وہ لڑنے کو تیار تھے لیکن قوم نے ساتھ نہیں دیا آخر صلح کی بنیاد ڈالی گئی اور لوزان کے معاہدہ میں ترکوں کے تمام مطالبات مان لئے گئے۔

قسطنطنیہ پر از سر نو پرچم ہلال لہرانے لگا آبنائے باسفورس سے دشمنوں کے جہاز نکل گئے ایشیائے کوچک کا علاقہ ترکوں کے پاس تھا ہی یورپی علاقہ بھی لے کر چھوڑا۔ اجنبی مراعات ختم کی گئیں یورپ کا مرد بیمار تندرست و توانا ہو گیا۔ یہ ایک معجزہ تھا جو بات کسی کے خیال میں بھی نہ آسکتی تھی اسے مصطفےٰ کمال نے واقعہ کر کے دکھایا۔ اور ترکی نے نئی زندگی پائی۔

نئی زندگی نیا جسم چاہتی ہے۔ ترک دشمنوں سے تو بچ نکلے تھے لیکن ان کا جسم قومی انحطاط و زوال کے مواد سے بھرا پڑا تھا۔ سالہا سال کی پے در پے جنگوں نے ملک کا برا حال کر ڈالا تھا تجارت اور صنعت باہر والوں کے ہاتھ میں تھی۔ زراعت کرنے والے بندوقیں اٹھائے پھرتے تھے امیر طبقے مال مست تھے اور زندگی کی مشکلوں کو داد عیش دے کر بھلایا کرتے تھے حکمران طبقوں کو صدیوں کی ظالم حکومت نے بے کار کر دیا تھا۔ تعلیم نام کو تھی علماء ہر ترقی کے دشمن اور ہر پرانی چیز کے شیدا اور اس کو باقی رکھنے کے لئے وطن قوم اور مذہب کو بیچنے کے لئے تیار۔ صوفیا خانقاہوں اور تکیوں میں وظائف کرنا زندگی کا عزیز ترین مشغلہ سمجھتے تھے۔ نئی زندگی جو برسوں کی جان توڑ کوششوں۔ خونریزیوں سازشوں بغاوتوں اور جنگوں کے بعد نوجوان کو ملی تھی کس طرح اس قوم کے فرسودہ اور لاغر جسم میں سما سکتی تھی اگر زندگی کی بقا منظور تھی تو جسم کا بدلنا بھی ضروری تھا مصطفےٰ نے جس سنگدلی اور سفاکی سے طرابلس اور بلقان کی جنگیں لڑیں درہ دانیال سے برطانیہ کو ہٹایا اور سقاریہ میں یونانیوں کو شکست دی وہی روح اب نئے جسم کی تعمیر میں کارفرما تھی۔ قوم کی بے حسی اور بے بسی جب سپاہی کو مجبور کرتی ہے کہ وہ دشمنوں کے خون میں نہا کر اپنی قوم کی رہنمائی کرے تو اس سے اعتدال پسند مصلح، اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے قائد کی توقع نہ کرنی چاہیئے۔

مصطفےٰ پاشا نے جس سختی کے ساتھ دشمنوں کے سر کچلے اس سختی کو اپنے ان دوستوں کے خلاف استعمال کرنے میں بھی اسے کوئی باک نہ تھا جو اس کے نزدیک وطن کے لئے دشمنوں سے کم خطرناک نہ تھے۔

ترکی قوم کو مصطفےٰ کمال نے نئی زندگی دی اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا اس نے اس نئی زندگی کو نیا قالب بھی دیا۔ جس کے حسن و قبیح پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور شاید یہ زیادہ نا مناسب بھی نہیں ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اگر مصطفےٰ کمال یہ نیا قالب ترکی کے لئے تیار کرتا۔ تو قوم کی صدیوں کی فرسودہ روایات' غلط مذہب کی غلط حدود مذہبی طبقوں کی جہالت اور عوام میں ان کی ہر دلعزیزی یہ سب چیزیں اس نئی زندگی کو کب کا ختم کر ڈالتیں۔ مصطفےٰ کمال نے اس نئی زندگی کو ابھرنے کا موقعہ دیا۔ وہ ابھری پرانی زنجیروں کو توڑ کر غلط راہ پر چل نکلی لیکن اس بے راہ روی سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ غلط راہ پر چلتے چلتے صحیح راہ پر آجانا کوئی بڑی بات نہیں لیکن جو زمین پر پاؤں نہ لگا سکے وہ چلے گا کیا۔ مصطفےٰ کمال نے خلیفہ اور سلطان کے ڈھونگ کو ختم کیا۔ یہ لوگ ظل اللہ کے نام سے پکارے جاتے تھے خشکی و تری میں ان کا سکہ چلتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اجنبی کے سایہ سے کانپا کرتے اور وقت پر دشمنوں کے ہاتھوں بک جایا کرتے تھے۔

علماء کا زور توڑا جن کی زندگی قوم کے لئے وبال جان بن چکی تھی اور ان کا مذہب ترقی کا دشمن ہو چکا تھا۔ تعویذ دینے والے پیر قبر پرست مجاور زاویہ نشین صوفی اور بھیک منگے فقیر جو قوم کے خون کو جونک کی طرح چوس رہے تھے ختم ہوئے عوام بے حس اور جاہل تھے ان کو وطنیت کا نشہ اور علم کی روشنی دی خلیفہ اور علماء کا مذہب اسلام تھا لیکن ان کے سب کام غیر اسلامی تھے انھوں نے اس اشتہار کو بے کار سمجھ کر حکومت کو مذہب کے اس مفت کے دم چھلے سے نجات دی اور اپنی اس بے دینی سے فائدہ اٹھا کر عیسائی مشنریوں کا سد باب کیا۔ ان کے ابتدائی مدرسے بند گئے اور ان کا تمدنی اقتدار جو قوم کے ضمیر کو برسوں سے خراب کر رہا تھا یوں ختم کیا روس سے قومی پیر چلا آتا تھا اس سے دوستی کی لیکن اس دوستی کے باوجود اس کے اثرات کو ملک

کے حدود میں قدم نہ رکھنے دیا۔ یونان پٹ چکا تھا۔ لیکن اس سے بھی صلح صفائی کرکے راہ ورسم بڑھائی برطانیہ سے اچھے تعلقات قائم کئے فرانس پر زور ڈال کر اپنے مطالبات منظور کرائے ترک زراعت سے غافل تھے انہیں زراعت میں لگایا اور زراعتی تعلیم کو عام کرنے کے لئے نئے طریقے پر زراعت کرنے کا شوق دلایا۔ صنعت وحرفت کا ترکوں میں نام تک نہ تھا قانون کے زور سے انہیں ان کاموں میں لگایا۔ تعلیم کو ترقی دی بچوں اور نوجوانوں میں قومی کاموں کا احساس پیدا کیا عورتیں زندگی سے دور گھر کی چہار دیواری میں وقت ضائع کرتی تھیں انہیں کاروبار زندگی میں لگایا۔ یہ الٰی چیزوں کو مقدس سمجھا جاتا تھا ان کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا کیا۔ ترکی ٹوپی بدلی، پردہ رخصت کیا عاجزی اور نیاز مندی کے سلام بدل دئے موسیقی کو جو رونے دھونے کے جذبات کو ابھارتی تھی زندگی بخش بنا دیا۔

مصطفےٰ کمال سرکش تھے اور بہت سخت قسم کے سرکش ان کے ارادے اٹل تھے اور جو ان کی راہ روکتا ان کے انتقام کی آگ کے نذر ہو جاتا۔ وہ باغی تھے بچپن سے، جوانی میں حریفوں کی رقابت نے انہیں اور باغی بنا دیا۔ اور جب حقیقی معنوں میں کام کرنے کا وقت آیا تو خلیفہ کی حرکتوں نے بغاوت کی اس آگ کو اور بھی تیز کر دیا۔ اگر اس سرکش اور باغی کو صحت بخش مذہبی ماحول ملتا۔ اور اس ماحول میں انہیں اپنی غیر معمولی قوت جرت اور دیگر صلاحیتوں کو بر سر کار لانے کے موقعہ ملتے رہتے تو یہ باغی اور سرکش مرد مومن بنتا۔ اور ترکی کو نئی روح کے ساتھ ایک ایسا قالب عطا کرتا جو ۱۳۰۰ برس پہلے کی یاد تازہ کر دیتا۔

مصطفےٰ کمال کی بڑائی اس کی اپنی بڑائی ہے اور اس کی کمزوریاں ذلیل اور پست ماحول کا نتیجہ مصطفےٰ کمال اگر اتنا سرکش اتنا باغی اتنا خودسر اور اتنا خوں خوار نہ ہوتا۔ تو یہ صدیوں کے قوم کے پرانے قالب کو جو تقدس اور خدائی کا درجہ حاصل کر چکا تھا کبھی نہ بدلنے پاتا۔

اس مرد غازی کی ایک ضرب کلیمی نے ملت اسلامی کے تمام بتوں کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا ہے اور اس کا پیدا کیا ہوا ولولہ آج ہر نوجوان کو اپنے اپنے ماحول میں اس ضرب کلیمی کو آزمانے

کی دعوت دے رہا ہے۔

غازی مصطفےٰ کمال صحیح معنوں میں بڑے آدمی تھے انھوں نے صدیوں کے جمود کو توڑا وہ جمود جس نے اسلام کی اصل روح کو مسخ کر دیا تھا ان کی بغاوت اور ان کے کفر نے آئندہ نسلوں کو کافر ہونے سے بچا لیا۔ ورنہ اگر یہی حالت رہتی تو نئی نسلوں کا انقلاب ان کی امنگیں ان کی آرزوئیں ان کی بے قراریاں اسلام کے اس فرسودہ اور بے روح قالب کو دیکھ کر کب مطمئن ہوتیں مصطفےٰ کمال کے کفر نے نہ معلوم کتنوں کو مومن بنا دیا اس لئے یہ کافر واقعی مرد مومن تھا۔ جو خود جلا اور اپنی ذات سے افق اسلام کو روشن کر گیا۔

ایران میں ریلوے

(از جناب مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری)

(ماہ گزشتہ وزارت طرق ایران کی مفصل روئداد بابت راہ آہن سرتاسر ایران "موصول ہوئی جو دس جزکی ہے اور بڑی تقطیع پر بالتصویر نہایت عمدہ چھاپی گئی ہے۔ مندرجہ ذیل مضمون اسی روئداد کا نہایت مختصر خلاصہ ہے۔ اسلم)

ستر سال سے اہل ایران کی دلی خواہش تھی کہ ان کے ملک میں ریلوے جاری کی جائے۔ جب سے ان کے تعلقات فرنگستان سے قائم ہوئے اور مغربی ممالک کے ساتھ ارتباط میں افزونی ہوئی اسی وقت سے یورپین تمدن کے مظاہر میں سے جو چیز ان کے لئے زیادہ جاذب نظر ہوئی وہ یہی ریلوے تھی۔ ایران کے مفکرین برابر اس بات پر زور دیتے رہے کہ ملک کی ترقی کے لئے موجودہ تمدن کے ضروری عناصر میں سے سب سے مقدم ریلوے کا اجرا ہے۔

مرحوم صنیع الدولہ جو گزشتہ صدی کے ایران کے نامور رجال سیاسی میں سے تھے ملکی ترقی کے وسائل کا محور ریلوے ہی کو سمجھتے تھے۔ اس بارہ میں انھوں نے اپنی تجاویز بھی شائع کی تھیں۔ مشروطیت کے بعد مجلس ملّی کے دورۂ چہارم میں ایک نمائندہ نے کہا تھا

"جس دن ایرانیوں کی یہ پرانی آرزو برآئے گی، اور انجنوں کی سیٹی اور ان کے آمد و رفت کے شور و غل کی آواز اہل ملک کے کانوں میں گونجنے لگے گی وہ دن ملّت کے لئے سب سے بڑا خوشی کا دن ہوگا۔ اور پھر ہم ایران کی گزشتہ عظمت کے اعادہ کی امید رکھ سکیں گے"

لیکن انتظامی اور اقتصادی بدحالیوں نے ایران کو اس درجہ پر پہنچا رکھا تھا کہ اس کے باشندوں کی یہ آرزو اس بچہ کی خواہش سے زیادہ نہ تھی جو چاہتا تھا کہ ایک بڑے اژدھے کو اپنے کھلونوں کی ڈبیا میں بند کرے۔

ایرانی ریلوے کی تاریخ

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا باوجود اس یقین کے کہ ہر قسم کی ملکی ترقیوں کے لئے ریلوے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہے اپنی زبون حالی کی وجہ سے ایران اس قابل نہ تھا کہ خود اس کو تعمیر کر سکتا۔ دول مغربیہ جو اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھیں اور اس کے ساتھ تعلقات بڑھانے کو اپنے استعماری اور نامشروع سیاسی اور اقتصادی اغراض کے لئے مفید سمجھتی تھیں اپنے نفوذ اور اثر کو بڑھانے کے لئے اس میں ریلوے نکالنے کے اجارے طلب کرنے لگیں۔ ۱۸۶۵ء سے یورپ کے لوگ ایران کے ایک ایک حصہ میں اجرا ریلوے کے لئے درخواستیں لے کر آنے شروع ہوئے جن میں روس۔ انگلستان۔ فرانس اور جرمنی وغیرہ مختلف ممالک کے نمایندے تھے۔ ۱۸۷۲ء میں انگریزوں نے یہ تجویز کی کہ بحیرہ روم سے ایک ریلوے لائن نکالیں جس کو وادی فرات و دجلہ سے لاکر ایران کے جنوبی حصے سے گزارتے ہوئے مکران کے راستہ سے ہندوستان تک پہنچا دیں۔ برطانی پارلیمنٹ نے اس کے لئے ایک مخصوص کمیشن متعین کیا جس نے بیرن جولیس رویٹر کی قیادت میں دربار ایران سے اس کو منظور کرایا۔ اس اجارہ میں صرف ریلوے ہی کا اجرا نہ تھا بلکہ ایران کی پوری تجارت بحر خزر سے خلیج فارس تک کا امتیاز بیرن موصوف کے نام ستر سال کی طویل مدت کے لئے واگذار کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس تجویز سے انگریزوں کا مقصد صرف روسیوں کو دھمکانا تھا۔ جونہی انھوں نے افغانستان کے معاملہ میں سمجھوتہ کر لیا کہ اس میں مداخلت نہیں کریں گے انگریزوں نے بھی اپنی یہ سیاسی نمائش ختم کر دی۔ چنانچہ دوسرے سال یعنی ۱۸۷۳ء میں یہ اجارہ رسماً باطل ہو گیا۔

۱۸۷۴ء میں ایک روسی انجینیر فالکہائن نے جس نے گرجستان میں ریلوے تعمیر کی تھی ایران میں آکر جلفا سے تبریز تک ریلوے نکالنے کی اجازت چاہی۔ اور اس کے پیچھے اس نے بہت کچھ صرفہ بھی کیا۔ مگر دربار ایران کو معلوم ہو گیا کہ یہ کام وہ اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی حکومت کے لئے لینا چاہتا ہے۔ اس کے پاس جو نقشے تھے ان سے بھی یہ ظاہر ہوا کہ مقصود یہ ہے کہ جلفا سے تبریز اور وہاں سے بغداد تک ریلوے لائن نکال کر دولت علیہ عثمانیہ پر جارحانہ اقدام میں آسانی پیدا کی جائے۔ اس لئے اس کی درخواست نامنظور کر دی گئی۔

۱۸۸۰ء میں ایک فرانسیسی کمپنی کے منیجر موسیو الیوں نے جو اسلامبول میں سکونت رکھتا تھا رشت سے

تہران تک ریلوے نکالنے کا ٹھیکہ لیا۔ مگر واپس چلا گیا۔ پھر ایک آسٹرین انجینیر ہروان شیروے نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا مگر اس نے بھی کچھ نہ کیا۔

۱۸۸۰ء میں امریکا کے سفیر متعینہ ایران نے امریکن سرمایہ اور انجینیروں سے ریلوے جاری کرنے کے لئے مختلف حصہائے ایران میں ٹھیکے لئے مگر وہ بھی کچھ کر نہ سکا۔

۱۸۸۶ء میں موسیو بوآتال نے جو تہران میں برق کا اجارہ دار تھا رشت سے تہران تک ریلوے بنانے کی اجازت حاصل کی۔ اور اس کے ساتھ بعض دیگر نقاط کو بھی پیوست کرنے کا اجارہ لیا۔ پانچ لاکھ فرانک کی رقم بھی اس غرض کے لئے بنک میں جمع کی مگر کام نہ ہوا۔

بوآتال مذکور کو اس زمانہ میں مردم شماری کی روئداد سے معلوم ہوا کہ درگاہ حضرت عبدالعظیم کی زیارت کے لئے سالانہ کم و بیش تیس لاکھ آدمی جایا کرتے ہیں۔ اس لئے اس نے تہران سے درگاہ مذکور تک جو چند میل ہے ریلوے بنانے کا ٹھیکہ لیا۔ پھر اس کو ایک بلجین کمپنی کے ہاتھ فروخت کرایا۔ اس نے بروکسل سے سامان لاکر یہ لائن تیار کی۔ ایران کی یہی پہلی ریلوے لائن تھی جس کا افتتاح ۱۸۸۸ء میں بڑے تزک و احتشام سے کیا گیا تھا۔ اسی کمپنی نے ایک دوسری ریلوے کا بھی ٹھیکہ لیا مگر نہ بنا سکی۔

اسی زمانہ میں حاجی محمد حسین امین الضرب نے تجارتی آسانی کے لئے دریائے مازندران سے تہران تک ریلوے لائن کا اجارہ حاصل کیا اور اپنے اور دیگر ایرانی تجار کے سرمایہ سے شاہ بندر محمود آباد سے جو بحر خزر کے ساحل پر ہے شہر آمل تک ۱۰ کیلومیٹر ریلوے لائن بنائی۔ صرف ایک انجن تھا اور ۱۲ ڈبے جن پر چھت نہیں تھی۔ ایک ہی انجن ڈرائیور تھا جو جرمن تھا۔ جب وہ چلا گیا تو ایک حبشی کو لائے جس نے بہت تھوڑے عرصہ میں انجن اور لائن دونوں کو خراب کر دیا۔ آخر کار ریل کا لوہا اٹھا لیا گیا اور دوسرے کاموں میں لگا یا گیا۔

۱۸۹۰ء سے لے کر ۱۹۰۷ء تک مختلف کمپنیاں ایران کے مختلف حصوں میں ریلوے کے ٹھیکے لیتی رہیں مگر کسی نے کچھ نہ کیا۔ مسٹر شوستر امریکن وزیر خزانہ ایران نے بھی ایک نقشہ تیار کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ امریکن سرمایہ سے ریلوے لائین تعمیر کرائیں گے مگر ان کے چلے جانے کی وجہ سے یہ تجویز بھی عمل میں نہ آسکی۔

۱۹۱۱ء میں روسی بنک نے تجارتی نہیں بلکہ روس کی فوجی غرض سے جلفا سے تبریز تک اجازت لے کر

ریلوے لائن تعمیر کی جس کا طول ۱۴۰ کیلومیٹر ہے یہ ایران کی تیسری ریلوے لائن تھی ۱۹۲۱ء میں جنگ عظیم کے بعد سوویٹ روس اور ایرانی معاہدہ کی رو سے جب یہ لائن ایرانی حکومت کے ہاتھ میں آئی اس وقت اس کی گاڑیاں۔ پٹریاں۔ انجن اور اسٹیشن سب از کار رفتہ تھے۔ رضا شاہ نے ہر چیز کو از سر نو درست کرایا۔ اور موجودہ زمانہ کے مروجہ مصالحہ سے اس کو ایسا ٹھیک بنا دیا کہ اب اس کی سالانہ آمدنی تقریباً پچاس لاکھ ریال ہوتی ہے علاوہ بریں تبریز سے ایک شاخ شرف خانہ تک ۵۳ کیلومیٹر کی اور بھی بنا دی ہے۔

اسی زمانے میں روسیوں نے اپنے جنگی نظام کے سلسلہ میں قفقاز سے ایک ریلوے لائن نکالی تھی۔ جو ایران کے شمال مغربی حصہ میں سے گزرتی ہوئی ترکی حدود میں پہنچی تھی۔ اس کا تقریباً سو کیلومیٹر حصہ ایرانی سرزمین میں پڑتا تھا جو اب ایران کے قبضہ میں ہے۔ مگر یہ لائن جنگ کے دوران میں اس قدر خراب ہو گئی تھی کہ اب اس کی پٹریاں اکھاڑ کر ایک جگہ جمع کر کے رکھدی گئی ہیں۔

مشرق میں انگریزوں نے جو لائن ہندوستان سے دزداب تک نکالی ہے اس کا ایک حصہ جو بولان سے زاہدان تک ہے ایران کے ہاتھ میں ہے ایک دوسری لائن انگریزوں نے ۱۹۱۹ء میں بوشہر سے برازجان تک بنائی تھی۔ روزانہ ایک ٹرین اس پر آتی جاتی تھی۔ مگر آج کل وہ خراب و خستہ حالت میں معطل پڑی ہے۔

ایران کی ریلوے لائنوں کی یہ مختصر تاریخ ہے جس کو دیکھ کر ناظرین حیران ہوں گے کہ جبکہ ساری دنیا میں ریلوے عام ہو گئی تھی کیا وجوہات تھے کہ ایران جیسے زرخیز ملک میں اس کا اجرا نہ ہو سکا۔ اس کا سبب حقیقت میں خود ایران کی کمزوری اور بے مائگی تھی۔ قاچاری عہد میں ملک کی انتظامی اور اقتصادی حالت اس درجہ گر گئی تھی کہ بیرونی کمپنیاں یہاں اپنا سرمایہ لگاتے ہوئے ڈرتی تھیں اور ان کو مطلق اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ ہم روپیہ اور محنت صرف کر کے کوئی نفع اٹھا سکیں گے۔ کیونکہ بدنظمی اور غارتگری کا دور دورہ تھا۔ خود حکومت کی آمدنی سالانہ ۵ اکروڑ سے لے کر ۲۰ کروڑ تومان سے زیادہ نہ تھی۔ ضروری اخراجات کے لئے بھی قرضے لینے پڑتے تھے۔ علاوہ بریں روس اور انگلستان کی باہمی رقابت ایک بڑا سبب تھی جو ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے کہ ایسا کام کرے جس سے اس کو اس ملک سے خاص فائدہ حاصل ہو یا اس کا نفوذ اور اثر بڑھ جائے۔

اس لئے طبعاً ایک دوسرے کے کاموں میں رکاوٹیں ڈالتے تھے جن کی وجہ سے کوئی بھی اس کی طرف اقدام نہیں کرتا تھا۔ ان سب پر مزید طبیعی موانع تھے کوہستانی سلسلوں اور سر بفلک پہاڑوں کے سینوں کو چیرنا اور جگروں کو تراشنا آسان نہ تھا۔

ٹرانس پرشین ریلوے

جنگ عظیم کے بعد رضا شاہ پہلوی کی ہمت اور ملت کی کوشش سے جب ایران کا سیاسی اور اجتماعی افق اجنبیوں کے دسائس اور غیروں کی مداخلت سے صاف ہوا ساری قوم میں جوش عمل اور ترقی کا ولولہ موجزن ہو گیا رفتہ رفتہ ملک کی انتظامی حالت اور اقتصادی کیفیت ٹھیک ہوئی اور سالانہ آمدنی ایک ہزار ملین تومان سے آگے نکل گئی اس وقت بلند حوصلہ شاہ نے ملت کی اس اہم اور مفید ترین ضرورت کی طرف توجہ فرمائی اور بحر خزر (قزوین) سے لے کر خلیج فارس تک ریلوے لائن تعمیر کرنے کا مقصد سامنے رکھا۔

پہلی کدال خود شاہ نے ۱۳۰۶ شمسی (۱۹۲۵ء) میں اپنے ہاتھ سے مار کر اس کام کا آغاز کیا اور پھر آخری پیچ بھی اپنے ہاتھ سے لگا کر ۱۳۱۷ شمسی (۱۹۳۶ء) اس کو مکمل کر دیا۔ اور یہ لائن بارہ سال کی پیہم کوشش اور محنت سے جس میں کم و بیش ساٹھ ہزار آدمی روزانہ کام کرتے تھے ایران کے جنوبی سرے سے شمالی سرے تک جاری ہوگئی۔ اور اہل ایران کی ہفتاد سالہ آرزو پوری ہو گئی۔ شمال اور جنوب دونوں جانب ان کا سلسلہ تجارت بحر خزر اور خلیج فارس سے مل گیا۔ اور اپنی آزاد بندرگاہوں سے مغربی اور مشرقی ممالک کے ساتھ ان کے تعلقات وابستہ ہو گئے۔

یہ لائن بحر خزر کے ساحل بندر شاہ سے شروع ہو کر مازندران کے زرخیز میدانوں سے گذرتی، کوہ البرز کے درۂ تنگ تالار پہنچ کر وہاں سے فیروز کوہ کے بلند اور دشوار گزار پہاڑوں کے سیکڑوں ٹنلوں میں سے داخل ہوتی اور نکلتی ہوئی تہران پھر قم کے راستہ سے لرستان کے کوہستانی سلسلہ کو پار کرتی اندیمشک سے خوزستان کے مسطح میدانوں میں آتی ہے۔ اور دزفول۔ اہواز اور دریائے کارون کے عظیم الشان پل سے گزرتی بندر شاہپور میں جو خلیج فارس کے ساحل پر ہے پہنچتی ہے۔ یہ کل مسافت ۱۳۹۴ کیلومیٹر ہے جو پہلے بہزار وقت و دشواری کم سے کم چالیس دن میں طے ہوتی تھی اور اب نہایت آرام و اطمینان کے ساتھ صرف چالیس گھنٹوں میں اس سرے سے اس

سرے تک مال اور مسافر پہونچتے ہیں۔

اس تمام لائن کی تعمیر میں سوائے چند انجینروں اور نقشہ برداروں کے جو مختلف مغربی ممالک سے بلا کر رکھے گئے تھے ایران ہی کے جملہ کاربرداز اور مہندس تھے۔ اور تیس ملین لیرہ (پاؤنڈ) کے صرفہ سے جس کا بڑا حصہ قند اور چائے پر محصول بڑھا کر وصول کیا گیا تھا حکومت ایران ہی کے سرمایہ سے اس کی تعمیر ہوئی۔ ایک پائی بھی باہر سے قرض نہیں لیا گیا۔

جب سے اس کا اجرا ہوا ہے ملکی تجارت میں وہ فروغ ہوا ہے جس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ علاوہ تجارت کے انتظامی معاملات میں بھی اس کی بدولت سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ رہزنی اور بدنظمی کا خاتمہ ہو گیا ہے تمام اقطاع میں امن و امان کا دورہ ہے اور کاروباری زندگی اور باشندوں کی معاشی حالت میں نمایاں ترقی ہو گئی ہے۔

یہ لائن موجودہ عہد کے انجینرنگ کے عظیم الشان کارناموں میں شمار کرنے کے قابل ہے۔ ایسے ایسے سربفلک پہاڑ راستہ میں پڑتے ہیں جن کے اوپر سے کبھی کوئی پرندہ بھی نہیں گزر سکا ہے۔ جب تک یہ تیار نہیں ہوئی تھی اس وقت تک خود ایران کے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی یقین نہیں آتا تھا کہ البرز اور فیروز کوہ کے بلند پہاڑوں اور لرستان کے دشوار گزار کوہساروں سے گزرتی ہوئی ریلوے لائن ان کے ملک کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک پار کرے گی۔ اس میں دو سو چوبیس ٹنل بنانے پڑے ہیں جن کا مجموعی طول کل لائن کا ۶ فی صدی ہے۔ ان میں سے بعض بعض دو دو کیلومیٹر سے بھی زیادہ لمبے ہیں۔ ان ٹنلوں کے علاوہ سینکڑوں پل بھی بنانے پڑے جن میں سے دریائے کارون۔ رود شور اور آبدیز وغیرہ کے پل بہت بڑے بڑے ہیں۔ شاہ بندر سے بندر شاہپور تک کل اسٹیشنوں کی تعداد ۹۰ ہے۔

یہ ساری لائن۔ اس کے انجن۔ اس کی گاڑیاں اور اسٹیشن یورپ کے جدید سے جدید ریلوے معیار کے مطابق بنائے گئے ہیں۔ پانچ کارخانے بھی مختلف مقامات میں قائم کئے گئے ہیں جن میں نہ صرف بگڑے ہوئے انجنوں اور ویگنوں کی مرمت کی جاتی ہے بلکہ بنائے بھی جاتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا ورکشاپ طہران کا ہے جو درجہ اول کا ہے۔ بقیہ اھواز، بندر شاہ۔ اندیمشک اور پل سپید میں۔ اراک اور دورود (بحریں) میں بھی دو کارخانے بن رہے ہیں جو عنقریب کام شروع کر دیں گے۔ ان کارخانوں میں ہر قسم کے جدید آلات،

جرثقیل اور برقی قوت سے کام لیا جاتا ہے۔

ریلوے کے متعلق ہر قسم کی تعلیم دینے کے لئے متعدد مدارس بھی کھول دیئے گئے ہیں جن میں ایرانی طلبا کو تعلیم دے کر تیار کیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے ملک کی ریلوں کو خود چلا سکیں اور غیر ملکیوں کی حاجت نہ پڑے۔

اس لائن کی تکمیل کے بعد دوسری دو لائنوں کا کام بھی شروع کر دیا گیا ہے۔

(۱) طہران سے تبریز تک

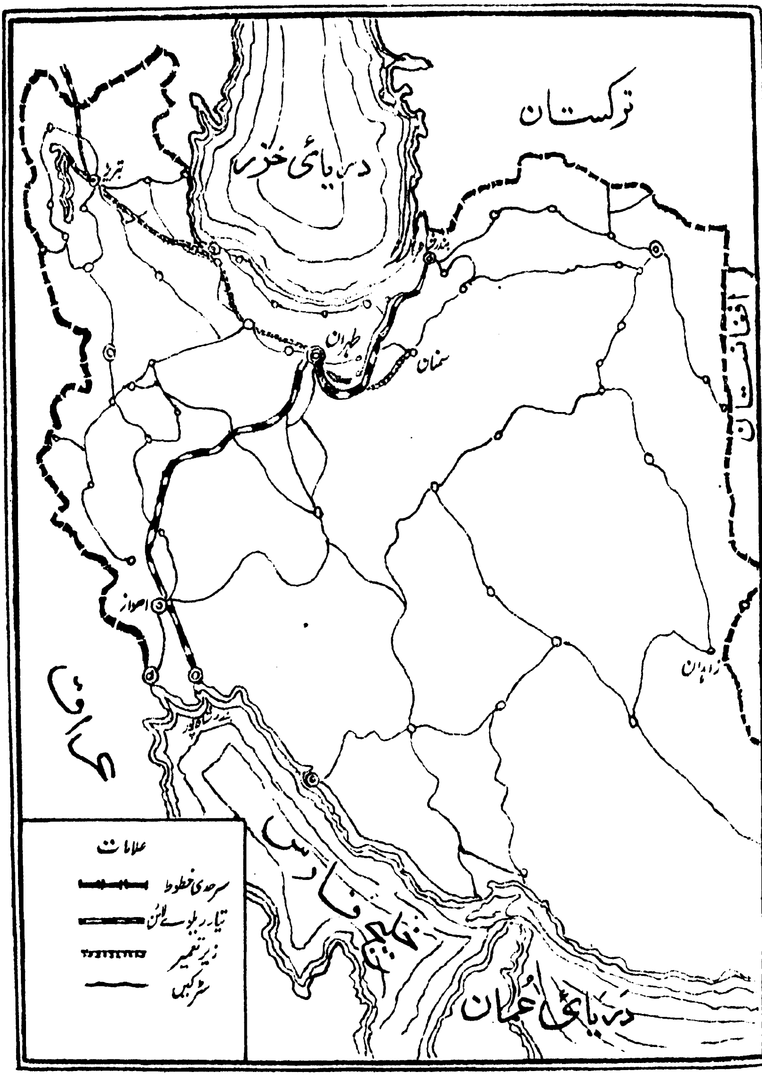
معلوم ہے کہ تبریز سے جلفا تک ریلوے موجود ہے۔ طہران سے تبریز کو ملحق کر دینے کے بعد براہ راست دارالسلطنت کا تعلق قفقاز کے ساتھ ہو جائے گا۔

(۲) گرمسار سے سمنان تک۔

خیال یہ ہے کہ یہ آخری لائن رفتہ رفتہ لاکر زاہدان سے ملا دی جائے گی تاکہ ہندوستان کے ساتھ تجارتی سلسلہ بڑھے۔

جملہ عالم اسلامی کے لئے مسرت کا مقام ہے کہ ترکی اور ایران ترقی کی شاہراہ میں سرعت کے ساتھ گامزن ہیں۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ کاش افغانستان کے متعلق بھی ہمارے کانوں میں دل خوش خبریں پہنچیں جو ہمارا سب سے قریبی پڑوسی ہے اور جس کی ترقی کا بہت کچھ اثر ہمارے اوپر پڑ سکتا ہے۔

اسلم جیراجپوری


ترکستان
دریائی خزر
تبریز
طہران
سمنان
افغانستان
اہواز
زاہدان
عراق
خلیج فارس
دریائی عمان
علامات
سرحدی خطوط
تیار ریلوے لائن
زیر تعمیر
سڑکیں

تعلیم کی نفسیاتی بنیادیں

(از جناب عبد الغفور صاحب - استاد دوں کا مدرسہ جامعہ)

تعلیم کے مفہوم کے سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح مختلف ضرورتوں کی وجہ سے آدمی مختلف جوابی عمل اختیار کرتا ہے۔ اور پھر یہ جوابی عمل نئی ضرورت سے کسی نئے جوابی عمل کے لئے سنگ بنیاد کا کام دیتا ہے۔ اس طرح انسان کی تعلیم و تربیت اور اصلاح ترقی کا سلسلہ جاری رہتا ہے یعنی یہ کہ تعلیم انسان کی انفرادی نشو و نما اور تمدنی ماحول کی باہمی اثر اندازی سے فروغ پاتی ہے۔

اب ہم یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ تعلیم کا یہ عمل کیوں جاری رہتا ہے۔ کون سے ایسے عناصر ہیں جو تعلیم کے سلئے بنیادی طور پر ضروری ہیں۔ اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے ہم نے عمل تعلیم کے سلسلہ میں کچھ اشارہ کیا تھا۔ اب ہم اس کو زیادہ واضح طور پر سمجھنا چاہتے ہیں۔

بچہ ایک نامی شخصیت رکھتا ہے۔ ایک طرف وہ انفرادی طور پر بڑھنے اور ترقی کرنے کی چند موروثی اور جبلی صلاحیتیں رکھتا ہے۔ دوسری طرف وہ زندگی کی مختلف منزلوں میں ان ذاتی صلاحیتوں کی بنا پر نسلی و تمدنی سرمایہ سے اپنے تجربہ اور معلومات کو برابر مالا مال کرتا جاتا ہے۔ وہ اپنے طور پر اپنی ان جبلی صلاحیتوں کے ذریعہ یہ تو جان سکتا ہے کہ سورج سے ہمیں گرمی اور روشنی پہنچتی ہے۔ آگ سے حرارت پہنچتی ہے۔ پانی ہماری زندگی کے لئے ایک لازمی چیز ہے۔ مگر وہ اپنے طور پر ان کی ماہیتوں کو نہیں سمجھ سکتا وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ سورج ہمیں نہ صرف گرمی اور روشنی پہنچاتا ہے بلکہ وہ ہماری زندگی کے لئے خوراک بھی مہیا کرتا ہے اس میں وہ حیات بخش قوتیں پائی جاتی ہیں کہ اگر دنیا ان سے محروم کردی جائے تو وہ زندگی کی نعمتوں سے بھی محروم ہو جائے گی۔ اسی طرح وہ سورج کے متعلق جدید علمی تحقیقات کو صرف از خود ہرگز نہیں سمجھ سکتا بلکہ ممکن ہے کہ اگر اس کو جاہل رکھا جائے تو وہ سورج کے متعلق وہی توہمات قائم کرے جو آج سے کئی ہزار سال پہلے اس کے دوسرے بھائی قائم کرتے چلے آئے ہیں اسی قسم کی بہت سی باتیں

ہیں جنھیں آدمی اپنے طور پر نہیں سمجھ سکتا۔ بلکہ وہ صرف نسلی تجربہ سے ان کے وسیع معنوں کو سمجھ سکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آدمی اپنے طور پر تجربہ کرنے اور سیکھنے کے لئے چند بنیادی محرکات رکھتا ہے مگر سماجی ورثہ ہی کی بدولت ان کی تہذیب و تربیت سے آدمی متمدن انسانوں کی زندگی گزار سکتا ہے اگر تمدنی اثرات سے بچپن ہی سے آدمی کو محروم کر دیا جائے تو وہ اس وحشی انسان سے بہتر زندگی کی اہلیت اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتا۔ جو چند بنیادی احتیاجات و محرکات کے اثر سے اپنی جسمانی احتیاجات کو پورا کرتا ہے اور بس۔ انسانی زندگی میں اس قسم کی مثالوں کی کمی نہیں ہے۔

اس قسم کے واقعات سننے میں آئے ہیں کہ کوئی بچہ اتفاق سے جنگل میں رہ گیا۔ اس نے عمر کا بیشتر حصہ جنگل میں انسانی آبادی اور اثر سے دور گزارا۔ اب وہ نہ زبان سمجھتا ہے نہ آدمیوں کی طرح کھاتا پیتا ہے۔ اور نہ ان کی طرح رہتا سہتا ہے۔ اس میں اور دوسرے جانوروں میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔ دور کیوں جائیں ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ ممالک کے موازنہ سے ہم اس فرق کو بہت اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ایک ترقی یافتہ ملک میں اس کے افراد کے لئے ترقی کرنے اور بڑھنے کے لئے زیادہ مواقع اور سہولتیں ہوتی ہیں مگر غیر متمدن ممالک میں افراد سماجی افلاس کی وجہ سے پسماندہ رہتے ہیں۔

یہاں پر تعلیم و تمدن کے مسئلہ کو چھیڑنے کا مقصد یہ تھا کہ انسان ارتقا کی ہر ایک منزل میں چند ابتدائی بنیادی صلاحیتیں رکھتا ہے اور ان میں ہر وقت ترقی و تبدیلی کی گنجائش رہتی ہے مگر جیسا ماحول ملتا ہے آدمی اپنی ان صلاحیتوں سے ویسا ہی کام لیتا ہے۔

اگر ہم نئی پود کے بہی خواہ ہیں، اس کی بڑھتی ہوئی زندگی اور جسمانی و ذہنی نشوونما سے دلچسپی رکھتے ہیں تو ہم پر لازم آتا ہے کہ بچہ کی صلاحیتوں کا مطالعہ کریں اور ان کی امکانی تربیت پر سوچیں اگر ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہر متوسط قابلیت کے انسان میں بہتر سے بہتر زندگی حاصل کرنے کی صلاحیتیں ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ علم، ترقی، اور تہذیب و تمدن کسی خاص فرد یا جماعت کی امتیازی خصوصیت نہیں ہے بلکہ نسل انسان کے تمام متوسط درجہ کے انسانوں میں بلا کسی نسلی اور ملی تفریق کے تعلیم و تربیت کی صلاحیتیں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں تو پھر ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم ان کی صلاحیتوں اور ان کے تربیتی امکانات کو بغور مطالعہ کریں۔ اور ان حالات

کو سمجھنے اور ان کو پیدا کرنے کی کوشش کریں جن کے ذریعہ قوم کا ہر فرد بہتر سے بہتر شہری بننے کے قابل ہو اور اپنی تعلیم سے اپنے آپ کو اور انسانیت کو فائدہ پہنچائے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہمارا فرض ہے کہ بچہ کی زندگی کی ہر منزل میں ایک نمو پذیر شخصیت تسلیم کریں اور اس نمو پذیر شخصیت کو جس قسم کی ذہنی اور جسمانی خوراک کی ضرورت ہو اس کا مناسب خیال رکھیں۔ اس لحاظ سے اگر بچہ کی زندگی کو ایک ننھے پودے سے تشبیہ دی جائے تو اگرچہ یہ تشبیہ مکمل نہیں کہی جاسکتی پھر بھی ہمیں اس سے بہت کچھ اندازہ بچہ کی بڑھتی ہوئی شخصیت کا ہو جائے گا۔

جس طرح پودا پھلنے پھولنے اور بڑھنے پھیلنے کے لئے اپنے اندر صلاحیتیں رکھتا ہے مگر اس کی قدرتی صلاحیتیں صرف اس وقت معیار ترقی کو پا سکتی ہیں جب اس کو مناسب وقت پر مناسب مقدار میں دھوپ، پانی اور کھاد وغیرہ دیا جائے۔ پودے کے راستہ میں بڑھنے کے لئے جو رکاوٹیں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتی رہیں ان کو دور کرتے رہیں۔ کم و بیش اسی طرح انسان کے بچہ کا حال ہے۔

تعلیم اور انسان کی نمو پذیری

بچہ کی ابتدائی خامیوں اور ناتوانی کو دیکھ کر تربیت کرنے والوں نے یہ غلط اندازہ لگایا ہے کہ بچہ چکنی مٹی کے مانند ہے۔ اس کو آدمی جس شکل میں چاہے ڈھال سکتا ہے۔ اس کی ساری زندگی کا دارو مدار معلم یا مربی کے منشا پر ہوتا ہے۔ اور معلم کو اس سے سروکار نہیں کہ بچہ کے اندر بڑھنے کے لئے کیا کیا صلاحیتیں ہیں۔ دنیا میں زندہ رہنے کے لئے کیا کیا محرکات ہیں۔ کیا وہ اپنے طور پر بھی کچھ تجربے کرنا اور سیکھنا چاہتا ہے؟ کیا وہ بھی اپنی خواہشات کی ایک چھوٹی سی دنیا رکھتا ہے اور ان کو پورا کرنے کی اسے دھن ہے۔ ہمارے معلم نے ابھی تک اس طرف کم توجہ دی ہے۔ وہ تعلیم کو اس غرض سے نہیں دیکھتا کہ تعلیم بچّہ کی زندگی کی ایک ایسی اہم ضرورت ہے جس کو بچہ اپنے طور پر بھی پورا کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے طور پر بھی سیکھنے کی خواہش رکھتا ہے۔ معلم کا کام یہ ہے کہ وہ بچہ کی اس ضرورت کو سمجھے۔ اس کی حدود کو بھانپ لے اور ان حدود کے اندر اندر بہتر سے بہتر طریقہ پر اس کی مدد کرے۔ وہ بچہ کے چنچل پن، اس کی شوخی، اس کی تیزی، طراری اور چلبلے پن

کو تعلیم کی راہ میں رکاوٹیں نہ سمجھے۔ وہ اپنے ارادے اور بچہ کے ارادے کو دو متضاد چیزیں خیال نہ کرے۔ بچہ کی ذاتی اپج اور دلچسپیوں کا لحاظ کرے۔ معلم کو اس بات کا یقین ہونا چاہیئے کہ بچہ بھی اپنی طرف سے سیکھنے اور تجربہ کرنے کا اقدام کر سکتا ہے۔ اس لئے بلا کسی امتیاز کے معلم بچہ کے تمام مشغلوں کو شک و شبہ کی نظر سے نہ دیکھے تعلیم اور بچہ کے مشاغل دو متضاد چیزیں نہیں ہیں ان میں ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ موجودہ تعلیم کی بڑی خرابی تو یہ ہے کہ اس میں بچہ کی زندگی کے دو حصے سمجھے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو بچہ گھر پر گزارتا ہے۔ ساتھیوں میں کھیلتا ہے۔ اپنی چھوٹی موٹی عملی دلچسپیاں رکھتا ہے۔ دوسرا رخ اس کی زندگی کا یہ ہے کہ وہ مدرسہ جاتا ہے کتابیں پڑھتا ہے۔ مختلف مضامین سیکھتا ہے۔ اور مروجہ دستور کے مطابق زندگی کی تیاری کرتا ہے۔

بچہ کی شخصیت میں اس قسم کی دوئی ہرگز نہیں پائی جاتی۔ بچہ ایک مجموعی شخصیت رکھتا ہے گھر اور مدرسہ پر وہی شخصیت مجموعی طور پر بڑھتی ہے۔ وہ مجموعی طور پر اثرات قبول کرتی ہے۔ اس لئے بچہ کے گھر اور مدرسہ میں قریبی تعلق ہونا ضروری ہے۔ بچہ کی تعلیم اس کے قریب ترین ماحول سے شروع ہونی چاہیئے۔ جیسے جیسے ذہنی وسعت پیدا ہوتی جائے گی ماحول کا دائرہ بھی بڑھتا جائے گا اور بچہ کی تعلیمی جولانگاہ بھی وسیع تر ہوگی۔ اس لئے معلم یا مربی کا فرض ہے کہ وہ بچوں کی ضرورت کو سمجھے، ان کے قریب ترین مشاغل اور ذاتی دلچسپیوں سے واقف ہونے کی کوشش کرے اور ان کی روشنی میں بچہ کی تعلیم و تربیت کا ہر موقع پر اہتمام کرے۔

تعلیم کو ابھی تک بہت تنگ معنوں میں لیا گیا ہے۔ تعلیم کے معنی یہ سمجھے گئے ہیں کہ آدمی کو شہری زندگی کے لئے تیار کیا جائے۔ بچہ کے سامنے کسی نہ کسی طرح سماج کا نقطۂ نظر پیش کیا جائے چنانچہ اس بنا پر اس کے ساتھ نئے رنگروٹ کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس سے وہ تمام قواعد اور ریاضتیں کرائی جاتی ہیں جو کسی نئے فوجی کو کرنی ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک میں تو شاید تعلیم اس سے بھی زیادہ محدود معنوں میں لی گئی ہے یعنی یہ کہ نوجوانوں کو نوکریوں کے لئے تیار کیا جائے اگر ملک کے کسی مخصوص طبقہ کے لئے فوجی تعلیم کی طرح اس مخصوص قسم کی تعلیم کا انتظام کرایا جاتا تو بھی ایک معنی رکھتا مگر یہاں تو اندھا دھند سارے ملک کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کا سلسلہ عرصہ دراز سے جاری ہے۔ اور نہ معلوم کب تک جاری رہے گا۔

اس ناقص نظام تعلیم سے جتنا قومی نقصان ہمارے ملک کو ہوا ہے اس کا اندازہ ہماری قوم کی ذہنی اور علمی کم مایگی سے بآسانی کیا جا سکتا ہے، غرض ہماری تعلیم میں کبھی اس قسم کی منظم کوشش نہیں کی گئی کہ تعلیم سماجی مصلحتوں اور انفرادی صلاحیتوں کی بنا پر دی جائے۔

سماجی حیثیت کو پہر بھی تسلیم کیا گیا ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس کا استعمال غلط طریقہ سے ہوا ہے اور اس میں بچہ کی ذات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بچہ کی تعلیم میں زیادہ سے زیادہ یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اس کو سماج کے عام سانچہ میں ڈھال دیا جائے۔ بچہ میں خود سماج سے متاثر ہونے اور اس کا زاویہ نگاہ سمجھنے کی صلاحیت ہے۔ مگر جس طریقہ سے سماج کے سرمایہ کو پیش کیا جاتا ہے وہ بالکل پھیکا اور خشک ہے۔ اس میں بچہ کو کبھی اس کا موقع نہیں دیا جاتا کہ وہ سماج کے کاموں میں سادہ طور پر شرکت کرے اور اس طرح سماج کی روح کو سمجھے بلکہ غیر فطری دباؤ کے ماتحت سماج کی بعض مسلمہ باتوں کو مجرد شکل میں بچہ پر تھوپ دیا جاتا ہے۔

جس طرح آدمی تیرنا تیرنے سے سیکھتا ہے اسی طرح سماجی زندگی کو سماج کے مشاغل اور اداروں میں براہ راست شرکت کرنے سے سیکھتا ہے، اور صرف اسی صورت میں بچہ حقیقی معنوں میں تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ غرض سماجی اداروں کے ذریعہ ہی بچہ کو علمی اور تمدنی سرمایہ سے روشناس کرایا جا سکتا ہے۔ اس لئے جب مدرسہ میں الگ الگ مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے اور بچہ اس میں اپنی کچھ دلچسپی نہیں پاتا تو وہ یا تو پڑھنے سے جی چراتا ہے یا بیگار سمجھ کر استاد کے ڈر سے لگا رہتا ہے۔ یہ کتنا ظلم ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو متواتر کئی گھنٹے بے معنی چیزیں رٹائی جائیں اگرچہ بالغ کے لئے یہ بامعنی ہیں لیکن بچوں کی اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اس کی ضرورت کو نہیں سمجھتے۔ اس لئے جب بچے پڑھنے سے پہلو تہی کرتے ہیں تو ان کی صلاحیتوں پر شبہ کیا جاتا ہے مگر معلم یہ نہیں سمجھتا کہ اگر ان کو آزادی دی جائے تو ان میں خود بخود اندرونی ضبط کی تربیت ہو سکتی ہے۔ اس لئے بچہ سے مکمل خاموشی، تابعداری اور فرمانبرداری کی امید اس کی بڑھتی ہوئی شخصیت کی قیمت پر کی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی پابندیاں بہت نیک نیتی کی بنا پر کرائی جاتی ہیں اور بہت سے لوگ یہ خیال

"جو راستاد بہ زہر پدر" خلوص نیت سے رکھتے ہیں مگر بچہ کی تعلیم و تربیت کے متعلق بہ نظریہ بچہ کی فطرت اور قدرتی صلاحیتوں سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ اگر ہم بچہ کی فطری نمو پذیری اور اس کے قوانین سے واقف ہوتے تو ہم تعلیم و تربیت کو یک طرفہ معاملہ سمجھ کر اس کی بڑھتی ہوئی شخصیت کو اپنے طرزِ عمل سے نقصان نہ پہنچاتے اور اس کے ارادوں۔ خواہشوں۔ فیصلوں، جذبات اور خیالات کا احترام کرتے۔

بچہ اپنی دوڑ دھوپ سے کھیل کود سے، اشیاء کے جوڑ توڑ سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ جذبات اور خواہشات رکھتا ہے۔ ارادے اور مقاصد رکھتا ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا ہے اپنے ماحول میں تصرف کرنا چاہتا ہے اور اس طرح سے وہ اپنے طور پر کچھ نہ کچھ سیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے اندر مخفی قوتیں ہیں وہ کسی نہ کسی شکل میں اظہار چاہتی ہیں۔ خارجی افعال کے ذریعہ اپنی تربیت و تکمیل چاہتی ہیں۔ اور یہ محرکات بچہ کے لئے اس قدر قدرتی ہیں جس طرح بھوک اور پیاس ہیں۔ یہ وہ محرکات ہیں جن کی تربیت سے آدمی مہذب انسان بن سکتا ہے اور جن کی طرف سے غفلت برتنے سے انسان وحشی سے زیادہ ترقی نہیں کر سکتا۔ ان کی صحیح تربیت سے انسان میں وہ خوبیاں اور مہارتیں پیدا ہو سکتی ہیں جو متمدن زندگی کا لازمہ ہیں غرض یہ محرکات اور جبلی صلاحیتیں ابتدائی حالت میں کتنی ہی خام اور ناتمام کیوں نہ ہوں ان میں ترقی اور اصلاح کی اس قدر گنجائش ہے جس کا اندازہ ہم اپنی اور دوسروں کی زندگی کے مشاہدہ سے کر سکتے ہیں آغاز میں دیکھئے تو انسان کا بچہ اپنی زندگی کے لئے دوسروں کا کس قدر محتاج ہوتا ہے مگر وہی عاجز و ناتواں مخلوق تربیت پا کر وہ کچھ کر سکتا ہے جس کا کہ آدمی کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ غرض انسان جبلی طور پر بڑھنے۔ ترقی اور اصلاح کرنے کے لئے چند بنیادی محرکات اور صلاحیتیں رکھتا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ قدرتی محرکات کیا ہیں جن کو کام میں لا کر بچہ کی تربیت کی جا سکتی ہے۔

اگر یہ ممکن ہوتا کہ آدمی پیدائشی طور چند محدود محرکات رکھتا جن کے اثر سے انسان کا جوابی عمل متعین ہو جاتا تو انسان کی تعلیم و تربیت کے متعلق چند مخصوص بنیادی محرکات کی روشنی میں آسانی سے پیشبندی کی جا سکتی تھی۔ مثلاً یہ کہنا آسان ہوتا کہ مخصوص حالات پیدا کرنے سے آدمی مخصوص قسم کا طرزِ عمل اختیار کرے گا مگر یہ بنیادی تحریکات کوئی ایسی شے نہیں ہیں جن کی طرف ہمیشہ کے لئے انسان کے طرزِ عمل کو

منسوب کیا جا سکے کیونکہ انسان کے یہ محرکات علم اور تجربہ سے بدلتے رہتے ہیں۔ ہر دوسری تحریک اپنے اثرات کے اعتبار سے پہلی تحریک سے مختلف ہوتی ہے۔ حالانکہ ہو سکتا ہے کہ ماخذ ایک ہی ہو۔ مثلاً بچہ میں بھوک کے لئے کھانے کی خواہش ایک بنیادی تحریک ہے مگر وہ شروع میں کھانے کے لئے جن چیزوں کو پسند کرتا ہے بڑھنے پر ان کو چھوڑتا جاتا ہے بچپن میں بچہ کو اگر کریلا دیا جائے تو شاید کڑواہٹ کی وجہ سے اسے تھوک کر منھ سے پھینک دے مگر جیسے جیسے مختلف کھانوں کا اسے موقع ملتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کا ذوق بدلتا جاتا ہے اب یہ سوال نہیں ہوتا کہ آدمی بھوک کی وجہ سے کھانا چاہتا ہے بلکہ وہ خاص قسم کا کھانا کھانا چاہتا ہے۔ مختلف کھانوں میں ایک خاص قسم کا امتزاج چاہتا ہے۔ اس لئے ترقی و تبدیلی کے اعتبار سے انسان بہت سی وسعتوں کا مالک ہے۔ وہ تعلیم و تربیت کے لئے عجیب و غریب صلاحیتیں رکھتا ہے اسی لئے چند نفسی سانچوں میں اس کو محدود کرنا مشکل ہے۔ تاہم انسان کے ذاتی رجحانات کا اندازہ کرتے ہوئے اتنا کہا جا سکتا ہے کہ انسان خاص موقعوں پر خاص محرکات سے غالباً کوئی مخصوص طرز عمل اختیار کرے گا۔

اس سلسلہ میں جس طرز عمل کے متعلق زیادہ صحت و یقین کے ساتھ پیش گوئی کی جا سکتی ہے اس کو فعل اضطراری کہتے ہیں یعنی وہ فعل جو بہت حد تک غیر ارادی ہو گر ہمارے شعور سے خارج نہ ہو۔ ایسی صورتوں میں آدمی کسی خاص ہیجان کے لئے خاص جوابی عمل دینے پر مجبور ہوتا ہے جیسے تیز بجلی چمکنے میں ہماری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں لیکن ایسے اعمال انسان کی زندگی میں بہت تھوڑے ہیں بلکہ وہ بیشتر طور پر اپنے ارادہ سے خاص حالات کے اندر کوئی خاص عمل یا فیصلہ کرتا ہے۔ وہ اپنے فیصلہ اور طرز عمل میں بنیادی محرکات کا اس طرح پابند نہیں ہوتا جیسے بیشتر جانوروں کے معاملہ میں ہم نمایاں طور پر دیکھتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی شیر یا چیتے کو چھیڑا جائے تو اس کے پہلے محرک یعنی غصہ کا جوابی عمل پنجہ مارنا ہوتا ہے۔ مگر انسان کا معاملہ اس کے بہت مختلف ہوتا ہے اس کا یہ جوابی عمل صرف جبلی تحریک کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ بیشتر اس میں عادات اور گزشتہ تجربے کارفرما ہوتے ہیں چنانچہ ابتدا میں بہت کچھ کام بچے اپنے فوری جذبہ کے ماتحت کرتے ہیں۔ اسی طرح بعض جاہل اور غیر مہذب لوگ بھی اپنے ابتدائی محرکات کے اثر سے بہت جلد کچھ نہ کچھ فیصلہ کرتے ہیں۔ گر مہذب

اور تجربہ کار آدمی بہت سے عادات پیدا کرتے ہیں۔ اپنے بہت سے جذبات پر قابو پاتے ہیں۔ بہت سی ناپسند عادتوں کو ترک کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان کا فیصلہ بیشتر جچا تلا ہوتا ہے۔ بچوں کو زندگی کا تجربہ کم ہوتا ہے۔ ان کی عادتیں ناپختہ ہوتی ہیں اور معلومات محدود اس لئے ان کے کاموں اور مشغلوں میں بے ساختگی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی ہے اور تجربہ بڑھتا جاتا ہے عادات بھی کوئی مخصوص شکل اختیار کرنے لگتی ہیں وہ اپنے کاموں کو نتائج کی رو سے جانچنے اور عقل کی روشنی میں دیکھنے کے عادی ہوتے جاتے ہیں۔ مثلاً جب چھوٹے بچے فٹ بال کھیلتے ہیں تو شروع میں گول کرنا اور دوسری جماعت کو ہرانا اپنا مقصد سمجھتے ہیں مگر ذرا سی دیر میں گول کرنے کا مقصد آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور وہ گیند مارنا اپنا مقصد سمجھنے لگتے ہیں اپنی مقررہ جگہوں کو چھوڑ چھوڑ کر بال کے ارد گرد جم جاتے ہیں۔ اس مثال میں بچے گول کرنے کے مقصد کو بھول جاتے ہیں بلکہ چونکہ ان میں قوت ہے لہذا قوت کے اظہار سے اس طرح اطمینان حاصل کرتے ہیں کہ لات مارنے سے گیند کتنی دور تک گئی۔ جیسے جیسے ان کا تجربہ بڑھتا جاتا ہے وہ اپنے ساتھیوں کا خیال کرنے لگتے ہیں۔ منظم طور پر کھیلنے سے انہیں خوشی حاصل ہونے لگتی ہے وہ کسی مقصد پر دیر تک قائم رہنے کے عادی ہونے لگتے ہیں۔ کسی مشغلہ پر دیر تک سوچ سکتے ہیں۔ اور زیادہ یکسوئی کے ساتھ اس میں مشغول رہ سکتے ہیں۔ یہ سب رجحانات۔ عادت اور تجربہ سے مناسب عمر میں بچہ میں نشو و نما پاتے ہیں۔

یہ بات کہ ابتدائی محرکات زندگی کے آخری محرکات نہیں ہیں بلکہ یہ چند اساسی رجحانات ہیں جن کی تشکیل آئندہ زندگی کے مواقع اور تجربات پر اپنا دارومدار رکھتی ہے۔ ایک چھوٹے بچہ کی مثال سے واضح ہو جائے گی۔ بچوں کو ناآشنا چیزوں سے ایک قدرتی دلچسپی ہوتی ہے۔ ایک سمجھ دار دایہ چھوٹے بچہ کی اس خاصیت سے اسی کے نہلانے اور صاف رکھنے میں اس طرح فائدہ اٹھاتی ہے۔ دایہ ایک چھوٹے سے ٹب میں پانی ڈالتی ہے اس میں تھوڑا سا صابن گھول لیتی ہے۔ صابن کو گھولنے کے بعد ایک باریک نلکی سے اس میں بلبلے پیدا کرتی ہے۔ بچہ ان بلبلوں کو دیکھتا ہے اور بہت ذوق و شوق سے پانی کی طرف لپکتا ہے پانی کا درجہ حرارت معتدل ہے پانی میں وہ بلبلوں کو پکڑنے کے لئے ہاتھ پیر مارتا ہے اسے اس تجربہ سے خوشی حاصل ہوتی ہے اور اس خوشی میں پانی کا خوف بچہ کے ذہن سے اتر جاتا ہے۔ شروع میں تو بلبلوں

کے لالچ سے بچہ پانی میں ہاتھ پیر مارتا ہے لیکن بعد میں پانی میں ہاتھ پیر مارنے سے اسے خوشی ہوتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ اس طرح نہانے سے اسے دلچسپی پیدا ہونے لگتی ہے اب وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے مقررہ وقت پر نہانے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کو صفائی اور غسل کرنے کی ایسی عادت پڑ جاتی ہے کہ اگر کسی وقت اس کو نہانے کو نہ ملے تو اسے تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ اس مثال میں ہم نے دیکھا کہ کس طرح محرکات بدلتے جاتے ہیں۔ شروع میں آدمی جس تحریک سے کوئی کام کرنے لگ جاتا ہے بعد میں اس کام یا مشغلہ کے دوران میں خود بخود ایسی تحریکیں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں جو کرنے والے کو اس کو جاری رکھنے پر آمادہ کرتی ہیں اس مثال سے ہم نے دیکھا کہ کس طرح جبلی محرکات عادات اور تجربہ سے بدلتے رہتے ہیں۔ شروع میں آدمی کے جوابی عمل بالکل شعوری محرکات سے طے ہوتے ہیں مگر جیسے جیسے عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے اور تجربہ بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے آدمی اپنی سیرت کی تدریجی تشکیل کے دوران میں ان ابتدائی محرکات کی تربیت کرتا جاتا ہے۔ چنانچہ بعد میں جاکر نہ وہ صرف عادات اور فوری محرکات سے اثر قبول کرتا ہے بلکہ وہ سوچ سمجھ کر بھی بہت کچھ اپنے طرز عمل کو طے کرتا ہے۔ چنانچہ جتنا زیادہ آدمی کام سمجھ بوجھ سے لیتا ہے اتنا اس کا کام زیادہ با تربیت اور جچا تلا ہوتا ہے۔ اس کے کام میں بے ساختگی اور من موجی پن کو دخل نہیں ہوتا بلکہ اس کا ہر قدم کسی متعین منزل کی طرف بڑھا ہوتا ہے۔ اور اس کا ہر ایک کام کسی طے شدہ خاکہ کا حصہ ہوتا ہے۔ چنانچہ محرک شعوری Impulse خواہش، مقصد، ارادہ یہ سب محرک کی مختلف صورتیں ہیں جو سوچ بچار اور جبلی محرکات کے اثرات کی نسبتی کمی بیشی سے مختلف شکلیں اختیار کرتی ہیں ہمیں ان مختلف الفاظ کی تشریح سے معلوم ہو جائے گا کہ سوچ بچار کس طرح جبلی محرکات کو بدلتے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ محرک یا فوری جذبہ ہوتا ہے جس میں آدمی ایک دم بے ساختہ طور پر کسی کام کو کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے جیسے بچہ کھلونے کو دیکھ کر فوراً اس کی طرف لپکنے لگتا ہے اس صورت میں بچہ جو کچھ کرتا ہے اس سے آگاہی رکھتا ہے۔ مگر یہ آگاہی بالکل وقتی ہے۔ ذرا سی دیر میں اگر وہ چیز نظر سے غائب ہو جائے تو اسے بھول جاتا ہے دوسری بات ہے مقصد۔ اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ مقصد کی حالت میں طلب کی یہ کیفیت دیر تک رہتی ہے اس میں اس طلب کو پورا کرنے میں سوچ بچار کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اس میں بچہ نہ صرف کسی چیز کو حاصل

کرتا ہے بلکہ اس کے ذہن میں حاصل کرنے کے خاص خاص امکانات ہوتے ہیں۔ وہ ان امکانات کو سوچتا ہے۔ اور حصول مقصد کے لئے ذرائع سوچتا ہے مثلاً کسی چھوٹے بچہ کو اس کا باپ ایک خوبصورت تصویر دکھاتا ہے۔ بچہ خوش ہوتا ہے اسے حاصل کرکے کچھ دیر تک اپنے پاس رکھتا ہے باپ اس کی توجہ کو ہٹا کر تصویر اٹھا لیتا ہے اس اندیشہ سے کہ شاید بچہ تصویر خراب کر ڈالے۔ بچہ کو تصویر یاد آتی ہے۔ اس کے لینے پر اصرار کرتا ہے۔ روتا ہے۔ ماں کے پاس تصویر دلانے کے لئے دوڑتا ہے۔ کسی اور قریبی رشتہ دار کو تصویر دلانے کے لئے آمادہ کرتا ہے اب یہ بچہ نہ صرف کسی فوری تحریک کے اثر سے کسی دیکھی ہوئی تصویر کو اٹھاتا ہے جیسے پہلے مثال میں ہم نے دیکھا بلکہ اس صورت میں تصویر غائب ہونے پر بھی تصویر کا تصور اس کے دماغ پر حاوی ہے۔ وہ تصویر دوبارہ حاصل کرنے کے لئے نئے طریقے سوچتا ہے۔ تصویر کی یاد برابر اسے ستاتی ہے۔ اس صورت میں بچہ زیادہ غور و فکر اور اپنے گزشتہ کامیاب تجربوں سے فائدہ اٹھاتا ہے مثلاً جب وہ دیکھتا ہے کہ اتا اس کا مطالبہ پورا نہیں کرتی۔ تو اماں کے پاس دوڑتا ہے۔ ان کو پریشان کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنا مطالبہ اماں کے ذریعہ پورا کرانے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ ارادہ کی صورت میں جوابی عمل اس سے بھی زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ یہاں پر کسی کام کے کرنے کے لئے صرف ایک محرک نہیں ہوتا بلکہ کئی محرکات ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں مثلاً ایک بچہ مدرسہ بھیجا جاتا ہے راستے میں وہ دوسرے لڑکوں کو کھلے میدان میں مزے سے گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے دیکھتا ہے۔ کھیلنے کے لئے جی بہت للچاتا ہے مگر کیا کرے مدرسہ نہ جائے تو والد ناراض ہوں۔ بچہ نیک طبیعت کا ہے۔ وہ والد کی ناراضگی کا بھی خیال کرتا ہے ادھر گلی ڈنڈے کی لالچ اور ساتھیوں کا بلاوا پھسلا رہا ہے۔ آخر کیا کرے۔ اس کشمکش کی حالت میں وہ تھوڑی دیر رہنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ والد کا ناراض کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ مدرسہ ہی چلنا چاہیئے۔ یہاں پر بچہ کو دو کاموں میں سے ایک کام کو ترجیح دینی پڑی۔ جب ایسی صورت حال پیش آتی ہے تو اس صورت میں محض جبلی محرکات یا جبلی محرکات پر مبنی عادتیں آدمی کے طرز عمل میں فیصلہ کن نہیں ہوتیں بلکہ اسے کسی خاص رد عمل کے اختیار کرنے کے لئے سوچنا پڑتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس سوچنے میں وہ اپنے گزشتہ عادات یا جبلی محرکات سے اثر قبول کرے کیونکہ آدمی جب کسی نئی مشکل سے دوچار ہوتا ہے

اور اسے حل کرنے کے لئے سوچتا ہے تو عام طور پر وہ اپنے گذشتہ علم اور تجربہ سے جس کی مدد سے وہ ایسے موقعوں پر کامیاب ہوا ہے کام لیتا ہے اور جب وہاں سے بھی کوئی جواب نہیں ملتا تو اس کی روشنی میں احتیاط سے کوئی فیصلہ کرتا ہے۔

تعلیم اور جبلت

گزشتہ سطروں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ جبلتیں بجائے خود ایسی محرکات نہیں ہیں جو ہمیشہ کے لئے ہماری زندگی پر حاوی ہوں۔ ان کے متعلق تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ زندگی کے لئے ابتدائی محرکات کا کام دے سکتی ہیں۔ پھر جیسے جیسے تجربہ بڑھتا جاتا ہے ان کا اثر گھٹتا جاتا ہے آدمی نیا ذوق پیدا کرتا ہے۔ نئی عادتیں سیکھتا ہے۔ نئے مقاصد بناتا ہے۔ نئی ضرورتیں پیدا کرتا ہے اس لئے شروع کی عادتیں مقاصد، مشاغل اور دلچسپیاں نئی حاصل شدہ دلچسپیوں کے سامنے ماند پڑ جاتی ہیں اور نئے پیدا شدہ محرکات آدمی کی زندگی میں مدد دیتے ہیں۔ مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ آدمی کی اندرونی صلاحیتوں اور رجحانات پر بھروسہ کرکے ان کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔ ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ ہو۔ ان کی نشو و نما خود رو ہو۔ کیونکہ یہ تبدیلی و ترقی کبھی خود بخود نہیں ہوا کرتی اس کے لئے خاص ماحول خاص اہتمام اور خاص طریقۂ کار کی ضرورت ہوتی ہے جب جا کے کہیں حسب منشا نتیجہ نکلتا ہے۔ اس لئے جو لوگ سمجھتے ہیں کہ انسانی جبلت بالکل صحیح ہے اور اس کی آزادی ہی تعلیم و ترقی کے لئے کافی ہے وہ انسانی جبلت سے ضرورت سے زیادہ توقع رکھتے ہیں جس طرح وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ انسانی فطرت بری ہے اس کو بدلنا چاہیئے۔ اور اس بنا پر بچہ کی خواہش اور منصوبہ سے بے اعتنائی برتتے ہیں اور اس پر پابندی لگانا چاہتے ہیں اپنے خیالات میں زیادہ یاس مشرب ہیں اسی طرح اول الذکر لوگ زیادہ آس مشرب ہیں چنانچہ اول الذکر گروہ کا ایک ممتاز عالم روسو سماجی اثر پذیری کے خلاف بغاوت کرکے کہتا ہے "خدا نے آدمی کو پیدا کیا مگر سماج نے آدمی کو بگاڑ کر شہری بنایا" لیکن ایک تیسری جماعت ہے جس کا خیال ہے کہ انسان نہ فطرتاً برا ہے کہ اس کی ہر ایک امنگ کو دبایا جائے اور نہ اتنا سلیم الطبع ہے کہ وہ اپنے لئے اپنے طور پر بغیر

رہنمائی کے بہتر راہ نکال سکے اور اچھا اور کامیاب انسان بن سکے۔

انسان تہذیب و شائستگی کے لئے صلاحیتیں ضرور رکھتا ہے مگر تعلیم و تربیت کے بغیر وہ جلا نہیں پاسکتیں۔ چنانچہ ہم آسانی سے دیکھ سکتے ہیں کہ جہاں بچہ کو تعلیم و تربیت کا موقع نہیں ملتا ہے وہاں باوجود آزادی کے جانوروں سے کچھ بہتر زندگی نہیں گذارتا اس لئے تہذیب و شائستگی، عمدہ خیالات، پاکیزہ عادتیں، اچھا ذوق، بلند مقاصد اور عمدہ مہارت اور کاریگری بغیر مناسب ماحول اور تعلیم و تربیت کے خود بخود پیدا نہیں ہو سکتے آج سماج تہذیب و ترقی کے جس معیار پر پہنچ گیا ہے اس نے اور بھی اس بات کو لازمی کر دیا ہے کہ انسان کی تربیت کے لئے ایسا مخصوص ادارہ ہونا چاہیئے جہاں پر وہ شہری زندگی کے لئے بہتر طریقہ پر تیاری کر سکے۔ یہ تربیت صرف کہنے سننے سے عمل میں نہیں آسکتی بلکہ اس کے لئے تو ایسے ماحول کی ضرورت ہے جس میں بچہ سماج کے مختلف مشاغل سے آشنا ہو جائے۔

اس لئے مدرسہ یا تعلیم گاہ ہمارے سماج کا بہترین نمونہ ہونا چاہیئے۔

بچہ کی قدرتی صلاحیتوں کی تربیت بذریعہ سماجی ماحول کے سلسلہ میں امریکہ کا ممتاز فلسفی اور ماہر تعلیمات جان ڈوئی کہتا ہے "بذاتِ خود قدرتی جبلتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں کیونکہ انسان اپنی دلچسپیوں میں سماجی ماحول سے خوشہ چینی کرتا ہے۔ عقاب اور شیر کی مثال میں غصہ کو براہ راست زندگی کے بچاؤ اور برقرار رکھنے کا مفید ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے مگر انسان کی زندگی میں یہ جبلت بالکل بے معنی سی چیز رہ جاتی ہے۔ اگر اس کو سماج کی اثراندازی سے الگ سمجھا جائے تو ایسی حالت میں غصہ بھڑاس کے بے کار اخراج سے زیادہ معنی نہیں رکھتا۔ غصہ میں اس وقت معنی پیدا ہو جاتے ہیں جب وہ سلگنے والا رنج ہو۔ ایک اندرونی کوفت اور خلش ہو۔ ایک اکسانے والی تحریک ہو۔ ایک خوفناک انتقامی جذبہ ہو یا ایک بھڑکنے والا شعلہ ہو۔ اگرچہ یہ با معنی مظاہر پیدائشی تحریکات کے ردعمل سے پیدا ہوتے ہیں لیکن یہ سماج کے جوابی طرزِ عمل سے متاثر ہوتے ہیں یہ اور اس قسم کے دوسرے اشتعال انگیز مظاہر محض جبلی نہیں ہیں بلکہ یہ عادتیں ہیں جو دوسروں کے تعلق سے بن گئی ہیں۔ اور یہ دوسرے لوگ بھی اپنی مخصوص عادتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنی عادتوں میں غصہ کی اندھی قوت کو خاص مواقع پر استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے اس میں کچھ معنی پیدا ہو جاتے ہیں"

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری جبلتوں کی تربیت اور ہماری عادتوں کی تشکیل کس قدر سماجی اثرات کی مرہون منت ہے۔

قدرتی صلاحیتوں کے بارے میں اس قدر بیان کرنے کے بعد اب ہم ان کو صاف طور پر سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ نفسیات کی اصطلاح میں ان تمام صلاحیتوں اور رجحانات کے لئے ایک لفظ استعمال کیا گیا ہے یہ لفظ جبلت کہلاتا ہے۔ صاف اور سادہ لفظوں میں "جبلت" سے مراد انسان کے وہ موروثی رجحانات ہیں جو خاص خاص مواقع پر کم سے کم تحریک سے خود بخود کوئی خاص جوابی عمل پیدا کرتے ہیں مثلاً بچہ کو یکایک زمین پر گرانے سے ڈر لگتا ہے اسی طرح کسی آدمی کی خودداری کو ٹھیس لگانے سے اس کو غصہ آتا ہے۔ اور وہ انتقامی کارروائی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے یا اگر کسی کو قید تنہائی دی جائے تو وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کی محبت کو ترستا ہے یہ اور اس قسم کی دیگر جبلتیں انسان میں پائی جاتی ہیں جن کے ابھارنے سے آدمی کسی خاص طرز عمل کے اختیار کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ جبلت کے سمجھانے کے لئے جب اس قسم کی مثالیں دی جاتی ہیں تو اس پر یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ اصلی اور پیدائشی رجحانات نہیں ہیں بلکہ یہ چند حاصل کردہ عادتیں ہیں جن کو انسان نے اپنے تجربہ سے حاصل کیا ہے مثلاً بچہ گرنے سے اس لئے ڈرتا ہے کہ شاید وہ اس سے قبل یہ تلخ تجربہ اٹھا چکا ہو۔ یا آدمی قید تنہائی اس لئے محسوس کرتا ہے کہ وہ عرصہ تک ماں باپ بھائی بہن، عزیز اقارب اور دوستوں کے ساتھ رہ چکا ہے اور ان سے لطف اندوزی حاصل کی ہے اس لئے جب اسے ان کی صحبت کی خوشی سے محروم کیا جاتا ہے تو اس پر اداسی چھا جاتی ہے پروفیسر ڈڈرتھ نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "جبلت" کے سمجھنے میں اس قسم کی الجھنیں اس لئے پیدا ہوتی ہیں کہ ہم عادات اور جبلتوں کو ایک دوسرے کا مخالف سمجھنے لگتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہ جبلت ہی ہے جو عادت کے لئے سنگ بنیاد کا کام دیتی ہے۔ جبلت ہی پر تو عادت "تجربہ" اور تعلیم کا سارا قصر تعمیر کیا گیا ہے۔ کھانے کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ایک عادت ہے کیونکہ یہ تو ہر جاندار کی ایک لازمی ضرورت ہے مگر یہ عادت بھی ہے اس لئے

آدمی کو خاص وقتوں میں بھوک لگتی ہے۔ خاص خاص وقتوں میں خاص خاص چیزیں کھانے کو جی چاہتا ہے۔ خاص خاص لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں مزہ آتا ہے۔ غرض کھانا ایک طبعی ضرورت کے ساتھ ایک عادت بھی ہے اور آدمی میں ترقی اور اصلاح کی جتنی گنجائش ہے وہ کھانے میں بھی موجود ہے۔
اسی مطلب کو پروفیسر میکڈوگل نے اپنی کتاب social Psycology میں یوں واضح کیا ہے کہ بالواسطہ یا براہ راست جبلتیں آدمی کے تمام اعمال کے لئے اولین محرک ہیں۔ کسی جبلت کی بے ساختہ تحریک یا جبلت کے ذریعہ حاصل شدہ عادت کی تحریک سے ہر ایک شغلہ شروع ہوتا ہے اور اختتام کو پہنچتا ہے۔ جبلی تحریکات آدمی کے مقصد کو متعین کر دیتی ہیں اور اس کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے اس کو قوت دیتی ہیں۔

غرض انسان عام جانوروں کے برخلاف بہت سادہ جبلتیں لے کر دنیا میں آتا ہے۔ قدم قدم پر اسے سیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کی شائستگی کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں تطابق کی کتنی صلاحیت ہے۔ وہ کسی نئے کام کو کس قدر آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ موقع پڑ جانے پر وہ اپنی عادتوں کو کیسے بدل سکتا ہے۔ مختلف قسم کے لوگوں کے ساتھ کس طرح نباہ کرتا ہے اس کی شخصیت میں کس درجہ اثر اندازی اور اثر پذیری کی اہلیت پائی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ

ان سادہ اور خام جبلتوں کی وجہ سے شروع میں انسان اپنے ماحول کے اندر بالکل بے بس ہو جاتا ہے اگر ماں باپ کا سہارا نہ ہو تو شاید چند گھنٹوں سے زیادہ دنیا میں نہ رہ سکے یہ دوسری بات ہے کہ بالقوی وہ اپنی انھیں خام صلاحیتوں کی بدولت بہت تھوڑے عرصہ کے اندر مناسب ماحول اور تعلیم و تربیت کے اثر سے تمدن کی اس بلندی پر پہنچ جاتا ہے جہاں پر دوسرے جانوروں کا پہنچنا مشکل ہے۔ حالانکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جانور پیدائشی طور پر بہت سی مہارتیں جانتے ہیں مثلاً بعض بھڑوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بغیر کسی گزشتہ تجربہ یا نقل کے اپنے لئے ایک مخصوص قسم کا چھتہ تیار کرتی ہیں جس میں مادہ انڈے دیتی ہے اور اس طرح یہ خاص طرز کا گھونسلہ ایک نسل سے دوسری نسل تک بغیر وراثت کے اس طرح چلتا ہے کہ دوسری نسل کو پہلی نسل کی کاریگری کا کچھ پتہ نہیں لگتا اس لئے کہ دوسری نسل کے انڈوں

سے برآمد ہونے سے قبل ہی پہلی نسل مرجاتی ہے۔

دور کیوں جائیں کتے کو دیکھئے بغیر کسی گزشتہ تجربہ اور مشق کے پانی میں تیرنے لگتا ہے۔ یہی حال بطخ کا ہے۔ مگر انسان کی تربیت کے لئے قدرت نے اس کو ایسی خام صلاحتیں بخشی ہیں جن کی صحیح تعلیم و تربیت سے وہ اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ہوجاتا ہے۔

غرض یہ کہ تعلیم و تربیت کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے اس کے دو بڑے حصے کئے جا سکتے ہیں ایک تو انسان کی خام صلاحتیں" یا "جبلتیں" جن میں عمر اور تجربے کے وقت بوقت تبدیلی اور اصلاح ہوتی رہتی ہے اور دوسری طرف سماج یا معاشرتی ماحول کا ہمہ گیر اثر جس سے جاہل اور عالم سبھی متاثر ہوتے ہیں اور جن کے مقررہ اداروں، رسوم اور روایات و دستور کے سانچے میں قوم کے اخلاق و عادات، علم اور تجربہ ڈھل جاتے ہیں۔ اور انھیں کے ذریعہ افراد کی شخصیت کی تشکیل و تکمیل ہوتی ہے۔ اس مطلب کو پروفیسر جان ڈوئی نے نہایت عمدگی کے ساتھ اپنی کتاب "Human Nature & Conduct" میں سمجھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں "بچہ کی منتشر اور غیر مربوط تحریکیں کبھی بروئے کار نہیں آسکتیں جب تک ان کو سماجی نگرانی اور تعلقات سے رنگا نہ جائے۔ اس کی ابتدائی تحریکیں یا کاوشیں دراصل اپنے اسلاف اور بزرگوں کے مزید علم اور پختہ مہارتوں کو جذب کرنے کے لئے نقطہائے آغاز ہیں۔ یہ وہ ریشے ہیں جو اس غرض سے پہلے ہوتے ہیں کہ وہ سماج کے دستور و آئین سے وہ خوراک حاصل کریں جس کے سہارے پر وہ آزاد و مستقل زندگی گزارنے کے قابل ہوسکیں۔ یہ وہ ادارے ہیں جو موجودہ سماجی قوت کو انفرادی قابلیت میں تبدیل کر رہے ہیں یہی تعمیر نو کے ذرائع ہیں۔

"پاکستان"

(اس مضمون کو جن بزرگ نے ہمارے پاس رسالہ جامعہ میں اپنے نام سے شایع کرنے کے لئے روانہ فرمایا تھا بعد میں ان کی یہ ہدایت ہمیں موصول ہوئی کہ یہ مضمون ان کے نام سے شایع نہ کیا جائے بلکہ ان کے چھوٹے بھائی کے نام سے شایع کیا جائے جو کالج میں تعلیم پا رہے ہیں ہم اسے مناسب نہیں سمجھتے کہ ایک زیر تعلیم نوجوان کے نام کے ساتھ ان کے بڑے بھائی کے وہ خیالات خواہ مخواہ منسوب کئے جائیں جنھیں ان کی مصلحت اندیشی اپنے نام کے ساتھ شایع کرانا مناسب نہیں سمجھتی۔ ہم اس مضمون کو واپس کر دیتے لیکن چونکہ ہم اس کی کتابت کرا چکے تھے اس لئے مصنف کے نام کو مخفی رکھ کر اسے شایع کر رہے ہیں)

رسالہ جامعہ کی اشاعت بابت جنوری میں ایک صاحب نے جنھوں نے اپنا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا تحریک پاکستان پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور ان تمام شکوک و شبہات کو قبل از وقت پیش کر دیا ہے جو اس تحریک کا ایک مخالف پیش کر سکتا ہے۔ سب سے اول آپ نے اس امر سے انکار کر دیا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ان کی رائے میں ذرائع آمد و رفت اور وسائل خبر رسانی کی ترقی کے بعد ملکوں کی طبعی تقسیموں اور طبقات الارض کی تفریقوں کی اہمیت بہت کم ہو گئی ہے لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ براعظم یورپ ماسوائے روس رقبہ میں ہندوستان کے برابر ہے۔ ذرائع آمد و رفت و وسائل خبر رسانی کی ترقی کے لحاظ سے ہندوستان کو یورپ سے دور کی نسبت بھی نہیں۔ جہاں پر یورپ میں دو لاکھ میل سے زیادہ لمبی لائن ہے۔ ہندوستان میں ریلوں کی لمبائی ۴۰ ہزار کے قریب ہے۔ لیکن ان تمام سہولتوں کے باوجود یورپ کی تقسیم ۲۶ جغرافیائی قطعوں میں ہو چکی ہے جہاں پر جدا جدا قومی

حکومتیں قائم ہیں۔ اگر ہندوستان میں کلکتہ سے پشاور تک اور بمبئی سے دہلی۔ پشاور۔ کوئٹہ اور کراچی تک آمد و رفت کی سہولتوں کو ترقی ہو چکی ہے تو یورپ میں پیرس سے قسطنطنیہ (اسلامبول) اور برلن سے روم تک کے طویل سفر بھی ہوائی اور خشکی کے راستوں سے کم از کم مدت میں طے ہو سکتے ہیں۔ دریائے ڈینیوب مشرقی یورپ کی سب سے بڑی تجارتی شاہراہ ہے اور نصف درجن کے قریب ملکوں میں سے گذرتا ہے۔ جو اسے اپنی تجارت و وسائل آمد و رفت کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ ملک سیاسی طور پر جدا ہیں۔ لہٰذا وسائل آمد و رفت کسی ملک کے مخصوص محل و قوع کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتے۔ پاکستان حقیقت میں ایک قدرتی خطۂ زمین ہے جو طبعی و جغرافیائی طور پر ہندوستان سے بالکل جدا ہے۔ دریائے سندھ اور اس کے معاون اس سرزمین کو سیراب کرتے ہیں۔ اس کی قدرتی حد بندی جنوب و مشرق کی طرف ریگستان راجپوتانہ و دریائے جمنا کرتے ہیں۔ ان کی آب و ہوا ہندوستان کے مقابلہ میں گرمیوں میں سخت گرم اور سردیوں میں سخت سرد ہے۔ اس کے وسائل آمد و رفت ہندوستان سے بالکل جدا ہیں۔ این ڈبلیو آر ریلوے کی شاخیں اس سرزمین کے اطراف و جوانب میں پھیلی ہوئی ہیں جن سے پاکستان کے مختلف حصے یکساں فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ بیرونی ملکوں سے بحری تجارت کراچی کی بندرگاہ سے ہوتی ہے۔ اس سرزمین کے تجارتی شہروں کا جو براہ راست تعلق کراچی کی بندرگاہ سے ہے وہ اور کسی دوسری بندرگاہ سے نہیں ہو سکتا۔ یہاں کے لوگ اپنی طرز معاشرت۔ رسم و رواج۔ تمدن و تہذیب جسمانی وضع قطع لباس۔ تاریخی روایات فوجی رجحان میں ہندوستان سے بالکل مختلف ہیں۔ یوپی مدراس و بنگال کے باشندے پنجابی۔ سرحدی یا سندھی سے کوئی دور کی مناسبت بھی نہیں رکھتے چہ جائیکہ ان کو ملا کر ایک متحدہ ہندوستانی قومیت قائم کی جائے۔ لہٰذا جدا محل و قوع و جغرافیائی حیثیت کی بنا پر اور مخصوص حالات و روایات کے لحاظ سے پاکستان ہندوستان سے بالکل الگ تھلگ واقع ہے۔

پاکستان کی جداگانہ ہستی کے جواز میں دوسری دلیل امتیاز نسل ہے لیکن اگر آپ نے یہ کہہ کر ترک کر دیا کہ دنیا میں خالص نسل رکھنے والے لوگوں کا

وجود نہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر فلسطین میں عرب یہودی آئرلینڈ میں آئرش اور السٹر کے رہنے والے۔ وسط یورپ میں سلافی اقوام۔ جنوبی یورپ کی لاطینی اقوام وغیرہ کیوں نسلی امتیازوں کی بنا پر جدا قوموں میں منقسم ہیں۔ آئرلینڈ کے باشندے مذہبًا عیسائی ہیں۔ صدہا سال سے ایک ہی ملک میں آباد ہیں۔ سب انگریزی طرز کی زبان بولتے ہیں۔ لیکن مخصوص نسلی امتیاز کی بنا پر جدا حکومتوں میں منقسم ہیں۔ السٹر کے رہنے والے اپنے آپ کو انگریزی نسل سے منسوب کرتے ہیں اور بقیہ آئرلینڈ کے رہنے والے اپنی قدیم سیلٹک نسل پر فخر کرتے ہیں۔ کیا اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ پولز۔ روسی۔ زیچ۔ سرب۔ کروٹ۔ بلغار سب سلافی النسل اقوام ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنے مخصوص نسلی امتیاز کو قائم رکھتی ہیں قوموں کی تشکیل میں نسلی امتیاز کے جذبہ نے ہمیشہ نمایاں حصہ لیا ہے پاکستان کے باشندے وسط ایشیا کی اقوام سے نسبت رکھتے ہیں جو وقتاً فوقتاً زمانہ ماضی میں اس سرزمین میں آباد ہوتی رہیں ہندوستان کے باقی حصوں میں آریہ نسل کے لوگ اصلی باشندوں سے مخلوط ہوئے لیکن یہاں بیرونی اقوام غالب حیثیت میں رہیں اور اصلی باشندے ترک وطن پر مجبور ہوئے یہی وجہ ہے کہ جسمانی مضبوطی۔ قد و قامت۔ رنگت۔ چہرے کی ساخت کے لحاظ سے یہاں کے باشندے بقیہ ہندوستان پر فوقیت رکھتے ہیں۔

آپ نے مذہب کے اختلاف کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ اس سے مجھے اتفاق ہے لیکن زبان کے اختلاف کو یہ کہہ کر نظر انداز کیا ہے کہ اس کی وجہ بھی مذہبی اختلاف ہے۔ کیا بنگال میں جہاں مسلمان آبادی کا ۵۵ فی صدی ہیں مذہبی اختلاف کے ہوتے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ایک ہی نہیں ہے۔ اگر یہ درست ہے تو مذہب زبان کے اختلاف کا باعث نہیں۔ پاکستان کے لوگ چونکہ نسل کے لحاظ سے بقیہ ہندوستان سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے زبان کا اختلاف اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ بقیہ ہندوستان کے مقابلہ میں پاکستان ہی ایسی سرزمین ہے جہاں پر کہ اردو سب باشندوں کے لئے مشترک زبان ہے اور اس کا اثر در سوخ نہایت تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے یہاں پر سندھ اخبارات و رسائل کثرت سے اردو میں شائع

ہوتے ہیں پرائمری و مڈل مدارس میں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ سرکاری دفاتر میں اردو کو ہی درباری زبان کا درجہ حاصل ہے بقیہ ہندوستان کی مانند یہاں پر بنگالی۔ مرہٹی۔ گجراتی۔ تامل وغیرہ مختلف زبانوں سے مقابلہ کا کوئی خطرہ نہیں۔ بلکہ مذہبی عقائد کے لحاظ سے بھی اس علاقہ کے باشندے بقیہ ہندوستان کے مقابلہ میں آپس میں زیادہ قریب ہیں۔ اسلام کے براہ راست غالب اثر کے باعث اس سرزمین میں ہندوؤں میں آریہ سماج تحریک کو فروغ حاصل ہوا جو اپنے آپ کو توحید پرست و اہل کتاب سمجھتے ہیں اور قدیم ہندو بت پرستی کے مخالف ہیں۔ سکھوں میں بھی اسی طرح اسلامی خیالات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ مورتی پوجا و بت پرستی کو اس سرزمین میں وہ وقار حاصل نہیں ہے جو اسے ہندوستان میں حاصل ہے۔

اس امر کو تسلیم کرنے کے بعد کہ پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہے آپ نے یہ سوال کیا ہے کہ ہم اس اکثریت کو کیوں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر اسی سوال کو ہم ہندوستان پر عاید کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں فیڈرل نظام حکومت کے قیام سے ہندو اکثریت کے پیش نظر کیا چیز ہے اس کا جواب ایک ہندو قوم پرست کی طرف سے یہ ہوگا کہ مکمل آزادی جس میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا اسی طرح پاکستان کا ایک مسلمان قوم پرست یہ جواب دینے کا حق رکھتا ہے کہ وہ پاکستان کی مکمل آزادی چاہتا ہے جس میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں فیڈرل نظام حکومت کے قیام سے ہندو عنصر غالب رہے گا اور ہندو تہذیب کو فوقیت حاصل ہوگی لیکن یہ نتیجہ فی نفسہ مطلوب نہیں بلکہ خاص ماحول کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح پاکستان میں فیڈرل نظامِ حکومت کے قیام سے مسلمان عنصر غالب رہے گا اور اسلامی تہذیب کو فروغ ہوگا لیکن یہ نتیجہ بھی فی نفسہ مطلوب نہیں۔

آپ نے یہ تصور کرتے ہوئے کہ پاکستان میں مسلمان خالص اسلامی طرز کی حکومت قائم کریں گے جس میں غیر مسلم اقوام سے امتیازی سلوک روا رکھا جائے گا۔ ان کی آبادی کو ظلم سے بتدریج کم کیا جائے گا۔ ان کو فوجی و سول ملازمت کے حقوق سے محروم کیا جائے گا اس امر کا ثبوت دینے کی

کوشش کی ہے کہ مسلمان حکومت کے اہل نہیں۔ اور ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان میں ہندو اکثریت کی حمایت پر انصاف پسند حکومت قائم ہو سکتی ہے لیکن پاکستان میں محض اس لئے حکومت قائم نہیں ہو سکتی کیونکہ مسلمان غیر مسلم اقوام سے رواداری کا سلوک نہیں کریں گے اگر آج انگریز فیڈرل نظام حکومت میں چند تبدیلیاں کر دیں تو کانگرس کا انتہا پسند طبقہ بھی انگریز سے معاونت کرنے کو تیار ہے۔ کیا مرکزی ہند میں فیڈرل نظام حکومت سے وہ شکوک وشبہات مسلمانوں کے دلوں میں پیدا نہیں ہوں گے جن کا ذکر آپ نے پاکستان کی صورت میں کیا ہے اگر اسی طرح کا ایک نظام حکومت پاکستان میں قائم ہو جائے تو یہ غیر مسلموں کے لئے کیونکر مضرت رساں ہو گا۔

رہا یہ سوال کہ جب ہمارا مقصد مشترکہ فائدہ ہے تو پھر اس کے لئے خاص طور پر مسلمانوں کی اکثریت قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں پر پھر آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ مطلوب مسلمان کی اکثریت کا تحفظ نہیں بلکہ پاکستان کا جدید انتظام حکومت ہے جس میں پاکستان کے باشندے کو ریلوے۔ ڈاکخانہ و تار برقی۔ جملہ ذرائع آمد و رفت۔ ہوائی۔ بری و بحری فوج۔ امورات خارجہ محصول اشیائے درآمد و برآمد۔ اندرونی و بیرونی تجارت۔ نقل و حرکت آبادی وغیرہ پر پورا پورا اختیار ہو گا پاکستان ہندوستان کا ایک جزو بن کر اپنی انفرادیت و اہمیت کو کھونا نہیں چاہتا یہاں کے باشندے اپنے مخصوص حالات کے مطابق ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ اگر جذبۂ وطن پرستی سلطنت روس۔ ٹرکی و آسٹریا ہنگری کو ایک درجن سے زیادہ آزاد حصوں میں تقسیم کر سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ براعظم ہندوستان میں یہ جذبہ کارفرما نہ ہو ان تینوں سلطنتوں میں صدہا سال تک مختلف مذاہب ونسلوں کے لوگ باہم شیر و شکر ہو کر رہے۔ اقتصادی و معاشی امور میں سب کا مفاد مشترک تھا۔ روس میں غیر روسی اقوام کل آبادی کا ۲۵ فی صدی حصہ تھیں۔ لیکن ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد روس کے مغرب میں پولینڈ۔ ایسٹونیہ۔ لٹویہ۔ لتھونیہ۔ اور فن لینڈ کی آزاد ریاستیں قائم ہو گئیں۔ حالانکہ یہ پانچوں علاقے جغرافیائی لحاظ سے ملک روس کا جزو تھے اور کوئی قدرتی حد بندی ان کو علیحدہ

ملک روس سے جدا نہیں کرتی تھی۔ اسی طرح سلطنت آسٹریا ہنگری کی مختلف اقوام جو سب کی سب رومن کیتھولک مذہب کی پیرو ہیں علیحدہ علیحدہ علاقوں میں مالک قرار دی گئیں۔ سلطنت ٹرکی میں چار سو سال تک عرب و ترک ایک ہی حکومت کے ماتحت رہے۔ ترکی اور عربی سوال کو کبھی اہمیت حاصل نہ ہوئی۔ لیکن جنگ یورپ کے بعد ان علاقوں میں جہاں عربوں کی اکثریت تھی ان کا حق خود اختیاری تسلیم کیا گیا۔

پاکستان کے بعد ہندوستان کا دوسرا حصہ جو جدید انتظام حکومت قائم کرنے کا حقدار ہے وہ مشرقی بنگال و آسام ہے۔ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی آبادی ۷۰ فی صدی کے قریب ہے اس کے ۱۸ اضلاع میں سے ۱۶ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور تین اضلاع میں مسلمان سب سے بڑی واحد جماعت میں ہیں۔ دریائے گنگا مشرقی بنگال کو مغربی بنگال سے جدا کرتا ہے۔ آسام کا میدانی حصہ جس میں سلہٹ اور گوالپاڑہ کے اضلاع شامل ہیں دراصل مشرقی بنگال کا ہی ایک حصہ ہیں۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر بنگالی مسلمان ہیں جو مشرقی بنگال سے جاکر آباد ہوئے ہیں۔ انھوں نے کئی مرتبہ مشرقی بنگال سے اپنے اضلاع کے الحاق کی کوشش کی لیکن وہ محض اس وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے کہ گورنمنٹ صوبہ آسام کی جداہستی کو قائم رکھنا چاہتی تھی۔ ان دونوں اضلاع کی علیحدگی کی صورت میں آسام کے رقبہ و آبادی میں اس حد تک کمی ہونے کا اندیشہ تھا کہ یہ ملک ایک جدا صوبہ نہیں رہ سکتا تھا لہذا اس مشکل کا حل اسی صورت میں ہے کہ مشرقی بنگال و آسام کے الحاق سے ایک جدا صوبہ بنا دیا جائے اور اس جدید صوبہ کی حدبندی انھی پرانے حدود پر قائم کی جائے جس طرح ۱۹۱۱ء سے پیشتر مشرقی بنگال و آسام کا صوبہ قائم تھا اس جدید صوبہ میں ۴ کروڑ کی آبادی میں سے مسلمانوں کی تعداد ۳ کروڑ کے قریب ہو جائے گی اگر پاکستان و مشرقی بنگال و آسام براعظم ہند کے جدا حصے تسلیم کرلئے جائیں تو مسلمانوں کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو سکتا ہے۔ ان ہر دو علاقوں میں کل آبادی ۸ کروڑ کے قریب ہو گی جس میں سے مسلمان تعداد میں ۶ کروڑ کے قریب ہوں گے بقیہ ہندوستان میں دو و ڈھائی کروڑ کے

درمیان مسلمان رہ جائیں گے جو بطور اقلیت کے شمار کئے جا سکتے ہیں اور ان کو وہی حقوق دئے جا سکتے ہیں جو ان ہر دو اسلامی صوبوں میں غیر مسلم اقلیتوں کو دئے جائیں گے۔

پاکستان کے قدرتی ذرائع بہت وسیع اور غیر محدود ہیں۔ بر اعظم ہند میں پاکستان ہی ایک ایسا حصہ ہے جہاں پر کہ موجودہ آبادی سے تین گناہ زیادہ آبادی سما سکتی ہے کشمیر۔ پنجاب و سندھ میں بڑے وسیع قطعات اراضی زیر کاشت لائے جا سکتے ہیں۔ پاکستان کے جنگلات اس کی عمارتی وصنعتی ضروریات کے لئے کافی ہیں۔ چراگاہوں میں مویشی بکثرت پالے جا سکتے ہیں۔ معدنیات کی بھی بہتات ہے جو بوقت ضرورت ملک کی صنعت وحرفت کو فروغ دے سکتی ہیں۔ بجلی کی طاقت اسقدر مقدار میں پیدا کی جا سکتی ہے کہ جس سے بینکڑوں کارخانے وکلیں چل سکیں۔ ذرائع آمدنی میں ریلوے کی آمدنی ای آئی آر کے بعد ہندوستان کے ہر دوسری ریلوے لائن سے زیادہ ہے پاکستان میں معاملہ زمین وآبپاشی کی آمدنی بنگال۔ یوپی۔ مدراس ہر ایک سے زیادہ ہے علیحدگی کی صورت میں انکم ٹیکس ومحصول بندرگاہ کی آمدنی جو خزانہ مرکزی میں جمع ہوتی ہے براہ راست پاکستان کی آمدنی میں شمار ہوگی اور یہ زائد آمدنی صوبۂ سرحد وبلوچستان کے اخراجات کی کفیل ہو سکتی ہے پاکستان میں وسائل ودولت کو ترقی دینے کے لئے مزدوروں کی کمی نہیں۔ قومی حکومت کے قیام سے صنعت وحرفت کو لازمی فروغ ہوگا کوئی ملک آغاز میں سرمایہ۔ تنظیم وماہر مزدوروں سے بیک وقت مستفید نہیں ہو سکتا۔ ٹرکی جدید جو آج اس قدر ترقی کر رہا ہے جنگ یورپ سے پیشتر اقتصادی طور پر پاکستان سے بدتر حالت میں تھا۔ وسائل دولت غیر ترقی یافتہ حالت میں تھے۔ ملک میں سرمایہ کی کمی تھی۔ تمام تجارت اجنبی اقوام کے ہاتھ میں تھی۔ اعلیٰ تعلیم کا ملک میں خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ ترک اپنے اصلی وطن ایشیائے کوچک میں غیروں کے دست نگر تھے زراعت۔ سپہگری یا ملازمت ان کا پیشہ تھا۔ ملک کی اندرونی تجارت پر یونانی ارمنی۔ یہودی لوگوں کا قبضہ تھا۔ بڑے بڑے مشہور شعبہ جات جیسے ڈاکٹری معلمی۔ بنکنگ دوکانداری وغیرہ غیر ترکی اقوام کے ہاتھ میں تھے۔ جس طرح آج پاکستان کا سرمایہ وتجارت ہندو کے قبضہ میں ہے

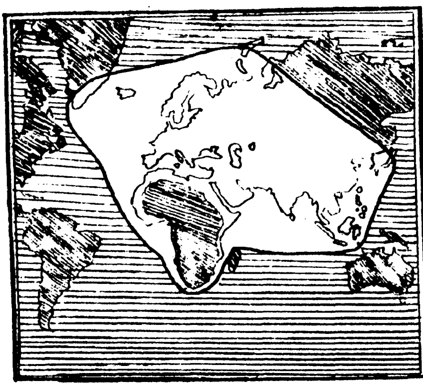
اسی طرح ٹرکی کا تمام سرمایہ و تجارت یونانی یہودی وارمی اقوام کے قبضہ میں تھی۔ لیکن جنگ یورپ کے بعد ٹرکی قوم میں قومی احساس اس حد تک پیدا ہوا کہ ہر مشکل سے مشکل مسئلہ ان کے لئے آسان ہوگیا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اگر پاکستان کے مسلمان اپنی حالت کو بہتر بنانے کے لئے عزم بالجزم کرلیں تو وہ کامیاب ہو جائیں۔

باقی رہا یہ سوال کہ اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے اور پاکستان کو ہندوستان سے جدا کرنے کی صورت میں تبلیغ کے مواقعات کم ہو جائیں گے۔ یہ ایک فرضی تخیل ہے اسلام کی اصلی و حقیقی تبلیغ یہ ہے کہ ہر مسلمان صحیح رنگ میں مسلمان بن جائے۔ پاکستان کے مسلمان اگر اپنی علیحدہ و آزاد حکومت میں اسلامی روایات و اصولوں پر پورے طور پر عمل کریں گے تو یقیناً اس کا اثر براہ راست ہمسایہ اقوام پر پڑے گا۔ آج ہر کام میں تنظیم کی ضرورت ہے۔ انفرادی کوشش سے کوئی کام پورے طور پر سر انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اگر پاکستان کے مسلمان دنیوی و دینی رنگ میں جملہ اسلامی صفات کے حامل بن جائیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ اس نمونہ کو دیکھ کر دنیا میں اشاعتِ اسلام کے کام کو فروغ حاصل ہو جائے آپ نے مشکلات کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ دراصل حالت مایوسی کا اظہار ہے پاکستانی مسلمان اپنے مستقبل کو امید افزا سمجھتا ہے۔ وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر قربانی کرنے کو تیار ہے۔ وہ اپنے دل میں آزادی کی سچی تڑپ رکھتا ہے لیکن وہ ایسی آزادی کا خواہشمند ہے جو ہمیشہ کے لئے اس کو انگریز ہندو دونوں کی غلامی سے نجات دلائے۔ اور اسے اپنی قسمت کا پورا مالک بنا دے۔ ہندوستان کا مسلمان آج دو مصیبتوں میں مبتلا ہے۔ سیاسی طور پر وہ انگریز کا غلام ہے لیکن اقتصادی طور پر ہندو کا دست نگر ہے۔ اگر آج اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ اس کی آزادی اور دولت پر ہر دو اقوام نے قبضہ کیا ہوا ہے تو مسلمان کا مسئلہ بہت جلد حل ہو سکتا ہے۔

عہد وسطیٰ[1] میں یورپ کی حالت

سنہ ۱۱۰۰ء میں دنیا کے بارے میں یورپ کا تصور

چند بڑے عالموں کو اگر چھوڑ دیا جائے تو یورپ کے باقی لوگوں کی کل دنیا سنہ ۱۱۰۰ء میں جس جگہ پیدا ہوئے تھے صرف اس کے آس پاس علاقہ یا زیادہ سے زیادہ قریب کے چند میلوں میں جو گاؤں آباد تھے ان تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ دور دراز مقامات کا سفر اکثر و بیشتر وہ نہیں کرتے تھے۔ سڑکوں کی تعداد بہت کم تھی اور جو تھیں ان کی حالت بہت خراب تھی۔ زمین کے بیشتر حصہ پر جنگل کھڑے تھے اور اکیلے سفر کرنا خطرے سے خالی نہ سمجھا جاتا تھا۔ نہ ریلیں تھیں نہ جہاز تھے سوائے کمزور بادبانی کشتیوں کے اور موٹر بھی نہیں تھے۔ کبھی کبھار پیدل یا گھوڑے پر دوسرے گاؤں کا سفر کیا جاتا تھا اور اسے زندگی کا بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ اس قسم کے سفر کے لئے بھی بڑی ہمت کی ضرورت ہوتی تھی اور بڑی تیاریاں کرنا پڑتی تھیں اور اس کا بعد میں برسوں تک تذکرہ جاری رکھا جاتا تھا۔



چند بڑے عالموں کو دنیا کے جن حصوں کا علم تھا انہیں حاشیہ کے نقشہ کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ نقشہ کے اندر جو سیاہ حصہ ہے اس سے لوگ ابھی تک بالکل ناواقف تھے۔ ان کے دنیا کے تصور میں یورپ کا بیشتر حصہ ایشیا کا کچھ حصہ اور افریقہ کے شمالی اور مغربی ساحل کے قریب کی ایک تنگ اور لمبی کتر شامل تھی۔

---

[1] عہد وسطیٰ سنہ ۴۷۶ء سے شروع ہوتا ہے یعنی جب رومیوں کا تسلط یورپ پر ختم ہو گیا تھا اور سنہ ۱۶۰۰ء یعنی موجودہ عہد کی ابتدا تک جاری رہتا ہے۔

سنہ ۱۱۰۰ء میں یورپ کی زندگی آیئے عہد وسطیٰ کے یورپ پر جادو کے جہاز پر بیٹھ کر سفر کریں۔ اس طرح ہم پورے براعظم کو بہت تھوڑے عرصہ میں دیکھ سکیں گے۔ مصر کے اسکندریہ سے ہم اپنا سفر شروع کریں گے اور یورپ سے ہوتے ہوئے انگلستان پہنچ جائیں گے۔ ہم وینس سے گذریں گے جو نہروں کا شہر ہے۔ راستہ میں ہمیں بیسیوں چھوٹے چھوٹے قلعے نظر آئیں گے جن کے گرداگرد گاؤں بسے ہوں گے۔ پیرس پر بھی ہم ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں گے جہاں کی گندگی اور تنگ گنجان آبادی سے ہماری طبیعت مکدر ہو جائے گی۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہ محسوس کریں گے کہ پیرس نے یورپ کا ایک اہم شہر بننا شروع کر دیا ہے۔ اس کے بعد ہم لندن پہنچ جائیں گے۔ لیکن ہم اسے بالکل نہ پہچان سکیں گے کیونکہ مکان بہت نیچے نیچے لکڑی کے بنے ہوئے اور پھوس کے چھپر کے دکھائی دیں گے۔ جب ہم شہر پر سے گذریں گے تو ہمارے منظر کو دھندلا کرنے کے لئے دھوئیں کی کوئی باریک سی لکیر بھی کہیں نظر نہ آئے گی۔ آمد و رفت کے شور کی گڑگڑاہٹ کا کہیں نام و نشان بھی نہ ہوگا۔ اسٹیشنوں پر ریلیں تیزی سے آتی جاتی نظر نہیں آئیں گی موٹروں کے ہارن کا شور بھی سنائی نہ دے گا۔ شہر بالکل خاموش اور سویا ہوا نظر آئے گا۔ بیل آہستہ آہستہ بھدی گاڑیوں کو کھینچتے دکھائی دیں گے۔ لدے ہوئے چھوٹے گدھے بھی دوڑتے نظر آئیں گے۔ لیکن نہ تو فولاد کی کلیں دھواں اگلتی ہوں گی، نہ فیکٹریاں ہونگی۔ نہ بجلی کے تار ہوں گے نہ ہوائی جہاز بلکہ جس یورپ کا مشاہدہ ہم اس زمانے میں کرینگے اس میں ہمیں شہر اور قصبے بہت کم نظر آئیں گے۔ یورپ کے اکثر لوگ ان چھوٹی بستیوں میں آباد نظر آئیں گے جنھیں مینر (MANOR) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

مینر کی زندگی مینر میں مرکزی حیثیت زمیندار کی گڑھی کو حاصل ہوتی تھی۔ یہ گڑھی یا قلعہ بھورے رنگ کے پتھروں کا ایک بڑا مکان ہوا کرتا تھا جو عموماً کسی پہاڑی پر بنایا جاتا تھا۔ اس کے گرداگرد عمدہ کھیت اور گاؤں کے درختوں کی زمین ہوتی تھی۔ درختوں کے درمیان مچھلی پکڑنے کے لئے ایک تالاب ہوتا تھا اور درختوں کی زمین ہی میں زمیندار کے شکار کھیلنے کے لئے جانور ہوا کرتے تھے۔ جہاں تک ممکن تھا اس گڑھی سے قریب ہی ایک چھوٹے گاؤں کی مختصر جھونپڑیاں بنی ہوتی تھیں۔ یہ جھونپڑیاں بہت کم حیثیت اور خراب ہوتی تھیں اور ان کے رہنے والوں کو اپنی حفاظت کے لئے ہمیشہ گڑھی کے رہنے والوں کی ضرورت رہتی تھی۔ گاؤں کے آگے غلہ

کے کھیت اور درختوں کی زمین ہوتی تھی۔ ان کھیتوں سے آگے ہر طرف جنگل پھیلا ہوا تھا جنگل میں سے گذرنے کے لئے کوئی سڑک بنی ہوئی نہیں تھی بلکہ صرف بھدی لکیریں اور راستے ہوتے تھے۔

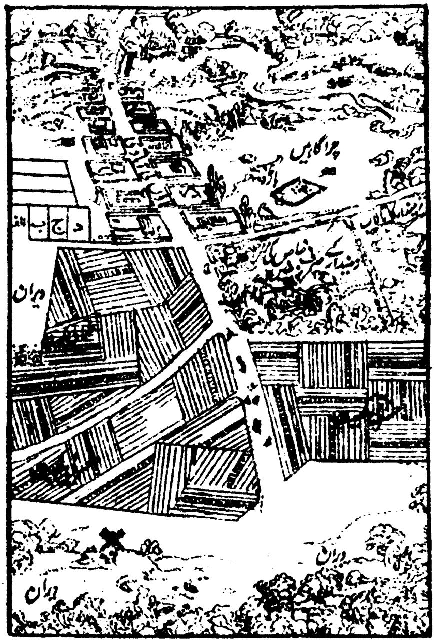
امیروں اور پادریوں کا طبقہ زمین کے بیشتر حصہ کا مالک تھا۔ کچھ کسان بھی ایسے تھے۔ جن کی گھر کی زمینداری تھی لیکن ان کے قبضہ میں رقبہ بہت مختصر ہوا کرتا تھا۔ باقی سب لوگ گڑھی کے زمیندار کے ماتحت ہوتے تھے زمیندار کو اپنی رعایا پر بیچنے اور خریدنے کے علاوہ باقی سب طرح کے اختیارات حاصل تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد زمیندار کو زمین کے ساتھ رعایا بھی ترکہ میں ملا کرتی تھی اور زمیندار اپنی اس رعایا اور ان کی اولاد کو اپنے مرنے کے بعد اپنے سب سے بڑے بیٹے کے لئے ترکہ میں چھوڑ جایا کرتا تھا۔

زمیندار کی رعیت میں جو لوگ شامل تھے نہ تو زمین کو خرید سکتے تھے نہ فروخت کر سکتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ زمین کو چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ اپنے بزرگوں کی طرح یہ جب زمین پر پیدا ہوتے تھے اسی زمین سے وابستہ رہ کر اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے پابند تھے۔ انھیں اپنے زمیندار کی پوری طرح اطاعت کرنا پڑتی تھی اور زمیندار کی حفاظت کے معاوضہ میں اس کے کھیتوں کی جتائی بوائی اور کٹائی کیا کرتے تھے۔ اپنی کچھ پیداوار کو وہ ذاتی استعمال کے لئے رکھ سکتے تھے لیکن زمیندار کا ان کی پیداوار یا جانوروں پر جو مطالبہ بھی ہوتا تھا اسے پورا کرنے کے لئے بالکل مجبور رہتے تھے۔ زمیندار برابر لڑتے رہتے تھے اور بعض وقت گڑھی کے محاصرہ کے بعد جب کسان گڑھی سے باہر نکلتے تھے تو دیکھتے تھے کہ زمیندار کے دشمنوں نے ان کے کھیتوں کو بالکل برباد اور ویران کر دیا ہے۔

سنہ۱۱ئہ کے قریب انگریزی قوم کی ایک مردم شماری کے اعداد	
	فی صدی
امیر اور پادری	۴
ایسے کسان جن کی گھر کی زمینداری تھی	۱۲
زمیندار کی رعیت	۷۰
واقعی غلام	۹
دیگر	۵

جیسا کہ حاشیہ کے نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے کسانوں کی تعداد زمینداروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوا کرتی تھی انھیں "رعایا" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور انھیں دو عنوانوں کے ماتحت تقسیم کیا جاتا تھا۔ اول چھوٹے کسان جو دس ایکڑ سے لیکر چالیس ایکڑ تک کاشت کرتے تھے اور دوسرے کمین جو زمیندار کے لئے ہر طرح کا کام کیا کرتے تھے اور انھیں ایک یا دو ایکڑ زمین جوتنے بونے کے لئے دے دی جاتی تھی۔

زمین کی تقسیم اور کاشت کا طریقہ | ذیل میں جو نقشہ دیا گیا ہے اس میں زمین کی تین قسمیں نظر آتی ہیں (۱) درختوں کی زمین اور ویران زمین (۲) چراگاہیں اور (۳) مزروعہ رقبہ ۔ درختوں کی زمین اور ویران زمین میں سے گھاس کاٹنے اور لکڑی جمع کرنے کی کسانوں کو اجازت تھی۔ ان کے مویشی، سور اور گھوڑے زمیندار کے زندہ دھن کے ساتھ ان میں چیر سکتے تھے۔



اس وقت کے کھیت آج کل کے بڑے کھلے ہوئے فارموں سے بہت مختلف ہوتے تھے۔ یہ لانبی اور تنگ کتروں میں بٹے ہوئے ہوتے تھے۔ ہر لانبی کتر ایک شخص کے فارم کا ایک حصہ ہوتی تھی۔ گاؤں کا رہنے والا ہر شخص ان کھیتوں کی جو سڑک کے دونوں طرف ہوتے تھے اور مغربی کھیت، مشرقی کھیت، شمالی کھیت کے ناموں سے موسوم کئے جاتے تھے ایک ایک کتر کو جوتا کرتا تھا مثلاً نقشہ میں سیاہ رنگی ہوئی کتروں کو تلاش کیجئے۔ مغربی کھیت میں ایسی سات کتریں ہیں، مشرقی میں آٹھ اور شمالی میں آٹھ۔ ان تئیس کتروں کی کاشت ایک ہی آدمی کو کرنا پڑتی تھی چنانچہ ایک شخص کی کاشت میں جو زمین تھی وہ تمام مینر میں بکھری ہوئی ہوتی تھی اور کسان کو اپنی پوری زمین کو جوتنے کے لئے ایک کھیت سے دوسرے کھیت تک سفر کرنا پڑتا تھا ایک اور بات بھی تھی جو خاص طور پہ

اس نقشہ میں انگلستان کے ایک مینر کے جن تین بڑے کھیتوں کو دکھایا گیا ہے ان کی ملکیت زمیندار کو حاصل تھی۔ ایسے کسانوں کے کھیتوں کو جو گھر کے زمیندار تھے الف، ب، ج، د کے عنوان سے علیحدہ دکھلایا گیا ہے انہیں کرافٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ باڑے میں بعض پالتو جانوروں کو رکھا جایا کرتا تھا۔

لائق ذکر ہے اور وہ یہ کہ ان کتروں میں سے کچھ کتروں کو بغیر جوتے ہوئے پرتی چھوڑ دیا جاتا تھا کچھ کتروں پر گیہوں بوتے تھے، کچھ پر جو اور جئی اور کچھ کو بغیر بوئے چھوڑ دیتے تھے۔ اس چیز کو "تین کھیتوں کے نظام" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ عام طور پر تین کھیتوں میں سے صرف دو کی بوائی کی جاتی تھی اور تیسرے کو آرام کرنے کے لئے خالی چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ ایک ہی کھیت کو مسلسل استعمال کرنے کی وجہ سے اس کی زرخیزی کو نقصان نہیں پہنچتا تھا۔

رعایا کے لگان ادا کرنے کا طریقہ | رعایا کو زمین کا بہت بھاری لگان ادا کرنا پڑتا تھا۔ ان کے پاس نقد دام نہیں ہوتے تھے اس لئے انھیں خدمت کی شکل میں لگان ادا کرنا ہوتا تھا۔ زمیندار اپنے محل میں عیش سے رہتے تھے صرف کبھی کبھی شکار، ماہی گیری یا جنگ کرنے کے لئے باہر نکلا کرتے تھے۔ وہ اپنے خرچ کو پورا کرنے کے لئے زمین کا ایک بڑا ٹکڑا صرف خاص کے لئے رکھتے تھے اس کی بوائی، جتائی اور کٹائی ان کی رعایا کیا کرتی تھی اور یہ کام انھیں اپنی ذاتی زمینوں کی نگہداشت کے علاوہ کرنا پڑتا تھا۔ کام ان کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا تھا اور ہر ہفتہ میں کچھ دن انھیں زمیندار کے لئے کام کرنا پڑتا تھا۔ رعیت کو تین دن کام کرنا ہوتا تھا اور کمینوں کو ایک دن جب بوائی اور کٹائی کا وقت آتا تھا تو کام دوگنا ہو جاتا تھا۔ اس لئے بعض وقت انھیں اپنے کھیتوں کی طرف سے کچھ دن کے لئے مجبوراً غفلت کرنا پڑتی تھی اور یہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ کسان کی ذراسی غفلت سے فصل کو بڑا زبردست نقصان پہنچ جاتا ہے لیکن یہ بے چارے اپنے کام سے غفلت زمیندار سے محبت کی بنا پر نہیں کرتے تھے بلکہ ایسا کرنے کے لئے مجبور تھے یہ بغاوت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اگر یہ ایسا کرتے تو زمیندار اور اس کے سپاہی جن کے پاس ہتیار رہتے تھے ان نہتے لوگوں پر حملہ کر کے انھیں فوراً زیر کر لیتے تھے۔

انھیں زمیندار کے کھیتوں کی صرف بتائی ہی نہیں کرنا پڑتی تھی بلکہ اسے مویشی، دودھ، مرغیوں انڈوں شہد اور باغ کی پیداواروں کا ایک حصہ بھی دینا پڑتا تھا۔ ایک پادری ان لوگوں کی زندگی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بہت سے زمیندار اپنی رعایا کو محنت کرنے کے لئے مجبور کرتے تھے اور انھیں روٹی تک کھانے کو نہیں دیتے تھے:۔

آج کل بہت سے زمیندار ایسے ہیں کہ جب ان کو غریب کسان کی گائے بیچنے پر ملامت کی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ اس گاؤدی کو اس بات کو غنیمت سمجھنا چاہیے کہ میں نے بچھڑے کو اور خود اسے زندہ چھوڑ دیا۔ اگر میں چاہتا تو اسے اور زیادہ نقصان پہنچا سکتا تھا۔ میں نے اس کی بطخ لے لی ہے اور بطخ کے پر اس کے لئے چھوڑ دیئے ہیں"

جب رعیت میں سے کسی شخص کی موت واقع ہو جاتی تھی تو زمیندار اس کے ترکہ میں سے بہترین حصہ کا مالک خود بن جاتا ہے۔ دوسرے درجہ کی چیزوں پر پادری قبضہ کر لیتا بیوہ اور یتیم بچوں کو اکثر کچھ بھی نہ مل سکتا۔

جب رعیت میں سے کوئی شخص اپنی لڑکی کی شادی کرنا چاہتا تو اسکے باپ کو زمیندار سے اجازت لینا پڑتی اسی طرح اگر کوئی کسان اپنی گائے یا بیل بیچنا چاہتا تو وہ زمیندار کی اجازت حاصل کئے بغیر ایسا نہ کر سکتا۔

رعیت کا افلاس زمیندار کی رعایا کے رہنے کے لئے افلاس زدہ بدتر سے قسم کے چھوٹے جھونپڑے ہوتے تھے جنھیں ٹیڑھی میڑھی لکڑیوں اور گارے سے بنایا جاتا اور پھوس سے چھایا جاتا تھا۔ ان میں صرف ایک کمرہ ہوتا تھا اور کوئی انگیٹھی یا چولھا نہیں ہوتا تھا خالی زمین پر پیال بچھا کر فرش بنا دیا جاتا تھا۔

جب مرد اور کچھ عورتیں کھیت سے کام کر کے واپس آتے تھے تو ان کے سامنے گھر کی ماں ابلی ہوئی پت گوبھی اور نمک سے محفوظ کیا ہوا سور کا گوشت رکھ دیا کرتی تھی۔ کھانے کے برتن میں ہر شخص اپنی انگلیاں ڈالتا تھا یا روٹی کے ٹکڑے کو چمچے کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ کبھی کبھار انھیں مچھلی مٹر یا اسٹرابیری وغیرہ بھی مل جایا کرتے تھے۔ دن میں یہی ان کا بڑا کھانا ہوتا تھا اور شاید اسی ایک کھانے پر ان کو گذر کرنا پڑتی تھی۔

کسانوں کے کپڑے بڑے گندے ہوتے تھے۔ ان کے دھونے کے لئے وقت نہیں ملتا تھا۔ کپڑے دھونے کے معنی یہ تھے کہ جن کے کپڑے دھوئے جا رہے ہیں وہ بستر میں دبکے پڑے رہیں کیونکہ کسی شخص کے پاس دو جوڑے کپڑے ہونا بڑی عیاشی سمجھی جاتی تھی۔

رات کے اندھیرے کو دور کرنے کے لئے کسی روشنی کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ البتہ کبھی کبھار بکری کی چربی کی موم بتیاں جلائی جاتی تھیں۔ دن کی محنت سے تھک کر چور ہونے کے بعد جب لوگ واپس آتے تھے

تو ایک بھدی سی سیڑھی پر چڑھ کر اٹاری پر پہنچ جاتے تھے۔ اور وہاں پرال کے ڈھیر پر گر کر صبح تک سوتے رہتے تھے۔

۱۱۰۰ء کے مینر کی خودکفالتی زندگی

ہم نے اوپر کے بیان میں صرف کسانوں کا ذکر کیا ہے لیکن گاؤں والوں کو کھیتی کے علاوہ اور دوسرے کام کرنے والے لوگوں کی بھی ضرورت رہتی تھی۔ کسانوں کے اوزار بنانے کے لئے ایک لوہار کی، ان کے غلہ کو زمیندار کی چکی پر پیسنے کے لئے ایک چکی والے کی ضرورت ہوتی تھی۔ کسان کے لئے اور زمیندار کے لیے، جب اسے مچھلی کے شکار کا شوق نہ ہوتا تھا گاؤں کا ماہی گیر مچھلیاں پکڑا کرتا تھا۔ بھیڑوں کے بالوں کو کاٹ کر گاؤں کی عورتیں دن کو کاتتی اور بنتی تھیں اور ان کے کپڑے بناتی تھیں۔ مینر کی ایک عدالت بھی ہوتی تھی جہاں زمیندار صدر کی حیثیت سے جج اور جوری دونوں کے فرائض انجام دیتا تھا۔

لیکن مینر میں ہر چیز مل سکتی تھی۔ مثلاً چکی کے پاٹوں کو فرانس جیسے دور دراز مقام سے جنگلوں اور سمندروں کو پار کر کے لایا جاتا تھا۔ زمیندار اپنے زرہ بکتر اور مضبوط تلوار کو اسپین سے حاصل کیا کرتے تھے۔

پھر طویل وقفوں کے بعد گاؤں میں نئی صورتیں بھی نظر آیا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی ایک پھیری والا یا سفر پیشہ گویا آنکلتا تھا۔ پھیری والے کی گٹھڑی کو کسان جادو کی گٹھری سمجھتے تھے کیونکہ یہ مشرق کے زیوروں میں ریشم کے کپڑوں اور گرم مسالوں سے بھری ہوئی ہوا کرتی تھی۔ انھیں اس بات کی بڑی تمنا ہوتی تھی کہ وہ باہر کی وسیع دنیا کی کوئی چیز خرید سکیں لیکن اپنے افلاس کی وجہ سے کوئی چیز نہ خرید سکتے تھے۔ زمیندار اور کبھی کبھی وہ کسان بھی جن کی گھر کی زمینداری تھی چیزیں خریدا کرتے تھے۔ رعیت غریب کو اگر پیٹ بھر کر کھانا مل جاتا تھا تو وہ اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتی تھی۔

بھاٹ قوال یا گوّیے جو ایک مینر سے دوسرے مینر کا برابر سفر کرتے رہتے تھے ایک عجیب و غریب دنیا کے بہادروں کی لڑائیوں اور ان کی عشق و محبت کے گیت گایا کرتے تھے۔ جب لوگ انھیں سنتے تھے تو ان کی آنکھیں چمکنے لگتی تھیں اور لانبی سانس لیتے تھے کیونکہ یہ گیت انھیں رومانی افسانے معلوم ہوتے تھے لیکن بھاٹ ان غریب لوگوں کے درمیان زیادہ نہیں ٹھیرتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ زمیندار کی گڑھی

کے دعوت کے کمرہ میں اسے تمام رات گیت سنانا پڑیں گے۔

۱۱۰۰ء کے بعد مینر کی خودکفالتی زندگی کا خاتمہ — تاجروں، میلوں، قصبوں اور شہروں کی ترقی

لیکن مینر کی یہ خودکفالتی زندگی مسلسل جاری نہیں رہ سکی۔ پڑوس کے گاؤں میں کبھی کبھی میلے منعقد کئے جانے لگے۔ اور زمیندار کی اعانت سے جیسے تاجر تحفے تحائف اور خراج ادا کرتے تھے گاؤں والوں کو ان میں شریک ہونے کی اجازت ملنے لگی۔ میلہ کا زمانہ بڑی ہماہمی کا ہوتا تھا۔ ان لوگوں کے لئے جو ایک ہی طرح کی زمین اور لوگوں کے چہرے دیکھتے دیکھتے تھک جاتے تھے میلہ میں خاصا تنوع اور دلچسپی ہوتی تھی۔ پھر ان کے تھکے ہوئے ہاتھوں اور جھکی ہوئی کمر کو بھی اس زمانہ میں آرام کا موقع مل جاتا تھا۔

مذہبی تہواروں کے موقع پر مینر کے لوگ قریب کے شہر کے بڑے گرجا میں جایا کرتے تھے۔ پادری کے خطبہ کے بعد سڑک کے دونوں کناروں پر گرجا گھر میں ڈرامے ہوتے تھے یا جلوس نکلتے تھے یا سڑکوں پر کھیل کود ہوتا تھا۔ ایسے موقعوں پر پھیری والے اور دکاندار سڑک کے دونوں کناروں پر کپڑے کی عارضی دکانیں کھڑی کر لیتے تھے اور خریداروں کو للچانے کے لئے اپنے سامان کی نمائش کرتے تھے۔ زندگی کے ضروری سامان مثلاً گوشت، اون، نمک اور مچھلی کی بھی نمائش کی جاتی تھی اور تعیشات مثلاً شراب، گرم مسالے، ریشم کے کپڑے اور زیورات کی بھی نمائش ہوتی تھی۔

اگر مینر کے کسی آدمی کے پاس غلہ کی ایک زائد بوری یا اونی کپڑے کا اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا ایک صاف ٹکڑا ہوتا تھا تو وہ دکاندار سے اپنی بیوی کے لئے اتوار کے دن کے پہننے کے واسطے ریشم کا ایک ٹکڑا خرید سکتا تھا۔ دکاندار چیزوں کو صرف فروخت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ انھیں آئندہ کسی اور دوسری جگہ بیچنے کے لئے خریدا بھی کرتے تھے۔

اگر دکاندار کسی شخص کے کپڑے کو اس لئے نہیں خریدتے تھے کہ اس کی بنائی گھٹیا قسم کی تھی تو وہ میلہ سے یہ ارادہ کر کے لوٹتا تھا کہ آئندہ تہوار کے موقع پر جب دوبارہ میلہ لگے گا تو وہ اس سے بہتر کپڑا بن کر لائے گا۔ میلے میں جن چیزوں کو وہ دیکھتا تھا ان میں سے اکثر کو چونکہ وہ خریدنا چاہتا تھا اس لئے انھیں حاصل کرنے کے لئے سخت سے سخت محنت کرنے کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ میلہ اس کی زندگی کی یکسانیت میں ایک

ہنگامہ برپا کر دیتا ہے اور جب میلہ دیکھ کر وہ معینہ کو واپس جانا تھا تو معینہ کی زندگی اسے بے جان معلوم ہوتی تھی اور اس کے اندر یہ حوصلہ اور امنگ پیدا ہوتی تھی کہ کسی طرح اپنے طرز زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا کرے۔

چنانچہ میلوں سے چیزوں کے بنانے میں دلچسپی بڑھ جاتی تھی اور ان سے دستی صنعتوں کو فروغ حاصل ہوتا تھا۔ رعیت کے جو افراد عمدہ قسم کا کپڑا بننا یا دھات کو کوٹ پیٹ کر عمدہ زیور بنانا یا لکڑی کے ٹکڑوں کو چھیل کر عمدہ صندوق بنانا سیکھ لیتے تھے تو ان چیزوں کے معاوضہ میں وہ ان دوسری چیزوں کو خرید سکتے تھے جن کی طلب انھیں زیادہ ہوتی تھی۔ اس تجارت سے ان کے پاس ایک ذاتی پونجی روپیہ پیسہ کی شکل میں اکٹھی ہو سکتی تھی اور جب کبھی ایسا ہو جاتا تھا تو پھر وہ زمیندار کے بالکل پابند اور محکوم نہ رہتے تھے۔

عہد وسطےٰ کے دستکار اور ان کی پنچایتیں

انگلستان میں آج کل تقریباً ہر چیز مشینوں کے ذریعہ بنائی جاتی ہے۔ لیکن عہد وسطےٰ میں ہر چیز سادہ اوزاروں کے ذریعہ ہاتھ سے بنائی جاتی تھی۔ دستکار یعنی ماہر کاریگر لوگوں کے پہننے کے لئے کپڑا بنتے اور سیتے تھے۔ وہ دھاتوں کو کوٹ پیٹ کر لڑائیوں میں کام آنے والے زرہ بکتر اور تلواریں بناتے تھے۔ وہ ہلوں، کدالوں اور انگیٹھیوں کو بناتے تھے۔ غرضکہ صنعت کے سب کام دستکار اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔

دستکاری کے یہ کام فیکٹریوں میں نہیں کئے جاتے تھے بلکہ کاریگر انھیں اپنے گھروں پر کیا کرتے تھے۔ جب دستکاروں کی مہارت میں ترقی ہو جاتی تھی اور اپنی دستکاری سے ہی پورے طور پر گذر کرنے کے لایق ہو جاتے تھے تو وہ اپنے گاؤں سے قصبوں اور شہروں کو منتقل ہو جاتے تھے جہاں ان کے مال کے خریدنے اور قدر کرنے والے لوگ زیادہ تعداد میں موجود ہوتے تھے یعنی ایسے لوگ موجود ہوتے تھے جن کے پاس قیمتی زیورات اور کپڑوں کے خریدنے کے لئے روپیہ ہوتا تھا جو اپنے خاندان کی عزت کو برقرار رکھنے کے لئے عمدہ یادگاریں قائم کیا کرتے تھے یا جو اپنے عالیشان مکانوں کی زینت اور زیبائش کے خواہشمند ہوتے تھے۔

خردہ فروشی کی ایسی دوکانیں جس میں مال کو جمع رکھا جائے اس زمانہ میں بالکل معدوم تھیں درمیانی تاجروں کا بھی تقریباً کوئی وجود نہیں تھا۔ دستکار اپنے مال کی تجارت خود ہی کیا کرتے تھے۔ جیسے ہی ایک چیز بن کر تیار

ہوتی تھی فوراً فروخت کردی جاتی تھی اور دوسری چیز کا بنانا شروع کر دیا جاتا تھا۔

جب چیزیں ہاتھ سے بنائی جاتی ہیں تو ہر ایک بنائی ہوئی چیز دوسری سے مختلف ہوتی ہے مشین کی بنائی ہوئی چیزوں کی طرح ان میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح کاریگروں کے کام کی رفتار بھی یکساں نہیں ہوتی۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک کاریگر دوسروں کے مقابلہ میں بہت اعلیٰ قسم کا کام انجام دے۔ اس لئے اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہوتا تھا کہ کسی مصنوعہ چیز کی قیمت کیا ادا کی جائے۔

اس قیمت کی نگرانی کرنے کے لئے کاریگروں نے اپنی انجمنیں بنانا شروع کر دیں جنھیں گلڈس (جرگوں یا پنچایتوں) کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ یہ پنچایتیں قاعدے بناتی تھیں کہ مال کس قسم کا بنایا جائے مال کی کتنی قیمت لی جائے۔ ایک لڑکے کو پنچایت کا پورا رکن بنانے سے پہلے کتنے سالوں تک امیدوار رکھ کر کام سکھایا جائے۔

عہد وسطیٰ کے دستکاروں کی فہرست سے اس بات کا اندازہ ہو سکے گا کہ اس زمانہ میں پیشوں میں کس قدر تنوع پایا جاتا تھا اور تقسیم عمل نے کتنی ترقی کر لی تھی۔ جو لوگ غذا کی صنعت میں لگے ہوئے تھے ان کے نام حسب ذیل تھے۔ قصائی اور کھالوں کو بنانے والے پن چکی پر آٹا پیسنے والے اور نانبائی، شراب کھینچنے والے اور باورچی یہ سب لوگ ایسے تھے جو اپنے اپنے فن کے ماہر ہوتے تھے۔ اسی طرح دھاتوں کی صنعت میں بھی خاصی تقسیم عمل پائی جاتی تھی کچھ لوگ نعلبند ہوتے تھے کچھ لوہار، چاندی کے کاریگر، سنار، تانبے کا کام کرنے والے ٹین کا کام کرنے والے وغیرہ۔ پھر مختلف قسم کے اوزار بھی مختلف کاریگر بنایا کرتے تھے۔ مثلاً چاقو چھری اور چمچے بنانے والے، بھیڑوں کا اون کاٹنے والی قینچیاں بنانے والے، تلواروں کو مزین کرنے والے، نیام بنانے والے، فولاد کی زنجیریں بنانے والے، مچھلی پکڑنے کے لئے کانٹے بنانے والے، تالے بنانے والے، چاقو پر سان رکھنے والے وغیرہ۔ لوگوں کے لئے کپڑا مہیا کرنے کے واسطے ریشم، اون، کتان اور کینوس کے بننے والے کاریگر ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کپڑے کی سلائی کے لئے بھی مختلف خاص پنچایتیں ہوتی تھیں۔ مثلاً درزی، لیسیں بنانے والے وغیرہ عمارت سازی کی پنچایت میں بھی مختلف ضمنی تقسیمیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً معمار، سنگتراش، کھپریل بنانے والے، بڑھئی، ٹین

کی چادر بنانے والے وغیرہ غرضکہ پیشوں کا ایک خاصا پیچیدہ نظام پیدا ہو گیا تھا۔

بعض قصبوں اور شہروں میں چند دستکاریاں خاص طور پر ترقی کر گئی تھیں مثلاً اٹلی کے شہر فلورنس، میلان، جنوآ اور وینس خوب صورت دستکاری کے لئے مشہور تھے۔ یہ دولتمند شہر تھے اور یہاں کے لوگ یورپ کے دوسرے شہروں کے مقابلہ میں زیادہ تعلیم یافتہ تھے اور یہاں کے دولتمند لوگ نادر اور بیش قیمت چیزوں کے کاریگروں کی خاص طور پر سرپرستی کرتے تھے۔ مثلاً وینس اپنے شیشہ کے برتنوں، پیتل کے کام، بیلوں، چمڑے کے کام، مخمل، ساٹن، زربفت وغیرہ کے لئے مشہور تھا۔ آج بھی وینس کے شیشہ کے پرانے برتنوں کے کام کو اس فن کے ماہر بہت اچھا سمجھتے ہیں اور اس کا شمار نوادر میں کیا جاتا ہے۔ وینس والوں نے ایک خاص رنگ کو بھی دریافت کیا تھا جسے "وینس کے سرخ رنگ" کے نام سے عہد وسطیٰ میں شہرت حاصل ہوئی تھی۔

اوپر کے تمام بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قصبوں کے مقابلے میں شہروں کی زندگی میں خاصا تنوع پیدا ہو گیا تھا۔ ان چیزوں کے بنانے کے لئے بہت سے گھروں اور دکانوں کو برابر مصروف رہنا پڑتا ہوگا اور جس قسم کا کام یہ دستکار لوگ کرتے تھے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جو نہایت فارغ البالی اور آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔

عہد وسطیٰ کے آخری دور میں یورپ کے بڑے شہر
۱۔ انگلستان کے قصبے اور شہر۔ لندن

لندن کی حالت عہد وسطیٰ میں وہ نہیں تھی جو اب ہے اس شہر کی آبادی منتشر تھی اس کی سڑکیں بہت تنگ تھیں۔ کچھ سڑکوں کو تو بے ڈھنگے طریقہ پر پتھر سے پاٹ دیا گیا تھا لیکن کچھ ایسی تھیں جو پٹی ہوئی بھی نہیں تھیں سڑک کے بیچ میں ایک نالی بہتی تھی لیکن جب بارش ہوتی تھی تو نالی کا پانی اتنا چڑھ جاتا تھا کہ سڑک کے بھر جانے کے بعد مکانوں کے اندر پہنچنا شروع کر دیتا تھا۔ شہر کے کچھ حصے ایسے تھے جو بھک منگوں سے بھرے ہوئے تھے اور چور بھی بہت تھے۔ چونکہ اس زمانہ میں پولس کے سپاہی نہیں ہوتے تھے اس لئے رات کے اندھیرے میں سڑکوں پر چلنا خطرناک سمجھا جاتا تھا اور لوگ بہت کم اس قسم کی جرأت کیا کرتے تھے۔

جب آہستہ آہستہ بہت سے سالوں کے گذرنے کے بعد انگلستان کی جہاز رانی اور جہاز سازی کی صنعت کو ترقی ہوئی تو لندن کے شہر نے بھی بڑھنا شروع کیا اور یہ تجارت اور دستکاری کا ایک بہت مصروف مرکز بن گیا۔ تنگ سڑکوں کے دونوں طرف لوگوں کے مکان اور دستکاروں کی دوکانیں بن گئیں۔ دوکانیں مشرقی شہروں کی دوکانوں کی طرح بالکل کھلی ہوئی ہوتی تھیں خریدار جب سڑکوں پر سے گذرتے تھے تو استاد دستکار اور اس کے آدمیوں سے ان کے کام کے دوران میں گپ شپ کیا کرتے تھے۔ مال کی خرید و فروخت کھلے بازار میں کی جاتی تھی اور قیمتوں کے مول تول کے سلسلہ میں بڑی بحث ہوا کرتی تھی۔

میلوں کے موقعوں پر غیر ملکوں کے تاجر بھی انگلستان میں خرید و فروخت کے لئے جمع ہوا کرتے تھے۔ یہ میلے مقررہ اوقات میں منعقد کئے جاتے تھے کبھی سال میں ایک مرتبہ کبھی اس سے زیادہ۔ گاؤں اور قصبوں کے میلوں کے مقابلہ میں یہ میلے بڑے ہوتے تھے اور ان میں اشیاء کا تنوع بھی زیادہ ہوتا تھا۔ غیر ملکوں کے تاجر اس بات سے واقف ہوتے تھے کہ یہ میلے کب منعقد ہوں گے اور انگلستان میں انہی میلوں کے زمانے میں اپنا سامان یورپ اور ایشیا کے دور دراز ملکوں سے لے کر آتے تھے۔ ان میں سے بعض میلے مثلاً ونچسٹر کا میلہ تجارت کے بین الاقوامی مرکز سمجھے جاتے تھے۔ فرانس اور ہالینڈ کے تاجر ان میلوں میں ارادہ کر کے شریک ہوتے تھے۔ ان میلوں میں اون، شراب، گرم مصالحے، گوشت، کپڑے، لباس اور مختلف قسم کے زیوروں کی تجارت بڑے پیمانہ پر ہوا کرتی تھی۔

غرضکہ عہد وسطیٰ کے آخری دور میں انگلستان میں شہر تیزی سے ترقی کر رہے تھے ۱۳۷۷ء میں لندن کی آبادی ۳۰ ہزار تھی۔ یارک کی ۱۲ ہزار، برسٹل کی دس ہزار، پلیمتھ کی آٹھ ہزار، کوونٹری کی ۷ ہزار، ناروچ کی ۶ ہزار اور لنکن کی ۵ ہزار۔ ۱۳۷۷ء میں انگلستان کی جو مردم شماری کی گئی اس میں ۹ شہروں میں ۵ ہزار سے زائد آبادی تھی گیارہ قصبوں میں تین ہزار اور چار ہزار نو سو ننانوے کے درمیان، ۱۹ قصبوں میں ایک ہزار اور ۲ ہزار نو سو ننانوے کے درمیان اور تین قصبوں میں ایک ہزار سے کم آبادی تھی۔

۲۔ فرانس کے قصبے اور شہر | شاید آپ نے لندن کو جس کی آبادی ۳۰ ہزار تھی ایک بڑا شہر سمجھا ہو لیکن

پیرس کی آبادی ۱۳۲۰ء میں ۲ لاکھ تھی اور یہ لوگ بیسیوں پیشوں میں مصروف تھے۔ پیرس کا محل وقوع بہت اچھا ہے یہ دریائے سین کے کنارے واقع ہے اور مغرب سے اس دریا میں تین اور دریا آکر ملتے ہیں۔ اس زمانے میں دریا بہت آسان ذریعہ نقل وحمل کا سمجھے جاتے تھے اس لئے سلطنت روما کے زوال کے بعد فرانس کے بادشاہوں نے پیرس کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اس شہر نے تیزی سے ترقی کرنا شروع کی اور دریائے سین کے دونوں طرف پھیل گیا۔

ہر سال پیرس میں ایک بڑا میلہ ہوتا تھا جو دو ہفتے تک جاری رہتا تھا۔ ان میلوں میں شریک ہونے کے لئے تاجر مل کر بڑی بڑی کمپنیاں بنا لیتے تھے۔ غیر ہموار سڑک پر مال کو لے جانا چونکہ مشکل ہوا کرتا تھا اس لئے لوگ کشتیوں پر سامان لایا کرتے تھے۔ یہ کشتیاں اور بجرے دریائے سین اور اس کے معاونوں میں چلا کرتے تھے لیکن پیرس کی تجارت غیر ملکوں کے ساتھ بہت کم تھی خود فرانس کے دریاؤں کے کنارے جو قصبے آباد تھے انھیں سے پیرس کے لوگ تجارت کرتے رہتے تھے۔ پیرس کی صنعت وتجارت اتنی بڑھتی گئی کہ ۱۳۰۰ء کے آخری سالوں میں اس کی آبادی تین لاکھ کے قریب ہوگئی۔

۳۔ اٹلی کے شہر | اٹلی میں کئی شہر ایسے تھے جو بحر روم میں اپنے محل وقوع کی بنا پر بڑی بڑی بندرگاہیں بن گئے تھے۔ مثلاً وینس اٹلی کے ساحل کے قریب بحر ایڈریاٹک کے چھوٹے جزیروں پر بسا ہوا تھا۔ دوسرے شہروں سے یہ مختلف تھا۔ اس کے گرد اونچی فصیلیں کھنچی ہوئی نہیں تھیں بلکہ اس کا تحفظ سمندر کے ذریعہ ہوتا تھا۔ تنگ بھدی سڑکوں پر چلنے کی جگہ لوگ اس کی نہروں میں کشتیوں پر سوار ہو کر سفر کیا کرتے تھے۔ ان چھوٹے جزیروں میں مکان اور دکانیں تو بنائی جا سکتی تھیں لیکن کاشت اور باغبانی کا کام نہیں کیا جا سکتا تھا اس لئے لوگوں کو اپنی گزر اوقات کے لئے کھیتی کی جگہ اور دوسرے کام کرنا پڑتے تھے۔ چنانچہ وہ ماہی گیری تجارت اور صنعت کے کاموں سے لگے ہوئے تھے۔

مشرق سے تجارت کرنے کے لئے شہر کے بہت سے تاجر جہاز بنوایا کرتے تھے۔ ۱۱۰۰ء میں وینس والوں کے پاس کئی ہزار جہازوں کا بیڑا تھا۔ ان جہازوں سے انھوں نے بحر روم کے تمام سمندری ڈاکوؤں کو ختم کر دیا تھا اور تجارتی جہازوں کے لئے راستہ محفوظ کر دیا تھا۔ اسی بنا پر وینس اور یورپ کے دوسرے

علاقوں کے درمیان تجارت کو خوب ترقی حاصل ہو گئی تھی۔

ایک پرانی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۳۱۸ء میں بلجیم کے ایک شہر برگس کے سالانہ میلہ میں وینس کے پانچ جہاز سامان سے لدے ہوئے آئے ان جہازوں میں ہندوستان سے ریشم اور گرم مسالے مراکش سے شکر دوائیں اور دار چینی مصر سے سیاہ مرچ اور مسالے روس سے روئیں دار کھالیں اور موم اور تاتاریوں کے علاقہ سے سونا ریشم اور روئیں دار کھالیں لائی گئی تھیں۔ جب یہ جہاز وینس اور مشرق کو واپس گئے تو کچے مال سے لد کر گئے۔ مثلاً کھالیں، سر لیس، نمک، گوشت، مچھلی، سن، عمارتی لکڑی، ٹین اور سیسہ۔ مغربی کاریگروں کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں کی بھی وینس میں مانگ تھی۔ کچھ تو وینس میں ہی کھپ جایا کرتی تھیں باقی اسکندریہ کے بڑے شہر کو جہازوں میں روانہ کر دی جاتی تھیں جہاں ایک سالانہ میلہ میں مشرقی تاجر جمع ہوا کرتے تھے۔ بعد کے زمانہ میں اس مال کا کچھ حصہ خشکی کے راستہ سے ہندوستان تک کو بھی جانے لگا تھا۔

وینس والے شمالی یورپ کی بندرگاہوں سے کچا مال جہاز پر لادنے کے لئے خریدتے تھے اور مشرقی بندرگاہوں میں جا کر ان کو فروخت کرتے یا ان کے معاوضہ میں دوسرا سامان حاصل کیا کرتے تھے۔ جہاز بھر کر سامان خریدنے کے معنی یہ تھے کہ لوگ ایک بڑی رقم کو خطرے میں ڈالا کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ان کی کشتیاں سال سال بھر تک وینس واپس نہیں آتی تھیں اور اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ راستہ میں انہیں سمندری ڈاکو یا طوفان تباہ کر دیا کرتے تھے۔

اس قسم کی تجارت کو چلانے کے لئے وینس کے لوگوں کو بڑے روپیہ کی ضرورت رہتی تھی۔ اس روپیہ کو فراہم کرنے کے لئے وینس کے تاجر متحد ہو کر ساہوکارے کی کمپنیاں بنا لیتے تھے اور جب کسی تاجر کے پاس اتنا روپیہ نہیں ہوتا تھا کہ اپنے طور پر جہاز پر مال لاد سکے تو ان ساہوکارے کی کمپنیوں سے روپیہ قرض لے لیا کرتا تھا۔ چنانچہ جتنی وینس کی تجارت کو ترقی ہوتی رہی اتنی ہی اس کی دولت اور ساہوکارے کے کام کو فروغ حاصل ہوتا رہا۔ ۱۶۰۰ء میں وینس میں ایک ایسا بڑا بنک موجود تھا جو نہ صرف وینس کے تاجروں کو روپیہ قرض دیتا تھا بلکہ یورپ کے دوسرے شہروں کے لوگ بھی اس سے لین دین کا کاروبار کیا کرتے تھے۔

اسی طرح وینس کے ساہوکاروں کا اقتدار آہستہ آہستہ بڑھتا رہا۔ لوگ اپنے کاروبار میں روز بروز زیادہ روپیہ لگانے لگے اور بنکوں کی اہمیت میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ روپیہ والے آدمیوں کو وہی طاقت حاصل ہوگئی جو پہلے صرف زمینداروں کو ملی ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں جب کہ تجارت کو ترقی ہو رہی تھی اور لوگوں نے ادھر ادھر سفر کرنا شروع کر دیا تھا بڑے ساہوکار مثلاً میڈیسی وغیرہ کو بہت شہرت اور اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ جو طاقت پہلے امراء کے ہاتھ میں تھی وہ اب تاجروں کے ہاتھوں میں پہنچنا شروع ہو گئی تھی۔

جرمنی کے شہر — اسی زمانہ میں جرمنی کے کئی شہر بھی اپنی دستی صنعتوں اور تجارت کی وجہ سے دولتمند اور طاقتور بنتے جا رہے تھے۔ جنوب کے وہ شہر تھے جو اٹلی فرانس یا بحر اٹلانٹک کو جانے والی شاہراہوں پر واقع تھے تاجر قدرتی طور پر مال کو خریدنے اور بیچنے کے لئے ان شہروں میں ٹھیرا کرتے تھے ان میں سے کچھ شہر مثلاً نورنبرگ اور آسبرگ بہت بڑے تجارتی مرکز بن گئے تھے۔ نورنبرگ میں بہت سے دولتمند آدمی کپڑے کی صنعت میں لگے ہوئے تھے۔ کپڑے کی صنعت کے ساتھ دوسری اور صنعتیں بھی ترقی کر رہی تھیں۔ ۱۵۰۰ء میں آگسبرگ بھی جرمنی کا نہایت اہم شہر سمجھا جاتا تھا۔ اس میں ایک محلہ ایسا تھا جو تمام یورپ میں سب سے اچھا سمجھا جاتا تھا۔ اس کے مکانوں کی چھتیں تانبے کی ہوتی تھیں اور مکان پتھر سے بنائے جاتے تھے۔ اس زمانہ کے سیاحوں کا بیان ہے کہ اس وقت جو لوگ سربرآوردہ اور ممتاز سمجھے جاتے تھے وہ اپنے مکانوں میں لگے ہوئے تانبے اور پیتل کی نمائش کیا کرتے تھے۔ ان کے مکان کے بڑے پھاٹک تمام دن کھلے رہتے تھے تاکہ آنے جانے والے لوگ ان کے مکان کو دیکھ کر ان کی بڑائی کا اندازہ کر سکیں۔

ان کے علاوہ شمالی جرمنی میں بحر بالٹک اور بحر شمالی کے ساحل پر اور بھی کئی بڑے شہر تھے مثلاً ہمبرگ، برمن اور لوبک۔ جرمنی کے یہ شہر انگلستان، فرانس، اٹلی اور اسپین کے شہروں کی طرح پتھر کی بڑی فصیلوں سے گھرے ہوتے تھے جن میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر گول یا چوکور مضبوط دمدمے ہوا کرتے تھے۔ عہد وسطیٰ کے شہر بالکل قلعہ جیسے ہوتے تھے۔ ان شہروں میں صرف بڑے بڑے

پھاٹکوں کے ذریعہ سے داخل ہو سکتے تھے جو رات کو بند کر دیے جاتے تھے۔

عہد وسطیٰ کے آخری زمانہ میں صلیبی جنگوں سیاحوں اور تاجروں کے اثر سے تبدیلیاں

اس زمانہ میں جب کہ یورپ والے دنیا سے الگ تھلگ اپنے چھوٹے چھوٹے گاؤں اور شہروں میں زندگی بسر کر رہے تھے، ایشیا کے اکثر حصوں میں دولت و ثروت کے بڑے بڑے مرکز موجود تھے۔ مشرق بعید میں جس کو اس زمانہ میں یورپ کے لوگ "کیتھے" کے نام سے موسوم کرتے تھے زرخیز زراعتی زمینیں، بڑے تجارتی شہر، منڈیاں، مدرسے اور خوب صورت عمارتیں پائی جاتی تھیں۔ عراق، ایران اور ترکی میں بھی تجارت اور صنعت کی بڑی گرم بازاری تھی۔

آج چین ہندوستان اور ایران کو "پس ماندہ" ملکوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن ۱۱۰۰ء میں یورپ کے "پس ماندہ" لوگوں کو ایشیا والوں نے شائستگی اور تہذیب کے ہزاروں سبق سکھائے تھے۔ ایشیا کے مہذب لوگ عہد وسطیٰ کے آخری دور میں یورپ کے وحشیوں کو جن کے یہاں نہ منظم حکومت تھی نہ امن و امان، جہاں خانہ جنگیوں اور شراب کی بدمستیوں کا دور دورہ تھا، جو فن مصوری فن عمارت سازی اور فن پارچہ بافی وغیرہ میں بہت پیچھے تھے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور ان لوگوں کی ناپاکی تو ضرب المثل بن گئی تھی۔ ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک مشرقی بندرگاہ میں ایک انگریز جہاز سے سمندر میں گر گیا۔ جب اسے بمشکل تمام سمندر سے نکال کر ساحل پر لایا گیا تو ایک ایشیائی حضرت نے ان پر پھبتی کہی "میاں خدا کی مہربانی کا شکر ادا کرو عمر بھر نہانا نصیب نہیں ہوا تھا خدا نے تمہیں نہلا دیا"

صلیبی جنگیں

۱۱۰۰ء کے بعد ایشیائی تہذیبوں کے بارے میں یورپ کے گوشہ نشین لوگوں کو دو ذریعوں سے واقفیت حاصل ہوئی۔ پہلا ذریعہ صلیبی جنگیں تھیں اور دوسرا ذریعہ یورپ کے وہ سیاح تھے جنھوں نے ایشیا کا سفر کیا اور واپسی پر اپنے سفرناموں کو یورپ میں شایع کیا۔ ۱۰۵۰ء کے بعد یروشلم پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور انھوں نے عیسائیوں کو وہاں سے نکال دیا تھا۔ دو سو سال تک یعنی ۱۰۹۶ء سے ۱۲۹۱ء تک کیتھالک چرچ کے پادری اور یورپ کے امرا اور بادشاہ اپنے لوگوں کو فلسطین پر دوبارہ قبضہ جمانے کے لئے ابھارتے رہے۔ فلسطین پر حملہ کرنے کے لئے سات مہموں کو

تنظیم دی گئی اور کسانوں اور زمینداروں کے مسلح جتھے فلسطین کے لیے روانہ کئے جاتے رہے۔ اس دو سو سال کے عرصہ میں، یورپ کے بہت سے امیروں تاجروں کاریگروں اور کسانوں کو فلسطین میں رہنے کا موقع ملا۔ اس کا اثر انگلستان، فرانس اور مغربی یورپ کے دوسرے ملکوں پر بہت اچھا پڑا۔ مشرق قریب اور مشرق بعید کی تہذیبوں کا علم انھیں روز بروز زیادہ حاصل ہوتا رہا اور یورپ اور ایشیا کے شہروں میں تجارت کو خوب ترقی ہوئی۔

فلسطین دنیا کے بہترین تجارتی علاقہ میں واقع تھا۔ اس کے مشرق میں ایران، ہندوستان اور چین تھا اور مغرب میں مصر، قسطنطنیہ، وینس، فرانس، جرمنی اور انگلستان۔ عہد وسطیٰ کے آخری دور میں اس کی حیثیت ایک تجارتی چوراہے جیسی تھی۔

یورپ کے سیاح اور تاجر دوسرا ذریعہ جس سے یورپ کی واقفیت دنیا کے بارے میں بڑھی، وہ یورپ کے راہبوں اور تاجروں کے سفر تھے جو انھوں نے ایران، ہندوستان اور چین میں کئے۔ سنہ ۱۱۰۰ء کے بعد سے اگرچہ یورپ کے کچھ عیسائیوں نے یروشلم میں رہنا شروع کر دیا تھا لیکن ایشیا کے باقی ماندہ حصہ کے بارے میں ان کی واقفیت پھر بھی بہت کم تھی۔ انھیں صرف تاجروں کی زبانی ہندوستان اور چین کے قصے سننے کا کبھی کبھی موقع مل جایا کرتا تھا لیکن سنہ ۱۱۶۰ء اور سنہ ۱۳۳۰ء کے درمیان ایک یہودی پیشوا، کئی عیسائی راہبوں اور متعدد تاجروں نے ایشیا کے طویل اور پرصعوبت سفر اختیار کئے۔ کچھ تو ایشیا میں ہی رہ پڑے اور وہیں مر گئے، کچھ یورپ واپس آئے اور انھوں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کے حالات قلمبند کئے۔ ان کے بیان کئے ہوئے قصے پھیلنا شروع ہوئے اور دوسرے لوگوں کو سفر کی خواہش پیدا ہوئی۔ آہستہ آہستہ بہت سے یورپ کے سیاح اور تاجر ایشیا جانے لگے اور اس طرح یورپ کی دنیا کی سرحدیں وسیع ہونا شروع ہو گئیں۔

ان سیاحوں کو خشکی اور سمندر پر ہزاروں میل کے سفر نہایت مشکل حالات میں کرنا پڑے۔ ہر طرف وہ دشمنوں سے گھرے ہوتے تھے۔ اکثر راستہ انھیں پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔ کھانے اور پینے کو نہیں ملتا تھا۔ عجیب و غریب تجربات ہوتے تھے۔ ایشیا میں پہنچ کر انھوں نے ایک نئی دنیا

کو دیکھا جس کا تمدن و تہذیب ان سے بہت بلند اور اعلیٰ تھا۔ ان لوگوں نے اپنے سفر کے حالات کو یا تو خود لکھا یا دوسروں سے لکھوایا۔ ان سیاحوں میں مارکوپولو کے سفر کے حالات سب سے زیادہ مکمل ہیں۔ اگر ہم مشرق کی تہذیبوں کو اس زمانہ کے یورپینوں کے نقطہ نگاہ سے دیکھنا چاہتے ہیں تو ان سیاحوں کے سفر ناموں کا مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے۔

یورپ اور ایشیا کے درمیان تجارت کا اضافہ صلیبی جنگوں اور مذہبوں اور تاجروں کی سیاحت کا یہ نتیجہ ہوا کہ عہد وسطیٰ میں یورپ کی تجارت بڑھنا شروع ہوگئی۔ یورپ کے قصبے اور شہر ترقی کرنے لگے۔ صنعت و حرفت میں اضافہ ہوا اور یورپ کی شکل وہ بننے لگی جو آج پائی جاتی ہے۔ خشکی اور سمندر کے ذریعہ یورپ کے اندر اور یورپ اور ایشیا کے درمیان تجارت میں اضافہ ہوا۔ مشرق سے خصوصاً ہندوستان اور چین سے یورپ کے لوگوں نے تعیشات حاصل کرنا شروع کیں۔ مثلاً گرم مسالے، بخور، عطریات، قیمتی پتھر، قالین اور بیش قیمت کپڑے۔ مغربی ایشیا کو یورپ والے غلہ، تیل، شہد، سیسہ، لوہا، فولاد، ٹین، گندھک، کپڑا، چمڑا، اون، صابن، بال دار کھالیں اور غلام روانہ کرنے لگے۔ اور جیسے جیسے زمانہ گذرتا رہا تجارت بہت عام اور متنوع ہوتی گئی۔ تاجروں کو بہت منافع حاصل ہونے لگا اور وہ ہمیشہ اپنے کاروبار کو زیادہ وسیع کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔ وہ اپنے جہازوں کو اپنے مال کے لئے نئی منڈیاں دریافت کرنے کے لئے بھیجنے لگے۔ چنانچہ کولمبس نے ١٤٩٢ء میں جو سفر کیا تھا وہ بھی تجارت کے نئے راستے کی تلاش میں ہی کیا گیا تھا۔

سفر اور تجارت کی دشواریاں اگرچہ تجارت میں اضافہ ہوا تھا لیکن مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں ایسی ایسی مشکلوں اور خطروں کا سامنا کرنا پڑتا تھا جن کے بارے میں آج ہمیں یقین کرنے میں بھی تامل ہوگا۔ مثلاً سڑکیں بڑی خراب تھیں اور ان پر سفر کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

عام طور پر تاجر اور دوسرے سیاح گھوڑوں کی پیٹھ پر سفر کیا کرتے تھے۔ سڑکیں جنگلوں اور پہاڑوں پر سے ہوکر گذرتی تھیں۔ جنگلوں کے درمیان کہیں کہیں شہر اور گاؤں نظر آتے تھے اور ان کے بیچ میں فاصلے بہت زیادہ ہوا کرتے تھے۔

اکثر گاؤں ایسے تھے کہ جن میں تین چار گھر ہوتے تھے یہاں تک کہ جو گاؤں شہر پیرس کے قریب تھے وہاں بھی مکانوں کی تعداد سات آٹھ سے زیادہ نہ تھی۔ اسپین میں آدمی ۵۰ میل تک سفر کرتا چلا جاتا تھا۔ لیکن اسے ایک گھر بھی نظر نہ آتا تھا۔ موجودہ زمانے میں تو سیاح کو آدمیوں سے بچنے میں مشکل اور خوشی حاصل ہوتی ہے لیکن سنہ ۱۲۰۰ء میں سیاحوں کے لئے مشکل اور سلامتی اس بات میں نظر آیا کرتی تھی کہ کسی طرح دو بارہ آدمیوں کے درمیان پہنچ جائیں۔"

پھر ڈاکوؤں کا خطرہ ہمیشہ لگا رہتا تھا۔ کبھی تو یہ واقعی ڈاکو ہوتے تھے اور کبھی زمیندار ان کو اپنے علاقہ میں روک کر ان سے کچھ اینٹھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ یہ بات ایشیا میں بھی پائی جاتی تھی اور یورپ میں بھی۔ شارع عاموں پر اس میں شک نہیں سرائیں اور رباط ہوا کرتے تھے۔ بعض وقت ان کی حالت بہت اچھی ہوتی تھی لیکن اکثر یہ بہت گندی اور غیر آرام دہ ہوا کرتی تھیں لیکن جب مسافر گھوڑے کی پیٹھ پر لمبا سفر کرکے آتے تھے تو انھیں یہی غنیمت معلوم ہوتی تھیں۔

غرضکہ سنہ ۱۳۰۰ اور سنہ ۱۵۰۰ء کے درمیان دنیا کے دور دراز علاقوں نے ایک دوسرے سے نزدیک ہونا شروع کر دیا تھا۔

خلاصہ؛ عہد وسطےٰ میں اکثر مردوں اور عورتوں کی زندگی مینیر کے اندر محدود ہوا کرتی تھی۔ یہاں چھوٹی جماعتیں بنا کر وہ رہتے تھے اور باقی تمام دنیا سے تقریباً بے نیاز ہوتے تھے۔ وہ اپنے لئے غلہ اور مویشی خود ہی پیدا کر لیتے تھے۔ اپنا آٹا خود ہی پیس لیتے تھے۔ اپنا دھاگا خود ہی کاتتے اور اپنا کپڑا خود ہی بنتے تھے اپنے جوتے خود ہی بناتے تھے اور جن چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی ان میں سے اکثر خود ہی پیدا کر لیا کرتے تھے۔

پھر سنہ ۱۱۰۰ء کے بعد دنیا کے کچھ حصوں میں آہستہ آہستہ تبدیلی ہونا شروع ہوئی۔ لوگ چونکہ زیادہ چیزیں خریدنا اور بیچنا چاہتے تھے اس لئے چیزیں زیادہ بنائی جانے لگیں۔ قصبے تجارتی مرکز بن گئے اور جب لوگ ان کی طرف زیادہ کھنچنے لگے تو ان کی ترقی اور بھی زیادہ ہونے لگی۔ عہد وسطےٰ کی تنگ دنیا وسیع ہونے لگی۔ دنیا کے دور دراز علاقے ایک دوسرے

کے قریب آنے لگے اور ایک دوسرے پر روز بروز زیادہ انحصار کرنے لگے۔ تجارت اور شہروں کی ترقی اور دنیا کا ایک وسیع تخیل پیدا کرنے میں ان تاجروں اور سیاحوں کا بہت بڑا حصہ ہے جنھوں نے مشرق کی سیاحت اور سفر کئے۔

موجودہ عہد سے اگر مقابلہ کیا جائے تو اس زمانے کی زندگی بہت سادہ تھی۔ چونکہ چیزیں ہاتھ سے بنائی جاتی تھیں۔ تجارت اور سفر میں دقتیں تھیں۔ آبادی بکھری ہوئی تھی۔ اس لئے اس عہد کی زندگی موجودہ زمانہ کے صنعتی ملکوں کی زندگی سے بہت مختلف تھی۔

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

ہماری دنیا میں ایسا کوئی آدمی نہیں ہے جسے کبھی اپنی کسی عادت نے مجبور اور پرانی عادت نے پریشان نہ کیا ہو اور جسے اس پر تعجب نہ ہوا ہو کہ بری عادت کتنی جلدی اور اچھی عادت کتنی دیر میں پڑتی ہے۔ حقہ یا سگریٹ کے دو چار کش، افیون و شراب کے دو چار گھونٹ ان نشوں کی عادت ڈال دیتے ہیں۔ سویرے سونے اور سویرے اٹھنے کی عادت ڈالتے ڈالتے عمر گذر جاتی ہے یہانتک کہ وہ غضب کی نیند آتی ہے کہ آدمی قیامت تک اٹھتا ہی نہیں۔ انسان کی طبیعت کو پرکھنے والے پنڈت اور دوداں جی کہتے ہیں کہ تماشا دیکھنے کا شوق بھی ایسی عادت ہے جو ایک بار پڑ جائے پھر چھڑائے نہیں چھٹتی اور پھر لطف یہ کہ جیسا تماشا ویسی ہی اس کی عادت سینما اور تھیٹر کے شوق کو برا کہنے والے بہت سے ہیں لیکن دونوں سے پوچھئے تو معلوم ہوگا پھر مرغ اور منیڈھے اور ہاتھی کی لڑائی دیکھنے کے سامنے اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں اس لئے کہ وہ آدمی کو بالکل ہی اپنا غلام بنا کر چھوڑتی ہے۔ اس قسم کی سب سے بری لت آدمیوں کی لڑائی دیکھنے کا شوق ہے ایک زمانہ تھا جب روم میں لوگ آدمیوں کے لڑنے، ان کے زخمی ہونے اور مرنے کو ٹکٹ لے کر دیکھا کرتے تھے جیسے ہم آج کل فلم دیکھتے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ بڑے رحم دل لوگ ایک مرتبہ آدمی کا خون بہتے دیکھ لیتے تو پھر ایسا چسکا پڑ جاتا کہ انھیں کوئی طاقت روک نہیں سکتی تھی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آدمیوں کو لڑا کر تماشا دیکھنے کی رسم روم سے باہر نہیں پھیلی اور اب جو ایسی لڑائی دیکھنا چاہتا ہے اسے اپنی سلامتی کی فکر بھی کرنا پڑتی ہے۔ یہ نہ ہوتا تو تماشا دیکھنے کی لت نہ جانے کیا کیا اندھیر ڈھایا کرتی۔

لیکن اب بھی آپ جدھر نظر اٹھائیے، تماشا دیکھنے کا شوق موجیں مار رہا ہے۔ جب کبھی اس کا خیال آتا ہے کہ لڑائی ہوئی تو ان کے اپنے سروں پر ہی بم پھٹیں گے تو لوگ کانپ اٹھتے ہیں پر چاہتے سب یہی ہیں کہ کوئی نہ کوئی تماشا دیکھنے کو ملے۔ اگر ہماری آپ کی قسمت سے ایسا ہو جائے کہ مسٹر چیمبرلین سے دو دو باتیں کرنے کا موقعہ ملے اور ہمارے دل میں جو بات ہے ہم ان سے کہیں کہ آپ نے ہٹلر اور مسولینی کے سامنے جھک کر دنیا کی آزاد قوموں کی بے عزتی کرائی اور آزاد جمہوری حکومت کے اصول کو خطرہ میں ڈال دیا تو وہ پہلے تو ہمارے اوپر الزام لگائیں گے کہ آپ حضرات بنتے ہیں آزادی اور جمہوریت کے شیدائی۔ مگر دل میں نرے تماشائی ہیں اور آپ کچھ بھی کہیں میں ایسا نہیں ہوں کہ آپ کی باتوں کے پھیر میں آکر آپ کو خوش کرنے کے لئے تماشا دکھانے لگوں۔ اگر تم نے مسٹر چیمبرلین کو کسی طرح یقین دلا دیا کہ ہمیں خونی تماشا دیکھنے کی لت تھی اور نہ ہے تو وہ فوراً بحث کا پہلو ذرا بدل کر جواب دیں گے کہ آپ سے میری مراد خاص طور سے آپ لوگ نہیں تھے۔ اس لئے کہ آپ تو برطانیہ کے وفادار شانتی کی پوجا کرنے والے شہری ہیں۔ میرا اشارہ ان لوگوں کی طرف تھا۔ جو سمجھتے ہیں کہ یورپ کی سیاست ایک گاڑی ہے جس میں ہم گھوڑوں کی طرح جتے ہوئے ہیں اور ہم میں سے کامیاب وہی ہوگا جو اس گاڑی کو اپنی طرف کھینچ لے جائے اس کھینچا تانی میں گاڑی الٹے یا تمام گھوڑوں سمیت کسی گہرے غار میں گر جائے۔ آپ لوگوں کو مجھ سے یہ شکایت ہے کہ میں نے پورا زور نہیں لگایا اور ہٹلر اور مسولینی کو گاڑی بہت دور تک جدھر وہ چاہتے تھے کھینچ لے جانے دی۔

مجھے آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ گاڑی کو نہیں دیکھتے کہ کتنی نازک ہے راستہ کو نہیں دیکھتے کہ کیسا اونچا نیچا اور خطرناک ہے فاشسٹ گھوڑے ہنہناتے تھپکتے اور آپ ہی آپ دولتیاں چلاتے ہیں تو آپ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے بڑا کام کیا۔ اب آپ ہی سوچئے کہ گھوڑے کا کام کودنا ہے کرتب دکھانا ہے یا گاڑی کھینچنا اور میں نے اگر ہٹلر اور مسولینی کو ذرا ڈھیل دیدی اور سیاست کی گاڑی کو ٹوٹنے اور الٹنے سے بچا لیا تو اس میں دنیا کا فائدہ تھا۔ یا نقصان بے شک

لوگ چاہتے ہیں کہ ان کا کام بھی بنے اور نام بھی رہے لیکن میں تو وہی کر سکتا ہوں جو میرے بس میں ہے ہٹلر اور مسولینی میرے مقابلے میں نوجوان ہیں انھیں تماشا کرنے اور تماشا دیکھنے کا شوق ہے میں جو کچھ کر سکتا ہوں خاموشی سے کر لیتا ہوں مسٹر چیمبرلین کا یہ جواب سنکر آپ شاید چپ ہو جائیں اور چیمبرلین تھکے ماندے نہ ہوتے اور انھیں نزلہ کی شکایت نہ ہوتی تو ممکن ہے کہ آپ کو قائل ہوتے ہوئے دیکھ کر وہ دو چار باتیں ایسی ہی کہہ جائیں جنھیں وہ عام طور پر دل میں چھپا رہے ہیں شاید وہ یہ کہدیں کہ آپ لوگ جو میرے اوپر الزام لگاتے ہیں کہ میں نے آزادی اور جمہوریت کی ناؤ ڈبو دی بڑی نادانی کی بات کرتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ میں نے ہسپانیہ میں دخل نہیں دیا۔ مگر جرمن اور اٹلی کو دخل دینے سے نہیں روکا بھلا آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ میں دخل دیتا تو کس بنا پر سوشلزم سے آپ جانتے ہیں مجھے ہمدردی نہیں ہے اور مجھے یقین ہے کہ اکثر لوگ جو سوشلسٹ بنتے ہیں ایک نئے فیشن کی پیروی کر رہے ہیں جو سچے سوشلسٹ ہیں وہ گنتی میں بہت کم ہیں انھوں نے مجھے وزیر اعظم نہیں بنایا اور میں ان کو خوش کرنے کا ذمہ دار نہیں۔ تو میں کیوں آپ ہی آپ برطانیہ کو ایک سوشلسٹ ملک سمجھ کر ہسپانیہ کے جھگڑے میں الجھ جاتا رہا یہ اعتراض کہ میں نے جرمنی اور اٹلی کو دخل دینے سے کیوں نہیں روکا سو آپ ہی بتائیے کہ میں آزاد اور خود مختار ملکوں کو کس طرح روک سکتا تھا میں نے جو کچھ طے کیا برطانیہ کے لئے ہی طے کیا اور فرانس پر تھوڑا سا دباؤ ڈالا کہ وہ بھی ہسپانیہ کے جھگڑے سے الگ رہیں۔ اس لئے کہ فرانس اور برطانیہ سے اتحاد ہے اور ہم دونوں کو ایک ہی پالیسی پر چلنا چاہیئے، جرمنی اور اٹلی نے فرینکو کا ساتھ دیا اور اس کی اتنی مدد کی کہ وہ آخر میں جیت گیا۔ آپ کی طرح میں بھی جانتا ہوں۔ بلکہ آپ سے بہت بہتر جانتا ہوں کہ جرمنی اور اٹلی دونوں جیسا موقعہ ہوتا ہے ویسی ہی بات کہتے تھے کل وہ قسمیں کھاتے تھے کہ ہم کو ہسپانیہ کے معاملہ سے صرف اتنا ہی تعلق ہے کہ ہم فرینکو کے ہم مذہب ہیں اور اسے کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ کبھی وہ کھلم کھلا مدد کرتے اور فرینکو کی فتح کو اپنی فتح سمجھتے۔ میں نے جہاں تک کہ سیاست کے آداب

اس کی اجازت دیتے ہیں ان پر ظاہر کر دیا کہ میں انھیں جھوٹا نہیں سمجھتا ہوں۔ اگر آپ خیالی باتوں میں نہ پڑے ہوتے اور دنیا کو ذرا آنکھیں کھول کر دیکھتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ میں نے بڑی مصلحت سے کام لیا اس لئے کہ آپ جھوٹے کو اس کے منھ پر جھوٹا کہدیجئے تو سچا نہیں بن جاتا بلکہ اور زیادہ صاف اور صریح جھوٹ بولنے لگتا ہے۔ اپنے ہم پیشہ لوگوں کی تعلیم و تربیت کرنا میرا کام نہیں میرا کام تو صرف برطانیہ کا فائدہ اور بھلائی کرنا ہے اور آپ اس میں دیکھیں گے کہ میں کبھی نہیں چوکا۔ فرینکو کے ہوائی جہازوں نے بیسیوں تجارتی ہوائی جہازوں پر بم بازی کی اور میں کچھ نہیں بولا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس میں برطانیہ اور برطانیہ کے شہریوں کو خاص نقصان نہیں ہوتا لیکن ستمبر ۱۹۳۷ء میں جب ایک بارگی آب دوزوں نے بحر روم اور اٹلانٹک میں حملے کرنا شروع کر دئے تو میں نے فوراً پہرے ہر طرف بٹھا دئے۔ اور یہ خطرہ بہت جلد دور ہو گیا۔ اب ہسپانیہ کی لڑائی ختم ہو رہی ہے تو میں اس کا انتظام کر رہا ہوں کہ برطانیہ اور ہسپانیہ کے جیسے تعلقات جنگ سے پہلے تھے ویسے ہی اب بھی ہو جائیں اور برطانیہ کو بحر روم میں جو اطمینان پہلے تھا۔ اب پھر حاصل ہو جائے آپ نے دیکھا کہ میں نے کس استادی سے ایک برطانوی جہاز بھیج کر منورکا کے جزیرے پر جنرل فرینکو کا قبضہ کرا دیا۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ جزیرے ہسپانیہ کے دکھن میں ہیں اور جزائر سے جو جہاز جنوبی فرانس کی بڑی بندرگاہ مارسی کو جاتے ہیں وہ ان کے پاس ہو کر گزرتے ہیں اس کے بہت قریب ایک اور جزیرہ میجورکا ہے جسے اٹلی نے زبردستی ایک ہوائی مرکز بنا لیا ہے اور جہاں اس کے جنگی جہاز بھی اب رہنے لگے ہیں میں نے اٹلی سے محبت کئے بغیر ایک چال چلی کہ جس سے اٹلی کا پتہ کٹ گیا اور فرینکو پر مفت کا ایک احسان ہو گیا۔ میں ایسی ہی کچھ چالیں اور سوچ رہا ہوں فرینکو کی حکومت کو میں نے تسلیم کر لیا ہے اور آپ ذرا صبر کریں پھر دیکھئے گا کہ فرینکو باتیں چاہے اسی زبان میں کرے جس میں کہ ہٹلر اور مسولینی بولتے ہیں۔ لیکن وہ جو کچھ کرے گا مجھ سے صلاح مشورہ کر کے کرے گا یہی میں چاہتا ہوں مسٹر چیمبرلین کی ان دلیلوں کا اب آپ کیا جواب دیں گے۔ سوائے اس کے کہ دیکھئے فرینکو کی سیاست اب کتنے پلٹے کھاتی ہے۔

ایک ہسپانیہ کا معاملہ نہیں ہے ساری فاشسٹ سیاست کا ہے جرمنی اور اٹلی نے اس میں اپنا فائدہ دیکھا تو وہ فرینکو کو آپ سے پھرا دیں گے اس لئے کہ وہ ابھی تک بالکل انھی کے ہاتھ میں ہے۔ اور شاید فرینکو بھی اپنا فائدہ دیکھے۔ آپ کی سیاست نے دنیا کو یقین دلا دیا ہے کہ آپ کا اور فرانس کا دن ڈوبنے کو ہے۔ اب تو فرینکو موقع بے موقع ضد کرے گا اور جرمنی اسے اکساتا رہے گا جرمنی نے اب پولینڈ اور اوکرائن کو تاکا ہے۔ وہ ضرور اس کی کوشش کرے گا۔ کہ فرینکو سے اس کا یارانہ رہے اور جب وہ اوکرائن کو دبوچے تو آپ بالکل بے بس ہوں۔

مسٹر چمبرلین یہ بات سنکر ضرور مسکرائیں گے شاید انھیں ہنسی بھی آ جائے وہ کہیں گے کہ آپ صرف اخبار پڑھتے ہیں۔ اور میرے سامنے جرمنی کی نئی اور پرانی تمام کارروائیوں کا دفتر کھلا رکھا ہے آپ اس لئے پریشان ہیں کہ جرمنی بہت زیادہ ملک فتح کرے گا اس کی دولت بہت بڑھ جائے گی اور یورپی سیاست کی باگ ڈور بالکل اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔ مگر آپ کو اس کا خوف ہے تو آپ نے مجھ ہی کو سارے یورپ کا چوکیدار کیوں سمجھ لیا ہے اور آخر آپ سے میں کے مرتبہ کہوں کہ میں صرف برطانیہ کی سلامتی کا ذمہ دار ہوں۔ اگر روس پولینڈ اور رومانیہ میں اتنی طاقت نہیں کہ جرمنی کو روک سکیں۔ تو ظاہر ہے کہ جرمنی کو روکا نہیں جا سکے گا اوکیرائن حاصل کرنے سے جرمنی کی طاقت بہت بڑھ جائے گی لیکن پیٹ بھی بھر جائے گا۔ مگر میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ جرمنی کو اوکرائن اسی طرح خالی دھمکی دے کر مل جائے گا۔ جیسے کہ چیکوسلواکیا ملا تھا روس پولینڈ اور رومانیہ اس کی ضرور مخالفت کریں گے اور ہٹلر بھی یہ خوب جانتے ہیں کہ اوکرائن کا مال مفت ہاتھ آنے والا نہیں۔

پھر آپ اس کا بھی خیال رکھئے کہ میں نے سولینی کو بگڑنے نہیں دیا۔ اور جب وہ چاہیں مجھ سے دوستی و اتحاد کر سکتے ہیں انھوں نے اپنے داماد وزیر خارجہ چیانو کو ابھی پولینڈ بھیجا ہے بلقان کی ریاستوں کو بھی وہ جرمنی کی بڑھتی طاقتوں سے ڈرا رہے ہیں اور اگر میں نے ان کے ساتھ روپیے سے سلوک نہ کیا تب بھی وہ جرمنی کے حوصلے دیکھ کر آپ ہی میری طرف جھکیں گے۔ اوکرائن

پر حملہ کرنے سے فاشسٹ سیاست کی کشتی اس طرح ڈگمگائے گی کہ ہر ہٹلر خود پانی میں گر جائیں تو کچھ تعجب نہیں۔ یہ سب باتیں آپ کو خود سوچنا چاہیئے میں آپ سے کچھ نہیں کہونگا۔ ورنہ آپ مجھ پر اور اعتراض جڑ دیں گے مجھے اپنے بڑھاپے اور تجربے پر ناز ہے اس کے بعد گفتگو کا سلسلہ جاری رہنے کا موقع نہیں لیکن جب آپ اور تمام مسلوں پر مسٹر چمبرلین کی رائے سن چکے ہیں تو آپ کے منھ سے چین کا نام ضرور نکل جائے گا ممکن ہے مسٹر چمبرلین یہ لفظ سنیں ہی نہیں۔ ممکن ہے وہ جاتے جاتے کہدیں۔ کہ اس معاملے میں آپ نے جو رائے قائم کی ہے۔ وہ بھی غلط ہے آپ سیاست کی زبان نہیں سمجھتے آپ کو یہ نہیں معلوم ہے کہ چینی اور جاپانی لڑ کس بنا پر رہے ہیں۔ میں نے اب تک اپنی سیاست کے بارے میں جو کچھ بتلایا ہے اس پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ برطانوی سیاست کا مقصد کیا ہو سکتا ہے غور کرنے کے لئے وقت بھی بہت ہے چین اور جاپان کا جھگڑا کچھ جلد طے ہونے والا نہیں۔

جامعہ

زیرِ ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۳۱	مئی ۱۹۳۹ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مشاورتی بورڈ

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں — پروفیسر محمد مجیب

ڈاکٹر سید عابد حسین — پروفیسر سعید انصاری

معتمد اور مدیر:- پروفیسر محمد عاقل

ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد

۱۔ سیاسی، معاشی، تعلیمی اور تمدنی مسائل کا مطالعہ کرنا۔

۲۔ مطالعہ کے نتائج کو کتابوں اور رسالوں کی شکل میں شائع کرنا

۳۔ ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ نکالنا۔

۴۔ جلسے منعقد کرنا جس میں ملک کے سربرآوردہ ماہرین، ادارہ کی دعوت پر اجتماعی مباحث پر مقالوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور حاضرین سوالوں یا تقریروں کے ذریعے سے تبادلۂ خیالات کر سکیں گے۔

فرقہ وارانہ مسئلہ اور اس کے حل کرنے کے مختلف تاریخی طریقے

(از ڈاکٹر اے ی اسیروادم ریڈر سیاسیات و انتظامات عامہ مدراس یونیورسٹی)

ہندوستان آج جن مسئلوں سے دوچار ہے ان میں بلاشبہ فرقہ وارانہ مسئلہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ مسئلہ آل انڈیا فیڈریشن اور آزادی کامل کے مسئلوں سے بھی جن پر آج کل بہت بحث و مباحثہ کیا جاتا ہے زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ اس کے ماننے میں غالباً کسی کو تامل نہیں ہوگا کہ اگر ملک کے اندر خانہ جنگی اور نا اتفاقیاں موجود ہوں تو بہترین سیاسی ادارے بھی کامیاب نہیں ہو سکتے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جب تک قومی اتفاق پیدا نہ ہو جائے ہمیں آزادی کی جدوجہد کو ملتوی کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ اس کا امکان بہت قوی ہے کہ سیاسی آزادی کے حصول اور قیام کے لئے جو جدو جہد کی جائے گی وہ بذات خود خوشگوار تعلقات اور باہمی سمجھوتوں کی ان مخفی قوتوں کو پیدا کرنے کا موجب ہوگی جس سے ایک متحد اور مضبوط قوم تعمیر کی جا سکے گی۔

مہاتما گاندھی کو آج ہندوستان کے زندہ لوگوں میں سب سے بڑی شخصیت سمجھا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے ہمارے اندر قومی وقار نفس کا ایک زبردست احساس پیدا کر دیا ہے لیکن وہ شخص مہاتما گاندھی سے بھی بڑا ہوگا جو قومی اتحاد کے لئے ایک پائدار حل نکال سکے گا۔ آئندہ نسلیں ایسے شخص کو موجودہ ہندوستان کا سب سے بڑا مصلح سمجھیں گی۔ جب تک قومی اتحاد مفقود ہے اور فرقہ وارانہ فسادات کا زور ہے ہم غلام بنے رہیں گے اور باہر کی دنیا ہمارا مذاق اڑاتی رہے گی۔

فرقہ وارانہ ذہنیت کی مذمت کرنے سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان اختلافات کو ایک دن کے اندر مٹایا جا سکتا ہے یا یہ کہ ہندوستانی جماعت کے مختلف عناصر کو ہر حیثیت سے ایک ہی نمونہ اور سانچے کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لینا چاہیئے۔ اختلافات تو ایک عرصہ دراز تک جاری رہیں گے اور بذات خود ان کے جاری رہنے میں کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ اختلافات میں

برائی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب سوال برتری اور کم تری کا پیدا ہونے لگتا ہے اور اس سے شک و شبہہ اور بے چینی کی نہایت تلخ فضا پیدا ہو جاتی ہے جس طرح ایک خاندان کے افراد قدرتی طور پر آپس کے تعلقات میں زیادہ یگانگت محسوس کرتے ہیں اور کچھ باتوں میں دوسرے خاندانوں سے اپنے آپ کو ممتاز سمجھتے ہیں اسی طرح ان لوگوں میں بھی جو ایک ہی قسم کے خیالات اور نصب العین رکھتے ہیں اور ایک ہی طرح کے مذہبی اعتقادات رکھتے ہیں ہم جنسی کا شعور پیدا ہو جاتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دوسری جماعتوں کی طرف سے ان کے دل میں نفرت اور دشمنی پیدا ہو جائے۔ نہ یہ ضروری ہے کہ اختلاف کا یہ خط اتنا نمایاں ہو جائے کہ معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی کے تمام پہلوؤں پر چھا جائے۔ فرقہ وارانہ تنظیم کو جہاں تک معاشرتی میل جول اور تمدنی ترقی کا تعلق ہے وہاں تک تو جائز سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کی وجہ سے ایک قوم مخالف سیاسی اور معاشی گروہوں میں منقسم ہونے لگے تو اسے جائز نہیں سمجھا جا سکتا۔ عہد جدید کی ریاست ایک دنیوی ادارہ ہے اور اس میدان میں وہ اپنے شہریوں سے مکمل وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ معاشی اور سیاسی پروگراموں، پالیسیوں اور طریقوں کے مطابق تو پارٹیاں بنانے کی اجازت دے سکتی ہے اور اسے دینا چاہیے لیکن اگر ہر مذہبی فرقہ اور جماعت، ہر نسلی گروہ، اور ہر لسانی اقلیت کو ریاست اپنے سے جدا ہونے کی اجازت دیتی رہی تو اس کا نتیجہ اس کے حق میں خودکشی ثابت ہوگا۔ اگر انتشار پسند قوتوں کو حاوی ہونے کا موقع دے دیا جائے تو نہایت زبردست سلطنت بھی ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔

یہ دیکھ کر سخت تکلیف اور افسوس ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ تمام نیک نیت ہندوستانی قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن پھر بھی اس سمت میں ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔ اس کا سبب عقل کی کمی نہیں ہے بلکہ اتحاد باہمی کے ارادہ کی کمزوری ہے اور اس کمزوری کا سبب وہ خوف، بدگمانی اور سخت بداعتمادی ہے جو ہر فرقہ کے دل میں دوسرے کی طرف سے پائی جاتی ہے۔ مسلمانوں میں سے اکثر اور دوسری اقلیتوں میں سے کچھ لوگوں کو خوف ہے کہ سوراج کے معنی ہندو راج ہوں گے۔ اپنے اس خوف کے ثبوت میں وہ شہادت کے طور پر اس بات کو

پیش کرتے ہیں کہ سرکاری دفتروں، تعلیم گاہوں وغیرہ میں جو شخص برسرِ اقتدار ہو جاتا ہے وہ خالی جگہوں پر صرف اپنی ذات اور برادری کے لوگوں کو بھرتی کرنا شروع کر دیتا ہے اور اس جانب داری کو جائز قرار دینے کے لیے یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ دوسرے فرقوں میں ضروری قابلیت رکھنے والے لوگوں کا فقدان ہے۔ یہ بات پہلے تو ممکن ہے صحیح رہی ہو لیکن اب ہر فرقہ میں تعلیم کے ترقی پا جانے کے بعد یہ عذر صحیح نہیں رہا ہے۔

یہ بات محتاجِ وضاحت نہیں ہے کہ ہندوستان سے اس وقت تک نااتفاقی ختم نہ ہوگی جب تک ہم بڑے پیمانہ پر فیاضی، برادرانہ سلوک، رواداری اور ایک دوسرے کے نقطۂ نگاہ کے سمجھنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ سیاسی دستور اور تحفظات اور ضمانتیں ایسی حالت میں جب دل کے اندر دشمنی باقی رہے محض کاغذی کارروائی بن کر رہ جاتی ہیں۔ یہ فرض کرنا کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ جھگڑے ہمیشہ باقی رہیں گے اور اس لئے بہترین حل یہ ہے کہ اپنے معاشرتی، معاشی اور سیاسی انتظامات کو فرقہ وارانہ اصول کے ماتحت سلجھانے کی کوشش کی جائے تاریخ کے اسباق سے روگردانی کرنا ہے۔ دوسرے ملکوں کو بھی اسی قسم کی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اور انھوں نے حالات کے زیرِ اثر جزوی یا مکمل طور پر ان مسائل کو حل کر لیا ہے۔ جو کام دوسرے لوگ کر سکے ہیں ہندوستانی بھی کر سکتے ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ تمام مذہبی جماعتیں اپنے مذہب کی تعلیمات کی روح کی طرف رجوع کریں اور اپنے فرائض پر بھی اتنا ہی زور دیں جتنا کہ وہ اپنے حقوق پر دیتے ہیں یہ بات بہت زیادہ قابلِ افسوس ہے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں مذہبی جذبہ بہت قوی ہے اور جہاں مذہبی جوش وخروش مکمل ترکِ دنیا کی صورت بھی اختیار کرتا رہتا ہے پھر بھی مذہب سے لوگوں کو ملانے کی جگہ ان کو جدا کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ مذہب کو ہی سرے سے ختم کر دیا جائے، بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ مذہب کے تصور کو بدل دیا جائے۔ مذہب ہندوستان کی لعنت نہیں ہے بلکہ ہماری مصیبتوں کا اصل سبب مذہب کا غیر مذہبی اور ناجائز تصور ہے۔ کوئی مذہب رقابت، نفرت، شک، بے اعتمادی یا خود غرضی (چاہے وہ انفرادی

صورت میں ہو یا ہے جماعتی صورت میں) نہیں سکھاتا۔

فرقہ وارانہ ذہنیت کے ختم کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کو اپنے فرائض کے پورا کرنے کے لئے اتنی ہی تربیت دی جائے جتنی کہ انھیں اپنے حقوق کے حاصل کرنے کے لیے دی جاتی ہے۔ جس دنیا میں آج کل ہم رہ رہے ہیں اس میں ممکن ہے یہ بات ناقابل عمل معلوم ہو لیکن بہرحال ہمیں کوشش کرکے ضرور دیکھنا چاہیے۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ جس شخص کے پاس جتنی زیادہ چیزیں ہوتی ہیں اتنی ہی اور زیادہ چیزیں حاصل کرنے کے لیے اس کی حرص بڑھ جاتی ہے۔ لیکن جب ہم چیزوں کو دینا شروع کر دیتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو شریک کرنے لگتے ہیں تو خود ہماری زندگی میں اور دوسروں کی زندگی میں ایک سیر چشمی اور فارغ البالی پیدا ہو جاتی ہے۔

اوپر کے بیان سے ظاہر ہوا کہ فرقہ پرستی کا سبب روحانیت کی بنیادی کمی اور سیرت کی خرابی ہے جس کی وجہ سے ادنیٰ مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے مذہب کی آڑ لی جاتی ہے۔ فرقہ پرستی شہریت کے اعلیٰ جذبہ کے منافی ہے اور اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے اچھا شہری ہونا نہایت ضروری ہے لیکن جن لوگوں کو اچھا شہری بنانا ہو پہلے ان کی سیرت کو اچھا بنانے کی ضرورت ہے۔

اس عام بحث کے بعد اب ہم فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل کرنے کے لئے جو مختلف تجربے دوسرے ملکوں میں کئے گئے ہیں ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے بعض ہمارے لئے ہندوستان میں مفید اور سبق آموز ثابت ہوں۔

سوئٹزرلینڈ | سوئٹزرلینڈ ایسا ملک ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے نسلی، مذہبی اور لسانی اختلافات کو اس خوبی کے ساتھ حل کیا ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کے لئے ایک نمونہ بن گیا ہے اس ملک کے لوگوں کا تعلق کسی ایک نسل سے نہیں ہے۔ جرمن نسل کے لوگ ۷۰ فی صدی ہیں فرانسیسی نسل کے ۲۰ فی صدی اور اٹلی کی نسل کے ۶ فی صدی ان کی کوئی ایک قومی زبان بھی نہیں ہے۔ اکثر لوگ جرمن زبان بولتے ہیں اور بقیہ فرانسیسی اور اطالین۔ مذہبی اعتقاد کے لحاظ سے بھی اسی قسم کا اختلاف پایا جاتا ہے، ۵۸ فی صدی لوگوں کا تعلق پروٹسٹنٹ مذہب کے مختلف فرقوں سے ہے ۴۱ فی صدی کا رومن کیتھلک

ہے۔

لیکن نسل، زبان اور مذہب کے اس اختلاف کے باوجود کم از کم گذشتہ چھ سو سال سے سوئٹزر لینڈ ایک متحد ملک رہا ہے اور اس سے بھی زیادہ قابل ذکر یہ بات ہے کہ اس کے لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ یورپ کے تمام ملکوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس خصوصیت کے پیدا کرنے میں جن اسباب نے خاص طور پر حصہ لیا ہے وہ حسب ذیل ہیں (الف) ملک بہت مختصر اور اس کا علاقہ یکجا اور پیوست ہے۔ (ب) اس ملک میں مدافعت کے قدرتی ذرائع موجود ہیں (ج) لوگ ذہین وطن پرست اور معقولیت پسند ہیں (د) جائداد کی تقسیم نسبتاً مساوی ہے اور غریبوں اور امیروں میں زیادہ فرق نہیں پایا جاتا۔ (ہ) عمدہ شہری اور سیاسی روایات موجود ہیں جن پر لوگ فخر کرتے ہیں اور جن کو قائم رکھنا چاہتے ہیں اور (و) ایک سادہ، قابل فہم اور معقول طرز حکومت موجود ہے۔

تین طاقتور پڑوسیوں کی موجودگی نے بھی سوئٹزر لینڈ کے باشندوں کو متحد رکھنے میں بہت مدد دی ہے۔ اس کے مقابلہ میں جب ہندوستان پر نظر ڈالی جاتی ہے تو دل میں بعض وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ برطانیہ نے ایک طویل عرصہ تک جس طرح امن و امان کو قائم رکھا ہے اور جو لوگوں میں اعتماد کو پیدا کر دیا ہے کہ باہر کے حملہ آوروں سے ہندوستان کو محفوظ رکھنے کے لئے انگلستان انتہائی کوشش کرے گا کہیں یہ چیز تو ہندوستان کے مختلف فرقوں میں اختلاف و جنگ کے جاری رکھنے کا سبب نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کے لوگ اپنا تحفظ اپنی ذاتی کوشش سے کرنے کے لئے مجبور ہوتے اور اگر وہ یہ سمجھتے کہ نااتفاقی کی صورت میں تباہی لازمی ہے تو انھوں نے ضرور ان ذرائع اور وسائل کو ڈھونڈھ نکالا ہوتا جن سے فرقہ وارانہ اختلافات کو ہم آہنگی کے ساتھ مٹایا جا سکتا ہے۔

سوئٹزر لینڈ میں جس فیڈرل نظام حکومت کا رواج ایک عرصہ سے ہے اس کی وجہ سے بھی اتحاد اور پائداری کے پیدا ہونے میں بہت مدد ملی ہے۔ اس کی وجہ سے فیڈریشن میں شریک ریاستوں کو بہت بڑی حد تک مقامی خود مختاری مل گئی ہے۔ سوئٹزر لینڈ کی سرزمین کو بے شمار چھوٹے چھوٹے خود مختار ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ان ضلعوں میں اکثر و بیشتر مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں اور ہر ایک

کے اندر اپنی جداگانہ سیاسی تنظیم پائی جاتی ہے۔فرقہ وارانہ مسئلہ کے لئے اس قسم کا حل ہندوستان کے واسطے بھی بہت مفید ہو سکتا ہے۔اگر صوبوں کو بڑی حد تک خود مختار کر دیا جائے اور مقامی حکومتوں کی قوت میں اضافہ کر دیا جائے تو ہندوستان کے مختلف فرقوں کو اپنی قوتوں اور اہلیتوں کے استعمال کرنے کے لئے ایک بڑا میدان مل جائے گا۔اس نقطۂ نگاہ سے اگر صوبوں اور مقامی قسمتوں کا انتظام اس طرح پر کیا جائے کہ مختلف اقلیتوں کو ان کے حدود کے اندر پورا اقتدار حاصل ہو جائے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔

سوئٹزر لینڈ کی مثال سے جو ایک دوسرا قیمتی سبق حاصل کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ وہاں سیاسی جماعتیں عام طور پر نسلی، لسانی یا مذہبی اختلافات کی بنا پر نہیں بنائی جاتیں۔ یہ صحیح ہے کہ کلریکل جماعت کو بڑی قوت کیتھلک صوبوں سے حاصل ہوتی ہے لیکن اس جماعت کے علاوہ دوسری جماعتیں مثلاً زراعت پیشہ لوگوں کی جماعت، انڈیپنڈنٹ ڈیماکریٹس کی جماعت اور سوشل ڈیماکریٹس کی جماعت بھی ہیں جو نسلی، لسانی اور مذہبی گروہوں کی جماعت پر انحصار نہیں کرتیں سوئٹزرلینڈ میں پارٹی کا جذبہ بہت قوی نہیں ہے اور لوگوں کے اندر جاہ اور منصب طلبی کی خواہش بھی اتنی بڑھی ہوئی نہیں ہے جتنی کہ ہندوستان میں ہے۔

ان حالات کی موجودگی میں سوئٹزرلینڈ میں مساوات اور آزادی کے تصور کو خوب ترقی حاصل ہو گئی ہے۔ضمیر اور مذہب کی مکمل آزادی حاصل ہے۔کسی شخص کو کسی ایسی عبادت گاہ کا خرچ پورا کرنے کے لئے جس کا وہ خود ممبر نہ ہو کوئی محصول ادا نہیں کرنا پڑتا۔اس بات کا ہندوستان سے مقابلہ کیجئے جہاں انگلیکن چرچ کے بعض پادریوں کا خرچ اس قومی آمدنی سے پورا کیا جاتا ہے جو غیر عیسائیوں سے وصول کی جاتی ہے۔نظام حیدرآباد نے بھی جن کے ملک میں ۹۰ فی صدی ہندو اور گیارہ فی صدی مسلمان ہیں محکمہ کلیسا قائم کر کے برطانوی ہندوستان کی پیروی کی ہے۔سوئٹزرلینڈ کے علاقہ کے اندر کوئی بشپ کا علاقہ بغیر عہدیہ (کانفیڈریشن) کی منظوری کے قائم نہیں کیا جا سکتا۔

تمام صوبوں میں ابتدائی تعلیم مفت ہے۔

کناڈا | یہ دوسرا ملک ہے جس نے اپنے نسلی اور لسانی مسائل کو کامیابی کے ساتھ حل کر لیا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے برطانوی اور فرانسیسی نسل کے لوگ کناڈا میں امن وامان کے ساتھ رہ رہے ہیں اور ان میں نااتفاقی کا کوئی سخت مظاہرہ کبھی نہیں ہوتا۔ اس کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ فرانسیسی زیادہ تر کیوبک کے صوبہ میں آباد ہیں ان کے مقابلہ میں برطانوی لوگ تمام مملکت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کیوبک ۱۷۵۹ء سے برطانیہ کے قبضہ میں ہے اور کناڈا کا کل علاقہ برطانیہ کے قبضہ میں ۱۷۶۳ء میں آگیا تھا ۱۹۲۱ء میں کناڈا کی کل آبادی ایک کروڑ ۳ لاکھ ۷، ہزار ۸۰۶، تھی جس میں ۳۰ لاکھ ۱۰ ہزار ۱، تو برطانوی نسلوں سے تعلق رکھتے تھے اور ۲۹ لاکھ، ۲ ہزار ۹۹۰ فرانسیسی نسل سے۔ برطانوی نسل کی بیشتر آبادی کا تعلق پروٹسٹنٹ مذہب سے تھا اور فرانسیسی نسل کے لوگوں کا کیتھولک مذہب سے لیکن اس اختلاف کے باوجود دونوں نسلوں کے لوگ ہم آہنگی کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔

کیوبک میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں طرح کے ابتدائی مدرسہ پائے جاتے ہیں۔ لیکن دونوں ایک ہی محکمہ تعلیم کے ماتحت ہیں اور مشترکہ محصول سے چلائے جاتے ہیں اگرچہ ان کا انتظام پوری آزادی کے ساتھ علیحدہ علیحدہ کیا جاتا ہے۔ پورے ملک کی تعلیم صوبہ کی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا خرچ مقامی محاصل سے پورا کیا جاتا ہے اور امداد صوبہ کی حکومت کی طرف سے بھی ملتی ہے۔ کیوبک کے صوبہ کو آزادی ہے کہ جس طرح چاہے اپنی تعلیم کے انتظام میں ترمیم و تنسیخ کرے۔ انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانیں سکھائی جاتی ہیں۔ صوبہ کی کیتھلک آبادی کے لئے مونٹریال اعلیٰ تعلیم کا مرکز ہے۔ کناڈا کے فرانسیسیوں کو اپنی زبان بہت زیادہ عزیز ہے اور وہ برابر اس بات کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ اس میں سے متروک اور اینگلیکن اصل کے الفاظ کو خارج کرتے رہیں۔

برطانیہ عظمیٰ | عام طور پر یہ فرض کیا جاتا ہے کہ جزائر برطانیہ ایک ہم آہنگ ملک ہے اور اس میں کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ کبھی موجود نہیں رہا ہے۔ لیکن جو لوگ یہ فرض کرتے ہیں وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ انگریزوں، ویلس کے رہنے والوں اور اسکاٹ لینڈ کے رہنے والوں کا تعلق ایک ہی نسل سے نہیں ہے۔ ان کا خون مختلف ہے، ان کے قومی رواج مختلف ہیں اور ایک حد تک ان کی زبان

بھی مختلف ہے لیکن پھر بھی ان تینوں گرد ہوں نے مل کر رہنا سیکھ لیا ہے۔ اگر اسکاٹ لینڈ کا کوئی باشندہ یہ کہے کہ انگریز اس پر ظلم کر رہے ہیں تو سب لوگ اس بات پر ہنسیں گے کیونکہ جتنا ان کا واقعی حصہ ہونا چاہیئے تھا اسکاٹ لینڈ کے اس سے زیادہ لوگ برطانیہ کے وزیر اعظم کے عہدہ پر رہ چکے ہیں۔ برطانوی تجارت اور صنعت میں بھی ان کا حصہ بہت اچھا رہا ہے اور اگرچہ یہ بات مذاق میں کہی جاتی ہے کہ برطانوی سلطنت کو آئرلینڈ والوں نے حاصل کیا اور انگریز لوگ اسکاٹ لینڈ والوں کے فائدہ کے لئے اس پر حکومت کر رہے ہیں لیکن اس میں بہت کچھ صداقت موجود ہے۔

ایک زمانہ میں مذہبی اختلافات کی وجہ سے انگلستان میں ایک مصیبت نازل رہتی تھی لیکن اب یہ سب ختم ہو گئے ہیں۔ کیتھلک اور پروٹسٹنٹ اب ایک دوسرے کو جلاتے اور قتل نہیں کرتے کیونکہ اب ایک دوسرے کا خوف ان کے دلوں سے نکل گیا ہے۔ جب خوف ہوتا ہے اسی وقت مذہب کے نام پر سزا دینے کا کام اور اس کے جواب کے طور پر انتقامی کارروائی شروع کی جاتی ہے۔ آج کل بھی کبھی کبھی یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ اسکاٹ لینڈ والوں اور ویلس کے لوگوں کو ہوم رول ملنا چاہیئے لیکن اس مطالبہ کی نوعیت کبھی سنجیدگی کی حد تک نہیں بڑھتی اور اس کی وجہ انگریزوں کا وہ رواداری کا سلوک ہے جو وہ اپنے ملک کے دوسرے عناصر کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔

آئرلینڈ آئرلینڈ ابھی تک اپنے فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل نہیں کر سکا ہے۔ جیمس اول کے دور حکومت کی ابتدا میں شمالی آئرلینڈ (السٹر) میں انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے آدمی ترک سکونت کر کے آباد ہو گئے تھے یہ سب کے سب پروٹسٹنٹ تھے اور ان کی وجہ سے آئرلینڈ دو غیر مساوی مذہبی فرقوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ جس سے بعد میں بڑی تلخی پیدا ہوئی اور آج تک یہ لوگ آئرش فری اسٹیٹ کے ساتھ جس کو ۱۹۲۲ء میں دستوری آزادی مل گئی ہے متحد نہیں ہو سکے ہیں۔

اس دستور کے اندر جن حقوق کا اعلان کیا گیا ہے انہیں السٹر کے لوگوں نے اپنے لئے کافی نہیں سمجھا اس لئے وہ آئرش فری اسٹیٹ میں شامل نہیں ہوئے۔ اعلان حقوق میں اس بات کی تعریف کی گئی ہے کہ کن کن لوگوں کو آئرلینڈ میں شہریت کے حقوق حاصل ہیں۔ اس میں آئرلینڈ

کی زبان کو قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے لوگوں کے جسم اور ان کی جائداد کو ناقابل دست اندازی قرار دیا گیا ہے ضمیر عبادت زبان اور اجتماع کی آزادی دی گئی ہے۔ اس میں کسی مذہب کی امداد نہیں کی گئی ہے اور "مختلف مذہبی فرقوں کے انتظام میں جو مدرسے ہوں گے ان کو سرکاری امداد دیتے وقت کسی قسم کے ترجیحی سلوک کا حق نہیں دیا گیا ہے۔"

تمام شہریوں کو ابتدائی تعلیم مفت دیئے جانے کا حق دیا گیا ہے۔ ہندوستان کے لیے بنیادی حقوق کیا ہوں۔ اس مسئلہ پر ایک عرصہ تک بحث کی جاچکی ہے اور بحث و مباحثہ کے بعد انھیں ۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی اب اس سوال کو ازسر نو زندہ کر رہی ہے۔

جنوبی افریقہ | جنوبی افریقہ نسلی اختلافات کا دنگل رہ چکا ہے۔ اس ملک میں ڈچ، برطانیہ کے لوگ، نیگرو، رنگ دار (یعنی مخلوط نسل کے) لوگ اور ہندوستانی آباد ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں جنوبی افریقہ کی آبادی کا تخمینہ جنوب مغربی افریقہ کو ملا کر ۹۵ لاکھ، ۴ ہزار ۵۰۹ کیا گیا تھا جس میں ۲۰ لاکھ ۴۳ ہزار ۴۲۵ تو یورپ کے لوگ ہیں اور ۹، لاکھ ۱۳ ہزار ۱۲۶ غیر یورپی ہیں۔ مردم شماری میں برطانیہ کے لوگوں اور ڈچ لوگوں کے اعداد اس وجہ سے الگ الگ نہیں دیے جاتے کہ اس سے ان دونوں فرقوں کے اختلاف کے مستقل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس پر ہندوستان میں ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ہندوستان میں مذہبی بنیاد پر حکومت اور انتظام کے ہر شعبہ میں اعداد رکھے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اخبار بھی بجائے یہ لکھنے کے کہ زید نے بکر کو مار ڈالا تقریباً ہمیشہ یہ لکھتے ہیں کہ "ایک ہندو نے ایک مسلمان کو مار ڈالا" یا "ایک مسلمان بگڑ بیٹھا وغیرہ"

یورپ کے لوگ افریقہ میں آباد ہونے کے لئے آئے تھے اور رنگین نسل کے لوگ ان کی رعایا رہ چکے تھے۔ پہلا مسئلہ جس کے حل کرنے کی ضرورت پڑی وہ برطانیہ کے لوگوں اور ڈچ لوگوں کا تھا جس کا انجام آخر میں جنگ بوئر کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ۱۹۰۵ء کے قانون نے جمہوری قوتوں کو آزادی کے ساتھ نشوونما کا موقع دے کر ان دونوں فرقوں کو ایک دوسرے سے قریب آنے کا موقع فراہم

بھی مختلف ہے لیکن پھر بھی ان تینوں گروہوں نے مل کر رہنا سیکھ لیا ہے۔ اگر اسکاٹ لینڈ کا کوئی باشندہ یہ کہے کہ انگریز اس پر ظلم کر رہے ہیں تو سب لوگ اس بات پر ہنسیں گے کیونکہ جتنا ان کا واقعی حصہ ہونا چاہیئے تھا اسکاٹ لینڈ کے اس سے زیادہ لوگ برطانیہ کے وزیر اعظم کے عہدہ پر رہ چکے ہیں۔ برطانوی تجارت اور صنعت میں بھی ان کا حصہ بہت اچھا رہا ہے اور اگرچہ یہ بات مذاق میں کہی جاتی ہے کہ "برطانوی سلطنت کو آئرلینڈ والوں نے حاصل کیا اور انگریز لوگ اسکاٹ لینڈ والوں کے فائدہ کے لئے اس پر حکومت کر رہے ہیں" لیکن اس میں بہت کچھ صداقت موجود ہے۔

ایک زمانہ میں مذہبی اختلافات کی وجہ سے انگلستان میں ایک مصیبت نازل رہتی تھی لیکن اب یہ سب ختم ہو گئے ہیں۔ کیتھلک اور پروٹسٹنٹ اب ایک دوسرے کو جلاتے اور قتل نہیں کرتے کیونکہ اب ایک دوسرے کا خوف ان کے دلوں سے نکل گیا ہے۔ جب خوف ہوتا ہے اسی وقت مذہب کے نام پر سزا دینے کا کام اور اس کے جواب کے طور پر انتقامی کارروائی شروع کی جاتی ہے۔ آج کل بھی کبھی کبھی یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ اسکاٹ لینڈ والوں اور ویلس کے لوگوں کو ہوم رول ملنا چاہیئے۔ لیکن اس مطالبہ کی نوعیت کبھی سنجیدگی کی حد تک نہیں بڑھتی اور اس کی وجہ انگریزوں کا وہ رواداری کا سلوک ہے جو وہ اپنے ملک کے دوسرے عناصر کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔

آئرلینڈ آئرلینڈ ابھی تک اپنے فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل نہیں کر سکا ہے۔ جیمس اول کے دور حکومت کی ابتدا میں شمالی آئرلینڈ (السٹر) میں انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے آدمی ترک سکونت کر کے آباد ہو گئے تھے یہ سب کے سب پروٹسٹنٹ تھے اور ان کی وجہ سے آئرلینڈ دو غیر مساوی مذہبی فرقوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ جس سے بعد میں بڑی تلخی پیدا ہوئی اور آج تک یہ لوگ آئرش فری اسٹیٹ کے ساتھ جس کو ۱۹۲۲ء میں دستوری آزادی مل گئی ہے متحد نہیں ہو سکے ہیں۔

اس دستور کے اندر جن حقوق کا اعلان کیا گیا ہے انہیں السٹر کے لوگوں نے اپنے لئے کافی نہیں سمجھا اس لئے وہ آئرش فری اسٹیٹ میں شامل نہیں ہوئے۔ اعلان حقوق میں اس بات کی تعریف کی گئی ہے کہ کن کن لوگوں کو آئرلینڈ میں شہریت کے حقوق حاصل ہیں۔ اس میں آئرلینڈ

کی زبان کو قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے لوگوں کے جسم اور ان کی جائداد کو ناقابل دست اندازی قرار دیا گیا ہے ضمیر عبادت زبان اور اجتماع کی آزادی دی گئی ہے۔ اس میں کسی مذہب کی امداد نہیں کی گئی ہے اور "مختلف مذہبی فرقوں کے انتظام میں جو مدرسے ہوں گے ان کو سرکاری امداد دیتے وقت کسی قسم کے ترجیحی سلوک کا حق نہیں دیا گیا ہے۔"

تمام شہریوں کو ابتدائی تعلیم مفت دیے جانے کا حق دیا گیا ہے۔ ہندوستان کے لئے بنیادی حقوق کیا ہوں۔ اس مسئلہ پر ایک عرصہ تک بحث کی جا چکی ہے اور بحث و مباحثہ کے بعد انہیں ۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی اب اس سوال کو ازسرنو زندہ کر رہی ہے۔

جنوبی افریقہ جنوبی افریقہ نسلی اختلافات کا دنگل رہ چکا ہے۔ اس ملک میں ڈچ، برطانیہ کے لوگ، نیگرو، رنگ دار (یعنی مخلوط نسل کے) لوگ اور ہندوستانی آباد ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں جنوبی افریقہ کی آبادی کا تخمینہ جنوب مغربی افریقہ کو ملا کر ۹۹ لاکھ، ۴ ہزار ۵۹۵ کیا گیا تھا جس میں ۲۰ لاکھ ۴۴ ہزار ۴۲۵ تو یورپ کے لوگ ہیں اور ۹، لاکھ ۱۳ ہزار ۱۶۱ غیر یورپی ہیں۔ مردم شماری میں برطانیہ کے لوگوں اور ڈچ لوگوں کے اعداد اس وجہ سے الگ الگ نہیں دیے جاتے کہ اس سے ان دونوں فرقوں کے اختلاف کے مستقل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس پر ہندوستان میں ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ہندوستان میں مذہبی بنیاد پر حکومت اور انتظام کے ہر شعبہ میں اعداد رکھے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اخبار بھی بجائے یہ لکھنے کے کہ زید نے بکر کو مار ڈالا تقریباً ہمیشہ یہ لکھتے ہیں کہ "ایک ہندو نے ایک مسلمان کو مار ڈالا" یا "ایک مسلمان بگڑ بیٹھا وغیرہ"

یورپ کے لوگ افریقہ میں آباد ہونے کے لئے آئے تھے اور رنگین نسل کے لوگ ان کی رعایا رہ چکے تھے۔ پہلا مسئلہ جس کے حل کرنے کی ضرورت پڑی وہ برطانیہ کے لوگوں اور ڈچ لوگوں کا تھا جس کا انجام آخر میں جنگ بوئر کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ۱۹۰۵ء کے قانون نے جمہوری قوتوں کو آزادی کے ساتھ نشو و نما کا موقع دے کر ان دونوں فرقوں کو ایک دوسرے سے قریب آنے کا موقع فراہم

کر دیا۔ لیکن اب بھی دونوں مکمل طور پر ایک دوسرے سے نہیں ملے ہیں۔ ڈچ لوگوں کے اندر ایک حد تک شکست خوردہ لوگوں کی ذہنیت پائی جاتی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا تمدن برطانیہ کے برابر اچھا نہیں ہے۔ اس کے برعکس برطانیہ کے لوگ اپنے آپ کو افضل اور برتر سمجھتے ہیں اور اس بات کو ڈچ لوگ سخت ناپسند کرتے ہیں۔ برطانیہ کے لوگوں میں تخیل کی کمی ہے اور وہ اس بات کو نہیں سمجھ سکتے کہ بوئر لوگ کیوں سلطنت برطانیہ کی برکات کی تعریف اتنی ہی شد ومد سے نہیں کرتے جتنی کہ برطانوی نسل کے لوگ کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے آیندہ کے فسادات کے لئے ذہنی فضا تیار ہو رہی ہے۔

لیکن اس کے اثر کو زائل کرنے والے اور دوسرے اثرات بھی اپنا کام کر رہے ہیں۔ انگریزی اور افریقی دونوں زبانوں کو سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ ملازمتیں جن میں کچھ عرصہ کے لئے برطانوی نسل کے لوگوں کا اجارہ سا قائم ہو گیا تھا اب دونوں نسل کے لوگوں کے لئے کھل گئی ہیں۔ برطانوی افسر جو پہلے افریقی زبان سیکھنے سے انکار کرتے تھے اب انھیں لازمی طور پر اس زبان کو سیکھنا پڑتا ہے۔ جنوبی افریقہ کی یونین کے وزیر اعظم ہمیشہ بوئر نسل کے لوگ ہوتے ہیں آپس کی شادیوں اور دو زبان بولنے والے خاندانوں کی وجہ سے اختلافات مٹتے جا رہے ہیں۔

جنرل بوتھا "ایک دھارے کی پالیسی" کا علمبردار تھا تاکہ اس کے ذریعہ سے دونوں نسلیں ایک متحدہ جنوب افریقی قوم میں جذب ہو جائیں۔ لیکن یہ چیز بڑی حد تک ناقابل عمل ثابت ہوئی ہے۔ جنرل ہرٹزاک کی پالیسی "دو دھاروں کو قائم رکھنے والی پالیسی" ہے جس کی وجہ سے دونوں نسل کے لوگوں کے فرق کو قائم رکھا جاتا ہے لیکن مشترکہ مفاد کے کاموں میں شرکت کرنے کے لئے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ جدا کرنے والے جو رجحانات ہیں ان میں کمی اس اندیشہ سے پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر سفید نسل کے لوگوں کے اختلافات قائم رہے تو رنگین نسل کے لوگ ان پر حاوی ہو جائیں گی۔

جنوبی افریقہ میں سیاسی پارٹیوں کی تنظیم زیادہ تر نسلی بنیاد پر رہی ہے سیاسی خیالات پر نہیں۔ مگر ۱۹۳۴ء سے دو جماعتوں یعنی جنوبی افریقہ پارٹی اور نیشنلسٹ پارٹی کو ملا کر جنوبی افریقہ کی ایک متحدہ پارٹی بنا دی گئی ہے۔ سیاسی اصولوں اور پالیسیوں کی بنیاد پر بھی پارٹیاں بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

گو مردم شماری میں دونوں نسل کے لوگوں کے اعداد الگ الگ نہیں دیے جاتے لیکن پھر بھی یہ کہنا صحیح ہے کہ دونوں نسل کے لوگوں کی تعداد تقریباً برابر ہے۔ نٹیال کے صوبہ کو چھوڑ کر باقی سب صوبوں میں ڈچ لوگوں کی تعداد برطانوی نسل کے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ ڈچ زیادہ تر کسان ہیں اور دیہات میں رہتے ہیں لیکن برطانوی نسل کے لوگ زیادہ تر صنعت کا کام کرتے ہیں اور شہروں میں رہتے ہیں۔ اگر اتحاد کے عناصر کافی قوی نہ ہوئے تو اندیشہ ہے کہ معاشی مفاد کے اس اختلاف کی وجہ سے آئندہ تصادم کے امکانات پیدا ہوں گے۔

ملک کے اصل باشندوں اور رنگین نسل کے لوگوں کے ساتھ جنوبی افریقہ میں جو سلوک کیا جاتا ہے اس کے لئے جنوبی افریقہ کافی بدنام ہو چکا ہے۔ تمام جنوبی افریقہ میں بوئر جس قسم کے سلوک کو عام طور پر روا رکھتے ہیں اسکے مقابلہ میں کیپ کے صوبہ میں اصل باشندوں کے ساتھ انگریزوں کا سلوک نسبتاً بہتر ہے۔ کیپ کی نوآبادی میں دیسی لوگوں کو لیجسلیٹو کاؤنسل میں اپنے نمایندے بھیجنے کا حق ملا ہوا ہے۔ یونین کے ادنیٰ اور اعلیٰ ایوان میں انھیں "سنہ ۱۹۳۶ء کے دیسی لوگوں کی نمایندگی کے قانون" کے مطابق نمایندگی ملی ہوئی ہے۔ اس ایکٹ کی رو سے دیسی لوگوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ سینیٹ کے لئے چار ممبر اور ہاؤس آف اسمبلی کے لئے تین ممبر منتخب کرسکیں۔ اور یہ ارا کین اس صورت میں بھی جب کہ ایوانوں کو برطرف کردیا جاتا ہے پانچ سال تک اپنی نشستوں پر قائم رہتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک سخت پابندی یہ ہے کہ دونوں ایوانوں کے ارا کین کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ یورپی نسل کے برطانوی رعایا ہوں۔ دیسی لوگ جن چار سینیٹروں کا انتخاب کرتے ہیں ان کے علاوہ گورنر جنرل چار سینیٹروں کو دیسی مفاد کی نمایندگی کے لئے نامزد کرتے ہیں۔

پرانے بوئر لوگوں کی روایت یہ رہی ہے کہ دیسی لوگوں کو گرجا اور ریاست میں برابر کا مرتبہ نہ دیا جائے۔ لیکن موجودہ پالیسی انتہاپسندی کی طرف مائل نظر آتی ہے۔ سیل روڈس نے جس پالیسی کی حمایت کی تھی وہ یہ تھی کہ "زیمبی کے جنوب میں جتنے مہذب آدمی ہیں ان سب کو مساوی حقوق دیئے جائیں" لیکن اس پر عملدرآمد ابھی تک نہیں کیا جاسکا ہے۔ سفید نسل کے لوگ دیسی لوگوں کو

جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب دینے کے بھی مخالف ہیں۔
چونکہ کھلے طور پر دبانا اور جذب کرنا دونوں مشکل ہیں اس لئے آج کل جس پالیسی کی تبلیغ کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ انھیں الگ رکھا جائے اور ان کے لئے متوازی ادارے علیحدہ قائم کیے جائیں۔ اس پالیسی کے مطابق کچھ علاقے تو ایسے ہوں گے جن میں سفید نسل کے لوگوں کو اقتدار حاصل ہوگا اور رنگین نسل کے لوگ محض اجرت پر کام کرنے والے لوگوں کی حیثیت سے کام کریں گے۔ لیکن دوسرے ایسے علاقے ہوں گے جن میں رنگین نسل کے لوگوں کو قانون سازی اور انتظام سلطنت کے اختیارات ملے ہوئے ہوں گے۔
متوازی اداروں کی پالیسی کے سلسلہ میں "دیسیوں کو نمائندگی دینے والی ایک کاؤنسل" قائم کی گئی ہے۔ اس کاؤنسل میں چھ سرکاری ممبر ہوتے ہیں چار گورنر جنرل کی طرف سے نامزد کیے جاتے ہیں اور بارہ منتخب شدہ دیسی ممبر یعنی ہر انتخابی حلقہ سے تین تین ممبر۔ اس کونسل کا کام یہ ہے کہ مندرجہ ذیل باتوں پر غور کرکے رپورٹ پیش کرے (الف) مجوزہ قانون پیش کرنا جہاں تک ان کا اثر دیسی آبادی پر پڑتا ہو (ب) کوئی اور معاملہ جس میں وزیران کی رائے طلب کرے (ج) کوئی اور دوسرا معاملہ جو عام طور پر دیسیوں کے مفاد پر اثر ڈالتا ہو۔
عدالت کے سلسلہ میں دیسی کمشنروں کی عدالتیں مخصوص علاقوں میں قائم کی گئی ہیں جن کا کام یہ ہے کہ وہ تمام سول مقدمات اور دیسیوں کے مابین جو معاملات ہوتے ہیں ان کی سماعت کرتی ہیں ان عدالتوں کی اپیل دیسی اپیل کی عدالتوں میں کی جاتی ہے اور ان کا فیصلہ آخری ہوتا ہے سوائے اس صورت کے کہ یہ عدالت اس پر راضی ہو جائے کہ اس مسئلہ کے بارے میں جس کی یہ عدالت صراحت کردے گی سپریم کورٹ کی اپیل کی عدالت میں معاملہ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ فوجداری کا اختیار بھی جو مجسٹریٹ کی عدالت کے مساوی ہوگا دیسی کمشنروں کی عدالت کو دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح فوجداری کا ایک محدود حد تک اختیار دیسی سرداروں کو اپنے قبیلہ کے لوگوں کے معاملات کے لئے دیا جاسکتا ہے۔
اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس قسم کے اداروں کو نہ تو ہندوستان کی اکثریت

پسند کرے گی نہ اقلیت جن فرقوں کے لیے یہ قائم کئے جائیں گے۔ ان کی کم تری کے بارے میں ہمیشہ کے لئے مہر توثیق ثبت ہو جائے گی اور اس کے بعد ایک متحدہ قومی جماعت نہیں بنائی جا سکے گی۔

علیحدہ کرنے کا خیال چاہے وہ جزوی علیحدگی ہو یا مکمل علیحدگی ایک باطل خیال ہے خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ وسائل آمد و رفت کی ترقی کی وجہ سے دنیا روز بروز ایک دوسرے کے قریب آتی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ ابراہیم لنکن نے کہا تھا "اگر ہم کالے آدمی کو باہر رکھنے کے لئے ایک دیوار بنائیں گے تو ہمیں سفید آدمی کو باہر رکھنے کے لئے سات دیواریں بنانا پڑیں گی"۔ جہاں تک عملی سیاست کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ جنوبی افریقہ کے دیسیوں کی نصف سے زیادہ تعداد سفید نسل کے لوگوں کے علاقہ میں رہتی ہے اس لئے ان سب کو علیحدہ کرنا ممکن نہیں ہے ان کی علیحدگی سے یہ ضروری ہو جائے گا کہ ان کے لیے جتنی زمین اس وقت مخصوص کی گئی ہے اس سے زیادہ زمین مخصوص کی جائے اور دیسی مزدوروں کی جگہ سفید رنگ کے مزدوروں سے کام لیا جائے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے لوگوں نے اکثر سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ پر بحث و مباحثہ کیا ہے کہ اپنے ایک کروڑ ۱۰ لاکھ حبشیوں کو دوبارہ افریقہ بھیج دیں لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلا ہے۔

ہندوستان میں بھی بعض وقت یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ ملک کو دو ہندوستانوں میں تقسیم کر دیا جائے ایک ہندوؤں کا ہندوستان ہو اور دوسرا مسلمانوں کا ہندوستان اور پھر ان کی ایک مشترکہ وفاقی حکومت ہو۔ مسلم ہندوستان میں افغانستان، بلوچستان، کشمیر، شمال مغربی سرحدی صوبہ، پنجاب اور سندھ شامل ہوں گے کچھ حوصلہ مند حضرات یہ بھی چاہتے ہیں کہ ایک مسلمانوں کی سو میل چوڑی پٹی پنجاب اور بنگال کو ملانے کے لیے بنا دی جائے تاکہ یہ احاطہ بھی مسلم علاقہ میں شامل کیا جا سکے۔ دوسرے حضرات کی یہ خواہش ہے کہ اس فہرست میں حیدرآباد کو بھی اس بنا پر شامل کر لیا جائے کہ یہاں کے حکمران مسلمان ہیں اگرچہ یہاں کی ۹۰ فی صدی آبادی ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ تمام ہندوؤں کو ان مسلمانوں کے لئے جو مندرجہ بالا علاقوں سے تعلق نہیں رکھتے حیدرآباد کو چھوڑ دینا ہو گا۔ ان تجویزوں کا ناقابل عمل ہونا بالکل ظاہر ہے۔ پھر ڈیڑھ سو سال کے اندر اتحاد کا جو کام ہوا ہے اس کے ختم کرنے کے لئے اس

سے زیادہ یقینی طریقہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا اور اس سے اتحاد ہند کے تخیل پر ایسی ضرب کاری لگے گی کہ جس کے بعد وہ ہرگز جاں بر نہ ہو سکے گی۔

جنوبی افریقہ کے لئے اور بھی تجویزیں نسلی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ کابینہ کے طرز کی جماعت عاملہ کو منسوخ کر دیا جائے اور اس کی بجائے امریکہ یا سوئٹزرلینڈ کے طرز کی جماعت عاملہ قائم کی جائے دوسری تجویز یہ ہے کہ سینٹ کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ ہاؤس آف اسمبلی میں جب ایسے سودات قانون منظور ہوں جو دیسیوں کے حق میں مضر ہوں انھیں مسترد کر دے تیسری تجویز یہ ہے کہ مستقل بورڈ اور کمیشن مقرر کیے جائیں تاکہ ان کے ذریعہ غالب اکثریت رکھنے والی پارلیمنٹ کی زیادتیوں کا سدباب کیا جا سکے۔ اس آخری تجویز کی تائید میں یہ کہا جاتا ہے کہ دیسی معاملات کا کمیشن'' اس کام کو پہلے سے ہی کر رہا ہے لیکن اس کا تقرر حکومت کی طرف سے ہوتا ہے اور اس کا کام محض مشورہ دینا ہے۔ اس کو دیسی مفادوں کی صحیح نمایندگی کا موقع دینے کے لئے یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ کمیشن کے ارکان کو ایک آل افریقہ دیسی کونسل منتخب کرے اور جب کبھی حکومت واضح طور پر دیسی لوگوں کی مخالفت کی پالیسی پر عمل درآمد کرے تو اسے مداخلت کے زیادہ اختیارات دیے جائیں۔

لیکن ہمیں نہ تو دوسری تجویز معقول معلوم ہوتی ہے نہ تیسری۔ دوسری تجویز سے تو عوام کا ایوان کمزور اور بے اثر ہو جائے گا اور تیسری تجویز سے پارلیمنٹ کا اقتدار ایک قانون سے بالا ادارہ کے قائم ہو جانے کی وجہ سے ختم ہو جائے گا۔ جس کام کا کرنا مناسب ہے وہ یہ ہے کہ ایک اقلیتوں کی کونسل یا اسٹینڈنگ کمیٹی بنائی جائے جو ان تمدنی اور معاشری مسائل پر جن سے اقلیتیں متاثر ہوتی رہتی ہیں غور کرے۔

باقی ماندہ برطانوی افریقہ | جب افریقہ کی برطانوی سلطنت کے دوسرے حصوں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو وہاں بھی حالت اس سے زیادہ بہتر نظر نہیں آتی۔ جنوبی روڈیشیا کو ذمہ دار حکومت ۱۹۲۴ء میں دی گئی تھی لیکن ابھی تک دیسی لوگوں کو روڈیشین پارلیمنٹ میں کوئی نمایندگی نہیں ملی ہے۔ جنوبی روڈیشیا

کی پالیسی دیسیوں کے ساتھ بالکل جنوبی افریقہ کی یونین جیسی ہے۔ شمالی روڈیشیا اور نیا سالینڈ کی لیجسلیٹو کاؤنسل خالصتہً سفید نسل کے لوگوں پر مشتمل ہے۔

کینیا میں مختلف نسلی گروہوں کی نمایندگی کو ان کی تعداد سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ لیجسلیٹو کانسل میں گیارہ ایکس آفیشو ممبر ہوتے ہیں نو نامزد کیے ہوئے سرکاری ممبر، گیارہ منتخب کئے ہوئے یورپین، پانچ منتخب کئے ہوئے ہندوستانی، ایک منتخب کیا ہوا عرب اور دو نامزد کئے ہوئے غیر سرکاری ممبر دیسی لوگوں کے مفاد کی نمایندگی کرنے کے لئے۔ جہاں تک تعداد کا تعلق ہے یورپین لوگوں کی تعداد صرف ۱۸ ہزار ۲۶۹ ہے۔ ایشیا کے لوگوں کی ۴۱ ہزار ۸۳۵، عربوں کی ۱۲ ہزار ۵۵۸ اور دیسیوں کی ۳۱ لاکھ ۸۶ ہزار ۷۰۶، غیر یورپینوں کی تعداد یورپینوں سے زیادہ ہے لیکن ان کی نمایندگی نصف سے بھی کم ہے۔ یہ لوگ مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کے لئے شور مچا رہے ہیں لیکن سفید نسل کے لوگ ان کے مخالف ہیں۔

ٹانگانیکا کی لیجسلیٹو کاؤنسل ۱۳ سرکاری ممبروں، دس نامزد کئے ہوئے غیر سرکاری ممبروں (اگرچہ عملاً صرف ۹ کو نامزد کیا جاتا ہے) ۵ یورپینوں اور دو ہندوستانیوں پر مشتمل ہے۔ یوگانڈا کی لیجسلیٹو کاؤنسل میں ۹ سرکاری اور ۶ غیر سرکاری ممبر ہوتے ہیں۔ مؤخر الذکر میں عموماً دو ہندوستانی بھی ہوتے ہیں۔

(باقی)

سرمایہ داری اور فسطائیت

(از جناب محب الحسن صاحب بی۔ اے (آنرز) لندن پروفیسر ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر)

یہ سمجھنے کے لئے کہ فسطائیت[1] کیا ہے؟ اور کیوں وجود میں آئی۔ اس کی ضرورت ہے کہ ہم سرمایہ داری نظام کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں اس لئے کہ وہ اس کا ایک دور اور اس کی ایک منزل ہے۔ سرمایہ داری اور فسطائیت کوئی مختلف اور متضاد چیزیں نہیں۔ ان کی بنا یکساں اصولوں پر ہے۔ دونوں میں دولت آفرینی عوام کے نکتہ نظر سے نہیں کی جاتی بلکہ نجی فائدہ کے لئے اور دونوں میں ذرائع پیداوار پر قبضہ سماج کا نہیں ہوتا بلکہ افراد کا ہوتا ہے یہ ضرور ہے کہ انگلستان۔ فرانس اور امریکہ جو کہ سرمایہ داری کے گہوارے ہیں اور جہاں اس نے نشوونما پائی ابھی ایک حد تک جمہوریت کے ڈھانچے کو قائم کئے ہوئے ہیں اور شاید اس بات سے لوگ یہ نتیجہ نکالیں کہ سرمایہ داری اور فسطائیت دو مختلف چیزیں ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب سرمایہ داری اپنی بقا کے لئے دوسرا روپ اختیار کر لیتی ہے تو اس کو ہم فسطائیت کہتے ہیں ان دونوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں صرف ظاہری شکل وصورت کا فرق ہے۔ انگلستان اور فرانس میں جمہوریت کا نام ونشان ابھی اس وجہ سے باقی ہے کہ وہاں سرمایہ داری کو اتنا دھکا جنگ عظیم کے بعد نہیں لگا جتنا کہ جرمنی میں وہ فاتح ملک تھے ان کے پاس وسیع نوآبادیاں اور مقبوضات تھیں اور اس کی لوٹ سے وہ مزدوروں کو ایک حد تک راضی رکھ سکتے تھے۔ اس وجہ سے مزدوروں نے جنگ کے بعد کبھی موجودہ معاشی نظام کو فنا کرنے کی کوشش نہیں کی اور اس لئے سرمایہ داروں کو اس کی ضرورت نہیں پڑی کہ وہ

---

[1] یہاں پر فسطائی اور نازی الفاظ ایک ہی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں اور جو نظام جرمنی اور اٹلی میں قائم ہے اسس کو فسطائیت کہا گیا ہے۔ نازی (N A Z i) نیشنل سوشلسٹ جرمن مزدور پارٹی (NATIONAL SOCIALIST GERMAN WORKERS PARTY) کا مخفف ہے اور اس کا سرکاری نام N S D A P ہے۔ اس کی بنیاد ۲۰-۱۹۱۹ میں پڑی۔ اٹلی میں فسطائی (FASCIST) پارٹی صاحب اقتدار ہے۔ یہ لفظ فاشیو (FASCIO) سے نکلا ہے جس کے معنی جماعت یا اتحاد کے ہیں۔ یہ ۱۹۲۵ء میں قائم ہوئی۔

حکومت مطلق قائم کریں۔ لیکن ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں کہ جتنا سرمایہ دارانہ نظام پر زوال آرہا ہے اتنا ہی فرانس اور انگلستان میں فسطائی قوتیں ترقی پذیر ہو رہی ہیں۔ دونوں ملکوں کی داخلی اور خارجی پالیسی اس کا مظہر ہیں۔ دونوں ملکوں میں مزدوروں کی جماعت پر جبر و تشدد کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ اور آزادی خیال و بیان پر سخت پابندیاں عائد کی جا رہی ہیں اس کے علاوہ فرانس اور انگلستان کی حکومتوں کا رویہ چین حبش، چیکوسلواکیہ اور اسپین سے ایسا رہا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ فسطائیت کو جمہوریت پر ترجیح دیتی ہیں اور اس کی کوشاں ہیں کہ فسطائی قوتوں کا ہر جگہ یورپ میں بول بالا ہو جائے۔

سرمایہ داری کی سب سے پہلے بنیاد انگلستان میں پڑی یہیں اس کو عروج ہوا۔ ایسا کیوں ہوا؟ ہم کو چاہیئے کہ اس وقت کے دوسرے یورپین ممالک کے حالات پر ایک سرسری نظر دوڑائیں۔

پندرھویں صدی میں اہل پرتگال و ہسپانیہ یورپ میں ایک بہت منظم منضبط اور مہم پسند لوگ تھے یہ اس کشمکش اور جد و جہد کا نتیجہ تھا جو ان کو آزادی حاصل کرنے کے لئے موروں (MPOR S) کے خلاف کرنا پڑی۔ اور جب آزادی نصیب ہوگئی تو کامیابی کے نشہ سے مخمور ہو کر انھوں نے بڑی بڑی مہمیں سر کیں۔ کولمبس نے نئی دنیا تلاش کی اور واسکوڈیگاما نے ہندوستان کے جانے کا نیا راستہ معلوم کیا۔ اہل پرتگال نے فن جہاز رانی و جہاز سازی میں اتنی ترقی کی کہ وہ مشرق کی تمام بحری تجارت پر جو کہ عربوں اور اہل وینس و جینوا کے ہاتھوں میں تھی قابض ہو گئے۔ ہسپانیہ والوں کے حصہ میں نئی دنیا اور اس کی سونے کی کانیں پڑیں اور سولہویں صدی میں یہ دونوں قومیں دنیا کے ایک بڑے حصے پر چھائی ہوئی تھیں۔

لیکن سترھویں صدی سے ان پر زوال آنا شروع ہوا۔ اور بہت تھوڑے عرصہ میں ہالینڈ اور انگلستان نے اشتراک کر کے ان کی طاقت کو بالکل توڑ دیا۔ پرتگال اور ہسپانیہ خود بھی اپنی ناکامیوں کے ذمہ دار تھے۔ جاگیرداری نظام اور مذہبی تعصب نے دونوں ملکوں پر ایسی جمود کی کیفیت طاری کر دی کہ وہاں کوئی ایسا طبقہ نہ پیدا ہو سکا۔ جو کہ نئی ترقیوں اور نئے اصولوں کا علمبردار ہوتا۔ ہسپانیہ قرونِ وسطیٰ کے نظام کی زنجیروں سے ابھی تک جکڑا ہوا تھا۔

سترھویں صدی سے ہالینڈ کا عروج شروع ہوا۔ لیکن برطانیہ سے تجارتانہ رقابت اور جدو جہد کا نتیجہ اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا۔ وہ ایک چھوٹا ملک تھا۔ اس لئے وہ انگریزوں سے مقابلہ نہ کر سکا۔ اس صدی کے آخر سے اس کا زوال شروع ہوا اور انگلستان اس کا قائم مقام بنا۔ فرانس نے بھی سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں بہت ہاتھ پیر پھیلائے۔ تجارت کے لئے کمپنیاں بنائیں۔ نئی دنیا میں نوآبادیاں قائم کیں۔ اور ہندوستان پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے انگلستان سے بڑی بڑی معرکہ آرائیاں کیں۔ لیکن فرانس کو اس تجارتی دوڑ میں شکست ہوئی۔ وہ بھی اسپین کی طرح جاگیرداری اور مذہبی تعصب کا شکار بن گیا۔

انگلستان کی تاریخ نے ان ممالک کے برخلاف بالکل دوسرا ہی پہلو اختیار کیا۔ یہاں بارھویں اور تیرھویں صدی سے ایک ایسا درمیانی طبقہ پیدا ہونے لگا جس نے اون کی تجارت کی وجہ سے بہت تیزی کے ساتھ ترقی شروع کر دی۔ ٹیوڈر حکمرانوں نے باغی امراکی سرکوبی کے لئے ان سے تعاون کیا۔ جس سے ان کی قوت میں اور اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ جب خاندان اسٹوارٹ کا دور دورہ ہوا اور اس نے تجارت پر پابندیاں عائد کرنا شروع کر دیں تو اس نئے طبقے نے مقابلہ پر کمر باندھلی جس کا نتیجہ ۱۶۴۴ء کی خانہ جنگی تھی اور آخرکار اس نے شاہی استبدادیت اور جاگیرداری کو شکست دی اور ۱۶۸۸ء سے خود برسراقتدار ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی تجارت میں خوب ترقی ہوتی گئی اور ایسے قوانین وضوابط بن گئے جس سے اس کو اور مدد ملی۔ اس کے علاوہ انگریز فرانسیسیوں اور جرمنوں کے مقابلہ میں پہلے ایک متحدہ قوم بن گئے۔ وہ بڑی حد تک اور ملکوں کی مذہبی جنگوں سے محفوظ رہے اور دوسروں کے مقابلہ میں مذہبی رواداری بھی قائم کر دی۔ پھر ملک کی آب وہوا اور اس کا (ATLANTIC OCEAN) بحراوقیانوس میں واقع ہونا ایسی باتیں تھیں جس سے یہاں کے تجارتی طبقے نے بہت فائدہ اٹھایا۔ اور اپنی دولت خوب بڑھالی۔ اس کی مدد سے کارخانے قائم ہونے لگے تاکہ دوسرے ملکوں کو (اور خاصکر امریکہ کی انگریزی نوآبادیوں کو) مصنوعات بھیجی جائیں لیکن چونکہ ان کارخانوں میں صرف ہاتھ کا کام ہوتا تھا۔ اس لئے نہ صرف انگریزی نوآبادیوں کو ان کی ضروریات کا سامان پہنچانا مشکل تھا۔ بلکہ ذرائع

آمدنی بھی بہت محدود تھے۔ اس وقت یہ لازم تھا کہ دولت آفرینی کا کوئی دوسرا طریقہ وجود میں آئے چنانچہ اٹھارویں صدی کے آخر سے ایجادات و اختراعات ہونا شروع ہوئے۔ اور ہاتھ کے بجائے مشین سے اشیاء بننے لگیں۔ یہی وہ حیرت انگیز چیز ہے جس کو ہم صنعتی انقلاب کہتے ہیں۔ گویا کہ انگلستان کی جغرافیائی معاشی اور سیاسی حالات کی وجہ سے سب سے پہلے صنعتی انقلاب یہیں آیا۔ اور موجودہ معاشی نظام جس میں ہم سب رہتے ہیں اور جس کو سرمایہ داری کہا جاتا ہے اسی صنعتی انقلاب کا سبب ہے۔ اس صنعتی انقلاب کا یہ نتیجہ ہوا کہ تمام دنیا انگلستان کی منڈی بن گئی۔ لیکن اس کے یہ راز زیادہ عرصہ تک دوسرے ملکوں سے پوشیدہ نہ رہ سکے فرانس نے ۱۷۸۹ء کے انقلاب کے ذریعہ سے جاگیرداری نظام سے چھٹکارا حاصل کر کے صنعتی ترقی شروع کر دی۔ جرمنی نے بھی انیسویں صدی کے وسط سے جبکہ وہاں قومی اتحاد قائم ہو گیا صنعت و تجارت کے میدان میں قدم رکھا۔

اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ آخر اس صنعتی انقلاب کے دنیا پر کیا اثرات ہوئے سب سے پہلا نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دست کاروں کو اپنا کام بند کر دینا پڑا اس لئے کہ مشین کا مقابلہ کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ بھوک اور تنگ دستی سے بچنے کے لئے ان کے پاس اب اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا کہ وہ ملوں میں جا کر اپنی "محنت" بہت قلیل اجرت پر بیچ ڈالیں اور بجائے مالک رہنے کے سرمایہ داروں کے غلام بن جائیں اس انقلاب کا اثر کاشتکاروں پر بہت تباہ کن ہوا۔ اول تو کسان کھیتی کے علاوہ دست کاری سے بھی کچھ کما لیتے تھے لیکن مشینوں نے یہ ذریعہ آمدنی بالکل بند کر دیا۔ دوسرے واقعات پیش آئے کہ ان کو کاشتکاری بھی ترک کرنی پڑی۔ تیرھویں صدی ہی سے انگلستان میں زمینداروں نے اپنی زمینوں کو کاشتکاروں کے قبضہ سے نکال کر احاطہ بندی شروع کر دی تھی۔ اس میں وہ بھیڑیں پالتے تھے۔ کیونکہ ان کے لئے اون کی تجارت کھیتی کے مقابلہ میں زیادہ نفع بخش تھی۔ لیکن اس احاطہ بندی کی وجہ سے ہزاروں کسان بے روزگار ہو گئے اور شہروں میں تلاشِ معاش کے لئے پھرنے لگے صنعتی انقلاب نے ان کی حالت کو اور ابتر بنا دیا کیونکہ احاطہ بندی کی تحریک زیادہ شدید ہو گئی اور بڑے بڑے زمینداروں نے زراعت مشینوں کی مدد سے شروع کر دی۔ بیچارے کاشتکاروں کو بے روزگار

ہو کر اور دیہات کی آزاد اور تندرست زندگی کو خیر باد کر کے ملوں میں غلامی کرنے کے لئے شہروں میں آنا پڑا۔

اس زمانے میں نہ کوئی فیکٹری کے متعلق قانون تھے اور نہ مزدور اتنے بیدار اور منظم تھے کہ وہ اپنے حقوق کی پاسبانی کر سکتے۔ سرمایہ دار ان سے مثل جانوروں کے برتاؤ کرتے تھے۔ کام بہت لیتے تھے لیکن اجرت اتنی بھی نہ دیتے کہ وہ اپنا پیٹ پال سکتے۔ پانچ چھ برس کے بچوں سے لے کر حاملہ عورتوں تک سے سینکڑوں گز نیچے کانوں کے اندر اتنی محنت اور مشقت کے کام لئے جاتے تھے کہ ان کا حال سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مزدوروں سے چودہ چودہ اور سولہ سولہ گھنٹے کام لیا جاتا تھا اور ان کو رہنے کی جگہ مرغیوں کے دربے سے مکانوں میں دی جاتی تھی۔ ایک چھوٹے سے گندے اور کثیف کمرے میں پورے پورے خاندانوں کو زندگی بسر کرنا پڑتی۔ مارکس ایک county کے مجسٹریٹ کا مزدوروں کی حالت کے متعلق حوالہ دیتا ہے۔ جس کو میں یہاں درج کرتا ہوں۔ ”اکثر چھوٹے بچے اپنے گندے بستروں سے دو تین یا چار بجے صبح کو اٹھائے جاتے تھے اور رات کے دس گیارہ یا بارہ بجے تک ان سے بہت ہی معمولی اجرت پر کام لیا جاتا تھا۔“ یہاں پر میں ایک بیس سالہ لڑکی کا دردناک واقعہ جس کا نام میری عین واکلے تھا بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں وہ ایک بڑے اور معزز عورتوں کے کپڑے سینے کے فرم میں ملازم تھی اس کو روزانہ ساڑھے سولہ گھنٹے اور بعض اوقات تیس گھنٹے متواتر کام کرنا پڑتا تھا۔ اس کی لاغر تندرستی اور گھٹتی ہوئی طاقت میں قہوہ اور شراب سے جان ڈالی جاتی تھی۔ آخر کار ایک مرتبہ ایک شاہی رقص کے سلسلہ میں اس کو اعلیٰ طبقہ کی خواتین کا لباس بنانے میں ساڑھے چھبیس گھنٹے کی مسلسل محنت کرنا پڑی۔ اس کے بعد اس کو ایسے کمرے میں سونے کو جگہ ملی جس میں تقریباً تیس اور لڑکیاں تھیں اس میں نہ ہوا کا گذر تھا اور نہ کوئی آرام کا سامان۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری دو دن بیمار رہ کر مر گئی۔ اس واقعہ کو استثنائی نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ یہ نمونہ ہے ان لاکھوں مزدوروں کی زندگی کا جن کو افلاس اور غم و الم کے سوا کبھی آرام و آسائش سے سابقہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ تمام باتیں تو درکنار جو سب سے زیادہ ہیبت ناک مصیبت ان کے سر پر منڈلایا کرتی

تھی۔ وہ خوف بے روزگاری تھا۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ اس کا سبب کیا تھا۔ مغربی یورپ کی صنعتی ترقیوں سے کساد بازاری کا آنا لازم تھا۔ سرمایہ داری نظام میں پیدائش کی خاکہ اور تخمینہ سے ترقی نہیں کی جاتی۔ بلکہ اندھادھند طریقہ سے سرمایہ دار لوگوں کی ضروریات مدنظر نہیں رکھتے بلکہ اپنی ذاتی منفعت کو۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ چونکہ نئی ایجادات اور اختراعات کا سلسلہ جاری رہا جس سے کہ پیدائشی قوتیں بھی ترقی کر لی گئیں سرمایہ میں اضافہ ہوتا رہا اور نئے نئے ذرائع پیدائش قائم ہوتے گئے اس وجہ سے اشیاء ان کی کھپت سے کہیں زیادہ پیدا ہونے لگیں جس کی وجہ سے قیمتیں کم ہو جاتیں اور چونکہ فائدہ کی گنجائش کم ہو جاتی اس لئے سرمایہ دار اپنی فیکٹریاں بند کر دیتے اور اس طرح ہزاروں مزدور بے روزگار ہو جاتے۔

ان دشواریوں کا حل یوں ہو سکتا تھا کہ اول تو پیدائش ایک خاکہ اور نظام کے ساتھ کی جاتی اور یہ مدنظر رہتا کہ اس میں اور عوام کی ضروریات میں ایک توازن قائم رہے دوسرے یہ کہ مزدوروں کو اتنی کافی اجرت دی جاتی کہ وہ اپنی تمام ضروریات زندگی کا سامان خرید سکتے۔ اس طرح مال کی کثرت اور خریداروں کی کمی کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا اور اس کے ساتھ ساتھ کساد بازاری کا آنا بھی بند ہو جاتا۔ لیکن اس اسکیم پر سرمایہ دار کب عامل ہو سکتے تھے اس لئے کہ یہ ان کے اصولوں کے منافی ہے۔ اس کے اختیار کرنے کے یہ معنی تھے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماریں۔

چنانچہ سرمایہ داروں نے اپنی مشکلات کا حل یوں کیا کہ وہ دوسرے ملکوں کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ تاکہ ان پر سیاسی اثر یا اقتدار قائم کر کے ان کو اپنے مال کی منڈیاں بنائیں۔ انگلستان نے ہندوستان کو اس کی صنعت و حرفت کو ختم کر کے اپنی مصنوعہ اشیاء کی منڈی بنا لی اور اسی لئے اپنے اثر کا جال دنیا بھر میں پھیلا دیا۔ انیسویں صدی کے آخری بیس سال میں برطانیہ عظمیٰ۔ فرانس بلجیم اور جرمنی نے افریقہ میں بڑی بڑی نوآبادیاں حاصل کیں اور تقریباً اس کے ۹/۱۰ حصے پر قابض ہو گئے لیکن باوجود اس کے سرمایہ دار ممالک کو سیری حاصل نہ ہوئی۔ ان کی حالت عمر عیار کی زنبیل کی سی تھی

جس میں جو کچھ آیا وہ ہضم ہو جاتا۔ چونکہ سرمایہ بڑھتا رہا۔ نئی ایجادات ہوتی رہیں اور پیداوار کی قوتوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس لیئے جو نو آبادیاں اور مقبوضات ان کے پاس تھے وہ ان کی ضروریات کے لیئے ناکافی ہے۔ پرانی تقسیم تسلی بخش ثابت نہ ہوئی۔ چنانچہ بیسویں صدی کے آغاز سے مغربی یورپ کے ممالک میں ایک دوسرے کے دائرۂ اثر کو اس سے چھیننے کی جدوجہد شروع ہوئی۔ جرمنی نے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے صنعتی میدان میں انگلستان اور فرانس کے بعد قدم رکھا اور اس لیئے اس کے ہاتھ بہت کم نو آبادیاں لگیں۔ لیکن اس نے اتنی تیزی سے ترقی شروع کر دی کہ اس کو نو آبادیاں کی کمی بہت جلد محسوس ہونے لگی۔ جرمنی کو ایسے خطہ کی ضرورت تھی جہاں سے اس کو اپنی فیکٹریوں کے لیئے مال دستیاب ہو سکتا اور بدلہ میں وہ اپنی مصنوعہ اشیا بھیج سکتا۔ چنانچہ جرمنی انگلستان اور فرانس کو تباہ کرنے کے منصوبے باندھنے لگا۔ فرانس اور انگلستان بھی جرمنی کی صنعتی ترقیوں اور بری اور بحری قوت کو دیکھ کر حسد کرنے لگے اور اس کی تباہی کے درپے ہوئے چنانچہ ان ممالک کے آپس کے مفاد کے تصادم کا نتیجہ ۱۹۱۴ء کی جنگ تھی۔

لیکن اس جنگ سے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس لئے کہ اب سرمایہ داری کا آخری دور آ پہنچا تھا۔ کسادبازاری جو ایک میعادی بیماری تھی اب مستقل مرض بن گئی۔ اور وہ تمام تضاد جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اب نمایاں طریقہ سے اپنا اثر دکھلانے لگے۔ تجارتی رقابتوں۔ انتقامی محاصل۔ اور نو آبادیوں کی از سر نو تقسیم کی جدوجہد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور سرمایہ دار ملک پھر دوبارہ جنگ کے لئے تیاریاں کرنے لگے۔ یہ اس کے فطری نقائص اس کو تیزی کے ساتھ تباہی کی طرف ڈھکیل رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور عنصر تھا جو اس کی فنا کا کوشاں تھا۔ یہ مزدور تھے جو محسوس کرنے لگے کہ سرمایہ داروں کی تباہی اور بربادی میں ان کی نجات اور بہبودی کا راز پنہاں ہے۔ ان میں اتنا سیاسی شعور اور اتنی بیداری پیدا ہو گئی تھی کہ وہ سمجھنے لگے کہ سماج کا معاشی نظام بہت ناقص ہے اور اس کا مقصد صرف تباہی۔ جنگ۔ بے روزگاری اور افلاس کا پیدا کرنا ہے۔ اس سے تنگ آکر انھوں نے اس کا ارادہ کر لیا کہ سرمایہ داری کو ختم کر دیں اور اس کے بجائے ایسا نظام قائم کریں

جس میں ذرائع پیداوار افراد کی نہیں بلکہ تمام قوم کی ملکیت ہوں۔ پیدائش کی بنیاد ذاتی منفعت پر نہیں بلکہ ضرورت عامہ پر ہو۔

سرمایہ داروں کے سامنے ان حالات میں تین صورتیں تھیں۔ اول تو کچھ دے دلاکر مزدوروں کی تالیف قلوب کر لیتے اور اس طرح سے ان کو باغیانہ رویہ سے باز رکھتے۔ انیسویں صدی میں وہ اس اصول پر ایک حد تک عامل رہے اس لئے کہ اپنی نوآبادیوں کی لوٹ کے مکلف دسترخوان سے وہ چند سوکھے ٹکڑے مزدوروں کو بھیک دے سکتے تھے لیکن بیسویں صدی سے ان مقبوضات اور نوآبادیوں کی قومی تحریکوں اور صنعتی ترقیوں نے اس امر کو مشکل بنا دیا۔ اس کے علاوہ سرمایہ داروں نے یہ محسوس کیا کہ بین الاقوامی تجارتی مقابلہ میں کامیابی کی یہی صورت ہے کہ مزدوروں کو جتنی ہی کم اجرت دی جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ لیکن مزدور اس پر کب راضی تھے وہ لڑنے پر آمادہ ہو گئے اس وقت سرمایہ داروں کے سامنے دو طریق کار تھے یا تو وہ مزدوروں سے بغیر مقابلہ کئے ہوئے اپنے ہاتھ پاؤں ڈال دیتے اور اپنی تباہی کو قبول کرتے۔ لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔ اس لئے کہ کوئی جماعت بغیر قوت آزمائی کئے ہوئے اپنے مفاد کو نہیں چھوڑتی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ مزدوروں کی قوت بالکل ختم کر دی جائے کیونکہ یہی ان کے پہلو میں سب سے بڑا خار تھا۔

جرمنی۔ اٹلی اور آسٹریا کے سرمایہ داروں نے اسی اصول پر عمل کیا اور اپنی بقا کے لئے ایک ایسی مطلق العنان حکومت قائم کر دی جس کا مقصد مزدوروں کی طاقت کو فنا کر دینا تھا۔ اس استبدادی نظام کو ہم فسطائیت کہتے ہیں اور اس کی وجہ سے ممکن ہو گیا کہ سرمایہ داری کی بوسیدہ عمارت کچھ عرصہ کے لئے جبر وظلم کے کمزور ستونوں کے سہارے پر رک سکے۔ گویا کہ فسطائیت اس وقت وجود میں آئی جبکہ سرمایہ داری نظام اپنے خلقی نقائص۔ تضاد اور مزدوروں کے حملوں کی وجہ سے اپنی آخری سسکیاں لے رہا تھا۔ ہٹلر اور مسولینی نے آکر اس میں ذرا جان ڈال دی۔ آگے چل کر بتایا جائے گا کہ اشتراکی لیڈروں نے اپنی کمزوری۔ مصالحت پسندی اور غداری سے فسطائی تحریک کو کس قدر تقویت دی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے اور مزدوروں کی صحیح رہنمائی کرتے تو آج جرمنی اور اٹلی میں اشتراکیت

کا بول بالا ہوتا۔ لیکن ان کی حماقتوں سے سماجی انقلاب ناکامیاب ہوا اور اس کا جواب سرمایہ داروں نے فسطائیت سے دیا۔

اگر یورپ کے جنگ عظیم کے بعد کے واقعات پر ایک نظر دوڑائی جائے تو نہ صرف سرمایہ داری اور فسطائیت کے رشتہ پر روشنی پڑ سکتی ہے بلکہ یہ بھی ظاہر ہو سکتا ہے کہ فسطائیت کو جرمنی۔ آسٹریا اور اٹلی میں کیوں فتح ہوئی اور انگلستان اور فرانس میں کیوں نہ ہوئی۔ میں اس مضمون کی ابتدا میں فرانس اور انگلستان کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس وجہ سے اب میں اپنے کو جرمنی اور اٹلی ہی کے حالات تک محدود رکھوں گا جرمنی کو جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے جنگ عظیم میں شکست ہوئی۔ فاتح ملکوں نے اس کی تمام افریقہ کی نوآبادیوں کو آپس میں بانٹ لیا۔ یورپ میں الساس اور لورین Alsace and Lorraine جو کہ ۱۸۷۱ء سے اس کے قبضہ میں تھے۔ فرانس کو واپس دلا دئے گئے۔ اس پر کئی ارب پونڈ کا تاوان لگایا گیا، اور جب وہ دے نہ سکا تو ۱۹۲۳ء میں فرانس نے روہر Ruhr کی کوئلہ کی کانوں پر قبضہ کر لیا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے جرمنی کے معاشی نظام کی چولیں ہل گئیں۔ بین الاقوامی کساد بازاری کے اثرات یہاں اور ملکوں کے مقابلہ میں زیادہ شدید پڑے۔ اس لئے یہاں کے سرمایہ داروں کے سامنے اس کے سوا اور کیا چارہ تھا کہ وہ کسی ایسے نظام کو قائم کریں جو ان کی نوآبادیاں دلائے۔ جو جرمنی کو دنیا میں پھر ایک طاقتور ملک بنا دے اور جو سب سے زیادہ اہم بات تھی وہ یہ کہ وہ مزدوروں کی طاقت کو ختم کر دے۔

جرمنی میں مزدور بہت باشعور اور منظم تھے اور لڑائی کے بعد انھوں نے یہ تہیہ کر لیا کہ ان کو ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہیئے جو کہ واقعتاً ان کی حکومت ہو اور جو ان کے حقوق کی پاسبانی کر سکے۔ اسی وجہ سے انھوں نے ۱۹۱۸ء کا انقلاب کیا اس کے بعد ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۹ء میں پھر انھوں نے اشتراکی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے لیڈروں کی غداری کی وجہ سے یہ تحریکیں ناکامیاب رہیں۔ مگر اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ سوشل ڈیموکریٹ لیڈروں کا

۱؎ یہ جرمنی کی اشتراکی پارٹی تھی جس کی بنیاد کارل مارکس Karl Marx اور اینگلس Engels نے ڈالی تھی۔ بیسویں صدی کے اس میں رجعت پسندی آنا شروع ہو گئی اور ۱۹۱۴ء کی جنگ میں اپنے اصولوں کے خلاف قیصر Kaiser جرمنی کا ساتھ دیا۔ اس کے بعد اس نے کئی مرتبہ اشتراکی حکومت قائم کرنے کا موقع ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۲ء تک جرمنی میں اس کا اقتدار

اثر کم ہونے لگا اور مزدور کمیونسٹ پارٹی میں داخل ہونے لگے۔ سرمایہ دار یہ حالت دیکھ کر کب چین سے بیٹھ سکتے تھے۔ جب تک کہ اشتراکی پارٹی ان کے لئے مفید تھی انھوں نے اس کی اور مزدوروں کی رواداری کی۔ لیکن جب مزدور اس کی قیادت سے منکر ہونے لگے اور بغاوت کے علم بردار ہوئے تو وہ نانذیوں کے ذریعہ سے ان کو پسپا کرنے کی کوشش کرنے لگے اور اگر ہم جرمنی کی نانذی NAZI پارٹی کی تاریخ دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی نشوونما میں سرمایہ داروں نے کس قدر مدد دی ہے جب ۱۹۲۳ء میں ہٹلر نے بویریا Bavaria کی حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو لیوڈنڈارف Ludindorff نے جو جنگ عظیم میں سپہ سالار رہ چکا تھا اس کی سازش میں بڑا حصہ لیا۔ ڈیوک ولیم آف بویریا۔ Bavaria۔ ڈیوک آف برنزوک BRUNSWICK کروپس KRUPPS اور ماندس Monds وغیرہ جو کہ بہت زبردست سرمایہ دار تھے نانذیوں کی برابر مالی اور فوجی امداد کرتے رہے۔

اٹلی میں بھی فسطائیت انھیں وجوہات سے قائم ہوئی جیسے کہ جرمنی میں۔ اس وجہ سے یہاں پر اس کی توضیح کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ فرق ہے وہ مقامی حالات کی بنا پر ہے۔ جرمنی میں ہٹلر کی فتح ہوئی اس لئے کہ وہ ایک حد تک شکست خوردہ قوم کے جذبات کی نمائندگی کرتا تھا۔ لیکن مسولینی نے یہ نعرہ بلند کیا کہ اگرچہ اٹلی نے جنگ میں فتح پائی ہے لیکن صلح میں اس کو شکست ہوئی۔ اٹلی کو لندن کے پوشیدہ صلح نامے میں شہر فیوم اور علاقہ "ڈالمیشا" DOLMESIA کا وعدہ کیا گیا تھا۔ لیکن ورسائی .... کے صلح نامے میں انگلستان فرانس اور امریکہ نے اس کا ایفا نہ کیا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر مسولینی نے قومیت اور قومی عزت و اہمیت کے جذبات ابھار کر اپنی پارٹی کی قوت کو بہت بڑھا لیا۔ لیکن فسطائیت جرمنی اور اٹلی دونوں جگہوں میں سرمایہ داری اور اشتراکیت کی کشمکش کا نتیجہ تھی۔ سرمایہ داروں نے یہ محسوس کیا کہ اگر وہ مزدوروں کی طاقت

اور اثر رہا لیکن اس کی غفلت اور حماقتوں سے نانذی پارٹی ترقی کرتی رہی۔ ان حالات کو دیکھ کر ۱۹۱۰ء میں مزدوروں کے باشعور طبقے نے کمیونسٹ پارٹی (Communist Party) کی بنیاد ڈالی۔

کو برباد نہ کر دیں گے تو اشتراکیت کی فتح ہوگی۔ اسی لئے انھوں نے ایسی پارٹی کی جوان کی مطلب براری کرے بنیاد ڈالی۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ چونکہ اٹلی اور جرمنی میں سرمایہ دار بغیر مسولینی اور اٹلی کی رائے کے تصرف نہیں کر سکتے اور چونکہ ان ڈکٹیٹروں اور سرمایہ داروں میں کبھی کبھی داخلی اور خارجی پالیسی پر اختلاف ہو جاتا ہے اس لئے ان ملکوں میں سرمایہ داری نظام نہیں ہے۔ یہ رائے بالکل غلط ہے۔ جرمنی اور اٹلی میں ذرائع پیداوار افراد کے ہاتھ میں ہیں نہ کہ سماج کے اور پیدائش نجی فائدہ کے لئے کی جاتی ہے نہ کہ عوام کی ضروریات پوری کرنے کے لئے۔ یہ ضرور ہے کہ فسطائیت سرمایہ داروں پر پابندیاں عائد کرتی ہے لیکن یہ بھی ان کے فائدہ کے لئے۔ سرمایہ دار نوآبادیاں چاہتے ہیں جہاں سے ان کو کچا مال مل سکے اور اس کے بجائے اپنی مصنوعات بیچ سکیں۔ لیکن نوآبادیوں پر قبضہ کرنے کے لئے ایک زبردست مسلح فوج کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے سرمایہ پر بغیر ہٹلر اور مسولینی کی رائے کے تصرف نہیں کیا جاتا کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ جرمنی اور اٹلی کی دولت کا بیشتر حصہ اسلحات جنگ بنانے میں صرف کیا جائے اور یہی جرمنی اور اٹلی میں ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ عوام کے آرام و آسائش کے لئے روپیہ صرف کیا جائے فسطائی ایک تباہ کن جنگ کے لئے سامان بنانے میں مشغول ہیں۔ باوجود ان باتوں کے جرمنی اور اٹلی کے موجودہ حالات یہ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ وہاں سرمایہ داروں کی آمدنی برابر بڑھ رہی ہے لیکن مزدوروں کی اجرت برابر کم ہوتی جاتی ہے اور اسی وجہ سے ان کا معاشرتی معیار بھی گرتا جا رہا ہے۔

بعض لوگ شاید اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں کہ چونکہ انگلستان اور فرانس جیسے سرمایہ دار ملکوں میں جمہوریت ہے اس لئے فسطائیت اور سرمایہ داری میں یقیناً کوئی بنیادی فرق ہوگا۔ لیکن یہ تجزیہ غلط ہے۔ سرمایہ دار جمہوریت کا ڈھونگ اس وقت تک رچاتے ہیں جب تک کہ ان کے ذاتی مفاد معرض خطر میں نہ ہوں۔ وہ اعتراضات اور تنقیدات سے نہیں گھبراتے لیکن جب اپنی حالت کو خطرے میں پاتے ہیں تو استبدادیت قائم کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ مزدور

سبھائیں توڑ دی جاتی ہیں۔ چناؤ بالکل ایک رسمی چیز ہو کر رہ جاتا ہے۔ قانون ساز جماعتیں برائے نام قائم رہتی ہیں اور آزادی خیال وبیان پر طرح طرح کی سختیاں اور پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں۔
لیکن یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر جرمنی اور اٹلی کے عوام ان مظالم کو کیوں برداشت کرتے ہیں اس کا جواب تو یہ ہے کہ فسطائی مزدوروں کے باشعور طبقہ کو جبر وتشدد سے دبائے رکھتے ہیں کیونکہ وہ ان کی چالوں کو پہچانتے ہیں۔ دوسروں کے لئے جن میں سیاسی بیداری کم ہے اور جو حالات کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے سرمایہ داروں کے فسطائی ایجنٹ ان کو راضی رکھنے کے لئے نئے نئے جذباتی اور دل خوش کن نظریئے ایجاد کرتے ہیں۔ کبھی ان کو سوشلسٹ، کمیونسٹ اور یہودی کی نفرت کا نشہ پلایا جاتا ہے تاکہ اس میں وہ اتنے مخمور ہو جائیں کہ اپنی پریشان حالی کا احساس نہ کرسکیں اور کبھی اسی لئے ان کی توجہ بیرونی فتوحات کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے۔
اٹلی اور جرمنی میں سرمایہ داری نے اپنی بقا کے لئے یہی طریقے اختیار کئے۔ انگلستان میں جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے استبدادی نظام کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی لیکن جتنا ہی اس کا معاشی نظام کمزور ہوتا جارہا ہے اتنا ہی وہاں فسطائی رجحان بڑھتا جارہا ہے۔

ہندوستان اور بین الاقوامی تجارت

(از جناب ریاض الحسن صاحب)

یورپ کے دور جدید کی تاریخ میں دو چیزیں صاف طور پر نظر آتی ہیں۔ ایک تو قومی ریاستوں کا تصور اور ان کا قیام، اور دوسرے صنعتی انقلاب۔ موجودہ زمانے کی قومیت کا نظریہ ہم کو انھیں قومی ریاستوں کی ترقی اور بقا کی کوششوں میں ملتا ہے۔ قومیت کی تعریف مختلف لوگوں نے مختلف طریقوں سے کی ہے لیکن عام تعریف یہ کی جاتی ہے کہ قومیت ایک خاص جغرافیائی حد بندی کے اندر اس خطہ کے لوگوں کا آپس میں خیال و عمل کی یکسانی اور یک رنگی پیدا کرتا ہے۔ اس یکسانی سے جو ریاست بنے گی وہ قومی ریاست ہوگی اور وہ اپنی حدود کے اندر کامل طور پر خود مختار ہوگی۔

انقلاب فرانس کے زمانہ میں جب بد نظمی پھیلی تو نپولین نے بڑی ہوشیاری سے تمام قوتوں کو سمیٹ کر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر کچھ دنوں کے بعد فرانس کے تخت پر قبضہ کر بیٹھا۔ اس زمانے میں اس کی برابر یہ کوشش رہی کہ فرانس کی کھوئی ہوئی طاقت کو از سر نو حاصل کیا جائے اور یورپ پر فرانس کا سکہ دوبارہ بٹھایا جائے۔ نپولین کے اس فعل سے یورپ کی دوسری قوموں میں غم و غصہ کا جذبہ بھڑک اٹھا اور وہ لوگ جوابی کارروائی پر تیار ہو گئے۔ منجملہ اور کئی چیزوں کے، اس جوابی کارروائی نے بعد کو قومیت کا رنگ پکڑا جس سے آپس میں دشمنی اور رقابت کی آگ اور تیز ہو گئی۔ یہ اسی کا کرشمہ تھا کہ اٹلی نے اپنے منتشر شیرازہ کو یکجا کرنا شروع کیا اور مختلف چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ کر آخر کار ایک قومی ریاست کی بنیاد ڈالی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جرمنی میں ایک نیا فلسفہ تعلیم رائج ہوا جس سے جرمنی کی مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ملا کر جرمنی قوم کی یک رنگی اور وحدت پر زور دیا جانے لگا۔ ساتھ ہی وہ تمام تدبیریں سوچی جانے لگیں جو ان کا وٹوں کو ہٹا کر ایک واحد جرمن قوم کے بننے میں مدد دیں۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں انگلستان سے ایک دوسرے قسم کے انقلاب کی لہر اٹھی جو قومیت

کی طرح رفتہ رفتہ یورپ کے تمام ملکوں پر کم و بیش پھیل گئی۔ یہ صنعتی انقلاب کی لہر تھی جس نے سماج کے بہت سے پرانے بندھنوں کو توڑ دیا اور بہت سے نئے رشتے پیدا کر دیے۔ بھاپ سے چلنے والا انجن ایجاد ہوا۔ پھر اس کی مدد سے بہت سے پتلی گھر بن گئے۔ لوہے کے بڑے بڑے کارخانے کھلے اور ریل اور جہاز خشکی اور پانی پر سفر کرنے لگے۔ کھیتوں میں کام کرنے والے کسان جو اپنا بیکار وقت چوپالوں میں بیٹھ کر کھیل تماشا یا گپوں میں گزارتے تھے رفتہ رفتہ مزدور بن گئے اور کارخانہ کی سیٹی اور انجن کی بھک بھک کے منتظر رہنے لگے۔ ان نئے نئے طریقوں سے دولت کی پیدائش میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔

انیسویں صدی میں ساٹھ ستر سال کے اندر یہ صنعتی انقلاب انگلستان سے نکل کر براعظم یورپ پر اپنا اثر دکھانے لگا۔ سنہ ۱۸۳۰ء کے بعد فرانس میں ریلوں کا جال بچھنا شروع ہوا اور لوہے اور دوسری مصنوعات کے کارخانے کھلنے لگے۔ سنہ ۱۸۵۰ء کے بعد جرمنی اسی راستہ پر چلنے لگا اور اس صدی کے آخر میں تو روس اور جاپان بھی اسی صف میں شامل ہو گئے۔ جس طرح انقلاب فرانس اور نپولین کی بڑھتی ہوئی طاقت نے یورپ میں قومیت کی روح کو ابھارا تھا اسی طرح انگلستان سے جو صنعتی انقلاب کی لہر اٹھی اس نے قومیت کو معاشی رنگ میں رنگ دیا۔ قومیت نے جب صنعتی ترقی کا لبادہ اوڑھا تو وہ لوگ جو جنگ کے وقت پرانے قسم کے ہتھیاروں سے مسلح ہوتے تھے اب عمدہ قسم کی توپوں، بندوقوں، بموں اور دیگر آلات جنگ کا استعمال کرنے لگے۔ اس ہنگامے سے قوموں میں جو نفسی نفسی کی کیفیت پہلے سے پیدا ہو گئی تھی اس کو تقویت پہنچی اور ہر ملک کے پیش نظر بس یہی خیال تھا کہ لڑائی کے وقت بچاؤ کی بہترین ترکیب کیا ہوگی، اور وہ کون ساحربہ ہوگا جس سے دشمن کو زیر کر کے قومی وقار کو بڑھایا جاسکتا ہے۔ صنعتی انقلاب نے لوہے کے بڑے بڑے کارخانوں کے قائم کرنے، مصنوعات کو فروغ دینے اور آلات جنگ کے سستے اور بڑی تعداد میں بنانے کا راستہ دکھایا۔ فرانس اور جرمنی نے اس انقلاب سے فائدہ اٹھا کر ایک دوسرے کو زک دینے کی پوری کوشش کی۔

سائنس کی ترقی نے صنعت کی دنیا میں جو انقلاب پیدا کیا تھا اس کا اثر زراعت پر بھی پڑا۔ اول

تو وسائل آمد و رفت کی ترقی سے جو غلہ پہلے دوسرے ملکوں سے نہ آسکتا تھا وہ اب یورپ کی منڈیوں میں آکر بکنے لگا۔ دوم سائنس کی مدد سے کھیتوں کی پیداوار میں بھی اضافہ ہوا۔ زمین نے اپنی دولت اگلنی شروع کر دی۔ اس سے بعض ملکوں میں غلہ اور بعض میں مصنوعات کی کثرت نظر آنے لگی۔ شروع کے پچاس برسوں میں تو یورپ کے ملکوں میں تجارت کی خوب گرم بازاری رہی۔ جہاں جہاں مقامی محصول یا چنگی تھی وہ اٹھادی گئی۔ اور بڑے بڑے ملکوں کے درمیان تجارت کو بڑھانے اور درآمد پر محصول کو گھٹانے کے لئے معاہدے بھی ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض ملک بالکل صنعتی بننے لگے اور بعض بالکل زراعت پیشہ۔ چنانچہ انگلستان میں کھیتی باڑی کا کام تقریباً ختم ہو گیا اور لوگ کارخانوں میں کام کرنے لگے۔ برطانوی مصنوعات کی دنیا میں مانگ بڑھی کیونکہ اس وقت برطانیہ ہی صنعتی زندگی کی دوڑ میں سب سے آگے تھا۔ گو امریکہ میں کسی قدر پابندیاں تھیں مگر دنیا کے بازار برطانیہ کے کارخانہ داروں کے واسطے کھلے ہوئے تھے۔ یہ لوگ سستی سے سستی کچی پیداوار خریدتے اور پھر ان کو کارخانوں میں بنا کر نفع کے ساتھ بیچ دیتے۔ یہ گویا آزاد تجارت کا اصول تھا جس کی رو سے جو چیز جہاں سستی سے سستی ملے وہاں سے لی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد تجارت کا یہ طریقہ اس صورت میں کہ لوگوں کے دل ایک دوسرے سے صاف ہوں اور قومی و نسلی منافرت اور کمزور ملکوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی خواہش نہ ہو بہت اچھا ہے مگر اس کو کیا کیجئے کہ یہ بیماری انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

آزاد تجارت سے فائدہ بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی۔ فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ جو ملک پکی چیزیں نہیں پیدا کر سکتے ان کو پکی چیزیں سستی مل جاتی ہیں۔ پکی چیزیں پیدا کرنے والے ملکوں کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں بڑے بڑے کارخانے کھل جاتے ہیں اور ان میں وہ حسب ضرورت سامان جنگ بھی تیار کر سکتے ہیں۔ اس سے دوسری قوموں پر ان کا اثر و رعب قائم ہوتا ہے اور لوگ ان سے ڈرتے ہیں۔ نقصان یہ ہوتا ہے کہ کچی پیداوار والے ملک بے بس ہو جاتے ہیں اور کسی آفت کے وقت بجائے اپنی طاقت کے دوسروں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اسی طرح جنگ کے وقت جب آمد و رفت کا سلسلہ کٹ جاتا ہے تو صنعتی ملک والوں کو بھی فاقہ کشی کا خطرہ ہوتا ہے۔

آزاد تجارت کا اصول تمام دنیا کو ایک بڑی منڈی تصور کرتا ہے اور کسی قسم کی انسانی پابندی کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اس طرز کا سب سے بڑا مفکر انگلستان کا مشہور معاشی آدم اسمتھ گزرا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ذاتی طور پر ہر شخص اپنا نفع نقصان پہچانتا ہے اس لئے ہر شخص کو آزاد چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ جس طرح چاہے نفع کی خاطر تجارت کرے۔ اس صورت میں مقابلہ سخت تو ہوگا لیکن نفع وہی کمائے گا جو اچھے سامان پیدا کرے گا۔ سوائے خاص خاص موقعوں کے ریاست کو آزاد تجارت میں کبھی دخل نہ دینا چاہئے کیونکہ دخل اندازی سے دولت کی پیدائش میں جو تجارت کا عین مقصد ہے، کمی ہوتی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے معاشیات کے ماہروں نے اس نظریہ سے اختلاف کیا ہے۔ ان میں سب سے مشہور جرمنی کا معاشی فریڈرک لسٹ (FREDERICK LIST) ہے۔ لسٹ کا خیال ہے کہ ہر قسم کی معاشی تحریک کو اول ملک اور قوم سے وابستہ ہونا چاہیئے اور اس کا مقصد بجائے دولت کی افزائش کے ملک اور قوم کی ترقی ہونا چاہیئے آدم اسمتھ کی طرح وہ بھی آزاد تجارت کا قائل ہے مگر کہتا ہے کہ آزاد تجارت اس وقت ہو جب تمام ملکوں میں مقابلہ کی طاقت یکساں طور پر پیدا ہو جائے۔ اگر ایک ملک قدرتاً کمزور ہے اور اس میں معاشی ذرائع کم ہیں تو وہ مضبوط اور معاشی ذرائع رکھنے والے ملک کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکے گا۔ اور تباہ ہو جائے گا۔ اس کمزوری کو دور کرنے کے لئے وہ بیرونی تجارت پر پابندی عائد کرنے کے حق میں ہے تاکہ اس پابندی کے سایہ میں ملک معاشی ترقی کر سکے اور جب کمزوری دور ہو جائے تو آزاد تجارت قائم ہو جائے۔ آدم اسمتھ اور لسٹ میں فرق یہ ہے کہ آدم اسمتھ تمام دنیا کو ایک ہی تجارتی حلقہ شمار کرتا ہے اور مضبوط اور کمزور ملکوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا ہے۔ برخلاف اس کے لسٹ قوموں کی معاشی ترقی کی بنیاد ان کی ذاتی حیثیت اور ان کی مخصوص ملکی کیفیت پر رکھتا ہے تاکہ جب سب قومیں اپنی اپنی جگہ ترقی کریں تو ان میں اتحاد ہو سکے۔

لسٹ نے اپنی کتاب "علم المعیشت کا قومی نظام" ۱۸۴۱ء میں شائع کی اور تھوڑے دنوں بعد جرمنی کو اس کی صداقت کا احساس ہونے لگا۔ انیسویں صدی کے وسط میں جب

یورپ میں غلہ سستا ہونے لگا تو جو ملک غلہ سستا نہیں پیدا کر سکتے تھے ان کو بڑی آفت کا سامنا کرنا پڑا۔ کسان بھوکوں مرنے لگے۔ کھیت ویران ہو گئے کیونکہ بازار میں دام کم ہو جانے سے کسان کھیتی چھوڑ کر دوسرے پیشوں میں لگ گئے۔ ان کسانوں کی روزی کا معاملہ بہت سخت تھا خاص کر ان ملکوں کے لئے تو اور بھی سخت تھا جہاں فوجی بھرتی کا دارومدار کسانوں پر تھا۔ جرمنی اور فرانس مدتوں سے ایک دوسرے کے حریف چلے آتے تھے اور ان کی فوجوں میں سپاہی بھی کسانوں کے لڑکے ہوتے تھے اس لئے یہ دونوں ملک کسی طرح بھی آزاد تجارت پر چل کر کسانوں کی تباہی برداشت نہیں کر سکتے تھے چنانچہ آزاد تجارت کو ختم کرنے کے لئے پہلا قدم جرمنی نے اٹھایا اور یہ قدم جیسا کہ ظاہر ہے محض معاشی غرض سے نہیں اٹھایا گیا تھا بلکہ اس میں فوجی اور سیاسی غرض بھی چھپی ہوئی تھی۔ یہ گویا معاشی قومیت کی ابتدا تھی۔ سنئے ذوق کے ایک شعر میں عشق اور تجارت کو کس طرح نبھایا گیا ہے۔ کہتے ہیں[۵]

اس نے جب مال بہت رد و بدل میں مارا ہم نے دل اپنا اٹھا اپنی بغل میں مارا

تجارت میں نقصان کا افسوس اور پھر دل کو بازار سے اٹھا لینا کیا چیز ہے؟ ذوق کا یہ فعل بالکل معاشی قومیت ہی کے انداز میں تو ہے جس کا اشارہ انھوں نے اس شعر میں کیا ہے۔

بیرونی تجارت پر محصول لگا کر پابندی عائد کی جاتی ہے۔ یہ محصول دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک محصول تو وہ ہوتا ہے جو صرف ملک کے بجٹ میں آمدنی بڑھانے کے لئے لگایا جاتا ہے۔ اس کی شرح بہت معمولی ہوتی ہے۔ دوسرا محصول وہ ہوتا ہے جو ملک میں صنعت و حرفت کو ترقی دینے اور نئی نئی صنعتوں کو قائم کرنے کے لئے لگایا جاتا ہے۔ اس کی شرح بہت زیادہ ہوتی ہے اور بعض حالتوں میں تو سو فی صدی سے بھی اوپر جاتی ہے تاکہ کسی خاص چیز کا داخلہ ملک میں رفتہ رفتہ کم ہو جائے۔ فرانس اور جرمنی کی ۱۸۷۰ء والی لڑائی نے دونوں ملکوں میں فولاد کے کارخانوں کی اہمیت بہت بڑھا دی اور ان کارخانوں کی ترقی کے ذریعے سوچے جانے لگے ۱۸۷۹ء میں جرمنی میں پہلے پہل بسمارک کی تحریک سے ایک نیا قانون منظور ہوا جس کی رو سے باہر سے آنے والے غلہ اور تمام سامان تجارت پر محصول لگا دیا گیا۔ دو برس بعد فرانس میں بھی ایسا ہی محصول جاری

ہوا یہ سلسلہ یہاں تک چلا کہ ۱۹۰۱ء تک سوائے انگلستان کے یورپ کے تمام بڑے بڑے ملکوں نے درآمد پر حفاظتی محصول لگاکر آزاد تجارت کو ختم کر دیا۔ انگلستان جو آزاد تجارت کا قلعہ سمجھا جاتا تھا وہاں بھی تحریک ہوئی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۱۴ء تک کا زمانہ یورپ کی تاریخ میں سیاسی سازشوں اور خفیہ ریشہ دوانیوں کا زمانہ ہے۔ اس دور میں تقریباً ہر ملک کی یہی کوشش رہی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے قومی وقار اور جنگی قوت کو بڑھائے اور دنیا کے بازاروں پر قبضہ حاصل کر کے اپنی دولت میں اضافہ کرے۔ اس کوشش نے پرانی رقابتوں کو خوب بھڑکایا جس کا نتیجہ جنگ عظیم کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جنگ عظیم نے رہی سہی آزاد تجارت کو ختم کر دیا جنگ کے زمانہ میں تمام ملکوں نے اپنی پرانی صنعتوں کو ترقی دی اور بعض نئی صنعتیں قائم کیں۔ جنگ کے بعد اپنی ترقی یافتہ صنعتوں کی حفاظت کے لئے ہر ملک میں محصول درآمد پر اضافہ ہونے لگا۔ ۱۹۱۹ء کے بعد سے تو دنیا میں ہر طرف حفاظتی محصولوں کی اونچی اونچی دیواریں نظر آتی ہیں جنھوں نے تجارت کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔ خود برطانیہ میں ۱۹۲۲ء میں قانون تحفظ صنعت منظور ہوا لیکن اس تجارت کی بندش سے دنیا کے لوگ تنگ آ گئے مگر کوئی ملک پہلے محصول کم کرنے کو تیار نہ تھا بہرحال اس حالت کو دور کرنے کے لئے ۱۹۲۷ء میں دنیا کی ایک معاشی کانفرنس ہوئی مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی۔ ابھی یہی گومگو کا عالم تھا کہ ۱۹۲۹ء میں معاشی بدحالی کا دور شروع ہو گیا۔ اس کی وجہ سے حفاظتی محصولوں میں اور بھی اضافہ کیا گیا۔ آج دنیا کی یہ حالت ہے کہ ہر ملک ایک تجارتی حصار کے اندر بند ہے البتہ کہیں کہیں چند ملک آپس میں تجارتی معاہدہ کر لیتے ہیں اور ایک دوسرے کے مال پر رعایتیں کرتے ہیں۔ اس سے محصول میں کمی تو ضرور ہوئی مگر برائے نام۔ ان حالات کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا میں آزاد تجارت کا دور شاید اب ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

یہ تو آپ نے دنیا کی تجارت کا حال سنا۔ اب ذرا ہندوستان کی بیرونی تجارت کا حال سنئے۔

۱۸۵۸ء میں ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی سے نکل کر برطانوی حکومت کے قبضہ میں آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ انگلستان میں ہر طرف آزاد تجارت کا دور دورہ تھا۔ چنانچہ اس کا اثر ہندوستان کی

تجارت پر بھی پڑا۔ ۱۸۵۸ء سے پہلے ہندوستان کی بیرونی تجارت آزاد تھی البتہ بعض چیزوں پر برائے نام محصول آمدنی کے لئے لگا دیا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں حکومت کو کافی رقم خرچ کرنا پڑی بجٹ کی اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ۱۸۵۹ء میں سوتی کپڑوں پر محصول درآمد ۵ فی صدی سے بڑھاکر ۱۰ فی صدی کردیا گیا لیکن تین برس بعد یہ گھٹا کر پھر ۵ فی صدی کر دیا گیا۔ ۱۸۸۲ء میں یہ ۵ فی صدی محصول بھی اٹھا دیا گیا اور برائے نام محصول نمک، شراب، اسلحہ اور افیون پر رہ گیا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد برما میں لڑائی چھڑ گئی اور سرحد پر بھی فوج کشی ہوئی جس سے حکومت کو کافی خرچ برداشت کرنا پڑا اور روپیہ سال بہ سال بڑھتا گیا تا آنکہ ۱۸۹۴ء کے بجٹ میں ۳½ کروڑ کا گھاٹا ہوا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے حکومت نے سوائے سوتی کپڑوں کے تمام اشیاء درآمد پر ۵ فی صدی کا عام محصول لگا دیا لیکن جب اس سے بھی کام نہ چلا تو سوتی کپڑے پر بھی ۵ فی صدی محصول لگانا پڑا مگر حکومت نے ساتھ ہی دیسی ملوں کے مال پر بھی ۵ فی صدی کا ٹیکس لگایا جو دو برس بعد گھٹا کر ۳½ فی صدی کر دیا گیا یہ صورت جنگ عظیم تک جاری رہی۔ جنگ کے زمانہ میں بیرونی وسائل آمد و رفت کے کم ہو جانے سے ہندوستانی صنعت و حرفت کو کافی ترقی ہوئی۔ بہت سی نئی نئی صنعتیں کھل گئیں اور پرانی صنعتیں چمک اٹھیں۔ کارخانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں عام محصول درآمد کی شرح بڑھا ۷½ فی صدی کر دی گئی اور چھ برس بعد جب مزید آمدنی کی ضرورت ہوئی تو یہ شرح ۱۵ تک پہنچ گئی۔

اب تک ہندوستان آزاد تجارت کے اصول پر چلتا رہا۔ مگر جنگ نے جو سبق دیا اس سے معلوم ہوا کہ صنعت کی ترقی ازبس ضروری ہے۔ ۱۹۲۱ء میں حکومت نے انڈین فسکل کمیشن مقرر کیا اور اس سے ہندوستانی صنعت، تجارت اور اس کی حفاظت کے لئے رائے طلب کی۔ کمیشن نے بیرونی تجارت کو محفوظ اور محصول درآمد میں موثر اضافہ کا مشورہ دیا اور بتایا کہ ایک ٹیرف بورڈ قائم کیا جائے جس کا فرض یہ ہو کہ وہ ہر اس صنعت کی تحقیقات کرے جس کو محفوظ کرنے کا مطالبہ کیا جائے اگر تحقیقات کے بعد ثابت ہو جائے کہ فلاں صنعت کو حفاظت کی ضرورت ہے تو ٹیرف بورڈ کی سفارش پر حکومت محصول بڑھا دے۔ حکومت نے کمیشن کی رپورٹ منظور کر لی۔ اب ہندوستان گویا آزاد

تجارت سے نکل کر محفوظ تجارت کے اصول پر چل رہا ہے۔

اس کمیشن کی سفارش کے مطابق جو ٹیرف بورڈ بنا اس کے سامنے لوہے، فولاد، روئی، شیشہ اور شکر وغیرہ کے کارخانوں کی تحقیقات اور ان کو محفوظ کرنے کے مطالبے ہوئے۔ تحقیقات کے بعد اس قسم کی باہر سے آنے والی چیزوں پر محصول بڑھا دیئے گئے۔ اس کی وجہ سے تمام صنعتوں کو ترقی ہوئی خصوصاً شکر سازی نے تو بہت ترقی کی کروڑوں روپے کے بجائے اب صرف ساٹھ ستر ہزار کی باہر سے آتی ہے اور ملک اپنی ضرورت آپ پوری کرلیتا ہے اسی طرح لوہے اور فولاد کے کارخانوں میں کافی ترقی ہوئی۔ روئی کے کارخانوں کو تو کچھ لڑائی سے فائدہ ہوا اور کچھ حفاظتی محصول سے۔ آج کوئی ۴۰۰ سے اوپر ملیں چل رہی ہیں جو ساٹھ فی صدی سے زیادہ ہندوستان کی ضرورتوں کو پورا کرلی ہیں۔ لیکن صنعت کی ترقی میں ایک چیز کا ذکر بہت ضروری ہے۔ اور وہ ہماری سودیشی تحریک ہے اس تحریک نے لوگوں کے رحجان میں ایک انقلاب پیدا کردیا۔ دیسی کپڑے اور دیسی چیزوں کا استعمال بڑھ گیا جس سے ملکی صنعت کو بہت فروغ ہوا۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ۱۹۲۹ء کی معاشی بدحالی نے بین الاقوامی تجارت کو بہت نقصان پہونچایا۔ اس نقصان کو کم کرنے کے لئے ۱۹۳۲ء میں برطانیہ نے اوٹاوا میں ایک تجارتی معاہدہ مرتب کیا جس میں ہندوستان، برطانیہ اور برطانوی نوآبادیاں شریک تھے۔ اس معاہدہ کا مطلب یہ تھا کہ برطانیہ اور برطانوی شاہنشاہی کے تابع جو ملک ہیں ان کی آپس کی تجارت کو بڑھایا جائے مثلاً اجنبی ملکوں سے مال کے مقابلہ میں ان ملکوں میں ایک دوسرے کا مال کم محصول پر داخل ہو سکے گا۔ اس رعایت سے بعض ملکوں کی تجارت کو کسی قدر فائدہ ضرور ہوا۔ ہندوستان میں اس معاہدہ کی رو سے برطانوی مال کم محصول پر آتا ہے اور اسی طرح ہندوستان کے مال کو انگلستان میں بہ نسبت غیر ملکوں کے ترجیح دی جاتی ہے۔ ہندوستان کے محصول درآمد پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر شرح ۱۵ فی صدی سے شروع ہو کر ۵۰ فی صدی تک پہنچتی ہے۔ اوٹاوا کا عہدنامہ اسمبلی نے رد کردیا اور اب علیحدہ علیحدہ دوسرے ملکوں سے تجارتی معاہدہ کرنے کی رسم پڑ چکی ہے

جاپان سے ایک معاہدہ ہو چکا ہے اب انگلستان سے گفت وشنید ہو رہی ہے۔

آپ نے ہندوستان اور یورپ کی تجارتی واقعات کی ایک مختصر روداد سن لی۔ آج دنیا میں چیزوں کی کمی نہیں۔ اگر تجارت پر سے پابندیاں اٹھالی جائیں اور لوگ انسانوں کی طرح برتاؤ کرنے لگیں تو دنیا کی کتنی آفتیں کم ہو جائیں مگر دنیا کا مرض بڑی حد تک سیاسی ہے اور جب تک سیاسی گتھی نہ سلجھ جائے معاشی سکون وآرام محال ہے۔

حکومت اور تعلیم

(از جناب سید وقار عظیم صاحب الہ آباد)

کسی ملک یا قوم کی تعلیم پر عموماً تین چیزوں کا اثر پڑتا ہے۔ اس ملک کی اقتصادی حالت، اس کی سوسائٹی (جس کے وسیع مفہوم میں مذہبی جماعتیں، سیاسی تحریکیں اور خود حکومت سب چیزیں شامل ہیں) اور تیسرے وہاں کا کلچر۔ اقتصادی حالت اور ضرورت کے مطابق مختلف قسم کے مدرسے قائم کئے جاتے ہیں، ان کے درس، ان کا انتظام، ان کے مدرس، اور ان کا سامان، سب چیزیں ایسی ہیں جن پر مالی حالت کا نمایاں اثر پڑتا ہے۔ سوسائٹی، اس سے بھی زیادہ گہرا اثر ڈالتی ہے۔ مذہب جو کچھ چاہتا ہے، سیاسی تحریکیں جس چیز کی طالب ہوتی ہیں اور سب سے زیادہ یہ کہ خود حکومت جو کچھ پسند کرتی ہے، تعلیم کے ذریعہ سے وہی بچوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ اور انھیں ان خارجی اثرات کے رنگ میں ڈبو کر زمانہ کے مطابق نئی نئی شکلوں میں بدل دیا جاتا ہے۔ ہاں کلچر، تو حقیقت میں تعلیم پر سب سے نمایاں اثر اسی کا ہونا چاہیئے۔ ملک کی قدیم روایات، گذری ہوئی نسلوں کے جمع کئے ہوئے بیش بہا تجربے، ان کے خیالات کے انمول خزانے، ادب، تاریخ، فلسفہ، طرز معاشرت، رفتار و گفتار کے طریقے، اچھائیوں اور برائیوں کا معیار، ان سب چیزوں کی گہری رنگ آمیزی، ملک اور قوم کے تعلیمی نصاب اور نظام پر ہونی چاہیئے، اس لئے کہ پہلی دو چیزیں خارجی ہیں اور تیسری داخلی۔ داخلی اثرات زیادہ دیرپا، مستحکم اور مضبوط ہوتے ہیں اور ان کے زیر اثر آنے والا آدمی، ان سے مستقل طور پر متاثر ہوتا ہے۔

یہ بات محسوس سب نے کی لیکن اس پر جس طرح عمل ہونا چاہیئے تھا، نہیں ہوا۔ اور قریب قریب ہر زمانہ میں تعلیم پر جس چیز کا سب سے زیادہ اثر رہا، وہ حکومت تھی۔ چونکہ حکومت، بظاہر ان تینوں چیزوں کے مقابلہ میں زیادہ طاقت ور ہے۔ اس لئے اس نے اپنی ضرورتوں کو پیش نظر

رکھ کر تعلیم کے نصاب و نظام مرتب و مقرر کئے اور باقی اثرات غیر محسوس طریقے پر پس پشت پڑ گئے نپولین کو تعلیم کی قوت کا احساس تھا جب اس نے کہا کہ ایک تعلیمی جماعت قائم کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ ملک کے سیاسی اور اخلاقی تخیل کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں آجائے۔" اور یہی احساس تھا، جس نے دنیا کے ہر ملک میں حکمرانوں کی رہبری کی انھوں نے اپنے اپنے مقصد کے مطابق تعلیم کے نظرئے بنائے انھیں رائج کر کے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنایا اور اس طرح اپنی سلطنتوں کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم بنالیں۔ چین اور یونان میں مذہبی پیشواؤں اور خاندان کے بزرگوں کا دور دورہ تھا اس لئے تعلیم نے اس بات پر زور دیا کہ دیوتاؤں اور گھر کے بڑے بوڑھوں کی پرستش کی جائے۔

یورپ میں مذہب کا دور دورہ ہوا تو تعلیم کا مقصد صرف یہ رہ گیا کہ لوگوں کو مذہب اور اس کی تبلیغ کے لئے زیادہ سے زیادہ کام کا بنایا جائے۔ انگلستان کے موجودہ دور سے پہلے تعلیم کی مدد سے قوم کے بچوں کو زیادہ مہذب اور سوشل بنانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ باہر سب کچھ اور اندر کچھ نہیں۔ اسی طرح امریکہ اور جاپان کو لیجئے۔ جاپان نے تعلیم کی مدد سے اپنی قومی عظمت بڑھانے کی کوشش کی۔ امریکہ نے اس سے قومی اتحاد و اتفاق کا سبق پڑھانا چاہا۔ غرض یہ کہ ہر ملک اور ہر قوم کے سامنے ہمیشہ سے مختلف مقاصد رہے اور ان سب کے حاصل کرنے میں ہر ایک نے تعلیم ہی سے سب سے زیادہ مدد لی۔

لیکن جوں جوں تہذیب اور تمدن میں زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں، حکومت اور تعلیم کا رشتہ بھی زیادہ پیچیدہ اور اہم ہوتا جا رہا ہے۔ آزادی اور احساس کی ایک لہر ساری انسانی دنیا پر دوڑتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے اور اس لئے ہر ملک اور ہر قوم میں ہزاروں نئی نئی تحریکات پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ ایک تحریک دوسری پر غالب ہونا چاہتی ہے ایک قوت دوسری کو دبانا چاہتی ہے اور ان میں سے ہر ایک کا مقصد ہے کہ اس کا پروگرام اور لائحہ عمل دنیا میں سب سے آگے رہے، وہ امام ہو اور دوسرے مقتدی۔ وہ رہبر ہو اور دوسرے رہرو۔ اس لئے اس کشمکش کے زمانہ میں کسی ایسی طاقت کی ضرورت ہے جو ان سب پر غالب ہو۔ جس کے سامنے سب بظاہر اپنی اپنی راہوں

پر چلتے ہوئے معلوم ہوں، لیکن کوئی کسی دوسرے کے راستے میں رکاوٹ نہ پیدا کرے اور ایک وقت ایسا آئے کہ سب کے سب جا کر ایک مرکز پر مل جائیں۔ راستے مختلف، لیکن منزل سب کی ایک۔ ان مختلف قوتوں کو یکجا کرنے والی سب سے بڑی قوت حکومت ہے۔ لیکن حکومت بھی مجبور ہے۔ صرف اس کی موجودگی، مخالف قوتوں کو ایک جگہ نہیں جمع کر سکتی۔ صرف اس کا ہونا ہی اسے سب سے بڑا نہیں بنا سکتا۔ اسے ضرورت ہے کسی ایسی سحر آفریں کشش کی جس کی مدد سے وہ سب کو اپنی طرف کھینچ لے۔ زور اور طاقت کا زمانہ ختم ہو چکا۔ اب اگر اس سے کام لیا جا سکتا ہے تو صرف اسی حالت میں جب دنیا غافل ہو۔ سوتے ہوؤں کو مار دینا آسان ہے، لیکن جاگتے ہوؤں کی طرف قدم بڑھانا بھی دشوار۔ دنیا اب بیدار ہے، اس لئے جب کوئی حکومت صرف زور اور طاقت سے کام لینا چاہتی ہے تو پہلے فضا کو خمار آلود بنا دیتی ہے۔ لوگ اس نشے میں ڈوب کر غافل ہو جاتے ہیں اور ظالم کا داؤں چل جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ کوئی حکومت خواہ وہ نرمی سے رعایا کو اپنا ہم خیال بنانا چاہے، خواہ سختی سے بغیر کسی بیرونی مدد کے ایسا نہیں کر سکتی۔ اور یہ مدد جتنی زیادہ تعلیم سے مل سکتی ہے کسی اور چیز سے نہیں مل سکتی۔ اس نے نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا کو پیچیدہ نظام کو ضرورت ہے ایک زبردست طاقت کی جو مخالف قوتوں کو ابھرنے کا موقع نہ دے، اور یہ زبردست طاقت ہے، حکومت اور دوسری طرف حکومت کو ضرورت ہے کسی ایسے آلے کی جس کی مدد سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے۔ یہ آلہ ہے تعلیم دنیا حکومت کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی اور حکومت تعلیم کے بغیر۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حکومت، تعلیم کے ذریعہ سے کسی محدود ذاتی مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس کا سوال ہی نہیں باقی رہا۔ کسی مقصد کو محدود اور ذاتی ہونے کے باوجود بھی کافی وسیع ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ دنیا کی رفتار بہت تیز ہے اور جو ملک یا قوم اس تیزی سے بڑھتی ہوئی دنیا کے ساتھ نہیں چل سکتا، اسے دوسری قومیں کچلتی اور پامال کرتی ہوئی آگے نکل جاتی ہیں، کسی کو مڑ کر دیکھنے کی فرصت نہیں۔ ہر شخص کو خود اپنی حالت سنبھالنی مشکل ہے، پھر بھلا کسی دوسرے کی مدد کے کیا معنی۔ اس لئے اس مقابلہ کی دنیا میں ہر قوم کو اپنے ذاتی مقاصد کو بھی

اس حد تک وسیع بنانا پڑتا ہے کہ وہ قومی وقار اور عظمت کی ترقی میں زیادہ سے زیادہ مدد دے سکیں۔ مثال کے لئے جاپان، جرمنی، ترکی، اٹلی اور روس موجود ہیں۔ ہر ملک کے سیاسی اصول جداگانہ ہیں، دوسرے سیاسی نظام کی بنیاد، کہیں نازیت اور فاشیت پر ہے، کہیں اشتراکیت اور قومیت پر، اور کہیں صرف قومی وقار عظمت اور بیداری کے احساس پر۔ لیکن ان میں سے ہر ایک ایک لحاظ سے ہم خیال ہے اور وہ یہ کہ ہر ملک کو ایک بیدار، متحدہ اور باعمل قوم کی ضرورت ہے۔ ہر ملک اچھے شہری بنانا چاہتا ہے۔

اچھے شہری کا کیا مقصد ہے اور اس مقصد کی تکمیل کس طرح ہو سکتی ہے؟ اس کی بحث کرنے سے پہلے صرف ایک بات کا اندازہ کر لینے کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ آج کل دنیا میں عموماً دو طرح کی حکومتیں ہیں۔ جمہوری یا شخصی۔ جمہوری حکومتوں میں، سلطنت کی باگ ڈور رعایا کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ رعایا اپنے کچھ نمائندے چنتی ہے اور یہی نمائندے رعایا کی آواز بن کر ملکی اور قومی مفاد کے ہر معاملے کو، حکومت کی فضا میں پھیلاتے ہیں۔ جو وہ چاہتے ہیں وہ ہوتا ہے اور ملک میں خوش حالی رہتی ہے شخصی سلطنتوں میں، رعایا کی آواز نسبتاً دھیمی اور ہلکی ہوتی ہے۔ لیکن آمر یا شخصی حکمراں چونکہ اپنی سلطنت کو باقی رکھنا چاہتے ہیں، اس لئے اس ہلکی آواز کا بھی اثر ہوتا ہے۔ کچھ اپنی سیاست کے جادو سے، اور کچھ لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کر کے، وہ انہیں اپنے قابو میں رکھتا ہے۔ اسے کچھ ایسے منتر یاد ہوتے ہیں کہ ان کے پھونکتے ہی سب اس کا کلمہ پڑھنے لگتے ہیں۔ اور حکومت کا پہیہ بغیر کسی روک ٹوک کے چلتا رہتا ہے۔ چونکہ تعلیم کے بغیر نہ جمہوری حکومتوں کا کام نکل سکتا ہے، نہ شخصی حکومتوں کا، اس لئے اس کا دور دورہ دونوں جگہ رہتا ہے دونوں کو اچھے شہری پیدا کرنے کی دھن ہوتی ہے لیکن یہ کہ دونوں کے نزدیک اچھے شہری کون ہیں؟ یہ بالکل اضافی چیز ہے۔

رسل (.RUSSEL) نے اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر شہریوں کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک شہری وہ جو جمہوری حکومتوں میں ہوتے ہیں، اور دوسرے وہ جو شخصی حکومتوں میں۔ پہلے قسم کے شہری کو رسل نے تخلیقی (.CREATIVE) شہری کہا ہے اور دوسرے قسم کے شہری کو میکانک (mechanic) ان

کا خیال ہے کہ ایک اچھے شہری کے لیے ضروری ہے کہ اس میں کم سے کم پانچ خوبیاں ہوں۔ فکر کی قوت، لیڈر بننے کی صلاحیت، ڈسپلن، شرکتِ عمل کا احساس اور رواداری۔ اس لیے کہ جمہوری حکومتوں میں ملک اور قوم کی بھلائی، ترقی اور عظمت میں ہر شخص کو الگ الگ اور اجتماعی حیثیت سے حصہ لینے کی ضرورت ہے ہر شخص اپنے مخصوص فکر اور عمل سے قوم کی مجموعی حالت کو بہتر سے بہتر بنانے میں حصہ لیتا ہے۔ یہ بات پہلی دو صفتوں کے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن چونکہ انفرادی حیثیت سے فکر اور عمل کی انتہائی بلندیوں پر پہنچنے کے باوجود بھی کوئی شخص ملک اور قوم کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا اس لئے اسے ایک منظم جماعت کا فرد ہونا چاہئے وہ جو کچھ کرے صرف اپنے لئے نہیں بلکہ پورے ملک اور قوم کی بھلائی کے لیے، اس کے لئے تیسری اور چوتھی صفت ضروری ہے۔ اور اس سے زیادہ ضرورت ہے رواداری کی۔ چونکہ ہر شخص کو خیال اور عمل کی آزادی حاصل ہے اس لیے ہر شخص میں دوسرے کے خیال کو صبر سے سننے اور اس پر غور کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیئے۔ دوسرے کے خیال، نقطۂ نظر اور جذبہ کا احترام بے حد ضروری ہے۔ اس کے بغیر شرکت عمل ممکن نہیں۔

دوسرے قسم کے شہری جنہیں شخصی حکومتوں کا شہری بننے کی تعلیم دی جاتی ہے، ان شہری سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ چونکہ آمر (DICTATOR) کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی رعایا کا ہر شخص اس کے بنائے اصول اور قانون کو اپنے لئے ایمان سمجھے، اور اس پر بغیر چون وچرا کے عامل ہو، اس لئے وہ چاہتا ہے کہ اس کے تمام شہری خیال اور جذبہ میں یکساں ہو ـــ جو کچھ ان سے کہا جائے، اسے وہ اپنی قومی اور ملکی بہبودی سمجھ کر اس پر عامل ہوں۔ ان کا ہر عمل، اسی مخصوص ذہنیت کے رنگ میں ڈوب کر نکلے۔ ان کے لئے آمر نے ایک سانچہ بنا دیا ہے اور آدمی جب اس سانچے میں ڈھل کر باہر نکلتا ہے، تو وہ شہری کہے جانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اس شہری کی حیثیت بالکل مشین کی سی ہے جو چلتی ہے تو ایک خاص انداز اور رفتار سے اور اگر نہیں چلتی۔ تو بالکل نہیں۔ اس میں اپنی گردش کو بدلنے کی صلاحیت نہیں۔ اسی طرح یہ شہری جس سانچے میں ڈھال دیا گیا، اس سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس میں آزادیٔ فکر و عمل کا جذبہ نہیں ہوتا، وہ لیڈر بننے کی صلاحیت بھی نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے کہ اسے بدلتی

ہوئی ضرورتوں کے لحاظ سے بدلنا نہیں آتا۔ اس کی فطرت میں لچک نہیں۔ ڈسپلن اور شرکت عمل اس کے لئے بھی ضروری ہیں۔

اس بحث کا خلاصہ یہ کہ جمہوری اور شخصی دونوں حکومتیں اچھے شہری بنانا چاہتی ہیں اور دونوں کے نزدیک "شہریت" کا معیار جداگانہ ہے۔ تعلیم دونوں جگہ دو مختلف فرائض انجام دیتی ہے۔ "تخلیقی شہری" بھی اسی کا پیدا کیا ہوا ہے اور مشین نما شہری بھی۔ تعلیم سے دو مختلف موقعوں پر دو الگ الگ کام لئے گئے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کا تقاضا بھی یہی ہے، جو جمہوری حکومتوں کا اس لئے کہ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ فطرت کے قریب ہونا چاہیئے۔ فطرت انسان کی بہترین معلم ہے تہذیب کے جال کے پھیلنے سے پہلے، بچہ فطرت ہی کی گود میں تعلیم پاتا تھا۔ وہ دنیا کی چیزوں کو دیکھ کر، انھیں چھوکر، ان میں شریک ہوکر، فکر اور عمل کی آزادی کے ساتھ، ان سے نئے نئے سبق سیکھتا اور اپنے تجربات کی دنیا کو وسیع کرتا رہتا تھا۔ اس لئے ضرورت ہے اب بھی اسے فطرت کے اسی ماحول کی گود میں پالا جائے۔ تاکہ اس کی مخصوص فطرت زیادہ سے زیادہ ترقی کرے اور کائنات کے وسیع تنوع میں کوئی فرق نہ آئے۔ شخصی حکومتیں فطرت کے اس ماحول کو نظرانداز کرتی ہیں اور جمہوری حکومتوں میں غیر ارادی طور پر اسی پر عمل ہوتا ہے۔

لیکن فطرت صرف یہیں تک محدود نہیں۔ فطرت کا ایک مقصد ہے انسان کو اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق انتہائی ترقی دینا۔ لیکن یہ انتہائی ترقی اصل میں اس جماعت یا سماج کی ضرورت کے لئے ہے جس میں انسان رہتا ہے۔ ترقی کا مقصد یہ ہے کہ ہر انسان اپنی مخصوص صلاحیت کے مطابق اپنی جماعت، سماج یا قوم کی ترقی اور بہبودی میں حصہ لے۔ اس لئے تعلیم کو اس خاص جماعت کی ضرورتوں کے مطابق ہونا چاہیئے، جس میں انسان رہتا ہے۔ ہر جماعت یا سماج کا کلچر، دوسری سماج سے مختلف ہے۔ یہ ایک دو سال میں نہیں بن جاتا۔ بلکہ کلچر مجموعہ ہے، ان تمام تجربات کا جو نسلاً بعد نسلاً کسی قوم تک پہنچتے ہیں۔ ادب، تاریخ، فلسفہ، رسم ورواج، تہذیب وتمدن، کھانا پہننا، رہنا سہنا، بول چال، زبان اور فن، اور ان سب چیزوں کے مختلف نظریے مل کر کسی خاص جماعت کا کلچر کہے جاتے ہیں

اور یہ غیر محسوس طریقے پر انسان کے خمیر کا جزو بن جاتے ہیں۔ اس لئے جو تعلیم فطرت سے قریب ہونا چاہتی ہے اس کا ایک ضروری جزو یہ بھی ہے کہ وہ قوم کے کلچر اور اس کی روایات کی آئینہ دار ہو۔ صحیح تعلیم وہی ہے جو ہماری داخلی فطرت کے مطابق ہو، جس میں ایسے رجحانات ہوں جو ہمارے خمیر میں بسی اور رچی ہوئی چیزوں سے مل کر بنے ہوں۔

اس لئے فطری تعلیم کے حقیقت میں تین جزو ہوئے۔ انفرادی۔ سماجی اور مثالی انفرادی نقطۂ نظر سے انسان کی فطرت کے مطابق اس کی انتہائی ترقی۔ سماجی نقطۂ نظر سے کسی مخصوص جماعت کی ضرورتوں کا لحاظ، اور مثالی نقطۂ نظر سے اس جماعت کے کلچر کا عکس۔ یہ تینوں چیزیں ہر اچھی تعلیم کے لئے لازمی ہیں۔ اس لئے ہر حکومت کا فرض ہے کہ تعلیم کو ان تینوں حیثیتوں سے مکمل بنائے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا، تعلیم نہ افراد کے لئے کام کی ہو سکتی ہے اور نہ سماج، ملک اور قوم کے لئے۔ ملکی تعلیم کے نصاب کی تدوین اور نظام کی ترتیب کرتے وقت ہر حکومت کو یہ تین سوال پیش نظر رکھنے چاہییں کہ۔

۱۔ تعلیم پڑھنے والوں کو شخصی اور انفرادی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ ترقی دے۔

۲۔ وہ جماعت یا سماج کی ضرورتوں کے مطابق ہو۔

۳۔ وہ سماج کے کلچر اور روایات کی آئینہ دار ہو۔

ان اصول کے مطابق نصاب کی ترتیب کے بعد حکومت کو اس کی تفصیلات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ملکی اور قومی ترقی ہو اور یہ بغیر اچھی تعلیم کے ممکن نہیں۔ اس لئے اس کا فرض ہے کہ تعلیم کو ہر حیثیت سے بہتر بنائے۔ اور اس کے ایسے اصول بنا دے جن پر عمل کرنے کے بعد بہترین نتائج کی امید ہو سکے۔ مدرسے اپنی ضرورتوں کے مطابق تفصیلوں میں جو تبدیلیاں چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن صرف اصول بنا دینے ہی سے حکومت کا کام ختم نہیں ہوتا۔ اسے یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ ان اصولوں اور ضروریات کے مطابق ملک میں کافی مدرسے ہیں یا نہیں، انھیں کافی کامیابی سے چلانے کے لئے سرمایہ موجود ہے یا نہیں اور ان صورتوں میں مقررہ اصول پر عامل ہو سکتے ہیں

یا نہیں۔ اس لیے حکومت کو مدرسوں کی مالی امداد بھی بڑی حد تک اپنے ذمہ لینی پڑے گی۔

بظاہر مشورے دینا آسان ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان اصولوں کے مطابق ہم کس حد تک تعلیم دینے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ یوں تو ہر کام میں اور ہر قدم پر مختلف قسم کی دقتوں کا پیدا ہونا ضروری ہے، لیکن سوال ان دقتوں کے حل کرنے کا ہے۔ ہمارے ملک میں اب تک جو تعلیم جاری ہے وہ شاید فطرت کے تینوں اصول کے مطابق نہیں۔ نہ اس میں افراد کو شخصی ترقی حاصل کرنے کا موقع ہے نہ اس میں سماج کی ضرورتوں کا حل ہے، اور نہ وہ ہمارے کلچر کی آئینہ دار ہے۔ اس لیے یقینی طور پر ہمیں اس نظام میں شدید انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اسی احساس کے بعد ہمارا دشوار کام شروع ہوتا ہے۔

عوام میں تعلیمی دلچسپی اور اس کے بلند مقاصد کا صحیح احساس پیدا کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ انہیں تھوڑی بہت تعلیم دی جائے۔ اس لیے حکومتوں کے سامنے اس وقت سب سے پہلا یہ سوال ہونا چاہیے کہ کس طرح ملک کا بچہ بچہ پڑھا لکھا ہو جائے۔ شکر یہ ہے کہ اس خیال نے اب عملی شکل اختیار کرنی شروع کر دی ہے اور ملک کی متعدد تحریکیں اب جہالت کو مٹانے کا بیڑا اٹھا چکی ہیں۔ حکومت اس سلسلے میں بہت مدد کر سکتی ہے۔ اسے چاہیے کہ ملک بھر میں لازمی تعلیم کا قانون نافذ کر دے اور ہر شخص کو بغیر کچھ خرچ کئے ہوئے تعلیم حاصل کرنے کی آسانیاں بہم پہنچائی جائیں۔ ملک کے بچے بچے کو تعلیم اور اس کی ضرورت سے آگاہ کر دینے کے بعد دوسرے مسائل ہمارے سامنے آتے ہیں۔

پہلے تو یہ کہ تعلیم ایسی ہو جس میں افراد کو اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق انتہائی ترقی کا موقع ملے اس قسم کی تعلیم صرف وہ تعلیم ہو سکتی ہے جہاں بچے صرف کتابوں سے پڑھ کر نہیں، بلکہ "کچھ کر کے" سیکھیں مدرسے کی فضا آزاد ہو۔ ہر بچے کی فکر کو عمل کا موقع دیا جائے۔ وہ سب کے ساتھ مل کر کام کرے۔ ایثار، محبت، شرکت عمل، رواداری، اپنی جماعت کی محبت اور اس کی عزت کا احساس اس میں پیدا ہو یہ مقصد صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب ہم مدرسوں کو بچوں کی ایک چھوٹی سی دنیا بنا دیں جہاں انہیں اپنی دلچسپی کے مطابق ہر چیز سیکھنے ہر کام میں حصہ لینے، اور ہر جذبہ کے احساس و اظہار

کا موقع ملے۔ اس طرح کے مدرسے یورپ اور امریکہ میں کافی ہیں اور ان سے نکلنے والے بچے انفرادی اور اجتماعی ہر حیثیت سے قوم اور ملک کے سرمایۂ ناز رکن بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس طرح مدرسوں سے دوسرا مقصد خود بخود حل ہو جائے گا۔ ہر بچہ وہ کام سیکھے گا، جس کے لئے وہ فطرتاً موزوں ہے اور اس لئے ذاتی شخصیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ، اس میں ملک اور قوم کا ایک مفید رکن بننے کی قوت بھی پیدا ہو جائے گی۔ وہ اپنے مخصوص کام سے سوسائٹی کے نظام زندگی میں ایک خاص حصہ لے گا۔ اس کی ضرورتیں بھی پوری ہوتی رہیں گی اور سوسائٹی بھی اس کے کاموں سے فائدہ اٹھائے گی۔ چونکہ ہر شخص اپنی دلچسپی کا کام کرے گا۔ اس لئے کام میں اس کا جی لگے گا۔ اس کی زندگی بھی اچھی ہوگی اور کام بھی اچھے سے اچھا ہو سکے گا۔ سوسائٹی کے اس میں دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا ہر فرد اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن اور خوش حال ہے اور دوسرے یہ کہ ہر کام جو ہو رہا ہے، اسے اس کا ماہر کر رہا ہے اس لئے کام کی اچھائی پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔

اب رہا تیسرا سوال کلچر کا۔ کلچر کا مسئلہ سب سے مشکل ہے۔ ایک تو اس لئے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں کا کلچر مختلف ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ایک ہی جماعت میں کچھ پڑھے لکھے اور زیادہ بے پڑھے لکھے لوگوں کے معاشرت، تمدن اور نقطۂ نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لئے تعلیم کی بنیاد کلچر پر کس طرح رکھی جا سکتی ہے؟ بظاہر یہ سوال بہت مشکل ہے۔ لیکن اس کے دو جواب ہیں۔ ایک تو یہ کہ کلچر کے اختلافات ہمیں اپنے زمانہ میں زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ زمانہ گذر جانے کے بعد ان اختلافات میں سے ایسے حصے نکل جاتے ہیں، جن کا تعلق لوگوں کی چند وقتی ضروریات سے ہوتا ہے۔ اور ہر زمانے کی معاشرت کا ایک مستقل حصہ آئندہ آنے والی نسلوں تک، اس عہد کے کلچر کی صورت میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اب سے ایک صدی پہلے بھی کلچر کے یہاں اختلافات تھے لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ اختلافات کے غیر مستقل جزو مٹتے گئے اور ان کے مستقل حصے باقی رہ کر ہم تک پہنچے۔ یہی حال موجودہ کلچر کا ہوگا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ علم و جہل کا جو فرق اس وقت اتنا نمایاں ہے، اسے کوشش کر کے رفتہ رفتہ

مٹایا جاسکتا ہے اور اس کے بعد خود بخود ملک میں کلچر کے اختلافات میں کمی ہوتی جائے گی۔ علم لوگوں کو ہم مذاق بنا دینے کے بعد، معاشرت اور زندگی میں بھی انھیں ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ قریب کر دے گا۔ اس لیے ناامید ہونے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت ہے عمل اور امید کی ——— حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں آنے کے بعد دشواریاں، خود بخود آسانیاں ہو جائیں گی۔

ہندوستانی صنعتوں کو تحفظ کی ضرورت

(از جناب عبداللہ زمانی ایرانی صاحب متعلم جامعہ)

صنعت کے تحفظ سے کیا مراد ہے | کسی شئے کو نقصان پہنچانے والی شئے سے بچانا تحفظ کہلاتا ہے جماعتی زندگی میں عدل و انصاف کو رواج دینے کے لئے انسان مجبور ہوا کہ اپنے اوپر اور اپنی جماعت کے دوسرے افراد پر باہمی تحفظ کی غرض سے کچھ پابندیاں عاید کرے۔ یعنی اس نے ریاست ایجاد کی اور ریاست کو حق دیا کہ اگر کوئی اس کے حق کو چھیننا چاہے یا وہ خود دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا چاہے تو سزا پائے۔ یہ تو سیاسی تحفظ کا عام مفہوم ہوا۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ صنعت کے تحفظ سے کیا مراد ہے روسو جیسا فطری آزادی کا حامی فلسفی بھی اس بات کے ماننے پر مجبور ہوا تھا کہ چونکہ بعض انسان دوسروں کی بہ نسبت ضعیف ہوتے ہیں اس لئے ان کا تحفظ ضروری ہے اور اسی تحفظ کے لئے ریاست وجود میں آتی ہے۔ بالکل یہی حالت صنعتوں کی بھی ہے۔ بعض ممالک کی صنعتیں ترقی پر ہیں ان کے لئے خام پیداوار، معدنیات اور دیگر لوازم صنعت بکثرت ہیں اور ایسے زمانے میں ترقی کی ایک خاص منزل تک پہنچ بھی چکی ہیں جب کہ ان کا کوئی رقیب نہ تھا۔ اب اگر کوئی ملک صنعتی ترقی کی اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہے تو جب تک طاقتور اور ترقی یافتہ صنعتی ممالک کے مقابلے سے اس کا تحفظ نہ کیا جائے تو وہ ترقی نہ کرسکے گا۔ اس لئے حکومت مجبور ہوتی ہے کہ اس ملک کی صنعتوں کے تحفظ کا سامان کرے۔ جس کے یہ معنی ہوئے کہ تحفظ کی تعریف یہ ہوسکتی ہے کہ تحفظ کمزور ابتدائی صنعتوں کو قوی اور ترقی یافتہ صنعتوں کی رقابت سے بچانے کا نام ہے۔

تحفظ پر اعتراض | اوپر کے بیان سے یہ بھی ثابت ہوا کہ صنعتوں کے تحفظ کی کیوں ضرورت ہے مگر اس کے لئے کچھ تفصیل کی حاجت ہے۔ لیکن اس سے قبل تحفظ کے مخالفوں کا نقطہ نظر پیش کردینا زیادہ بہتر معلوم

ہوتا ہے۔ وہ دلائل جن پر وہ زیادہ زور دیا کرتے ہیں یہ ہیں۔

(۱) تحفظ سے داد و ستد کی کامل آزادی باقی نہیں رہتی جس کی وجہ سے محنت اور عمل ان جگھوں پر نہیں پہنچ سکتے جہاں کہ ان کی اشد ضرورت ہے۔ بلکہ جہاں ان کی بہت زیادہ ضرورت ہے وہاں ممکن ہے کہ یہ بہت کم ہوں اور جہاں کم ضرورت ہے وہاں بہت زیادہ تعداد میں ہوں۔ اس لئے یہ ایک غیر فطری اور ناپسندیدہ رویہ ہے کہ ایسی پابندی عائد کی جائے جس سے فطری توازن تجارت بگڑ جائے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مجموعی حیثیت سے دنیا کی پیداوار گھٹ جائے گی اور دولت بھی کم ہو جائے گی۔

(۲) یہ کہ عدم تحفظ کی صورت میں ہر شخص آزاد ہے کہ جس طرح چاہے اپنی قوتوں کو کام میں لاکر اپنا سامان تو مہنگے سے مہنگا بیچ ڈالے اور دوسروں کا سستے سے سستا خریدے اور اس رقابت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کی ہمت بلند ہو جائے گی۔ ہر شخص اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے کی کوشش کرے گا اور اپنے دل و دماغ سے کام لے کر ہر ہر لحہ نئی نئی صورتیں اور راستے تلاش وایجاد کرے گا تاکہ اپنی چیز زیادہ سے زیادہ دلکش بنائے اور دوسروں کی چیزیں سستے سے سستے داموں پر حاصل کرے۔ اس سے نہ صرف دنیا کی مجموعی پیداوار اور دولت بڑھے گی بلکہ اشیا کی نفاست اور گوناگونی میں بھی ترقی ہوگی اور خریدار اور فروشندہ کا حوصلہ بھی بڑھ جائے گا اور ہر ملک اس طرح پر انتہائی ترقی حاصل کر سکے گا۔

(۳) انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے بنی نوع سے مساوات کا برتاؤ کیا جائے۔ خود غرضی ایک بیہانہ اور ناپسندیدہ شے ہے۔ اس لئے تحفظ اس اخلاقی زاویۂ فکر سے بھی کوئی پسندیدہ اور بہترین چیز نہیں ہے۔

(۴) تحفظ درحقیقت تحفظ نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ سے صنعت کی بعض قسموں کو تو فائدہ پہنچتا ہے اور بعض کو نقصان۔ یعنی تحفظ کا مقصد صرف ایک ناپسندیدہ حیثیت سے پورا ہوتا ہے اور دوسری حیثیت سے بالکل مضر اور نقصان رساں ہے۔

(۵) اس سے صنعتی کارخانوں میں جو جماعتیں کام کررہی ہیں ان کی اخلاقی حالت پر برا اثر پڑتا ہے۔

(۶) اس سے سرمایہ دار تو مستفید ہوتے ہیں لیکن غریب طبقہ کو جو کہ ان صناعوں کی اشیا صرف کرتا ہے نقصان پہنچتا ہے۔

(۷) چونکہ تحفظ کے لئے حکومت کو صنعت اور تجارت میں دخل دینا پڑتا ہے۔ اس لئے اس سے بسا اوقات برے سیاسی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

(۸) اس سے قوموں میں ایک قسم کی دشمنی اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔

(۹) تحفظ دینے کے بعد اس کا ہٹانا مشکل اور ملک کی سیاسی و معاشی حالت پر بہت برا اثر ڈالتا ہے۔

تحفظ پر اعتراضات کا جواب | یہاں تک تو تحفظ کے مخالفین کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا اب اس سے پہلے کے ہم اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اعتراضات کا مختصر جواب دے دیا جائے۔

(۱) یہ کہ تحفظ سے محنت اور اصل اپنی فطری روانی سے رک جائے گی۔ اس لئے غلط ہے کہ عدم تحفظ کی صورت میں بھی اس کا نہ صرف امکان ہے بلکہ عملاً اس کا وجود پایا گیا ہے اور پایا جاتا ہے کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ملکوں کی پالیسئ تحفظ اختیار کرنے سے پہلے سب ملکوں کی محنت در اصل حسب ضرورت کام میں آئی ہے اور یا اپنی اپنی لیاقت کے برابر ہر ملک اپنی تجارت و صنعت کو ترقی دے سکا ہے؟ اس کا جواب نفی میں اس قدر بدیہی ہے کہ اس کے لئے ذرا بھی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

(۲) یہ کہ ہر ملک یا ہر شخص کو آزادی ہو کہ اپنی اپنی چیزوں کو بہتر سے بہتر بنا کر بڑی سے بڑی قیمت پر فروخت کرے اور سستے سے سستے سامان اپنے لئے فراہم کرے۔ یہ اعتراض بھی ٹھیک نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ہم نے مثال دے کر بتایا ہے کہ بعض صنعتیں ابتدائی حالت میں ہوتی ہیں اور جب تک موجودہ حالات ان کے لئے ناموافق ہیں اور انھیں

سہارا نہ مل جائے۔ کمزور انسان کی طرح قوی کے مقابلہ میں، ترقی یافتہ صنعتوں کے مقابلہ کی استعداد نہیں رکھتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اگر ان کو تحفظ نہ دیا جائے تو وہ بالکل ختم ہو جائیں گی۔ پھر یہ کہ حکومت اور تحفظ پر اعتماد کرکے ہمیشہ تحفظ ہی کے بل پر کھڑی رہنے کے قابل ہوں گی یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ یہ تحفظ تو ابتدائی کمزوری یا بیماری کی حالت میں ہر شئے کے لئے ضروری ہے مثلاً انسان جب پیدا ہوتا ہے تو کیا اس کو اس اندیشہ کی بنا پر سہارا نہیں دینا چاہیئے، یا گود میں نہیں لینا چاہیئے، یا اس کا تحفظ نہیں کرنا چاہیئے، کہ آئندہ اپنا تحفظ خود نہ کر سکے گا اور ہمیشہ ماں کی گود اور خبرگیری کا محتاج رہے گا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح انسان نہ صرف حالت طفولیت میں ماں باپ کے سہارے کا محتاج ہے بلکہ کمزوری اور بیماری کی حالتوں میں بھی۔ اس طرح وہ صنعتیں بھی تحفظ کی محتاج ہوں گی جو اگرچہ وہ وجود میں عرصہ سے آچکی ہیں لیکن پست حالت میں ہیں۔

(۴) اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی تحفظ اس لئے کوئی بری چیز نہیں ہے کہ کوئی ملک اپنی صنعتوں کو ترقی دے کر دوسروں کو ایسا کرنے سے نہیں روکتا۔ ہر ملک کو آزادی حاصل ہے کہ وہ تحفظ کو اختیار کرے یا نہ کرے۔

(۵) یہ کہ تحفظ، تحفظ یافتہ صنعتوں کے حق میں اگر مفید ہے تو اس کے علاوہ دیگر صنعتوں کے حق میں مضر ہے، یہ بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ حکومت کی نظر میں جن صنعتوں کو تحفظ نہ دینے سے تحفظ دادہ صنعتوں کے مقابلہ میں نقصان کا خطرہ ہو حکومت ان کو بھی تحفظ دیگی۔ اور اگر ایک ملک کی پالیسی تحفظ سے دوسرے ملک کی صنعتوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو اس کا جواب اوپر دے دیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ بھی اپنی صنعتوں کو تحفظ دے کر ہر قسم کے نقصان سے بچا سکنے میں آزاد ہے۔

(۵) یہ کہ صناع طبقہ کے اخلاق پر تحفظ سے برا اثر پڑتا ہے اسکو کوئی باور نہیں کر سکتا۔ مثلاً کیا امریکہ والوں کے اخلاق جو کہ تحفظ میں انتہا پسند ہیں انگریزوں کے اخلاق سے جو کہ آزادئ تجارت میں انتہا پسند ہیں، پست ہیں؟

(۶) یہ کہ تحفظ سے سرمایہ دار کو فائدہ، اور غریب طبقہ کو نقصان پہنچے گا؛ اس کا جواب یہ ہے کیا حکومت خارجی رقابت اور نقصانات سے اپنی صنعت کو بچا سکتی ہے۔ غریب طبقہ کو سرمایہ دار کی دستبرد سے نہیں بچا سکتی؟ پھر یہ کہ تحفظ سے رعایا پر بہت بار پڑتا ہے؟ یہ قربانی وقتی ہے اور آئندہ چل کر جلد ہی اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔

(۷) یہ کہ تحفظ سے سیاسی ناخوشگوار واقعات و نتائج پیدا ہوتے ہیں؛ یہ بھی ایک بے دلیل اعتراض ہے اب ساری دنیا میں تحفظ کا نظام جاری ہے یہاں تک کہ انگلستان سا علمبردار آزادی بھی اس سے مستثنےٰ نہیں ہے؛ کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ان تمام ممالک میں محض تحفظ کی وجہ سے سیاسی خلفشار یا خوشگوار نتائج پیدا ہوئے ہیں؟ اگر منطق سے کام لے کر اثبات میں کوئی جواب بھی دیا جائے تو کیا آزاد پالیسی سے کوئی ایسا سیاسی نتیجہ نہیں پیدا ہوتا ہے؟

(۸) قوموں میں اگر تحفظ کی وجہ سے دشمنی پیدا ہوتی ہے؛ تو اس کے جواب میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ متمولوں کے اپنی دولت کی حفاظت کرنے سے بھی چوروں کے دل میں ان سے نفرت پیدا ہوتی ہے کیونکہ ان کو دوسروں کا مال چرانے اور غصب کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے' کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی قوم دوسری قوموں سے اس لئے دشمنی پیدا کرے کہ انھوں نے اپنی دولت کے تحفظ کا سامان کیا ہے اور اس کی زیادتی سے اپنے مفاد کو بچانے کی کوشش کی ہے تو اس کا کیا علاج!

(۹) یہ کہ تحفظ دینے کے بعد اس کا ہٹانا قوم اور ملک کے لئے مضر ہوتا ہے اور ملک کے مالیات پر اس کا برا اثر پڑتا ہے' وغیرہ۔ یہ بھی ایک لایعنی اعتراض ہے اس لئے کہ تحفظ جب ہٹایا جاتا ہے کہ اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہی ہو اور جب اس کی ضرورت باقی رہی تو ظاہر ہے کہ اس کے دور کرنے ہی میں ہر طرح کا فائدہ ہے۔ اور اس کا باقی رکھنا یا تو بے سود ہوگا یا نقصان رساں۔

<u>تحفظ کے فوائد</u> اس سے پہلے کہ ہم ہندوستان کی صنعتوں کے تحفظ کی ضرورت پر بحث کریں۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ محض ان فوائد تحفظ کا ذکر کر دیا جائے جن کی وجہ سے آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ہر ملک اس کا حامی نظر آتا ہے اور اسے نہ صرف مفید بلکہ ضروری سمجھتا ہے اور یہ فوائد موجودہ زمانے میں خاص

طورسے اہمیت رکھتے ہیں۔ پھر دنیا کو آج ایک بڑی جنگ کا خطرہ ہے۔ اٹلی کا حبشہ پر قابض ہو جانا۔ اسپین کی یہ طول وطویل جنگ۔ جاپان وچین کا یہ میدان کارزار، اور ابھی ابھی آسٹریا پر جرمنی کا یکایک قبضہ وغیرہ وغیرہ ایسے حالات ہیں جن کو کوئی محتاط حکومت نظرانداز نہیں کرسکتی بلکہ اپنے مستقبل کے لئے معاشی، سیاسی اور دیگر قسم کے بچاؤ کا سامان اسے کرنا پڑے گا اور چونکہ آج کل جنگ کی سب سے بڑی وجہ۔ معاشی معاملات ہوتے ہیں یعنی یہ کہ جنگ اس لئے ہوتی ہے کہ یا تو کسی ایسے ملک پر قبضہ کیا جائے جہاں معدنیات اور مواد خام کے ذخائر کافی موجود ہوں یا اس ملک کو اپنے کارخانہ جات کی مصنوعہ اشیا کے لئے وسیع منڈی بنایا جاسکتا ہو۔ اس لئے تحفظ مصنوعات کا مسئلہ اور زیادہ اہم ہو گیا ہے۔ یہاں اس بات کا جتانا بھی بے جا نہ ہوگا کہ ہمارا مقصد تحفظ سے صرف تحفظی محاصل برآمد عاید کرنا یا صنعتی کارخانوں کو مدد دینا نہیں بلکہ ان تمام ذرائع کو اختیار کرنا مراد ہے جن کو ملک کی صنعت کی ترقی کے لئے حکومت ضروری سمجھتی ہو مثلاً علاوہ تحفظی محاصل کے حکومت یہ بھی کرسکتی ہے کہ اشیائے درآمد کی مقدار محدود کردے یا بعض چیزوں کو بالکل ممنوع قرار دے دے۔ وغیرہ تحفظ کے حامی اپنی تائید میں حسب ذیل دلائل پیش کرتے ہیں۔

(۱) جو صنعت ابھی وجود میں نہیں آئی ہے یا بالکل ابتدائی حالت میں ہے یا وجود میں تو عرصہ ہوا کہ آچکی ہے مگر ترقی یافتہ صنعتوں کی رقابت کی وجہ سے خراب حالت میں ہے۔ ان سب کو تحفظ دینا لازمی ہے۔ تاکہ وہ تحفظ کے سہارے پر ترقی پاکر اپنے انتہائی نشوونما کو پہنچ سکیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ بلا تحفظ مقابلہ کی تاب نہ لاکر ختم ہو جائیں گی۔ مثلاً شکر کو لیجئے اگر جاوا کی شکر پر تحفظی محصول عاید کرکے اس کی درآمد کو کم نہ کیا جائے تو ہندوستان میں باوجودیکہ گنے کی کاشت بخوبی ہوسکتی ہے نیز ضروری سامان فراہم کیا جاسکتا ہے شکر کی صنعت ترقی نہیں کرنے پائے گی۔

(۲) آج کل دنیا کے ہر گوشے میں ہر ہر لمحہ جنگ کا خطرہ رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے نازک وقت میں سامان جنگ یا اور اشیا کے لئے دوسرے ممالک کا دست نگر ہونا اور خاص کر اگر بدقسمتی سے دشمن کا ملک ہو تو بہت زیادہ خطرناک ہے۔ اس لئے دور اندیشی کے نقطۂ نظر سے ہر ملک کو

چاہیئے کہ وہ ہر حیثیت سے جہاں تک ممکن ہو دوسروں سے آزاد رہے اور اپنی احتیاجات خود فراہم کرے۔

(۳) بسا اوقات تحفظی محاصل کے نہ ہونے سے درآمد کا پلہ برآمد سے اتنا بھاری رہتا ہے کہ تجارت کا توازن بگڑ کر ملک ہمیشہ یا کم از کم عرصۂ دراز کے لئے قرضہ کا زیر بار ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ کے طور پر ملک کے تمام طبقوں پر اس کا نہایت ہی برا اثر پڑتا ہے۔ بسا اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ طاقتور حکومتوں نے اس طرح پر کمزور حکومتوں کو اپنا مقروض بنا کر ان کے ملکوں پر قبضہ تک کر لیا ہے اس سے درآمد اور برآمد میں توازن قائم رکھنے کے لئے بھی تحفظ ناگزیر ہے۔

(۴) بعض ملکوں میں بعض چیزوں کے پیدا کرنے کی خاص صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ مثلاً ہندوستان کا جوٹ۔ تحفظ کے مخالفین کا کہنا یہ ہے کہ ہر ملک کو چاہیئے کہ صرف وہ چیزیں پیدا کرے جن کی صلاحیت اس میں زیادہ ہو۔ اور جن چیزوں کو پیدا کرنے کی صلاحیت دوسرے ملکوں میں زیادہ ہو تو یہ کام ان کے سپرد کر دے۔ پھر آپس کے مبادلہ سے ہر ملک اپنی ضروریات حاصل کرے۔ لیکن حامیان تحفظ اسے ٹھیک نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں کہ جس طرح انسان کمل طور پر اس وقت صحیح اور سالم مانا جا سکتا ہے جبکہ اس کی تمام قوتیں مناسب طور پر نشوونما پائی ہوئی ہوں۔ نہ یہ کہ بعض قوتیں تو انتہائی ترقی پر پہنچائی جائیں اور بعض بالکل ناگفتہ بہ حالت میں چھوڑ دی جائیں۔ جیسے کہ کوئی طالب علم کہ اس کو پڑھنے میں تو کافی مشق ہو مگر اس کو لکھنا نہ آتا ہو۔ یا کوئی دماغی حیثیت سے تو قوی ہو لیکن جسمانی حیثیت سے کمزور۔ یا بالعکس۔ اس طرح ہر ملک کو چاہیئے کہ اپنے تمام ذرائع ثروت سے فائدہ اٹھائے اور جہاں تک ممکن ہو اپنی ضروریات خود مہیا کرے جس کے لئے تحفظ شرطِ اولین ہے۔

(۵) اگر کوئی ملک صنعتی ملک بننا چاہتا ہے یا صنعتی تو پہلے ہی سے ہے مگر اپنی صنعت کی ترقی کا خواہاں ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تحفظ کو اس لئے اختیار کرے تاکہ سرمایہ دار کی اصل جس کی کثرت اس مقصد کے پورے ہونے کے لیئے شرطِ اولین ہے معرض خطر میں نہ

پڑے اور وہ اطمینان کے ساتھ اپنی اصل کو کام میں لا سکے۔

(۶) چاہیئے کہ تحفظ کے ذریعے سے ملک کا بازار ملک ہی کی پیداوار اور مصنوعات کے لئے محفوظ کیا جائے۔

(۷) تحفظ سے مزدوروں کی اجرت بڑھتی ہے ان کا معیار زندگی بلند ہو جاتا ہے۔ امریکہ کے مزدور اس کی بہترین مثال ہیں۔

(۸) تحفظ سے ملکی صنعتوں کو استقلال حاصل ہوتا ہے۔

(۹) تحفظ سے ایک قسم کا جذبۂ خودی پیدا ہوتا ہے جو کہ قومیت کی تعمیر میں نہ صرف بہت زیادہ مفید ہے بلکہ بہت ضروری بھی ہے۔ پھر یہ کہ تحفظ دیے جانے کے بعد صنعت میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔ لوگوں کی ہمت افزائی ہونے کی وجہ سے ایک نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ وہ اپنا کاروبار بہت سرگرمی سے انجام دیتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر ایک ایسی بیداری قوم میں پیدا ہوتی جو کہ ملک کی سیاست میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت کچھ تحفظ کی حمایت میں لکھا جا سکتا ہے لیکن عدم گنجائش اور تنگی وقت کے خیال سے ان چند باتوں پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

یہاں تک تو ہم نے تحفظ کے متعلق ایک عام بحث کی ہے۔ اب ہم صرف ہندوستان کے مسئلے کو لیتے ہوئے یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کو کن وجوہ کے لحاظ سے تحفظ کی ضرورت ہے۔ اور اس طرح ہم اصل بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ہندوستان کی خاص صلاحیتیں | ہندوستان کو وسعتِ رقبہ، اس کی وسیع آبادی اور مختلف و کثیر پیداوار کے لحاظ سے نہ صرف ایک ملک بلکہ اسے ایک براعظم سمجھنا چاہیئے۔ ہندوستان کا ایک ایک صوبہ یورپ کے ایک ایک ملک کے برابر ہے۔ ہندوستان کو تحفظ دینا اس لئے اور زیادہ ضروری ہے کہ اس کے مختلف صوبوں میں وہ تمام وسائل و دولت موجود ہیں جو کہ ایک ترقی یافتہ صنعتی ملک کے لئے لازمی ہیں۔ چنانچہ محکمۂ اراضیات کے ناظم مسٹر ٹامس ہالینڈ نے صنعت و حرفت کی کانفرنس

کے روبرو ۱۹۰۵ء میں جو مضمون پڑھا تھا" اس واقعہ کی تصدیق کی ہے اور کہا ہے کہ اگر کانی اصل میسر ہو' کاروبار میں اولالعزمی بڑھے اور صنعت و حرفت کی تعلیم بھی حاصل ہو جائے تو معدنیات کی قسم سے شاید ہی کوئی چیز ہو جو یہاں دستیاب نہ ہو سکے" ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ "اب موقع آگیا ہے کہ لوہا اور فولاد خود ہندوستان میں تیار کیا جائے" اور یہی دو چیزیں ہیں جن کی قیمت معدنیات کی برآمد میں سب سے زیادہ بڑھی رہتی ہے۔

اس کے علاوہ ہندوستان کا عہد ماضی بھی شاہد ہے کہ یہاں کی صنعت شہرۂ آفاق رہ چکی ہے اس سلسلے میں ایک فاضل کا قول نقل کیا جاتا ہے جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہندوستان نے انگریزی حکومت کے آنے کے بعد سے اپنی صنعت میں کیسی معکوس ترقی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "صنعتوں میں اہل ہنود نے بہت پیشتر کے زمانے میں غضب کا کمال حاصل کیا تھا حتیٰ کہ روم کے شاہی دربار ہندوستان کے طلائی اور نقرئی بافتوں سے زرق برق بنے رہتے تھے آج سے صدیوں پہلے ڈھاکے کی ململ تمام مہذب ممالک میں مشہور تھی یہاں کے پارچے کہ جن کی نفاست دنیا بھر میں بے مثل تھی۔ یہاں کے منجر کہ جن میں جگمگاتے ہوئے جواہرات ٹکے ہوئے تھے۔ بیش قیمت زردوزیاں کشیدے کم خواب' زربفت اور تاش بادلے' عجیب و غریب بوقلموں قالین' نہایت درخشاں میناکاریاں' وہ نازک بچہ کاریاں کہ بڑی بڑی خوردبینوں سے کہیں باریک اجزا کا پتہ چلے تو چلے۔ ساز و سامان پر نہایت ہی عمدہ بڑے اہتمام کا نقش و نگار' طرح طرح کی شکل و صورت کی نہایت عمدہ ضمیر کی تلواریں۔ یہ سب چیزیں اب بھی نظر آتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہاں بھی صنعتوں نے کیا کمال حاصل کیا تھا"

مسٹر مارٹین اپنی کتاب سلطنت ہند میں لکھتا ہے کہ "جس زمانے میں برطانیہ کے وحشی باشندے اپنے جسم رنگتے تھے۔ تارعنکبوت کی سی باریک ڈھاکہ کی ململ' کشمیر کی نفیس شال' دہلی کے کارچوب' ریشم' قیصر روم کے دربار میں بڑے بڑے نازنین وحسین زیب تن کرتے تھے۔ دھات کا بنا ہوا سامان' ہاتھی دانت' آبنوس اور صندل پر کیسے خوشنما نقش و نگار اور گل کاریاں کیسی

خوش رنگ چھینٹیں، ہیرے جواہرات اور مدنی نفاست سے جڑے ہوئے زر دوز مخملیں اور قالین، کیا پختہ فولاد، نہایت عمدہ چینی اور اعلیٰ درجہ کا بحری سامان کشتی اور جہاز وغیرہ صدیوں دنیا کی مہذب قومیں ہندوستان کی ان مصنوعات پر عش عش کرتی رہیں اور جب کہ لندن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا تھا۔ ہندوستان دنیا کا سب سے ہرا بھرا بازار تھا" سر ولیم ہنٹر کے یہ جملے بھی نقل کے قابل ہیں۔ وہ کہتے ہیں "ہندوستان کی قدرتی دولت اور اس کے وسیع بحری ساحل سے کہیں زیادہ اس کے باشندوں کی صنعت گری میں خداداد ذہانت اور قابلیت اس کو ایشیا بھر کا تاج بنائے ہوئے تھے"

ہندوستانی صنعتوں کے اسباب زوال | ذیل کے مختلف وجوہ سے ہندوستان کی صنعتوں کو زوال ہوا۔

(۱) صنعتی انقلاب نے ہوا کا رخ بدل دیا۔ جوں جوں انسان کو فطرت پر غلبہ حاصل ہوتا گیا اور بجائے ہاتھ پیر یا جانوروں کے اس نے بھاپ اور بجلی کے ذریعہ مشین سے کام لینا شروع کیا ووں ووں پرانی دستی صنعتوں کا زوال شروع ہوا۔

(۲) ہندوستان کی صنعتوں کو جس چیز کی وجہ سے سب سے زیادہ صدمہ پہنچا اور اس کے لئے کچھ تفصیل کی بھی ضرورت ہے وہ انگریزی حکومت ہے۔

سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایسی چالیں چلیں اور ایسی تدبیریں اختیار کیں جن سے یہاں کی دستی صنعتیں بے دست و پا ہو کر رہ گئیں اور اس کے بعد سے اب تک حکومت برطانیہ کھلم کھلا دیسی صنعتوں کو ہر طریقے سے فنا کرنے یا کم از کم ترقی نہ ہونے دینے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ اس کے اسباب گو کہ مختلف ہیں لیکن مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس کا یہ عمل محض انگلستان والوں کو فائدہ پہنچانے پر مبنی ہیں۔ سر ولیم ہنٹر لکھتے ہیں اور ان کا یہ بیان ایک واقعی دردانگیز کہانی ہے۔

"ہندوستان پر انگلستان کی عنایت ملاحظہ ہو۔ ہندوستان کے بنے ہوئے کپڑوں پر بڑھا بڑھا کر محصول درآمد لگانے سے بھی کام نہ چلا تو ان کی درآمد ہی روک دی، اور اس طرح ہندوستان

کے کپڑوں کا انگلستان میں آنا ممنوع قرار پایا" اس کے بعد بھی برطانیہ تھا کہ جب تحفظ کی بدولت اپنی صنعت و تجارت کو کمال ترقی پر پہنچا چکا، سارے اسباب بحری حمل و نقل پر قبضہ کر چکا اور اپنے کارخانوں کے لئے مواد خام کا محتاج ہوا اور اپنی مصنوعات کے لئے منڈیوں کی ضرورت پڑی تو آزاد تجارت کا علمبردار بنا اور تحفظ کی پالیسی پر انگلستان والوں نے طرح طرح کی نکتہ چینیاں شروع کیں۔ اور بد قسمتی سے ہندوستان بھی اس کے قبضہ میں آگیا انگریز اس کے سوا کیا چاہتا تھا۔ ع

یک گلے می خواستم یک گلستاں یافتم۔ ایک بہترین اور زرخیز ملک ہاتھ آگیا جس کی خام پیداوار بہت کافی، بازار بہت وسیع اور اس پر طرہ یہ کہ رعایا جاہل یعنی جس طرح چاہے وہ اسے اپنا آلہ کار بنائے۔

لیکن ہندوستان کا موجودہ وسیع بازار بھی ناکافی سمجھا گیا اور جو کچھ صنعت و حرفت ہندوستان میں باقی رہ گئی تھی اس کے خاتمہ کی کوشش شروع کی گئی۔ جو صنعتی اور تجارتی قوانین بنائے گئے وہ ہندوستانیوں کے مفاد کے خیال سے نہیں بلکہ انگلستان والوں اور خاص کر لنکاشائر کے کارخانے داروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کے لحاظ سے بنائے گئے۔ حکومت آمدنی کی ضرورت کی وجہ سے مجبور ہوتی ہے کہ ۳½ فی صدی درآمد کا محصول عاید کرے تو اس خیال سے کہ ممکن ہے اس سے لنکا شائر والوں کی صنعت برآمد کو نقصان پہنچے اور اس قلیل محصول سے ہندوستانی صنعت کو تحفظ مل جائے۔ ہندوستانی مصنوعات پر بھی اتنا ہی محصول عاید کیا جاتا ہے۔

اس بحث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انگریز جو یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے لئے تحفظ مضر ہے اور اس کی برآمد پر تحفظ سے برا اثر پڑے گا یعنی یہ کہ جب ہندوستان اپنی صنعت کو تحفظ دے گا تو ہندوستان سے دیگر صنعتی ممالک جو مواد خام وغیرہ منگاتے ہیں وہ نہیں منگائیں گے یا ہندوستان سے اپنی درآمد کم کر دیں گے۔ یہ بات بھی صرف ایک خود غرضانہ دلیل ہے ورنہ اس کی کیا ضرورت تھی کہ ہندوستان کی داخلی مصنوعات پر محصول عاید کیا جائے۔

تحفظ کے مخالفین کی تمام دلیلیں ہم نے پیش کر دیں اور ان کے جواب بھی۔ نیز تحفظ کے فوائد کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ کہا جائے کہ یہ دلائل تو نظری اور علمی بحث سے تعلق رکھتے ہیں لیکن عملاً اگر دیکھا جائے تو تحفظ کی اور تائید ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ہم دیکھتے ہیں موجودہ زمانے میں ہر ملک میں اسی کا راگ گایا جاتا ہے۔ چنانچہ جرمنی ۱۸۷۹ء سے اب تک تحفظ پر عامل ہے فرانس نے ۱۸۸۱ء اور جاپان نے ۱۸۹۹ء میں تحفظ کی پالیسی کو اختیار کیا نیز جاپان نے تو ۱۹۱۱ء میں تحفظی پابندیوں کو اور بھی بڑھا دیا۔ امریکہ تو تحفظ کا علمبردار رہا ہی۔ دنیا جانتی ہے کہ امریکہ کا تمول تحفظ ہی کی بدولت ہے۔ ورنہ وہ بھی ہندوستان کی طرح مفلس ہو جاتا اور دور کیوں جائیں خود انگلستان کی صنعتوں کی ابتدا جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے تحفظ ہی کے سایہ میں ہوئی۔ مصنوعات کی درآمد پر ۷۵ فی صدی تحفظی محصول عاید کیا گیا۔ اسی طرح انگلستان کے کپڑوں کے کارخانوں کو مختلف ترکیبوں سے تحفظ دیا گیا اور جنگ عظیم کے بعد سے موٹر کی درآمد پر ۳۳ فی صدی محصول درآمد عاید کیا گیا۔ قانون تحفظ کارخانہ جات پاس ہوا۔ شکر پر سے محصول آب کاری اٹھایا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

کیا دنیا بھر کے لئے تحفظ مفید اور صرف ہندوستان کے لئے مضر اور نقصان رساں ہے؟ آج کل تمام بڑے صنعتی ممالک تمام کے تمام بلا استثناء تحفظ کی بدولت اپنی اپنی انتہائی ترقی پر پہنچ چکے ہیں پھر ہندوستان کی صنعتوں میں کونسی نرالی بات ہے؟ جس کے لئے تحفظ بہت نقصان دہ بتایا جاتا ہے۔

بات یہ ہے کہ اگر ہندوستان برطانیہ کا محکوم نہ ہوتا اور بالکل آزاد ہوتا تو ان جھگڑوں کی ضرورت پیش ہی نہ آتی بلکہ تحفظ اختیار کئے ہوئے اسے کافی عرصہ بھی گذر چکا ہوتا۔ لیکن کیا کیا جائے کہ ایسا نہیں ہے انگلستان اپنی رعایا کو چھوڑ کر ہندوستان کے مفاد کا خیال کیوں کرے اور کس طرح کر سکتا ہے اور اس پر طرّہ یہ کہ دنیا کی نظروں میں بھی بدنامی نہیں چاہتا۔ نتیجہ یہ کہ براہ راست محض قوت سے کام لے کر اپنی مقصد براری کرنے کے بجائے سیاسی مکاریوں، دھوکہ بازیوں اور

خودغرضانہ دلیلوں کے ذریعہ سے اپنا کام نکالنا چاہتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر اس کے پاس قوت نہ ہوتی تو ہندوستان ان مکاریوں میں کبھی نہ آتا۔ کیونکہ اب ہندوستانی بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ ان کی بھلائی کس میں ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ "دست شکستہ بارگراں" جس طرح کہ کسی نے لکھا ہے"۔ ہندوستان کی صنعتوں کے لئے تحفظ اتنا ضروری ہے اور اس کے فوائد اتنے لازمی اور بدیہی ہیں کہ ان کے لئے کسی بحث و استدلال کی ضرورت ہی نہیں کیا کوئی منصف اور بے غرض شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ساری دنیا تحفظ کا دامن تھام کر اپنی داخلی وخارجی، سیاسی ومعاشی، کمیوں کو پورا کرنے میں منہمک رہے اور ہندوستان اس سے محروم رہے اور دنیا کے لئے لنگرخانہ بن کر ان کی من مانی چیزیں مہیا کرے اور خود مفلس رہ کر سخاوت کا دروازہ دوسروں ہی پر کھلا چھوڑ دے کیا ہندوستان نے اپنی عظمت پارینہ کو بھلا دیا اگر اس میں اپنی عظمت رفتہ کو حاصل کرنے کی صلاحیت ہے اور یقیناً ہے تو اسے چاہیئے کہ اپنی بے بسی کا احساس دل میں لے کر میدان میں نکلے اور ہر بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے دریغ نہ کرے۔ یہاں تک کہ اپنا مقصد حاصل کر کے سانس لے۔

اس مختصر بیان سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہندوستان کی صنعتوں کے تحفظ کی مخالفت کیوں کی جاتی ہے۔ ورنہ ہندوستان کے لئے تحفظ کے ناگزیر ہونے میں کسی بحث کی ضرورت نہیں۔

تحفظ کی نوعیت: یہاں تک تو ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی بہرحال تحفظ ہندوستان کی صنعت کی ترقی کے لئے لابدی شے ہے اب یہ دیکھنا ہے کہ تحفظ کی نوعیت کیا ہو فیسکل کمیشن نے اختصاصی طریق تحفظ کی سفارش کی تھی یعنی صرف ان صنعتوں کو تحفظ دینا چاہیئے جو کہ اس کے بغیر ترقی نہ کر سکیں ان کے لئے اور ہر قسم کی ضروریات مہیا ہوں۔ تحفظ کے بعد ایک خاص مدت کے اندر اندر اس قابل ہو سکیں کہ باہر کی صنعت کا مقابلہ کر سکیں اس کے علاوہ ہندوستانی معاشیین نے بھی کچھ تنقیدیں اس پر کی ہیں مثلاً یہ کہ تحفظ کی چند خرابیاں جو ہیں وہ

یہاں کے تحفظ میں نہیں ہونی چاہییں۔ اس میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) ہندوستان میں اس وقت بڑی بڑی صنعتوں پر اکثر و بیشتر غیر ملکیوں کا قبضہ ہے اور چونکہ تحفظ کا بار اشیاء کے صرف کرنے والوں کے طبقہ پر پڑتا ہے اور اس کا فائدہ براہ راست مصنوعات کے پیدا کرنے والے سرمایہ دار کو اس لئے اس کا بھی کسی نہ کسی طرح علاج کرنا چاہیئے۔

(۲) ہندوستان میں اصل کی کمی ہے اس لئے یہ لازمی ولابدی ہے کہ غیر ملکی اصل سے کام لیا جائے لیکن اس کے معنی یہ نہ ہونے چاہییں کہ اس اصل کے ذریعہ سے تحفظ کی بدولت جو کچھ فائدہ یا نتیجہ ہو وہ بھی یہ غیر ملکی سرمایہ دار اینٹھ لیں۔

(۳) یہ بھی ممکن ہے کہ سارے کارخانے دار آپس میں ساز باز کرکے تحفظ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر غریبوں کو لوٹ لیں۔ اس کی پیش بینی بھی کرنی چاہیئے۔

اس طرح اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن کا خیال تحفظ دیتے وقت از حد ضروری ہے لیکن تحفظ کی نوعیت کا فیصلہ خود ہندوستانیوں کو کرنا چاہیئے نہ کہ برطانوی حکومت کرے۔

آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تحفظ کی بدولت ہندوستان اپنی ذاتی قوت کو ترقی دے سکتا ہے اور اپنی معاشی زندگی کا معیار بلند رکھ سکتا ہے ۱۹۲۴ء سے ہندوستان میں تحفظ کی پالیسی پر عمل شروع ہوا ہے مگر اس قسم کے تحفظ سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اس لئے کہ یہ بھی محض ہندوستانی سرمایہ دار اور کارخانہ دار کو بہلانے کے لئے دیا گیا ہے۔ ورنہ یہ کوئی منظم پالیسی نہیں ہے۔ بلکہ انگلستان اور دیگر غیر ممالک کے سرمایہ داروں (جن کا ہندوستان کی بڑی بڑی صنعتوں اور منابع ثروت پر قبضہ ہے) کے مفاد کا خیال کرکے یہ تحفظ دیا گیا ہے۔

مختصراً یہ کہ تحفظ لازمی ہے اور اس کی نوعیت وغیرہ کا فیصلہ خود ہندوستانی کریں گے اور اس کے علاوہ تمام تلبیس آمیزانہ بحث ومباحثہ بیکار ہے۔

اقبال کا نوجوان

(از جناب نورالحسن ہاشمی صاحب ایم اے)

(بہ سلسلہ سابق)

نہ صرف زبان ہی سے علامہ اقبال نوجوانوں کی تعمیر سیرت پر زور دیتے ہیں بلکہ وہ عملاً بھی اسی قسم کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ لاہور کے چند نوجوان طلبا علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک جلسہ مشاعرہ کی صدارت کے لئے درخواست کی۔ علامہ نے فرمایا خیر میں صدارت تو کرتا ہوں لیکن شاعری تم لوگوں کے لئے بہت مضر ہے اور پھر اس کے بعد موجودہ شاعری اور اس کے بے فائدہ ہونے پر اس قدر شدت سے لیکچر دیا کہ ان جوانوں کا تمام جذبہ شعری یک لخت ٹھنڈا ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ ہم نوجوانوں کی جو حالت ہے یعنی یورپ کی کورانہ تقلید۔ احساس غلامی غائب خود پر بھروسہ نہیں اعتماد نہیں۔ تعلیم کو محض ذریعہ معاش یا ذریعہ وجاہت سمجھنا۔ "کالج میں بیٹھ کر محض ڈینگیں مارنا" ظاہر کو اصل حقیقت جاننا۔ خود غرض اور اپنی ہی فکر ہونا اس لئے آپس میں نفاق۔ مادہ اور حواسی چیزوں پر یقین رکھنا اس لئے بیدینی لامذہبی۔ تن کی پرورش اور روح کی تربیت سے ناآشنا محض۔ عیاں ہے کہ جس قوم کے افراد کا یہ حال ہوگا اس قوم کی بقا کیونکر ہو سکتی ہے۔ اب جبکہ قومیں زندگی کی دوڑ میں مصروف ہیں اور عرصہ کائنات میں فنا و بقا کا سخت معرکہ گرم ہے جس نے ہاتھ پاؤں ڈال دئے یا جو نرم بستر کا جویا ہوا یقینی اس کو دوسری قومیں کچلتی ہوئی اور روندتی ہوئی آگے نکل جائیں گی۔ کیا مسلمان قوم اس قابل ہے کیا اس میں زندگی کی اس قدر قوت ہے کہ وہ موجودہ تنازعہ اللبقا کی گرما گرمیوں کی تاب لا سکے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ اب وہ مسلمان مسلمان ہی نہیں رہا۔ اب مسلمان اور مسلمان بچے جیسے رہ گئے ہیں ان کی صورت ان کی حالت یہ ہے:-

مومن وبیش کساں بستن نطاق! — مومن وغداری و فقر و نفاق!

با پشیزے دین و ملت را فروخت ‏ ‏ ‏ ‏ ہم متاع خانہ و ہم خانہ سوخت
لا الہ اندر نمازش بود و نیست ‏ ‏ ‏ ‏ ناز ہا اندر نیازش بود و نیست
زور در صوم و صلوٰۃ او نماند ‏ ‏ ‏ ‏ جلوہ در کائنات او نماند
آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ ‏ ‏ ‏ ‏ فتنۂ او حب مال و ترس مرگ
رفت ازو آں مستی و ذوق و سرور ‏ ‏ ‏ ‏ دین او اندر کتاب و او بہ گور
صحبتش از عصر حاضر در گرفت ‏ ‏ ‏ ‏ حرف دیں را از دو پیغمبر گرفت
آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد ‏ ‏ ‏ ‏ آں ز حج بیگانہ و ایں از جہاد
تا جہاد و حج نماند از واجبات ‏ ‏ ‏ ‏ رفت جاں از پیکر صوم و صلوٰۃ
سینہ ہا از گرمیٔ قرآں تہی ‏ ‏ ‏ ‏ از چنیں مرداں چہ امید بہی

از خودی مرد مسلماں در گذشت
اے خضر دستے کہ آب از سر گذشت

سجدۂ کز وے زمیں لرزیدہ است ‏ ‏ ‏ ‏ بر مرادش مہر و مہ گردیدہ است
سنگ اگر گیرد نشانِ آں سجود ‏ ‏ ‏ ‏ در ہوا آشفتہ گردد ہم چو دود
ایں زماں از سر بزیری ہیچ نیست ‏ ‏ ‏ ‏ اندرو جز ضعف پیری ہیچ نیست
آں شکوہ ربی الاعلیٰ کجا ست ‏ ‏ ‏ ‏ ایں گناہ اوست؟ یا تقصیر ماست
ہر کسے بر جادہ او تند رو ‏ ‏ ‏ ‏ ناقۂ مابے زمام دہر زہ دو

صاحب قرآن و بے ذوق طلب
العجب ثم العجب ثم العجب

(جاوید نامہ)

اپنے گذشتہ سے ہم سبق نہیں لیتے۔ حال کی کیفیتوں اور زار حالتوں کو دیکھتے ہیں لیکن آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ آئندہ کے ہولناک نتائج رہ رہ کر اپنا بھیانک چہرہ ہم کو دکھلاتے ہیں لیکن ہم ہیں کہ بیفکر اور لاپرواہ بیٹھے ہیں۔ ہم کو اپنے میں اعتبار نہیں رہا۔ خود میں زور اعتماد

ہنیں۔ ہا۔ فنا (ویدانت اور بودھ مذہب والی) کو ہم بقا سمجھنے لگے ہیں اور اپنی کشتی موجوں کے تلاطم پر بغیر کسی پتوار یا ناخدا کے ڈال رکھی ہے۔ ہم خود قرآن کو پس پشت ڈال دینے کی وجہ سے اپنا راستہ تاریکیوں میں بھلا بیٹھے ہیں ایسے حالات میں اقبال کی آواز پر لبیک نہ کہنا گویا موت کو قطعی دعوت دینا ہے۔ اقبال کی بانگ کہ اپنی خودی میں یقین رکھو۔ ناامیدی بھول جاؤ۔ دل میں درد اور تپش پیدا کرو دل کو بلند اور روح کو سربلند کرو۔ فقر کو جادۂ راہ بقا سمجھو۔ راہ حق اور راہ دین میں گامزن ہو۔ یہ ایسی بانگ درا ہے کہ سونے والوں کو بغیر چونکائے نہیں رہ سکتی اور مست اور نیند کے متوالوں کو ایسا ہلا دے گی ایسا جھنجوڑ دے گی کہ وہ لامحالہ آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

لیکن ایک سوال یہاں پر پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کا یہ نوجوان عملی ہے یا محض خیالی یعنی یہ کہ وہ نوجوان جو اقبال کے دل و دماغ میں ہے کیا دنیا میں واقعی طور پر ایسا ہونا اور ایسا تربیت اور تعلیم سے بن جانا ممکن ہے؟ بجا طور پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ جوانی جس میں کہ شباب فطرتاً جوش اور نمائش خودی پر بہت مائل ہوتا ہے کیا اقبال کے فقر کی تلقین دل پر رکھ سکتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہو سکتا ہے؟ کیا وہ دنیا اور علائق دنیا سے اپنے دل کو الگ کر سکتا ہے جبکہ ہر ہر قدم پر اس کے لئے لغزش کے لئے سامان موجود رہتے ہیں۔ کیا وہ اس دنیا سے جس کو وہ بہت رنگین دیکھتا اور سمجھتا ہے یوں دل برداشتہ ہو سکتا ہے کہ اس میں بھی رہے اور اس سے الگ بھی رہے۔ باہمہ اور بے ہمہ کا اصول اہل شباب کے لئے ناممکن ہی سا معلوم ہوتا ہے دل میں فقر پیدا کرنا۔ جوانی میں اپنے دل کو بڈھا بنا لینا ایک دماغی بیماری کہی جا سکتی ہے نہ کہ اس کا صحیح استعمال۔

اقبال کے پیغام فقر کی غلط تشریح ہو گی اگر اس سے اس قسم کے شکوک پیدا ہوں۔ اقبال کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ نوجوان اپنے احساسات یا جذبات یا خیالات میں کسی طور پر بڈھا ہو جائے بلکہ وہ تو ایک ابدی شباب جوش اور ذوق عمل کی تلقین کرتا ہے۔ یہ صحیح کہ زمانۂ شباب تمام و کمال رنگینیاں اور دلچسپیاں اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے اور اپنے باہر کی دنیا بھی رنگین

دو دلچسپ دیکھتا ہے لیکن وہ یہ تو کہیں نہیں کہتا کہ اس رنگینیٔ تخیل کو مار دو۔ یا برہمچریوں کی طرح نفس کے فنا کرنے کی ترغیب نہیں دیتا (بلکہ وہ اس کے سخت خلاف ہے ملاحظہ ہو واقعہ بر مجلہ چند گھنٹے علامہ اقبال کے ساتھ۔ معارف ستمبر ۱۹۳۸ء) بلکہ وہ البتہ یہ بتاتا ہے کہ یہ ثانوی چیز ہے اول شئے حق کی راہ میں جد وجہد۔ اور اپنی خودی کی تعمیر ہے اور اپنے کردار و سیرت کی تربیت

معارف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

لیکن شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہونے سے پیشتر معارف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کرنا اول شرط ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کا نوجوان خیالی نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ اول تو اقبال کی تلقین جد و جہد جوش و سرگرمی کے ساتھ میں فطرت شباب کے مطابق ہے۔ اس کے علاوہ طبیعت میں استغنا و ہمت و پامردی اور خود اعتمادی کا پیدا کر دینا بھی جوانی کی نفسیات کے بالکل مناسب ٹھیرے گا۔ اس لئے کہ جوانی ہی میں آدمی اپنے میں زور و سوز محسوس کرتا ہے جوانی ہی میں وہ تمام دکماں پر فتح کرنے اور ہر شئے پر قدرت حاصل کرنے کا طامع ہوتا ہے اور جوانی ہی میں اپنی محنت و کوشش کے اعتماد پر اپنے میں آسانی سے شان استغنا پیدا کر سکتا ہے۔ بڑھاپا ضعف قویٰ کا زمانہ ہے اور کمزوری کی وجہ سے حرص دنیا اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اپنے میں وہ شان بے نیازی نہیں پیدا کر سکتا جتنا کہ ایک نوجوان اپنے دل میں پیدا کر سکتا ہے اور اسی شان بے نیازی کا دوسرا نام فقر ہے۔ اپنے نظریہ فقر کی اقبال مزید تشریح اس طرح کرتے ہیں

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا اللہ کی شان بے نیازی
کنجشک و حمام کے لئے موت ہے اس کا مقام شاہبازی!
روشن اس سے خرد کی آنکھیں بے سرمۂ بو علی و رازی!
حاصل اس کا شکوہ محمود فطرت میں اگر نہ ہو ایازی
تیری دنیا کا یہ سرافیل رکھتا نہیں ذوق بے نوازی

ہے اس کی نگاہ عالم آشوب　　در پردہ تمام کارسازی!
یہ فقر غیور جس نے پایا　　بے تیغ و سناں ہے مرد غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری　　(جاوید سے۔ ضرب کلیم)

اقبال کا پیام عمل اور اقبال کی صلاح جد وجہد نوجوانوں کے خون کو گرم کرتی ہے اور چونکہ گرمی شباب کا تقاضا ہے اس لئے کسی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال کا پیغام جوانوں کی فطرت کے مطابق نہیں ہے رہی وہ باتیں جن کی تربیت اقبال نے بتلائی ہے وہ ان میں پہلے سے موجود ہوتی ہیں اس لئے ذرا سی تربیت سے ان خصائص کو غیر معمولی طور پر ترقی دی جا سکتی ہے مثلاً کون جوان ایسا ہوتا ہے جس کے دل میں حوصلہ مندی عزم وہمت کے جذبات نہیں ہوتے۔ اسی جذبۂ حوصلہ مندی کو اقبال اور بھی اکسانا چاہتے ہیں اس قدر کہ زمین و آسمان پر اس کو مالک بنانا چاہتے ہیں بلکہ ذوق طلب اس قدر بڑھا دینا چاہتے ہیں کہ کسی مقام پر رک جانا یا کسی خاص جگہ کو منزل قرار دے دینا وہ نوجوان کے ذوق کی تشنگی و حوصلہ کی پستی قرار دیتے ہیں

تو رہ نورد شوق ہے! منزل نہ کر قبول!　　لیلیٰ بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول!
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز　　ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول!

جوانوں کو اس قسم کی تلقین ظاہر ہے ان کی فطرت کے کس قدر مطابق ہے اور کیونکر تحسین کی جا سکتی ہے

اقبال کے اس نوجوان کے متعلق ایک دوسرا سوال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا وہ شعائر و روایات اسلامی کے مطابق ہے؟ صوفیا وکرام تو اس سے قبل ذات کو فنا کر دینے کی تعلیم دیا کرتے تھے اور قرآن سے اس کی تاویلیں بھی پیش کرتے تھے۔ جبر کو اصول زندگی مانتے تھے اور خود کو مٹا کر خدا پر تکیہ کرنا شرائط ایمان میں سے سمجھتے تھے۔ یہ آخر اقبال نے کیوں اور کیسے خود کی بقا اور خودی

کی قدرت کے اصول قرآن سے استنباط کرلئے

درحقیقت ایران کا تصوف یعنی خودی کا بطلان کا اصول ویدانت اور بدھ مت کے
اصولوں کے موافق تھا اور جیسا علامہ اقبال نے اپنے مقالہ ایران کے فلسفہ میں ثابت کیا ہے
اور اکثر خطوط میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے کہ یہ طریقہ تفکر ایران میں انھیں مذاہب کے پیروں کی
تعلیم سے وہاں پہنچ چکا تھا اس لئے وہاں کے تفکر وتخیل پر جاری وساری ہوگیا ورنہ ظاہر ہے
کہ یہ چیز سامی نسلوں میں قطعی موجود نہ تھی اور یوں بھی یہ آریائی قوموں کی چیز ہے۔ اور اپنے
اس خیال میں اقبال کو رومی سے بہت کچھ مدد ملی جس نے جبر وقدر کے مسئلہ کو دو لفظوں
میں بالکل واضح کردیا کہ

بال بازاں را سوئے سلطان برد
بال زاغاں را بہ گورستان برد

اس کے علاوہ یہ بات قرآن سے بھی ظاہر ہے کہ فرماتا ہے لیس الانسان الا
ما سعیٰ۔ نہیں ملتا کسی کو مگر اتنا جتنے کے لئے وہ محنت کرے۔ اور بالکل یہی چیز ہے جو رومی
نے بتلائی ہے کہ جس میں جتنی ہمت وجرات ہوتی ہے اتنا ہی اس کا رتبہ بلند ہوتا ہے ورنہ
یوں زاغ اور باز دونوں کے پر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ خودی کی فنا وبقا کے متعلق قرآن
شریف کا صاف حکم موجود ہے کہ لا تحزن ولا تقنطو۔ ظاہر ہے جب یہ حکم دیا جائے گا
کہ نہ غم کرو اور نہ ناامید ہو تو اس سے کبھی یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ اپنی خودی کو مٹادو اور اپنی
خودی کا مٹانا تو اسی وقت ہوسکتا ہے جب زندگی اور دنیا کو ہر طرح ہیچ سمجھا جائے اور یہی بدھ
مذہب کا خاص پرچار ہے کہ چونکہ زندگی جینے کے لائق نہیں اور دنیا فانی ہے اور دکھ اور فساد
سے بھری اس لئے اس میں جی لگانا بے کار ہے زندگی بدھ ازم کے مطابق فقیری میں اور بھکشو
بن کر گذارنا چاہیئے خود کو فنا اور بے کار محض سمجھ کے۔ اسلام نے اس قسم کی رہبانیت کی کبھی تعلیم
نہیں دی لا رھبانیۃ فی الاسلام۔ اسلام نے مادہ کی حقیقت سے انکار کبھی نہیں کیا اور

نہ اس سے الگ رہنے یا بھاگنے کی کبھی تعلیم دی۔ ہاں مادہ سے اپنی ذات اور روح کو بلند رکھنے کی البتہ تلقین کی ہے۔ مادیات کو مقصد بالذات نہیں بنایا، روح کو مادہ میں زندگی کرنے کو کہا لیکن یہ بھی کہا کہ اپنے دیدہ و دل دار کھے اور محض مادہ ہی میں نہ متوجہ رہے اور اسی کو اقبال فقر کہتے ہیں۔

دلا رمز حیات از غنچہ دریاب حقیقت در مجازش بے حجاب است
زخاک تیرہ می روید و لیکن نگاہش بر شعاع آفتاب است

ان دلائل کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اقبال اپنے نوجوان کو جو خودی کی تعمیر کی اور بے خوفی کی تعلیم دیتا ہے وہ سراسر قرآں کے احکام کے مطابق ہے۔ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون اس کی تلقین میں جاری وساری ہے۔ یا یہ امر کہ انھوں نے صرف مسلمان نوجوانوں کو کیوں مخاطب کیا کیا دوسرے جوانوں میں اس قسم کی کمزوریاں نہ تھیں جو مسلمان نوجوانوں میں پائی جاتی ہیں یا کیا یہی تعلیم دوسری جوانوں کے لیے مفید ثابت نہ ہوگی۔ اس امر کا شافی جواب ان کے ایک خط میں مل سکتا ہے جو انھوں نے ڈاکٹر نکلسن کو اپنے ایک معترض مسٹر ڈکنس کے متعلق لکھا ہے جو کہتا تھا کہ ان کا تخاطب مسلمانوں ہی سے صرف ان کے محبت اسلام کی وجہ سے ہے

"یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنس کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیش نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھیرایا ہے بلکہ دراصل میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔ مسٹر ڈکنس کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائنات انسانیت کے اتحاد عمومی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کرلیتا ہے اور کہتا ہے

تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم"

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اقبال کی موجودہ مسلم نوجوان کی بیماری کی تشخیص صحیح ہے اور کیا ان کا طریقہ علاج جو انھوں نے بتایا ہے وہ مفید ثابت ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں کیا اقبال

کا نوجوان موجودہ تنازعۃ البقا اور کشمکش کو سر کرنے کے لائق اور اسمیں کامیاب ثابت ہوگا۔ اور اس قدر کامیاب کہ وہ دوسروں سے بازی لے جا سکے گا۔

یہ تو بالکل عیاں ہے کہ مسلمان من حیثیۃ القوم آج کل بہت پستی کی حالت میں ہیں دوسری قومیں ان سے بہت آگے بڑھ چکی اور بڑھ گئی ہیں۔ مسلمان بالکل جمود کی حالت میں ہیں۔ اس لئے کہ کوئی راہ عمل ان کے سامنے نہیں ہے۔ وہ ہر قوم کو آگے بڑھتے دیکھتے ہیں اور تکتے ہوئے رہ جاتے ہیں۔ آپس میں نفاق الگ۔ افراد کے سردار الگ بے ذوق و پست۔ نہ ارادوں میں زور نہ ولولوں میں شور اس تمام پستی کی اصل وجہ کیا ہے؟ محض یہ کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے، دوسری وجہ یہ کہ غلط تعلیم و تربیت

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندان مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

ظاہر ہے کہ ایسی تعلیم پائے ہوئے نوجوان کس قسم کے نکلیں گے

یہ بتاں عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں
نہ ادائے کافرانہ نہ تراش آذرانہ

یا

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

غرضکہ مسلمان اور مسلمان نوجوانوں کی جو حالت آج کل ہے اس کی تشخیص اور نبض شناسی اقبال نے بالکل صحیح کی ہے۔ اب رہا طریقۂ علاج؛ اقبال نے پہلے جڑ ہی کی حالت درست کرنا مناسب سمجھا اور اس کی درستی کے لئے ان کا پہلا اور اصلی گر خودی کی تلقین ہے۔ جب انسان اپنے آپ کو صحیح راستہ پر اور مضبوط خیال کرنا شروع کرے گا تو ظاہر ہے اس کی وہ تمام قوتیں برسرکار آ جائیں گی جو اس میں پنہاں ہیں اور یہی تخلیق کا مقصد ہے کہ ہم اپنی تمام خوابیدہ قوتوں کو بیدار کریں اور اس طرح فطرت کے عطایا کا صحیح اور جائز استعمال ہو سکے۔ جب دل سے کمزوری کا احساس جاتا رہا اور نگاہ میں گرمی آنا شروع ہوئی تو ایسا نوجوان جو نہ کچھ کر ڈالے عجب نہیں

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے برندہ و براق

اس کی نگہ شوخ پہ ہوتی ہے نمودار
ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے جو قوت اشراق

اور ایسا نوجوان جس کی خودی بیدار ہو گئی ہو اس کی زندگی کا کیا کہنا

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی　　نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر

خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب　　خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر

اقبال کا دوسرا اگر فقر کی تلقین ہے اور درحقیقت یہ بہت بڑا اور اہم اصول ہے۔ دنیا میں رہنا لیکن دنیا کو مقصد بالذات نہ سمجھنا خاک سے اور خاک میں پیدا ہونا لیکن کرۂ خاکی سے اپنے کو سربلند رکھنا دراصل عزم و ہمت و حوصلہ کی بہترین تربیت ہے اور خصوصاً مسلمان کے لئے آج کل جب کہ ان کی اپنے نصب العین سے ناواقفیت ان کو مختلف غلط راستوں پر ڈال دینے کے لئے آمادہ ہے۔ ہیں زر و مال و خوں ریزی و جہانگیری حرص و طمع کے جال پھیلائے ہوئے ہے اور مسلمان کے قدم اس کی طرف لڑکھڑاتے ہوئے اور اس غلط راستہ پر بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں اقبال کے یہ بانگ فقر نہایت خوش آیند کہی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے کہنے کا طرز بھی کچھ کم موثر نہیں۔ جوش و روانی۔ زور و شور کے ساتھ جوان کا اپنا ذاتی ڈھنگ ہے اور خون نوجوان کے لئے بہت موزوں وہ مسلمان نوجوان کو گذشتہ کی بھی یاد دلاتے ہیں اور گذشتہ کی حالات بتا کر اسے اکسانا اور آمادہ کرنا چاہتے ہیں۔ (تاریخ کی تعمیری قوت سے وہ بخوبی واقف ہیں ان کے نزدیک سر زند از ماضی تو حال تو خیزد از حال تو استقبال تو)

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے؟　　وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارہ

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں　　کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاجِ سرِ دارا

طنز سے بھی موقعہ موقعہ سے کام لیتے ہیں

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا　　موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات

بہتر ہے کہ بے چارے مموں کی نظر سے　　پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں　　کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ!

غرضکہ ہر طرح سے وہ مسلم خوابیدہ کو بیدار کر دینا چاہتے ہیں۔ درد دل میں ہے اس لئے انہیں

اپنی غایت اور اس غرض سے کام ہے کہ مسلمان نوجوان بیدار ہو جائیں ورنہ طریقہ بیداری ان کی شاعری کا جزو اصلی نہیں

اب رہی یہ بات کہ ایسا نوجوان موجودہ دنیا میں اپنا کیا درجہ رکھے گا سو ظاہر ہے کہ جب خود میں اتنا زور پیدا ہو جائے گا اور اپنے میں اس قدر اعتماد ساتھ ہی دل میں وسعت نگاہ میں بلندی اور جان میں سوز تو ایسے نوجوان کے راستوں میں کونسی رکاوٹیں حایل ہو سکیں گی۔ صرف یہ نہیں کہ وہ موجودہ حالات زندگی کے موافق اپنے آپ کو بنا سکے گا بلکہ اپنی قوت روحانی کی بدولت وہ مصاف زندگی میں اس قدر طاقتور ثابت ہوگا کہ اپنے حالات اپنے خارجی واقعات پر پورا پورا قبضہ وقدرت حاصل کر سکے گا۔ وہ محض اپنے زمانے اور وقت کی پابندی نہ کرے گا بلکہ اپنے زمانہ اور وقت کو اپنا پابند بنائے گا۔ اس کے علاوہ چونکہ علامہ اقبال نے روح کی تربیت فرمائی ہے اس لئے ایسا نوجوان محض کسی خاص زمانہ اور خاص عہد ہی کے لئے موزوں اور مناسب نہ سمجھا جائے بلکہ تمام آنے والے عہدوں اور زمانوں کے لئے کسی خاص مقام یا جغرافی چار دیواری کے لئے نہیں بلکہ ہر مقام اور ہر جگہ کے لئے۔ مختصراً یہ کہ ایسا نوجوان ہمیشہ کے لئے مثالی رہے گا۔ اس لئے کہ روح کے لئے صحیح تعلیم اور صحیح راستہ کا مل جانا شرط ہے۔ گامزن تو وہ ہو ہی جائے گی۔ مسلمان قوم اب تک محض اس وجہ سے دوسروں کا منھ دیکھتی رہی اور دوسروں کی تقلید کرتی رہی کہ اسے خود اپنا جادہ نہیں معلوم تھا اس کے علاوہ صوفیا نے انھیں غلط راستہ پر ڈال دیا تھا۔ اب جب کہ انھیں ایک درویش اور دانائے رہز نے صحیح راستہ دکھا دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان قوم پھر گذشتہ کی طرح دوسری قوموں کے مقابلے میں سربلند اور ممتاز نظر آنے لگے

اب ایک سوال اور رہ جاتا ہے وہ یہ کہ کیا مسلمانوں کے لئے اس سے بہتر نوجوان یا مسلمان نوجوان (یا کسی نوجوان) کے لئے اس سے بہتر تعلیم ممکن ہے؟ بہتر و بدتر ایک اضافی کلمہ ہے جو ہر زمان و مکان میں مختلف ہوا کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زمانہ کی موجودہ حالت اور دنیا کی نئی زمانہ رنگ کشمکش دیکھتے ہوئے صحیح طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے نوجوان کا تصور مکمل۔ باعمل اور

بہترین ہے اور اس کے ساتھ اتنا بھی ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس سے بہتر بھی کوئی مثالی نوجوان ممکن ہوا اور ساتھ ہی وہ عملی بھی ہوا تو اس کا بھی تخیل اقبال ہی کے نوجوان کی داغ بیل پہ ڈالا جائے گا اور اسی کی محض ایک ترقی یافتہ صورت ہو گی نہ کہ اس مختلف النوع۔

آخر میں بس اب یہی کہا جا سکتا ہے کہ خدا مسلمانوں کو اس کی توفیق دے کہ وہ اقبال کے پیغام کو سمجھیں اور اپنے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اس کے بنائے ہوئے اصولوں پر کرائیں کیونکہ ان اصول کا منبع و مخرج قرآن ہے اور انھیں پہ عمل کرنے سے وہ پھر دنیا میں سربلند اور نیک نام ہو سکتے ہیں۔

جوانوں کو مری آہ سحر دے　　پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے　　مرا نور بصیرت عام کر دے

برطانیہ کس طرح دنیا کی تجارت کا مرکز بن گیا؟

قدیم زمانے میں اس جزیرہ کا نام برٹین تھا اور اس میں نیم وحشی لوگ آباد تھے۔ اس کی جنوبی بندرگاہوں میں جو اس زمانے میں دنیا کا انتہائی شمالی کنارہ سمجھی جاتی تھیں رومی تاجر آکر رہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ یہاں ٹین ملتا تھا جس کی برونز (یعنی تانبے اور ٹین کا مرکب) بنانے میں ضرورت پیش آتی تھی۔ اس زمانہ میں جب لوگوں کو لوہے کا زیادہ علم حاصل نہیں تھا اوزار اور ہتھیار بنانے کے لئے برونز کو ہی سخت ترین دھات کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ انگلستان میں آج جس علاقہ کا نام کارنوال ہے وہاں جولیس سیزر کے زمانے (۵۵ ق۔ م) سے پہلے ٹین کی کانوں کو کھودنا شروع کر دیا گیا تھا اور رومی جہاز اسے اٹلی لے جایا کرتے تھے۔ لیکن ان ابتدائی تجارتی تعلقات کے باوجود انگلستان ایک تجارتی قوم نہیں بن سکی تھی۔

امریکہ کی نئی دنیا کے دریافت ہونے سے پہلے جزائر برطانیہ دنیا سے بالکل الگ تھلگ واقع تھے۔ اس زمانے میں جس دنیا کا لوگوں کو علم تھا اس کا مرکز بحر روم تھا اور جیسے وینس، اسکندریہ بغداد اور موصل دنیا کے تجارتی شہر سمجھے جاتے تھے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں جہاز بحر روم میں تیرا کرتے تھے اور قیمتی سامانوں سے لدے ہوئے اونٹوں کے قافلے مشرقی یورپ سے مغربی ایشیا کا مسلسل سفر کرتے رہتے تھے۔

لیکن برطانیہ کے پاس تاجروں کو دینے کے لئے کچھ زیادہ مال نہیں تھا اور اس کا محل وقوع بھی تجارت کے لئے موزوں نہیں تھا۔ رومی اور دوسرے قدیم لوگوں کا خیال تھا کہ برطانیہ پر سطح زمین کی حد ختم ہو جاتی ہے اور چونکہ زمین کی گولائی کا علم عام طور پر لوگوں کو نہیں تھا اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ اس سے آگے بڑھنے کے معنی یہ ہیں کہ فنا کے اتھاہ گڑھے میں کود جائے۔ قدیم اسکندریہ اور یورپ میں دنیا کے جو نقشے عہد وسطیٰ میں بنائے جاتے تھے ان میں برطانیہ کو دنیا کے شمال مغربی سرے پر جگہ دی جاتی تھی۔ دوسرے مہذب

ملکوں سے چونکہ اس کے تعلقات بہت کم تھے اس لئے اسے یورپ کے وحشیوں اور غیر مہذب لوگوں کا تاریک مسکن سمجھا جاتا تھا۔

بعد کے زمانے میں بھی تاجروں کو برطانوی بندرگاہوں تک پہنچنے کے لئے جن کی آبادی چھوٹے قصبوں سے زیادہ نہیں تھی ساحل اٹلانٹک تک سفر کرنے کا کوئی خاص شوق پیدا نہیں ہوا۔ وہ اسے زیادہ پسند کرتے تھے کہ بحر روم کے ان شہروں کا سفر کریں جو نزدیک تھے اور ساتھ ہی ساتھ بہت مہذب بھی تھے۔ یہاں تاجروں کو تفریح و دلبستگی کا خوب موقع ملتا تھا۔ اگر جینوآ کا کوئی تاجر خرید و فروخت کرنا چاہتا تھا تو چند روز کا سفر کر کے وہ مارسائی یا اور زیادہ نزدیک کے شہروں مثلاً فلورنس اور وینس تک چلا جاتا تھا۔ اسکندریہ تک بھی وہ جا سکتا تھا جہاں اسے ہندوستان، چین، ایران اور عراق عرب کے تاجروں سے مال کے مبادلہ کا موقع مل سکتا تھا اور اگر وہ اپنا گھر چھوڑنے کے لئے مایل نہ ہوتا تھا تب بھی گھر بیٹھے بہت سے ملکوں کا مال اسے مل جاتا تھا کیونکہ اس زمانے میں اٹلی دنیا کے کاروبار کا مرکز تھا۔

لیکن بےچارہ انگریز تاجر اتنا خوش نصیب نہیں تھا۔ کیونکہ جنوآ، وینس اور بروگس کے جہاز محض کبھی کبھی انگلستان کی بندرگاہوں کی طرف آ نکلتے تھے۔ جس علاقہ کو آج بلجیم کہا جاتا ہے خصوصاً اس کا شہر بروگس تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی میں دنیا کی تجارت کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔ بروگس کے کپڑے کے تاجر انگریزی اون خریدتے تھے اور اس کے معاوضہ میں ٹلی کا بنا ہوا سامان دیا کرتے تھے۔ لیکن اکثر و بیشتر غریب انگریز تاجروں کو اپنا مال بیچنے کے لئے اپنا گھر بار چھوڑ کر دوسرے ملکوں کو جانا پڑتا تھا اور انھیں بڑی مشکلوں اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان کے لئے بحری سفر بہت طویل اور خطرناک ہوتا تھا۔ بحری ڈاکوؤں کے جہاز ان پر اکثر حملے کر دیا کرتے تھے اور ان کے مال پر قبضہ کر کے ان کے جہازوں کو ڈبو دیتے تھے۔ جب کبھی یہ بےچارے منزل مقصود پر خیر و عافیت سے پہنچ جاتے تھے تو اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ان کے مال کی طرف کوئی متوجہ ہی نہیں ہوتا تھا۔

نئی دنیا کا انکشاف لیکن ۱۴۹۲ء کے بعد سے حالات نے ایک نیا رنگ اختیار کرنا شروع کیا کہ کرسٹوفر کولمبس نے جو

اٹلی کا ایک جہاز راں تھا غیر معلوم سمندروں کا سفر کیا اور انگلستان کے مغرب میں نئی سرزمین کو دریافت کیا جس کا نام بعد میں امریکہ رکھا گیا۔ اس کے بعد اور لوگوں نے اس سلسلہ کو جاری رکھا اور بہت جلد سمندر پار دوسرے براعظموں یعنی شمالی اور جنوبی امریکہ کو دنیا کی حدود میں شامل کر لیا گیا۔

انگریزی جہاز رانوں نے بھی اس نئی سرزمین کو دیکھنے کے لئے مغرب کا سفر کیا۔ انگریزوں کے بادشاہ کی ملازمت میں وینس کا ایک جہاز راں جان کیبٹ تھا اس نے ۱۴۹۷ء میں نیوفاؤنڈلینڈ کو دریافت کیا۔ انگلستان کے غریب بادشاہ نے اسے اس کارگزاری کے صلہ میں دس پونڈ یعنی ڈیڑھ سو روپیہ انعام دیا! لیکن انگلستان کے لوگوں نے دیوانوں کی طرح اس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔ بہت سے آدمی آیندہ کے بحری سفر میں اس کے ساتھ جانا چاہتے تھے۔

ان انکشافات کی وجہ سے ہر ملک کی تجارت کی رفتار تیز ہوگئی۔ اسپین اور پرتگال نے جن کا شمار اس وقت کی بڑی تجارتی قوموں میں کیا جاتا تھا سونا اور دوسری دولت کو لانے کے لئے دریافت کرنے والوں اور فتح کرنے والوں کو روانہ کرنا شروع کر دیا اور ان ملکوں کی دولت بہت تیزی کے ساتھ بڑھ گئی۔ اس کے بعد واسکوڈرگاما نے جو پرتگال کا ایک حوصلہ مند جہاز راں تھا افریقہ کے گرد چکر لگایا اور یہ معلوم کیا کہ تاجروں کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ پورا راستہ پانی پر طے کر کے اپنا مال ہند شرقی، چین اور ہندوستان تک لے جائیں۔ بحر روم کے تاجر شرقی ملکوں کی تجارت میں اپنا حریف کسی کو بنتا نہ دیکھ سکتے تھے اس لئے انھوں نے مشکلات پیدا کرنے کی پوری کوشش کی تاکہ مغربی یورپ کے تاجروں کو مکمل بحری راستہ نہ مل سکے۔ مگر اب ایسا راستہ ہند اور ماورائے ہند کا دریافت ہو گیا تھا جس پر ان کو کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔

یہ اہم خبر ایک جہاز راں سے دوسرے جہاز راں تک، ایک شہر سے دوسرے شہر تک، ایک ملک سے دوسرے ملک تک پھیلتی رہی۔ انگلستان کو ایشیا سے اپنی تجارت بڑھانے کا بہت شوق تھا اس نئے بحری راستہ کے دریافت ہو جانے کے بعد اس نے بھی تجارت کی اس تگ و دو میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا۔ انگریزی ملاحوں نے پرتگیزی جہازوں پر ملازمت کرنا شروع کی تاکہ اس بحری راستہ کے

رموز کا پتہ چلائیں جو افریقہ کے گرد جاتا ہے۔ انگریزی تاجروں نے دور دراز علاقوں مثلاً ترکی، روس، عمانٹا اور افریقہ کے شمالی ساحل سے بھی تجارتی تعلقات شروع کر دئے اور انگلستان نے اس کا بھی پورا ارادہ کرلیا کہ مغرب میں جو نئی زمینیں دریافت ہوئی ہیں ان کی تجارت میں بھی اپنا واجبی حصہ حاصل کرے۔

سنہ ۱۵۰۰ء میں برطانوی بندرگاہیں تجارت کے خوش حال مراکز بن گئیں

یورپ کے ملکوں میں جہاں جہاں تجارت کی جاتی تھی وہاں کشتی سازی اور ملاحی نے اہم پیشوں کی حیثیت اختیار کرلی۔ برطانیہ کے نوعمر لڑکے ملاح بن کر سمندر کے سفر کرنے لگے۔ برطانوی تاجر خوشی کے ساتھ اپنے جان اور مال کو دنیا کے بعید ترین گوشوں سے تجارت کرنے کے لئے خطرہ میں ڈالنے لگے۔ انگلستان کے جری سپاہیوں نے جنھیں "ایلیزبتھ کے سمندری کتوں" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا یعنی ڈریک، ریلے، ہاکنس اور گلبرٹ نے حریف ملکوں کے جہازوں کے سفر کو بہت خطرناک بنا دیا۔ اسپینی جہازوں کی دولت کو یہ لوگ اکثر لوٹ لیا کرتے تھے جس کا یہ اثر ہوگیا تھا کہ برطانوی جھنڈے کو دیکھ کر غیر ملکی ملاح کانپنے لگتے تھے ان لوگوں نے بہت سے سالوں تک اسپین کی تجارت کو لوٹنے کا سلسلہ جاری رکھا اور ان جہازوں کے مال کو اپنے وطن لے جاتے رہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ غلاموں کی تجارت بھی کیا کرتے تھے۔ افریقہ سے غلاموں کو خریدتے تھے اور ہند مغربی کے اسپینی نوآبادی بسانے والوں یا اسپین کے دولتمند لوگوں کے ہاتھ انھیں فروخت کر دیتے تھے۔

یہ لوگ اس قدر دلیر تھے اور اسپین کے جہازوں کو اتنا نقصان پہنچاتے تھے کہ آخر میں مجبور ہو کر اسپین نے انگلستان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ لیکن اس جنگ میں اسپین ناکامیاب رہا۔ سنہ ۱۵۸۸ء میں اسپین کا شاندار بیڑہ یعنی آرماڈا جو انگلستان کی بڑھتی ہوئی بحری قوت کو تباہ کرنے کے لئے بنایا گیا تھا ختم کر دیا گیا۔ اور اس طرح انگلستان کا ایک نہایت طاقتور حریف مقابلہ کے [illegible] میدان سے خارج ہوگیا۔ انگلستان کے لوگوں کی ہمتیں اور حوصلے بڑھ گئے، اور انھوں نے کل دنیا کی تجارت پر قبضہ کرنے کے لئے اپنی توجہ کو مرکوز کرنا شروع کر دیا۔

غرضکہ اس چھوٹے سے جزیرے کی [illegible] دنیا کے ساتھ بڑھتی رہی۔ اب دنیا میں اس کا محل وقوع بدل چکا تھا۔ اسپین اور پرتگال کے علاوہ یورپ کے باقی تمام ملکوں کے مقابلہ میں امریکہ سے اس کا فاصلہ کم یا برابر

تھا۔ اس کے پاس بہت سی اچھی بندرگاہیں اور عمدہ جہاز تھے۔ اس کی قوم کے لوگ ماہر جہاز ران بن گئے تھے اور انھیں تجارت کے فائدہ کا بھی پوری طرح علم تھا۔

چنانچہ اب انگلستان کا مقابلہ غیر ملکی تاجروں کے ساتھ بہت سخت قسم کا ہوگیا تھا۔ زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے انگلستان کے لوگ بڑے خطرے برداشت کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اپنے لدے ہوئے مال کو حفاظت کے ساتھ پہنچانے کے لئے انگلستان کے سمندری کپتان طوفانوں کے موقع پر، دشمن کے جہازوں کی لڑائی کے وقت اور دوسرے خطرات کے موقعوں پر جان کی بازی لگا دیتے تھے۔ خوفناک بحری ڈاکو اب بھی ساحلوں پر گھات میں لگے رہتے تھے۔ جہاز بہت مختصر اور نازک ہوتے تھے اور اگر موجودہ معیار سے انھیں جانچا جائے تو بڑے سمندروں کے خطرات کے مقابلہ کرنے کی اہلیت ان میں بہت کم تھی۔

ملک کے اندر جو لوگ انگلستان کی تجارت کے کام میں مصروف تھے ان کی جانیں تو خطرے میں نہ ہوتی تھیں لیکن وہ اپنا مال خطرے میں ڈال رہے تھے۔ دولتمند خواتین اپنے زیور گروی رکھ کر تجارتی مال سے جہازوں کو لادا کرتی تھیں۔ بیرونی تجارت سے نفع کمانے اور اپنی دولت کو کئی گنا بڑھانے کے لئے لوگ اپنا سارا روپیہ خطرے میں ڈال دیتے تھے۔ اس زمانے میں صرف قیمتی مال جہازوں پر لادا جاتا تھا اور جب یہ مال ایک دفعہ ملکی بندرگاہوں میں حفاظت کے ساتھ پہنچ جاتا تھا تو اسے بہت بڑے نفع کے ساتھ فروخت کیا جا سکتا تھا۔ لوگ نفع کو ہی اپنے سامنے رکھتے تھے اور نقصان کا خیال اور اس اندیشہ کو کہ ممکن ہے جہاز ڈوب جائے اور کبھی واپس نہ آئے دل میں جگہ نہ دیتے تھے۔ چنانچہ یہ برابر ہوتا رہتا تھا کہ بہت سے آدمی دولتمند ہو جاتے تھے اور بہت سے بالکل تباہ و برباد۔ کاروباری لوگ بڑی بڑی بازیاں لگاتے تھے اور جہازوں کے واپس آنے کا دیر دیر تک انتظار کرتے رہتے تھے۔

برطانوی تاجروں کی تجارتی کمپنیاں مثلاً ایسٹ انڈیا کمپنی

کسی ایک آدمی کے لئے دولتمند بن جانا بہت مشکل تھا۔ دو سال کی طویل مدت کے سفر کے لئے جو جہاز نکلتے تھے ان کے لئے سامان کوئی ایک آدمی تنہا فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک تن تنہا جہاز کو حملہ آور ڈاکوؤں یا دوسرے ملکوں کے حریف جہازوں کے بالکل رحم و کرم پر رہنا پڑتا تھا۔ تاجروں نے اس مسئلہ کا حل کمپنیاں بنا کر کیا۔ یہ کمپنیاں جہازوں کا ایک بیڑہ

بناتی تھیں ان کو چلانے کے لئے ملاحوں کو ملازم رکھتی تھیں اور طویل سفر کے لئے جس قدر غذا اور دوسری چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی ان سب کو فراہم کیا کرتی تھیں۔ ان کا نام تجارتی کمپنیاں ہوتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ان تجارتی کمپنیوں کی بہت مشہور مثال ہے۔ اس کے جو اراکین سمندر کا سفر کرتے تھے اگر وہ ڈوب نہ جاتے تھے یا ایشیا کے ویران ساحلوں پر بخار میں مبتلا ہو کر نہ مرتے تھے تو واپسی پر خاصے دولت مند ہو جاتے تھے۔ اس کمپنی کی ابتدائی تاریخ مسلسل اور پیہم خطروں، جرأت، ہمت، عزم، استقامت، کامیابی اور ناکامی کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ دوسری کمپنیوں کے مقابلہ میں یہ زیادہ عرصہ تک باقی رہی اور اس کو منافع بھی زیادہ حاصل ہوئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کو سنہ ۱۶۰۰ء میں ان انگریزی تاجروں نے بنایا تھا جنھوں نے ملکہ الزبیتھ سے ہندوستان اور انگلستان کی تجارت کے اجارہ کا پروانہ حاصل کرنا چاہا تھا۔ ملکہ نے انھیں پروانہ دے دیا تھا۔ ۱۶۰۱ء میں چار جہاز جو اس کمپنی کی پہلی تجارتی مہم تھی انگلستان سے روانہ ہوئے تھے اور ڈھائی سال بعد یہ جہاز سیاہ مرچ سے لدے ہوئے واپس آئے تھے۔ کمپنی نے انھیں بیچ کر بہت نفع کمایا تھا۔ اس کے بعد اور زیادہ سرمایہ جمع کیا گیا۔ سنہ ۱۶۰۴ء میں یہی چاروں جہاز دوبارہ روانہ کئے گئے۔ ایک تو تباہ ہو گیا لیکن تین واپس آئے اور اپنے ساتھ سیاہ مرچ، لونگ، جائفل اور جوتری لاد کر لائے۔ کمپنی کے اراکین میں اس کی آمد پر بڑی ہماہمی اور ہنگامہ ہوا تھا۔

سنہ ۱۶۰۶ء میں تین اور جہاز بھیجے گئے لیکن ان کو بہت کم کامیابی ہوئی۔ سنہ ۱۶۰۸ء میں دو جہاز اور بھیجے گئے لیکن دونوں ضایع ہو گئے۔ اس کے بعد ۱۶۰۹ء میں ایک جہاز بھیجا گیا اور اتنا قیمتی مال واپس لایا کہ کمپنی کے شرکا کو دو سو فی صدی منافع تقسیم کیا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس کامیابی کی جب خبر پھیلی تو سرمایہ اکٹھا کرنا بہت آسان ہو گیا۔

سال گذرتے رہے اور کمپنی کی قسمت بھی پلٹے کھاتی رہی۔ بعض سالوں میں اسے نفع ہوتا تھا اور بعض میں نقصان۔ جب جہاز انگلستان واپس آنے میں کامیاب ہو جاتے تھے تو مال کی ہر طرف سے مانگ رہتی تھی۔ لیکن اس زمانے میں جو مال آتا تھا وہ موجودہ زمانے کے مال سے بہت مختلف ہوتا

تھا۔ آج کل کی طرح لوہے، کوئلے، گوشت، گیہوں، تیل وغیرہ سے جہاز لدے ہوئے نہیں ہوتے تھے بلکہ ان میں تیس لاکھ پونڈ سیاہ مرچ، ۲ لاکھ پونڈ جوتری   پندرہ لاکھ پونڈ شورا ہوا کرتا تھا۔ تانبے اور ٹین کی بھی مانگ رہتی تھی۔ اسی طرح کافی، چائے، ادرک، بانس بنگالی ریشم، سوت اور رنگین رومالوں کی بھی مانگ تھی۔ جب کبھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہاز واپس آتے تھے تو لوگ بڑے ذوق اور شوق سے ان چیزوں کو خریدا کرتے تھے۔

لیکن رفتہ رفتہ جہاز رانی محفوظ ہوتی گئی۔ زیادہ جہاز مال سے لدے ہوئے انگلستان واپس آنے لگے اور کمپنی نے آہستہ آہستہ روپیہ پیدا کرنا شروع کیا۔

سنہ ۱۷۰۰ء میں اور کمپنیاں بنائی گئیں۔ کچھ لوگوں نے وہیل مچھلی کا شکار کرنے کے لئے جہاز بنائے اور انھیں گرین لینڈ کے سمندروں میں بھیجنا شروع کردیا۔ وہیل کے شکار کی صنعت بھی اتنی ہی غیر یقینی تھی جتنی مشرق بعید کی تجارت۔ بعض سالوں میں کمپنی کامیاب ہو جاتی تھی اور بعض سالوں میں بالکل ناکام رہتی تھی۔ لیکن ان کمپنیوں کی ناکامی کے باوجود انگریز تاجر اپنا روپیہ ان کمپنیوں میں لگاتے رہے۔ ان کے جہاز کرہ زمین کے دور دراز علاقوں کا سفر کرتے رہے اور انگلستان کی تجارت جیسا کہ حاشیہ کے نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے برابر بڑھتی رہی۔

سنہ ۱۶۱۴ء تا سنہ ۱۷۵۰ء میں انگلستان کی تجارت کی ترقی	
سنہ ۱۶۱۴ء	۲ کروڑ ۱۰ لاکھ ڈالر
سنہ ۱۷۰۱ء	۶ کروڑ ۲۰ لاکھ "
سنہ ۱۷۵۰ء	۱۰ کروڑ ڈالر

اوپر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان کی حالت میں کس طرح تبدیلی واقع ہوئی۔ ابتدا میں انگلستان مہذب دنیا کے بالکل سرے پر آباد تھا لیکن بعد میں وہ دنیا کی تجارت کا مرکز بن گیا۔ اس کے مناسب محل وقوع اس کی عمدہ بندرگاہوں اور اس کی حوصلہ مند آبادی نے اسے تجارتی رہنمائی کا اہل بنادیا۔ انگریز قوم کو سمندر سے اور تجارت کے کاروبار سے ہمیشہ انسیت رہی ہے۔

اس غیر ملکی تجارت سے برطانیہ کی صنعتوں کو بھی ترقی ہوئی۔ دور کے ملکوں کی عمارتی لکڑی، گرم مسالے

اور کپاس کو جب انگلستان نے حاصل کرنا چاہا تو اسے اس کے بدلے میں اپنی بنی ہوئی چیزوں کو روانہ کرنا پڑا انگلستان کے کاریگروں نے لوہے کا مال اونی اور سوتی مال، مٹی کے برتن، گھر کے استعمال کی چیزیں روز بروز زیادہ مقداروں میں بنانا شروع کیں اور انھیں انگلستان کے تاجروں نے ان ملکوں میں بیچنا شروع کیا جہاں سے وہ کچا مال حاصل کرنا چاہتے تھے۔

برطانیہ کے لئے ایک بڑے تجارتی بیڑہ کی تعمیر | چونکہ برطانیہ بہت سی چیزیں درآمد اور برآمد کرتی تھی اس لئے انگریز تاجروں نے مال کو لانے اور لیجانے کے لئے خود اپنے جہاز تعمیر کرنا نفع بخش سمجھا۔ تجارتی کمپنیاں تو اس کام کو پہلے ہی سے کر رہی تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو جہاز ابتدا میں بنائے اس میں جس اصول کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا وہ یہ تھا کہ جہاز چاہے سست رفتار ہوں لیکن ہونے چاہئیں مضبوط اور مستحکم۔ یہ بہت پختہ ہوتے تھے ہوا اور خراب موسم کا مقابلہ کر سکتے تھے اور بحری ڈاکوؤں کو پسپا کرنے کے لئے خوب مسلح ہوتے تھے۔ لیکن یہ سپاٹ اور چوکور ہوتے تھے اس لئے ان کی رفتار تیز نہیں ہوتی تھی۔ انگلستان سے ہندوستان تک سفر کرنے میں دو سال بلکہ اس سے بھی زائد لگ جاتے تھے۔ لیکن سولھویں اور سترھویں صدی کے پورے زمانہ میں انہی سست رفتار لیکن محفوظ جہازوں کو استعمال کیا جاتا تھا۔

۱۸۵۰ء میں "ٹی کلپرس" کی تعمیر | ابتدا میں چائے کا شمار تعیشات میں ہوتا تھا۔ مثلاً ۱۶۶۴ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک قیمتی تحفہ انگلستان کے بادشاہ کو دینا چاہا تو اس نے دو پونڈ چائے کے ایک بنڈل کو اس کام کے لئے منتخب کیا۔

سترھویں صدی میں انگلستان کے لوگوں نے چائے کو پسند کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۸۵۰ء تک مشرق بعید کی تجارت کا یہ ایک اہم جز بن گئی تھی لیکن مال کے جہازوں کی سست رفتاری کی وجہ سے اس کی تجارت میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوتی تھی۔ چین سے انگلستان تک آنے میں جو ایک سال صرف ہوتا تھا اس میں چائے کا سارا ذائقہ ختم ہو جاتا تھا۔

۱۸۵۰ء میں نئے نمونہ کے بادبانی جہازوں نے جو امریکہ میں بنائے جاتے تھے انگریزی جہازوں کی جگہ لینا شروع کر دی تھی۔ یہ جہاز پتلے اور ترشے ترشائے ہوتے تھے تقریباً ایک ایکڑ کے رقبہ میں

ان کے سفید بادبان پھیلے ہوئے ہوتے تھے اور جب ان میں ہوا بھر جاتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پرند اڑتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ ان کا نام "ٹی کلپرس" تھا۔ انگلستان کو مشرق کی تجارت اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لیے ان کی نقل اتارنا پڑی۔

ان جہازوں کے تیز رفتار اور قابل اعتماد ہونے کا پتہ ان کی انتہائی کارگزاریوں سے چلایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ پانچ "ٹی کلپرس" چین کے فوچو مقام سے ایک ہی روز روانہ ہوئے اور انگلستان کے دریائے ٹیمس میں چند گھنٹوں کے فصل سے ۱۲۰ دن بعد پہنچ گئے۔ اس طرح پر انگلستان کے "کلپر" جہازوں کے بیڑے نے رفتار کی تیزی کے مسئلہ کو حل کر دیا۔

ان "کلپر" جہازوں کو اس زمانہ میں ایک بڑی حیرت انگیز چیز سمجھا جاتا تھا۔ ان کے چلانے کے لیے بڑی مہارت کی ضرورت ہوتی تھی اور جو کپتان انھیں چلاتے تھے وہ حریف جہازوں کے ساتھ اپنے مقابلہ کا تذکرہ فخر کے طور پر کیا کرتے تھے۔

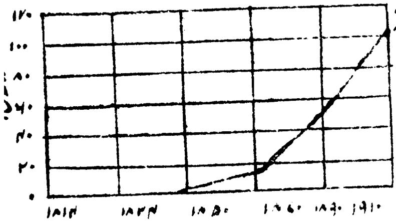
فولاد کے بنے ہوئے دخانی جہاز | لیکن تمام بادبانی جہاز جس میں "کلپرس" بھی شامل تھے ہوا اور موسم کے پابند ہوا کرتے تھے چار مہینے کے اندر چین سے انگلستان تک کا سفر نہایت موافق حالات میں کیا جا سکتا تھا لیکن اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہوا اور طوفان کی وجہ سے انھیں دیر ہو جاتی تھی بلکہ راستہ بھٹک جاتا تھا اس لیے جہازوں کی کمپنیاں زیادہ قابل اعتماد ذرائع سفر کی ضرورت بہت شدت کے ساتھ محسوس کر رہی تھیں۔

۱۸۰۰ء کے ابتدائی سالوں میں دخانی انجنوں سے چلنے والے جہازوں کی افواہ مشہور ہوئی۔ رابرٹ فلٹن کے جہاز کلیرمونٹ نے دریائے ہڈسن پر چلنا شروع کر دیا اور دریائے اوہیو اور میسیسپی پر بھی دخانی کشتیاں چلنے لگیں۔ جہاز بنانے والوں نے سوچنا شروع کیا کہ دخانی جہاز سمندروں پر بھی کیوں نہ چلائے جائیں تاکہ سفر میں تیزی اور باقاعدگی پیدا ہو جائے اور ترقی پسند جہاز سازوں نے مسافروں اور مال کے لیے ایسے جہاز بنانا بھی شروع کر دیے۔

۱۸۳۸ء میں ایک انگریزی جہاز "گریٹ ویسٹرن" بحر اٹلانٹک کو پار کر کے محض دخانی قوت سے نیویارک پہنچ گیا۔ انگلستان کو واپس ہوتے وقت وہ اپنے ساتھ ۶۸ مسافر اور ۲۰ ہزار خطوط لایا۔ اور

پندرہ دن کے اندر اس نے اپنا سفر پورا کر لیا۔ اس سے جہاز بنانے والی کمپنیوں کو دخانی جہازوں کے فائدے کا یقین ہو گیا۔ بادبانی جہاز بالکل تو ختم نہیں ہوئے۔ بادبانوں کی قوت کے استعمال کرنے میں خرچ کم تھا اور اس سے سفر خاصی تیزی کے ساتھ کیا جا سکتا تھا اسی لئے آج بھی بہت سے بادبانی جہاز سمندر کا سفر کرتے نظر آتے ہیں۔

لیکن دخانی انجنوں نے بادبانوں کی جگہ لینا شروع کر دی اور پرانے اور لکڑی کے جہازوں اور تیز چلتے ہوئے "کلیپرس" کی جگہ فولاد کے بنے ہوئے جہاز استعمال کئے جانے لگے۔ اس سے برطانیہ کو سمندروں پر اپنی برتری قائم رکھنے کا موقع مل گیا ورنہ کلیپرس کے ذریعہ سے امریکہ نے برطانیہ کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ لوہے اور فولاد کو برطانیہ نے امریکہ سے پہلے بنانا شروع کر دیا تھا

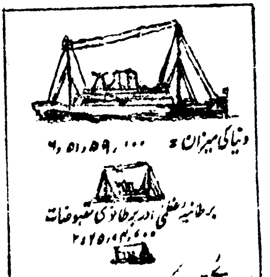


سنہ ۱۸۱۰ء تا ۱۹۱۰ء میں انگلستان کے جہازوں میں اضافہ

یہی وجہ تھی کہ برطانیہ فولاد کے جہاز امریکہ کے مقابلہ میں سستے بنا سکتا تھا۔

چنانچہ جتنی فیکٹریاں بڑھتی رہیں کوئلہ کو جتنی کانوں سے نکالنے کا کام ترقی پاتا رہا اور زیادہ فولاد اور ریل کی پٹریاں بنائی گئیں اتنی ہی جہازوں کی طلب، کارخانوں اور کانوں کی پیداوار کو انگلستان سے باہر اور غذا اور کچے مال کو انگلستان کے اندر لے جانے کے لئے بڑھتی رہی، انگلستان کے تجارتی بیڑہ کو ترقی ہوتی رہی اور سمندروں پر اس کا اقتدار مسلّم ہو گیا۔

سنہ ۱۸۵۰ء کے بعد سے انگلستان کے دخانی جہازوں کا بیڑا قوت اور حجم میں بڑھتا رہا۔ جنگ عظیم سے بہت پہلے انگلستان کے جہازوں کا وزن کل دنیا کے جہازوں کے وزن کا ایک تہائی ہو گیا تھا اور یہی صورت کم و بیش آج تک قائم ہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں دنیا کے دخانی



اس نقشہ میں دنیا کے دخانی جہازوں اور موٹر جہازوں کے وزن کو ٹنوں میں مجموعی طور پر اور مختلف ملکوں کے لئے الگ الگ دکھایا گیا ہے یہ اعداد سنہ ۱۹۲۶ء کے ہیں۔

جہازوں اور موٹر جہازوں کی کل مقدار ۶ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن تھی۔ اسی قسم کے برطانیہ کے جہازوں کا میزان ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ٹن ہوتا تھا۔ دوسرا نمبر امریکہ کا تھا تیسرا جاپان کا، چوتھا جرمنی کا اور پانچواں فرانس کا۔

برطانیہ کو اپنے بحری بیڑہ کو ترقی دینے کی ضرورت اس لئے تھی کہ اس کی تجارت دنیا کی بہت سی بندرگاہوں سے ہونے لگی تھی۔ ان بندرگاہوں تک آسانی اور جلدی کے ساتھ پہنچنے کے لئے بہت سے جہازوں کی ضرورت تھی۔ سنہ ۱۸۰۰ء کے بعد سے انگلستان کی تجارت پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑھ گئی تھی

سوتی مال جو برطانیہ عظمیٰ سے برآمد کیا جاتا ہے	
سالانہ اوسط	
سنہ ۱۸۲۹ء تا ۱۸۳۱ء	۸ کروڑ ۸۰ لاکھ ۴۵ ہزار ۲ سو ۲۰
سنہ ۱۸۵۹ء تا ۱۸۶۱ء	۲۳ کروڑ ۱۸ لاکھ ۴۰ ہزار
سنہ ۱۸۸۹ء تا ۱۸۹۱ء	۳۵ کروڑ ۴ لاکھ ۴۰ ہزار ۴۰
سنہ ۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۳ء	۵۹ کروڑ ۵۸ لاکھ ۹۱ ہزار ۶ سو ۲۰
سنہ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۱ء	ایک ارب ۱۸ کروڑ ۳ لاکھ ۲۰ ہزار

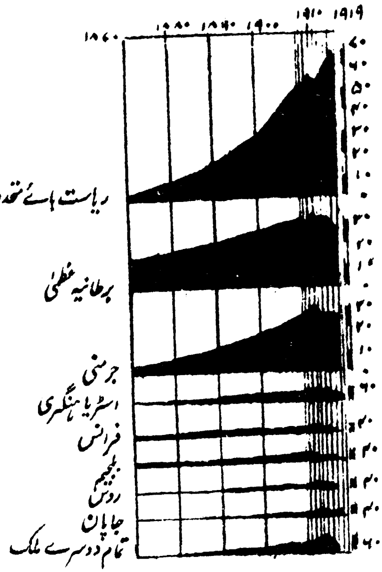
انجنوں اور مشینوں کی ایجاد کے بعد کوئلہ کی کانوں، لوہے کے کارخانوں اور کپڑے کی فیکٹریوں کی پیداوار حیرت انگیز طریقہ پر بہت زیادہ بڑھ گئی۔ برطانیہ کے لوگ ان تمام چیزوں کو خود نہیں خرید سکتے تھے۔ اس لئے زاید پیداوار کو ٹھکانے لگانے کا سوال بہت اہم ہوگیا اور اس کا برآمد کرنا نہایت ضروری ہوگیا۔

سنہ ۱۸۵۰ء میں برطانیہ کی تمام دنیا سے جو تجارت تھی اس کی کل مقدار صرف دس کروڑ ڈالر تھی لیکن سنہ ۱۹۱۱-۱۳ء کے سالوں میں صرف سوتی مال کی برآمد کا سالانہ اوسط ۶۰ کروڑ ڈالر کا تھا۔ ان اعداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۰۰ء کے بعد سے کتائی اور بنائی کے کارخانے انگلستان میں پھیل رہے تھے۔ لوگ فیکٹریوں میں خوب محنت سے کام کر رہے تھے اور نئی نئی ایجادیں بہترین مشینیں اور انجن تیزی کے ساتھ بن رہے تھے فیکٹریوں کا کاروبار ان کی بساط سے زیادہ ہوتا جارہا تھا اس لئے وہ کمپنیاں اپنے سرمایہ میں اضافہ کر رہی تھیں۔ سوتی مال کی برآمد بڑھتی رہی یہاں تک کہ برطانیہ نے ایک ارب ڈالر سالانہ کا مال دنیا کو بیچنا شروع کر دیا۔

برطانیہ کی دوسری مصنوعات کی تجارت بھی بڑھتی رہی۔ فولاد کی پٹریوں، مشینوں، اوزاروں اور دوسری لوہے اور فولاد کی چیزیں بنانے میں سنہ ۱۹۰۰ء تک اس کی تجارت سب سے آگے رہی تھی

برطانیہ بصورت مجموعی ایک بڑا کارخانہ بن گیا جس کا کام کچے مال کو مصنوعہ شکل دینا ہوگیا ۔ مصنوعہ مال کے معاوضہ میں جو رقم اسے ملتی ہے اس سے وہ غذا، کچا مال اور زندگی کی ضرورت کی دوسری چیزیں خریدتا رہتا ہے ۔

برطانیہ کے کوئلہ کے ذخائر کوئلہ کو انگلستان کی ترقی میں بہت زبردست اہمیت حاصل ہے۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں برطانیہ کی کانوں سے اتنا کوئلہ پیدا ہوتا تھا جتنا تمام دوسرے ملکوں میں مجموعی طور پر پیدا ہوتا تھا۔ سنہ ۱۹۰۰ء تک برطانیہ میں دنیا کی سب جگہوں سے زیادہ کوئلہ پیدا ہوتا تھا۔ لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو انگلستان پر فوقیت حاصل ہوگئی۔ لیکن پھر بھی ہر سال انگلستان بہت زیادہ کوئلہ اپنی کانوں سے نکالتا رہتا ہے۔ اس تمام کوئلہ کو انگلستان خود استعمال نہیں کرتا بلکہ اس کے تاجر اس کے بیشتر حصہ کو دوسرے ملکوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ اس فروخت سے جو نفع حاصل ہوتا ہے اس سے جزئی طور پر انگلستان والے غذا، روئی، لوہا، ربڑ، عمارتی لکڑی، اون اور دوسری چیزوں کی ان کثیر مقداروں کی قیمت ادا کرتے ہیں جنہیں وہ درآمد کرتے رہتے ہیں۔



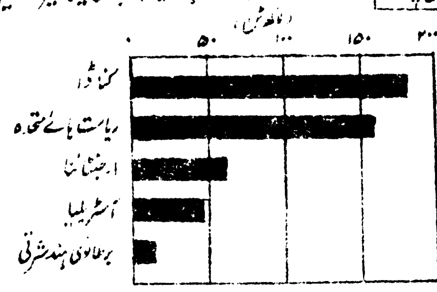
اس نقشہ میں دنیا کے بڑے صنعتی ملکوں کی کوئلہ کی پیداوار کو سنہ ۱۸۶۰ء سے سنہ ۱۹۱۹ء تک دکھایا گیا ہے۔ سیاہ حصہ کی اونچائی سے اس سال کی پیداوار کو ظاہر کیا گیا ہے۔

کوئلہ کے بغیر انگلستان کے لئے ایک بڑا صنعتی ملک بننا ناممکن ہوتا اس کی آبادی بھی اتنی نہ بڑھ سکتی نہ

اتنے آدمیوں نے کھیتی کا پیشہ چھوڑ کر شہر کی فیکٹریوں میں کام کرنا شروع کیا ہوتا۔ برطانیہ میں کوئلہ کی کثیر رسدگی وجہ سے یہاں کی جہاز رانی اور جہاز سازی کی صنعت کو بھی ترقی ہوئی کوئلہ کی قوت سے جہاز چلائے گئے کوئلہ کی وجہ سے ہی یہ ممکن ہوا کہ انگلستان کے جہاز جاتے وقت اور واپس آتے وقت دونوں موقعوں پر مال سے لدے ہوئے رہیں۔ یہ اس طرح ہوا کہ برطانیہ میں جو مال درآمد کیا جاتا تھا مثلاً لوہا گیہوں عمارتی لکڑی وغیرہ۔ یہ تو حجم میں زیادہ ہوتا تھا اور جگہ زیادہ گھیرتا تھا لیکن برطانیہ سے جو مال جاتا تھا مثلاً کپڑا اور دوسری مصنوعی اشیا زیادہ جگہ کم گھیرتی تھی۔ جہاز کے مالک چاہتے تھے کہ جاتے وقت اور آتے وقت دونوں موقعوں پر ان کے جہاز مال سے لدے ہوئے رہیں کیونکہ اگر جہاز خالی رہے تو اس سے روپیہ کے نقصان کا اندیشہ تھا۔ اس لئے برآمد کے وقت جہاز کا جو حصہ خالی رہتا تھا اس میں کوئلہ بھر جاتا تھا۔ ارجنٹائنا اور ہندوستان کوئلہ خریدنا چاہتے تھے برطانیہ کے بحری مرکزوں کے لئے جو جزیروں پر واقع تھے کوئلہ کی ضرورت رہتی تھی۔ اس لئے جاتے وقت جب جہاز کم حجم کا مصنوعہ مال لے جاتا تھا اس میں کوئلہ بھی لادا جا سکتا تھا۔ جاتے وقت ہلکی مصنوعہ چیزیں اور کوئلہ اور آتے وقت بڑا حجم رکھنے والا کچا مال مثلاً لوہا عمارتی لکڑی، روئی اور غلہ۔ غرض دونوں وقت وزن برابر رہتا تھا۔ اور برطانیہ کے لئے جہاز رانی بہت نفع بخش ہوتی تھی۔

برطانیہ کا صنعتی انقلاب کے بعد غذا کے لئے دوسرے ملکوں پر انحصار

سنہ ۱۸۰۱ء کے بعد سے برطانیہ کی آبادی میں حیرت انگیز اضافہ ہونے لگا۔ اس وقت آبادی ایک کروڑ ۵ لاکھ تھی۔ سو سال بعد آبادی ۴ کروڑ ۰۰ لاکھ ہو گئی۔ لیکن صنعتی انقلاب کے شروع ہونے کے بعد سے انگلستان کے لوگوں نے کھیتی کے کام کو چھوڑنا اور شہروں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا اس لئے باوجود اس کے کہ لوگوں کی تعداد

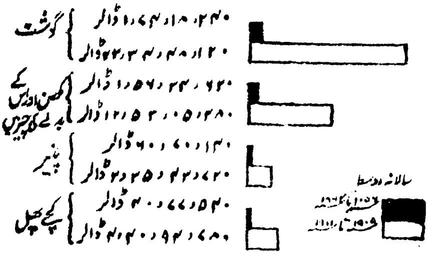


اس نقشہ میں دکھایا گیا ہے کہ برطانیہ کے شہروں کی آبادی کے لئے غذا کہاں سے کتنی مقدار میں حاصل کی جاتی ہے۔

تیزی سے بڑھ رہی تھی پھر بھی انگلستان میں غذا کی پیداوار برابر کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا صحیح اندازہ رقبہ زیر کاشت سے کیا جا سکتا ہے سنہ ۱۸۷۱ء تک تو زیر کاشت زمین میں کمی نہیں ہوئی لیکن اس کے بعد سے کھیتی کم زمینوں پر کی جانے لگی سنہ ۱۹۱۳ء میں صرف ایک کروڑ ۴۳ لاکھ ایکڑ پر کاشت کی جاتی تھی گویا سنہ ۱۸۷۱ء کے مقابلہ میں ۲۲ فی صدی کی کمی ہو گئی تھی۔

گیہوں کی کاشت میں اور بھی حیرت انگیز کمی ہوئی۔ اور حیرت انگیز اس لئے کہا گیا کہ انگلستان کے لوگ زیادہ تر گیہوں کی روٹی کا ہی استعمال کرتے ہیں۔ سنہ ۱۸۷۳ء میں ۴۰ لاکھ ایکڑ زمین پر گیہوں بویا جاتا تھا۔ لیکن چالیس سال بعد جتنے رقبہ پر گیہوں بویا جاتا تھا وہ ۵۰ فی صدی گھٹ گیا تھا۔ جَو، جئی، آلو اور دوسری خاص خوردنی اجناس کی کاشت میں بھی ایسی ہی کمی واقع ہو گئی تھی۔ ایک طرف تو اجناس خوردنی کی کاشت ۵۰ فی صدی گھٹ گئی تھی اور دوسری طرف آبادی ۵۰ فی صدی بڑھ گئی تھی۔ یہ حیرت انگیز صورت حال تھی۔

سنہ ۱۹۱۴ء تک جب کہ جنگ عظیم شروع ہوئی اتنے لوگوں نے کھیتی کے کام کو ترک کر دیا تھا کہ انگلستان کے صرف ۷ فی صدی کام کرنے والے کھیتی کے ساتھ وابستہ تھے۔ ان اعداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کے شہروں کے ہزاروں بھوکے لوگوں کا پیٹ انگلستان کے کسان نہیں بھر سکتے تھے۔ غذا اور دوسرے کچے مال کو انگلستان میں باہر کے ملکوں سے لانے کی ضرورت تھی۔ کھیتی کے کام کو چھوڑنے اور صنعتی ملک بن جانے کی وجہ سے انگلستان اپنے غذا کے ایک بڑی حصہ کے لئے باہر کی دنیا پر انحصار کرنے لگا



گیہوں کے علاوہ اور دوسری خاص غذاؤں کی درآمد ان مستطیلوں سے سالانہ درآمد کے اوسط کا اظہار سنہ ۱۸۶۶ء تا سنہ ۱۸۷۶ء اور سنہ ۱۹۰۶ء تا سنہ ۱۹۱۱ء کے سالوں کے لئے کیا گیا ہے۔

تھا اعداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب سے تقریباً ربع صدی قبل غیر ملکوں پر یہ انحصار اور بھی بہت زیادہ تھا۔ سنہ ۱۸۶۵ء میں برطانیہ میں ۱۳۵ پونڈ گیہوں فی شخص درآمد کیا جاتا تھا اور سنہ ۱۹۰۵ء میں

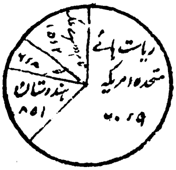
برطانیہ میں جو گیہوں استعمال کیا جاتا ہے اس کا ۵/۶ حصہ ۲۶۱ پونڈ گیہوں فی شخص۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ، کناڈا، آسٹریلیا اور ارجنٹائنا سے منگایا جاتا ہے۔ دوسری بنیادی غذاؤں کے لئے بھی برطانیہ کا دارومدار دوسرے ملکوں پر ہے۔ جنگ سے پہلے بھی گوشت کا ۴۰ فی صدی حصہ باہر سے درآمد کیا جاتا تھا۔ ہر سال انڈوں اور مکھن پنیر وغیرہ کی بیشتر مقدار دوسرے ملکوں سے حاصل کی جاتی ہے۔

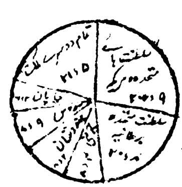
کچے مال مثلاً روئی، خام لوہا، ربر وغیرہ کے لئے برطانیہ کا دوسرے ملکوں پر دارومدار ۔ سنہ ۱۸۰۰ء سے پہلے بھی انگلستان کے کاتنے اور بننے والے اونی کپڑے کے ساتھ ساتھ سوتی کپڑا اپنے گھروں پر بنایا کرتے تھے۔ لیکن برطانیہ کی سرد مرطوب آب وہوا میں روئی پیدا نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے انگلستان کے پارچہ بافوں کو دور دراز ملکوں سے روئی حاصل کرنے کے لئے اپنے جہاز روانہ کرنا پڑتے تھے دنیا کے تین اہم روئی کے مرکزوں یعنی ریاست ہائے امریکہ کی جنوبی ریاستوں، ہندوستان اور مصر سے سنہ ۱۸۰۰ء کے بعد روئی کی کثیر مقدار لائی جانے لگی۔ سوتی کپڑے کی صنعت نے خوب ترقی پائی دستی بنائی کی جگہ مشین کی بنائی نے رواج پالیا اور انگلستان کے ہزاروں مزدوروں کی زندگی کا دارومدار غیر ملکوں سے روئی کے فراہم کرنے پر ہوگیا۔

انگلستان کی فیکٹریوں کی پیداوار اتنی بڑھ گئی تھی کہ اٹھارہویں صدی کے آخری سالوں میں بھی کاتنے والوں اور بننے والوں کو مصروف رکھنے کے لئے دنیا میں کافی روئی پیدا نہیں کی جاسکتی تھی اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ روئی کے پھل کو توڑنے اور صاف کرنے کا کام اتنی تیزی سے نہیں ہوتا تھا جس سے بے کار مزدوروں اور مشینوں کو مصروف رکھا جاسکتا۔ دور کے ملکوں میں سیاہ رنگ کے لوگ گرم سورج کے نیچے ہاتھ سے کپاس کو توڑا کرتے تھے۔ کپاس سے بنولے علیحدہ کرنے کا کام بھی ہاتھ سے کیا جاتا تھا۔ یہ کام اتنا سست اور صبر آزما ہوتا تھا کہ کپاس کے سینکڑوں کھیتوں کے مزدور انگلستان کی بھوکی مشینوں کا پیٹ بھرنے کے لئے کافی روئی تیار نہ کر پاتے تھے۔

سنہ ۱۷۹۳ء میں امریکہ کے ایک اسکول ماسٹر ایلی وہٹنی نے انگلستان کے کاتنے اور بننے والوں

کو ان کی پریشانی سے نجات دلائی۔ اس نے روئی اوٹنے کی مشین ایجاد کی جس کی وجہ سے بنولے نکالنے کا کام ہاتھ کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ تیز رفتار کے ساتھ کیا جانے لگا۔ اس اہم ایجاد کی وجہ سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے جنوبی علاقہ میں انگلستان کی فیکٹریوں کے لئے زیادہ مقدار میں روئی پیدا کی جانے لگی یہاں تک کہ امریکہ سے انگلستان کے استعمال کے لئے ۸۰ فی صدی روئی مہیا کی جانے لگی۔ پچاس سال کے اندر انگلستان کی مشینوں میں اتنی اصلاحیں کی جا چکی تھیں کہ برطانیہ کی فیکٹریوں کے لئے روئی روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔





ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہندوستان اور مصر یہ تین ملک سب سے زیادہ روئی پیدا کرتے ہیں اور ان ہی تین مقامات سے برطانیہ سب سے زیادہ روئی منگاتا ہے۔ ان دو میں بائیں ہاتھ پر جو دائرہ ہے اس میں مختلف ملکوں کے لئے کپاس کی پیداوار کے تناسب
ستہ ملکوں پر سو سال پہلے کی طرح آج فی صدی کو دکھلایا گیا ہے۔ دائیں ہاتھ پر جو دائرہ ہے اس میں دنیا کے مختلف ملکوں
بھی انگلستان کے مزدوروں کی زندگی کی کپڑے کی پیداوار کے فی صدی تناسب کو دکھایا گیا ہے۔
کا دارومدار ہے۔ کاتنے اور بننے والی فیکٹریوں کو مصروف رکھنے کے لئے روئی کی رسد بہت ضروری ہے۔ جب کسی وجہ سے ان علاقوں میں روئی کی پیداوار کم ہو جاتی ہے مثلاً روئی میں کیڑا لگ جاتا ہے یا بارش کی کمی اور زیادتی کا فصل پر اثر پڑتا ہے تو انگلستان کے ہزاروں مزدوروں کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ ان کے لئے روئی کی کثرت کے معنی غذا، کپڑے اور مکانوں کی کثرت کے ہیں۔

خام لوہے کے لئے انگلستان کا دوسرے ملکوں پر انحصار

انگلستان میں کچھ خام لوہا تو ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ صنعتی انقلاب سے پہلے انگلستان کے پاس اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کافی لوہا موجود تھا۔ اس کی ضرورتیں زیادہ تر .... اوزاروں اور ہتھیاروں کے لئے لوہے کی ضرورت ہوتی

تھی۔ لیکن مشینوں کی ایجاد اور انگلستان کے صنعتی ملک بن جانے کے بعد انگلستان کی ضرورت لوہے اور دوسرے کچے مالوں کے لیے جو فولاد بنانے میں کام آتے ہیں بہت بڑھ گئی۔ بغیر فولاد کے نہ ریلیں بنائی جا سکتی ہیں نہ جہاز، نہ فیکٹریاں کھڑی کی جا سکتی ہیں نہ مشینیں۔ برطانیہ کو اب خام لوہا حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ دوسرے ملکوں خصوصاً سویڈن اور اسپین پر دارومدار کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ فولاد کے بنانے کے لیے جن دوسرے کچے مالوں کی ضرورت ہے ان کے لئے بھی اسی اور دوسرے ملکوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ فولاد کے بنانے میں دوسری دھاتوں مثلاً کرومیم، ٹن اور نکل کی ضرورت ہوتی ہے۔ برطانیہ میں یہ چیزیں کافی مقدار میں موجود نہیں ہیں اس لئے برطانیہ کی بندرگاہوں میں نکل کناڈا سے، کرومیم اور لوہا اسپین، ایشیا سے کوچاب اور ہندوستان سے دینیڈیم جنوبی امریکہ سے اور اس طرح دوسرے سامان دوسرے ملکوں سے آتے رہتے ہیں۔

ربڑ کے لئے انگلستان کا دوسرے ملکوں پر انحصار جدید عہد کی صنعتی دنیا ربڑ پر سفر کر رہی ہے۔ برطانیہ میں بہت سی موٹر گاڑیاں اور موٹر ٹھیلے چلتے ہیں۔ اگر ان کے ٹائروں اور دوسرے حصوں کے لئے ربڑ موجود نہ ہوتا تو سفر ناممکن ہو جاتا۔ انگلستان کی ریل گاڑیوں میں جو ہوائی بریک لگائے جاتے ہیں ان میں بھی ربڑ لگایا جاتا ہے۔ نقل و حمل اور خبر رسانی کا دارومدار ربڑ پر ہے۔ جماعتوں کی زندگی ربڑ کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے۔ لیکن برطانیہ میں ایک پونڈ ربڑ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ برطانیہ جتنا ربڑ استعمال کرتی ہے اس کا ایک بڑا حصہ سیلون، ریاست ہائے ملایا، جاوا، بورنیو اور منطقہ حارہ کے دوسرے جزیروں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ انگریزی ربڑ کے ان باغات کے مالک ہیں اور ان میں دنیا کے ربڑ کی مجموعی پیداوار کا $\frac{3}{5}$ حصہ پیدا ہوتا ہے۔ ربڑ پیدا کرنے والی بیشتر زمین سلطنت برطانیہ کی حدود میں شامل ہے۔

معدنی تیل کے لئے برطانیہ کا دوسرے ملکوں پر انحصار صنعتی قومیں کوئلہ کے بعد جس ایندھن کا بہت زیادہ استعمال کرتی ہیں وہ معدنی تیل ہے حال کے سالوں میں برطانیہ نے معدنی تیل کا استعمال بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ برطانیہ کے فوجی بحری جہازوں کا ۹۰ فی صدی حصہ اور اس کے تجارتی

جہازوں کی خاصی بڑی تعداد تیل استعمال کرنے والے انجنوں سے چلائی جاتی ہے۔ برطانیہ کی سڑکوں پر بہت سی موٹر گاڑیاں اور موٹر بسیں تیل سے چلائے جاتے ہیں۔ اس کی فیکٹریوں کے بہت سے انجن بھی تیل سے چلنے لگے ہیں۔ برطانیہ دنیا کے ان ملکوں میں ہے جن میں تیل کا صرف بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن انگلستان میں یہ تمام معدنی تیل پیدا نہیں کیا جاتا۔ کچھ تیل تو سینکڑوں سالوں سے انگلستان کے کنوؤں اور چشموں سے نکالا جا رہا ہے لیکن دنیا کے نقشہ میں تیل کے جن اہم کھیتوں کو دکھایا جاتا ہے ان میں سے کوئی ایک بھی برطانیہ میں واقع نہیں ہے۔ تیل کے لئے برطانیہ کو ریاست ہائے امریکہ، میکسیکو، روس، ایران، ڈچ جزائر ہند مشرقی، وینی زوایلا، رومانیا اور میسوپوٹامیا پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ یہی آٹھ علاقے دنیا میں ایسے ہیں جہاں سب سے زیادہ معدنی تیل پیدا ہوتا ہے۔

دوسرے کچے مالوں کے لئے برطانیہ کا دوسرے ملکوں پر انحصار

گنجائش کی کمی کی وجہ سے ان تمام اشیاء غذا اور کچے مالوں کا بیان کرنا ممکن نہیں ہے جن کے لئے برطانیہ دوسرے ملکوں پر انحصار کرتا ہے۔ انگلستان کے لوگ چائے اور کافی بہت پیتے ہیں۔ چائے کے لئے انھیں چین، جاپان، سیلون، ہندوستان اور مشرق بعید کے دوسرے مقامات پر انحصار کرنا پڑتا ہے ان کی کافی برازیل، وسطی امریکہ، میکسیکو اور جزائر ہند غربی سے آتی ہے۔ انگلستان کے لوگ شکر کا بھی بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں اور تقریباً تمام شکر یورپ یا جزائر ہند غربی یا دوسرے دور دراز مقامات سے لائی جاتی ہے۔

انگلستان کے دسترخوان کو لیگ آف نیشنس کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے کیونکہ انگلستان کے لاکھوں گھروں میں وہ غذائیں استعمال کی جاتی ہیں جنھیں دنیا کے مختلف ملکوں سے درآمد کیا جاتا ہے انگریزوں کی زندگی کا معیار بلند ہے۔ ان کو بہت سے ایسے کھانوں کی عادت پڑ گئی ہے جو برطانیہ میں پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ مثلاً انھیں انجیر، کھجوریں، لیموں، کیلے، ناریل، کوکو، چاکلیٹ، بادام، چلغوزہ، کاجو، اخروٹ، زیتون اور سینکڑوں دوسری چیزوں کی ضرورت رہتی ہے جو سب دور دراز ملکوں سے درآمد کی جاتی ہے۔

انگلستان کے لوگوں کی آمدنی جتنی انیسویں صدی میں بڑھتی رہی ہے اتنی ہے آرام اور عیش کی چیزوں

کے لئے ان کی طلب میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ ان کے کپڑوں میں بہت تنوع پیدا ہوگیا ہے۔ دوسرے علاقوں کے نئے نئے سامان استعمال کیے جاتے ہیں۔ گھر کے برتن اور سامان کی تعداد اور تنوع میں بھی اضافہ ہوگیا ہے اور ان میں سے اکثر ایسی چیزوں سے بنائے جاتے ہیں جنہیں ایشیا افریقہ شمالی امریکہ غرضکہ ہر براعظم سے حاصل کیا جاتا ہے مختصر یہ کہ جتنا برطانیہ کے معیار زندگی میں اضافہ ہوا ہے اتنا ہی اس کا انحصار دوسرے ملکوں پر زیادہ ہوگیا ہے۔

خلاصہ: برطانیہ چار بڑے وجوہ کی بنا پر دنیا کی تجارت کا مرکز بن سکا۔

۱۔ جدید دنیا سے تجارت کرنے کے لئے برطانیہ کا محل وقوع مناسب تھا

۲۔ برطانیہ پہلا ملک تھا جس نے بڑے پیمانہ پر مشینوں سے چیزوں کو بنانا شروع کیا

۳۔ برطانیہ نے جہاز رانی کی صنعت کو خوب ترقی دی

۴۔ اپنے جہازوں اور فیکٹریوں کو قوت مہیا کرنے کے لئے اور دوسرے ملکوں کو فروخت کرنے کے لئے اس کے پاس کوئلہ کے بڑے ذخیرے موجود تھے۔

ان وجوہ کی بنا پر انگلستان دنیا کی تجارت کا مرکز بن گیا۔

انگلستان پہلے ایک ایسا ملک تھا جو دنیا کے بالکل سرے پر گمنامی کی زندگی بسر کر رہا تھا لیکن اب اس کا محل وقوع دنیا کے لوگوں سے چیزوں کا مبادلہ کرنے کے لئے بہت موزوں ہے۔

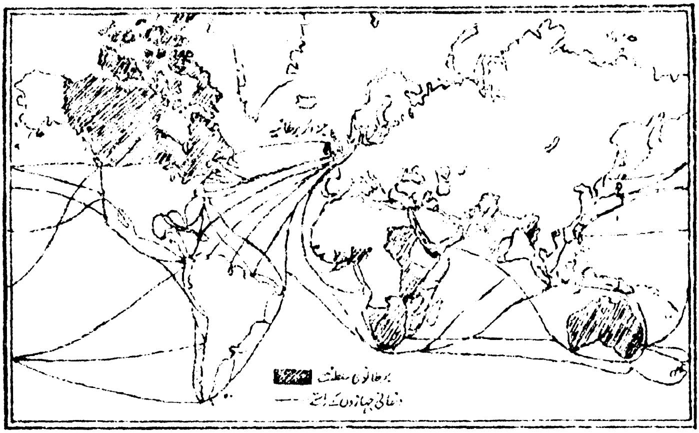
پہلے یہ ایک ایسا زراعتی ملک تھا جس میں ابتدائی طرز کی زندگی بسر کی جاتی تھی لیکن اب کوئلہ کی کان کنی اور چیزوں کو مصنوعہ شکل دینے میں اس کا درجہ بہت بڑھا ہوا ہے۔

پہلے یہ سب سے جدا اور اپنی ضرورتیں خود آپ پوری کرتا تھا لیکن اب دنیا کے بعید ترین ملکوں پر اسے اپنی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے انحصار کرنا پڑتا ہے۔

پہلے یہ منتشر کھیتوں اور چھوٹے قصبوں کا ملک تھا لیکن اب گنجان آباد شہروں کا ملک بن گیا ہے۔

پہلے اس کی آبادی کو زندگی کی محض انتہائی ضروری چیزیں دستیاب ہو سکتی تھیں لیکن اب یہ ایک دولتمند ملک ہوگیا ہے اور اس کے لوگوں کا معیار زندگی امریکہ کو چھوڑ کر باقی سب ملکوں کے مقابلہ میں بہت

زیادہ بلند ہے۔



دنیا کے سمندروں میں تجارت کی راہیں

دنیا کی تجارت کا ایک نقشہ بنا کر موجودہ صورت حال کو اچھی طرح ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اس نقشہ سے برطانیہ کی مرکزیت اچھی طرح ظاہر ہو رہی ہے۔ ہاتھ کی انگلیوں کی طرح تجارت کے بہت سے راستے انگلستان سے نکلتے ہیں اور سمندروں کو عبور کرتے ہوئے دنیا کے بعید ترین ملکوں تک پہنچ جاتے ہیں اپنی ان انگلیوں کے ذریعہ برطانیہ دنیا کی ہر قسم کی پیداوار کو اپنی مٹھی میں بند کرتی رہتی ہے اور اس کے معاوضہ میں اپنے مال کو باہر بھیجتی رہتی ہے۔ انگلستان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے درمیان جو تجارت کا سلسلہ جاری ہے اس کا اظہار موٹی لکیر سے ہوتا ہے۔ دوسری موٹی لکیر اسپین کا چکر لگاتی بحر روم اور نہر سویز سے ہوتی ایشیا اور افریقہ کے درمیان سے گزرتی مشرق بعید تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح جنوبی امریکہ کے مختلف علاقوں کو جو راستے جاتے ہیں وہ بھی خاصے موٹے ہیں۔

ان راستوں کے ذریعہ برطانیہ کی تجارت جنگ عظیم کے شروع ہونے سے پہلے یعنی ۱۹۱۳ء میں اتنی کثیر تھی کہ درآمد اور برآمد کی مجموعی مقدار تقریباً ، ارب ڈالر ہوتی تھی۔

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

آج کل کا قاعدہ ہے کہ جب کبھی کوئی قتل ہو جاتا ہے تو پولس مردے کی لاش کا معائنہ کراتی ہے جس سے یہ پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ موت کس طرح واقع ہوئی اور اس سے قتل کا جرم ثابت کیا جاتا ہے۔ قاتل پکڑا نہ گیا ہو تو اس ذریعے سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ کون شخص ہو سکتا ہے اور اسے گرفتار کرنے کی تدبیریں بھی کی جا سکتی ہیں۔ چیکوسلواکیا کا خاتمہ کوئی تین ہفتے پہلے ہو چکا ہے اور زمانے کی رفتار کو دیکھتے ہوئے سمجھیے کہ خاصی مدت گذر چکی ہے، لیکن یہ مردہ ابھی تک بے نام ونشان نہیں ہو گیا ہے، اور اس کا معائنہ کرنے سے پہلے اس سیاست کے بڑے بڑے بھید کھولے جا سکتے ہیں جو اس جرم کا اصل سبب ہیں۔

یہ تو نظر ڈالتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ قتل کی ترکیب انوکھی تھی۔ چیکوسلواکیا کی پہلے تو کھال کھینچی گئی، اور پھر اس بنا پر کہ جس کی کھال کھینچی گئی ہے وہ زندہ نہیں رہ سکتا، مارنے والے نے چیکوسلواکیا کو جان سے مار ڈالا۔ جرم کی ایک اور خصوصیت یہ بھی تھی، کہ کھال کھینچنے میں پولیس مجرم کے ساتھ تھی اگرچہ اس نے یہ شرط لگا دی تھی کہ ضرورت سے زیادہ تکلیف نہ پہنچائی جائے اور اس کے بعد مجرم بھی پولیس کو چیکوسلواکیا کو سلامت رکھنے میں مدد دے، مجرم نے وعدے کے خلاف چیکوسلواکیا کی جان لے لی، جس پر پولس چلا رہی ہے کہ بڑی ہتیا ہو گئی، یورپ کا دھرم نشٹ ہو گیا اخلاق کی جڑ کٹ گئی۔

ہمارے ملک میں ایسا کوئی حادثہ ہوتا تو آپ ضرور کہتے کہ پولس جرم میں شریک تھی، اس لیے اس پر بھی قتل کا الزام لگتا ہے، لیکن قومیں جب ایسا جرم کرتی ہیں تو انھیں سزا دینے والا کوئی

نہیں ہوتا، لوگ خدا کو یاد کرکے رہ جاتے ہیں اسی وجہ سے ہوشیار قوموں کو چاہیئے کہ وہ ایسے حادثوں پر غور کرتی رہیں اور اپنے آپ کو مجرموں سے نہیں بلکہ ہمدردوں سے اور مددگاروں سے بچائے رکھیں، جو پولس کی وردی پہن کر مجرموں کا کام آسان کرنے کو پہنچ جاتی ہیں، اس لحاظ سے دیکھئے تو چیکوسلواکیا پر جو دوسرا وار کیا گیا، وہ اور بھی سبق آموز ہے۔

پچھلے اکتوبر میں جب سوڈیٹن علاقے جرمنی کو دئے گئے، یعنی چیکوسلواکیا کی کھال کھینچی گئی تو خاص سلواکیا میں آزادی کی ایک تحریک جس کے بانی پادری ملسکا تھے، اور جس کی فوج ملسکا رڈ کہلاتی تھی، خاصی ترقی کر چکی تھی اور اب تو یہ بات پھیل گئی ہے، کہ سلواکیا کی اس تحریک کو جرمنی کا روپیہ چلا رہا تھا، اکتوبر تک باہر کے لوگوں کو صرف اتنا معلوم تھا، کہ جرمنی کو اس تحریک سے ہمدردی ہے، اس ہمدردی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کو سڈٹین علاقے ملے اور ادھر سلواکیا نے سوراج مانگا، چیک حکومت اس مطالبے کو منظور نہ کرتی تو اور کیا کرتی مگر منظور کرنے سے اس کو فائدہ نہ ہوا، سلواکیا میں برابر فساد ہوتا رہا، اور ہر ہٹلر اس فساد کی ذمہ داری چیک حکومت پر ڈالتے رہے آخر سلواکیا نے چیک حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اپنی وزارت کو بدلے اور قریب قریب اسی وقت سلواکیا کے وزیر اعظم سیو ہر ہٹلر کے پاس مشورہ کرنے پہنچے ان دونوں میں کیا باتیں ہوئیں یہ ہمیں معلوم نہیں لیکن اس کے بعد چیکوسلواکیا کے صدر ڈاکٹر ہافا سے کہلوایا گیا کہ وہ اپنے وزیر خارجہ فوالوسکی کو لے کر برلن آئیں۔ ڈاکٹر ہافا کو دعوت قبول کرنے کے سوا چارہ نہ تھا، ۱۵ مارچ کی شام کو برلن پہنچے ان کا بڑی شان سے استقبال کیا گیا مگر یہ بہت جلد ہر ہٹلر کے پاس پہنچا دئے گئے، وہ خود ربن ٹروپ اور ڈاکٹر گورنگ کے ساتھ ایک کمرے میں بیٹھے تھے، اور میز پہ ایک تحریر رکھی تھی، جو ڈاکٹر ہافا کو پڑھ کر دستخط کرنے کو دے دی گئی تھی، وہی اعلان تھا جو ۱۶ مارچ کی صبح کو شائع ہوا اور جس میں ڈاکٹر ہافا کی طرف سے کہا گیا، کہ وہ اپنے ملک کو ہر ہٹلر کے سپرد کرتے ہیں، اور انھیں یقین ہے کہ ملک کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ جرمنی میں شامل ہو جائے پہلے تو کچھ دیر انھوں نے انکار کیا، مگر ہر ہٹلر اور اس کے ساتھیوں نے پہلے ڈاکٹر ہافا کو سمجھایا، تو پھر ڈرایا دھمکایا اور جب

وہ اس طرح نہ مانے ان سے کہہ دیا گیا کہ آپ کے نہ ماننے سے آپ کا کام نہ بنے گا، جرمن فوجیں
چکوسلواکیا میں داخل ہو گئی ہیں اور چھ سو ہوائی جہاز تیار کھڑے ہیں کہ حکم ملتے ہی پراگ پر جا کر بم
برسائیں، ڈاکٹر ہاخا غریب کو پہلے بھی کئی مرتبہ غش آ چکا تھا، اس خبر کو سنتے ہی وہ بے ہوش ہو گئے،
میزبان کے انتظام کو دیکھئے کہ وہ ان کی اس کمزوری کو بھی جانتے تھے اور پاس ہی کمرے میں ایک
ڈاکٹر مناسب انجکشن دینے کے لیے بیٹھا تھا، انجکشن کے بعد ڈاکٹر ہاخا کو ہوش آیا اور پھر انھوں نے
اعلان پر دستخط کر دیے، اس اعلان میں چیک فوجوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ جرمن فوجوں کا مقابلہ نہ کریں
بلکہ انھیں ملک پر قبضہ کرنے دیں، اور اس حکم کی وجہ سے جرمن فوجیں بغیر فوجی نقصان اٹھائے چیکوسلواکیا
کی راجدھانی میں گھس گئیں، بارہ گھنٹے بعد ہر ہٹلر بھی وہاں پہنچ گئے، چکوسلواکیا پر ہر ہٹلر کی حکومت
ہو گئی، کہتے ہیں کہ کوئی ڈیڑھ دو ہزار چیک سپاہیوں اور شہریوں نے غلامی کو موت پر ترجیح دی
مگر ان غیرت مندوں کا خون بہنا بھی تو کسی نے نہیں دیکھا اور ہر ہٹلر کو یہ کہنے کو ہو گیا کہ
انھوں نے بغیر خون بہائے جرمن سیاست کا ایک اور مقصد پورا کر لیا، تہذیب اور اخلاق کے
ان دونوں چوکیداروں یعنی برطانیہ اور فرانس کی کارگزاری بھی سن لیجئے، انھوں نے یورپ کو جنگ سے
بچانے کی خاطر جرمنی کو چکوسلواکیا کی کھال کھینچ لینے دی، اور پھر ایسے بھولے بن گئے گویا کہ کچھ
ہوا ہی نہیں، لطف یہ ہے کہ خاص انھیں دنوں جب برلن میں چکوسلواکیا پر قبضہ کرنے کے
مشورے ہو رہے تھے، برطانیہ میں سرکاری نہیں تو قریب قریب سرکاری طور پر یقین دلا دیا گیا
تھا کہ اب یورپ کا آسمان صاف ہے اور جسے کوئی اور فکر نہ ہو وہ چین سے سو سکتا ہے، جب جو
کچھ ہونا تھا ہو چکا تو اس کی پوچھ گچھ ہونے لگی کہ آخر ایسی بے بنیاد خبر کس نے مشہور کی، وزارت
خارجہ کے دفتر والوں نے کہا کہ ہم ایسے ناواقف نہیں ہیں کہ خطرے کے وقت اعلان کریں کہ
اب خطرہ نہیں ہے، یہ خبر سڑک کی دوسری طرف سے یعنی وزیر اعظم کے گھر یا دفتر سے نکلی ہو گی، عقلمند
آدمی اپنی حماقت تسلیم نہیں کرتے جہاں سب عقلمند ہوں وہاں اسی پر تعجب کیا جا سکتا ہے کہ ایسی
حماقت کی بات کون کر سکتا ہے اور برطانیہ میں اسی پر تعجب کیا جاتا رہا۔ اور باہر لوگ اس بات پر

حیرت کرتے رہے کہ برطانیہ اور فرانس نے اخلاق اور تہذیب کے چوکیدار ہوتے ہوئے اپنے آپ
کو کس طرح ہر ذمہ داری سے بری سمجھ لیا، پچھلے اکتوبر میں ان دونوں اور جرمنی اور اٹلی میں طے ہوا تھا، کہ
سب چکوسلواکیا کی حفاظت کریں گے، ہم آپس مل کر ایسا وعدہ کرتے تو ہر شخص دوسرے کو اس کی پابندی
پر مجبور کرتا، اس کا سبب یہ ہوتا کہ ہم وہ داؤں پیچ کر ہی نہیں سکتے، جو برطانوی سیاست کو قدرت
نے سکھائے ہیں، مسٹر چیمبرلین نے چکوسلواکیا کے خاتمہ کی خبر سنتے ہی کہدیا، کہ چونکہ ہر ہٹلر نے اپنے
وعدہ کی پابندی نہیں کی ہے، اس لئے تم پر بھی کوئی ذمہ داری نہیں ہے یعنی چکوسلواکیا مر گیا اس کا
افسوس ہے ہم کیا کرتے مارنے والے نے ہم سے صلاح مشورہ کیا نہیں، جو ہم اس کو روکتے، یہ
جواب ایسا تھا کہ جسے سن کر ہر ہٹلر نے شمال میں لیتھونیا کو الٹیمیٹم دے کر میمل کا شہر حاصل کر لیا۔ اور جنوب
میں رومانیہ کو اسی طرح الٹیمیٹم دے کر ایک تجارتی معاہدہ رومانیہ سے کیا جس کی بدولت جرمنی کا رومانیہ
پر تو نہیں مگر اس کی زمین اور تجارت اور سرمایہ پر قبضہ ہو گیا ہے، کہنے کو تو رومانیہ آزاد ہے لیکن جرمنی
نے اسے اب اس طرح پکڑ لیا ہے کہ وہ جرمنی کے پنجے سے نکل نہیں سکتا۔

اب کسی کو اپنی سلامتی کا بھروسا نہیں رہا ہے ایسی حالت میں لوگ اندھا دھند لاٹھی چلاتے
ہیں اور ناحق چوٹ کھاتے ہیں لیکن آپ غور کریں تو، اصل میں یہ سب ریاستیں یہی تھیں کہ ان ریاستوں کو
جنھوں نے مل کر لیگ کو دنیا میں حیثیت اور عزت بخشی تھی لیکن اب برطانیہ اور فرانس نے اپنے رویہ
سے سب کو بدظن کر دیا ہے اور اس طرح لیگ کا رہا سہا بھرم بھی جاتا رہا، مسٹر بولڈون نے پچھلے الکشن کے
وقت کہا تھا، کہ ہمیں ووٹ دو اس لئے کہ ہم اس کی کوشش کر رہے ہیں کہ یورپ میں ہر قوم کی سلامتی
کا ذمہ، باقی تمام قوموں پر ڈال دیا جائے اور اس طرح لڑائیوں کا خطرہ دور کیا جائے لیکن الکشن کے
بعد وہ پالیسی اختیار کی گئی کہ جس نے لیگ کو ختم کر دیا اور ہر ریاست کو اب اپنی فکر کرنے پر مجبور کر دیا گیا
ہر ہٹلر نے تو سیاست پر احسان کیا برطانیہ اور فرانس نے غلط فہمیوں کا جال پھیلا رکھا تھا، اسے کاٹ
کر پھینک دیا۔ اور اب آئندہ کوئی ریاست، چکوسلواکیا کی طرح آخر وقت تک دھوکا نہیں کھائے گی،
فرق صرف اتنا ہے کہ ہر ہٹلر کو اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے وہ طریقے نہیں آتے جو برسوں

کے تجربے نے برطانیہ اور فرانس کو سکھا دئے ہیں یا اگر انھیں آتے ہیں تو وہ انھیں برتنا نہیں چاہتے اسے اپنی کسر شان سمجھتے ہیں ان کی سیاست اب ڈنکے کی چوٹ پر انھیں ارادوں کا اعلان کر رہی ہے جو انھوں نے اب سے دس برس پہلے اپنی کتاب میں بیان کئے تھے یعنی یہ کہ یورپ میں جرمن سامراج قائم ہو جائے گا جو باقی قوموں پر حاوی ہو جائے گا۔ دنیا میں جرمن تہذیب کی رونق پھیلائے گا لیکن اگر یورپ پر جرمن سامراج چھا بھی گیا، تو کون سا اندھیر ہو جائے گا اس میں یورپ اور دنیا کے لئے وہ کون خطرہ ہے جو کسی دوسرے سامراج میں نہ تھا، بلکہ غور کیجئے تو زیادہ خطرہ اسی میں ہے کہ برطانیہ فرانس اپنی موجودہ حیثیت اور طاقت کو قائم رکھنے کی کوشش میں جرمن سیاست کی اور بے جا مخالفت کریں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو دوست بن کر اس طرح ڈبو دیں جیسے چکوسلواکیا کو مشرقی یورپ میں ڈبو دیا تھا فرانس کی نہ بڑے پیمانہ پر صنعت ہے اور نہ تجارت نہ کوئی سیاسی اثر جرمنی کو ادھر بڑھنے کا موقعہ ملے تو برطانیہ اور فرانس کا اس میں ذرا نقصان نہیں ادھر کی ریاستوں کو جرمن کا سہارا مل گیا تو وہ کسی طرح کا دکھ اٹھانے کی بجائے بہتیری مصیبتوں اور دشواریوں سے نجات پائیں گے۔

برطانیہ نے یہ بہانہ کرکے کہ فیصلہ بہت جلد کرنا ہے کانفرنس میں بہت دیر لگے گی، روس کی اس تجویز کو کہ امن پسند قوموں کی کانفرنس کی جائے نامنظور کر دیا ہے، اس کی جگہ پولینڈ اور رومانیہ سے علیحدہ علیحدہ معاہدے کئے جا رہے ہیں برطانیہ اور فرانس نے پولینڈ کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، روس میں جو خیال ظاہر کیا گیا ہے وہ بے بنیاد نہیں کہ یہ جرمنی کو ڈانزک اور شمالی پولینڈ کو بغیر لڑے دے دینے کی ترکیب ہے برطانیہ اور فرانس نے پولینڈ اور رومانیہ کو جس طرح دھوکے میں ڈال دیا ہے اور ہر ہٹلر کو للکارا ہے کا نتیجہ یہ تو ضرور ہو جائے گا کہ مسٹر چمبرلین اگلے الکشن میں کامیاب ہو جائیں گے، لیکن اس سے یورپ کی بے چینی بڑھے گی اور کوئی تعجب نہیں کہ مار پیٹ ہو جائے۔

جامعہ

زیر ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

نمبر ۶	جون ۱۹۳۹ء	جلد ۳۱

فہرست مضامین

ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مشاورتی بورڈ

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں | پروفیسر محمد مجیب

ڈاکٹر سید عابد حسین | پروفیسر سعید انصاری

معتمد اور مدیر:۔ پروفیسر محمد عاقل

ادارۂ اجتماعیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد

۱۔ سیاسی، معاشی، تعلیمی اور تمدنی مسائل کا مطالعہ کرنا۔

۲۔ مطالعہ کے نتائج کو کتابوں اور رسالوں کی شکل میں شائع کرنا

۳۔ ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ نکالنا

۴۔ جلسے منعقد کرنا جس میں ملک کے سر برآوردہ ماہرین ادارہ کی دعوت پر اجتماعی مباحث پر مقالوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور حاضرین سوالوں یا تقریروں کے ذریعے سے تبادلۂ خیالات کرسکیں گے۔

بچّہ اور تعلیم

(جناب عبدالغفور صاحب استاد دں کا مدرسہ جامعہ)

گذشتہ مضامین میں ہم نے اس بات کے ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ تعلیمی عمل نفسیاتی اعتبار سے کیا ہے؟ اور انسان کے اندر سیکھنے یا تطابق حاصل کرنے کے لئے کون سی بنیادی محرکات اور جبلتیں پائی جاتی ہیں؟ اور پھر ان کی صحیح تربیت اور نشو ونما پر ہماری تعلیم کا کس قدر دار و مدار ہے؟ اس مضمون میں ہم بچہ کی انفرادی شخصیت کو اس نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ وہ کیوں کر سیکھتا ہے؟ یعنی وہ سماج کے علمی سرمایہ اور طبعی ماحول کے اثرات کو کس طرح اپنی زندگی کا تار و پود بناتا ہے؟ اس کے ذہنی نشو ونما کے قوانین کیا ہیں؟ اور اس کی روشنی میں ہم بچہ کی خام صلاحیتوں اور چھوٹے موٹے تجربات زندگی کی توسیع و ترتیب کیونکہ کر سکتے ہیں؟ یہ بات ہم اس لئے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ تعلیم کی نفسیاتی بنیادوں کے ضمن میں ہم نے دیکھا کہ بچہ کی زندگی کا ارتقار منفی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ وہ بڑھنے اور ترقی کرنے کے لئے اپنے اندر ایجابی قوتیں رکھتا ہے، جس کے صحیح اظہار پر اس کی زندگی کی صحیح تشکیل کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اس لئے ہم تعلیم میں بچہ کو ایک ایسے نامی وجود کی حیثیت سے دیکھیں گے جو نہ صرف دوسروں کے سہارے پر جیتا ہے بلکہ خود بھی اپنی زندگی کی تشکیل میں مصروف رہتا ہے۔ معلم کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اس عملی تشکیل میں بچہ کی مدد کرے کیونکہ بچہ عمر کی ہر ایک منزل میں نیا برگ و بار لاتا ہے، پرانی عادتیں چھوڑتا جاتا ہے اور نئی عادتیں اپنے نئے تجربوں کی بنا پر اختیار کرتا جاتا ہے۔ اس طرح زندگی کی جڑیں جن کو ہم جبلت کے نام سے موسوم کرتے ہیں، ہمہ وقت ماحول سے اپنی خوراک حاصل کرتی رہتی ہیں۔ ان جڑوں کی صحیح کارکردگی سے زندگی میں تر و تازگی رہتی ہے اس لئے زندگی کو مختلف تجربات سے قوت پہنچتی رہتی ہے۔ زندگی کا یہ اصول ایک بنیادی تعلیمی

مسئلہ کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ صرف وہ چیزیں بچہ کی بڑھتی ہوئی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں جو اس کی کسی ضرورت کو پورا کرتی ہیں اس لئے پڑھاتے وقت ہمیں بچہ کے ماحول اس کی ضروریات اور اس کی کیفیات نفسی کا مطالعہ کرانا چاہیئے۔ تاکہ بچے کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ جو معلومات ہم بچہ کو دیتے رہتے ہیں، وہ اس کی زندگی سے جوڑ کھاتے ہیں یا نہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو بچہ کا ماحول بہت محدود ہوتا ہے۔ شروع میں اس کی سماجی واقفیت خاندان اور آس پاس کے رہنے والے چند پڑوسیوں تک محدود رہتی ہے اسی طرح مکان کے اعتبار سے گھر، مدرسہ، بازار اور زیادہ سے زیادہ گاؤں یا محلہ تک اس کی رسائی ہوتی ہے۔ غرض شروع میں اس کا ماحول بہت تنگ ہوتا ہے۔ پھر اس کی نفسی زندگی کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ صرف ان چیزوں کو سمجھ سکتا ہے اور سمجھنا چاہتا ہے جو اس کی زندگی کی ضروریات سے بالکل قریب ہوں۔ اس لحاظ سے اس کا ذہنی افق بہت تنگ ہوتا ہے۔ وہ اپنی محدود دنیا سے باہر دیکھنے کا عادی نہیں ہوتا۔ جہاں بے تعلق اور دور کی باتیں شروع ہوئیں اس کی توجہ اور یکسوئی غایب ہوئی۔

اس لئے بچہ کی محدود زندگی کا تقاضا یہ ہے۔ کہ اس کی تعلیم کا آغاز اس کی روزمرہ کی ضروریات سے کیا جائے۔ اس لئے اگر ہم بچوں کو ان کی خوراک، پوشاک، رہنے سہنے، خاندان، اور دوسرے جانے پہچانے لوگوں کے حالات سے شروع کریں۔ تو یہ طریقہ بچے کے لئے زیادہ دلچسپ اور مناسب ہے۔ اس طرح بچے کو جو معلومات ملتی ہیں، ان کو وہ خوشی سے جذب کر لیتا ہے اور ان کو سمجھ بوجھ کر روزمرّہ کی زندگی میں برت کر سکتا ہے۔ ابھی تک تعلیم کو بچے کے مطابق کرنے اور آسان بنانے کے سلسلے میں جو کوشش ہوتی رہی ہے، وہ یہ ہے۔ کہ بالغوں کے تجربوں اور ان کے علمی ذخیرہ کو سادہ سے سادہ شکل میں بچوں کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ تاکہ بچوں کو بڑوں کا علم اخذ کرنے میں دشواری نہ ہو۔ چنانچہ مختلف درجوں کے بچوں کے لئے مجرد معلومات کا ایک سادہ خاکہ تیار کیا جاتا ہے۔ جس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے چند سالوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے اور یہ توقع کی جاتی ہے

کہ ہر ایک بچہ مقررہ حصہ کو اچھی طرح سے پختہ کرکے اگلی جماعت میں ترقی پانے کا مستحق ہو جائے گا۔
جہاں تک علم حاصل کرنے کا تعلق ہے، نئی تعلیم والے بھی اس بات پر متفق ہیں کہ بچوں کو گذشتہ تمدنی سرمائے سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے" کیوں کہ اس سے فائدہ اٹھائے بغیر آگے چلنا مشکل ہے۔ مگر ان کو اس طریقہ پر ایک بنیادی اعتراض ہے۔ وہ کہتے ہیں" کہ علم کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کرکے منطقی ترتیب کے ساتھ پڑھانا بچے کی نمو پذیر زندگی سے چشم پوشی کرنا ہے۔ اس قسم کی بے جان منطقی ترتیب کو ایک معمار تو برت سکتا ہے۔ کہ عمارت بناتے وقت ایک اینٹ پر دوسری اینٹ رکھتا چلا جائے اور اس طرح الگ الگ اینٹوں کی مرتب تعمیر سے ایک عالی شان عمارت تیار کرے۔ مگر معلم تو کیا کسی مالی کے لئے بھی اس طرح کا میکانکی طریقہ برتنا مناسب نہیں ہے کیونکہ مالی کو بھی پودے کی نامی ضروریات، مثلاً ہوا، پانی، روشنی، دھوپ وغیرہ کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ مالی اگر پودے کو وقت سے پہلے پانی دے۔ تو اس سے پودے کے نشو ونما پر یقیناً خراب اثر پڑے گا۔ اور اگر ضرورت سے زیادہ پانی دے تو پھر اس پودے کے گلنے سڑنے کا خطرہ ہے خوراک کسی نامی وجود کے لئے اس وقت فائدہ مند ہوتی ہے جب اسے کھانے کی ضرورت ہوتی ہے یہی خوراک پھر جسم کے ریشے ریشے میں رس بس کر اس کی زندگی کا جزو بن جاتی ہے تعلیم کی بھی یہی حالت ہے۔ کیونکہ علم تمدنی زندگی کے لئے دایہ کا کام کرتا ہے۔ اس کے دامنِ تربیت میں مستقبل کا شہری اور انسانی تمدن کا وارث پرورش پاتا ہے۔ اور اس کے ذریعے وہ زندگی کے رموز سمجھتا ہے اس لئے تعلیم میں بچوں کی ضروریات کو سامنے رکھنا ہر معلم کا فرض ہے۔ تعلیم کا معاملہ بچے کا معاملہ ہے بنیادی مسئلہ یہ نہیں ہے کہ مدرس کیا پڑھاتا ہے اور کتنی مقدار میں پڑھاتا ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ بچہ کتنا جذب کر سکتا ہے۔ اور کن حالات میں جذب کرتا ہے۔ اگر معلم بچے کی اس نامی ضرورت کو سمجھے۔ تو پھر تعلیم و تربیت کا مسئلہ صحیح بنیادوں پر ڈالا جا سکتا ہے۔"

ابھی تک تعلیم کے سلسلے میں یہ جو مختلف مضامین کے پڑھانے کا دستور رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت عرصے تک تعلیم کو یک طرفہ معاملہ سمجھ کر ایسا کیا گیا ہے۔ بچے کو جو کچھ پڑھایا جاتا ہے

وہ سماجی ضرورت سے پڑھایا جاتا ہے۔ کیونکہ جو کچھ بالغ اپنی سمجھ میں بہتر سمجھتے ہیں۔ اس کو آئندہ نسل تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہے۔

کیونکہ ہر ایک نسل گزرے ہوئے لوگوں کے تجربات کو ایک قیمتی امانت کے طور پر محفوظ رکھ کر کسی قدر نئے اضافہ اور تصرف کے ساتھ نئی نسل کے سپرد کر دیتی ہے اور اس طرح انسان کی زندگی میں تسلسل رہتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہر ایک نسل جو دنیا میں آتی ہے وہ اس امانت کو جوں کا توں نہیں حاصل کر سکتی۔ کیونکہ اس میں پیدائش کے ساتھ یہ اہلیت نہیں ہوتی کہ وہ فوراً ہی امانت کے اس بوجھ کو سنبھال سکے۔ اس لئے ہر ایک نسل کے لئے یہ عملی سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کس طرح نسلی تجربات کو نئی پود تک منتقل کیا جائے۔ ہر ایک زمانے میں لوگوں نے اپنے اپنے طور پر اس کا حل سوچا ہے۔ شروع میں جب علوم و فنون کا ذخیرہ اس قدر بڑھا نہیں تھا اور لوگ سادہ زندگی گذارتے تھے تو یہ بات آسان تھی کہ سماج کے کاموں میں عملی شرکت سے نئی نسل پرانی نسل کے ہنروں کو سیکھے۔ مختلف پیشہ وروں کی برادریوں کے ادارے تعلیم و تربیت کے بڑے کار آمد ادارے تھے۔ مگر چونکہ موجودہ زمانہ میں تمدنی زندگی کا معیار اس قدر بلند ہو گیا ہے کہ بچہ اس طرح سماجی مشاغل میں براہ راست شرکت کرنے سے وہ مہارت حاصل نہیں کر سکتا۔ جو ہر ایک شہری کو حاصل ہونا چاہیئے۔ اس لئے لازمی طور پر اس کی تیاری کے لئے خاص قسم کا انتظام کرنا پڑا۔ شہری زندگی کی تیاری مدرسہ کے سپرد کی گئی۔ مدرسہ نے سماجی تجربات کا نچوڑ کر اس کو مختلف مضامین کے نام سے مدرسہ میں پڑھانا شروع کر دیا۔ چونکہ بچہ میں اس قدر صلاحیت تو تھی نہیں۔ کہ سماجی علم کو اس کی اصلی شکل میں قبول کر سکے۔ اس لئے اس کے آسان سے آسان اجزا کئے گئے۔ تاکہ وہ بچے کی سمجھ میں آسانی سے آسکیں۔ اگرچہ علم میں اس طرح کے اختصار اور سادگی سے بچوں کے لئے بہت سی آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ مگر اس سے علم اور زندگی کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ کیونکہ اس اختصار کے عمل میں زندگی کے ان سماجی اثرات کو نظر انداز کرنا پڑا جس کی وجہ سے علم وجود میں آیا تھا۔ اس لئے علم سے روح نکال کر اس کی بے جان لاش کو مدرسہ میں جگہ دی گئی جس کا نتیجہ تعلیم

و تدریس کی بے لطفی اور بے حسی کی شکل میں آج ہمارے سامنے ہے ۔

علم کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کرنا اس غلط فہمی کی بنا پر تھا ۔ کہ بچہ بھی چھوٹے پیمانے پر آدمی ہوتا ہے ، اس لئے علم کو اس کے مطابق کرنا گویا اس کو مختصر کر دینا ہے ۔ یہ بات بچے کی نفسیاتی کیفیت کے بالکل منافی ہے ۔ بچے کے تجربات کی دنیا نہ صرف مختصر ہوتی ہے ۔ بلکہ بالغ اور بچے کی نفسی کیفیات میں بھی بنیادی فرق ہوتا ہے ۔ بالغ چیزوں کو منطقی ترتیب سے دیکھنے کا عادی ہوتا ہے ۔ وہ ماہر خصوصی کی حیثیت سے برسوں کسی مسئلہ کی جزویات پر سوچ سکتا ہے وہ تمدنی اور طبعی علوم کے کسی مخصوص مسئلہ پر تحقیق کر سکتا ہے ۔ اور اس کو اپنا مقصد زندگی بنا سکتا ہے مگر بچے کی دنیا جذبات و احساسات کی دنیا ہوتی ہے صرف شخصی تعلقات اور عملی مشاغل اس کی زندگی کو مربوط رکھ سکتے ہیں ۔ وہ عملی مشاغل ہی کے ذریعے زندگی کے مربوط حقائق کو سمجھ سکتا ہے ۔ وہ کسی مضمون کو مضمون کی حیثیت سے دیکھنے کا عادی نہیں ہوتا ۔ اس لئے جہاں اسباق کو اس کی زندگی سے الگ کر دیا ۔ وہاں بچے کے لئے اس کے اندر کوئی معنی نہیں رہ جاتے اس لئے اس کی علم سے وابستگی ٹوٹ جاتی ہے ۔ کیونکہ معلومات کے اس قسم کے اختصار اور منطقی ترتیب سے لازمی طور پر وہ مجرد شکل اختیار کرتی ہیں اور اس طرح کے اصطلاحی علم کا حاصل کرنا بچے کی زندگی کا شیوہ نہیں ہے ۔ اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ طلبہ کو بالکل اصطلاحی علم پڑھایا نہ جائے ۔ کیونکہ سبھی لوگ جانتے ہیں ۔ کہ ہر ایک طالب علم کے ضروری نہیں ہے کہ ان لمبے چوڑے تجربات سے خود بھی گذرے جن سے گذر کر ہمارے بزرگوں نے ہم تک یہ تمدنی سرمایہ پہنچایا ہے اور نہ افراد کی تھوڑی سی عمر میں یہ بات ممکن ہے چھوٹی عمر میں عملی مشاغل کے ذریعے سیکھنے کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ بچہ اپنے تجربے کی روشنی میں علم کی ان کنجیوں کو پا سکے ۔ جن کی مدد سے وہ علوم و فنون کے دروازے کھول سکے ۔ غرضیکہ بچے کے لئے اصطلاحی علم کا جاننا بھی ضروری ہے ۔ مگر اس وقت جب کہ بچے کے پاس اتنے ذاتی تجربات ہو جائیں ، جس کی بنا پر وہ اس مدون اور مرتب اصطلاحی

علم کو سمجھ سکے۔ جو یونیورسٹیوں کے کتب خانوں اور معملوں میں محفوظ رکھا گیا ہے۔

اگر ہم بچے کی شخصیت کو ایک بڑھتا ہوا نامی وجود سمجھنے لگیں۔ تو پھر ہم بچے کی تعلیم و تربیت میں ایسی بنیادی غلطی نہیں کر سکتے۔ بچے کے اندر تمدنی سرمایہ سے استفادہ کرنے کی ہر قسم کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ وہ بسا اوقات اپنے چھوٹے موٹے مشاغل میں وہی کچھ کرتا ہے جسے بڑے اچھے اور ترقی یافتہ پیمانے پر کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جس سماجی فضا میں پرورش پاتا ہے وہ خود بھی اس کے لئے تعلیمی اثرات سے لبریز ہوتی ہے۔ وہ غیر محسوس طریقہ پہ اس سے کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے۔ بچے کے ان چھوٹے موٹے مشاغل کو صحیح طور سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان میں تعلیم و ترقی کے لئے کون کون سی ایسی قوتیں پائی جاتی ہیں جن کو فروغ دے کر ہم بچے کو آہستہ آہستہ تمدن کی بلند تر سطح پر پہنچا سکتے ہیں۔ جس طرح نصاب کے مختلف مضامین کو پڑھانا بچے کی تعلیم و تربیت میں مقصود بالذات نہیں ہے۔ اسی طرح صرف بچے کے لئے عملی مشاغل کا انتظام کرنا بھی کسی بڑے مقصد کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتا۔ یہ دراصل وہ ذرائع ہیں جن کے بل بوتے پر ہم بچوں کو تعلیم و تمدن کی وسیع تر دنیا میں لے جا سکتے ہیں۔ اس طرح کی عملی دلچسپیاں بچے کے لئے ایسا موافق ماحول پیدا کر لیتی ہیں۔ جس میں بچہ نفسیاتی طور پر سیکھنے کے لئے بالکل تیار نظر آتا ہے۔ اس لئے معلم کی نظر ایک طرف نصاب یا بڑوں کے مرتب تجربات پر رہنی چاہیئے اور دوسری طرف خود بچے کی زندگی میں سے ایسے عناصر کو چنتے رہنا چاہیئے جن کو فروغ دے کر بچے کو نہایت سہولت اور قدرتی طریقہ پر بڑوں کے تجربات سے آشنا کیا جا سکے یعنی بڑوں کے علم اور تجربے سے وہ حصہ بچے کے سامنے پیش کر دے۔ جو اس وقت بچے کی ذات کے لئے سب سے زیادہ نزدیک ہو۔ کیونکہ صرف اسی طریقہ سے بچوں کے سادہ تجربات کے ساتھ بڑوں کے مرتب اور ترقی یافتہ تجربات کا آہستہ آہستہ پیوند لگایا جا سکتا ہے۔

نامی ہونے کے ساتھ ساتھ بچے کی زندگی مربوط ہوتی ہے۔ وہ مجموعی حیثیت سے کام کرتی ہے یعنی اس میں اتنی پختگی نہیں ہوتی۔ کہ وہ مختلف شاخوں میں پھیل جائے اور اس کی زندگی کی یہ شاخیں

صاف طور پر نظر آئیں بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عملی کاموں میں دلچسپی لیتا ہے ان کو بہت مستعدی اور انہماک سے کرتا ہے۔ اس لئے عملی مشاغل کے سلسلہ میں بچے کو جو کچھ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں وہی اس کے علم اور واقفیت کا سرمایہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ سرمایہ اس کے چھوٹے موٹے تجربات کا نتیجہ ہوتا ہے، یہ معلومات اگرچہ بے ترتیب اور خام شکل میں ہوتی ہیں۔ مگر اس میں بچے کے بڑوں کے پیش کردہ مرتب معلومات سے معنی کہیں زیادہ پنہاں ہوتے ہیں۔ اگر وہ بڑوں کی دی ہوئی معلومات کو سمجھ سکتا ہے۔ تو صرف ان چھوٹے موٹے تجربوں کی بنیاد پر سمجھ سکتا ہے وہ زندگی کی مجرد معلومات مختلف مضامین کی شکل میں الگ الگ طور پر تجزیہ نہیں کر سکتا۔ اگر معلومات بچے کی عملی زندگی سے الگ کر کے مختلف مضامین کی حیثیت میں پڑھائی جائیں۔ تو بچہ اپنے مخصوص نفسی حالات کی بنا پر ان کو نہیں سمجھ سکتا۔ سمجھنے کو ہم یہاں وسیع معنوں میں لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بچے بہت چھوٹی عمر میں بھی ہزار ہزار تک گنتی لکھ سکتے ہیں۔ مگر سمجھنے سے مراد رٹنا نہیں ہے بلکہ اخذ کی ہوئی اشیا کو اپنی زندگی کا جزو بنانا ہے یعنی یہ کہ حاصل کردہ معلومات کو آدمی بوقت ضرورت صحیح طور پر برت سکے اور معلومات کو آدمی اس وقت صحیح موقعہ پر کام لا سکتا ہے جب کہ عملی طور پر آدمی کو اس کا تجربہ ہو جائے چونکہ بالکل چھوٹے بچوں کی زندگی میں اس قسم کے مواقع کم آتے ہیں جس میں وہ بڑے اعداد کا استعمال کر سکیں، اس لئے بچوں کے ذہن میں اس کا تصور مشکل سے آ سکتا ہے لہذا معلم کا فرض ہے کہ وہ بچے کی زندگی پر بحیثیت مجموعی نظر رکھے۔ ایسے تعلیمی مواقع پیدا کرے، جن میں بچہ خوشی کے ساتھ شرکت کر سکے۔ اس صورت میں وہ جہاں موقع دیکھے مختلف مضامین کے اعتبار سے معلومات دیتا جائے۔ تاکہ وہ اس کی مجموعی تجربی زندگی کے اجزا کا کام دیں۔ اس لئے بچے کو مختلف مضامین پڑھانے کے لئے سب سے پہلے صحیح ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور یہ صحیح ماحول عملی کاموں میں براہ راست شرکت کرنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ یہاں پر بچے کے لئے ایسے مواقع پیش آتے ہیں جن میں معلم تمام درسی مضامین کو نہایت عمدگی کے ساتھ کھپا سکتا ہے

نئی تعلیم کا یہ نظریہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کی سچائی پر کھنے کے لئے ہمیں کسی خاص اہتمام اور تحقیق کی ضرورت پڑے یا بہت سے نفسیاتی اصولوں کی چھان بین کرنی پڑے۔ اگر ہم بچے کے روزمرہ مشاغل کا مشاہدہ کریں۔ ہمیں اندازہ ہو جائے گا۔ کہ جس طرح عموماً ہم بچے کو پڑھاتے ہیں۔ اس طرح وہ نہیں سیکھتا۔ مختلف مضامین کے اسباق محض اسباق کی حیثیت سے سیکھنا بچے کی زندگی کا خاصہ نہیں ہے۔ جیسا کہ پچھلی سطروں میں بتایا گیا کہ بچہ مختلف عملی مشاغل کے ذریعے اپنی معلومات فراہم کرتا ہے اور یہ تجربے یا مشاغل بچے کی مربوط معلومات کو با معنی بنا دیتے ہیں۔ بچہ اپنے مشغلوں اور کھیلوں میں حساب سیکھتا ہے، اس طرح کہ ان میں اسے گننے، ناپنے اور تولنے کے مواقع پیش آتے ہیں۔ سائنس سیکھتا ہے، اس طرح کہ وہ اپنے طبعی اور سماجی ماحول میں موسموں کی تبدیلیوں کا اثر محسوس کرتا ہے اور خود بھی اپنے مشاغل کے دوران میں وہ دنیا کی سرد و گرم، اونچ نیچ اور سخت و گرم سے براہ راست تجربہ کرتا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ دنیا کے سرد و گرم سے بچانے کے لئے کن کن اشیا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور کون کون ان کو فراہم کرتے ہیں۔ کس طرح سے وہ ان کو فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح سے وہ ان مواقع پر بچے کے لئے سماج کا سبق سیکھتا ہے پھر اگر بچہ کو یہ سمجھایا جائے کہ مختلف زمانوں میں لوگوں نے اپنے اپنے بچاؤ کے لئے کون کون سے طریقے اختیار کئے ہیں تو پھر ہم بچوں کو انسانی زندگی کے ارتقا یا تاریخ کی ایک ہلکی سی جھلک دکھا سکتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ کسی ایک ہی مشغلہ کے دوران میں زندگی کے ان تمام تجربات سے دوچار ہوتا ہے۔ مگر اسے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بچہ کہیں پر حساب سیکھتا ہے۔ کہیں ڈرائنگ سیکھتا ہے کہیں جغرافیہ اور تاریخ کا سبق لیتا ہے۔ کیونکہ بچے کے اندر اتنی ذہنی پختگی نہیں پائی جاتی کہ وہ زندگی کے ان مختلف پہلوؤں پر الگ الگ طور پر سوچ سکے۔ البتہ صحیح موقعہ پر ان مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنا اور ان کو تعلیمی اغراض کے لئے استعمال کرنا معلم کا کام ہے۔ کیونکہ بچہ خود بخود ان تعلیمی حقیقتوں کا تجزیہ کر کے ان پر نہیں سوچ سکتا اور نہ اس طرح کا سوچنا سادہ زندگی کا شیوہ ہے۔ بچے تو کیا بڑے بھی اپنی ابتدائی زندگی کے دور میں یہ تقسیم

نہیں کر پاتے ہیں۔ یہ دراصل تمدن اور ترقی یافتہ زندگی کی ایک ضرورت ہے کہ زندگی کے گوناگون تجربات کو چند موٹے موٹے اصول اور کلیات کی روشنی میں سمجھا جائے۔ چنانچہ تمدنی سلسلے کی بدولت تب انسان کے پاس تجربوں کا ذخیرہ ہونے لگا۔ اس وقت کاٹ چھانٹ ترتیب وتدوین کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیونکہ اس وقت اصولی ضابطوں کے بغیر زندگی کے مختلف مظاہر کا سمجھنا مشکل تھا۔ اس لئے جہاں زندگی کے مختلف تجربے مختلف طبعی اور تمدنی علوم میں بٹ گئے، وہاں پر بھی ہر ایک علم کے اصول اور قواعد مرتب کرنے پڑے۔ غرض بچہ بڑوں کے برخلاف اپنی زندگی میں مضامین کو اس طرح الگ الگ کرکے نہیں سیکھتا البتہ جیسے جیسے بچے کی عمر بڑھتی جائے، اور اس کا تجربہ وسیع ہوتا جائے، معلومات کو پھر منطقی ترتیب کے ساتھ پڑھا دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ مگر اس وقت بھی الگ الگ مضامین کے سماجی پہلو کو نظرانداز کرنا ان کو تقریباً پھیکا اور بے معنی بنا سکتا ہے، کیونکہ معلومات بذات خود علم اور تجربات کی توسیع کے لئے اتنی اہمیت نہیں رکھتے جتنا کہ ان کو سیکھنے کی ضرورت کا احساس ہوتا۔ تاکہ ایک تو طلبہ اس کے حاصل کرنے میں پوری توجہ مرکوز کرسکیں اور دوسرے اس بات کو سمجھیں کہ سماجی زندگی میں کسی علم وہنر کی قدر ومنزلت کیا ہے اور اس نے سماج کے بدلنے میں کیا مدد دی ہے اس طرح سے بچہ صحیح معنوں میں تمدنی ارتقا سے واقف ہو جائے گا اور آہستہ آہستہ سہولت کے ساتھ موجودہ زندگی کے مسائل کو ان کے تاریخی پس منظر کے ساتھ سمجھنے کی اہلیت پیدا کرے گا۔

غرض بچے کی مخصوص نفسیاتی کیفیت اس بات کی متقضی ہے کہ اس کی بڑھتی ہوئی شخصیت کو تعلیم کا مرکز قرار دیا جائے۔ یعنی یہ دیکھا جائے کہ کس طرح اس کے تجربات کا دائرہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے؟ کس طرح وہ شروع میں بالکل اپنی شخصی تعلقات کی چھوٹی سی دنیا میں رہتا ہے اور کس طرح علم کی روشنی اس کو صرف ذاتی تجربات کے ذریعہ پہنچتی ہے؟ اس لئے معلم کا کام یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ بچوں کی ضروریات کو نظرانداز کرتے ہوئے بڑوں کے تجربات کو سادہ کرکے منطقی ترتیب کے ساتھ اصطلاحی شکل میں ان کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرے

اس طرح کی جلد بازی سے بچے کو فائدے کی بجائے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ بے مقصد طریقہ پر پڑھانے سے اس کو مدرسہ کی پڑھائی اور استاد سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ بچے کی زندگی کی نازک جڑیں خود بھی سماجی زندگی سے خوراک حاصل کرنے میں لگی رہتی ہے۔ ہمارا کام یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اس عمل میں تدریجی طور پر بچے کی مدد کریں اور سماج کی منتخب اچھائیوں اور ہنرمندیوں سے بچوں کو اس طرح سے روشناس کرائیں کہ جو کچھ بچوں کو پڑھایا جائے وہ ان کے روزمرہ کے تجربات اور مشاہدات سے تعلق رکھے۔ اس لئے علم اور بچے کی زندگی کو دو متضاد چیزیں نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ سیکھنے کو بچے کی زندگی کی قدرتی نشوونما کا ایک لازمی عمل سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ انسان اپنی زندگی کے دوران میں تمدنی زندگی کے مختلف تجربات میں سے کسی نہ کسی صورت سے گزرتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارا موجودہ تمدن جس معیار پر پہنچا ہے اور جس تیزی کے ساتھ آگے کو بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کے پیش نظر زندگی سے تطابق حاصل کرنے کے لئے بچے کو صرف ذاتی تجربات کے ذریعہ سیکھنے پر نہیں چھوڑا جا سکتا اور اس لئے پڑھائی کے سلسلہ میں ایک خاص منزل پر پہنچ کر ضرور کسی نہ کسی طرح اصطلاحی علم اور منطقی ترتیب کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ لیکن بالکل ابتدائی تعلیم میں بچے کی مربوط زندگی کو جہاں پر وہ مجرد حقیقتوں کے ذہنی تجربے کرنے کے قابل نہیں ہوتا، الگ الگ مجرد معلومات میں بانٹ دینا اس کی ایک اہم ضرورت سے چشم پوشی کرنا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ استاد اپنے کام میں مختلف معلومات کا کوئی واضح تصور نہ رکھے۔ بلکہ استاد کا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ ہر ایک تعلیمی مشغلہ کی تعلیمی قدروں کی صحیح پڑتال کرکے دیکھے کہ اس میں بچوں کے سیکھنے کے لئے کون کون سے اہم مواقع نکل سکتے ہیں اور کون مواقع کن کن تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے استعمال کئے جا سکتے ہیں؟ اگر ہم کتاب کی بجائے بچے کو مرکز بنائیں اور صرف خاموشی سے سننے والے بچے کی بجائے چلتے پھرتے اور کام میں مشغول بچے کا تصور کریں جو کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا ہے اور کرنے سے سیکھنا چاہتا ہے۔ تو پھر ہم کو اپنے تعلیمی نقطۂ نظر میں بہت بنیادی تبدیلی کرنی پڑے گی۔ پھر ہم

صحیح معنوں میں بچے کے مشاغل کی قدر و قیمت کرنا سیکھیں گے۔ جان ڈوئی نے جو تعلیم میں سب سے پہلے اس خیال کے علمبردار ہیں اپنی کتاب The school and the child میں استادوں کو جو مشورہ دیا ہے۔ اس کو ہم یہاں پر اپنی راہ نمائی کے لئے درج کرتے ہیں: "اس بات کا خیال اپنے ذہن سے نکال دو۔ کہ نصاب کے مضامین بذات خود کوئی مقررہ اور بنی بنائی چیز ہیں۔ جو بچے کی زندگی سے الگ وجود رکھتے ہیں۔ اس طرح یہ بھی نہ سمجھو کہ بچے کے تجربات بالکل اٹل اور جامد ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ بچے کی ان سادہ شغلوں میں لوچ، نمو پذیری اور زندگی پائی جاتی ہے اور یہیں خیال کرنا چاہیئے کہ بچہ اور نصاب تعلیم کے دو ایسے نشان ہیں جو ایک ہی عمل کے دوسروں کو ظاہر کرتے ہیں۔ جس طرح علم ہندسہ میں دو نقطوں کا درمیانی فاصلہ ایک خط کو ظاہر کرتا ہے اسی طرح تعلیم بچے کی موجودہ زندگی اور درسی علوم کے باہمی رشتہ سے عبارت ہے تعلیم ایک مسلسل تعمیر نو کا نام ہے۔ جو بچے کے موجودہ تجربات سے شروع ہو کر سماج کی ان منظم حقیقتوں کے مجموعے تک پہنچ جاتی ہے جن کو ہم علوم و فنون کہتے ہیں۔"

بچے کو مرکز ماننے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ پھر ہم مختلف مضامین کو کس طرح بچے کی مشغول زندگی میں کھپا سکتے ہیں کیونکہ نئی تعلیم اور پرانی تعلیم میں بنیادی فرق یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی پرانی تعلیم میں درسی معلومات تعلیم کا مرکز ہوتی ہیں اور نئی تعلیم میں بچے کی زندگی۔ پرانی تعلیم میں مجرد معلومات کو آسان کر کے بچوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور نئی تعلیم میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ان معلومات کو بچے کے سامنے پیش کرنے کے سماجی مشاغل کو بطور ذریعہ استعمال کرنا چاہئے یعنی یہ کہ سماج میں طرح طرح کے مشاغل پائے جاتے ہیں۔ بعض مشاغل خام اشیاء کے کام سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے زراعت، باغ بانی۔ ماہی گیری اور کان کنی وغیرہ اور بعض کام صنعت و دستکاری سے تعلق رکھتے ہیں یعنی پھر لوگ اس خاص پیداوار میں تصرف کر کے اس کو سماج کی ضروریات کے قابل بنا دیتے ہیں اور کچھ کام لین دین سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی چیزیں لوگوں تک مختلف تاجروں کے ذریعے سے پہنچتی ہیں اور پھر خریداروں کو خود بھی اپنی ضروریات کو دیکھتے ہوئے مختلف

چیزوں کی خریداری کا انتخاب کرنا پڑتا ہے کہ کون سی چیز پائیداری اور خوبصورتی کے اعتبار سے زیادہ مفید ہے اور کون سی کم۔ اس لئے ان تمام مشاغل کے سلسلے میں بعض ایسی ہنرمندیوں کے جاننے کی ضرورت پڑتی ہے جن کے بغیر ان ضرورتوں کو پورا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس لئے لازماً ہر مشغلہ کے ضمن میں ہمیں تھوڑا تھوڑا کرکے ان کو کسی نہ کسی طرح سیکھنا پڑتا ہے۔ نئی تعلیم والوں کا مقصد یہ ہے کہ پڑھانے والوں کو یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے، کیونکہ یہ سیکھنے کا بالکل قدرتی طریقہ ہے۔ سماجی مشاغل کے ذریعہ آدمی نے نتیجے کے طور پر یہ سارا علم سیکھا ہے اور نئی نسل بھی اسی طرح سے اس کو سیکھ سکتی ہے۔ چنانچہ پراجکٹ متھڈ اور حرفہ کے ذریعہ پڑھانے والوں کا بنیادی خیال یہی ہے۔ بنیادی تعلیم والے بھی حرفوں کو تعلیمی پروگرام میں اسی مقصد کے پیش نظر شامل کرتے ہیں۔

بچے کو مرکز مان کر نئی تعلیم والے درسی مضامین کی حیثیت کو گرانا نہیں چاہتے۔ البتہ اس کو بچے کی ہم آہنگ اور مجموعی تعلیم و تربیت کے لئے وسائل کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جہاں پر نئی تعلیم کے مقاصد کے پیش نظر تعلیم دی جا رہی ہے، وہاں پر بھی مقررہ نصاب کو پورا کرنا پڑتا ہے اور وہاں بھی مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ مگر یہاں پر بچے کی عملی دلچسپی مقدم ہوتی ہے اور مضامین کو عملی مشاغل کے دوران میں جو سیکھنے کے مختلف مواقع آتے ہیں، ثانوی حیثیت سے پڑھاتے ہیں۔ اس طرح کی پڑھائی کو نئی تعلیم میں ربط مضامین کہتے ہیں۔ چنانچہ بنیادی تعلیم میں بھی جہاں پر استاد حرفہ کے ذریعہ تعلیم دیتا ہے اپنے پروگرام کے تختے پر الگ الگ مضامین مثلاً زبان حساب، سماجی مطالعہ اور عام سائنس کے خانے قائم کرتا ہے یہ مضامین مختلف عملی مشاغل اور بچوں کے ماحول کی مناسبت سے پڑھائے جاتے ہیں۔ اس تقسیم کا فائدہ یہ ہے کہ استاد کے ذہن میں اس بات کا تصور واضح ہو جائے کہ بچہ اپنے عملی مشاغل کے دوران میں کون کون سی ایسی منزلوں میں سے گزرتا ہے جہاں پر اس کو ان مضامین کے سیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یا کم از کم وہ اس موقع پر خاص باتیں سیکھنے کے لئے آمادہ نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ مواقع بعض مرتبہ صاف طور پر نظر نہیں آتے مگر دیکھنے والے ان مواقع کی دھندلی سی جھلک بچے کے معمولی مشاغل، ان کے ماحول اور خود ان کی گفتگو میں دیکھ

سکتے ہیں۔ وہ اکثر ایسی چیزوں سے وابستہ نظر آئیں گے، جہاں پر ان کی دلچسپیوں کو تعلیمی کاموں میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ یہاں پر بچے کی معلومات کو مختلف مضامین کے عنوانات کے نام سے تقسیم کرنا اس لئے ضروری ہے کہ استاد ان کی روشنی میں بچے کے تعلیمی مشاغل کی حیثیت کو جانچ سکے اور ان کی مدد سے بچے کی بالکل سادہ اور ابتدائی زندگی میں بھی ان صحیح قدروں کی آبیاری کر سکے جن پر متمدن زندگی کا دارومدار ہے۔ اس لئے کہ اگر ہم شروع ہی سے بچوں کے مشاغل میں تعلیمی اور ترقی پذیر رجحانات کا اندازہ کر سکیں، تو ہم زیادہ یقین کے ساتھ ترقی پذیر اور تسلی بخش زندگی کی طرف ان کی راہ نمائی کر سکتے ہیں۔

بچوں کی دلچسپیاں کئی طرح کی ہو سکتی ہیں۔ ان میں ایسی بھی ہیں جن سے بچے کی تعلیم و تربیت میں بہت مدد لی جا سکتی ہے اور ایسی بھی جن میں شرکت کرنے سے کوئی تعلیمی اور تربیتی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے استاد کو اس معاملہ میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کو چاہیئے کہ مختلف مشاغل کے دوران میں وہ ایسے مواقع یا ضمنی مشاغل کی کھوج میں لگا رہے۔ جہاں سے وہ بچے کی تعلیمی زندگی کو ٹھیک راستے پر لگا سکے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ بچے ایسے مشاغل میں لگ جائیں جو ان کے لئے بذات خود تو دلچسپ ہوں مگر ان سے کوئی تعلیمی فائدہ مترتب نہ ہو سکے۔ اس لئے جس طرح کسی خاص مضمون کو مقصود بالذات سمجھ کر پڑھانا بچے کی تعلیم و تربیت میں کوئی بڑا حصہ نہیں لیتا۔ اسی طرح کسی دلچسپی کو محض دلچسپی کی غرض سے پورا کرنا ہمارے تعلیمی مقصد کو حاصل نہیں کر سکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس دلچسپی یا مشغلہ میں بچے کی مجموعی (جسمانی اور ذہنی) نشو و نما کے لئے کون کون سے جاندار عناصر موجود ہیں جن کو کام میں لا کر ہم بچے کو چند قدم آگے بڑھا سکیں۔ یہ بات ہم اس لئے صاف کرنا چاہتے ہیں کہ ممکن ہے نئی تعلیم کی نسبت جس میں کہ بچوں کی دلچسپی کو مرکزی حیثیت دی جاتی ہے، پڑھانے والوں کو یہ غلط فہمی ہو کہ بچے کی دلچسپیوں کو پورا کرنا ہی سب کچھ ہے۔ بچے تو کیا بڑوں کی دلچسپیوں میں سے بھی ہم ایسی مثالیں پیش کر سکتے ہیں جو تعلیمی ترقی کے اعتبار سے ہرگز بارآور نہیں کہی جا سکتیں اور جن کی حیثیت دماغی عیاشی یا اوقات گزاری سے زیادہ

نہیں ہے۔ مثال کے طور پر شطرنج کو لیجیے۔ شطرنج کھیلنے والا صرف شطرنج ہی کھیل کر اپنی زندگی کو تمدنی قدروں سے مالا مال نہیں کر سکتا۔ کیونکہ شطرنج کھیلنے والا اس اعتبار سے کولھو کے بیل کی طرح ساری عمر ایک ہی محدود دائرے میں چکر لگاتا رہتا ہے اور جب آنکھوں سے پٹی اترتی ہے تو اپنے آپ کو وہیں کا وہیں کھڑا پاتا ہے۔ اس لئے تعلیمی مشاغل کے انتخاب میں کافی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بنیادی تعلیم میں حرفوں کو متعین کرکے اس خطرے کو بہت کچھ کم کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں جتنے حرفے منتخب کئے گئے ہیں، ایک تو ان کی اجتماعی قدر و قیمت اس قدر ہے کہ اس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے ان میں درسی مضامین کو کھپانے کی لوچ اور وسعت موجود ہے۔ ہر ایک حرفہ ہماری تمدنی زندگی کی کسی اہم سے اہم ضرورت کی کفالت کرتا ہے۔ اس لئے ہر حرفے کے سلسلے میں ایسے ضمنی مشاغل اور دلچسپیاں نکل سکتی ہیں جو ہماری پوری درسی تعلیم کی مہارتوں کو اپنے اندر سمیٹ سکیں۔

حرفے کے ذریعے تعلیم دینے کے سلسلے میں اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ معلم اس کی صحیح تعلیمی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ بنیادی تعلیم والوں نے حرفوں کا تعین کرکے اس بات میں معلم کی ضرور مدد کی ہے کہ وہ صرف بچوں کی دلچسپی کو مرکز مان کر ایسے غیر تعلیمی مشاغل میں نہ الجھ جائیں جن سے بچے کو کوئی تعلیمی فائدہ نہ پہنچے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ان حرفوں ہی کو مقصد مان کر دستی مہارت میں خصوصیت پیدا کرنے کی خاطر بچے کی عام تعلیم سے بے اعتنائی کی جائے۔ نصاب کے دئے ہوئے حرفوں کو تعلیمی پروگرام میں مرکزی حیثیت ضرور دینی چاہیئے مگر بنیادی حرفے کے سلسلے میں جو ضمنی مشاغل نکلتے ہیں اور جن کو بچے خوشی کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی طرف سے معلم کو چشم پوشی نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس سے ایک طرف تو کام میں تنوع کی وجہ سے نئی نئی دلچسپیاں پیدا ہوتی ہیں اور حرفے کے مختلف پہلوؤں کے متعلق بچے کی عام واقفیت بڑھتی جاتی ہے اور کام کی نوعیت زیادہ تخلیقی ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی آزادی سے بچہ اس تنگ نظری اور یک طرفہ تربیت سے بچ جاتا جس کا معمولی دست کاری سے پیدا ہونے

کا اندیشہ ہے اور دوسری طرف ضمنی مشاغل کے دوران میں کثرت سے ایسے مواقع نکل سکتے ہیں جن کے ذریعہ درسی مشاغل کی وجہ سے طالب علم کو کام کرنے کے لئے اور درسی مضامین کو سیکھنے کے لئے ایک بہت بڑا میدان ہاتھ آ جاتا ہے۔ اس لئے بنیادی حرفے کو وسیع نقطہ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ اگر حرفے کے میدان کو تنگ کر دیا جائے اور صرف براہ راست اسی کے ذریعہ ہم تعلیم دینا چاہیں، تو اس طرح سے ہم اپنے تعلیمی میدان عمل کو تنگ کریں گے اور ان متنوع تجربات سے تعلیمی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے جو مرکزی حرفہ کے دوران میں نکلتے رہیں گے۔

یہ ضرور ہے کہ استاد کو اس بات کا خیال رکھنا پڑے گا کہ کسی عمر میں بچوں کی دلچسپیوں اور تجربوں کو کہاں تک بڑھایا جا سکتا ہے یعنی یہ کہ کسی خاص موقع سے مدد لے کر ہم کتنا تعلیمی مواد بچے کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اس معاملے میں استاد کو لازمی طور پر بچوں کی استعداد کا لحاظ رکھنا ہوگا اور نصاب کا مقصد بھی یہی ہونا چاہیئے کہ وہ بچوں کے تعلیمی حدود متعین کرنے میں استاد کی راہ نمائی کرے۔ اس لئے نصاب کا متعین ہونا بھی استاد کو اس حق سے محروم نہیں کرتا کہ وہ مقررہ معلومات زندگی کے مختلف مشاغل کی صورت میں موقع موقع پر بچوں کو دیتا رہے البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ استاد کے دئے ہوئے نصاب کی ترتیب کی ہو بہو پابندی بھی کر سکے کیونکہ مختلف مشاغل کے دوران میں جو جو مواقع نکلتے رہتے ہیں، ان کو پہلے ہی سے کسی مقررہ ترتیب کے ساتھ بھانپ لینا ناممکن ہے اس لئے کہ بچوں کے مشاغل میں اس قدر لوچ اور تغیر پذیری ہوتی ہے کہ ہر قدم پر نصاب کی مقررہ ترتیب کا ساتھ نہیں دیا جا سکتا۔ تاہم استاد کے ذہن میں نصاب کی نوعیت اور تعلیمی حدود کا تصور واضح ہونا ضروری ہے تاکہ وہ ہر موقع پر نصاب کے جزویات کو بہترین تعلیمی موقعوں پر برت سکے۔ اس لئے جن مدرسوں میں حکومت کی طرف سے مقررہ نصاب کی پابندی لازم بھی قرار دی گئی ہے وہاں بھی بچوں کو حرفوں کے ذریعہ بہت حد تک پڑھایا جا سکتا ہے۔ البتہ اگر نصاب میں ایسی معلومات کا پڑھانا رکھا گیا ہے جو بچوں کی

زندگی سے دور ہیں تو یہ نصاب کی کمی ہے اور اس کو پورا کرنا چاہیئے۔

بات یہ ہے کہ ہم نے علم کو زندگی سے سیکھا ہے اور ہم زندگی ہی کے ذریعہ پھر اس کو حاصل کر سکتے ہیں۔ ہماری موجودہ تعلیم کی سب سے بڑی خرابی تو یہ ہے کہ یہ زندگی سے الگ ہوگئی ہے۔ اس نے نظری اور کتابی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اس لیئے اس کی نامی خصوصیت کی جگہ میکانکی طرز تعلیم نے لے لی ہے اور میکانکی ہونے کی وجہ سے جو خرابیاں لازم آتی ہیں وہ سب اس میں آگئی ہیں۔ تعلیم کے متعلق بچوں کا رویہ تجربی ہونے کی بجائے بالکل روایتی ہوگیا ہے۔ طلبہ سے زیادہ سے زیادہ رٹنے کی توقع کی جاتی ہے۔ جو کچھ انھیں پڑھایا جاتا ہے اس کی وہ ہو بہو نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیئے موجودہ تعلیم طوطے کی تعلیم کہلاتی ہے۔ درجہ میں استاد ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ طالب علم کی ہستی نفی کے برابر ہوتی ہے۔ تعلیمی پروگرام میں بچے کی ذاتی اپج اور سیکھنے کی قدرتی صلاحیتوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ پروفیسر جان ڈوئی نے اس قسم کی رسمی تعلیم کی جو بڑی بڑی خامیاں ظاہر کی ہیں۔ ہم ان کو مختصر طور پر یہاں ذکر کرتے ہیں۔

"پہلی بات یہ ہے کہ جو کچھ بچے کو پڑھایا جاتا ہے اور جو کچھ بچہ دیکھتا، پسند کرتا، اور محسوس کرتا ہے۔ ان میں کوئی زندہ رشتہ نہیں پایا جاتا۔ یہ چیز بچے کی معلومات کو بالکل رسمی بنا دیتی ہے۔ البتہ جب یہ رسمی علم حقیقت کا جامہ پہن لیتا ہے۔ جس کی مدد سے انسان کسی نئی حقیقت کا کھوج لگا سکے۔ تو اس وقت یہ علامات بھی اصلیت رکھتی ہیں۔ علم کی رسمی علامتیں جو باہر سے بچے پر تھوپ دی جاتی ہیں اور جن کو بچے نے اپنے ابتدائی تجربات میں ٹھوس طریقے پر محسوس نہیں کیا ہے، وہ صرف علامت ہی علامت ہے۔ اس کا سیکھنا بچے کے لئے بالکل بے روح اور غیر دلچسپ ہے۔"

"دوسری خرابی جو اس طرح کی بیرونی طور پر عائد کردہ تعلیم سے پیدا ہوتی ہے، وہ یہ ہے۔ کہ اس میں سیکھنے کے لئے بچے کے اندر کوئی آمادگی نہیں پائی جاتی۔ اس میں نہ صرف گزشتہ محسوس کی ہوئی حقیقتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ نئی صداقتوں کا کوئی جوڑ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہاں تو سرے سے سیکھنے کے لئے خواہش، ضرورت اور بے چینی نہیں پائی جاتی۔ جب مضامین کو

نفسیاتی رنگ دیا جاتا ہے' یعنی ان کو مجوزہ رجحانات اور مشاغل کی ترقی یافتہ صورت سمجھا جاتا ہے تو پھر یہ بات آسان ہو جاتی ہے کہ موجودہ مشاغل کے دوران میں بعض علمی' ذہنی اور اخلاقی مشکلات کا اندازہ کر کے ان کو کسی متعلقہ صداقت کو سیکھنے کے ذریعہ حل کیا جائے۔ اس ضرورت سے آدمی سیکھنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ بچے کے سامنے کوئی مقصد ہوتا ہے۔ تو پھر وہ اپنی تکمیل کے لئے بچے کو وسائل ڈھونڈنے پر آمادہ کرتا ہے۔ لیکن جب درسی معلومات بچے کے سامنے براہ راست اسباق کی صورت میں اس لئے پیش کی جاتی ہیں۔ کہ بچہ انہی کو مقصد سمجھ کر سیکھے۔ تو پھر مقصد اور ضرورت کے ملانے والے رشتے کا غائب ہو جانا صاف صاف طور پر محسوس ہوتا ہے۔ جب ہم تدریس کے سلسلے میں میکانکی اور مردہ طریقہ تعلیم کا ذکر کرتے ہیں۔ تو اس سے ہمارا مطلب اسی تعلیمی محرک کی کمی ہوتا ہے۔ نامی اور زندہ تعلیم نام ہے باہمی ردعمل کا جو ذہنی طلب اور اس کی تسکین کے لئے مادی ذرائع کی رسد سے پورا ہوتا ہے۔"

تیسری خرابی یہ ہے۔ کہ نہایت مستند معلومات کو بھی اگر بہت عمدہ منطقی ترتیب کے ساتھ بیرونی طور پر بچے کے سامنے بنی بنائی صورت میں پیش کر دیا جائے۔ تو اس وقت بھی بچے کے لئے اس میں کوئی منطقی ترتیب نہیں رہتی۔ ضرور اس میں کاٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ کہیں مشکل حصوں کو نکالنا پڑتا ہے۔ کہیں ان کو ہموار کر کے آسان کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے خود بچے کے ذہن میں جو معلومات کی ترتیب ہوتی ہے اور جس کو بچے کی زندگی کی ضروریات مقرر کر دیتی ہے۔ وہ قائم نہیں ہوتی۔ اس لئے جب معلومات کو بیرونی طور پر بچے کی موجودہ ضروریات سے قطع تعلق کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ تو ان میں وہ ترتیب اور قوت نہیں رہتی۔ جو ایک طرف بچے کی گزشتہ معلومات کے ساتھ جوڑ کھائے اور دوسری طرف اس کو آگے سوچنے پر ابھارے۔

برطانیہ کی عالمگیر سلطنت

برطانوی سلطنت کیا ہے؟ | دنیا کا تقریباً ایک چوتھائی رقبہ برطانیہ کی سلطنت میں شامل ہے۔ اسی طرح دنیا کی تقریباً ایک چوتھائی آبادی یعنی ۴۰ کروڑ سے زیادہ نفوس برطانیہ کے ماتحت ہیں[۱]۔ برطانیہ کی سلطنت میں دنیا کے جو حصے شامل ہیں انھیں سامنے کے صفحہ پر نقشہ کے ذریعہ سے دکھایا گیا ہے۔ ان میں سے بڑے بڑے علاقے حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ جزائر برطانیہ   ۴۔ کناڈا

۲۔ ہندوستان   ۵۔ آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ

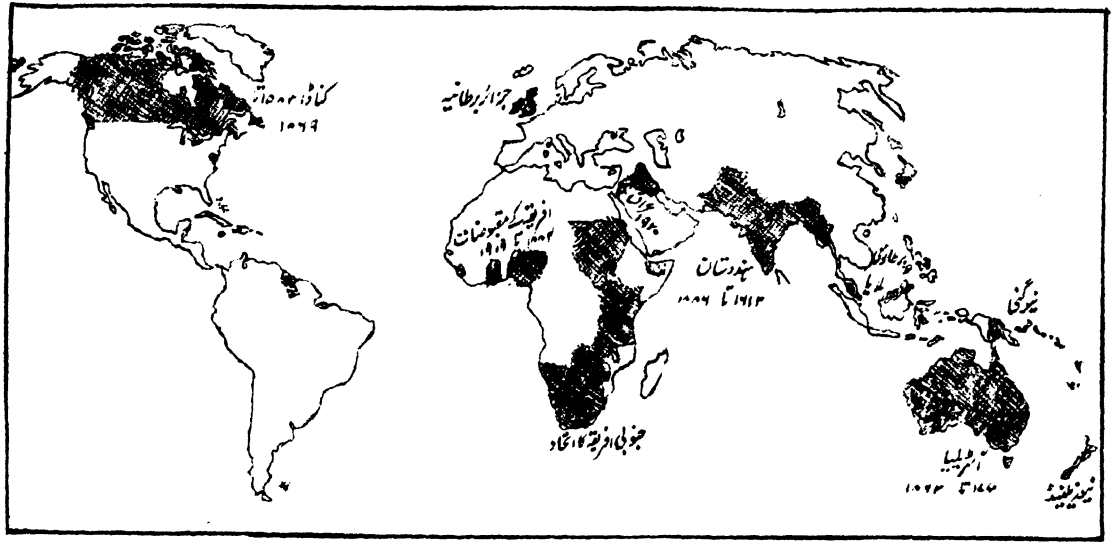
۳۔ جنوبی افریقہ کا اتحاد اور افریقہ کے دوسرے علاقے   ۶۔ ریاست ہائے ملایا

اس کے علاوہ برطانیہ کی سلطنت میں بہت سے چھوٹے جزیرے شامل ہیں جو دنیا کے ساتوں سمندروں میں بکھرے ہوئے ہیں اور بہت سی عمدہ بندرگاہیں برطانیہ نے غیر ملکوں میں حاصل کر رکھی ہیں۔

بعض ملکوں کو جنگ عظیم کے بعد لیگ آف نیشنس نے یورپ کے دول کی حفاظت میں دے دیا تھا اس سلسلہ میں عراق (میسوپوٹامیا) اور افریقہ کے بہت سے ایسے علاقے جو پہلے جرمنی کے قبضہ میں تھے برطانیہ کی نگرانی میں آ گئے ہیں۔ مصر کو بھی بعض وقت برطانوی سلطنت کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔

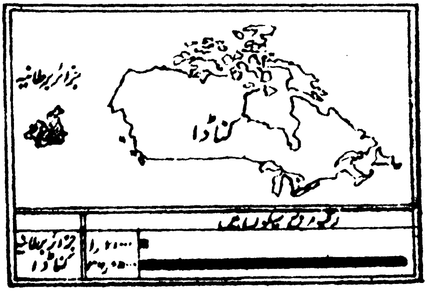
---

[۱] یہ ماتحتی مکمل نہیں ہے سلطنت کے بہت سے حصے خود مختار ہو گئے ہیں اور اب انھیں نو آبادی کی جگہ ڈومینین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ برطانوی سلطنت کا سرکاری نام بھی ۱۹۲۱ء سے برٹش کامن ویلتھ آف نیشنس "اقوام کی برطانوی دولت مشترکہ" رکھ دیا گیا ہے۔ تمام سلطنت کا سردار بادشاہ کو سمجھا جاتا ہے لیکن جملہ سیاسی معاملات میں وزیر اعظم اور اس کے ساتھی بادشاہ کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں اور یہ لوگ برطانوی پارلیمنٹ



دنیا کے تمام براعظموں کی زمینیں برطانوی سلطنت میں شامل ہیں ان میں سے خاص خاص کو ان تاریخوں کے ساتھ جب وہ برطانوی سلطنت میں شامل ہوئیں نقشہ میں دکھایا گیا۔

برطانیہ عظمیٰ کا برطانیہ کی وسیع سلطنت سے مقابلہ برطانیہ کے قبضہ میں جو خاص خاص علاقے ہیں ان میں سے کوئی علاقہ بھی برطانیہ عظمیٰ کے برابر مختصر نہیں ہے۔ کناڈا، آسٹریلیا، افریقہ کے برطانوی مقبوضات اور ہندوستان —— ان ملکوں کے صرف صوبوں کا مقابلہ جب برطانیہ سے کیا جاتا ہے تو ان میں سے ہر ایک کا رقبہ انفرادی طور پر جزائر برطانیہ کے رقبہ سے زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس وسیع سلطنت میں ہندوستان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جزائر برطانیہ کی آبادی چار کروڑ تیس لاکھ ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستان کی آبادی ۳۵ کروڑ ہے۔ ہندوستان کے صوبہ بنگال اور صوبہ جات متحدہ ان دونوں میں سے ہر ایک کی آبادی برطانیہ عظمیٰ سے زیادہ ہے۔ رقبہ کے لحاظ سے پنجاب، صوبہ جات متحدہ اور صوبہ جات متوسط ان میں سے ہر ایک برطانیہ عظمیٰ سے زیادہ بڑا ہے۔ حاشیہ کے نقشہ میں برطانیہ کے رقبہ کا کناڈا کے رقبہ سے مقابلہ کر کے دکھلایا گیا ہے۔ اسی طرح کا مقابلہ دنیا کے نقشہ کو دیکھ کر برطانیہ کی سلطنت کے دوسرے حصوں سے بھی کیا جا سکتا ہے۔



برطانیہ کے رقبہ کا کناڈا کے رقبہ سے مقابلہ۔ کناڈا برطانوی سلطنت کا ایک حصہ ہے

برطانیہ کیوں زمین کے اس قدر بڑے حصے پر اپنا قبضہ قائم رکھنا چاہتا ہے اس سلطنت کو بنانے کے لئے برطانیہ کے بہت سے لوگوں نے اپنی جانیں جنگ کے میدانوں، جنگلوں اور ریگستانوں میں قربان کی ہیں۔ انھوں نے سردی گرمی،

(بقیہ نوٹ صفحہ) کو جواب دہ ہوتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے ممبروں کو انگلستان، اسکاٹ لینڈ، ویلز اور شمالی آئرلینڈ کے لوگ منتخب کرتے ہیں۔ ان علاقوں کا مجموعی طور پر جب ذکر کیا جاتا ہے تو انھیں "سلطنت متحدہ برطانیہ و شمالی آئرلینڈ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس نام میں پہلے بہت سالوں تک پورا آئرلینڈ شامل تھا لیکن ۱۹۲۲ء سے آئرلینڈ کے جنوبی حصہ کو آئرش فری اسٹیٹ کے نام سے خود مختار ڈومینین بنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح کناڈا اور آسٹریلیا بھی برطانیہ کی نگرانی سے تقریباً بالکل آزاد ہیں۔

بھوک اور بیماری کی تکلیفوں کو برداشت کیا ہے۔ انھوں نے یہ سب کچھ بہت سے وجوہ کی بنا پر کیا ہے کچھ لوگوں نے تو اپنے وطن کی محبت کے جذبہ سے سرشار ہوکر اور سلطنت برطانیہ پر ناز کرنے کے لئے یہ سب کچھ کیا۔ کچھ لوگ اتنے من چلے اور مہم پسند تھے کہ ان سے گھر پر چین سے نہیں بیٹھا جاتا تھا اس لئے خطرات برداشت کرنے کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ کچھ لوگ ہندوستان، آسٹریلیا یا کناڈا کو اس وجہ سے روانہ ہوئے کہ انگلستان میں آبادی بہت زیادہ ہوگئی تھی اور کھیتی کے لئے وہاں زمین موجود نہیں تھی۔ کچھ لوگ سونے کی تلاش میں روانہ ہوئے اور کچھ ریلیں بنانے کے لئے۔

لیکن سب سے اہم دلیل یہ تھی کہ انگریز اپنی زندگی کو بہتر طریقے پر گزارنا چاہتے تھے۔ اس خواہش کے ماتحت ہزاروں انگریز بحر اٹلانٹک کو عبور کر کے شمالی امریکہ پہنچ گئے اور ہزاروں جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا کے دور دراز علاقوں میں جا کر بس گئے۔ غرضکہ برطانوی سلطنت کی تعمیر میں زیادہ اچھی اور زیادہ آزاد زندگی کی خواہش کا حصہ بہت اہم ہے۔

پھر سلطنت کے ترقی پانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انگریزوں کو تجارت کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ ہم پچھلی بحث میں دیکھ چکے ہیں کہ برطانیہ کس طرح دنیا کی تجارت کا مرکز بن گیا۔ جتنی برطانیہ کی تجارت بڑھتی گئی اتنی ہی اس کی سلطنت بھی زیادہ وسیع ہوتی گئی۔ ان دونوں کی ترقی ساتھ ساتھ ہوتی رہی۔ جیسے جیسے مینروں کا انگلستان جدید صنعتی برطانیہ عظمٰی بنتا رہا ویسے ویسے برطانوی سلطنت بھی وسیع ہوتی رہی۔ اس تبدیلی کی کہانی تو ہم بیان کر چکے ہیں۔ انگلستان ہی وہ پہلا ملک تھا جس میں مشینوں اور انجنوں کا استعمال شروع ہوا اور بڑے پیمانہ پر مشینوں کے ذریعہ چیزیں بنائی جانے لگیں۔ انگریزوں کی آبادی نے اپنے کھیتوں کو چھوڑ دیا اور شہروں میں کثیر تعداد میں جمع ہو گئے۔ اس جزیرے کی آبادی بڑھتی رہی غذا کی پیداوار کم ہوتی گئی اور مصنوعہ چیزیں زیادہ تعداد میں بنائی جانے لگیں۔ اس بیان سے ثابت ہوا کہ تجارت کو برطانوی سلطنت کی تعمیر میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ سلطنت اس لئے بنائی گئی ہے تاکہ مال کے خریدنے

اور فروخت کرنے سے نفع کمایا جائے۔ سنہ ۱۵ء کے بعد سے جس علاقہ کی برطانیہ نے نگرانی شروع کی ہے وہاں اس نے تجارت کو بھی ضرور شروع کیا ہے۔

اتنی بڑی سلطنت برطانیہ کے قبضہ میں کس طرح آئی؟

لیکن اس بات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ برطانیہ جیسے چھوٹے سے ملک نے کس طرح زمین کے اتنے وسیع رقبوں پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بارے میں بہت سی کتابیں انگریز مصنفوں نے لکھی ہیں جس میں انگریزوں کی جرأت ہمت اور خطرات پسندی کی بڑی تعریفیں کی گئی ہیں اور بتلایا گیا ہے کہ کس طرح خشکی اور سمندر میں لڑائیاں لڑکر اور مصیبتیں جھیل کر انگریزوں نے اپنی سلطنت کو پھیلایا۔ یہاں اس کا حال صرف مختصر طور پر بیان کیا جاسکتا ہے اور اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے ہندوستان کی مثال کو سامنے رکھ کر دیکھیں گے کہ برطانیہ کی سلطنت کو کس طرح وسعت حاصل ہوئی۔

ہندوستان پر برطانیہ کا قبضہ کس طرح ہوا

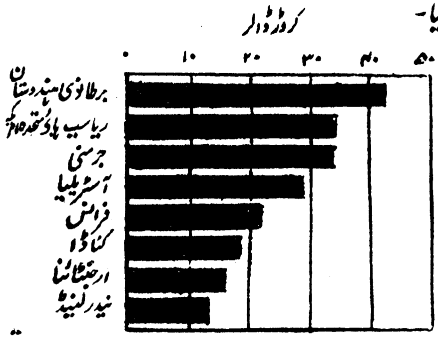
انگریز یہ چاہتے تھے کہ کسی خوب آباد ملک کے ساتھ تجارت کریں۔ تین سو سال گذرے انھوں نے نہایت حقیر پیمانہ پر اپنی تجارت کو شروع کیا۔ جو انگریز تاجر مشرقی ملکوں کو ڈھونڈنے نکلے تھے انھوں نے دیکھا کہ ہندوستان سے اگر گرم مسالہ دھات کی چیزیں اور کپڑے خرید کر برطانیہ میں لے جائے جائیں اور وہاں فروخت کئے جائیں تو اس میں بڑا فائدہ ہوگا۔ اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے بڑی مشکلوں سے ہندوستان تک جانے والے اور وہاں سے قیمتی سامان لاد کر لانے والے جہاز حاصل کئے۔ بہت سے انگریزوں کا عقیدہ تھا کہ اس کام سے بہت نفع حاصل کیا جاسکتا ہے اس لئے انھوں نے کمپنی کے کاروبار میں اپنی پوری دولت لگادی۔

ابتدا میں کمپنی کو بہت سی مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن بعد میں اسے خوب نفع حاصل ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ کمپنی اور برطانوی حکومت نے ہندوستان میں زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے متفرق جگہوں پر حاصل کرنا شروع کئے لیکن پھر دونوں کی حکومت مسلسل طریقہ پر ہندوستانیوں کی زیادہ تعداد پر قائم ہونے لگی۔ ہندوستانی رئیسوں اور حکمرانوں کو شکست دی گئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی

نے اپنی حکومت خود قائم کرلی۔ ایک گورنر جنرل مقرر کیا گیا اس کی ماتحتی میں بہت سے افسر اور برطانوی اور ہندوستانی فوج رکھی گئی اور ان کے ذریعہ سے ملک میں امن قائم کیا گیا۔

تجارت بڑھتی رہی خصوصاً اٹھارویں صدی کے آخری حصہ میں انگریز ہندوستان کے گیہوں اور کپاس، اور دوسری غذاؤں اور کچے مال پر بہت زیادہ دارومدار کرنے لگے اپنا مصنوعہ مال فروخت کرنے کے لئے بھی انگریزوں کو ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں آدمیوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا، اور انگلستان کی مصنوعہ چیزوں کے لئے ہندوستان ایک نفع بخش منڈی بن گیا۔

لیکن ہندوستان کے لوگوں کے رسم ورواج اور مذہب انگریزوں جیسے نہیں تھے بلکہ ان سے مختلف تھے۔ بعض صورتوں میں انگریز حکمرانوں نے کوشش کی کہ ہندوستانی یورپ کے لوگوں جیسا طرز زندگی اختیار کرلیں لیکن ہندوستانیوں نے اس کے خلاف بغاوت کی۔ غرضکہ آخر میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانیوں پر حکومت نہ کرسکی تو برطانوی حکومت نے سرکاری طور پر اسے اپنی سلطنت کا ایک حصہ بنالیا۔



اس نقشہ میں برطانیہ کے بہترین گاہکوں کو اور جتنی مقدار میں وہ چیزیں خریدتے ہیں انہیں دکھایا گیا ہے یہ بات دیکھنے کے لائق ہے کہ ہندوستان دوسرے سب ملکوں سے زیادہ برطانیہ کا مال خریدتا ہے۔

برطانیہ کے تاجر ہندوستان کے ساتھ بہت زبردست تجارت کرتے ہیں۔ اس تجارت کی سالانہ قیمت ۴۰ کروڑ ڈالر سے زیادہ ہوتی ہے۔ برطانیہ اتنا زیادہ مال دنیا کے کسی دوسرے ملک کے ہاتھ فروخت نہیں کرتا۔ نہ امریکہ کے ہاتھ نہ جرمنی کے نہ فرانس کے کناڈا کو جتنا مال برآمد کیا جاتا ہے اس کے مقابلہ میں یہ تین گنا ہے۔ ہندوستان کے لوگ بہت غریب ہیں لیکن چونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے (برطانیہ سے تقریباً ۹ گنا) اس لئے اگرچہ ہر گاؤں انفرادی طور پر بہت کم مال خریدتا ہے لیکن بصورت

مجموعی میزان بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔

ہندوستان کے شہروں میں برطانیہ کی مشینیں، ونگینیں، موٹریں، لاریاں اور بھاپ کے انجن بڑی مقداروں میں فروخت کیے جاتے ہیں۔ پھر شہروں اور بڑے قصبوں میں چند بہت زیادہ امیر لوگ بھی رہتے ہیں۔ یہ لوگ بہت ٹھاٹھ اور عیش کے ساتھ رہتے ہیں انھوں نے یورپ کی زندگی کے معیاروں کو اختیار کر لیا ہے اور برطانیہ کا بنا ہوا بہت سا مال خریدتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ برطانیہ ہندوستان کو اپنی سلطنت میں شامل رکھنا اور اس کی تجارت پر نگرانی رکھنا چاہتا ہے۔

پھر ہندوستان سے برطانیہ غذا اور کچا مال بھی جو اس کی زندگی کے لئے نہایت ضروری ہیں بہت بڑی مقداروں میں خریدتا رہتا ہے۔ ہندوستان سے ہر سال انگلستان کے پارچہ بافی کے کارخانوں کے لئے روئی سے لدے ہوئے بہت سے جہاز روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ گیہوں چائے اور چاول سن، اون اور چمڑا بھی بڑی مقداروں میں روانہ کیا جاتا ہے۔

اوپر کے بیان سے ثابت ہوا کہ انگریز تاجروں کو ہندوستان سے بہت فائدہ پہنچا ہے اور انگلستان کے کارخانے اور ان کے مزدوروں کو ہندوستان کی پیداواروں اور ہندوستان کی منڈیوں پر بہت زیادہ دارومدار کرنا پڑتا ہے برطانوی سلطنت میں جتنے علاقے شامل ہیں ان سب میں تجارت کے نقطۂ نگاہ سے ہندوستان سب سے زیادہ بیش قیمت حصہ ہے۔



ہندوستان کا رقبہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے رقبے کے نصف سے زائد ہے لیکن اس کی آبادی امریکہ سے تین گنا زیادہ ہے۔

کناڈا اور آسٹریلیا برطانوی سلطنت کے تمام علاقوں میں ہندوستان کی آبادی سب سے زیادہ ہے لیکن پھر بھی ہندوستان برطانوی سلطنت کا ایک مختصر

حصہ ہے۔ اس سلطنت کے جو دوسرے اجزا ہیں ان کے رقبہ بہت زیادہ وسیع ہیں۔ کناڈا، آسٹریلیا اور افریقہ کے مقبوضات سے ہندوستان کا مقابلہ کرنے سے یہ چیز سمجھ میں آسکتی ہے۔
سلطنت کے ساتھ ان دوسری نوآبادیوں کا الحاق مختلف طریقوں پر ہوا۔ ہندوستان میں تو انگلستان کو ایک پرانی اور خوب ترقی یافتہ تہذیب کو فتح کرنا پڑا اس کے بعد وہ اس کی سلطنت کا جزو بنا۔ لیکن کناڈا کا بیشتر حصہ اور آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کا پورا حصہ بالکل ویران تھا۔ جب انگریز پہلے پہل ان علاقوں میں گئے تو یورپ والوں کو ان کا علم نہیں تھا اور ان میں نیم مہذب اور قدیم ترین وضع کے دیسی لوگ آباد تھے۔ ان علاقوں کی زمین کو آباد ہونے کے بعد مفید بنایا جا سکا۔

برطانیہ کے ایسے باہمت لوگ جو گھر، دولت اور مہم کے آرزومند تھے وہ ان علاقوں میں ہر جگہ پہنچے۔ اپنے ساتھ اپنی انگریزی زبان، انگریزی لباس انگریزی قوانین، مراسم اور طرز خیال لے گئے اور اپنے ان نئے گھروں میں انھوں نے ویسے ہی زندگی بسر کرنے کی کوشش کی جیسی کہ وہ برطانیہ میں بسر کرتے تھے۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی میں یہ کام انھوں نے شمالی امریکہ میں جاری رکھا اور اپنی تیرہ نوآبادیاں بسائیں جو بعد میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی تشکل میں برطانیہ سے آزاد ہوکر ایک الگ ریاست بن گئیں۔ اسی زمانے میں یہ لوگ کناڈا کے جنوبی اور مشرقی حصوں میں بھی آباد ہوتے رہے۔ یہاں انھوں نے جنگلوں کو صاف کیا، زمین کو جوتا اور اپنے لئے مکانات تعمیر کیے۔ کچھ بڑے قصبے اور شہر بھی بننا شروع ہو گئے چنانچہ آج کناڈا میں ۹۵ لاکھ آدمی آباد نظر آتے ہیں۔

اس کے بہت سال بعد اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں برطانیہ سے دوسرے لوگ دنیا کے کرہ کا نصف چکر کاٹ کر آسٹریلیا اور نیوزلینڈ کے ساحلوں پر پہنچے اور وہاں اپنی نوآبادیاں بسانے لگے۔ اس کے اور بعد انیسویں صدی میں برطانیہ کے بعض لوگ

جنوبی افریقہ کے اندرونی حصہ میں بھی داخل ہونے لگے اور یہ تمام زمینیں آہستہ آہستہ بڑی خوش حال نوآبادیاں بن گئیں۔

برطانیہ کے لوگوں نے ان نوآبادیوں میں اپنے لئے جو گھر بنائے وہ برطانیہ کے گھروں سے بہت زیادہ ملتے جلتے تھے۔ جو لوگ سب سے پہلے ان نوآبادیوں میں جاکر بسے انھوں نے اپنے پرانے رواجوں، زبان، لباس اور طرزِ خیال کو قائم رکھا اور آج بھی مادرِ وطن سے بہت سالوں تک جدا رہنے اور شاید برطانیہ کو کبھی نہ دیکھنے کے باوجود کناڈا، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور دوسری برطانوی نوآبادیوں کے لوگوں کو برطانیہ کے لوگوں اور اپنے آبائی وطن کے ساتھ بہت گہری وابستگی ہے اور جذبہ اور تنظیم کی اس یکجہتی کی بنا پر سلطنت کو "برطانوی نسل رکھنے والی قوموں کا خاندان" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

جب ان نئے براعظموں میں انگریز پہنچے تو انھوں نے بہت نئے اور عجیب عجیب قسم کے زندگی کے طریقوں کا مشاہدہ کیا اور اپنے نئے ماحول سے جس طرح انھوں نے مطابقت پیدا کرنے کی جد وجہد کی اس کو پڑھ کر بہت جوش پیدا ہوتا ہے۔ اکثر جگہ انھیں مخالف دیسیوں جنگلی درندوں اور فطرت کی پیدا کی ہوئی دشواریوں کے ساتھ جنگ کرنا اور ان کو قابو میں لانا پڑا۔ برطانوی سلطنت کے دوسرے خاص خاص حصوں کو جس طرح حاصل کیا گیا اس کا یہاں محض ایک خاکہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ ہر نوآبادی کی کہانی ہندوستان سے مختلف ہے لیکن اس کا عام انداز تقریباً یکساں ہے۔ برطانوی سلطنت کے تمام حصوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنا تو ممکن نہیں ہے اس لئے یہاں صرف بحرِ روم اور افریقہ کے مقبوضات کے بارے میں کچھ باتیں بیان کی جائیں گی۔

بحرِ روم اور افریقہ میں برطانوی مقبوضات

دو سو سال سے برابر برطانیہ بحرِ روم کے اندر اور اس کے آس پاس زمین حاصل کرتی رہی ہے۔ ایک ایک کرکے اس نے مندرجہ ذیل کو اپنی سلطنت میں شامل کیا ہے:۔

۱۷۱۳ء — بحرِ روم کے مغربی دروازہ پر جبرالٹر کا قلعہ

۱۸۱۴ء	مالٹا کا جزیرہ
۱۸۳۹ء	عدن جو بحر احمر سے نکلتے وقت شمالی ساحل پر واقع ہے۔
۱۸۷۵ء	نہر سویز کی نگرانی کا خاص حق
۱۸۷۸ء	سائپرس کا جزیرہ
۱۸۸۲ء	مصر پر قبضہ (لیکن اب مصر آزاد ہو گیا ہے البتہ اینگلو مصری سوڈان پر برطانیہ کا قبضہ ہے)
۱۸۸۴ء	بحر احمر میں عدن کے بالمقابل برٹش شمالی لینیڈ

ان زمینوں کو حاصل کرنے کے لئے برطانیہ کو بہت جد و جہد کرنا پڑی۔ یہ مقامات رقبہ کے لحاظ سے تو غیر اہم ہیں لیکن ان پر قبضہ کرنا برطانیہ کے لئے بہت ضروری تھا۔ اول تو اس لئے تاکہ بحر روم کے زرخیز علاقہ کی تجارت پر قبضہ کرنے میں مدد ملے اور دوسرے اس لئے تاکہ ہندوستان کو اس کے جو جہاز جاتے ہیں ان کا تحفظ کیا جا سکے۔ غالباً دوسری وجہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

بحر روم کے آس پاس جو زمینیں واقع ہیں انھیں ہزاروں سال سے برابر تجارتی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ان علاقوں میں قدیم زمانہ میں مصر، فنشیا، کریٹ، یونان اور روم کے جہاز قیمتی مال لایا لے جایا کرتے تھے۔ پھر ایک ہزار سال بعد وینس، جنوآ اور برگس کے جہاز اسکندریہ میں اپنا مال ایشیا کے تاجروں سے تبادلہ کرنے کے لئے لایا کرتے تھے۔ بحر روم کے ساحلوں پر ہی مصریوں، یونانیوں، رومیوں اور مسلم ترکوں کی وسیع سلطنتوں نے ترقی پائی۔

پھر جب صلیبی جنگیں ہو چکیں اور یورپ والوں نے مشرقی ایشیا کے ملکوں سے واقفیت حاصل کر لی تو مشرق و مغرب کی تجارت کے لئے بحر روم کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ گئی بحر روم کے پورے علاقہ میں تجارت کی بہت زیادہ گرم بازاری پائی جاتی ہے۔ اس کے اردگرد تقریباً ۱۰ کروڑ لوگ آباد ہیں اور ان کا گذر اس طرح چلتا ہے کہ یہ باہر کی دنیا سے تجارت کرنے کے لئے جہازوں پر مال لادے لے جاتے رہتے ہیں۔ اس کے ساحل پر فرانس، اسپین، اٹلی (ان تینوں کی افریقہ میں نو آبادیاں

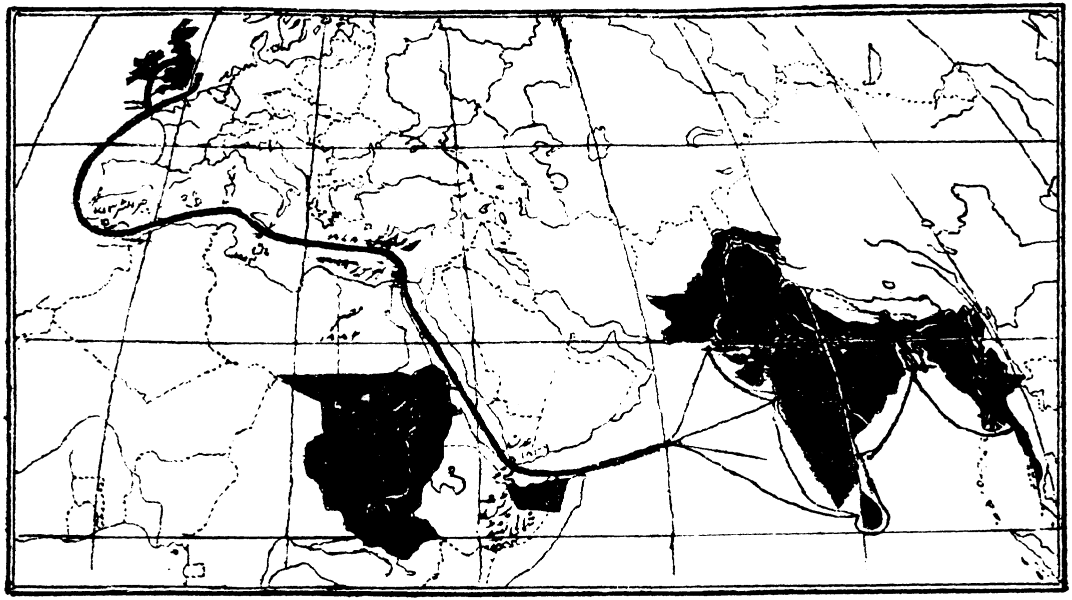
ہیں) یونان، یوگوسلاویا، ترکی، شام، فلسطین اور مصر آباد ہیں۔ ان ملکوں سے دور یورپ کی اور دوسری ایسی قومیں ہیں جن کی تجارت کا دارو مدار بھی بحر روم پر ہی ہے۔ مثلاً روس کی مثال کو لیجئے کہ وہ باہر کی دنیا کو بحر روم کے راستے سے مال روانہ کرنے کے لئے بہت زیادہ مجبور ہے۔ شمالی یورپ کے تمام دوسرے ملک بھی بحر روم کی تجارت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

اس لئے بحر روم میں زمین حاصل کرنے کا ایک سبب تو یہ تھا کہ برطانیہ بحر روم میں جو قومیں آباد ہیں ان کے ساتھ تجارت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی دوسری زیادہ اہم وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوستان کے سمندری راستہ کا تحفظ کرنا چاہتا تھا۔

نقشہ میں بحر روم کی شکل ایک بڑی جھیل جیسی معلوم ہوتی ہے جس کی لمبائی دو ہزار میل ہے اور چوڑائی تین سو سے پانسو میل تک۔ اس کے چاروں طرف زمین ہے۔ اگر دو چھوٹے راستوں کے ذریعہ اس کا تعلق باہر کے سمندروں سے نہ ہوتا تو یہ پورے طور پر جھیل بن جاتی۔ ایک راستہ تو مغرب میں ہے جس سے بحر روم کا پانی بحر اٹلانٹک سے مل جاتا ہے۔ اس جگہ پر اسپین کے جنوبی سرے پر ایک بڑی چٹان واقع ہے جس کا نام جبرالٹر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس تنگ راستے کی محافظت کے لئے فطرت نے اس چوکیدار کو مقرر کر دیا ہے۔ غالباً دنیا میں جبرالٹر سے زیادہ مضبوط کوئی دوسرا قلعہ نہیں ہے۔ اس کی توپیں تمام جہازوں کو بحر روم کے اندر آنے اور باہر جانے سے روک سکتی ہیں۔

برطانیہ نے جبرالٹر کو ۱۷۱۳ء میں حاصل کیا اس پر قلعہ تعمیر کیا اور آج تک یہ برطانیہ کے قبضہ میں ہے۔ اس قلعہ اور برطانیہ کے بحری بیڑے کی وجہ سے برطانیہ کو جبرالٹر کی آبنائے کے راستے پر پورا اقتدار حاصل ہو گیا اور اس ذریعہ سے بحر روم کے علاقہ میں اس کی تمام تجارت محفوظ ہو گئی اور آج ہندوستان جانے کا جو سیدھا راستہ ہے اس کا تحفظ بھی اسی مقام سے کیا جاتا ہے۔

بحر روم کے سب سے زیادہ جنوبی کنارے پر جہازوں کا ایک دوسرا دروازہ ہے یعنی نہر سویز



انگلستان اور ہندوستان کے تجارتی راستے میں برطانوی مقبوضات

اس کے ذریعہ بحر احمر میں داخل ہوتے ہیں اور پھر وہاں سے بحر ہند میں۔ جب تک نہر سویز نہیں بنی تھی یورپ کے جہازوں کو جنوبی افریقہ کا پورا چکر لگا کر بحر ہند میں پہنچنا پڑتا تھا۔ یہ راستہ بہت لانبا اور خطرناک تھا لیکن بہت سالوں تک اسی راستہ کو برطانیہ کے جہازوں کے لئے بہترین راستہ سمجھا جاتا تھا۔

لیکن برطانیہ کے تاجروں کو امید تھی کہ کسی زیادہ آسان راستہ کا پتہ لگ جائے گا۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء میں ایک فرانسیسی کمپنی نے سویز کی خاکنائے میں ایک نہر بنا کر تیار کر دی۔ یہ خیال تو نیا نہ تھا۔ تاجر مدت سے اس کا خواب دیکھ رہے تھے لیکن ۱۸۶۹ء تک کوئی قوم اس خواب کو سچ کر کے نہ دکھلا سکی تھی۔

اس نئی نہر نے زمین کے اس تنگ ٹکڑے کو جو ایشیا اور افریقہ کو ملاتا تھا کاٹ کر دو جدا براعظموں میں تقسیم کر دیا۔ اس راستہ کے نکلنے کی وجہ سے مشرق بعید کے راستے میں ۵ ہزار میل کی مسافت کی کفایت ہوئی۔ اس لئے برطانیہ کے لئے نہر سویز پر قبضہ حاصل کرنا نہایت زیادہ اہم ہو گیا۔ ۱۸۷۵ء میں برطانیہ کی حکومت نے اس کمپنی سے اس کے حصے خرید لیے جس نے اس نہر کو بنایا تھا اور اس طرح برطانیہ کا بحر روم کے دونوں دروازوں پر قبضہ ہو گیا مغرب میں جبرالٹر کا قلعہ اور مشرق میں نہر سویز۔

یورپ کی دوسری تجارتی کمپنیوں نے برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ دوسری قوموں کے جہازوں کے لئے بھی نہر سویز کو کھلا رکھا جائے۔ اس لئے ۱۸۸۸ء میں کئی ملکوں نے اس معاہدہ پر دستخط کیے کہ نہر کو "جنگ اور امن دونوں زمانوں میں ہر قسم کے جہازوں کی آمدورفت کے لئے چاہے وہ تجارتی ہوں یا جنگی بلا قومی جھنڈوں کے امتیاز کے کھلا ہوا اور آزاد رکھا جائے گا" لیکن برطانیہ کو چونکہ نہر سویز کا قبضہ مل گیا تھا اس لئے اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ کوئی دوسرا ملک ہندوستان کو اس آسان راستے کو اس کے لئے بند نہ کر سکے گا۔

۱۸۸۲ء میں برطانیہ نے سوچا کہ اگر نہر سویز پر اسے قبضہ رکھنا ہے تو اسے مصر پر بھی قبضہ

کرنا چاہیئے اس لیے کہ نہر اس زمین میں کھودی گئی تھی جس کی مالک مصر کی حکومت تھی۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی خطرہ تھا کہ ممکن ہے کوئی دوسری طاقتور قوم مصر پر قبضہ کرے اور ہندوستان کے اس مختصر راستے میں رکاوٹ ڈال دے۔ چنانچہ ۱۸۸۲ء میں برطانوی فوج نے مصر پر حملہ کر دیا۔ مصریوں نے حملہ کا مقابلہ کیا لیکن وہ کمزور تھے اور برطانیہ مضبوط تھی اس لیے آخر میں مصر والوں نے اطاعت قبول کر لی۔

مصر کے بارے میں مفصل معلومات فراہم کرنے کا تو یہاں موقع نہیں ہے لیکن مصر کی تاریخ کی ایک ذراسی جھلک دکھانا ضروری ہے۔ جب ہندوستان میں تہذیب کی ابتدا ہو رہی تھی اور یورپ میں آوارہ گرد وحشی قبائل گھومتے پھرتے تھے اس زمانہ میں مصر میں ایک نہایت طاقتور تہذیب نیل کی وادی میں موجود تھی۔ لیکن بہت صدیوں سے دنیا میں مصر کی اہمیت زائل ہو چکی تھی۔ یہ ایسے کسانوں کی سرزمین بن گئی تھی جو دریائے نیل کے کنارے بکھرے ہوئے تھے۔ آج اس ملک میں لاکھوں آدمی آباد ہیں لیکن ان میں سے زیادہ تر لوگ گیہوں اور کپاس پیدا کرتے ہیں۔

گو مصر کوئی دولت مند ملک نہیں تھا لیکن برطانیہ نے اس پر قبضہ کرنے کے فوائد کو سمجھ لیا تھا۔ نہر سویز رکھنے کے علاوہ مصر گیہوں اور کپاس کی بڑی مقدار دں کو بھی پیدا کرتا تھا جن کی برطانیہ کے لوگوں کو بڑی ضرورت تھی۔ پھر تیسری بات یہ تھی کہ مصر کے لوگ برطانوی مال کے خاصے اچھے گاہک تھے۔ آخر میں برطانیہ کے کاروباری لوگوں نے یہ سوچا کہ مصر میں روپیہ لگانے کا اچھا موقع ہے۔ ان چار وجوہ کی بنا پر بہت سے برطانیہ کے لوگ مصر کو برطانیہ کی سلطنت میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ برطانوی قبضہ کے زمانے میں (۱۸۸۲ء تا ۱۹۲۲ء) مصر برطانیہ کے تجارتی مفاد کے لیے بہت نفع بخش ثابت ہوا۔ ریلوں، بنکوں اور فیکٹریوں کے سلسلہ میں برطانیہ کا ۴۰ کروڑ ڈالر سے زیادہ روپیہ مصر میں لگا ہوا ہے۔

۱۹۲۲ء میں برطانیہ نے مصر کی آزادی کو تسلیم کر لیا۔ مگر یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے

کہ وہ برطانیہ کے ہندوستان یا سوڈان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ آج انگلستان کا قبضہ مصر پر نہیں ہے لیکن جس زمانہ میں چالیس سال تک برطانیہ کا قبضہ رہا اس نے اپنی تجارت کو خوب ترقی دے لی۔ چنانچہ آج بھی مصر برطانیہ سے تمام دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں دوگنی اشیا خریدتا اور تین گنی اشیا فروخت کرتا ہے۔

وسطی اور جنوبی افریقہ میں برطانیہ کے وسیع مقبوضات

برطانیہ کے جن مقبوضات کا ابھی تک ہم نے ذکر کیا ان کا رقبہ اور آبادی بہت زیادہ ہے۔ لیکن ابھی برطانیہ کے تمام مقبوضات کا بیان ختم نہیں ہوا ایک اور وسیع علاقہ ایسا ہے جو برطانوی سلطنت میں اٹھارویں صدی کے آخر میں شامل ہوا یعنی وسطی اور جنوبی افریقہ۔



افریقہ میں برطانوی سلطنت

یورپ کے ملکوں میں تنہا برطانیہ ہی ایسا ملک نہیں ہے جس کے قبضہ میں افریقہ کی زمین ہے۔ فرانس کے قبضہ میں اس براعظم کا ایک تہائی حصہ ہے۔ اٹلی اور پرتگال کی نوآبادیاں بھی یہاں موجود ہیں۔ جنگ عظیم سے پہلے جرمنی کی بڑی بڑی نوآبادیاں بھی یہاں موجود تھیں۔ تقریباً تمام ملک کو یورپ کے ملکوں نے آپس میں تقسیم کرلیا ہے۔

رسالہ جامعہ کی آئندہ اشاعتوں میں ہم تبلائیں گے کہ کس طرح اس براعظم کی زمین کو باہم تقسیم کیا گیا اور کن کن قوموں نے یہ کام انجام دیا۔

افریقہ کی سرزمین میں حیرت انگیز قدرتی وسائل دولت

افریقہ کو ایک عرصہ تک "تاریک براعظم" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا یہ نام اس لحاظ سے صحیح تھا کہ اٹھارویں صدی تک اس براعظم کے اندرونی حالات سے لوگ ناواقف تھے۔ گھنے جنگل، وحشی درندے، ریگستان، اور سیاہ وحشی انسان ــ ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے سفید نسل کے لوگ افریقہ کے اندر جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ یہ ایک لامعلوم ملک تھا جس میں یورپ کے بہت سے لوگ جب کبھی گئے انھیں بیماری اور موت کا شکار بننا پڑا۔

لیکن اٹھارویں صدی کے آخر میں چند سفید نسل کے لوگ افریقہ کے خطرات کو برداشت کرنے میں آخر کامیاب ثابت ہوئے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ بہت سی قیمتی چیزیں لے کر واپس آئے۔ ہاتھی دانت، قیمتی لکڑیاں، جواہرات اور ربڑ۔ انھوں نے تانبے، ٹین سونے اور چاندی کی بڑی معدنوں کا بھی پتہ دیا۔

سنہ ۱۸۸۰ء کے بعد سے سفید نسل کے بہت زیادہ آدمیوں نے افریقہ کے خطرات کو برداشت کرنا شروع کر دیا اور ان میں سے بہت سے دولت مند ہوگئے۔ انگریز، بلجیم کے رہنے والے، فرانسیسی اور جرمن سب افریقہ کے اندر گئے اور وہاں جاکر یا تو انھوں نے فارموں اور معدنوں کے قائم کرنے میں اپنے سرمایہ کو لگایا یا پھر ربڑ کے باغات کو تنظیم دی۔ سنہ ۱۹۰۰ء سے پہلے یورپ کے لوگ افریقہ کی گرم آب وہوا میں کافی، کپاس، تاڑ کے درخت، گنے کی شکر، کیلے

اور تمباکو بویا کرتے تھے اور دوسرے براعظموں کو فروخت کرنے کے لئے جہازوں پر لاد کر روانہ کرتے رہتے تھے۔

سفید نسل کے آدمیوں میں برطانیہ کے لوگوں نے سب سے پہلے افریقہ کے اندرونی حالات کا پتہ لگایا اور اس ملک کے ساتھ تجارت کو ترقی دی۔ ہمت والے انگریزوں نے اپنی زندگی کا مطمح نظر سلطنت کو تعمیر کرنا قرار دے لیا تھا اور افریقہ کے تاریک ملک میں ان کے لئے بے انتہا جاذبیت تھی۔ وہ مصر میں اور اینگلو مصری سوڈان میں داخل ہو گئے تھے۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مصر آزاد ہو گیا ہے۔ لیکن اینگلو مصری سوڈان ابھی تک برطانوی سلطنت کا ایک حصہ ہے۔ اس میں چراگاہیں اور کاشت کی زمینیں بہت اچھی پائی جاتی ہیں۔ دیسیوں کی سیاہ فام آبادی اونٹوں گایوں بھیڑوں اور بکریوں کو پالتی ہے۔ ۵ لاکھ سے زاید کسان اور گلہ بان دس لاکھ مربع میل میں بکھرے ہوئے ہیں اور چھوٹے چھوٹے گاؤں میں رہتے ہیں۔ آب پاشی کے ذریعہ سے اینگلو مصری سوڈان برطانیہ کے لئے روز بروز زیادہ کپاس پیدا کرنے لگا ہے۔ مصر کے ساتھ اس علاقہ پر قبضہ کرنا برطانیہ کے لئے بہت مفید تھا کیونکہ اس سے برطانیہ کے لئے ہندوستان کا راستہ محفوظ ہو جاتا تھا اور برطانیہ کو غذا کی اشیا بھی فراہم کی جا سکتی تھیں۔ ۱۸۸۰ء کے بعد کے پچاس سالوں میں برطانیہ نے براعظم افریقہ کے تقریباً ایک تہائی حصہ پر قبضہ کر لیا ہے۔

آج افریقہ میں برطانیہ کے رقبہ کی میزان ۴۰ لاکھ مربع میل ہوتی ہے۔ یہ رقبہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے رقبہ سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ اس کی وجہ سے برطانوی حکومت کو ایک مسلسل علاقہ تقریباً چار ہزار میل لانبا مصر کی جنوبی سرحد سے کیپ آف گڈ ہوپ تک مل جاتا ہے۔

نقشہ میں کیپ ٹاؤن کو ڈھونڈیے۔ جنوبی افریقہ کے اس جنوبی سرے پر برطانیہ کے تاجروں نے ۱۸۱۵ء میں ایک نو آبادی بسائی تھی یہاں ہالینڈ کے لوگوں کی ایک نو آبادی

سنہ ۱۶۵۲ء سے تھی۔ سنہ ۱۸۲۰ء تک انگریز مہاجرین کی ایک بڑی تعداد یہاں پہنچ گئی تھی اور کیپ ٹاؤن کے مشرق میں آباد ہوگئی تھی۔

سنہ ۱۸۳۶ء میں ہالینڈ کے لوگ شمال کی طرف آرینج اور وال دریاؤں کے قریب منتقل ہوگئے۔ ہالینڈ کے یہ لوگ جنھیں "بوئر" کہا جاتا ہے کسان تھے۔ جب برطانیہ کے لوگ براعظم کے جنوبی سرے پر بسنے لگے تو بوئر لوگ اور زیادہ شمال کی طرف بہتر زمینوں کی تلاش میں منتقل ہوگئے۔ غرضکہ اس طرح سنہ ۱۸۵۰ء میں اس علاقہ میں ہزاروں بوئر کسان آباد ہوگئے اور انھوں نے اپنی دو آزاد ریاستیں قائم کرلیں۔ ایک آرینج فری اسٹیٹ اور دوسری جمہوریت ٹرانسوال۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں برطانیہ کے تاجر جمہوریت ٹرانسوال کے شمال کی طرف منتقل ہو گئے۔
ان میں سے ایک سیسل روڈس بھی تھا جو نوآبادی بسانے اور نئے ملکوں کا حال دریافت کرنے میں بہت جری اور دلیر تھا۔ سنہ ۱۸۸۹ء میں روڈس نے ایک بڑی تجارتی کمپنی برٹش جنوبی افریقہ کمپنی کے نام سے بنائی۔ بہت سے انگریزوں نے اس کمپنی کے کاروبار میں اپنا روپیہ لگایا جس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں ملک تھا اور وہ اس پر حکومت کرتی تھی اسی طرح روڈس کی کمپنی نے بھی "روڈیشیا" کے علاقہ کو جس کا نام روڈس کے نام پر رکھا گیا تھا فتح کیا اور اس پر حکومت شروع کردی۔ اب اس ملک میں ایک بڑا رقبہ شامل ہے جس کی وسعت تقریباً چار لاکھ چالیس ہزار مربع میل ہے اور اس میں تقریباً بیس لاکھ دیسی لوگ اور ۴۴ ہزار سفید نسل کے آدمی آباد ہیں۔

جب برطانیہ کے لوگ پہلے پہل اس علاقہ میں گئے تو انھوں نے دیسی حکمراں لوبنگولا کو راضی کرلیا کہ وہ اس دستاویز پر دستخط کردے جس کے ذریعہ اس ملک میں کانیں کھودنے کا پورا حق کمپنی کو مل جائے۔ اس کے بعد انگریزوں نے اپنی کانیں کھودیں اور نوآبادیاں اور قلعے تعمیر کیے۔

جب لوبنگولا کو معلوم ہوا کہ اس نے اپنی رعایا کے حقوق غیروں کو حوالے کردیے ہیں تو اس نے انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ کو خط لکھا کہ اس کی رعایا کی زمین واپس دلانے میں ملکہ اس کی مدد کریں اس کے جواب میں ایک خط آیا کہ روڈیشیا کے انگریزوں پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ

سردار کے علاقہ میں صرف سونے کی کانیں کھودیں گے اور رعایا کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچا
ئیں گے نہ ان کے گاؤں اور مزروعہ کھیتوں اور مویشیوں کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعرض کریں گے۔"
لیکن ملکہ کے اس خط کے باوجود حالات کی نوعیت خراب ہوتی گئی۔ برطانیہ کے کان
کے مالکوں نے دیسی آبادی کو اپنی کانوں میں کام کرنے کے لئے مجبور کیا۔ دیسیوں نے بغاوت
کی اور معاہدہ کے دو سال بعد انگریزوں کی فوج روڈیشیا پر حملہ کرنے اور اسے فتح کرنے کے
لئے روانہ کی گئی۔

اس جنگ میں بہت سے دیسی لوگ مارے گئے اور لوبنگولا کو مجبوراً اطاعت کرنا پڑی۔ اس
کی رعایا نے مایوس ہو کر کہا "ہمارا ملک ہم سے چھن گیا ہماری مویشی چھن گئی ہماری آبادی منتشر ہو گئی۔
ہمارے پاس زندہ رہنے کے لئے کچھ باقی نہیں بچا......... ہم سفید آدمیوں کے غلام ہو گئے۔
ہماری حیثیت کچھ بھی باقی نہیں رہی اور ہمیں کسی قسم کے کوئی حقوق حاصل نہیں رہے۔"
سونے کی کانوں کا کھودنا جاری رہا۔ پچیس سال میں یعنی ۱۸۹۰ء سے ۱۹۱۵ء تک
روڈیشیا سے ۸۰ لاکھ آؤنس سونا نکالا گیا۔ اس ملک سے برطانوی تاجروں کو بہت فائدہ
حاصل ہوا۔

اسی زمانے میں ہالینڈ کے لوگوں کے علاقہ میں سونے اور ہیرے کی کانیں دریافت
ہوئیں نقشہ میں کمبرلے کو ڈھونڈیے۔ بہت سالوں تک برطانیہ کے نوآبادی بسانے والے
اور بوئر لوگ ساتھ ساتھ رہ رہے تھے لیکن ان کے تعلقات دوستانہ اور خوشگوار نہیں تھے
جوں جوں زمانہ گذرتا گیا برطانیہ کے لوگوں اور بوئروں کی لڑائی بھی بڑھتی رہی یہاں تک کہ ۱۸۹۹ء
میں کھلی جنگ شروع ہو گئی۔ برطانوی فوج بھیجی گئی اور تین سال کی طویل مدت گذرنے کے بعد بوئروں
کو فتح کیا جا سکا۔ برطانوی حکومت نے تو اپنے تاجروں اور نوآبادی بسانے والوں کی حمایت
کی لیکن برطانیہ کی رعایا نے بوئروں کی جنگ کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔
لیکن جب جنگ ختم ہو گئی تو برطانیہ کے رہنماؤں اور بوئروں کے رہنماؤں نے مل کر ایک

نئی حکومت بنائی اور سنہ ۱۹۱۰ء میں جنوبی افریقہ کا اتحاد قائم ہوا۔ اس میں برطانیہ اور ہالینڈ دونوں کی نو آبادیاں شامل کی گئیں یعنی کیپ آف گڈ ہوپ، نٹال، دریائے آرنج کی نو آبادی اور ٹرانسوال ایک بوئر جنرل اس نئی ریاست کا پہلا وزیر اعظم بنایا گیا اور تمام بڑے افسر بوئر بنائے گئے اس وقت سے اس ملک کی آبادی اپنی مجلس قانون ساز تو خود منتخب کر لی ہے لیکن برطانیہ اس کی حکومت پر ایک عام نگرانی کرتی رہتی ہے۔

جب جنوبی افریقہ میں یہ واقعات ہو رہے تھے برطانیہ وسطی افریقہ اور سوڈان کے جنوب میں اور علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر رہی تھی سنہ ۱۸۸۸ء میں کینیا کی نو آبادی کو برطانیہ کے علاقہ میں شامل کر لیا گیا۔ سنہ ۱۸۹۴ء میں اگونڈا کی نو آبادی کو۔ اس طرح برطانیہ کو شمال میں مصر سے لے کر جنوب میں راس امید تک ایک علاقہ کو چھوڑ کر مسلسل رقبہ مل گیا۔ یہ چھوٹا ہوا علاقہ خاصا بڑا تھا اور ٹانگا نائکا کے علاقے کے نام سے موسوم تھا (پہلے اس علاقہ کا نام جرمن مشرقی افریقہ تھا) اس کو جرمنی کے مہاجرین نے آباد کیا تھا اور یہ جرمنی کی سلطنت میں شامل تھا لیکن جب جنگ عظیم میں جرمنی کو شکست ہوئی تو یہ علاقہ بھی برطانوی سلطنت میں شامل ہو گیا۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں سلطنت کی تعمیر کے جس کام کو سو سال تک جاری رکھا گیا تھا وہ آخر ختم ہوا اور برطانیہ کو مصر سے راس امید تک مسلسل رقبہ مل گیا۔ اس کے علاقہ کے بہت سے حصوں میں برطانیہ کے انجینیروں نے سونے، لوہے، تانبے، ٹین اور دوسری دھاتوں اور ہیروں کو کانوں سے نکالنا شروع کر دیا۔ اونچی زمینوں پر برطانیہ کے گلہ بانوں نے بھیڑوں کو پالنا شروع کر دیا۔ نیچی زمینوں پر برطانیہ کے کسانوں نے گیہوں اور دوسری کھانے کی پیداواروں کو انگلستان کے لاکھوں بھوکوں کا پیٹ بھرنے کے لئے پیدا کرنا شروع کر دیا۔ شمال میں یعنی مصر اور سوڈان میں برطانیہ نے دریائے نیل پر آبپاشی کے لئے بند بنانا شروع کیا اور لاکھوں ایکڑ زرخیز زمین پر کپاس کی کاشت شروع کر دی۔ کینیا اور اینگلو مصری سوڈان میں ہاتھی دانت کے لئے ہاتھیوں کا شکار کیا گیا۔ نئے نئے گاؤں بلکہ بڑے بڑے قصبے افریقہ کے بہت سے مقامات میں پیدا

ہو گئے۔

اس وسیع علاقہ کی پیداواروں کو ساحل تک لانے کے لیے اور ان کو جہازوں پر لادکر انگلستان اور دوسرے ملکوں کو روانہ کرنے کے لئے نوآبادیاں بسانے والے انگریزوں نے ریل کی ضرورت کو محسوس کیا۔ چنانچہ انھوں نے ایک بڑی اسکیم بنائی یعنی یہ کہ افریقہ کے شمالی اور جنوبی حصہ کو قاہرہ سے لے کر راس اسپد تک ریل کے ذریعہ سے ملادیں۔ انھوں نے صرف اسکیم ہی نہیں بنائی بلکہ ریل کی تعمیر کے کام کو شروع بھی کر دیا اور یہ کام اس قدر تیزی سے کیا جا رہا ہے کہ ہزاروں میل لانبا ریل کا راستہ بن کر تیار ہو گیا ہے اور اس کا استعمال بھی شروع کر دیا گیا ہے۔

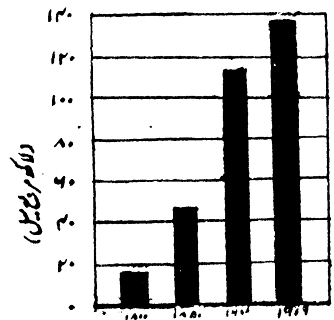
ریل کے بنانے کا یہ کام بڑی زبردست ہمت اور ارادہ کا کام ہے۔ بعض جگہوں پر ریل کو ریگستان صحرا کی ناقابل اعتماد زمین کے مشرقی حصہ سے ہو کر گذرنا پڑا۔ بعض جگہوں میں مرکزی افریقہ کے نہایت گھنے جنگلوں میں جہاں خونخوار درندے اور وحشی سیاہ نسل کے لوگ آباد ہیں ریلیں بنانا پڑیں۔

غرضکہ یہ مختصر خاکہ ہے کہ کس طرح برطانیہ نے افریقہ کے ایک تہائی حصہ کو اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ اس وسیع علاقہ میں بہت مختلف قسم کی زمینیں مختلف قسم کی آب و ہوائیں اور مختلف قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اگر ان سب کے حالات کو لکھا جائے تو اس کام کے لئے کئی کتابیں بھی ناکافی ہوں گی۔

خلاصہ ہم نے مختصر طور پر برطانیہ کی سلطنت کے خاص علاقوں یعنی ہندوستان، بحر روم کی زبینوں اور افریقہ کے مقبوضات کا مطالعہ کیا۔ اگر ہمارے پاس گنجائش ہوتی تو ہم اور بھی دوسرے چھوٹے چھوٹے مقبوضات کا مطالعہ کرتے مثلاً ریاست ہائے ملایا کا وفاق، بورنیو کے حصے اور سمندروں میں بکھرے ہوئے اور بہت سے جزیروں کا۔ چین میں بھی برطانیہ کے قبضہ میں بہت سی بندرگاہیں اور زمین کے حصے ہیں۔ جزائر غربی ہند میں بھی اس کے مقبوضات

ہیں۔ جزائر باہما اور برمدا بھی اس کے قبضہ میں ہیں۔ وسطی امریکہ اور جنوبی امریکہ میں بھی کچھ زمین اس کی نگرانی میں ہے۔

برطانوی سلطنت کے نقشہ کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جزائر تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ برطانیہ نے ان پر اس لئے قبضہ کر رکھا ہے کہ ان پر برطانیہ کے لڑائی اور تجارت کے جہاز مرمت کوئلہ کھانے اور دوسری رسد حاصل کرنے کے لئے ٹھیر سکتے ہیں۔



برطانوی سلطنت کی سنہ ۱۸۰۰ء اور سنہ ۱۹۱۹ء کے درمیان ترقی

برطانیہ کی سلطنت کو جس طرح تیزی کے ساتھ ترقی ہوئی ہے اس کا اظہار حاشیہ کے نقشے سے کیا گیا ہے۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں برطانیہ کے پاس صرف پندرہ لاکھ مربع میل علاقہ تھا لیکن جنگ عظیم کے اختتام کے وقت برطانیہ کے پاس ایک کروڑ تیس لاکھ مربع میل سے زیادہ رقبہ تھا۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں برطانیہ کی سلطنت میں دنیا کا صرف دو فی صدی حصہ تھا لیکن سنہ ۱۹۱۹ء میں یہ رقبہ بڑھ کر ۲۵ فی صدی ہوگیا تھا۔ دنیا کے علاقہ کا ایک چوتھائی اور دنیا کی آبادی کا بھی تقریباً ایک چوتھائی حصہ برطانیہ کے قبضہ اور نگرانی میں ہے۔

اس کے بعد برطانیہ کی تجارت اور برطانیہ کی سلطنت میں جو قریبی تعلق ہے اسے آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر برطانیہ کی تجارت کی ترقی کے اعداد کا برطانیہ کی سلطنت کی ترقی کے اعداد سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ برطانیہ کی تجارت اور سلطنت میں ساتھ ساتھ ترقی ہوئی ہے۔ جن سالوں میں برطانیہ نئی نئی نوآبادیوں کو حاصل کر رہی تھی اور تمام دنیا میں اپنی سلطنت کو وسیع کر رہی تھی انہی سالوں میں خارجی دنیا کے ساتھ اس کی تجارت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

اس کے بعد اس بات کا سمجھنا بھی سہل ہو جاتا ہے کہ برطانیہ نے اتنی بڑی سلطنت کو

کیوں تعمیر کیا۔ جب صنعتی انقلاب پھیلنا شروع ہوا اور مشینیں ایجاد کی گئیں روز بروز زیادہ تعداد میں فیکٹریاں کھڑی کی گئیں اور لوگوں نے روز بروز زیادہ کثیر تعداد میں مشینوں کی صنعت میں کام کرنا شروع کر دیا۔ فیکٹریوں اور کانوں، ریل کی لائنوں اور گوداموں کے مالک روز بروز زیادہ روپیہ پیدا کرنے لگے۔ اس روپیہ کا کیا کیا جائے۔ اس مسئلہ نے بھی اہمیت اختیار کرنا شروع کر دی۔ اس کا کچھ حصہ تو انگلستان میں نئی فیکٹریاں بنانے نئی مشین لگانے، نئے مزدوروں کو ملازم رکھنے، نئی ریلوں اور نئے بجلی کے پاور اسٹیشنوں کے بنانے پر صرف کیا گیا۔ اس کا بہت کچھ حصہ تعیشات پر بھی صرف کیا گیا۔

مگر پھر بھی بہت فاضل روپیہ بچ گیا۔ پھر اس کے علاوہ برطانیہ کے لوگوں کے پاس فیکٹریوں میں جتنا مال بنایا جاتا تھا اس سب کے خریدنے کے لئے روپیہ موجود نہیں تھا اس لئے فیکٹری کے مالکوں کو برطانیہ سے باہر اپنے مال کے بیچنے اور اپنے روپیہ کو کاروبار میں لگانے کے لئے نئی جگہوں کو ڈھونڈنا پڑا۔ وہ ہندوستان، کناڈا، مصر اور افریقہ کے دوسرے حصوں میں، چین میں اور دور دراز آسٹریلیا میں گئے انھوں نے اپنے مال کے لئے تمام دنیا میں منڈیاں تلاش کیں۔

ان انگریزوں نے جن کے پاس فاضل روپیہ تھا فیصلہ کیا کہ دنیا کے بعید ترین حصوں میں فیکٹریاں بنائی جائیں کانیں کھودی جائیں اور تیل کے چشمے نکالے جائیں۔ انھوں نے سونے، ہیرے، تانبے اور ٹین کو کانوں سے نکالا۔ بھیڑوں کپاس اور گیہوں کو پیدا کیا۔ کناڈا، آسٹریلیا اور ملایا کے علاقہ میں غرضکہ دنیا کے ہر حصہ میں انھوں نے اسی طرح کے کام کیے۔ چنانچہ اسی بنا پر جنگ عظیم سے پہلے سلطنت برطانیہ تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تھی اور نو آبادیوں اور برطانیہ کے درمیان تجارت کو بڑا فروغ حاصل تھا۔

فرقہ وارانہ مسئلہ اور اس کے حل کرنے کے مختلف تاریخی طریقے

(از ڈاکٹر ایڈی اسیر وادم، ریڈر سیاسیات و انتظامات عامہ مدراس یونیورسٹی)

(بہ سلسلہ سابق)

اشتراکی روس | روس کو اس مفہوم کے ساتھ تو قوم نہیں کہا جا سکتا جس مفہوم کے ساتھ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو ایک قوم کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس کا اتحاد ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے۔ جنگ عظیم سے پہلے روس میں کم سے کم دس علاقے ایسے تھے جو ایک دوسرے سے واضح طور پر نمایاں تھے اور جن میں کوئی قریبی تعلق نہیں پایا جاتا تھا اور ان میں مختلف نسلوں، مختلف زبانوں اور مختلف مذہبوں کے لوگ آباد تھے۔ آج ان کی جگہ ایک متحدہ حکومت (یونین) ہے اور سات ایسی جمہوریتیں ہیں جنھیں ایک حد تک خود مختاری ملی ہوئی ہے لیکن یہ سب کی سب ایک ہی پارٹی کی نگرانی میں ہیں۔

"قوموں کی کونسل" میں یونین کی سپریم کونسلوں، خود مختار جمہوریتوں اور خود مختار علاقوں کی سودیٹ کے نمایندے شامل ہوتے ہیں۔ اس میں دس نمایندے تو یونین کی جمہوریت کے ہوتے ہیں اور پانچ پانچ خود مختار علاقوں کے۔

حق انتخاب بلا امتیاز مذہب، قومیت، قیام یا جنس کے تمام شہریوں کو جن کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ ہے اور جو دولت آفریں محنت کے ذریعہ اپنی روزی کماتے ہیں یا سرخ فوج یا سرخ بیڑہ کے سپاہی اور ملاح یا ان کے کمانڈر ہیں ملا ہوا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ | ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں پہنچنے کے بعد مختلف قوموں کے لوگوں کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ ۱۹۳۰ء کی مردم شماری کے مطابق امریکہ میں دس کروڑ ۸۸ لاکھ ۶۴ ہزار ۲۰۷ سفید نسل کے لوگ تھے ایک کروڑ ۱۸ لاکھ ۹۱ ہزار ۱۴۳ حبشی تھے

اور ۲۰ لاکھ ۱۹ ہزار ۶۹۶ دوسری نسل کے لوگ۔ اس ملک میں حبشیوں کے مسئلہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس کو حل کرنے کے لیے مختلف قسم کی پالیسیاں اختیار کی جا چکی ہیں کچھ دنوں تک حبشیوں کو ایک علیحدہ علاقہ میں رکھنے کی پالیسی پر عمل ہوتا رہا پھر ان پر ہر جگہ دھونس جمانے کی پالیسی کو اختیار کیا گیا لیکن یہ دونوں پالیسیاں ناکامیاب ثابت ہوئی ہیں۔ البتہ جذب کرنے کی پالیسی کم سے کم جہاں تک تمدنی طور پر جذب کرنے کا تعلق ہے آہستہ آہستہ کامیاب ہو رہی ہے۔ معاشرتی حیثیت سے یہ دونوں گروہ بالکل جدا ہیں اگرچہ سفید نسل کے بعض لائق اعتبار مشاہدہ کرنے والوں کی یہ رائے ہے کہ حبشی لوگ آخر میں سفید نسل کے لوگوں میں بالکل جذب ہو جائیں گے۔ حبشیوں کو ووٹ کا حق تو دے دیا گیا ہے لیکن جنوب کی بہت سی ریاستوں نے ایسے طریقے اختیار کر رکھے ہیں جن سے حبشی اپنے رائے دینے کے حق سے عملاً محروم ہو گئے ہیں۔ جنوبی ریاستوں میں معاشرتی زندگی میں حبشیوں سے علیحدہ رہنے کا رواج اب بھی زوروں پر ہے۔ حبشیوں کے مدرسے، یونیورسٹیاں، گرجا گھر علیحدہ ہوتے ہیں۔ ریلوے ٹرین، ٹریم کار، تھیٹر اور سینما میں ان کی جگہیں علیحدہ رکھی جاتی ہیں۔ معاشی میدان میں بھی حبشیوں کے مقابلہ میں دوسرے لوگوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جب کوئی دوسرا شخص نہیں ملتا تب آخر میں حبشی کو ملازم رکھا جاتا ہے اور سب سے پہلے اسے ہی برطرف کیا جاتا ہے غرضکہ حبشیوں کے مسئلہ کو ابھی تک حل نہیں کیا جا سکا ہے اور جب تک اس مسئلہ کا کوئی معقول حل نہ کیا جائے گا امریکہ کی قومیت کی بنیادیں بہت غیر استوار ثابت ہوں گی۔ دونوں نسلوں کے درمیان اتحاد عمل اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوششیں بڑے پیمانہ پر اختیاری طور پر کی جا رہی ہیں لیکن نہایت طویل زمانہ کے تعصبات کو آہستہ آہستہ ہی ختم کیا جا سکے گا۔

یورپ میں قومی اقلیتیں یورپ میں صدیوں سے جہاں کہیں نام نہاد ملکی لوگوں کے ساتھ ایک یا ایک سے زائد غیر قومیں آباد ہیں وہاں ان کی وجہ سے جنگیں برپا ہوتی ہیں۔ ان اقلیتوں کو "قومی گروہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ پڑوس کی کسی نہ کسی ریاست کے ساتھ ان کی نسلی، تمدنی یا لسانی وابستگیاں ہوتی ہیں اور ان اقلیتوں کے آبائی ملک سیاسی حیثیت سے جس قدر طاقتور ہوتے ہیں

اسی حد تک یہ اقلیتیں بھی اپنا زور دکھاتی ہیں ۔ ان اقلیتوں کے پیدا ہونے کے متعدد اسباب ہوتے ہیں کہیں تو یہ ماضی بعید میں نقل سکونت کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں اور بعد کی انفرادی نقل سکونت یا ملکی الحاق یا علاقوں کی دوسری تبدیلیوں کی وجہ سے ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا ہے ۔ ان میں سے بعض اقلیتیں تو اکثریت میں آہستہ آہستہ بالکل جذب ہو گئی ہیں لیکن بعض نے اپنی غیریت اور علیحدگی کو قائم اور برقرار رکھا ہے ۔ ان میں سے اکثر کا تعلق مخالف سیاسی گروہ سے رہا ہے یعنی ایسے گروہ سے جو کسی نہ کسی زمانہ میں مستبد حکمراں کی حیثیت سے برسر اقتدار رہ چکا ہے ۔ اس کے علاوہ یہ عموماً دولتمند بھی ہوتی ہیں ۔ ان دو آخر الذکر اسباب کی بنا پر ان اقلیتوں کو ستانے اور لوٹنے کو جائز سمجھا جانے لگتا ہے اور قوم کی تمام محرومیوں اور مصیبتوں کی ذمہ داری ان کے سر منڈھ دی جاتی ہے ۔ یورپ میں جس قسم کا ریاستی نظام آج کل چل رہا ہے یعنی پارلیمنٹری جمہوری نظام اس میں ان اقلیتوں کو اپنی اکثریت بنانے کا کوئی موقع حاصل نہیں ہے ۔

تمام یورپ میں قومی اقلیتوں کی تعداد تقریباً ۴ کروڑ ہے اور اس میں جرمن اقلیتوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے ۔ میونخ کے معاہدہ سے پہلے چیکوسلویکیا کی آبادی میں جرمنوں کی تعداد ۲۵ فی صدی تھی ۔ دوسری خاص اقلیتیں یوکرنیوں، یہودیوں، کٹیالینیوں (اسپین میں)، مگیاروں، ترکوں اور تاتاروں، بلغاریوں، درمقدونیوں، سفید روسیوں، پولوں، روسیوں، البانیوں، رومانیوں، سلووینیوں، یونانیوں، کروٹوں، سلوواکوں، چیکیوں اور مراویوں، سرویوں، لیتھونیوں، اور ارمینیوں کی ہیں ۔ جن ملکوں میں اقلیتیں خاص طور پر پائی جاتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-

پولینڈ (۳۲ فی صدی) چیکوسلوویکیا (۱۹۳۸ء تک، ۳۴ فی صدی)، رومانیا (۲۰ فی صدی) لیتھوانیا (۲۶ فی صدی)، یوگوسلاویا اور البانیا (دونوں میں بائیس بائیس فی صدی) اسپین (۱۵ - ۲۰ فی صدی) ہنگری اور یونان (دونوں میں پندرہ پندرہ فی صدی) اور بلغاریا (۱۲ فی صدی) ۔

یورپ کی اقلیتوں کے مسائل زیادہ تر تمدنی، نسلی اور لسانی ہیں ۔ اقلیتوں کو اپنی زبان، تمدن، رواج اور روایات کے تحفظ کا بہت زیادہ خیال ہے ۔ سرکاری ملازمتوں میں اپنے حصہ کے تحفظ

کرنے کی کوشش ان ملکوں میں افلاس زدہ ہندوستان کی طرح نہیں کی جاتی۔ یورپ کے ملکوں کی اقلیتوں کی طرح ہندوستان کی اقلیتوں کا ربط و تعلق غیر ملکوں کی اقلیتوں کے ساتھ نہیں پایا جاتا۔

اقلیتوں کے ساتھ سلوک کرنے میں یورپ کی ریاستوں نے ذیل میں درج کئے ہوئے طریقوں میں سے کسی نہ کسی کی پیروی کی ہے جو ریاستیں روشن خیال ہیں انھوں نے شروع کے طریقوں کو اختیار کیا ہے اور دوسری ریاستوں نے علی الترتیب بعد کے طریقوں کو:۔

(۱) اپنی نسلی، تمدنی اور اجتماعی زندگی کا انتظام کرنے کے لئے اقلیتوں کو خود مختار بنا دیا گیا ہے اور اس میں اسکولوں کے جداگانہ انتظام کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

(۲) ریاست کی طرف سے اقلیتوں کے نسلی اور تمدنی مطالبات کو پورا کرنے کے لئے خاص سرکاری ادارے قائم کئے گئے ہیں۔ اس کی مثال کے طور پر ڈنمارک کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جو انتظامات کئے جاتے ہیں اس میں اقلیتوں کے بچوں کو ان کی اپنی زبان میں تعلیم دینے کے لئے خاص سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ استادوں کا تعلق اس گروہ سے ہو جس گروہ سے کہ شاگردوں کا تعلق ہے۔

(۳) قوم کے تمام افراد کو ایک ہی طرح کے قوانین کا ماتحت بنایا جاتا ہے اور اقلیتوں کے ساتھ کسی طرح کی کوئی خاص رعایت نہیں کی جاتی چنانچہ یوگوسلاویہ میں نجی مدرسوں کا قائم کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اٹلی میں سرکاری مدرسوں کی حاضری کو لازمی قرار دیا گیا ہے ان دونوں ملکوں میں اقلیتوں کے لئے مدرسوں کے جس نظام کو ایک زمانہ میں فروغ حاصل تھا وہ ختم کر دیا گیا ہے۔

(۴) اقلیتوں کے مقابلہ میں دوسرے شہریوں کے ساتھ قانونی طور پر امتیازی سلوک کرنا۔ چنانچہ ہنگری میں ڈراما کے "ہیرو" ایسے ہی اشخاص کو بنایا جاتا ہے جن کے نام مگیاری ہوتے ہیں رومانیا میں جب کوئی ڈراما رومانیا کی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان میں دکھایا جاتا ہے تو اس پر ایک خاص ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ لیتھویا میں جہاں ابھی تک اقلیتوں کے ساتھ روشن خیالی کا برتاؤ کیا جاتا تھا اب ایسے مذہبی قوانین بنائے گئے ہیں جن کا اثر اقلیتوں پر برا پڑتا ہے۔ اس قسم کے قوانین

دوسرے ملکوں میں بھی منظور کئے گئے ہیں اور ان سے جرمن لوگوں کو خاص طور پر نقصان پہنچا ہے۔

یورپ میں ایسی کئی اقلیتیں ہیں جن کے حقوق کا تحفظ بین الاقوامی معاہدوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ یہ معاہدے یورپ کی ریاستوں مثلاً پولینڈ وغیرہ نے جنگ عظیم کے ختم ہونے پر ابتدا میں اتحادی حکومتوں کے ساتھ انفرادی طور پر کیے تھے اور بعد میں یہی معاہدے انجمن اقوام کے ساتھ کئے گئے تھے یہ معاہدے زیادہ تر ان نئی ریاستوں کے ساتھ کئے گئے تھے جو جنگ کے خاتمہ پر وجود میں آئی تھیں اس کے علاوہ ان چھوٹی ریاستوں کے ساتھ بھی یہ معاہدے کئے گئے تھے جن کے رقبے کو روس اور دوسری شکست خوردہ دول کا علاقہ چھین کر بڑھا دیا گیا تھا۔ نیز شکست خوردہ ریاستوں کے ساتھ بھی (جرمنی کو علیحدہ کرنے کے بعد) اسی طرح کے معاہدے کئے گئے تھے۔ اس وقت سترہ ایسے معاہدے اعلانات اور معاہدوں کے خاص ابواب موجود ہیں جن کے ذریعہ بین الاقوامی تحفظ کی ضمانت کی گئی ہے۔ اتحادی دول مثلاً فرانس اور اٹلی اور وہ ریاستیں جنھوں نے جنگ عظیم میں حصہ نہیں لیا تھا مثلاً ڈنمارک ان بین الاقوامی معاہدوں کے پابند نہیں ہیں۔ جن ملکوں میں ان معاہدوں پر عمل درآمد ہوتا ہے وہ عموماً چھوٹی ریاستیں ہیں۔ بڑی ریاستیں بالکل مطلق العنان اور خود مختار ہیں۔ عام طور پر شمالی ریاستوں نے معاہدے کی شرائط کو جنوبی ریاستوں کے مقابلہ میں زیادہ ایمانداری کے ساتھ پورا کیا ہے۔

ان تمام معاہدوں کے ذریعہ سے قومی اقلیتوں کو ایسے حقوق مل گئے ہیں جو ریاست کے اقتدار مطلق کے منافی نہیں ہیں یہ حقوق حسب ذیل ہیں:۔ (۱) قومیت کا حق یا تو ملک میں پیدا ہونے کی وجہ سے یا بعض شرائط کے ماتحت مستقل سکونت کی بنا پر مکمل تحفظ کے لئے اس حق کا حاصل کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ (۲) قانون کی نگاہ میں مساوات اور سول اور سیاسی حقوق میں بلا امتیاز نسل زبان اور مذہب مساوات (۳) جان کا مکمل تحفظ اور ہر طرح کے مذہب یا اعتقاد کی پیروی کرنے کی مکمل آزادی بشرطیکہ اس آزادی سے انتظام عامہ اور اخلاق عامہ میں خلل پڑنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔ (۴) نجی تبادلہ خیال، تجارت، مذہب، صحافت، یا کسی چیز کے طبع کرنے یا عام جلسوں اور عدالتوں کے سامنے جس زبان کو چاہیں اس کے بولنے کا حق (۵) سرکاری ملازمتوں تقرریوں اور اعزازات

یا پیشوں کو چلانے کے سلسلے میں کسی امتیازی سلوک کا نہ ہونا۔ (۶) اقلیتوں کی ایسی زبانوں میں جو سرکاری زبانیں نہیں ہیں تعلیم کے لئے مناسب سہولتیں دینا (۷) خیراتی، مذہبی، معاشرتی ادارے، مدرسے اور دوسرے تعلیمی اداروں کے قائم کرنے، ان کے انتظام کرنے اور ان پر نگرانی رکھنے کا حق اور اس کے ساتھ ان کے اندر اپنی زبان اور اپنے مذہب کو آزادی کے ساتھ استعمال کرنے کا حق۔ (۸) ان ضلعوں میں جہاں اقلیتیں مجتمع ہوں ریاست کی آمدنی کا ایک مناسب حصہ تعلیمی مذہبی اور خیراتی اغراض کے لئے دینا۔

سیاسی اور معاشرتی اقلیتوں کو کوئی تحفظ نہیں دیا گیا ہے۔

ان حقوق کے تحفظ کی ذمہ دار لیگ آف نیشنز کی کونسل بنائی گئی ہے۔ جب ان معاہدوں کی خلاف ورزی ہوتی ہے یا ان کی خلاف ورزی کا اندیشہ ہوتا ہے تو صرف کونسل کا ممبر کونسل کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرا سکتا ہے۔ کونسل کے ممبروں کے علاوہ دوسرے لوگ جن میں اقلیتیں بھی شامل ہیں عرضی کے ذریعہ کونسل تک اپنی بات پہنچا سکتے ہیں لیکن ان عرضیوں کی حیثیت محض ذرائع معلومات جیسی ہوتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ عرضیاں معقول طریقہ پر لکھی جائیں ان کے لکھنے والے ذمہ دار لوگ ہوں اور ان کا موضوع ایسا مسئلہ ہو جس کے بارے میں کوئی تازہ فیصلہ نہ سنایا جا چکا ہو اور جس ملک سے اقلیت کا تعلق ہے اس سے علیحدگی کا مطالبہ ان عرضیوں میں موجود نہ ہو لیگ کا سکریٹری جنرل ان شرائط کی روشنی میں اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ درخواست قابل غور ہے یا نہیں۔

جب اس سوال کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو درخواست کونسل کے پریسیڈنٹ کے پاس بھیجی جاتی ہے اور وہ معمولی معاملات میں کونسل کے دو ممبروں کے ساتھ اور استثنائی صورتوں میں کونسل کے چار ممبروں کے ساتھ جنھیں وہ خود نامزد کرتا ہے اس پر کارروائی شروع کرتا ہے۔ یہ کمیٹی یہ فیصلہ بھی کر سکتی ہے کہ کسی کارروائی کی ضرورت نہیں ہے یا متعلقہ ریاست سے غیر رسمی طور پر معاملہ طے کر سکتی ہے یا پوری کونسل کو اسی مسئلہ کی طرف متوجہ کرنے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ غیر رسمی طور پر معاملہ کو اقلیتوں

کے شعبہ کے سکریٹریٹ کے ذریعہ سے طے کرنا ایسا طریقہ ہے جس کی تائید میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اس سے بدنامی اور تشہیر نہیں ہوتی اور حکومت متعلقہ کے ساتھ تعلقات خراب نہیں ہوتے۔

جب عملی کارروائی کی ضرورت سمجھی جاتی ہے تو اس وقت پہلا کام یہ کیا جاتا ہے کہ شکایت کی نقل حکومت متعلقہ کو کیفیت لکھنے کے لئے روانہ کردی جاتی ہے۔ حکومت متعلقہ یہ اعتراض کرسکتی ہے کہ یہ درخواست قابل غور نہیں ہے جب یہ صورت ہوتی ہے تو معاملہ جیسی ضرورت ہوتی ہے اسی کے مطابق کونسل کی تین یا پانچ کی کمیٹی کے فیصلہ کے لئے پیش کردیا جاتا ہے۔ حکومت متعلقہ کو تین ہفتے اس بات کا جواب دینے کے لئے دیے جاتے ہیں کہ آیا وہ الزام کا کوئی جواب دے گی یا نہیں اور دو مہینہ کی مہلت اصل جواب کے لئے دی جاتی ہے۔ عرضی گذاروں کو جواب کے دیکھنے یا جواب کا جواب الجواب دینے کا موقع نہیں دیا جاتا کیونکہ ایسا کرنے سے قومی اقتدار مطلق کے اصول کی نفی ہوتی ہے جھگڑا لیگ کونسل اور حکومت کے درمیان سمجھا جاتا ہے حکومت اور عرضی گذاروں کے درمیان نہیں۔

جن معاملات کے بارے میں قانونی مشورہ کی ضرورت ہوتی ہے انھیں بین الاقوامی عدالت کے مستقل کورٹ کے سامنے پیش کردیا جاتا ہے اور معاہدہ کے حدود کے اندر قانون اور واقعہ کے بارے میں عدالت کا فیصلہ آخری سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے معاملات میں اس کے فیصلہ کی نوعیت محض مشورہ جیسی ہوتی ہے اگرچہ اس کے ساتھ بہت کچھ اخلاقی اور قانونی وزن بھی شامل ہوتا ہے۔

کونسل کا کوئی ممبر اگر چاہے تو کونسل کے اس طریقہ کار کے علاوہ مستقل عدالت سے اس قسم کا فیصلہ بھی حاصل کرسکتا ہے جس کی پابندی اس ریاست کے لئے جس نے اقلیتوں کے معاہدہ پر دستخط کئے ہیں لازمی ہوتی ہے۔ ایسی صورت حال کی ایک مثال وہ ہے جب جرمنی نے مستقل عدالت کے سامنے جنوری ۱۹۳۲ء میں پولینڈ کے معاملہ کو پیش کیا تھا جس میں بالائی سلیشیا کی اقلیتوں کے حدود کا مسئلہ زیر بحث تھا۔

کونسل کی اکثریت کی منظوری کے بغیر اقلیتوں کے کسی معاہدہ میں کوئی ترمیم نہیں کی جاسکتی۔ اگرچہ

موجودہ طریقہ اس پرانے طریقہ سے بہتر ہے جس میں ایک طاقتور ریاست ایک شاکی اقلیت کی طرف داری کے سلسلہ میں مداخلت کیا کرتی تھی لیکن پھر بھی اس سے مسئلہ کا کوئی قابل اطمینان حل نہیں ہوتا لیگ کی اس کارروائی کی حیثیت ایک سیاسی پنچایتی فیصلہ کی سی ہوتی ہے اس لیے کونسل کا کوئی ممبر ریاست کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ریاست طاقتور ہوتی ہے آمادہ نہیں ہوتا۔ کونسل کے سامنے جو سینکڑوں درخواستیں پیش کی جا چکی ہیں ان میں سے صرف چند کے بارے میں قابل اطمینان فیصلہ دیا گیا ہے۔ اکثر کو محض ضابطہ کی عدم تکمیل کی بنا پر خارج کر دیا گیا اور بہت سوں پر کسی قسم کی کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اس کے علاوہ لیگ کونسل چونکہ ایک سیاسی جماعت ہے اس لیے سیاسی مصلحتوں کا اسے بہت زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ معاملہ کا فیصلہ قانون، ماہروں اور جغرافیہ دانوں اور معاشیات کے ماہروں کے مشورے کے مطابق کیا جائے پھر لیگ کی کونسل مقامی زیادتیوں کا تدارک کرنے کے لیے کچھ زیادہ موزوں بھی نہیں ہے۔ اس کی مشین بہت بھاری ہے اور مشکل سے حرکت میں آتی ہے۔ جب شکایت کرنے والی اقلیت مضبوط ہوتی ہے اس وقت تو کام کا یہ طریقہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن بعض ایسے معاملوں میں جہاں صورت حال بہت خراب تھی اور جن میں انفرادی طور پر ظلم و زیادتی کی گئی تھی ان کے تدارک کرنے میں لیگ ناکامیاب ثابت ہوئی۔ جن جگہوں میں فسادات اکثر اور سخت قسم کے ہوتے رہتے ہیں وہاں لیگ کے مقیم نمایندے کچھ عرصے کے لیے مقرر کیے جا سکتے ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہوگا کہ مخالف فریقوں کے نزدیک رہیں اور ان میں خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کریں ایک مستقل کمیشن مثلاً ابتدائی کمیشن بھی مقرر کیا جا سکتا ہے جو اقلیتوں کے ساتھ جو زیادتیاں کی جاتی ہیں ان سب پر غور کرے اور معاہدے کے ماتحت جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں انھیں پورا کرے اس کام کے لیے ایک قانونی جماعت کے کامیاب ہونے کا امکان ایک سیاسی جماعت کے مقابلہ میں زیادہ ہے[1]۔ اس لیے مستقل عدالت سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ ایک "مساواتی

---

[1] یہ تجاویز سر گلبرٹ مرے کی ہیں

کمیشن" بھی مقرر کیا جا سکتا ہے جس میں ریاست اور اقلیت کے مساوی نمائندے متنازعہ فیہ مسائل پر اولین ٹریبونل کی حیثیت سے فیصلہ صادر کریں۔

اقلیتوں کو اپنی جگہ پر اپنے اس فرض کو محسوس کرنا چاہیے کہ ان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ وفادار ہم قوم ہونے کی حیثیت سے جس قوم سے تعلق رکھتے ہیں اس کے ساتھ اشتراک عمل کرتے رہیں اور ان کو یہ ہرگز نہ چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو قومی اقلیتوں کی ان انجمنوں سے وابستہ کرلیں جو تمام یورپ کی خاص خاص اقلیتوں کو باہم منسلک کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں اور جن کی وجہ سے فرقہ وارانہ ذہنیت کا شعلہ ہمیشہ بھڑکتا رہتا ہے مثلاً ایسی انجمنیں جیسی کہ یورپ میں جرمنی نسل رکھنے والے گروہوں کی انجمن یا پولینڈ کے ان لوگوں کے لیے جو باہر رہ رہے ہیں وارسا کانگریس آف پولس یا ریگا کی اتحاد روسی کی کانگریس کیونکہ جیساکہ آلوٹھنگھم نے کہا ہے "کسی ریاست کے بنیادی مفادات کو اقلیتوں کے مسئلہ کے حل کرنے کے طریقہ سے نقصان نہ پہنچنا چاہیے۔"

ہندوستان میں اقلیتوں کا مسئلہ اپنی خراب ترین شکل میں موجود ہے اور اس کا کوئی پائدار حل افق سیاست پر نظر نہیں آتا ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی مطابق ہندوستان کی کل آبادی ۳۵ کروڑ ۲۰ لاکھ ۳۷ ہزار ۰۰ ہے۔ اس آبادی میں ۲۳ کروڑ ۹۱ لاکھ ۵۹ ہزار ۴۰ یعنی ۶۸ فی صدی ہندو ہیں ۷ کروڑ ۶۷ لاکھ ۷۷ ہزار ۵۴۵ یعنی ۲۲ فی صدی مسلمان ہیں ۶۲ لاکھ ۹۶ ہزار ۷۶۳ یعنی ۱ ۱ فی صدی عیسائی ہیں اور ۴۳ لاکھ ۳۰ ہزار ۷۷۱ سکھ ہیں۔ ۷۷ فی صدی آبادی خود مختار ہندوستان میں پائی جاتی ہے اور ۲۳ فی صدی ہندوستانی ریاستوں میں۔ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہندوؤں کے مقابلہ میں زیادہ تیزی سے ہوتا ہے۔ ہندو مذہب کیونکہ فی الاصل تبلیغی مذہب نہیں ہے اس لئے مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کی وجہ سے اسے نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

سکھ چونکہ صرف پنجاب تک محدود ہیں اس لئے ان کا مسئلہ کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں ہے ہندوستانی عیسائیوں کی وجہ سے بھی کسی ناقابل حل شکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ان میں ہندو اور مسلمان دونوں اصل کے لوگ شامل ہیں اور ان کے سیاسی نقطہ نظر میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے

خاص اختلاف ہندوؤں اور مسلمانوں میں پایا جاتا ہے جو تمام ہندوستان میں مختلف تناسب کے ساتھ پھیلے ہوئے ہیں۔ خاص خاص صوبوں میں مختلف مذہبوں کے پیروؤں کا جو تناسب پایا جاتا ہے اس کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے کیا جا سکے گا:۔

صوبہ	مذہب	تعداد	فی صدی
بنگال	ہندو	۲ کروڑ ۱۵ لاکھ ۷۰ ہزار ۴۰۷	۴۳ فی صدی
	مسلم	۲ کروڑ ۷۴ لاکھ ۹۷ ہزار ۶۲۴	۵۵ "
مدراس	ہندو	۴ کروڑ ۱۲ لاکھ ۷۷ ہزار ۲۷۰	۸۹ "
	مسلم	۳۳ لاکھ ۵ ہزار ۹۳۷	۷ "
	عیسائی	۱۷ لاکھ ۷۴ ہزار ۲۷۶	۳ "
بمبئی	ہندو		۷۶ "
	مسلم		۲۰ "
پنجاب	ہندو	۶۳ لاکھ ۲۸ ہزار ۵۸۸	۲۷ "
	مسلم	ایک کروڑ ۳۳ لاکھ ۳۲ ہزار ۴۶۰	۵۷ "
	سکھ	۴۰ لاکھ ۷۲ ہزار	۱۳ "
سرحدی صوبہ	ہندو	ایک لاکھ ۴۲ ہزار ۹۷۷	
	مسلم	۲۲ لاکھ ۲۷ ہزار ۳۰۳	
سی۔پی		زیادہ تر ہندو	
سندھ	مسلم		۷۳ "

ہندو زیادہ تر جنوب اور وسط ہند میں چھائے ہوئے ہیں۔ مدراس کے صوبہ میں یہ ۸۹ فی صدی سے کم نہیں ہیں۔ آسام، بہار اور اڑیسہ، یو۔پی، وسط ہند کے علاقوں راجپوتانہ اور بمبئی میں ان کی اکثریت ہے۔ سرحدی صوبہ، بلوچستان اور کشمیر پر مسلمانوں کا اجارہ ہے اور پنجاب، مشرقی بنگال اور سندھ میں ان کی خاصی بڑی اکثریت ہے آسام میں ان کی تعداد ۳۲ فی صدی یو۔پی میں ۱۵ فی صدی

اور حیدر آباد میں ۱۱ فی صدی ہے۔

زبانوں کے لحاظ سے بھی ہندوستان بہت زیادہ منقسم ہے بولی کی زبانوں کو چھوڑنے کے بعد بھی ہندوستان میں ۲۲۵ زبانیں پائی جاتی ہیں لیکن ہندوستانی جو ہندی سے علیحدہ ایک چیز ہے ہندوستان کی مشترک زبان بنتی جا رہی ہے۔

معاشرتی رواجات۔ مراسم اور طریقہ ہائے زندگی کے لحاظ سے بھی بہت گہرے فرق پائے جاتے ہیں۔ مسلمان گوشت کھاتے ہیں ہندوؤں کی ایک بہت بڑی تعداد نباتی غذا کھاتی ہے۔ مسلمانوں میں خاصی بڑی حد تک مساوات پائی جاتی ہے لیکن ہندو ذاتوں میں منقسم ہیں۔ ذات اس حد تک تو ختم ہو گئی ہے کہ مختلف بڑی ذاتوں کے درمیان معاشرتی تعلقات میں رواداری پیدا ہو گئی ہے لیکن ابھی تک باہم مل کر کھانا کھانے کا رواج عام نہیں ہوا ہے اور باہمی شادی تو ضمنی ذاتوں کے درمیان بھی نہیں ہوتی۔ ہندوؤں میں کم سے کم جنوب کے ہندوؤں میں پردے کا رواج نہیں ہے لیکن مسلمان ملک کے بڑے حصہ میں پردے کے پابند ہیں۔ لباس اور بالوں کے کتروانے کے سلسلہ میں بھی ہندؤں کا اور مسلمانوں میں فرق پایا جاتا ہے۔

مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ ان کا روحانی وطن مکہ ہے اور اس حد تک ان کی وابستگی ہندوستان کے ساتھ زیادہ گہری نہیں ہے ایسے مسلمان کثرت سے ملتے ہیں جو افریقہ، مصر عرب یا ایران کے مسلمانوں کے ساتھ تو بہت جلد گھل مل جاتے ہیں لیکن اپنے ہم قوم غیر مسلم ہندوستانیوں کے ساتھ ملنے میں انھیں تامل ہوتا ہے۔ اتحاد اسلام کی تحریک بھی مسلمانوں کے لئے ایک خاصی کشش رکھتی ہے۔

مذہبی معتقدات اور مراسم کا جہاں تک تعلق ہے مسلمان توحید پرست ہیں اور ایک خدا اور ایک پیغمبر پر ایمان رکھتے ہیں اس کے برعکس ہندو مذہب میں جہاں ایک طرف ادنیٰ ترین حیوان پرستی اور معبودوں کی کثرت کی گنجائش ہے وہاں دوسری طرف ہمہ اوست کا فلسفہ بھی موجود ہے۔ اس کی اس ہمہ گیری کو اگر ایک نقطہ نگاہ سے اس کی قوت سمجھا جا سکتا ہے تو دوسرے

نقطہ نگاہ سے یہ اس کی بڑی کمزوری بھی ہے۔ چونکہ ہندو مذہب میں مختلف بلکہ متضاد مذہبی خیالات و مراسم رکھنے والے لوگوں کی گنجائش ہے اس لئے اس کی ٹھیک ٹھیک تعریف اور تحدید کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کی ہمہ گیری نے اس کی شکل کو غیر متعین کر دیا ہے۔ بہرصورت یہ اسلام کے برابر صاف اور واضح نہیں ہے۔ چونکہ ہندو ایک ہمہ گیر مذہب کے ماننے والے ہیں اس لئے ان کے واسطے مذہبی رواداری آسان ہے اگرچہ بعض موقعوں پر یہ رواداری مذہبی بیگانگی کی شکل اختیار کر لیتی ہے ہندوؤں میں مذہب کے ماننے والے جو بہترین لوگ ہیں وہ غور و فکر میں منہمک رہتے ہیں اور ایثار اور خود گذاری کی ان منزلوں پر پہنچے ہوئے ہیں جن تک دوسرے مذہب کے پیروؤں کی مشکل سے رسائی ہو سکتی ہے۔ عام طور پر ہندو نرم اور منکسر المزاج صابر اور غیر تشدد پسند ہوتے ہیں اور ناانصافی کو برداشت کرتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے حقوق کے لئے لڑ سکتے ہیں اور بعض وقت ان کا رویہ جارحانہ اور بے صبری پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ مذہبی تبلیغ کا جذبہ مسلمانوں میں ہندوؤں کے مقابلہ میں یقیناً زیادہ ہوتا ہے۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے ہندو مسلمانوں سے زیادہ آگے بڑھے ہوئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک عرصہ تک اپنے آپ کو مغربی اثر اور تعلیم سے علیحدہ رکھا۔ پردہ کے رواج کی وجہ سے مسلم عورتوں میں بھی تعلیم کم پھیل سکی ہے۔ کتابی علم میں ہندوؤں نے اپنے آپ کو زیادہ موزوں ثابت کیا ہے۔

معاشی مفاد میں ہندو مسلمانوں میں زیادہ واضح فرق نہیں پایا جاتا۔ ہندو بھی کسان کاشتکار زمیندار، مزدور اور تاجر ہیں اور مسلمان بھی۔ شہروں میں مسلمانوں کا خاصا بڑا تناسب تجارت میں مصروف ہے۔ مہارت کے کاموں میں مثلاً صنعت اور دستکاری میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ دیہی علاقوں میں دونوں فرقوں کے لوگ غریب ہیں۔ بنگال اور پنجاب میں جہاں مسلمانوں کی معمولی اکثریت ہے وہاں بیان کیا جاتا ہے کہ دولت کے نقطہ نگاہ سے مسلمان ہندوؤں سے پیچھے ہیں کیونکہ بہت سے زمیندار اور ساہوکار ہندو ہیں۔

مندرجہ بالا اختلاف کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں پورے طور پر باہمی یگانگت پیدا نہیں ہوئی۔ خود غرض سیاسی لیڈر ان اختلافات کو اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے اور زیادہ بڑھا دیتے ہیں۔ ایک مشہور سیاسی لیڈر نے ابھی حال میں کہا تھا کہ "ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق اس جماعت سے نہیں ہے جس سے دوسرے ہندوستانیوں کا تعلق ہے۔ ان کی بالکل ایک جداگانہ قوم ہے اور انھیں فرقہ کی جگہ قوم کے نام سے موسوم کرنا چاہیئے اور انھیں اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے کا اختیار ملنا چاہیئے"۔ ایک اور مسلمان نے یہ کہا ہے کہ حیدرآباد کے لوگ بجائے خود ایک قوم ہیں ان کا بادشاہ اور ان کا قومی جھنڈا بالکل الگ ہے۔ یہ بیانات نہ صرف واقعہ کے اعتبار سے غلط ہیں بلکہ ان سے نہایت خراب اثر بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

پھر ہندوؤں کے درمیان بھی شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ۶ کروڑ اشخاص کم از کم جہاں تک معاشرت کا تعلق ہے باقاعدہ طور پر ہندوؤں کے زمرہ میں شامل نہیں ہیں۔ سورن ہندوؤں میں بھی برہمنوں اور غیر برہمنوں، مرہٹوں اور غیر مرہٹوں کے اختلافات پایا جاتا ہے۔

علاج | ہمارے سامنے جو حل طلب مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ کس طرح ان متصادم مفادوں اور گروہوں کو متحد کیا جائے اور ان میں قومی اتحاد اور ایک جہتی کی روح پھونکی جائے۔ ہندوستان نے ابھی تک یہ سبق نہیں سیکھا ہے کہ "اتحاد میں ہی طاقت ہے" جب تک ہندوستان میں خانہ جنگی جاری رہے گی اس وقت تک باہر کے لوگ اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ پہلا سبق جسے ہندوستان کو پڑھنا چاہیئے وہ باہمی ہمدردی، باہمی احترام اور ایک دوسرے کے نقطہ نگاہ کے سمجھنے کا سبق ہے۔ اس رواداری کے ساتھ قلب کی اس وسعت کا پیدا ہونا بھی ضروری ہے جو دوسروں کی اچھائی کو دیکھ سکتی اور اس کی قدر کر سکتی ہے۔ اختلافات کے معنی لازمی طور پر کم تری یا برتری کے نہیں ہوتے۔ ہر مخلص ہندوستانی محب وطن کا نصب العین یہ ہونا چاہیئے "ضروری باتوں میں اتحاد، مشتبہ باتوں میں آزادی اور سب باتوں میں فیاضی"۔

جب اس مناسب روح اور رویہ کا عام طور پر رواج ہو جائے گا تو پھر مجالس قانون ساز اور

ملازمتوں میں فرقہ وارانہ نمائندگی کے سوال کی اہمیت زائل ہو جائے گی۔ اگر فرقوں کے تعلقات میں پوری دوستی اور صاف دلی ہو تو چند نشستوں یا عہدوں کی کمی یا زیادتی کی طرف کوئی شخص بھی کبھی متوجہ نہیں ہوگا۔

علیحدگی اور متوازی اداروں کے قائم کرنے کی پالیسی بہت ناپسندیدہ ہے۔ ہندوستان کے مختلف فرقے اس قدر ملے جلے ہوئے زندگی بسر کر رہے ہیں کہ ان کو معاشرتی، تمدنی یا جغرافی طور پر علیحدہ کرنا نہ صرف ناپسندیدہ ہے بلکہ ناقابل عمل بھی ہے۔ ہم کو اپنی تمام کوششوں کو اس عقیدہ کے ساتھ شروع کرنا چاہیے کہ ہم باہمی سمجھوتہ اور رواداری ہم آہنگی اور اتحاد کے ساتھ ضرور رہ سکتے ہیں۔ ہم کو اپنا نصب العین یہ بنانا چاہیے کہ "ہر فرقہ کو معقول حدود کے اندر رہتے ہوئے معاشرتی تمدنی اور مذہبی آزادی اور تمام فرقوں کے لئے ایک واحد ریاست۔" ہم نہ ہندو راج چاہتے ہیں نہ مسلم راج نہ برطانوی راج نہ ان کا کسی قسم کا ایک مشترکہ راج بلکہ ہم ہندوستانی راج چاہتے ہیں۔ اگر اقلیتوں کو مطمئن کرنے اور انھیں اپنا طرفدار بنانا منظور ہے تو پہلی بات جو ہمیں کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ ان کے دل میں اکثریت کے خلوص اور نیک نیتی کی طرف سے اعتماد کی کیفیت پیدا کی جائے خوف، شبہ اور بے اعتمادی کے تمام اسباب کو دور کرنا چاہیئے۔ دستور میں بنیادی حقوق کو رکھنے اور عدالتوں کی طرف سے ان کی سختی کے ساتھ پابندی کرانے سے یقیناً صحیح سمت میں قدم اٹھایا جا سکتا ہے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے اس وقت بنیادی حقوق کا مسئلہ موجود ہے۔ حال میں بنیادی حقوق کے بارے میں جو قرارداد اس نے منظور کی ہے وہ حسب ذیل ہے:-

"مختلف لسانی رقبوں کے تمدن، زبان اور رسم خط کا تحفظ کیا جائے گا"

"کسی شخص کو اس کے مذہب، ذات عقیدہ یا جنس کی وجہ سے، سرکاری ملازمت یا قوت واعزاز کے کسی عہدہ کے حاصل کرنے یا کسی تجارت اور پیشہ کو اختیار کرنے کے لئے نااہل نہیں سمجھا جائے گا۔

"تمام مذاہب کے بارے میں ریاست غیر جانبدار رہے گی۔

رائے دینے کا حق تمام بالغ آبادی کو ملا ہوا ہوگا۔

"ہر شہری کو آزادی ہے کہ وہ تمام ہندوستان میں جہاں چاہے نقل وحرکت کرے، جس حصّہ میں چاہے سکونت اختیار کرے، جائداد پیدا کرے جس تجارت اور پیشہ کو چاہے اختیار کرے ہندوستان کے ہر حصہ میں تحفظ یا قانونی کارروائی کے وقت اس کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا جائے گا۔"

ان میں سے بہت سے حقوق وہ ہیں جو یورپ کی اقلیتوں کے معاہدوں میں موجود ہیں ان سے مذہبی اعتقاد و مراسم کی آزادی کی ضمانت، تمدن، زبان اور رسم الخط کا تحفظ سرکاری ملازمتوں میں داخلہ کے مساوی مواقع، سرکاری مذہب کا عدم قیام، سب بالغوں کو حق رائے دہی اور تمام ہندوستان میں نقل وحرکت اور سکونت کی آزادی مل جاتی ہے۔

یہاں اس بات کی طرف توجہ دلانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان بنیادی حقوق میں اپنے مذہب کی تبلیغ کے حق کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ مفاہمت کے پیش نظر تبدیل مذہب کی ناجائز کوششوں کو بند کرنا بہت ضروری ہے ——————

—— تبدیل

مذہب کی ان کوششوں کو نہ اخلاقی وجوہ کی بنا پر جائز سمجھا جا سکتا ہے نہ روحانی وجوہ کی بنا پر لیکن جو لوگ سچے دل سے مذہب کو بدلنا چاہیں ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہونا چاہیئے۔ یہ صحیح ہے کہ تبدیل مذہب کی جائز اور ناجائز صورتوں میں امتیاز کرنا بہت مشکل ہے۔[۵] ہم میں جو بہترین

---

[۵] اس مضمون میں جن خیالات کا اب تک اظہار کیا گیا ہے یا جن کا آئندہ اظہار کیا جائے گا ان سے مدیر کا اتفاق خیال رکھنا ضروری نہیں ہے۔ یہ مضمون نگار کے ذاتی خیالات ہیں اور ان کے لئے مضمون نگار خود جواب دہ ہیں (مدیر)

لوگ ہیں ان کے کاموں میں بھی بعض اوقات اچھے اور برے دونوں قسم کے محرکات عمل موجود ہوتے ہیں۔ جب صورت یہ ہے تو جو لوگ مختلف محرکوں اور مصلحتوں کے پیش نظر اپنا مذہب بدلتے ہیں ان کی حالت پر بھی ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ بہرحال جایز اور ناجایز تبدیلی مذہب پر قانون کی کوئی نگرانی قائم نہیں کی جاسکتی۔ البتہ رائے عامہ اور مذہبوں کے باہمی سمجھوتہ سے اس کام کو کیا جاسکتا ہے۔ ہر مذہبی فرقہ کو ذاتی طور پر خود اپنے اوپر یہ پابندی عاید کر لینا چاہیئے کہ وہ ان لوگوں کو جو محض خود غرضی کی بنا پر ان کے حلقہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں اپنے مذہب میں داخل نہ کریں گے۔ غرضکہ اس طرح ایک مناسب رائے عامہ کو پیدا کرنا چاہیئے جو ہر قسم کی ناجائز تبدیلی مذہب کا تدارک کر سکے۔ مہاتما گاندھی کا وہ رویہ صحیح نہیں تھا جب انھوں نے جایز اور ناجایز تبدیلی مذہب میں فرق کرنے سے انکار کر کے یہ کہا تھا کہ میں برسر اقتدار آ گیا اور عیسائیوں نے اپنے آپ کو صرف معاشرتی اور انسانی ہمدردی کے کاموں تک محدود نہیں رکھا تو میں ان کا بوریا بدھنا بندھوا کر انھیں ہندوستان سے نکال دوں گا۔

تبدیلی مذہب کے کام میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی وجہ سے بھی جو ہندوستان کی سیاسی نظام میں نہایت مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑ چکے ہیں بہت تیزی پیدا ہوگئی ہے۔ جب دو سال ہوئے ڈاکٹر امبیدکر نے ہندو مذہب کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا تھا اور دبی ہوئی ذاتوں کے لوگوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ من حیثیت الجماعت کسی دوسرے مذہب کو قبول کریں تو ملک میں یہ مکروہ منظر دکھائی دیا تھا کہ مختلف مذہبوں اور فرقوں کے رہنماؤں نے اپنی مال کو منڈی میں بیچنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر امبیدکر عقلمند آدمی تھے انھوں نے اظہار تعلق تو سب کے ساتھ کیا لیکن کسی کے ساتھ مستقل رشتہ قبول نہیں کیا۔ جب تک ملازمتوں میں فرقہ وارانہ نمایندگی باقی رہے گی تبدیل مذہب کی کوششیں بھی جاری رہیں گی۔ مسلم لیگ کے جوش سے ہندو مہاسبھا کا جوش بھی بڑھا اور آریہ سماج کا تبدیلی مذہب کا جذبہ بھی بھڑک اٹھا۔ ہندو مذہب کی مشکلات سے عیسائیوں، سکھوں یا مسلمانوں کو کبھی ناجایز فائدہ نہ اٹھانا چاہیئے۔

بنیادی حقوق کے اس کانگریسی رزولیوشن میں جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ایک دفعہ صوبہ پرستی کے خلاف بھی موجود ہے لیکن اس سے مقصد پورے طور پر حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں اس بات کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے کہ جو لوگ سکونت اختیار کر چکے ہیں انھیں سرکاری ملازمت میں شامل ہونے کا حق بھی دے دیا جائے۔ صوبہ پرستی کی طرف سے اندیشہ ہے کہ وہ فرقہ پرستی سے بھی زیادہ ہندوستان کے اتحاد کی دشمن ثابت ہوگی۔ اگر اس کا تدارک جلد نہیں کیا گیا تو اس سے بے انتہا نقصان پہنچے گا۔ "بہار بہاریوں کے لئے ہے" "اندھرا دیش اندھرا والوں کے لئے ہے"۔ ایک خاص حد تک تو یہ نعرے جایز سمجھے جا سکتے ہیں لیکن اگر اس حد سے آگے بھی ان کو بڑھایا گیا تو اس سے ہندوستانی قومیت کا تخیل کمزور ہو جائے گا۔

بنیادی حقوق اس میں شک نہیں بہت قیمتی چیز ہیں لیکن ان کے اثر اور فایدے کا انحصار اس بات پر ہے کہ انھیں کس قدر ایمانداری اور پابندی کے ساتھ عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ یورپ کی قومی اقلیتوں کے بارے میں ایک مصنف نے حال میں بالکل ٹھیک لکھا ہے "ہو سکتا ہے کہ جہاں قانونی مساوات موجود ہو وہاں حقیقۃً عدم مساوات پائی جائے" اسی مصنف کا قول ہے کہ یوگوسلادیا نے ڈکٹیٹر شپ کے قائم ہو جانے کے بعد سے اپنے معاہدے کی پابندیوں کو نہایت کھلے بندوں پامال کیا ہے۔ اس نے اقلیتوں کے نجی مدرسوں کو ممنوع قرار دیا ہے اور اقلیتوں کے پریس پر نہایت سخت سنسرشپ قائم کر دی ہے۔ اجتماع کی آزادی سلب کر لی گئی ہے اور اقلیتوں کے خود مختار ادارے بند کر دئے گئے ہیں۔

مجالس قانون ساز اور سرکاری ملازمتوں میں اقلیتوں کی نمایندگی کا مسئلہ پچھلے کچھ دنوں سے بہت نزاعی مسئلہ بن گیا ہے۔ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا انتظام سب سے پہلے ۱۹۰۹ء میں مارلے منٹو رفارم کے وقت کیا گیا تھا۔ اس کے بعد سے ان کو وسیع اور گہرا کر دیا گیا ہے اور ان کے چھوڑنے کے بظاہر کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ لارڈ منٹو نے تو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کو اقلیتوں کے حق کی حیثیت سے تسلیم کیا تھا لیکن ۱۹۳۵ء کے قانون ہند کے ذریعے نہ صرف قانونی اقلیتیں بنائی گئی ہیں بلکہ قانونی اکثریتیں بھی بنا دی گئی ہیں سرکاری ملازمتوں میں بھی فرقہ پروری کو داخل کر دیا گیا

اس حقیقت کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے ملک بہت سے بند کمروں میں تقسیم ہوجاتا ہے، اور اس سے تنگ گروہ بندیوں کو ترقی حاصل ہوتی ہے پھر بھی یہ بات اپنی جگہ پر بحث طلب رہے گی کہ آیا اس سے خود اقلیتوں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے یا نہیں۔ میرے ایک طالب علم نے فرقوں کے حساب سے پنجاب کی آبادی کی تقسیم پر جو عملی تحقیقات کی ہے اس میں اس نے دعویٰ کیا ہے کہ مسلمانوں کو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے بغیر بھی اتنی ہی نشستیں مل سکتی ہیں جتنی اب انہیں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی صورت میں مل رہی ہیں اور اس میں فائدہ یہ ہوگا کہ جو لوگ مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب سے چنے جائیں گے انہیں سب فرقوں کا اعتماد حاصل ہوگا۔ مختلف فرقوں کی نشستیں آج کل جس طرح مقرر کی جاتی ہیں اس میں صوبہ وار مختلف مذہبی فرقوں کی مجموعی تعداد کو دیکھا جاتا ہے۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ ان مختلف انتخابی اضلاع کا ہوشیاری کے ساتھ مطالعہ کیا جائے جہاں سے مختلف فرقوں کے نمائندوں کے منتخب ہونے کی معقول وجوہ کی بنا پر امید کی جاسکتی ہے اگر اس مطالعہ سے یہ ظاہر ہو کہ اقلیتیں بغیر جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کو اختیار کیے ہوئے اپنے تناسب کو قائم رکھ سکیں گی تو اس سے مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کی تحریک کو بہت تقویت پہنچے گی یا کم سے کم تحفظ نشست کے ساتھ مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کے قائم ہونے کا امکان پیدا ہو سکے گا۔

کیونکہ اولاً ہندوؤں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ہندوؤں کو ووٹ دیں اور مسلمانوں اور عیسائیوں کو کہ وہ مسلمانوں اور عیسائیوں کو ووٹ دیں۔ اس سے ان فرقوں کے ترقی پسند لوگوں کے ساتھ جو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کو قومی اور جمہوری اصول کے خلاف سمجھتے ہیں اور جو ایک عام حلقہ انتخاب میں ووٹ دینا چاہتے ہیں، سخت ناانصافی ہوتی ہے۔ ہمیں اس بات کا پختہ یقین ہے کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے ہندوستان کی سیاسی زندگی کی ترقی میں روکاوٹ پیدا ہوگی۔ یہ راستے کا ایک بڑا روڑا ہیں اور اگر ہندوستان کو آزاد، متحد اور جمہوریت پسند خود مختار

قوم بننا ہے تو ان سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔

اگر امیدواروں کا انتخاب فرقہ وارانہ بنیاد پر جاری رکھا جائے تب بھی مجلس قانون ساز میں پہنچنے کے بعد انھیں اس بات کی آزادی حاصل ہونا چاہیئے کہ جس پارٹی کے ذریعہ وہ اپنی رائے میں سمجھیں کہ ملک کے بہترین مفاد کو ترقی حاصل ہو سکتی ہے اس میں وہ شامل ہو سکیں عیسائیوں کے تمام ان نمایندوں سے جن کا انتخاب فرقہ وارانہ بنیاد پر ہوا ہے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ ہر مسئلہ پر متحدہ طور پر ووٹ دیا کریں غیر ضروری ہے۔ تمام دوسرے فرقوں کی طرح مسلمانوں میں بھی ترقی پسند، اعتدال پسند، قدامت پسند، کمیونسٹ، سوشلسٹ اور انفرادیت پسند لوگ پائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو طبعی طور پر دوسرے فرقوں کے ان لوگوں کے ساتھ لگاؤ ہوتا ہے جو ان کے ہم خیال ہیں۔ تمام مسلمانوں کو یہ احساس نہیں ہے کہ وہ ہندوؤں کے پیروں کے نیچے دبے ہوئے ہیں اگر پارٹی کے نظام کو جو جمہوریت کے لئے لازمی سمجھا جاتا ہے صحیح طریقہ پر ترقی کرنا ہے تو اسے سیاسی اور معاشی پروگرام پالیسی اور طریقہ کار کی بنیاد پر ترقی کرنا چاہیئے نہ کہ پیدائش اور مذہبی وابستگی کے اتفاقی حالات کی بنیاد پر۔

یہ بات بہت خوش آیند ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس اقلیتوں کے حقوق کے مسئلہ پر پوری توجہ کر رہی ہے۔ کانگریسی صوبوں کے وزیروں کے لئے ایک کانگریسی ہدایت نامہ تیار کیا جا رہا ہے اخباری اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وزراء کو اس کے ذریعہ یہ ہدایت کی جائے گی کہ وہ اقلیتوں کو ملازمتوں میں مناسب نمایندگی دیں ان کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے تعلیمی سہولتوں کو وسیع کریں اور اقلیتوں کے تمدن زبان اور مذہب کی حفاظت کریں۔ گاؤکشی اور مسجدوں کے سامنے باجہ بجانے کے سوال پر رواج کا احترام کیا جائے۔ مہاتما گاندھی نے ابھی حال میں یہ اعلان کیا ہے کہ اتفاق رائے نہ ہونے کی صورت میں وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ کسی عمارت پر ترنگا جھنڈا نصب کیا جائے۔ جہاں تک بندے ماترم کا تعلق ہے ابھی حال میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ صرف ابتدائی دو بندوں کو جو بے ضرر معلوم ہوتے ہیں اور جن میں کسی ہندو دیوی یا دیوتا کو مخاطب نہیں کیا

گیا ہے قائم رکھا جائے۔

اگر ہم غلطی پر نہیں ہیں تو ہمارا خیال ہے کہ کانگریسی حلقوں میں موجودہ رجحان مصالحت اور مفاہمت کی طرف ہے۔ اقلیتیں بھی اگر اس کا جواب ایسا ہی دیں گی تو بہت اچھا ہوگا۔ اگر اکثریت نے بہت سی صورتوں میں سرکاری ملازمتوں پر اجارہ قائم کرکے اور اقلیتوں پر نازیبا پابندیاں عاید کرکے ان کے ساتھ ناانصافی کی ہے تو اقلیتوں نے بھی موقع ملنے پر کچھ ان سے زیادہ بہتر کام نہیں کیا ہے۔

ہندوستان کے مختلف فرقوں میں سرکاری ملازمتوں میں اپنا تناسب بڑھانے کے لئے اکثر جھگڑا ہوتا رہا ہے کچھ سالوں سے حکومت ہند اس پالیسی پر عمل کر رہی ہے کہ جو ملازمتیں اس کی نگرانی میں ہیں ان میں سے ۲۵ فی صدی مسلمانوں کو دی جائیں اور ۸ ⅓ فی صدی دوسری اقلیتوں کو۔ ملازمتوں کو حاصل کرنے کی خواہش کی وجہ سے بلاشبہ خود غرض نہ مفادوں اور پارٹیوں کو ترقی پانے کا موقع مل رہا ہے۔ اس کا ایک علاج تو یہ ہے کہ سرکاری عہدوں کی بڑی بڑی تنخواہوں اور بھتوں کو کم کر دیا جائے۔ مالی مشکل کی وجہ سے یہ کام اس وقت بھی شروع ہوگیا ہے اور یہ بات نہ صرف محصول گذار کے لئے ایک برکت ثابت ہوگی بلکہ قومی تحریک کو بھی اس سے فائدہ پہنچے گا۔ اہلیت کے کم ترین معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے سب فرقوں کو مختلف سرکاری ملازمتوں میں خدمت کرنے کا مساوی موقع دینا چاہیئے۔ ابتداء میں تقرر کرتے وقت فرقہ دارانہ تفریق کا خیال رکھا جا سکتا ہے لیکن ترقی میں صرف اہلیت کے مطابق فیصلہ ہونا چاہیئے کیونکہ نااہل افسروں سے محفوظ کیے جانے کا حق ہر شہری کو ملنا چاہیئے وہ چند آدمیوں کے اس حق سے زیادہ وقیع ہے کہ انھیں اپنی ملازمت کے زینہ کی آخری سیڑھی پر صرف اس لئے پہنچنے دیا جائے کہ ان کا تعلق اس فرقہ یا اس فرقہ سے ہے۔ فرقہ داری کی جو برائیاں ہیں انھیں رشوت ستانی، بد اطواری اور سرپرستی کے مواقع کو ختم کرکے بھی کم کیا جا سکتا ہے۔

فرقہ وارانہ تعلقات کے بہتر بنانے کی دوسری تجویزوں کو بھی ذیل میں مختصر طور پر بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) صوبہ کی حکومتوں اور مقامی حکومتوں کو جہاں تک ممکن ہے مناسب انتظامی کارروائیوں اور پالیسیوں کے ذریعہ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرنا چاہیئے کیونکہ اقلیتوں کے تحفظ جیسے معاملہ میں انتظامی کارروائیاں، قانون سازی اور عدالتوں کے فیصلے کے مقابلہ میں زیادہ موثر ثابت ہوتی ہیں۔ بہترین قوانین کو بھی طریقہ انتظام میں بے ایمانی سے کام لے کر ناکام بنایا جاسکتا ہے محاصل کے بار کو مساوی طور پر تقسیم کرنا چاہیئے، مختلف قسم کے ٹیکسوں کو لگاتے وقت اس بات کی طرف سے احتیاط برتنا چاہیئے کہ کسی خاص تجارت یا پیشہ کو جس میں کسی ایک فرقہ کے لوگوں کی اکثریت ہو کوئی امتیازی نقصان نہ پہنچ جائے۔ کانگریس گاؤں کی پنچایتوں کو زندہ کرکے اور انہیں مقامی کاموں کے لئے ایسے محاصل کو حوالہ کرکے جو مقامی طور پر اکھٹے کئے جاتے ہیں ترقی کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ فرقہ وارانہ کشیدگی ختم ہو جائے گی جب ایک ہی گاؤں کے وہ لوگ جو ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں اپنے اوپر آپ حکومت کرنے لگیں گے اور حکومت کے کام کے لئے کل جماعت میں سے بہترین آدمیوں کو منتخب کریں گے اور اس انتخاب کے وقت اس بات کو نہیں دیکھیں گے کہ انتخاب کے امیدوار کی ذات یا مذہب کیا ہے۔

(۲) قانونی نظائر، اور مجلس قانون ساز کے مستقل احکامات کو اس طرح پیدا کرنا اور ترقی دینا چاہیئے کہ جس سے اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ ہو سکے اور ان کے اعتماد کو حاصل کیا جا سکے۔

(۳) اجازتی قاعدوں اور کارروائیوں کے ذریعہ اونچے ذات والوں کی نگرانی کرنی چاہیئے کیونکہ ہم ایک طرف تو فرقہ پرستی کی مذمت اور دوسری طرف ذات کی حمایت نہیں کر سکتے۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ ذات کا نظام اگر فرقہ پرستی کی جڑ نہیں ہے تو ایک طرح کی فرقہ پرستی ضرور ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ذات کے نظام کو اس وقت تک ختم نہیں کیا جا سکتا جب تک ہندوؤں کے طرز زندگی کو بنیادی طور پر نہ بدلا جائے۔ لیکن ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندو مذہب میں ذات کے بغیر بھی اتنی سچائی اور زندگی موجود ہے کہ ذات کے ختم ہو جانے سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ذات کے نظام کے بارے میں مسلسل عمل اور پروپیگنڈے سے نقطہ نگاہ اور ذہنیت کو بدلنے کی ضرورت ہے

ہمیں اس ذہنیت سے نجات حاصل کرنا چاہیئے کہ میری ذات یا گوت کا آدمی میرے ہم قوم ہندستانی کے مقابلہ میں مجھ سے زیادہ قریب ہے جب تک ہندوستان کی تمام سوسائٹی میں باہمی شادیوں کا رواج نہیں ہوگا فرقہ پرستی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہے گی ہندوستان کو تمام دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں اس بات کی بہت زیادہ ضرورت ہے کہ انسانی برادری اور خدا کی الوہیت کا درس دیا جائے۔

اس سلسلہ میں یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ مدراس کی وزارت نے چھوت چھات کو تمام سرکاری جگہوں سے ختم کرنے کے لئے کارروائی کو شروع کر دیا ہے۔ ملابار کے داخلۂ مندر کے قانون کو اس ضمن میں مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کے دوسرے قوانین صوبہ اور ملک کے دوسرے حصوں کے لئے بھی بنائے جائیں۔

(۴) ہمیں اس قسم کے امکانات کی بھی تلاش کرنا چاہیئے کہ مختلف مذہبوں کے ماننے والے لوگ کس طرح ایک ہی گھر میں رکھے جا سکتے ہیں چین اور جاپان میں تو یہ چیز بہت عام ہے لیکن ہندوستان میں ذات کے نظام اور غذا، لباس اور معاشرتی مراسم کے اختلاف کی وجہ سے یہ چیز مشکل معلوم ہوتی ہے بہرحال اس مسئلہ پر غور کرنا ضروری ہے۔

(۵) فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو ترقی دینے کے لئے ایسے آدمیوں کی مستقل کمیٹیاں بنا دینی چاہئیں مختلف فرقوں کی نمائندگی کرتے ہوں اور جن کا کام یہ نہ ہوگا کہ وہ اپنے گروہوں کے لئے وکیل کا کام کریں بلکہ جن کا کام یہ ہوگا کہ وہ مخالف جماعتوں کے تعلقات کو خوشگوار رکھیں۔ ان کمیٹیوں کے کام میں یکجہتی پیدا کرنے کے لئے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا ایک صوبہ جاتی ڈپارٹمنٹ بنا دینا چاہیئے۔ ان کمیٹیوں کے ممبر ایسے لوگ ہونے چاہئیں جن کی ہمدردیاں وسیع ہوں جو تعصب سے خالی ہوں اور جنھیں پڑوس کے ہر شخص کا اعتماد حاصل ہو۔

جہاں تک فرقہ وارانہ فسادات کا تعلق ہے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ان کی ابتدا ہمیشہ غیر مصدقہ رپورٹوں کی بنا پر ہوتی ہے۔ کوئی شخص یہ خبر مشہور کر دیتا ہے کہ ایک ہندو لڑکی کو ایک

مسلمان بھگا لے گیا یا کسی ہندو نے ایک مسلمان کے چھرا بھونک دیا اور جب فساد ایک دفعہ شروع ہو جاتا ہے تو پھر آگ کی طرح پھیل جاتا ہے۔ اس کو روکنے کے لئے تیزی کے ساتھ باثر عاملانہ کارروائی کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ مدراس کی حکومت نے اپنے ضلع کے مجسٹریٹوں کو فرقہ وارانہ فسادات کو دبانے کے لئے پورے اختیارات دے رکھے ہیں اور ان کے ان اختیارات کی اپیل عدالت میں نہیں بلکہ حکومت سے کی جاسکتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ان لوگوں کو جو فرقہ وارانہ فساد شروع کرتے ہیں عبرت آموز سزائیں دی جائیں۔ یہ بات قابل افسوس ہے کہ ایسے لوگوں کو آسانی کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بڑے شہروں کے غنڈوں کی جتھہ بندی کو توڑنے کی ضرورت ہے۔

(۶) گاؤکشی اور مسجد کے سامنے باجا بجانے کے سلسلہ میں معقول نظائر کے قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اچھے شہری ہونے کے نقطہ نگاہ سے فرائض کو حقوق سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اگر گاؤکشی مسلمان چھوڑ دیں تو یہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی حاصل کرنے کے لئے ان کی طرف سے نہایت زبردست ایثار ہوگا۔ اس سے ہندوؤں کی دائمی دوستی کو نہایت یقینی طور پر حاصل کیا جا سکے گا۔ حیدرآباد کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہاں گاؤکشی بہت سالوں سے منع کر دی گئی ہے۔ لیکن اگر گاؤکشی کو جاری رکھنا ضروری ہو تو اس کام کو حقیقی انسانیت کے ساتھ عام پبلک کی نگاہ سے دور رہ کر کیا جا سکے اتنا ہی اچھا ہے۔ اسی طرح اگر ہندو مسجدوں اور دوسری عبادت گاہوں کے قریب اپنے گھنٹے اور ناقوس بجانا چھوڑ دیں تو اس سے فرقوں میں باہمی ہم آہنگی پیدا کرنے میں بہت مدد ملے گی لیکن اگر گانا اور بجانا ضروری ہو تو اس کو ایسے وقت ہونا چاہیے جو مسلمانوں کی عبادت کا وقت نہیں ہے اور ان اوقات کا تعین کر دینا چاہیے۔

(۷) روشن خیال پجاریوں اور مذہبی پیشواؤں کے پیدا کرنے کے کام میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ ان پڑھ اور نیم تعلیم یافتہ پجاری اور ملا ہندوستان کے مذہبوں کی ایک بڑی لعنت ہیں۔ اکثر

صورتوں میں انہی کی وجہ سے مذہبی دیوانگی اور تعصب پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں ایسے مذہبی رہنماؤں کی ضرورت ہے جو یہ سمجھتے ہوں کہ انصاف، رحم اور پاکبازی خدا کی نگاہ میں مراسم مذہب کی پابندی سے زیادہ پسندیدہ چیزیں ہیں۔ خدا ظاہری رضاجوئی نہیں چاہتا بلکہ وہ دل کی حضوری نیاز اور تسلیم چاہتا ہے۔

(۸) فرقہ وارانہ مدرسوں کی جگہ قومی مدرسے قائم کرنے چاہئیں۔

(۹) بچوں کو بہترین اخلاقی تعلیم دینے کے لئے اگر ہندوستان کی مختلف مذہبی کتابوں اور ان کی دعاؤں اور مناجاتوں اور مختلف مذہبوں کے عظیم المرتبت مردوں اور عورتوں کی زندگی کے حالات سے مدد لی جائے تو اچھا ہے۔

(۱۰) قومی لباس، قومی رواجات اور قومی تہواروں کے بارے میں بھی تحقیقات کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارے مسلمان بھائی ہمارے ترنگے جھنڈے میں ہلال کو بھی شامل کرنا چاہیں تو ہمیں اس کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیئے کسی مذہب کے پیرؤں کے لئے کسی خاص قسم کے لباس یا ذات کے نشان یا کسی اور ظاہری علامت سے اس بات کا اعلان کرتے رہنا کہ وہ دوسروں سے مختلف ہیں فضول سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ہر ہندوستانی بچے کو چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان سکھ ہو یا عیسائی مقامی زبان کے ساتھ ساتھ قومی زبان (ہندوستانی) کو بھی سیکھنا چاہیئے۔

(۱۱) ہندوستان کی غریبی کے کم کرنے کے لئے جو کچھ بھی کیا جائے گا اس سے فرقہ وارانہ ذہنیت کے رفع کرنے میں بہت مدد ملے گی کیونکہ اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ نہایت خراب معاشی حالات کی وجہ سے ہزاروں آدمیوں کو باعزت روزی کمانے کا موقع نہیں ملتا اور اس کی وجہ سے فرقہ وارانہ رقابتیں اور سرکاری ملازمتوں کے لئے تگ و دو شروع ہو جاتی ہے۔ یہ دیکھ کر ہمت بڑھتی ہے کہ اس وقت بھی معاشی تنظیموں نے فرقہ وارانہ تنظیموں کی جگہ لینا شروع کر دی ہے۔ پنجاب جیسے صوبہ میں جہاں فرقہ پروری کا جذبہ بہت مضبوط تھا مسلمانوں کے

غریبوں نے امیروں کے مقابلہ میں ہندوؤں کے غریبوں کے ساتھ مل کر کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ کانپور میں جو ابھی مزدوروں کا اسٹرائک ہوا تھا اس میں مسلم مزدوروں کو ہندو مزدوروں کے ساتھ لڑانے کی خود غرضانہ کوششیں ناکام رہی تھیں۔

(۱۲) ہمیں مختلف فرقوں کے صاحب فکر مردوں اور عورتوں کے حلقے ملک کے طول و عرض میں بنانا چاہییں تاکہ ہم آہنگی اور ایک جہتی کو ترقی ہو اور تمام فرقوں کے نوجوانوں کی خدمات حاصل کی جاسکیں اور پھر یہ لوگ مختلف فرقوں میں مفاہمت اور مصالحت پیدا کرانے کے کام کو تبلیغی جوش وخروش کے ساتھ شروع کر سکیں۔

انقلاب ایران

(جناب احمد خاں صاحب)

مثل مشہور ہے کہ ہر کمالے را زوالے۔ ہر سلطنت کے لیے ترقی اور تنزل لازم وملزوم چیزیں ہیں۔ جب تک خاندان کو حکومت کرتے کرتے کچھ زمانہ گذر جاتا ہے تو اس کے جانشینوں میں مختلف قسم کے نقائص پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ عیش وآرام میں پڑکر مفاد عامہ کو بھول جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امرا اور وزرا بھی جو صحیح معنوں میں حکومت کے کل پرزے ہوتے ہیں ان ہی کی تقلید کرنے لگتے ہیں اور اس عام لاپرواہی اور بے توجہی کی وجہ سے ملک میں ایک عام بدنظمی پیدا ہو جاتی ہے۔ حکومت کا یہ رنگ ڈھنگ رعایا کو بالکل نہیں بھاتا، اور حکمراں طبقے کے خلاف بغاوت شروع ہو جاتی ہے۔ اس بغاوت سے اکثر ان لوگوں کو اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ جو بہتر قابلیت اور حسیت رکھتے ہیں اور سلطنت ان کے قدم چومتی ہے۔ اس کا نام انقلاب ہے۔

یورپ کی صنعتی ترقی کے بعد وہاں کے ممالک کو دو چیزوں کی ضرورت ہوئی۔ ایک تو خام اشیا کی اور دوسرے مصنوعہ مال کی کھپت کے لئے منڈیوں کی ہندوستان میں ان کی یہ دونوں ضرورتیں پورا کرنے کی اہلیت شاید زیادہ تھی۔ اس لئے اس پر تقریباً ہر سلطنت کی نظریں پڑتی ہیں اور آخرکار انگریز اس پر قابض ہوئے۔ ہندوستان کا مقام ایسا ہے کہ اس پر خشکی کی طرف سے صرف مغرب ہی سے حملہ کیا جا سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے ہندوستان کی مغرب میں ایران اور افغانستان ہیں۔ اور ان دونوں ملکوں کے حدود انگلستان کی ایک ہم سر سلطنت یعنی روس سے ملتے ہیں لہذا سلطنت برطانیہ کے لئے ضروری ہوگیا کہ اگر وہ ہندوستان پر قبضہ رکھنا چاہتی ہے تو ان دونوں ممالک پر اثر رکھے۔ اس اثر کو قائم رکھنے کی کوششوں نے جو کشمکش پیدا کی وہ انقلاب ایران کا ایک نہایت اہم عنصر ہے۔

انیسویں صدی کے شروع میں جب ایران میں ناصر الدین شاہ تخت نشین تھا۔ یورپ کے سب سے بڑے مدبر اور سپہ سالار نپولین کو عروج ہوا۔ یورپ میں خاصا غلبہ حاصل کرنے کے بعد اس کی نظر ایشیا اور افریقہ پر پڑی۔ ایشیا میں ہندوستان اور افریقہ میں مصر چنا گیا۔ اور قرب کی وجہ سے اس نے پہلے مصر پر حملہ کیا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کا راستہ بھی صاف کرنا شروع کر دیا۔ اس رستے کی صفائی میں ایران بھی آگیا۔ فرانس سے فوجی مشن ایران بھیجے جانے لگے۔ تاکہ ایرانی فرانسیسیوں کی فوجی صلاحیتوں سے مرعوب ہو جائیں۔ مگر ان مشنوں کا زور کم کرنے کے لئے روسی اور انگریزی مشن بھی ان کے تعاقب میں آئے۔ اسی اثنا میں نپولین کو شکست ہوئی اور فرانسیسی مشن آنے بند ہو گئے۔ اور ایران میں روس اور برطانیہ مقابلے پر آگئے۔ اس طرح ایران یورپی سیاست کے بھنور میں آگیا۔

خاندانِ قاچار ایران پر تقریباً ایک صدی حکومت کر چکا تھا اور اب ناصر الدین کے رنگ ڈھنگ سے اس خاندان پر زوال آتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ملک میں اس بے جا غیر ملکی مداخلت نے حکومت کی غفلت کو دور نہ کیا۔ اور حکومت کی بے پروائی دیکھ کر ملک میں ایک عام بے چینی اور بدنظمی پھیل گئی اس بدنظمی سے بابی تحریک نے جو اس زمانے میں زور پکڑ رہی تھی اثر لیا۔ اور حکومت کو اس کی لاپرواہی کی طرف توجہ دلانی چاہی۔ مگر ناصر الدین شاہ نے یہ گوارا نہ کیا کہ خود اس کی رعایا اس پر نکتہ چینی کرے۔ چنانچہ اس نے بابی تحریک کے خلاف نہایت ہی سخت کارروائی کی اور اس تحریک کو تقریباً مٹا دیا۔ بابی تحریک بادشاہ کے رستے میں آخری رکاوٹ تھی۔ اب راستہ صاف پاکر بادشاہ تیزی کے ساتھ عیش و آرام کی طرف بڑھا۔ اور وزرا بھی اس کے ساتھ ہو لئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خزانہ جو کہ خاص رعایا کا مال ہوتا ہے گنتی کے چند لوگوں پر صرف ہونے لگا۔ تعیش کی زندگی میں جتنی دولت ہو کم ہوتی ہے۔ چنانچہ عوام پر ٹیکسوں کی بھرمار ہوئی۔ جس کے بوجھ سے عوام بالکل دب گئے اسی زمانے میں بادشاہ کو یورپ جانے کی سوجھی۔ روپے کی قلت کی وجہ سے غیر ملکیوں سے قرضہ لینا پڑا جس کے بدلے میں ان پر تجارتی رعایتوں کے دروازے کھول دیئے گئے۔ اس طرح ایرانی تجار

مغربی ممالک کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ یہاں جو غیر ملکی آئے انھوں نے یہاں کی بدنظمی کو دیکھ کر آہستہ آہستہ حکومت کے مختلف شعبوں کو اپنے ہاتھ میں لینا شروع کر دیا اور اب ایرانیوں کے لئے سوائے زراعت کے پیٹ پالنے کا کوئی اور ذریعہ نہ رہ گیا۔

اس دور میں سید جمال الدین افغانی اور ملکوم خان کی شخصیتوں کو ایران کے لئے غیبی مدد سمجھنا چاہیے یہی دو حضرات ہیں جنھوں نے ایرانی قوم میں انقلاب کی روح پھونکی اس موقعہ پر بہتر ہے کہ ان اصحاب کے متعلق بھی کچھ بتا دیا جائے۔

سید جمال الدین افغانی، افغانستان کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوئے۔ آپ نے پہلے تعلیمات اسلامیہ کا درس حاصل کیا اور اس کے بعد اسلامی ممالک کی سیاحت کی۔ مصریوں کو بیدار کرنے میں آپ نے نہایت ہی نمایاں حصہ لیا۔ اور خاص طور پر نوجوانوں کو تو آپ ہی نے جگایا۔ ۱۸۸۶ء میں ناصر الدین شاہ نے آپ کو ایران آنے کی دعوت دی۔ آپ ایران تشریف لے گئے۔ وہاں کی قابلِ رحم حالت دیکھ کر مولانا سے نہ رہا گیا اور آپ نے وہاں اصلاحات کا سلسلہ جاری کیا ایران میں آپ نے دو سال تک قیام فرمایا اور اس عرصہ میں ایک بہت بڑا گروہ شاگردوں کا اپنے گرد اکٹھا کر لیا۔ آپ نے رعایا کی حالت بہتر کرنے کے لئے بادشاہ سے چند مطالبات کئے جس کے سبب سے بادشاہ کے اور آپ کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی اور آخرکار آپ کو ایران چھوڑنا پڑا۔ آپکے ایران چھوڑ دینے سے آپ کے اثر میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ اب آپ کے شاگرد مختلف شہروں میں پھیل گئے۔ اور اس طرح انھوں نے ایک نئی پود تیار کی جو آزادی کو اپنا نصب العین سمجھتی تھی اور شاہی حکومت سے نفرت کرتی تھی۔

اس دور کی دوسری شخصیت ملکوم خان کی ذات تھی۔ آپ اصفہان کے رہنے والے تھے۔ طہران میں ایک معمولی استاد کی حیثیت سے آئے تھے۔ مگر اپنی قابلیت اور ہمت کی وجہ سے حکومت ایران کی طرف سے سفیر مقرر ہوئے اور لندن بھیجے گئے۔ یہاں سے آپ نے ایران کی حالت کے متعلق بادشاہ سے خط و کتابت کی۔ اور چند اصلاحات کی تجویز بادشاہ کو بھیجی۔ جب آپ کی طرف

کوئی توجہ نہیں کی گئی تو آپ نے اپنا عہدہ چھوڑ دیا اور ایک اخبار نکالنا شروع کیا جس میں حکومت ایران کے اس نامنصفانہ رویئے کے خلاف مضامین شائع ہوئے۔ آپ نے اس اخبار کے ذریعہ ایران میں اصلاحات کے لیئے زمین تیار کی۔

عوام میں اب عام بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ انھوں نے اپنا لیڈر مولویوں کو بنایا۔ یہ مولوی اکثر وہی تھے جو سید جمال الدین صاحب سے استفادہ حاصل کر چکے تھے۔ ان لوگوں نے استبدادی حکومت سے چھٹکارا پانے کے لئے بے حد قربانیاں کیں اور آزادی کی راہ میں بے دریغ جانیں تک قربان کر دیں۔

ناصرالدین شاہ کے ظلم وستم کی جب کوئی حد نہ رہی تو ایک ایرانی نوجوان نے اسے قتل کر دیا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ وہ سید جمال الدین کے شاگردوں میں سے تھا۔ اس پر ان کے دوسرے شاگردوں کو بھی تلاش کیا گیا۔ مگر صرف تین اشخاص ہی مل سکے اور وہ قتل کرا دیئے گئے۔ اس طرح ناصرالدین شاہ کا خاتمہ ہوا۔ اس نے اپنی عمر میں ایران کے لیئے صرف ایک کام کیا اور وہ کاسک بریگیڈ کا قیام تھا۔ اس فوج نے آئندہ چل کر ایران کی سیاست میں بہت بڑا کام کیا۔ ناصرالدین شاہ کے قتل کے بعد جو بدلہ سید جمال الدین صاحب کے شاگردوں سے لیا گیا اس نے عوام میں ایک بے چینی پیدا کر دی اور وہ حکومت سے بدلہ لینے پر تل گئے۔

ناصرالدین کے بعد مظفرالدین تخت نشین ہوا۔ یہ آدمی نرم دل اور طبیعت کا بہت کمزور تھا اس کمزوری سے غیر ملکیوں نے کافی فائدہ اٹھایا مگر ساتھ ہی ساتھ اس کی اس کمزوری سے قومیت پسند طبقے کو بھی بہت تقویت پہنچی۔ مظفرالدین کا زمانہ صحیح معنوں میں قومیت پسندوں کے شباب کا زمانہ ہے۔ اس کے تخت نشین ہوتے ہی روس اور برطانیہ دونوں بادشاہ کو اپنے اثر میں لانے کے لیئے زور لگانے لگے۔ مگر بادشاہ نے ان دونوں میں سے کسی سے بھی نہیں بگاڑی۔ بلکہ دونوں کو خوش رکھنے کے لیئے جو کچھ کر سکتا تھا کیا۔

عوام میں بھی اب کافی بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ قومی لیڈروں نے بھی بادشاہ کی اس کمزوری

کو سمجھا اور اس سے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ انھوں نے مختلف اصلاحات اور دستور اساسی کا مطالبہ کیا
پہلے پہل کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ اس پر عوام نے طہران کو چھوڑ دیا۔ اور وہ قریب کے شہروں میں چلے
گئے۔ تب بادشاہ کو جھکنا پڑا۔ اور ان کے مطالبات پورے کیے گئے۔ بڑے مطالبات دو تھے
ایک تو یہ کہ عین الدولہ وزیر اعظم کو اس کے عہدے سے برطرف کر دیا جائے۔ دوسرے ایک
مجلس (پارلیمنٹ) قائم ہو جس میں عوام کے نمائندے ہوں اور بادشاہ ان کے مشورے سے
حکومت کرے۔ چنانچہ ۵ اگست ۱۹۰۶ء میں مجلس کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اور ۷ اکتوبر
۱۹۰۶ء کو اس کا پہلا اجلاس ہوا۔ مجلس میں اراکین کی کل تعداد ۱۵۶ تھی جن میں سے ۶۰ نمائندے
امرا کے تھے۔ اور باقی عوام کے جو مختلف صوبوں سے منتخب ہو کر آئے تھے۔ اس طرح بادشاہ عوام
کے نمایندوں کے مشوروں کا پابند ہو گیا۔ شاہی مسند کے لئے یہ تمام پابندیاں پیدا کر کے مظفرالدین
راہئ ملک عدم ہوا۔ اور اس کا بیٹا محمد علی بادشاہ ہوا۔

محمد علی شاہ کے زمانے میں ملک میں بہت بد امنی رہی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ یہ آدمی
ذرا غیور تھا۔ کسی کا پابند ہو کر رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ جب وہ بادشاہ ہوا تو اس نے اپنے آپ کو مختلف
قسم کی پابندیوں میں جکڑا پایا۔ اس نے ان پابندیوں کو دور کرنے کے لئے مختلف تدبیریں کیں۔
مثلاً اس نے سب سے پہلے مجلس میں شاہی حقوق کا مسئلہ پیش کیا۔ وہ کہتا تھا کہ بادشاہ کو مجلس کے
مشورے کا بالکل پابند نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کو کم از کم اتنی آزادی ضرور ملنا چاہیئے کہ اگر وہ کسی موقعہ
پر کسی وجہ سے مجلس کے مشورے پر عمل کرنا نہ چاہے یا اس مشورے کو برا سمجھے تو وہ اپنے اختیارات
سے کام لے سکے۔ جب مجلس میں اس کے ان مطالبات کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ تو اس نے عوام میں اپنا اثر
قائم کرنا چاہا۔ مگر عوام مجلس کے اثر کو قبول کر چکے تھے۔ انھوں نے اس کی ایک نہ سنی۔ لے دے کے
صرف عدالتی پارٹی نے اس کا ساتھ دیا۔ یہ پارٹی بہت مختصر تھی جس سے اس کا کام چلتا نظر نہ آتا تھا
چنانچہ اس کو کسی اور رفیق کی تلاش ہوئی۔ اور جب ہر طرف سے ناامیدی ہو گئی تو اس کی نظر روس اور
برطانیہ پر پڑی۔ یہ دونوں تو چاہتے ہی تھے کہ کسی نہ کسی طرح ہم ایران کی سیاست پر حاوی ہو جائیں

چنانچہ دونوں طرف سے بادشاہ کو بیں یں کرنے کی کوشش ہوئی اور روس کامیاب ہوا۔ بادشاہ کو روس ایک ایسا رفیق ملا جیسا وہ چاہتا تھا۔ اور روس نے بھی یہ دوستی آخری وقت تک نباہی۔

بادشاہ مجلس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اس نے یہ سوچا کہ مجلس کی عمارت کو گرادیا جائے اور اراکین کو منتشر کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک موقع پر اس نے عدالتی پارٹی کا جلسہ عام کیا جس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ عدالتی پارٹی کے لیڈروں نے مجمع میں اپنی تقریروں کے ذریعے بہت جوش پیدا کر دیا۔ اور انھوں نے چند روسی سپاہیوں کے ساتھ مجلس کو بہت نقصان پہنچایا مگر عمارت کو گرا نہ سکے۔ مجلس کے اراکین نے شہر کی جامع مسجد میں عام جلسہ کیا جس میں بادشاہ کی اس حرکت پر بہت ناراضگی کا اظہار کیا گیا اور بادشاہ کو یہ عہد کرنا پڑا کہ وہ مجلس کا مطیع ہوکر رہے گا مگر اس واقعہ سے اس کی خودداری کو ٹھیس لگی اور اسی ہفتے کے اندر اندر اس نے طہران چھوڑ دیا اور شہر کے باہر روسی حفاظت میں ایک باغ میں قیام کیا۔ یہاں اس نے ایران پر قابو پانے کی انتہائی کوشش کی۔ ایک دن تار وغیرہ کٹوا دئے گئے تاکہ طہران کی خبریں دوسرے صوبوں تک نہ پہنچ سکیں اور روسی مدد سے طہران کا محاصرہ کر لیا۔ اراکین مجلس نے اپنے آپ کو بالکل بے بس پاکر صلح کا پیغام بھیجا اور مطمئن ہوکر بیٹھ رہے۔ دوسری صبح کو تڑکے، شاہی فوج کے ایک ہزار سپاہی شہر میں داخل ہوئے اور مجلس کی عمارت کو آگ لگا دی اور اراکین مجلس کو گرفتار کر لیا گیا۔ جن میں سے بعض کو جلاوطن کر دیا گیا۔ بعض کو قید خانہ نصیب ہوا اور بعض پوشیدہ طریقے سے قتل بھی کرائے گئے۔ اس طرح پھر ایک دفعہ استبدادی حکومت قائم ہوگئی اور اس کا سلسلہ تقریباً ایک برس تک رہا۔ مختلف صوبوں میں بغاوتیں ہوئیں جن کو روسی مدد سے فرد کرنے کی کوشش کی گئی۔ کاسک بریگیڈ اس زمانے میں بادشاہ کی طرف تھا۔ اس سے بہت کام لیا گیا۔ اول اول تو قومیت پسند اپنے اپنے صوبوں میں لڑتے رہے پھر ان کی فوجیں مل گئیں اور انھوں نے طہران پر حملہ کیا۔ ۱۲ جولائی ۱۹۰۹ء کو بختیاری اور قومی فوج طہران میں داخل ہوگئی اور کاسک بریگیڈ نے ہتھیار ڈال دئے۔

ان تمام واقعات کے بعد بھی بادشاہ نے ہمت نہ ہاری وہ روسی پناہ میں چلا گیا اور کوشش کرتا رہا کہ ایران کو فتح کرلے چنانچہ روسی مدد سے اس نے پھر حملہ کیا۔ اول اول تو کاسک بریگیڈ جو اب قوم کے ساتھ تھا پیچھے ہٹتا چلا آیا۔ مگر ایک مقام پر اس نے جان لڑا کر مقابلہ کیا اور بادشاہ کو شکست دی۔ یہ بادشاہ کی آخری کوشش تھی۔ اس کے بعد وہ معزول کر دیا گیا اور اس کے لڑکے احمد شاہ کو جس کی عمر ۱۲ سال کی تھی بادشاہ بنا یا گیا اور حکومت صحیح معنوں میں مجلس کے ہاتھ میں آگئی۔

ابھی تک خانہ جنگی کی وجہ سے مجلس پورے طور پر اصلاحات عمل میں نہ لا سکی تھی۔ اب اس کو بالکل آزادانہ موقع ملا۔ اور اس نے ملک کی بہتری کے لئے کام کرنا شروع کیا۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ شاہی فضول خرچیوں کی وجہ سے عوام پر ٹیکسوں کی بھرمار تھی۔ مجلس نے مالیات کے محکمے کو چلانے کے لئے امریکہ سے مدد لی اور وہاں سے شسٹر چند مددگاروں کے ساتھ اسی کام کے لئے آئے۔ مسٹر شسٹر بہت ہی مخلص آدمی تھے۔ آپ نے آتے ہی عوام پر سے بے جا ٹیکسوں کو ہٹایا اور امراء پر جائز ٹیکس لگائے۔ امراء کا طبقہ ایسا تھا جس نے تقریباً ایک صدی سے کبھی ٹیکس کا نام بھی نہ سنا تھا۔ یکایک یہ حالت دیکھ کر وہ بدکا۔ دوسری طرف مسٹر شسٹر نے غیر ملکی تاجروں پر ٹیکس لگائے تاکہ ایرانی تجارت کو فروغ ہو۔ مگر روس اور برطانیہ یہ ٹیکس گوارا نہ کر سکے اور ان ٹیکسوں سے بچنے کے لئے کوشش کرنے لگے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ مسٹر شسٹر کو ایران سے نکالا جائے اور یہ کام اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا تھا جب تک مجلس میں اکثریت نہ حاصل کی جاتی۔ چنانچہ مجلس کے دوسرے سیشن میں ان دونوں بیرونی حکومتوں اور ایران کے امراء نے مل کر مجلس میں اکثریت حاصل کر لی شسٹر کو نکال باہر کیا۔ اور پھر جو قانون جی میں آیا پاس کر دیا۔ ملک کی حالت پھر بدتر ہو گئی اور عوام مجلس سے بھی بدظن ہو گئے۔

اسی اثنا میں روس میں انقلاب ہوا جس کی وجہ سے ایران میں روسی زور کم ہو گیا۔ مگر اس انقلاب سے ایران نے بہت اثر لیا۔ خاص طور سے شمالی ایران میں اشتراکیت کا بہت زور شور سے پروپیگنڈا

کیا گیا۔ کاسک بریگیڈ میں بھی انقلاب ہوا جس کی وجہ سے کچھ بدامنی کا اندیشہ ہوا۔ اور رضا خاں کاسک بریگیڈ کے کمانڈر مقرر ہوئے۔ اس طرح ایک ایسی شخصیت کو عروج کا موقعہ ملا جس نے بعد میں آکر ایران کو ترقی کے موجودہ معراج پر پہنچا دیا۔

اس زمانے میں مجلس نے تیل کے چشموں کا اجارہ برطانیہ کی ایک کمپنی کو دے دیا جس سے ایران کو بہت سخت اقتصادی نقصان پہنچا اور عوام میں مجلس کا اعتبار جاتا رہا۔ ایران پر برطانیہ کا اثر غالب تھا۔ طہران میں ایک برطانوی فوج تھی اور ہر طرح کے تجارتی مراعات برطانیہ کو حاصل تھے۔

رضا خاں بیدار مغز آدمی تھا۔ وہ ایران کو کسی غیر قوم کے اثر میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ مجلس سے بھی خفا تھا اور رعایا سے بھی۔ مجلس سے اس لئے کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس نے مشکلوں کے ساتھ اور تکلیفیں برداشت کرکے جو اختیارات حاصل کئے تھے اب ان کو استعمال میں نہیں لاتی۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان ارا کین میں سب لوگ مخلص ہیں اور رعایا کا دل سے بھلا چاہنے والے ہیں۔ مگر لیڈر کی کمی ہے جو ان کو کام بتائے کہ اب یوں کرو اور اب یوں۔ وہ عوام سے اس لئے خفا تھا کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ مجلس کو پورے پورے اختیارات حاصل ہیں۔ وہ جو چاہے کر سکتی ہے۔ مگر وہ اسے کچھ کرنے پر مجبور نہیں کرتے تھے۔ ان تمام باتوں کی بنا پر اس نے ۵ر فروری ۱۹۲۱ء کو کاسک بریگیڈ کے ۲½ ہزار جوانوں کے ساتھ طہران پر حملہ کیا برطانوی فوج کے کمانڈر نے شہر سے باہر رضا خاں سے ملاقات کی اور بغیر کسی کشت و خون کے رضا خاں کی فوج شہر میں داخل ہوگئی اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد مجلس کی طرف سے رضا خاں وزیر جنگ مقرر ہوئے۔

وزیر جنگ ہوتے ہی رضا خاں نے ایران کی فوجی قوت بڑھانا شروع کی اور آذربائیجان کی ۱۹۲۳ء کی شورش میں ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ایران کے پاس ۴۰ ہزار مسلح اور تربیت یافتہ سپاہی موجود تھے۔ لیکن ایران کا وزیر اعظم سید ضیاء الدین، رضا خاں کی اس ترقی کو دیکھ کر بہت کڑھتا تھا اس نے کئی مرتبہ رضا خاں کو نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ مگر اسے کوئی موقعہ نہ ملا۔ اور آخرکار ایک

دن وہ خود ہی طہران چھوڑ کر چلا گیا جس سے مجلس کا منتخب شدہ کابینہ ٹوٹ گیا۔

اب رضا خان نے اپنا کابینہ مرتب کیا۔ مگر خود وزیر جنگ کا عہدہ ہی لیا۔ اس لیے کہ وہ عہدے وغیرہ حاصل کرنے کا خواہش مند نہ تھا۔ وہ ایران کی ترقی چاہتا تھا اور اپنا سب کچھ اس ایک مقصد میں صرف کر دینا چاہتا تھا۔ اسی سال ایک مشن امریکہ سے اس مقصد کے لئے بلایا گیا کہ وہ یہاں کی اقتصادی اور مالی حالت میں اصلاح کرے۔ اس کابینہ میں جو رضا خان نے مرتب کیا تھا جب وزیر اعظم کا کام کسی سے نہ سنبھالا جا سکا تو پھر اس نے خود ہی یہ عہدے لیا۔ اسی سال احمد شاہ قاچار، ایران سے چلا گیا اور اس نے پیرس میں رہائش اختیار کی۔ اس طرح قاچار خاندان کا ایران میں بالکل خاتمہ ہو گیا۔

۱۲ دسمبر ۱۹۲۵ء کو مجلس نے اعلان کیا کہ رضا خان کو ان کی خدمات کے صلے میں بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ اور ۲۶ اپریل ۱۹۲۶ء کو آپ کی تاج پوشی کا جشن منایا گیا۔ اس طرح رضا خان، رضا شاہ پہلوی بن گئے۔

بادشاہ ہوتے ہی رضا شاہ نے قوم کو آزادی کا وہ میٹھا پھل چکھانا شروع کیا۔ جو بہت ہی مصیبتوں اور دقتوں سے حاصل کیا گیا تھا۔ یعنی عوام کی ترقی کے لیے مختلف قسم کی اصلاحات کیں مثلاً تعلیم عام کر دی، ملک والوں میں دو بڑے مذہبی فرقے شیعہ اور سنی تھے۔ جن میں ہمیشہ لڑائیاں جھگڑے رہتے تھے۔ ان کو ختم کر دیا اور آمد و رفت کے لئے ریلوں کا انتظام کیا۔ ان سب کاموں سے بڑا کام یہ کیا کہ انھوں نے برطانوی اور روسی اثر کو ملک سے دور کیا اور اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایران بھی ایک ایسا ملک ہے جو آزاد ہے اور اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

نازیت کا پس منظر

(خواجہ احمد فاروقی، بی۔اے)

پچھلے زمانہ کا ایک قصہ مشہور ہے کہ سرد ملک کا ایک بڈھا برف گاڑی[1] میں بیٹھا ہوا، اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ جنگل میں جا رہا تھا۔ راستے میں ایک بھیڑیا ان کا پیچھا کرنے لگا بڈھے نے گھوڑے کے ہنٹر پر ہنٹر رسید کئے۔ اور آگے نکلنے کی کوشش کی لیکن بھیڑیا نزدیک سے نزدیک تر ہوتا گیا۔ بالآخر بڈھے نے کچھ کھانے کا سامان اس کے آگے ڈالا لیکن اس سے بھوکے بھیڑیے کی نیت نہیں بھری وہ اور بھی تیزی کے ساتھ پیچھا کرتا رہا اتنے میں گھوڑا ہانپنے لگا اور تھکن کی وجہ سے اس کی وہ تیز رفتاری بھی نہیں رہی۔ آخرکار وہ بھیڑیا، برف گاڑی کے اتنا قریب آگیا کہ بیوی اور بچے اس کی خونی آنکھوں کو دیکھ کر لرزنے لگے۔ انھیں یہ محسوس ہونے لگا کہ بس اب ایک لمحہ کے اندر وہ موت کے منھ میں ہوں گے بڈھے نے یہ دیکھ کر کہ اب گھر والوں کے بچاؤ کی کوئی صورت باقی نہیں رہی ایک جست کی اور اپنے آپ کو بھیڑیے کے سپرد کر دیا۔ بھیڑیا اس کے کھانے میں مصروف ہو گیا اور بچے محفوظ جگہ پہنچ گئے۔

اس بڈھے کو گذرے ہوئے زمانہ ہو گیا لیکن اس کے ایثار و قربانی کی مثال آج بھی روشن ہے۔ اس نے بیوی بچوں کی خاطر اپنی جان کی پرواہ نہیں کی اور گھر والوں کو حملہ کی زد سے بچا لیا۔ لیکن آج ہمیں تہذیب اور جمہوریت سرنگون نظر آتی ہے جب ہم یورپ کے میدان سیاست میں اس مثال کی صریح خلاف ورزی دیکھتے ہیں۔ اس وقت وہ ضعیف العمر اپنے آپ کو بچانے کی فکر میں ہے اور اپنی مدافعت کے لئے اس نے گھر والوں کو ایک ایک کر کے بھیڑے کے سپرد کرنا شروع کر دیا ہے۔ آج برطانیہ امن عالم کا ابوالآبا سمجھا جاتا ہے۔ اس نے نازیت کی تسکین اشتہا

---

[1] بغیر پہیوں کی گاڑی جس پر سوار ہو کر برف پر سفر کرتے ہیں۔

کے لئے مختلف دول یورپ کی قربانیاں پیش کیں لیکن ہٹلر کے جوع البقر میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوئی۔ اس کی بھوک بالکل اس خونخوار بھیڑیے کی طرح ہے جس کی معمولی قربانیوں سے سیری نہیں ہوتی۔ بلکہ اسی طرح اس کی ہمت بڑھ جاتی ہے اور اس کے حملہ کی شدت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ رائن، اسٹریا، زیکوسلوویکیا اور میمل ایک ایک کرکے اس قربان گاہ پر چڑھا دیئے گئے۔ لوکارنو، ورسیلز اور میونک کے مواثیق و معاہدات کی فضائے آسمانی میں دھجیاں اڑا دی گئیں لیکن پھر بھی امن عالم کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔

ایک جمہوریت پسند مفکر نے سیاسیات حاضرہ پر تقریر کرتے ہوئے بڑے مزہ کا فقرہ کہا تھا:۔

"اگر میرا بس چلے تو میں تمام نیلگوں آسمان پر جلی اور خونی حروف میں صرف ایک لفظ ——— نازیت ——— لکھ دوں"

اس میں شک نہیں کہ آج نازیت نے یورپ کے توازن ملکی کو برباد کرنے اور امن عالم کو معرض خطر میں ڈالنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ اس کی کتاب سیاست میں ایفائے وعدہ کوئی چیز نہیں۔ وہاں طریقہ کار کے بجائے نتیجہ سے بحث ہوتی ہے اور آغاز سے زیادہ انجام پر زور دیا جاتا ہے لیکن آخر یہ نازیت ہے کیا؟ جس کے طنطنہ اور دبدبہ کے آگے دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں نے سر عجز خم کر دیا ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر شکست خوردہ قوم اپنی ہار کے چودہ یا پندرہ سال کے زمانہ میں بہت زیادہ وطن پرست ہو جاتی ہے اور اسی بنا پر جرمنی میں بھی اشتراکیت قومی کا قیام ہوا۔ عام انگریزوں کے نزدیک ہٹلر کی عظیم الشان کامیابی کا راز صرف اس میں پوشیدہ ہے کہ اس نے جرمنی کی ان حسیات کو بیدار کرنا چاہا جو جنگ عظیم میں بری طرح پامال ہو چکی تھیں۔ اور جن کی تباہی اور بربادی کو آئین ورسیلز نے مکمل کر دیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ نازیت اس احساس کمتری کی پیداوار ہے جو تمام جرمن قوم پر ایک اعصابی مرض کی طرح مسلط تھا۔ گویا ان لوگوں کے نزدیک ہٹلرازم مجرزی کا ایک دوسرا نام ہے جو محض ایک عارضی اور ہنگامی چیز ہے۔

اس بحث میں اگر کچھ سچائی ہے تو صرف اتنی کہ اس سے ہمیں ہٹلر کی انتقامانہ ذہنیت اور معاندانہ انداز تقریر کا تھوڑا بہت نفسیاتی جواز مل جاتا ہے لیکن یہ تمام کی تمام حقیقت نہیں ہے ہٹلر کے مسلک اور تحریک کو ہنگامی کہنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس کی تمام تاریخی کڑیوں سے ناواقف ہیں بہت سے لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہٹلرازم ہاوسٹن اسٹورٹ[1] (Houston Stewart)اور گوبنیو[2] (Gobineau)کی تحریروں کا محض ہے اور بس لیکن یہ صحیح نہیں ہے جرمنی میں ان خیالات کو اس وقت نشوونما حاصل ہوئی جب فتح مندی و کامرانی بسمارک کی فوجوں کے قدم چوم رہی تھی۔ اور اسے ڈنمارک، اسٹریا، اور فرانس پر پورا تصرف حاصل ہوتا جا رہا تھا۔ اس وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نازی مسلک کسی شکست خوردگی یا کمتری کے احساس کی ہنگامی پیداوار نہیں ہے بلکہ اگر اس کے پس منظر کا صحیح مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ جرمنی کی تاریخی روایات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے ہنرش واں ٹرٹشک (Heinrich Von-Treitschke) کے نظریۂ ریاست اور مین کیمف' (Mein Kampf) کے خاص خاص اصولوں کو سامنے رکھیے اور دیکھئے کہ ان میں کس قدر حیرت انگیز تطابق اور مماثلت ہے۔ ہٹلر کی جہاد فرمائی یہود دشمنی، مطالبہ مستعمرات، اور پان جرمن ازم غرض اس کے تمام بڑے بڑے اصول سب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی جرمن پروفیسر سے مستعار ہیں۔ اس کے بعد آپ ہٹلر اور جرمن شہنشاہوں کی تقریروں کو سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ ان میں خیال کی کس قدر یکسانیت ہے۔ اس وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ نازیت ماضی کی تفسیر حال ہے۔

ٹرٹشک (Treitschke) ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۹۶ء میں انتقال کر گیا۔

---

(۱) و (۲) دو مصنفوں کے نام ہیں جن میں سے پہلا انگریز اور دوسرا فرانسیسی۔ یہ دونوں اپنے خیالات کی "نجونیت" کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ (غ۔ا۔ف)

اس نے آرنٹ اور ڈلمان (Dahlmann) کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا اور ۱۸۵۹ء میں اپنی مشہور کتاب "ریاست" تصنیف کی جس کو اس نے بعد میں اور بڑھایا اور حقیقت یہ ہے کہ اسی کی وجہ سے اس نے مستقل شہرت حاصل کرلی۔ ۱۸۷۴ء میں وہ برلن میں شعبہ تاریخ جدید کا صدر مقرر ہوگیا اور مرتے وقت تک اس عہدہ پر فائز رہا۔ وہ اپنی زندگی ہی میں سروش غیبی سمجھا جانے لگا تھا۔ اور مرنے کے بعد تو اس کی شہرت میں اور چار چاند لگ گئے۔ جنگ عظیم کے قبل تک لوگ اس "ارسطوئے ثانی" کے نام کو آنکھوں سے لگاتے تھے۔

ٹرٹشک نے اپنا نظریۂ ریاست حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے :۔

"ریاست، طاقت کا دوسرا نام ہے۔ اور اس کا اولین فرض جنگ کرنا ہے بغیر جنگ کے کسی ریاست کا تصور نا ممکن ہے .... فرد کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اسی اپنی خودی کو ایک بڑے کل میں جذب کردینا چاہیئے۔ خیر عمومی کے آگے خیر انفرادی بالکل بے معنی شے ہے۔ اگر اس نکتہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا جائے تو پھر جنگ کی عظمت بھی آسانی سے سمجھ میں آجائے گی ...... جنگ سیاسی تصوریت کا اقتضا ہے۔ مادیت اسی سے برسرپیکار رہی لیکن سب سے زیادہ قابل ملامت اخلاق کی وہ کجروی اور کمزوری ہے جو انسانیت سے شجاعت ہی ختم کردینا چاہتی ہے۔"

اس کے مقابلہ پر ہٹلر کہتا ہے، "کسی حکومت کو اپنے ارادہ اور منشا کو دوسری حکومت کے ساتھ وابستہ نہیں کردینا چاہیئے۔ اس کا جب جی چاہے لڑائی کرے اور جب جی چاہے پچھلے معاہدوں کو منسوخ کردے۔"

صلح نامۂ ورسلیز کے متعلق ہٹلر کے یہ الفاظ بہت مشہور ہیں کہ "اس کی حیثیت "لوح مزار" سے زیادہ نہیں ہے" اسی طریقہ سے وہ دوسری حکومتوں کے مابین کسی ایسے معاہدہ کو "جس کا مقصد لڑائی کرنا نہیں ہے" کوئی وقعت نہیں دیتا۔ جمہوریت پرستوں کو وہ "پارلیمانی دوافروشوں"

سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "اگر ان کے اور ہمارے درمیان کوئی معاہدہ ہوگا تو وہ صرف حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہوگا اور اس سے زیادہ کچھ نہیں"

ہٹلر طاقت اور قوت پر پورا بھروسہ رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ آفرینشِ آدم سے لے کر اس وقت تک قوت ہی نے حکومت کی ہے اور یہی چیز "نئے زمین و آسمان" کی "تخلیق" میں مددگار ہو سکتی ہے۔ اسی طرح وہ قوت اور طاقت کے ساتھ ساتھ تعصب اور تشدد کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔

ہٹلر امتیاز نسل کے معاملہ میں بھی ٹرٹشکے سے بالکل متفق ہے۔ موخر الذکر اپنی مشہور کتاب میں لکھتا ہے کہ آریہ قوم بڑی خصوصیات کی حامل ہے۔ وہ تمام نسلوں سے زیادہ بہادر اور شجاع ہے اور اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر اس چیز کی تلوار سے حفاظت کرنے کے لئے آمادہ رہتی ہے جس کو وہ اپنی روحانی جد وجہد سے حاصل کرتی ہے۔ ہٹلر کے نزدیک نسل کی بقا ذاتی آزادی کے تحفظ سے زیادہ ضروری اور اس کی یہود دشمنی کا بھی ایک بڑا سبب یہی آریہ پرستی ہے۔

ٹرٹشکے نے ایک مرتبہ سامی نسل کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا تھا:۔

"اب آریہ لوگ روپیہ پیسے کا انتظام کرنے کے اہل ہو گئے ہیں اس لئے یہودیوں کی کوئی ضرورت نہیں...... اس کے علاوہ اس سامی نسل کی تمام خرابیاں منصہ شہود پر آ رہی ہیں اور اس طرح وہ ہمارے لئے روز بروز خطرہ کا سبب بن رہی ہے"

ہٹلر نے یہودیوں کی "ضرورت" قطعاً بھی تسلیم نہیں کی ہے، نازی جرمنی نے ان کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک برتا ہے اور جس طرح ان کی زندگیوں کو یکسر آہ اور کراہ بنا دیا ہے، وہ آج کسی سے پوشیدہ نہیں۔

ہٹلر عورتوں کے باب میں بھی ٹرٹشکے کا بالکل ہمنوا معلوم ہوتا ہے۔ برلن کے اس حکیم دماغی کے نزدیک بھی عورت کی زندگی صرف گھر اور بچہ سے متعلق ہونا چاہیئے اور ہٹلر بھی یہی سمجھتا ہے کہ عورت کا اہم ترین فریضہ تدبیر منزل سے باخبر ہونا ہے ٹرٹشکے اور ہٹلر دونوں اسی بات کے خواہاں ہیں کہ عورتوں کو ایک مضبوط قوم پیدا کرنا چاہیئے۔ آمر جرمنی کے نزدیک شادی کا "مقصد" نصف

انسان اور نصف یوزینہ قسم کے جانور" پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ ایک ایسی تندرست و توانا قوم پیدا کرنا ہے جو اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کے لحاظ سے اقوام عالم کو زیر و زبر کر سکتی ہو، وہ ایسی عورتیں نہیں چاہتا "جو نہ صحیح معنوں میں عورت ہیں اور نہ مرد بلکہ ایک تیسری جنس ہیں جس کو خود مرد کے اعمال نے پیدا کیا ہے"

ٹرٹشک نے ہٹلر پر جو احسان کیے ہیں اس کی فرد بہت طویل ہے۔ فوج کی شدید تابع داری کے معاملہ میں بھی جرمنی کا آمر ٹرٹشک کا خوشہ چین نظر آتا ہے۔ موخرالذکر کا خیال ہے کہ فوج اپنی کوئی منشا اور رائے نہیں رکھ سکتی۔ اس کو ریاست کے حاکم اعلیٰ کا اسی قدر فرمانبردار ہونا چاہیئے جس طرح ایک غلام آقا کا ہوتا ہے۔ ٹرٹشک نے ان خیالات کا اظہار ۱۸۹۲ء میں ایک لکچر کے سلسلہ میں کیا تھا۔ ہٹلر نے غالباً اسی اصول کے ماتحت جون ۱۹۳۴ء میں ان تمام لشکریوں کو نکال باہر کیا جو اختیارات کے طلب گار تھے۔ جنرل وان شلیشر (Von Schleicher) کا قتل اور بہت سے خاکی پوشوں کا ختم کیا جانا اسی قبیل کی چیز ہے۔

نازی جرمنی کا مطالبہ مستعمرات بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مطالبہ محض خام پیداوار کے حصول کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ ٹرٹشک کہتا ہے کہ اس مطالبہ کی نوعیت تاریخی، نفسیاتی، سیاسی، اور معاشیاتی ہے اور جس طرح بھی ہو" اس ضرورت کو پورا کرنا چاہیئے۔ ہٹلر کا بھی راسخ عقیدہ ہے کہ" ہماری کھوئی ہوئی نوآبادیاں پارلیمانی الفاظ سے نہیں بلکہ صرف چمکدار تلوار اور خوں ریز جنگ سے حاصل ہو سکتی ہیں"

ٹرٹشک نے لکھا ہے کہ آئندہ جرمنی کے بلند مرتبہ کا انحصار ان لوگوں کی تعداد کثیر پر ہوگا جو جرمن بولتے ہوں گے۔ نازی جرمنی بھی اس بات کا خواہش مند ہے کہ جرمن کلچر کو فروغ اور وسعت دی جائے۔ اور جہاں جہاں اس کے اثرات موجود ہوں، انھیں باقی رکھا جائے۔ وہ اسی بنا پر خود قراری (Self Determination) کے اصول کا بڑا علمبردار ہے۔ برازیل (Brazil) میں جرمن زبان، جرمن اخبارات، اور جرمن اسکولوں کو قائم رکھنے

کے لئے بڑی جدوجہد کی گئی ہے۔ اور یہی عمل سوئٹزرلینڈ اور ہالینڈ میں کیا گیا ہے لیکن اس کوشش کی سب سے زیادہ عملی صورت سوڈیٹن، موریویا، بوہیمیا، سائیلیسیا، ڈینزگ اور میمل میں نظر آتی ہے اس لئے کہ ان میں سے بہت سے علاقے آج جرمن ریشتاغ میں شامل ہو چکے ہیں۔

جرمنی کی موجودہ سیاست کا صحیح مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں اس کے ماضی سے بے خبر نہیں ہونا چاہیئے۔ نازیت سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور اس کے ماضی کی عملی تفسیر۔ جو لوگ اس کی بنیادیں حال اور صرف حال ہی کی ہنگامی فضا میں تلاش کرتے ہیں وہ حقیقتاً ایک بڑی تاریخی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ہمیں نازیت کی صحیح تشریح کے لئے جرمنی کی پرشین پالیسی، بسمارک کی تمناؤں اور جرمن شہنشاہوں کی سنہ ۱۸۷۰ء، سنہ ۱۹۰۰ء اور سنہ ۱۹۱۲ء کی حکمت عملیوں کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے اور سب سے زیادہ توجہ ہمیں ان ذہنی پیشواؤں کی طرف مبذول کرنا چاہیئے جن کے خیالات نے جرمنی کو موجودہ قالب میں ڈھال دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس تاریخی روشنی میں نازیت کی جو شکل مرتب ہوگی وہ بہت زیادہ کریہہ المنظر اور ہیبتناک معلوم ہوگی لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ اسی کی کارفرمائی ہے کہ آج اس نے جرمنی کو یورپ کی سب سے بڑی قوت بنا دیا ہے اور اتنے وسیع[1] رقبہ پر حکومت عطا کی ہے جو اسے ولیم ثانی کے زمانہ میں بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ آج اس کی عسکری قوت روس سے بھی زیادہ ہے اور ہوائی طاقت فرانس اور انگلستان دونوں سے بہتر ہے، تجارت کے میدان میں بھی جرمن مسابقت بڑی اہمیت حاصل کرتی جارہی ہے اور اس کے معاشی وسائل میں معتدبہ اضافہ ہوگیا ہے۔

---

[1] قیصر ولیم ثانی کے زمانہ میں جرمنی کا رقبہ ۲۰۸۸۰۰ مربع میل تھا اور آج زیکوسلواکیا شامل ہو جانے کے بعد اس کا رقبہ ۲۲۴۴۵۹۴ مربع میل ہے۔ (خ۔ا۔ف)

پریوں کی کہانیاں

(۱)

"اگلے زمانے میں" میں نے کہنا شروع کیا۔ "بہت پرانے زمانے میں جب زندگی بالکل انگھڑ اور ناتراشیدہ تھی، جب تمدن کی بنا نہیں پڑی تھی اور کہیں کسی قسم کے کارخانے کا کسی کو بعید ی خیال بھی نہ ہوا تھا، لوگ خوش اور مطمئن تھے! کیونکہ حق و صداقت پر جستجو و تلاش کی گمراہیوں کے اتنے پردے نہ پڑ گئے تھے۔ اس لئے کہ وہ لوگ بصیر تھے فطرت عالم کو دیکھتے اور خدا کو پہچانتے تھے! ان کو یقین تھا کہ خدا اسی عالم ایجاد کے اندر ہے! آج کی طرح وہ اسے عرش نشین و کرسی مقام نہ سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ وہ ہواؤں کے اندر چلتا ہے، پانی کے اندر بہتا ہے، اور زندگی کا ہر مظہر، قطع نظر اس سے کہ وہ کیا ہے اور کہاں ہے، خدا کا مظہر ہے، خدا ہے! انھیں کامل یقین تھا کہ یہ عالم آب و گل ہی اس کی جلوہ گاہِ ناز ہے، کہ وہ بس ایک جلوہ ہی تو ہے، وہی تو جلوۂ حیات ہے! تمہاری، میری اور سب کی روحیں اسی کے جلوۂ نور کا ایک جزو ہیں۔

"میں کیا کوئی بھی نہیں بتا سکتا کہ کس طرح مگر انھوں نے اس حقیقت کو جان لیا تھا اور اس کا اعلان کر دیا تھا۔ ان کی باتیں سادہ تھیں اور ان کے خیالات غیر ملوث تھے! انھوں نے بتا دیا کہ چاند اور سورج کی چمک ان کی روح ہے، ہواؤں اور پانیوں کی قوت روانی ان کی روح ہے! یہ ان کا بس انداز بیان تھا: مطلب یہ تھا کہ کائنات میں کوئی شے روح سے خالی نہیں! انھوں نے ہر چیز میں زندگی کا احساس کیا تھا، کیونکہ یہ ایک صداقت تھی! ان کی کہانیاں اسی صداقت کے بیان اور تمثیلیں ہیں!"

حیرت زدہ دردانہ مجھے تکتی رہی۔

"تم اس کا احساس و یقین نہیں کرتیں؟" میں نے پوچھا۔ "اس تمام منظر نور و رنگینی کو دیکھو کہ وہ کس طرح ندی کے گیت کی سنگت بنا ہوا ہے! کیا تم اس سب کو مردہ کہہ سکتی ہو جو صفات و وجود کی تکمیل میں لگا ہوا اس ذات کو نمایاں کر رہا ہے؟"

"نہیں میں محسوس کر رہی ہوں!" اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

"ان لوگوں کے بعد ان سے بھی بڑے لوگ آئے؛ انھوں نے وحدت وجودی کو سمجھا۔" میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "اور انھوں نے بتایا کہ ہر شے میں روح ہے مگر وہ روحیں جداگانہ نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی روح ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے! وہ جو روشنی کے اندر ہے، جو ہواؤں کے اندر ہے، جو سبزہ و برگ کے اندر ہے، اور جو حیوان و انسان کے اندر ہے، ایک ہی شے ہے! ہر چند مظاہر لاتعداد ہیں مگر مظہر ایک ہی ہے: وہ آئینہ خانہ کی شمع ہے کہ ہر چھوٹے بڑے صاف اور دھندلے شیشوں میں ضو انداز ہوتی ہے! اور وہ ذات واحد، وہ روح عالم، جس نے کائنات بنائی، اپنی اسی کائنات کے اندر سکونت رکھتا ہے، جس طرح تمہاری روح تمہارے اندر رہتی ہے:"

میں سانس لینے کو رکا تو دردانہ نے کہا۔

"کہے جاؤ:"

"یہ لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ روح، یہ خدا، محبت ہے —— محبت جو لازوال ہے! محبت کا وہ شمہ بھی جسے انسان محسوس کرے خدا ہے اور باقی ہے! اور وہ اپنے لباس کو اپنے نئے موزوں و خوب صورت بناتا رہتا ہے! ہماری روحیں نور الٰہی کا جزو ہیں اور یہ سب کائنات بھی اسی نور کا جلوہ ہے —— اور اس لئے کہ اس کا جلوہ فنا نہیں ہو سکتا یہ دنیا ہمیشہ کے لئے ہے اور ہماری دنیا ہے:"

"تو پھر دنیا نے اتنی بین اور حیرت ناک حقیقت کو کیوں نظر انداز کر دیا؟" دردانہ نے سمجھا اور سوال کیا۔

"فطرت کے پیامیوں نے اسی صداقت واحدہ کو دنیا پر ظاہر کیا تھا۔ مگر ان کے بعد مذہب ذریعہ معاش بن گیا اور ان پیشہ ور مذہبوں نے اس حقیقت پر پردہ ڈالا تاکہ ان کا اپنا تفوق قائم رہے: انھوں نے اس کی حقیقت کو نہ سمجھا، نہ مانا، اور مٹایا۔"

"تو کیا صداقت مٹائی بھی جا سکتی ہے؟" دردانہ نے سوال کیا۔

"نہیں صداقت باوجود اپنے مخالفوں کے مٹائی نہیں جا سکتی: وہ ہر ایسی کوشش کے بعد تازہ دم اور زیادہ آب و تاب کے ساتھ رونما ہوتی رہی ہے! جب اور جہاں اس پر خاک ڈالی گئی ہے، تب اور وہیں شدید قوت و تجلی کے ساتھ جلوہ فگن ہوئی ہے اور وہ مٹی نہیر ایک قلیل وقفے کے لیے دھندلی کر دی جائے۔ سلا دی جائے، مگر وہ پھر تابندہ و بیدار ہو جاتی ہے!"

"میرے صاحب! میں اس روشنی کے لیے بہت ممنون ہوں! مگر میرا دماغ اب بالکل تھک گیا ہے!" یہ کہہ کر دردانہ نے آنکھیں بند کر لیں اور سو گئی۔ اس کے دل کی تڑپ کو میں نے اپنے دل کے اندر محسوس کیا اور اس کی تابش میرے اندر سرایت کر گئی!

میں نہیں سویا: میرے دماغ میں خیالات کا ہجوم تھا۔ اس صداقت کے خیالات کا جو اتنی بین اور اتنی سادہ ہے! انسان کی حماقت آبیوں کے خیالات کا! مذہبی پیشوا اس کو مستور و مدفون کرتے ہیں کہ فی المعنی خدا کی کرسی ان کو مل جائے! اس بے ایمانی کے خیالات سب مجھے حیرت میں ڈال رہے تھے!

میں سوچ رہا تھا کہ سائنس داں بھی اسی کوشش میں رہے ہیں۔ اس کا سبب! میں نہیں جانتا۔ شاید بے بصیرت ہونے کے باعث! لیکن وہ اگر اپنے علم کی واقعیت کا احساس کر سکتے ہیں تو ان پر اس حقیقت کو بھی ضرور منکشف ہونا چاہیے، ورنہ ان کے نظریے غور و فکر کا نتیجہ نہیں محض اتفاقی امور ہیں؟ عالم کے ارتقا کا ایک نظام مرتب کیا جاتا ہے جو اپنی تفصیلات میں کم و بیش درست ہے۔ لیکن اس کے ماننے اور منوانے والے نہیں دیکھتے کہ اثبات

ارتقائے عالم کے لئے جو استدلال وہ پیش کرتے ہیں وہی دلائل و براہین اس بات کو بھی ثابت کر رہے ہیں کہ اشیائے عالم کے اندر ایک اور تنہا روح جاری و ساری ہے" ! ایک مقصد کی تکمیل کی طرف حرکت پیہم" اس کا نام ارتقاء ہے! کیا یہ کام محض توانائی کا انجام دے سکتی ہے؟ توانائی کا عمل اور ردعمل تو مساوی و یکساں ہے : توانائی کا قانون بس یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو پھیلائے اور منتشر کرے، تاکہ جہاں نہ حرارت ہے نہ برودت نہ نور ہے نہ ظلمت، جہاں کچھ بھی نہیں، وہاں اعتدال پیدا ہو جائے۔ لیکن وہ قوت جو اس بات کی جانچ پڑتال کرتی ہے جو ترازو کا پاسنگ دیکھتی ہے، اور توانائی کی کرر ترکیز کرتی ہے، وہ حیات ہے ! یہ کام حیات کے سوا کوئی دوسری قوت انجام نہیں دے سکتی۔ پھر اگر ناقابل شمار قرنوں کے بعد بھی آفتاب روشن ہے، پانی بہ رہا ہے، ہوائیں چل رہی ہیں، تو اس کی علت غائی کیا ہے؟ وہ حیات ہے! چنانچہ اس سے بڑی صداقت کوئی نہیں ہو سکتی کہ کسی نامعلوم طریق پر حیات اشیائے عالم میں جاری و ساری ہے، ان کے اندر مکین ہے : اسی سے کائنات کی تخلیق ہوئی اور وہی ان کو قائم رکھتی ہے۔

یہ علمائے سائنس اتنے خفاش چشم کیوں ہیں کہ وہ خود اپنے نظریوں کے ناقابل بطلان نتائج کو نہیں دیکھ سکتے ؟ وہ کیوں نہیں سمجھ سکتے کہ پرانے قصے، پریوں کی کہانیاں ہفوات نہیں بلکہ صداقتوں کی صداقت ہیں ؟

پیشوایان مذہب اور سائنسداں اس بارے میں دونوں برابر ہیں۔ وہ سامنے کی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے ؛ اپنی بند آنکھوں کو کھولنے کی جرأت اس لئے نہیں کر سکتے کہ وہ چوندھیا جائے گی ! مذہبی پیشوا تو خدا کو غائب کر دیتے ہیں، اور علمائے سائنس اس کا انکار کر دیتے ہیں؛ لیکن خدا اسی عالم میں ہے، وہ کائنات کی روح ہے اور اشیا اس کا جسم ہیں جو موت کے عمل سے ہمیشہ درست یا جوان رہتا ہے ۔۔۔ یہاں تک کہ تکمیل بعید کا خواب پورا ہو ! یعنی اس دنیا میں زندگی خدا ہے اور خدا غیر متغیر محبت !

دوسری قوموں کی طرح قدیم یونانیوں نے بھی، اس سے قبل کہ وہ بصیرت سے محروم ہوں، اس حقیقت کی جھلک دیکھی تھی اور اسے بڑی خوبی سے بیان بھی کر گئے ہیں۔ مگر آج ان کے اساطیر کو کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ کیونکہ خود ہم میں سے وہ صداقت مفقود ہے جو ان اساطیر کے اندر چھپی ہوئی صداقت کی گونج ہو سکے! بایں ہمہ یہ تمثیل غور طلب ہے:-

ٹیٹینس (Titans) اوشینس (Oceanus) اور ٹی تھیز (Tithys) یعنی خالص عنصری قوتیں سمندر پر حکمراں تھیں مگر الٰہ البحر نپچون (Naptune) اور الہتہ البحر ایمفی ٹرائٹ (Amphitrile) نے ان کو فتح کیا تو سمندر میں ایک روح دوڑ گئی، تحت بحر میں دیکھنے والا آج بھی دیکھ سکتا ہے، جس کی آنکھوں میں نور ہے اور کان گنگ نہیں، اب بھی دیکھ اور سن سکتا ہے کہ:-

"اے خدائے بزرگ و برتر! میں کسی فرسودہ مذہب کی پیروی میں ریاکارانہ و بے خلوص نماز یا پوجا نہ کروں گا! میں منکر کہلایا جا کر بالائے کوہ اور سر ساحل تیرے وہ جلوے دیکھتے رہنا چاہتا ہوں جو مجھے اس وسیع کائنات میں اپنی بے بسی بھلا دیتے ہیں!"

کوہ و دریا و غروب آفتاب　　　　من خدا را دیدم آنجا بے حجاب!

(۲)

"موت فی الواقع ہولناک ہے!" میں نے تائیذ اکہا: "یہ خیال کہ آگے پیچھے یہ سب خوبصورت پرندکسی نہ کسی طریق پر فنا ہو جائیں گے، سخت دلدوز خیال ہے! اور ہر چیز ـــ ہم سب بھی باقی نہ رہیں گے!"

"ہاں، ہم ـــ ہم سب بھی!" دردانہ نے دوہرایا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہو گئے: "ہر چیز فنا ہو جاتی ہے؟ موت کا وجود کیوں ہے؟ ہم سب کیوں نہیں جیتے؟"

ایسا معلوم ہوا کہ آفتاب کی پر مسرت تجلیوں میں یک بیک تاریکی داخل ہو گئی ہے،

اس کی زندگی کی آب حرارت میں دفعتاً ٹھر شامل ہو گئی ہے۔ ایک خوف نے دن کی شان و تجل کو ناقص کر دیا ہے۔

"تم اس کی کیا توجیہ کرتے ہو؟" اس نے اپنے شوہر کو مخاطب کیا۔ "اس کی تفریح میں کوئی پریوں کی کہانی نہیں!"

"پریوں کی کہانی؟" میں نے متحیرانہ دہرایا۔

"جی ہاں، یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کی تمام گتھیاں اب سے مدتوں پہلے پریوں کی کہانیوں میں سلجھا دی گئی ہیں،" دردانہ نے بتایا۔ "اور دنیا اب اگر پھر ان معموں میں الجھی ہوئی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ دنیا نے حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور اس لئے نہ تو وہ ان کہانیوں کی تاویلوں کو سمجھ سکتی ہے اور نہ ان کے حل کو نئی تمثیلات کے اندر بیان کر سکتی ہے۔"

میں نے جمالی کی طرف دیکھا۔ اس نے گردن کے اشارے سے اعتراف کیا۔

"اس راز کی بھی کہ موت کیا ہے اور کیوں ہے توجیہہ کی جا چکی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں!" جمالی نے جواب دیا۔

"تو وہ کہانی ضرور سناؤ!" میں نے اپنی خواہش ظاہر کی۔

"جمالی کچھ پس و پیش کرتا نظر آیا۔

"اپنے شوہر سے کہو کہ وہ کہانی ضرور سنائیں۔" میں نے دردانہ سے ہنس کر کہا۔

اس نے جمالی کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔ وہ بھی جواب میں ہنسا۔

"بہت اچھا۔ مگر شرط یہ ہے کہ دخل نہ دینا!" جمالی نے کہا۔

جمالی کے حکم کی تعمیل میں ملاح نے شکاری کو سایہ دار کنارے پر کھڑا کر دیا جہاں شلنیں ہمارا منہ چوم رہی تھیں اور ہوا خاموش تھی۔

"مجھے امید ہے کہ کہانی غم انجام نہ ہوگی۔" میں نے اپنی آرزو کا اظہار کیا۔

"پریوں کی کہانیاں کبھی المناک نہیں ہوتیں، کیونکہ حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں!" جمالی نے جواب میں کہا" وہ حقیقت جو غیر متبدل ہے۔ مگر متغیر شکلوں کے اندر مستور رہتی ہے ہمیشہ حسین و پرمسرت ہے!"

"موت کی حقیقت بھی!" میں نے سوال کیا۔

"جی، موت کی حقیقت خاص طور پر ہے!" جمالی نے جواب دیا۔

"ٹھتونس (Tithonus) کو معبودۂ سحر (Dawn) کے ساتھ محبت تھی" جمالی نے کہنا شروع کیا۔ اس کے چہرے سے کمال مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"ٹھتونس کون تھا؟" دردانہ نے سوال کیا۔

"ہر انسان ٹھتونس تھا، ہے، اور ہوگا —— سب مرد عورت اور عورتیں، تم اور میں ٹھتونس ہیں!"

"اسے نمودِ سحر (Dawn) سے محبت کیوں تھی؟" میں نے پوچھا۔

"کیا تمہیں نمودِ سحر سے عشق نہیں؟ صبح استعارہ ہے اشیاء کے اٹھان سے، اس کے ریعان سے جب ہر چیز کمال دلکش ہوتی ہے۔ ہمارا عنفوانِ شباب بھی نمودِ سحر ہے کہ اس وقت کائنات زیادہ حیرت ناک اور امید و آرزو کی ترقی پذیر روشنی سے منور ہوتی ہے! صبح کی روشنی میں ہم ہر چیز کو دیکھ لیتے ہیں، وہ صبح حیات ہے، گلزار بہاراں ہے، کلیوں کی لب کشائی ہے، بیدار محبت طائروں کی پہلی الاپ ہے! نمودِ سحر کی انگلیاں گلاب رنگ ہیں، وہ جس کو چھو لیتی ہیں جوانی کے رنگ سے رنگ جاتا ہے!" وہ چپ ہو گیا۔ اس کے الفاظ سے پیدا شدہ خیالات نے میرے دل اور روح کو چھا لیا۔ "ٹھتونس موت سے ڈرتا تھا —— تم اور میں ٹھتونس ہیں!" وہ پھر خموش ہو گیا اور سکوت و خوف کو جو اس کے الفاظ سے پیدا ہو گئے تھے اپنی کہانی کہنے کے لیے چھوڑ دیا۔

پانی کی ہلکی لہریں جو کشتی پر آجانا چاہتی تھیں خموش ہو گئیں۔ گہرے اور سنہرے سکوت میں

کوئی آواز مخل نہ تھی جماکی کے الفاظ یا ان کا اثر اس سکوت پہ چھا گیا۔

"ٹتھونس نے نمودِ سحر سے آرزو کی کہ اس کو غیر فانی بنا دے۔ ٹتھونس تم ہو، میں ہوں اس نے جو مانگا وہ مل گیا: اب وہ مر نہ سکتا تھا۔ مگر بوڑھا ہوتا جا رہا تھا —— اسی طرح ہم سب بوڑھے ہو جائیں گے۔ مگر نمودِ سحر ہمیشہ نوجوان ہے: ظلمات موت کے عمل سے ہر صبح تازہ و شاداب جلوہ گر ہوتی تھی: نمودِ سحر کو موت کا خطرہ نہیں؛ موت کو علم ہے کہ سحر غروب آفتاب اور رات کی تاریکی کے اندر سے ہر روز نیا ریعان لے کر نمودار ہوتی ہے —— کہ اصل میں موت و حیات ایک ہی ہیں!"

ٹتھونس کا کیا حشر ہوا؟" دردانہ نے سوال کیا۔

"وہ اتنا ضعیف ہو گیا کہ موت کی آرزو کرنے لگا۔ اگرچہ وہ امر ہو چکا تھا مگر اب زندگی سے عاجز تھا اس نے سحر سے پھر التجا کی کہ اسے موت یعنی دائمی شباب مل جائے، کیونکہ اس کا غیر فانی ہونا اب اجیرن ہو رہا تھا؛ اگر ہم تم غیر فانی بنا دیئے جائیں تو یہی حالت ہو گی —— نمودِ سحر ایک غیر فانی مخلوق کو موت نہیں دے سکتی۔ اس لئے اس نے ٹتھونس کو ٹڈے کا چولا دے دیا۔ اب وہ صبح کے وقت سحر کے گیت گاتا رہتا ہے: وہ اب بقائے دوام کی آواز ہے جو سحر کے حضور مناجات گاتی رہتی ہے موت باب الحیات ہے تنہا دروازہ ہے! اور یہی مناجاتِ سحر ہی!"

"اور موت کی مناجات کیا ہے؟" دردانہ نے سوال کیا۔

"موت کی مناجات بھی وہی ہے —— یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں!" اس نے جواب دیا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"کہانی تھی سو ہو چکی! اب آپ اور کیا سننا چاہتی ہیں؟" وہ کہنے لگا۔

"کچھ نہیں!" میں نے جواب دیا۔

شام ہوتے ہم لوگ واپس ہوئے سورج اپنی شانوں کے ساتھ غروب ہو چکا اور دن کا بادشاہی دربار ختم تھا۔

جمالی، اور درد ا نہ صبح ہوتے رخصت ہوئے اور اپنی ناؤ پہ چلے گئے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ وہ ہمارے مہمان ہوئے اور ان سے مکرر ملنے کا اشتیاق ہے۔ تاکہ ان کی شادی کا انجام معلوم کرسکوں میرا خیال ہے کہ نتیجہ اگر اچھا ہوا تو بہت اچھا ہوگا اور برا ہوا تو نہایت برا؛ یہ دونوں اتنے توانا اتنے جذباتی اور اتنے فطری ہیں کہ دونوں میں ایک بھی ادھوری شادی کو منظور نہ کرے گا — اور نیم شادی منجملہ اور رواجوں کے ایک عام رواج ہے۔ دونوں میں سے ہر ایک بجائے خود کل کا طالب ہوگا یا پھر بالکل کچھ نہ لے گا؛ یا تو دونوں کو ایک روحی وحدت ہونا چاہیئے یا پھر وہ جدا ہوجائیں گے؛ یہ مجھ پہ اچھی طرح واضح ہوگیا ہے؛ مگر دونوں میں کون سی صورت وقوع پذیر ہوتی ہے، مجھے اس کی تلاش ہے؛

صبح یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار

(اقبال)

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

آدمی پر طاقت اور جثے کا خواہ مخواہ اثر پڑتا ہے۔ چونکہ پہلوان سمجھے جانے کا اتنے ہی فائدے ہیں
تنے پہلوان ہونے میں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں کشتی لڑنے والے پہلوان ہوتے ہیں وہاں ایک قسم ایسے
ہ والوں کی بھی ہوتی ہے جو دنگل سے بچنے میں گھر گھی شکر دودھ میدہ کھا کھا کر ایسی صورت شکل بنا لیتے ہیں
انھیں چیلنج دینے کی کسی کو ہمت ہی نہیں ہوتی اور مصلحت انھیں ایسے گر سکھا دیتی ہے کہ وہ داؤں پیچ کریں
کریں جیت انھیں کی رہتی ہے۔

یورپ والوں کی نظر میں امریکہ کی ریاست ہائے متحدہ اسی قسم کے پہلوانوں کی حیثیت رکھتی ہے فرق صرف
ہے کہ یورپ کی جمہوری ریاستیں امریکہ کی ہمدردی اور مدد کو اپنا خاص حق سمجھتے ہیں اور یورپی سیاست میں
فرقہ بندیاں ہوتی ہیں ان میں یہ چاہتی ہیں کہ امریکہ والے ان کے ساتھ مل کر اس کا پلہ بھاری کر دیں امریکہ
ے یہ نہیں مانتے کہ وہ دنیا میں اس لیے پیدا کئے ہیں کہ یورپی سیاست کی ترازو میں وزن بڑھانے کی ضرورت
اکر دیں اور جب یورپ کی جمہوری ریاستیں ان سے ملاقات بڑھانے کی کوشش کریں تو انھیں فوراً شبہ
ہوتا ہے کہ انھیں دھوکا دے کر ان سے کوئی کام نکالا جائے گا یہ شبہ سچا نہیں ہے اسی وجہ سے اسے دور کرنا بہت
ل ہے اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یورپ کی سیاست امریکہ میں نصب کرنے کا شوق اور امریکی سیاست یورپ
ا جھنجھلاہٹ پیدا کر دیتی ہے، لیکن سیاست میں مزاج کو غرض کا غلام بن کر رہنا پڑتا ہے اس لئے جب کبھی امریکہ
لے اپنی کسی غرض سے یا خالی اخلاقی جوش میں یورپ اور ایشیا کے جھگڑوں میں حصہ لینے پر آمادہ نظر آتے
ا تو یورپ کی جمہوری ریاستوں میں بڑی خوشی منائی جاتی ہے اور مشورے کی ہر مجلس میں امریکہ کے نمائندگی
لئے صدارت کی کرسی خالی کر دی جاتی ہے پچھلی جنگ عظیم میں پریذیڈنٹ ولسن کی جو عزت برطانیہ اور

فرانس میں کی گئی اس کا حال آپ جانتے ہوں گے مگر اس عزت افزائی کا نتیجہ جو نکلا وہ شاید آپ بھول گئے ہوں مگر امریکہ والوں کو وہ اچھی طرح یاد ہے اور اسی سبب سے وہ اب یورپی سیاست کی چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتے ہیں۔

پچھلے چار پانچ برس کے واقعات کچھ ایسے تھے کہ امریکہ والے چپ نہ رہ سکے تھے نیویارک کے Mayor اور مار دیا نے کبھی مسٹر کورڈل ہل اور کبھی خود پریذیڈنٹ روزولٹ نے کوئی ایسی بات کہہ دی کہ جس سے یورپ میں کوئی ٹھٹھا ہوا کسی کو امید ہوئی کہ امریکہ میں عام رائے یا حکومت کرنے والوں کو اپنی مصلحت امریکہ کو یورپ کے قریب لے آئے گی اور جمہوری حکومتوں کو ایک بڑا سہارا ملے گا لیکن سچ پوچھئے تو امریکہ کے لیڈروں نے پچھلے چار پانچ سال میں جو کچھ کہا اس کا تعلق یورپ کی سیاست سے نہیں تھا۔ بلکہ امریکہ کے اندرونی معاملات سے تھا اور یورپ کی سیاست میں تو امریکہ والوں نے قسم کھائی ہے کہ کبھی نہ لڑیں گے ان کے لئے مناسب بھی یہی ہے جرمنی ترقی کرے اور آدھے یورپ پر قبضہ کر بھی لے تو اس میں ان کا کوئی نقصان نہیں وہ اپنے الگ اور محفوظ بیٹھے رہیں گے تجارت کو دیکھئے کہ اس میں اب تک اس کا اصل مقابلہ جرمنی سے نہیں بلکہ انگلستان سے ہے وہ جانتے ہیں کہ اگر ایک طرف برطانیہ یورپی سیاست میں اس کا سہارا چاہتا ہے اس بنا پر کہ وہ آزاد اور جمہوری حکومت کا علم بردار ہے تو دوسری طرف جنوبی امریکہ کی تجارت میں وہ ان کی جڑ کاٹتا رہتا ہے اس لئے کہ امریکہ کے بعد دنیا کا سب سے بڑا سرمایہ دار ملک وہی ہے سیاست اور تجارت پر اخلاق اور مذہب کا رنگ چڑھانے میں خود امریکہ اتنا ہوشیار نہیں ہے جتنا کہ انگلستان والے ہیں اور اب جبکہ وہ ایک بار بڑی دھوم دھام سے بے وقوف بنائے جا چکے ہیں تو وہ اور بھی چوکنا ہو گئے ہیں انھیں اپنی آزادی بہت عزیز ہے لیکن وہ دوسروں کو اپنی طرح آزاد کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتے وہ جمہوریت کو حکومت کا سب سے اچھا طریقہ مانتے ہیں لیکن کبھی اگر یہ طریقہ چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے تو انھیں دکھ بھی نہیں ہوتا وہ اطمینان سے رہنا اور اپنا کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ایسے بھی نہیں ہیں کہ فسطائی حکومتوں کے تیور دیکھ کر ڈر جائیں اس لئے کہ ان کے اپنے ہاں ان حرفتوں کا خاصا رواج ہے جس کا الزام فسطائی حکومتوں پر لگایا جاتا ہے یعنی یورپ کی حالت خراب تو امریکہ والے افسوس کریں گے، وعظ کہیں گے، مگر سدھار کی تدبیریں سوچنا یورپ والوں ہی

پر چھوڑ دیں گے اور اگر خدانخواستہ لڑائی چھڑ گئی تو وہ یورپ والوں کو خود لڑ کر فیصلہ کر لینے دیں گے!

۱۶ اپریل کو پریذیڈنٹ روزولٹ کا ڈکٹیٹروں کے نام جو پیغام پہنچا اور ۲۸ کو ہر ہٹلر نے اس کا جواب دیا۔ اسے سمجھنے کے لئے ان باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے آپ کو پریذیڈنٹ روزولٹ کا پیغام پڑھتے ہی خیال ہوا ہوگا کہ انھوں نے ایک ایسے بزرگ کی زبان اور انداز میں گفتگو کی ہے جنھیں نصیحت کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے، جو تفصیلی معاملات میں الجھنا نہیں چاہتے بس اخلاق اور تہذیب کا نام روشن رکھنا چاہتے ہیں یہ انداز پریذیڈنٹ روزولٹ اس لئے اختیار کر سکتے ہیں کہ یہ ان کی قوم کا انداز ہے۔ لیکن ہر ہٹلر کی طرف سے نہیں بلکہ ایک غیر جانبدار کی طرف سے اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ جرمنی، اٹلی نے تہذیب کی جو خدمت کی ہے اس کا امریکہ والے بھی مدتوں تک مقابلہ نہ کر سکیں گے اور اگر آپ خوبیوں کے گننے کی جگہ عیبوں پر نظر کر کے انصاف کرنا مناسب سمجھتے ہوں تو اس لحاظ سے بھی آپ امریکہ والوں کو دوسروں سے بہتر نہ پائیں گے پریذیڈنٹ روزولٹ نصیحت صرف اس لئے کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں کہ ان کے ملک میں سرمایہ افراط سے ہے اور اسے کسی دشمن کا خوف نہیں۔ لیکن دنیا کی حالت ایسی ہے کہ خطرہ اچانک پیدا ہو جائے تو کچھ تعجب بھی نہیں۔ اس لئے امریکہ کے رہبر چاہتے ہیں کہ قوم کو بیدار رکھیں اور سامان جنگ میں روپیہ لگانے پر تیار کریں۔ یورپ میں اسی غرض کو پورا کرنے کے لئے بہت زیادہ کہنا پڑتا ہے امریکہ میں پریذیڈنٹ یا اس کے کسی سکریٹری کی تقریر ہو جاتی ہے۔

پریذیڈنٹ روزولٹ نے ڈکٹیٹروں کو کہا ہے کہ آپ حضرات تین چار آزاد قوموں کا خون کر چکے ہیں اور پندرہ بیس کو اسی طرح ڈرا رہے ہیں کہ ان کی جان نکلی جا رہی ہے، یورپ کی جمہوری ریاستوں میں یہی بات طرح طرح سے کہی جا رہی ہے، مسٹر روزولٹ سے بہت پہلے ڈکٹیٹروں کو اس کی دعوت دے چکی ہیں کہ گفتگو اور سمجھوتے کے ذریعے کام کو آسان بنائیں اور جنگ جیسی وحشیانہ چیز کا استعمال قطعاً نہ کریں۔ اسی وجہ سے ہر ہٹلر نے ۲۸ اپریل کو پریذیڈنٹ روزولٹ کے جواب میں کہا کہ انہیں پریذیڈنٹ روزولٹ کے اس خیال سے اتفاق نہیں کہ ہر جنگ دنیا کی تباہی کا سبب ہوگی۔ ہر لڑائی کا عالمگیر ہو جانا نہیں ہے، لیکن ہر لڑائی بے شک دنیا کو مبتلا کر دے گی اگر قومیں خواہ مخواہ ایک دوسرے سے معاہدہ کرتی رہیں اور اپنے

پر اسے سب کی سلامتی کا ذمہ اپنے اوپر لے لیں۔ یہاں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہر ہٹلر برطانیہ سے باتیں
کر رہے ہیں اگرچہ سخن اس کا امریکہ کی طرف ہے اور یہ بھی آپ سمجھ جائیں گے کہ برطانیہ سے یہ باتیں کیوں
کی جا رہی ہیں۔ ہر ہٹلر جواب دینے میں بڑے تیز ہیں اور اگر آپ جمہوری اخباروں سے اثر لے کر
پہلے ہی سے ان کی ہر بات کو غلط اور برا نہ سمجھ لیں۔ تو آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے ہر معاملہ میں اگر
اپنی صفائی نہیں کی ہے تو دوسروں پر اتنے الزام لگا دئے ہیں کہ کوئی برا کہنے یا برا بن کر نصیحت کرنے کا
حقدار نہیں رہتا۔ لیکن ان کی تقریر کا یہ حصہ اگرچہ بحث کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہے مگر اس میں کوئی نئی بات
نہیں۔ نئی بات انھوں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے
تک برطانیہ کا سامراج پھیلا ہوا ہے ویسے ہی جرمنی کو سامراج پھیلانے کا موقع دینا چاہئے۔ انگریزوں کا سامراج
ایک کارنامہ ہے اور ہر ہٹلر نے صاف کہا ہے کہ یہ سامراج اس بات کا ثبوت ہے کہ اینگلو سیکس قوم میں
دنیا کو آباد کرنے اور تہذیب کی روشنی کو پھیلانے کی بڑی صلاحیت ہے، جس کی وہ دل سے قدر کرتے ہیں،
لیکن ایک زمانہ تھا کہ جرمن سامراج دریائے رھائن سے بحر اسود Black sea تک اور بحر شمالی سے بحر روم
تک پھیلا ہوا تھا، یہ سامراج اپنی کمزوری کے سبب سے قائم نہ رہ سکا، اسی دوران میں جبکہ جرمنی اندرونی فساد
میں مبتلا تھا انگریز دنیا بھر میں پھیل گئے مگر اب جو جرمنی متحد اور طاقتور ہو گیا ہے تو اسے اپنے پرانے
سامراج کو اسی شان کے ساتھ قائم کرنے کا حق پھر سے ہو گیا ہے اور ہر ہٹلر کے نزدیک یہ بڑی بے
انصافی ہوگی کہ اسے اپنا حوصلہ پورا کرنے سے روکا جائے، یعنی جب ہر ہٹلر دل پر ہاتھ مار کر برطانیہ
سے کہتے ہیں کہ آپ کو دولت عزت اور سامراج مبارک ہو تو برطانیہ کو بھی ان سے کہنا چاہئے، کہ
آپ کو بھی آپ کی حکومت استبداد اور طاقت مبارک ہو اور خدا کرے اب ہمارا جیسا سامراج قائم
کر کے ہماری طرح نام پیدا کریں اور دنیا میں تہذیب کی رونق پھیلائیں، ہر ہٹلر کو بڑا دکھ ہے کہ برطانیہ
جتنی خوشی سے مبارک باد دینے کی جگہ پولینڈ، رومانیہ، اور روس سے معاہدہ کر رہا ہے اور اسی فکر میں ہے کہ جرمنی کے ہاتھ
پیر باندھ کر اس کے پڑوسیوں کے حوالے کر دے اسی دکھ میں انھوں نے اس معاہدہ کو جو ۳۵ء میں برطانیہ
سے کیا تھا چاک کر ڈالا ہے، مگر وہ اب بھی برطانیہ سے دوستی اور اتحاد عمل کرنے پر تیار ہیں اور برطانیہ کو انھوں نے

جامعہ

زیر ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۳۲	اگست ۱۹۳۹ء	نمبر ۲

فہرست مضامین

ادارۂ اجتماعیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مشاورتی بورڈ

ادارۂ اجتماعیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض ومقاصد

۱۔ سیاسی، معاشی، تعلیمی اور تمدنی مسائل کا مطالعہ کرنا۔

۲۔ مطالعہ کے نتائج کو کتابوں اور رسالوں کی شکل میں شائع کرنا۔

۳۔ ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ نکالنا۔

۴۔ جلسے منعقد کرنا جس میں ملک کے سربرآوردہ ماہرین، ادارہ کی دعوت پر اجتماعی مباحث پر مقالوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور حاضرین سوالوں یا تقریروں کے ذریعے سے تبادلۂ خیالات کرسکیں گے۔

قوتِ محرّکہ کی کہانی

دنیا میں انسان کے سب سے اول ظاہر ہونے کی تاریخ پانچ لاکھ سال پہلے تبلائی جاتی ہے اس پانچ لاکھ سال پہلے کی مدت سے دس ہزار سال کی مدت تک یعنی چار لاکھ ۹۰ ہزار سال کے دوران میں انسان صرف چیزوں کو پکڑنا اور اپنے رگ پٹھوں کی قوت سے کام لینا سیکھ سکا تھا۔ اور ایک طویل مدت گذر جانے کے بعد اس نے ڈنڈے اور پتھر کے بھدّے اوزار اور آگ کا بنانا بھی سیکھ لیا تھا۔ آج سے صرف دس ہزار سال پہلے اس نے جانوروں کو پالتو بنانا سیکھا اور غلاموں کی محنت سے بھی کام لینے لگا۔ اس کے علاوہ اس نے بیلن، ڈھلواں سطح، بیرم (لیور) اور آہنچہ (بوجھ اٹھانے والی چرخی) کو استعمال کرنا اور کشتیوں کو بادبانوں سے چلانا بھی سیکھ لیا۔ پھر اس کے بعد آج سے دو سو سال پہلے تک یعنی ۹ ہزار آٹھ سو سال کی طویل مدت کے دوران میں انسانوں نے کوئی اور غیر معمولی ایجاد نہیں کی۔ البتہ آج سے دو سو سال پہلے یورپ کے لوگوں نے لائق استعمال مشینوں کا بنانا، کوئلہ اور معدنی تیل کو ایندھن کے طور پر جلانا، اور مشینوں کو پانی کی قوت سے چلانا سیکھا۔ غرضکہ اوپر کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہزاروں سال تک انسان جس قوت محرکہ سے کام لیتے رہے وہ صرف آدمیوں اور جانوروں کے رگ پٹھوں اور ہوا اور پانی کی قوت تک محدود تھی۔ اس پوری طویل مدت میں آدمی فطرت کا غلام بنا رہا۔ البتہ پچھلے دو سو سال میں جو پانچ لاکھ سال کی طویل مدت کے مقابلہ میں بہت مختصر زمانہ معلوم ہوتا ہے آدمیوں نے انجنوں سے چلنے والی مشینوں سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔

آج انجنوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ اگر ہم امریکہ جیسے ملک کے بارے میں یہ معلوم کرنا چاہیں کہ اس میں مشین کی قوت کا کس قدر استعمال ہو رہا ہے تو ہمارے لئے اس بات کا

پتہ چلانا ممکن نہ ہو سکے گا۔ اس قوت محرکہ کا تخمینہ کرنے میں ہمیں لاکھوں موٹروں، ہزاروں ریل کے انجنوں بے شمار فیکٹریوں اور بجلی، روشنی، گرمی اور قوت محرکہ کے کارخانوں، بجلی کی ریلوں اور ریڈیو اسٹیشنوں کی قوت محرکہ اور بے شمار دوسرے چھوٹے چھوٹے ذرائع کی قوت محرکہ کو شامل کرنا ہوگا۔ امریکہ میں کھانے مکان، کپڑے اور تفریح کے سامان مہیا کرنے کے سلسلہ میں جو کچھ بھی کام کیا جاتا ہے اس کا بہت بڑا حصہ قوت محرکہ کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ وہاں بڑے فارموں پر انجنوں سے مشینوں کو چلایا جاتا ہے۔ انجنوں ہی سے موٹر لاریوں اور ریلوں کو جو غذا کے سامانوں، کوئلہ اور دوسرے کچے اور مصنوعہ مال کو منتقل کرتی رہتی ہیں چلایا جاتا ہے۔ ان کے مکانوں اور گوداموں کو روشن کرنے کے لئے اور ٹیلیفون، ٹیلیگراف اور وائرلیس سے پیغامات بھیجنے کے لئے انجن ہی قوت محرکہ فراہم کرتے ہیں۔

پرانے زمانے کے مقابلہ میں ہمارے زمانہ میں انجنوں کے استعمال کی وجہ سے کام کرنے میں جو سہولتیں پیدا ہوگئیں ہیں ان کا اندازہ ہم ایک مثال کے ذریعہ سے کرانا چاہتے ہیں۔ اہرام مصر پرانے زمانہ کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر دنیا آج بھی حیرت کرتی ہے۔ اہرام کئی ہیں جنھیں سب سے پہلے آج سے پانچ ہزار سال قبل بنانا شروع کیا گیا تھا۔ ان میں سے سب سے بڑی اہرام آج سے چار ہزار سال پہلے بنائی گئی تھی۔ اس کی اونچائی پانسو فٹ ہے اور اس کی شکل مخروطی ہے یعنی سطح زمین پر اس کی شکل مربع جیسی ہے اور اوپر ایک نقطہ پر جا کر ختم ہوتی ہے موجودہ عمارتوں سے اس کا مقابلہ کیا جائے تو امریکہ میں ریڈیو سٹی کی جو ستر منزلہ عمارت ہے یہ اہرام اس کی بیالیسویں منزل کے برابر اونچی ہے۔ اس اہرام کی تعمیر میں بیس لاکھ سے زائد چونے کے ٹھوس پتھر لگائے گئے تھے جن میں سے ہر ایک کا وزن ۲۱ من کا تھا اور اونچائی تقریباً ۲ فٹ تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس عورت کو کس طرح بنایا گیا تھا۔ اس کی تعمیر وزن اٹھانے اور منتقل کرنے والی مشینوں کے ذریعہ سے نہیں کی گئی تھی جن کا مصریوں کو بالکل علم نہیں تھا بلکہ انسانی بازوؤں اور ان کی کمر کی قوت سے کی گئی تھی۔ اس کے بنانے میں ایک لاکھ آدمیوں کو سال میں تین مہینہ بیس سال تک مسلسل کام کرنا پڑا تھا یعنی ۲۰ کروڑ دنوں کی انسانی محنت سے یہ اہرام تعمیر کرائی جا سکی تھی۔ چونے کے بڑے بڑے

پتھر دریائے نیل کے ذریعہ کشتی پر لاد کر لائے جاتے تھے' پھر دریا کے کنارے سے بہت سی آدمی مل کر انھیں کھینچتے تے اور بڑی بڑی اونچائیوں پر پہنچایا کرتے تھے۔ لوگ پسینہ میں شرابور اور تھک کر چور ہو جاتے تھے اور دھکیل دھکیل کر ان پتھروں کو ان کی مناسب جگہ پر پہنچاتے تھے۔ لیکن ۱۰ کروڑ دنوں کی انسانی محنت سے بھی یہ کام انجام کو نہ پہنچ سکتا تھا اگر مصریوں نے چند سادہ اوزار اور کام کرنے کے طریقوں کو دریافت نہ کر لیا ہوتا۔

سب سے پہلی چیز جس سے مصریوں نے مدد لی وہ بیلن تھے۔ جب بیلن یا پہیے کو کسی بھاری وزن کے نیچے رکھ دیا جاتا ہے تو اس کا ہلانا سہل ہو جاتا ہے۔ دوسرا طریقہ جس سے وزنی چیزوں کو منتقل کرنے میں سہولت ہوئی وہ سطح کا ڈھلواں بنا دینا ہے۔ جب سطح مستقیم ہوتی ہے تو نیچے کی سطح سے بلند سطح تک وزنی چیزوں کا پہنچانا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن جب سطح ڈھلواں رکھی جاتی ہے اور اونچائی آہستہ آہستہ بڑھتی ہے تو وزنی چیزوں کو اوپر پہنچانے میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ تیسری چیز جس سے چیزوں کے منتقل کرنے میں سہولت پیدا ہوئی وہ بیرم یا لیور یعنی ایسے لانبے ڈنڈے کا استعمال تھا جس کو ٹیک (فلکرم) پر اس طرح قائم کیا جاتا ہے کہ اس کا بھاری اور چھوٹا سرا وزن اٹھانے والے کی طرف رہتا ہے اور لانبا اور ہلکا سرا وزن کی طرف رہتا ہے۔ اس کے ذریعہ بڑا وزن کم قوت صرف کرنے کے بعد اٹھایا جا سکتا ہے۔ چوتھی چیز جس سے وزن اٹھانے میں سہولت ہوئی وہ آنچہ کا استعمال ہے ایسی وزن کو رسی سے باندھ کر رسی کو چرخی پر لپیٹا جاتا ہے جس سے بھاری وزن سہولت کے ساتھ نیچے سے اوپر پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہوا کے چلنے اور پانی کے بہنے کی قوت سے بھی آدمیوں نے کام لینا شروع کر دیا تھا۔

ان ایجادوں کی موجودگی میں مصر کے ایک لاکھ آدمیوں کے لئے یہ ممکن ہوا کہ ۱۰ کروڑ دنوں کی محنت کر کے ایک پانسو فٹ اونچی یادگار قائم کر سکیں۔ یہ واقعی ان کا بڑا زبردست کارنامہ تھا اور آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے اگر اسی قسم کے اہرام کے بنانے کی کوشش کی جاتی۔۔۔ تو جتنے دن کی محنت مصریوں کو لگانا پڑی تھی ہمیں بھی اتنی ہی محنت صرف کرنا پڑتی۔ کیونکہ اس تمام دوران میں ہمارے

کام کرنے کے طریقوں میں کوئی بہت غیر معمولی فرق پیدا نہیں ہوا تھا۔ لیکن آج اسی مدت میں اور اتنی ہی محنت کے ساتھ ہم اہرام جیسی اننٹی عمارتیں بنا سکتے ہیں اور اگر ان کی تعمیر میں فولاد اور کنکریٹ کے استعمال کرنے کی اجازت دی جائے تو ہم ایسے دو سو چالیس اہرام بنا سکتے ہیں۔ فولاد اور کنکریٹ کی عمارت اس قدر دیرپا نہیں ہوگی لیکن اگر فولاد کے ڈھانچے میں اسفالٹ (ڈامر اور ریت کا مرکب) بھر دیا جائے تو عمارت کو شاید اتنا ہی دیرپا بھی بنایا جا سکتا ہے۔ پھر ہمارے زمانہ کے مزدوروں کو ایسی تھکا دینے والی سخت محنت نہیں کرنا پڑے گی جیسی مصر کے غلاموں کو برداشت کرنا پڑتی تھی ہمارے بہت سے مزدوروں کا کام اپنے رگ پٹھوں پر زور ڈالنے کی جگہ صرف مشین کے بٹن دبانے اور کلیں گھمانے تک محدود رہے گا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ ہمارے کام کرنے کے طریقوں میں جسمانی محنت اور قوت کی جگہ علم و حکمت کا بہت بڑا حصہ ہے۔ دو ہزار سال گذرے یورپ کے لوگوں نے دنیا کی چیزوں کی ماہیت کے بارے میں اپنے خیالات کو لکھنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن ان کے پاس چیزوں کو ٹھیک ناپنے اور اپنی اردگرد کی دنیا کا صحیح مشاہدہ کرنے کے لئے اوزار موجود نہیں تھے گو یہ صحیح ہے کہ ان سے پیشتر کے زمانہ میں لوگوں کو کچھ اوزاروں کا علم حاصل تھا۔ بہرحال یورپ کے لوگوں کے پاس گھڑی، گز، سمت نما، دوربین، خوردبین جیسے معمولی اوزار بھی نہیں تھے۔ ان اوزاروں کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ تاروں، سورج اور زمین کی حرکت اور خشکی و تری میں جانوروں کی زندگی کی بابت محض اندازے اور تک بندی سے کام لے سکتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے ایک ہی چیز کو بار بار دیکھنا شروع کیا تو ان کے علم میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا رہا اور ایسی رائیں قائم ہونے لگیں جنھیں محض ظن و تخمین سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ غرضکہ اس طرح انھیں آہستہ آہستہ اس بات کا پتہ چلا کہ واقعات و مظاہر کے اسباب کیا ہیں۔ سنہ ۱۶۰۰ء کے بعد سے سائنس والوں نے ناپنے کے زیادہ صحیح اوزاروں کو بھی بنانا شروع کر دیا اور سنہ ۱۷۰۰ء کے بعد ایجاد کرنے والوں نے لائق استعمال مشینوں اور انجنوں کا بھی پتہ چلا لیا۔ جب ناپنے کے اوزار انجن اور مشینیں ایجاد ہو گئیں تو

تو پھر لوگوں کے رہنے سہنے کے طریقوں میں تیزی کے ساتھ تبدیلی ظاہر ہونے لگی۔ اور لوگوں کے غذا حاصل کرنے، کپڑا بنانے، سڑکیں تعمیر کرنے، چیزوں کو منتقل کرنے اور شہروں کے بنانے کے طریقے بالکل بدل گئے۔

لہٰذا قوت محرکہ کی کہانی سنتے وقت اس بات کو ہمیشہ ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ ہماری تہذیب کی تعمیر میں جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ سائنس کی معلومات ہیں۔ دوسری چیز جس کو خاص اہمیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ جن ملکوں میں یہ ترقیاں ہوئیں ان کے پاس کوئلہ، معدنی تیل اور پانی کے بڑے ذخیرے موجود تھے اور یہی تین وہ ذریعے تھے جن سے انجنوں نے قوت محرکہ پیدا کی۔

اس تمہیدی بیان کے بعد ہم یہ دیکھیں گے کہ قوت محرکہ کے ذریعہ مشینوں کو چلانا کس طرح شروع کیا گیا۔ ابتدا میں انجن بنانے کے بہت سے تجربے کئے گئے جن میں سے کچھ ناکام رہے اور کچھ کامیاب ہوئے۔ مثلاً سورج کی گرمی، سمندر کے مدوجزر۔ اور جمے ہوئے پانی وغیرہ سے چلنے والے بہت سے انجن بنائے گئے لیکن ان میں ۳ انجن ایسے تھے جو قابل استعمال ثابت ہوئے اور جن کی بنیاد پر آج ہماری تہذیب کی پوری عمارت قائم ہے یعنی بھاپ، بجلی اور گیس کے انجن۔ اب ہم ان تینوں انجنوں کی ایجاد کے بارے میں الگ الگ کچھ حالات پیش کریں گے۔

۱۔ <u>بھاپ کا انجن</u> اس بات کو تو لوگ سینکڑوں سالوں سے جانتے تھے کہ بھاپ کے اندر قوت موجود ہے لیکن لاکھوں کروڑوں آدمی پیدا ہوئے اور مر گئے مگر اس بات کو معلوم نہیں کیا جا سکا کہ اس قوت سے کام کس طرح لیا جا سکتا ہے جب پانی کا ایک قطرہ بھاپ بنتا ہے تو رقیق حالت کے مقابلہ میں وہ سترہ سو گنی زیادہ جگہ گھیرتا ہے۔ جب قطرہ بھاپ بننے کے لئے پھیلنا چاہتا ہے اگر اس وقت اس کو تنگ جگہ میں بند کر دیا جائے تو اس سے بہت بڑی مقدار میں قوت پیدا ہو جاتی ہے ایک طویل زمانہ تک لوگ اس بات پر قیاس آرائی کرتے رہے کہ اس قوت کو چیزوں کو حرکت دینے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن سنہ ۱۶۰۰ء سے پہلے ایجاد کرنے والے بھاپ کی قوت سے کام

لیتے ہیں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اور جب وہ کامیاب ہو گئے تو ہمارا بھاپ کا انجن بن گیا جس سے جدید صنعتی تہذیب کا آغاز ہوتا ہے۔

بھاپ کے انجن کی کہانی تو دراصل دو ہزار سال پہلے شروع ہوتی ہے۔ اس قدیم زمانے میں بھی لوگ بھاپ کی قوت پر حیرت کرتے تھے اور منصوبے بنایا کرتے تھے کہ بھاپ سے کیا کیا کام لئے جا سکتے ہیں۔

سنہ ۵۰ء میں یا شاید اس سے بھی پہلے ان سائنس دانوں میں سے ایک نے جس کا نام ہیرو تھا اور جو اسکندریہ میں رہتا تھا بھاپ کی ایک گیند ایجاد کی تھی۔ اس میں یہ کاری گری رکھی گئی کہ بھاپ کی قوت سے گیند گھوما کرتی تھی۔ نیچے کی گیند میں پانی گرم کیا جاتا تھا اور بھاپ بنائی جاتی تھی اور یہ بھاپ سیدھی سیاہ نلکی سے ہو کر تیزی کے ساتھ اوپر آتی تھی اور اوپر کی گیند میں جو چار مڑی ہوئی نلکیاں لگی رہتی تھیں ان سے باہر نکلتی تھی۔ جب بھاپ قوت کے ساتھ ان چاروں نلکیوں سے نکلنا چاہتی تھی تو گیند گھومنے لگتی تھی۔ ہیرو اور اس کے دوست اس منظر سے لطف اٹھایا کرتے تھے۔ اگرچہ ان لوگوں کے لئے یہ چیز صرف ایک کھلونے کی حیثیت رکھتی تھی لیکن فی الحقیقت اسے ایک ادھورا ناتمام انجن سمجھنا چاہیئے۔

اگر ہیرو یا کسی اور دوسرے سائنس داں نے اس بات کا پتہ لگا لیا ہوتا کہ اس بھاپ کو زیادہ مکمل انجن میں بند کر کے مفید کام لئے جا سکتے ہیں تو اندازہ کیجئے کہ اسی قدیم زمانہ میں کیا کچھ نہ ہو گیا ہوتا۔ لیکن سینکڑوں صدیوں تک کسی سائنس داں نے اس کا پتہ نہیں لگایا۔ سنہ ۱۶۰۰ء تک آدمیوں نے کسی ایسی ترکیب کو نہیں سوچا جس سے بھاپ سے مفید کام لیا جا سکتا۔ جو ترکیبیں اور طریقے سوچے گئے وہ ایسے عجیب تھے کہ ان کو استعمال میں لانا ممکن نہیں تھا۔ مثلاً آج سے تین سو سال پہلے ایک اٹلی کے باشندے نے جس کا نام برانکا تھا ایک عجیب شکل کا انجن بنایا۔ اس میں بھاپ ایک مجسمہ کے منہ میں دبی ہوئی نلکی سے نکلتی تھی اور ایک دندانہ دار پہیئے سے ٹکراتی تھی جو اس کی وجہ سے حرکت میں آ جاتا تھا۔ اس پہیے سے ایک اور دندانہ دار پہیہ لگا رہتا تھا اور وہ آٹا کوٹنے

والی ہوگریوں کو اوکھلیوں کے اندر چلایا کرتا تھا۔

پسٹن کی ایجاد | ڈینس پیپن (۱۶۴۷ء تا ۱۷۱۲ء) پہلا شخص تھا جس نے ایک بند نلکی یعنی سلنڈر میں بھاپ کو استعمال کرنے اور سلنڈر کے اندر جہاں اس کی قوت ضائع نہ ہوسکتی تھی اس سے کام لینے کے طریقہ کو سوچا۔ سلنڈر میں اس نے ایک گول ٹکیہ جیسا ڈھکنا جسے پسٹن کہتے ہیں لگایا۔ اس کا محیط سلنڈر سے چھوٹا رکھا جس کی وجہ سے وہ سلنڈر کے اندر ذرا ڈھیلا رہتا تھا۔ سلنڈر کے پیندے میں پانی گرم کیا گیا اور اس کی بھاپ بنائی گئی جب پانی بھاپ بنا تو اس کو زیادہ جگہ کی ضرورت ہوئی اس لئے اس نے پسٹن کو اوپر دھکیلا۔ پھر جب بھاپ ٹھنڈی ہوئی تو اس کی قوت کم ہوگئی اور پسٹن دوبارہ اپنی جگہ پر آگیا۔

پیپن کے انجن نے ٹھیک کام نہیں کیا لیکن لوگوں کو اس کی ایجاد سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ پسٹن کا یہ خیال ہے بہت اچھا۔ چنانچہ انھوں نے اب بھاپ کو نلکیوں یا فواروں کے سوراخوں سے نکالنا چھوڑ دیا اور اس کے بعد سے وہ سلنڈروں میں پھنسائے ہوئے پسٹنوں کو مکمل کرنے کی فکر میں لگ گئے۔ لیکن جب تک یورپ کے لوگوں نے کوئلہ کو کثیر مقدار میں استعمال کرنا شروع نہیں کیا اس وقت تک قابل استعمال انجن ایجاد نہ ہوسکے۔

سولھویں صدی اور سترھویں صدی میں انگلستان کی کوئلہ کی کانوں کو گہرا کھودنا شروع کردیا گیا تھا۔ جب کوئلہ نکالا جاتا تھا تو کانیں ہمیشہ پانی سے بھر جایا کرتی تھیں اور اس پانی کو ہاتھ کے پمپوں سے نکالنے کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ اس کام میں خرچ بہت زیادہ ہوتا تھا۔ اس لئے کان کے مالکوں نے ایسا انجن ایجاد کرنے والے کو جو پانی کو پمپ کے ذریعہ کھینچ کر نکال سکے انعام دینے کا وعدہ کیا۔

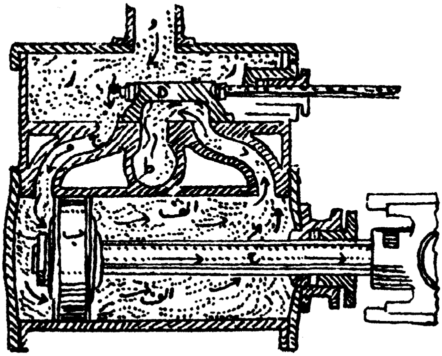
۱۷۰۰ء تک کئی موجدوں نے اس طرح کے انجن بنائے۔ لیکن ان کے انجن ادھورے اور نامکمل تھے۔ ان موجدوں میں سب سے زیادہ شہرت ٹامس نیوکومن کو حاصل ہوئی۔ اس کا پمپ کرنے والا انجن دستی پمپوں سے بہتر کام کرتا تھا لیکن عام طور پر یہ سب ناقابل اطمینان تھے کیونکہ یہ

سب اکثر بگڑ جاتے تھے۔ اسی حالت میں پچاس سال اور گذر گئے تب کہیں ایسا انجن ایجاد ہوا جو سہولت کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا تھا۔

جیمس واٹ ۱۷۳۶ء تا ۱۸۱۹ء | ۱۷۶۳ء میں نیوکومن کا ایک پمپ کرنے والا انجن گلاسکو کی سکاٹش یونیورسٹی میں بگڑ گیا۔ لوگ اسے شہر میں جیمس واٹ کے پاس جو اوزار بنایا کرتا تھا مرمت کرانے کے لئے لے گئے۔ واٹ نے اس انجن کا مطالعہ بہت ہوشیاری کے ساتھ کیا اور مرمت کرتے وقت اس نے معلوم کیا کہ اس وقت تک جتنے انجن دریافت ہوئے تھے ان سب کے مقابلہ میں ایک اور زیادہ کارآمد انجن کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ جس انجن کی وہ مرمت کر رہا ہے اس میں بھاپ کی قوت سے پسٹن کو صرف ایک طرف دھکا دیا جاتا ہے۔ اس لئے بھاپ کی بہت زیادہ قوت ضائع ہو جاتی ہے۔ اس نے جو انجن کو ایجاد کیا اس میں بھاپ کے پھیلنے کی قوت سے پسٹن کو دونوں طرف دھکا دیا جا سکتا تھا۔ انیس سال تک واٹ اپنے انجن کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا رہا اور ۱۷۸۲ء میں اس نے انگلستان میں اپنے انجن کے لئے پیٹنٹ حاصل کر لیا۔

جیمس واٹ کو انجن کا باپ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے ہی انجنوں کو استعمال کے لائق بنایا۔ جس انجن کو اس نے بنایا وہ اصول کے لحاظ سے بالکل ویسا ہی ہے جیسے کہ انجن آج کل ہم استعمال کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ واٹ کے زمانہ سے لے کر اب تک انجنوں میں بہت سی اصلاحیں ہو چکی ہیں لیکن ہماری ریلوں اور بڑے بڑے کارخانوں کو چلانے والے انجنوں میں پسٹن والے ایسے ہی سلنڈر لگے ہیں جیسے کہ ڈیڑھ سو سال پہلے واٹ کے انجن میں لگے ہوئے تھے۔

اگر ہمارے جدید بھاپ کے انجنوں کے بیچ سے کاٹا جائے تو اندر سے وہ ایسے نظر آئیں گے جیسا کہ حاشیہ کے نقشہ میں دکھایا گیا ہے (الف) سلنڈر ہے اس کے اندر (ب) پسٹن لگی ہوئی ہے جو (الف) کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس بھاپ کی وجہ سے ہلتی ہے جو پہلے (ج) سے اور بعد میں (د) کے ذریعہ سلنڈر میں داخل ہوتی ہے (ہ) ڈھکن کو ظاہر کرتا ہے



اور اس کے موقف سے اس بات کا فیصلہ ہوتا ہے کہ بھاپ (ج) سے داخل ہوگی یا (د) سے یہ ڈھکن بھاپ کے عمل جانے سے کھلتا اور بند ہوتا رہتا ہے۔ جب ڈھکن اس موقف پر ہوتا ہے جس کا اظہار حاشیہ کی تصویر میں کیا گیا ہے تو بھاپ (ج) کے ذریعہ داخل ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے پسٹن سلنڈر کے دوسرے سرے پر پہنچ جاتا ہے بائلر سے (جسے تصویر میں دکھایا نہیں گیا ہے) بھاپ (و) نلکی کے ذریعہ (ز) مقام پر آتی ہے جسے بھاپ کا صندوق کہتے ہیں۔ اس بھاپ کے صندوق سے بھاپ (ج) اور (د) سوراخوں کے ذریعہ سلنڈر میں داخل ہوتی ہے جب پسٹن کو بھاپ سلنڈر کے دوسرے طرف دھکیل دیتی ہے تو پسٹن راڈ (ح) سلنڈر کے سامنے کے حصہ کو طے کرتا ہے۔ جو بھاپ پسٹن کو دھکا دیتی ہے اس کے نکلنے کے لئے کوئی راستہ ہونا چاہیئے چنانچہ یہ (د) سوراخ کے ذریعہ باہر نکلتی ہے اور خارج کرنے والی نلکی (ط) میں سے ہوکر ہوا میں مل جاتی ہے جس وقت یہ عمل پورا ہو رہا ہوتا ہے ڈھکنا (ہ) حرکت کرکے (ج) سوراخ کو ڈھک لیتا ہے اور (د) سوراخ کو کھول دیتا ہے۔ اب بھاپ کے صندوق سے بھاپ (د) سوراخ کے ذریعہ داخل ہوتی ہے اور پسٹن کو بائیں طرف دھکا دیتی ہے اور (ج) سوراخ سے ہوتی ہوئی (د) نلکی کے ذریعہ ہوا میں مل جاتی ہے اور یہ عمل اسی طرح جاری رہتا ہے۔

واٹ کا انجن جیسے ہی مکمل ہوا امریکہ والوں نے اس سے اور اس کے خیال سے فائدہ اٹھانا شروع کردیا۔ امریکہ میں جنگ انقلاب سے پہلے ناکمل انجنوں کو نیوجرسی کی تانبے کی کانوں سے پانی پمپ کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ ۱۸۰۳ء کے کچھ عرصہ بعد آلیور ایونس نے انجنوں

کے استعمال کے بارے میں تجربے کرنا شروع کیے۔ اسی لیے اُسے امریکہ کے جیمس واٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس کے فوراً بعد دخانی انجن کو خشکی اور تری کی گاڑیوں کے کھینچنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ جن پٹریوں پر گاڑیوں کو چلانے کے لئے گھوڑوں کو جوتا جاتا تھا اب ان گاڑیوں کو دخانی انجن سے چلایا جانے لگا۔ دخانی انجن کو ان پتواروں کے ساتھ لگاکر جو کشتی کو چلاتے تھے دخانی کشتی بنائی گئی۔ اسی طرح گاڑی کے پہیوں سے دخانی انجن کو وابستہ کرکے سڑک پر چلنے والی پہلی دخانی گاڑی بنائی گئی۔ حال کے زمانہ میں ایک نئے قسم کا دخانی انجن بنایا گیا ہے جسے ٹربائن کہتے ہیں۔ "ٹربائن" اٹلی کی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی بگولے کے ہیں۔ اسے ایک انگریز سی۔ اے۔ پارسنس نے ایجاد کیا تھا اور اس کی وجہ سے ان انجنوں میں خصوصیت کے ساتھ بڑی زبردست تبدیلی ہوگئی جو جہازوں اور پاور اسٹیشنوں میں لگائے جاتے ہیں جو ٹربائن انجن جہازوں میں لگائے جاتے ہیں ان میں بھاپ کی قوت سے ایک فولادی نل میں بند کئے ہوئے پہیے کی تھاپیوں کو گھمانے کا کام لیا جاتا ہے۔ اس پہیے کو جہاز کے اس دھکیلو PROPELLER کے ساتھ وابستہ کردیا جاتا ہے جو پانی کے نیچے جہاز کے ساتھ لگا ہوتا ہے۔ پہیے کی تھاپیاں بھاپ کی قوت سے تیزی کے ساتھ گردش کرتی ہیں جس سے دھکیلو پانی کے اندر چکر کھانے لگتا ہے اور اس کی وجہ سے جہاز آگے کی طرف حرکت کرنے لگتا ہے۔

۱۸۹۷ء میں یہ نئے قسم کا انجن ٹربینا نامی ایک چھوٹی کشتی میں لگایا گیا تھا جس نے اپنی رفتار کی تیزی سے اس وقت کی تمام دوسری کشتیوں کے ریکارڈوں کو مات کردیا۔ آج یہ دخانی ٹربائن ان تمام پیچ دار دھکیلوؤں کو گردش میں لاتے ہیں جن سے ہمارے تمام مال اور مسافروں کے تیز ترین جہاز حرکت کرتے ہیں۔ اسی طرح جتنے بڑے پاور اسٹیشن ہیں ان میں بھی دوسرے دخانی انجنوں کی جگہ ٹربائنوں کو استعمال کرنا شروع کردیا گیا ہے۔

۲۔ گیس انجن پانی جب بھاپ بن کر پھیلتا ہے اور اس سے جو قوت پیدا ہوتی ہے دخانی انجن اس کو

ہی چلائے جاتے ہیں۔ سائنس دانوں کو اس بات کا ایک عرصہ سے علم تھا کہ پانی کے علاوہ جب اور دوسری چیزوں کو گرم کر کے ہوا کی شکل دی جاتی ہے تو ان میں بھی پھیلنے کی زبردست قوت پیدا ہو جاتی ہے اس لئے جب لوگوں نے نلکی کے اندر بند کئے ہوئے پسٹن کو چلانے کا اصول معلوم کر لیا تو ان کو اس بات کی جستجو ہوئی کہ پانی کے مقابلہ میں کسی اور دوسری چیز کو آزمایا جائے جس کے ہوا میں منتقل ہونے کی قوت پانی سے بھی زیادہ طاقتور ہو۔ اس قسم کی ایک چیز جس کا تجربہ کامیاب ثابت ہوا گیسولین ہے۔

پانی کو جب گرم کیا جاتا ہے تو وہ بھاپ بن جاتا ہے لیکن جلتا نہیں ہے۔ مگر گیسولین کی صورت اس سے مختلف ہے۔ جب اسے گرم کیا جاتا ہے تو یہ بھی تیزی کے ساتھ پھیلتی ہے اور ہوا بن جاتی ہے۔ لیکن جب یہ ہوا ذراسی چنگاری کے پاس پہنچتی ہے تو یہ دھماکے کے ساتھ پھیلتی ہے۔ تجربے سے لوگوں کو معلوم ہوا کہ جب اس گیس کو نلکی کے اندر بجلی کے شرارے کے ذریعہ بھک سے اڑایا جاتا ہے تو بہت زیادہ قوت پیدا کی جا سکتی ہے۔

گیس کے انجنوں میں دخانی انجنوں کے مقابلہ میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا وزن اور حجم زیادہ نہیں ہوتا۔ دخانی انجن میں ایک بڑے بائلر (پانی کے ابالنے والا برتن) پانی کے ذخیرہ اور پانی کو گرم کرنے کے لئے ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے اس انجن کو لازمی طور پر بڑا بنانا پڑتا ہے۔ لیکن ایک گیس کے انجن کے لئے محض ایندھن (مثلاً گیسولین، نفتہ، یا جس چیز کو بھی ہوا بنانے کے لئے استعمال کیا جائے) کے ذخیرہ کی ضرورت ہوتی ہے اور اس لئے اس کو چھوٹا بنایا جا سکتا ہے چنانچہ چھوٹی کشتیوں، موٹر کاروں اور ہوائی جہازوں کے لئے گیس کا انجن بہت موزوں ثابت ہوا ٹریکٹر، پمپوں اور فصل کاٹنے کی مشینوں میں بھی گیس کا انجن لگایا جاتا ہے اور آج کل عام طور پر تمام چھوٹی مشینوں میں گیس کے انجنوں ہی کا استعمال کیا جاتا ہے۔

۳۔ بجلی کا انجن: اس کے علاوہ ایک تیسری قسم کی قوت بھی پائی جاتی ہے یعنی بجلی اور اس کے استعمال کرنے کے لئے ایک تیسرے قسم کا انجن بھی استعمال کیا جاتا ہے جس کو الکٹرک جنریٹر یا بجلی پیدا کرنے والے

انجن کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

آج کل جب ہم ایک بٹن دباتے ہیں اور اس سے اندھیرے کمرے میں بجلی پیدا ہو جاتی ہے تو اس روشن قمقمے کی تہ میں جو بجلی کی کہانی ہے اس کی طرف ہمارا ذہن منتقل نہیں ہوتا یا جب بجلی کی مسافر گاڑی کو بمبئی سے پونا تک خاموشی اور تیزی کے ساتھ بہتا ہوا دیکھتے ہیں تو ہم اس بات پر کبھی دھیان نہیں دیتے کہ بمبئی سے ایک دور دراز مقام پر کچھ بڑی بڑی مشینیں بھی موجود ہیں جو دن رات کام کرتی رہتی ہیں اور بجلی کو برابر پیدا اور روانہ کرتی رہتی ہیں۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ابر کی بجلی اور اس پیدا کی ہوئی بجلی میں کوئی فرق نہیں ہوتا دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ بجلی کی طاقت سے بھی آپ واقف ہیں کیونکہ بجلی سے مکانوں کے گرنے اور آدمیوں کے تلف ہو جانے کے واقعات آپ سنتے رہتے ہیں۔ اگر ایسی طاقتور چیز کو پکڑ کر اس کی طاقت سے کام لیا جائے تو ظاہر ہے اس سے ریل گاڑیوں اور زبردست لیم و شحیم مشینوں کو چلایا جا سکتا ہے۔ ابھی تک انسان آسمان کی اس بجلی کی قوت کو تو کام میں نہیں لا سکا ہے۔ لیکن اس نے اپنے لئے خود بجلی پیدا کرنا اور اس کی قوت سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔ بجلی کے قابل استعمال طریقے کے دریافت ہونے سے پہلے سینکڑوں سائنس دانوں کو اس کے بارے میں تجربے کرنے پڑے۔ اس طرح سب سے پہلا قدم مقناطیس کو ایجاد کرکے اٹھایا گیا۔

مقناطیس کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ بہت سال گذرے ایک انگریز سائنس داں میکائیل فراڈے نے اس بات کو (سنہ ۱۸۳۱ء) معلوم کیا کہ جب تار کو مقناطیس کے اوپر آگے پیچھے حرکت دی جاتی ہے تو اس سے تار میں بجلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نے اور اس کے بعد پھر دوسرے موجدوں نے مقناطیسوں اور تانبے کے ہلتے ہوئے تاروں پر اپنے تجربوں کو جاری رکھا۔ انھوں نے معلوم کیا کہ اگر ایک تار کو ایک نلکی کے اوپر کئی دفعہ لپیٹ دیا جائے اور اس نلکی کو ایک مقناطیس کے اندر تیزی سے گھمایا جائے تو تار کے اندر ایک مسلسل برقی رو جاری ہو جائے گی۔ اس کے بعد انھوں نے معلوم کیا کہ جب ایک نلکی کے گرد بہت سے تار لپیٹ دئے جائیں تو برقی رو

کی زیادہ مقدار کو پیدا کیا جاسکتا ہے۔ بہت سے تجربوں کے بعد بجلی پیدا کرنے والی مشینیں جنھیں جنریٹر کہتے ہیں بنائی گئیں اور وہ بڑی مقدار میں قوت کو پیدا کرنے لگیں۔

موجدوں نے ایک دوسری اور اہم بات یہ معلوم کی کہ اگر تانبے کے ان تاروں کو جنریٹر کے باہر پھیلا دیا جائے تو یہ بجلی کی قوت کو سینکڑوں میلوں تک لے جاسکتے ہیں اور ان دور دراز مقامات پر لیمپوں کو روشن کرسکتے ہیں۔ موٹروں کو چلا سکتے ہیں اور ایسے ہی اور بہت سے کام کرسکتے ہیں۔

سائنس میں ان معلومات کی وجہ سے بہت اہم اضافہ ہوا۔ ایک شہر میں بجلی پیدا کرنا اور دوسرے شہر میں اس کو استعمال کرنا بلکہ دوسرے صوبہ اور ملک میں استعمال کرنا یہ ایک ایسا خواب تھا جو کبھی شرمندہ تعبیر ہوتا نظر نہ آتا تھا لیکن یہ خواب مسٹر ایڈیسن اور دوسرے موجدوں کی کوششوں سے سچ ثابت ہوگیا ہے۔

ان کی ایجادوں کی وجہ سے ملک کے ہر حصہ میں پاور اسٹیشن بنا دیے گئے ہیں۔ امریکہ میں ۱۹۲۰ء میں ایک بڑی کمپنی تاروں کے ذریعہ قوت محرکہ کو چھ سو میل کے فاصلہ تک بھیج رہی تھی بعض سائنس دانوں کا یہ خیال ہے کہ عنقریب ایسے طریقے بھی معلوم ہوجائیں گے جن سے بجلی کی قوت محرکہ کو بغیر تاروں کے بھی منتقل کیا جاسکے گا۔

اب بجلی کے ذریعہ ہر طرح پر انسانی مشقت کو کم کرنے کے لئے کام لیا جارہا ہے۔ اس سے آدمیوں اور مال کو تیزی سے منتقل کیا جاسکتا ہے اس سے گھروں اور سڑکوں کو روشن کیا جاسکتا ہے۔ اس سے مکانوں کی صفائی کرائی جاسکتی ہے اور گرمیوں میں مکانوں کو ٹھنڈا رکھا جاسکتا ہے اس سے فیکٹریوں کی بہت سی مشینوں اور چھاپہ خانوں کو چلایا جاسکتا ہے۔ اس سے سینما کی تصویروں کو تھیٹر کے اسٹیجوں کو روشن کیا جاتا ہے اور ریڈیو سے جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ بھی اسی کی رہین منت ہے۔

امریکہ میں آج دخانی انجنوں، گیس کے انجنوں اور بجلی کے انجنوں سے بے انتہا قوت

محرکہ پیدا کی جاتی ہے۔ اس قوت محرکہ کا صحیح پتہ چلانا تو ممکن نہیں ہے البتہ اس کا تخمینہ کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۲۵ء میں ایک تخمینہ کیا گیا تھا جس میں اس قوت کا اندازہ ۴۳ کروڑ ۵۰ لاکھ گھوڑوں کی قوت کیا گیا تھا۔ اس میں آدھی سے زیادہ قوت محرکہ موٹر گاڑیوں کے چلانے میں صرف ہوتی تھی ½ ریل گاڑیوں کے چلانے میں ½ تجارتی جہازوں کے چلانے میں اور دوسرے بڑے عنوانات جن میں قوت محرکہ سے کام لیا جاتا تھا حسب ذیل تھے :-

صنعت، بجلی کی روشنی اور قوت محرکہ کے پاور اسٹیشن، محکمہ بحر کے جہاز، سڑکوں کی ٹرمیں وغیرہ۔

زراعت وصنعت میں انجنوں کے استعمال کرنے کی وجہ سے ایک آدمی کے کام کرنے کی قوت کئی گنا زیادہ بڑھ گئی ہے۔ کسان کے کام کرنے کی اہلیت میں ایسی مشینوں کے ایجاد ہو جانے کی وجہ سے جو جوتتی بوتی اور فصل کاٹتی ہیں کم سے کم سو گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ اسی قسم کی تبدیلی اور دوسری صنعتوں میں بھی ہو گئی ہے۔ ہاتھ کے اوزار استعمال کرنے والے کاریگر کے مقابلہ میں فیکٹری کا ایک مزدور کئی گناہ زیادہ کام کر سکتا ہے۔ مثلاً دخانی انجنوں کی ایجاد سے پہلے ایک پارچہ باف بستی کرگے پر صرف چند گز کپڑا یومیہ بن سکتا تھا۔ اب ایک پارچہ باف جو بیس کرگوں کی بیک وقت نگرانی کرتا ہے ایک دن میں سینکڑوں گز کپڑا بن سکتا ہے۔ جوتے کا ایک جوڑا آج کل قوت محرکہ سے چلنے والی مشین کے ذریعہ سے تیس چالیس منٹ کے اندر بنایا جا سکتا ہے۔ ہاتھ سے جوتے کا جوڑا بنانے کے لئے منٹوں کی جگہ اتنے ہی گھنٹے صرف کرنا پڑتے تھے۔

اسی طرح فولاد کی صنعت کی مثال کو لیجے۔ امریکہ کی صنعتوں میں فولاد کی صنعت کا شمار بڑی صنعتوں میں کیا جا سکتا ہے اس کی ترقی میں بھی انجنوں اور مشینوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ فولاد کے ان بڑے بڑے کھمبوں اور بلیوں کو بنانے کے لئے جن سے ہمارے پلوں اور فلک بوس عمارتوں کو تعمیر کیا جاتا ہے دیو صفت مشینوں کی ضرورت ہوتی ہے جو فولاد کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو اٹھا کر ان کو خوب ٹھوک پیٹ سکیں اور جب فولاد کے یہ کھمبے اور بلیاں بن جاتی ہیں تو مشینوں کے ذریعہ ہی انھیں ایک دوسرے سے ملایا جاتا ہے۔ بھاپ کے ہتھوڑے

نہ صرف بے انتہا قوت کے ساتھ ضرب لگا سکتے ہیں بلکہ وہ ایک مختصر رقبہ پر اپنی پوری قوت کو مرکوز بھی کر سکتے ہیں ۔ فولاد کے ایک ٹکڑے پر ایک ہی جگہ ایک ہی وقت میں ایک ہزار آدمیوں کے لئے ہاتھ سے ضرب لگانا ناممکن ہوتا ہے ۔لیکن بھاپ کا ہتوڑا ایک ہزار آدمیوں کی قوت کو اس طرح مرکوز کر سکتا ہے ۔

ایک اور دوسری مثال کو لیجے ۔نیو یارک کی ریاست میں ابھی دنیا کا سب سے بڑا پاور اسٹیشن مکمل کیا گیا ہے یہ ایک اسٹیشن اکیلا دس لاکھ گھوڑوں کی قوت پیدا کر سکتا ہے ۔ پھر یہ کارخانہ چوبیس گھنٹے برابر چلتا رہے گا جس کے معنی یہ ہیں کہ اوسطاً آدمی جتنے وقت تک کام کرتے ہیں اس سے تین گنے وقت میں یہ اپنا کام جاری رکھے گا ۔

دنیا میں تو یہ پاور اسٹیشن سب سے بڑا ہے لیکن امریکہ میں ایسے اور سینکڑوں پاور اسٹیشن ہیں ۔ ہر شہر میں اور اکثر بڑے قصبوں میں ایسے پاور اسٹیشن موجود ہیں جہاں بجلی پیدا اور تقسیم کی جاتی ہے ۔

پرانے زمانہ میں جب بادشاہ اپنے دشمنوں پر حملہ کرتے تھے تو پانی نکالنے اور گاڑیاں کھینچنے کے لئے لوگوں کو گرفتار کر لیا کرتے تھے ۔لیکن موجودہ زمانہ میں ہمارے انجن کائنات کے رازہائے سربستہ کا کھوج لگاتے اور اپنے لئے بجلی کے غلام بناتے ہیں اور ان کے یہ غلام سرنگوں میں ریلیں چلاتے، پانی کے پمپوں کو کھینچتے اور ہماری سڑکوں کو روشن رکھتے ہیں ۔ پرانے زمانہ میں انسانوں کے ہم جنس غلام کام کا بیشتر حصہ انجام دیا کرتے تھے ۔ آج میکانکی غلام انجنوں اور مشینوں کی شکل میں کام کے بیشتر حصہ کو پورا کرتے ہیں ۔امریکہ کے انجنیروں کا یہ کہنا ہے کہ ان کے ملک کے ہر خاندان میں افراد خاندان کے علاوہ سو میکانکی غلام ایسے ہیں جو برابر کام کرتے ہیں ۔ دنیا کے اور کسی ملک کو یہ بات اس مقدار میں حاصل نہیں ہے ۔امریکہ کے مزدور کے اختیار میں دنیا کے دوسرے مزدوروں کے مقابلہ میں زیادہ قوت محرکہ پائی جاتی ہے اسی لئے اس کی اہلیت کارگذاری دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے ۔صرف ایک بٹن کو دبا کر

وہ حیرت انگیز کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ وہ فولادی چادر میں ایک وقت میں سو سوراخ کرسکتا ہے۔ وہ ایک لانبی ریل گاڑی کو حرکت میں لاسکتا ہے۔ وہ رات کو دن کرسکتا ہے وہ سینکڑوں من لوہا اٹھا سکتا ہے اور اپنی سینکڑوں منزلوں کی عمارتوں پر پہنچنے کے لئے اپنے آپ کو اٹھوا سکتا ہے۔

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مزدور کی قوت کس طرح انجنوں کی وجہ سے کئی گنا زیادہ بڑھ گئی ہے۔ آئندہ کسی صحبت میں ہم دیکھیں گے کہ انجنوں سے چلنے والی مشینوں کی وجہ سے معیار زندگی کے بلند ہونے کے امکانات کس طرح پیدا ہوجاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے عہد کے ہر آدمی کی قوت دیوؤں جیسی ہے اور ہم دیوؤں کی قوت کے عہد میں زندگی گذار رہے ہیں۔

خلاصہ اوپر کے بیان میں ہم نے مختصراً یہ بات بیان کی کہ کس طرح انسانوں نے اپنے رگ و پٹھے کی قوت کی جگہ اور قوتوں کو استعمال کرنے کے لئے اپنی طویل جد و جہد کو جاری رکھا فطرت کو تسخیر کرنے اور اس کی مدد سے اپنے تمام کام کرانے کی کوشش میں انسانوں کو لاکھوں سال صرف کرنا پڑے آخیر میں مندرجہ ذیل منازل کو اختیار کرکے انسان مشین کی قوت سے فائدہ اٹھا سکا۔

(۱) اس نے ایسے اوزار بنائے جن کو وہ اپنے ہاتھوں سے استعمال کرسکتا تھا۔

(۲) اس نے جانوروں کو سدھایا اور اپنا کام کرانے کے لئے انھیں جوتا۔

(۳) دوسرے قبیلوں اور قوموں کے آدمیوں کو اس نے پکڑا اور ان کو غلام بنا کر ان سے اپنا کام کرایا۔

(۴) اس نے ہوا اور دریاؤں سے اپنے پہیوں کے چلانے کا کام لیا

(۵) سائنس کے عہد کی ابتدا میں اس نے انجنوں کی بھاپ کے ذریعہ اپنے پہیوں کو تیزی سے گھمایا۔

(۶) اس نے انجنوں میں گیس کو استعمال کرنا شروع کیا اور اپنی قوت محرکہ کو اور زیادہ بڑھا لیا

(۷) اس نے بجلی کو قبضہ میں کیا اور قوت محرکہ کو بڑے بڑے فاصلوں پر پہنچایا۔

آج امریکہ جیسے ملک میں جس قدر قوت محرکہ بھی استعمال کی جا رہی ہے وہ تقریباً سب کی سب مشینوں کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ رگ و پٹھے کی کوئی قوت بھی اب اس قوت کی جگہ نہیں لے سکتی جس کی مدد سے امریکہ کے آدمی اپنا کام چلا رہے ہیں۔ مشین کی قوت سے لوگوں کو آرام مل رہا ہے۔ ان کا معیار زندگی بلند ہو رہا ہے۔ ان کو کھانے کو زیادہ ملتا ہے فرصت زیادہ ملتی ہے کپڑے اچھے ملتے ہیں۔ امریکہ کے لوگ آج کل جس قدر آرام اور چین سے زندگی بسر کرتے ہیں دنیا کے لوگوں نے اس سے پہلے کبھی ایسی زندگی بسر نہیں کی۔ وہاں کے بہت سے لوگ اس طرح کی عیش و عشرت کی زندگی گذارتے ہیں جیسی کہ آج سے چند صدی پہلے بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں تھی۔ یہ سب عیش و آرام صرف انجنوں کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ ان بے شمار مشینوں کی ایجاد کی وجہ سے ممکن ہو سکا ہے جو انجن کی قوت سے چلتی ہیں۔ ان انجنوں کے بغیر وہ تمدن و تہذیب جو مغرب کا طرۂ امتیاز ہے کبھی پیدا نہ ہو سکتی۔

رہنے سہنے کے نئے اور پرانے طریقے

موجودہ زمانہ میں بجلی کے ایسے آدمی ایجاد کئے گئے ہیں جنھیں جب مناسب طریقہ پر مخاطب کیا جاتا ہے تو وہ سوالوں کے جواب دیتے ہیں، احکام قبول کرتے ہیں اور جو کچھ ان سے کرنے کے لئے کہا جاتا ہے اسے پورا کرتے ہیں۔ اس قسم کے ایک آدمی سے دربان کا کام لیا جاتا ہے جب کوئی شخص اس کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے "کھل جا سم سم" تو دروازہ خاموشی کے ساتھ تیزی سے کھل جاتا ہے لیکن اس سے دروازہ کھلوانے کے لئے ٹھیک انھیں لفظوں کو استعمال کرنا چاہیئے کیونکہ ذرا لفظوں میں فرق ہوا تو پھر دروازہ نہیں کھلے گا۔ انھیں بنایا ہی اس طرح گیا ہے کہ یہ صرف مقررہ الفاظ کی تعمیل کرتے ہیں اور جن سوالوں کے جواب دینے کے لئے انھیں بنایا گیا ہے ان کے ہی جواب دے سکتے ہیں۔ اس قسم کے آدمی نما شین سے حکم کی تعمیل کرانے کے لئے آپ کو اس بات کا علم ہونا چاہیئے کہ یہ کیا کام کر سکتی ہے اور اس کے مخاطب کرنے کا مناسب طریقہ کیا ہے۔

لیکن اس شین کے قریب ہونا ضروری نہیں ہے۔ فرض کیجیے آپ اپنے گھر سے ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ہیں۔ اگر آپ کے گھر پر ایک بجلی کا آدمی موجود ہے تو آپ ٹیلیفون پر اسے بلا سکتے ہیں اور جب وہ جواب دے تو آپ اس سے دریافت کر سکتے ہیں کہ "کیوں بھئی انگیٹھی کی آگ کس قدر گرم ہے۔" وہ فوراً اس کی حرارت کے بارے میں آپ کو ٹھیک ٹھیک جواب دے گا۔ اب اگر اس کے بعد آپ اس سے کہیں گے کہ "آنچ کو اور تیز کر دو اور ٹیلیفون کو رکھ دو" تو وہ آپ کے حکم کی بجنسہٖ تعمیل کرے گا۔

شہر نیویارک کے تالاب میں تین بجلی کے آدمی آج کل فی الواقعی کام کر رہے ہیں۔

ٹیلیفون پر جب کبھی انھیں بلایا جاتا ہے تو وہ رات دن جواب دیتے رہتے ہیں اور پانی کی رسد کے بارے میں ٹھیک ٹھیک اطلاعیں دیتے ہیں۔ یہ ایمان دار اور لائق اعتماد ملازم ہیں اور یہ احکام کی تعمیل بجلی جیسی تیزی کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔ اس قسم کے اور آدمیوں کو بھی کام پر لگایا جائے گا اور یہ لوگوں کے لئے کون کون سے اور دوسرے کام بہت جلد کرنے لگیں گے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

بجلی کے آدمی کا نام سن کر ہم حیرت کے ساتھ سوال کرتے ہیں کہ کیا ہماری موجودہ دنیا کی حیرت ناک ایجادیں کبھی ختم نہ ہوں گی۔ ہم نے خشکی بلکہ سمندر کے پار کے دور دراز لوگوں سے بغیر دو بدو ہوئے دوستیاں قائم کرلی ہیں۔ آوازیں ہوا میں تیرتی ہوئی براعظموں کو عبور کر سکتی ہیں اور لاکھوں آدمی انھیں ایک ہی وقت میں سن سکتے ہیں۔ ہندوستان سے لندن اور نیویارک تک تیز رفتار ہوائی جہازوں کے ذریعہ سفر کیا جا سکتا ہے جس وقت ہم اپنی تعطیلیں گذارنے کے لئے دوسرے ملکوں کو جائیں گے ہمارے کچھ کام بجلی کے ایسے آدمی کرتے رہیں گے جو ٹیلیفون کا جواب دے سکتے ہیں اور ہمارے احکام کی بغیر غلطی کئے ہوئے تعمیل کرسکتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں سچ مچ بڑی حیرت انگیز تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔

ہمارے لئے اس بات کا احساس کرنا اب مشکل ہوتا جا رہا ہے کہ ہزاروں لاکھوں سال تک لوگ کیسے بغیر ان ایجادوں کے گذر کرسکتے۔ وہ فطرت کی قوتوں کے غلام تھے۔ جانوران کا شکار کرتے رہتے تھے اور طوفان انھیں زیر وزبر کرتے رہتے تھے۔ صرف چند ہزار سال ہوئے انسانوں نے ہوا، پانی اور زمین کی چیزوں سے فائدہ حاصل کرنا سیکھا۔ اور اپنی ضرورتوں اور تفریحوں کو پورا کرنے کے لئے قوائے فطرت کو نئے طریقوں پر استعمال کرنے کے کام کو شروع کیے ہوئے تو ابھی دو سو سال بھی پورے نہیں ہوئے ہیں۔ ان ایجادوں کے بعد مشینوں میں تبدیلیاں حیرت انگیز تیزی کے ساتھ ہوتی رہی ہیں۔ گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں لوگوں نے اپنے طرز زندگی اور طرز خیال کو جتنی تیزی سے بدلا ہے اس سے پہلے کئی ہزاروں سال میں بھی نہیں بدل

سکتے تھے۔

مثال کے طور پر امریکہ کے رہنے سہنے کے طریقوں کا مطالعہ کیجیے کہ سنہ ۱۸۵۰ء میں کون سے طریقے رائج تھے اور آج ان کی جگہ کون سے نئے طریقے رائج ہو گئے ہیں۔

امریکہ کے گھروں میں تبدیلی | ایک شخص ہنری اسمتھ کی مثال کو سامنے رکھیے جو سنہ ۱۸۵۰ء میں اوہیو کی سرزمین میں رہتا تھا۔ اس کا مکان لکڑی کے بڑے بڑے لٹھوں سے جنھیں امریکہ کے جنگلوں سے کاٹ لیا جاتا تھا بنایا جاتا تھا۔ اس کے اندر صرف ایک کمرہ ہوتا تھا جو زیادہ بڑا نہ ہوتا تھا اور جس پر پلاسٹر وغیرہ بالکل نہیں ہوتا تھا۔ گھر کی پوری زندگی اسی کمرہ میں گذاری جاتی تھی یہیں بیگم اسمتھ کھانا پکاتی تھیں یہیں سیتی تھیں اور یہیں چرخہ کاتتی تھیں۔ پتھر کی انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر جسم کو گرم کیا جاتا تھا، کھانا پکایا جاتا تھا اور پڑھنے کے لئے روشنی حاصل کی جایا کرتی تھی۔ ہنری اور اس کے لڑکے خود ہی اپنے لئے اس لکڑی سے جسے گھر کے اردگرد کے درختوں کو کاٹ کر حاصل کیا جاتا تھا بھدی میزیں، کرسیاں اور اسی قسم کا فرنیچر کا دوسرا سامان بنا لیتے تھے۔ ان کی بیٹی جولی دریا سے نہانے اور کھانا پکانے کے لئے پانی لایا کرتی تھی اور آگ پر ایک برتن میں اسے گرم کیا کرتی تھی پورا دن کام کرتے کرتے گذر جاتا تھا۔ چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر باقی سب لوگوں کو اتنا کام کرنا پڑتا تھا کہ ان کی کمر ٹوٹ جاتی تھی۔

اب اس کے مقابلہ میں آج کل جس طرح امریکہ کے لوگ اپنی زندگی گذارتے ہیں اسے ملاحظہ کیجیے۔ آج کل ہر خاندان کے لوگوں کے استعمال کے لئے کئی کئی کمرے ہوتے ہیں جنھیں سردی میں آتش دان سے گرم کیا جاتا ہے اور گرمیوں میں بجلی کے پنکھوں سے ٹھنڈا رکھا جاتا ہے آپ گیس کھول دیتے ہیں یا بٹن دبا دیتے ہیں اور آپ کو پکانے کے لئے گرمی اور پڑھنے کے لئے روشنی مل جاتی ہے۔ آپ نل کی ٹونٹی گھماتے ہیں اور پانی گرم یا ٹھنڈا آپ کے نہانے کے ٹب یا برتن دھونے کے حوض میں گرنا شروع ہو جاتا ہے۔ کپڑا دھونے کی مشینیں، کپڑا سینے کی مشینیں، بجلی کی استریاں، خلاء کے ذریعہ کمرے کے اندر جھاڑنے اور اس کی صفائی — یہ تمام طریقے

ہیں جن سے آدمی اپنے آپ کو گھر کے کام کی سخت محنت سے بچا سکتا ہے۔ ایسی کون سی مفید چیز ہے جسے آپ دوکان سے جاکر یا قریب کے شہر کو فرمایش بھیج کر اپنے گھر کے لئے حاصل نہیں کر سکتے؟ جب کبھی آپ کو ضرورت ہوتی ہے کتابیں اور رسالے آپ کو نہایت کثیر تعداد میں دستیاب ہو سکتے ہیں؟

امریکہ کے غذا حاصل کرنے کے طریقوں میں تبدیلی

سنہ ۱۸۰۰ء میں اسمتھ کے گھر کے لوگوں کی غذا بہت سادہ ہوا کرتی تھی سردیوں میں صرف نمک لگا ہوا سور کا گوشت، مکئی کی روٹی اور آلو ملا کرتے تھے۔ اکثر غذا کی قلت رہتی تھی اور اس میں تنوع بہت کم ہوتا تھا۔ ربیع کی فصل میں ترکاری اپنی زمین میں بوئی جاتی تھی۔ کھانے کو بس یہی چیزیں ملتی تھیں۔

لیکن آج کتنا فرق ہو گیا ہے۔ اب گھر کے کونہ کی ایک الماری کے اندر پرچون کا سارا ذخیرہ نہیں رکھا جاتا بلکہ ہر چیز ضرورت کے وقت پڑوس کی پرچون کی دوکان سے حاصل کی جاتی ہے جس میں ٹیلیفون لگا ہوتا ہے۔ "ہیلو۔ کیا آپ پروننگ کی پرچون کی دوکان سے گفتگو کر رہے ہیں۔ دیکھئے میں مسز وارن، ۸۷ سیڈر اسٹریٹ سے بول رہی ہوں۔ مہربانی فرما کر میرے چھوٹے لڑکے کے لئے لفافہ میں بند کی ہوئی ایک ڈبل روٹی، ایک پونڈ دانہ دار شکر، ہڈی دار چوزہ کا ایک ڈبہ اور پانچ پونڈ آلو دے دیجئے۔ آپ کے یہاں فلوریڈا کی عمدہ نارنگیاں ہیں؟ اچھا تو آدھی درجن نارنگیاں بھی دے دیجئے، اور چین کی ایک پونڈ سبز چائے اور سمرنا کے انجیروں کا ایک پیکیٹ بھی بھیج دیجئے۔ اچھا بس۔ خدا حافظ"

ہر روز ہزاروں گوشت مارکٹوں، ڈیریوں، بیکریوں، اور پرچون کے اسٹوروں میں ٹیلیفون کے ذریعہ اس قسم کے کھانے کی فرمائشیں آتی ہیں جنہیں سنہ ۱۸۰۰ء میں ہرگز نہیں خریدا جا سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں امریکہ میں اس قسم کے کھانوں کو پیدا ہی نہیں کیا جاتا تھا آج امریکہ کی اکثر آبادیوں میں لوگ، اسٹورز کو ٹیلیفون کے ذریعہ اپنی غذا کی روزانہ رسد کے لئے فرمائش بھیج سکتے ہیں۔

لیکن امریکہ کی غذا کے تنوع میں جو کچھ اضافہ ہوا ہے اس کی اہمیت اور چیزوں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ نہیں ہے ایسی جو چیز دلچسپ ہے وہ یہ ہے کہ امریکہ کے لوگوں کو اکثر غذائیں تیار شدہ فوری استعمال کے لایق مل سکتی ہیں۔ گوشت، ترکاری اور پھلوں کو ٹین کے ڈبوں میں بند خریدا جا سکتا ہے۔ جس کھانے کو تیار کرنے میں ۱۸۰۰ء میں پورا دن لگ جاتا اب وہ پرچون کے اسٹور سے خریدنے کے بعد صرف چند منٹوں کے اندر دسترخوان پر چنا جا سکتا ہے اس تیار شدہ غذا کی وجہ سے محنت اور وقت کی بہت زبردست کفایت ہو گئی ہے۔

کپڑوں کے بنانے میں تبدیلیاں ہنری اسمتھ کا چچازاد بھائی ولیم ۱۸۰۰ء میں اوہیو کی نئی زمینوں میں جا کر آباد نہیں ہوا بلکہ وہ نیویارک کے گاؤں میں ہی مقیم رہا اور اپنی روزی حاصل کرنے کے لیے جوتے بنانے لگا۔ وہ لکڑی کی بنچ کے ایک سرے پر بیٹھ کر جس کی نشست چمڑے سے منڈھی ہوا کرتی تھی کام کیا کرتا تھا اور بنچ کے دوسرے سرے پر اس کے تمام اوزار رکھے رہتے تھے منہ میں کیلیں بھری رہتی تھیں اور وہ نہایت سخت محنت کے ساتھ جوتے کو کاٹتا، کھینچتا، ٹانکا، ٹھوکا، کھرچا اور ملا کرتا تھا۔ بہت تیزی سے کام کرنے کی صورت میں دو تین دن کی محنت کے بعد ایک جوڑا جوتا تیار ہوتا تھا۔ یہ جوتے مضبوط اور دیرپا تو ضرور ہوتے تھے لیکن وضع میں بھدّے ہوتے تھے۔

آج ہمارے لیے فیکٹریوں میں سینکڑوں آدمی مل کر جوتے بناتے ہیں۔ ایک جوڑ جوتا بنانے کے لئے ایک سو پچاس سے زیادہ مختلف مشینوں کو استعمال کیا جاتا ہے جہاں مشینیں خوب ترقی یافتہ ہیں وہاں اگر سوکھنے کے وقت کو شمار نہ کیا جائے تو ایک جوڑا تیس چالیس منٹ کے اندر تیار ہو جاتا ہے اور ہر روز ہزاروں خوبصورت جوتے بنا کر تیار کر دئے جاتے ہیں۔

کپڑے بنانے میں بھی اس فرق کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ابتدا میں جن لوگوں نے نوآبادیاں بسائیں ان کے گھروں پر ہی عورتیں سوت کاتا اور کپڑا بنا کرتی تھیں۔ جب کپڑا بن کر تیار ہو جاتا

تو اسے ہاتھ سے ہی کاٹا اور سیا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سنہ ۱۸۰۰ء میں سلے ہوئے کپڑوں کو ایک بیش قیمت چیز سمجھا جاتا تھا۔

لیکن آج کل مشین کی دنیا میں کام بالکل مختلف طریقہ پر کیا جاتا ہے۔ پرانے چرخے ختم ہو گئے ہیں۔ ہاتھ کے کرگھے صرف عجائب خانوں میں نظر آتے ہیں اور ان کی جگہ آج کل ہزاروں ملیں سوت کاتنے اور کپڑا بننے کے لئے قائم کر دی گئی ہیں اور کپڑے کاٹ کر سینے کے لئے بھی بڑی بڑی فیکٹریاں کھڑی کر دی گئی ہیں۔

ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی میں حیرت انگیز تبدیلی

لیکن سنہ ۱۸۰۰ء کی زندگی اور آج کی زندگی میں سب سے زیادہ نمایاں فرق سفر کرنے کے طریقوں میں نظر آتا ہے مثلاً آج کل امریکہ کے بڑے شہروں کے بہت سے آدمی اپنے کام کی جگہ سے چالیس یا پچاس میل کے فاصلہ پر رہتے ہیں لیکن روزانہ صبح شام اپنے گھر آ جا سکتے ہیں۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں اس فاصلہ کو طے کرنے کے لئے دو تین دن صرف ہوتے تھے اور بجائے کسی عمدہ سڑک پر آرام دہ ٹرین یا تیز رفتار موٹر میں سفر کرنے کے اس زمانہ کے لوگوں کو یا تو پیدل سفر کرنا پڑتا تھا یا گھوڑے کی پیٹھ پر یا ڈاک کی شکرموں وغیرہ میں خاص خاص سڑکیں تو اچھے موسم میں غنیمت ہوتی تھیں لیکن جب بارش کا سلسلہ طول پکڑ جاتا تھا تو ان پر سفر کرنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ نوآباد علاقوں کی سڑکیں بس لیکیں ہوتی تھیں جن پر پیدل یا گھوڑے کی پیٹھ پر سفر کیا جا سکتا تھا۔ اکثر سڑکوں پر بیس میل کا فاصلہ دن بھر میں طے کیا جا سکتا تھا اور حالات اگر بہت اچھے ہوتے تب چالیس میل کے سفر کو انتہا سمجھا جاتا تھا۔

آج کل دن میں ہوائی جہاز اور رات میں ایکسپریس ریل گاڑی کو استعمال کر کے امریکہ کے پورے برِ اعظم کا سفر دو دن میں کیا جا سکتا ہے۔ ملک کے بعید ترین گوشوں کو بھی پکی اور عمدہ سڑکوں کے ذریعہ ملا دیا گیا ہے۔

خبر رسانی میں بھی خوب ترقی ہو گئی ہے۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں اس کا انحصار تیز ترین سواری پر

ہوا کرتا تھا لیکن آج امریکہ کے لوگ اپنے ملک کے کسی شہر میں بلکہ لندن تک میں اپنے دوستوں سے ٹیلیفون کے ذریعہ چند منٹ کے اندر بات کر سکتے ہیں ریڈیو کے ذریعہ الفاظ تیزی کے ساتھ روانہ کیے جا سکتے ہیں۔ قطب جنوبی کے حالات دریافت کرنے کے لئے جو لوگ جاتے ہیں وہ اپنے امریکہ کے دوستوں سے برابر گفتگو کر سکتے ہیں۔

غرضکہ ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی میں ایسی ایسی حیرت انگیز تبدیلیاں واقع ہوگئی ہیں۔

قوت متحرکہ میں تبدیلیاں | لوگوں کے رہنے سہنے کے طریقوں میں جو یہ تبدیلیاں ہوئیں ہیں ان کے کئی اسباب ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ اہم سبب وہ ایجادیں ہیں جن کے ذریعہ سے مشینوں کو قوت متحرکہ سے چلایا جا سکتا ہے۔

۱۸۰۰ء میں کام زیادہ تر انسان اور جانوروں کے رگ پٹھوں کے ذریعہ کیا جاتا تھا۔ اور صرف ہوا اور پانی کی قوت کو ابتدائی طریقوں پر استعمال کرنا ممکن تھا۔ ہنری اسمتھ کو اپنا اناج ہاتھ سے پیسنا پڑتا تھا اور چکی کے بھاری پاٹوں کو چلانا بڑا مشکل کام تھا۔ شہروں میں بھی جس تک گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر پورے دن میں پہنچا جا سکتا تھا سست رفتار کے ساتھ چلنے والے پانی کے پہیوں یا ہوا چکیوں کے ذریعہ ضروری قوت متحرکہ پیدا کی جا سکتی تھی ہر جگہ کھیتوں کو گھوڑے یا بیلوں کی مدد سے لکڑی کے ہل سے جوتا جا سکتا تھا۔ فصل کی کٹائی ہنسیے کے ذریعہ کی جا سکتی تھی۔ ایری کی نہر کو ۱۸۱۷ء تا ۱۸۲۵ء کو سینکڑوں آدمیوں نے کدالوں اور پھاوڑوں سے کھود کھود کر بنایا تھا۔

لیکن آج کل زمین کی جتائی، فصل کی کٹائی اور غذا کی تیاری کے تمام کام تیزی اور آسانی کے ساتھ مشین کے ذریعہ کئے جاتے ہیں۔ نہر ایری کے مکمل ہونے کے تقریباً ایک صدی بعد قوت متحرکہ سے چلنے والے دخانی پھاوڑوں اور دوسری بڑی بڑی مشینوں نے نہر پناما کو ایک ایسے پہاڑ کے درمیان سے کھود کر نکالا جو سات میل چوڑا تھا۔ اگر محض انسان کے رگ پٹھوں پر بھروسہ کیا جاتا تو منطقہ حارہ کے اس گرم اور بیماریوں اور وباؤں سے بھرے ہوئے علاقہ

میں نہر کھودنا اور بحر اوقیانوس کو بحر الکاہل سے ملانا ناممکن ہو جاتا۔

آج کل قوت متحرکہ انسان کے دکھتے ہوئے رگ پٹھوں سے نہیں بلکہ بھاپ کے شور اور بجلی کی خاموشی سے فراہم کی جاتی ہے۔ بیسیوں دریاؤں کے پانی کو نہایت زور کے ساتھ پہیوں پر گرا کر ان کو تیزی سے متحرک کیا جاتا ہے اور ان کی اس حرکت سے بجلی پیدا کی جاتی ہے جسے تانبے کے تاروں کے ذریعہ میلوں دور لے جا کر سینکڑوں مشینوں کے پہیوں کو چلایا جاتا ہے۔ مشین کی مدد سے مزدور کی قوت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

اوپر کے بیان کا یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہیئے کہ امریکہ کے تمام لوگ سنہ ۱۸۰۰ء میں ایسی ہی زندگی بسر کر رہے تھے جیسی کہ ہنری اسمتھ کی بیان کی گئی۔ ہنری اسمتھ نوآباد علاقہ میں زندگی گذار رہا تھا۔ لیکن جو لوگ بحر اٹلانٹک کے ترقی پذیر شہروں مثلاً بوسٹن، نیویارک، فلاڈلفیا میں زندگی گذار رہے تھے ان میں بہت سے دولت مند تاجر، وکیل اور بادبانی جہازوں کے مالک تھے۔ ورجینیا اور دوسری جنوبی ریاستوں میں بڑے بڑے فارموں کے مالک ایسے دولت مند لوگ تھے جن کے پاس بہت سے ملازم ہوا کرتے تھے اور جو نہایت باریک ریشم اور ساٹن لندن کے تاجروں سے خریدا کرتے تھے۔ شہر کے موچیوں اور دوسرے کام کرنے والوں کے مکان بھی نوآبادیوں میں بسنے والے لوگوں کے مقابلہ میں بہتر ہوا کرتے تھے۔ لیکن بصورت مجموعی امریکہ کے لوگوں کی اکثر تعداد غریب تھی اور انھیں بہت سخت محنت کرنا پڑتی تھی۔ وہ بہت کم سفر کرتے تھے۔ ان کی تعلیم تقریباً بالکل نہیں ہوتی تھی اور بہت کم کتابیں پڑھ سکتے تھے۔ بہت بڑی حد تک گاؤں یا قصبہ کے لوگوں کو اپنے علاقہ اور اپنی ذاتی محنت کی پیداوار پر ہی دارومدار کرنا پڑتا تھا اور باہر کے ملکوں کی مختلف پیداواروں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔

لیکن اگر توجہ کو صرف نوآبادیوں تک ہی محدود رکھ کر دیکھا جائے کہ سنہ ۱۸۰۰ء میں ان کی زندگی کیسی تھی اور آج ان کی زندگی کیا ہے تو اس فرق کو ذیل کے نقشہ کے ذریعہ ظاہر کیا جا سکتا ہے:۔

سنہ ۱۸۰۰ء میں	آج
۱۔ چھوٹے بھدی وضع کے لکڑی کے مکان، جن میں کمرے بہت کم ہوتے تھے اور سردی گرمی کے بچاؤ کا بندوبست بھی خراب ہوتا تھا۔ خانہ داری کی سہولتیں بھی بہت کم تھیں۔	۱۔ بہت سے کمروں کے موسم کے اثرات سے محفوظ مکانات جنھیں اینٹوں، سیمنٹ، کنکریٹ، فولاد اور لکڑی سے بنایا جاتا ہے اور جن کے اندر بہت سی اور دوسری آسانیاں اور سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔
۲۔ چند سادہ قسم کے کھانے جنھیں بھدے اوزاروں کے ذریعہ گھر کے کھیتوں سے حاصل کر کے گھر کے اندر ہی تیار کیا جاتا تھا غذا میں تنوع بہت کم ہوتا تھا اور اکثر غذا کی قلت رہتی تھی۔ غذا کا حاصل کرنا بہت کچھ موسموں کا پابند تھا۔	۲۔ کھانے میں کثیر تنوع جن میں سے بہت سی چیزیں اکثر ان ریاستوں اور ملکوں میں حاصل کی جاتی ہیں جو گھر اور وطن سے بہت دور واقع ہیں انھیں مشینوں سے بڑی تعداد میں تیار کرایا جاتا ہے اور عالمگیر ذرائع نقل و حمل اور خبر رسانی کے ذریعہ انھیں اپنی آبادی میں لایا جاتا ہے۔
۳۔ سادہ اور سپاٹ قسم کے کپڑے اور کھالیں جن کو گھر کے لوگوں کی محنت سے ہی تیار کیا جاتا تھا۔ ان گھر کے بنے ہوئے کپڑوں کی وضع میں تنوع بہت کم ہوتا تھا۔	۳۔ مختلف قسم کے دلکش اور دیدہ زیب کپڑے جنھیں بڑی مقدار میں خاص خاص مشینوں سے تیار کیا جاتا ہے اور ان کے تیار کرنے میں تمام دنیا سے سامان حاصل کر کے لگایا جاتا ہے اور انھیں مقامی اسٹوروں سے خریدا جاتا ہے۔
۴۔ صرف ضروری سفر کیا جاتا تھا لیکن سڑکیں کم اور خراب تھیں۔ سفر یا تو پیدل کیا جاتا تھا یا گھوڑے کی پیٹھ یا بھدی گاڑیوں اور کشتیوں میں۔ پیغامات اور خبروں کا پہنچانا بھی اتنا ہی مشکل اور آہستہ ہوتا تھا۔	۴۔ کاروبار اور تفریح کے لئے بہت زیادہ سفر کیا جاتا ہے جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی سڑکوں، ریلوں، آبی راہوں کی وجہ سے بہت سہل ہو گیا ہے۔ پیغامات اور خبریں ڈاک خانوں، ٹیلیگراف، ٹیلیفون اور وائرلیس کے ذریعہ بہت تیزی سے روانہ کی جاسکتی ہیں۔
۵۔ آدمیوں اور جانوروں کے رگ پٹھوں اور ہوا اور پانی کی قوت سے کام لیا جاتا تھا۔ لوگ "قدرتی" قوت پر بھروسہ کرتے تھے اس لئے کام میں محنت زیادہ تھی اور کارگزاری کم	۵۔ مشین کے لئے قوت محرکہ کی بہت بڑی مقدار بھاپ، گیس اور بجلی کے انجنوں سے حاصل کی جاتی ہے۔ ان سے مشینیں چلتی ہیں جو کام کو کفایت اور زیادہ کارگزاری کے ساتھ کرتی رہتی ہیں۔

ہمارے ذرائع نقل و حمل نے کس طرح ترقی کی؟

موجودہ زمانے میں، ریلوں، موٹروں اور دخانی جہازوں نے کرۂ زمین کے کروڑوں آدمیوں کو جو سینکڑوں ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب کر دیا ہے۔ ہم اپنی ضرورت کی معمولی معمولی چیزوں کے لئے ان مقامات پر دارومدار کرنے لگے ہیں جو ہم سے ہزاروں میل دور ہیں۔ ہمارے عزیز و قریب ہم سے جدا ہو کر ہزاروں میل دور چلے جاتے ہیں لیکن ہمیں کوئی فکر اور پریشانی نہیں ہوتی کیونکہ ان کی خبر ہمیں فوراً کے فوراً مل سکتی ہے اور ضرورت کے وقت چند دن کے اندر اندر ہم ان سے دوبارہ مل سکتے ہیں۔

لیکن انسانوں کو یہ آرام و اطمینان بہت حال ہی میں حاصل ہوا ہے۔ چند سیاح اور تاجر تو پرانے زمانہ میں بھی قیمتی مال لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر کیا کرتے تھے لیکن یہ سفر بہت خطرناک ہوتے تھے۔ ان کو پورا کرنے میں بہت مدت صرف ہوتی تھی اور اس عرصہ میں انھیں اپنے عزیز و احباب سے بالکل بے خبر رہنا پڑتا تھا۔ پرانی دنیا کے آدمی نہ تو اس قدر کثیر تعداد میں سفر کرتے تھے جیسے آج کرتے ہیں اور نہ دنیا کا مال اس قدر کثیر مقدار میں مختلف ملکوں کو اس قدر جلد اور کم صرف کے ساتھ روانہ کیا جا سکتا تھا۔ ہندوستان کی پرانی تہذیب مصر اور چین کی پرانی تہذیبیں غرض کہ کرۂ زمین کے کسی مقام کے رہنے والوں کو تاریخ کے کسی زمانہ میں ایسے ذرائع نقل و حمل اور رسل و رسائل کا علم نہیں تھا جیسا کہ آج ہمیں حاصل ہے۔ ذرائع نقل و حمل میں یہ تمام ترقی صنعتی انقلاب یعنی سنہ ۱۷۵۰ء کے بعد ہوئی ہے۔

ذرائع نقل و حمل کی ترقی کی تاریخ نہایت دلچسپ ہے۔ نقل و حمل کا سب سے پہلا ذریعہ انسان کے اعصاب تھے۔ اس کی کمر، اس کے بازو، اس کے شانے، اس کا سر ان ہی

پر ابتدا میں چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھا کر لے جایا جاتا تھا۔ "نینڈر تھل انسان" یعنی انسانوں کے باوا آدم کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا ظہور یورپ میں آج سے ۵ لاکھ سال پہلے ہوا تھا۔ اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو ظاہر ہونے کے ہزاروں سال بعد تک یہ نینڈر تھل آدمی اور اس کی اولاد اپنی کمر اور بازوؤں کو ہی چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے استعمال کرتی رہی۔ دنیا کے بہت سے پس ماندہ حصوں میں آج بھی وزن کو منتقل کرنے کا یہی طریقہ رائج ہے مثلاً چین، افریقہ اور ہندوستان میں اشیا کی ایک کثیر مقدار کو انسانی اعصاب کی قوت کے ذریعہ سے ہی منتقل کیا جاتا ہے۔

لیکن ایک طویل مدت گذر جانے کے بعد آدمیوں نے آہستہ آہستہ جانوروں کو اپنے بوجھ اٹھانے اور اپنے وزن کھینچنے کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ اپنے وزنی بوجھوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے انسان اس قدر بے تاب تھا کہ جس جانور کو بھی یہ اپنے قابو میں لا سکا اسی پر اس نے اپنا بوجھ لادنا شروع کر دیا۔ اگر ان تمام جانوروں کو ایک جگہ جمع کیا جا سکے جن کو انسانوں نے باربرداری کے لئے استعمال کیا ہے تو ایک دلچسپ سرکس اور اچھا خاصا جانوروں کا عجائب خانہ تیار ہو جائے۔ ہندوستان کے ہاتھی، عرب اور مصر کے اونٹ، فلسطین اور دوسرے بحر روم کے ملکوں کے گدھے، جنوبی امریکہ کے پہاڑوں کے لاما، فلپین اور سیام کے دریائی بھینسے، سست رفتار بیل، منگولیا کے ٹٹو، مضبوط پہاڑی گھوڑے اور خچر وغیرہ وغیرہ سب ہی کو اس فہرست میں شامل کرنا ہو گا۔ ان جانوروں کی پیٹھ پر تاریخ کے ایک طویل زمانہ تک تجارت کا سامان منتقل کیا جاتا رہا اور اب بھی ایسی دور افتادہ اور پس ماندہ جگہوں میں جہاں عمدہ سڑکیں نہیں ہیں انہی کو سامان کے منتقل کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد پہیوں کا رواج شروع ہوا۔ تاریخ کے مطالعہ سے اس شخص کے نام کا تو پتہ نہیں چلتا جس نے سب سے پہلے پہیے کو ایجاد کیا۔ غالباً غار میں رہنے والا کوئی کاہل

اور احدی آدمی تھا جس نے اپنے سر پر بوجھ لادنے کی جگہ کمر پر زور ڈالنا زیادہ پسند کیا اور لکڑی کے موٹے موٹے لٹھوں کو لڑھکاتے لڑھکاتے اسے اس بات کا پتہ چلا کہ لکڑی کے لٹھوں کو لادنے کی جگہ ان کو لڑھکانا زیادہ سہل ہے۔ بہر حال اس بات کو ہم وثوق کے ساتھ کر سکتے ہیں کہ ابتدائی زمانہ میں موٹے گول لٹھوں کو بھاری چیزوں کو حرکت دینے کے لئے استعمال کیا جایا کرتا تھا۔ بعض ملکوں میں مثلاً چین اور ہندوستان میں آج بھی بعض گاڑیاں ایسی ملتی ہیں جن کے پہیے گول اور موٹے لٹھوں کے محض چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر بنا لیے جاتے ہیں لیکن اس قسم کے ٹھوس پہیے جلد چٹخ جاتے ہیں اور سخت کھردری زمین پر جلد گھس جاتے ہیں ان کا وزن زیادہ ہوتا ہے اور ان کا کھینچنا یا ان کو دھکا دے کر آگے بڑھانا مشکل ہوتا ہے اس لئے آہستہ آہستہ انسانوں نے ان کی اصلاح کرنی شروع کی۔ لٹھوں کے بیچ کے حصہ کو کھوکھلا کیا جانے لگا اور پہیے کی مضبوطی کو قائم رکھنے کے لئے اس میں آر پار ڈنڈے یا تختے لگائے جانے لگے اور انھیں تختوں میں سے ایک دوسرے کو قائم اور پہیہ کو متحرک رکھنے کے لئے کچھ ابتدائی وضع کے ساتھ استعمال کیا جانے لگا۔ اس کے بعد پھر اور ہزاروں سال گذر گئے تب کہیں جاکر انسانوں نے پہیوں کی تعمیر میں اور زیادہ اصلاحیں کیں۔ مدار، دُھرا، ارا، گھیرا اور ہال استعمال کرنا شروع کیا گیا لیکن یہ سب لکڑی کے ہوتے تھے۔ ہمارے پاس اس بات کے لئے کافی ثبوت موجود ہے کہ پہیے کی اس اصلاح شدہ شکل کو انسانوں نے آج سے کئی ہزار سال پہلے سیکھ لیا تھا۔ کیونکہ قدیم مصریوں، اسیریا والوں، چینیوں اور ہندوستانیوں کے پاس ایسی پہیے دار گاڑیاں تھیں جن میں پہیے کے موجودہ اصولوں سے بہت بڑی حد تک فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔

پہیے کے رواج کے بعد انسان پہلے کے مقابلہ میں بڑی بڑی وزنی چیزوں کو زیادہ سہولت کے ساتھ اٹھانے لگا۔ مضبوط جانوروں کے مقابلہ میں چونکہ انسان جلد تھک جاتا ہے اس لئے انسانوں نے جانوروں کو اپنی پہیے دار گاڑیوں کے کھینچنے کے لئے استعمال

کرنا شروع کر دیا۔ بعض ملکوں میں گاڑیوں کے کھینچنے کے لیے بیلوں کا استعمال کیا جانے لگا۔ بیل مضبوط تو ضرور تھا لیکن اس کی چال سست تھی۔ اس لیے آدمیوں نے گھوڑوں کو وزن کھینچنے کے لیے سدھانا شروع کیا۔ گھوڑے بیلوں کے برابر وزنی بوجھ تو نہیں کھینچ سکتے تھے لیکن وہ ہلکے وزن کو تیزی کے ساتھ کھینچنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ اس لیے بہت سے ملکوں میں گھوڑے کا رواج عام ہو گیا۔

گاڑیاں روز بروز بہتر قسم کی بنائی جانے لگیں۔ پہیوں کی بھی اصلاح کی گئی لیکن رفتار کی تیزی اور مال کی مقدار کا دارومدار جانوروں کی طاقت اور تیزی پر ہی رہا۔

اس کے بعد پھر ہزاروں سال گذر گئے اور لوگ اپنی بھدی اور سست رفتار گاڑیوں کو استعمال کرتے رہے۔ پھر ۱۷۵۰ء کے بعد صنعتی انقلاب ہوا اور سو سال کے اندر ذرائع نقل و حمل اور خبر رسانی میں مکمل تبدیلی پیدا ہو گئی۔ انجنوں کی طاقت کو صرف چیزوں کے بنانے کے لیے ہی نہیں بلکہ انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ جس زمانہ میں آدمی مشینوں کو قوت متحرکہ کے ذریعہ سے چلانا سیکھ رہے تھے اسی زمانے میں ریل گاڑیوں، بحری جہازوں، موٹروں اور ہوائی جہازوں کو بھی قوت متحرکہ کے ذریعہ سے چلانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

میکانکی قوت کی وجہ سے ذرائع نقل و حمل کی رفتار اور ان کی بوجھ لے جانے کی قوت میں بہت اضافہ ہو گیا۔

گھوڑوں کے ذریعہ سے گاڑیوں کو پانچ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہر روز چالیس میل تک کھینچا جا سکتا تھا۔ لیکن دخانی یا گیس انجن کے ذریعہ ریلوں اور موٹروں کو ساٹھ اور اسی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دن و رات کھینچا جا سکتا ہے۔ سال بہ سال میکانکی قوت کے ذریعہ گاڑیوں میں مال لے جانے کی اہلیت بڑھتی جا رہی ہے۔ آج ایک بڑی موٹر لاری میں جسے صرف ایک آدمی چلاتا ہے اتنا وزن لاد کرلے جایا جا سکتا ہے جسے آٹھ سو آدمی اپنی پیٹھ پر

اٹھا سکتے ہیں اور پھر وقت کے حساب سے مقابلہ کیا جائے تو اسی مدت میں کم سے کم پانچ گنا زیادہ دور لے جایا جا سکتا ہے۔ ایک مال گاڑی میں جسے صرف ۲ آدمی چلاتے ہیں جو بوجھ یہ چھ آدمی اٹھا سکتے تھے اس سے ۲۰ ہزار گنا زیادہ مال لادا جا سکتا ہے۔

ذرائع رسل و رسائل کی تیز رفتاری میں ذرائع نقل و حمل سے بھی بہت زیادہ ترقی ہوگئی ہے۔ آج سے پچھتر سال پہلے تک پیغام کی رفتار، پیغام بردوں کی رفتار کی پابند ہوا کرتی تھی یہ لوگ پیدل یا گھوڑے یا گاڑی یا بادبانی کشتی ریل یا دخانی جہاز پر سوار ہو کر سفر کرتے تھے لیکن اس کے بعد حیرت انگیز ایجادیں ہوئیں انھوں نے ہمارے لیے اس بات کو ممکن کر دیا ہے کہ اپنے پیغامات کو ہوا کے ذریعہ چند لمحوں کے اندر بجلی کی کوند کی طرح منتقل کر سکیں۔ ٹیلیفون کی ایجاد سے پہلے ایک آدمی کی آواز دو سو تین سو فٹ تک ہوا میں سنائی دے سکتی تھی لیکن ٹیلیفون کے ذریعہ تین ہزار میل تک آواز کو پہنچایا جا سکتا ہے ریڈیو اور وائرلیس کے ذریعہ آواز دس ہزار میل بلکہ اس سے زائد دور لے جائی جا سکتی ہے۔

ویران سمندروں میں کیبل کا جال بچھا ہوا ہے اور ہمارے پیغامات سمندر کی گہرائی کی اس مٹی اور گونگھوں میں سے ہو کر گذرتے ہیں جہاں تک سورج کی روشنی کبھی نہیں پہنچ سکتی۔ ریڈیو کے پیغامات زمین سے ہزاروں میل دور سمندر میں جہازوں تک پہنچائے جا سکتے ہیں اور جہاز اُن کا جواب دیتے رہتے ہیں جہاز کے سمندری راستوں میں اگر برف کی تیرتی ہوئی چٹانیں موجود ہوتی ہیں تو ان کی اطلاع ریڈیو کے پیغام کے ذریعہ تمام جہازوں کو نشر کی جا سکتی ہے اور وہ اپنا راستہ بدل سکتے ہیں۔ لندن اسٹاک اکسچینج میں حصوں وغیرہ کا جو بھاؤ سہ پہر کے وقت ہوتا ہے اس کا علم نیویارک والوں کو دوپہر کے کھانے سے پہلے ہو جاتا ہے[۵]۔

---

[۵] نیویارک میں لندن کے مقابلہ میں سورج تین چار گھنٹہ دیر میں طلوع و غروب ہوتا ہے۔

بنیادی قومی تعلیم میں ربط سے کیا مراد ہے؟

(از جناب سید احمد علی صاحب نگراں مدرسہ ابتدائی قرول باغ دہلی)

(مضمون نگار صاحب جامعہ کے ابتدائی مدرسہ واقع قرول باغ میں نگراں مدرسہ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ گذشتہ سال مدرسہ کی چوتھی جماعت میں بنیادی قومی تعلیم کے نصاب کے مطابق پڑھائی کا تجربہ کیا گیا تھا۔ یہ تجربہ احمد علی صاحب اور ان کے رفقار کی کوششوں سے بہت کامیاب رہا تھا۔ اس سال ابتدائی مدرسہ کی پہلی پانچ جماعتوں میں یہ تجربہ شروع کیا جائے گا۔ احمد علی صاحب کا یہ مضمون اس حیثیت سے خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کا مستحق ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ذاتی تجربہ اور عملی کوشش کے نتیجہ پر مبنی ہے ہم دوسرے اہل فکر و تجربہ حضرات کو بھی دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں مدیر)

بنیادی قومی تعلیم کے نصاب میں حرفوں کے ذریعہ بچہ کی تعلیم اور تربیت پر بہت زور دیا گیا ہے، لہٰذا اس اسکیم کے چلانے والوں کے سامنے چند ایسے خیالات اور اصولوں کا ہونا ضروری ہے جو تجربہ پر مبنی ہوں ۔ تاکہ ان اصولوں اور خیالات کی روشنی میں کام کرنے والوں کے لئے ایک حد تک آسانی ہو جائے۔ لیکن جو کچھ میں نے اپنے تجربہ کے دوران میں محسوس کیا ہے اور جس کو میں چند تعلیمی اور نفسیاتی اصولوں کے ماتحت لانا چاہتا ہوں وہ چیز اٹل نہیں ہو سکتی۔ تجربہ کے ساتھ اس میں تبدیلی ہوتی رہے گی لیکن فی الحال جبکہ ملک کے گوشہ گوشہ میں لوگ ایسے طریقہ سے تعلیم دینے کے لئے آمادہ ہو رہے ہیں چند اصولوں کا سامنے رکھنا ضرور مفید ہوگا۔

"ربط سے کیا مراد ہے؟" "یہ عمل قدرتی طور پر کس طرح واقع ہوتا ہے؟" "یعنی تمام مضامین کی تعلیم حرفہ کے ذریعہ کس طرح ہو سکتی ہے؟" "حرفہ میں کون کون سے ایسے عناصر موجود ہیں جن سے تمام مضامین کی پڑھائی وابستہ کی جا سکتی ہے؟" اس سوال کا جواب میں حرفوں اور دستکاریوں کی مختلف حیثیتوں اور بچہ کے فطری رجحانات اور صلاحیتوں کو پیش نظر رکھ کر دوں گا لیکن اس سے پہلے کہ کوئی بات

پیش کی جائے ہمیں بنیادی قومی تعلیم کی کمیٹی کی ہدایت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ رپورٹ ہماری اس قدر ہدایت کرتی ہے "جو حرفہ انتخاب کیا جائے وہ ماحول کے مطابق ہو" یا دوسری جگہ یہ بیان کیا گیا ہے "جو حرفہ چنا جائے وہ تعلیم کے لئے مناسب ہو، اسے انسان کے ضروری کاموں اور دلچسپیوں سے قدرتی طور پر لگاؤ ہو، اور وہ تعلیم کے پورے نصاب میں پھیلایا جا سکے"۔ اس مختصر سی عبارت سے اس معاملہ کی مکمل طور پر تشریح نہیں ہوتی۔ لیکن پھر بھی چند باتیں بالکل صاف طور پر نظر آتی ہیں مثلاً :-

(الف) حرفہ کا انتخاب ماحول کے مطابق ہو، یعنی مدرسہ اگر ایسی بستی میں ہو جہاں لوگ چمڑے کا کاروبار کرتے ہوں تو وہاں بنیادی حرفہ چمڑے کا کام ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس مدرسہ کے بچوں کو اس حرفہ سے قدرتی لگاؤ ہوگا۔ اور اس قدرتی لگاؤ کی وجہ سے تمام اس تعلیم کا جو اس حرفہ کے ذریعہ دی جائے گی بچہ پر خاطر خواہ اثر مرتب ہوگا اور بچہ بہت دلچسپی سے اس تعلیم میں حصہ لینے پر آمادہ نظر آئے گا، ماحول کے مطابق حرفہ کا انتخاب کرنے میں بچہ کے سماجی اور قدرتی ماحول کی تعلیم میں بھی براہ راست لگاؤ ہوگا۔

(ب) چنے ہوئے حرفہ میں اتنی صلاحیت ہونی چاہیئے کہ وہ تعلیم کے پورے نصاب میں پھیلایا جا سکے یعنی اس میں اس قدر نئے اور حقیقی مواقع REAL LIFE SITUATIONS پیدا ہوتے رہنے چاہئیں کہ ان مواقع سے فائدہ اٹھا کر نصاب کی ساری باتیں سکھائی جا سکیں اس طرح کہ بچوں کی دلچسپی ان میں برابر قائم رہے۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ حرفوں کا جائزہ لیا جائے کہ آیا ان میں اتنی صلاحیت RICHNESS ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ بنیادی قومی تعلیم کے نصاب میں جن حرفوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کا جائزہ لینے سے ہمیں ذیل کی چند باتیں خاص طور پر نظر آتی ہیں۔

(۱) ہر حرفہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ مثلاً لوگوں نے اپنی کس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اس کو شروع کیا؟ کہاں شروع کیا؟ ابتداء میں اس کی کیا صورت تھی یعنی کس حالت میں انسانی

ضروریات کے لئے استعمال ہوتا تھا؟ دوسری جگہوں میں اس کا رواج کیسے ہوا؟ کیا دوسری جگہ کے لوگوں نے اس میں کچھ تبدیلی کی؟ یا ویسے ہی اختیار کرلیا۔ اس حرفہ کو بہتر طریقہ پر کرنے کے لئے کب کب کن کن لوگوں نے کیا کیا کوششیں کیں وغیرہ وغیرہ؟ کاغذ بنانا (کاغذ کی ترقی کی تاریخ) ریشم، اون اور روئی کے کپڑے تیار کرنے میں اس قسم کے تمام درجوں سے جن کا تعلق گذشتہ زمانہ کے واقعات اور سماجی اثرات سے ہے گزرنا پڑتا ہے۔ اور یہاں تاریخی واقعات بیان کرنے میں بالکل قدرتی لگاؤ نظر آتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ مختلف ممالک کے حالات جاننے کی ضرورت بھی اس حرفہ کا ایک جزلاینفک معلوم ہوتی ہے۔ اس بات کے پیش نظر ٹریننگ اسکول کے نصاب میں اُن حرفوں کی تاریخی حیثیت پر مشتمل ایک نصاب ہونا چاہیئے جو بنیادی قومی تعلیم کے حرفے کے نصاب میں دیئے ہوئے ہیں۔ حرفوں کے شروع ہونے کے زمانوں اور ان ملکوں کے حالات پر زور دینا چاہیئے جہاں انھوں نے نشو ونما پائی۔ اس نصاب میں ان تمام سماجی اثرات کو بھی شامل کرنا چاہیئے جن کی وجہ سے مختلف حرفے ترقی کرتے کرتے ہمارے سامنے موجودہ صورت میں آئے۔

(۲) مختلف زمانوں میں بعض حرفوں کو خاص اہمیت رہی ہے لیکن لوگوں کے مذاق کے بدلنے سے اس کی وہ اہمیت نہ رہی۔ اس کے علاوہ کسی دوسری دستکاری نے اس کی جگہ لے لی اور اس طرح اس کا رواج کچھ کم ہوگیا مثلاً کسی زمانہ میں ریشم اور اون کے کپڑے کا رواج تھا۔ لیکن روئی اور بعدہٗ لینن کے کپڑے کے رواج سے ریشم اور اون کے کپڑوں کی وہ اہمیت نہ رہی۔ یہاں بھی ان تاریخی اثرات اور ایجادات کے مطالعہ کا موقع ملتا ہے جنھوں نے ان تبدیلیوں پر اثر ڈالا۔

(۳) گذشتہ زمانہ میں مختلف حرفوں کی ترقی انھیں مقامات پر ہوتی تھی جہاں ابنائے حکومت سکونت اختیار کرتے تھے۔ لہٰذا مختلف دستکاریوں کے ماہرین کی جماعت وہیں پیدا ہوجاتی تھی جہاں بادشاہ یا راجہ رہا کرتا تھا اور یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ اکثر حرفوں کی نشو ونما انھیں شہروں

میں ہوئی جہاں بادشاہ یا راجہ کی راج دھانی تھی مختلف دستکاریوں نے بادشاہ یا راجہ کے شوق کے لئے کوئی چیز بنائی۔ اگر پسند ہوگئی تو رواج ہوگیا اور دوسرے لوگوں نے بھی برتنا شروع کر دیا نہیں تو اس کو کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ اس قسم کے دستکار اور باہنر بادشاہوں اور امیروں کے لئے مختلف چیزیں تیار کرتے تھے جن میں ان کی تمام ہنرمندی اور قابلیت کا اظہار ہوتا تھا لیکن اب جب سے جمہوری نظام کا دور شروع ہوا ہے وہ تمام حالات بدل گئے ہیں۔ اب کسی حرفہ یا دستکاری کے شروع کرنے اور ترقی دینے کے لئے ابنائے حکومت کے سکونت اختیار کرنے سے زیادہ جغرافی حالات اور عوام کی ضروریات کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے کتنی ایسی چیزوں کا چلن ہوگیا ہے جو عوام کے شوق کو پورا کرتی ہیں۔ ان چیزوں میں اپنے ملک اور پرائے ملکوں کی کتنی ہی چیزیں شامل ہیں۔

(۴) جو لوگ کسی حرفہ یا دستکاری کو اختیار کر چکے ہیں ان کی زندگیوں میں چند مخصوص باتیں پائی جاتی ہیں۔ جو ان کے رہن سہن، رسم و رواج، زبان اور پہناوے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی شادی بیاہ کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ مخصوص قسم کی تفریحات اور میلوں ٹھیلوں میں شریک ہوتے ہیں۔ آپس کے جھگڑے ٹنٹے بھی ان کی اپنی پنچایتوں میں طے ہو جاتے ہیں مثلاً دہلی کے کارخندار اور دیگر علیگڈھ کے قفل ساز، بنارس کے گرہست (جو لوگ ریشمی کپڑا بننے کا کام کرتے ہیں) اور بہار کے مومن بھائی اپنی مخصوص زندگی بسر کرتے ہیں۔

(۵) حرفہ اور دستکاری میں استعمال ہونے والی چیزیں کچھ تو اپنے ملک میں دستیاب ہوتی ہیں اور کچھ باہر سے آتی ہیں۔ خام اشیاء کے لئے خواہ وہ باہر سے آتی ہیں یا اپنے ملک میں دستیاب ہوتی ہیں مخصوص جغرافیائی حالات کے جاننے کی ضرورت ہے جن کا مطالعہ کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح بنی بنائی چیزیں مثلاً اوزار اور دوسرے سامان وہاں کیوں تیار ہوتے ہیں؟ وہاں کیا کیا سہولتیں ہیں؟ ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کیسے پہنچایا جاتا ہے؟

(۶) حرفہ یا دستکاری کے لئے مختلف چیزیں خریدنے کے لئے بازار جانا، مختلف دکانوں

پر چیزیں دیکھنا قیمتیں معلوم کرنا قیمتوں کا موازنہ کرنا نرخ کا نوٹ کرنا اور اپنے کام کے لئے چیزیں خریدنے سے لین دین کی مشق ہوتی ہے ۔ پھر ان سے کوئی چیز تیار کرنا اور مقابلہ کا خیال کرتے ہوئے بازار میں ان کو فروخت کرنا یا خود اپنے مدرسہ میں دکان کھولنا اور وہاں یہ چیزیں فروخت کرنا حساب کے لئے پورا ماحول پیدا کر دیتا ہے ۔

(۷) مختلف حرفوں اور دستکاریوں میں خوشنمائی اور دلکشی پیدا کرنے کے لئے مصوری کا موقع آتا ہے چیزوں کو بہتر سے بہتر طریقہ پر لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے لئے آرٹ سے خاطر خواہ مدد لینے کی ضرورت پڑتی ہے ۔

لیکن بد قسمتی سے یہ ذوق عام دستکاروں میں ابھی پیدا نہیں ہوا ہے ۔ حالانکہ آرٹ اور ہنر نے ہندوستان میں مختلف حیثیتوں سے گزشتہ زمانہ میں خاصی ترقی کی لیکن اب وہ تمام باتیں یادگار ماضی کے طور پر مختلف صحیفوں، عمارتوں اور عجائب خانوں میں تو موجود ہیں پر مختلف ہنرمندوں کے کام میں اس کا کوئی نقشہ نظر نہیں آتا ۔ اور اگر کہیں کہیں اس کا دھندلا سا نقشہ نظر بھی آتا ہے تو لوگوں کے مذاق نے اس کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور اس کی جگہ باہر کے آرٹ نے لے لی ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہمارے ملک کے صناعوں اور کاریگروں نے مجبور ہو کر باہر والوں کی نقل کرنا شروع کر دی ہے جس کی شکل مسخ ہو کر اس قدر بھونڈی ہو گئی ہے کہ مذاق سلیم رکھنے والوں کو اپنے صناعوں اور کاریگروں میں کچھ دلچسپی نہیں رہی ۔ اس تبدیلی کا مطالعہ تاریخی اعتبار سے بہت سی باتوں کو ہمارے سامنے پیش کرنے کا موقع دے سکتا ہے ۔ اس لئے کہ ہندوستان کا آرٹ بہت پرانا ہے ۔ یہاں کے آرٹ کو یہاں کی تاریخ سے خاصہ لگاؤ رہا ہے ۔ اس کے علاوہ اس مطالعہ میں ہم اس زمانہ کی زندگی کا حال بھی پیش کر سکیں گے اس لئے کہ کسی زمانہ کا آرٹ اس زمانہ کی جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے ۔

(۸) مختلف دستکاریوں اور حرفوں کو ترقی دینے کے لئے مختلف لوگوں، انجمنوں اور حکومت کی کوششوں کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے ۔

ہم نے دیکھا کہ حرفہ میں اس قدر گوناگونی اور رنگینی ہے کہ وہ بنیادی قومی تعلیم کے پورے نصاب میں آسانی کے ساتھ پھیلایا جاسکتا ہے۔ اس میں زبان، مضمون نگاری، حساب، تاریخ، جغرافیہ، سماج کا علم اور ڈرائنگ کی بہت سی باتیں بتلائی جاسکتی ہیں۔ اس میں ایسے عناصر اور ایسی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں کہ وہ ہر ایک مضمون کی تعلیم کا موقع فراہم کر دیتا ہے۔

اس تفصیل کے بعد اب ہمیں مضامین کے حرفوں سے ربط کو بچوں کی فطرتی صلاحیتوں اور ان کے رجحانات کو مد نظر رکھ کر بھی دیکھنا چاہیئے۔ ربط کے معنی ہیں تعلق یا لگاؤ۔ تعلق یا لگاؤ دور کا بھی ہوسکتا ہے اور قریب کا بھی۔ صاف اور صریح بھی ہوسکتا ہے، مبہم اور مشکوک بھی۔ لیکن کسی حرفہ میں جب ہم مربوط پڑھائی کا تذکرہ کرتے ہیں تو یہ لگاؤ اور تعلق اس قدر فرق کے ساتھ نظر نہیں آتے اس لئے کہ بچوں کی عملی کام سے دلچسپی ان کے لئے ایسی ضرورت پیدا کر دیتی ہے کہ تمام قسم کے تعلقات میں اس قسم کا کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ بلکہ کام اس طرح انجام پاتا ہے کہ دور اور قریب، صاف اور مبہم تعلقات ایک سلسلہ کی کڑی بنتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بچہ جب ایک کام ختم کرکے دوسرا کام شروع کرتا ہے یا جب ایک بات کے علم ہونے پر دوسری بات سیکھتا ہے تو اس کو یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وہ جو کچھ سیکھ رہا ہے یا پڑھ رہا ہے اس کا حرفہ سے دور کا یا قریب کا تعلق ہے، اس کے علاوہ کسی حرفہ پر کام کراتے وقت کام کی نوعیت اس طرح بدلتی رہتی ہے اور بچہ کی تجسس اور تلاش کی فطری عادت ایسے مواقع بہم پہنچاتی رہتی ہے کہ مربوط پڑھائی کو اس نظر سے دیکھنے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا، مثلاً بچے لیئی سے ابری بناتے ہیں تو استاد بچوں کو مشورہ دیتا ہے کہ ابری میں کچھ بنانا بھی چاہیئے۔ بچے مختلف تجویزیں پیش کرتے ہیں جو لکھ لی جاتی ہیں اور ہر بچہ بھی انھیں نوٹ کرلیتا ہے، اس طرح جب بچے ابری بناتے ہیں تو اپنی سوچی ہوئی چیزیں ابری پر بناتے ہیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ خوشنما ہوجائے۔ اس کام میں بچہ کی انفرادی کوشش، سوجھ بوجھ، اور اپنے سابقہ تجربہ کو استعمال کرنے کا کافی موقع مل جاتا ہے ہر بچہ اپنے طور پر سوچی ہوئی چیزیں لئی اور رنگ لگانے کے بعد اس پر بناتا ہے، کوئی بچہ پتے سے نقش بناتا ہے کوئی پھول سے اس میں کوئی چیز بناتا ہے۔ کوئی

انگلی سے کوئی تصویر ہی بنا دیتا ہے، کوئی برش سے سینری بناتا ہے غرض کہ ہر ایک اپنی طبیعت کے مطابق کوئی نہ کوئی نئی چیز بناتا ہے اور انفرادیت کو نشو و نما ملنے کا بہترین موقع ملتا ہے۔ بچوں کی رنگ برنگ کی بنی ہوئی اس قسم کی چیزوں سے کئی ایک باتیں وابستہ کی جا سکتی ہیں اور پڑھائی کے مواد کے لئے بہترین مواقع مل سکتے ہیں ممکن ہے کہ بچہ استاد کا یا اپنے کسی ساتھی کا شروع شروع میں سہارا لے اور نقل سے کوئی چیز بنائے لیکن رفتہ رفتہ ہمت دلانے سے وہ ابری پر اپنی طبیعت سے بھی چیزیں بنائے گا۔

کام جب اس ڈھنگ سے کرایا جا رہا ہو تو تعلیم کا اثر بغیر اس حساب کے مرتب ہوتا ہے کہ اب فلاں مضمون پڑھایا جا رہا ہے اور اب فلاں۔ وجہ یہ ہے کہ ایک بات دوسری بات سے اس طرح وابستہ ہوتی چلی جاتی ہے کہ یہ کہنے کا امکان ہی باقی نہیں رہتا کہ فلاں مضمون کے مربوط کرنے میں کھینچا تانی کی گئی ہے اور بعض مرتبہ کام کراتے کراتے خود بخود ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے مثلاً بچے تیل سے ابری تیار کر رہے تھے ضرورت محسوس ہوئی کہ ہر بچہ کی ابری بننے کے بعد پہچانی جا سکے۔ یہ مشکل اس طرح بھی حل ہو سکتی تھی کہ کاغذ کی پشت پر ہر بچہ کا نام پنسل یا روشنائی سے لکھ دیا جاتا، لیکن اس طرح کرنے سے نہ کوئی نیا پن ہوتا اور نہ کوئی خوبی، لہٰذا استاد نے ہر بچہ کا نام بڑی احتیاط سے کاغذ پر کاٹ کر اس کاغذ پر لگایا جس پر ابری بننے والی تھی، اب ہر بچہ اس بات کا بڑے غور سے مشاہدہ کر رہا تھا کہ جب رنگ پر کاغذ ڈالا جائے گا تو نام کیسے بنے گا؟ ہر بچہ کی توجہ اس کام کی طرف تھی، اگر ایک بچہ دوسرے بچہ کو ذرا بھی ہٹاتا تو وہ فوراً بھوں چڑھا کر اس کو گھورتا یا استاد سے شکایت کرتا۔ عملی کام میں بچوں کی دماغی یکسوئی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، یہاں ہر بچہ مشتاق تھا کہ یہ کام کیسے ہوتا ہے! پہلے استاد نے ایک کاغذ پانی پر ڈالا اور اٹھا لیا، بچے کے نام پر بھی رنگ آ گیا۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی، لیکن جب استاد نے نام کا پرچہ کاغذ سے ہٹایا تو نام کی جگہ خالی رہ گئی اور چاروں طرف ابری کی رنگینی میں بچہ کا نام رنگ نہ لگنے کی وجہ سے صاف پڑھا جانے لگا جس بچہ کا وہ نام تھا وہ پڑھ بھی سکتا تھا۔ پڑھائی کی ابتدا کے لئے

یہ پہلا قدم تھا جو بغیر اس احسان کے اٹھا کہ بچہ اب پڑھنا سیکھ رہا ہے۔ اس لئے کہ ہر بچہ آرزومند تھا کہ اس کی ابری پر اس کا نام ہو، لیکن جب تک وہ پڑھ نہ سکتا ہو وہ کیسے معلوم کرے گا کہ اس کی ابری پر اس کا نام لکھا ہوا ہے؟ اب وہ پڑھنا سیکھنا چاہتا ہے۔ حرفہ میں اس کی ضرورت پیدا ہوگئی ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ تو دور کا لگاؤ ہے، لیکن استاد نے کام کی نوعیت ایسی بدل دی ہے کہ لگاؤ بالکل قدرتی اور بدیہی ہوگیا ہے۔ آپ اس کام میں جملے اور الفاظ کے پڑھانے کا اہتمام بھی کرسکتے ہیں، ایک جملہ کاغذ پر لکھ کر کاٹ لیجیے: "حامد کی ابری لال ہے" اس کو اس کاغذ پر لگا دیجیے جس پر ابری بننے والی ہے، اب اس کو کشتی میں ڈال کر اٹھا لیجیے، اس جملہ کے الفاظ پر بھی رنگ آجائے گا لیکن آپ پورا جملہ کاغذ پر سے علیحدہ کرلیجیے، جو جگہ خالی اور سادہ رہ جائے گی۔ وہاں یہ جملہ صاف پڑھا جائے گا ہر بچہ سو فی صدی توجہ سے اس جملہ کو پڑھے گا، اگر آپ کام کی نوعیت کو بدلتے رہیں تو بچوں کی دلچسپی بہت عرصہ تک قائم رہ سکتی ہے، مثلاً آپ اس قسم کی ابری جس پر کوئی جملہ لکھا ہوا ہو ان کو گھر پہنچا دیں بچے بڑی خوشی سے لے جائیں گے، اور اپنے والدین کو اور دوسرے لوگوں کو دکھائیں گے، ایک تو اس خیال سے کہ انھوں نے اس کو خود بنایا ہے، دوسرے اس لئے کہ اس پر جو جملہ لکھا ہوا ہے اس کو پڑھ بھی سکتے ہیں، اگر آپ بچہ کی اس میں صحیح طریقہ پر رہنمائی کریں تو بچے اس خیال سے کہ اگر کوئی گھر پر پوچھے کہ یہ کیا لکھا ہے؟ بڑی توجہ اور دھیان سے جملہ کو پڑھنے کی طرف مائل رہیں گے، وہ اس کام کو ایک بڑے مقصد کے ماتحت کریں گے اور وہ یہ نہ چاہیں گے کہ جملہ نہ پڑھنے سے ان کی سبکی ہو۔ کیا یہ اس تعلیم کا بہترین اثر نہیں ہے کہ اس تعلیم کا اثر بچے اپنے گھروں تک لے جاتے ہیں اور اس سے والدین اور سرپرستوں کو بھی باخبر رکھتے ہیں؟

عملی کام میں جب آپ بچوں کی اپج اور سوجھ بوجھ کو پنپنے کا خاطر خواہ موقع دیں گے تو ان کی نئی نئی تجویزیں مضامین کو مربوط کرنے کے لئے نئی نئی راہیں پیدا کردیں گی لیکن اگر آپ منطقی ترتیب کے ساتھ ایک بات کے بعد دوسری بات کے پیش کرنے کا اہتمام کریں گے تو بہت جلد آپ کی گاڑی رک جائے گی۔ ایک دفعہ چوتھی جماعت کے بچے لفافہ بنانے کے لئے لیئی تیار کر رہے تھے

ایک بچہ نے پوچھا کہ لیپی میں نیلا تھوتھا کیوں ملاتے ہیں؟ بچوں نے مختلف جوابات دیئے۔ استاد نے کہا کہ دونوں قسم کی لیپی بنائیں اور تجربہ کریں۔ بچوں نے دونوں قسم کی لیپی بنائی، استاد نے تھوڑی تھوڑی لیپی ہر ایک قسم میں سے لے کر علیحٰدہ علیحٰدہ کاغذ پر رکھ دی۔ جس لیپی میں نیلا تھوتھا نہیں ملا ہوا تھا اس پر بے شمار مکھیاں آکر جمع ہو گئی تھیں لیکن جس لیپی میں نیلا تھوتھا ملا ہوا تھا اس کے قریب بہت کم مکھیاں آتی تھیں۔ استاد نے بچوں کو اس تجربہ کے بعد بتلایا کہ نیلا تھوتھا زہر ہے اور آٹے میں اس کے ملانے سے مکھیاں نہیں آتیں، اس کے علاوہ جس کتاب کی جلد ایسی لیپی سے بنائی جاتی ہے اس کو چوہے نہیں کترتے، نیلے تھوتھے کی لیپی سوکھ جائے گی لیکن خراب نہ ہوگی برخلاف اس کے بغیر نیلے تھوتھے کی لیپی سڑ کر خراب ہو جائے گی۔ یہ بات اس قدر سادہ ہے لیکن پھر بھی اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے۔ جب یہ تجربہ ہو رہا تھا تو ایک لڑکے نے پوچھا کہ ماسٹر صاحب پیتل کی دیگچیوں میں بھی نیلے تھوتھے سے ملتی جلتی کوئی چیز ہوتی ہے وہ کیا ہے؟ استاد نے بتایا کہ اس کو "کس" کہتے ہیں، جس برتن میں کس ہو اسمیں نہ کھانا کھانا چاہیئے اور نہ کھانا پکانا چاہیئے، اس لئے کہ اس میں بھی نیلے تھوتھے کا سا زہر ہوتا ہے۔ جو صحت اور تندرستی کے لئے مضر ہے۔ ایسے تمام برتنوں کی قلعی کرا لینی چاہیئے، اس تفصیل میں بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، اگر میں کہوں کہ صحت اور صفائی کے اصولوں پر بہت اچھا سبق پڑھایا گیا تو لوگ اس کے متعلق بھی یہی کہیں گے کہ یہ تو بہت دور کا تعلق اور لگاؤ ہو گیا لیکن بچوں کی تجسس اور تلاش کی فطری عادت کو آپ کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں؟ اور جب وہ اپنی اس عادت کی وجہ سے آپ کو سکھانے کا موقع دیتے ہیں تو آپ محض اس خیال سے کہ وہ بیکار ربط ہوتا ہے کیا انھیں سیکھنے سے باز رکھیں گے؟

بچوں کی تجسس اور تلاش کی فطری عادت اور اس کا اپنا سابقہ تجربہ کسی بڑے کام کے کرتے وقت کئی چھوٹے چھوٹے کاموں کے شروع کرنے کا موقع دیں گے۔ جیساکہ اوپر کی مثال میں ظاہر کیا گیا ہے۔ لیکن چھوٹے چھوٹے بامقصد کاموں کو اس طرح چلانا چاہیئے کہ وہ اس بڑے کام پر حاوی نہ ہو جائیں، اس چھوٹے بامقصد کام کو اس بڑے کام کی تکمیل کے لئے ہی استعمال کرنا چاہیئے۔

مثلاً بڑا کام کارڈ بورڈ اور کاغذ سے چیزیں بنانا ہے اور لیپی بنانا اس بڑے کام کے ضمن میں کرایا جاتا ہے یا کاغذ اور کارڈ بورڈ کے کارخانوں کا مشاہدہ بھی ضمنی کام ہے، اس قسم کے تمام ضمنی کام اس بڑے کام کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں لیکن اگر استاد نے ہوشیاری سے بچوں کی رہنمائی نہ کی تو اس قسم کے چھوٹے چھوٹے کام بذات خود مقصد بن جائیں گے اور کارڈ بورڈ سے ماڈل بنانے کا کام پس پشت جا پڑے گا۔ اس قسم کے ضمنی کاموں میں ان مضامین کو مربوط کرکے پڑھانا چاہیئے جو بڑے کام MAJOR PROJECT میں شامل کئے جانے سے رہ گئے ہیں۔

کسی بڑے کام MAJOR PROJECT کرانے کے دوران میں مندرجہ ذیل چھوٹے چھوٹے کام یا ضمنی کام MINOR PROJECTS نکل سکتے ہیں جن میں مختلف مضامین شامل کرنے کا اتنا ہی موقع ہو سکتا ہے جتنا اصل پراجیکٹ پر اور ان کاموں کے کرنے کے لئے بچے کھلے دل سے آمادگی ظاہر کریں گے بلکہ اکثر صورتوں میں ان کاموں کے کرنے کے لئے بچوں ہی کی طرف سے تجویزیں آئیں گی۔

(۱) جو کام ہم کرنے والے ہیں اس کام کے کرنے والوں کا مشاہدہ کرنا کہ وہ کس طرح کام کرتے ہیں اور کیا کیا چیزیں بناتے ہیں۔

(۲) مختلف چیزیں خریدنے کے سلسلہ میں مختلف دکانوں پر جاکر لین دین نرخ اور چیزوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا

(۳) دکان اور بینک چلانا، (۵) نمائش کرنا

(۴) کوئی ڈرامہ کرنا (۶) کسی تہوار یا میلے کے موقع پر اپنی چیزیں بیچنے کے لئے لے جانا

(۷) مختلف پیداواروں کا مشاہدہ کرنے کے لئے گاؤں میں جانا۔

(۸) گاؤں کا مشاہدہ کرنا اور گاؤں کے لئے مفید کام کرنا۔

ان کاموں کو تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لئے جاری رکھنا چاہیئے، بچوں کی رہنمائی اس طرح کرنی چاہیئے کہ وہ خوشی سے ان کاموں کا انتخاب کریں، ان کاموں کو مشاہدہ کرنے کے لئے

انھیں کی طرف سے تجویزیں آنی چاہییں۔ اس لئے کہ ان تجویزوں کی تکمیل کے لئے وہ سب کچھ کریں گے اور ان کی تجویزوں کی تکمیل کے لئے جو کچھ کام ہوگا وہ بہت سے مضامین کے پڑھانے کے لئے خودبخود دروازے کھول دے گا۔

ملکیت ذاتی

ملکیت ذاتی کی ابتدا | عہد جدید کی معاشی زندگی کی بنیاد ملکیت ذاتی پر قائم ہے۔ ملکیت ذاتی کا تخیل ہمارے ذہنوں میں اس قدر پیوست ہوگیا ہے کہ ہم ملکیت ذاتی کے حق کو ایک طبعی حق سمجھنے لگے ہیں۔ لیکن ملکیت ذاتی کا ارتقا اور تمام دوسرے معاشی اداروں کی طرح آہستہ آہستہ ایک طویل مدت کے گذرنے کے بعد ہوا ہے۔ یہ ایک اضافی چیز ہے مجرد اور قطعی نہیں ہے۔

معاشرت کی ابتدائی منزلوں میں ملکیت ذاتی کا تخیل نہیں پایا جاتا۔ ابتدائی انسان بندروں کی طرح اپنی غذا کو چھین جھپٹ کر حاصل کرتا تھا اور جن چیزوں کو اس طرح حاصل کرتا تھا ان کو فوراً ہی صرف کر ڈالتا تھا۔ جب اس نے مستقبل کا خیال کرنا شروع کیا اور دوسرے جانوروں کی طرح غذا کے ذخیرے کو اکٹھا کرنے لگا تب بھی یہ اشیا اس کے قبضہ میں اس وقت تک رہ سکتی تھیں جب تک کسی دوسرے زیادہ طاقتور وحشی انسان سے اس کو سابقہ نہیں پڑتا تھا۔ اس لئے عارضی قبضہ تو ہوتا تھا لیکن ملکیت کا کوئی مسلمہ حق موجود نہیں تھا۔ جب ملکیت کا نہایت ابتدائی تخیل پیدا ہوا تو وہ جماعتی تھا ذاتی اور انفرادی نہیں تھا۔ انسانی گروہ غذا کی تلاش میں جگہ بہ جگہ مارے مارے پھرتے تھے اور اپنی اس آوارہ گردی میں بعض علاقوں کو اپنے لئے مخصوص سمجھنے لگتے تھے اور ان میں دوسرے وحشی انسانوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس طرح جماعتی ملکیت پیدا ہو جاتی تھی۔ قبضہ اور استعمال نے ملکیت کا بیج بویا۔ لیکن یہ استعمال جماعتی تھا۔ انفرادی نہیں تھا۔ غذا حاصل کرنے کے لئے عام طور پر متحدہ کوشش کی ضرورت ہوتی تھی اور گروہ کے نمائندے بعض مقررہ اصولوں کے مطابق غذا کو افراد کے مابین تقسیم کیا کرتے تھے حتیٰ کہ مذہبی اشیا بھی مثلاً مقدس پتھروں اور چڑیوں کے پروں کی حفاظت بھی کل جماعت کی طرف سے ہی کی جاتی تھی۔

سب سے پہلے ملکیت ذاتی زیوروں اور لباس کی مختصر اشیا میں پیدا ہوئی۔ انھیں بالکل ابتدا سے ایک فرد کی شخصیت کا لازمی جزو سمجھا گیا ملکیت ذاتی کی طرف دوسرا قدم اس وقت اٹھایا گیا۔ جب تمام ذخیرہ سے کچھ ہتھیار الگ کرلیے گئے اور انھیں گروہ کے کسی غیر معمولی بہادر رکن کے ساتھ وابستہ کیا جانے لگا زیوروں کی طرح ان ہتھیاروں میں بھی ایک فرد کی شخصیت کا عکس دیکھا جانے لگا اور جب وہ مرتا تھا تو اس لاش کے ساتھ اس کے یہ ہتھیار بھی دفن کر دیے جاتے تھے۔ جب تہذیب اور زیادہ اونچی منزل پر پہنچی تو نقل پذیر جھونپڑے یا خیمے اور اوزاروں اور برتنوں کے مختصر ذخیرے بھی افراد کی ملکیت میں شامل ہونے لگے۔ لیکن ابھی تک ذاتی ملکیت کی تفریق بہت زیادہ نمایاں نہیں ہوئی تھی۔ اس کی معاشیاتی اہمیت بہت کم تھی اور ملکیت کے اجتماع کی خواہش مفقود تھی۔ ایک محدود حد کے بعد زیادہ زیورات کو ایک بوجھ اور زیادہ اوزاروں اور ہتھیاروں کو بے کار سمجھا جاتا تھا۔ معاشی زندگی میں افراد کے مقابلہ میں جماعتی کوششوں کو ابھی تک بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔

جب جانوروں کو پالنا شروع کیا گیا تو اس کے ساتھ ملکیت ذاتی نے بھی نمایاں طور پر ترقی کرنا شروع کردی۔ جب گلوں کو محفوظ رکھنے کا علم لوگوں کو حاصل ہوا تو اس کے ساتھ ساتھ ان کے لیے یہ بھی ممکن ہوا کہ اپنی زندگی کو کم از کم ایک مختصر حد تک جماعت سے جدا سمجھ سکیں اور انھوں نے جماعت سے آزاد ہوکر اپنی ذات اور اپنے متعلقین کے واسطے فراغت اور خوش حالی حاصل کرنے کے لیے آزادی کے ساتھ اپنی قوتوں کو کام میں لانا شروع کر دیا۔ ملکیت ذاتی کو اب روز بروز زیادہ اہمیت حاصل ہونے لگی۔ اس کی وجہ سے ابوی خاندان پیدا ہوا اور اس نے غریب اور امیر کے فرق کو پیدا کر دیا۔ دولت میں اب جانوروں کے گلے شامل ہونے لگے۔ زیورات اور خزانہ کی اب محض ان کے ذاتی افادہ کی وجہ سے ہی قدر نہیں کی جاتی تھی بلکہ اس لیے بھی کہ ان کے معاوضہ میں زندہ دھن حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ابتدائی دولت مویشی ہوا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں اس بڑھتی ہوئی دولت کی حفاظت کے لیے انسانی متعلقین کی بھی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔

چنانچہ ابوی خاندان کے مکھیا کے بچے اور بیویاں اس کی ذاتی ملکیت سمجھی جاتی تھیں اور جہاں ان کی تعداد ناکافی ہوتی تھی وہاں غلامی شروع کر دی گئی اور غلام بہت جلد خاندان کا ایک نہایت اہم عنصر بن گیا۔ لیکن ابھی تک زمین پر قبضہ شروع نہیں ہوا تھا کیونکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ گلہ بان موسمی حالات کے تغیر کے ساتھ چراگاہوں کی تلاش میں ادھر ادھر گھوما کرتے تھے اور قبائلی رواجوں کا اثر ابھی تک اتنا مضبوط تھا کہ عام علاقہ کے زیادہ پسندیدہ علاقوں پر انفرادی قبضہ کا سدباب کیا جاسکتا تھا۔

اس بیان سے دو باتیں صاف ہو جاتی ہیں۔ اول تو یہ کہ ایک عرصہ تک ملکیت ذاتی صرف انتقال پذیر اشیاء یعنی جانوروں، انسانوں اور ذاتی سامان پر مشتمل رہی۔ جو جماعت مسلسل گردش کرتی رہتی ہے اس کے درمیان ناقابل انتقال اشیاء کی ملکیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ دوسری یہ کہ ملکیت ذاتی کی ابتدا قبضہ مخالفانہ اور استحصال سے ہوئی اور دولت کے اجتماع کی شروعات اکثر صورتوں میں جبر اور ڈکیتی کے ذریعہ ہوئی ہے۔ لیکن کل جماعت کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس قسم کا خود غرضانہ اجتماع بھی جماعتی مرفہ الحالی کے لئے ضروری معلوم ہوگا۔ اس سے نہ صرف دولت کی پیدائش میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ تہذیب کو بھی ترقی ہوتی ہے۔ شکاریوں کے گروہ کے مقابلہ میں گلہ بانی کرنے والے قبیلوں کی زندگی اخلاقی حیثیت سے زیادہ بلند ہوتی ہے۔ ملکیت ذاتی کے پیدا ہو جانے سے جہاں انسانی فطرت میں بعض بہت سی ناپسندیدہ خصوصیات ترقی پا جاتی ہیں وہاں اس سے کفایت شعاری، عاقبت اندیشی، پس اندازی تیزی سنجیدگی اور سمجھ داری کی صفات بھی پیدا ہوتی ہیں جن کے بغیر کوئی مستقل ترقی ہرگز ممکن نہیں ہے ملکیت انفرادی ہوتی جا رہی تھی لیکن چونکہ فرد پر ابھی تک گروہ کی بڑی حد تک نگرانی تھی اس لئے ملکیت ذاتی کو تسلیم کرانے والی طاقت ابھی تک جماعتی فائدہ کے ساتھ وابستہ تھی۔ فرد کو ملکیت ذاتی سے فائدہ اٹھانے کا حق اس لئے ملا ہوا تھا کہ اس سے بصورت مجموعی جماعت کا مفاد پورا ہوتا تھا۔ اس لئے ابتداء سے ہی اس برائی کے ساتھ بھلائی لگی ہوئی تھی۔ ابتداء میں ملکیت ذاتی کے ساتھ جو تشدد لازمی طور پر موجود تھا اسی سے ایک پائدار معاشرت کا نظم و انتظام پیدا ہوا۔

زمین میں ملکیت ذاتی کا ارتقا | دوسرا قدم اس وقت اٹھایا گیا جب زرعی منزل پیدا ہوئی۔ اس کے دو اہم نتائج ہوئے اول تو اس کی وجہ سے غلامی کو بہت ترقی ہوئی کیونکہ زمین کو نفع بخش طریقہ پر جوتنے کے لئے محنت کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد کی ضرورت محسوس کی جانے لگی جبری اور مفت محنت سے قدرتی طور پر مالک کے منافع میں اضافہ ہونے لگا اور خاص حالات میں زراعت کی ترقی کے معنی غلاموں کی ملکیت کی ترقی کے مترادف ہوگئے۔

اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر منقولہ اشیاء میں بھی ملکیت ذاتی پیدا ہونے لگی۔ جب ابتدائی عارضی رہنے کی جگہوں کی بجائے مستقل بستیاں آباد ہونے لگیں تو زیادہ پائدار مکانوں کی ضرورت اور ان کا فائدہ ظاہر ہونے لگا۔ اگر مکانوں میں ملکیت ذاتی پیدا ہو جانے سے مکان کے اندر ذاتی سامان بھی بڑے پیمانہ پر اکٹھا کیا جانے لگا اور دولت کا یہ اجتماع زراعت کی آمدنی کی وجہ سے جو گلہ بانی کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتی تھی ممکن ہو گیا مکانوں کے مقابلہ میں زرعی زمین میں ملکیت آہستہ آہستہ پیدا ہوئی بعض صورتوں میں جہاں جغرافیائی اور موسمی حالات کی وجہ سے گلہ بانوں کے گروہ کے لئے زمین سے روزی حاصل کرنا مشکل تھا جیسے ناروے میں اور جہاں منظم ڈاکوؤں کے حملہ کا خوف بھی کم تھا افراد نے کسانوں کی حیثیت سے زندگی شروع کردی اور ہر شخص تنہا رہنے اور جس قدر زمین کی ضرورت تھی اس پر قبضہ کرنے لگا۔ استعمال کا حق بہت جلد ملکیت میں تبدیل ہوگیا۔ اسی طرح جب نئی نوآبادیوں میں ایسی جماعتوں کی شاخیں جا کر بسنے لگیں جنھیں زراعت سے خوب واقفیت تھی جیسے امریکہ میں تو وہ اپنے ہمراہ زمین کی ملکیت ذاتی اور جداگانہ رقبہ کاشت کے رواج کو بھی ساتھ لے گئے۔ لیکن اکثر ایسی جگہوں میں جہاں مویشی چرانے والے لوگ ترقی پاکر کسان بنے جماعتی رواج نہایت آہستہ آہستہ ختم ہو سکے۔ جس طرح خانہ بدوشوں کے گروہ اپنے خیمے ایک جگہ اکٹھے لگایا کرتے تھے اور اپنے مویشیوں کو ساتھ ساتھ چرنے دیا کرتے تھے اسی طرح گاؤں کے مکان بھی اکٹھے بنائے گئے اور ملحقہ رقبہ میں کاشت کے لئے جداگانہ ٹکڑے صرف عارضی طور پر کاشتکاروں کو دئے جاتے تھے مختلف حیثیت کے

ان عارضی عطیوں سے جلد ہی مستقل قبضہ کی شکل اختیار کرلی اگرچہ ان کا استعمال کا طریقہ جماعتی ضرورتوں کا پابند ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ جب آبادی بڑھی اور مقبوضہ زمین کو تقسیم کیا جانے لگا تو مختلف حیثیت کی زمینوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے گئے اور ایک ہی آدمی کے پاس بہت سی کھیت مزروعہ رقبہ کے مختلف حصوں میں پائے جانے لگے اور ان ملے جلے کھیت کے ٹکڑوں کو مناسب طریقہ پر کاشت کرنے کے لئے ضروری ہوگیا کہ بہت سے جماعتی قاعدے بنائے جائیں۔ یہ کھیت کے ٹکڑے اتنے چھوٹے ہوتے تھے کہ ان کے گرد باڑھ نہیں لگائی جا سکتی تھی۔ کاشت کے اس طریقہ کو کھلے کھیتوں کے نظام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس نظام میں کسی ایک آدمی کے لئے یہ انتظام رکھنا بہت مشکل تھا کہ اس کی مویشی چرتے چرتے دوسروں کے کھیت میں نہ پہنچ جائیں گا اس لئے بڑے رقبہ کی ایک ہی طرح پر کاشت کی جاتی تھی۔ پھر اس سے نتائج بھی اچھے پیدا ہوتے تھے۔ چنانچہ عہد وسطےٰ کی دیہی جماعت یعنی مارک کی بنیاد متحدہ کاشت پر قائم تھی اور ابتدائی زمانے کی جماعتی ملکیت نہ صرف جنگلوں میں باقی رہی جن کا کچھ پابندیوں کے ساتھ استعمال کرنے کا حق جماعت کے ہر رکن کو حاصل ہوتا تھا بلکہ چراگاہوں میں بھی جہاں ہر شخص کو اپنے مویشی کے چرانے کا حق حاصل ہوتا تھا باقی رہی اور مزروعہ زمین میں بھی باقی رہی جس کے استعمال کا حق فصل کی کٹائی کے بعد پوری جماعت کو مل جاتا تھا۔

جب زمین میں اس قسم کی ملکیت ذاتی کو ترقی ہو رہی تھی ایک دوسرا عنصر بھی کام کر رہا تھا اور یہ چیز اندرونی نہیں بلکہ خارجی تھی۔ جب فاتح قبائل نئے علاقوں کو چھین لیتے تھے تو یہ بات ان کے لئے نہایت زیادہ اہمیت اختیار کرلیتی تھی کہ اپنے زرعتی مقبوضات کی حفاظت کریں اور یہ خدمت فوجی سرداروں کو سپرد کی جاتی تھی جو اکثر سب سے زیادہ مال دار گلوں کے مالک ہوا کرتے تھے۔ زراعت کے پیشہ کو اختیار کرلینے کے بعد ذاتی اور قبائلی تعلقات کی جگہ ملکی اور سیاسی تعلقات نے لے لی۔ بالفاظ دیگر ریاست پیدا ہوئی اور مقامی تقسیمیں اور اضلاع جاگیرداروں کی نگرانی میں دے دیے گئے۔ کاشتکار یا باجگزار چاہے وہ افراد ہوں یا گروہ اب اپنی زرعتی

آمدنیوں کا ایک حصہ تحفظ کی قیمت کے طور پر ادا کرنے لگے اور ضلع پر فوجی سردار کے عسکری قبضہ نے جلد ہی ملکیت ذاتی کی شکل اختیار کرلی۔ مارکوئیس ابتدا میں "مارچ" کے محافظ کو کہتے تھے کاشتکار کے حقوق مالکانہ کو جاگیردار کے حقوق کے ماتحت سمجھا جانے لگا اور اس طرح جاگیرداری نظام پیدا ہوا جس میں مینر کے مالک کو بہت زیادہ اقتدار حاصل ہوتا تھا اور اس کے ماتحت درجہ بدرجہ معاشری تعلقات کا ایک پور انظام بن جاتا تھا۔

بعض صورتوں میں کاشتکاروں کے ابتدائی حقوق زائل ہوگئے اور ان کی حیثیت محض پٹہ داروں کی ہوگئی جنھیں کسی قسم کے حقوق مالکانہ ملے ہوئے نہیں تھے اور دوسری صورتوں میں انھوں نے رفتہ رفتہ لگان اور دوسرے جاگیردارانہ نذرانوں سے خود کو آزاد کرنا شروع کردیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ جدید طریقوں کے اثر سے مشترکہ کاشت کا سلسلہ بھی ختم ہونے لگا اور انفرادی کاشت کو شروع کیا گیا اور اس طرح یورپ کے ملکوں کی خود کاشت زمینداریاں پیدا ہوئیں۔ چنانچہ زمین یا تو زمیندار کی یا کاشتکار کی انفرادی ملکیت بن گئی یہاں تک کہ صنعتی سرمایہ کی ترقی کے زمانے میں جائداد غیر منقولہ کو وہی حیثیت دے دی گئی جو جائداد ذاتی کو حاصل تھی امریکہ اور یورپ کے بہت سے حصوں میں آج کل زمین اتنی ہی سہولت سے خریدی اور فروخت کی جاتی ہے جیسے اور تمام دوسرے سامان۔

یہاں بھی زمین میں ملکیت ذاتی کا انحصار جماعت کی اجازت پر منحصر معلوم ہوتا ہے مویشی کے گلوں کی طرح زمین پر ملکیت ذاتی کی ابتدا بھی جبر اور دھوکے سے ہوئی ہے لیکن پہلی صورت کی طرح اس صورت میں بھی جماعت کو بصورت مجموعی اس سے فائدہ پہنچا۔ جاگیردار کی ملکیت ذاتی سے امن و اطمینان پیدا ہوا جس کا موجود ہونا پیداوار کے اضافہ کے لیے لازمی شرط ہے ——

—— زمین میں ملکیت ذاتی کا پیدا ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ لوگ انفرادی عمل کے جماعتی فائدہ کو تسلیم کرنے لگے تھے۔ جب تک مشترکہ کاشت سے کھیتوں کا بہترین استعمال کیا جاتا رہا اسی نظام کو اہمیت حاصل رہی لیکن جب جدید عہد میں زمین پر سرمایہ لگانے سے

یتی کاشت کا امکان پیدا ہوا تو انفرادی طریقہ کے فواید نمایاں ہونے لگے۔ پرانے مشترکہ یا کھلے ہوئے کھیتوں کی حلقہ بندی کی گئی اور زمینداروں نے جو مشترکہ کاشت کی پابندیوں سے آزاد ہوگئے تھے اپنے قطع زمین کو بہترین طریقہ پر استعمال کرنا شروع کردیا۔ زمین پر ملکیت ذاتی اس بنا پر انتہائی عروج کو پہنچ گئی کہ اس کے ساتھ استعمال کی انفرادی آزادی بھی وابستہ تھی۔

زراعت میں زیادہ منافع پیداوار کے اضافہ کی وجہ سے حاصل کیا جانے لگا۔ چنانچہ یہاں بھی ملکیت ذاتی سے آخر میں جماعت کو فائدہ پہنچا۔ جائداد غیر منقولہ جائداد منقولہ کی طرح اس لئے ملکیت ذاتی بن گئی کہ جماعت نے انفرادی ملکیت کے فوائد کو تسلیم کرلیا۔

ملکیت ذاتی کے متعلق نظریے | جو کچھ ابھی کہا گیا ہے اس سے دو نتیجے اخذ کیے جاسکتے ہیں اول یہ کہ ملکیت ذاتی کی وجہ جواز اس کا جماعتی فائدہ ہے اور دوسرے یہ کہ ملکیت ذاتی کے حقوق کو ہمیشہ جماعتی نتائج کا پابند ہونا چاہیئے۔

بعض رومی مصنفوں کے یہاں ملکیت ذاتی کا جو سب سے پہلا نظریہ ملتا ہے وہ قبضہ کا نظریہ ہے۔ مگر یہ اصول کہ ملکیت کا حقدار وہی شخص ہے جو سب سے پہلے اس پر قبضہ کرتا ہے ترقی کی ابتدائی منازل میں تو شاید ٹھیک ہوسکتا ہے چونکہ جہاں کسی شخص کو جائداد سے کوئی دلچسپی نہیں ہے وہاں ایک نو وارد کے اس قسم کے دعوے پر کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا جہاں مال کے مالک کا پتہ نہیں چلتا وہاں جس خوش نصیب کو مال پڑا ہوا ملتا ہے اسی کو وہ سپرد کردیا جاتا ہے لیکن جہاں جائداد سے دوسرے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہوں وہاں قبضہ اور تسلط کے حق کو پیش کرنے سے انصاف کے نظریہ کی نہیں بلکہ جبر و تشدد کے نظریہ کی حمایت ہوتی ہے۔ قبضہ کے نظریہ کی ممکن ہے یہ ثابت ہوجائے کہ جائداد کی بعض قسموں پر ملکیت کا قانونی حق کیسے پیدا ہوا لیکن اس سے ملکیت ذاتی کے لئے وجہ جواز پیدا نہیں ہوتی سوائے اس نادر صورت کے کہ دولت پہلے کسی کے قبضہ میں نہ ہو اور کوئی شخص اس سے فائدہ نہ اٹھا رہا ہو۔ محض یہ

واقعہ کو کہ ایک شخص نے ایک چیز پر قبضہ کر لیا ہے اس بات کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ اس پر اس کا قبضہ جاری بھی رہنا چاہیئے"۔

دوسرا نظریہ فطری حق کا ہے۔ قدیم عہد کے فلسفی اور عہد وسطےٰ کے آخری دور کے مصنفوں کا بیان ہے کہ ملکیت ذاتی ایک فطری حق ہے یعنی قانون فطرت کا ایک حصہ ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لفظ فطرت کا کیا مفہوم ہے؟ اگر فطرت کے معنی انسان کے باہر جو طبعی اور حیوانی دنیا ہے اس کے لئے جاتے ہیں تو یہ ظاہر ہے کہ فطری قانون کا لفظ مظاہر کے صرف لازمی تعلقات کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے اور فطری حق صرف اس حق کو کہا جا سکتا ہے جو طاقت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے یا اس قوت کو کہا جا سکتا ہے جس سے ان مظاہر کی وضاحت ممکن ہے اور اس اعتبار سے تہذیب کی تمام ترقی گویا اس بات کی کوشش ہے کہ وحشیوں کے درمیان جو فطری قانون کی عملداری پائی جاتی ہے اس سے نجات حاصل کی جائے۔ اس مفہوم کے مطابق فطرت اور انسانی ترقی دو متضاد چیزیں نظر آتی ہیں اور ملکیت ذاتی غیر فطری معلوم ہوتی ہے کیونکہ فطری حالت میں اس کا وجود نہیں پایا جاتا۔ لیکن اگر اس کے بالمقابل ہم فطرت کا مفہوم تمام کائنات کی جس میں انسان بھی شامل ہے ساخت لیتے ہیں اور اگر ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ملکیت ذاتی اس اعتبار سے فطری ہے کہ ملکیت ذاتی فرد کی جو تخیل کائنات کا حامل ہے تکمیل ذات کے لئے ضروری ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم فطری حق کی اس ہمہ گیر اصطلاح کو اپنے جایز اور ناجایز کے ایک عارضی تخیل پر منطبق کر رہے ہیں جس کی بابت تاریخ کی یہ شہادت ہے کہ ہمارے جایز و ناجایز کے تخیلات میں برابر تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ قدیم زمانے کے عظیم فلسفیوں نے غلاموں کی ملکیت ذاتی کی حمایت فطری حق کی دلیل پیش کر کے کی تھی۔ بہت سی ان چیزوں کو جنھیں آج ہم فطری سمجھتے ہیں ہمارے اخلاف اسے غیر فطری سمجھیں گے۔ اس لئے فطرت کا تخیل اس مفہوم کے ماتحت بہت غیر مستقل اور تغیر پذیر ہو جاتا ہے۔

اس میدان سے ہارنے کے بعد فطری حق کے نظریہ کے حامیوں نے نظریہ محنت میں پناہ لینے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ ملکیت ذاتی کا حقیقی حق اس کے پیدا کرنے میں جو محنت اور پریشانی اٹھانی پڑتی ہے اس کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ چیز کا مالک یقیناً اس شخص کو ہونا چاہیئے جو اسے پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ زمین کو کسی نے پیدا نہیں کیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم عہد کے فیلیاس (PHALEAS) سے لے کر موجودہ عہد کے ہنری جارج کے شاگردوں تک تمام عہدوں کے فلسفی یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ اور چیزوں میں تو ملکیت ذاتی کی مدافعت کی جا سکتی ہے لیکن زمین میں ملکیت ذاتی کا ہونا انصاف پر مبنی نہیں ہے۔ مگر زمین کی ملکیت ذاتی کے یہ نقاد اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ زمین اور محنت کی مزعومہ پیداوار میں اس اعتبار سے فرق جو کچھ بھی ہے وہ صرف مدارج کا ہے کیونکہ دنیا کی کوئی چیز بھی خالص افراد کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے۔ بڑھئی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ جس میز کو وہ بناتا ہے اس پر ملکیت قائم کرنے کا اسے حق ہے لیکن سوال یہ ہے کہ میز کے بنانے میں اس کا کس قدر ہاتھ ہے۔ جس درخت کی لکڑی سے اس نے میز بنائی وہ اس کا بنایا ہوا نہیں تھا۔ جس کلہاڑی سے اس نے لکڑی کو کاٹا وہ اس کے آباؤ اجداد کی صدیوں کی ایجادوں کا نتیجہ ہے۔ شہتیر جس دریا میں بہ کر اس کی کارگاہ تک آیا وہ بڑھئی کا بنایا ہوا نہیں تھا۔ ان تمام درمیانی منزلوں سے اگر قطع نظر بھی کر لی جائے تو بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قانون اور حکومت نے اس کی ذمہ داری نہ لی ہوتی تو اس کے وہ اوزار جنھیں میز کے بنانے میں اس نے استعمال کیا اور اس کی مصنوعہ شے پر اس کا قبضہ کتنے عرصہ تک قائم رہ سکتا تھا اور پھر سب سے آخری بات یہ ہے کہ اس کی میز کس کام کی ہوتی اگر جماعت کی طرف سے اس کی طلب موجود نہ ہوتی۔ میز کی قدر انفرادی محنت کا اتنا ہی نتیجہ قرار دی جا سکتی ہے جتنی زمین کی قدر۔ جتنی چیزیں بھی پیدا کی جاتی ہیں یا جن کا مبادلہ کیا جاتا ہے وہ سب جماعت کی رہین منت ہیں۔

جب بعض فلسفیوں نے دیکھا کہ قبضہ کے نظریہ، فطری حق کے نظریہ اور محنت کے نظریہ

سے ملکیت ذاتی کا ناقابل انکار حق ثابت نہیں ہوتا تو انھوں نے ملکیت ذاتی کا "قانونی" نظریہ پیش کیا جس کا مفہوم مختصراً یہ ہے کہ جس چیز کو قانون تسلیم کرے وہی جایز طور پر ملکیت ذاتی ہے لیکن اس چیز کو معاشیات کا نظریہ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک اچھا قانون ہو سکتا ہے کہ معاشی حیثیت سے برا ہو۔ قانون معاشی حالات کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں اور آہستہ آہستہ معاشی حالات سے ہی مطابقت پیدا کرتے رہتے ہیں۔ قانونی نظریہ سے ہمیں ملکیت کی موجودہ حقیقت کا علم ہو جاتا ہے ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کیوں ہے اور اس کو کیسا ہونا چاہیئے۔

ہر طرف سے ہار کر ہم معاشرتی مفاد کے نظریہ کو قبول کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں حقیقتاً یہ نظریہ جتنے نظریے اوپر بیان کئے گئے ہیں ان سب میں مخفی طور پر موجود ہے اور یہی وہ کڑی ہے جس سے ان سب نظریوں کو باہم منسلک کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ جمہوری نظام میں جماعت نے انفرادی آزادی کے حدود کو بہت وسیع کر دیا ہے لیکن پھر بھی جدید قوموں میں فرد جماعت کے مقابلہ میں بالکل اتنا ہی بے بس ہے جتنا قدیم قوموں میں ہوا کرتا تھا۔ اگر موجودہ عہد میں ہم غیر مقبوضہ دولت پر فرد کو قبضہ کرنے کی اجازت دیتے ہیں، اگر ان چیزوں پر جنھیں محنت کی پیداوار سمجھا جاتا ہے ہم بعض حقوق کو تسلیم کرتے ہیں اگر ہم ملکیت ذاتی کے عناصر کے گرد قانون کی تہ لپیٹ دیتے ہیں تو ان تمام صورتوں میں جماعت کا مقصد متعین اور واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے وہ ان سب باتوں کی اجازت اس لئے دیتی ہے کہ اسے اس حقیقت کا دھندلا سا احساس ہوتا ہے کہ ان سب باتوں سے جماعتی فلاح پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ ملکیت ذاتی جماعتی ترقی کی نشانی ہے۔ اس کی ابتدا جماعتی وجوہ سے ہوئی اس کی نشو و نما جماعتی اجازت کی مسلسل محکومی میں ہوئی ہے۔ اس کو فطری حق صرف اس مفہوم کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ تمام معاشری ترقی ایک فطری چیز ہے۔

ملکیت ذاتی کے حدود: اب اگر جماعتی مفاد ہی ملکیت ذاتی کی حقیقی وجہ جواز ہے تو یہ ظاہر ہے کہ ملکیت ذاتی کے حقوق کی حد بندی جماعتی مصالح کو پیش نظر رکھ کر ہونی چاہیئے۔ مثلاً موجودہ عہد

کا آبپاشی کے مسئلہ کو لیجئے۔ انگریزی کامن لا میں ملکیت ذاتی کا جو تخیل ہے جسے خوب صورت طریقہ پر اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ یہ جنت کی چیزوں سے لے کر دوزخ کی چیزوں تک پھیلی ہوئی ہے یعنی اس کی دسترس سے کوئی چیز باہر نہیں ہے یہ تخیل نتیجہ ہے انگلستان کی مرطوب آب و ہوا کا یہاں پانی کی کثرت ہے اس لئے لوگوں کے ذاتی مفاد سے بہترین نتائج پیدا ہونے کی توقع قائم کی جا سکتی ہے۔ لیکن جہاں علاقہ خشک یا نیم خشک ہو جیسے ہندوستان میں ہے تو یہاں قبضہ کی بنا پر یا محنت کی بنیاد پر کسی ایک شخص واحد کا قبضہ دریا پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا ہے یہاں جو ملکیت ذاتی کا قانون پیدا ہوا ہے وہاں انفرادی حقوق کو جماعت کا محکوم قرار دیا گیا ہے۔

جو بات بنجر زمین کے لئے صحیح ہے وہی مدارج کے اختلاف کے ساتھ ملکیت کی اور بھی بہت سی شکلوں کے لئے صحیح سمجھی جا سکتی ہے۔ ملکیت ذاتی ایک تخیل کی حیثیت سے تو بلاشبہ ہمیشہ باقی رہے گی۔ لیکن اس کے اجزائے ترکیبی میں برابر تبدیلی ہو رہی ہے۔ ایک زمانہ میں غلاموں کی ملکیت کو معاشی اعتبار سے فائدہ بخش اور اخلاقی حیثیت سے جائز سمجھا جاتا تھا سڑکوں پر ذاتی ملکیت ایک بہت عام اور جائز چیز سمجھی جاتی تھی۔ نیو یارک میں گودیوں کی ملکیت تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے برعکس بجلی کا چرانا یا تار اور ٹیلیفون میں کنکشن لگانا مال کی چوری جیسا جرم سمجھا جاتا ہے اگر کارلائل کا یہ قول صحیح ہے کہ کسی شخص کا وہ اعتقاد نہیں ہوتا جو اس کے باپ دادا کا تھا تو یہ بھی صحیح ہے کہ کسی شخص کی ملکیت میں وہ چیزیں نہیں ہوتیں جو اس کے باپ دادا رکھا کرتے تھے۔

ملکیت ذاتی کا حق وہ امتیازی حق ہے جسے جماعت افراد کو عطا کرتی ہے۔ اسے عام طور پر فائدہ بخش اس لئے سمجھا جاتا ہے کہ سب لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ مفاد ذاتی کے اصول پر عمل کرنے سے بصورت مجموعی بہتر نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ انسانی فطرت کے ارتقا کی موجودہ منزل میں ملکیت ذاتی پیدائش دولت کی کثرت اور بہتری کی محرک ہے۔ اس لئے فیصلہ ہمیشہ جماعتی نقطہ نظر سے ہوتا ہے۔ اور جہاں کہیں ملکیت ذاتی کے نتائج جماعتی مفاد کے مخالف نظر آئیں

تو جماعت کے لئے جائز ہے کہ وہ ملکیت کے حق کو محدود کردے۔ چنانچہ پیٹینٹ اور کاپی رائٹ کا حق ہر جگہ چند سالوں کی مدت کے لئے دیا جاتا ہے اس کے بعد مالک کا حق جماعت کو پہنچ جاتا ہے۔ جس طرح زمین کی ملکیت ذاتی کو بصورت مجموعی جائز سمجھا جاتا ہے اسی طرح بعض وقت جب زمینوں پر قبضہ بڑھایا جانے لگتا ہے تو اس سے جماعتی ترقی رک جاتی ہے اور اس کا تدارک کرنے کے لئے ان کے رقبہ کو محدود کرنے کے لئے نیوزیلینڈ کی طرح باقاعدہ تحریکیں چلائی جاتی ہیں یا ملکیت کے حق کی شکل آئرلینڈ کی طرح بدل دی جاتی ہے جس سے پیشہ دار خودکاشت زمیندار بن جاتے ہیں۔

ملکیت ذاتی کے موجودہ حقوق میں مداخلت اس وقت کرنا چاہیئے جب اس کی ضرورت قطعی اور قابل یقین شہادت سے ثابت ہو جائے کیونکہ عام طور پر ملکیت ذاتی اور انفرادی آزادی دونوں جدید تہذیب کی ترقی سے قریبی طور پر متعلق رہی ہیں معاشی آزادی اور معاشی مقابلہ کے حدود سے ملکیت ذاتی کے حدود پر بھی روشنی پڑتی ہے ــــــــ

ــــــــ ملکیت کے حقوق کے تحفظ کا انحصار مقابلہ کے وجود اور اس کی نفع بخش ہونے پر ہے۔ جہاں مقابلہ کی جگہ اجارہ لے لیتا ہے وہاں ملکیت کے حقوق کی داخلی نگرانی کی جگہ جماعت کی خارجی نگرانی کو لینا چاہیئے۔ اس کے علاوہ جہاں مساوات کی شرط جس پر مقابلہ کے نظریہ کی بنیاد قائم ہے مفقود ہوتی ہے مقابلہ کی فائدہ بخش قوت زائل ہو جاتی ہے اور جماعت کے معاشی مفاد نے تحفظ کا مطالبہ ہوتا ہے کہ ملکیت ذاتی کے حقوق کے استعمال پر پابندی عاید کی جائے۔ کچھ لوگ کمیونزم اور سوشلزم کی تبلیغ کرنے لگتے ہیں۔ کمیونسٹ ملکیت ذاتی کی مکمل تنسیخ کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔ سوشلسٹ پیدائش دولت کے ذرائع میں ملکیت ذاتی کی تنسیخ چاہتے ہیں لیکن اشیا صرف میں اسے قائم رکھنا چاہتے ہیں دونوں اس قدر انتہا پسند ہیں کہ خرابیوں کے ازالہ کی کوشش میں وہ جدید تہذیب کے خاص فوائد اور اس کے متعلقات کو بھی خیرباد کہنے کے لئے آمادہ ہیں۔

ملکیت کے حقوق کے اجزائے ترکیبی | ملکیت کے حقوق کو پانچ عنوانوں کے ماتحت جمع کیا جا سکتا ہے ہبہ کا حق، معاہدہ کے ذریعہ بیع کا حق، استعمال کا حق، ترکہ کا حق اور غیر محدود اکتساب کا حق۔ اس میں اول دوم کو ملکیت ذاتی کے تقریباً سب حامی تسلیم کرتے ہیں۔ ایک آدمی اپنی جائداد کو نہ صرف یہ کہ جس طرح چاہے دوسرے کو دے سکتا ہے بلکہ اسے فروخت بھی کر سکتا ہے پٹہ اور ادھار پر بھی دے سکتا ہے اور انہیں گروی بھی دے سکتا ہے۔ صرف جن جگھوں پر جاگیردارانہ قوانین کے کچھ آثار باقی ہیں وہاں ان حقوق پر کچھ پابندیاں ہیں۔ ورنہ باقی سب جگہ پر یہ حقوق تسلیم کیے جاتے ہیں۔ تیسرا حق اس قدر قطعی نہیں ہے VESTED RIGHTS موجودہ حقوق کے مقابلہ میں EMINENT DOMAIN حق بالادست کا نظریہ پیش کر کے جماعتی نگرانی کی ابتدا کی جاتی ہے اور اس بحث کو سرکاری پالیسی میں روز بروز زیادہ گھسا کر جماعتی نگرانی کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ ایک شخص اپنی جائداد کو جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے لیکن اس کا استعمال اس طرح نہیں کر سکتا کہ اس کے پڑوسیوں کو اس سے تکلیف پہنچے۔ انفرادی حق ہمیشہ جماعتی پابندیوں کا ماتحت ہوتا ہے۔

لیکن خاص اختلاف چوتھے اور پانچویں حق کے سلسلہ میں پیدا ہوتا ہے۔ ترکہ اور وراثت کا حق بعد میں پیدا ہوا ہے۔ ملکیت ذاتی کے قائم ہونے کے بہت عرصہ بعد تک اصلی مالک کے مرنے کے بعد جائداد جماعت کے قبضہ میں پہنچ جایا کرتی تھی۔ سامان میں ترکہ کا حق پیدا ہو جانے کے بہت عرصہ بعد تک جائداد منقولہ میں اس قسم کا حق تسلیم نہیں کیا جاتا تھا وصیت اور بلا وصیت کی وراثت ہر جگہ خاندان کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے اور خاندان کا یہ قریبی رشتہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں بذات خود معاشی قوتوں کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ جب وصیت کرنے والے کی زندگی کے ختم ہو جانے کے بعد بھی جائداد کو قائم و برقرار رکھنے کی ضمانت کی گئی تو اس کا دولت کے حصول اور اس کی پیدائش کی معیشت پر بڑا زبردست اثر پڑا۔ جہاں خاندان کی معاشری اور معاشی حیثیت زیادہ ہے وہاں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ترکہ چھوڑنے کا حق ایک فریضہ بن جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ خاندان کے پس ماندگان کا حق وراثت بھی چلتا رہتا ہے۔ چنانچہ PORTION LEGITIME یعنی فرانس

اور جرمنی میں بچوں کا قانونی حق اور اینگلو سیکسن ملکوں میں بیوہ کا حق مہر DOWER RIGHT اسی نوعیت کے ہیں۔

موجودہ عہد میں خاندانی جذبہ کے کمزور ہو جانے اور مختصر حلقہ میں محدود ہو جانے کی وجہ سے ترکہ کے محدود کرنے کی تحریک بھی ترقی کر رہی ہے۔ ترکہ کے محاصل میں جو عہد جدید میں ترقی ہو رہی ہے خصوصاً دور کے رشتہ داروں کے ترکہ کے حق پر جو بہت زیادہ محصول لگائے جاتے ہیں انہیں اس رجحان کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ جب اس قسم کے محصول امریکہ میں ۱۵ فی صدی، انگلستان میں ۱۰ فی صدی اور سوئٹزرلینڈ اور آسٹریلیا کی بعض ریاستوں میں ۲۰ اور ۲۵ فی صدی ہوا اس وقت سے ترکہ کے حق پر بڑی پابندی شروع ہو گئی مگر اس کے تسلیم کرنے کے لئے معقول وجہ موجود ہے کہ جس طرح خاندان کے قریبی تعلقات کی گری خول سے جدا ہو جانے کے بعد باقی رہے گی اسی طرح ترکہ کے محاصل کی یہ تحریک بھی اس جگہ پر ختم ہو جائے گی جہاں اس کی وجہ سے اکتساب دولت کے رجحان میں کمی واقع ہونے کا خطرہ پیدا ہو گا۔ اس کے برعکس دولت کو غیر محدود حد تک جمع کرنے کے حق پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ کثیر دولت کے جمع ہو جانے سے جمہوری حکومت کے انتظام میں دشواری پیدا ہو جائے گی لیکن اس نقطہ کے مقرر کرنے میں جس کے آگے دولت کا جمع کرنا معاشی یا سیاسی حیثیت سے خطرناک ہے بہت مشکل ہے۔ ہمارا اشارہ یہاں عام دولت سے ہے جسے ایمان داری سے حاصل کیا گیا ہو بعض چیزوں میں ملکیت ذاتی کو ناجائز قرار دیا جاتا ہے چاہے اس کی رقم کم ہو یا زیادہ بے ایمانی چھوٹے کاروبار میں بھی اتنی ہی قابل ملامت ہے جیسے بڑے کاروبار میں۔

عام طور پر بڑی جائداد کو ایمان داری سے اس وقت حاصل کیا جا سکتا ہے جب جماعت کو اس کی وجہ سے بہت بڑا فائدہ پہنچے جو جماعت کی خدمت بہتر طریقہ پر کرے گا اسے نفع بھی بہت زیادہ ملے گا۔ کامیاب اور ایمان دار کاروباری آدمی اسی وقت منڈی پر قبضہ رکھ سکتا ہے جب وہ اپنے حریف کے مقابلہ میں سستا مال بیچتا ہے اور جب وہ سستا مال بیچتا ہے تو وہ صرف

کا فائدہ کرتا ہے۔ نفع کو روکنے کے معنی یہ ہوں گے کہ کاروبار کی آزادی کو روکا جائے۔ کاروبار کی آزادی کو روکنے سے قیمتیں بڑھیں گی اور زیادہ قربانی کرنا پڑے گی دولت کو محدود کرنے کی پالیسی ناقابل عمل اور معاشی حیثیت سے خطرناک ہے۔ مگر اس عام جذبہ کی معقولیت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ دولت کی عدم مساوات کی کثرت سے جمہوری صفات آخر کار خطرہ میں پڑجائیں گی لیکن اس کا علاج ملکیت ذاتی کی مخالفت کرنے سے یا دولت کے اجتماع کو روکنے سے نہیں کیا جاسکتا ملکیت ذاتی کی بنیادی اہمیت سے جس پہ جدید عہد کی تمام تہذیب کی عمارت قائم ہے انکار کرنا یا اس کی اہمیت کو کم کرنا لغو اور فضول بات ہے۔ ارسطو کے الفاظ میں معاشی نصب العین کو خوبی کے ساتھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ ملکیت کو ذاتی رہنا چاہیئے لیکن اس کا استعمال مشترک ہونا چاہیئے۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ جماعت کی طرف سے دولت کے متولی ہونے کے تخیل کی تعلیم دی جائے یعنی دولت حاصل کرنے والے پہ ایک جماعتی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ معاشی ترقی ملکیت ذاتی سے قریبی طور پہ وابستہ ہے لیکن اس کے باوجود جماعت کی طرف سے اس کی نگرانی اور اسے صرف میں لانے کا مطالبہ ہے اور ہم دولت کے حقوق کے ساتھ ساتھ اس کے فرائض کو بھی محسوس کرنے لگے ہیں۔ اس اخلاقی پابندی کا انحصار بیک وقت جماعتی مفاد کے صحیح معاشی تخیل ملکیت ذاتی کے وجہ جواز اور اس کی تحدید پر ہے۔

مقابلہ

مقابلہ کی نوعیت | ایک اعتبار سے مقابلہ کو زندگی کا قانون قرار دیا جا سکتا ہے۔ علم حیات سے ہمیں زندگی کی اس کشمکش کا علم حاصل ہوتا ہے جو حیوانوں میں جاری ہے اور جس کی وجہ سے فطری انتخاب کا کام چل رہا ہے اور وہی زندہ اور باقی رہتے ہیں جو اصلح ترین اور موزوں ترین ہوتے ہیں۔ اس کشاکش کی خاص شکل اس جدوجہد کو قرار دیا جا سکتا ہے جو فطرت کی قوتوں اور ذی حیات اجسام میں جاری ہے جس کی وجہ سے فرد ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور جب حالات سازگار ہوتے ہیں تو ان ذی حیات اجسام کا ارتقا ہوتا ہے جو اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کر کے باقی رہنا سیکھ لیتے ہیں۔ لیکن جہاں فطرت بخل سے کام لیتی ہے اور اس کے وسائل سب کے لئے کافی نہیں ہوتے تو فطرت کے ساتھ جو کشاکش جاری ہے اس میں ایک اور کشاکش کا بھی اضافہ ہو جاتا ہے یعنی مختلف گروہ یا واحدے اپنا ذاتی حصہ حاصل کرنے کے لئے باہم کشاکش شروع کر دیتے ہیں۔ مقابلہ کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ مقابلہ فطرت کے خلاف جدوجہد کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کشاکش کا نام ہے جو فطرت کی فیاضی سے لطف اندوز ہونے کے لئے مختلف واحدوں میں جاری رہتی ہے۔

مقابلہ کی ابتدائی شکلوں میں مقابلہ افراد کے مابین نہیں ہوتا بلکہ جماعتوں کے درمیان ہوتا ہے اور زندگی کی شروعات سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اکثر جانوروں کی طرح انسان میں بھی غذا کے حصول کے لئے پہلا مقابلہ جو شروع ہوتا ہے وہ گروہوں کے درمیان ہوتا ہے افراد کے مابین نہیں۔ چنانچہ ابتدا ہی سے امداد باہمی کا اصول نمایاں ہونے لگتا ہے اور گروہوں کے درمیان مقابلہ صرف اس لئے ممکن ہوتا ہے کہ خود گروہ کے اندر امداد باہمی موجود ہے اس قسم کی ابتدائی امداد باہمی کا مشاہدہ امریکہ کی سرحدی زندگی میں کیا جا سکتا ہے جہاں جنگل سے

شہتیروں کے ڈھونے، عمارتوں کے کھڑا کرنے اور اسی قسم کے دوسرے مشترکہ کاموں میں سب پڑوسی مل کر کام کرتے ہیں۔ جب گروہ کے اندر تقسیم عمل شروع ہو جاتی ہے تو فطری انتخاب یعنی مقابلہ کا اصول گروہ کے افراد میں بھی اپنا عمل شروع کر دیتا ہے۔ لیکن یہ کام آہستہ آہستہ ہوتا ہی کیونکہ فرد کی خوش حالی کو کل جماعت کی خوش حالی کا پابند سمجھا جاتا ہے۔ جب گروہ زیادہ بڑے اور طاقتور ہو جاتے ہیں تو ہمیں امداد باہمی کی اعلیٰ تر شکلیں نظر آنے لگتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ افراد کے مابین جو جدوجہد یعنی مقابلہ جاری ہے اس میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد تاریخی عہد میں قوموں کے درمیان جو مقابلہ شروع ہوتا ہے اس میں کامیابی کا فیصلہ نہ صرف یہ کہ ریاست کی نوعیت سے ہوتا ہے جو انسانی اشتراک عمل کی اعلیٰ ترین شکل ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اس بات سے ہوتا ہے کہ قوم کے اندر مقابلہ کے لئے جدوجہد کا جو سلسلہ جاری ہے وہ اپنے نتائج کے لحاظ سے کس نوعیت کا ہے کیونکہ اس سے قوم کے جسم و دماغ کی وہ تمام اہلیتیں ترقی پاتی ہیں جس پر سیاسی قوت کا آخری دارومدار ہوتا ہے اور اسی بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ مقابلہ کی حدیں اتنی ہی وسیع ہوتی ہیں جتنی کہ خود زندگی کی۔

اگر مقابلہ کو علم حیات میں ترقی کی بڑی جزئی تشریح کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے تو معاشی دنیا میں اس چیز کا منطبق کرنا اور بھی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ معاشیات کا موضوع دولت اور انسان کا باہمی تعلق ہے۔ انسان اور جانوروں میں فرق یہ نہیں ہے کہ انسان دولت کو عاقبت اندیشی اور کفایت شعاری کے ساتھ استعمال میں لاتا ہے کیونکہ انسانوں کی طرح کچھ ایسے جانور بھی موجود ہیں جو دولت کے صرف کرنے میں عاقبت اندیشی اور کفایت شعاری پر عمل کر رہے ہیں۔ انسان اور جانور میں فرق یہ ہے کہ انسان دولت پیدا کرنا جانتا ہے جانور نہیں جانتے یہی وجہ ہے کہ انسانی معاشیات میں مقابلہ کا مفہوم صرف یہی نہیں ہے کہ اس سے ایک موجودہ ذخیرہ کو کس طرح عاقبت اندیشی کے ساتھ تقسیم کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک اضافہ پذیر ذخیرہ کو کیوں کر مناسب طریقہ پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انسانوں میں زائد حصہ کو حاصل کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ زائد پیدا

کیا جائے۔ دولت کو صرف کرنے والی تمام جماعتوں میں اس زاید ما حصل کو تقسیم کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ فتح انہی لوگوں کو حاصل ہوگی جو بہتر اور سستی اشیاء پیدا کرسکیں گے۔ منڈی پر قبضہ کرنے کا یقینی طریقہ صرف یہ ہے کہ حریف کے مقابلہ میں مال سستا فروخت کیا جائے۔ چنانچہ کاروباری اصول کی حیثیت سے مقابلہ کے معنی یہ ہوں گے کہ لاگت کو کم کرکے دولت کو بڑھایا جائے علم حیات میں تو مقابلہ کی وجہ سے ترقی بالواسطہ ہوتی ہے لیکن معاشیات میں ترقی کا تمام راز مقابلہ میں ہی پوشیدہ ہے اور عام حالات میں مقابلہ کو تجارت کی روح سے تعبیر کیا جاسکتا ہے مقابلہ کا ایک فریق ممکن ہے ضمنی طور پر دولت جمع کرنے میں بھی کامیاب ہو جائے۔ لیکن اگر اس نے یہ دولت ایمانداری کے ساتھ جمع کی ہے (اور یہ ایمانی دولت کی صفت نہیں ہے بلکہ افراد کی صفت ہے چاہے وہ امیر ہوں یا غریب) تو یہ صرف اسی صورت میں جمع کی جاسکتی ہے جب اس سے جماعت کو بہت زیادہ فواید حاصل ہوتے ہیں۔ فتح اس کی ہوتی ہے جو جماعت کی بہترین خدمت کرتا ہے۔

اس لئے معاشی ترقی میں مقابلہ کا حصہ بڑا زبردست ہے۔ ملکیت ذاتی کے اصول کے ساتھ ساتھ رسے بھی ترقی کا خاص محرک سمجھنا چاہیئے۔ اس کے ذریعہ افادہ کے حدود کو وسعت دی جاسکتی ہے اور انسانی احتیاجات کے پورا کرنے کے لئے دولت کا جو زائد ذخیرہ موجود ہے اس کو اور زیادہ جمع کیا جاسکتا ہے۔ دولت کے صرف کرنے والوں کو مقابلہ کے ذریعہ قیمتوں کے ان اضافوں سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے جنھیں زائد منافع کے لالچ میں خریداروں کو ادا کرنے کے لئے مجبور کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ مقابلہ میں وہ قوت ہے جس سے ازخود ناجائز منافع کم کئے جاسکتے ہیں اور نفع کو اعلیٰ قیمتوں کے مقابلہ میں ادنیٰ قیمتوں کا پابند بنایا جاسکتا ہے افراد میں مقابلہ کی وجہ سے مستعدی، کفایت شعاری اور طاقت کی بنیادی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں اور اس طرح فرد اور جماعت کے مفاد میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ ایک شخص کی کامیابی کا دارومدار صرف اس بات پر ہونے لگتا ہے کہ وہ دوسروں کی کتنی خدمت کرسکتا ہے۔

مقابلہ کی شکلیں | مقابلہ کی پانچ خاص شکلیں ہیں :- اشیاء کا مقابلہ، افراد کا مقابلہ، منڈیوں کا مقابلہ، طبقوں کا مقابلہ، اور نسلوں کا مقابلہ،

(۱) اشیاء کے مقابلہ سے مراد وہ مقابلہ ہے جو معاشری پسندیدگی سے پیدا ہوتا ہے۔ ہر فرد برابر اس ادھیڑبن میں لگا رہتا ہے کہ اس چیز کو خریدوں یا دوسری کو جب وہ کشش و پنج کی انتہائی حد پر ہوتا ہے تو قیمت کی ذراسی تبدیلی سے وہ ایک چیز کی جگہ دوسری چیز کو پسند کر لیتا ہے۔ اس کشمکش میں جو اصول پوشیدہ ہے اس کو اسی بنا پر قانون بدل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ فروشندہ کو ہمیشہ چوکنا رہنا چاہیئے کہ کہیں قیمت کے بڑھنے سے اس کی بکری پر تو اثر نہیں پڑے گا پھر عیوض اور بدل کا یہ سلسلہ صرف اشیاء ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک عامل پیدائش کی جگہ دوسرے عامل پیدائش کو بھی بدل کے طور پر قبول یا مسترد کیا جاتا ہے۔ معاشی احتیاجات کی کسوٹی پر سب چیزوں کو اس اصول کے ماتحت پرکھا جاتا ہے کہ کس میں احتیاج رفع کرنے کی سب سے زیادہ اہلیت پائی جاتی ہے۔ صرف مصرف ہی کبھی ایک چیز کو اور کبھی دوسری کو پسند نہیں کرتا بلکہ آجر بھی کبھی مزدوروں کی تعداد بڑھا دیتا ہے، کبھی مشینوں میں اضافہ کرتا ہے تاکہ نتائج بہترین پیدا ہوسکیں۔ شرح اجرت یا شرح سود کی ذراسی تبدیلی سے وہ ایک کی جگہ دوسرے کا استعمال شروع کر دیتا ہے۔ اور نا اہل عامل کو اہل عامل سے بدلنے کے بعد ہی وہ مصرف کو آمادہ کر سکتا ہے کہ ایک شے کی جگہ دوسری شے کو ترجیح دے۔ اس لیے عیوض اور بدل کے ذریعہ جو مقابلہ کیا جاتا ہے وہ اس لیے اہم ہے کہ اس سے اس انتہائی حد کا تعین ہو جاتا ہے جس کے آگے قیمتیں نہیں بڑھ سکتیں۔ معاشی اشیاء کی طرح ہر معاشی عامل بھی یا تو بالحقیقت یا بالقوۃ باہمی مقابلہ میں مصروف ہے مگر مقابلہ کے وجود کے لئے یہ ضروری ہے کہ عاملین پیدائش میں ایک کاروبار سے دوسرے کاروبار اور ایک شے سے دوسری کی طرف منتقل ہونے کی پوری آزادی یعنی انتقال پذیری موجود ہو۔ جب سرمایہ اور محنت کی انتقال پذیری مکمل ہوتی ہے اسی وقت مقابلہ بھی بالکل آزاد ہوتا ہے جب اس انتقال پذیری میں رکاوٹیں ہوتی ہیں تو معاشی تصادم نمایاں ہونے لگتا ہے۔ ہوسکتا ہے

کہ قانونی، معاشری اور معاشی اسباب کی بنا پر ایک شے کی جگہ دوسری شے کے استعمال کرنے میں رکاوٹ ہو۔ لیکن جب حالات اوسط درجہ کے ہوتے ہیں تو مقابلہ حقیقی اور موثر ہوتا ہے۔

(۲) افراد میں باہم جو مقابلہ پایا جاتا ہے اس کا مفہوم مختلف اشیاء کے پیدا کرنے والوں یا مختلف عاملین پیدائش کی باہمی رقابت اور چشمک نہیں ہے بلکہ وہ رقابت ہے جو ایک ہی شے کے پیدا کرنے والوں یا ایک ہی عامل پیدائش میں پائی جاتی ہے۔ اوسط حالات میں اس کی وجہ سے ہر شخص انتہائی کوشش کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے اور جماعتی ذخیرہ میں ہر شخص کی طرف سے جو حصہ جمع کیا جاتا ہے کامیابی اس کا ایک پیمانہ بن جاتی ہے۔ جتنا زیادہ ایک مزدور پیدا کرے گا اتنی ہی زیادہ اسے اجرت ملے گی۔ جتنا زیادہ ایک کپڑے کا کارخانہ اپنی پیداوار بڑھائے گا اور جتنی کم لاگت پر وہ اپنی اشیاء کو منڈی میں لائے گا اتنا ہی زیادہ اس سے دولت کے صرف کرنے والوں اور اس خاص پیدا کرنے والے کو فائدہ پہنچے گا۔ افراد کے درمیان مقابلہ کو نتائج کے لحاظ سے اس جدوجہد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو کارکردگی کے اضافہ، اہلیت کی ترقی، قوت پیدائش کی وسعت، ایجاد و اختراع کی کثرت غرضکہ معاشی شخصیت کی تکمیل کے لئے جاری ہے۔ جس قدر طاقتور یہ شخصیت ہوگی اتنی ہی زیادہ قوائے فطرت پر دسترس حاصل ہوگی اور اتنی ہی تیزی سے دولت کی ترقی ہوگی۔ ملکیت اس کی اگرچہ افراد کے ہاتھوں میں ہوگی لیکن اس سے ناگزیر طریقہ پر جماعت کو بھی فائدہ حاصل ہوگا۔

(۳) منڈیوں کے مقابلہ سے مراد ان افراد کا مقابلہ نہیں ہے جو منڈیوں میں موجود ہوتے ہیں بلکہ خود منڈیوں کا باہمی مقابلہ ہے۔ منڈیوں کے مقابلہ کی اصطلاح میں اشیاء اور افراد دونوں کا مقابلہ اس مفہوم کے ساتھ ضرور شامل ہے کہ منڈی میں افراد اور اشیاء دونوں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں لیکن یہ اصطلاح صرف انھیں چیزوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ ہر بڑے شہر میں اس بات کے لئے برابر جدوجہد جاری رہتی ہے کہ وہ تقسیم اور مبادلہ کا مرکز بن جائے اور یہ خواہش اس امید پر قائم کی جاتی ہے کہ اس طرح جو دولت جمع ہوگی اس سے دوسرے کاروبار کی اہلیت کارکردگی

کو بڑھایا جاسکے گا۔ غلہ کی تجارت کے لیے نیویارک کا مقابلہ بالٹی مور سے ہے اور کپاس کی تجارت کے لیے نیو اورلینس گلیو اسٹن سے مقابلہ کر رہا ہے۔ منڈیوں میں مقابلہ کے ذریعے فاصلہ کے عنصر پر قابو حاصل کرنے کی جستجو کی جاتی ہے چنانچہ ذرائع نقل وحمل کے جو مسائل ہیں ان کی اصل بنیاد مقابلہ کو ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہاں بھی منڈیوں کے مقابلہ کی وجہ سے لاگت میں کمی واقع ہوتی ہے اور منڈی میں اقتدار حاصل کرنے کی جنگ کو کامیابی کے ساتھ اسی وقت ختم کیا جاسکتا ہے جب کہ خدمت زیادہ موثر طریقہ پر کی جائے۔

(۴) طبقوں کا مقابلہ اس بنا پر پیدا ہوا ہے کہ جماعت دولت پیدا کرنے والوں کے مختلف گروہوں میں منقسم ہوگئی ہے۔ نہ صرف مزدوروں اور سرمایہ داروں کے بڑے بڑے طبقے پائے جاتے ہیں بلکہ سرمایہ داروں میں بھی زراعتی، تجارتی اور صنعتی سرمایہ کے مالکوں کے طبقے یعنی زمیندار، تاجر اور فیکٹری کے مالک پیدا ہوگئے ہیں اور پھر یہ بھی اور چھوٹے چھوٹے طبقوں میں منقسم ہوگئے ہیں بعض مصنفوں کو مثلاً سوشلسٹ کو اس بات سے خوشی حاصل ہوتی ہے کہ وہ طبقوں کے تصادم کو معاشی تبدیلی کا بنیادی سبب قرار دیتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اس سے نہ صرف مظلوم کی تمام جائداد اس سے چھین لی جاتی ہے بلکہ آخر میں جماعت بھی ختم ہو جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ طبقوں کا مقابلہ گو دوسرے مقابلوں کی طرح ناگزیر ہے لیکن حدود کے اندر رہے تو نتائج کے اعتبار سے اتنا ہی مفید ہے جتنی کہ دوسرے مقابلے ہیں مفید ہے۔ آزاد مقابلہ کے نظام میں سرمایہ زراعت سے صنعت میں اسی وقت منتقل ہوگا جب صنعتی مشاغل زیادہ دولت آفریں ثابت ہو جائیں گے یعنی جب جماعت بصورت مجموعی صنعتی پیدا وار کو زیادہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنے لگے گی۔ رہا یہ سوال کہ کون زیادہ خوش حال ہے ساہوکار یا زمیندار تو اس کا دارومدار بھی دراصل اس بات پر ہے کہ کون خریداروں کو اپنا طرف دار بنا سکتا ہے اور طرف دار وہی بنا سکے گا جو چیزیں سستی یا بہتر قسم کی مہیا کرے گا۔ اسی طرح مزدوروں اور سرمایہ داروں کے طبقوں میں بھی مفاد کا تصادم پایا جاتا ہے لیکن اجرت اور منافع کا جو حصہ ان میں سے ہر ایک کو ملے گا اس کا دارومدار جیسا کہ ہم دیکھیں گے اس بات پر

ہوگا کہ دونوں کا مشترکہ پیداوار کے پیدا کرنے میں نسبتی حصہ کس قدر ہے۔

(۵) نسلی یا قومی مقابلہ اپنے معاشی پہلو کے اعتبار سے موجودہ کشاکش کی آخری شکل ہے۔ جدید ترقی کی بہت نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہتھیاروں کی خونی آویزش کی جگہ تجارت کی پر امن رقابت نے لے لی ہے۔ جدید عہد کا ہتھیار تلوار یا بندوق نہیں ہیں بلکہ ملکی صناع اور برآمد کرنے والے کا کاروباری حوصلہ ہے۔ جو قوم بھی تجارتی اور صنعتی سن بلوغ کو پہنچ جاتی ہے وہ اپنی زائد پیداوار کی نکاسی کے لئے بیرونی منڈی پر قبضہ کرنے کی تلاش کرتی ہے۔ منڈی حاصل کرنے کی اس خواہش سے کبھی کبھی جنگ بھی پیدا ہو جاتی ہے مگر بصورت مجموعی آج کل کی جنگ مال کو سستا کرنے کے لئے کی جاتی ہے اور انجام کار بڑی فوج یا بحری بیڑہ سے غیر جانبدار منڈی کو قائم نہیں رکھا جاتا بلکہ دولت کے پیدا کرنے والوں کی اہلیت کارکردگی سے اس مقصد کو حاصل کیا جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تجارتی یا دوسرے قومی مفادوں کے تحفظ کے لئے ایک بڑی فوج اور بڑے بحری بیڑہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن موجودہ عہد میں فوجی طاقت کی بنیاد اصل میں معاشی ہی ہوتی ہے اور جب معاشی اہلیت غائب ہو جاتی ہے فوجی قوت میں بھی انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اب بڑی قوموں کے بارے میں فیصلہ ان کی فوجوں اور جنگی جہازوں کی تعداد کو دیکھ کر نہیں کیا جاتا بلکہ ان کی ملکی پیداوار اور بیرونی تجارت کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ معاشی قوت سے ہی بالقوہ فوجی اہلیت کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ پھر یہاں بھی مقابلہ کا اثر صحت بخش ہوتا ہے۔ قدیم تجاریئین کے نظریہ کی بنیادی غلطی ان کا یہ اعتقاد تھا کہ جب ایک قوم کو تجارت سے فائدہ ہوتا ہے تو دوسری کو لازماً اس سے نقصان ہوتا ہے۔ جدید نظریہ یہ ہے کہ ہر قوم کو اس کے پڑوسی کی مرفہ الحالی سے اس اصول کے ماتحت فائدہ پہنچتا ہے کہ جتنا مال دار گاہک بنے گا اتنا ہی مال زیادہ بکے گا۔ تجارت سے دونوں قوموں کو فائدہ پہنچتا ہے اگرچہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک کو زیادہ اور دوسرے کو کم پہنچے۔ بیرونی منڈیوں پر قبضہ سستا مال بیچ کر ہی قائم رکھا جا سکتا ہے۔ ایک ملک کے منافع دوسرے ملک کے خریداروں کو نفع پہنچا کر ہی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ذاتی اور طبقہ کے مقابلہ کی طرح قومی

مقابلہ ایک ملک کو نفع اسی وقت پہنچا سکتا ہے جب وہ ملکوں کے گروہ کو بھی فائدہ پہنچائے اس سے ایک قوم کو فائدہ پہنچتا ہے لیکن ضمناً دوسری قوموں کی بھی ترقی ہو جاتی ہے۔

مقابلہ کے خطرات | مقابلہ کے اس بنیادی فائدے کو جن مختلف شکلوں میں اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس میں کوئی خامی ہی نہیں پائی جاتی۔ جہاں جنگ ہوتی ہے اور ایک فاتح ہوتا ہے وہاں مفتوح اور شکار کا ہونا بھی ضروری ہے کوئی بھی کشاکش ایسی نہیں ہو سکتی جس سے مفتوح کے کرب و تکلیف کو علیحدہ کیا جا سکے۔ تکلیف ترقی کے ساتھ لازمی طور پر وابستہ ہے جس طرح ایثار کم سے کم سعی کی شکل میں تسکین اور فرحت کا پیش خیمہ ہے۔ حیوانی دنیا میں جہاں مقابلے بے رحمی سے کیا جاتا ہے یہ برائی بہت نمایاں ہے۔ وہاں ترقی کو شکار کی موت کی قیمت دے کر خریدا جاتا ہے۔ جنگ حیوانی جبلتوں اور درندوں کی طاقتوں کے درمیان ہوتی رہتی ہے۔ فتح چاہے وہ نسل کے لئے کتنی ہی فائدہ بخش کیوں نہ ہو فرد کی زبردست قربانی کے بعد حاصل کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں انسانی مقابلہ اپنی معاشی شکل میں کچھ تو درندوں کے مقابلہ سے مشابہ ہوتا ہے لیکن زیادہ تر اس سے مختلف اور ممتاز ہوتا ہے۔ معاشی مقابلہ سے ناکام حریف کی معاشی موت بلاشبہ واقع ہوتی ہے جب صناع کا حریف اس کے مقابلہ میں مال سستا بیچتا ہے اسے آخر میں میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑتا ہے۔ اس کے مقابل کی کامیابی جس سے دولت کے استعمال کرنے والوں کی معاشی ترقی پیدا ہوتی ہے اس کے لئے ذاتی طور پر تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔

مگر دو باتیں ہیں جو درندوں کے مقابلہ سے انسانی مقابلہ کو مختلف کرتی ہیں اول تو یہ کہ ہو سکتا ہے کہ یہ معاشی خرابی عارضی ہو صناع جو ایک کاروبار میں ناکام رہتا ہے وہ اکثر دوسرے کاروبار میں جس کے لئے وہ زیادہ موزوں ہوتا ہے کامیاب ہو جاتا ہے۔ اپنی ابتدائی ناکامی کی وجہ سے وہ دوسری جگہ دوہری کوشش کرتا ہے اور آخر میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کے زوال کے معنی خاتمہ کے نہیں ہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ یہ زوال حقیقتاً اس کی ترقی کا پیش خیمہ ثابت

ہو۔ دوسرے معاشی مقابلہ میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خاتمہ بالکل واقع نہ ہو بلکہ صرف ایک نسبتی شکست اس مفہوم کے اعتبار سے پیدا ہو جائے کہ دو حریفوں کی ترقی کی رفتار غیر مساوی ہو جائے مزدور سرمایہ داروں سے مقابلہ کرتے ہیں ایک ملک دوسرے ملک سے مقابلہ کرتا ہے ۔ دونوں مسلسل فائدہ حاصل کرسکتے ہیں گو اس فائدہ کے تناسب میں اختلاف پیدا ہو جائے ۔ درندوں کے مقابلہ میں کشاکش صرف چیزوں کے صرف کے لئے ہوتی ہے انسانی مقابلہ میں یہ کشاکش چیزوں کی پیدائش کی شکل اختیار کرلیتی ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ آخر میں دونوں کا مقصد احتیاجات کی تسکین ہوتا ہے لیکن مقصد تک پہنچنے کے وسائل مختلف ہوتے ہیں ۔ اس اختلاف سے دونوں حریفوں کو ان منافع میں شریک ہونے کا موقع مل جاتا ہے جو معاشی مقابلہ کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں ۔

لیکن ان خوبیوں کے باوجود مقابلہ اکثر ایک تکلیف دہ کام ہوتا ہے اور اس بنا پر کہ کشاکش جسمانی طاقت کے میدان سے ذہنی اہلیت کے میدان میں منتقل ہوگئی ہے مقابلہ کی اذیت اور تکلیف میں کمی واقع نہیں ہوتی ۔ اس کے علاوہ مقابلہ بعض وقت اس قدر خوفناک شکل اختیار کر لیتا ہے کہ اس سے دونوں حریفوں کی قوتیں سلب ہو جاتی ہیں ۔ اسے "CUT THROAT COMPETITION" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور اس کا ذکر کچھ سالوں سے بہت سنا جانے لگا ہے ۔ اس میں منڈی پر قبضہ کرنے کے لئے قیمتوں کو اصل لاگت سے بھی کم کر دیا جاتا ہے ۔ خریدار کو اپنے عارضی فائدے کے بہت مہنگے دام دینے پڑتے ہیں کیونکہ کچھ عرصے بعد دولت کے سب پیدا کرنے والے ختم ہو جاتے ہیں ۔ اس جگہ مقابلہ اپنی بدترین شکل میں نظر آتا ہے ۔ کیونکہ تمام مقابلہ کرنے والوں کو گر کر اپنے بدترین بے اصول حریف کی سطح تک اتر آنا پڑتا ہے ۔ اسی طرح مزدوروں کے درمیان بھی سخت ترین مقابلہ شروع ہوسکتا ہے جب مزدوروں کی ضرورتیں انھیں مجبور کرتی ہیں کہ وہ اپنا معیار بھی اتنا ہی پست کرلیں جتنا کہ ایک نہایت کم اجرت پانے والے اور سب سے زیادہ محنت کرنے والے

مزدور سے نے بنا رکھا ہے۔ان دونوں صورتوں میں مقابلہ کی وجہ سے کامیاب کاروبار یا خوش حال مزدوروں کی جماعت کا دائمی قیام خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ مقابلہ کے خاص فائدوں کو قائم رکھا جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی ناہموار شاخوں کو کاٹ کر برابر کر دیا جائے یعنی معاشرتی فایدہ کو قائم رکھا جائے اور انفرادی ایثار کو کم کیا جائے۔ بالفاظ دیگر سوال یہ ہے کہ مقابلہ کے صحیح حدود کیا ہیں ؟

مقابلہ کے حدود | اس مسئلہ کا مطالعہ تین نقطہائے نگاہ سے کیا جا سکتا ہے یعنی مقابلہ کی سطح کی نقطہ نگاہ سے، مساوات کے قائم رکھنے کے نقطہ نگاہ سے اور تیسرے سرکاری کاروبار سے مشابہت رکھنے والے کاروبار کو زندہ رکھنے کے نقطہ نگاہ سے۔

(۱) درندوں اور انسانوں کے مقابلہ میں جو بنیادی فرق ہے اور جو درحقیقت اور تمام دوسرے اختلافات کی تہ میں بھی کام کرتا رہتا ہے وہ یہ ہے کہ حیوانات تو اپنے ماحول کے پابند ہوتے ہیں لیکن انسان کم سے کم ایک حد تک اپنے ماحول کو بدل سکتا ہے۔ یہ بات صرف طبعی ماحول کے لئے ہی صحیح نہیں ہے بلکہ معاشری و معاشی ماحول کے لئے اس سے بھی زیادہ صحیح ہے۔معاشرت کا کام یہ ہے کہ وہ مقابلہ کی عام سطح کو بلند کر دے۔مقابلہ کی اس انتہائی شکل میں بھی جس کو جنگ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں بین الاقوامی سمجھوتوں کے ذریعے جنگ کی واقعی سختیوں میں کمی کئے بغیر بے کار نقصان اور غیر ضروری تکلیف کے روکنے میں کامیابی حاصل کر لی گئی ہے اور اب یہ کہنا صحیح نہیں رہا ہے کہ جنگ اور محبت میں ہر چیز جایز ہوتی ہے۔اسی طرح معاشی زندگی میں ہم اکثر یہ سنتے ہیں کہ ناجایز اور فریقین کو نقصان پہنچانے والا مقابلہ کیا جا رہا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ذلیل اور قابل ملامت طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں۔کاروباری زندگی کی ترقی سے درندوں جیسی کشاکش سے ہم بہت دور ہٹتے جا رہے ہیں اور جماعت آج کل اکثر "جایز" اور "ناجایز" مقابلہ میں تفریق کرتی رہتی ہے۔"جایز" مقابلہ کیا ہے اس کا جواب نہ صرف مختلف زمانوں میں بدلتا رہتا ہے بلکہ مختلف پیشوں کے لئے بھی اس کا جواب مختلف ہوتا ہے۔ہماری ریلوں کے

طریقے ایک نسل پہلے کے طریقوں سے بہت مختلف ہو گئے ہیں۔ ایک وکیل یا ایک ڈاکٹر کی فیس وا
میں مقابلہ ان پیشوں کے جن اخلاقی اصولوں کے ماتحت ہوتا ہے وہ تجارت کے پیشہ کے اصولو
سے مختلف ہوتے ہیں۔ وریتھ اسٹریٹ میں جو کاروبار کے اصول ہیں ویسے وال اسٹریٹ میں
نہیں ہیں۔ کسانوں میں مقابلہ فیکٹری کے مالکوں کے مقابلہ سے جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔
ہر گروہ کا اپنا ایک خاص معیار ہوتا ہے اور ایک اوسط درجہ کا آدمی اگر اسے پورا کر دیتا ہے
تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ ترقی کے معنی یہ ہیں کہ اس معیار کو بلند کیا جائے اور معاشی حیثیت سے
جو چیز جائز ہے اس کے مفہوم کو برابر وسیع کرنا جاری رکھا جائے۔ لیکن معیار کی پیروی سے
انفرادی آزادی میں تھوڑی مداخلت ضرور ہوتی ہے۔ رائے عامہ کی قوت کے ذریعہ جس کا
عکس کاروبار کے قاعدوں اور رواج اور قانون کی دفعات میں نظر آتا ہے مقابلہ ایک اعلیٰ
شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ بے ایمانی کو غصہ اور ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے فیکٹری
کے قوانین بنائے جاتے ہیں کمینہ اور اسٹرائک کو توڑنے والے لوگوں کی ملامت کی جاتی ہے
بے اصولی کے ساتھ کاروبار میں روپیہ لگانے پر سزا دی جاتی ہے مقابلہ ختم نہیں ہو رہا ہے
بلکہ اس کی سطح کو بلند کیا جا رہا ہے۔

(۲) دوسری چیز جو قابل لحاظ ہے وہ مساوات ہے۔ مکمل مساوات کا بلاشبہ کہیں وجود نہیں
ہے کیونکہ تنوع تو زندگی کا قانون ہے مقابلہ اپنا کام معاشی میدان میں بھی ایسا ہی کرتا رہتا ہے
جیسا کسی اور دوسرے میدان میں اور اس میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جن کے پاس بہتر
قسم کا سامان ہوتا ہے۔ مگر جب مقابلہ کرنے والوں میں عدم مساوات بہت زیادہ ہوتی ہے
تو جماعت کو مقابلہ کے مخصوص فوائد حاصل نہیں ہوتے۔ اگر ایک شخص ایک چیز کو دس آنے میں
پیدا کر سکتا ہے اور اس کا دوسرا واحد مدمقابل اس چیز کو پچاس آنے میں پیدا کرتا ہے۔ تو ۴۵
آنے کی قیمت مقرر کرنے سے منڈی پر اس کا پورا قبضہ ہو جائے گا۔ لیکن اگر مقابلہ کرنے والے
لوگ زیادہ اہل ہوتے تو ہو سکتا تھا کہ اسے اپنی قیمت پندرہ آنے تک گھٹانا پڑتی۔ مقابلہ کرنے

والوں میں جتنی زیادہ مساوات ہوگی اتنا ہی زیادہ دولت کے صرف کرنے والوں کو فائدہ پہنچے گا اگر دولت پیدا کرنے والے لوگوں کی اہلیت کارگذاری کو کسی طرح اتنا بڑھایا جائے کہ اس قسم کی نسبتی عدم مساوات کم ہو جائے تو اس سے تمام جماعت کو بڑا فائدہ پہنچے گا جیسا ہم آگے چل کر دیکھیں گے تامینی محاصل کے ذریعہ بین الاقوامی مقابلہ کی جو حد بندی کی جاتی ہے اس کی تائید میں بھی یہی دلیل خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس طرح کمترین اجرت کے لئے جو مطالبہ کیا جاتا ہے یا مزدوروں کی انجمنیں جو جائز طریقے اختیار کرتی ہیں ان میں بھی یہی بات پیش نظر رہتی ہے کہ کمزور ترین افراد کو طاقتور ترین افراد کے معیار کے قریب لایا جائے۔ اپنی بہترین شکل میں اس کا منشاء یہ نہیں ہوتا کہ سب کو برابر کر کے نیچے کی سطح پر لے آیا جائے بلکہ کوشش کی جاتی ہے کہ جو لوگ پست ہیں ان کی سطح کو بلند کیا جائے۔

اس میں جس نکتہ پر خاص زور دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ایک کمزور حریف کو مضبوط کرنے سے نہ صرف اس حریف کو فائدہ پہنچتا ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ کل گروہ کو فائدہ پہنچے اور آخر میں کل جماعت اس سے مستفید ہو۔ مقابلہ باقی رہتا ہے لیکن اس کی عدم مساوات کم ہو جاتی ہے۔ دوسری جگہوں کی طرح یہاں بھی یہ خطرہ پایا جاتا ہے کہ ممکن ہے جماعت کو کمزوروں کے قوی ہو جانے سے جو فائدہ پہنچے وہ کم ہو اور مضبوطوں کی آزادی کو محدود کر دینے سے نقصان زیادہ پہنچے۔ لیکن یہ ایسا اندیشہ ہے جو جمہوریت کے تمام نظام میں پایا جاتا ہے اور اس کا تحفظ دوسری طریقوں پر کرنا چاہیئے۔

(۳) تیسری چیز جو خطرہ کا موجب بنتی ہے وہ نیم سرکاری کاروبار کی موجودگی ہے۔ سپریم کورٹ کے ۱۹۰۴ء کے نام نہاد "فیصلہ شمولیت" کے تھوڑے ہی عرصہ بعد جس میں نارتھرن سیکورٹیز کمپنی کو غیر قانونی قرار دیا گیا تھا ایک مشہور وکیل نے اس فیصلہ کے خلاف علی الاعلان تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اب کوئی بھی اس پرانے مقولہ کو تسلیم نہیں کرتا کہ "مقابلہ تجارت کی روح ہے"۔ لیکن یہ تنقید غلط فہمی پر مبنی تھی۔ ریلوں میں ایک خاص قسم کے مقابلہ کو تو بلاشبہ تجارت کی روح قرار نہیں دیا جا سکتا۔

لیکن اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریلیں اور ویسے ہی اور دوسرے وسائل آمد و رفت و خبر رسانی اور قوت متحرکہ معمولی تجارتی کاروبار سب اس اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں کہ ان کی حیثیت نیم سرکاری سی ہوتی ہے یہ کاروبار ایسے ہیں جن میں مفاد عامہ کی اہمیت اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ اس کو ذاتی منافع کا پابند نہیں بنایا جاسکتا معمولی نجی کاروبار میں خریدار اور فروشندہ انفرادی طور پر سودا کرتے ہیں اور جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے مقابلہ کی وجہ سے قیمتوں میں یکسانیت پیدا ہوتی رہتی ہے لیکن اس کے باوجود جو لوگ زیادہ طاقت یا زیادہ رسوخ رکھتے ہیں ان کے لئے خفیہ طور پر قیمتوں میں کمی کر دی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کاروباری آدمی کے منافع کا بیش تر حصہ چیزوں کو منافع کے ساتھ خریدنے کی مہارت میں مضمر ہوتا ہے۔ کاروبار میں عام رواج ہے کہ مختلف گاہکوں سے مختلف قیمتیں لینے کا نظام جاری ہے ریلوے بھی چونکہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی اس عام پالیسی پر عمل کرنے کی کوشش کرتی ہیں اس لئے ریلوے کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اب اس بات کو تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ ڈاک خانہ کی طرح ریلوں کو بھی مختلف گاہکوں کے ساتھ ذاتی رعایت اور امتیاز کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ایک دولت مند تاجر کو اپنے چھوٹے حریف کے مقابلہ میں ڈاک خانہ سے ٹکٹ سستے داموں پر نہیں ملتے اس لئے اسے مال کے کرایہ میں بھی ریلوں کی طرف سے کوئی رعایت نہ ملنا چاہیئے معمولی کاروبار میں مقابلہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مختلف افراد کے ساتھ مختلف قسم کا سلوک کیا جائے اور یہ چیز فائدہ بخش ہوتی ہے۔ لیکن ریل کے کرایہ کے نرخوں میں مقابلہ کے معنی یہ ہیں کہ مال لادنے والوں میں ایک کے ساتھ رعایت کی جائے اور دوسرے کے ساتھ نہ کی جائے اور یہ قابل ملامت ہے۔ معمولی قیمتوں میں مقابلہ تجارت کی جان ہے لیکن ریلوے کے معاملہ میں مقابلہ سے جائز تجارت فنا ہو جاتی ہے۔ نیم سرکاری کاروبار میں جس مقابلہ کو پسندیدہ سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ خدمت اور سہولتوں کا مقابلہ ہے۔

اوپر کے بیان سے ظاہر ہوا کہ مقابلہ ایک ایسی قوت ہے کہ جس کا غلط استعمال جائز نہیں ہے۔ بعض کاروبار میں تو اس پر عمل ایک محدود حد تک ٹھیک ہے جب نسبتی مساوات موجود ہوتی

ہے اس وقت اس کا عمل بہت مفید ہوتا ہے لیکن اس کے عمل کے معیار کو برابر بلند کرتے رہنے کی ضرورت ہے ۔ ان حدود کے اندر اور ان شرائط کے ساتھ اسے ایک حیات بخش اور مفید قوت کہا جا سکتا ہے ۔

مقابلہ کے بدل | مقابلہ کے جواب میں معاشی مظاہر کی نگرانی کی تین اور ممکن صورتیں پیش کی جا سکتی ہیں ۔ (۱) رسم و رواج (۲) امداد باہمی اور (۳) اجارہ

(۱) رسم و رواج | ایک زمانہ میں رسم و رواج کی اہمیت موجودہ عہد کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھی مشرق کی نسبتاً زیادہ جامد جماعتوں میں اور یورپ میں عہد وسطیٰ کے ابتدائی زمانہ میں جماعت کے کاروبار میں معاہدہ کی جگہ رواج کو پورا عمل دخل حاصل تھا ۔ لوگ خاص حالات اور پیشوں کے اندر پیدا ہوا کرتے تھے اور ان سے باہر نکلنا یا تو بہت مشکل ہوتا تھا یا بالکل ناممکن ۔ ہندوستان کے ذات پات کے نظام کی سختیوں میں ہمیں رسم و رواج اپنی انتہائی ترقی یافتہ شکل میں نظر آتے ہیں ۔ قیمتیں بھی بیشتر رواج پر مبنی ہوا کرتی تھیں ۔ عہد وسطیٰ میں منصفانہ قیمت کو جاری کرنے کی تمام کوششوں کے معنی یہ ہوتے تھے کہ جس چیز کی جو قیمت رواجاً چلی آ رہی ہے وہ جاری رکھی جائے ۔ سرمایہ بڑی حد تک زمین میں لگا ہوا تھا اور اس لئے غیر انتقال پذیر تھا ۔ محنتیوں کو اجازت نہیں تھی کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ یا ایک تجارت سے دوسری تجارت میں منتقل ہوں ۔ لیکن تاہم رواجی معیشت کی اس منزل میں بھی مقابلہ بالکل معدوم نہیں تھا ۔ جتنا عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ قیمتیں مقابلہ کی مخفی اور پوشیدہ قوتوں کے اثرات قبول کیا کرتی تھیں ۔ آج بھی بعض معاشی مظاہر کے معین کرنے میں رسم و رواج کا حصہ محسوس کیا جا سکتا ہے گو اب یہ تیزی سے گھٹتا جا رہا ہے ۔ یہاں تک کہ ہمارے ملک کے پس ماندہ اور ابتدائی علاقوں میں بھی مقابلہ اور مسابقت کی جدید زندگی تیزی کے ساتھ گھستی چلی جا رہی ہے ۔ اس لئے صنعتی جماعت کے معاشی نظریوں کا انحصار آج کل رسم و رواج پر نہیں بلکہ مقابلہ اور مسابقت پر ہونے لگا ہے ۔

(۲) امداد باہمی کو بعض اعتبارات سے مقابلہ کا بالکل برعکس اور بعض اعتبارات سے اس کا ضمنی نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابتدا ہی سے گروہ کے اندر امداد باہمی اس مقصد کے ساتھ پائی جاتی ہے تاکہ گروہوں کے درمیان مسابقت کے کام کو بہتر طریقہ پر چلایا جا سکے آج بھی خاندان کے افراد کے مابین کوئی مقابلہ نہیں پایا جاتا اگرچہ مختلف خاندانوں کے درمیان بڑے زور شور سے مقابلہ ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح ایک کمپنی کے حصہ دار اس غرض سے اشتراک باہمی سے کام کرتے ہیں تاکہ زیادہ موثر طریقہ پر دوسری کمپنیوں سے مقابلہ کریں۔ حقیقتاً سینکڑوں قسم کی انجمنیں پائی جاتی ہیں کچھ اختیاری ہوتی ہیں کچھ جبری ان میں کلب بھی شامل ہے اور ریاست بھی جس سے جدید معاشری زندگی کی تکمیل ہوتی ہے اور جن کا کم و بیش معاشی زندگی پر اثر پڑتا ہے اور جو منڈی کی کشاکش کے ساتھ ساتھ ہم آہنگی سے کام کرتی رہتی ہے۔ اس قسم کی امداد باہمی اور مقابلہ میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔

لیکن اگر امداد باہمی کو اس کو اصطلاحی مفہوم کے ساتھ لیا جائے تو اس میں پیدائش اور تقسیم دولت کے کام میں مقابلہ کا ترک کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ تقسیم دولت میں امداد باہمی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ گاہک جو اور خود کمپنی کی انجمنوں کے ارکین ہوتے ہیں اپنے میں سے کسی ایک ممبر کو اسٹور کا منیجر بنا لیتے ہیں اور جو نفع ہوتا ہے اس میں سب شریک ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ چیزوں کو کہیں باہر سے نہ خریدیں اس لئے مقابلہ موجود نہیں ہوتا۔ اس قسم کے کوآپریٹو سٹور خصوصیت کے ساتھ انگلستان میں پائے جاتے ہیں۔ امریکہ میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ڈپارٹمنٹ اسٹورس کے برابر سستی چیزیں مہیا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ پیدائش دولت میں امداد باہمی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ دار تاجر سے نجات حاصل کی جائے اور مزدوروں کے درمیان مقابلہ ختم کیا جائے مزدور اپنے میں سے ایک یا زائد آدمی کو کاروبار کی نگرانی کے لئے چن لیتے ہیں اور منافع کو آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں امداد باہمی کے اصول پر دولت پیدا کرنے کے کام میں بعض نمایاں

کامیابی حاصل ہوئی ہیں لیکن جیسا کہ ہم دیکھیں گے اس کا میدان بہت محدود ہے اور مقابلہ کے بدل کی حیثیت سے اس کے اختیار کرنے میں بڑے موانع ہیں۔

(۳) جہاں امداد باہمی میں دولت کے استعمال کرنے والوں اور مزدوروں میں باہمی مقابلہ کا ترک کرنا ضروری ہوتا ہے وہاں امداد باہمی کی ایک تیسری صورت اور بھی ہے جس میں سرمایہ داروں اور کاروبار کے منیجروں میں باہمی مقابلہ کو ترک کر دیا جاتا ہے اس کو عام طور پر سرمایہ داروں کے اتحاد کے نام سے موسوم کرتے ہیں اگر یہ اتحاد نامکمل ہوتا ہے تو اس میں مقابلہ کی عملداری باقی رہتی ہے اور اگر مکمل ہوتا ہے تو اجارہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس لئے کاروبار میں جب مقابلہ ختم ہوجاتا ہے تو اس کا آخری نتیجہ اجارہ ہی ہوتا ہے۔

اجارہ کئی شکلوں میں پایا جاتا ہے چنانچہ اسی اعتبار سے اسے مختلف عنوانات کے ماتحت تقسیم بھی کیا جاتا ہے۔ اجارے یا تو نجی ہوتے ہیں یا سرکاری ہوتے ہیں۔ پھر سرکاری اجارے بھی یا تو مالی ہوتے ہیں یا معاشرتی۔ مالی اجارے تو وہ ہوتے ہیں جنھیں حکومت مالی وجوہ سے چلاتی ہے مثلاً نمک یا تمباکو وغیرہ کے اجارے معاشرتی اجارے ایسے کاروبار ہوتے ہیں جنھیں حکومت زیادہ تر معاشرتی وجوہ سے چلاتی ہے مثلاً امریکہ میں فیڈرل ڈاک خانہ یا ساؤتھ کیرولینیا میں شفاخانہ کا نظام اس کے برعکس نجی اجارے تین قسم کے ہوتے ہیں:۔ ذاتی، مزدوروں کے اور سرمایہ کے۔ ذاتی اجاروں کا انحصار قدرتی صلاحیتوں پر ہوتا ہے۔ ایک بڑے ایکٹر یا گویا بجائے خود ایک علیحدہ قسم ہے۔ مزدوروں کے اجاروں کا انحصار مزدوروں کی انجمنوں پر ہوتا ہے اور ان کا اثر خاص طور پر آجروں پر پڑتا ہے اگرچہ بالواسطہ ان سے پبلک بھی متاثر ہوتی ہے۔ سرمایہ کے اجارے ایسے ہیں جن سے عام طور پر دولت کے استعمال کرنے والوں کو براہ راست دوچار ہونا پڑتا ہے۔

پھر آخر میں سرمایہ کے اجارے بھی چار قسم کے ہوتے ہیں۔ قانونی، قدرتی، انتخابی FRANCHISE اور معمولی کاروباری اجارے (۱) قانونی اجارے ایک زمانہ میں بہت عام تھے اور بادشاہ جس پر ان کی نظر

عنایت ہوتی تھی انہیں دیا کرتے تھے۔ آج کل یہ صرف پیٹنٹس اور حق تصنیف کی شکل میں دیے جاتے ہیں۔ (۲) قدرتی اجارے وہ ہیں جو قدرتی محل وقوع کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں مثلاً بعض ایسی زمینیں یا معدنیں اور سمندر اور دریا جنہیں خاص قدرتی منافع حاصل ہوتے ہیں (۳) انتخابی اجارے FRANCHIS نیم سرکاری کاروبار کی شکل اختیار کر لیتے ہیں مثلاً ریلیں، تار گھر، ٹیلیفون کمپنیوں، گیس، پانی، بجلی کی روشنی وغیرہ کی کمپنیاں کہ جن کو نفع بخش طریقہ پر اس وقت چلایا جا سکتا ہے۔ جب زمین کے اوپر یا نیچے کے سرکاری شارع عام پر حق انتخاب FRANCHISE عطا کیا جاتا ہے۔ صحیح معنوں میں تو انہیں قدرتی اجاروں کی ایک ضمنی تقسیم سمجھنا چاہیئے۔ یہاں تجربے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ طویل زمانہ میں مقابلہ ناممکن اور ناپسندیدہ ہوتا ہے یا تو اس لئے کہ مقابلہ کی وجہ سے یا تو امتیازی سلوک روا رکھنا پڑتا ہے جیسے ریلوں کی مثال میں یا اس لئے کہ اس کی وجہ سے سڑکوں کا استعمال کرنے کے سلسلہ میں ناقابل برداشت مداخلت کی جاتی ہے یا غیر ضروری مشین اور کارخانے کھڑے کئے جاتے ہیں جیسے ان اجاروں کی مثال میں نظر آتا ہے جنہیں میونسپل اجارے کے نام سے غلط طور پر موسوم کیا جاتا ہے۔ (۴) اخیر میں معمولی کاروباری اجاروں میں موجودہ کاروبار کے بیشتر وہ کاروبار شامل ہیں جنہیں TRUSTS سے موسوم کیا جاتا ہے اور جن کے فی الواقعی اجارہ ہونے کے بارے میں بھی جیسا کہ آگے وضاحت کی جائے گی شبہ کیا جا سکتا ہے

اس سے صاف طور پر ظاہر ہوا کہ نجی اجارہ صرف ذاتی اجاروں کی شکل میں قیمتوں کی قابل اطمینان طریقہ پر نگرانی کر سکتا ہے کیونکہ اس صورت میں دولت کا استعمال کرنے والا خوشی سے غیر معمولی قدرتی صلاحیت کی قدر کرنے اور اس کو ترقی دینے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ نیز پیٹنٹس اور حق تصنیف میں بھی جہاں جماعت کچھ عرصہ کے لئے مقابلہ کے منافع کو ترک کرنے کے لئے اس لئے تیار ہو جاتی ہے کہ اس سے ایجاد و اختراع کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور آخر میں اور بہت زیادہ منافع حاصل ہونے کا امکان پیدا ہوتا ہے اجارہ کے ذریعہ قیمتوں کے تعین کو گوارا کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ بقیہ تمام دوسری صورتوں میں ذاتی اجارہ کی وجہ سے دولت کے صرف کرنے

والے بالکل بے بس ہو جاتے ہیں۔ جب مقابلہ کے ذریعہ خریداروں کو فائدہ پہنچانے کا امکان ختم ہو جاتا ہے تو مجبوراً قانون کو مداخلت کرنا پڑتی ہے۔ اس لیے غیر محدود اجارہ کو صرف نہایت استثنائی صورتوں میں مقابلہ کا بدل سمجھا جاسکتا ہے۔

اوپر کی تمام بحث سے ظاہر ہوا کہ مقابلہ ایک ایسی قوت ہے جس سے جماعت کے معاشی مشاغل کی مستقل طور پر نگرانی کی جاسکتی ہے۔ لیکن مقابلہ ہر جگہ موجود نہیں ہوتا اور نہ ہمیشہ فائدہ بخش ہوتا ہے۔ اگر اس کی برائیوں کو اس سے جدا کر دیا جائے اور مناسب حدود کے اندر رکھا جائے تو جتنا یہ وسیع اور ہمہ گیر ہوتا ہے اتنا ہی مفید بھی ہوتا ہے۔

معاشی آزادی

غلامی کی ابتدا اور ترقی | صنعتی آزادی نے ملکیت ذاتی کی طرح آہستہ آہستہ ترقی کی ہے۔ غیر تعلیم یافتہ وحشی کی آزادی کی جو تصویر کھینچی جاتی ہے اس کی حقیقت پریوں کے افسانوں سے زیادہ نہیں ہے ابتدائی آدمیوں میں تین طرح پر آزادی کا فقدان پایا جاتا تھا۔ اول تو فطرت کی طرف سے ان کے اندر ایک نہایت غلامانہ خوف پایا جاتا تھا دوسرے وہ اپنے زیادہ مضبوط ہمراہیوں سے خوف زدہ رہتے تھے اور تیسرے انہیں معاشرتی گروہ کا خوف رہتا تھا۔ فطری مظاہر سے ناواقفیت کی بنا پر وہ ہر قسم کے خوف اور اوہام کا شکار رہتے تھے اور جادوگروں اور دوا دینے والوں کو انہیں اپنے پنجے میں پھانس لینے کا خوب موقع ملتا تھا چونکہ جس جماعت میں وہ رہتے تھے اس کا انحصار درندوں جیسی طاقت پر تھا اس لئے انہیں ہمیشہ زیادہ مضبوط وحشیوں کے رحم وکرم پر رہنا پڑتا تھا۔ پھر چونکہ دوسری طرف گروہ یا قبیلہ پر زندگی کے وسائل حاصل کرنے کے لئے انہیں انحصار کرنا پڑتا تھا اس لئے وہ چاروں طرف سے ایسے معاشری رواج سے جکڑے ہوتے تھے جنھیں توڑنا ممکن نہیں تھا اور ایسی جماعتی ممنوعات کی پابندی کرنا پڑتی تھی جن سے بچنے کی کوشش حماقت تھی۔ ابتدائی فطرت نے نہیں بلکہ تہذیب نے آزادی کو پیدا کیا ہے۔ علم نے انسان کو اوہام سے نجات دی ہے۔ قانون اور انتظام نے اسے ظالموں سے محفوظ کرایا ہے اور معاشری ترقی نے زندگی کے ہر شعبہ میں آزادی کی ایک ایسی فضا پیدا کی ہے جو روز بروز مطلق العانیت سے زیادہ محفوظ ہوتی چلی گئی ہے۔ سیاسی آزادی کی طرح معاشی آزادی، آزادی تقریر کی طرح خیال کی آزادی یہ سب معاشرت کی زیادہ ترقی یافتہ منازل کے نتیجے ہیں۔

جو آزادی معاشیات کے ماہروں کے لئے خاص طور پر دلچسپی کا باعث ہے وہ دو قسم کی

اول تو جسم کی آزادی جو تمام محنت کی بنیاد ہے اور دوسرے اپنی محنت پہ اختیار کے علاوہ معاشی جد و جہد کی آزادی۔ اول الذکر میں (محدود مفہوم کے ساتھ) انفرادی آزادی شامل ہے اور اس سے غلامی کے مطالعہ کی طرف رہنمائی ہوتی ہے اور دوسرے میں متعدد مظاہر شامل ہیں جن کا ذکر آگے مناسب موقع پر کیا جائے گا۔ پہلے ہم غلامی کے موضوع کو لیتے ہیں۔

غلامی کی ابتدا کے بارے میں حال کے زمانہ تک بڑی غلط فہمی پائی جاتی تھی۔ عام طور پر غلامی کے چار اسباب بیان کئے جاتے ہیں۔ فتح، قرض، جرم اور پیدائش۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ میں جو لوگ گرفتار ہوتے تھے انھیں غلام بنایا جاتا تھا۔ یا جو لوگ خود کو فروخت کر ڈالتے تھے یا قرضہ ادا نہ کر سکتے تھے غلام بن جاتے تھے یا ایسے مجرموں کو غلام بنایا جاتا تھا جن کو قتل سے کچھ کم سزا دی جاتی تھی یا جو لوگ غلام ہوتے تھے ان کی اولاد بھی غلام رہا کرتی تھی۔ یہ بیان اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن اس سے غلامی کی ابتدا اس کی توسیع اور اس کے زوال پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

غلامی ایک ایسا ادارہ ہے جس کے ذریعہ دوسروں سے جبراً خدمت لی جاتی ہے۔ یہ اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب خاصی بڑی تعداد میں مزدوروں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ معاشرت کی نہایت ابتدائی منزلوں میں انسان جو کام کرتا تھا وہ شکار اور ماہی گیری تک محدود ہوتا تھا اور یہ دونوں مشاغل بجائے خود دلچسپ ہوتے تھے۔ جماعت کا ہر فرد ایسے کام میں مصروف رہتا تھا اور لازمی محنت کی ضرورت تھی نہ گنجایش تھی۔ جب ملکیت ذاتی پیدا ہوئی اس وقت البتہ غلامی کی ابتدا ہوئی۔ خاص خاص صورتوں میں ہمیں ملکیت ذاتی اور بار بار ماہی گیروں کے گروہوں میں بھی نظر آتی ہے جیسے شمالی بحرالکاہل کے ساحل کے بعض انڈین قبائل میں۔ یہاں غلام سے ماہی گیری اور خانگی کام میں مدد لی جاتی ہے۔ لیکن عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ غلامی صرف ابتدائی معاشی منزل میں جہاں غذا بغیر سرمایہ کی مدد کے سہولت کے ساتھ حاصل ہو سکتی ہے پائی جا سکتی ہے۔ لیکن جہاں یہ صورت نہیں ہوتی جیسے آسٹریلیا والوں یا امریکہ کے انڈینس اور اسکیموں میں وہاں غلامی سے لوگ ناواقف رہتے ہیں۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ملکیت ذاتی کو گلہ بانی کی منزل میں اہمیت حاصل ہونا شروع ہوتی ہے

غلام سے اس دور میں گوالہ اور گڈریے کی حیثیت سے کام لیا جاسکتا ہے۔ پھر ابوی خاندان ترقی پاتا ہے اور غلام خاندان کا ایک لازمی جزو بن جاتا ہے لیکن اس زمانہ میں بھی غلامی کی اہمیت نسبتاً بہت کم ہوتی ہے۔ کیونکہ بڑے بڑے گلوں کی نگرانی صرف چند آدمی کرسکتے ہیں اور چونکہ ایسے فلاکت زدہ آزاد آدمی کثرت سے موجود ہوتے ہیں جن سے حسب دل خواہ کام لیا جاسکتا ہے اس لئے غلاموں کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ پھر اس کے علاوہ خانہ بدوشی کی غیر مقیم زندگی میں خانگی غلاموں کی بڑی تعداد کا اکٹھا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

لیکن جب ہم زراعتی منزل پر پہنچتے ہیں تو حالات بدل جاتے ہیں۔ زمین کو جوتنے کا کام بہت سخت ہوتا ہے لیکن اگر مزدوروں کی کافی تعداد موجود ہو تو اس کام سے نفع حاصل کیا جاسکتا ہے ایک مقررہ قطع زمین پر ایک خاص حد تک محنتیوں کے ہر اضافہ کے ساتھ پیداوار میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور چونکہ ایک جگہ پر قیام ہوتا ہے اس لئے خانگی ملازموں کو مختلف حیثیتوں سے ملازم رکھا جاسکتا ہے غرضکہ جتنے زیادہ غلام ہوتے ہیں اتنی ہی دولت میں اضافہ ہوتا ہے اور غلاموں کے مالک کو آرام و آسایش کا موقع ملتا ہے۔

زراعتی عہد کے ابتدائی زمانہ میں غلامی کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں تھی۔ جب مالک اور اس کے خاندان کی فوری ضرورتیں پوری ہو جاتی تھیں تو اس کے بعد زائد مزدوروں کو ملازم رکھنے میں کوئی فائدہ نہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جب بارٹر کو ترقی ہوئی اور زائد پیداوار کے مبادلہ کے امکانات پیدا ہوئے تو زمین کے رقبہ اور غلاموں کی تعداد میں اضافہ نفع بخش نظر آنے لگا۔ دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ غلامی کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ زراعتی پیداوار کے لئے منڈی ترقی پاجائے اور زمینداریوں کا انتظام کاروباری طریقہ پر کرنا شروع کر دیا جائے۔ جب ایسا ہو جاتا ہے تو غلامی سے مالکوں کو نفع حاصل ہونے لگتا ہے اور بڑی بڑی زمینداریوں میں اب کاروبار کی نوعیت اس قدر مختلف ہو جاتی ہے کہ غلاموں کی بڑی تعداد نہ صرف خانگی بلکہ صنعتی کاموں کے پورا کرنے کے لئے بھی استعمال کی جانے لگتی ہے چنانچہ روم میں غلامی کی ترقی بڑے پیمانہ پر

جمہوریت کی آخری صدیوں میں ہی ہو سکی۔ اور اس زمانہ میں غلامی LATIFUNDIA کے اصول پہ بڑے بڑے کاروبار کی ایک نمایاں خصوصیت بن گئی۔ اسی طرح امریکہ میں غلامی نے اس وقت اہمیت حاصل کی جب ابتدا میں تمباکو اور بعد میں کپاس کو باہر کے ملکوں کو بڑے پیمانہ پہ برآمد کیا جانے لگا اور ان کی کاشت کے لئے غلاموں کو رکھنا نفع بخش نظر آنے لگا۔

لیکن منڈی کے علاوہ ایک اور عنصر کا پایا جانا بھی ضروری ہے اور یہ چیز ہے خالی زمین کا موجود ہونا جہاں غیر مزروعہ اور غیر مملوکہ زمین کے بڑے بڑے قطعات موجود ہوتے ہیں وہاں غلاموں کی محنت کو نفع بخش طریقہ پہ استعمال کیا جا سکتا ہے اور زمیندار کے نقطہ نگاہ سے غلامی ناگزیر چیز بن جاتی ہے۔ اگر ہر شخص کو اس بات کی آزادی حاصل ہو کہ زمین کے جس قطعہ پہ چاہے قبضہ کر کے اپنے طور پہ کاشت شروع کر دے تو پھر ظاہر ہے دوسروں کی زمین پر کوئی شخص بھی اپنی مرضی سے کام کرنا پسند نہیں کرے گا سوائے اس صورت کے کہ دوسرے لوگ اس قدر معاوضہ دینے پر آمادہ ہوں جو اس آمدنی سے زیادہ ہو جو وہ شخص اپنی ذاتی زمین پر محنت کر کے خود حاصل کر سکتا جب زمیندار یہ دیکھتا ہے کہ اسے خوشی سے کام کرنے والے نہیں ملتے یا ملتے ہیں تو اتنا معاوضہ مانگتے ہیں جو اس کے تباہ کرنے کے لئے کافی ہے تو وہ جبریہ محنت کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ اور جب تک اچھی زمین غیر محدود وسعت کے ساتھ موجود رہتی ہے غلاموں کی محنت جسے ایک سطحی محنت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ نفع بخش رہتی ہے۔ پرانی زمین کو بہتر طریقہ پر جوتنے کے مقابلہ میں نئی زمین کو کاشت میں لانا زیادہ فائدہ رساں ثابت ہوتا رہے گا اور محنت کو دوگنا کرنے سے زمین کے رقبہ کو بڑھانا معاشی اعتبار سے اچھا نظر آئے گا۔ جب زمین کی پیداوار ناعاقبت اندیشی سے کاشت کرنے کی وجہ سے گھٹنے لگے گی اس وقت بھی پرانے علاقوں میں غلامی نفع بخش معلوم ہوگی اور اس کا نفع زمین کے کام کے وجہ سے نہیں پیدا ہوگا بلکہ اس بنا پر پیدا ہوگا کہ پرانے علاقہ میں غلاموں کو پیدا کر کے نئے اور دور دراز کے علاقوں میں فروخت کیا جا سکے گا۔ زمیندار کے لئے یہ بات غیر اہم ہے کہ اس کی دولت زمین کی پیداوار سے حاصل ہو رہی ہے یا غلاموں کی پیدائش

سے۔ جب تک نئی زمین کی رسد کی وجہ سے غلاموں کی قدر باقی رہے گی ان کی بڑھتی ہوئی تعداد سے زمین کی گھٹتی ہوئی زرخیزی کی تلافی ہوتی رہے گی۔ اور اخیر میں جب پیدائش دولت میں غلامی اہمیت اختیار کرلیتی ہے تو پھر غلاموں کا استعمال صرف زراعت تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ صنعت میں بھی غلاموں سے ہی کام لیا جانے لگتا ہے۔

چنانچہ یونان کے عہد زریں میں جب میونسپلیٹوں کے درمیان باہمی تجارت کا سلسلہ شروع ہوا غلامی نے بھی ترقی حاصل کرنا شروع کی اور جب یونانیوں نے بحر روم کے چاروں طرف اپنی آبادیاں بسانا شروع کیں تو غلامی کی جڑیں اور بھی مضبوط ہوگئیں۔ یونان کی شہری ریاستیں نہ صرف غلاموں کی خاص منڈیاں بلکہ غلاموں کی نسل کشی کا مرکز بن گئیں اور آخر میں صنعت پر بھی غلامی چھاگئی۔ رومیوں کی حکومت کی آمد کے بعد غلامی کو ایک نئی زندگی حاصل ہوئی اور غلاموں کا رکھنا نہ صرف اٹلی کی سرزمین میں نفع بخش ہوگیا بلکہ اٹلی کی حکومت میں جتنے علاقے تھے ان سب میں غلاموں سے نفع بخش طریقہ پر کام لیا جانے لگا۔ جب تک نئی فتوحات اور نئے الحاقات کا سلسلہ جاری رہا غلامی کو فروغ رہا۔ اسی طرح جب یورپ کے مہاجرجن کے باپ دادا نے غلامی کے آخری نشان کو اپنے ملکوں سے خارج کردیا تھا نئی دنیا میں جاکر بسے تو انھوں نے اس سرزمین میں پہنچتے ہی غلامی کو اس کی تمام پرانی سختیوں کے ساتھ دوبارہ جاری کردیا۔ یہ صحیح ہے کہ امریکہ میں غلامی کا نظام صرف زراعت میں ہی پھیل سکا صنعت اس سے محفوظ رہی۔ صنعت میں اس کے نہ پھیلنے کا سبب یہ ہوا کہ ان وجوہ کی بناپر جن کا ذکر ابھی کیا جائے گا یورپ میں صنعتی تہذیب غلاموں کی منزل سے ترقی پاکر آزادی کی منزل پر پہنچ چکی تھی اسی طرح امریکہ کے جنوبی حصہ کے مقابلہ میں شمالی حصہ میں بھی صنعت میں آزاد مزدوروں کا استعمال شروع کیا جاچکا تھا اور چونکہ یورپ یا امریکہ کے شمالی حصہ سے مصنوعہ اشیا کو سستی قیمت پر حاصل کیا جاسکتا تھا اس لئے صنعت میں غلامی کا رواج نفع بخش نہیں رہا تھا۔

غلامی کا زوال اور اس کا غائب ہوجانا | غلامی کے زوال اور بعد میں اس کے غائب ہوجانے کے اسباب کو جب ہم ڈھونڈتے ہیں تو اس سلسلہ میں نئی زمین کی رسد کی کمی ایک نہایت اہم سبب نظر آتی ہے

جب نئی زمین کی رسد گھٹتی ہے تو غلامی کے نقصانات ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ کیرنس CAIRNES کا قول ہے کہ غلامی کے کام میں تین قسم کی خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ کام دل سے نہیں کیا جاتا۔ کام میں مہارت نہیں ہوتی اور کام کرنے والے میں ہمہ دانی کی کمی ہوتی ہے یعنی بہت سے کاموں کے کرنے کی اہلیت نہیں پائی جاتی۔ جب تک نہایت زرخیز زمین کثرت کے ساتھ دستیاب ہوتی رہتی ہے، سطحی کاشت فائدہ بخش رہتی ہے۔ لیکن جب دس بیس سال تک زمین کے ایک ہی ٹکڑے کی کاشت کی جاتی ہے تو اس کی پیداآوری پر اس کا برا اثر پڑتا ہے اور مسلسل اور سخت محنت کرنے کی ضرورت محسوس کی جانے لگتی ہے جب ایسا ہونے لگتا ہے تو زمیندار اسی میں اپنا فائدہ دیکھنے لگتے ہیں کہ غلامی کی سختیوں میں کمی کریں اور کھیتی کے مزدوروں سے زیادہ محنت لینے کے لئے انھیں اس بات کی بھی اجازت دینے لگتے ہیں کہ وہ ذاتی طور پر بھی کچھ کام کر سکیں۔ روم میں غلام آہستہ آہستہ COLONUS کے نام سے موسوم کئے جانے لگے۔ جیسے کچھ صدیوں بعد انگلو سیکسن تھین THEGN کی جگہ ولین VILLEIN پیدا ہو گیا تھا یعنی غلام کی جگہ رعیت پیدا ہوئی رعیت اور غلام میں فرق یہ ہے کہ رعیت کے افراد کو کچھ ذاتی حقوق بھی مل جاتے ہیں اور وہ افراد کے ساتھ وابستہ ہونے کی جگہ زمین کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے یعنی وہ زمین کے ساتھ تو منتقل کیے جا سکتے ہیں لیکن زمین سے جدا نہیں کیے جا سکتے۔ رعیت کے افراد اپنے وقت کے ایک حصہ میں زمیندار کے لئے مفت کام کرنے کے لئے اس کے بعد بھی مجبور رہتے ہیں۔ لیکن جب زمین کی زرخیزی میں بہت زیادہ کمی واقع ہو جاتی ہے تو زمیندار یہ محسوس کرتا ہے کہ رعیت کو بالکل آزاد کرنے میں اور ایک مقررہ لگان جنس یا زر کی شکل میں لینے اور اس کو زمین پر قبضہ کرنے دینے میں اس کا نفع زیادہ ہے۔ یہ کام آہستہ آہستہ چلتا رہتا ہے اور مختلف ملکوں کے مختلف حالات کے مطابق اس کی رفتار میں فرق ہوتا رہتا ہے مگر اخیر میں غلامی کا آخری نام و نشان بھی مٹ جاتا ہے اور کاشتکار یا تو مزدور بن جاتا ہے یا آزاد پیشہ دار کسان۔

غلامی سے آزادی کی طرف منتقل ہونے میں عموماً پانچ منزلوں سے گذرنا ہوتا ہے (۱) آقا کی

طرف سے غلام کے بعض ذاتی حقوق کو تسلیم کرنا (۲) غلام کو ملکیت کے بعض حقوق کا عطا کیا جانا مثلاً روم کے غلاموں کو فرصت کے وقت میں ذاتی طور پر کام کر کے ایک PECULIUM یعنی انفرادی رقم کے حاصل کرنے کا حق حاصل تھا (۳) شادی کے حق کا عطیہ جس سے آقا غلاموں سے نسل کشی کرانے کے حق سے دست بردار ہو جاتا تھا (۴) غلاموں کو آزادی اس شرط کے ساتھ کہ کچھ خدمتوں کا حق محفوظ رکھا جاتا تھا (۵) غلاموں کی مکمل آزادی اور ان کی تمام خدمات کی جگہ ایک مقررہ لگان بہ شکل زر کا تعین۔

غلامی سے رعیت اور رعیت سے آزادی میں منتقل ہونے کی پوری مثال مغربی یورپ کی تاریخ میں ملتی ہے۔ جہاں آبادی کے اضافہ اور نتیجہ کے طور پر اور نئی زمین کی کمی کی وجہ سے کاشت کے بہتر طریقے مجبوراً اختیار کرنا پڑے۔ اس کام میں شہروں کی آزاد صنعت و تجارت کی ترقی سے اور بھی تیزی پیدا ہوگئی اور اگرچہ داخل خارج کے عارضی جھگڑوں کی وجہ سے زمینداروں نے کہیں کہیں اس کی مخالفت کی مگر آخر میں ہر جگہ سے رعیت کا نظام ختم ہوگیا یا تو اس وجہ سے کہ رعیت نفع بخش نہیں رہی تھی یا اس وجہ سے کہ جماعت نے آزاد صنعتی کاریگر کی ضرورت اور قدر کو زیادہ بہتر طریقہ پر سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ پہلی صورت میں جیسے انگلستان میں رعیت نسبتاً خاموشی سے ختم ہوگئی دوسری صورت میں مثلاً فرانس میں جہاں زمیندار اپنے حقوق کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ رعیت کے آخری نام و نشان کو مٹانے کے لئے انقلاب کی ضرورت پیش آئی۔

امریکہ میں جہاں ابتدا میں مزروعہ رقبہ کے محض ایک حاشیہ پر قبضہ کیا گیا تھا جب آزاد مزدوروں اور امیدواروں اور قرض کے معاوضہ میں کام کرنے والوں کی تعداد کو ناکافی سمجھا گیا تو غلامی کے نظام کو اختیار کیا گیا اور پہلے انڈینس کو اور بعد میں حبشیوں کو غلام بنایا گیا۔ شمالی ریاستوں میں جہاں زمین کم زرخیز تھی اور کاشت کے اچھے طریقے اختیار کرنا ضروری تھے وہاں تو سوائے HUDSON VALLEY اور NARRAGAUSETH BAY کے باغات کے اور کہیں غلامی نے گہری جڑیں نہیں پھیلائیں۔ لیکن جنوبی ریاستوں میں آب و ہوا اور زمین دونوں کی وجہ سے غلامی زیادہ نفع

بخش ثابت ہوئی۔ جب ساحل کی زمینوں کی زرخیزی کم ہوئی تو غلامی کا رواج نئی زمینوں کو مسلسل حاصل کرتے رہنے کی وجہ سے جاری رہا۔ اس کی وجہ سے MEXICAN WAR لڑی گئی اور CUBA پر قبضہ کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ جنوبی میسیسی کی وادی کے کھل جانے سے غلاموں کی قیمت اتنی بڑھی کہ نہ صرف ساحلی ریاستیں بلکہ اندرون ملک کے وہ پہاڑی علاقے بھی جہاں غلامی کبھی بذات خود ترقی نہیں پا سکتی تھی منڈی کے لئے غلاموں کی نسل کشی کرنے لگے اور اس وقت سے جنوب کا پورا علاقہ اس "اہل اور عجیب رواج" کا طرف دار بن گیا۔ جنوب نے جب یہ محسوس کیا کہ زمین کے غلاموں کی مزید رسد ختم ہونے والی ہے تو اسے جنگ کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑا اگرچہ غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے جنگ کرنا پڑی تھی۔ لیکن اگر غلاموں کو اس طرح آزاد نہ بھی کیا جاتا تو بھی غلامی ضرور غائب ہو جاتی۔ جب رقبہ کی توسیع کا امکان باقی نہیں رہا اور آزاد اور تیز رفتار صنعتی نظام پیدا ہو گیا تو غلامی بذات خود نفع بخش باقی نہیں رہی یہ ضرور رعیت کی کسی شکل میں بدل جاتی اور اخیر میں آزادی کے زیادہ نفع بخش عام نظام میں مل جاتی LINCOLN کے اعلان کی وجہ سے قلم کی ایک جنبش نے وہ کام کر دیا جسے پورا کرنے کے لئے مغربی یورپ کو صدیاں صرف کرنا پڑی تھیں۔ اسی زمانہ میں زار روس نے بھی اسی قسم کا حکم جاری کیا تھا لیکن امریکہ میں اس تبدیلی کی شکل معاشی انقلاب جیسی تھی اور روس میں اس کی شکل اصلاح جیسی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ روس میں تو جس چیز کو ختم کیا گیا وہ رعیت کا نظام تھا۔ لیکن امریکہ میں اس سے بھی زیادہ سخت چیز یعنی غلامی کو ختم کیا گیا۔ لیکن دونوں جگہ قانون کو بس تھوڑی سی ہی پیش قدمی سے کام لینا پڑا۔ کیونکہ معاشی حالات و واقعات کی بنا پر یہ تبدیلی تو تیزی سے واقع ہونے والی ہی تھی۔

اس لئے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ غلامی اخلاقی تعلیمات کی وجہ سے ختم ہوئی۔ یونان کے بزرگ ترین فلسفیوں نے غلامی کو جائز سمجھا تھا کیونکہ وہ کسی ایسے جماعتی نظام کا تصور ہی نہیں کر سکتے تھے جس میں غلامی موجود نہ ہو۔ جنوب کے پادری ایمان داری کے ساتھ انجیل سے اسناد پیش

کرکے کہتے تھے کہ جماعتی استحکام کے لئے غلامی کا ہونا ضروری ہے۔ بہت سے رومی مصنفوں نے غلامی کی اخلاقی خرابیوں کا ذکر کیا لیکن جب تک اس کی معاشی خرابیاں مصلحوں نے اور عام پبلک نے محسوس نہیں کیں اس وقت تک غلامی غائب نہیں ہوئی۔ امریکہ کی خانہ جنگی میں اخلاقی بیداری کی ایک لہر دوڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی لیکن انسانی فطرت شمال میں بھی ویسی ہی تھی جیسی جنوب میں اور اگر شمال کی آب وہوا اور وہاں کے معاشی حالات جنوب سے مشابہ ہوتے تو اس قسم کی اخلاقی بیداری پیدا نہ ہوتی۔ اس میں شک نہیں اعلیٰ اخلاقیات سے جماعتی زندگی کی اصلاح ہوتی رہتی ہے لیکن پائدار اثرات پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو معاشی حقایق سے بھی قریبی وابستگی ہو۔

غیر مقبوضہ زمین کی رسد جب پورے طور پر ختم ہوگئی تو غلامی بھی جماعت سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئی۔ صرف منطقہ حارہ کی بعض نوآبادیوں میں جہاں زمین کی کثرت ہے غلامی کے جاری رہنے کا کچھ امکان پایا جاتا ہے۔ اگر نوآبادیاں جدید صنعتی ریاستوں کی محکوم یا زیر اثر نہ ہوتیں تو اس امکان کو اغلبیت کا درجہ حاصل ہو جاتا لیکن موجودہ صورت میں یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ برطانوی مقبوضات میں مزدوروں پر معاہدہ کے ذریعے جو قانونی پابندیاں لگائی جاتی ہیں ان سے زیادہ کسی اور قسم کی سختی مزدوروں کو برداشت کرنا پڑے گی۔ مگر یہاں بھی نیز جاوا کے "کاشت" کے نظام اور اسپینی امریکہ کے پابند ملازموں کے نظام میں بھی اس بات کی طرف سے خاص طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے کہ کہیں یہ طریقے ہمیں دوبارہ رعیت کے نظام کی طرف واپس نہ لوٹا دیں۔

غلامی اور رعیت کے نظام کی حمایت پانچ وجوہ سے کی گئی ہے۔ (۱) غلامی مردم خوری سے بہر حال بہتر ہے۔ شکار کو کھانے کی جگہ اس کو زندہ رہنے دینا ترقی کی طرف ایک بڑا قدم اٹھانا ہے۔ مگر جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ اس حقیقت کو بھلا دیتے ہیں کہ جب غلامی نے بہت زیادہ ترقی پائی، غلام بنانے والے لوگ مردم خواری کی منزل سے عرصہ ہوا دور ہو چکے تھے۔

(۲) کہا جاتا ہے غلامی سے مزدوروں کی حفاظت ہوتی ہے۔ اور حفاظت (مثلاً عہد وسطےٰ میں) آزادی سے زیادہ ضروری تھی مگر یہ بھی ایک ایسا مفروضہ ہے جو مزدور کے نقطۂ نگاہ سے ثبوت کا محتاج ہے۔ (۳) پھر کہا جاتا ہے کہ غلامی سے کام کرنے کی عادت پڑتی ہے۔ اس میں شک نہیں کچھ حبشیوں کو امریکہ کے جنوبی حصہ میں عاقبت اندیشی اور انتظام کی تعلیم بالکل اسی طرح دی گئی جیسے فوج کو قواعد کرائی جاتی ہے۔ لیکن اس سے جو یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور دوسرے طریقہ سے یہی نتائج حاصل نہیں کئے جاسکتے تھے یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی تردید ان تمام ملکوں کی مثال سے ہوتی ہے جہاں آزاد مزدوروں نے آزاد رہ کر ترقی حاصل کی ہے۔ پھر اس کے علاوہ اس بات کو فراموش کردیا جاتا ہے کہ بہت سے مزدور ان علاقوں سے آئے تھے جہاں کام سے لوگ پورے طور پر واقف تھے۔ (۴) پھر یہ کہا جاتا ہے کہ غلامی سے فرصت رکھنے والے طبقہ کی ترقی ہوتی ہے۔ لیکن یہ نتیجہ بھی طبقہ امرا کے مفروضات پر مبنی ہے۔ اس میں اس جمہوری امکان کو قطعی طور پر نظر انداز کردیا جاتا ہے جہاں یہ توقع قائم کی جاتی ہے کہ فرصت اور تہذیب صرف چند خوش نصیب افراد تک محدود نہیں رہیں گے۔ (۵) آخر میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ جہاں دیسی آبادی کام کرنا نہیں چاہتی وہاں معاشی ترقی کے لئے لازمی محنت نہایت ضروری ہے اس طریقہ استدلال میں بھی اس بات کو نظر انداز کیا جاتا ہے کہ معاشی ترقی کا آخری مقصد آدمی ہے دولت نہیں ہے اور نیز یہ کہ صنعتی اور فنی تعلیم کے جن ذرائع کو جدید تہذیب نے دریافت کیا ہے جب تک ان سے پوری طور پر مایوس نہ ہو جائیں اس وقت تک اس دعوے کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ معاشی ترقی کے لئے محنت بلاشبہ ضروری ہے لیکن جس نام نہاد ترقی کا انحصار مزدوروں کی دائمی انتفاع ناجائز پر ہو وہ کبھی پسندیدہ نہیں سمجھی جاسکتی۔ غلامی چاہے وہ جزوی ہو چاہے مکمل اس کا مہلک اور تباہ کن اثر غلام اور غلام کے مالک دونوں پر پڑتا ہے۔ جدید عہد کا ضمیر اس کے جاری رہنے کی کبھی اجازت نہیں دے سکتا اور خوش قسمتی

سے معاشی حقایق ہر جگہ جدید عہد کے ضمیر سے پورے طور پر ہم آہنگ ہیں۔ اور ان معاشی حقایق میں بنیادی مرتبہ اس حقیقت کو حاصل ہے کہ اب دنیا میں ایسی زمین باقی نہیں رہی ہے جو کسی کے قبضہ میں ہو۔ معاشی عمل کی آزادی جس طرح جسمانی آزادی نے آہستہ آہستہ ترقی پائی ہے۔ اسی طرح معاشی اعمال و افعال کی آزادی بھی انہی حالات میں پیدا ہوئی ہے۔ ان دونوں قسم کی معاشی آزادیوں کو اس لئے ترقی ہوئی ہے۔ موجودہ حالات میں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ آزادی کی وجہ سے دولت اور عام ترقی میں اضافہ ہوتا ہے۔ موجودہ نظریہ قدیم اور عہد وسطیٰ کے مطلق العنانی کے نظریہ سے جس میں فرد کی معاشی زندگی میں مداخلت کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا بہت مختلف ہے۔ موجودہ نظریہ یہ ہے کہ افراد پر بھروسہ کیا جائے کہ وہ اپنے مواقع سے فائدہ اٹھا سکیں گے اور اپنی قوتوں کو مناسب طریقہ پر استعمال کر سکیں گے۔ ایک صحیح اور تندرست دماغ رکھنے والا بالغ آدمی عام طور پر جانتا ہے کہ اس کے لئے کون سی چیز مفید ہے اور کون سی مضر اور جب وہ اپنی اہلیتوں کا استعمال نہایت موثر طریقہ پر کرے گا تو اس سے عام طور پر جماعت کو بھی فائدہ حاصل ہوگا۔ اس طریقہ استدلال میں یہ بات مضمر ہے کہ ذاتی مفاد اور عام بہبودی میں یکسانیت پائی جاتی ہے اور آج کل مہذب دنیا میں ہر جگہ یا تو یہ نصب العین حاصل کیا جا چکا ہے یا اس کے حاصل کرنے کی تمنا کی جا رہی ہے۔

لیکن اگر ہم اس مسئلہ کا اور قریبی طور پر مطالعہ کریں گے تو ہمیں پتہ چلے گا کہ آزادی کے معنی محض مداخلت یا نگرانی کے فقدان کے ہی نہیں ہیں۔ اسپنسر نے آزادی کا جو یہ منفی نظریہ پیش کیا ہے اور جسے اوسط درجہ کے آدمیوں نے اختیار کر لیا ہے اس کے مقابلہ میں گرین نے اپنا ایک اور نظریہ پیش کیا ہے اور اس کو زیادہ مکمل شکل جدید مفکروں نے دی ہے وہ نظریہ یہ ہے کہ تمام دوسری آزادیوں کی طرح معاشی آزادی بھی ابتدائی انسان کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ صدیوں کی صبر آزما کوشش سے اس نے اپنی موجودہ شکل حاصل کی ہے۔ انفرادی آزادی جماعتی کوشش کا ماحصل ہے اگر اس کو تخریب کی جگہ ایک تعمیری کوشش بنانا ہے اگر اس سے جماعتی انتشار کی جگہ جماعتی ترقی کے مقصد کو پورا کرنا ہے تو اسے دو شرطوں کو پورا کرنا چاہئیے۔

ان میں سے پہلی شرط مساوات کی ہے۔ مساوات سے ہمارا مطلب کل مساوات نہیں ہے کیونکہ ایک حد تک تو عدم مساوات نظام فطرت میں داخل ہے۔ آدمی غیر مساوی جسمانی، دماغی اور اخلاقی اہلیتوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور ان اختلافات کو کسی انسانی کوشش اور احتیاط سے نہیں مٹایا جاسکتا اور جیسے ہی ملکیت ذاتی ترقی پاتی ہے ان قدرتی عدم مساوات کا ناگزیر اثر مقبوضات کی عدم مساوات پر بھی ظاہر ہونے لگتا ہے حقیقی مساوات جو معاشی حیثیت سے اہمیت رکھتی ہے وہ تین قسم کی ہے۔ اول قانونی مساوات یعنی اس بات کا یقین کہ کہ قانون کی نگاہ میں ایک آدمی کی وہی وقعت ہے جو دوسرے کی ہے اور نیز یہ کہ اس کے معاشی حقوق کا تحفظ مساوی طریقہ پر کیا جائے گا۔ دوسرے مواقع کی مساوات اس مفہوم کے ساتھ کہ قانونی یا معاشرتی انضباط کی بنا پر کسی شخص پر کسی پیشہ یا حرفہ کا دروازہ بند نہیں ہے۔ تیسرے سودوں کی شرائط میں کم از کم ایسی نسبتی مساوات کہ جس سے سودے کا ایک فریق دوسرے فریق کے بالکل رحم وکرم پر نہ رہے۔ جب تک ان تین قسموں کی مساوات نہیں ہوگی آزادی محض برائے نام رہ جائے گی کیونکہ جس آزادی کا انحصار شدید عدم مساوات پر ہوتا ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ طاقتور کو کمزور سے اپنی بات منوانے کی آزادی حاصل ہے۔ بغیر مساوات کے آزادی دینے کے معنی ایک شخص کا اقتدار اور دوسرے کی محکومی ہیں۔ اپنے سرمایہ کو غلاموں میں لگانے کی آزادی کی حمایت امریکہ کے جنوبی علاقہ کے لوگوں نے نہایت زور شور کے ساتھ کی لیکن یہاں اس آزادی کے معنی ایک شخص کی آزادی اور دوسرے کی غلامی ہوئے۔

مساوات کے علاوہ مقابلہ اور جدید معاشی زندگی کی ترقی سے آزادی کے لئے ایک اور شرط بھی پیدا ہوگئی ہے انسانی ترقی کی موجودہ حالت میں سرمایہ کے اجتماع اور مزدوروں کے اتحاد سے جو کثیر قوت حاصل ہونے لگی ہے۔ اس کو برے مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ برائیاں قانون کی زد سے باہر ہوسکتی ہیں مگر جماعتی حیثیت سے قابل ملامت ہیں۔ جب تک بڑی طاقت میں ذمہ داری کے احساس کی وجہ سے اعتدلال نہ پیدا ہو اس میں درندگی پیدا ہو جانے

کا احتمال رہتا ہے۔ دولت کی ذمہ داریوں کا ذکر تو اب عام طور پر سنا جانے لگا ہے لیکن جن کے رتبے بڑے ہیں ان کی ذمہ داریاں بھی زیادہ ہیں" ایسا مقولہ ہے جس کا اطلاق ہر قسم کی معاشی قوت پر کیا جا سکتا ہے چاہے وہ دولت کی شکل میں ظاہر ہو یا نہ ہو۔ جس چیز کی ضرورت ہے اور جو آہستہ آہستہ ترقی پا رہی ہے وہ یہ ہے کہ جماعت میں اتحاد اور ایک جہتی کا احساس پیدا کیا جائے یعنی ہر شخص یہ سمجھے کہ وہ اپنے ہمسایوں کی بہبودی سے اپنی ذاتی بہبودی کو جدا نہیں کر سکتا اور نیز یہ کہ اس کے ہر فعل کا محاسبہ ان اثرات کی بنا پر کیا جائے گا جو اس کے فعل سے جماعت کے لئے بصورت مجموعی رونما ہوتے ہیں۔ فرانسیسی انقلاب کی "اخوت" والی اصطلاح میں اسی چیز کو مبہم طور پر ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور آج بھی دوسرے ناموں کے ذریعہ اسی خیال کو ظاہر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ معاشی شعبہ میں اس کا اطلاق ایسا ہی صحیح اور مناسب ہے جیسے زندگی کے اور دوسرے شعبوں میں۔ آزادی اگر بغیر ذمہ داری کے حاصل ہو تو یہ گمراہی پر ختم ہوتی ہے۔

لہٰذا صحیح معاشی آزادی کو اس اعتبار سے تعمیری سمجھا جا سکتا ہے کہ اس میں نگرانی مفقود نہیں ہوتی بلکہ نگرانی قانون کے ذریعہ سے ایسی مثبت پیچیدہ شرائط کے ساتھ کی جاتی ہے کہ اس کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ تعداد کو اپنی اہلیتوں کو آزادی کے ساتھ ترقی دینے کا موقع مل جاتا ہے۔ آزادی کا انحصار جب مساوات اور ذمہ داری پر ہوتا ہے تو اس سے افراد دولت مند اور جماعت ترقی پذیر ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر آزادی بغیر مساوات اور ذمہ داری کے عطا کر دی جائے تو اس سے چند آدمی تو ترقی کر سکتے ہیں لیکن بہت سے زوال کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ آزادی منفی مفہوم کے ساتھ اختلال اور انتشار کا موجب ہے لیکن آزادی مثبت مفہوم کے ساتھ افراد اور جماعت کے تعلقات میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ اول الذکر پائدار معاشی ترقی کے لئے ایک خطرہ ہے موخر الذکر اس کی معاون اور مددگار ہے۔

معاشی آزادی کی مختلف شکلیں | (۱) آزادی کی پہلی اور نہایت ظاہری شکل شادی اور طلاق کی آزادی ہے۔ یہ بات بلاشبہ صحیح ہے کہ شادی کا رواج محض معاشی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے نہیں ہوا بلکہ اس کا

مقصد اس سے بہت زیادہ وسیع تھا۔ مگر جب شادی کی تاریخی شکلوں کو دیکھا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس پر معاشی قوتوں کا اثر اس سے کہیں زیادہ پڑا ہے جتنا کہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ شادی کی آزادی کو خصوصیت کے ساتھ موجودہ معاشی زندگی کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ شادی کے حق پر پابندیاں عاید کرنا عہد وسطیٰ میں ذاتی محکومی کا ایک لازمی جزو سمجھا جاتا تھا اور زمیندار اس کو اپنی آمدنی کا ایک ذریعہ بنایا کرتا تھا۔ لیکن جسمانی آزادی کے نمودار ہو جانے کے بعد بھی شادی کا حق انھیں لوگوں کو ملتا تھا جن کے پاس کچھ جائداد ہوتی تھی۔ مثلاً انیسویں صدی کے شروع میں جنوبی جرمنی میں یہی صورت حال تھی۔ آج بھی یورپ کے بعض ملکوں میں فوجی افسر اسی وقت شادی کر سکتے ہیں جب ان کے پاس ایک مقررہ حد سے زیادہ جائداد ہوتی ہے۔ اس کے برعکس طلاق کی آزادی کا وجود ابتدائی جماعت میں بھی پایا جاتا تھا۔ لیکن ابتدا میں اس کا انحصار عدم مساوات پر ہوا کرتا تھا۔ جب ابوی خاندان بن گیا اور موجودہ خاندان کی ابتدا ہوئی تو شوہر کو بیوی کو طلاق دینے کا حق مل گیا۔ لیکن بیوی شوہر کو طلاق نہیں دے سکتی تھی۔ طلاق کا نیا حق جس کا انحصار زیادہ تر مساوات پر ہے عورتوں کی معاشی آزادی کے بعد ہی پیدا ہوا ہے۔ اس کے وسیع تر معاشی اور مذہبی پہلوؤں پر بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے اس لئے انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

شادی اور طلاق کی آزادی کے بعد دوسرا نمبر نقل و حرکت کی آزادی کا ہے۔ عہد وسطیٰ میں اندرون ملک میں نقل و حرکت کرنے پر بھی پابندیاں لگائی جاتی تھیں۔ مثلاً انگلستان میں سکونت کے جو قوانین تھے ان کی بنا پر ایک مزدور کے لئے اپنی جائے پیدائش کو چھوڑنا تقریباً ناممکن ہوتا تھا۔ موجودہ عہد میں آزادی کی ترقی سے نہ صرف ملک کے اندر بلکہ مختلف ملکوں کے درمیان نقل سکونت کا حق حاصل ہو گیا ہے اور جہاں کہیں ہجرت پر پابندیاں اب بھی موجود ہیں انھیں عہد وسطیٰ کی یادگار سمجھنا چاہیئے۔ اس کے برعکس غیر ملکیوں کے داخلہ کے خلاف جو قانون موجودہ ملکوں میں اب بھی پائے جاتے ہیں ان پر تنقید آزادی کے مثبت پہلو کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیئے۔ مثلاً چینیوں کے داخلہ کو امریکہ نے ممنوع قرار دیا ہے۔ سستی چینی محنت سے بلاشبہ امریکہ کے بحر الکاہل کے

ساحل کے ڈھلوان علاقے کے وسائل دولت کی ترقی میں مدد مل سکتی ہے۔ لیکن چینی اور امریکی مزدوریں جو عدم مساوات پائی جاتی ہے اس کی بنا پر اس داخلہ پر سب سے زیادہ اعتراض کیا جاتا ہے۔ امریکہ جیسے نئے ملک میں جہاں جتنی ضرورت ہے اس سے کم آبادی پائی جاتی ہے نئے آدمیوں کے داخلہ کی عام طور پر حوصلہ افزائی کرنا چاہئے کیوں کہ اگر نو وارد کی زندگی کا معیار اصلی باشندے کے مقابلہ میں کم ہے تو کچھ عرصہ بعد وہ خود یا اس کی اولاد امریکہ کے معیار تک اپنے آپ کو بلند کر سکے گی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ چینی امریکہ کی آبادی میں جذب ہونے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا اور امریکہ کے معاشرتی طریقوں کو اختیار نہیں کرتا۔ وہ اپنے کم تر معیار کو قایم اور برقرار رکھتا ہے اور اگر خاصی تعداد میں موجود ہو تو امریکہ کے معیار کو بھی اپنی پست سطح تک گرا سکتا ہے۔ چنانچہ داخلہ کی اگر آزادی دے دی جائے تو پیش نظر مثالوں میں اس سے تاجروں کی مرفہ الحالی میں تو اضافہ ہوگا اور نو وارد کی آسائش میں بھی مقابلتاً ترقی ہو جائے گی۔ مگر امریکہ کے مزدور کی حالت مستقل طور پر سقیم ہو جائے گی آخر میں بصورت مجموعی معاشی زوال کی حالت پیدا ہو جائے گی۔ یہ ایک جھوٹی آزادی ہوگی کیونکہ اس کا انحصار عدم مساوات پر ہوگا۔

مگر جہاں تیزی کے ساتھ مساوات پیدا ہونے کا امکان پایا جائے اور جہاں غیر ملکی حکومتیں یا منتقل کرنے والی کمپنیاں مصنوعی طریقہ پر لوگوں کا داخلہ کرا رہی ہو وہاں داخلہ پر پابندیاں عاید کرنا معاشی حیثیت سے نقصان رسان ہے۔ امریکہ میں ۱۸۵۰ء کے آس پاس کے زمانہ میں جاہل لوگ اسی غلطی کا شکار تھے اور آج بھی امریکہ میں داخلہ پر پابندیاں عاید کرنے کے جو لوگ حامی ہیں وہ اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ یہ بلا شبہ صحیح ہے کہ ادنیٰ طبقہ کے نو وارد کی وجہ سے کم اجرت دینے والے کارخانوں کو ان کی مرضی کے مطابق مزدور مل جاتے ہیں اور اس سے مزدوروں کے مسئلہ میں پیچیدگی اور دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کا علاج داخلہ کو ختم کرنا یا اس پر سخت پابندیاں لگانا نہیں ہے بلکہ اجرتوں کو بڑھانا اور مزدوروں کی حالت کو بہتر بنانا ہے۔ یہ کام مزدوروں کی تنظیم برائے عامہ، قانون سازی، دولت کے اضافہ اور کفایت کاروبار کے اختیار کرنے سے کیا جا سکتا ہے کسی ایسے ملک

میں جہاں مزدوروں کی رسد پہلے ہی سے زیادہ ہو اوپر لکھی ہوئی دلیل کی اہمیت ضرور کم ہو جائے گی۔ لیکن امریکہ میں ابھی ایسی حالت پیدا نہیں ہوئی ہے کہ نوواردوں کا داخلہ عام طور پر بالکل بند کردیا جائے یا اس پر سخت پابندیاں عاید کر دی جائیں۔

(۳) نقل و حرکت کی آزادی کے بعد پیشے کی آزادی کا نمبر ہے۔ پچھلے زمانے میں پیشہ انتخاب کرنے کے حق پر متعدد قسم کی پابندیاں لگی ہوئی تھیں۔ سب سے خراب صورت تو وہ تھی جہاں ذات اور رواج کی بنا پر ترقی کو روکا جاتا تھا اور لوگوں کو ایسے پیشوں میں لگایا جاتا تھا جن کے لئے وہ موزوں نہیں ہوتے تھے۔ پیشے کی آزادی کی وجہ سے جہاں تک ممکن ہے صحیح آدمی صحیح کام پر لگ جاتا ہے اور اس سے دولت کی پیدائش میں اضافہ اور تقسیم میں بہتری پیدا ہوتی ہے۔ جدید نظام معاشرت میں صرف ان پیشوں کے لئے جہاں نا اہلیت سے غیر ذمہ داری کے پیدا ہونے اور دوسروں اور خود اپنی ذات کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا ہے اہلیت کی شہادت فراہم کرنے کے لئے لوگوں کو پابند کیا جاتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹروں، دانتوں کے ماہروں، انجینیروں، ہوابازوں وغیرہ سے جو سرٹیفکٹ مانگے جاتے ہیں وہ صحیح آزادی کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتے بلکہ اسے ہموار کرتے ہیں۔ ٹریڈ یونین میں جو امیدواروں کے قواعد موجود ہوتے ہیں وہ کبھی تو مفید ہوتے ہیں اور کبھی مضر۔ جہاں ان کا مقصد اچھے کام کی ضمانت کرنا ہوتا ہے یا جہاں اس کا مقصد کم اجرت والے مزدوروں کے یکبارگی داخلے سے اجرتوں اور مزدوروں کے معیار زندگی کے زوال کو روکنا منظور ہوتا ہے وہاں ان کی حمایت میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن جہاں اہل مزدوروں کو باہر رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ایک بند جماعتی اجارہ قائم کیا جاتا ہے۔ جیسے پنچایتی نظام کے آخری دور میں ہوگیا تھا تو اس قسم کی پابندی کے لئے کوئی وجہ مدافعت نہیں معلوم ہوتی۔

(۴) آزادی کی ایک اور قسم متحد ہونے کی آزادی ہے۔ معاشی اغراض کے لئے جو اتحاد کئے جاتے ہیں ان کی خاص شکل مزدوروں اور سرمایہ داروں کی انجمنیں ہیں۔ قدیم روم میں اور زار کے زمانے کے روس میں سیاسی اور معاشی مقاصد حاصل کرنے کے لئے مزدوروں کو سختی کے ساتھ دبایا جاتا

زیادہ پکے ہوئے پھلوں یا سڑے ہوئے گوشت یا افیون جیسی اشیاء کا استعمال۔

(۲) چھٹی آزادی اشیاء کی پیدائش کی آزادی ہے جس میں معاہدہ اور تنظیم (خطر انگیزی) کی آزادی بھی شامل ہے۔ یہاں بھی موجودہ عہد میں اہمیت دوسری ہی چیزوں کو دی جانے لگی ہے۔ دنیا کے آدمی اب حکومت کو ایک ہمہ دان، ہمہ فہم، رعایا پرور ادارہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ اب یہ محسوس کیا جانے لگا ہے کہ حکومتیں نہ رعایا کے لئے ہمیشہ مشفق ہوتی ہیں اور نہ ہمہ دان اور ہمہ فہم۔ مثلاً عہد وسطیٰ کی حکومتوں کے بنائے ہوئے قوانین اس قدر پیچیدہ اور متناقض ہوتے تھے کہ ان سے انفرادی آزادی عمل میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی اور پیدائش دولت کے اضافے کی کوشش کرنے والوں کو ان کی مداخلت کی وجہ سے ترقی کا پورا موقعہ نہیں ملتا تھا ایسے قوانین کا منسوخ کرنا ہی فائدہ مند تھا۔ جب فرانسیسی صناعوں نے کولبرٹ سے کہا تھا (LAISSEZ NOUS FAIRE) یعنی حکومت کی طرف سے عدم مداخلت ہی اچھی پالیسی ہے لہذا ہمیں پوری آزادی عمل دی جائے تو ان کے پیش نظر اسی قسم کے نقصان رساں قوانین تھے (ان مواقع کو توڑنے کے لئے جو ترقی کے راہ میں حائل تھے اور جن کی وجہ سے لوگوں کو مساوی مواقع حاصل نہ تھے) اس قسم کی تخریبی کوشش نہایت ضروری تھی لیکن موجودہ زمانے میں جماعت کے متعلق طبقوں کے مفاد کی حفاظت کرنے کے لئے فطری اور عملی دونوں حیثیتوں سے عدم مداخلت کی پالیسی میں ترمیم کرنا ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔ موجودہ زندگی میں پیچیدہ ضرورتوں کی وجہ سے حکومت کے واسطے لازمی ہوگیا ہے کہ دولت کے صرف کرنے والوں، کاروبار میں روپیہ لگانے والوں اور عام پبلک کے مفاد کی حفاظت کرنے کے لئے صنعت و تجارت کی تنظیم کی نگرانی کرے۔ لیکن عہد وسطیٰ اور موجودہ عہد کی مداخلت میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر مقابلے کو ختم کرنا چاہتی تھی اور آخر الذکر اس کی مملکت کو وسیع اور اس کی سطح کو بلند کرنا چاہتی ہے۔ البتہ اس قاعدے سے صرف اسی مداخلت کو مستثنےٰ سمجھنا چاہیے جہاں مقابلے پر یہ دیکھ کر پابندیاں عاید کی جاتی ہیں کہ اس سے دولت ضائع ہو رہی اور نا اہلیت ترقی پا رہی ہے۔ لیکن موجودہ عہد میں مقصد ہمیشہ یہی رہتا ہے کہ آزادی کو مساوات اور ذمہ داری کے حصول کا ایک ذریعہ بنا کر ترقی دی جائے۔ فیکٹری کے قوانین

زیادہ پکے ہوئے پھلوں یا سڑے ہوئے گوشت یا افیون جیسی اشیاء کا استعمال۔

(۶) چھٹی آزادی اشیاء کی پیدائش کی آزادی ہے جس میں معاہدہ اور تنظیم (خطر انگیزی) کی آزادی بھی شامل ہے۔ یہاں بھی موجودہ عہد میں اہمیت دوسری ہی چیزوں کو دی جانے لگی ہے۔ دنیا کے آدمی اب حکومت کو ایک ہمہ دان، ہمہ فہم، رعایا پرور ادارہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ اب یہ محسوس کیا جانے لگا ہے کہ حکومتیں نہ رعایا کے لئے ہمیشہ مشفق ہوتی ہیں اور نہ ہمہ دان اور ہمہ فہم۔ مثلاً عہد وسطےٰ کی حکومتوں کے بنائے ہوئے قوانین اس قدر پیچیدہ اور متناقض ہوتے تھے کہ ان سے انفرادی آزادیٔ عمل میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی اور پیدائش دولت کے اضافے کی کوشش کرنے والوں کو ان کی مداخلت کی وجہ سے ترقی کا پورا موقعہ نہیں ملتا تھا ایسے قوانین کا منسوخ کرنا ہی فائدہ مند تھا۔ جب فرانسیسی صناعوں نے کولبرٹ سے کہا تھا (LAISSEZ NOUS FAIRE) یعنی حکومت کی طرف سے عدم مداخلت ہی اچھی پالیسی ہے لہذا ہمیں پوری آزادی عمل دی جائے تو ان کے پیش نظر اسی قسم کے نقصان رساں قوانین تھے (ان مواقع کو توڑنے کے لئے جو ترقی کے راہ میں حائل تھے اور جن کی وجہ سے لوگوں کو مساوی مواقع حاصل نہ تھے) اس قسم کی تخریبی کوشش نہایت ضروری تھی لیکن موجودہ زمانے میں جماعت کے متعلق طبقوں کے مفاد کی حفاظت کرنے کے لئے فطری اور عملی دونوں حیثیتوں سے عدم مداخلت کی پالیسی میں ترمیم کرنا ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔ موجودہ زندگی میں پیچیدہ ضرورتوں کی وجہ سے حکومت کے واسطے لازمی ہوگیا ہے کہ دولت کے صرف کرنے والوں، کاروبار میں روپیہ لگانے والوں اور عام پبلک کے مفاد کی حفاظت کرنے کے لئے صنعت و تجارت کی تنظیم کی نگرانی کرے۔ لیکن عہد وسطیٰ اور موجودہ عہد کی مداخلت میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر مقابلے کو ختم کرنا چاہتی تھی اور آخر الذکر اس کی مملکت کو وسیع اور اس کی سطح کو بلند کرنا چاہتی ہے۔ البتہ اس قاعدے سے صرف اسی مداخلت کو مستثنےٰ سمجھنا چاہیے جہاں مقابلے پر یہ دیکھ کر پابندیاں عاید کی جاتی ہیں کہ اس سے دولت ضائع ہو رہی اور نااہلیت ترقی پا رہی ہے۔ لیکن موجودہ عہد میں مقصد ہمیشہ یہی رہتا ہے کہ آزادی کو مسا وات اور ذمہ داری کے حصول کا ایک ذریعہ بنا کر ترقی دی جائے۔ فیکٹری کے قوانین

سے مزدوروں کو مقابلہ کا بہتر موقع ملتا ہے۔ ریلوے کے قاعدوں سے سامان روانہ کرنے والوں کے ساتھ مساوی برتاؤ ہونے لگتا ہے۔ بنکوں، بیمہ کی کمپنیوں اور دوسری کمپنیوں کی نگرانی سے ساہوکارے کے کاروبار میں ذمہ داری پیدا ہوتی ہے۔ ان سب صورتوں میں مداخلت جائز ہے کیونکہ اس سے یقینی اور زیادہ ہمہ گیر آزادی پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں آزادی کے مثبت پہلو کو سامنے رکھنا چاہیئے نہ کہ منفی پہلو کو۔

(۷) سب سے آخر میں تجارتی آزادی کا نمبر ہے۔ یہ درحقیقت آخرالذکر عنوان میں شامل ہے اس لئے کہ تجارت بھی اشیاء کی پیدائش کا ہی دوسرا نام ہے مگر تجارت کی بحث پیدائش دولت کے موضوع کا اس قدر اہم حصہ ہے کہ عام طور پر اس کا بیان جداگانہ طور پر کیا جاتا ہے۔ موجودہ عہد میں اندرون ملک کی تجارت پر سے تو عہد وسطیٰ کی تمام پابندیاں ختم کر دی گئی ہیں۔ اس لئے آج کل اس سلسلہ میں جو بحث و مباحثہ کیا جاتا ہے اس کا تعلق بین الاقوامی تجارت سے ہوتا ہے۔ یہاں بھی عام نظریہ آزاد تجارت کی موافقت میں ہے۔ مگر آزاد تجارت ہمیشہ اور لازمی طور پر مفید نہیں ہوتی۔ اگر ایک شے کو پیدا کرنے میں دو ملکوں کی نسبتی عدم مساوات زیادہ ہوگی تو کمزور ملک میں ایسی صنعتوں کی ترقی رک جائے گی جو اس ملک کے لئے نفع بخش یا بہت زیادہ ضروری ہو سکتی ہیں۔ ان حالات میں اگر صنعت کا اس طرح تحفظ کیا جائے کہ ملک کے اندر مقابلہ کا سلسلہ جاری رہے تو اس سے ملکی اور غیر ملکی صناعوں میں نسبتی مساوات پیدا ہو جائے گی جس سے آخر میں دولت کے استعمال کرنے والوں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ مگر یہ پالیسی صرف اسی وقت مفید ہو سکتی ہے جب تحفظ سے اہلیت کارکردگی کا واقعی اضافہ ہو اور جب درمیانی زمانہ کا لازمی معاشی نقصان، بعد کے زمانہ کے فائدہ سے زیادہ نہ ہو۔ صرف ایسی صورت میں بین الاقوامی تجارت کی آزادی میں مداخلت جائز ہے کیونکہ صرف اسی قسم کی مداخلت بعد کی زیادہ حقیقی اور مفید آزادی کی ضامن ہو سکتی ہے۔

انفرادی آزادی کا معاشری پہلو | اوپر کے بیان سے ظاہر ہوا کہ موجودہ زمانہ میں آزادی کو سبب نہیں بلکہ نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کا مفہوم صرف رکاوٹوں کا نہ ہونا نہیں ہے کیونکہ یہ صورت گمراہی اور بے راہ روی کی ہے آزادی کی نہیں۔ ہر قوم کی معاشری ترقی اسی وقت ہوتی ہے جب انفرادی

آزادی پر سب لوگوں کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر کچھ پابندیاں عاید کی جاتی ہیں۔ یہ پابندیاں رواج کے ذریعہ یا اختیاری جماعتی قوانین یا جبری قوانین کے ذریعہ لگائی جاتی ہیں۔ اچھے آداب و اطوار اور معاشری رسومات جن کی وجہ سے افراد کی آزادیاں محدود ہوجاتی ہیں تہذیب کی نشانیاں ہیں۔ انجمنیں مثلاً گرجاگھر، کلب اور تجارتی یونین ایسے قوانین بناتی ہیں جن کی ہر رکن کو پابندی کرنا پڑتی ہے۔ گورنمنٹ بہت سے ایسے قوانین بناتی ہے جن کی معقولیت میں کسی کو شبہ نہیں ہوتا اور جن کی پابندی لازمی ہوتی ہے ان تمام صورتوں میں انفرادی آزادی کو لازمی طور پر کچھ پابندیاں قبول کرنا پڑتی ہیں۔ صنعتی معاملات میں خصوصیت کے ساتھ انفرادی آزادی سے لوگ ناجائز فائدہ اٹھانے لگتے ہیں۔ جب اپنا فائدہ دیکھتے ہیں اس وقت تو آزادی کو قربان کرنے میں تامل نہیں کرتے لیکن جب دوسروں کے مفاد میں آزادی پر کوئی پابندی عاید کی جاتی ہے تو آزادی کا نام لے کر شور مچاتے ہیں مثلاً ریلوے کے مالک دوسرے سرمایہ داروں سے اتحاد کرکے اپنی آزادی پر خود تو پابندیاں عاید کرلیتے ہیں لیکن جب مال روانہ کرنے والوں کے مفاد میں پابندیاں عاید کی جاتی ہیں تو اس کو مداخلت بیجا سے تعبیر کرتے ہیں۔ غلاموں کا مالک تجارت کی آزادی کا تو طالب تھا لیکن انسان کی آزادی کی طرف سے بے پروا تھا۔ صناع اپنے بیرونی حریف سے تو تحفظ چاہتا ہے لیکن فیکٹری کے قوانین کی مخالفت کرتا ہے۔ جب مبادلہ خارجہ کے سٹہ سے کپاس کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے تو کپاس بونے والا اس بات کی تعریف کرتا ہے لیکن سوت کاتنے والا سٹہ کی آزادی کی برائی کرتا ہے۔ فیکٹری کا مالک خود تو فروخت کرنے والی انجمنوں میں شامل ہوجاتا ہے جس کے ذریعہ اشیا رکی پیداوار پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں یا قیمتوں کو مقرر کیا جاتا ہے لیکن مزدور سبھاؤں کے ظلم کا رونا روتا رہتا ہے۔ مزدور سبھائے امیدواروں کے داخلہ مزدوروں کی آزاد بھرتی اور بائی کاٹ کے بارے میں تو قانون بناتی ہے لیکن سرمایہ داروں کی طرف سے جو مزدوروں کو فیکٹری میں داخل ہونے سے روکا جاتا ہے۔ یا سرمایہ دار جب ٹرسٹ بناتے ہیں تو اس کی سخت مخالفت کرتی ہے ان تمام مثالوں سے ظاہر ہوا کہ اس معاملہ میں کس قدر کج بحثی سے کام لیا جاتا ہے۔ آزادی کا صحیح مفہوم

سمجھنے کے لئے آزادی کو معاشری اور انفرادی دونوں نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہئے۔ افراد نے جو کچھ بھی ترقی کی ہے وہ جماعتی کوشش کے طور پر کی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرد جماعت کا پابند ہے۔ جس آزادی سے معاشری ترقی پیدا ہوتی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ مشترکہ مقصد کے حاصل کرنے کے لئے فرد ہمیشہ آمادہ رہے۔ اگر یہ آمادگی ذاتی مرضی اور اختیار سے نہیں ہے تو اس طرف مائل کرنے کے لئے یا تو ترغیب دینا چاہیئے یا مجبور کرنا چاہئے۔ آزادی تاراج اور ظلم کی قوتوں کے درمیان توازن قائم کرنے کا دوسرا نام ہے ایسی انفرادی آزادی جو دوسروں کے حقوق کو یا اکثریت کے بہترین مفاد کو فراموش کر دیتی ہے اصلی آزادی کے لئے مہلک ثابت ہوتی ہے اسی طرح سے جماعت کی طرف سے ایسی پابندیاں جو افراد کی ترقی کے امکانات کو بھلا دیتی ہیں اصلی آزادی کے لئے تباہ کن ثابت ہوتی ہیں۔ معاشی نقطۂ نگاہ سے صرف اسی چیز کو آزادی کہا جا سکتا ہے جو گروہ کے لئے زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کرنے کے نصب العین کو سامنے رکھتی ہے اور گروہ کے اندر اور باہر ہر فرد کے لئے زیادہ سے زیادہ دولت صرف کرنے کے مواقع کو ترقی دیتی ہے۔ ایک شخص کی آزادی سے دوسرے اشخاص کی معاشی ترقی خطرہ میں نہ پڑنا چاہیئے۔

جس طرح آزادی کی سیاسی تعبیر یہ ہے کہ حکومت میں جمہوریت پیدا ہو جائے۔ اسی طرح معاشی آزادی جو ترقی کی ضامن ہے اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب معاشی جمہوریت پیدا ہو جائے۔ اس کی کمترین شکل یہ ہے کہ ہر شخص کو معاشی مواقع حاصل ہوں اور مواقع کا انحصار بڑی حد تک مساوات اور ذمہ داری پر ہوتا ہے۔ اس مفہوم کے مطابق بہترین حکومت وہ نہیں ہے جو کم سے کم مداخلت کرتی ہے بلکہ وہ ہے جو وسیع اور بعید تر آزادی کی لازمی شرائط کے حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ آخری تجزیہ کے بعد معلوم ہوگا کہ معاشی آزادی عمل کا نتیجہ ہوتی ہے بے عملی کا نہیں مداخلت سے پیدا ہوتی ہے عدم مداخلت سے نہیں۔

جامعہ

زیر ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

نمبر ۳	ستمبر ۱۹۳۹ء	جلد ۳۲

فہرست مضامین

ادارۂ اجتماعیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مشاورتی بورڈ

ادارۂ اجتماعیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض ومقاصد

۱۔ سیاسی، معاشی، تعلیمی اور تمدنی مسائل کا مطالعہ کرنا۔

۲۔ مطالعہ کے نتائج کو کتابوں اور رسالوں کی شکل میں شائع کرنا۔

۳۔ ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ نکالنا۔

۴۔ جلسے منعقد کرنا جس میں ملک کے سربرآوردہ ماہرین ادارہ کی دعوت پر اجتماعی مباحث پر مقالوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور حاضرین سوالوں یا تقریروں کے ذریعے سے تبادلہ خیالات کریں گے۔

فلسفۂ لغت

(از جناب محمد کامل صاحب بابا علی فرنگی محل)

تمہید| انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے وہ جماعت سے الگ رہ کر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ جماعت میں رہنے والا تبادلۂ خیالات اور اظہار مطلب کے لیے مجبور ہے تاکہ ابتدائی زندگی کی ضروریات میں ایک انسان کو دوسرے سے مدد مل سکے۔ اس مقصد کے لیے اول اول صرف اشارے اور کنائے مقرر ہوئے جن سے ادائے مطلب کا کام ناقص طور پر انجام پاتا تھا۔

کیونکہ دور بربریت کے ابتدائی عہد میں ضروریات زندگی محض سادہ اور بالکل تقاضائے فطرت کے مطابق ہوتی تھیں آبادیاں نہایت قلیل تھیں پیٹ بھرنے کے لیے پھل پھلاری یا شکار کا گوشت تن ڈھانکنے کے لیے چوڑی پتیاں یا جانوروں کی کھالیں موسمی شدائد سے بچنے کے لیے پہاڑی غار یا درختوں کے کھوکھلے تنے کافی تھے اس لیے عرصہ دراز تک چند مہمل آوازوں کے ساتھ ساتھ جسم کی حرکت دست و ابرو کے اشارے ان کا مافی الضمیر ادا کرتے رہے۔

لیکن رفتہ رفتہ آبادیاں بڑھنے لگیں انسانی ضروریات میں اضافہ ہوا معاملات گنجلک اور معاشرت پیچیدہ ہوتی گئی اب خارجی دنیا اور خود انسانی زندگی کے متعلق معلومات کا ذخیرہ اس قدر بڑھ گیا کہ اشارات و علامات ادائے مطالب کے لیے بالکل ناکافی ثابت ہونے لگے علاوہ بریں اشیاء مادی کے ذریعہ اظہار خیال میں غلط فہمیاں بھی ہونے لگیں۔ جن کی وجہ سے معاملات میں خلل واقع ہوتا تھا۔ لہذا اظہار خیالات کے لیے دوسرے ذرائع کی دریافت کی جانب انسان کا ذہن رجوع ہوا۔ اس نے خیال کیا کہ جس طرح جذبات و احساسات کا اظہار آوازوں سے خواہ وہ کتنی ہی بھونڈی کرخت اور ثقیل کیوں نہ ہوں کیا جاتا ہے اسی طرح تمام ضروریات خواہشات اور خیالات بھی ترتیب وار آوازوں کے ذریعے ظاہر کئے جا سکتے ہیں۔ چونکہ تمدن کی ترقی کے ساتھ

ساتھ آوازوں سے بھی ترقی کر لی تھی اس لئے متکلم ہونے میں پلا وقت آوازیں کام آگئیں۔

شروع شروع جب آوازوں کے ذریعے سے انسان نے ادائے مطلب کا اہتمام کیا تو اس کے سامنے زندہ یا مردہ آوازوں کی ایک وسیع دنیا موجود تھی جیسے بادل کی گرج ہوا کی سنسناہٹ ٹہنیوں کا چرانا یا مثلاً گھوڑے کی ہنہناہٹ مینڈک کا ٹرانا کتے کا بھونکنا وغیرہ۔ ابتدا میں اس نے اشیار کے نام ان آوازوں کی نقل کر کے رکھے جو اشیائے مذکورہ سے پیدا ہوتی ہیں مثلاً (کٹ) ایسی آواز ہے جو کسی چیز کے کٹنے سے پیدا ہو یہ آواز اسی معنی میں باختلاف مخارج دنیا کی اکثر زبانوں میں پائی جاتی ہے جیسے انگریزی میں CUT عربی میں (قط قطع وغیرہ) یہ طریقہ آسان اور قدرتی تھا۔ پہلے تو صرف مسموعات ہی کی نقل ہوتی تھی لیکن بعد میں مرئیات اور ملوسات وغیرہ سے بھی اسمار اصوات حسی بننے لگے جیسے اردو میں سبزہ لہلہانا چہرہ تمتمانا۔ چراغ ٹمٹمانا۔ جواہرات جگمگانا۔ آنسو ڈبڈبانا اصوات مرئی کی مثالیں اور گدگدی۔ بدن سنسنانا۔ بلبلانا۔ پیر جھنجھلانا۔ اصوات لمسی کی مثالیں اور چٹپٹا صوت ذوقی کی مثال ہے۔ عربی میں (تضعضع تذبذب۔ مربرب۔ مقبقب۔ وغیرہ)

جب تمدن نے کسی قدر ترقی کی اور انسان کو ایک چیز کی مختلف حیثیتوں کا علم ہوا تو اس نے معلومہ لفظ میں تھوڑی تھوڑی تبدیلی کر کے نئے الفاظ بنا لئے جن میں پہلا مفہوم قائم رہا۔ جس کی مثالیں اردو میں (کٹ۔ کوٹ۔ کھد) اور عربی میں (قط۔ قطع۔ قتل) ہیں۔ جب انسانی ضروریات زیادہ بڑھ گئیں اور مفرد الفاظ سے کام نہ چل سکا تو ان پر علامات کا اضافہ کیا گیا جیسے کٹنا۔ کاٹنا کٹوائی۔ پھر مشتقات پیدا ہوئے جیسے کاٹا۔ کاٹتا ہے۔ کاٹے گا۔ کاٹنے والا۔ کٹا ہوا۔

یہ تغیرات ایک ہی دن میں نہیں تمام ہو گئے۔ بلکہ روز افزوں انسانی ضروریات کے ساتھ جاری رہے موجودہ زبانیں قرنہا قرن کے حوادث طبعی کا نتیجہ ہیں۔ جب تک دنیا میں نسل انسانی کا وجود ہے اس وقت تک زبانوں میں تغیرات ارتقائی جاری رہیں گے۔

زبان یا لغت | لغت ایسی بامعنی آوازوں کا نام ہے جن سے انسان اپنا مافی الضمیر ادا کر سکے۔ قوموں کے اختلاف اور ان کی گوناگوں آوازوں کی بدولت بے شمار زبانیں یا لغتیں عالم وجود میں آگئیں

جو ایک دوسرے سے اسلوب بیان معانی اور الفاظ کی ساخت میں الگ الگ ہیں۔ کیونکہ جس طرح کی آوازیں ایک قوم آسانی سے نکال لیتی ہے بسا اوقات اسی طرح کی آوازیں نکالنا دوسری قوم کے لئے دوبھر بلکہ محال ہو جاتا ہے۔ اس چیز کا ہم آپ روزانہ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ یوروپین اپنی پوری کوشش صرف کرنے پر بھی بدقت تمام شاید ہی (ح، خ، ع، غ، ض) کا تلفظ صحیح طور پر ادا کر سکیں۔ اسی طرح عربوں میں اکثر و بیشتر وہ لوگ ملیں گے جو (T، D، P، WH) کسی طرح بھی ادا نہیں کر سکتے۔ وسط افریقہ میں بسنے والے قبائل کی لغت سے حروف شفویہ (جو حروف ہونٹوں کی مدد سے ادا کئے جاتے ہیں جیسے م، پ، و، ہ، ف) یکسر مفقود ہیں۔ کولمبیا کے سرخ ہندوستانی (ب، ف، ج، د، و) بالکل نہیں نکال سکتے۔ آسٹریلیا کے اکثر باشندے حروف صفیریہ (جن حرفوں میں سیٹی کی سی آواز نکلتی ہے مثلاً س، ش، ص، ث، ز، ظ) کا استعمال نہیں کرتے ہیں۔ نیوزیلینڈ والے مندرجہ ذیل حروف (ب، س، د، ف، ح، خ، ل، ق، ص، و، ی) سے بے نیاز ہیں۔ قدیم مصری زبان ہیروگلیفی (HIEROGLYPHIC) ان حروف سے یکسر خالی ہے (ب، ج، د، ز، ظ، ض) سنسکرت میں یہ حروف نہیں (ت، ق، خ، خ، غ، ز، ذ، ظ) تامل میں ان حرفوں کا استعمال نہیں ہے (ج، ح، خ، د، ذ، ڑ، ز، ش، ع، غ، ف، ق، ہ) اس اختلاف تلفظ سے پتہ چلتا ہے کہ غالباً ایک زبان بولنے والی قوم کے اعضاء نطق کی ساخت طبعی طور پر یکساں ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ بعض مخارج پر قادر ہوتے ہیں اور بعض پر نہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے پتہ چلتا ہے کہ (ت، م، ن، ہ) ایسے حروف ہیں جن کو ہر قوم آسانی سے ادا کر لیتی ہے کیونکہ اختلاف ہوتے ہوئے بھی یہ حروف تقریباً کل زبانوں میں پائے جاتے ہیں (بجز ہار مخلوط کے) اگر ہم "ہ" کے طریقۂ تلفظ کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس کا تلفظ طبعی ہے جس کو ادا کرنے میں کسی قسم کی زحمت نہیں ہوتی جب کہ ہم عادتاً سانس نکالتے وقت منھ بھی کھول دیں "ت" اس طرح ادا کی جاتی ہے کہ سانس خارج کرتے وقت زبان اوپر کے دانتوں سے لگا لی جائے۔ جو آواز منھ کو اندر سے پولا کر کے ناک اور منھ سے نکالی جائے وہ "م" ہوگی۔ "ن"

"بھی اُم" ہی کی طرح ادا کیا جاتا ہے جب کہ زبان تالو سے لگا کر منھ کھول دیا جائے۔

ان آوازوں کے معانی اور مرکب الفاظ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں زبانیں اور لہجے پیدا ہو گئے جو شمار سے باہر ہیں۔ موجودہ زمانہ کا علم اللغت (PHILOLOGY) ان کی حالتوں کا اندازہ کر کے دو قسمیں کرتا ہے "ترقی یافتہ" اور "غیر ترقی یافتہ" اس دوسری قسم میں وہ زبانیں شامل ہیں جو اسلوب بیان کے اعتبار سے کمتر درجہ کی ہیں اور الفاظ کے اعتبار سے بسیط۔ مثلاً زنگیوں کی زبانیں جو جنوبی افریقہ میں بولی جاتی ہیں یا امریکی زبان جو سرخ ہندوستان میں مستعمل ہے چینی بھی انھی زبانوں میں شامل ہے جس کی خاص صفت یہ ہے کہ تمام الفاظ ایک ہی طرح کے ہیں جن میں اسم فعل اور حرف کا مطلق امتیاز نہیں۔ ایک ہی لفظ اسم فعل اور حرف کا کام دیتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے ساتھ دوسرے معنی دار الفاظ لگا دیے جائیں۔ حامی زبانیں قدیم مصری قدیم حبشی بربری بھی اس قسم میں داخل ہیں۔ (بعض ماہرین لغت نے قدیم مصری زبان" HIEROGLYPHIC "کو مشرقی زبانوں میں شمار کیا ہے کیونکہ وہ اکثر حالتوں میں ان سے ملتی جلتی ہے لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ یہ اصل زبان ہے اور وہ سب اس کی فرعین ہیں اس کا اصلی نام حامی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس کو حام بن نوح ؑ کی اولاد بولتی تھی۔)

اب رہیں ترقی یافتہ زبانیں جن کی امتیازی شان یہ ہے کہ غیر محدود بولنے والے رکھتی ہیں اور انسان کی مختلف تعبیری ضروریات کو پورا کر دیتی ہیں انھیں کی فرعین متمدن اقوام میں مستعمل ہیں۔ یہاں سے ان کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ اگر ان میں اس کی صلاحیت ہے کہ گردانیں گردانی جا سکیں اور صیغہ بنائے جا سکیں تو وہ "متصرفہ" کہلائیں گی ورنہ "غیر متصرفہ" آخر الذکر میں تورانی زبانیں شامل ہیں جن کی شاخوں میں سے ایک شاخ ترکی ہے۔ یہ ایشیائے کوچک تاتار اور وسط ایشیا میں شرقاً اور سائبیریا کے شمالی حدود تک شمالاً بولی جاتی ہے۔ اس کی دوسری شاخیں منگولی تنگناسی اور اوگرانی ہیں۔

"ترقی یافتہ غیر متصرف" زبانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی ترتیب جامد اصول پر ہوتی

ہے اور اپنی بناوٹ میں کسی قسم کا تغیر قبول نہیں کرتیں بن میں صیغے بنانے کے لئے کچھ بے معنی مقرر شدہ الفاظ ان اصلوں کے آخر میں لگا دیے جاتے ہیں جن سے اصلین بلا تغیر باقی رہتی ہیں۔ مثال کے لئے ترکی لفظ "اوقو" کو لیجیے، یہ ایک اصل ہے جس کے معنی ہیں پڑھائی۔ اس سے مصدر بنانے کے لئے آخر میں علامت مصدر "مک" لگا دی جائے گی (اوقومک) جب ماضی مطلق بنایا جائے گا تو اس کے آخر میں "دی" کا اضافہ کرکے کہیں گے "اوقودی" (اس نے پڑھا) پھر ماضی بعید بنانے کے لئے "ایدی" اور "دی" کا اضافہ ماضی مطلق پر ہوگا "اقودیدی" (اس نے پڑھا تھا) جب جمع بنانا چاہیں گے تو اسی پر علامت جمع "لر" لگا دیں گے "اقودیدیلر" (انھوں نے پڑھا تھا) اب منفی بناتے وقت علامت نفی "ما" کو اصل اور دیگر اضافہ شدہ علامتوں کے درمیان رکھ دیں گے "اوقومدیدیلر" (انھوں نے نہیں پڑھا تھا) یہی اضافہ علامات کی صورت طلب تمنا اور استفہام وغیرہ کے لئے بھی ہوگی لیکن اصل فعلی اپنی بناوٹ کے لحاظ سے پہلا ہی لفظ رہ گیا۔

متصرفہ زبانوں کی خصوصیت ہے کہ ان کی گردانیں بنانے کے لئے اصلوں کے اول آخر بھی اضافہ ہو سکتا ہے اور بیچ میں بھی۔ ان کی دو بڑی قسمیں پائی جاتی ہیں آریائی اور سامی۔

۱۔ آریائی زبانیں۔ یا ہندی یورپی جن کا دوسرا نام یافث ابن نوح کی نسبت سے "یافثی" بھی ہے۔ اس کی ایک قسم جنوبی ہے جس میں جنوبی ایشیا کی تمام زبانیں شامل ہیں جیسے سنسکرت (اور اس کی تمام شاخیں ہندی وغیرہ) فارسی۔ پشتو۔ کردی۔ بخاری۔ ارمنی اور اوستی۔ دوسری قسم شمالی ہے جس میں یورپ کی کل زبانیں شامل ہیں۔ اس کی چار قسمیں ہیں "قلتی" جس کی فرعیں جزائر برطانیہ میں (انگلستان کو چھوڑ کر) بولی جاتی ہیں۔ "اطالوی" جس کی فرع لاطینی ہے اور لاطینی کی شاخیں فرانس اٹلی۔ اسپین اور پرتگال میں رائج ہیں۔ "ہیلینی" جو قدیم و جدید یونانی اور وندی کی اصل ہے۔ وندی کی شاخیں روس بوہیمیا اور بلگیریا میں مستعمل ہیں "تیوتونی" جس سے انگلینڈ۔ جرمنی ہالینڈ۔ ڈنمارک اور آئس لینڈ کی زبانیں پیدا ہوئیں۔ آریائی زبانوں کو گردانے کے لئے ابتدا یا آخر اصل میں لگنے والی علامتیں بامعنی (جو تنہا بغیر کسی لفظ سے ملائے اپنے مستقل معنی رکھتی ہیں)

بھی ہو سکتی ہیں ۔ یہ علامتیں زیادہ تر آخر میں لگتی ہیں اور کبھی کبھی ابتدا میں بھی جیسے انگریزی کا ایک لفظ ہے THANK (شکریہ) جس سے "THANKFUL" (بہت شکر گذار) بنایا گیا پھر -UN THANKFUL " (غیر متشکر) اور "UNTHANKFULNESS" عدم تشکر) بنا۔ یا مثلاً "CAPABLE" (قادر) سے " INCAPABLE " (غیر قادر) اور " INCAPABILITY" عدم قدرت) بنایا گیا۔
یہی صورت تمام گردانوں میں ہوگی ۔

(۲) سامی زبانیں۔ سام ابن نوح کی طرف منسوب ہیں جس سے اس بات کا اشارہ پایا جاتا ہے کہ یہی قسم بہت بڑی ہے کیونکہ سامی نسل (جو ان زبانوں کو بولتی ہے) دنیا میں سب سے زیادہ آباد ہے سامی زبانوں کو لغات شرقی بھی کہتے ہیں۔ چونکہ ان میں عربی جیسی زبان موجود ہے لہٰذا ان کا شمار ایسی زبانوں میں کیا جاتا ہے جو باعتبار اسلوب بیان بہترین باعتبار نطق وسیع تر باعتبار الفاظ سریع اور باعتبار تعبیرات لطیف ہیں ان کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ قدیم ترین تاریخ کی محافظ ہیں (میری مراد توریت سے ہے جو عبرانی زبان میں ہے) یہ تو معلوم ہی ہے کہ سب سے پہلے تمدن انہی زبانوں کے بولنے والوں میں پھیلا۔ جیسے فنیقی ۔ بابلی اور آشوری وغیرہ ۔ان زبانوں کی تین بڑی قسمیں پائی جاتی ہیں آرامی عبرانی اور عربی ۔

۱۔ آرامی۔ اس کی دو شاخیں سریانی اور کلدانی ہیں۔ آرامی بابل کی پرانی زبان ہے جس کے آثار بابل اور آشور کے کھنڈوں میں اب تک خط میخی اور خط انباری میں کھدے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ کلدانی میں زمانہ کے ہاتھوں ایسا تغیر ہوا کہ اس کے بعض الفاظ ہی تبدیل ہوگئے ۔ اس میں عہد قدیم کے بعض سفر نامے لکھے ہوئے تھے جیسے سفر دانیال وغیرہ ۔ اس کا بھی نام وہاں زبردستی آرامی ہی رکھ لیا گیا تھا حالانکہ اس میں اور اصلی آرامی میں الفاظ معانی کا بین فرق موجود ہے ۔ اسی طرح آشوری بھی بابلی سے مختلف ہے۔ آج کل سریانی گروہ جس زبان کو کلدانی کہتا ہے وہ کلدانی نہیں بلکہ سریانی ہے جس کے اعراب میں کچھ تغیر ہوگیا ہے کلدانی تو درحقیقت سریانی کی اصل ہے جس کے الفاظ اور معانی میں تغیر ہو کر سریانی بنی ۔ پرانی بابلی زبان شروع میں آرامی کہی جاتی تھی جب اس میں تھوڑا سا تغیر ہوا تو وہ

کلدانی کے نام سے موسوم کی گئی۔ جب اس میں دوبارہ تغیر ہوا تو اس کا نام سریانی پڑ گیا پھر اس کے اعراب میں تبدیلی ہونے سے دو الگ الگ زبانیں سریانی شرقی اور سریانی غربی شمار کی جانے لگیں۔

بعض تاریخی حالات اصلی آرامی زبان میں محفوظ ہیں اور بابل و آشور کے کھنڈروں میں کھدے ہوئے ہیں۔ سریانی ہی میں وہ انجیل بھی محفوظ ہے جس کا ترجمہ "ترجمۂ بسیطہ" کے نام سے دوسری صدی عیسوی میں کیا گیا۔

۲۔ عبرانی۔ اس کی خصوصیت کا راز قدیم تاریخ کی محافظت میں مضمر ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں اور اس کے بولنے والے تمام قوموں میں نمایاں رہے۔ جو زبان آج کل اسرائیلی بولتے ہیں وہ خالص عبرانی نہیں ہے۔ بلکہ اس میں آرامی اور کلدانی کے بعض الفاظ بھی اس وقت داخل ہو گئے جب کہ یہ لوگ بابل والوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوئے تھے۔ زمانہ قدیم الیام کرنے ہے جس پر یہ سب زبانیں مل جاتی ہیں۔ عبرانی کی دو شاخیں تھیں فنیقی اور قرطجنی۔ جو اب مردہ ہو چکی ہیں۔

۳۔ عربی۔ یہ تمام سامی زبانوں میں بلند پایہ ہے اور اس کا جاننا دوسری ہم نسل زبانوں کی معلومات حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ ابتدا میں یہ صرف جزیرہ نمائے عرب ہی میں بولی جاتی تھی۔ لیکن ظہور اسلام کے بعد پھیلنا شروع ہوئی یہاں تک کہ مشرق اور مغرب اس سے گونج اٹھے ہندوستان سے جبل طارق تک شرقاً و غرباً اور بحر عرب سے بحر اسود تک شمالاً و جنوباً اس کا چرچا پھیل گیا۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ اس زمانے کی دنیائے تمدن میں عام طور پر رائج تھی۔ عربی حروف کا عجمی زبانوں مثلاً ترکی فارسی اور اردو۔ میں استعمال اس کا ناقابل تردید ثبوت ہے مشرقی زبانیں تو رہیں ایک طرف یورپین زبانیں بھی اس کی خوشہ چین ہیں جیسا کہ آگے چل کر ہم بتائیں گے عربی کی شاخوں میں سے حبشی اور دوسری زبانیں پیدا ہو کر فنا کے گھاٹ اتر گئیں۔ واضح رہے کہ اگر قرآن شریف جیسا مرکز موجود نہ ہوتا تو اب تک نہ معلوم کتنی شاخیں عربی سے پیدا ہو چکی ہوتیں۔

اصل لفظ "عرب" کے متعلق لوگوں کی مختلف رائیں ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لفظ "عبر" ہے جو الٹ پلٹ کر عرب ہو گیا بعض کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ یہ "عَرَبَ" سے

ماخوذ ہے جس کے معنی فصاحت کے ہیں چونکہ عربی فصیح ترین زبان ہے لہذا اس کا نام عرب ہوا۔ کچھ حضرات اس طرف گئے ہیں کہ یہ لفظ "یعرب" سے ماخوذ ہے۔ یعرب وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے عربی بولی۔ ڈاکٹر وانڈیک کی رائے مندرجہ ذیل ہے۔

جس زمانہ میں سامی قوم خلیج عرب کے کنارے کنارے اس جگہ آباد تھی جس کا نام بعد میں عراق عرب مشہور ہوا۔ اس وقت کوشی قوم مہرا حضرموت اور الحسا کی راہ سے آکر ان پر حملہ آور ہوئی اور ان کو مار بھگایا۔ ان میں سے کچھ لوگ تو بلاد فارس کی طرف نکل گئے۔ کچھ لوگ فرات کے کنارے بس گئے۔ (یہ تارحی کہلاتے تھے اور حضرت ابراہیمؑ کے اسلاف میں سے تھے) کچھ لوگ مغربی سمت چلے گئے (جس کا نام بعد میں جزیرہ عرب ہوا) ان لوگوں نے لفظ عرب עדב "غرب" سے لیا جس کے معنی ہیں "سورج ڈوبنے کی سرزمین" عبرانی رسم الخط میں عین اور غین کی ایک ہی شکل ہوتی ہے کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ لفظ اردبا (یورپ) بھی اسی עדובת (عروبہ) کی تغیر شدہ شکل ہے (رانسن اور ماکس مولر کی تصانیف اور فورسٹ کی لغت دیکھو) کچھ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ اس کا نام لفظ "عرب" سے لیا گیا ہے جس کے معنی عبرانی میں مخلوط اور ملے ہوئے کے ہیں چونکہ یہ گروہ بنی قحطان "بنی اسمٰعیل۔ بنی مدیان۔ بنی مواب۔ بنی عمون۔ اور بنی عملاق سے مل کر بنا تھا لہذا اس کا نام عرب ہوا۔ (ممکن ہے کہ جنوب میں کوشی قوم بھی مخلوط ہو گئی ہو) واللہ اعلم۔

سامی زبانوں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی اصلیں سہ حرفی ہیں اور مشتقات بنانے کے بعد میں بسا اوقات باقی رہتی ہیں یعنی ان کی حرفوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ اعراب میں تغیر واقع ہو جاتا ہے جس سے اس کے مفہوم میں تبدیلی آجاتی ہے۔ جیسے عربی میں ایک اصل "قتل" ہے جس کے معنی مار ڈالنے کے ہیں۔ اس کے اعراب میں تغیر کرکے مختلف اسماء اور افعال بنائے جا سکتے ہیں... "قَتَلَ" فعل ماضی معروف "قُتِلَ" فعل ماضی مجہول "قَتْلٌ" مصدر "قِتْلٌ" بمعنی دشمن "قِتْلٌ" "قتول

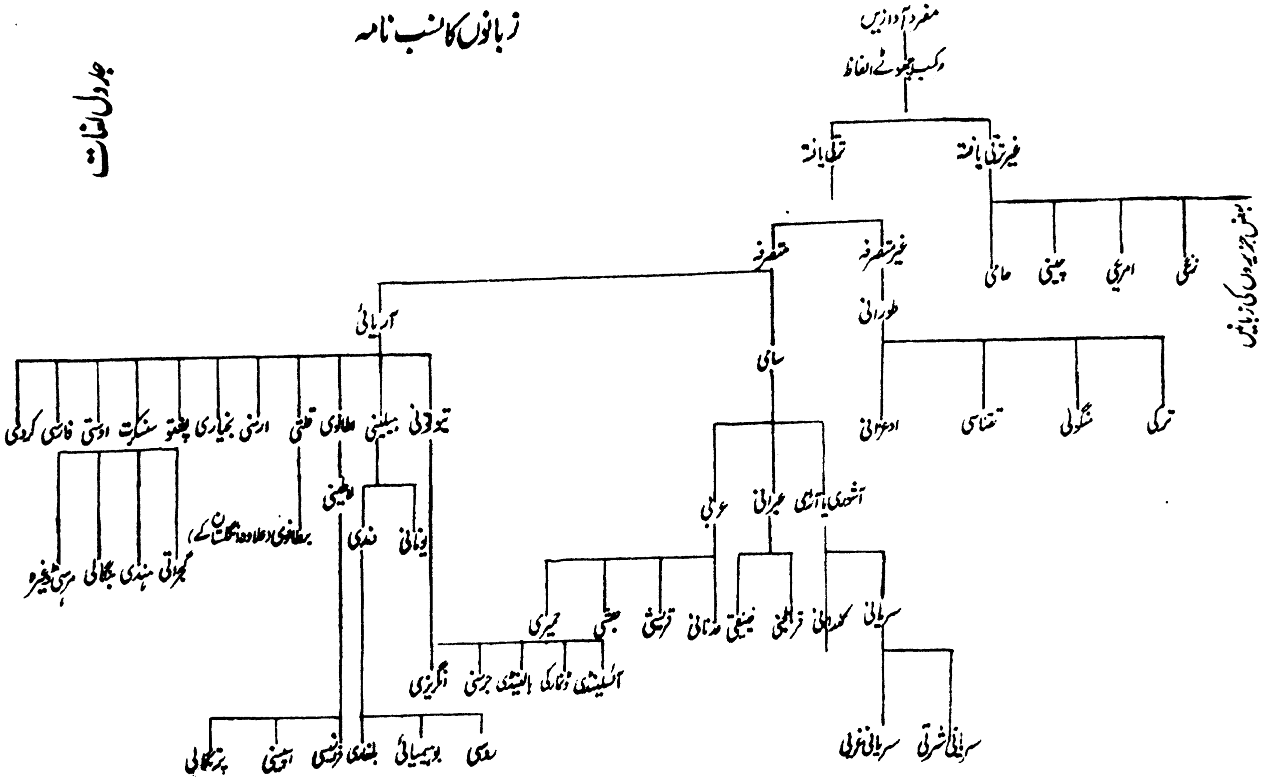
کی جمع کبھی کبھی یہ اعراب کھینچ کر بڑھ بھی جاتے ہیں جیسے "قَاتِل" "قَاتَل" "قَتِیل" "قَتُول" "قِتَال" "قُتَال"
اور "قَتلیٰ" وغیرہ۔ لیکن علامات بڑھا کر صیغے بنانے میں آریہ زبانوں جیسی ہیں تمام اس میں دو امتیازی
خصوصیتیں پائی جاتی ہیں اول یہ کہ اس کے مشتقات کا بڑا حصہ اعراب کے تغیر ہی سے بنتا ہے
دوسرے یہ کہ اس کے صیغے ایسی علامتیں قبول نہیں کرتے جو معنی دار ہوں۔

اس تقسیم سے یہ بات صریحی طور پر ثابت نہیں ہوتی کہ ان سب زبانوں کی اصل ایک ہی ہے
خاص کر جب کہ شاخیں پھوٹنے کے بعد بہت زیادہ تغیرات ہو گئے۔ لیکن تلاش اور مقابلہ سے
یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سامی اور آریائی دونوں زبانوں میں اضافہ علامات کر کے یا بلا اضافہ
گردانے جانے کی صلاحیت موجود ہے لہذا متصرفہ کی شاخیں سمجھی جائیں گی۔ متصرفہ اور غیر متصرفہ
میں مشتقات بنانے کی قابلیت پائی جاتی ہے اس لئے یہ دونوں ترقی یافتہ زبانیں متصور ہوں گی
اگرچہ ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ زبانوں میں تغیرات کی بنا پر بہت زیادہ اختلاف اور بعد ہو گیا ہے
تاہم تلاش اور مقابلہ سے ان دونوں کا درمیانی رشتہ ظاہر ہو جاتا ہے جیسا کہ آئندہ صفحات کے مطالعہ
سے واضح ہو جائے گا۔

تمام زبانوں کی اصل | زبانوں کی تقسیم سے ان قوموں کی تقسیم مراد ہے۔ جو ان کو مافی الضمیر ظاہر کرنے کا
ذریعہ بنائیں۔ ہمارے کہنے کا مقصد ہے کہ زبانوں کی قسمیں طورانی۔ آریائی اور سامی ہیں جو قومیں
اس وقت طورانی زبانیں بولتی ہیں ایک نسل سے ہیں۔ آریائی زبانیں بولنے والی قومیں ایک
نسل سے۔ یہی حال دوسرے گروہوں کا بھی ہے۔ مثلاً جو قومیں آریائی زبانیں بولتی ہیں ان میں
کے کچھ فرقے یورپ میں اور کچھ فرقے ہندوستان اور فارس میں ہیں۔ اگرچہ آج فاصلہ کی
زیادتی سے ان کے عادات و اخلاق ایک دوسرے سے مختلف ہیں پھر بھی اس میں شک
نہیں کہ قدیم ترین زمانہ میں ایک ہی فرقہ یا خاندان تھا جو ایک سرزمین پر زندگی بسر کرتا تھا پھر امتداد
زمانہ سے ان میں علیحدگی شروع ہوئی یہاں تک کہ دو جگہ تقسیم ہو گئے جن کو ہم قسم جنوبی اور قسم
شمالی کہیں گے۔ قسم جنوبی تو وسط ایشیا میں جا بسی اور قسم شمالی نے یورپ میں قدم جمائے جیسا

جدول لغات

زبانوں کا نسب نامہ



جیسا زمانہ گزرتا گیا ان قسموں کی بھی قسمیں ہوتی چلی گئیں ۔ بعینہ یہی حال سامی زبانوں کا بھی ہوا کہ اس کے بولنے والے دوآبہ (دجلہ و فرات) کے درمیان رہتے تھے اور ایک زبان بولتے تھے ۔ جب زمانہ نے پلٹا کھایا یا تو بعض لوگوں نے ترک وطن کیا ۔ خواہ کسی سبب سے بھی ہو ۔ تلاش یا جنگ سے گریز اور جزیرۃ العرب پہونچ کر سکونت اختیار کرلی ۔ کچھ زمانہ گذرنے پر ان کی زبان ترقی کرنے کی وجہ سے بدلنا شروع ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان عربی اور قوم عرب بن کر تیار ہوگئی پھر ان میں سے دوسرے گروہ نے ہجرت کر کے شمالی جزیرۃ العرب میں قیام کیا ۔ ان کی زبان بھی بدلنے لگی یہاں تک کہ اس کی مستقل حیثیت ہوگئی اور عبرانی کے نام سے موسوم ہوئی ۔ (غالبًا اس طرف کے پہلے مہاجر حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہیں جس وقت یہ شاخیں اپنی اپنی جگہوں پر ارتقائی مدارج طے کر رہی تھیں اسی زمانہ میں ان کی اصل بھی دوآبہ کے درمیان ترقی کر رہی تھی ۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک کا میلان کسی نہ کسی طرف تھا ۔ اسی پر تمام زبانوں کی شاخوں کو قیاس کر لینا چاہیئے ۔ عبرانی نے جب مستقل صورت اختیار کرلی تو اس سے فینیقی زبان پیدا ہوئی ۔ انھی میں سے ایک گروہ نے مغرب کی طرف جا کر قرطبنہ کو اپنا وطن بنا لیا اور ان کی زبان مستقل ہونے پر قرطجنی کہلائی ۔ یہی صورت دوسری فرعوں میں بھی ہوئی ۔ قرطجنی زبان الفاظ اور ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے اپنی بہن فینیقی ۔ اس سے اوپر اپنی خالہ عربی پھر اپنی نانی سامی سے بہت ملتی جلتی ہے جو آریائی جیسی ہے ۔ آریائی کا سلسلہ طورانی تک پہنچتا ہے جو چینی سے مشابہ ہے ۔ جیسے جیسے قومیں اپنے اصلی قبیلوں سے دور ہوتی گئیں ویسے ہی ویسے ان کی زبانیں بھی اپنی اصل سے مختلف ہوتی چلی گئیں ۔

جب ہم زبانوں کے مدارج نشو و نما کو سامنے رکھ کر موجودہ زبانوں سے مقابلہ کریں گے تو ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی فرعین کیسے اور کس زمانہ میں بنیں ۔

یہ مشہور ہے کہ انسان کی ابتدائی نشو و نما فرات اور دجلہ کے درمیان عراق سے آرمینہ اور کوہ قاف تک ہوئی جب نسل زیادہ بڑھ جاتی تو کچھ لوگ علیحدہ ہو کر دوسری جگہوں میں جا بستے ۔ تمام گروہ بیک وقت الگ نہیں ہوگئے بلکہ ہوتا یہ تھا کہ جب سرزمین وطن ان کے قیام کے لئے ناکافی ہوتی

اور ذرائع معاش کم ہو جاتے تو ایک فرقہ ان سے جدا ہو کر کسی نہ کسی طرف چلا جاتا۔ توریت میں ایک ایسی ہجرت کا ذکر موجود ہے جس کی وجہ سے متعدد زبانیں پیدا ہو گئیں۔ اس قصہ کی سرخی "حکایت تبلبل الالسنہ" ہے۔ توریت ہی میں دوسری جگہ روئے زمین پر قوموں کے متفرق ہونے اور پھیلنے کا ذکر موجود ہے لیکن صرف وہی قومیں گنائی ہیں جو حضرت نوح کی نسل سے طوفان کے بعد پھیلیں۔ ان قوموں کا کوئی ذکر نہیں ہے جو قبل طوفان نشو ونما پا چکی تھیں نسل قابیل اور اس کی فرعین کیا ہوئیں؟ قبل طوفان پائی جانے والی قومیں کہاں گئیں؟ ان باتوں میں توریت بالکل خاموش ہے۔ صرف انہی لوگوں کے حالات سے بحث کرتی ہے جو دوآبہ کے درمیان رہتے تھے اور طوفان میں غرق ہو گئے۔ اس میں شک کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ انسان کے عالم وجود میں آنے اور طوفان کے درمیان ایک طویل مدت ہے۔ اس عرصہ میں قومیں بنیں ان سے نسلیں پیدا ہوئیں اور مہاجرت کر کے روئے زمین کا بڑا حصہ آباد کر دیا۔

یہ تو ظاہر ہے کہ غیر ترقی یافتہ زبانوں کے بولنے والے دوآبہ کے درمیان بسنے والوں سے کہیں زیادہ پرانے ہیں جیسے چینی اور قدیم مصری جن میں سے ایک فرقہ مشرق میں چلا گیا اور دوسرا مغرب میں۔ اس معاملہ میں تاریخ ہماری تائید کرتی ہے کہ یہ قومیں دنیا کی قدیم ترین قوموں میں سے ہیں کیونکہ اگر وہ قدیم ترین قومیں نہ ہوتیں تو ان کی زبانیں بھی بسیط نہ ہوتیں بلکہ قبل طوفان ہی ان کی فرعین بن جاتیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ زبانیں ابھی تک اپنے ابتدائی دور میں ہیں۔ ابتدائی دور سے وہ زمانہ مراد ہے جب کہ علامتیں پیدا نہیں ہوئی تھیں اور نہ اسم فعل اور حرف میں کوئی امتیاز کیا جاتا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ چین قابیل نسل سے ہوں اس لئے کہ توریت ہم کو قابین کا ماہر صنعت و موسیقی ہونا بتاتی ہے اور چینی قوم مختلف صنعتوں میں پرانی ماہر ہے۔

چین کو عربی سین (صین) کہتے ہیں۔ ہم کو صین اور قابین میں یہاں تک لفظی مشابہت معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں کو ایک ہی لفظ شمار کرنا صحیح ہوگا کیونکہ ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں جن میں قاف اور صاد کا آپس میں تبادلہ ہوا ہو۔ علاوہ ازیں یورپی زبانوں میں حرف (C) کبھی تو قاف یا

کاف کی آواز ظاہر کرتا ہے اور کبھی صاد یا سین کی۔ نیز پرانی انگریزی میں اس کا تلفظ جیم اور کاف کی درمیانی آواز سے کیا جاتا تھا "ج" اور "چ" قریب المخرج ہیں لہذا بہت ممکن ہے کہ بعض زبانوں میں قائین کا تلفظ" CHINA چائنا" یا چین ہو گیا ہو۔ اسی طرح قبائل عرب میں "گ" کے تلفظ میں اختلاف ہے بعض قبائل اس کا تلفظ "ک" کرتے ہیں بعض "چ" بعض "سین" اور بعض "شین" یہی مشابہت قائین اور قدیم مصر کے نام میں بھی دکھائی دے گی جو کیم، یا کیمی، کہلاتا تھا (ممکن ہے کہ علم الادویہ کے متعلق اسی قوم نے ابتدائی معلومات حاصل کئے ہوں اور اس فن کا نام اسی قوم کی طرف منسوب کر کے کیمیا رکھا گیا ہو) کاف اور قاف قریب المخرج ہیں۔ نون اور میم کا آپس میں تبادلہ مشہور ہے۔ رہا زیر د زبر کا اختلاف تو وہ کوئی چیز نہیں۔ مذکورہ بالا بیان سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ غیر ترقی یافتہ زبانیں بولنے والی قومیں روئے زمین کو طوفان سے پہلے ہی آباد کر چکی تھیں۔ پھر تورانی بولنے والی قوموں کے اجداد نے ہجرت کر کے شمالی ایشیا میں سکونت اختیار کر لی جن کی نسل سے مغل اور تاتاری وغیرہ قومیں ہیں۔ پھر وہ گروہ بھی الگ ہو گیا جو بعد کو آریہ کہلایا۔ اس کی شاخیں ہندوستان۔ فارس کردستان۔ اور یورپ میں جا بسیں۔ اسی طرح سامی اور ان کی نسلیں بھی الگ ہو گئیں۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ جب کوئی زبان اپنی اصل سے جدا ہوئی تو خود اس میں نشو و نما پیدا ہو جایا کرتی تھی اور دونوں زبانیں اپنے بولنے والوں کے حالات کے مطابق چلتی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ویسے ہی ویسے یہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتیں چلی گئیں۔ لیکن ان دونوں دور افتادہ زبانوں کی مشابہت تحقیق اور مقابلہ سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ زبانوں کو اپنی اصل سے جدا ہوئے جتنا زیادہ زمانہ گذرا اتنا ہی زیادہ اختلاف پیدا ہو گیا اور جتنا کم زمانہ گذرا اتنا ہی اختلاف بھی کم رہا۔ عبرانی اور عربی زبان کے الفاظ طریق تعبیر اور مشتقات کی مشابہت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ایسی ہی مشابہت ان یورپی زبانوں میں بھی محسوس ہو گی جو لاطینی سے نکلی ہیں۔ ان میں کی ہر زبان اس وقت اپنی اصل سے علیحدہ ہوئی جبکہ مختلف قسم کی تعبیریں اور اشتقاق اصل میں نشو و نما پا چکے تھے لہذا مشابہت خوب نمایاں رہی۔ لیکن عربی اور لاطینی مشابہت کے اعتبار سے

بہت دور ہوگئیں کیونکہ یہ اس وقت الگ ہوئیں جس وقت تک اصل میں پوری طرح نشو ونما نہیں ہو چکی تھی بلکہ ان دونوں نے بذات خود الگ الگ ارتقائی مدارج ایک دوسرے سے مختلف طور پر طے کیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشابہت میں بہت کمی واقع ہوگئی۔ اسی سبب سے عربی اور چینی زبانوں میں انتہائی بعد ہوگیا کیونکہ چینی اصلی سامی قوم سے ہزار ہا سال پیشتر اس وقت علیحدہ ہوئی جب کہ زبان ابتدائی حالت میں تھی۔

اب ہم لغت کے اس قدیم ترین مواد سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو تمام زبانوں کی اصل میں پایا جائے جس کی وجہ سے ہم ان کی باہمی مشابہت معلوم کر سکیں گے۔

لغت کے سب سے پرانے لفظوں میں ضمیریں۔ گنتی اور ضروریات زندگی کے نام مثلاً کھانا پانی۔ قیام گاہ اور پوشش وغیرہ جیسی چیزیں شامل ہیں۔

ضمیریں ضمیریں صرف تین ہوتی ہیں متکلم۔ مخاطب اور غائب جن پر جمع اور تانیث وغیرہ کی علامتیں بڑھا دی جاتی ہیں۔ جب ہم ان کو علامات اور اس نون سے خالی کریں گے جو بعض زبانوں میں پایا جاتا ہے تو ان کے آپس کی مشابہت ظاہر ہو جائے گی۔ ضمیر متکلم "ی" اور "ک" آواز دل سے بنتی ہے (کسی زبان میں دونوں حرف پائے جائیں گے اور کسی میں ایک) اردو میں "ی" اور "ہ" ہے جو ہم کو (میں اور ہم) میں نظر آتی ہے ("ی" "ء" "ح" "ہ" وغیرہ کا آپس میں تبادلہ ہوا کرتا ہے) عربی میں "ی" یا "ح" ہے جیسے "نحن" اور "ی" جو ضمیر واحد متکلم منصوب میں خواہ متصل ہو یا منفصل اور ضمیر مجرور میں پائی جاتی ہے۔ فارسی میں "ام" اور "ایم" بحالت اتصال۔ سریانی میں (ܐܢܐ ان کی) جس کا تلفظ "الوخی" ہوگا۔ عبرانی میں אנכי (انوک) یا אני (لے) قدیم مصری میں (ان کو) یا (یا) (آ) آشوری میں (ago) لاطینی میں (ago) یونانی میں (egun) سنکرت میں (aha) یا (ahom) انگریزی میں (I) جرمنی میں (ich) چینی میں (nga) یا (ga) یا (a) منگولی میں (na)

مخاطب کی ضمیر سے جس وقت جنس اور عدد کی علامتیں ہٹالی جائیں تو سب زبانوں میں اصل "ت" نکلے گی۔ جیسے اردو میں (تم۔ تر۔ تیرا۔ تجھ) عربی اور سریانی میں (انت) عبرانی میں אתה

(ادّہ لاطینی میں (tu) فرانسیسی میں (tu) انگریزی میں (THOU) جرمنی میں (tu) یا (du) سنسکرت میں (tuma) فارسی میں (تو) آشوری میں (اَتا) کلدانی میں (انت) پرانی مصری میں (entuk) قبطی میں (ntok) چینی میں (nu) منگولی میں (tai) ۔

ضمیر غائب کی اصل تمام زبانوں میں "ہ" ہے۔ یونانی میں (I) جرمنی میں (ihm) فارسی میں (وے) اردو میں (وہ) چینی میں (soh) اس کا تلفظ "اوہ" ہوگا "s" زائد ہے) عربی میں (ہو ہی۔ ہما۔ ہنّ۔ ہم۔ ہ۔ ہا) سریانی میں (ہو۔ ہی۔ ہُ۔ ہِ۔ ہنون۔ ہنین) عبرانی میں (ہوا۔ ہیا۔ ہُ۔ ہَ ہم۔ ہن) انگریزی میں (he - his - him her) ۔

گنتی | اندازہ کیا جاتا ہے کہ گنتیاں ضمیروں کے بہت بعد وجود میں آئیں اسی واسطے جتنی شباہت ضمیروں میں پائی جاتی ہے اتنی گنتیوں میں نہیں پائی جاتی۔

عربی کے لفظ واحد سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب سامی زبانیں آریائی زبانوں کے مقابلہ میں مستقل ہوچکیں تب یہ معرض وجود میں آیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے آریائی زبانوں میں پایا جاتا ہو جس کے آثار سوا یونانی کے اب مفقود ہوگئے۔ عربی کے واحد میں اصل (حد) ہے جو دوسری سامی زبانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ یونانی زبان میں واحد کے معنی میں (heis) مستعمل ہے۔ آریائی زبانوں میں جن الفاظ سے "ایک" کا مفہوم پیدا ہوتا ہے ان کی اصل "و" اور "ن" ہے۔ لاطینی میں (unus) یونانی میں (en) انگریزی میں (one) یا (on) اسی طرح دیگر آریائی زبانوں میں بھی ہے۔ اب رہیں سامی زبانیں تو ان میں اصل "و" اور "ل" ہے جو عربی کے لفظ (اول) میں پوری طرح محفوظ ہے۔ اردو میں اس کی یادگار لفظ (پہلا) میں "ل" باقی رہ گیا ہے۔ (ل۔م۔ن۔ر۔ کا آپس میں تبادلہ ہوتا ہے)

(دو) اس کی اصل "ت" ہے جس کا تبادلہ (ث۔س۔د) سے ہوتا ہے۔ عربی میں (اثنان) فارسی میں (دو) یونانی میں (duo) لاطینی میں (duo) انگریزی میں (two) یہی حال باقی زبانوں کا بھی ہے۔ عربی میں الف اور نون زائد ہیں جن کا استعمال بطور علامت تثنیہ ہوتا ہے۔

(تین) عربی میں اس کی اصل (ثلث) ہے جو تمام سامی زبانوں میں مشترک ہے اسی طرح آریائی زبانوں میں بھی جیسے لاطینی میں (tres) یونانی میں (treis) انگریزی میں (three) فارسی میں (سہ)۔

(چار - پانچ) آریائی اور سامی زبانوں میں مشترکہ طور پر ان کی اصل تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔

(چھ) اس کی اصل "ست" ہے ("س" اور "ج" قریب المخرج ہیں یہاں تک کہ بعض زبانوں میں دونوں آوازوں کے لئے ایک ہی حرف استعمال کیا جاتا ہے) عربی میں (ستہ) عبرانی اور فارسی میں (شش) لاطینی میں (sex) یونانی میں (hex) سلافونی میں (شست) انگریزی میں (six)

(سات) عربی میں (سبعہ) لاطینی میں (septem) یونانی میں (hepta) فارسی میں (ہفت) سنسکرت میں (ستپا) انگریزی میں (seven) اس سے پتہ چلتا ہے کہ اصل (سب) ہے جس پر سامی زبانوں میں (ع) اور اکثر آریائی زبانوں میں (ت) کا اضافہ ہو گیا۔

سات کے اوپر کوئی صورت مطابقت کی نہیں ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سامی اور آریائی گروہ اس وقت علیحدہ ہوئے جب کہ آٹھواں عدد پیدا نہیں ہوا تھا۔ دنیا میں اب تک کچھ وحشی قومیں ایسی ہیں جن کی زبان میں پانچ کے اوپر کوئی عدد نہیں پایا جاتا۔

ہم کو مذکورۂ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ گنتی کی مشابہت صرف آریائی اور سامی زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ غیر ترقی یافتہ زبانیں گنتی پیدا ہونے کے پہلے ہی اپنی اصل سے الگ ہو چکی تھیں بالفاظ دیگر چینی اور مغل اس وقت دوآبہ سے ہجرت کر گئے جب ان کی زبان میں گنتیوں کا وجود بھی نہ تھا۔ بعد میں ان کے یہاں گنتی پیدا ہوئی جس کا تعلق مذکورۂ بالا زبانوں سے نہ تھا۔ چینی زبان میں دو کو (شونگ) تین کو (شام) چار کو (سی) پانچ کو (ینچو) چھ کو (لوک) کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ضروریات زندگی کے نام | عہد اول کے انسان نے اپنی بول چال میں سب سے پہلے ان اشیا کے نام رکھے جو اس کی جہد للبقا میں کام آسکیں۔ چونکہ یہ ضمیروں اور گنتیوں سے بھی پہلے بن چکے

تھے۔اس لئے ان کی مشابہت تمام زبانوں میں اچھی طرح نمایاں ہے۔ واضح رہے کہ زبان ہمیشہ نشوونما کی حالت میں رہتی ہے نئے نئے الفاظ پیدا ہوتے ہیں اور پرانے متروک ہو جاتے ہیں۔ الفاظ میں تغیر کمی بیشی۔ تبادلہ۔ اور حروف کے مقدم مؤخر ہونے سے ہو جاتا ہے۔ اکثر زبان زد الفاظ میں اسی قسم کی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ ضروریات زندگی کے نام سب سے پرانے زبان زد الفاظ ہیں۔ یہ توقع نہیں رکھنا چاہیئے کہ مشابہ الفاظ کی مثالیں کثرت سے ملیں گی یا ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ زبانوں میں بیک وقت مل جائیں گی۔ کبھی کوئی لفظ سامی اور آریائی زبانوں میں مشترک ملے گا یا کبھی ان میں سے ایک اور چینی میں۔ کچھ ایسے الفاظ بھی ہیں جو سب میں پائے جاتے ہیں۔ ایسی مثالیں درج ذیل ہیں۔

(۱) ماں۔ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ایک ہی لفظ دنیا بھر کی زبانوں میں رائج ہے کیونکہ یہی انسانی بولی کا قدیم ترین لفظ ہے۔ لاطینی میں (mater) یونانی میں (miter) سنسکرت میں (matri) انگریزی میں (mother) فارسی میں (مادر) اردو [illegible] عربی عبرانی اور سریانی میں (اُم) تبتی میں (یم) چینی میں (مو) قبطی میں (ماو) جس طرح ان سب لفاظ میں اصل "م" ہے اسی طرح ان الفاظ میں بھی جو ماں کو مخاطب کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ جیسے ہندی میں (ماتا) اردو میں (اماں) عربی میں (اُمّی) اکثر یورپی زبانوں میں (Mama) یا (Mami)

(۲) باپ۔ آریائی زبانوں میں (pater) یا اسی سے ملتے جلتے الفاظ ہیں جیسے انگریزی میں (Father) فارسی میں (پدر) ہندی میں (پتا) اس میں اصل "ب" ہے جو سامی زبانوں میں بھی (اب) کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ چینی میں (بو) یا (فو) ب۔ پ۔ ف۔ د۔ کا آپس میں تبادلہ ہوتا ہے۔

(۳) دنیا۔ لاطینی میں (DO) ایسے ہی الفاظ بقیہ آریائی زبانوں میں بھی ہیں۔ فارسی میں (دادن) "دن" علامت مصدر ہے جس کو گرانے کے بعد صرف "دا" باقی رہ جاتا ہے اردو

میں "دینا" اس میں "نا" علامت مصدر ہے۔ اس لفظ میں اصل "د" ہے۔ عربی میں (ادّی) یا (اعلیٰ) عین زائد ہے۔ قدیم مصری میں (دا) "د" "ت" اور "ط" ہم مخرج ہیں۔

(۴) کٹنا۔ کاٹنا۔ یہ لفظ دنیا بھر کی زبانوں میں مشترک ہے۔ لاطینی میں (Caedo) انگریزی میں (cut) فرانسیسی میں (Casser) چینی میں کت قدیم مصری میں (کھت) عربی میں (قط قص قطع)

(۵) ہونا۔ لاطینی میں (Esse) سنسکرت میں (as) انگریزی میں (was-is) عبرانی میں (یش) سریانی میں (یت) اردو میں (تھا) عربی میں (ایس) مگر عربی میں یہ لفظ لا رنافیہ کے بغیر نہیں پایا جاتا (لا ایس جس کا مخفف لیس ہے)

(۶) مرد۔ لاطینی میں۔ (Vir) یونانی میں (Anir) اسپینی میں (Nambee) انگریزی میں (man-men) فارسی میں (مردم) اردو میں (مرد) عربی میں (مرء) منگولی میں (Ere) اس لفظ میں اصل "ر" ہے۔

(۷) حرف نفی۔ اکثر سامی زبانوں میں (لا) اور آریائی زبانوں میں (Na) یا اس کی شاخیں مستعمل ہیں۔ عربی میں (لا۔ ما) انگریزی میں (not-Non-Un) فارسی میں (نہ۔مَ) اردو میں (نہ۔ نہیں۔ مت) تمام طورانی زبانوں میں (ال۔ نہ۔ ما) تامل میں (الے) ل۔م۔ن۔ کے درمیان نسبت لفظی معلوم ہی ہے۔

مذکورۂ بالا مثالیں ایسے الفاظ کی ہیں جن کی اصل تمام بڑی بڑی زبانوں میں ایک جیسی ہیں۔ لیکن وہ مشابہ الفاظ جو چند زبانوں میں پائے جائیں۔ اس قدر کثرت سے ہیں کہ ان کا ایک جگہ جمع کرنا غیر ممکن ہے صرف چند مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔ اردو (کھوہ) لاطینی (Cavea) انگریزی (Cave) عربی (کہف) ۔۔ عربی (ارض۔ ثری) انگریزی (Earth) فرانسیسی (Terra) ۔ عربی (اللہ) تبتی (لہا) ۔ عربی (مار) قدیم مصری (ما) چینی (مو) وغیرہ وغیرہ۔

(باقی)

قومی تنظیم

(از پروفیسر کے۔ ٹی۔ شاہ جنرل سکریٹری قومی تنظیمی کمیٹی)

(ذیل میں اس نوٹ کے ضروری اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جو پروفیسر کے۔ٹی۔شاہ نے قومی تنظیمی کمیٹی کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اپنی سب کمیٹیوں کی ہدایت کے لئے شائع کیا ہے۔ مدیر)

پلاننگ یا تنظیم کسے کہتے ہیں؟ جمہوری نظام میں پلاننگ کے معنی ہیں عوام کی منتخب شدہ جماعتوں کی طرف سے چند جماعتی نصب العینوں کا مقرر کیا جانا اور ان کے مطابق ایسے ماہران فن کا جن کی اپنی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں ہے ذیل کے مختلف کاموں میں باہمی ربط پیدا کرانا یعنی دولت کے صرف کرنے، دولت کے پیدا کرنے، کاروبار میں سرمایہ لگانے، تجارت کرنے اور قومی آمدنی کے تقسیم کرنے کے مختلف کاموں میں ہم آہنگی اور یکجہتی پیدا کرنا۔ اس قسم کی پلاننگ کو صرف معاشی نقطہ نگاہ سے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کے مقصد کو سامنے رکھ کر ہی نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ اس میں تمدنی اور روحانی قدروں اور زندگی کے دوسرے انسانی پہلوؤں کو بھی شامل سمجھنا چاہیئے۔

پھر تنظیم کے لئے صرف جماعتی نصب العین کا ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس پلین کو عملی جامہ پہنانے کے لئے قوت اور اقتدار کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔ اگر یہ قوت کسی اعتبار سے محدود ہوئی یا پلین کو عملی جامہ پہناتے وقت کسی اور قسم کی معاشی یا سیاسی پابندیاں حائل ہوئیں تو ہمہ گیر تنظیم رکھنے والی معیشت ترقی نہ کر سکے گی۔ صحیح تنظیم مکمل سیاسی اور معاشی آزادی کی صورت میں ہی کی جا سکتی ہے۔ اس لئے ہندوستان میں قومی تنظیم کے لئے مکمل کوشش تو اسی وقت کی جا سکے گی جب اس ملک کو پورا اقتدار بالادست حاصل ہوگا لیکن ملک میں جو حالات آج کل

موجود ہیں اور ہم پر طرح طرح کی جو پابندیاں لگی ہوئی ہیں ان کے ہوتے ہوئے ہم کو اپنے پلین یا منصوبہ میں ایسی تجویزیں بھی رکھنا ہوں گی جو فوری طور پر قابل عمل ہوں گی اور ہم کو ایسے اقدامات کو تبلانا ہوگا جن کو پلین کے پورا کرنے اور ملک کے ذرائع سے زیادہ سے زیادہ امکانی فائدہ اٹھانے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے ہم اس وقت بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ ان اقدامات کو منظم معیشت کی مکمل اسکیم کا ہم آہنگ ہونا چاہیئے اور کسی حال میں بھی ہم کو کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیئے جو پلین کے پورا کرنے میں مزاحم ہو۔

ہمارے جماعتی نصب العینوں کا جہاں تک تعلق ہے ملک میں ایک بڑی حد تک اتفاق رائے پایا جاتا ہے اگرچہ بعض بنیادی اختلافات بھی موجود ہیں جن میں سے بہت سے ممکن ہے ہماری اس تحقیقات کے بعد ختم ہو جائیں۔ ایک حد تک ان نصب العینوں کی طرف نیشنل کانگرس نے اپنی متعدد قرار دادوں اور اپنے عام طرز عمل سے ہماری رہنمائی اور ہدایت بھی کی ہے۔ ہمیں کانگریس کے اس عام طرز عمل کی پیروی کرنی چاہیئے اور کانگریس کے تبلائے ہوئے مقاصد کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں کراچی کانگریس کے بنیادی حقوق کی قرار داد اور کانگریس کے انتخابی مینی فیسٹو کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

کانگریس بہت سے سالوں سے گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے پر بہت زور دے رہی ہے اور ملک کو گاؤں کے لوگوں کی حالت کی طرف متوجہ کر رہی ہے۔ ہم بھی اس بات کو نہیں بھلا سکتے کہ ہندوستان کی ترقی کا اندازہ ان کروڑوں آدمیوں کے معیار زندگی کی بلندی سے ہی کیا جا سکتا ہے جو دیہاتوں میں آباد ہیں۔ لیکن لوگوں کے ذہن میں دیہاتی صنعتوں اور بڑے پیمانہ کی صنعتوں کے مطالبات کے سلسلہ میں ایک غیر واجب تصادم پیدا ہو گیا ہے۔ تصادم اس بات کا تو ہو سکتا ہے کہ کس کو کس قدر اہمیت دی جائے اور ہندوستان میں اس وقت جو حالات پائے جاتے ہیں ان میں بلاشبہ خانگی صنعتوں کو خوب ترقی دینا جمہور کی فلاح وبہبود کے لئے بہت زیادہ ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی صاف اور کھلی

ہوئی ہے کہ بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو ترقی دینا بھی ملک کی نہایت فوری ضرورت ہے۔ بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو ترقی دیے بغیر کسی ملک کو سیاسی یا معاشی آزادی نہیں مل سکتی اور جب سیاسی آزادی ہی مفقود ہو تو دیہی اور خانگی صنعتوں کی بہت زیادہ ترقی کی بھی کوئی امید قائم نہیں کی جا سکتی بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو ترقی دیے بغیر لوگوں کے معیار زندگی کو موثر طریقہ پر تیزی کے ساتھ بلند کرنا ممکن نہیں ہے۔ کلیدی صنعتوں، مدافعت کی صنعتوں اور پبلک فائدہ کی صنعتوں کو بڑے پیمانہ پر ہی چلایا جا سکتا ہے جیسے کہ دیہی اور خانگی صنعتوں کی ترقی میں بھی سستی قوت محرکہ اور مناسب مشینوں کے فراہم ہو جانے سے جنھیں بڑے پیمانہ کی صنعتوں کے ذریعہ سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے بڑی مدد ملتی ہے۔ اس لئے ایک حد تک یہ کہنا صحیح ہے کہ دستی صنعتیں اور بڑے پیمانہ کے کاروبار ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے ملک کے سامنے مسئلہ کسی ایک کے انتخاب کا نہیں بلکہ دونوں سمتوں میں ہم آہنگی کے ساتھ ترقی کرنے کا ہے اور جہاں تک ہو سکے ہمیں اس بات کی کوشش کرنا چاہیے کہ دیہی صنعتوں اور بڑے پیمانہ کی صنعتوں میں باہمی تصادم نہ ہونے پائے۔

کانگریس کی طرف سے گھریلو صنعتوں کی ترقی پر جو زور دیا جاتا ہے اس کی خاص وجہ یہ خواہش ہے کہ تقسیم دولت کے نظام میں زیادہ انصاف پیدا کیا جائے اور نگرانی اور امتیازی کی عدم موجودگی میں صنعتی ترقی سے جو برائیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا سدباب کیا جائے۔ منظم معیشت میں چونکہ تقسیم دولت کی نگرانی بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور جب تقسیم دولت انصاف پر مبنی ہوتی ہے تو صنعتی ترقی کی برائیوں کا چونکہ سدباب کیا جا سکتا ہے اس لئے ہندوستان کی قومی تنظیم میں تقسیم دولت کی ایک مناسب اسکیم نہایت لازمی حیثیت رکھتی ہے۔

صنعتی وزرا کی دہلی کی کانفرنس میں جو قرارداد منظور کی گئی تھی اور جس کی وجہ سے قومی تنظیمی کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا ہے اس میں کمیٹی کو صنعتوں کو ترقی دینے کی نہایت واضح طور پر ہدایت کی گئی ہے اور وزنی کلیدی صنعتوں، اوسط پیمانہ کی صنعتوں اور گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے کا مطالبہ

کیا گیا ہے۔ چنانچہ کمیٹی کے حدود تحقیقات اسی بات پر مشتمل ہیں۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ کانگریس نے اپنی بنیادی حقوق کی قرارداد میں اس کا فیصلہ کردیا ہے کہ "ریاست کلیدی صنعتوں اور خدمتوں، معدنی وسائل، ریلوں، آبی راہوں، جہاز رانی اور پبلک نقل و حمل کے دوسرے ذرائع کی یا خود مالک ہوگی یا ان کی نگرانی کرے گی۔"

قومی معیشت کی تنظیم کا خاص مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ جہاں تک ہو سکے قومی خود کفالت کو حاصل کیا جائے نہ یہ کہ بیرونی منڈیوں کے لئے قومی معیشت کو ترقی دی جائے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بین الاقوامی تجارت کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ اس کی تو ضرور حوصلہ افزائی کرنا چاہیئے لیکن اس طرح پر کہ معاشی سامراج سے محفوظ رہ سکیں۔ ملک کی زرعی اور صنعتی پیداوار کا پہلا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ملکی ضرورتوں کے لئے غذا، کچا مال اور مصنوعہ اشیا کی رسد مہیا کی جائے البتہ زائد پیداوار کی نکاسی کے لئے راستے ڈھونڈھے جا سکتے ہیں تاکہ ہندوستان کے بین الاقوامی قرضوں کا ھگتان کیا جا سکے۔

ہمیں جس بنیادی مقصد کو سامنے رکھنا ہے وہ یہ ہے کہ عوام کے لئے ایک مناسب معیار زندگی یقینی طور پر حاصل کیا جائے۔ مناسب معیار زندگی میں کم ترین احتیاجات کے پورا کرنے کے ساتھ ساتھ آرام اور آسایش کا ایک اضافہ پذیر حصہ بھی شامل ہونا چاہیئے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں کے لئے معاشیات کے ماہروں نے کم ترین احتیاجات کے پورا کرنے کے لئے روپیہ کی موجودہ قیمت کے ساتھ پندرہ روپیہ ماہوار سے لے کر پچیس روپیہ ماہوار تک کی رقم کا تخمینہ کیا ہے۔ لوگوں کی کم ترین احتیاجات کو رقموں کی شکل میں محض سہولت کے خیال سے ظاہر کیا گیا ہے ورنہ حقیقتاً ان کا اظہار اشیاء اور خدمات کی شکل میں کرنا چاہیئے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستان کی سالانہ فی کس آمدنی کے اوسط کا تخمینہ پچیس یا تیس روپے کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ نہ صرف غذا بلکہ انسانی زندگی کی اور دوسری لازمی ضرورتیں بھی اس آمدنی کے ذریعہ پوری نہیں کی جا سکتیں۔ اس لئے آئندہ دس سالوں میں ہر شخص کے لئے کم ترین معیار زندگی

کو حاصل کرنے کے واسطے قومی آمدنی میں بہت زیادہ اضافہ کرنے کی ضرورت ہے اس کمترین معیار کو حاصل کرنے کے لئے نہ صرف پیدائش دولت کو بڑھانا ہوگا بلکہ تقسیم دولت کو بھی زیادہ منصفانہ طریقہ پر تنظیم دینا ہوگا۔

ایک حقیقی ترقی پذیر معیار زندگی کے لئے تو ہمیں قومی دولت کو پانچ یا چھ گنا زیادہ کرنا ہوگا لیکن فی الحال آئندہ دس سالوں میں کم ترین معیار زندگی کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں آمدنی کو دوگنا تین گنا بڑھانا پڑے گا اور ہمیں اسی مقصد کو سامنے رکھ کر اپنی تنظیم کے کام کو شروع کرنا چاہئے۔

منظم ترقی کو چند معروضی طریقوں سے جانچا جا سکتا ہے جنھیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

(I) غذا میں ترقی پروٹین، کاربوہائیڈریٹ، معدنیات (اور دوسری ضروری مدافعتی غذاؤں) کے کم ترین معیار کو سامنے رکھ کر جس کی قوت حرارت ایک بالغ کام کرنے والے کے لئے ۲۴سو تا ۲۸سو کیلاریز ہونا چاہیئے۔

(II) کپڑے کی ترقی موجودہ ۱۵ گز فی کس سالانہ کے مقابلہ میں ۳۰ گز فی کس سالانہ تک

(III) مکان کے معیار کو کم از کم سو مربع فیٹ فی کس تک پہنچنا چاہیئے۔

دوسرے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو ترقی کے ناپنے کے دوسرے حسب ذیل پیمانے مقرر کئے جا سکتے ہیں:۔

(I) زرعی پیداوار میں اضافہ } کم از کم اتنا اضافہ کہ جس کے ذریعہ اوپر کے درج کئے ہوئے
(II) صنعتی پیداوار میں اضافہ } غذا اور کپڑے کے کم ترین معیار کو حاصل کیا جا سکے۔

(III) بے روزگاری میں کمی

(IV) فی کس آمدنی میں اضافہ

(V) ناخواندگی میں کمی

(VI) پبلک کے فائدے کی خدمات میں اضافہ

(VII) طبی امداد کی فراہمی اس معیار کے مطابق کہ ایک ہزار کی آبادی کے لئے ایک شفاخانہ

قائم ہو جائے۔

(viii) زندگی کی اوسطاً جو توقع کی جاتی ہے اس میں اضافہ ۔

پلین کی تکمیل کو وقتاً فوقتاً ناپنے کے لیے اعداد و شمار کا جمع کرنا اور ان کا مقابلہ کرنا ضروری ہے تنظیم کی ترقی کے ساتھ ساتھ اعداد و شمار کے جمع کرنے کے کام میں بھی ترقی کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

پلین کے مختلف شعبوں میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنا بہت لازمی ہے تنظیم کا راز یہ ہے کہ ترقی کا سلسلہ ہر محاذ پر جاری رکھا جائے ۔زراعت کی تنظیم اس لیے ہو کہ اشیائے غذا کے معاملہ میں ان معیاروں کے مطابق جنھیں اوپر بیان کیا جا چکا ہے ملک اپنی ضرورتوں کی خود کفالت کر سکے ۔اسی طرح اشیائے خام کو بھی پہلے سے مقرر کیے ہوئے معیار کے مطابق پیدا کیا جائے ۔زمین کی زرخیزی کا تحفظ، جنگلوں میں نئے درختوں کا لگانا، گھاس کی زمینوں کا انتظام سیلاب کی نگرانی، دریاؤں کا انتظام اور اندرون ملک کے دریائی نقل و حمل کی اصلاح مویشیوں اور چارے کی ترقی یہ منظم پروگرام کے چند ایسے عنوانات ہیں جن کو باقاعدگی کے ساتھ ابھی تک شروع نہیں کیا گیا ہے ۔قوت محرکہ کی ترقی اور صنعتی قوت محرکہ کے لیے کوئلہ اور دوسرے قسم کے ایندھنوں کا تحفظ بھی تنظیم کا محتاج ہے ۔اس سے بھی زیادہ اہم مختلف قسم کی صنعتوں مثلاً بڑے اور اوسط پیمانہ کی اور گھریلو صنعتوں کی تنظیم ہے کہ صرف ان کے ذریعہ سے ہی زمین کے موجودہ دباؤ کو موثر طریقہ پر کم کیا جا سکتا ہے ۔مطمح نظر یہ ہونا چاہیے کہ دس سال کے اندر اندر ایک ایسا متوازن معاشی نظام پیدا ہو جائے جس میں تقریباً نصف آبادی زراعت پر انحصار کرے۔

پھر تنظیم کے پروگرام میں عام تعلیم اور پیشہ کی تعلیم اور ترقی میں امداد دینے والی تحقیقات علمی بھی شامل کرنے کی ضرورت ہے ۔اسی طرح سرکاری خدمات کے مقام اور تنظیم کو بھی اس پلین کی ضرورتوں کا پابند ہونا چاہیے۔

اگر معاشی ترقی کے مقابلہ میں آبادی کے اضافہ کی شرح زیادہ رہی تو تنظیم کی کوئی کوشش

مقصد کے حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔ ہندوستان کی منظم معیشت میں آبادی کو اس لئے قصداً نہیں بڑھایا جائے گا تاکہ زائد آبادی کو دوسرے ملکوں میں بسنے کے لئے روانہ کیا جاسکے بلکہ جو زائد آبادی فی الواقعی موجود ہوگی اسے معاہدوں کے ذریعہ ترک سکونت کی اجازت دی جائیگی لیکن اس کا خیال رکھا جائے گا کہ نئے علاقوں میں ان مہاجرین کے حقوق کا مناسب تحفظ کیا جائے۔

اس پلین کی تکمیل کے لئے دس سال کی میعاد مقرر کرنا چاہیئے اور مختلف زمانوں اور معاشی زندگی کے مختلف شعبوں کی ترقی کے نگرانی کے لئے درمیانی زمانہ کے معیاروں (CONTROL FIGURES) کا مقرر کرنا بھی ضروری ہے۔

مدافعت کی صنعتوں[1] کی ملکیت اور نگرانی ریاست کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے، پبلک کے فائدہ کی صنعتوں[2] پر بھی ریاست کی ملکیت یا نگرانی ہو سکتی ہے لیکن اس رائے کو سختی سے رکھنے والے لوگ بھی ہیں جو ہر حال میں پبلک کے فائدہ کی صنعتوں پر ریاست کی ملکیت قائم کرانے کے حامی ہیں۔ دوسری کلیدی صنعتوں[3] پر بھی حکومت کی ملکیت یا نگرانی ہونا چاہیئے۔

جب دوسرے حالات (مثلاً اشیاء خام اور وسائل کی موجودگی اور صرف کرنے والے مرکزوں سے قرب) یکساں ہوں تو پلین میں صنعتی حیثیت سے پس ماندہ علاقوں کی طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے ملک کے مختلف حصوں میں مختلف صنعتوں کو تقسیم کرنے کی سفارش کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیئے کہ ہر صوبہ اور ریاست کو جہاں تک ہو سکے اپنے کچے مال سے فائدہ اٹھانے، اپنے مزدوروں کے لئے روزگار فراہم کرنے اور اپنے سرمایہ کو کاروبار میں لگانے کا پورا موقع ملے۔

مزدوروں کے بارے میں قواعد اور ضوابط، تندرستی، بیماری اور بے روزگاری کے بیموں

---

[1] ، [2] ، [3] مدافعت کی صنعتوں، پبلک کے فائدہ کی صنعتوں اور کلیدی صنعتوں کی فہرست اس مضمون کے خاتمہ پر ضمیمہ نمبر (ب) میں درج کی گئی ہے۔

قوم کے لئے مکانات کی فراہمی اور معاشرتی فلاح کی دوسری اسکیموں میں بھی پلین کے ساتھ یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ صوبوں اور ریاستوں کی طرف سے ان کی ابتدا کی جائے گی لیکن قومی تنظیم کے کمیشن کی طرف سے اجرتوں اور مزدوروں کو روزگار سے لگانے کے سلسلہ میں کم ترین معیاروں کو مقرر کر کے ایک عام طرز عمل کا تعین کر دیا جائے گا۔

مختلف صوبوں میں سرمایہ کے وسائل اور صنعتی تجربوں اور ابتدائی کاموں کے شروع کرنے کی اہلیت کے اعتبار سے اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس لئے ان کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ قومی تنظیمی کمیشن اور ان کے متعلقہ شعبوں کی معرفت اپنے کام کرائیں۔

جہاں تک عام منظم معاشی ترقی کے لئے مالی ذرایع اور وسائل کے فراہم کرنے کا تعلق ہے صوبہ اور مرکز کی حکومتوں کے اعتبار سے پوری طرح فائدہ اٹھانا چاہیئے اور ملک کی ساہوکارے اور بیمہ کے اداروں کے روپیہ لگانے کی پالیسی میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرنا چاہیں جن سے صنعتی تنظیم کو ترقی دی جا سکے۔

منظم معیشت کی مکمل اسکیم کا بنانا ایک بہت بڑا کام ہے جس کے لئے مکمل معلومات، اعداد و شمار اور فنی ماہروں، صنعتی تاجروں، منتظموں اور عام پبلک کے اشتراک عمل کی ضرورت ہے اس اسکیم کو ترقی پذیر ہونا چاہیئے۔ بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کرتے رہنا چاہیئے اور عملی کارروائی کے دوران میں جو تجربے حاصل ہوں ان سے برابر فائدہ اٹھاتے رہنا چاہیئے یہ ظاہر ہے کہ ہماری موجودہ قومی تنظیمی کمیٹی اس طرح کی مکمل اسکیم کے بنانے سے قاصر ہے اور نہ وہ اس منزل پر اس قسم کا کوئی ارادہ رکھتی ہے۔ اس وقت جس کام کے کرنے کا ارادہ ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ منظم معیشت کی ایک ایسی بنیاد رکھ دی جائے جس پر آئندہ عمارت تعمیر کی جا سکے لیکن اس منزل پر بھی پوری تصویر کے خاکہ کو ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ بعد میں جب موقع ملے اور وسائل بہم ہو جائیں تو اس تصویر کو مکمل کیا جا سکے۔ ہندوستان دنیا کے ان چند ملکوں میں سے ایک ہے جن کے حدود کے اندر ایک منظم نظام کی تعمیر کے تقریباً پورے وسائل

موجود ہیں۔

اس لئے کمیٹی کا ارادہ ہے کہ جو اعداد و شمار موجود ہیں یا جو آسانی سے حاصل کئے جا سکتے ہیں ان کی مدد سے تصویر کا ایک عام خاکہ تیار کرے۔ امید یہ ہے کہ آئندہ سال کے شروع میں ایک ابتدائی رپورٹ پیش کی جا سکے گی۔ جسے تنظیم کی دوسری منزلوں کی بنیاد بنایا جا سکے گا۔

قومی تنظیم کی اسکیم کا ایک خاکہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ضمیمہ (الف) قومی معاشی تنظیم کی اسکیم کا خاکہ

(۱) زمین کی تنظیم

زمین کی زرخیزی کا تحفظ۔ جنگلوں میں نئے درختوں کا لگانا اور گھاس کی زمینوں کا انتظام۔ آبادی، غذا اور فصلوں کی تنظیم۔ صوبہ کے درمیان نقل سکونت اور دوبارہ بستی بسانا۔ مویشیوں کی ترقی، مقامی نسلوں کی ترقی اور معاشی حیثیت سے غیر فائدہ بخش نسلوں کا ختم کر دینا۔

(۲) پانی کی تنظیم

سیلاب کی نگرانی اور دریاؤں کا انتظام۔ نہروں کا بنانا اور آبپاشی کی ترقی۔ ملک کے اندر دریائی سفر کی ترقی۔ سمندری اور اندرون ملک کے ماہی گیری کے مرکزوں کی ترقی۔ خشک دریاؤں اور آبی راہوں کو دوبارہ ترقی دینا۔

(۳) قومی وسائل کی تنظیم

قوت محرکہ اور ایندھن کی ترقی (جس میں آبی بجلی کی ترقی اور کوئلہ یا دوسرے قسم کے ایندھن کو صنعتی قوت محرکہ یا متحدہ صنعتوں کے لئے ترقی دینا بھی شامل ہے)۔ ہر قسم کے کچے مال کو (جس میں جنگل کی پیداوار یں بھی شامل ہیں) دریافت کرنا اور ان سے فائدہ اٹھانا۔ معدنی وسائل سے فائدہ اٹھانا۔

(۴) مزدوروں کی تنظیم

مزدوروں کے لئے ضوابط اور قانون سازی۔ مزدوروں کی تنظیم۔ تندرستی، بیماری اور بے

روزگاری کا بیمہ، مکانوں کی فراہمی اور جماعتی بہبود کی کوششیں۔

(۵) زرعتی تنظیم

بیجوں، کھادوں، اوزاروں اور کھیتی کرنے کے طریقوں میں اصلاح۔ کھیتی میں امداد باہمی اور اگر ضرورت ہو تو ان کی اشتمالی اصول پر تنظیم دیہات کے نقل و حمل اور طریقہ خرید و فروخت میں جس کے ساتھ دیہی اعتبار بھی منسلک ہے اصلاح۔ قرض میں کمی کرنا اور زرعی ساہوکارے کی نگرانی زمین کے معاملہ اور ترکہ کے قوانین پر نظر ثانی۔ زراعت سے متعلق خانگی صنعتیں اور ضمنی پیشے۔

(۶) صنعتی تنظیم

کلیدی اور بنیادی صنعتوں کی ترقی (کیمیادی، معدنی اور دھات سازی کی صنعتیں، مشینیں مشین کے اوزار اور قوت محرکہ فراہم کرنے والے انجن)۔ ہلکی صنعتوں کی ترقی۔ زرعتی صنعتوں کی ترقی۔ بڑی منظم صنعتوں کو عقل کے مطابق تنظیم دینا تاکہ اندرونی مقابلہ کا تدارک ہو سکے اور بڑے پیمانہ اور چھوٹے پیمانہ اور دستکاری کی صنعتوں میں ہم آہنگی پیدا کی جا سکے۔ مختلف صوبوں کی صنعتی پالیسی میں کچے مال، کم ترین اجرتوں اور مزدوروں کے ملازم رکھنے کے معیاروں میں یکجہتی پیدا کرنا۔

(۷) تجارتی تنظیم

امتیازی تحفظ کی پالیسی پر عمل درآمد۔ زراعت کے خاص فائدہ کے لئے باہمی فائدہ کے معاہدے۔

(۸) اعتبار کی تنظیم

زر کی پالیسی میں تنظیم۔ مختلف اعتبار کی ایجنسیوں میں مرکزی نگرانی کے ماتحت ہم آہنگی اور یکجہتی۔ زراعت کے لئے طویل مدت کے اعتبار کی تنظیم۔ صنعتی بنک کاری کی ترقی۔

(۹) مالیات کی تنظیم

محصول کے بار کی ایسی نظر ثانی جس سے دیہی عوام کو فائدہ پہنچے۔ زمین کی معاملہ کی پالیسی پر نظر ثانی۔ دیہی جماعتی فلاح کے مختلف کاموں پر خرچ (اس میں اندرونی وسائل آمد و رفت، بہم رسانی

آب، صفائی اور دیہات کے لیے مکانوں فراہم کرنے کی اسکیم شامل ہے)

(۱۰) تعلیم کی تنظیم

زراعتی تعلیم اور پروپیگنڈا۔ مختلف درجوں کی فنی تعلیم جس میں کارکنوں کی تعلیم بھی شامل ہے
صنعت اور ترقی کے لئے تحقیقات علمی۔

ضمیمہ (ب)

مدافعتی صنعتوں، کلیدی صنعتوں اور پبلک فائدہ کی صنعتوں کی فہرست

مدافعتی صنعتیں

۱۔ آتشیں ہتھیار (زمین، ہوا اور سمندر کے) اور ان کے حصے

۲۔ گولہ بارود، کارتوس، آتشگیر سامان، شلیں، ٹارپیڈو وغیرہ

۳۔ ٹینک اور مسلح کاریں اور فوجی ضرورت کے لئے دوسرے مشین لگے ہوئے سامان

۴۔ ہر نمونہ کے جنگی جہاز جن میں آب دوز کشتیاں بھی شامل ہیں۔

۵۔ ہر قسم کے جنگی ہوائی جہاز

۶۔ جنگ کے لئے ہوائی گیسیں اور گیس کے نقاب

الونٹ: جنگی جہاز اور جنگی ہوائی جہاز امن کے زمانہ کے کارخانوں میں بھی بنائے جا سکتے ہیں

کلیدی صنعتیں

۱۔ قوت محرکہ آبی اور حرارت کی

۲۔ ایندھن، کوئلہ اور لکڑی کا ایندھن، معدنی تیل، قوت محرکہ کے لئے کام آنے والا الکوہل، قدرتی گیسیں۔

۳۔ دھاتیں لوہے اور غیر لوہے والی جس میں ان سے خام دھات حاصل کرنا بھی شامل ہے

۴۔ مشین کے اوزار بنانے والی صنعتیں

۵۔ مشین اور مشین کے حصے بنانے والی صنعتیں

۶۔ جہازوں، ریلوں، واگنوں، موٹروں، ہوائی جہازوں وغیرہ کی بنانے والی انجینیری کی وزنی صنعتیں

۷۔ اوزار اور آلات۔ تجارتی صنعتی، علمی

۸۔ کیمیادی، وزنی کیمیادی، باریک کیمیادی جس میں رنگ بھی شامل ہیں، زمین کو زرخیز کرنے

والے مسالے کی صنعتیں۔

پبلک فائدہ کی صنعتیں

۱۔ بجلی، گیس اور دوسرے قسم کی قوت کو تقسیم کرنے والی صنعتیں
۲۔ نقل و حمل اور رسل و رسائل کے سلسلہ میں پبلک کی خدمت کرنے والی صنعتیں
۳۔ بہم رسانی آب
۴۔ صفائی

بنک کاری اور بیمہ پر بعد میں غور کیا جائے گا۔

(نوٹ) اوپر جو فہرستیں درج کی گئی ہے یہ صرف عارضی ہیں ان میں آئندہ اضافہ اور تبدیلی ہوسکتی ہے۔

کیا حرفوں کے ذریعہ تمام مضامین پڑھائے جا سکتے ہیں؟

(از جناب سید احمد علی صاحب نگراں مدرسہ ابتدائی قرول باغ دہلی)

بنیادی قومی تعلیم کے استادوں کے مدرسوں میں اور ان ابتدائی مدرسوں میں جہاں بنیادی قومی تعلیم کے مطابق تعلیم ہو رہی ہے یہ سوال تمام پڑھانے والوں کے سامنے ہوتا ہے۔ اپنے اپنے طور پر استادوں نے اس کا حل بھی سوچا ہے لیکن انھیں ابھی شبہ ہے کہ جو طریقہ ان کی سمجھ میں آیا ہے وہ موثر اور نتیجہ خیز بھی ہے یا نہیں۔ ابتدائی مدرسہ کے چھوٹے چھوٹے بچوں میں تو ہمارا کام کسی نہ کسی طریقہ سے چل ہی جائے گا اور اگر کہیں مضامین کا براہ راست کسی حرفہ سے تعلق نہ بھی ہوگا تو کام میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہوگی لیکن استادوں کے مدرسوں میں جہاں اکثر خود سوچنے والے اساتذہ بھی ہوتے ہیں ہمارا اچھا لائحہ عمل ہی ان کی تشفی کر سکے گا۔

نئی تعلیم میں اپنا خرچ آپ برداشت کرنے کا سوال تو بہت بعد میں آئے گا۔ اس کے لئے تو ابھی سے پریشان ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں معلوم ہوتی لیکن حرفوں کے ذریعہ تمام مضامین کی تعلیم کا سوال تو پہلے ہی دن سے ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس تعلیم کے نئے پن نے ملک کے قابل لوگوں کا رخ بنیادی قومی تعلیم کے استادوں کے مدرسوں کی طرف کر دیا ہے اور جو لوگ ان ٹریننگ اسکولوں کے ذمہ دار ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان مدرسوں میں آنے والے اساتذہ پہلے ہی دن سے اس چیز کے معلوم کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں کہ ان کو وہ باتیں معلوم ہو جائیں جن سے وہ حرفہ سے مضامین کے مربوط کر کے پڑھانے کی طریقوں سے واقف ہو سکیں۔ لہذا یہ سوال اپنی جگہ پہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

بنیادی قومی تعلیم کی دو ہی خوبیاں ملک کے لوگوں کو بہت بھائی ہیں ایک تو اس کا اپنا خرچ آپ برداشت کرنا دوسرے بچے کی مکمل تعلیم حرفہ کے ذریعہ ہونا۔ ملک کے قابل سے قابل لوگوں نے

اس کی ان دونوں خوبیوں کو اب تک سراہا ہے اور جن مدرسوں میں بنیادی قومی تعلیم کا نصاب پڑھایا جا رہا ہے وہاں روزانہ اس بات کے دیکھنے کے لئے لوگ آتے رہتے ہیں اور ہمارے کام سے زیادہ ہماری گفتگو سے تشفی پاتے ہیں لیکن اس بات کا عرصہ تک جاری رہنا خود اس اسکیم کے لئے بہت مضر ہے۔ اس اسکیم کا جو کچھ خاکہ ہمارے ذہنوں میں ہے اور جس کو ہم ان مہانوں کے سامنے پیش کر کے ان کی تشفی کرتے ہیں اس کو اب عملی جامہ پہنانا چاہیئے۔ اس سے ایک طرف تو ہم ان مدرسین کی تشفی کر سکیں گے اور دوسری طرف اس اسکیم کے بھی خواہوں کی بات رکھ سکیں گے۔

ہم نے اپنے مدرسہ میں حرفوں کے ذریعہ تمام مضامین کی پڑھائی کا تجربہ کیا اس دوران میں اس کے نئے نئے طریقوں پر غور کرنے اور آزمانے کا برابر موقعہ ملتا رہا۔ ان مواقع کو میں نے اپنی رپورٹ "گتے کے کام سے مضامین کا ربط" میں درج کر کے شائع کر دیا ہے اور ہم نے جن اصولوں کو پیش نظر رکھ کر تجربہ کیا ہے وہ بھی "بنیادی قومی تعلیم میں ربط سے کیا مراد ہے؟" کے عنوان سے رسالہ جامعہ میں شائع ہو چکا ہے۔ میرے خیال میں ان اساتذہ کو جو بچوں کے ساتھ اس قسم کے تجربہ میں جگہ بہ جگہ لگے ہوئے ہیں اپنے تجربوں کو قلم بند کر کے رسالوں اور اخباروں میں شائع کرتے رہنا چاہیئے۔ اس میں پس و پیش نہ کرنا چاہیئے۔ اگر تجربوں میں غلطی ہوگی تو ہم اس سے بھی سیکھیں گے۔ اگر ہمارے پہلے تجربہ کا نتیجہ غلط ہوگا تو ہم دوسرا بہتر طریقہ سوچ کر اختیار کریں گے اور اس غور و فکر سے بہتر راستہ نکال سکیں گے۔ نئے کام میں پہلے پہل اچھے نتائج دیکھنے میں نہیں آتے لیکن وہ ہمیں ایسے طریقوں کے سوچنے میں ضرور مدد دیتے ہیں جن سے اچھے نتائج مرتب ہو سکتے ہیں یہی وجہ تھی کہ ایک سال کے اندر کارڈ بورڈ کو بطور حرفہ قرار دے کر مربوط پڑھائی کا جو کچھ تجربہ ہم نے کیا اس کو ہم نے کتابی شکل میں شائع کر دیا بغیر اس پس و پیش کے کہ یہ غلط ہے یا صحیح نئے کام میں جب تک کوئی کیا ہوا تجربہ ہمارے سامنے نہ ہو ہم اس کے حسن و قبح پر کس طرح غور کر سکتے ہیں؟ اگر کارڈ بورڈ کے کام پر کئی تجربے ہمارے سامنے ہوں تو ہم مربوط پڑھائی کے بہترین طریقے پیش کر سکتے ہیں پھر بھی ہم اس تجربہ کے بعد ایک ایسا خاکہ پیش کرتے ہیں جو لوگوں کے لئے تھوڑی ترمیم کے بعد مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے۔

کارڈ بورڈ کے کام میں کارڈ بورڈ سے ماڈل بنانا اصل دھندا تھا لیکن اس بڑے کام میں کئی ایک چھوٹے چھوٹے بامقصد کام کرنے پڑے، جن کا کرنا اس بڑے کام کے ضمن میں ضروری تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے عملی کام اس بڑے کام کے کرانے میں خود بخود پیدا ہوتے ہیں کبھی ارادی طور پر کبھی غیر ارادی طور پر اور کبھی بچوں کے سوالات کرنے کے دوران میں مثلاً

(۱) بازار جا کر کارڈ بورڈ سے ماڈل بنانے کے لئے سامان خریدنا۔

(۲) کاغذ اور کارڈ بورڈ بنانے کے کارخانے دیکھنا

(۳) لیئی پکانا

(۴) شہر کی ان دوکانوں کا مشاہدہ کرنا جہاں کارڈ بورڈ سے لوگ مختلف چیزیں بناتے ہیں

(۵) تیل اور لیئی کی ایری بنانا

(۶) ہاتھ سے کاغذ بنتے ہوئے دیکھنا

(۷) خود ہاتھ سے کاغذ تیار کرنا

(۸) شہر کے لوگ کارڈ بورڈ سے جو چیزیں تیار کرتے ہیں وہ کس کس کام میں استعمال ہوتی ہیں؟

(۹) جو ماڈل بچے بناتے ہیں وہ کس کس کام میں استعمال ہوتے ہیں

(۱۰) چیزوں کے بیچنے کا انتظام کرنا۔

(۱۱) کارڈ بورڈ کے کام میں جو اوزار اور چیزیں استعمال ہوئی ہیں ان کو کن کن لوگوں نے تیار کر کے ہماری ضرورت کے لئے مہیا کیا ہے؟

(۱۲) کارڈ بورڈ اور کاغذ جن چیزوں سے بنتا ہے ان کی پیداوار کا مشاہدہ کرنا

یہ چند ان کاموں کی فہرست ہے جن میں بچوں کو عملاً کچھ کرنا پڑتا ہے لیکن اس قسم کے عملی کاموں کے علاوہ چند مسائل بھی کام کرنے کے دوران میں بچوں کے سامنے آتے ہیں مثلاً

(۱) کاغذ سب سے پہلے کہاں کہاں بننا شروع ہوا؟ کس طرح شروع ہوا؟

(۲) دوسرے ملکوں میں کس طرح کن کن لوگوں کے ذریعہ پھیلا۔ اس کی ترقی میں کن ممالک

کے حکمرانوں اور لوگوں نے مدد کی ؟

(۳) کاغذ کی ایجاد سے دوسری کون کون سی چیزیں ایجاد ہوئیں ؟

(۴) کاغذ یا کارڈ بورڈ کن کن چیزوں سے بنتا ہے ؟ وہ چیزیں ملک کے کس کس حصہ میں پیدا ہوتی ہیں ؟ اس کے لئے کس قسم کی آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے ؟ آب و ہوا کا اثر انسان پر کیا ہوتا ہے ؟

(۵) کس کس قسم کا کاغذ ہندوستان کے باہر سے آتا ہے اور کن ممالک سے ؟ ہندوستانی کارڈ بورڈ کے علاوہ باہر سے کہاں کہاں سے کارڈ بورڈ آتا ہے ؟

(۶) ایک جگہ سے دوسری جگہ چیزیں کیسے جاتی ہیں ؟

(۷) ہم کن کن چیزوں میں کاغذ استعمال کرتے ہیں ؟

عملی کاموں اور بامقصد مسئلوں کے چند ہی عنوانات میں نے لکھے ہیں لیکن کام کرانے کے دوران میں کام کی وسعت اس قدر ہو جاتی ہے کہ اس میں زیادہ عملی کاموں اور بامقصد مسئلوں کے پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ میں نے چند باتیں اس لئے لکھی ہیں تاکہ میں ربط کے امکانات کو مضامین کے عنوانات کے تحت ظاہر کر سکوں یہ وہ SITUATIONS مواقع ہیں جہاں مضامین کے مربوط کرنے کا امکان صاف طور پر نظر آتا ہے اور یہی مواقع ہمارے لئے مربوط پڑھائی کا راستہ کھول سکتے ہیں۔ کام کرانے والوں کو دستی کام میں اس قسم کے مواقع کی تلاش خاص طور پر کرنی چاہیئے پھر یہ بات خود سمجھ میں آنے لگے گی کہ ان مواقع پر زبان، حساب، سماج کے علم اور جنرل سائنس کے کون کون سے اسباق بچوں کو پڑھائے جائیں !

آیئے پہلے عملی کاموں کی فہرست سے شروع کریں اور دیکھیں کہ ان کاموں کے کرانے میں کن کن مضامین کے پیش کرنے کا موقع ملتا ہے۔

(۱) بازار جاکر کارڈ بورڈ سے ماڈل بنانے کے لئے سامان خریدنا

طریقہ کار : اس سامان میں مختلف کاغذ رنگین اور سادے کارڈ بورڈ، چاقو، قینچی، گنیا، فٹ رول

پنسل، چمڑا، کپڑا وغیرہ چیزیں شامل ہوں گی۔ سامان کی خریداری میں لازمی طور پر کئی دکانوں پر چیزیں دیکھنا اور بھاؤ معلوم کرنا چاہیے۔ زندگی میں چیزوں کی خریداری میں جو صورتیں پڑتی جاتی ہیں اس کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ بچوں کو زندگی کے لئے صحیح طور پر تیار کریں تو ہمیں ان کے لئے اس قسم کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہیے۔ بچوں کے لئے خود سامان مہیا کر دینے سے بچوں میں RESOURCEFULNESS نہیں پیدا ہو سکتی۔ اگر بچے خود جا کر اپنے کام کے مطابق چیزیں خریدیں گے تو وہ اس چیز کی عملی تعلیم حاصل کریں گے کہ چیزوں کے اصل نرخ کیا ہیں اور کون سی چیز کس بازار میں دستیاب ہوتی ہے؟ جغرافیہ کی موجودہ تعلیم دنیا کی بڑی بڑی منڈیوں سے تو ہمیں واقف کرا دیتی ہے لیکن ہمیں خود اپنے شہر کی منڈیوں کا علم بالکل نہیں ہوتا۔

استاد کے لئے ساری جماعت کا لے جانا مناسب نہ ہوگا بلکہ بچوں کی اس بارے میں رہنمائی کی جائے کہ وہ اپنی جماعت سے چند طلبا کو منتخب کریں جو جا کر کئی دکانوں پر چیزیں دیکھیں اور نرخ معلوم کر کے اپنی رپورٹ مرتب کر کے جماعت کے سامنے پیش کریں۔ رپورٹ کا خاکہ بھی خود بچوں کو استاد کی رہنمائی میں جماعت میں طے کرنا چاہیے۔ مثلاً چیزوں کی کتنی اقسام ہیں۔ مختلف اقسام میں کون کون سے فرق نمایاں ہیں؟ کس طرح بکتی ہیں (من کے حساب، یا پونڈ کے حساب، یا رم کے حساب یا فی عدد وغیرہ) کیا کیا نرخ ہیں؟ کہاں کہاں سے آتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ چیزوں کی فہرست طویل ہوگی اس لئے کئی کمیٹیاں بنانی چاہئیں۔ اگر دکانوں پر تمام باتیں نہ معلوم ہو سکیں تو کتابوں سے معلوم کرنا چاہیے (اس انداز پر کتابیں ابھی نہیں لکھی گئی ہیں) ورنہ استاد اپنی معلومات سے بچوں کو رپورٹ مرتب کرنے میں مدد دے۔ (اس طرح کام کرانے سے جو ذہنی اثرات مرتب ہوں گے ان کا تذکرہ کسی دوسرے مضمون میں کروں گا)

اگر استاد دیکھے کہ کسی چیز کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا کام بہت زیادہ ہوگا تو اس کو چاہئے کہ وہ اس کے لئے ایک بڑی کمیٹی کے بنانے کی طرف بچوں کی رہنمائی کرے۔ اس بڑی کمیٹی کی کئی چھوٹی چھوٹی کمیٹیاں بنائی جائیں۔ مثلاً کاغذ اور کارڈ بورڈ کے متعلق دریافت کرنے کا کام یقیناً بہت

زیادہ ہوگا۔ مختلف رنگ مختلف قسم اور مختلف سائز کے کاغذات مختلف ممالک سے آتے ہیں سادے فل اسکیپ کاغذ ۶ پونڈ سے ۱۶ پونڈ تک ہوتے ہیں، لائن دار کاغذ ۶ پونڈ سے ۱۴ پونڈ تک ہوتے ہیں۔ اسی طرح کارڈ بورڈ ہندوستان کے علاوہ جاپان اور ہالینڈ سے بھی منگایا جاتا ہے۔ کاغذ اور کارڈ بورڈ کے کئی کارخانے ہندوستان میں بھی ہیں۔

اگر ان باتوں کو مضامین اور اسباق کے تحت تقسیم کر کے دیکھا جائے تو ذیل کی باتیں صاف طور پر بتلائی جا سکتی ہیں

زبان | مختلف دوکان داروں کے نام کمیٹیوں کا خط لکھنا کہ وہ انھیں اپنی دوکان پر آنے اور چیزوں کی متعلق معلومات حاصل کرنے کی اجازت دیں (تمام طلبا خط لکھیں جو اچھا ہو وہ بھیجا جائے۔ ایک خط کمیٹی کے فائل میں رہے) دکانیں دیکھنے کے بعد شکریہ کا خط لکھنا۔ خط لکھنے کے متعلق کوئی مضمون پڑھنا جس سے یہ معلوم ہو کہ خطوط کن باتوں کے متعلق لکھے جاتے ہیں اور ان کے لکھنے کا کیا کیا ڈھنگ ہوتا ہے نمونہ کے خطوط جماعت میں پڑھ کر سنانا۔ نمونہ کے خطوط جماعت میں لکھ کر آویزاں کرنا۔ خطوط کا کوئی معیار طے کرنا۔ کمیٹیوں کا رپورٹ مرتب کرنے کے لیے" جماعت کی رائے اور استاد کے مشورہ سے خاکہ تیار کرنا۔ کمیٹیوں کا اپنی اپنی رپورٹیں جماعت کے سامنے پیش کرنا۔ اگر کوئی بات رہ گئی ہو تو استاد کے مشورہ سے اس کو شامل کرنا یا ایسی باتوں کو صحیح کر کے لکھنا جو غلط معلوم ہوتی ہوں۔ رپورٹوں کے مرتب کرنے کے دوران میں ان چیزوں کے متعلق کتابوں رسالوں اور اخباروں سے بھی پڑھنا۔ رپورٹ کا اپنے قلمی رسالہ میں شایع کرنا

حساب | مختلف چیزوں کے نرخ کا چارٹ تیار کرنا۔ مثلاً جاپانی گتا کتنے من بکتا ہے؟ ہندوستانی اور ہالینڈ کا گتا کس حساب سے بکتا ہے؟ گرس، رم، کوڑی، کے پیمانے لکھ کر آویزاں کرنا۔ ہندوستانی تول اور انگریزی تول کے پیمانے لکھ کر جماعت میں لگانا۔ پیمائش کے پیمانہ لکھنا۔ ابتدائی جماعتوں میں جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم کے سادے اور مرکب قاعدوں کی مشق کے لئے چیزوں کی خریداری کے سلسلہ میں سوالات مرتب کرنا اور بڑی جماعتوں میں حساب تجارت اور اکائی کے طریقوں سے

قیمت کا پھیلانا۔

سماج کا علم | ہندوستان کے نقشہ پر ان شہروں کا درج کرنا جہاں کاغذ اور کارڈ بورڈ کے مِل ہیں ان شہروں کا درج کرنا جہاں چاقو اور قینچیاں تیار ہوتی ہیں۔ ان شہروں کا لکھنا جہاں ہاتھ سے کاغذ تیار کیا جاتا ہے۔ دنیا کے نقشہ پر ان ممالک کا درج کرنا جہاں سے ہندوستان میں کاغذ آتا ہے۔ ان ملکوں کی بابت کتابوں سے پڑھنا ذرایع آمد ورفت کے متعلق پڑھنا۔ رسل ورسائل کو طریقوں کا معلوم کرنا۔ ایک جگہ کے لوگ دوسری جگہ کے لوگوں کے لئے کیوں چیزیں تیار کرتے ہیں؟ ہندوستان میں ہندوستان کی ضروریات کے مطابق کاغذ کیوں نہیں تیار ہوتا؟

(۲)، کاغذ اور کارڈ بورڈ بنانے کے کارخانے دیکھنا

طریقہ کار | ہندوستان میں ابھی اتنے کارخانے قائم نہیں ہوئے ہیں کہ مدرسوں کو کہیں قریب ہی اس قسم کے کارخانوں کے دیکھنے کا موقعہ مل سکے۔ لیکن اگر کہیں قریب ہی اس قسم کا کوئی کارخانہ ہو تو جماعت کو آپس میں مشورہ کرکے طے کرنا چاہیئے کہ وہ کارخانوں میں جا کر کیا کیا دیکھنا چاہتے ہیں؟ تمام کارخانوں میں یہ دقت ہوتی ہے کہ بچوں کو کارخانہ دیکھنے کے لئے اندر نہیں جانے دیتے۔ ہر جگہ یہی جواب ملتا ہے کہ بچے اندر نہیں جا سکتے۔ غالباً بچے مشینوں کی دیکھ بھال میں بالکل محو ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ مشینوں سے بچ کر دیکھنے کا خیال جاتا رہتا ہے اور اس طرح حادثات ہو جاتے ہیں لیکن اگر استاد ذمہ داری لے تو غالباً اجازت مل جاتی ہے استاد کو تھوڑے تھوڑے لڑکوں کو کارخانہ میں لے جا کر چیزیں دکھلانا چاہیئے تاکہ بچے مشینوں سے بچ کر تمام باتوں کا مشاہدہ کر سکیں۔ کاغذ اور کارڈ بورڈ بننے کا پورا طریقہ اس طرح سمجھانا چاہیئے کہ بچے بعد کو اس کو قلم بند کر سکیں۔ پاور ہاؤس اور اس کے مال کا مشاہدہ خاص طور پر کرانا چاہیئے جس سے کاغذ یا گتا تیار ہوتا ہے کارخانوں میں مزدوروں کی زندگی کا مشاہدہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے تقسیم کار کی منظم مثال کی طرف بچوں کی توجہ خاص طور پر مبذول کرانی چاہیئے۔

زبان | کارخانہ دیکھنے کے لئے اجازت حاصل کرنا۔ اجازت حاصل کرنے کے لئے درخواست لکھنا

درخواست میں لکھنا کہ کیا کیا باتیں دیکھنا چاہتے ہیں اور کیوں ؟ کارخانہ دیکھنے کے بعد شکریہ کا خط لکھنا اور رپورٹ مرتب کرنا۔ رپورٹ کا رسالہ میں شائع کرنا۔ کارخانوں کے متعلق کتابوں سے پڑھنا۔ کارخانہ کی تاریخ کے متعلق پڑھنا۔ سفر کے حالات لکھ کر رسالہ میں شائع کرنا۔ ریل پر نظمیں پڑھنا

حساب | اگر سفر ریل کے ذریعہ کیا گیا ہو تو کرایہ خوراک تانگہ اور قلی وغیرہ کا حساب کرنا۔ مختلف درجوں کا کرایہ ریل معلوم کرنا۔ کرایہ فی میل۔ آمد و خرچ کا بجٹ بنانا۔ آمد و خرچ کا حساب رکھنا۔ آمد و خرچ کا حساب رسالہ میں شائع کرنا۔ اگر سفر لاری کے ذریعہ کیا گیا ہو تب بھی کرایہ خوراک اور رہائش کا حساب معلوم کرنا۔ کرایہ فی میل بذریعہ لاری معلوم کرنا۔ پٹرول کی قیمت فی گیلن معلوم کرنا۔ گیلن کا پیمانہ لکھ کر جماعت میں آویزاں کرنا۔ ایک گیلن پٹرول میں کار اور لاری کتنے کتنے میل جاتی ہیں؟ ٹائم ٹیبل دیکھنا سیکھنا ٹائم ٹیبل بنانا۔ ریل کی رفتار کے سوالات اکائی سے کرنا۔

سماج کا علم | پٹرول کہاں کہاں نکلتا ہے؟۔ دنیا میں کوئلہ کہاں کہاں نکالا جاتا ہے؟ انجن، موٹر اور بجلی کے ایجاد کرنے والے کون تھے؟ ان کے متعلق کتابوں سے پڑھنا۔ ریل، موٹر اور بجلی کی ایجاد سے دنیا کو کتنا فائدہ ہوا؟ مزدور گاؤں چھوڑ کر ملوں میں کام کرنے کیوں جاتے ہیں؟ کارخانہ دار اور مل کے مالک مزدوروں کے لئے کیا کیا کرتے ہیں؟ جو کچھ وہ کرتے ہیں کیا وہ کافی ہے؟ مزدوروں کی تحریکیں اور ان کے چلانے والے۔ کسانوں کی تحریکیں ان کے مقاصد اور چلانے والے ملوں اور کارخانوں میں حادثات کی روک تھام کس طرح کی جاتی ہے۔ مزدوروں کی تندرستی اور صحت کے لئے اور کیا کیا انتظامات ہیں؟ جن جن چیزوں سے کاغذ تیار ہوتا ہے وہ کہاں کہاں پیدا ہوتی ہیں؟ اس کارخانہ تک کیسے آتی ہیں؟ ذریعہ آمد و رفت۔ بیل گاڑی، ٹرالی، موٹر لاری، ریل وغیرہ

جنرل سائنس | بانس، گنا، گیہوں، روئی اور چاول کیسے پیدا کرتے ہیں۔ پودوں کی زندگی کے متعلق معلوم کرنا۔ بانس کے جنگل میں کون کون سے پرند جانور اور کیڑے پائے جاتے ہیں؟ بجلی اور گیسوں کے متعلق پڑھنا۔ بجلی کی طرح ہوا، پانی اور بھاپ میں بھی طاقت ہوتی ہے ان طاقتوں کو کیسے معلوم کیا گیا؟ معمولی حادثات علاج معالجہ کے لئے کیا کیا صورتیں اختیار کی جاتی ہیں؟

(۳) لیئی بنانا

طریقہ کار | بظاہر لیئی پکانا بہت معمولی سا کام ہے لیکن اس کو جب ہم پڑھائی کے نکتہ نظر سے دیکھتے ہیں تو اس میں کیمسٹری کے اصولوں کے مشاہدہ کا پورا موقعہ ملتا ہے۔ لیئی اچھی اسی وقت بن سکتی ہے جبکہ اس میں زیادہ سے زیادہ چپک ہو۔ ایسی لیئی چیزوں کے مناسب طریقہ سے ملانے سے ہی بن سکتی ہے پھر لیئی عرصہ تک صحیح حالت میں اس طرح رہے کہ اس کی وہ چپک بھی برقرار رہے اس کو اگر آپ کہیں رکھ دیں تو کوئی جانور یا پرندہ پکا ہوا آٹا سمجھ کر کھا نہ جائے۔ لیئی پکاتے وقت نیلا تھوتھا ملانا بچوں کے لئے یہ بہت دلچسپ تجربہ ہوگا اگر نیلا تھوتھا بنا کر دکھایا جائے۔

زبان | کسی ایسے قصے کا سنانا جس میں زہریلے سانپ نے کاٹا ہو اور مرے ہوئے آدمی کو کسی نے زندہ کیا ہو (جیسے منشی پریم چند جی کا افسانہ منتر) ایک آدمی کا قصہ جس نے بہت سے چوہوں کو آٹے میں گولی دے کر مار ڈالا۔ ایسے قصے جس میں کسی نے کسی کو زہر دیا ہو جیسے حضرت حسنؓ کا قصہ۔ یا سقراط حکیم کا قصہ جس کو زہر سے بھرا ہوا پیالہ پینے کے لئے دیا گیا تھا۔ بادشاہوں کے قصے جن کو زہر دیا گیا۔ زہر کی روک تھام کے لئے خاص قسم کے پیالہ کا مغلوں کے وقت میں بننا ایجاد ہونا۔

حساب | تھوڑی لیئی پکانے میں لکڑی یا کوئلہ میدہ اور نیلے تھوتھے کا خرچ زبانی سوالات کے ذریعہ معلوم کرنا۔ ہر چیز کی مقدار کا مقرر کرنا۔ تناسب اور فی صدی (یہ قاعدے جس جماعت کے نصاب میں ہوں وہاں پڑھائے جائیں)

سماج کا علم | سانپ کے کاٹے سے کتنے لوگ ہندوستان میں مرجاتے ہیں۔ سانپوں کی قسمیں بچھو کی قسمیں۔ زہر کیا ہے؟

جنرل سائنس | زہر کن کن چیزوں میں ہوتا ہے اس کا اثر کس طرح ہوتا ہے اور کس قسم کا ہوتا ہے؟ نیلا تھوتھا کس طرح بنتا ہے؟ کس اور زنگ کیسے پیدا ہوتے ہیں؟

(۴) شہر کی ان دکانوں کا مشاہدہ کرنا جہاں کارڈ بورڈ سے لوگ مختلف چیزیں تیار کرتے ہیں؟

طریقہ کار | بچوں کو کئی ایسے کارخانے دکھلانے چاہئیں جہاں لڑکے لڑکیاں مرد اور عورتیں کارڈ بورڈ

کے مختلف سایز کے بکس ان دکانداروں کے لیے تیار کرتے ہیں جو اپنی چیزوں کو ان بکسوں میں رکھ کر فروخت کرتے ہیں۔ بعض کارخانے ایسے ہوتے ہیں جو کارڈ بورڈ اور چمڑے کو ملا کر سوٹ کیس بناتے ہیں اور بعض کارخانے کارڈ بورڈ کی فینسی چیزیں تیار کرتے ہیں مثلاً زیورات کے ڈبے سگار دان اور گڑیوں کے ڈبے وغیرہ۔ اس مشاہدہ میں ان کے اوزاروں اور ان کے بنانے کے طریقوں کو اچھی طرح دکھلانا چاہیے کس وزن کا کارڈ بورڈ کس چیز کے بنانے میں استعمال کرتے ہیں؟ وہ اپنا سامان کہاں کہاں سے منگاتے ہیں؟ کتنی دیر کام کرتے ہیں؟ اپنے یہاں کام کرنے والوں کو کیا اجرت دیتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ باتیں پیش نظر رکھی جا سکتی ہیں۔

زبان | بچوں سے اس مشاہدہ کے بعد مضمون لکھوائے جائیں جو ان کے ماہواری یا پندرہ روزہ رسالہ میں شائع ہوں۔ ان چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں عموماً گندگی ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں بچوں کی تجویزیں لکھی جائیں اور ان تجویزوں کو عملی جامہ پہنانے کی جو صورتیں ہو سکتی ہیں ان پر غور کرایا جائے کارخانوں کی حفاظت اور نقصان سے بچانے کی تدبیروں پر غور کرنے کے لئے کہا جائے اور ان کی تجویزیں قلم بند کر کے شائع کی جائیں (یہ کام استاد کے مشورہ سے ہونا چاہیے تاکہ بچے بہترین تجویزیں سوچ سکیں اس سے سوشل اسٹڈیز کے نصاب میں پولیس اور مونسپلٹی کے بارے میں تبلانے میں آسانی ہوگی) اس کے متعلق پڑھنا کہ کونسی دستکاری بڑے پیمانہ پر ملوں کے ذریعہ ہو سکتی ہے اور کونسی چھوٹے پیمانہ پر گھروں میں کرائی جا سکتی ہے۔

حساب | بکسوں اور ڈبوں پر لاگت اور بکری کے سوالات چاروں مرکب قاعدوں تجارت اور اکائی کے ذریعہ بطور مشق کرانا۔ چونکہ مختلف سایز اور کوالٹی کے بکس اور ڈبے بنتے ہیں لہذا مختلف قیمتوں کے درسے درجن یا گرس کی قیمت معلوم کرائی جا سکتی ہے۔ کام کرنے والوں کی اجرت معلوم کرنا اور اس کا حساب زبانی سوالات میں نکالنا کہ وہ ایک ماہ میں یا ایک سال میں کتنا پیدا کر لیتے ہیں؟

سماج کا علم | لوگ اپنے بچوں کو کارخانوں میں کام کرنے کے لیے کیوں بھیجتے ہیں؟ ان کو تعلیم کے لئے کیوں نہیں بھیجتے؟ پولیس اور میونسپلٹی کارخانوں کی حفاظت اور صحت کے لیے کیا کرتی ہیں؟ اجارہ داری

کا کیا مطلب ہے؛ لوگ اپنی چیزیں رجسٹرڈ پیٹینٹ کیوں کراتے ہیں اس قسم کے کارخانوں کے قیام کے لیے کیا کیا شرائط ہیں؟

جنرل سائنس | ایک طرح سے بیٹھ کر متواتر کام اور دیر تک کام کرنے میں دوران خون پر کیا اثر پڑتا ہے دوران خون کے صحیح طریقہ پر انجام نہ پانے کی وجہ سے اعضا کی نشو و نما پر کیا اثر پڑتا ہے کم جگہ میں بہت سے لوگوں کے کام کرنے سے صحت پر کیا اثر پڑتا ہے؟

کمپنی کی تجارت ہندوستان میں

(از جناب منت اللہ رحمانی صاحب ایم۔ ایل۔ اے)

انگریزوں کے اقتدار سے پہلے ہندوستان کی صنعتیں بے نظیر شمار کی جاتی تھیں خصوصاً مسلمانوں کے زمانۂ حکومت میں تو ہندوستانی صنعتوں نے اس قدر ترقی کی اور ان کی برآمد اس قدر بڑھی کہ دوسرے ملکوں پر ہندوستان کا مال چھایا ہوا نظر آنے لگا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کے سوتی، اونی اور ریشمی کپڑے اور قالین، موتی، جواہر اور زیورات مرصع طلائی اور نقرئی سامان، خوشبوئیں، رنگ اور مسالے، چوبینہ کا کام، لوہے کا سامان، فولاد کے آلات اور ہتھیار، غرضکہ تمدن اور تمول کی اعلیٰ سے اعلیٰ ضروریات دور دور کے ممالک یہاں سے منگاتے تھے، اور چونکہ ہندوستان نے جہاز سازی اور جہاز رانی میں بھی بہت ترقی کر لی تھی، اس لئے یہ ساری چیزیں ہندوستان ہی کے بنے ہوئے جہازوں میں ہندوستانی جہاز راں کی زیر نگرانی جایا کرتی تھیں، اور انہیں مصنوعات کی خاطر یورپ والے ہندوستانی تجارت کے شیدائی تھے، اور اس کی راہ میں جان و مال لٹاتے تھے۔

سولھویں صدی سے یورپ کے تاجر بحری راستہ سے ہندوستان آنا شروع ہوئے اور سترھویں صدی کی ابتدا میں انگلستان کے تاجر ہندوستان پہنچے، اور سترھویں صدی کے وسط سے تجارت میں ترقی شروع ہوئی اور سترھویں صدی کے آخر میں اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ سوتی کپڑا ریشم اور ریشمی کپڑا، اون، متفرق مصنوعات، شورہ، نیل، مصالحے اور ادویات خاص کر انگلستان کو برآمد ہوتی تھیں۔ بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی معرفت ہندوستانی کپڑا انگلستان کے علاوہ آئرلینڈ، اسپین، فرانس، جرمنی اور تمام قرب و جوار کے یورپی ممالک میں پھیل گیا، اور ایسا مقبول ہوا کہ امیر و غریب سب ہی استعمال کرنے لگے، ہندوستانی کپڑا خوش وضع، خوش رنگ، پائدار اور بہت سستا تھا یوں تو وہ عام طور پر کالیکو کہلاتا تھا، لیکن چھینٹ، دریس، گنگم، ہمہم وغیرہ اس کی بہت سی قسمیں مشہور

تھیں تن پوشی سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ فیشن اور زیب و زینت کی ضروریات انھیں سے پوری ہوتی تھیں۔ انگلستان کے پارچہ باف ہندوستانی کپڑے کا مقابلہ کرنے سے بالکل عاجز تھے وہ زیادہ تر ادنیٰ کپڑا تیار کرتے تھے اور اس کے معاوضہ میں ہمسایہ ممالک سے کچھ سن کا کپڑا بھی منگاتے تھے جو لینن کہلاتا تھا۔ انھیں کپڑوں سے پہننے اوڑھنے کا کام چلتا تھا۔ ہندوستانی کپڑا اپنی خوبیوں کی بدولت اس قدر مقبول ہوا کہ پارچہ بافوں کا روزگار بالکل مارا گیا اور دوسرے ملکوں سے انگلستان میں سن کا کپڑا آنا بھی بند ہوگیا۔

جیمس اول کے زمانہ سے انگلستان میں ریشمی کپڑے کی صنعت پر بھی توجہ جاری تھی، پہلے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی نے فارس اور چین سے کچھ ریشم خام لا کر دیا تو انگلستان کے صناع بہت خوش ہوئے اور صنعت میں جان پڑ گئی، لیکن بنگال ریشم کا گھر ہے، وہاں ریشمی کپڑے کی صنعت درجہ کمال کو پہنچ گئی تھی، ایسٹ انڈیا کمپنی نے کارخانے قائم کرکے پارچہ بافوں سے ریشمی کپڑے تیار کرانا شروع کر دئے، بلکہ انگلستان سے کچھ پارچہ باف بلا کر ان کی مدد کے لئے رکھ دئے۔ طرح طرح کے لاجواب ریشمی کپڑے تیار ہونے لگے، مثلاً اطلس، کمخواب، ساٹن، تن زیب اور رومال وغیرہ اور سب کے سب پائدار اور ارزاں، جب یہ مال انگلستان پہنچا تو لوگ دیکھ کر دنگ ہوگئے اور بے ساختہ بول اٹھے کہ دنیا میں اس سے بہتر کپڑا ملنا محال ہے، اول تو سوتی کپڑے کی بنوٹ کچھ کم نہ تھی، ریشمی کپڑے نے اور بھی دلوں کو موہ لیا، اس کے علاوہ متفرق مصنوعات میں مندرجہ ذیل سامان ہندوستان سے تیار ہو کر انگلستان جایا کرتے تھے اور وہاں بہت مقبول ہوتے تھے۔ ریشمی رومال۔ باناتی ہیٹ یعنی انگریزی وضع کی ٹوپیاں، سلے سلائے کپڑے، خوشنما دستی پنکھے، چینی کے برتن، تانبے پیتل کے منقش برتن اور صندوقچے، چوبینہ کے سامان، میز کرسی وغیرہ جو نقاشی اور رنگ سازی کا اعلیٰ نمونہ ہوتے تھے، کھلونے اور تصویریں، ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی فہرستوں میں یہ سامان بکثرت درج ہیں کہ فلاں فلاں جہاز میں اس اس قدر سامان ہندوستان سے انگلستان پہنچا۔

ہندوستان سے جو سامان خام برآمد ہوتا تھا، اہمیت کے لحاظ سے اس میں شورہ سب سے مقدم نظر آتا ہے، اس کے بعد نیل، لاک مصالحہ اور ادویات کی برآمد تھی۔

'شورہ' بارود کی جان ہے اور ہر سلطنت کو بارود کی جس قدر ضرورت ہے، وہ محتاج بیان نہیں، اس کی پیداوار عام نہیں شورہ دنیا کے خاص خاص حصوں میں ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے صوبۂ بہار میں شورہ قدرتی طور پر افراط سے پیدا ہوتا ہے، ایسٹ انڈیا کمپنی حکومت انگلستان کے واسطے ہندوستان سے شورہ لے جاتی تھی اور اس کی برآمد پر اس کو ناز تھا۔

جس طرح شورہ بارود کی جان ہے، اس زمانہ میں نیل رنگ سازی کی جان تھی، اور اس کی جگہ پر بہت مانگ تھی، خوش قسمتی سے نیل بھی ہندوستان میں بکثرت پیدا ہوتا تھا اور کمپنی اس کی برآمد بھی خوب کرتی تھی، جب تک یورپ اور خاص کر جرمنی میں نئے نئے رنگ نہیں ایجاد ہوئے، ہندوستان میں نیل کا کاروبار خوب چلتا رہا، اور بیسویں صدی کے وسط سے نیل کا کاروبار پھیکا پڑ گیا۔

'لاک' بھی ہندوستان کے جنگلوں کی خاص پیداوار ہے، قدیم زمانہ میں اس سے اعلیٰ قسم کی رنگین وارنش تیار ہوتی تھی جس سے لکڑی کی مصنوعات پر نہایت خوشنما نقش و نگار بنتے تھے اور یہ ہندوستان کی خاص صنعت تھی، سترھویں صدی تک اس کی مانگ بڑی اچھی تھی، اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے واسطہ سے اس کی برآمد جاری تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان سے کچھ ادویات کی جڑی بوٹی بھی برآمد کرتی تھی۔ افیون بھی لے جاتی تھی۔ کافی۔ جو کوہ نیلگری پر پیدا ہوتی ہے، اس کا بھی استعمال انگلستان میں شروع ہوگیا تھا اور وہ بھی برآمد کی فہرست میں نظر آتی ہے۔ بعد کو انگلستان میں چائے کا شوق بھی پیدا ہوگیا اور وہ بھی ہندوستان سے برآمد ہونے لگی۔

سترھویں صدی کے آخر تک ان تمام چیزوں کی برآمد بہت بڑھ گئی اور خصوصیت سے انگلستان، ہندوستانی مال کی فروخت کے لیے منڈی بن گیا، اور اس کے مقابلہ میں انگلستان

کی معدودے چند صنعتوں میں اونی کپڑا قومی صنعت مانا جاتا تھا۔ لیکن اس میں کوئی خوبی نہ تھی، گراں بہت تھا اور ہندوستان میں تو اسے کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے انتہائی کوشش کی کہ انگریزی اونی کپڑا برآمد ہو۔ کمپنی نے بہت ہاتھ پیر مارے۔ فارس میں تو کچھ ضرور فروخت ہوا لیکن ہندوستان میں تو کسی نے ہاتھ بھی نہ لگایا۔ پارلیمنٹ نے ۱۶۹۳ء کے منشور میں کمپنی کے ساتھ یہ شرط لگا دی کہ وہ کم از کم ایک لاکھ پونڈ قیمتی اونی کپڑا ہر سال انگلستان سے برآمد کرتی رہے۔ مجبوراً کمپنی کو منظور کرنا پڑا۔ لیکن وہ ہندوستان میں فروخت نہیں ہوتا تھا۔ کمپنی کے گماشتے یہاں سے بار بار لکھتے کہ کپڑا گودام میں پڑا ہوا ہے، دیمک لگ رہی ہے، کوئی نہیں خریدتا اور وہاں سے تاکید آتی کہ اونے پونے جس طرح بھی نکل سکے نکال دو، قیمت کی کچھ پروا نہ کرو ہم بھی کیا کریں مجبور ہیں، جو کچھ نقصان ہوگا دوسری مدوں سے پورا کر دیں گے چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے ایک مراسلہ مورخہ ۳ جنوری ۱۶۹۴ء میں لکھا ہے کہ :۔

> "ہم کو نیا منشور ملا ہے، اس کے مطابق ہم پہلے سے زیادہ اونی کپڑا فروخت کرنے پر مجبور ہیں، اور اس کی جو مقدار رکھی گئی ہے، اس کا فروخت ہونا کسی طرح ممکن نہیں، اس میں سے کچھ تو فارس بھیج دیا جاتا ہے اور وہاں اس کی کچھ مانگ بھی ہے، اور بقیہ ہندوستان چلا جاتا ہے وہاں بمشکل تھوڑا سا فروخت ہوتا ہے، باقی کو خواہ ہم مفت تقسیم کر دیں، یا گودام میں پڑا رہنے دیں حتیٰ کہ دیمک اور کیڑے جن سے ہم کو سخت نقصان پہنچتا رہا ہے، اس کو چٹ کر لیں۔"

بہر حال ہندوستانی مصنوعات خاص کر کپڑے کو جب انگلستان میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کا رواج بڑھا، تو انگلستان میں بے کاری پھیلنے لگی اور سخت برہمی پیدا ہونے لگی، اور انگلستان کے صناعوں نے مختلف طریقہ پر حکومت کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرنا شروع کئے، اور پارلیمنٹ میں بے شمار محضر اور درخواستیں پیش ہوئیں جن میں سے چند ذیل میں درج کی جاتی ہیں :۔

(۱) درخواست گذار پھول دار اور ریشمی کپڑا تیار کرتے ہیں اور اون اور ریشم ملا کر بھی کپڑا بنتے ہیں

اور یہی ذریعہ معاش ہے لیکن جب سے ہندوستان کا ریشمی اور سوتی کپڑا آیا اور اس کا رواج بڑھا یہاں کا کاروبار بالکل مارا گیا، اگر ہندوستانی کپڑا نہ روکا گیا تو یہ صنعت یہاں بالکل تباہ ہو جائے گی۔

(۲) اس علاقہ میں ریشمی اور ریشم اور اون ملا ہوا کپڑا بنایا جاتا ہے اور لوگوں کا یہی عام پیشہ ہے کچھ دنوں پہلے خوب فراغت سے زندگی بسر ہو رہی تھی، لیکن چند دنوں سے کاروبار بہت گر گیا اور لوگ بے کاری سے پریشان ہیں، استدعا یہ ہے کہ ہندوستانی کپڑے کی تجارت روک کر ملکی صنعت کو پناہ دی جائے۔

(۳) پارچہ بافی اور اس سے متعلق دوسری صنعتیں ہم لوگوں کا خاص پیشہ تھا اور انھیں پر معاش کا مدار تھا۔ لیکن اب وہ سب صنعتیں غائب ہو رہی ہیں، اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان سے ریشمی اور سوتی کپڑا آرہا ہے نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ پہلے دوسروں کی امداد کرتے تھے آج وہ خود بے کار اور محتاج ہیں۔ لہٰذا درخواست دینے والوں کی استدعا ہے کہ ہندوستانی کپڑا روکا جائے۔

(۴) عرضی گذار ایک بڑی جماعت ہیں، ایک زمانہ سے ان کو قانونی طور پر حقوق حاصل ہیں ایسٹ انڈیا کمپنی نے حال میں ہندوستان میں بہت سی باناتی ٹوپیاں (ہیٹ) بنوا کر منگائی ہیں اگر ان کی درآمد نہ روکی گئی تو یہ صنعت یہاں تباہ ہو جائے گی، اس لئے کہ ہندوستان میں ہر قسم کی ارزانی ہے، اور مال بہت سستا تیار ہوتا ہے۔

(۵) ہندوستانی لوگ ہمارے ریشمی کپڑے کی صنعت پہلے ہی ہضم کر چکے ہیں، پنکھوں کی صنعت بھی انھوں نے قبضہ میں کر لی ہے اور ہمارے چوبینہ کے کام کو بھی دبا لیا ہے۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے وہ یہاں کی صنعتوں کو برباد کر دیں گے، معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دنوں میں ہندوستان پیرس کا جانشین بن کر ہم پر فیشن عاید کرے گا ہم کو تو فرانس ہی کے وضع دار کپڑوں کا آنا سخت ناگوار تھا، اب ہندوستان سے خوب وضع دار لباس تیار ہو کر بکثرت آرہا ہے اور ہمارے درزیوں کا روزگار تباہ ہو رہا ہے۔

غرض اس قسم کی بے شمار شکایتیں اور درخواستیں پیش کی گئیں، اور یورپ کے صناعوں نے مل کر ہندوستانی مال کے خلاف خوب خوب پروپیگنڈا کیا، اور ساتھ ہی ساتھ سودیشی کی تحریک بھی پوری قوت سے چلائی گئی، وہی سودیشی کے استعمال کی تحریک جب ہندوستان میں چلائی جاتی ہے تو انگریز اس کو کوتاہ نظری سے تعبیر کرتے ہیں، اور حکومت اس پر سزائیں دیتی ہے، جیل بھیجتی ہے اور ہر ممکن طریقہ پر اس کے دبانے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن جب خود انگلستان کی صنعت خطرہ میں تھی، تو اس حربہ کو پوری قوت سے استعمال کیا گیا۔ سودیشی کی تائید و حمایت میں نظمیں لکھی گئیں مضامین میں شائع کیے گئے، اور رسالے چھاپے گئے اور ان میں ہندوستانی مال کے مقاطعہ پر زور دیا گیا اور انگلستان ہی کا بنا ہوا مال پہننے اور استعمال کرنے کی ترغیب دی گئی۔ انگلستان کی عورتیں خصوصاً فیشن کی بہت زیادہ دلدادہ ہوتی ہیں، اور وہی ہندوستانی مال کی زیادہ قدر کیا کرتی تھیں۔ اس لیے عورتوں کے لیے خاص طریقہ پر رسالے شائع کیے گئے، جن میں ان سے ولایتی مال کے استعمال کی اپیل کی گئی، اور مختلف جذباتی اور نفسیاتی طریقہ پر ہندوستانی مال کے مقاطعہ پر زور دیا گیا تھا۔

ولایتی صنعتوں کی تباہی و بربادی کے علاوہ ایک سب سے بڑا غم انگلستان والوں کو یہ تھا کہ ہندوستانی مال کے بدلے میں انگلستان سے سونا اور چاندی ہندوستان بھیجا جاتا ہے، جس سے ایک ملک کی تباہی یقینی ہے، اور جس کو کوئی بھی اپنے ملک سے باہر نکالنا نہیں چاہتا چنانچہ اسی زمانہ میں ایک انگریز نے لکھا تھا کہ :-

> "یہ تجارت (ہندوستانی) بدترین قسم کی تجارت ہے، چاندی اور سونا جو کسی طرح بھی ہم کو علیحدہ نہ کرنا چاہیے، ہمارے ہاتھ سے نکل رہا ہے اور اس کے معاوضہ میں ہمارے یہاں ہندوستانی مصنوعات اور کھیل کھلونے آ رہے ہیں۔ جن کی ہم کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

غرض جب اس طرح یورپ والوں نے ہندوستانی مال کے خلاف اپنے ملک میں ہنگامہ کیا تو پھر حکومت کو اس کی طرف توجہ کرنی پڑی، اور کیوں نہ کرتی وہاں تو خود ملک والوں کی حکومت

تھی، وہاں ہندوستان کی طرح دوسروں کی حکومت تو تھی نہیں کہ ہندوستانی مریں یا زندہ رہیں، حکومت کو اپنے نفع سے مطلب ہے، ہندوستان کی صنعت تباہ ہو یا محفوظ رہے، حکومت کو اس سے کیا غرض! بہرحال انگلستان کی حکومت نے اپنے ملکی بھائیوں کی چیخ و پکار اور ولایت کی صنعت کے تحفظ و بقا کی طرف توجہ کی، اور پارلیمنٹ میں بھی اس پر بحث شروع ہو گئی، چنانچہ پارلیمنٹ کے ایک ممبر کرنل بریچ COL. BREECH تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

"ہندوستان کی جس چیز نے ہم کو سب سے زیادہ تباہ کیا وہ "کالیکو" یعنی سوتی کپڑا ہے کہ اس نے ہمارے اونی کپڑے کو بالکل نکما کر دیا، کیا افسوس ہے کہ ہندوستانی تو دولت لوٹ رہے ہیں، اور عیسائی تباہ ہو رہے ہیں۔"

ایک اور "صاحب" اس طرح فرماتے ہیں کہ:۔

"انگلستان کے پارچہ بافوں کو ہندوستانی پارچہ بافوں کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے، اس لئے کہ اول تو ہندوستان میں مال بہت ارزاں ہے، دوسرے وہاں کے پارچہ باف ایک آنہ روز پر گذر کر سکتے ہیں۔ اگر یہی لیل و نہار ہیں تو یہ خیال کرتے ہوئے دل دھڑکتا ہے کہ آخر اس تجارت کا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہندوستان کے لوگ مالا مال ہو جائیں گے، اور ہم غربت اور افلاس میں گرفتار ہوں گے۔"

ایک تیسرے "صاحب" نے ہندوستانی تجارت پر اس طرح اظہار خیال فرمایا کہ:۔

"ہندوستانی تجارت کی روک تھام ضروری ہے، کیونکہ نہ صرف پارچہ بافی بلکہ انگلستان کی بہت سی صنعتیں ہندوستانی مال کی درآمد سے خطرے میں پڑ گئی ہیں، ہندوستانی مصنوعات نہ صرف انگلستان میں انگریزی مصنوعات کی جگہ استعمال ہوتی ہیں، بلکہ دوسرے ممالک میں بھی جہاں جہاں ہماری مصنوعات جایا کرتی تھیں، وہ ان کی جانشین بن گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کچھ بندوبست نہ کیا گیا تو ہماری صنعتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ انگریزی مصنوعات کو نہ کوئی گھر ہاتھ لگائے گا نہ باہر۔"

مسٹر پالکسفن MR. PALKISFAN نے اپنی تقریر میں کہا کہ :-

"ہندوستان سے جو کپڑا آتا ہے، وہ نہ صرف ہمارے یہاں اونی کپڑے کی بجائے استعمال ہوتا ہے بلکہ وہ دوسرے ملکوں میں پہنچ کر وہاں بھی ہمارے اونی کپڑے کی جگہ لے لیتا ہے اور ان ملکوں کے کپڑوں کو بھی ہمارے یہاں آنے سے روکتا ہے جو ہم پہلے اپنی مصنوعات کے معاوضہ میں منگایا کرتے تھے۔ غرضکہ ہندوستانی کپڑے نے ہمارے اونی کپڑے کا کام تمام کر دیا اور اپنے مقابل دوسرے ملکوں کے کپڑے کی درآمد بھی انگلستان میں روک دی۔"

ریشمی کپڑے کے متعلق مسٹر شیلڈن MR. SHIELDEN نے پارلیمنٹ میں اپنا یہ بیان دیا کہ :-

"انگلستان میں جو ریشمی کپڑا فرانس اور اٹلی سے درآمد ہوتا تھا۔ وہ بالکل بند ہو گیا، اس لئے کہ بنگال کا ریشمی کپڑا اس سے نصف قیمت پر آتا ہے، اور اس سے بہتر ہوتا ہے۔"

حاصل یہ کہ جب ہندوستان کی مصنوعات نے یورپ اور خصوصاً انگلستان کے بازاروں پر قبضہ کر لیا، اور انگلستان کی صنعتیں دم توڑنے لگیں تو انگلستان کے صناع اور وہاں کے باثر لوگوں نے خوب ہنگامے کئے۔ سودیشی کی تحریک چلائی، حکومت سے ہندوستانی مال کو قطعاً بند کر دینے اور اس کے استعمال کو جرم قرار دینے کا مطالبہ کیا، اور چونکہ زیادہ تر ہندوستانی مال ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کے ذریعہ آیا کرتا تھا۔ اس لئے انگلستان میں عام طریقہ پر کمپنی کی مخالفت شروع ہو گئی اور ناراضگی پھیل گئی، یہاں تک کہ ایک روز پارچہ بافوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفتروں پر حملہ کر دیا اور قریب تھا کہ غصہ میں اس کا سارا خزانہ لوٹ لیں۔ حکومت پر اتنا دباؤ دیا گیا کہ ایک دفعہ کپڑا بننے والوں کی عورتوں نے پارلیمنٹ کی عمارت پر ہلہ بول دیا اور اس کو گھیر لیا، تاکہ اگر کوئی ممبر ہندوستانی مال پر بندش کی مخالفت کرے تو وہ اس کی اچھی طرح مرمت کریں۔ اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے حامیوں نے آزاد تجارت کے فوائد بہت سمجھائے اور بڑی کوشش کی کہ ہندوستانی تجارت کا وہی پہلا سا سلسلہ جاری رہنے دیا جائے لیکن ایک

نہ چلی اور آخر ش ۱۷۰۰ء میں انگلستان کی پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کرہی دیا جس کی رو سے ہندوستانی کپڑے کی درآمد بند کر دی گئی اور ہندوستانی کپڑے کا استعمال جرم قرار دیا گیا۔ ایک عرصہ تک یہ قانون جاری رہا اور جب ہندوستان کی صنعت ختم ہو گئی تو انگلستان میں ہندوستانی پارچہ کی درآمد کی اجازت دے دی گئی، لیکن اس پر اتنا زبردست محصول لگایا گیا کہ وہ فروخت نہ ہو سکے۔

جس وقت انگلستان میں ہندوستانی مال کے متعلق امتناعی قانون پاس نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تک ایسٹ انڈیا کمپنی کا یہی مسلک اور طریقہ رہا کہ ہندوستانی مصنوعات کی تجارت پھیلے اور دوسرے ملکوں میں اس کے بازار پیدا ہوں، کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے اندر جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے، مختلف جائز اور ناجائز طریقوں سے صنعت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس لئے ہندوستانی تجارت کی ترقی سے سراسر کمپنی کا فائدہ تھا لیکن جب ۱۷۰۰ء میں امتناعی قانون انگلستان کی پارلیمنٹ میں پاس ہو گیا تو پھر ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی اپنا طریقہ بدل لیا یعنی ہندوستان سے مصنوعات برآمد کرنے کے بجائے خام سامان لے جانے کی کوشش شروع کر دی اور ہندوستان میں ولایتی مال کے رواج دینے کی تدبیریں اختیار کیں اور اسی روپے سے جو کمپنی ظالمانہ طریقوں سے ہندوستان سے لے گئی تھی انگلستان میں مختلف قسم کی صنعتوں اور گوناگوں ایجادات کا سلسلہ شروع کیا گیا۔

حاصل یہ کہ اٹھارھویں صدی کا زمانہ ہندوستان کی تجارتی اور صنعتی تاریخ میں ایک افسوسناک انقلاب کا زمانہ ہے، جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کی صنعت و تجارت کو ختم کر دیا اور ہندوستان سے کچے مال کی برآمد شروع کی اور ولایتی مصنوعات کو ہندوستان میں رائج کرنا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں بعد سارا ہندوستان ولایتی کپڑوں میں لپٹا ہوا نظر آنے لگا۔ ہر قسم کی چھوٹی بڑی ضروری اور غیر ضروری مصنوعات یورپ سے آنے لگیں یہاں تک کہ ہندوستان سوئی اور تاگے میں بھی انگلستان کا محتاج بن بیٹھا۔

فلسفۂ نراج

کیا نراج (انارکزم) اور دہشت انگریزی ہم معنی ہیں

(از جناب عبدالعزیز صاحب فاروقی بی اے ایبٹ آباد صوبہ سرحد)

جہالت بھی دنیا میں عجب کرشمے دکھاتی ہے لیکن جہالت اور لاعلمی کے طفیل سے بڑا نقصان اس چیز کو پہنچتا ہے جس کے متعلق ہمارا علم محدود ہو۔ بہت سی اچھی چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق آپ دل میں غلط نظریے قائم کیے اور طرح طرح کی بدگمانیاں لیے بیٹھے ہوں گے۔ لیکن اگر آپ اپنے اس رویہ کی وجوہات پر غور کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ کسی چیز شخص۔ اصول یا خیال کے خلاف آپ کی حقارت اور بدظنی کی حقیقی وجہ ناکافی معلومات — خواہ اسے کم علمی کہیے یا جہالت — کا ہونا ہی مثال کے طور پر ازمنہ وسطیٰ کے یورپ کو لیجیے۔ ان دنوں وہاں کے اچھے اچھے علما اور فضلا اسلام اور مسلمانوں کو ایک ہوا خیال کرتے تھے۔ اور بانئ اسلام کو (نعوذ باللہ) بت پرست — مانا کہ اس میں مخالف پروپیگنڈا کا بھی کچھ حصہ تھا۔ لیکن پراپیگنڈہ کا اثر بالعموم ناخواندہ اور جاہل عوام پر ہی ہوتا ہے۔ پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگ جنھیں حقایق کا علم ہوتا ہے۔ آسانی سے پراپیگنڈہ سے متاثر نہیں ہوتے۔ اس لیے اگر وہ بھی بعض مسائل میں غلط آرا رکھیں تو اس کی وجہ ان کی جہالت — عالمانہ جہالت یا جاہلانہ علمیت — ہی ہو سکتی ہے۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ جہالت کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان اس چیز کو پہنچتا ہے جس کے متعلق ہماری معلومات ناکافی اور غلط ہوں۔ اگر ہماری لاعلمیوں اور غلط فہمیوں کا پردہ ہٹ جائے تو بہت ممکن ہے کہ ہم بجائے اس چیز کو نفرت اور حقارت سے دیکھنے کے ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ یا کم از کم اس کی مخالفت ہی ترک کر دیں۔ موجودہ دور میں بہت سے مسائل اور

نظریات ایسے ہیں جو اس خاص قسم کی جہالت کی وجہ سے قبول عام نہیں حاصل کر سکے اور لوگوں میں
ان کے متعلق طرح طرح کی مضحکہ خیز اور بعید از حقیقت باتیں مشہور ہیں۔ ان ہی نظریات میں سے
ایک انارکزم یا نراج بھی ہے۔ انارکزم کا نام سنتے ہی آپ کے کان کھڑے ہو گئے ہوں گے اور
آپ نے اپنے ذہن میں ایک نیم پاگل۔ ضدی جیسے شخص کا تصور کر لیا ہو گا جس کا کام صرف یہ ہے
کہ ہر وقت لوگوں پر بم پھینکنے کی دھن میں رہے۔ طرح طرح کی بھیانک تشددانہ حرکات سے پبلک
میں دہشت پھیلائے اور اپنی انتہا پسند سیاسی آرا کو مجرمانہ حرکات کے جواز کے لئے نقاب کے
طور پہ استعمال کرے۔ آپ کو اپنی یہ رائے بالکل قدرتی اور صحیح نظر آتی ہوگی لیکن حقیقت سے یہ
ایسی ہی دور ہے جیسے ازمنہ وسطیٰ کے یورپی علمار کا اسلام کے متعلق نظریہ اس میں شک نہیں
کہ دنیا میں چند افراد ایسے بھی ہیں جو انارکزم کے معتقد ہوتے ہوئے بھی دہشت انگیز حرکات کے
حامی ہیں۔ لیکن حقیقی نراج (جسے بعض اوقات دہشت پسندی سے ممتاز بنانے کے لئے فلسفیانہ
انارکزم کا غیر ضروری اور بھدا نام دیا جاتا ہے) دوسروں کو دہشت انگیز حرکات سے ڈرانے دھمکانے
اور کسی فعل بر خلاف ضمیر مجبور کرنے کے قطعی خلاف ہے۔ اگر سچ پوچھیے تو بقول برٹرانڈ رسل صرف
بعض انارکسٹ ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگ مناسب حالات میں بم پھینکنا اور
جبر سے دوسروں سے اپنی بات منوانا روا جانتے ہیں۔ اس لئے جو نام کے انارکسٹ تشدد کے حامی ہیں
وہ گاندھی جی ایسے حامیان عدم تشدد کو چھوڑ کر سماج کے باقی طبقات سے کچھ بہت زیادہ مختلف
نہیں۔ اشتراکیوں کی طرح نراجی بھی جماعتی جنگ (جو مزدور طبقہ اور سرمایہ دار طبقہ کے باہمی مفاد کی تصادم
کی پیداوار ہے) کے قائل ہیں اس لئے اگر وہ بم استعمال کریں تو یہ بعینہٖ ایسے ہے جیسے حکومتیں دوران
جنگ میں بم اور دیگر آلاتِ ہلاکت استعمال کرتی ہیں۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ جہاں ایک انارکسٹ
ایک بم تیار کرتا ہے۔ وہاں حکومتیں لاکھوں بم توپیں اور بندوقیں بناتی ہیں اور جہاں وہ ایک آدمی
قتل کرتا ہے۔ وہاں حکومتوں کے استبداد اور جوع الارض کی وجہ سے لاکھوں انسانوں کا صفایا
ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں ہم انارکزم کے تصور کو بجا طور پر تشدد سے جدا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ تشدد

اور دہشت انگیزی نہ تو انارکزم کے لازمی اصولوں میں سے ہیں۔ اور نہ ہی محض انارکسٹوں کے لئے مخصوص!
اب یہ دیکھنا ہے کہ آخر انارکزم ہے کیا۔ انارکزم کے فلسفہ اور اس کی تعلیم کو سمجھنے کے لیے ہمیں
مروجہ فلسفۂ سیاسیات کی تہ تک جانا پڑتا ہے۔ آج سے کوئی نصف صدی پہلے کے بیشتر علمائے
سیاسیات (سر ہنری مین MAINE وغیرہ) نظریۂ جبر کے قائل تھے اور ریاست STATE کی ابتدا اور انقار
کی بنا مادی قوت کو قرار دیتے تھے۔ ان کے خیال میں جمہور کی نراجی اور خودسرانہ جبلت کو قابو میں
رکھنے اور امن وامان قائم کرنے کا واحد ذریعہ جبری قوت تھا۔ آج کل اس نظریہ کی صحت سے انکار
کیا جاتا ہے۔ جب بھی بڑے بڑے علمائے سیاست خواہ وہ پروفیسر لاسکی اور ہیر پروفیسر میک ایور
MACIVER کی طرح ریاست کے حلقہ اقتدار و اختیار کو جمہور کی مکمل آزادی برقرار رکھنے کے لئے محدود
کرنے کے قائل ہی کیوں نہ ہوں۔ کم از کم یہ تو مانتے ہیں کہ اگرچہ ریاست کی منتہائی بنا جمہور کی رضا
مندی ہے۔ اور اگرچہ قوتِ جبر ریاست کی روح اور اصل اصول نہیں لیکن اس کا امتیازی اور
لازمی نشان ضرور ہے۔ یہ نظریہ پرانے نظریہ سے اس حد تک مختلف ہے کہ اس کے مطابق
ہم قوانین کی پابندی اور حکومت کی اطاعت اس وجہ سے نہیں کرتے کہ ہمیں کسی سزا یا دباؤ کا خوف
ہوتا ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ ہماری ثقافتی روایات اور مجلسی جبلتیں INSTINCTS ہمیں قانون
شکنی سے روکتی اور آئین پسندی پر مجبور کرتی ہیں اور قانون کی بنا رضا پر ہے۔ جبر پر نہیں۔ لیکن یہ نیا
نظریہ بھی جبری طاقت کی ضرورت کا قائل ہے۔ اور بجائے یہ کہنے کے کہ چونکہ قانون جمہور کی مرضی سے
بنتے ہیں۔ اس لئے ان کے مفاد کے لئے کسی مادی طاقت اور قوت کی قطعاً ضرورت نہیں یہ
کہتا ہے کہ "قانون کی عمومیت کو ممکن العمل بنانے والی چیز رضا ہے۔ لیکن اس عمومیت کا اطلاق
قائم رکھنے کی گارنٹی طاقت ہے" (میک ایور)۔ آسان لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ
اگرچہ کسی قانون کی موجودگی اس امر کی دلیل ہے کہ جمہور کی اکثریت اس کے اصول سے متفق اور
اس کی پابندی کے لئے آمادہ ہے۔ لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو قانون پسندی کی
کم صلاحیت رکھنے یا کسی اور وجہ سے قانون کی پابندی سے گریز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو قانون کی پابندی پر مجبور کئے بغیر قانون کی عمومیت (سب لوگوں پر برابر اطلاق) میں فرق آتا ہے اور ان لوگوں کو قانون پسند بنانے کے لئے طاقت کا استعمال بعض دفعہ قانون کی عمومیت کو حقیقی معنوں میں قائم رکھنے کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ اس لئے موجودہ نظریہ کے مطابق ریاست کا امتیازی نشان جبری طاقت کی موجودگی ہے۔ اس نقطہ پر پہنچ کر انارکسٹ دوسرے علمائے سیاسیات سے جدا ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قانون کے نفاذ کے لئے (اگر وہ قانون سب کی مرضی سے بنا ہے) کسی طاقت اور جبر کے استعمال کی ضرورت نہیں۔ جب تمام لوگ ایک کام ہنسی خوشی سے اور مل جل کر سر انجام دے سکتے ہیں تو طاقت کا استعمال کہاں جائز ہے؟ انارکزم یا نراج جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ حکومت کا مخالف اور اس کی ضرورت کا منکر ہے۔ کیونکہ حکومت جمہور پر حاکمانہ اقتدار قائم رکھنے کے لئے استعمال کی جانے والی طاقت کا سرچشمہ اور منظہر ہے۔ اگر انارکزم کسی حکومت کو گوارا کر سکتا ہے تو وہ حکومت صرف آزاد حکومت ہی ہو سکتی ہے یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ آزاد حکومت کا نراجی تخیل اس کے عام معنی اور مفہوم سے جدا ہے۔ اور اس کے مطابق آزاد حکومت وہ نہیں جو بیرونی دباؤ اور خارجی رسوخ سے آزاد ہو۔ جیسا کہ تمام خودمختار ریاستیں SOVEREIGN STATES ہیں اور نہ ہی وہ حکومت ہر جس کی باگ ڈور بجائے ایک مختار مطلق بادشاہ یا آمر یا کسی محدود گروہ یا طبقہ کے ہاتھوں میں ہونے کے اکثریت کے ہاتھوں میں ہو۔ بلکہ وہ حکومت جو سب کی مرضی سے چلائی جائے۔ جس میں کوئی ایک گروہ کسی دوسرے گروہ پر کسی طرح کا مادی دباؤ نہ ڈال سکے جس میں اکثریت اقلیت کو اس کی مرضی کے خلاف کسی بات پر جبری ذرائع سے مجبور نہ کر سکے۔ جس میں ہر فرد کو ہر طرح کی مکمل آزادی ہو۔ منفی اور مثبت دونوں یعنی اسے کسی فعل پر خلاف مرضی مجبور نہ کیا جا سکے اور اپنی مرضی پر چلنے کی اجازت ہو۔ جب ہم اس نظریہ کا موازنہ مروجہ حالات سے کرتے ہیں۔ تو ہماری سمجھ میں یہ بات آ جاتی ہے کہ انارکسٹ کیوں پولیس اور تعزیری قوانین جیسے اداروں کی مخالفت کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ جمہور کے ایک طبقہ کی مرضی دوسروں پر جبراً ٹھونسی جاتی ہے اور یہ صورت صرف مطلق العنان

آمروں کی حکومتوں تک ہی محدود نہیں بلکہ جمہوری ممالک میں بھی موجود ہے۔ اس لیے جب تک جمہوریتوں میں بھی قانونی طاقت کے بل بوتے پر اقلیت کو اکثریت کا تابع فرمان بننے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ انارکسٹ جمہوری حکومت کو دوسری حکومتوں پر بہت زیادہ قابل ترجیح نہیں سمجھ سکتا۔ انارکسٹ کے مذہب میں سب سے اہم چیز آزادی ہے —— نوع انسان کے ہر فرد کے لیے مکمل اور مساوی آزادی۔ اس آزادی کے مفہوم کو جامۂ واقعیت پہنانے کے لیے انارکسٹ چاہتا ہے کہ جماعت یا اکثریت کو پاس افراد کو مجبور کرنے کے لیے جس قدر اختیارات ہیں۔ وہ سب موقوف کر دیے جائیں۔

اوپر کی تشریحات سے ظاہر ہے کہ انارکسٹ محض اکثریت کی حکومت نہیں چاہتا۔ بلکہ وہ حکومت چاہتا ہے جو سب کی مرضی کے مطابق چلائی جائے جس میں جماعتی نظام (پارٹی سسٹم) کا نام و نشان نہ ہو۔ اور سچ پوچھئے تو ان کی خواہش کچھ بے جا بھی نہیں۔ کیونکہ اکثریت کی حکومت آزادی کی ایسی ہی دشمن ہو سکتی ہے جیسے ایک مٹھی بھر آدمیوں کی۔ اکثریت کی حکومت کے اصول کو مروجہ سیاسی تخیل میں جو الہامی رنگ اور تقدس کا درجہ دیا جاتا ہے وہ سچ سے کوسوں دور ہے۔ ایک طاقتور جمہوری ریاست بڑی آسانی سے اپنے بہترین شہریوں پر بدترین مظالم ڈھا سکتی ہے —— ان شہریوں پر جو اپنی روشن خیالی اور آزادئ ضمیر کے باعث ارتقاء کا منبع و مخزن ہیں۔ تاریخ کے اوراق اس امر کے شاہد ہیں کہ جمہوری حکومتیں آزادی کی روح کچلنے میں دوسروں سے بہت پیچھے نہیں رہیں۔ خود انگلستان میں مسٹر بڑیڈلا اور مسز ابنی بیسنٹ پر مقدمات ٹریڈ یونین اور اشتمالی تحریکات سے بدظنی اور انکی طرح طرح کی آئینی و غیر آئینی قیود اکثریت کی دراز دستی کا واضح ثبوت ہیں۔ اس لیے انارکزم اگر اکثریت کی حکومت والے اصول کے خلاف علم بغاوت بلند کرے تو تعجب نہیں۔

جدید انارکزم کا بانی مشہور روسی مفکر باکونین —— کارل مارکس کا شدید ترین مخالف اور حریف —— تھا۔ لیکن نراجی فلسفہ بذات خود کوئی نئی چیز نہیں۔ بلکہ ایک قدیم عقیدہ ہے جس کے

نشانات ازمنۂ قدیم اور ازمنۂ وسطیٰ کے فلسفیوں اور مفکرین کے ہاں بھی ملتے ہیں۔ ایک لحاظ سے اشتراکیت اور نراج میں نمایاں مشابہت ہے۔ دونوں زمین اور اصل کی اجتماعی ملکیت کے حق میں ہیں اور اصل شاہی CAPITALISM کے خلاف۔ دونوں کا بنیادی نظریہ ایک ہی ہے یعنی سرمایہ کی انفرادی ملکیت بعض افراد یا جماعت کو باقی افراد یا جماعتوں پر ظلم اور جبر کرنے کی قوت دے دیتی ہے اور زیردستوں پر معاشی استبداد کا سرچشمہ ہے۔ راسخ العقیدہ سوشلسٹ کا خیال ہے کہ موجودہ اصل شاہی نظام کو ختم کر کے حکومت کو واحد سرمایہ دار بنا دینے سے افراد کو ہر طرح کی مساوات اور آزادی مل جائے گی، لیکن یہاں انارکسٹ سوشلسٹ سے اختلاف رکھتا ہے۔ اور ڈرتا ہے کہ اس صورت میں انفرادی سرمایہ دار کے تمام ظالمانہ اور جابرانہ خصائل حکومت میں پیدا ہو جائیں گے۔ اس لئے وہ اجتماعی ملکیت کے اصول کا تو حامی ہے۔ مگر ساتھ ہی حکومت کے اختیارات جس حد تک ہو سکے گھٹانا بلکہ حکومت کو ہی بالکلیہ اڑا دینا چاہتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سماجی نظام انارکزم کے تجویز کردہ اصولوں پر ڈھالا جائے تو آخر دنیا کا کام کہاں تک چلے گا؟ جب پیدا شدہ دولت میں ہر شخص کو حصہ لینے کا حق ہوگا لیکن کام کرنے پر کوئی مجبور نہ کیا جا سکے گا تو کیا لوگ کام کرنا چھوڑ دیں گے اور یہ پیدائش دولت میں کمی واقع ہونے کا اندیشہ ہوگا؟ انارکسٹ اس کا جواب دیتا ہے کہ معاشی نقطۂ نظر سے انارکزم کوئی خیالی پلاؤ اور ناقابل عمل سکیم نہیں۔ موجودہ نظام کے ماتحت پیدائش دولت کا عمل جن اصولوں پر جاری ہے وہ نہ صرف نامنصفانہ اور غیر موزوں ہیں اور مساوات انسانی کی جڑوں پر کلہاڑا چلاتے ہیں۔ بلکہ بہت بڑی تیفع ذرائع پر منتج ہوتے ہیں یعنی موجودہ ذرائع کے بہترین اور مناسب ترین استعمال سے جس قدر دولت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اتنی نہیں پیدا ہو رہی ہے اگر پیدائش دولت کا عمل صحیح اور سائنٹیفک اصولوں پر ایک معینہ ترتیب PLAN کے ماتحت کیا جائے تو تمام کام کم وقت میں اور خوشگوار طریقے سے سرانجام دیا جا سکتا ہے اور سب لوگ خوش حالی اور آرام کی

زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ انارکسٹ بجا طور پر کہتا ہے کہ اگر تہذیب اور ترقی کو ساوات کے پہلو بہ پہلو چلنا ہے تو اس کا منشا یہ نہ ہونا چاہیے کہ آبادی کی واضح اکثریت محض روح اور جسم کا تعلق قائم رکھنے کے لئے سارا وقت تکلیف دہ اور ناگوار مشقت میں گذار دے۔ فنون لطیفہ اور علوم کے پھلنے پھولنے اور بڑھنے کی اولین شرط یہ ہے کہ آبادی کی اکثریت کو اس قدر فراغت ہو کہ وہ ان میں دلچسپی سے دلچسپی لے سکے۔ جب لوگوں کو کام کاج کے دھندوں سے ہی فرصت نہ ملے گی تو فنون لطیفہ اور علوم میں کون دلچسپی لے گا۔ اور تہذیب و تمدن کے ارتقا کا عمل کیسے جاری رہ سکے گا؟

جو نظام انارکزم کا منتہائے نظر ہے۔ وہ ہر مروجہ یا مجوزہ نظام سے کہیں بہتر ہے۔ انارکزم کا فلسفہ شروع سے آخر تک انسانی ہمدردی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسی لئے اس کے عملی پروگرام کا پہلا جزو ہی موجود انسانیت کش اور ظالمانہ نظام اجرت کو منسوخ کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں انارکزم سوشلزم اور کمیونزم سے بھی دو قدم آگے ہے۔ مروجہ اصل شاہی نظام میں مزدور کو مطلوبہ کام کی معینہ مقدار پوری کرنے کے صلہ میں اجرت ملتی ہے۔ سوشلزم میں ہر وہ شخص اجرت پانے کا حق دار ہے جو کام کرنے پر رضامندی ظاہر کرے —— کام کی نوعیت یا مقدار کی قید نہیں۔ لیکن انارکزم میں کام کرنے پر رضامندی کی شرط بھی نہیں۔ ہر شخص کو کام کرنے نہ کرنے کی آزادی ہے۔ لیکن پیداشدہ دولت میں حصہ پانے کا ہر شخص حق دار ہے۔ ایسے نظام میں ہر شخص نکما رہنے کی نسبت کام کرنے کو ترجیح دے گا۔ لوگوں کے نکما رہنے اور کام سے گریز کرنے کی حقیقی وجہ یہ نہیں ہے کہ انھیں نکما رہنے کی کوئی خاص الفت اور کام کرنے سے نفرت ہے۔ ممکن ہے دنیا میں چند آدمی ایسے بھی ہوں جو فطری کاہل ہوں۔ لیکن تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ عام لوگ کسی نہ کسی شغل میں مصروف رہنا پسند کرتے ہیں مثلاً وہ دولت مند لوگ جنھیں وافر دولت کا مالک ہونے کے باعث محنت کرنے کی ضرورت نہیں مگر وہ پھر بھی بے کاری اور کاہلی سے بچنے کے لئے کوئی نہ کوئی اعزازی کام اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔) بلکہ یہ وجہ ہے کہ انھیں سلسلہ حیات قائم رکھنے کی ضرورت سے مجبور ہو کر نہایت ناخوش گوار اور تلخ حالات میں اور بعض اوقات اپنی صلاحیت سے بڑھ کر دس بارہ گھنٹے لگاتار روزانہ کام کرنا پڑتا ہے۔ جب کام کا مطلب حد سے زیادہ کام اور معاشی غلامی نہ ہوگا۔ بلکہ دن کے چند

محدود اور معینہ گھنٹوں کے دوران میں ایک خوش گوار مشغلہ جس میں ہر شخص اپنی اپنی مرضی کے مطابق اپنی فطری صلاحیتیں اور قوی بروئے کار لا سکے گا۔ تو اس وقت کوئی وجہ نہیں کہ کوئی کام سے جی چرائے۔ ایسی جماعت میں کوئی جبر نہیں کوئی طاقت برتنے والی حکومت نہیں۔ جماعتی قانون البتہ ضرور ہوں گے لیکن طاقت کے بل پر نہیں بلکہ سب لوگوں کی رضامندی سے نافذ ہوں گے اور کسی "خورد بینی" اقلیت کو بھی بجز اس کی مرضی کے خلاف نہ چلایا جا سکے گا۔

یہ سوال کہ ایسا نظام عملی دنیا میں کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے کسی آئندہ فرصت میں زیر بحث لایا جائے گا۔ ان چند صفحات کے لکھنے سے مدعا صرف یہ تھا کہ انارکزم کے متعلق تصویر کا دوسرا رخ بھی پیش کیا جائے۔ اور یہ بتایا جائے کہ انارکزم وہ ہوّا نہیں جو عام طور پر لوگوں کو ڈرانے کے لئے گھناؤنی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اوپر کی تشریحات سے ظاہر ہے کہ انارکزم کا کوئی اصول ایسا نہیں جو تشدد کے جواز کا حامی یا اس کے ارتکاب کی ترغیب دیتا ہو۔ برعکس اس کے انارکزم کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ کسی طرح دنیا سے جبر و تشدد کا خاتمہ کیا جاوے لیکن اگر بعض نیم دیوانے انارکسٹ کہلاتے ہوئے بھی تشدد کا ارتکاب کریں یا کوئی نام نہاد انار کسٹ اپنے لب و لہجہ میں درشتی کا اظہار کرے۔ تو اس سے انارکزم پر قیاس کرتے ہوئے سب انارکسٹوں کو دہشت انگیز اور تشدد پسند قرار دینا صریح ناانصافی اور حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔

ملکوں کی دولت مندی کا اندازہ کس طرح کیا جاتا ہے

بعض ملک ایسے ہیں جو دولت مند مشہور ہیں اور بعض ایسے ہیں جو غریب کہلاتے ہیں مثلاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو بہت دولت مند ملک سمجھا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس دولت مندی یا غریبی کا فیصلہ کس طرح کیا جاتا ہے۔ آئیے اس سوال کا جواب دینے کے لئے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے قدرتی وسائل اور مصنوعہ اشیاء کا مقابلہ دنیا کے باقی ملکوں سے کریں۔

پہلے "قدرتی وسائل" کی اصطلاح کی وضاحت کر دینا ضروری ہے۔ "قدرتی وسائل" میں دنیا کی زمین، اس کا لوہا، کوئلہ، معدنی تیل اور دیگر معدنیات، قدرتی گیسیں، پانی اور جنگلات شامل ہیں یعنی "قدرتی وسائل" میں وہ چیزیں شامل ہیں جو زمین کے اندر یا اس کے اوپر پائی جاتی ہیں اور جن کے پیدا کرنے میں انسان کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔

"مصنوعہ اشیاء" سے مراد اگر ایک طرف دنیا کی ریل پٹریاں، ٹیلیفون، ٹیلیگراف ہیں تو دوسری طرف روئی کا کپڑا اور اونی کپڑا، گیہوں اور دوسرے اناج اور کھیتوں میں پیدا کی ہوئی روئی ہے۔ اس میں وہ بھیڑیں بھی شامل ہیں جن سے کپڑے کے لئے اون حاصل کیا جاتا ہے اور وہ کاغذ بھی جس کا وجود ہماری موجودہ دنیا کے لئے نہایت ضروری ہو گیا ہے۔ پھر اس میں وہ ربڑ بھی شامل ہے جس پر دنیا کے لوگ اپنی موٹروں میں سوار ہو کر گھومتے پھرتے ہیں اور جو دنیا کی بہت سی ضروری اور عیش کی چیزوں کے بنانے میں کام آتا ہے۔ غرضکہ اسی قسم کی بے شمار دوسری چیزیں شامل ہیں جنھیں لوگ مصنوعہ شکل دیتے رہتے ہیں۔

ان اصطلاحوں کی وضاحت کے بعد اب سوال یہ ہے کہ قدرتی وسائل اور مصنوعہ اشیاء

کا کس قدر حصہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو ملا ہوا ہے؟ اس سوال کے جواب دینے سے ہی ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکیں گے کہ آیا ریاست ہائے متحدہ امریکہ ایک دولت مند ملک ہے یا نہیں ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے قبضہ میں دنیا کی زمین کا حصہ

سب سے پہلے اس سوال کو لیجیے کہ دنیا کی زمین کا کس قدر حصہ ریاست ہائے امریکہ کے قبضہ میں ہے؟ زمین کو دو سو سال سے زائد عرصہ تک امریکہ کی خاص دولت سمجھا جاتا رہا۔ اس برِاعظم میں آدمیوں کی تعداد کم تھی لیکن زمین کی بہت افراط تھی۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی کی پوری مدت میں جتنے مغرب کی طرف لوگ بڑھتے جاتے تھے انھیں زمین کے ایسے ٹکڑے ملتے جاتے تھے جن پر کسی کا قبضہ نہیں تھا جو شخص زمین لینا چاہتا تھا وہ بغیر کسی جھگڑے کے اپنی مرضی کے مطابق زمین کا انتخاب کر سکتا تھا۔

چنانچہ دو صدی سے زاید مدت تک یورپ کے مہاجرین شمالی امریکہ کے برِاعظم میں نوآبادیاں بساتے رہے۔ آج ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی وسعت مشرق سے مغرب تک تین ہزار میل اور شمال سے جنوب تک ایک ہزار میل ہے۔ اس کے ایک طرف بحر اوقیانوس ہے اور دوسری طرف بحر الکاہل۔ اس کے شمال میں کناڈا ہے اور جنوب میں میکسیکو۔ اس کا مجموعی رقبہ ۳۰ لاکھ ۲۶ ہزار ۷۸۹ مربع میل ہے۔ اس کے مقابلہ میں دنیا کی زمین کا مجموعی رقبہ ۵ کروڑ ۲۷ لاکھ ۵۵ ہزار دو سو ہے گویا دنیا کا ۱/۱۷ حصہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے قبضہ میں ہے۔ پھر یہ رقبہ صرف وسعت میں ہی زیادہ نہیں ہے بلکہ اس میں ہر طرح کی زمینیں شامل ہیں۔ اس میں جنگلات، میدان، پہاڑ، ریگستان، وادیاں اور ساحل سب کچھ شامل ہیں۔ اس کے حدود میں ایک بڑا مرکزی علاقہ ایسے میدانوں اور سر سبز زمینوں کا ہے جو گیہوں، مکا اور دوسری فصلوں کے پیدا کرنے کے لیے بہت موزوں ہے۔ دریائے مسیسی پی کے مغرب اور کوہ راکی کے مشرق میں زمین کا ایک ایسا وسیع ٹکڑا ہے جس میں لاکھوں مویشیوں کو چرایا جا سکتا ہے۔ مشرق اور مغرب کے پہاڑی اور کوہستانی علاقوں میں لاکھوں ایکڑ زمین پر جنگلات کھڑے ہوئے ہیں۔ کوہ اپالیچین مرکزی

میدان اور مغرب بعید کے بعض حصوں میں کوئلہ کی بڑی زرخیز کانیں موجود ہیں اور منے سوٹا میں خام لوہے کے قیمتی پہاڑ پائے جاتے ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دنیا کی آبادی کا کس قدر حصہ رہتا ہے

امریکہ کی دولت مندی کا خاص سبب یہ ہے کہ اس ملک میں زمین کے رقبہ کی کثرت ہے، لوہے اور کوئلہ کی قیمتی کانیں پائی جاتی ہیں، معدنی تیل کے کنوئیں موجود ہیں، آبشار ہیں اور بڑے بڑے جنگلات ہیں۔ لیکن یہ سب وسائل بیکار ہوتے اگر امریکہ میں آدمی موجود نہ ہوتے۔ زمین اسی وقت مفید ہوتی ہے جب اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح لوہا، کوئلہ، معدنی تیل بھی اسی وقت مفید ہوتے ہیں جب ان کو کانوں سے نکال کر استعمال کیا جاتا ہے اور یہی حال تمام دوسرے قدرتی وسائل کا بھی ہے۔ اسی لئے یہ کہا جاتا ہے کہ کسی قوم کی دولت کا اہم ترین حصہ اس کی آبادی ہوتی ہے۔ کیونکہ یہی آبادی قوم کے لئے سب کام انجام دیتی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بہت سے آدمی موجود ہیں اور ان کی تعداد اس قدر کافی ہے کہ وہ اس ملک کے کاموں کو اچھی طرح چلا سکتے ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دنیا کے لوہے کا کس قدر حصہ پیدا کیا جاتا ہے

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں چار کروڑ ۲۴ لاکھ ٹن لوہا سالانہ پیدا کیا جاتا ہے اور باقی تمام دنیا میں ۵ کروڑ ۴۴ لاکھ ٹن سالانہ۔ آج جو ملک لوہا پیدا کرسکتے ہیں وہی فولاد بھی بنا سکتے ہیں اور فولاد ہماری نئی تہذیب کی سب سے اہم پیداوار ہے۔ مہذب ملکوں کے لوگ ہر چہار طرف فولاد سے گھرے ہوئے رہتے ہیں۔ فولاد کے بغیر ریل گاڑیاں، موٹریں، واگن، موٹر لاری کوئی چیز بھی نہیں بنائی جاسکتی۔ فولاد کے بغیر شہر قائم نہیں رہ سکتے۔ فولاد اگر نہ ہوتا تو مہذب ملکوں کے وسیع مکانات، بڑے بڑے ہوٹل، تھیٹر اور سینما گھر، ہال اور ایلیویٹر (لفٹ)، وغیرہ کچھ بھی نہ بن سکتے۔ فیکٹریوں میں فولاد کے بڑے بڑے کرین ہوتے ہیں ریل گاڑیاں فولاد سے لدی ہوئی اور فولاد کی بنی ہوئی واگنوں کو فولاد کی پٹریوں پر کھینچتی ہیں۔ ہمارے پل فولاد کے بڑے زبردست شہتیروں سے بنائے جاتے ہیں۔ جہاز کی تعمیر میں بھی فولاد کی چادروں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ غرضکہ فولاد نئی تہذیب کے لئے بالکل ناگزیر ہوگیا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دنیا کی قوت محرکہ کا کس قدر حصہ پیدا کیا جاتا ہے

ان چیزوں کے بنانے کے لیے جن کے نام اوپر درج کیے گئے قوت محرکہ کی بڑی زبردست مقدار کی ضرورت پیش آتی ہے جب یہ چیزیں بن جاتی ہیں تو ان کو مفید بنانے کے لیے بھی قوت محرکہ کی ضرورت پیش آتی ہے اور ان ہزاروں ریل گاڑیوں کو چلانے کے لئے بھی جو مہذب ملکوں کے طول و عرض میں گردش کرتی رہتی ہیں قوت محرکہ کی بڑی زبردست مقداروں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۲ کروڑ ۶۰ لاکھ موٹریں پائی جاتی ہیں۔ ان سب کے چلانے کے لیے جس قدر قوت محرکہ کی ضرورت ہے اس کا اندازہ کیجیے۔ اسی طرح مہذب ملکوں کی بندرگاہوں میں بیسیوں جہاز داخل ہوتے رہتے ہیں جن میں سے ہر ایک کو ایسے انجن چلاتے ہیں جو قوت محرکہ کی بڑی مقداروں کو پیدا کرتے ہیں۔ بھاپ گیس اور پانی سے بجلی کی بڑی مقداریں ہمارے شہروں کو روشن کرنے اور ہمارے انجنوں اور مشینوں کے پہیوں کو گھمانے کے لیے پیدا کی جاتی ہیں۔ اس مشین کے عہد میں جو ملک بھی رہنمائی کی جگہ حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے پاس قوت محرکہ کو پیدا کرنے کے لیے ایندھن کی بڑی مقدار ہونا چاہیے۔

ہماری اس جدید تہذیب میں قوت محرکہ پیدا کرنے کے لیے کوئلہ اور معدنی تیل کو ایندھن کے طور پر جلایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تیز بہنے والے پانی سے بھی قوت محرکہ کے پیدا کرنے والے پہیوں کو گھمایا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اتنا کافی ایندھن پایا جاتا ہے جس سے قوم کے کام کو چلانے کے لیے کافی قوت محرکہ کو پیدا کیا جا سکے؟ ایسی صورت میں کہ دشمن امریکہ کی بندرگاہوں کا محاصرہ کرلیں اور بقیہ دنیا سے امریکہ کے لوگوں کو تجارت کرنے سے باز رکھیں تو کیا امریکہ کی ریلیں اور امریکہ کی فیکٹریاں بند ہو جائیں گی امریکہ کے بڑے بڑے کھیت ویران اور پرتی پڑے رہیں گے یا امریکہ کے لوگ اپنے ملک کی قوت محرکہ کی مدد سے اپنے تمام کام کو چلا سکیں گے۔ اعداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۶۰ کروڑ ۸۹ لاکھ ٹن کوئلہ سالانہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں باقی تمام دنیا میں ایک ارب

۰ کروڑ ۶۰ لاکھ ٹن کوئلہ پیدا کیا جاتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ایک ارب ۶۰ لاکھ کنستر معدنی تیل کے سالانہ پیدا کیا جاتے ہیں اس کے مقابلہ میں باقی تمام دنیا میں ۴۰ کروڑ ۳۰ لاکھ کنستر پیدا کیئے جاتے ہیں۔ امریکہ میں آبشار کی قوت سے بجلی کی قوت محرکہ ایک کروڑ ۸۰ لاکھ گھوڑوں کی قوت کے برابر پیدا کی جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں باقی تمام دنیا میں ۴ کروڑ گھوڑوں کی قوت کے برابر قوت محرکہ پیدا کی جاتی ہے۔ ان اعداد کے دیکھنے سے اس بات کا صرف ایک تصور قائم کیا جاسکتا ہے کہ امریکہ والے ہر سال کس قدر کوئلہ اور معدنی تیل پیدا کرتے ہیں اور آبشار کے ذریعے کتنی بجلی سالانہ بناتے ہیں لیکن ان اعداد سے اس بے شمار قوت محرکہ کا پتہ نہیں چلتا جسے امریکہ والے ہر سال استعمال کرتے ہیں۔ اس کا جواب دینے کے لئے اور بہت سی باتوں کے بیان کرنے کی ضرورت ہے جس کے لئے یہاں گنجایش نہیں ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ دنیا کے ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی کے کس قدر حصہ کا مالک ہے

یہ تو ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ ریاست ہائے امریکہ ایک بڑے رقبہ کا ملک ہے اس کے اندر دنیا کے فولاد، کوئلہ، معدنی تیل اور آبی قوت محرکہ کا ایک بڑا حصہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اس کی آبادی ۱۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ہے اور یہ اس کے وسیع علاقہ میں ہزاروں جماعتوں اور گروہوں کی شکل میں بکھری ہوئی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو رقبہ کی وسعت کے باوجود ایک متحدہ قوم بنائے رکھنے کے لئے ضرورت ہے کہ اسے ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی کے متعدد رشتوں سے باہم منسلک کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ ہمارے عہد کی فولاد اور قوت محرکہ کی تہذیب میں چیزوں اور خبروں کو تیزی کے ساتھ منتقل کرنے کے لئے بھی عمدہ ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی کی ضرورت ہے۔

گذشتہ سو سال میں امریکہ کے لوگوں نے ویران جنگلوں کو صاف کر کے فارم بنائے، کانیں کھودیں اور شہروں کو بنایا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی یعنی ریلوں، ٹیلیگرافوں اور ٹیلیفونوں کو بھی بہت ترقی دی۔ ڈاک خانوں، اخباروں اور رسالوں کا بھی ایک نہایت عمدہ نظام قائم کیا۔ چنانچہ امریکہ کے لوگوں کی دولت مندی میں ان چیزوں کا بڑا زبردست حصہ ہے

لیکن اس زمانے میں جب کہ امریکہ اپنی ریلوں اور اخبار کے چھاپہ خانوں کو ترقی دے رہا تھا انگلستان فرانس اور دوسرے ملک بھی اس کام کو کر رہے تھے۔ اس لئے اس بات کا پتہ چلانے کے لئے کہ ان میں سے کون زیادہ دولت مند ہے یہ ضروری ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ذرائع نقل وحمل اور خبر رسانی کا مقابلہ دنیا کے باقی دوسرے حصوں سے کیا جائے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ریل کی سڑکیں ۲ لاکھ ۶۲ ہزار میل تک پھیلی ہوئی ہیں۔ باقی تمام دنیا میں ریلوں کی لائن کی لمبائی ۵ لاکھ ۱۵ ہزار میل ہے۔ امریکہ میں دو کروڑ ۶۶ لاکھ موٹریں پائی جاتی ہیں باقی تمام دنیا میں موٹروں کی تعداد ۰۰ لاکھ ہے۔ امریکہ میں دنیا کے ۵ فی صدی رقبہ اور ۶ فی صدی آبادی کے مقابلہ میں ۵۹ فی صدی ٹیلیفون پائے جاتے ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ دنیا کے پہننے کے کپڑوں کے لئے کس قدر خام مال مہیا کرتا ہے؟

ہماری نئی تہذیب میں کپڑوں کو روئی، اون، ریشم اور چمڑے سے بنایا جاتا ہے۔ اگر روئی، اون یا ریشم کپڑوں، سوٹوں، قمیصوں بنیانوں، رومالوں اور موزوں کے بنانے کے لئے موجود نہ ہوتا تو ذرا سوچیے لوگ تن پوشی کا کیا انتظام کرتے امریکہ میں ۱۲ کروڑ ۰۰ لاکھ لوگوں کی پوشاک کا انتظام کرنا پڑتا ہے اس پوشاک کے بیشتر حصہ کو انھیں چیزوں سے بنانے کی ضرورت ہے۔ پھر چونکہ روئی اون اور ریشم سے زیادہ سستی ہوتی ہے اس لئے اس کی اہمیت ان خام مالوں میں سب سے زیادہ ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہر سال روئی کی ایک کروڑ ۰۴ لاکھ گانٹھیں پیدا کرتا ہے اس کے مقابلہ میں دنیا کے باقی حصوں میں ایک لاکھ ۰۲ ہزار گانٹھیں پیدا کی جاتی ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اناج کی پیداوار

مشینوں، فولاد اور قوت محرکہ کی وجہ سے بڑے بڑے شہر تو پیدا ہو گئے لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے لئے غذا حاصل کرنے کے واسطے امریکہ میں کیا انتظام کیا جاتا ہے؟ امریکہ کی تقریباً نصف آبادی شہروں میں رہتی ہے اور شہر کے لوگوں کو غذا پیدا کرنے کے کام سے بہت کم واسطہ ہوتا ہے لیکن ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں جہاں بڑے بڑے شہر پائے جاتے ہیں وہاں ساتھ ہی ساتھ اس ملک میں بڑی

بڑے فارم بھی موجود ہیں لیکن امریکہ کی آبادی کا صرف ایک چوتھائی حصہ کھیتوں پر فی الواقعی کام کرتا ہے۔ باقی لوگ اور دوسرے مختلف طریقوں پر کام کرتے رہتے ہیں یعنی مشینوں پر گوداموں میں چلتی ہوئی ریل گاڑیوں میں یا چیزوں کو خریدنے اور فروخت کرنے کے کام سے لگے ہوئے ہیں پھر اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ ہے کہ امریکہ کے کسان کھیتی کا کام ہاتھ سے نہیں کرتے بلکہ مشین کے ذریعہ سے کرتے ہیں وہ لکڑی کے ہلوں اور کھرپوں سے کام نہیں لیتے بلکہ ایسے ٹریکٹروں کے ذریعہ کام کرتے ہیں جو زیادہ کام کو تیزی کے ساتھ پورا کر سکتے ہیں۔ یہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ امریکہ میں دنیا کے رقبہ کا تقریباً ۵ فی صدی اور دنیا کی آبادی کا تقریباً ۶ فی صدی حصہ پایا جاتا ہے۔ دنیا کے مقابلہ میں غذا کی رسد کا تناسب ذیل کے اعداد سے لگایا جا سکتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۸۰ کروڑ ۷۰ لاکھ بوشل گیہوں پیدا ہوتا ہے اس کے مقابلہ میں باقی تمام دنیا میں ۳ ارب ۲۶ کروڑ بشل گیہوں پیدا ہوتا ہے۔ گویا امریکہ میں دنیا کے گیہوں کا ۲۵ فی صدی حصہ پیدا ہوتا ہے دوسرے قسم کے اناج کی پیداوار ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۳ ارب ۷۰ کروڑ بشل ہے اس کے مقابلہ میں تمام دنیا میں ۱۲ ارب بشل دوسری قسم کے اناج پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بھی دنیا کی رسد کا تقریباً ۲۵ فی صدی ہوتا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کس قدر کاغذ پیدا کیا جاتا ہے

موجودہ زمانے میں دنیا کاغذ کو جو اہمیت حاصل ہے وہ تشریح کی محتاج نہیں ہے۔ ہم اپنے مدرسوں کو کاغذ کے بغیر نہیں چلا سکتے ہمارے آباؤ اجداد کے زمانہ میں کاغذ کی رسد بہت کم تھی اور وہ اپنی تحریر کا کام تختیوں پر کیا کرتے تھے لیکن اب ہمارے اسکولوں میں کاغذ کا صرف بہت بڑھ گیا ہے۔ پھر سرکاری دفتروں اور بڑے بڑے شہروں میں بھی کاغذ کا استعمال بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ خرید و فروخت کے پوری کاروبار کا اندراج کاغذ پر کیا جاتا ہے۔ روزمرہ کی خبروں کو بھی اخباروں پر چھاپ کر شائع کیا جاتا ہے۔ مثلاً دنیا کے اخباروں کے لیے جو کاغذ تیار کیا جاتا ہے اگر اس کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۱۵ لاکھ ٹن اخبار کا کاغذ سالانہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اس کے

مقابلہ میں باقی تمام دنیا میں ۵۰ لاکھ ٹن اخبار کا کاغذ پیدا کیا جاتا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دنیا کی کس قدر لکڑی پیدا کی جاتی ہے

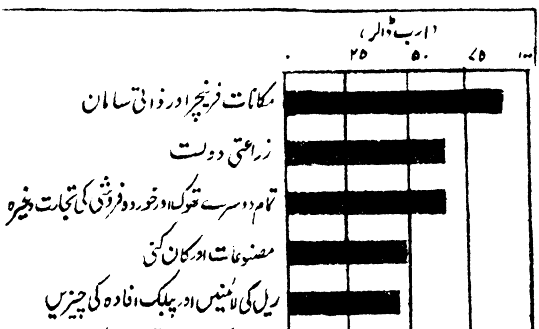
کاغذ مختلف چیزوں سے بنایا جاتا ہے مثلاً گودڑ، سبائی گھاس پھوس وغیرہ۔ لیکن ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے کاغذ کا بیشتر حصہ لکڑی سے بنایا جاتا ہے اور یہ لکڑی امریکہ کے جنگلات سے حاصل کی جاتی ہے۔ چنانچہ امریکہ کے لوگ جب کبھی اخبار پڑھتے ہیں تو گویا وہ اپنے جنگلات کی لکڑی کے ایک حصہ کو اپنے صرف میں لاتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ جس قدر لکڑی کاٹی جاتی ہے اس کے پورے حصہ سے کاغذ نہیں بنایا جاتا۔ لکڑی کے ایک بڑے حصہ سے عمارتیں، فرنیچر، ٹیلیفون اور ٹیلیگراف کے کھمبے، ریل کے سلیپر، جہاز اور بہت سی اور دوسری چیزیں بھی بنائی جاتی ہیں۔ حتےٰ کہ بعض قسم کے کپڑے بھی لکڑی سے بنائے جاتے ہیں مثلاً مصنوعی ریشم کی وہ قسم جسے ریے آن (RAYON) کہتے ہیں لکڑی سے ہی بنائی جاتی ہے اور ایک سو سال پہلے تو تمام وہ چیزیں جو اب فولاد سے بنائی جاتی ہیں لکڑی سے ہی بنائی جایا کرتی تھیں۔ گرم کرنے اور پکانے کے لئے بھی لکڑی کو ہی ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود لکڑی کا جس قدر صرف آج کل کیا جاتا ہے پرانے زمانہ میں اس کا اتنا صرف نہیں تھا۔ چنانچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں سالانہ ۲ ارب ۸۷ کروڑ ۸۰ لاکھ مکعب فٹ عمارتی لکڑی کاٹی جاتی ہے۔ دنیا کے باقی دوسرے حصوں میں ۲۲ ارب ۲۲ کروڑ ۸۰ لاکھ مکعب فٹ لکڑی کاٹی جاتی ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی دولت مندی کے اظہار کا ایک اور طریقہ۔ امریکہ کی ملکیت کا تخمینہ ڈالروں کی شکل میں

اوپر کے بیان سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی دولت مندی کا کچھ اندازہ تو ہو گیا۔ اس ملک میں زمین، کوئلہ، لوہا اور معدنی تیل کے قدرتی وسائل پائے جاتے ہیں اور مصنوعہ اشیاء میں یہ ریل کی لائنیں، ٹیلیفون، ٹیلیگراف، کاغذ، سوتی کپڑا، عمارتی لکڑی وغیرہ کثیر مقداروں میں پیدا کرتا ہے۔ اس کے قدرتی وسائل زیادہ ہیں اور ان سے وہ اشیاء کو مصنوعہ

شکل دینے کا کام خود ہی انجام دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا امریکہ کی دولت مندی کے تخمینہ کرنے کا کوئی اور دوسرا طریقہ بھی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں روپیہ آنے پائی کی شکل میں بھی امریکہ کی دولت مندی کا خاکہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ زمین اور دوسرے قدرتی وسائل، مصنوعہ چیزیں، فیکٹریاں، گودام، کانیں اور فارم، ریل کی پٹریاں، ٹیلیگراف اور ٹیلیفون، کاروبار کے لئے، حکومت کے کاموں کے لئے اور لوگوں کے رہنے کے لئے جو عمارتیں استعمال کی جاتی ہیں —— یہ سب دولت ہیں اور ان سب کو روپیہ آنہ پائی کی شکل میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ریاست ہائے امریکہ میں اس قسم کا تخمینہ سنہ ۱۸۵۰ء میں کیا گیا تھا جس سے ۷ ارب ۱۳ کروڑ ۶۰ لاکھ ڈالر کی دولت کے اعداد حاصل ہوئے تھے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں جب اسی قسم کا تخمینہ دوبارہ کیا گیا تو اس کا نتیجہ ۳ کھرب ۵۳ ارب ڈالر حاصل ہوا یعنی سنہ ۱۸۵۰ء کے مقابلہ میں سنہ ۱۹۲۲ء میں امریکہ کی دولت ۹۴ گنا زیادہ ہوگئی۔ ہندوستانی سکہ میں اس کی قیمت تقریباً ساڑھے نو کھرب روپیہ ہوتی ہے۔ حاشیہ کے نقشہ میں دکھایا گیا ہے کہ دولت کے اس تخمینہ کی میزان میں کون کون سی چیزیں کس تناسب کے ساتھ شامل ہیں۔ کھرب کی رقموں کا اندازہ کرنا ذرا مشکل ہے۔ جب امریکہ میں گذشتہ جنگ عظیم کے زمانہ میں حکومت کا بجٹ ایک ارب ڈالر سالانہ کا بنا تو لوگ حیرت زدہ ہوگئے ایک ارب ڈالر اس زمانہ میں اتنی بڑی رقم سمجھی جاتی



ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی دولت یعنی مکانات، فارم، گودام، فیکٹریاں، کانیں، ریل کی لائنیں، پبلک افادہ کی چیزیں اور سرکاری ملکیت

تھی کہ اس کا کوئی اندازہ بھی نہ کرسکتا تھا لیکن اب امریکہ کی قومی دولت میں سالانہ ۱۳ ارب ڈالر کا اضافہ ہو رہا ہے اور امریکہ کی حکومت تقریباً ۴ ارب ڈالر کا اپنا بجٹ بناتی ہے سنہ ۱۹۲۲ء میں جب کہ امریکہ کی دولت کا تخمینہ ۳ کھرب ۵۲ ارب ڈالر کیا گیا تھا اس وقت امریکہ کی آبادی ۱۱ کروڑ تھی۔ اس حساب سے امریکہ کی فی کس دولت کا حساب ۳ ہزار دو سو ڈالر یعنی تقریباً آٹھ ہزار ۸ سو روپیہ فی کس ہوتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اگر امریکہ کی مجموعی قومی آمدنی کو سب لوگوں میں برابر برابر تقسیم کیا جاتا تو ہر شخص کے حصہ میں جائداد اور پس انداز کیے ہوئے روپیہ کا حصہ ۸ ہزار ۸ سو روپیہ فی کس ہوتا اور چونکہ امریکہ کا اوسط خاندان باپ ماں اور دو تین اولاد پر مشتمل ہوتا ہے اس لیے امریکہ کے ہر خاندان کی اوسط دولت کا تخمینہ ۱۳ ہزار ڈالر یا تقریباً ۳۶ ہزار روپیہ کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں ۳۶ ہزار کی جائداد کے معنی ہیں ایک کوٹھی ضرورت کی تمام چیزیں اور کچھ تعیشات کی چیزیں۔ لیکن امریکہ میں اس سے ایک چھوٹا مکان، ضرورت کی تمام چیزیں اور تعیشات کی کچھ چیزیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

لیکن یہاں ایک غلط فہمی کو رفع کر دینا ضروری ہے۔ اوپر کے اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ امریکہ کی دولت واقعتہً مساوی طور پر آبادی کے درمیان تقسیم کر دی گئی ہے۔ اس دولت کا ایک بڑا حصہ ریل کی لائنوں، فیکٹری، کاروبار کی اونچی اونچی کوٹھیوں پر مشتمل ہے جن کی مالک انجمنیں اور کمپنیاں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دولت کا ۲/۳ حصہ یا تو حکومت کی ملکیت میں ہے یا ریل کی لائنوں، روشنی، گرمی اور قوت محرکہ مہیا کرنے والی کمپنیوں اور کانیں کھودنے والی کارپوریشنوں کی ملکیت میں ہے یا تھوک فروشی اور خوردہ فروشی کرنے والی دوکانوں کے قبضہ میں ہے۔ ان کے علاوہ جو دولت باقی بچتی ہے صرف اس میں مکانات، فرنیچر، کپڑے، کھیت اور ان کی پیداواریں شامل ہیں۔

کیا ریاست ہائے متحدہ امریکہ اپنی ضرورت کی تمام چیزیں اپنے ملک میں ہی پیدا کر لیتا ہے؟

اوپر جو مثالیں درج کی گئیں ان کے مطالعہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اپنی

ضرورت کی تقریباً تمام چیزوں کو خود اپنے ملک کے حدود کے اندر پیدا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے غذا، کوئلہ، لوہا، لکڑی، کپاس غرضکہ تمام چیزیں جس سے یہاں کی آبادی آرام اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکتی ہے امریکہ میں پیدا ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا امریکہ دوسرے ملکوں کی پیداوار سے بالکل آزاد ہے۔ مثلاً اگر فرض کیجیے انگلستان، فرانس، جرمنی اور جاپان ایک دن اس بات کا فیصلہ کر لیں کہ ہم ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ اپنی تجارت جاری نہیں رکھیں گے تو کیا یہ ملک اپنے کاروبار کو حسب سابق جاری رکھ سکے گا۔ بظاہر اس قسم کا امکان بہت غیر اغلب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ چیز ناممکن نہیں ہے۔ چنانچہ گذشتہ جنگ عظیم میں برطانیہ عظمیٰ، فرانس، روس، اٹلی اور ریاست ہائے امریکہ نے جرمنی اور آسٹریا کو اس طرح محصور کر لیا تھا کہ ان ملکوں کے لئے باہر سے کچا یا بنا ہوا مال لانا ناممکن ہو گیا تھا۔ اور ان دونوں ملکوں کو اپنی دس کروڑ آبادی کی غذا اور نگہداشت کے لئے پورے طور پر اپنے وسائل پر ہی دارومدار کرنا پڑا تھا۔ اس کی وجہ سے یہ ملک بڑی سخت تنگی کی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہو گئے تھے۔ ابتدا میں لوگوں کو اپنے تعیشات کو ترک کرنا پڑا پھر کچھ مہینوں کے بعد اپنی آرام و آسایش کی چیزوں کو اور بعد میں فاقہ کی نوبت آ گئی۔ جب جنگ ختم ہوئی تو سینکڑوں آدمی ان سختیوں کو برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے مر چکے تھے۔ اس لئے اس قسم کی افتاد کو ناممکن سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ آئیے اس بات کا پتہ چلائیں کہ امریکہ کن چیزوں کے لئے دوسرے ملکوں پر انحصار کرنے کے لئے مجبور ہے۔ مثال کے طور پر ربڑ کو لیجیے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دنیا کے ربڑ کا کس قدر حصہ پیدا کیا جاتا ہے

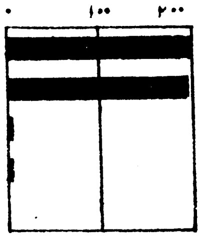
یہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں موٹروں اور موٹر لاریوں کی بہت کثرت ہے اور ان کے پہیوں کے بنانے میں ربڑ کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ فرض کیجیے کہ ان سینکڑوں جہازوں کا داخلہ جو ربڑ لاد کر امریکہ میں لاتے ہیں ناممکن ہو جائے تو امریکہ کے موٹر کتنے دن تک چلتے رہیں گے؟ اس کا جواب دینے کے لئے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ موٹر کے اچھے ٹائر کتنے میل سفر کرنے کے بعد بے کار ہو جاتے ہیں۔ غالباً دس ہزار میل یا غیر معمولی

حالات میں ۱۵ہزار میل تک یہ ٹائر چل سکتے ہیں۔ پھر جب اس قدر چل کر یہ گھس جائیں گے تو کیا کیا جائے گا۔ بلاشبہ نئے ٹائروں کی ضرورت ہوگی اور ابھی تک ربڑ کے علاوہ کسی اور دوسری ایسی چیز کا علم حاصل نہیں ہوسکا ہے جسے ٹائر کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ جب ربڑ نہیں رہیگی تو مجبوراً ایسے دھات کے ٹائروں کو استعمال کرنا پڑے گا۔ جنھیں ربڑ کے ہوا سے بھرے جانے والے ٹائروں سے پہلے گاڑیوں اور کوچوں کے کھینچنے کے لئے استعمال کیا جایا کرتا تھا۔

پھر اس کے علاوہ ربڑ سے اور بھی بہت سی دوسری چیزیں بنائی جاتی ہیں جنھیں ہم روزمرہ استعمال کرتے رہتے ہیں مثلاً ٹیلیفون میں باغوں کے پانی دینے کے نلوں میں مشینوں میں ریل گاڑیوں کے ہوائی بریک میں ربڑ کی ضرورت پڑتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ ربڑ کہاں پیدا ہوتا ہے۔ حاشیہ کے نقشہ سے معلوم کیا جاسکے گا

(کروڑ پونڈ)



دنیا کی میزان = ایک ارب اکیانوے کروڑ ستائیس لاکھ تیئیس ہزار

ریاست ہائے ملایا الجزائر مشرقی اور سیلون } = ایک ارب ۵۸ کروڑ ایک لاکھ ترانوے ہزار

جزائر نیل = چار کروڑ تہتر لاکھ بہتر ہزار

دوسرے ذرائع = ایک کروڑ اکیاون لاکھ اٹھاون ہزار

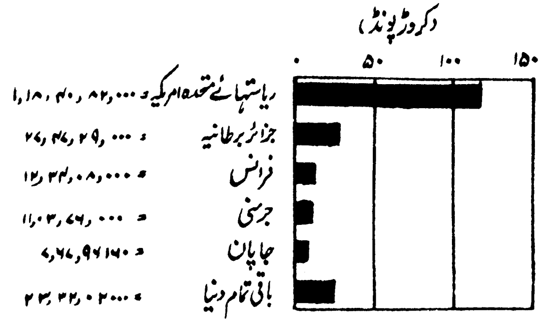
ریاست ہائے متحدہ امریکہ = صفر

دنیا کے ربڑ کی پیداوار کا کس قدر فی صدی حصہ امریکہ میں پیدا ہوتا ہے

کہ ربڑ کہاں کہاں پیدا ہوتا ہے۔ ۹۹ فی صدی سے زائد ربڑ جزائر شرقی میں پیدا ہوتا ہے اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں غالباً مشکل سے ایک پونڈ ربڑ پیدا ہوتا ہوگا۔

مگر اس کے باوجود ربڑ کے استعمال کرنے والوں میں جیسا کہ حاشیہ کے نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے امریکہ کا نمبر اول ہے۔ امریکہ دنیا کی پیداوار کا تقریباً ۳/۴ حصہ صرف کرتا ہے

پیدا کچھ نہیں کرتا جو پیدا تو نہ کرے اور خرچ بہت زیادہ کرے۔ ایسا ملک دوسرے ملکوں کی تجارت سے اپنے آپ کو کس طرح آزاد کر سکتا ہے۔ اگر دنیا کے دوسرے حصوں سے امریکہ کا تعلق قطع ہو جائے تو امریکہ کے لوگوں کو اپنے رہنے سہنے کے طریقوں میں بڑی زبردست تبدیلیاں کرنا پڑیں گی۔



دنیا میں جس قدر کل ربڑ استعمال ہوتا ہے اس کا کتنا فی صدی حصہ امریکہ میں صرف کیا جاتا ہے

غرضکہ اوپر کے بیان سے امریکہ کی دولت مندی اور محرومی کا ایک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ امریکہ کو چند چیزوں کے لئے تو بلا شبہ دوسرے ملکوں پر دارومدار کرنا پڑتا ہے لیکن باقی بیشتر چیزوں کو امریکہ خود اپنے علاقہ میں پیدا کر سکتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے بارے میں یہ چیز نہیں کہی جا سکتی بعض ملکوں کی دولت مندی تقریباً تمام تر دوسروں کے ساتھ تجارت کرنے پر منحصر ہے۔ بعض ملک نوآبادیوں کو اپنی سلطنت کا جز بنا کر اپنی خوش حالی کو قائم رکھتے ہیں بعض نوآبادیوں کے نہ ہونے کی وجہ سے پریشان اور مضطرب نظر آتے ہیں اور اپنی موجودہ دولت مندی کو دوسروں کے رحم وکرم پر منحصر دیکھتے ہیں۔ بعض اپنے قدرتی وسائل سے خود فائدہ اٹھانے کی صلاحیت یا قدرت نہیں رکھتے۔ غرضکہ ملکوں کی دولت مندی کا فیصلہ کرنے کے لئے ان تمام باتوں کو نظر کے سامنے رکھنا ضروری ہے۔

کاروبار کی تنظیم کی مختلف شکلیں

ابتدائی معاشی مصروفیت اور جرگہ یا CLAN

کاروبار کے معنی ابتدا میں حصول معاش کے لئے مصروف رہنا ہوا کرتے تھے لیکن اب اس کے معنی نفع کے لئے مصروف ہونا ہو گئے ہیں۔ اسی طرح کاروبار کی تنظیم کے معنی ابتدا میں کسی ایسی معاشی جد و جہد کے ہوا کرتے تھے جو منظم طریقہ پر کی جائے لیکن اب اس میں نفع یا توفیر کا مفہوم بھی چھپا ہوا موجود رہتا ہے۔ تنظیم کے لئے انگریزی لفظ ENTERPRISE انٹرپرائز ہے جس کے معنی ہیں تہیہ کرنا۔ جب ہم دولت کے حاصل کرنے کا تہیہ کرتے ہیں تو یہ ہماری معاشی جد و جہد ہوتی ہے۔ جب ہم منظم جد و جہد کے ذریعہ نفع حاصل کرنے کا تہیہ کرتے ہیں تو یہ گویا کاروباری تہیہ یا انٹرپرائز بن جاتا ہے۔

عہد جدید میں اس قسم کی جد و جہد کے بہت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے ناظم کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے ناظم کو انڈرٹیکر UNDERTAKER کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا لیکن اب چونکہ یہ لفظ ایک خاص کاروبار[1] کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے اس لئے اب تہیہ کرنے والوں کو انتری پرنیور ENTREPRENEUR کہنے لگے ہیں۔

نہایت ابتدائی قسم کی کاروباری تنظیم خاندان ہی کی ایک وسیع تر شکل ہوا کرتی تھی۔ لیکن خاندان بذات خود ایک طویل سلسلہ ارتقا کا ماحصل ہے۔ اس بات کے تسلیم کرنے کے لئے خاصی وسیع شہادتیں موجود ہیں کہ انسانوں کے وحشی آبا و اجداد چند در چند افراد کے چھوٹے چھوٹے گلوں یا گروہوں میں ادھر ادھر گھوما کرتے تھے۔ ان کی تعداد کی کمی اور بیشی کا انحصار عموماً اس بات پر ہوا کرتا تھا کہ غذا کی

---

[1] یعنی ان پیشہ ور لوگوں کے لئے جن کا کام تجہیز و تکفین کا انتظام کرنا ہوتا ہے۔

لئے جڑوں بوٹیوں کی رسد کتنی ہے، شکار کے دستیاب ہونے کے امکان کس قدر ہیں اور پانی کی موجودگی کی کیا کیفیت ہے۔ ابتدا میں گلہ یا گروہ کے سردار کو جنسی تعلقات پیدا کرنے کا اجارہ حاصل ہوتا تھا لیکن بعد میں جب یہ اجارہ ختم ہوا تو جنسی تعلقات میں سخت انتشار اور بے عنوانی پیدا ہو گئی۔ لیکن آہستہ آہستہ شادی کی مستقل شکلیں پیدا ہونے لگیں جن میں رشتہ داری کا شمار ماں کی طرف سے ہونے لگا ماں کی طرف سے نسل کا پتہ اس لئے لگایا جاتا تھا کہ اس زمانہ میں شادی کا جو جماعتی طریقہ رائج تھا اس میں کسی بچہ کے لئے اپنے باپ کا پتہ چلانا بہت مشکل تھا۔ اس قسم کے جو گروہ تاریخ کی ابتدا میں ہمیں ملتے ہیں انھیں CLAN یا جرگہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور چونکہ ان جرگوں کے ارا کین اپنے نسب کا سلسلہ ماں سے چلاتے تھے اس لئے انھیں رحمی مادری یا اموی قبیلوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں جہاں عورتوں کی ابتدائی زراعت یا کھیتی کی کاشت نے زیادہ اہمیت اختیار کر لی تھی یا جہاں خانگی فنون مثلاً کپڑا بننے اور کھانا پکانے کی ضرورت کو زیادہ محسوس کیا جانے لگا تھا وہاں عورتوں کی اہمیت میں ان معاشی وجوہ کی بنا پر بھی اضافہ ہو گیا اور ان جگہوں پر ہمیں جماعت کا وہ نظام نظر آتا ہے جسے MATRIARCHATE یعنی عورتوں کی حکومت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس قسم کا مادری MATRIARCHAL نظام تو ہمیں کہیں کہیں ہی ملتا ہے لیکن مادری یا اموی جماعت جس کا انحصار رحمی قبیلہ پر ہوتا تھا تقریباً ہمہ گیر تھی۔

اس ابتدائی قبیلہ کی جماعتی خصوصیات کو یہاں صرف اختصار کے ساتھ ہی بیان کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ عہد کے خاندان کے قسم کی کسی چیز کا اس عہد میں کہیں نشان نہیں ملتا۔ سوائے اس کے کہ ماں اپنے چند بہت چھوٹے بچوں کے ساتھ یکجا رہا کرتی تھی۔ رشتہ کا عام تعین قبیلہ کی رکنیت کے ذریعہ ہوتا تھا۔ اور قبیلہ کے افراد کے درمیان جنسی تعلق کا پیدا کرنا سخت جرم سمجھا جاتا تھا ہر قبیلہ اپنی اصل کا پتہ ایک قدیم ترین جد امجد سے لگایا کرتا تھا یہ عام طور پر کوئی نہ کوئی جانور یا پودا ہوتا تھا اور ٹوٹم کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور مقدس اور لائق پرستش سمجھا جاتا تھا۔ ٹوٹم کی پرستش کس

طرح شروع ہوئی یہ بات ابھی تک ایک رازِ سربستہ ہے لیکن اس کے وجوہ غالباً معاشی تھے۔ ٹوٹم ابتدا میں غذا کا خاص ذریعہ ہوا کرتا تھا لیکن بعد میں پارٹر کے لئے اس قدر مفید ہو گیا کہ اس کا غذا کے طور پہ استعمال کرنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ جہاں حالات آبادی کے بڑھنے کے لئے موافق ہوتی تھے وہاں جرگے ترقی کر کے بڑے قبیلے بن جاتے تھے اور ان قبیلوں میں باہم دور کی رشتہ داری پائی جاتی تھی۔ چھوٹے قبیلے اور بعض صورتوں میں بڑے قبیلے مشترکہ کھیلوں، تقریبوں اور عبادتوں کے مرکز ہوا کرتے تھے اور ان کے درمیان ایسے قبائلی مراسم پیدا ہو گئے جنھوں نے بعد میں ترقی پا کر قوانین اور اخلاقی اصول کا مرتبہ حاصل کر لیا۔

خاندان | چھوٹے قبیلوں کی معاشرت کے ختم ہو جانے کے اسباب بھی معاشی ہی تھے۔ جہاں حالات گلہ بانی کی ترقی کے لئے سازگار تھے وہاں جانوروں کے گلے پیدا ہونا شروع ہو گئے اور باپ کا اقتدار ملکیت کے محافظ اور روزی فراہم کرنے والے کی حیثیت سے مسلّم ہو گیا۔ جن مقامات پر جڑ کھودنے والی اور شکاری منزل کی جگہ زراعت نے لی وہاں زمین کے جوتنے، مکان کے بنانے اور ترکہ کو قائم رکھنے میں مرد کی محنت نہایت اہم ہو گئی اور اس کے بعد سے معاشی تنظیم میں مرد کو ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی اور اس بنا پر ابوی یا PATRIARCHAL خاندان پیدا ہو گئے۔

FAMULUS جس سے انگریزی لفظ FAMILY نکلا ہے لاطینی زبان میں ملازم یا غلام کو کہتے ہیں۔ اور اس لفظ کے معنی خاندان اس لئے ہو گئے کہ اس نئے خاندانی گروہ کے تمام اراکین اپنے باپ یا ابو الآبا کے خادم ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ خاندان کے تمام رشتے ملکیت کے ساتھ وابستہ ہونے لگے۔ باپ زمین، گلوں، بیوی یا بیویوں، بچوں اور غلاموں کا مالک ہوتا تھا اور ان کے علاوہ خاندان کے اور تمام رشتہ داروں پر بھی اس کا اقتدار مالکانہ ہی ہوا کرتا تھا۔ باپ سے ہی بیوی اور بیٹے کو نام ملنے لگے اور ترکہ خاندان کے ایک سردار سے دوسرے سردار کو وراثت میں ملنے لگا۔ اب زبردستی گرفتار کر کے شادی کرنے کی جگہ خرید کر شادی کی جانے لگی اور ابتدائی قبیلوں کے جماعتی رشتہ ازدواج کی جگہ تعدادِ ازدواج نے لے لی اور اخیر میں گھر کے کھیا کا صرف

ایک بیوی سے رشتہ ازدواج قائم ہونے لگا جس کی وجہ سے اس نئے خاندانی گروہ کے اتحاد میں زیادہ قربت اور اس کی تنظیم میں زیادہ مضبوطی پیدا ہوگئی اور معاشی تعلقات کی شدت کے احساس نے وہ پدرانہ اور برادرانہ تعلقات پیدا کر دیے جنھیں اخلاقی ترقی کا گہوارہ کہا جا سکتا ہے۔ اس ابویانہ نظام کا تعلق بعض علاقوں میں تو زراعت سے تھا جیسے یونان اور روم کی ابتدائی تاریخ میں اور بعض جگہ گلہ بانی سے جیسے کہ بائبل کے پیٹریارکوں کی زندگی میں۔ لیکن بہرصورت اس جدید اور حیات پرور ابویانہ نظام میں کچھ عرصہ تک قبائلی جماعت کی ظاہری شکل باقی رہی۔ لیکن جب قبائلی نظام کی معاشی بنیادیں کھوکھلی ہوگئیں تو قبائلی نظام کی پوری عمارت گر پڑی۔ جہاں کہیں وسیع تر معاشی مفاد کے اشتراک نے قبیلہ کے خونی رشتوں کی جگہ لے لی وہاں قبائلی جماعت کی جگہ سیاسی جماعت پیدا ہونے لگی اور اس طرح ریاست اور منظم حکومت کی ابتدا ہوئی۔

فلسطین یونان اور روم اور اسی طرح پران تمام ملکوں میں جنھوں نے تہذیب کو اپنی ذاتی کوششوں سے ترقی دی اسی قسم کے تدریجی ارتقا کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ان ملکوں میں جہاں ادنیٰ تہذیبوں کو یکبارگی اعلیٰ تر تہذیبوں کے ساتھ تعلقات پیدا کرنا پڑے اس تدریجی ارتقا کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا چنانچہ ٹیوٹن نسل کے قبیلوں کے تعلقات جب روم سے قائم ہوئے تو انھوں نے قبائلی معاشرت کو چھوڑ کر سیاسی معاشرت کو اختیار کر لیا۔ تقریباً یہی صورت آئرلینڈ پر انگلستان کے اثر کے بعد کہی جا سکتی ہے کیونکہ آئرلینڈ کے SEPTS عہد وسطیٰ میں کافی زمانہ تک قبائلی زندگی گذارتے رہے تھے اور اسکاٹ لینڈ میں تو آج سے ایک دو صدی پہلے تک قبائلی معاشرت کا زور باقی رہا۔

اوپر کی تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوی خاندان معاشی اسباب کا نتیجہ تھا اور جب تک وہ معاشی اسباب موجود رہے جنھوں نے ابوی خاندان کو معاشرتی اور سیاسی زندگی کی بنیاد بنا دیا تھا۔ ابوی خاندان بھی قائم رہا۔ لیکن صنعت و تجارت کی ترقی سے نیز خاندان کے بہت سے افراد کے لئے آزاد اور خود مختارانہ جدوجہد کے مواقع پیدا ہو جانے سے پرانے بڑے خاندانی گروہوں میں انتشار پیدا ہونے لگا اور اس کی جگہ جدید عہد کے مختصر خاندان پیدا ہوگئے جن میں خاندانی تعلق بہت

قریبی رشتہ داروں تک محدود ہو گیا اور اب حال میں معاشی زندگی کے جدید ترین ارتقا اور اس کی آزادی اور مقابلہ و مسابقت نے خاندانی نظم و انضباط کو اور بھی توڑ دیا۔ عورتیں آزاد ہو گئیں، طلاق کی کثرت ہو گئی، بچوں کے غیر شادی شدہ رہنے کا زمانہ برابر طویل ہوتا گیا اور اس طرح پر جدید خاندان کی زندگی کے وہ تمام اخلاقی اور معاشرتی مسائل پیدا ہو گئے جن کے بیان کرنے کے لئے ایک مستقل جداگانہ بحث کی ضرورت ہے۔

اوپر کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خاندان کو ایک کاروباری تنظیم کے نام سے صرف اس ابتدائی مفہوم کے ساتھ موسوم کیا جا سکتا ہے جس میں محض روزی حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کی جاتی ہے نفع حاصل کرنے کے لئے نہیں۔ دولت کی پیدائش کا کام گھر کے اندر کیا جاتا تھا گھر کے لوگ ہی اس کام کو کرتے تھے اور اس سے فائدہ اٹھانے والے لوگ بھی گھر کے ہی آدمی ہوتے تھے یعنی دولت کے پیدا کرنے والے اور صرف کرنے والے دونوں خاندان کے ہی افراد ہوتے تھے خاندان کا ہر فرد سب کے لئے محنت کرتا تھا اور سب کی پیدائش کو صرف میں لاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کاروبار کو اس کے موجودہ مفہوم کے ساتھ یعنی نفع کے لئے تنظیم دینے کی پہلی کوششیں بھی خاندانی گروہ کی بعد کی شکلوں میں ہی شروع کی گئیں۔ مثلاً جمہوریت روما کی پلانٹیشنس میں جن کے اندر غلاموں کی محنت سے کام لیا جاتا تھا واضح طور پر کاروباری تنظیم نظر آتی ہے اسی طرح ان بڑے بڑے خاندانوں کی تنظیم بھی جو عہد وسطے کے ابتدائی زمانہ میں ترقی پا کر دیہی جماعتوں میں منتقل ہو گئے تھے کم از کم جزئی طور پر کاروبار جیسی تھی۔ پھر ہمیں خاندان کی کاروباری تنظیم اور اشتراک عمل کی ایسی مثالیں صرف زراعت میں ہی نہیں ملتیں بلکہ تجارت میں بھی ملتی ہیں مثلاً عہد وسطے کی پنچایتوں COMMUNES کے تجارتی معاملات اور لین دین کی نوعیت بھی ایسی ہی تھی نیز یہ چیز صنعت میں بھی ملتی ہے جیسے روس کی آرٹل میں جو مزدوروں کی انجمن ہائے امداد باہمی کی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کاروبار کے لئے اگر اس کا مفہوم نفع طلبی لیا جائے خاندان کی تنظیم کچھ زیادہ موزوں نہیں تھی اور مسابقت کی زندگی کو جتنی زیادہ اہمیت حاصل ہوتی گئی اتنے ہی خاندان کے قابل و کارگزار افراد خاندان کی

تنظیم سے علیحدہ ہوتے گئے۔ زراعت پیشہ لوگوں کی قدامت پسندی کی وجہ سے زراعت میں تو یہ چیز آہستہ آہستہ پیدا ہوئی لیکن صنعت و تجارت میں یہ ترقی تیزی کے ساتھ ظاہر ہونے لگی۔ چنانچہ کاروبار کی اعلیٰ ترین ترقی یافتہ شکلوں کو صنعت و تجارت میں ہی دیکھا جاسکتا ہے۔

مددگاروں یا مزدوری پر کام کرنے والوں کا نظام

جب صنعت خاندانی گروہ بندی کی حدود سے زیادہ وسیع ہو جاتی ہے اور جب حالات غلامی کی ترقی کے لئے سازگار نہیں رہتے تو صنعت کے کام میں بیرونی امداد لینے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور آوارہ گرد آزاد کاریگر جو گاؤں گاؤں اور گھر گھر گھومتے پھرتے ہیں خاندان کا بہت سا کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بڑھئی، چمار، قلعی گر، معمار، کپڑا سینے والی عورتیں اس ضمن میں مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔ ان گھومنے والے دستکاروں کو ان کی خدمات کا معاوضہ دیا جاتا ہے اور انھیں عارضی طور پر خاندان کا رکن بنالیا جاتا ہے۔ یہ رسم آج تک باقی ہے۔ نیو انگلینڈ (امریکہ) میں اس قسم کے کام کرنے والوں کو مددگار "HELP" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مغربی امریکہ کے کسانوں کو جو مزدور امداد دیتے ہیں وہ بھی اسی قسم کے ہوتے ہیں اور انھیں مزدوری پر کام کرنے والے "HIREDMAN" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس لئے اس نظام کے لئے "مددگاروں یا مزدوری پہ کام کرنے والوں کے نظام" کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ ہر جماعت کی ابتدائی تاریخ میں اس قسم کا نظام ملتا ہے اور جو لوگ سوئٹزرلینڈ یا اسکنڈینیویا کی دیہی جماعتوں سے واقف ہیں وہ موجودہ زمانہ میں بھی اس نظام کے رائج ہونے کی شہادت دیں گے۔

مددگاروں کے نظام کو ایک درمیانی اور عبوری چیز سمجھنا چاہیئے کیونکہ خاندانی گروہ کو اس نظام کے رائج ہونے کے بعد بھی اہمیت حاصل رہتی ہے۔ چیزوں کو استعمال کرنے والا شخص پہلے کی طرح اب بھی کچا مال مہیا کرتا ہے اور اس کے بدلہ میں اسے بنا ہوا مال مل جاتا ہے۔ محنت اور اوزار کاریگر کے ہوتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ تبدیلی کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ چھوٹا کنبہ رکھنے والے خاندان محسوس کرنے لگتے ہیں کہ انھیں بیرونی امداد کی ضرورت اکثر پیش آنے لگی ہے گو یہ ضرورت بہت زیادہ سخت نہیں ہوتی اور بڑے خاندانی گروہوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کچھ زائد مددگاروں کو رکھنا ان کے لئے

نفع بخش ہے۔ اس طرح پر لوہاروں، آٹا پیسنے والوں، نانبائیوں اور جولاہوں کے پیشے مستقل ہو جاتے ہیں۔ ابتدا میں جو کاریگر آوارہ ادھر ادھر گھوما کرتے تھے اب وہ ایک جگہ سکونت اختیار کرتے ہیں اور مددگاروں سے بھی دست کاروں کا ایسا طبقہ پیدا ہو جاتا ہے جو خاندانی گروہ سے بالکل آزاد ہوتا ہے۔ جب یہ منزل آجاتی ہے تو وہ چیز پیدا ہو جاتی ہے جسے نظام دست کاری سے موسوم کیا جاتا ہے۔

دستکاری کا نظام اس نظام میں کاریگر بالکل خود مختار ہوتا ہے۔ اب وہ مصرف کے گھر میں کام نہیں کرتا اپنے ہی گھر میں رہتا ہے۔ خود ہی بازاروں میں خام اشیاء خریدنے کے لئے جاتا ہے۔ خام اشیاء کو اپنے گھر میں اپنے اوزاروں سے بناتا ہے اور بنی ہوئی اشیاء کو اپنی دوکان سے مصرف کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔ اب خاندانی نظام کی طرح دولت کی پیدائش خاندان کے لئے نہیں کی جاتی۔ یا مددگاروں کے نظام کی طرح خام شے اور مصنوعہ شے کا مالک مصرف نہیں ہوتا بلکہ اب کام کا ہر پہلو (آخری شے مصنوعہ کے فروخت ہونے تک) کاریگروں کے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے۔ کاریگر ہر چیز کو اپنے ہاتھ سے بناتا ہے۔ اسی لئے اس نظام کو ہم دستکاری کے نظام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ چیزیں اس سے پہلے یا اس کے بعد ہاتھ سے نہیں بنائی جاتی تھیں بلکہ اس سے اس حقیقت کا اظہار کرنا منظور ہے کہ اس نظام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صنعت کو اہمیت حاصل ہوتی ہے اور کاریگروں کا ایک مستقل طبقہ بن جاتا ہے اور یہ لوگ اپنے کاروبار کی تنظیم ذاتی طور پر کرنے لگتے ہیں لیکن چونکہ کاریگر اپنے گاہکوں کی فرمائش پر چیزیں بناتے ہیں اس لئے اس نظام کو سائی کے نظام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

عہد وسطیٰ میں ان کاریگروں نے آہستہ آہستہ اپنے آپ کو پنچایتوں یا پیشوں میں منسلک کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے تاریخ میں اس نظام کو پنچایتی نظام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے لیکن پنچایتیں سبب نہیں بلکہ نتیجہ ہوا کرتی تھیں اور دنیا کے بہت سے حصوں میں ہمیں ایسے دستکاروں کی مثالیں بھی ملتی ہیں جو پنچایتوں سے منسلک نہیں تھے۔ پنچایتی نظام میں ہر کاریگر کو پنچایت کے رکن بن جانے

کی توقع رہتی تھی. کام کی ابتدا امیدوار کے درجہ سے کی جاتی تھی. پھر خلیفہ کی حیثیت سے چند سال گذارے جاتے تھے اور جب پیشہ کے جز وکل سے خوب واقفیت پیدا ہو جاتی تھی تو استاد کا درجہ مل جاتا تھا۔ اگر موجودہ اصطلاحوں کو استعمال کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ دستکار آجر بھی ہوتے تھے اور تاجر بھی سرمایہ دار بھی ہوتے تھے اور مزدور بھی. طبقوں کی موجودہ تفریق اس وقت موجود نہ تھی ۔ اپنے اقتدار کے انتہائی عروج کے زمانہ میں پنچایتوں کو سیاسی اقتدار بھی حاصل ہونے لگا تھا۔ دستکار چونکہ اکثر شہروں میں رہتے تھے اس لئے شہری اور دستکار ہم معنی لفظ بن گئے تھے ۔ دیہات اور شہر کی تقسیم عمل بھی بہت نمایاں ہو گئی تھی اور MANOR مینر کی حیثیت صرف یہ رہ گئی تھی کہ وہ شہری پنچایتوں کو خام مال مہیا کیا کرتے تھے جس طرح عزلت نشین گھریلو معیشت سے صنعت کا خاندانی نظام وابستہ تھا اسی طرح تجارتی یا مقامی معیشت کے ساتھ پنچایتی یا دستکاری کا نظام وابستہ تھا۔

صلیبی جنگوں کے کئی صدی بعد تک یورپ کی صنعتی زندگی پر پنچایتی نظام حاوی رہا۔ لیکن دولت کے اضافہ سے دو نئی باتیں ترقی پاتی رہیں ۔ اول تو یہ کہ پنچایتیں زیادہ خودغرض اور محدود ہوتی گئیں یہاں تک کہ وہ اجارہ دار بن گئیں .... اور صنعتی ترقی میں معاون ہونے کی جگہ مزاحم ہونے لگیں. رکنیت صرف چند منتخب افراد تک محدود ہو گئی جن کے درمیان پیشہ اختیار کرنے کا حق وراثتاً منتقل ہونے لگا اور عام کاریگروں کو منافع میں شرکت کا کوئی موقع باقی نہیں رہا۔ اور اس لئے جہاں کہیں ممکن ہو سکا انھوں نے اپنے لیے پرانے دستکاروں سے علیحدہ نئی صنعتیں شروع کیں ۔ اور دوسری بات جو زیادہ اہم تھی یہ تھی کہ جب دستکاروں کے پاس دولت جمع ہونے لگی تو ان کو یہ خواہش بھی ہوئی کہ اسے نفع بخش کاروبار میں لگائیں چنانچہ صحیح معنی میں صنعتی سرمایہ پیدا ہونے لگا اور چونکہ اس صنعتی سرمایہ کو پرانے نظام کے ماتحت کاروبار میں لگانا ممکن نہیں تھا اس لئے پنچایتی یا دستکاری کا نظام آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا اور اس کی جگہ دوسری منزل جسے خانگی نظام سے موسوم کر سکتے ہیں پیدا ہو گئی۔

خانگی نظام | خانگی نظام میں سب سے پہلے سرمایہ دار یعنی آجر اور مزدور کے درمیان ایک خلیج حایل ہو

شروع ہوگئی۔ مددگاروں کے نظام میں بھی آجر ہوا کرتے تھے لیکن وہ ساتھ ہی ساتھ مزدور اور مصرف بھی ہوتے تھے۔ دستکاری کے نظام میں آجر اور مصرف میں فرق پیدا ہوگیا لیکن پھر بھی آجر جزئی طور پر کاریگر کا کام کیا کرتا تھا۔ لیکن خانگی نظام میں آجر اور کاریگر میں پوری طرح تفریق پیدا ہوگئی۔ اس کے علاوہ بنائی ہوئی چیز کے فروخت کرنے کا طریقہ بھی بدل گیا جس کی وجہ سے خانگی نظام نہ صرف مددگاروں کے نظام سے بلکہ دستکاروں کے نظام سے بھی مختلف ہوگیا۔ مددگاروں کے نظام میں پیداوار کو فروخت نہیں کیا جاتا تھا بلکہ آجر اسے اپنے صرف میں لے آتا تھا۔ دستکاروں کے نظام میں دولت کی پیدائش چھوٹے پیمانے پر اور فرمائش کے مطابق کی جاتی تھی اس لئے مصنوعہ شے کو دستکار براہ راست مصرف کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا۔ مگر جب سرمایہ کی وجہ سے دولت کی پیدائش بڑے پیمانہ پر ممکن ہوگئی تو بازار اتنا وسیع ہوگیا کہ دستکار کے لئے ذاتی اور انفرادی طور پر حاوی ہونا ممکن نہیں رہا اور نہ اس کے لئے یہ بات ممکن رہی کہ ان خاص طریقوں کو اختیار کرے جو اشیاء مصنوعہ کو فروخت کرنے کے لئے ناگزیر ہوگئے تھے۔ سرمایہ دار ہی ان کاموں کو کرسکتا تھا اس لئے یہ سرمایہ دار ہی کے ہاتھ میں پہنچ گئے۔ خانگی نظام کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اوزاروں کا مالک تو کاریگر ہی رہتا ہے اور کام کو اکثر اپنے خاندان والوں کی مدد سے اور زراعتی مشاغل کے ساتھ ساتھ اپنے گھر پر ہی انجام دیتا ہے لیکن شے مصنوعہ کی پیدائش کا کام اب دو طبقوں میں تقسیم ہوجاتا ہے اول تو وہ طبقہ جو کچے مال کو خریدتا اور مصنوعہ اشیاء کو فروخت کرتا ہے اور دوسرا وہ طبقہ جو اپنے ہاتھ کی محنت سے دولت پیدا کرتا۔ اپنے اوزاروں کو خود ہی فراہم کرتا اور اپنی ہی کارگاہ میں کام کو انجام تک پہنچاتا ہے۔

خانگی نظام کی اصطلاح مفہوم کی وضاحت کرنے کے لئے کچھ زیادہ موزوں نہیں ہے کیونکہ دستکاری اور پنچایتی نظام میں بھی کاریگر اپنے گھر پر ہی کام کیا کرتا تھا۔ مگر اس اصطلاح کو بعد میں آنے والے اُس نظام سے ممتاز کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جس میں کاریگر کو اپنے گھر پہ کام کرنا ترک کرنا پڑا تھا۔ خانگی نظام میں کاریگروں نے ہاتھ سے کام

کرنا جاری رکھا تھا مگر چونکہ اب ان کا اختیار دولت کی پیدائش کے پورے کام پر باقی نہیں رہا تھا اس لئے اس نظام کو دستکاری کے نظام سے بھی مختلف قرار دیا جا سکتا ہے۔ خانگی کاریگر کے لئے جو اصطلاح اس نظام کی ترقی کے زمانہ میں استعمال کی جاتی تھی وہ مینوفیکچر یعنی چیزوں کو ہاتھ سے بنانے والے کی اصطلاح تھی۔ کبھی کبھی اس کے کام کو خانگی کام کی جگہ مفوضہ کام COMMISSIONWORK سے بھی موسوم کیا جاتا تھا کیونکہ اس نظام میں سرمایہ دار جو خام شئے کا مالک ہوتا تھا ایک دوسرے خود مختار شخص کے ذمہ یہ خدمت تفویض کرتا تھا کہ وہ خام شئے کو مصنوعہ شکل دے کر سرمایہ دار کو واپس کر دے۔

خانگی نظام کو سترھویں صدی میں ترقی ہوئی اور انگلستان میں یہ نظام اٹھارھویں صدی میں انتہائی عروج پر پہنچ گیا۔ لیکن جیسے جیسے کاروبار کی مختلف منزلوں میں سرمایہ کا اضافہ ہوتا رہا اس میں بھی تبدیلی واقع ہوتی رہی۔ سب سے اہم تبدیلی پیدائش دولت کے کام میں کفایت کی تدبیریں اختیار کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اس زمانہ میں محنت کو بچانے والے طریقے اور مشینیں ایجاد کی جانے لگیں جو انسانی قوت کی جگہ مشین کی قوت سے کام لیتی تھیں اور ان کی وجہ سے کاروبار میں نفع بخش طریقہ پر سرمایہ لگایا جانے لگا۔ ۱۷۷۰ء سے قبل اس قسم کے ابتدائی تجربے پارچہ بافی کی صنعت میں شروع کئے گئے تھے لیکن ۱۷۷۰ء سے ۱۷۹۰ء تک کے زمانہ میں بہت سی بڑی بڑی ایجادیں ہوئیں۔ پھر ۱۸۳۰ء کے بعد دخانی ریلوے اور دخانی جہازوں کے استعمال کی وجہ سے مال کی منڈیاں بہت وسیع ہو گئیں۔ دوسری صنعتوں میں بھی اسی قسم کی ترقیاں ہوئیں اور ان کے مجموعی اثر سے وہ چیز پیدا ہوئی جسے فیکٹری کے نظام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

فیکٹری کا نظام | یہی وہ نظام ہے جس کے ماتحت جدید دنیا اپنی زندگی گذار رہی ہے۔ اس نظام میں سرمایہ دار آجر نہ صرف کچا مال مہیا کرتا ہے اور مصنوعہ مال کو فروخت کرتا ہے بلکہ کام کرنے کے طریقوں پر بھی اسے پورا اختیار و اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ مشین اتنی مہنگی ہوتی ہے کہ مزدور کی دسترس سے باہر ہوتی ہے اور چونکہ مشین آجر کی ملکیت میں شامل ہوتی ہیں اس لئے وہ عمارتیں

بھی جن میں مشینیں لگی ہوتی ہیں اور جہاں دولت کی پیدائش کا کام کیا جاتا ہے اسی کے قبضہ میں آجاتی
ہیں اور انھیں فیکٹری کے نام سے موسوم کیا جانے لگتا ہے۔ دستکاری کے نظام کی طرح اب مزدور
خود مختار نہیں رہتا۔ اب اوزار اور کارگاہ پر بھی خانگی نظام کی طرح اس کی ملکیت باقی نہیں رہتی۔ اب
اس کا کام صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ اس محنت کو مہیا کرتا رہے جو سرمایہ دار کی مشینوں کو اس
کی کارگاہ میں چلاتی ہیں۔ دولت کی پیدائش میں اس نئے نظام کے رائج ہونے سے جو غیر معمولی
اضافہ ہوتا ہے اس کا اثر مزدور پر بھی دولت کے پیدا اور صرف کرنے والے کی حیثیت سے
پڑتا ہے اور مزدوروں کی آبادی میں نہایت تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے لگتا ہے اور دیہات
سے شہر کی طرف ایک مسلسل آمد شروع ہو جاتی ہے صنعتی جماعت کو اس کی موجودہ شکل ملنے لگتی ہے
اور جماعتی آمدنی زمیندار کے لگان، مزدور کی اجرت، سرمایہ دار کے سود اور آجر کے نفع کی شکل میں
تقسیم ہونے لگتی ہے مینوفیکچرر کے معنی اب دستکار کے نہیں رہتے بلکہ اب اس کے معنی
اس شخص کے ہو جاتے ہیں جو دوسروں کو اپنا کام کرانے کے واسطے ملازم رکھتا ہے۔
سرمایہ کی ترقی سے مقابلہ اور تخمین میں اضافہ ہوتا ہے۔ درمیانی سرمایہ داروں کے نئے طبقے
نمودار ہو جاتے ہیں اور اعتبار اور مبادلہ کے طریقے بالکل بدل جاتے ہیں صنعتی سرمایہ دار اور آجر کا
اقتدار اس قدر نمایاں ہو جاتا ہے کہ سارے کاروباری نظام کو فیکٹری سسٹم کے نام سے موسوم کیا
جانے لگتا ہے۔

اس نئی منزل کا ارتقا اپنی تمام پیشرو منزلوں سے اس درجہ مختلف ہے کہ جس طریقہ سے یہ وجود
میں آئی ہے اسے صنعتی انقلاب کے نام سے موسوم کیا گیا ہے لیکن اگر انقلاب کا مفہوم یہ ہے کہ
پرانا نظام یکبارگی مکمل طور پر بدل دیا گیا تو اس نام کا انتخاب ٹھیک نہیں کیا گیا ہے کیونکہ یہ کام تدریجی
طور پر ہوا ہے۔ پارچہ بافی کی صنعت میں پوری طرح تبدیلی پیدا ہونے کے لئے تیس چالیس سال کی
مدت صرف ہوئی۔ اور دوسری صنعتوں میں فیکٹری نظام خانگی نظام کی جگہ انیسویں صدی میں لے
سکا۔ انگلستان سے باہر یہ تحریک اور بھی زیادہ آہستہ آہستہ چلی اور انگلستان میں آج بھی

بعض ایسی صنعتیں موجود ہیں مثلاً شیشہ کی صنعت، چھری کانٹوں کی صنعت، لوہے کی زنجیر بنانے کی صنعت جس میں فیکٹری سسٹم بہت معمولی طریقہ پر داخل ہو سکا ہے۔

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ کاروبار کی تنظیم کی یہ تمام صورتیں دوسری صورتوں سے نہایت واضح طور پر مختلف ہیں۔ ہر منزل میں ہمیں گذشتہ منزلوں کے باقی ماندہ آثار ملتے ہیں۔ خاندانی نظام اب بھی تمام ملکوں کے ان دور افتادہ علاقوں میں ملتا ہے جہاں جدید خیالات کی رسائی ابھی تک پورے طور پر نہیں ہو سکی ہے مثلاً امریکہ کے جنوبی اپالیشن پہاڑوں میں مددگاروں کے نظام کا مشاہدہ مختلف قسم کی گھریلو اور دوسری خدمتوں میں کیا جا سکتا ہے۔ دستکاری نظام کا نمونہ چمار اور درزی کے یہاں مل سکتا ہے خانگی نظام یورپ کے پارچہ بافوں اور جدید شہروں کے ان حصوں میں مل سکتا ہے جہاں بہت کم مزدوری قبول کر کے لوگ کام کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن کسی قوم کی معاشی زندگی کی امتیازی خصوصیت کا فیصلہ نمونہ کی اور اوسط قسم کی تنظیمی شکلوں کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ گذشتہ نظاموں کے باقی ماندہ آثاروں سے نہیں اور اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہے کہ جدید کاروباری تنظیم بہت بڑی حد تک فیکٹری نظام پر منحصر ہے۔

کاروبار کی مشترکہ اور جماعتی تنظیم | اس وقت تک ہم نے کاروبار کی تنظیم کا مطالعہ تنظیم کی تفریق کے نقطہ نگاہ سے کیا ہے۔ اب ہمیں مشترکہ پیدائش کے نقطہ نگاہ سے اس چیز کو مختصراً بیان کرنا چاہیئے یہاں ہمیں چار منزلیں نظر آتی ہیں (۱) ایسے کاروبار جنھیں افراد کرتے ہیں (۲) ایسے جنھیں ساجھی کرتے ہیں (۳) ایسے کاروبار جنھیں کارپوریشن کرتی ہیں اور (۴) ایسے کاروبار جو ٹرسٹوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔

(۱) یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اگرچہ مشترکہ معاشی جدوجہد کی شکل خاندان تھی لیکن کاروباری زندگی کے ساتھ جو سخت معاشی مقابلہ اور کشمکش قریبی طور پر وابستہ ہے اس کے لیے تنظیم کی یہ شکل کچھ زیادہ موزوں نہ تھی۔ کاروباری تنظیم درحقیقت کاروباری آدمیوں کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اور کاروباری اہلیت رکھنے والا آدمی آج کی طرح اس وقت بھی اکتساب و کوشش سے نہیں

بلکہ طبعی طور پر پیدا ہوتا تھا۔ عقل مندی، بہادری، قوت فیصلہ کی صحت اور انتظامی قابلیت ایک کامیاب تاجر کے لئے ضروری صفات ہیں۔ جس حد تک کسی فرد میں یہ قابلیتیں پائی گئیں اس نے ترقی کی۔ لیکن جب کاروباری تنظیم کا کام پھیل گیا تو افراد کے لیے تن تنہا تمام کام کو نپٹانا مشکل ہو گیا۔ اس لئے انھوں نے اپنے ساتھ ان لوگوں کو ملانا شروع کیا جن میں وہ صفات پائی جاتی تھیں جن کی خود ان کے اندر کمی ہوتی تھی۔

(۲) شراکت در اصل کاروبار کے کمزور پہلوؤں کو مضبوط کرنے کی ایک تدبیر تھی۔ اس کے ذریعہ سے مختلف اہلیتوں کے لوگ مل کر کام کرنے لگتے تھے اور کبھی کبھی سرمایہ رکھنے والوں اور اہلیت رکھنے والے لوگوں میں بھی میل ہو جاتا تھا۔ جس قدر یہ میل زیادہ ہوتا تھا اتنا ہی کاروباری واحدہ کی اہلیت کارگذاری میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ لیکن شراکت کی خوبیاں محدود ہیں۔ کاروبار میں شرکت کرنے والوں کے لئے ذاتی تعلقات اور ایک دوسرے پر مکمل اعتماد رکھنا بہت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شراکت کو لازمی طور پر صرف چند افراد تک محدود رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن جب کاروبار کے لئے اتنے زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہونے لگتی ہے جسے چند آدمی مہیا نہیں کر سکتے تو کاروبار کی ایک نئی تنظیم کی ضرورت محسوس کی جانے لگتی ہے اور اس ضرورت کو کارپوریشن پورا کرتی ہے۔

(۳) ڈیلوم DELOUME اور ویبر نے جو جدید تحقیقات کی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تجارتی کمپنیاں یا کارپوریشن جمہوریت روما کے آخری دور میں بھی موجود تھیں لیکن موجودہ شکل میں ان کا ابتدائی پتہ عہد وسطےٰ کے اٹلی کے شہروں میں ملتا ہے اس کی ابتدائی شکل وہ تھی جسے غلط طریقہ پر بنک کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اس میں چند اشخاص اپنے سرمایہ کو یکجا اکٹھا کر لیتے تھے اور حکومت کو اس کی آمدنی کی خاص خاص مدوں کو رہن رکھ کر قرض دے دیتے تھے اور اپنے قرضہ کے حصہ کی نسبت سے نفع میں شریک ہوا کرتے تھے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری قرضے اور مشترکہ کاروبار نہایت قریبی طور پر باہم متعلق تھے۔ مشترکہ سرمایہ کے اصول کی دوسری اہم

ترقی سولھویں صدی کی تجارتی کمپنیوں میں نظر آتی ہے جو ابتدا میں صرف ایک واحد بحری سفر کے لیۓ عارضی طور پر بنائی جایا کرتی تھی لیکن جن کو بعد میں آہستہ آہستہ ایک زیادہ مستقل شکل حاصل ہوگئی تھی۔ مگر مشترکہ کاروبار کی وہ ترقی جو جدید عہد کی امتیازی خصوصیت ہے ہیں انیسویں صدی میں ملتی ہے جب تجارتی سرمایہ پر صنعتی سرمایہ کا اقتدار قائم ہوگیا تھا۔

کمپنی یا کارپوریشن کے معاشی فوائد تین ہیں:۔ مشترکہ سرمایہ، محدود ذمہ داری اور دائمی زندگی کمپنی کی متحدہ ضمانت پر سرمایہ داروں کی تعداد میں غیر محدود اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ جتنا جس شخص کا کمپنی میں حصہ ہوتا ہے اتنا ہی کاروبار کے انتظام میں اس کا دخل ہوتا ہے اور وہ صرف اپنے حصہ کے بقدر کمپنی کے قرضوں اور ذمہ داریوں کا پابند ہوتا ہے۔ عہد جدید کی حکومتوں نے محدود ذمہ داری کے اصول کو تسلیم کرنے میں لیت ولعل سے کام لیا لیکن اب اس نظام کو معاشی زندگی کی جان سمجھنا چاہیئے۔ اس کی وجہ سے وہ غلط فہمیاں اور بداعتمادیاں رفع ہوگئی ہیں جو غیر محدود ذمہ داری اور ساجھے کی وجہ سے پیدا ہوا کرتی تھیں۔ حصوں کے فروخت اور منتقل کرنے میں بھی اس کی وجہ سے سہولت پیدا ہوگئی ہے اور اس کی وجہ سے سرمایہ کا وہ اجتماع اور اس کی جزئی تقسیم کا وہ امکان پیدا ہوا ہے جو ہمارے عہد کی معاشی زندگی کی نمایاں خصوصیت ہے پھر کمپنی کی آخری خصوصیت یہ ہے کہ افراد کی طرح کمپنی سوائے اس صورت کے کہ کاروبار ختم کردیا جائے کبھی مرتی نہیں ہے۔ حصہ دار غائب ہو سکتے ہیں لیکن حصے باقی رہتے ہیں۔ اس لیے اس کو دوام اور پائداری کے تمام فوائد حاصل رہتے ہیں۔ یہ حال اور مستقبل دونوں کی لیے منصوبے بنا سکتی ہے اور اپنے ڈائرکٹروں کے مناسب انتخاب اور ان کی تجدید سے بہترین قابلیت سے فائدہ حاصل کرسکتی ہے اور بدلے ہوئے ماحول سے مطابقت پیدا کرسکتی ہے۔

ان فوائد کے ساتھ ساتھ اس میں چند ناقابل انکار خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ کمپنی کو تین قسم کے لوگوں سے تعلقات قائم رکھنا پڑتے ہیں اول حصہ داروں سے دوسرے مزدوروں سے اور تیسرے پبلک سے اور انہی کی وجہ سے کمپنی کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً حصہ دارو ں

کی ہوشیار اور باخبر اقلیت کے مفاد کو محفوظ رکھا جائے یا بھولے اور ناواقف روپیہ لگانے والوں کی اکثریت کے مفاد کو دیکھا جائے، پھر حصہ داروں اور قرض داروں کے مفاد میں کس کے مفاد کو مقدم رکھا جائے۔ آیا ڈائرکٹروں کو مجبور کیا جائے کہ وہ متولی کے فرائض کو ٹھیک طرح پر انجام دیں — یہ مسائل ہیں جن کا ابھی تک کوئی مناسب حل نہیں کیا جا سکا ہے۔ اسی طرح مزدوروں اور آجروں کے تعلقات میں بھی وہ پرانی ہمدردی باقی نہیں رہی ہے جو شخصی تعلق کی بنا پر پیدا ہوتی تھی کمپنی ایک غیر شخصی ادارہ ہو گئی ہے اور اس میں خالص نفع طلبی کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کمپنی کے روح نہیں ہوتی۔ چنانچہ پبلک کے ساتھ بھی کمپنی کی طرف سے ایسا برتاؤ کیا جا سکتا ہے جس کے کرنے کی ہمت افراد کبھی نہیں کر سکتے۔ کمپنی کی اخلاقی حس کو افراد کی اخلاقی حس کی سطح تک بلند کرنا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن ان خامیوں کے باوجود جدید معاشی مشاغل کے لئے کمپنی کا وجود ناگزیر ہو گیا ہے۔ کمپنیوں کے بغیر دنیا کو دوبارہ معاشی تنظیم کے ابتدائی دور میں پہنچنا پڑے گا اور کثیر سرمایہ سے فائدہ اٹھانے کے جو مواقع سرمایہ داری نظام میں کمپنی کے ذریعہ پیدا ہوئے ہیں وہ ختم ہو جائیں گے۔

۱۴۔ متحدہ سرمایہ کے فوائد جب اور زیادہ بڑے پیمانہ پر ظاہر ہونے لگتے ہیں تو پھر کمپنیوں کو متحد کرنے کا بھی ارادہ کیا جانے لگتا ہے۔ ابتدا غیر پختہ معاہدوں سے ہوتی ہے جن سے قیمتوں اور پیداوار کے طریقوں کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسری منزل وہ ہوتی ہے جب آمدنی متحد ہو جاتی ہے اور کمپنیاں POOLS کا نام اختیار کر لیتی ہیں۔ اس کے بعد تیسری منزل میں کمپنیاں ایک دوسرے سے اور بھی زیادہ قریب آ جاتی ہیں اور مختلف کاروبار ایک مشترکہ سردار کی نگرانی میں آ جاتے ہیں اور اسے ٹرسٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ابتدا میں اتحاد کرنے والی کمپنیاں اپنے حصوں کو ایک متولی کو سپرد کر دیا کرتی تھیں جو اس مشترکہ کاروبار کی نگرانی یکجائی طریقہ پر کیا کرتا تھا۔ جہاں اس قسم کے اتحادوں کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے جیسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں وہاں یہی کام ایک نئی اور آزاد کمپنی بنا کر کیا جاتا ہے۔ جن چیزوں کو آج ٹرسٹ

کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے وہ حقیقتہً وسیع اور زبردست کمپنیاں ہوتی ہیں۔اس لئے ٹرسٹ کے مسائل کمپنیوں کے مسائل سے ملتے جلتے ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے ٹرسٹ کو اسی طرح کمپنیوں کی ایک ترقی یافتہ شکل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جیسے کمپنی خود ساجھا کرنے والوں کی ایک ترقی یافتہ شکل تھی یا ساجھا کرنے والے انفرادی کاروبار کی ایک ترقی یافتہ شکل تھے۔اس ترقی کے اسباب اور اس کے حدود کا مطالعہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے جس پر بحث کرنے کی نی الحا گنجایش نہیں ہے۔یہاں صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ جدید صنعت کی غیر معمولی ترقی کے زیر اثر سرمایہ کا جو اضافہ اور تفریق ہوئی ہے اس سے کاروبار کے طریقے روز بروز پیچیدہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

آپ نے ریڈیو پر کرکٹ اور دوسرے کھیلوں کا حال ایسے لوگوں کی زبانی سنا ہوگا جو خود کھڑے دیکھ رہے تھے اور اب آپ کے سامنے ایک چلتی پھرتی تصویر کی طرح پیش کر رہے ہیں۔ سیاست کا تماشا دیکھنے والا سب کچھ ایک ہی وقت میں نہ دیکھ سکتا ہے اور نہ دکھا سکتا ہے لیکن پچھلے ہفتے جو حادثہ اچانک پیش آیا اسے سمجھنے کے لئے آپ میری خاطر فرض کر لیجیے کہ یہ کرکٹ کا میچ تھا اور مجھے اجازت دیجیے کہ جو کچھ ہوا اسے .... میں دوبارہ بیان کر دوں۔ یہ تشبیہ کچھ بے جا بھی نہیں ہے اس لئے کہ انگلستان میں پہلے آدمیوں کا فرض مانا جاتا ہے کہ اپنے معاملات میں کرکٹ کے قاعدے برتیں یعنی ایمان داری کریں اور یہ یاد رکھیں کہ کھیل کا مزہ اس میں ہے کہ آدمی اپنی بازی لے اور دوسرے کی دے۔

ہاں تو صورت یہ سمجھئے یہ تھی کہ مسٹر چیمبرلین (BATTING) کر رہے تھے اور ہر ہٹلر گیند پھینک رہے تھے۔ مسٹر چیمبرلین بہت سنبھل کر کھیلنے والے آدمی ہیں اور ہر ہٹلر گیند کو چاہے جیسا چکر دے کر پھینکیں اور وہ چاہے جہاں گرا کھائے مسٹر چیمبرلین اسے ٹھوک ضرور دیتے ایک بار گی کیا دیکھا گیا کہ تینوں وکٹ ہر ہٹلر کے ہاتھ میں ہیں اور وہ اور اس کے ساتھی "آؤٹ آؤٹ" چلا رہے ہیں۔ اور فیلڈ میں لوگ اپنی جگہ اس طرح بدل رہے ہیں کہ گویا انھیں نئے کھلاڑی کے آکر بیٹ کرنے کا انتظار ہے۔

مسٹر چیمبرلین نے پہلے تو ذرا حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا پھر طے کیا کہ وہ آؤٹ نہیں ہوئے ہیں۔ اور اپنا بیٹ لئے جہاں تھے وہیں ہٹ لگانے کو تیار کھڑے رہے۔ اس کھیل میں کوئی امپائر تو تھا نہیں کہ فیصلہ کرتا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ہٹلر نے بولنگ شروع کر دی۔ ابھی کھٹ سے آواز آئی ہے مگر گیند نہیں

معلوم کہ کدھر گئی اور نہ بھی ہوا یا نہیں۔

یہ حادثہ کرکٹ کے میدان میں پیش آتا تو ہم شاید اپنی رائے قائم کر سکتے سیاست کا میدان اتنا بڑا ہے کہ اس میں آدمی کی نظر ہر جگہ پہنچ نہیں سکتی اور ہمیں بہت کچھ اب سوچنا پڑتا ہے یا دوسروں سے پوچھنا پڑتا ہے مثلاً یہ سوال کہ مسٹر چمبرلین کے وکٹ یعنی روس نے ان کو دغا کیسے دی اور دغا بھی دی تو ہٹلر کے ہاتھ میں کیسے پہنچ گیا۔ پھر یہ سوال کہ مسٹر چمبرلین آؤٹ ہو گئے ہیں یا زبردستی کھیل کھیل رہے ہیں اور سب سے دلچسپ سوال یہ ہے کہ اب وہ جم کر کھیلتے رہیں گے یا ہٹلر کی بولنگ انھیں مات کر دے گی۔

اب ذرا اسی موقعہ کا بیان سیاست کی زبان میں سن لیجئے ۲۰ اگست تک کسی کو پتہ نہ تھا کہ یورپی سیاست پلٹا کھانے والی ہے ڈانزگ میں ہر فورسٹر نے تقریر میں یہ کہا کہ ہم پولینڈ کے حملے کو روکنے کے لئے تیار ہیں اور جرمنی کی طرف سے معلوم ہوا کہ خالی ڈانزگ کو جرمن ریاست میں شامل کرنے کے بجائے اس کا مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ ۱۹۱۸ء میں لڑائی کے بعد جو علاقے جرمنی سے چھین کر پولینڈ کو دیدیئے گئے تھے وہ سب واپس کر دئے جائیں۔ آج کل جو ایسی خبروں سے پریشان ہو جائے اس کے لئے جینا مشکل ہے چنانچہ ہم نے بھی کوئی خیال نہ کیا۔ لیکن ۲۲ کو معلوم ہوا کہ ہر فون ربن ٹروپ موسکو جانے والے ہیں اور روس اور جرمنی میں معاہدہ ہونے والا ہے، اخباروں نے سمجھایا کہ یہ جرمن سیاست کی گیدڑ بھپکی ہے روس اور جرمنی کا اتحاد بھلا کیسے ہو سکتا ہے مگر اسی کے ساتھ یہ خبر تھی کہ برطانوی وزارت نے پھر اعلان کیا ہے کہ پولینڈ سے جو اس کا عہد و پیمان ہے وہ اس پر قائم ہے، چنانچہ ہم سمجھ گئے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اگلے دن فون ربن ٹروپ ہٹلر کی دعائیں لے کر ماسکو کی طرف اڑے وہاں پہنچ کر عہد نامے پر دستخط کر آئے اور رات کو آرام سے سو کر دوسرے دن واپس جرمنی چلے گئے ہم سے کہا گیا تھا کہ عہد نامے سے پہلے لمبی چوڑی گفتگوئیں ہوں گی روس جرمنی سے پوری خوشامد کرائے گا اور جتنی گالیاں اسے ہر ہٹلر سے ملتی ہیں وہ سب کی سب بلکہ اس سے کچھ زیادہ گالیاں فون ٹروپ کو سنا پڑیں گی تب کہیں وہ معاہدے پر راضی ہوگا۔ اس کی جگہ ہمیں پتہ چلا کہ روس اور جرمنی میں پچھلی فروری سے دبی زبان میں کچھ بات چیت ہو رہی تھی اور اس زمانہ میں بھی جبکہ فرانس برطانیہ اور پولینڈ کی فوج کے نمائندے ماسکو میں تھے

یہ گفتگوئیں ہو رہی تھیں معاہدے کی خبر ہم تک پہنچی بھی نہ تھی کہ مسٹر چیمبرلین نے پارلیمنٹ میں (DEFENSE OF THE REALM ACT) پاس کر کے وہ تمام اختیارات حاصل کر لیے جن کی لڑائی کے زمانہ میں ہر حکومت کو ضرورت ہوتی ہے اور ادھر روس کو راضی کرنے کی آخری کوشش اس طرح کی گئی کہ پولینڈ کے نمائندوں نے مان لیا کہ جنگ ہوگی تو روسی فوجوں کو پولینڈ کے اندر آ کر لڑنے کی اجازت ہوگی مگر اس کے باوجود فوجی مشوروں کا سلسلہ بند ہو گیا اور مشورہ کرنے والے معلوم ہوتا تھا کہ بھاگ کر جان بچانے کی فکر میں ہیں۔ حالت تھی بھی بڑی نازک روس نے اچانک اپنے تیور بدلے تھے، ہر ہٹلر برلن میں اپنے سپہ سالاروں سے قریب قریب رات بھر مشورہ کرتے رہے تھے اور کہا جاتا تھا کہ ۲۷ اگست کو وہ (TANNA BARG) میں تقریر کرنے کے ۱۲-۱۳ گھنٹے بعد پھر اپنی فوجوں کو جو سرحد پر تیار کھڑی ہیں۔ پولینڈ پر دوڑا دیں گے۔ اخباروں نے یہاں تک بتا دیا کہ کونسی فوج کہاں پر حملہ کرے گی لیکن اگر ایک طرف لڑائی کی دھوم مچ رہی تھی برطانوی شہریوں سے کہدیا گیا تھا کہ جرمنی چھوڑ دیں اور جرمنی شہریوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ انگلستان سے چلے آئیں تو دوسری طرف مسٹر چیمبرلین کی حسب مرضی گفتگو کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا ہر ہٹلر نے مشرق اور مغرب دونوں طرف اپنی سیاست کا کبوتر دوڑایا ہر فون ربن ٹروپ ماسکو گئے تو اسی کے ساتھ برطانوی سفیر سر نیولا ہنڈرسن ہر ہٹلر کا ایک پیغام لے کر پولینڈ پہنچے اس کے بعد اگرچہ ہر ہٹلر نے موسیو دلا دے اور پریذیڈنٹ روزولٹ کے کہنے پر پولینڈ سے بات چیت کرنے سے انکار کر دیا۔ برطانوی جہازوں کو بحر روم اور بحیرہ بالٹک میں جانے کی ممانعت کر دی گئی۔ جرمنی میں رشن کارڈ جاری ہو گئے لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں سر نیول ہنڈرسن کا لندن سے برلن اور برلن سے لندن جانا بھی ہو رہا ہے۔

اس کا نتیجہ کیا ہوگا ابھی مسٹر چیمبرلین خود بھی نہیں بتا سکتے آپ بھی چاہیں تو اطمینان سے نتیجہ کا انتظار کر سکتے ہیں، چاہیں تو اس پر غور کر سکتے ہیں کہ روسی جرمنی تعلقات نے اچانک پلٹیاں کھایا اور اس کا پولینڈ اور یورپ کی سیاست پر کیا اثر ہوگا۔

روس اور جرمنی میں اب تک آپ جانتے ہیں کہ بڑی گہری تجارتی دوستی تھی مگر اس کے ساتھ ہی

کم از کم دیکھنے میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ اتنی ہی گہری سیاسی عداوت بھی ہے۔ اسی وجہ سے یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ جب روس اور جرمنی ایک دوسرے کو اس طرح گالیاں دے رہے ہیں تو روس، انگلستان اور فرانس کو آپس میں اتحاد قائم کرنے میں اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے۔ جب بہت دیر لگی تو لوگ اس پر تعجب کرنے لگے اور کسی نے اس میں روس اور کسی نے برطانیہ کا قصور ثابت کیا مگر اتحاد کی تجویز کا جو حشر ہوا اس کا کسی کو بھی گمان نہ تھا۔ جرمنی کی طرف سے ہر فون ربن ٹروپ نے یہ بیان کیا ہے کہ برطانیہ ہمیں گھیرنا چاہتا تھا اور ہم نے روس کو اپنے ساتھ ملا کر یہ گھیرا توڑ دیا ہے۔ روس کی طرف سے اس پلٹ کھانے کا کوئی سبب نہیں بتایا گیا ہے لیکن ذرا سوچیے تو ایک نہیں بہت سی باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔

روسی پہلے چاہتے تھے اور شاید اب بھی اس پر تیار ہوں کہ ان کا برطانیہ اور فرانس سے ایسا معاہدہ ہو جائے کہ جس کے بعد کسی مخالف کو دھونس جمانے کی ہمت نہ ہو لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے اور شاید برطانیہ فرانس اور پولینڈ کے انداز سے ظاہر ہوتا گیا کہ وہ ایسا نہیں چاہتے، تو روس نے اپنے لیے بہتر سمجھا کہ وہ جرمنی سے دوستی کرے اور اس طرح ان جھگڑوں سے الگ ہو جائے جو یورپ میں آئے دن ہوتے ہیں۔ جرمنی سے دوستی کرنے میں اپنے عقیدوں کو جھٹلانے کا اندیشہ ضرور تھا اور ان بے چاروں کو دکھ پہنچانے کا خطرہ تھا جو روس کو بین الاقوامی کومیونزم کا علم بردار اور جرمنی کو کومیونزم کا سب سے کٹر دشمن مانتے ہیں لیکن یہ دکھ پہنچنا تو ایسے لوگوں کی قسمت میں لکھا تھا اور یہی سمجھتے ہوئے شاید سٹالن نے اور بھی کم تامل کیا۔ پھر اگر آپ یہ بھی سوچیں کہ روس اور جرمنی کے اس اتحاد سے وہ اینٹی کومنٹرن معاہدہ جو جاپان، جرمنی اور اٹلی کے درمیان ہوا تھا خود بخود ٹوٹ جاتا ہے تو اس اتحاد میں آپ کو روس کا ایک بڑا فائدہ بھی نظر آئے گا۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ اس کی وجہ سے جاپان کی ایک وزارت ٹوٹ گئی اور جاپانی سیاست ایک آہ بھر کر بیٹھ گئی۔ برطانیہ اور فرانس سے معاہدہ کرنے میں جاپان کی طرف سے خطرہ گھٹنے کی بجائے بڑھ جاتا۔

روس اور جرمنی کے درمیان طے یہ ہوا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر حملہ نہ کریں گے، ایک دوسرے کے دشمنوں کی مدد نہ کریں گے، ایسی فریق بندی میں شریک نہ ہوں گے کہ جس کا مقصد ان

میں سے کسی ایک کی مخالفت ہو' اپنے معاملات دوستانہ گفتگو کے ذریعے طے کرلیں گے اور ایک دوسرے کو ایسی باتوں کی خبر دیتے رہیں گے جن سے دونوں کا تعلق ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر پولینڈ خدانخواستہ لڑائی کا میدان بنا تو روس کا رویہ کیا ہوگا۔ اگر روس نے پولینڈ کی مدد نہ کی تو اس کے معنی ہیں کہ اس کے خیال میں جرمنی کا پولینڈ کو فتح کرلینا کوئی حرج کی بات نہیں لیکن اس کا یقین کرنا مشکل ہے۔ اگرچہ ہندوستان کے ایک مشہور اخبار کے نامہ نگار نے یہ فرض کرکے کہ روس اب ہر لڑائی میں جرمنی کا ساتھ دے گا یہ دکھلایا ہے کہ دراصل وہ جرمنی کی کوئی خاص مدد نہیں کرسکتا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ روس کو اس کا اندیشہ ہی نہیں ہے کہ لڑائی ہوگی۔ بلکہ جرمنی نے اسے اطمینان دلایا ہوگا۔ کہ وہ اپنا مطلب بغیر لڑے حاصل کرلے گا۔ ممکن ہے فرانس اور برطانیہ کے نمائندوں سے جو مشورے ہوئے انھوں نے بھی یہی بات موسیو مولوتوف اور ستالین کے ذہن نشین کردی ہو' اور انھوں نے آخر میں طے کیا ہو کہ خواہ مخواہ کے مشوروں سے یہ بہتر ہے کہ روس صاف کہدے کہ ہم آپ کے جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہتے۔ اب آپ جانئے اور آپ کا کام جانے۔ روس سے یہ کہلوا دینا جرمن سیاست کے لئے بڑی کامیابی کی بات ہے۔ اور اگرچہ مسٹر چمبرلین برابر یہ کہتے جا رہے ہیں کہ لڑائی ہوئی تو برطانیہ پولینڈ کی مدد کرے گا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ بڑی مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے انھوں نے گفتگو کا دروازہ پورا کھول دیا ہے' اور گفتگو کے ذریعے ہر ہٹلر کو معاملہ طے کرنے کا پورا موقع دے رہے ہیں۔

لیکن یہ بھی سنا گیا ہے کہ ہر ہٹلر میدان عمل میں قدم رکھنے سے پہلے صلح کی ایسی شرائط پیش کرنے والے تھے کہ جنھیں نہ مانا جائے تو وہ کہ سکیں کہ اب فساد کرنے کا الزام ان پر نہیں آتا اور وہ زبردستی اپنا حق وصول کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ یہ بھی سیاست کی بڑی اچھی چال ہے۔ اور ہر ہٹلر اسے آزما بھی چکے ہیں۔

تعلیم بالغاں کی کتابیں

تعلیم بالغاں کے قاعدے:۔ از ڈاکٹر سعید الظفر خاں صاحب۔ قیمت حصہ اول ۔، حصہ دوم ۔، حصہ سوم ۔/

مدرس کا قاعدہ:۔ اس مختصر سے رسالے میں تعلیم بالغاں کے قاعدوں کو پڑھانے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ قیمت ۲/

اردو سکھانے کا آسان طریقہ:۔ صاحبزادہ ڈاکٹر سعید الظفر خاں صاحب نے جو ریاست بھوپال کے وزیر تعلیم رہ چکے ہیں، بڑی عمر کے ان پڑھ لوگوں کی تعلیم کے سلسلے میں بہت اچھے اور کامیاب تجربے کئے ہیں۔ انھوں نے اپنے ان ہی تجربوں کی بنیاد پر اس مختصر سے رسالے میں اردو سکھانے کا سب سے آسان طریقہ پیش کیا ہے۔ قیمت ۴/

نماز:۔ یہ رسالہ بالغ مبتدیوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اس میں نماز کی تمام ضروری چیزیں اور چند مسائل جو نماز سے متعلق ہیں بتائے گئے ہیں۔ ۱۶ صفحے قیمت ۔/

حکایتیں مکمل:۔ اس کے دو حصے ہیں۔ دونوں میں چھوٹی چھوٹی سادے اور پیارے الفاظ میں کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ جو اخلاقی اور سماجی دونوں اعتبار سے بہت اچھی ہیں۔ قیمت مکمل ۱۰/

حبیب خدا:۔ آنحضرت کی سیرت پاک بہت ہی آسان اور دلچسپ زبان میں کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ قیمت ۔/

میونسپلٹی:۔ اس میں بالغوں کو بتایا گیا ہے کہ میونسپلٹی کیا ہے اور اس سے کیوں کر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ قیمت ۔/

جامعہ

زیر ادارت :- نور الحسن صاحب ہاشمی، ایم، اے (علیگ)

نمبر ۴	اکتوبر ۱۹۳۹ء	جلد ۳۲

فہرست مضامین

اعتذار

ستمبر ۳۹ء کا رسالہ بعض دشواریوں کے سبب صرف ایک دن تاخیر سے تیار ہوا۔ اس لئے ڈاک خانہ والوں نے اپنے قاعدے کے مطابق اسے روانہ کرنے کی اجازت نہ دی۔ لاہور کے صدر ڈاک خانہ سے خط و کتابت میں اتنی تاخیر ہوئی کہ ستمبر کا رسالہ جو شروع مہینے میں شائع ہوتا تھا آخر مہینے میں روانہ کیا جا سکا۔

اکتوبر کا رسالہ بھی کچھ ایسی ہی مجبوریوں کے سبب نسبتاً کم ضخامت پر شائع کیا جا رہا ہے۔ البتہ امید ہے کہ نومبر سے یہ دقتیں نہ رہیں گی۔

اس پرچے سے رسالہ کی ادارت میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے اب تک یہ اہم کام پروفیسر محمد عاقل صاحب کے سپرد تھا۔ اب اس مہینے سے ادارت کے فرائض مولوی نور الحسن صاحب ہاشمی انجام دیں گے۔ گو پروفیسر محمد عاقل صاحب رسالے کی ادارت سے سبکدوش ہو چکے ہیں پھر بھی اکتوبر کا رسالہ ان ہی کے مرتب کئے ہوئے مضامین پر مشتمل ہے اور آئندہ بھی امید ہے کہ ناظرین ان کے اعلیٰ مضامین سے استفادہ کر سکیں گے۔ اب تک جس ذوق اور دلچسپی سے جناب عاقل صاحب نے رسالے کا کام کیا میں کارکنان "جامعہ" اور رسالے کے ناظرین کی جانب سے ان کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ ان کی امداد اور مشورے رسالے کو آئندہ بھی حاصل رہیں گے۔

مہتمم

کیا حرفوں کے ذریعہ تمام مضامین پڑھائے جاسکتے ہیں؟

(از جناب سید احمد علی صاحب نگراں مدرسہ ابتدائی جامعہ قرول باغ، دہلی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

(اس اشاعت میں اس سلسلہ کا دوسرا مضمون شایع کیا جارہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے قارئین اس مضمون کا تنقیدی نظر سے مطالعہ کریں۔ اس کے قابل عمل اور کامیاب ہونے کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کوئی فیصلہ تو اسی وقت کیا جاسکے گا جب اس طریقہ سے تعلیم دیے ہوئے طلبہ زندگی کے کاروبار میں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ثابت ہوں گے لیکن تعلیم کے مقاصد اور ذرائع کے پیش نظر تعلیم کے ماہر اگر اس پر تنقید فرمائیں گے تو ممکن ہے اس کی خامیوں، فروگذاشتوں، غلطیوں یا گمراہیوں کو رفع کیا جاسکے۔ مدیر)

اپنے گذشتہ مضمون میں میں نے چار ضمنی کاموں (Minor Projects) کا تذکرہ کرتے ہوئے ان مواقع کو بیان کیا ہے جہاں استاد کوئی سبق، خواہ وہ زبان کا ہو، خواہ جنرل سائنس اور سوشل اسٹڈیز کا، مربوط کرکے پڑھا سکتا ہے ان ضمنی کاموں (Minor Project) میں جو خاص (Major Projects) کے سلسلہ میں اختیار کیے جاتے ہیں، میں نے صرف انھیں مواقع کا تذکرہ کیا ہے جو بالکل صاف طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن بچوں کے سوالات اور ان کی پوچھنے گچھنے کی فطری عادت ان بیان کردہ مواقع سے کہیں زیادہ مربوط پڑھائی کے مواقع پیدا کرتے ہیں۔ لیکن استاد کو چاہیے کہ ضمنی کاموں میں پیدا شدہ مواقع سے فائدہ اٹھائے جتنا مضامین اور مضامین کے اسباق کے عنوانات کو مربوط کرکے پڑھانے کی ضرورت ہو اس لیے کہ بعض اوقات بچوں کی دلچسپی اس قدر زیادہ ہوجاتی ہے کہ اصل کام یا خاص حرفہ میں دلچسپی کم ہوجانے کا اندیشہ ہونے لگتا ہے۔ لہذا استاد کی تھوڑی سی رہنمائی بچوں کو اصل مقصد یا حرفہ پر دلچسپی اور شوق سے کام کرنے پر قائم رہے گی اور یہ ضمنی کام ضرورت کے مطابق وقتاً فوقتاً کرائے جائیں گے اور کسی مضمون یا

کسی مضمون کے کسی سبق کی تکمیل تک ہی اس کام کی دلچسپی کو بڑھایا جائے گا۔

تمام ان مواقع سے جن کا میں نے کسی ضمنی کاموں (Minor Projects) میں تذکرہ کیا ہے کسی ایک جماعت میں فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ نہ تمام مواقع کے بیان کرنے کا یہ مطلب ہے۔ بلکہ یہ تمام باتیں کام کرنے والوں کی سہولت کے لئے لکھی گئی ہیں۔ جماعت کے معیار کے مطابق اس میں سے باتیں اخذ کی جا سکتی ہیں اور مواقع کے مطابق اسباق تعلق دے کر پڑھائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً لیئی بنانے میں لیئی بننے کا خرچ معلوم کرنے کے لئے زبانی حساب کسی جماعت میں کل دیا جا سکتا ہے لیکن لیئی میں پانی، میدہ اور نیلا تھوتھا کس نسبت سے ہے اور کتنے کتنے فی صدی ہے؟ یہ باتیں ساتویں جماعت میں تبلائی جا سکتی ہیں، یا کسی چیز کی قیمت کا صرف مرکب کے ذریعہ پھیلانے کا کام چوتھی جماعت میں کرایا جا سکتا ہے۔

کام کرانے والوں کو ایک اور تجربہ ہوگا یعنی کسی عملی کام کے کرانے کے دوران میں بہ یک وقت کئی باتوں کے سکھانے کا موقعہ ملے گا۔ مثلاً گتے سے کام کرانے کے دوران میں مختلف سائز کے گتے ناپ کر کاٹنے میں رقبہ نکلوانے کا موقعہ پیدا ہوگا لیکن ساتھ ہی ساتھ چیزوں کی خریداری میں روپے آنے اور پیسے کی جمع، تفریق اور ضرب تقسیم کے سکھانے اور مشق کرانے کا بھی موقعہ پیدا ہوگا اب اگر استاد کے رقبہ سکھانے کے مواقع سے فائدہ اٹھا کر بچوں کو رقبہ سکھانا شروع کیا ہے تو اسے بغیر اس قاعدے کی اچھی طرح مشق کرائے اور بچوں کو ذہن نشین کرائے، روپے، آنے کی جمع، تفریق اور ضرب تقسیم کے قاعدوں کے سکھانے کی طرف نہ آنا چاہیئے۔ ورنہ کام میں بے حد انتشار پیدا ہو جائے گا دھیان (Concentration) جاتا رہے گا اور کوئی بات پختہ طریقہ پر نہیں سکھائی جا سکے گی۔ یہی اندیشہ دوسرے مضامین میں بھی ہو سکتا ہے۔ لہذا استاد کی استادی اور ہوشیاری اسی میں ہے کہ کسی ضمنی کام میں پیدا شدہ مواقع سے اس طرح فائدہ اٹھائے کہ انتشار نہ پیدا ہو۔ یہ صورت نہ پیدا ہو کہ آج ایک بات سکھائی گئی تو کل بچوں کا رجحان کسی دوسری طرف دیکھتے ہوئے دوسری بات سکھانا شروع کر دیا۔ اس کے طریقہ کار میں یہ خوبی ہونی چاہیئے کہ کام میں پیدا شدہ مواقع کی دلچسپی اس وقت تک قائم رکھے جب تک زیر بحث سبق یا حساب کا کوئی قاعدہ پختہ طریقہ پر بچوں کو نہ سمجھا دیا گیا ہو اور اس کی کافی مشق نہ ہو چکی ہو۔

خیال یہ ہے کہ اس طرح کام کرانے سے بچوں کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو بے جا طریقہ پر روکا جائے گا لیکن نہیں اس کی نوبت بہت کم آئے گی۔ اس لئے کہ بچے جس شوق سے کسی بات کے کرنے پر آمادگی ظاہر کرتے ہیں اسی رفتار سے بہت جلد ان کی دلچسپی جاتی رہتی ہے جب تک استاد برابر کوئی ایک طریقہ نہ اختیار کرتا رہے جس سے اس آمادگی اور دلچسپی میں تناہی زور (Force) برقرار رہے جتنا کام کہ شروع کراتے وقت نظر آرہا تھا بچوں کی دلچسپیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ اصلی اور نقلی۔ کسی کام کے آغاز میں جب بچے آمادگی ظاہر کرتے ہیں، خواہ یہ آمادگی ان میں خود بخود پیدا ہوئی ہو یا استاد کے کام کے پیش کرنے کے دوران میں پیدا ہوئی ہو، دونوں صورتوں میں استاد کو بچوں کی اس آمادگی کو اچھی طرح پرکھ کر کام شروع کرانا چاہیئے۔ کبھی دو چار سوالات کرنے سے اور کبھی جماعت کی رائے لینے سے بچوں کی آمادگی کے اصلی اور نقلی ہونے کا اندازہ ہو جائے گا۔ بچوں کی اصلی دلچسپی میں سنجیدگی اور پختہ آمادگی نظر آئے گی۔ اس وقت ان کی نشست اور طرز گفتگو سے ان کی دلچسپی کے اصلی ہونے کا اندازہ ہو رہا ہوگا۔ آپ کی تھوڑی سی بے توجہی سے ان میں افسردہ دلی نظر آنے لگے گی لیکن نقلی دلچسپی میں یہ باتیں نہ ہوں گی۔ وہ دلچسپی نہ ہوگی بلکہ دل لگی ہوگی۔ اس میں غور و فکر نہ ہوگا اور جب آپ اس کام کے متعلق تجاویز طلب کریں گے تو معنی خیز خاموشی چھا جائے گی جس سے اب اندازہ لگا سکیں گے کہ بچوں نے جس بات کا ارادہ کیا ہے وہ محض تفریح کے لئے ہے، اس سے وہ کوئی تعلیمی فائدہ حاصل کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، محض جماعت میں بیٹھے بیٹھے اکتا گئے ہیں، لہذا جس دلچسپی میں دل لگی کا شائبہ پایا جاتا ہو اسے کوئی اہمیت نہ دینی چاہیئے اس لئے کہ اس سے کوئی تعلیمی فائدہ نہ حاصل ہو سکے گا۔ اس وقت بچوں سے کام کرانا وقت کا ضائع کرنا ہے۔ بچوں کی دلچسپی کو تعلیم کے لئے استعمال کرنا فنی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

عملی کام میں بھی دلچسپی اور آمادگی اصل مرکز اور طاقت ہے۔ یہی ربط کی بنیاد ہے۔ بچوں کی اس آمادگی اور دلچسپی کو صحیح راستہ پر ڈالنا ہی اصل کمال ہے۔ ہوشیار استاد وہی ہے جو عملی کام سے پیدا شدہ دلچسپی سے زیادہ سے زیادہ تعلیمی فائدہ اٹھائے اور اسباق کو بچوں کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ وہ عملی کام کو اچھی طرح کرنے اور اس سے واقف ہونے کے ضمن میں اسے ایک نہایت ضروری کام سمجھیں۔ بچے اس سبق کے مطالعہ کے

لئے بھی اتنے ہی بے تاب ہوں جتنا کسی عملی کام کے شروع کرتے وقت ہوتے ہیں۔ مثلاً جتنی آمادگی بچوں میں کوئلہ لانے، کوئلہ جلانے، میدہ اور نیلا تھوتھا پانی میں ملانے اور لیئی پکانے میں ہوتی ہے اتنی ہی آمادگی اور شوق اس بات کے معلوم کرنے میں بھی پیدا ہو جانا چاہیئے کہ دیگچی سے نکلی ہوئی بھاپ کہاں گئی اور میدے میں ملا ہوا پانی کہاں غائب ہو گیا یا بھاپ نے دیگچی سے نکلتے وقت ڈھکنا کیوں گرا دیا؟ لیئی پکتے وقت ان تمام باتوں پر روشنی پڑنی چاہیئے اور بھاپ اور پانی کے اسباق اس طرح مربوط ہو کر سامنے آنے چاہیئں۔ اگر طالب علموں نے کئی بار لیئی پکائی اور پھر بھی انھیں کوئلے کا نرخ نہیں معلوم ہے اور انھوں نے اس کا ایک ادھ سوال نہیں نکالا ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ پیدا شدہ ضمنی کام سے پورا تعلیمی فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے۔ اگر عملی کاموں سے اس طرح تعلیمی فائدہ نہیں حاصل کیا گیا ہے تو ہر عملی کام محض کھیل اور شوق کا مقصد پورا کر سکے گا۔

۵۔ تیل اور لیئی سے ابری بنانا

طریقہ کار: تیل کی ابری بنانے کے لئے (Oil eclour) آئل کلر، برش، جست کی کشتی، لیئی اور مٹی کے تیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیئی کی ابری بنانے میں بڑے برش، کپڑا رنگنے کے رنگ، بڑے پیالے اور لیئی کی ضرورت ہے۔ تیل کی ابری کا ڈزاین اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ رنگ کی جیسی نہ پانی پر ہوگی ویسی کاغذ پر آجائے گی۔ لیئی کی ابری اختیاری ہے۔ مرضی کے ڈزاین بنا سکتے ہیں۔ لیکن تیل کی ابری نیچرل ہونے کی وجہ سے نسبتاً خوشنما ہوتی ہے اور بہت آسانی سے بن سکتی ہے۔ لیئی کی ابری میں کچھ اہتمام کرنا پڑتا ہے لیکن وہ زیادہ تخلیقی (Creative) ہے۔ وہ مثل ڈرائنگ کے ہے لیکن ڈرائنگ بنانے سے آسان اور رنگوں کے خرچ کے اعتبار سے کم خرچ۔

ابری خواہ لیئی کی بنائی جائے خواہ تیل کی بچوں کی آمادگی اور دلچسپی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اچھا استاد ان سے بہت کام لے سکتا ہے۔ بچے ابری بناتے وقت بہت خوش ہوتے ہیں۔ نئے نئے ڈزائن اور نئی نئی شکلیں بنتی ہیں اور رنگوں کے استعمال سے برابر تنوع پیدا ہوتا چلا جاتا ہے لہذا خوشی اور مسرت میں بے قابو بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر ہر ایک طالب علم کو ابری بنانے کا کافی موقعہ نہیں دیا جاتا تو وہ کاپی

سے ورق پھاڑ پھاڑ کر کشتی میں ڈال دیتا ہے اور ابری بنا کر گھر لے جاتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ
کافی سامان ہو۔ ایک بڑی کشتی میں چار لڑکے یا زیادہ سے زیادہ چھ لڑکے کام کر سکتے ہیں۔ شروع شروع
میں بچوں کو اپنی بنائی ہوئی ابری' واپس لانے کے وعدہ پر' گھر لے جانے کی اجازت ہونی چاہیے' تاکہ وہ
اپنی بہنوں اور والدہ کو دکھلا سکیں۔ ایسا کرنے سے بچے نہ تو چھپا کر ابری لے جائیں گے اور نہ کاپی سے
ورق پھاڑیں گے اگر کوئی بچہ ابری واپس نہ لائے تو باز پرس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بچے اگر اپنا
کیا ہوا کام یا بنائی ہوئی چیزیں گھر پر دکھلانے لے جاتے ہیں تو گویا وہ مدرسہ کی تعلیم کا اثر گھر تک لے جاتے
ہیں۔ اس تعلیم کا چرچا گھروں پر بھی کرتے ہیں۔ بچوں کی خوشی کا اندازہ نہیں ہو سکتا جب وہ کوئی نئی چیز بنانے
میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اس وقت تو واقعی انھیں بڑی خوشی ہوتی ہے جب ان کی کامیابی کی تعریف
گھروں پر بھی ہوتی ہے۔ اس لئے اگر بچے پوچھ کر' ابری گھروں کو لے جانا چاہتے ہیں تو مدرسہ کو تھوڑا سا
نقصان برداشت کرنا چاہیے'۔

اس کام میں رنگوں کے متعلق بہت کچھ تبلایا جا سکتا ہے۔ مختلف رنگین چیزوں کے ہلکے اور بھاری
ہونے کے متعلق بھی تبلایا جا سکتا ہے۔ رنگوں کے متعلق بچوں کا معیار بہت پست ہوتا ہے۔ وہ شوخ
رنگوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ رنگوں کی ترتیب کا بھی انھیں کوئی خیال نہیں ہوتا یعنی کون سا
رنگ کس رنگ کے ساتھ زیادہ خوشنما اور جاذب نظر ہوگا۔ یہ بات خود ہمارے استادوں کو بھی نہیں
معلوم ہے۔ رنگوں کے ملانے میں اور ترتیب دینے میں ہم خود اس بات کا خیال نہیں رکھتے۔ یہ صحیح
ہے کہ رنگوں کے متعلق مختلف لوگوں کا مختلف (Taste) مذاق ہے۔ پھر بھی ہمیں اس کا معیار بلند کرنا چاہیے
بازار کی مختلف رنگین چیزوں کا معیار تو بہت پست ہے' وہ تو آنکھوں کو بھی بری معلوم ہوتی ہیں بچوں
کو اگر آزادی سے کام کرنے کی اجازت دے دیں گے اور اپنی ہدایت اور نگرانی میں کام نہ کرائیں گے
تو وہ نہایت گہرے رنگ کی ابری بنائیں گے۔ جس رنگ کو بحیثیت 'زمین' کے کاغذ پر ہونا چاہیے' وہ
بحیثیت 'بیل بوٹے' کے بنایا گیا ہوگا یا جس رنگ کو 'بیل بوٹے' کے لئے استعمال کرنا چاہیے تھا' وہ
'زمین' کے لئے استعمال کیا گیا ہوگا اور اس پر نہایت گہرے' بیل بوٹے دوسرے رنگ کے بنے ہوئے

ہوں گے۔ بچوں کو رنگوں کے ملانے میں بھی خاص تربیت دینے کی ضرورت ہے۔ ورنہ وہ رنگوں کی تمام پیالیاں خراب کر دیں گے۔ اور بعض بعض بچے تو کام میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ اپنے کپڑوں پر بھی ابری بنا لیتے ہیں۔

عملی کام میں بھی اچھے ڈسپلن سے بہت اچھا کام ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ بہ یک وقت پچیس تیس لڑکوں کے لئے کام مہیا کرنا ہوتا ہے اس لئے ضبط کی سخت ضرورت ہے۔ یہ بہتر ہوگا اگر استاد ابتدا میں کام شروع ہونے سے پہلے خود تھوڑی سی تیاری کر لے۔ مثلاً جن کاغذوں پر ابری بنوانا ہے انھیں کاٹ کر رکھ لے۔ رنگوں کو پیالوں میں ملا کر بچوں کو دکھا دے اور کشتی کے ارد گرد کرنے سے رکھ دے۔ کاغذ کو ابری بنانے کے لئے تیل پر ڈالنے اور اٹھانے کا دو تین مرتبہ ڈیمانسٹریشن دے پھر باری باری سے بچوں کو بلا کر اس کے مطابق عمل کروائے۔ اس وقت دوسرے بچے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ کر دیکھیں اور اپنی باری کا انتظار کریں۔ اس عمل کے دوران میں استاد بچوں کو رنگوں کے متعلق زبانی بتلاتا بھی جائے اور بچوں کی آمادگی سے فائدہ اٹھائے۔ اس بنیادی کام اور پیش بندی سے یہ فائدہ ہوگا کہ جب بچے ان کے متعلق اپنی کتاب سے اسباق پڑھیں گے تو بہت زیادہ توجہ اور دلچسپی سے پڑھیں گے۔

زبان | رنگوں پر بچوں سے مختلف سوالات کئے جائیں مثلاً خاص رنگ کون کون سے ہیں؟ کس رنگ کو کس رنگ میں ملانے سے کون رنگ تیار ہو جاتا ہے؟ (عملی طور پر استاد بچوں کو ملا کر دکھلائے کہ فلاں رنگ کو فلاں رنگ کے ساتھ ملانے سے فلاں رنگ تیار ہو جاتا ہے اور پھر بچوں سے بھی ایک ایک کر کے یہ کام کروایا جائے) مقررہ رنگ کس کس چیز میں ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب بچے بڑی مستعدی سے لکھوائیں گے اور ایک لمبی فہرست تیار ہو جائے گی جس کو استاد ذیل کے عنوانات میں تقسیم کر سکتا ہے۔

(۱) مختلف قسم کی تیتریاں (۲) مختلف قسم کے پرندے (۳) مختلف قسم کے پھول (۴) مختلف قسم کے جانور (۵) مختلف قسم کی چھالیں (۶) دھنک

رنگوں پر ایک سبق ترتیب دیا جا سکتا ہے جس میں اس قسم کی جملہ باتیں آسکتی ہیں اس کے علاوہ تیتری، پھول، اور پرندوں پر حسب معیار اور نصاب کے مطابق اسباق لکھے اور پڑھائے جا سکتے ہیں۔

جو ادبی حیثیت سے مفید ہوں گے۔ پھولوں، پرندوں، اور تیتری پر نظمیں پڑھائی جا سکتی ہیں۔ اسباق کو زیادہ بامعنی موثر اور واضح کرنے کے لئے، بچوں سے مختلف رنگ کے اونی اور سوتی کپڑے جمع کرائے جا سکتے ہیں۔ اس ضمنی بامقصد کام میں اگر بچوں کی چیزیں جمع کرنے کی فطری عادت کو تحریک دی جائے تو بچے مختلف رنگ کی تیتریاں، پر، تاگے، پھول، پتیاں اور ایسی ہی کتنی رنگین چیزیں جمع کر لائیں گے جن کو استاد کارڈ بورڈ پر نہایت قرینہ سے ترتیب دے کر جماعت میں آویزاں کر سکتا ہے اور اس سے تعلیمی فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔

عملی کام میں ابری بناتے وقت ایک جماعت نے تیتری کے سبق کے بعد کشتی میں تیتری کے پروں سے ملتی جلتی ابری بنائی اور پھر تیتری کی طرح قینچی سے کاٹ کر ایک پن میں لگا کر رکھا اس طرح کئی قسم کی تیتریاں بنوائی جا سکتی ہیں۔ رنگ برنگ کے پرندے اور پھول بھی لیئی کی ابری میں بنالئے جا سکتے ہیں۔ انہیں کارڈ بورڈ پر چپکا کر فریٹ ورک کی طرح کاٹا جا سکتا ہے کارڈ بورڈ کے ریشے جو اس آری سے کاٹنے سے نکل آئیں گے ریگ مال سے صاف کئے جا سکتے ہیں۔

حساب رنگوں کی خریداری میں روپے، آنے اور پیسے کی ضرب اور تقسیم سکھائی جا سکتی ہے۔ بذریعہ تجارت اور اکائی بھی قیمتیں پھیلائی جا سکتی ہیں۔ رنگوں کی قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں ایسا موقعہ آنے پر فی صدی کے سوالات سکھائے اور مزید مشق کے لئے نکلوائے جا سکتے ہیں۔ رنگوں میں مختلف رنگوں کی قیمتیں پھیلائی جا سکتی ہیں۔ مثلاً تیل کا رنگ (Oil colour)۔ پیسٹل کلر، موم پیسٹل کلر، واٹر کلر، کپڑے رنگنے کے رنگ اور وارنش کے رنگ۔

سوشل اسٹڈیز ہندوستان کی صنعت رنگ سازی بیسویں صدی کے وسط تک خوب ترقی پر تھی لیکن اس کے بعد سے اس صنعت کا کاروبار پھیکا پڑتا گیا۔ اس کی وجوہات کا تاریخی حیثیت سے مطالعہ کرنا تاریخی واقعات کے سمجھنے میں مدد دے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان تمام باتوں کا مطالعہ بھی بے حد دلچسپ ہو گا جن سے ہندوستان کی دوسری صنعتوں کی تباہی واقع ہوئی۔ ہندوستان میں رنگ کی ضرورت اب بھی مختلف طریقوں سے پوری کی جاتی ہے۔ مثلاً ہرسنگھار کے پھول سے لال رنگ نکالتے ہیں۔ مہندی کی پتیوں سے لال رنگ حاصل کرتے ہیں۔ ہلدی سے اور ٹیسو کے پھول سے زرد رنگ نکالتے ہیں

اور دیہاتوں میں استعمال کرتے ہیں لیکن یہ تمام صورتیں محنت طلب ہیں اس لئے عوام باہر سے آئے ہوئے رنگ ہی کو استعمال کرتے ہیں۔

ہندوستان کا نقشہ بنوایا جا سکتا ہے اور صوبہ بہار اور اس کا وہ رقبہ بنوایا جا سکتا ہے جہاں نیل کی کاشت ہوتی تھی۔ صوبہ بہار کی دوسری پیداواروں پر نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ اس علاقہ میں اب نیل کی کاشت کی بجائے گنے کی کاشت ہوتی ہے اور وہ تمام رقبہ جہاں بیسویں صدی کے وسط تک نیل بنانے کے کارخانے نظر آتے تھے، شکر سازی کے کارخانوں میں تبدیل ہو گیا ہے۔ خام اجناس اور پھل کی پیداوار کے اعتبار سے بہار کا صوبہ بہت ہی خوش قسمت ہے۔ جغرافیہ کے اسباق میں آب و ہوا، ذریعہ آمد و رفت اور مشہور شہر اور منڈیاں تبلائی جا سکتی ہیں۔

آج کل تمام رنگ جرمنی اور انگلستان سے آتے ہیں۔ ان کی بابت بھی جغرافیہ کے اسباق کے تحت معیار کے مطابق مختلف جماعتوں میں مختلف باتیں تبلائی جا سکتی ہیں۔ ذریعہ آمد و رفت اور بندرگاہوں کے اسباق تیار کر کے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

مٹی کا تیل کہاں سے آتا ہے؟ کیسے نکالا جاتا ہے؟ کیسے آتا ہے؟ بازاروں میں کیسے بکتا ہے؟ اس کا کیا استعمال ہے۔ برما کے علاوہ دنیا میں مٹی کا تیل اور کہاں کہاں پایا جاتا ہے؟ نقشوں کی مدد سے اس کے متعلق ضروری واقفیت دی جا سکتی ہے۔

جنرل سائنس | تیتری کی مکمل زندگی، یعنی لاروا، پیوپا اور مکمل تیتری۔ تیتری ایک پھول سے اڑ کر دوسرے پھول پر جانے میں کیا خدمت انجام دیتی ہے؟ مکمل پھول اور نامکمل پھول۔ ان کی پہچان۔ نامکمل پھول جس میں صرف مادہ حصہ ہوتا ہے اس وقت مکمل ہوتا ہے جب تیتری نر پھول کا برادہ جس کو پولن کا برادہ کہتے ہیں، اپنے پیروں اور سونڈوں کے ذریعہ لے جا کر مادہ پھول پر ڈالتی ہے۔ تیتری کی طرح کے دوسرے کیڑے بھی جو اس قسم کی خدمت انجام دیتے ہیں، پڑھائے جا سکتے ہیں۔

تیل اور دوسری تیل سے ملتی جلتی رقیق چیزیں پانی پر کیوں تیرتی ہیں؟ تجربے سے معلوم کیا جائے۔

٭

"ہماری مشکلات کا حل"

(از جناب محب الحسن خاں صاحب بی۔ اے۔ آنرز (لندن))

گذشتہ دو سو برس کے اندر مغربی ممالک نے حیرت انگیز اختراعات اور ترقیاں کی ہیں لیکن ابھی تک وہ سماجی انصاف کے اعتبار سے بہت پیچھے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چند لوگوں کے پاس دولت جمع ہو گئی ہے اور وہ عیش و آرام سے زندگی گذارتے ہیں لیکن محنت اور مشقت کرنے والوں کے دن بھوک تنگدستی اور مصیبت میں کٹتے ہیں۔ انسانی ہمدردی اور محبت ہر طرف مفقود ہو رہی ہے اور اس کے بجائے تجارتانہ ذہنیت اور خود غرضی کا ہر جگہ دور دورہ ہے۔ چند سرمایہ دار ملک دنیا کو غلامی اور استبدادیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی مطمئن نہیں نظر آتے بلکہ ایک دوسرے سے ایسی جنگ کی تیاریوں میں مشغول ہیں جو یقیناً موجودہ تمدن کو خاک میں ملا دے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر ان تمام کا کیا علاج ہے۔ کیا ہماری موجودہ سوسائٹی میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ ہماری زندگی کو بہتر بنا سکے۔ یا سوا اس کے کوئی چارہ نہیں کہ موجودہ سماج کو شیرازہ کشی نئے اصول پر جمایا جائے۔ یہی دو مسئلے ہیں جو کہ اس مضمون میں زیر بحث ہوں گے۔

دنیا میں بہت سے ماہر تعلیم[1] اور فلسفی ایسے ہیں جن کو سرمایہ دارانہ نظام میں کوئی خلقی نقص نہیں نظر آتا بلکہ صرف چند ظاہری خامیاں جو کہ ان کے خیال میں رفتہ رفتہ اچھی تعلیم کے ذریعہ سے دور ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح کلیسا کے سربرآوردہ پیشواؤں کا یہ خیال ہے کہ دنیا میں ایک عظیم الشان

---

[1] جان ڈیوی (John Dewey) جو امریکہ کا بہت بڑا ماہر تعلیم اور فلسفی ہے، اپنی کتاب فلسفہ اور تمدن صفحہ ۳۲۹ میں اس نظریہ کو بہت زور کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

تغیر ظہور میں آسکتا ہے، اگر حضرت عیسیٰ کی ہدایت پر لوگ قدم بقدم چلیں۔ ہندوستان میں گاندھی جی اپنے فلسفہ اہنسا کے ذریعہ سے نہ صرف اس ملک کا بلکہ تمام دنیا کا اخلاق اور روحانی معیار بلند کرنے کے لئے تیار ہیں۔

سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا محض تعلیم ہماری زندگی کو بہتر بنا سکتی ہے اور کیا اس میں اتنی قدرت ہے کہ ہماری مشکلات کو حل کر سکے۔ ان سوالات کے جواب کے لئے ہمیں مغربی یورپ کے حالات پر نظر ڈالنا پڑے گی۔ مغربی یورپ میں ہم دیکھتے ہیں کہ حالانکہ وہاں ایک عرصہ سے تعلیم عام ہے لیکن پھر بھی بے روزگاری افلاس اور تمام انسانی کمزوریاں موجود ہیں۔ اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ چونکہ وہاں تعلیم میں بڑے نقائص ہیں اس لئے سوسائٹی میں بھی خامیاں ہیں لیکن اگر اچھی تعلیم کا پرچار کیا جائے تو لوگوں کا اخلاقی معیار بہت بلند ہو سکتا ہے اور ان کی زندگی سے ظلم اور بے انصافی وغیرہ مٹائے جا سکتے ہیں، مگر اس خیال کے حامی بدقسمتی سے یہ نہیں سمجھتے کہ موجودہ حالات میں اچھی تعلیم کا رائج کرنا ہی ناممکن بات ہے۔ جو برسر اقتدار طبقہ ہے اور جس کے ہاتھ میں تمام نظام ملکی ہے، وہ یہ نہیں چاہتا کہ عوام کو اچھی تعلیم دی جائے اور ان پر حقیقت روشن کی جائے، کیونکہ اس میں ان کے مفاد معرض خطر ہو جاتے ہیں۔ تعلیمی ادارے حکمراں طبقہ کے لئے ایسے مفید آلہ ہیں کہ جن کے ذریعہ سے وہ اپنے اثر اور قوت کو قائم رکھتے ہیں۔ وہ عوام کو ایسی تعلیم دیتے ہیں جو ان کو ان کی موجودہ حالت پر قائم رکھے۔ ان کو ابھرنے نہ دے اور جو ان میں فرماں برداری اور غلامی کی ذہنیت پیدا کرے، مثلاً انگلستان میں بادشاہ سے محبت اور وفاداری کرنے کے لئے ایک عظیم الشان پروپگینڈہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح لوگوں کے دلوں پر یہ بات جاگزین کی جاتی ہے کہ سرمایہ داری ایک قدرتی نظام ہے۔ امیر حکومت کے لئے پیدا ہوا ہے اور غریب محکومیت کے لئے، غربت اور امارت ازل سے ہیں اور ابد تک رہیں گی۔ بالکل یہی تعلیم ہم کو ہندوستان میں دی جاتی ہے، صرف فرق اس قدر ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم محض یہاں کے امرا کا گیت گائیں ہم کو اپنے غیر ملکی حکمرانوں کی بھی قصیدہ خوانی کرنی پڑتی تھی، چنانچہ

تعلیم کا مطلب بالکل فوت ہو جاتا ہے۔ وہ تعلیم بالکل بے کار ہے جو حقیقتِ حال کو پوری طرح واضح نہ کر سکے بلکہ واقعات پر پردہ ڈال دے ہماری سوسائٹی میں فی الحال اسی طرح کی تعلیم رائج ہے اور یہ رہے گی جب تک اس میں دو طبقہ قائم رہیں گے یعنی حاکم و محکوم آسودہ و غیر آسودہ۔ امیر و غریب وہ جو بغیر محنت کے آرام و آسائش اٹھاتے ہیں اور وہ جو محنت و مشقت کے باوجود بھی پیٹ اور تن کے محتاج رہتے ہیں۔

اب ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ کیا محض وعظ و تلقین سے دنیا کی حالت بہتر ہو سکتی ہے؟ انگلستان میں فیبن سوشلسٹس (Fabian Socialists) جن کے برنارڈ شا (Bernard Shaw) اور سڈنی ویب (Sidney Webb) بڑے رکن ہیں اسی خیال کے حامی ہیں کہ اگر اشتراکیت کا کافی پروپگنڈہ کیا جائے تو سرمایہ دار خود بخود اس کی خوبیاں سمجھ کر سوشلسٹس بن جائیں گے اور اپنی جائدادیں خوشی سے قوم کے حوالہ کر دیں گے۔ اسی طرح جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، ہمارے ملک میں گاندھی جی انسان کو بغیر سوسائٹی کے نظام میں بنیادی تبدیلی کئے ہوئے اپنے اہنسا کے ذریعہ سے فرشتہ بنا دینا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ وعظ اور تلقین کے اثر کے اس قدر قائل ہیں کہ انسانی نفسیات کو بالکل بھول جاتے ہیں، یہ اس بات کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں کہ جو سماجی نظام غیر مساوات کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، وہ اپنے میں اتنی صلاحیت ہی نہیں رکھتا کہ انسانی زندگی کو بہتر بنا سکے۔ اس میں معدودے چند لوگ ذرائع پیداوار پر قابض ہو جانے کی وجہ سے دنیا کی تمام چیزوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اکثریت کو وہ مواقع نہیں ملتے جس سے وہ اپنی شخصیت کو ترقی دے سکیں۔ عوام کی زندگی جہالت غلامی اور افکار معاش میں صرف ہوتی ہے۔

دوسری بات جو ہم کو سمجھنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ کوئی جماعت اپنے مفاد کو کبھی نہیں چھوڑتی خواہ کتنی ہی اس کو تلقین کی جائے۔ اگر محض بات چیت سے کام چلتا ہوتا تو فرانس اور روس میں انقلاب نہ ہوتے اور بے کار خون کی ندیاں نہ بہتیں۔ اصل قصہ یہ ہے کہ بغیر انقلاب کے

ترقی نہیں ہوتی، اور جو پارٹی اس راز کو نہیں سمجھ سکتی وہ صحیح قیادت نہیں کر سکتی ہے۔ اسٹریا، جرمنی اور اٹلی کی اشتراکی پارٹیاں "وعظ و تلقین" پر زیادہ زور دیتی رہیں۔ اس لئے کہ ان کو سرمایہ داروں کی طرف سے بہت حسن ظن تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ان ملکوں میں ایسی ہولناک تنزل پذیر اور وحشیانہ حکومت قائم کرنے کے لئے، جس کو ہم فسطائیت کے نام سے پکارتے ہیں، راستہ کھول دیا۔

میرا اس بحث سے یہ مطلب نہیں کہ انسان فطری طور پر بے حس، بد خلق، خود غرض، بے انصاف اور ظالم پیدا ہوا ہے جیسا کہ انگریز فلسفی (ہابس (Hobbes) کا خیال تھا۔ نہ میرا روسو (Rousseau) کی طرح ایمان ہے جس کی رو سے انسان طبیعتاً نیک نفس، منصف مزاج، خوش اخلاق اور ایثار پسند ہے لیکن اس کو سماج نے خراب کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان نہ پیدائشی طور سے اتنا بڑا ہے جیسا کہ ہابس (Hobbes) کا خیال ہے اور نہ اتنا اچھا جیسا کہ روسو (Rousseau) کا۔ انسان کی طبیعت کا انحصار اس کے ماحول پر ہے اور اس کے معاشی حالات پر جب تک کہ اس مسئلہ کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے گا ہماری زندگی بہتر نہیں بن سکتی۔

ہماری سوسائٹی میں اس قدر عیوب ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار پر قوم کا قبضہ نہیں بلکہ افراد کا ہے۔ دولت آفرینی عوام کے فائدے کے لئے نہیں کی جاتی بلکہ ذاتی منفعت کے لئے، یہی دنیا کی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ بین الاقوامی جنگیں کیوں ہوتی ہیں؟ اس لئے کہ ایک ملک کے سرمایہ دار دوسرے ملک کے سرمایہ داروں کے بازاروں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی کمزوریوں کا سب سے زیادہ ذمہ دار ہمارا موجودہ معاشی نظام ہے۔ اس لئے قبل اس کے کہ کسی اور بات کی طرف توجہ کی جائے، ہمارے لئے یہ لازم ہے کہ ہم اس کی تشکیل اشتراکی اصول پر کریں۔ میرا اس بحث سے یہ مقصد نہیں کہ تعلیم غیر ضروری چیز ہے اور بس اشتراکی حکومت قائم کر دینے سے تمام مشکلات حل ہو جائیں گی۔ ہرگز نہیں۔ مطلب میرا یہ ہے کہ معاشی نظام کا سوال ایک بنیادی

مسئلہ ہے اس لئے اس کا حل سب سے پہلے ضروری ہے۔ دوسری دشواریوں کو ہم اسی وقت دور کر سکتے ہیں جب ذرائع پیداوار پر قوم کا قبضہ ہو جائے۔

میدان تعلیم میں جو نئی نئی باتیں معلوم کی گئی ہیں یا فرائیڈ (Freud) نے جو نئے نئے نظریہ انسانی نفسیات پر قائم کئے ہیں ان سے ہم موجودہ سرمایہ داری نظام کے ہوتے ہوئے فائدہ نہیں حاصل کر سکتے اس لئے کہ سرمایہ دار اس کے مخالف ہوں گے۔ مثلاً ایڈورڈ گلوور (Edward Glover) جو کہ فرائڈ (Freud) کے ایک بڑے شاگرد ہیں اپنی کتاب "انسان ہونے کے خطرات"[1] میں لکھتے ہیں کہ "دنیا میں جتنی خرابیاں ہیں تعلیم کے ذریعہ سے دور ہو سکتی ہیں" ان کا خیال ہے کہ ماؤں کو اپنے بچوں کی پرورش پہلے چار پانچ برس کرنا ضروری ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو عورت تین بچے رکھتی ہو اس کو تقریباً دس برس تک ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کرنا ہوگی اور اس زمانہ میں یہ باپ کے لئے بھی مناسب ہوگا کہ وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ کافی وقت صرف کرے۔ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس کو پانچ گھنٹے روزانہ سے زیادہ کام نہ کرنا چاہیئے تاکہ وہ باقی وقت کھانے آرام کرنے اور اپنے بیوی بچوں میں صرف کرے۔ ڈاکٹر گلوور (Glover) نے یہ اسکیم تو خوب پیش کی لیکن ان کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ سرمایہ پرست سرمایہ دار جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ہے کب اس پر کاربند ہونے کی اجازت دیں گے یہ اس کی شدید مخالفت کریں گے کیونکہ مزدوروں سے زیادہ سے زیادہ کام لینا اور کم سے کم اجرت دینا ان کا شیوہ ہے۔ ڈاکٹر گلوور کی اسکیم پر اگر کہیں عمل ہو سکتا ہے تو صرف سویٹ روس میں۔ اس لئے کہ وہاں کی حکومت کے مدنظر کسی ایک طبقہ کا فائدہ نہیں بلکہ عوام کا۔ اس لئے کہ وہاں کے لوگوں نے سرمایہ داری نظام سے سبکدوشی حاصل کر لی ہے اور اشتراکی حکومت قائم کر دی ہے جس میں ذرائع پیداوار پر افراد کا قبضہ نہیں ہے بلکہ قوم کا۔

---

[1] "انسان ہونے کے خطرات" ۱۵ء (Dangers of Being Human)

میرا اس بحث سے تعلیم و تربیت، پند و نصائح کی اہمیت کو کم کرنا نہیں صرف مقصد یہ ہے کہ میں دنیا کے معاشی نظام کو سب سے بنیادی سوال سمجھتا ہوں۔ سب سے پہلے اسی کا حل ضروری ہے۔ اس کے بعد اور چیزوں کا۔ اگر معاشی نظام بدل دیا جائے تو پھر تعلیم و تربیت پر کافی زور دیا جا سکتا ہے اور اس سے فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال نیکی کے لئے تلقین ذرا بے معنی ہوتی ہے اس لئے کہ اس پر عمل مشکل ہے یہ کہنا کہ "چوری مت کرو" تو بہت آسان ہے لیکن کیا اس پر وہ آدمی عمل کر سکتا ہے جس کو دو یا تین دن سے کھانا نہ ملا ہو اور جس کے بیوی اور ننھے ننھے بچے بھوک کی وجہ سے تلملا رہے ہوں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ کچھ دن ہوئے انگلستان میں ایک بھوکی عورت نان بائی کی دوکان سے ایک روٹی چراتی ہوئی پکڑی گئی۔ گورنمنٹ نے بجائے اس کے کہ اس کو نوکری دلائی ہوتی قید کی سزا دی۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، یہ تو تمام سرمایہ داری حکومتوں کے طریقے ہیں ہم یہ نہیں سمجھتے کہ جرائم پیشگی کی بنیاد ہمارے معاشی نظام میں ہے، اگر اس کو بدل دیا جائے تو جرائم بھی دور ہو جائیں گے۔ بجائے اس کے کہ لوگوں سے کہا جائے کہ چوری مت کرو، جھوٹ مت بولو وغیرہ وغیرہ۔ ہم کو چاہیئے کہ ایسی صورتیں پیدا کر دیں، ایسا نظام قائم کریں کہ برائی کرنے کی ترغیب ہی نہ رہے، یعنی اگر لوگوں کا افلاس دور کر دیا جائے تو جرائم کی تعداد میں بہت کثرت سے کمی ہو سکتی ہے۔ یہ درست ہے کہ جرائم دماغی خرابیوں کی وجہ سے بھی کئے جاتے ہیں لیکن یہ دماغی خرابی بھی ہمارے موجودہ سماج کا ایک نتیجہ ہے۔ ایک نئے قسم کا ماحول اور ایک نئے قسم کی تعلیم کے ذریعہ سے جرائم کے نفسیاتی اسباب بھی دور کئے جا سکتے ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے صنعتی انقلاب کے قبل ہمارے سماجی نظام کی تشکیل صرف ذاتی ملکیت ہی کی بنیاد پر ہو سکتی تھی اس وجہ سے کہ اس وقت کی پیدائشی قوتیں غیر ترقی شدہ اور کمزور تھیں۔ سوسائٹی کی بقا کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ دو طبقوں میں منقسم رہے۔ ایک طبقہ ایسا ہو جو محض پیدائش کا کام کرے اور اتنا وافر سامان پیدا کرے کہ دوسرے طبقہ کو اس کی تلاش

معاش کے افکار سے نجات دے تاکہ یہ حکومت کے انتظام میں اور علوم و فنون کی ترقی کے لئے اپنا وقت صرف کرے۔ یہ تقسیم کار اٹھارھویں صدی کے قبل ضروری تھا اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ جن گروہوں نے اس اصول کے خلاف کوشش کی کہ ذاتی ملکیت کو اڑادیں اور معاشی مساوات قائم کریں، وہ ناکامیاب رہے۔ اس لئے کہ ایسے نظام کے قائم کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ سوسائٹی کا ہر فرد پیدائشی کام میں مشغول رہتا تب کہیں سب کی ضروریات پوری ہو سکتی تھیں۔ لیکن پھر حکومت کا کام کون کرتا۔ ادب، سائنس اور فلسفہ کو، جو انسان کی دماغی زندگی کے لئے وہی اہمیت رکھتے ہیں جیسے کھانا اور پینا اس کی جسمانی زندگی کے لئے، کون ترقی دیتا۔ ان حالات میں سماج کا کام ایک دن بھی ٹھیک سے نہیں چل سکتا تھا۔

صنعتی انقلاب کے بعد حالات بالکل مختلف ہو گئے چنانچہ اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن اصولوں پر ڈیڑھ سو برس پہلے عمل محض خواب وخیال تھا، اب اس پر عمل نہ صرف دائرہ امکان میں آگیا ہے بلکہ اگر ان اصولوں کو اختیار نہ کیا جائے گا تو موجودہ سوسائٹی تباہ و برباد ہو جائے گی پیدائشی قوتیں اب اتنی ترقی کر گئی ہیں کہ پرانے تقسیم کار کی کوئی ضرورت نہیں رہی ہے۔ فی زمانہ اس کی ضرورت نہیں کہ سوسائٹی دو طبقوں میں منقسم رہے۔ اب اگر سب لوگ چند گھنٹہ روزانہ پیدائشی کام میں اپنا وقت صرف کریں تو نہ صرف اتنا وافر سامان پیدا ہو سکتا ہے کہ سب کی ضروریات پوری ہو جائیں بلکہ سب کو اتنا موقع اور وقت مل سکتا ہے کہ وہ حکومت کے کام میں اور علم و فن کی ترقی میں حصہ لے سکیں۔ باوجود ان باتوں کے دنیا کا بیشتر حصہ ابھی پرانے اصول پر منظم ہے یعنی ذاتی ملکیت پر۔ چند اشخاص کے پاس دولت جمع ہو گئی ہے اور وہ اس کے ذریعہ سے ایک کثیر اکثریت کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں نہ صرف پیدائشی قوتوں کی ترقی رکی ہوئی ہے بلکہ وہ تیزی کے ساتھ تنزل کی طرف جا رہی ہیں۔ بے روزگاری، مستقل کساد بازاری، افلاس اور خطرہ جنگ اس کے لئے صاف دلالت کرتی ہیں۔

دنیا میں صرف ایک ملک ہے جس نے اپنے معاشرتی نظام کی عمارت اس بے بہا بنیاد پر کھڑی کرلی ہے جس میں ذرائع پیداوار پر قوم کا قبضہ ہے نہ کہ افراد کا۔ وہ ملک سویٹ روس ہے جب سے سویٹ روس نے ذاتی ملکیت کو اڑا دیا وہ ترقی کے مدارج تیزی کے ساتھ طے کر رہا ہے ان حالات کو دیکھ کر یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں انسان اتنا خوش اور بہتر ہو جائے گا جتنا کہ وہ اپنی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا بیس برس کے قلیل معیار میں جو ترقیاں وہاں ہوئی ہیں، وہ مغربی یورپ کی صدیوں کی تہذیب اور تمدن کو شرمانے کے لئے ابھی سے کافی ہیں۔ فرانس اور انگلستان کے مدبرین ایک عرصہ سے بے روزگاری کے سوال کو حل کرنے کے لئے کوشش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک نہ کوئی کامیابی نصیب ہوئی ہے اور نہ اس کے کوئی آثار نظر آتے ہیں البتہ جرمنی نے بے روزگاری دور کر دی ہے لیکن دو تباہ کن طریقہ اختیار کر کے یعنی مزدوروں کی اجرت کم کر کے اور ان کو اسلحہ جنگ کی فیکٹریوں میں نوکری دلا کر برخلاف اس کے روس میں مزدوروں کی اجرت برابر بڑھ رہی ہے اور مزدور اس کام پر نہیں مامور ہیں کہ وہ دوسرے ملکوں کی آزادی چھیننے کے لئے سامان جنگ تیار کریں، بلکہ ان کی تمام قوتیں ان کی ضروریات زندگی کی چیزیں بنانے میں صرف ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں لوگوں کا معیار زندگی برابر بڑھ رہا ہے اور مزدور اتنے خوش و مطمئن نظر آتے ہیں، جتنے کہ دنیا کے کسی حصہ میں نہیں ہیں۔ ان کو روزانہ زیادہ سے زیادہ آٹھ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے، یہ محض اس لئے کہ وہ اپنا باقی وقت مختلف دلچسپیوں میں صرف کریں۔ ان کے بچوں کے لئے اسکول اور پرورش گاہیں ہیں جہاں وہ بہت اہتمام اور آرام کے ساتھ رکھے جاتے ہیں تاکہ وہ شہروں کی گلیوں میں جب کہ ان کے ماں باپ کام میں مشغول ہوں کس مپرسی کی حالت میں آوارہ گردی نہ کریں۔ چنانچہ اس وقت ماسکو (Moscow) جیسے بڑے شہر میں میلے کچیلے بچے گلیوں میں کھیلتے ہوئے مشکل سے دکھلائی دیں گے۔ سویٹ روس نے عورتوں کے مرتبہ کو بھی بہت ملند کر دیا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں عورت کو سب سے پہلے اسی ملک میں آزادی نصیب ہوئی ہے۔ ان کو وہی حقوق

حاصل ہو گئے ہیں جو کہ مردوں کو۔ ان کو مرد کے برابر اجرت ملتی ہے ہر آدمی کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ لڑکے کی ماں (خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ) کی اپنی کمائی کے چوتھائی حصہ سے کفالت کرے چاہے وہ اس کے ساتھ زندگی بسر کرے یا نہ کرے۔ حاملہ عورتوں کو چار ماہ کی پوری تنخواہ پر چھٹی مل جاتی ہے اور یہ معیار ڈاکٹر کی رائے سے بڑھ سکتا ہے عصمت فروشی قریب قریب بالکل کم ہو گئی ہے۔ انقلاب سے پہلے زار کے (Czar) زمانے میں تقریباً بیس ہزار رنڈیاں ماسکو میں تھیں لیکن اب صرف چار سو رہ گئی ہیں اور یہ تعداد بھی ملک کی معاشی اور تعلیمی ترقی کے ساتھ باقی نہ رہیگی۔

سویٹ حکومت عوام کی محض جسمانی نشو و نما کو ضروری نہیں سمجھتی بلکہ ساتھ ساتھ ان کی دماغی اور روحانی زندگی کو بھی بہتر بنانا اپنا فرض جانتی ہے۔ سنہ ۱۹۱۷ء کے پہلے حکومت وقت تعلیمی معاملات میں نہ صرف دلچسپی ہی نہیں لیتی تھی بلکہ تعلیم عامہ کی مخالف تھی اس لئے کہ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ لوگوں میں سیاسی شعور اور کسی قسم کی بیداری پیدا ہو۔ لیکن جب سے بالشویک پارٹی برسر اقتدار ہوئی ہے ملک میں تیزی کے ساتھ تعلیمی ترقی جاری ہے۔ تاتاریوں اور مغلوں کی زبانوں کے حروف جو کہ پہلے ملاؤں اور پادریوں کا اجارہ تھے اور ان کا سیکھنا دشوار تھا اب آسان کر دئے گئے ہیں تاکہ عوام ان کو آسانی کے ساتھ سیکھ سکیں۔ بہت سی زبانوں کے پاس نہ کوئی حروف تھے اور نہ کوئی خط چنانچہ حکومت نے بڑے بڑے ادیب مقرر کئے جنہوں نے محنت اور مشقت کر کے ان زبانوں کے لئے نئے حروف ایجاد کئے۔ مزدوروں اور کسانوں کے پڑھنے کے لئے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ فیکٹریوں میں کتب خانے قائم ہیں اور ملک میں تقریباً سات عرب کتابیں ہر سال شائع ہوتی ہیں جس میں مختلف اقوام کے بڑے بڑے پرانے ادیب اور فلسفیوں کی تصانیف بھی شامل ہیں۔

اقلیتوں کے مسئلہ میں بھی روس نے جرأت انگیز کامیابی حاصل کی ہے اس وقت دنیا کے ہر حصہ میں غیر رواداری اور قومی تعصب کا چرچہ ہو رہا ہے لیکن روس میں ایسا ملک ہے جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں اقلیتوں کا سوال تقریباً بالکل حل ہو گیا۔ نہ صرف روسی حکومت

اقلیتوں کی اقتصادی زندگی کی ترقی کی ذمہ دار بن گئی بلکہ اس نے ان کی تہذیب، زبان اور ان کے روایات کو قائم رکھنے اور ترقی دینے کا بھی ذمہ لے لیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں سویٹ جمہوریت میں روزافزوں ترقی ہو رہی ہے اور جہاں مغربی یورپ کے باشندوں پر افسردگی، بے اطمینانی اور بے بسی کے آثار چھائے ہوئے ہیں وہاں کے لوگوں کے دلوں میں جوش بھروسہ اور استقلال موجیں مار رہا ہے اس لئے کہ یہ ان کا ایمان ہے کہ وہ انسانی زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

اس بیان سے یہ نہ اخذ کرنا چاہیئے کہ ذرائع پیداوار کو افراد کے چنگل سے نکال کر قوم کے سپرد کرنے کے بعد سویٹ روس کے سامنے اب کوئی سوال نہیں ہے۔ اصل میں ابھی تو بڑے بڑے مرحلے سر کرنا ہیں لیکن میرا جو اس بحث سے مقصد ہے وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی میں کوئی بنیادی اور مستقل تبدیلی محض تلقین اور وعظ سے نہیں ہو سکتی ہے بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ذرائع پیداوار کو افراد کے تصرف سے نکال کر قوم کے حوالے کریں۔ اس کے بعد پھر پند و نصائح مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور تعلیم و تربیت سچے معنوں میں کی جا سکتی ہے۔

فلسفۂ لغت

(از جناب محمد کامل صاحب باب عالی فرنگی محل)

(بہ سلسلۂ سابق)

درصل عربی زبان کیا ہے | دنیا کی اکثر زبانیں خواہ وہ تورانی کی شاخیں ہوں یا آریائی کی کچھ نہ کچھ سامی زبانوں سے متاثر ضرور ہوئی ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ عربی پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔ سامی تمام زبانوں میں الفاظ کے اعتبار سے وسیع تر ہے۔ کیونکہ اسلام پھیلنے کے بعد جزیرۃ العرب میں بولی جانے والی دوسری زبانیں اس میں جذب ہو گئیں۔ علاوہ بریں اس کا دامن علمی خزانوں سے مالا مال ہے۔

علماء لغت کا اس بارہ میں اختلاف ہے کہ سامی زبانوں میں کون کس کی شاخ ہے۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ سامی کی بڑی بڑی اصلیں عبرانی سریانی اور عربی اب تک زندہ ہیں جن میں سے کوئی ایک دوسری کی شاخ نہیں ہے۔ لیکن یہ تینوں ایک اصل کی شاخیں ضرور ہیں جس کو دوآبہ میں بسنے والے سامی بولتے تھے مگر امتداد زمانہ سے فنا ہو گئی جن لوگوں نے طوفان کے بعد دوآبہ کی درمیانی سرزمین کو آباد کیا توریت انکو ارض شنعار کے بسنے والے سے تعبیر کرتی ہے۔ اقتضاء زمانہ سے اس قوم کے فرقے منتشر ہونا شروع ہوئے اور ایشیا کی مختلف سمتوں میں پھیلتے چلے گئے جن کی ضروریات زندگی کے مطابق زبانوں میں ارتقا ہوتا رہا۔ ان مہاجرین میں سے بعض لوگ شام کے ساحلی مقامات پر آباد ہو گئے ان کی زبان جو عبرانی کی ایک شاخ ہے فینیقی کے نام سے موسوم ہوئی بعض لوگ عراق عرب میں جا بسے۔ ان کی زبان آشوری کہلاتی تھی جس کی شاخیں سریانی اور کلدانی ہیں۔ کچھ لوگوں نے جزیرہ نمائے عرب کی سکونت اختیار کی، ان کی زبان ترقی کر کے عربی کہلائی جس کی شاخیں حبشی، حمیری، عدنانی۔ اور قرشی تھیں

مؤخر الذکر وہ زبان ہے جس میں کلام پاک نازل ہوا اور جس کو ابھی تک عربی بولنے والی قومیں بطور تحریری زبان کے استعمال کرتی ہیں۔

مذکورۂ بالا سامی زبانیں ایک ہی مرتبہ میں نہیں پیدا ہوئیں بلکہ ضرورتوں کے مطابق تبدریج ارتقار طبعی کے مدارج طے کرتی رہیں۔ ان زبانوں کو سامی سے علیحدہ ہوئے جس وقت تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا اس وقت آپس میں ایک دوسری سے بہت مشابہ تھیں۔ وہ تمام عربی قبائل جو اس وقت جزیرہ نمائے عرب مصر، شام، عراق اور بلاد مغرب میں آباد ہیں عربی بولتے ہیں لیکن ایک گروہ دوسرے گروہوں سے جتنا دور ہے اسی تناسب سے اس کی زبان اور دوسروں کی زبان میں تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ قرآن شریف ان سب کے لئے مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کلام پاک نہ ہوتا تو ہر شاخ اپنی جگہ ایک مستقل زبان ہو جاتی اور جس کو دوسری شاخیں بولنے والے سمجھ بھی نہ سکتے جیسا لاطینی زبان کی فرعون (فرانسیسی، ہسپینی، پرتگالی وغیرہ) میں ہوا لیکن عربی بولنے والے قبائل اپنی اپنی زبانوں کی حفاظت کلام پاک کے نمونہ پر کرتے ہیں اور تحریری زبان میں اس کی اتباع کرتے ہیں جو سب فرعون کو ایک اصل پر جمع کئے ہوئے ہے (تھوڑا بہت اختلاف بازاری اور عامیانہ زبانوں میں پایا جاتا ہے)

زمانہ قدیم میں جب سام کی نسل منتشر ہوئی اس وقت ان کے پاس کوئی لغت مدون نہ تھی اور نہ کوئی ایسا مرکز تھا جو سب فرعون کو جمع کئے رکھتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقتضار زمانہ نے طبعی طور پر اپنا اثر دکھایا کہ ان کی زبانیں شاخ در شاخ ہوتی چلی گئیں یہاں تک کہ کچھ صدیاں گذرنے پہ ہر ضرع ایک مستقل زبان بن گئی اور دوسری شاخوں سے مختلف ہو گئی۔ تاہم اگر کوئی شخص چاہے تو اصول و قواعد کی یکسانی جیسے وسائل اس کو مل جائیں گے جن سے وہ اصل تک پہنچ سکتا ہے عربی اور سریانی کی گردانوں اور الفاظ و معانی میں اتنی زبردست مشابہت ہے کہ ان کی اصل ایک ہونے میں شک ہی نہیں کیا جا سکتا۔

اگر عہد قدیم کے سفرنامے پڑھے جائیں تو یہی معلوم ہوگا کہ پرانے زمانہ میں یہ سب زبانیں

ایک جیسی تھیں حتیٰ کہ بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کا زمانہ آگیا اور وہ چالیس سال تک دشت سینا اور جزیرہ نمائے عرب میں رہے۔ باوجودیکہ ان کی زبان عبرانی تھی مگر جب عربوں سے ملتے تھے تو ایک دوسرے کی زبان بلا امداد ترجمان سمجھ لیا کرتے تھے۔ مثلاً اسی واقعہ کو لیجئے کہ ملکۂ سبا جو عرب کے ایک حصہ کی فرمانروا تھیں، حضرت سلیمان ابن داؤد علیہ السلام شاہ بنی اسرائیل کی ملاقات کے لئے سنہ ۔ ق ۔ م ۔ میں گئیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام سے ملیں تو دونوں نے بغیر مترجموں کے گفتگو کی۔ ایسے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک سامی زبان کی شاخیں ایک دوسرے سے مشابہ تھیں۔ غالباً ان کی اصل سے علیحدگی اور استقلال کو زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا۔

آریائی اور طورانی کی شاخوں پر سامی زبانوں کے اثرات

طورانی ۔ ۔ ۔ خلافت عباسیہ ترکوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنکر رہ گئی تھی وہ جس خلیفہ کو چاہتے معزول یا قتل کر دیتے اور جس کو چاہتے خلیفہ منتخب کر لیتے۔ باوجود اس سیاسی اقتدار کے جو انھیں خلافت پر خاص دار السلام بغداد میں حاصل تھا اپنی زبان کو عربی اثرات سے نہ بچا سکے۔ ترکی زبان عربی سے خوب متاثر ہوئی اکثر و بیشتر ترکی الفاظ متروک ہو گئے اور ان کی جگہ عربی الفاظ نے لے لی۔ ترکوں نے عربی رسم الخط اختیار کر لیا تھا جو مصطفےٰ کمال مرحوم کے ابتدائی دور تک رائج رہا لیکن مرحوم نے سیاسی مصالح کی بنا پر اس کو ترک کر کے لاطینی رسم الخط کو رواج دیا۔

مخلوط ——— ہندوستان میں خلجیوں کے عہد حکومت تک عربی کو بڑا عروج حاصل تھا حتیٰ کہ تعلیم یافتہ طبقہ کسی دوسری زبان میں خط کتابت کرنا بھی معیوب سمجھتا تھا اور فارسی عامیانہ بازاری زبان سمجھی جاتی تھی۔ اگرچہ اس عہد کے بعد عربی کی جگہ فارسی نے لے لی تاہم مذہبی زبان ہونے کی وجہ سے اس کا وقار قائم رہا۔ اب اردو جو ارتقائی حالت میں تھی فارسی کے مقابلہ پر عامیانہ زبان تسلیم کی گئی۔ باوجودیکہ اردو کی پیدائش اور نشو و نما ہندوستان ہی میں ہوئی پھر بھی آریائی زبان سے اتنی متاثر نہیں معلوم ہوتی جس قدر سامی سے ہے۔

دوسری متاثر ہونے والی زبانوں (جیسے ترکی فارسی وغیرہ) نے صرف الفاظ کی تبدیلی تک عربی کا اثر قبول کیا، ترکیبوں کا اس اثر سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن اردو زبان کے الفاظ اور ترکیبیں دونوں عربی سے اچھی طرح متاثر ہوئے۔ الفاظ کچھ تو اپنی اصلی حالت پر باقی رہے اور کچھ میں تلفظ کا ہلکا سا اختلاف پیدا ہو گیا۔ اول الذکر کی مثالیں کثرت سے ملیں گی۔ جیسے "ہوا" "آدمی" "لباس" "توجہ" "جاہل" "صحبت" "حکم" "صورت" "سلام" اور "منصب" وغیرہ۔ مؤخر الذکر کی کچھ مثالیں مندرجۂ ذیل ہیں۔

عربی (درا)، دہلی (درے) روہیلکھنڈ (اتے) ــــ عربی (قفل) لکھنؤ (قلف) حیدرآباد و مدراس (خفل) عامیانہ (کلف)۔ کلپھ) ــــ عربی (جنزیر (شہری) اردو (زنجیر) عامیانہ (جنجیر) ــــ عربی (وقت) دہلی و لکھنؤ (وقت) پنجاب (وکت) حیدرآباد (وخت) عامیانہ (وکھت)

ترکیبوں پر عربی اثرات کے چند نمونے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) الف و لام کا استعمال صرف سامی زبانوں کے لئے مخصوص ہے لیکن اردو میں ہم کو ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں الف و لام فارسی اور ہندی الفاظ پر داخل ہوا جیسے۔ قریب المرگ، جوان العمر ذوق البھڑک وغیرہ۔ اس میں مرگ خالص فارسی اور بھڑک ٹھیٹھ ہندی الفاظ ہیں۔

(۲) "و۔ ن" اور "ی۔ ن" بڑھا کر جمع بنانا عربی کے خصوصیات میں سے ہے مگر اردو میں بھی اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، جیسے کھال کی جمع "کھالوں۔ کھالیں" سڑک کی جمع سڑکوں۔ سڑکیں ــ میز کی جمع میزوں۔ میزیں ــ بوتل کی جمع بوتلوں۔ بوتلیں وغیرہ۔ (عربی میں "ن" کھلی ہوئی آواز دیتا ہے اردو میں غنہ ہو جاتا ہے اور حروف علت "و۔ ی" مجہول ہو جاتے ہیں۔)

(۳) "ا۔ ت" آخر میں لگا کر عربی کی جمع مؤنث سالم جیسی جمع بنائی جاتی ہے مثلاً۔ بیگمات کھنڈرات۔ باغات وغیرہ۔

(۴) الف یا ہائے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ میں حرف جار عربی کی طرح اپنا اثر کرتے ہیں جیسے "لوٹا۔ یا آملہ" ان پر جب حرف جار داخل ہو گا تو "ا" یا "ہ" یائے مجہول سے بدل جائیں گے

اور طویل کسرہ کی صورت پیدا ہوگی ۔ لوٹے پر ۔ لوٹے میں ۔ لوٹے سے ۔ لوٹے تک ۔ آملے سے آملے پر ۔ آملے میں ۔ آملے تک ۔ یہی صورت حالت اضافت میں بھی عربی کی طرح برقرار رہے گی لوٹے کی ٹونٹی ۔ آملے کا مربہ ۔

(۵) تنوین کا استعمال بھی عربی ہی سے ماخوذ ہے جیسے ۔ اندازاً ۔ نمونتہً وغیرہ ۔

(۶) آریائی زبانوں کی گردانوں میں تذکیر و تانیث کے لیے الگ الگ صیغے نہیں پائے جاتے "آیا" "آمد" مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے یکساں مستعمل ہے۔ بعض شاخوں میں صرف واحد مذکر غائب اور واحد مؤنث غائب میں تفریق کرنے کے لیے مذکر اور مؤنث کی ضمیریں بشرطیکہ موجود ہوں لگا دی جاتی ہیں جیسے "He came" اور She came لیکن اردو میں عربی اثر کے ماتحت مذکر اور مؤنث کے صیغے الگ الگ موجود ہیں جیسے ۔

	ماضی معروف	حال معروف	مستقبل معروف	ماضی مجہول	حال مجہول	مستقبل مجہول	اسم فاعل	اسم مفعول
واحد مذکر غائب	وہ لایا	وہ لاتا ہے	وہ لائے گا	وہ لایا گیا	وہ لایا جاتا ہے	وہ لایا جائے گا	لانے والا	لایا ہوا
واحد مؤنث غائب	وہ لائی	وہ لاتی ہے	وہ لائے گی	وہ لائی گئی	وہ لائی جاتی ہے	وہ لائی جائیگی	لانے والی	لائی ہوئی
جمع مذکر غائب	وہ لائے	وہ لاتے ہیں	وہ لائیں گے	وہ لائے گئے	وہ لائے جاتے ہیں	وہ لائے جائیں گے	لانے والے	لائے ہوئے
جمع مؤنث غائب	وہ لائیں	وہ لاتی ہیں	وہ لائیں گی	وہ لائی گئیں	وہ لائی جاتی ہیں	وہ لائی جائیں گی	لانے والیاں	لائی ہوئیں
واحد مذکر حاضر	تو لایا	تو لاتا ہے	تو لائے گا	تو لایا گیا	تو لایا جاتا ہے	تو لایا جائے گا	تو لانے والا	تو لایا ہوا
واحد مؤنث حاضر	تو لائی	تو لاتی ہے	تو لائے گی	تو لائی گئی	تو لائی جاتی ہے	تو لائی جائیگی	تو لانے والی	تو لائی ہوئی
جمع مذکر حاضر	تم لائے	تم لاتے ہو	تم لاؤ گے	تم لائے گئے	تم لائے جاتے ہو	تم لائے جاؤ گے	تم لانے والے	تم لائے ہوئے
جمع مؤنث حاضر	تم لائیں	تم لاتی ہو	تم لاؤ گی	تم لائی گئیں	تم لائی جاتی ہو	تم لائی جاؤ گی	تم لانے والیاں	تم لائی ہوئیں
واحد مذکر متکلم	میں لایا	میں لاتا ہوں	میں لاؤں گا	میں لایا گیا	میں لایا جاتا ہوں	میں لایا جاؤں گا	میں لانے والا	میں لایا ہوا
واحد مؤنث متکلم	میں لائی	میں لاتی ہوں	میں لاؤں گی	میں لائی گئی	میں لائی جاتی ہوں	میں لائی جاؤں گی	میں لانے والی	میں لائی ہوئی

جمع مذکر متکلم	ہم لائے	ہم لاتے ہیں	ہم لائیں گے	ہم لائے گئے	ہم لائے جاتے ہیں	ہم لائے جائیں گے	ہم لانے والے	ہم لائے ہوئے
جمع مؤنث متکلم	ہم لائیں	ہم لاتی ہیں	ہم لائیں گی	ہم لائی گئیں	ہم لائی جاتی ہیں	ہم لائی جائیں گی	ہم لانے والیاں	ہم لائی ہوئیں

صیغوں میں تذکیر و تانیث کا فرق سامی زبانوں کے لئے مخصوص ہے۔

آریائی —— فتح ایران کے بعد مشرقی آریائی زبانوں میں فارسی جس حد تک عربی سے متاثر ہوئی وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے یہاں تک کہ ایرانیوں نے بھی ترکوں کی طرح عربی رسم الخط اختیار کر لیا۔ موجودہ فارسی لغت میں تقریباً نصف الفاظ عربی کے ہیں جن میں سے کچھ الفاظ فارسی میں کھپ گئے جیسے طلبیدن۔ اور فہمیدن وغیرہ، اور کچھ اپنی اصلی حالت پر قائم ہے جن کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں جیسے خطا۔ صواب۔ جنت۔ ساقی۔ انس۔ عشق۔ حسن۔ سجادہ۔ خال۔ اسیر وغیرہ پہلے دور کی فارسی شاعری میں عربی بھی برابر کی شریک تھی بسا اوقات ایک مصرعہ فارسی میں اور دوسرا عربی میں ہوتا تھا مثلاً حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا — کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

حضوری گر ہمیں خواہی ازو غائب مشو حافظ — متی ما تلق من تہوی دع الدنیا واہملہا

آں لخوش کہ صوفی ام الخبائثش خواند — اشہی لنا و احلی من قبلۃ العذاری

شربت ناراز کف محبوبہ ام آمد بدست — قلتہا ذا قیل قالت اشرب قد کفاک

یا قرۃ العین طاہرہ کے اشعار ہیں

اگر آں صنم ز رہ ستم پئے کشتن من بگینہ — لقد استقام بسیفہ فلقد رضیت بما رضی

سحرے نگار ستمگرم قدمے نہاد ببسترم — فاذا رأیت جمالہ طلع الصباح کأنما

چو شنید نالۂ مرگ من پئے ساز من شدہ برگ من — فشکی علیہ مجدلاً وبکی علیہ مجلجلا

مغربی آریائی یا یورپی زبانیں تقریباً سب کی سب سامی لغات سے کم و بیش متاثر ہیں۔ فرانسیسی اور اطالوی زبانوں نے مفتوح ہونے کی وجہ سے عربی کے اثرات قبول کر لئے (مسلمانوں نے فتح اسپین کے بعد فرانس پر حملہ کر کے تقریباً نصف حصہ ملک پر قبضہ کر لیا تھا جو بعد میں ان کے

ہاتھ سے نکل گیا۔ صقلیہ (سسلی) کی وجہ سے اٹلی کی زبان عربی سے متاثر ہوئی)، انگلستان کے محل وقوع کے لحاظ سے کبھی یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ انگریزی کسی سامی زبان سے متاثر ہوسکے گی لیکن واقعات نے بتا دیا کہ وہ بھی سامی زبانوں کے عالمگیر اثرات سے نہ بچ سکی۔ عربی الفاظ اسپینیا سے فرانس میں ہو کر یا اٹلی سے جرمنی میں ہوتے ہوئے انگریزی زبان میں داخل ہو گئے یا حروب صلیبیہ کے دوران میں براہ راست انگریزی نے اخذ کئے (معرکہ ہائے صلیبی کے دوران میں ایک مشترک زبان بن گئی تھی جس کو دونوں فریق اظہار ما فی الضمیر کے لئے استعمال کرتے تھے۔) یورپ کی کل آبادی بجز چند بت پرست جرمن قبائل کے مذہب عیسوی کی پیرو تھی۔ اسی بنا پر ان کی مذہبی اصطلاحیں اور گذشتہ پیغمبروں کے نام عبرانی سے لئے گئے، جن کے تلفظ میں آلات نطق کے اختلاف کی وجہ سے کسی قدر فرق ہو گیا۔ (واضح رہے کہ عربی اور عبرانی تلفظ میں کہیں کہیں برائے نام فرق پایا جاتا ہے) مثلاً۔

اظہار رائے	انگریزی تلفظ	عربی تلفظ	اردو
	Abraham	ابراہیم	ابراہیم
	Amen	آمین	آمین
	Azrael	عزرائیل	فرشتہ موت
	Aadam	آدم ؑ	آدم ؑ
حضرت الیاس کے زمانہ میں آشوری اور سوری قومیں اس کو	Baal	بعل	ایک بت کا نام
پوجتی تھیں اس کا قدیم عبرانی تلفظ "بیت ایل" یعنی خانہ خدا ہے	Bethlehem	بیت اللحم	بیلت لحم
	Camel	جمل	اونٹ
اردو انجیل میں اس کو یوں لکھتے ہیں "ایلیاہ" لیکن اصل لفظ الیاس ہے	Elijah	الیاس ؑ	الیاس ؑ
	Eve	حوّا ؑ	حوّا ؑ

اردو	عربی تلفظ	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
اسحاقؑ	اسحاقؑ	Isaac	اردو انجیل میں اس کو یوں لکھتے ہیں (اضحاق)
بنی اسرائیل	اسرائیلی	Israelite	
یعقوبؑ	یعقوبؑ	Jacob	
عیسیٰؑ	عیسیٰؑ	Jesus	
ایوبؑ	ایوبؑ	Job	
یحییٰؑ	یحییٰؑ	Jehn	اردو انجیل میں اس کو یوں لکھتے ہیں (یوحنا)
ایک دریا	اردن ۔ یردن	Jordan	
یوسفؑ	یوسفؑ	Joseph	
آتش پرست	مجوس	Magi	
من وسلویٰ	من (وسلویٰ)	Manna	
مریمؑ	مریمؑ	Mary	
میکائیلؑ	میکالؑ	Mike	
موسیٰؑ	موسیٰؑ	Moses	
شہر ناصرہ کا باشندہ	نصرانی ۔ ناصری	Nazarene	حضرت عیسیٰؑ ہجرت کرکے ناصرہ تشریف لے گئے تھے اس لئے آپ بھی ناصری کہلائے
نوحؑ	نوحؑ	Noha	
فردوس	فردوس	Paradise	
شاہ مصر فرعون	فرعون	Pharoh	
یہودیوں کا ایک فرقہ	فریسی	Pharisee	یہودیوں میں دو بڑے فرقے ہیں "فریسی" اور "صدوقی"
سنیچر	سبت	Sabbath	

اظہار رائے	انگریزی تلفظ	عربی تلفظ	اردو
یہودیوں کا دوسرا فرقہ۔	Saddeeee	صدوقی	صدوقی
	Samuel	اسماعیل ؑ	اسماعیل ؑ
	Sarah	سارہ ؑ	سارہ ؑ
	Satan	شیطان	شیطان
	Sept	سبط	نسل۔ پوتے
اس شہر کی ملکہ بلقیس سے حضرت سلیمان ؑ نے نکاح کیا	Sheba	سبا	یمن کا ایک شہر
	Solomon	سلیمان ؑ	سلیمان ؑ
اردو انجیل میں اس کو یوں لکھتے ہیں (زکریاہ)	Zechariah	زکریا ؑ	زکریا ؑ
	Jerusalem	یروشلم	یروشلم

نویں صدی عیسوی کی ابتدا میں یورپ میں جہالت پورے شباب پر تھی۔ مذہبی خانقاہوں سے جو پادریوں اور اسقفوں کے ہاتھ میں تھیں، درس گاہوں کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ ایسے مدارس یورپ کے بڑے بڑے ممالک میں پائے جاتے تھے۔ فلسفہ و حکمت کی تعلیم بالکل ممنوع تھی۔ فلسفہ کی کتابوں پر راہبوں نے قبضہ کرکے جابجا مذہبی کتب خانہ میں مقفل کر دی تھیں۔ کسی کو ان کے مطالعہ کرنے یا نقل لینے کی اجازت نہ تھی۔ (اگر کہیں ان علوم کا کوئی ماہر نظر آتا تو یا وہ اندلس کے اسلامی مدارس کا تعلیم یافتہ ہوتا یا جنوبی اٹلی کے مدرسہ کا جو مسلمانان سسلی کی کوشش سے قائم ہوا تھا) مسیحی مدارس میں صرف لاطینی اور یونانی زبانیں سکھائی جاتیں جن کی صرف و نحو میں طلبہ کی عمر کا بیش قیمت حصہ برباد کر دیا جاتا تھا۔ جب وہ ان زبانوں میں کسی قدر ترقی کر لیتے تو دینیات کی طرف متوجہ کر دئے جاتے جس کی تعلیم کا اصول زبور توریت اور انجیلیں تھیں۔ منتہی طلبہ کو چند دیگر کتب روایات اور غیر مقبول اور مشتبہ انجیلیں بھی پڑھائی جاتیں تو اپاکریفہ کے نام سے مشہور تھیں

علاوہ بریں کلیسا کی پرانی تاریخیں، گذشتہ ولیوں کی سوانح عمریاں، مذہبی کونسلوں کی مفصل اور مشرح رپورٹیں بھی نصاب میں داخل تھیں۔ یہی علوم تھے جن کو لاطینی اور یونانی زبانوں میں ان کی پیچیدہ صرف ونحو کے ساتھ طلبہ پڑھا کرتے تھے۔ اس نصاب نے مدرسوں کی یہ حالت بنا رکھی تھی کہ نیچے درجوں کے طلبہ لاطینی اور یونانی کی صرفی گردانیں پلا پلا کے ازبر کرتے اور اوپر کے منتہی طلبہ آپس میں الٰہیات پر مباحثہ کرتے جو کبھی کبھی مکابرہ بہ پیر مجادلہ او مقاتلہ کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ان کو ممانعت تھی کہ سوا ان مباحث کے کسی عقلی مبحث کی طرف توجہ نہ کریں۔

یہ تھا یورپ کی جہالت کا پورا نقشہ۔ اگرچہ بعد میں مسلمانوں کی بدولت یورپ نے علوم میں خاصی ترقی کرلی یورپی قومیں عربوں کی حسب ذیل علوم پر شاگرد ہیں علم الادویہ علم ریاضی ہیئت طبیعیات، فلسفہ اور طب وغیرہ یہ علوم اسپین سے وسط یورپ ہو کر تمام یورپی ممالک میں پھیلے یورپ کی زبانوں میں ابھی تک مذکورہ علوم کی اصطلاحیں عربی ہی کی پائی جاتی ہیں۔ مثال کے لئے انگریزی کو لیجیے جو بہ نسبت دیگر یورپی زبانوں کے عربی سے بہت دور واقع ہوئی ہے۔

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
کیمیا (علم الادویہ)	الکیمیا	Alchemy	
الکوہل (جوہر شراب)	الکحول	Alcohol	
قرع انبیق	الانبیق	Alembice	
جبر و مقابلہ	(علم) الجبر	Algebra	زرنیخ تین رنگ کا ہوتا ہے۔ سفید جس کو سم الفار یا سنکھیا کہتے ہیں
ہرتال	زرنیخ	Arsenic	زرد کو ہرتال اور سرخ کو سنگ سلیمانی کہتے ہیں۔
سنکھیا			
سلیمانی			ستاروں کی معلومات حاصل کرنے کا آلہ۔
اسطرلاب	اصطرلاب	Astorlabe	
قیراط (ایک وزن)	قیراط	Carat	

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
صفر	صفر	Sypher	
پہلو دار	کعب	Cube	اس میں حروف مقدم موخر ہو گئے ہیں
درجہ	درجہ	Degree	یہ وزن بارہ قیراط کے برابر ہے
درم (ایک وزن)	درہم ۔ دراہم	Dram	
مقناطیس	مغناطیس	Magnet	کچھ حروف کم ہو گئے
بیضاوی شکل	اہلیلجی	Oval	؍؍
فلسفہ (حکمت)	فلسفہ	Philosophy	
پھوڑا	دمّل	Tumour	

عرب تاجروں کے قافلے اکثر سرزمین مغرب میں سامان تجارت لے جایا کرتے تھے جس میں زیادہ تر مشرقی مصنوعات اور پیداواریں ہوتی تھیں جیسے حلب کے بنے ہوئے مشہور آئینے کشمیری زعفران اور مصری چاول۔ اس قسم کی تمام چیزوں کے نام انگریزی میں عربی سے ماخوذ ہیں اگرچہ بعض الفاظ میں کسی قدر تغیر ہو گیا ہے (کیونکہ وہ فرانسیسی یا اطالوی کی وساطت سے انگریزی تک پہنچے) لیکن تلفظ کی رعایت کر کے ان کی اصلیت معلوم کی جا سکتی ہے۔ مثلاً

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
عنبر	عنبر	Amber	
انیسون	انیسون	Anise	

اظہار رائے	انگریزی تلفظ	عربی	اردو
	Arrack	عرق	عرق
اس کا تیل اکثر امراض میں مفید ہوتا ہے۔	Balsam	بلساں	بلساں
	Camphir	کافور	کافور
یمن کی خاص پیداوار ہے۔ اس کے تلفظ میں کچھ فرق ہو گیا ہے۔	Coffee	قہوہ	قہوہ۔ کافی
	Cummin	کموں	زیرہ
	Fur	فرود	پوستین
اس کے آخر میں ر R زیادہ ہو گیا۔	Jasper	یشب۔ یشب	یشب
	Mastic	مصطکار	مصطگی رومی
اس میں حرف کی کمی ہو گئی۔	Mine	معدن	کان
عربی میں رویت سے اسم آلہ ہے	Mirror	مرآۃ	آئینہ
	Musk	مسک	مشک
	Nenuphar	نیلوفر۔ نینوفر	کوکا بیلی
	Odorous Otto Or Otto	عطر	عطر
		فلفل	مرچ
	Pistachio	فستق	پستہ
	Rise	ارز۔ رز	چاولوں
	Saffran	زعفران	زعفران
	Sesame	سمسم	تل
	Sherbet	شربت	جو چیزیں پی جائیں

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
صابن	صابون	Soap	
شربت (میٹھا)	شراب	Syrup	
املی	تمر ہندی	Tamarind	
ایک قسم کی گھانس	طرخون	Tarragon	اس گھانس کی جڑ عاقر قرحا کہلاتی ہے۔

یورپ سے خوش اعتقاد زائرین بیت المقدس آیا کرتے تھے اور جن نئی چیزوں سے ان کو واسطہ پڑتا ان کے نام انھیں یاد ہو جاتے اور سفرنامہ بیان کرتے وقت وہی عربی الفاظ اپنے تلفظ میں ادا کرتے جو رفتہ رفتہ ان کی زبانوں کے جزو بن گئے۔ مثلاً۔

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
عرب	عرب	Arabia	
بدّو	بدوی	Badouin	
قاضی	قاضی	Cadi	
خلیفہ	خلیفہ	Caliph	
خطّہ ۔ اقلیم	اقلیم	Clime	
گنبد	قبّہ	Cope	
جن	جنّی	Genii	
آدم خور دیو غول بیابانی	غول	Ghoul	
سرائے	خان	Khan	

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
قریہ۔ گاؤں	قریہ	Kraal	ایک حرف (L) زیادہ ہوگیا۔
مینار	منارہ	Minaret	
مسجد	مسجد	Mosque	تلفظ میں کسی قدر فرق ہوگیا۔
راستہ	طریق	Track	

کارزار صلیبی اس لڑائی (Crusade) کو کہتے ہیں جو پانچویں صدی ہجری سے چھٹی صدی تک بیت المقدس کے لئے مسلمانوں اور عیسائیوں میں ہوتی رہیں۔ اس لڑائی میں سارے یورپ نے سنبھل سنبھل کر اور اپنی تمام قوت یک جا کر کے لاکھوں کے گروہ سرزمین شام میں بھیجے مگر نتیجہ یہی ہوا کہ مسلمان کامیاب رہے۔ یورپ نے اس عرصہ میں شام پر نو حملے کئے۔ اسی اثنا میں ایک زبان، لنگوفرینکا، مشرقی اور مغربی زبانوں کے اختلاط سے پیدا ہوگئی تھی۔

جنگ صلیبی کی اس طویل مدت میں لنگوفرینکا کی وجہ سے اکثر عربی الفاظ یورپی زبانوں میں جذب ہوگئے جن کی پوری فہرست درج کرنا طوالت سے خالی نہیں۔ مثال کے طور پر تھوڑے سے الفاظ لکھے جاتے ہیں۔

اردو	عربی	انگریزی تلفظ	اظہار رائے
کھونا	القلی	Alkali	
الف لام	ال	All	
استغراقی			
حلیف	حلیف	Ally	

اظہار رائے	انگریزی تلفظ	عربی	اردو
اس میں ایک حرف کی کمی ہوگی۔	Azure	ازرق	نیلگوں آسمانی رنگ
	Albeit	البتہ	البتہ تسپر بھی
	Breuet	براۃ	چھوٹنا عیب سے بیزاری
	Bug	بق	بھنگا پشہ
	Bugle	بوق	بگل
	Camisol	قمیص	قمیص۔ کرتہ
	Candle	قندیل	چراغ۔قندیل
	Capote	قبار	لبادہ
	Castle	قصر	شاہی محل
	Cat	قط	بلّی
	Cause	قضیہ	قضیہ،مقدمہ
	Corrode	قرض	قرض
	Cotton	قطن	روئی
	Cribble	غربال	چھلنی
	Cup	کوب	کنڈھے دار پیالہ

اظہار رائے	انگریزی تلفظ	عربی	اردو
	Earth	ارض	زمین
	Forky	فارق	فرق کرنے والا
	Fury	فورہ	جوش ہیجان
	Genus	جنس	جنس قسم
	Hoof	حافر	کھر - سم
	Ill	علیل	بیمار
	Jasmine Jessamine	یاسمین	چنبیلی
	Kettle	قدر	پتیلی
	Kill	قتل	مارڈالنا
	Lemon	لیموں	لیمو
	Lenity	لینۃ	نرمی
	Luscious	لذید	خوش ذائقہ
	Mameluke	مملوک	غلام
	Misterious	مستتر	پوشیدہ
	Noble	نبیل	بزرگ
ع' کا تلفظ یورپ والے نہیں کرسکتے۔	Neck	عنق	گردن
	Occiput	نقار	گدی
	Prey	فریسہ	شکار
	Refuse	رفض	چھوڑ دینا۔انکار کرنا

اظہار رائے	انگریزی تلفظ	عربی	اردو
	Sabre	سیف	تلوار
	Serpent	ثعبان	اژدھا۔ زہریلا سانپ
	Shackle	سلسلہ	زنجیر آہنی
	Ship	سفینہ	کشتی۔ جہاز
انگریزی کا لفظ عربی کے دو الفاظ سفینہ غرقت سے مرکب ہے کثرت استعمال سے درمیانی حروف غائب ہو گئے۔	Shipwreck	غرق	ڈوبنا
	Sound	صوت	آواز
اسطبل شامی عربوں کی زبان کا لفظ ہے۔	Stable	اصطبل	اصطبل۔ طویلہ
	Sultan	سلطان	سلطان
	Sander	شطر	آدھا ٹکڑا
	Tabour	طبل	نقارہ، طبل
	Tall	طویل	دراز قد، لانبا
	Thrash	درس	گیہوں کوٹنا
	Threat	تہدید	دھمکانا

فلسفۂ تحریر

لکھائی کی ایجاد کا قدرتی طریقہ ہر چیز اس وقت معرض وجود میں آتی ہے جب اس کی ضرورت محسوس کی جائے۔ ضرورت پڑنے پر انسان قوائے دماغی کو کام میں لا کر ایسی صورتیں اختیار کرتا ہے جن سے اپنی حاجت روائی میں آسانیاں حاصل کر سکے۔ اگر آگ سے پیدا ہونے والی تمام اختراعات

کی تلاش کریں جن کی ابتدا زمانۂ تاریخ سے بھی پہلے کی ہے تو آج نہایت آسانی سے ریڈیو کی لہروں تک پہنچ جائیں گے جو گھر گھر رائج ہے۔ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" جس نے کہا بالکل سچ کہا۔

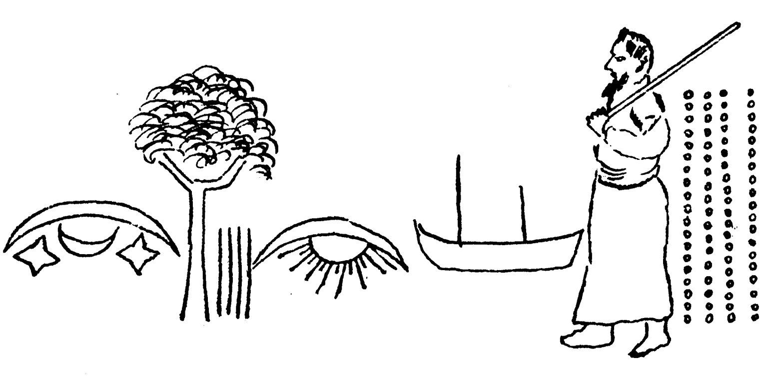
زبانوں کی ایجاد کو قرنہا قرن گذر گئے جن سے انسان اپنا مافی الضمیر صرف آوازوں میں ادا کرسکتا تھا۔ جب اس کی نسل بڑھی اور پھیلی حتی کہ لوگوں نے کسب معیشت کے لئے سفر اختیار کیا تو اب ان کو اپنے وطن میں خبریں پہنچانے کی یا راہ میں پیش آنے والے واقعات کو محفوظ کرنے کی ضرورت پیش آئی جس کی بنا پر انھوں نے نقوش اور تصاویر سے اس طرح کام لینے کی ابتدا کی۔

دور بربریت کے انسان بھی زینت وآرائش کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ جن جانوروں کا وہ شکار کرتے یا جن حیوانات ونباتات کی پرستش کرتے، ان کی تصاویر بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ پہلے یہ تصویریں بچوں کی بنائی ہوئی تصاویر کی طرح بھدّی اور بھونڈی ہوتی تھیں لیکن رفتہ رفتہ ان لوگوں کی مہارت بڑھتی گئی۔ وہ ہڈی اور سینگ کے ٹکڑوں پر انسانوں اور جانوروں کی شکلیں بناکر اپنے رہنے کے غاروں کو سجاتے تھے اور غاروں کے در و دیوار پر معمولی نقاشی بھی کرلیتے تھے۔ (اس کا رواج ابھی تک ہندوستان کے اکثر مکانوں میں پایا جاتا ہے جن کے دروازوں پر دیوتاؤں اور جانوروں کی تصویریں منقوش یا کندہ ہوتی ہیں) جب معاشرت نے زیادہ ترقی کی اور لوگ خاندانوں اور قبیلوں پر تقسیم ہوگئے تو قبائل کے سرداران تصویردار ہڈیوں اور سینگوں کو ایک دوسرے کے پاس بطور تحفہ بھیجنے لگے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ تصاویر بجائے ہدیہ کے نامہ وپیام کا ذریعہ بن گئیں۔ گویا کہ اس وقت تک تصویروں پر تین دور گذر چکے تھے، پہلے دور میں وہ صرف زیبائش کی چیزیں تھیں، دوسرے دور میں بطور تحفہ وہدیہ استعمال ہونے لگیں اور تیسرے دور میں نامہ وپیام کے کام آئیں۔

ہم عہد اوّل کے انسانی قبائل میں سے ایک قبیلہ فرض کرتے ہیں جس کے افراد پھلوں اور حیوانوں کے شکار سے اپنی خوراک حاصل کیا کرتے تھے اور غاروں میں زندگی بسر کرتے تھے

ان کے قبیلہ میں کوئی تاریخی یا اہم واقعہ پیش آگیا مثلاً شیر نے حملہ کرکے ان کے سردار کو پھاڑ کھایا، اس واقعہ کو وہ محفوظ کرلینا چاہتے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ کیا صورت اختیار کی جائے جس سے واقعہ محفوظ رہ سکے۔ آپ کے خیال میں کوئی صورت سوا تصویر کشی کے آہی نہیں سکتی خواہ وہ نقش کی صورت میں ہو یا ان کے حالات کے مطابق کسی چیز پر کھدائی کی صورت میں۔ اب وہ ایک تصویر بنائیں گے جس میں شیر اپنے پنجوں سے آدمی کو نوچ رہا ہے یا اس سے ملتی جلتی کوئی دوسری تصویر ہوگی۔ یہ پہلا قدم ہے جو انسان نے لکھائی کی طرف بڑھایا۔ اس دور کو ہم ذاتی تصویر کشی کا دور کہیں گے کیونکہ اس زمانہ میں صرف ایسے ہی حادثے محفوظ کئے جا سکتے ہیں جن میں صورت کشی ممکن ہو۔

بعض مفہوم ایسے بھی پائے جاتے تھے جن کی کوئی خارجی شکل نہیں ہے جیسے محبت عداوت۔ یا آج۔ کل۔ صبح۔ شام وغیرہ جو محض معنی ہی معنی ہیں۔ ان مطالب کو ادا کرنے کے لئے کچھ اشاروں کی ضرورت محسوس ہوئی جو مقرر کرلئے گئے، جیسے محبت کے لئے کبوتر۔ عداوت کے لئے سانپ۔ دن کے لئے دائرے کے اوپری حصہ میں سورج وغیرہ وغیرہ۔ ہم کچھ ایسے آدمی فرض کرتے ہیں جو کسی قبیلہ پر تین دن کی مسافت طے کرکے حملہ کرنے کے لئے رات میں ساحل پر اترے۔ سردار قبیلہ موجود نہیں تھا اس کے لڑکے نے اسے اطلاع دینا چاہی۔ وہ بجز اس کے کوئی ذریعہ نہیں اختیار کرسکتا کہ مندرجہ ذیل تصویر بنا کر باپ کے پاس بھیج دے۔



تصویریں نقطوں سے کثرت ظاہر کی گئی ہے۔ مسلح آدمی سے دشمن مراد ہے۔ کشتی سے سمجھا جائے گا کہ وہ لوگ بحری راستہ سے آئے۔ قوس میں سورج کی تصویر دن کا وقت بتاتی ہے۔ تین لکیروں سے تین کا عدد سمجھا جائے گا۔ درخت خشکی کی علامت ہے اور قوس سے جس میں چاند اور تاروں کی شکل بنی ہوئی ہے، رات مراد ہے۔

یہ لکھائی کی طرف دوسرا قدم ہے۔ اس میں اشارات مقرر کر کے تصویریں بنائی گئی ہیں جو بہر حال مفہوم ادا کرنے میں ذاتی تصورت کشی سے کہیں زیادہ بہتر اور کارگر ثابت ہوئیں۔ اس دور کو ہم "رمزی تصویر کشی کا دور" کہیں گے جس میں انسان کی بیشتر تعبیری ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں۔

ایک عرصۂ دراز گذرنے پر لوگوں نے تصویر کے مفہوم کا حرف اول مع اعراب مراد لینا شروع کیا جیسے دشمن کی تصویر سے پہلا حرف (د۔ مضموم) مراد لیا یا کشتی کی تصویر سے (ک مکسور) اور شاخ کی تصویر سے (ش۔ مفتوح) وغیرہ۔ لکھائی کی ایجاد کا یہ تیسرا قدم تھا اور بہت ہی اہم کیونکہ شکلوں کے مفہوم سے پہلا حرف مع اعراب مراد لیا جانا اس بات کی ابتدا تھی کہ مفرد آوازوں کی شکلیں الگ الگ مقرر ہو جائیں۔ اس دور کو ہم "آوازوں کی شکلوں کے دور" سے تعبیر کریں گے۔

مختلف چیزوں کی تصویریں بنا لینا کوئی آسان کام نہ تھا علاوہ بریں اس طرح کی لکھائی میں پھیلاؤ بہت ہو جاتا تھا۔ کچھ تو انسان کا ہاتھ طبعی طور پر سرعت اور تیزی کی طرف مائل ہے تاکہ جلدی جلدی مختلف شکلیں بن سکیں، اور کچھ وقت کی بچت کے خیال سے مسلح دشمن کی شکل ایسی بننے لگی جو تصویر تو نہیں کہی جا سکتی تھی لیکن اس سے ملتی جلتی چیز تھی۔ پھر اس میں بھی اتنی تبدیلیاں ہوتی چلی گئیں کہ اس کی اصلی شکل کا پتہ چلنا دشوار ہو گیا۔

اب وہ وقت آیا کہ انسان کو الگ الگ اعراب کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بجائے اس کے کہ وہ کسی شکل سے ایسی آواز مراد لے جس میں حرف کے ساتھ ساتھ حرکت بھی ہو ایسی آوازیں مراد لینے لگا جو صرف حرف تھیں اور اعراب کے لئے دوسری علامتیں مقرر کر لیں۔ پہلے جس شکل

سے (د بپیش۔ ڈ) سمجھا جاتا تھا اب اس سے فقط حرف (د) سمجھا جانے لگا اور اعراب کے لئے دیگر علامات کا اضافہ کر لیا گیا اس طرح آسانی بھی ہوئی اور وقت کی بچت بھی۔ یہ تھا "دور ہجائی"۔

لکھائی کو عہد اول سے ابتک چار دوروں سے گذرنا پڑا۔

(پہلا) ذاتی تصویر کشی کا دور۔ اس میں تصویریں صرف مرئیات ہی کو ظاہر کرتی ہیں۔ جس کی بنا پر فقط موٹے موٹے واقعات محفوظ کئے جا سکتے تھے۔

(دوسرا) رمزی تصویر کشی کا دور۔ اس کو ذاتی تصویر کشی پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ رمزی تصویریں ایسے معنوی مفہوم میں بتاتی ہیں جن کی کوئی خارجی شکل موجود نہیں ہے۔ اس دور میں انسان اکثر وہ چیزیں قلم بند کر سکتا تھا جو اس کے ذہن میں مختلف معنوی مفہوموں کے متعلق گذرتی تھیں۔ لیکن اس صورت میں ہزارہا شکلیں بنائی جاتی تھیں اور خاصی زحمت ہوتی تھی (چینی رسم الخط دوسرے اور تیسرے دور کے درمیانی زمانہ کی یادگار ہے، جس میں اشکال حروف کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔)

(تیسرا) آواز کی شکلوں کا دور۔ اس میں منقوش تصویر اپنے نام کا پہلا حرف مع اعراب بتاتی تھی جو کتابت کی ایجاد میں سب سے بڑا اور اہم قدم ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پچھلے دوروں میں مافی الضمیر ادا کرنے کے لئے ہزاروں شکلوں کا استعمال کرنا پڑتا تھا جو اس دور میں گھٹ کر سینکڑوں پر محدود ہو گئیں۔

(چوتھا) دور ہجائی۔ اس میں ان شکلوں نے حروف کی صورت اختیار کر لی۔ حروف ہجی منضبط ہو جانے کی وجہ سے شکلوں کی تعداد دھائیوں تک پہنچے گی۔

اس کے بعد بھی دو دو رمزید گذرے چوتھے دور تک حروف الگ الگ لکھے جاتے تھے (جیسے اب تک یورپی زبانوں کے طباعتی حروف ہیں۔ ان میں حروف کو ترتیب دے کر الفاظ بنانے کے بعد دو لفظوں میں فرق کرنے کے لئے تھوڑا سا فاصلہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ تامل تلنگی اور عبرانی وغیرہ درحقیقت اس چوتھے دور کی یادگار ہیں۔) اس صورت میں بسا اوقات الفاظ

ایک دوسرے میں مخلوط ہو کر صاف سمجھ میں نہیں آتے تھے لہذا ضرورت ہوئی کہ حروف کو ایک دوسرے میں جوڑ کر ایک لفظ بنایا جائے پھر دوسرا پھر تیسرا تاکہ ہر لفظ دوسرے سے ممتاز اور علیحدہ رہے۔ اس جوڑائی کے لئے مختلف تدبیریں اختیار کی گئیں۔ انگریزی تحریری رسم الخط میں ایک حرف کی پشت دوسرے حرف کے سرے سے جوڑ دی جاتی ہے سریانی میں بھی یہی صورت ہے۔ ہندی میں ایک لفظ پورا کرنے کے لئے حروف علت اور ماترے استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ لکھائی کا پانچواں دور ہے۔

یہاں تک تو آریائی اور سامی لکھائیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ آگے بڑھ کر عربی رسم الخط اور اس کی شاخوں پر چھٹا دور گذرتا ہے۔ ابھی تک پورے پورے حروف جوڑ دئے جاتے تھے لیکن مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر حرفوں کے صرف ابتدائی حصے ایک دوسرے میں جوڑے جانے لگے اور لفظ کے خاتے پر پورا حرف جوڑ دیا گیا۔ اکثر آریائی خطوط بائیں سے داہنے کو اور سامی خطوط داہنے سے بائیں کو لکھے جاتے ہیں۔ اگر داہنے ہاتھ میں قلم ہو تو طبعاً ہاتھ کی کشش بائیں سے داہنے کو ہوگی جس کی وجہ سے آسانی بھی ہوگی اور وقت بھی کم خرچ ہوگا۔ برخلاف اس کے داہنے سے بائیں کو قلم ٹھیلا جاتا ہے جس میں کسی قدر دقت بھی ہوتی ہے اور وقت بھی زیادہ خرچ ہوتا ہے اس لئے ضرورت محسوس کی گئی کہ حروف کے سرے جوڑ کر الفاظ بنائے جائیں تاکہ جگہ اور وقت کی بچت ہو سکے۔

یہاں یہ بیان کر دینا بے موقع نہ ہوگا کہ قدیم عربی رسم الخط محض ڈھکل پر پڑھا جاتا تھا کیونکہ اس میں نقطہ دار اور بے نقطہ حروف میں کوئی امتیاز نہ تھا اس بنا پر خیال کیا گیا کہ اسلام مختلف بلاد عجم میں پھیل چکا ہے جہاں لوگ عربی سے ناواقف ہیں اور بہت ممکن ہے کہ کلام پاک کی تلاوت میں غلطیاں رائج ہو جائیں لہذا اعراب اور نقطے ایجاد ہوئے تا خط صاف اور واضح اور خوب صورت بنایا گیا۔ (اس سے پہلے اعراب کا کام حروف علت سے لیا جاتا تھا لیکن اعراب معروف اور اعراب مجہول میں کوئی فرق ممکن نہ تھا اس لئے زیر زبر پیش کی شکلیں مقرر کی گئیں،

رسم الخط میں یہ اصلاح حجاج ابن یوسف کے زمانہ میں ہوئی اور اس کے بعد چوتھی صدی ہجری میں علامہ سجاوندی نے آیت، وقف مطلق، اور وقف لازم وغیرہ کی علامتیں مدون کیں۔ یہ تھا خط نسخ جو اب تک رائج ہے۔ اس میں معمولی تغیر کے بعد فارسی اور ترکی رسم الخط بن گئے۔ اگرچہ ان تینوں خطوں میں جزئی اختلاف ہے لیکن ایک کا جاننے والا بقیہ دونوں کو آسانی سے پڑھ سکتا ہے۔

ان رسوم خطوط کی تاریخ جو اب تک مستعمل ہیں | مندرجہ بالا بیان سے یہ تو معلوم ہی ہو چکا ہے کہ لکھائی نے ابتدا سے اب تک کس طرح تدریجی ترقی کی۔ اب ہم اس کی تائید میں تاریخی واقعات پیش کرنا چاہتے ہیں کہ عہد اول کے انسان نے کیسے خطوط سے کام لیا جو موجودہ خطوط کی پیدائش کا سبب ہیں۔

انسان نے عہد اول سے اب تک جن خطوط سے کام لیا ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے مگر ان میں کے اکثر خط اب متروک ہو چکے ہیں۔ ہم اس بحث میں آسانی پیدا کرنے کے لئے لکھائی کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) اصلی خطوط (۲) فرعی خطوط۔

(اصلی) یہ وہ قسم ہے جس کو قدیم متمدن قومیں کام میں لاتی تھیں۔ اس کی ابھی تک چار ہی شاخیں مل سکی ہیں۔

(۱) خط ہیروگلیفی (Hieroglyphic) (۲) خط میخی (۳) خط حتی (۴) خط چینی۔ ان میں کے تقریباً ہر خط نے الگ الگ نشو و نما پائی اور ذاتی تصویر کشی کے دور سے ترقی کرتا رہا لیکن دوسرے اور تیسرے دور کے درمیان ٹھہر گیا۔

(فرعی) وہ خطوط ہیں جو اصلی سے نکلے ہیں اور اب تک ان کا بیشتر حصہ زندہ یا مردہ پایا جاتا ہے۔ ان کا بیان آگے آئے گا۔

(۱) خط ہیروگلیفی۔ خطوط اصلیہ میں یہ سب سے اہم ہے اور عام طور پر یہی گمان کیا جاتا ہے کہ دنیا کے اکثر مشہور و معروف خطوط اسی سے پیدا ہوئے۔ یہ دوسرے اور تیسرے دور کے درمیان زمانہ کا خط ہے۔ اس کی بعض شکلیں اپنے ذاتی معنی دیتی ہیں بعض رمزی معنی اور بعض ابتدائی حرفوں کی

آوازیں۔ ذاتی معنی سے وہ معنی مراد ہیں جو کسی چیز کی تصویر سے اس کے لفظ پر دلالت کریں۔ ایسی تصویریں تمام اصلی خطوط میں مشابہ ہیں۔ رمزی تصویروں میں ہر قوم کی اصطلاحیں الگ الگ ہیں مثلاً مصریوں نے ان تصویروں سے حسب ذیل اشارے مقرر کر رکھے تھے۔



(۱) (۲) (۳) (۴) (۵) (۶)

شکل (۱) سے نفی یا بربادی سمجھی جائے گی۔ شکل (۲) جس میں ستارہ لٹک رہا ہے اندھیرے پر دلالت کرے گی۔ شکل (۳) سے مراد قوت اور طاقت ہے۔ شکل (۴) جس میں دو پاؤں چلتے ہوئے دکھائے گئے ہیں، حرکت کا مفہوم پیدا کرتی ہے۔ شکل (۵) میں ایک آدمی اپنے ہاتھ سے منھ کی طرف اشارہ کر رہا ہے، اس سے کوئی بھی ایسا کام سمجھا جا سکتا ہے جو منھ سے متعلق ہو، جیسے کھانا پینا یا بولنا۔ شکل (۶) ایک چھوٹی چڑیا کی تصویر ہے جس سے بدی مراد لی جاتی ہے۔ ہیروگلیفی حروف کی شکلیں (جو دوسرے دور تک پہنچ چکی تھیں) ذیل میں مع تفسیر درج کی جاتی ہیں۔ (بائیں سے داہنی طرف کو پڑھنا چاہیے۔)

(ان) (ی ہ) (رس) (رح) (وت، (س م ح) (رح) (وت، (ن اَ) (ن ا) (ن اُ)



سرھینا ← حرہ ← تو ← حمس ← حرہ ← تو ← ان ← اُن

شاروہن کا ← ہا ہمنے ← محاصرہ کیا ← ہم نے ← وقت ← جس

عرصہ دراز تک مصری اسی رسم الخط کو استعمال کرتے رہے۔ اس سے دو خط "ہیراتی" اور "ڈیموطیقی" بھی پیدا ہو گئے تھے جن سے وہ لوگ اسی کے ساتھ ساتھ کام لیتے رہے۔ ہیروگلیفی مذہبی پیشواؤں میں محدود تھا جو تیسری صدی عیسوی تک کام میں لایا گیا۔ ہیراتی ہیروگلیفی ہی کی ترقی یافتہ شکل تھی جس کے حروف تیزی سے لکھے جا سکتے تھے خط ڈیموطیقی ہیراتی کے بعد کی پیداوار ہے جو حروف ہجی کے لگ بھگ پہنچ گیا تھا۔ یہ خطوط مصر میں اس وقت تک مستعمل رہے جب تک کہ قبطیوں نے ان کو پرانے یونانی حروف سے نہیں بدل دیا۔ بعض ایسے ڈیموطیقی حروف بھی قبطی رسم الخط میں کام آ گئے جن کا مثل قدیم یونانی حروف میں موجود نہ تھا۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ ہیروگلیفی رسم الخط دنیا کے اکثر مشہور خطوں کی اصل ہے۔ گمان غالب ہے کہ فینیقیوں نے یہ خط مصر سے لے کر تمام عالم میں پھیلا دیا۔ فینیقی شام کے ساحلی مقامات پر تاریخی زمانوں سے پیشتر آباد تھے اور فراعنۂ مصر کے ہمعصر تھے۔ یہ سب سے پہلی قوم ہے جو عیسوی جنتری کے وجود میں آنے سے صدیوں پہلے کشتی رانی سے واقف ہوئی اور ملکوں ملکوں مال تجارت لئے پھری۔ اس نے ہیروگلیفی خط کو نشوونما دے کر حروف ہجی پیدا کئے اور تمام روئے زمین پر پھیلا دئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے قریبًا قرن پیشتر یونانیوں کلدانیوں اور یہودیوں وغیرہ نے انہی فینیقیوں سے لکھنا سیکھا۔ بعد میں اس خط سے ایسی شاخیں پیدا ہوتی چلی گئیں جو اب تک دنیائے تمدن میں مستعمل ہیں۔

یہ رسم الخط فینیقیوں کا ایجاد کردہ نہ تھا بلکہ انھوں نے مصریوں سے سیکھ کر اس میں اچھا نیاں ضرور پیدا کر دی تھیں۔ وہ تجارتی سلسلہ میں مصر آیا جایا کرتے تھے۔ مصریوں سے تجارتی معاملات قائم رکھنے کے لئے ان کو لکھائی سے کام لینے کی ضرورت محسوس ہوئی تب انھوں نے ہیروگلیفی اور ہیراتی کی کچھ شکلیں جیسی مصریوں میں مستعمل تھیں لے کر ان کی بناوٹ میں سہولیت استعمال کے لئے کسی قدر تغیر کر دیا۔ یونہی ہوتے ہوتے کچھ عرصہ کے بعد ان کے پاس ۲۲ شکلیں جمع ہو گئیں جن میں ہر ایک سے وہ اپنی زبان کے ایک ایک حرف کا کام لینے لگے اور اس کا نام وہی رہنے دیا

جس کی وہ تصویر تھی۔ (۲۲ حروف حسب ذیل تھے ا۔ب۔ج۔د۔ہ۔و۔ز۔ح۔ط۔ی۔ک۔ل م۔ن۔س۔ع۔ف۔ص۔ق۔ر۔ش۔ت۔) مثلاً بیل کی تصویر  جس سے مصری لوگ بیل ہی مراد لیتے تھے اور اس کو اپنی زبان میں آوا کہتے تھے۔ فینیقیوں نے بیل کے سر سے ملتی جلتی ایک شکل ( ) بنائی جس کا نام (الف) بمعنی بیل رکھا اور اس سے الف کا پہلا حرف (ا) مراد لیا۔ مصری ایک شکل گھر کی سی بنائی تھے ( ) اور اس کو اپنی زبان میں (با) کہتے تھے جس کے معنی ہیں گھر فینیقیوں نے سہولت کے لئے اس سے ملتی جلتی ایک شکل بنائی ( ) جس کا نام "بیتھ" رکھا (جس کے معنی ہیں "گھر" یا "خیمہ" عربی میں بیت صرف گھر کے معنی میں مستعمل ہے) اور اس کا حرف اوّل (ب) مراد لیا۔ مصری (ج) کے لئے اونٹ کی شکل () استعمال کرتے تھے فینیقیوں نے اس کی شکل ( ) آسان بنا کر جیل (عربی جمل = اونٹ) نام رکھا اور حرف اوّل (ج) مراد لیا۔ اسی طرح دندا نے دار شین کی خط ہیروگلیفی میں یہ شکل ہے ( ) جس میں اگے ہوئے درخت (شجر) بنائے گئے ہیں۔ انہی پر باقی حروف کو قیاس کر لینا چاہئے فینیقی لوگ حروف کا اقتباس کر کے اپنا لیتے تھے اور جس چیز کی شکل ہوتی اسی کا نام رکھ دیتے تھے یہاں تک کہ انھوں نے اپنی زبان کے کل حروف جمع کر لئے اور فینیقی ابجد عالم وجود میں آگئی جس کے حرفوں کے نام ان کی شکلوں پر دلالت کرتے ہیں جیسے۔

جدول ابجد اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو

فینیقیوں نے سنہ ۱۵۰۰ ق۔م۔ میں اہل یونان کو لکھنا سکھایا اور فینیقی حروف کسی قدر تغیر کے ساتھ یونانی میں رائج ہو گئے۔ عراق کے دوآبہ میں جا کر اشوریوں کو بھی سکھایا جو اس سے پہلے خط میخی استعمال کرتے تھے لیکن چونکہ فینیقی حروف کے استعمال میں زیادہ آسانی تھی لہٰذا انھوں نے خط میخی اس کے مقابلہ میں بالکل ترک کر دیا کیونکہ اس میں ہر لفظ کے لئے ایک علیحدہ شکل تھی اور پڑھنے والوں کو ہزاروں الفاظ کی جداگانہ شکلیں یاد رکھنا پڑتی تھیں چینی رسم الخط میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے۔

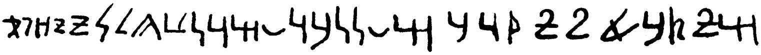
یونانی سے رومی گاتھک یونانی جدید اور سلافی وغیرہ رسم الخط پیدا ہوئے جو اب تک یورپ اور امریکہ میں مستعمل ہیں۔ قبطی بھی یونانی ہی کی شاخ تھی جو اب مردہ ہو چکی۔

(یورپی حروف کی جدول صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ ہو)

آرامی یا کلدانی سے تمام مشرقی خطوط جیسے عبرانی مربع، سطرنجیلی، نبطی اور ہندی پیدا ہوئے۔ سطرنجیلی کی شاخیں سریانی اور کوفی ہیں۔ نبطی سے عربی خط پیدا ہوا۔ ہندی کی شاخیں بنگالی اور گجراتی وغیرہ ہیں۔ فینیقی سے براہ راست قدیم عبرانی قرسی اور قرطجنی خطوط نکلے۔ قدیم عبرانی سے سامری حروف پیدا ہوئے۔ مذکورہ بالا خطوط میں سے اکثر اب مردہ ہو چکے ہیں۔

(تیسری جدول صفحہ ۴۳ و ۴۴ پر ملاحظہ ہو)

آرامی تمام مشرقی خطوط کی اصل ہے جو ابتدا میں درحقیقت فینیقی حروف تھے جن میں اختلاف پڑتے پڑتے اصل سے دوری ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ بعض حروف اوپر سے کھل گئے اور بعض بند ہو گئے، جس کی مثال حسب ذیل ہے۔



بیلحا سلم عمرن بر معنن قرب ذی میتبا



لحا نخشہ

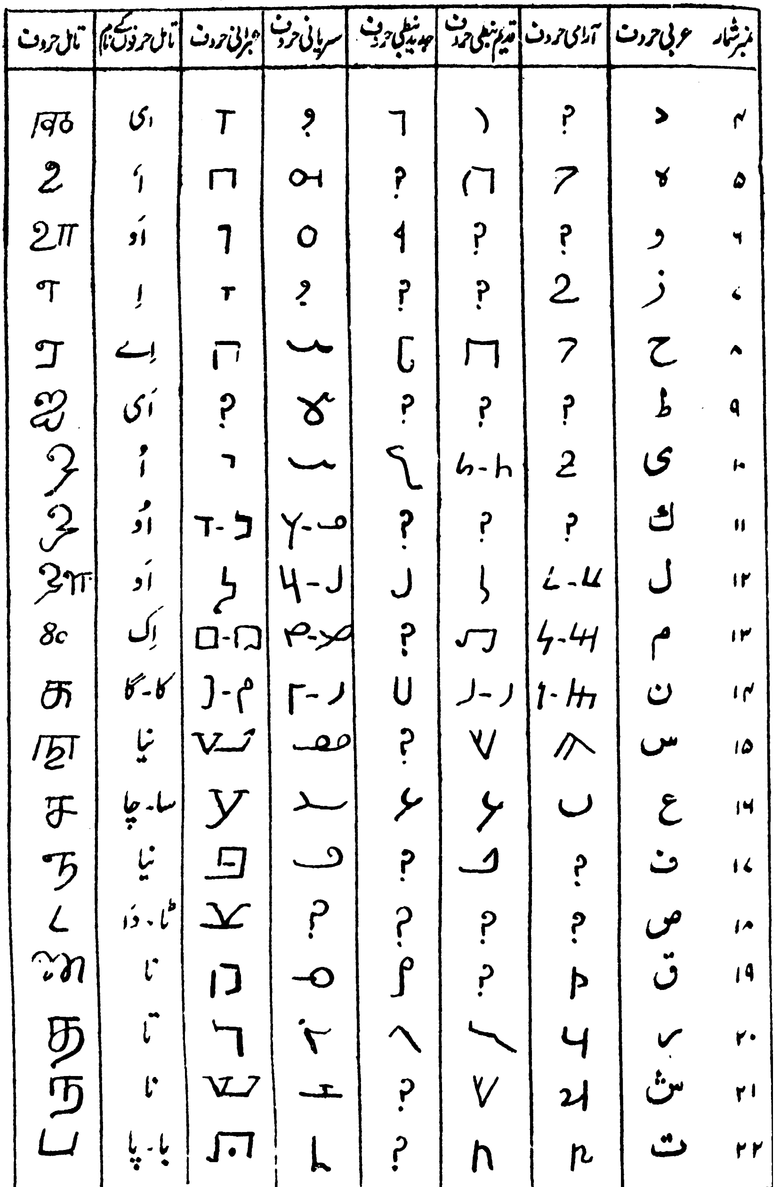
عربی حروف کا نام	فینیقی حروف کے نام	ان کے معنی	یونانی حروف کے نام	عربی حروف	فینیقی حروف	یونانی حروف	سامری حروف
الف	الف	بیل	الفا	ا	𐤀	A	ࠀ
بار	بیٹھ	خیمہ یا گھر	بیٹا	ب	𐤁	B	ࠁ
جیم	جیل	اونٹ	جملا	ج	𐤂	Λ	ࠂ

عربی حرفوں کے نام	فینیقی حرفوں کے نام	ان کے معنی	یونانی حرفوں کے نام	عربی حروف	فینیقی حروف	یونانی حروف	سامری حروف
دال	دالتھ	دروازہ	ڈلٹا	د	𐤃	Δ	ࠃ
ہا	ھ	م	ای	ہ	𐤄	Ε	ࠄ
واؤ	واؤ	گرز	او	و	𐤅	Υ	ࠅ
زا	زین	ہتھیار	م	ز	𐤆	Ι	ࠆ
حا	حیتھ	دیوار	ایتا	ح	𐤇	Η	ࠇ
طا	ٹیط	سانپ	سیتا	ط	𐤈	Θ	ࠈ
یا	یود	ہاتھ	یوتا	ی	𐤉	ς	ࠉ
کاف	کاف	رکاوٹ	کپّا	ک	𐤊	Κ	ࠊ
لام	لامدہ	چھونا	لامدھا	ل	𐤋	Λ	ࠋ
میم	میم	پانی	می	م	𐤌	Μ	ࠌ
نون	نون	مچھلی	نی	ن	𐤍	Ν	ࠍ
سین	سامک	ستون خانہ	سگما	س	𐤎	Ξ	ࠎ
عین	عین	آنکھ	?	ع	𐤏	⊙	ࠏ
فا	فا	منھ	پی	ف	𐤐	ς	ࠐ
صاد	صادی	——	زیٹا	ص	𐤑	Ϻ	ࠑ
قاف	قوف	کان	——	ق	𐤒	Ϙ	ࠒ
را	ریش	سر	رو	ر	𐤓	Ρ	ࠓ
شین	شین	دانت	——	ش	𐤔	Σ	ࠔ
تا	تاؤ	نشانی	ٹاؤ	ت	𐤕	Τ	ࠕ

یورپی حرفوں کے نام	رومی حروف	قدیم انگریزی حروف	جرمنی حروف	گاتھک حروف
اے	A	A	A	A
بی	B	B	B	B
سی	C	C	C	C
ڈی	D	D	D	D
ای	E	E	E	E
ایف	F	F	F	F
جی	G	G	G	G
ایچ	H	H	H	H
آئی	I	I	I	I
جے	J	—	—	J
کے	K	K	K	K
ایل	L	L	L	L
ایم	M	M	M	M
این	N	N	N	N
او	O	O	O	O

یورپی حرفوں کے نام	رومی حروف	قدیم انگریزی حروف	جرمنی حروف	گاتھک حروف
پی	P	P	P	P
کیو	Q	Q	Q	Q
آر	R	R	R	R
ایس	S	S	S	S
ٹی	T	T	T	T
یو	U	U	U	U
وی	V	V	V	V
ڈبلو	W	W	W	W
ایکس	X	X	X	X
وائی	Y	Y	Y	Y
زیڈ	Z	Z	Z	Z

نمبر شمار	عربی حروف	آرامی حروف	قدیم نبطی حروف	جدید نبطی حروف	سریانی حروف	عبرانی حروف	تامل حروف کے نام	تامل حروف
۱	ا	𐡀 - 𐡀	𐢀	𐢁	ܐ - ܐ	א	اَ	அ
۲	ب	𐡁	𐢃	𐢄	ܒ	ב	آ	ஆ
۳	ج	?	?	?	?	ג	اِ	இ


نمبر شمار
عربی حروف
آرامی حروف
قدیم نبطی حروف
جدید نبطی حروف
سریانی حروف
عبرانی حروف
تامل حروف کے نام
تامل حروف
۴ د ای
۵ ه اَ
٦ و اَو
۷ ز اِ
۸ ح اِے
۹ ط اَی
۱۰ ی اُ
۱۱ ك اُو
۱۲ ل اَو
۱۳ م اِک
۱۴ ن کا-گا
۱۵ س نیا
۱٦ ع سا-چا
۱۷ ف نیا
۱۸ ص ٹا-ڈا
۱۹ ق نا
۲۰ ر تا
۲۱ ش نا
۲۲ ت با-پا

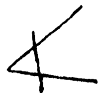
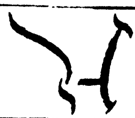
نمبر شمار	عربی حروف	آرامی حروف	قدیم نبطی حروف	جدید نبطی حروف	سریانی حروف	عبرانی حروف	تامل حرفوں کے نام	تامل حروف
۲۳	ث	—	—	—	ܬ	ת	ما	ம
۲۴	خ	—	—	—	ܚ	ח	یا	ய
۲۵	ذ	—	—	—	ܕ	ד	را	ர
۲۶	غ	—	—	—	ܓ	—	لآ	ல
							وا	வ
۲۷	پ	—	—	—	ܦ	פ	ڑا	ழ
۲۸	گ	—	—	—	ܓ	—	لا	ள
							را	ற
۲۹	ض	—	—	—	—	—	نا	ன
۳۰	ظ	—	—	—	—	—		
۳۱	ٹ	—	—	—	—	—		
۳۲	چ	—	—	—	—	—		
۳۳	ڈ	—	—	—	—	—		
۳۴	ڑ	—	—	—	—	—		
۳۵	ژ	—	—	—	—	—		

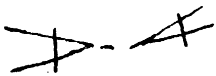
ان حروف کا بعد میں اضافہ ہوا ....

ان زبانوں میں یہ حروف بالکل نہیں پائے جاتے

ہندی حرفوں کے نام	ہندی حروف	ہندی حرفوں کے نام	ہندی حروف	ہندی حرفوں کے نام	ہندی حروف
اَ	अ - अ	ٹا	ट	شا	श
آ	आ - आ	ٹھا	ठ	کھشا (خا)	ष

ہندی حرفوں کے نام	ہندی حروف	ہندی حرفوں کے نام	ہندی حروف	ہندی حرفوں کے نام	ہندی حروف
اِ	इ	ترٗ	ञ	وا	व
اِی	ई	ٹا	ट	سا	स
اُو	उ	ٹھا	ठ	ہا	ह
اَو	ऊ	ڈا	ड		
اِے	ए	ڈھا	ढ		
اَے	ऐ	ڑاں	ण		
اُو	ओ	تا	त		
اَو	औ	تھا	थ		
اَن	अं	دا	द		
اَہ	अः	دھا	ध		
کا	क	نا	न		
کھا	ख	پا	प		
گا	ग	پھا	फ		
گھا	घ	با	ब		
ڑاں	ङ	بھا	भ		
چا	च	ما	म		
چھا	छ	یا	य		
جا	ज	را	र		
جھا	झ	لا	ल		

ہیروگلیفی	فینیقی	یونانی
 (آدا) بیل	 (الف) بیل	 (الفا)
ہیروگلیفی میں بیل کا پورا چہرہ بنا کر (آدا) کا پہلا حرف (آ) مراد لیا جاتا ہے۔	اس کی شکل ایک مثلث نما کی سی رہ گئی جس کو درمیان سے کاٹ کر بائیں کا مثلث منہ اور داہنی طرف کی شاخیں سینگ فرض کی گئیں یہ بیل کی تصویر بگڑ کر پہلی حرفی شکل تیار ہوئی	فینیقی شکل کو اس طرح گھمایا گیا کہ دونوں سینگ نیچے آ گئے اور منہ اوپر ہو گیا۔ یہ یورپی زبانوں کے حرف (اے) کی ابتدا ہے
سامری	**قدیم انگریزی**	**رومی**
	 (اے)	 (اے)
اس میں درمیان سے خط قاطع غائب ہو گیا۔	یونانی شکل سامری حرف کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر قدیم انگریزی (اے) کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔	(اے) کی سہل نگاری کے لئے ایک طالبعلم شخص نے یہ شکل وضع کی جو خوب صورت ہونے کے علاوہ سہل بھی ہے اور اب تک اکثر یورپی خطوط میں رائج ہے۔
عبرانی	**جرمنی**	**تامل**
 (آلیف) بیل		 (ا)
یہ شکل بھی کافی حد تک سامری حرف کی خوب صورتی سے متاثر ہوئی۔ سامری حرف میں داہنی طرف دو شاخیں ہیں اور اسمیں ایک۔	یونانی حرف (الفا) کا منہ اوپر سے کھل گیا اور خوب صورتی پیدا کرنے کے لئے عبرانی حرف (آلیف) کی اتباع کی گئی۔	جرمنی حرف سے بہت مشابہ ہے اور بالواسطہ عبرانی سے بھی۔

ہندی	آرامی	نبطی قدیم
अ (اَ)		
براہ راست تال حرف سے بہت مشابہ ہے اور بالواسطہ جرمنی اور عبرانی سے بھی۔	آرامی میں یہ دونوں شکلیں رائج تھیں۔	بیل کے سر (مثلث) پر صرف ایک لکیر سینگوں کی یادگار باقی رہ گئی۔

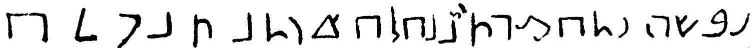
نبطی جدید	ع.بی	سریانی
		 انتہائی — ابتدائی
اس میں مثلث بھی مٹ گیا لیکن نیچے کی لکیر سے مثلث کی کچھ یادگار سی رہ گئی۔	اس میں نبطی جدید کے حرف کی اوپری لکیر بالکل سیدھی ہو گئی (ہندی میں آ مدود بھی یوں ہی سیدھا "آ" بنتا ہے۔ جیسے आ میں ہے)	یہ عربی الف کی طرح لمبائی میں لکھا جاتا ہے۔ اس کی دو شکلیں ہیں ایک ابتدائی جس میں ہلکی سی لہر پائی جاتی ہے کیونکہ اوپر سے نیچے کی طرف کشش میں لہر پیدا کرنا آسان ہے۔ دوسری انتہائی جو عربی الف کی طرح بالکل سیدھی ہے اس کی کشش نیچے سے اوپر کو ہو گی۔

(سلسلہ کے لئے صفحہ ۳۰ ملاحظہ ہو)

یعنی وہ تختہ جو معنٰ بن عمرن نے سلم دیوتا کو اپنی زندگی کے لئے پیش کیا۔ اس میں (ر۔ ب۔ اور ع) کے منہ اوپر سے کھل گئے جس کا فینیقی خط میں کہیں پتہ بھی نہیں ہے۔
خط آرامی ایشیا کی مختلف سمتوں میں پھیلا اور ہر گروہ میں پہنچ کر نئی شکل اختیار کی جس کی وجہ

سے مذکورہ بالا شاخیں پیدا ہوئیں۔ مندرجہ بالا نقشہ یہ بتایا ہے کہ شکلوں نے کس طرح ارتقائی مدارج طے کیے اور اپنی اصل سے بتدریج دور ہوتی چلی گئیں اسی نمونہ پر دوسرے حروف کو بھی قیاس کر لینا چاہیے۔

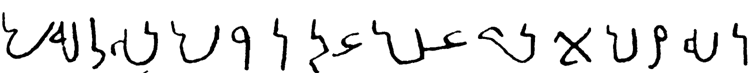
خط نبطی بھی آرامی ہی کی ایک شاخ ہے جس سے عربی خط نسخ پیدا ہوا۔ یہ رسم الخط بصری اور صرخدین بسنے والی قوم انباط میں مستعمل تھا۔ اسی نواح میں اس طرز تحریر کے کچھ نمونے دستیاب ہوئے جن کی دو مختلف قسمیں ہیں۔ ایک جو قدیم ہے اپنی وضع قطع میں آرامی رسم الخط سے قریب تر ہے۔ اس کی ان کتبوں کی عبارت نقل کی جاتی ہے جو حوران کے قرب وجوار میں دستیاب ہوئے۔



نفشه دی ہمرت دی بنه له ادینت بعله

یعنی ہمرت کا اسٹیچو جسے اس کے آقا ادینت نے بنایا۔

خط نبطی کی دوسری قسم جدید ہے جو عربی رسم الخط سے مشابہ ہے۔ ایک ایسا ہی کتبہ دستیاب ہوا جس پر عبارت اسی رسم الخط میں کندہ ہے۔ غالباً یہ اتصال حروف کی سب سے پہلی مثال ہے۔

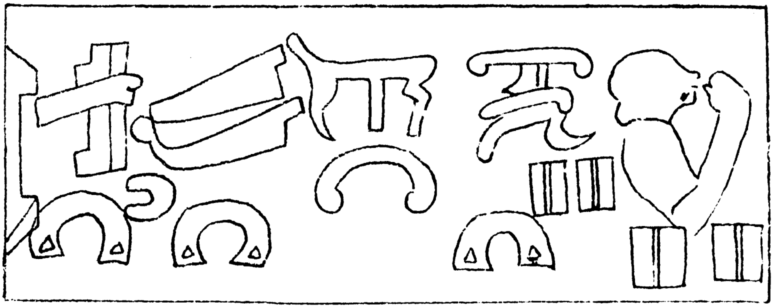


دبخ قبرا دی عبد عیدو بن کھیلو بن

یعنی یہ قبر عیدو بن کھیلو بن ...... کی بنوائی ہوئی ہے۔

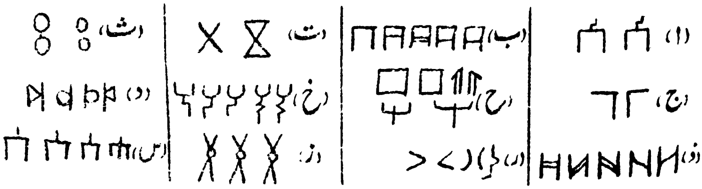
(۲) خط حثی۔ حثی ایک پرانی قوم تھی جو شام اور ایشیائے کوچک کے درمیان عہد قدیم میں آباد تھی۔ اس کی لڑائیاں فراعنۂ مصر اور آشوریوں سے ہوئیں۔ بعد ازاں تباہ و برباد ہو گئی اور اس کے آثار ہزاروں برس پیشتر معدوم ہو گئے تھے لیکن انیسویں صدی عیسوی میں

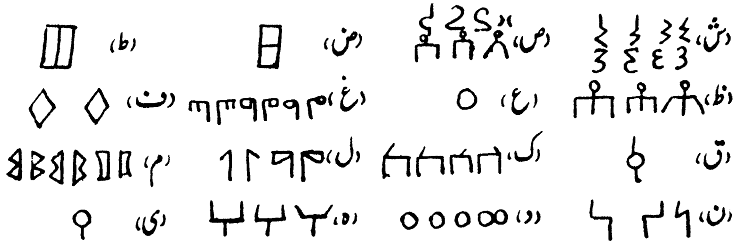
ہیں ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے ایک سنگی کتبہ ڈھونڈ نکالا جس پر ہیروگلیفی جیسے تصویری حروف کندہ ہیں۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ یہ طرزِ تحریر ہیروگلیفی کی طرح خود ایک اصل ہے۔ یہ پتھر محلہ دھان۔ حماۃ (شام) میں پایا گیا۔

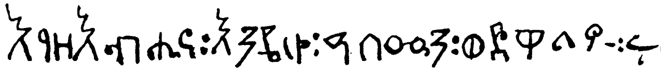


منہ میں ہاتھ دکھا کر بات کرنا مراد لیا گیا ہے۔ اس کے نیچے دو چوکور شکلوں سے (م۔ ا × ما) سمجھا جائے گا۔ گھوڑے کی نعل جیسی تین شکلیں ہیں جن میں ہر ایک سے (ا۔ س × اس) مراد ہے اور فاعلیت کی علامت ہے۔ اسی پر بقیہ دلالتوں کو بھی قیاس کر لینا چاہیئے جو ابھی تک حل نہیں کی جا سکیں۔

خیال کیا جاتا ہے کہ حبشی طرزِ تحریر سے کچھ رسم الخط پیدا ہوئے تھے جو بھلاوے میں پڑ گئے کیونکہ حبشی اور حمیری دو ایسے رسم الخط ہیں جو ہمارے نزدیک حبشی سے پیدا ہوئے۔ ان میں اور خطِ حبشی میں پوری مشابہت پائی جاتی ہے۔ علاوہ بریں ابھی تک ان کی اصل کا بھی پتہ نہیں چل سکا تھا لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ ان سے مشابہ تر خطِ حبشی ہے۔ خطِ حمیری مندرجہ ذیل ہے۔





اور یہ خط حبشی ہے:- 

اس میں اور حمیری خط میں پوری مشابہت پائی جاتی ہے بجز اس کے کہ حمیری داہنے سے بائیں کو اور حبشی بائیں سے داہنے کو لکھا جاتا ہے۔ بائیں طرف سے پہلا حرف (الف) کس قدر حمیری الف سے مشابہ ہے۔ دوسرا (جیم) اور تیسرا (زے) ہے جو حمیری کی ذال سے ملتا ہوا ہے۔ چوتھا (الف) پانچواں (بے) چھٹا (ط) اور ساتواں (ر) ہے۔ اسی پر باقی حروف کو بھی قیاس کر لینا چاہیئے۔

(۳) خط میخی۔ اس طرز تحریر کو آشوری اور بابلی قومیں اس وقت تک استعمال کرتی رہیں جب تک فینیقیوں کے حروف تہجی ان کو نہیں پہنچ گئے۔ اس کو خط میخی اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے حروف کی شکلیں کیلوں جیسی ہوتی ہیں۔ ان کی زبان کا لفظ (کالو) اس طرح لکھا جائے گا۔ <—< ، <—< جس کے معنی ہیں (جلانا) بابل اور آشور (عراق) کے کھنڈروں میں یہ رسم الخط اینٹوں پر کندہ پایا جاتا ہے۔ اس کے لکھنے کا طریقہ یہ تھا کہ مٹی کی اینٹوں پر کسی نوک دار چیز سے حروف کھود کر خشک کر لی جاتی تھیں۔ پہلی نظر میں خط میخی کو دیکھ کر یہی خیال ہوتا ہے کہ اس کو تصویر نویسی سے کوئی تعلق نہ ہوگا لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ در اصل تصویر نویسی ہی کی ایک شاخ ہے۔ اگر اس کی پرانی نشانیں دیکھی جائیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے حروف تصویروں جیسے ہیں۔

(۴) چینی خط۔ یہ طرز تحریر بہت پرانا ہے۔ اس کی شکلیں پورے پورے الفاظ کو ادا کرتی ہیں جیسے کہ قدیم تحریریں ہوتی تھیں۔ اسی بنا پر اس کی شکلوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

جرجی زیدان اور بعض دیگر علما کا خیال ہے کہ غور کرنے سے اس کی شکلیں تصویروں جیسی

معلوم ہوتی ہیں اگرچہ امتداد زمانہ سے ان میں تغیر واقع ہوگیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ خیال اپنی جگہ پر صحیح ہو اور چینی تحریر خط میخی اور خط تصویری کی درمیانی کڑی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ خط میخی کی ترقی یافتہ شکل ہو۔ نمونہ درج ذیل ہے۔

 ۔اگر غور کیا جائے تو خط میخی کی مشابہت صاف نظر آتی ہے۔
مندرجہ بالا نمونہ میں داہنی طرف سے شکل نمبر (۲) شکل نمبر (۳) اور شکل نمبر (۴) بالکل صاف مشابہ ہیں۔ اب رہیں پہلی اور پانچویں شکلیں تو ان میں کیلیں الگ الگ نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے میں سرے جڑے ہوئے ہیں۔ ہیروگلیفی اور میخی کی شاخیں داہنے سے بائیں یا بائیں سے داہنے کو بھی جاتی ہیں لیکن چینی کی سطریں اوپر سے نیچے کی طرف ہوتی ہیں۔ خط میخی میں بھی ہر لفظ کے لیے ایک شکل تھی۔ ایسی شکلوں کی تعداد اس زمانہ کے محدود ضروریات کے مطابق ۶۰۰ تھی۔ ممکن ہے کہ چین نے اس کو قبول کرکے ساتھ ساتھ اپنی ضروریات کے مطابق دیگر شکلوں کا اضافہ کرلیا ہو جن کی موجودہ تعداد میں ۴۱۲ مفرد آوازوں کی اور ۸۶۷۹ الفاظ کی علامتیں ہیں۔

نوٹ:۔ فاضل مضمون نگار نے اس موضوع پر اور بھی بہت کافی مواد جمع کیا ہے۔ اگر کوئی صاحب اس مضمون سے استفادہ حاصل کرنا چاہیں تو وہ جناب محمد کامل صاحب باب عالی فرنگی محل لکھنؤ سے براہ راست خط و کتابت کرسکتے ہیں۔

جمہوریت جدید اور اسلام

(محمد مظہر الدین صاحب صدیقی۔ بی۔ اے)

(اس موضوع پر اگر کوئی اور بزرگ اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہیں گے تو ہم ان کو رسالہ جامعہ میں ضرور شائع کریں گے۔ مدیر)

تمہید آج دنیا میں ہر جگہ جمہوریت اور آمریت برسرپیکار ہیں۔ انیسویں صدی تک یہ خیال عام تھا کہ جمہوریت سیاسی ارتقار کی آخری منزل ہے اور حکومتوں کا مستقبل اسی طرز فرماں روائی کے ساتھ وابستہ ہے۔ آئندہ جو کچھ ترقی ہوگی اس کی بنیاد عمومیت ہی ہوسکتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر جو کچھ تغیرات ہوں گے وہ اسی طرز حکومت کے ردوبدل اور توسیع واصلاح سے متعلق ہوں گے۔ سیاسی ارتقار کی کوئی نئی رو اور نظم مملکت کی کوئی نئی شکل انیسویں صدی کے ماہران سیاست کے تصور میں بھی نہ آتی تھی۔ لیکن سنہ ۱۹۱۴ء کے بعد جو کچھ ہوا اس نے ان تعلقات کو غلط ثابت کر دکھایا اور جمہوری طرز حکومت کے نقائص جو ابھی تک منظر عام پر نہ آئے تھے اب بے نقاب ہونے لگے۔ اطالیہ اور جرمنی میں جو انقلاب پیش آئے انھوں نے اس حقیقت کو آشکارا کر دیا کہ شخصی حکومت بشرطیکہ اس کا مقصد ملک کی فتح اور جمہور کی بہبود ہو کارکردگی اور منفعت کے لحاظ سے جمہوری حکومت سے کہیں فائق و برتر ہے۔ ان دو ملکوں میں جمہوری حکومت کی ناکامی کے کیا اسباب تھے ان سے ہمیں بحث نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ اس ناکامی سے سیاسی تصورات میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور آمریت کے اثرات دور دور تک پھیلنا شروع ہو گئے۔ ہمارے ملک میں بھی جہاں ابھی عمومیت کا پودا لگایا ہی جا رہا تھا اس کی مخالفت کی ہوائیں چلنے لگیں اور آمریت کسی نہ کسی بھیس میں جلوہ نما ہونے لگی۔ واقعات کی دنیا سے ہٹ کر خیالات و افکار کی دنیا میں بھی ان دونوں تصورات کی آویزش و پیکار جاری ہے اور نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کس کے حق میں مستقبل بالآخر فیصلہ صادر کرے گا۔

مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ اور زیادہ نازک اور پیچیدہ ہے کیونکہ جس وقت سے ہندوستان میں عمومی حکومت اور نیابتی ادارہ جات کا قیام شروع ہوا انھیں روز بروز یہ محسوس ہونے لگا کہ اس نظام حکومت میں ان کی ترقی کے امکانات تو ایک طرف ان کے وجود بقا کے لیے بھی کوئی تحفظ موجود نہیں ہے۔ یہ احساس درجہ بدرجہ قوی تر ہوتا گیا تا آنکہ مسلمانوں کے ہر طبقہ سے بالآخر عمومیت کے خلاف صدائیں اٹھنے لگیں لیکن اس جذبہ مخالفت میں لوگوں نے اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا کہ اصل قصور نفس عمومیت کا نہیں ہے بلکہ خرابی کی اصل جڑ عمومیت اور جمہوری ادارہ جات کی وہ خاص شکل ہے جسے ہمارے سر تھوپا جا رہا ہے اور جس کا قبول کر لینا اپنے امتیازی وجود کو مٹانے کے مترادف ہوگا۔ اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے نقطہ نظر سے اس امر کی جانچ کی جائے کہ حکومت و سیاست کا اسلامی تصور کہاں تک جمہوریت جدیدہ سے مطابقت رکھتا ہے اور کس حد تک اس میں آمریت کے عناصر داخل ہیں۔

جمہوریت کا مفہوم | لیکن سب سے پہلے ہمیں جمہوریت یا عمومیت کا مفہوم متعین کر لینا چاہیے کیونکہ اس کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں جمہوریت کی ایک عام تعریف یہ ہے کہ یہ وہ حکومت ہے جو جمہور کی ہو جمہور ہی کے لیے ہو اور جس کے چلانے والے خود جمہور ہوں (Government of the people, for the people and by the people) لیکن غور کیجیے تو یہ ایک نصب العین ہے جس کو عملی زندگی سے کوئی سروکار نہیں ہے یہ ممکن ہے کہ حکومت جمہور کی ہو اور جمہور کے لیے ہو لیکن یہ تو صریحاً غیر ممکن ہے کہ کسی ریاست کی ساری آبادی حکومت کو چلائے اور اس میں براہ راست شرکت کر سکے۔ ہاں اگر یونان قدیم کی طرح ہر شہر ایک خود مختار ریاست بنا دیا جائے تو یہ خیال شاید عملی شکل اختیار کر سکے۔ لیکن یونان قدیم کی مثال دیتے وقت اس واقعہ کو فراموش نہ کر دینا چاہیے کہ شہر ایتھنز (Athens) میں اس قسم کی حکومت میں عوام کی براہ راست شرکت صرف اس لیے ممکن ہوئی کہ وہاں غلاموں کا ایک کثیر التعداد طبقہ موجود تھا جو ہر قسم کے شہری حقوق سے محروم تھا اور جس کی زندگی کا صرف یہی مقصد تھا کہ وہ یونانیوں کے لیے ضروریات زندگی فراہم کرے تاکہ انھیں سیاسیات کی ہنگا

آرائیوں میں شرکت کے لئے فرصت مل سکے۔

چونکہ جمہوریت کا مذکورہ بالا تصور عملی دنیا کے لئے یکسر بے سود ہے اس لئے حصول مقصد کا بہترین طریقہ یہ قرار پایا کہ نیابتی ادارہ جات قائم کئے جائیں اور حکومت کا دروبست جمہور کے نمائندوں کے ہاتھ میں ہو۔ عرف عام میں جمہوریت سے اس کی یہی خاص شکل مراد لی جاتی ہے جس کا نام نیابتی حکومت (Representative Government) خود نیابتی حکومت کی ایک سے زیادہ شکلیں ہو سکتی ہیں لیکن ان تمام صورتوں میں جو تصور مشترک ہے وہ یہ حکومت کو جمہور کی مرضی کا تابع ہونا چاہیئے دوسرے الفاظ میں حکومت رائے عامہ (public opinion) کی پابند ہو یہی خیال درحقیقت جمہوریت کے لئے بمنزلہ اصل و بنیاد کے ہے کہ ریاست کے قوانین اور مملکت کا انتظام جمہور کی اکثریت کی مرضی کے مطابق ہونا چاہیئے یہیں سے حاکمیت (Sovereignty) کا مابہ النزاع مسئلہ پیدا ہوتا ہے یعنی حکومت کے اقتدار کا اصل سرچشمہ کہاں ہے۔ آیا حاکم یا فرمانروا اپنی ذات میں اس اقتدار کا حامل ہے یا اس کی حیثیت صرف ایک نائب کی ہے اور اقتدار کا اصل سرچشمہ جمہور کی ذات ہے۔ جمہوریت آخر الذکر نقطۂ نظر کی حامی ہے اس کے نزدیک حاکمیت جمہور کی ہے اور قانون اس وقت تک قانون نہیں کہلایا جا سکتا ہے جب تک کہ اس کو جمہور کی اکثریت کی تائید حاصل نہ ہو۔ اس کے برخلاف آمریت جمہور کی یہ حق نہیں دیتی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق اقتدار کا منبع خود آمر کی ذات ہے اور قانون اس کی مرضی کا نام ہے۔

اسلامی نظریہ | اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے یہ دونوں نظریات کہاں تک قرین صواب ہیں۔ اس کے لئے جب ہم قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی ہے کہ قرآن ان دونوں میں سے کسی نظریہ کو بھی قبول نہیں کرتا ہے۔ قرآن نہ کسی ایک انسان کو اور نہ انسانوں کے کسی گروہ یا جماعت کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے لئے جو قانون چاہے بنالے اسلامی نقطہ نظر سے حاکمیت (Sovereignty) نہ آمر کو حاصل ہے اور نہ جمہور کو۔ حاکمیت ساری کی ساری خدا کے لئے ہے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (حکومت تو بس اللہ کی ہے) یہی توحید کی بنیاد

ہے کہ ہر معاملہ میں اصل مرضی خدا کی ہے۔ کوئی قانون جسے کسی ایک انسان یا انسانوں کی کسی جماعت نے بنایا ہو اور جو انسان کی مرضی پر مبنی ہو، اسلامی حکومت کا قانون نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ وہ یا تو قرآن و حدیث کی تائید اپنے پیچھے نہ رکھتا ہو یا بصورت دیگر وہ ان کی اسپرٹ اور منشاء کے خلاف نہ ہو۔ یہاں نہ آمریت کا گذر ہے اور نہ جمہوریت کا دخل۔ حاکم اور جمہور دونوں خدا کی مرضی کے تابع اور منشائے ایزدی کے محکوم ہیں اور ان کے لئے سب سے بڑا قانون یہی ہے کہ وہ اپنے مصالح اور اپنی آراء کو اس کے فیصلوں میں دخیل نہ کریں۔ اسلامی حکومت میں قوانین کا بنانا یا منسوخ کرنا حاکم یا فرمانروا کا کام نہیں ہے اور نہ اس میں جمہور کا کوئی دخل ہے۔ اس حکومت کے تمام قوانین کا ماخذ و منبع مرضی خداوندی ہے جس نے خود کو تمام و کمال کتاب اللہ میں ظاہر فرما دیا ہے۔ البتہ ذیلی قوانین کی ترتیب و تدوین جو قرآن و حدیث کے احکام سے معارض نہ ہوں یا جن امور کی بابت قرآن و حدیث ساکت ہیں ان کی نسبت قوانین کا بنانا، یہ اختیارات بے شک امیر کو حاصل ہیں جن کو وہ اپنی مجلس شوریٰ کی مدد اور مشورہ سے عمل میں لا سکتا ہے۔ یہاں صرف عمومیت کا ایک عنصر پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس امر کے فیصلہ کا حق کہ آیا زیر بحث قانون قرآن و حدیث کی اسپرٹ اور ان کے منشا کے مطابق ہے یا نہیں، جمہور کو دیا گیا ہے لیکن یہاں بھی جمہوریت جدیدہ اور اسلامی نظام حکومت میں یہ فرق ہے کہ یہ حق عامۃ الناس کے ہر فرد کو حاصل نہیں ہے بلکہ صرف انھیں افراد (خواہ وہ اصطلاحی معنوں میں علماء کے زمرہ میں داخل نہ ہوں) جو علم دین رکھتے ہوں اور اپنے فیصلہ پر قرآن و حدیث سے استدلال لا سکتے ہوں۔ جب اس قسم کا کوئی اختلاف ہوگا تو آخری فیصلہ اجماع امت کے مطابق کیا جائے گا۔ ایک دوسرے نقطہ نظر سے اسلامی حکومت آمریت سے قریب تر معلوم ہوتی ہے اگرچہ اسلامی حکومت کا آج تک کوئی دستور مرتب نہیں ہوا ہے لیکن ایک ایسے دستور کے خد و خال اس قدر واضح ہیں کہ اس میں شک و اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے عملاً اسلامی حکومت کا قیام صرف خلافت راشدہ تک رہا اس لئے اگر ہم ایک اسلامی حکومت کا دستور مرتب کرنا چاہیں جو حقیقی معنوں میں اسلامی حکومت کہلائی جا سکے تو وہ خلافت راشدہ کے نمونہ پر ہونا چاہیئے۔ اس خلافت کا ایک پہلو ضرور آمریت

سے قریب تر تھا وہ یہ کہ خلیفہ یا امیر اپنے فیصلوں میں مجلس شوریٰ یا جمہور کی رائے کا لازمی طور سے پابند نہ تھا اگرچہ اکثر و بیشتر ان کی رائے کے مطابق ہی کام کرتا تھا۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ بحیثیت صدر عالم (Head of the Executive) خلیفہ نے مجلس شوریٰ کی اکثریت کی رائے کے خلاف عمل کیا ہے۔ لیکن خود خلیفہ کا انتخاب نیم جمہوری طرز پر ہوتا تھا یعنی خلیفہ اپنے جانشینوں کی ایک فہرست چھوڑ جاتا تھا یا جدید اصطلاح میں وہ چند اشخاص کو خلافت کے لئے نامزد کر دیتا تھا جو اس کے تجربہ میں منصب خلافت کے اہل ہوتے تھے۔ ان نامزد شدہ اشخاص میں جس کو جمہور کی اکثریت کی تائید حاصل ہو جاتی تھی وہ خلیفہ منتخب ہو جاتا تھا۔ اسلامی حکومت کا ایک جمہوری پہلو یہ بھی ہے کہ خلیفہ کو معزول کر دینے کا حق جمہور کو حاصل ہے اگر جمہور کو یہ محسوس ہو کہ خلیفہ یا امیر عدل وانصاف سے حکومت نہیں کر رہا ہے یا وہ حکومت خدا اور رسول کے احکام اور قرآن کی رہنمائی کے مطابق نہیں کرتا ہے تو وہ اس کو معزول کر سکتے ہیں۔

اس تمام تحریر سے میرا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ مسلمانوں کو خالص اسلامی نقطہ نظر سے نہ جمہوریت کا شیدا ہونا چاہیئے اور نہ آمریت کا دلدادہ۔ اسلامی نظام حکومت ایک نرالا انتظام حکومت ہے جس میں جمہوریت اور آمریت دونوں کے عناصر کا ایک عجیب وغریب امتزاج پایا جاتا ہے اور نظری حیثیت سے وہ ان دونوں پر فوقیت رکھتا ہے عملی حیثیت سے بھی جب تک یہ طرز حکومت قائم رہا اس سے زیادہ کامیاب اور مبنی بر انصاف طرز حکومت کا تصور ذرا مشکل سے کیا جا سکتا ہے اب رہا یہ سوال کہ اس قسم کی حکومت زیادہ عرصہ تک کیوں نہ قائم رہے گی اور نہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے اس میں اس قدر جلد زوال آ گیا نیز یہ کہ اگر موجودہ زمانہ میں اس قسم کی حکومت قائم کی جائے تو اس کے دستور کی کیا شکل ہوگی اس کے لئے زیادہ گہری نظر اور زیادہ غائر مطالعہ درکار ہے اور محل کی تنگنائی بھی اطناب کی اجازت نہیں دیتی ہے۔

جامعہ

زیر ادارت:۔ نور الحسن صاحب ہاشمی ایم۔ اے (علیگ)

نمبر ۵	نومبر ۱۹۳۹ء	جلد ۳۲

فہرست مضامین

ذاکر صاحب کا خط

(جب سے جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب یورپ تشریف لے گئے آخر ستمبر تک ان کے صرف دو تین پوسٹ کارڈ آئے تھے جن سے اتنا معلوم ہوا تھا کہ وہ جہاز سے اتر کر کچھ دن وینس ٹھیرے پھر ویانا اور بوداپسٹ گئے اور وسط اگست میں جرمنی جائیں گے۔ اس کے بعد کوئی خط نہیں آیا۔ ہم لوگوں کو کچھ خبر نہیں تھی کہ ان کی صحت کا کیا حال ہے اور علاج کیسا ہو رہا ہے۔ لڑائی چھڑ جانے کے بعد یہ فکر پیدا ہو گئی کہ اگر وہ اعلان جنگ کے وقت جرمنی میں موجود ہونے اور فوراً ہی وہاں سے روانہ ہو گئے تو نظر بند کر دیئے جائیں گے۔ سخت پریشانی اور انتظار کی حالت میں ۲۸ ستمبر کو یہ خط پہنچا جس سے بہت کچھ اطمینان ہو گیا۔

بعض حضرات کی رائے ہے اسے ڈاکٹر صاحب کے احباب اور ہمدردان جامعہ کی اطلاع کے لئے رسالہ جامعہ میں شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک اور مختصر خط آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ موصوف وسط نومبر تک ہندوستان واپس آئیں گے)

HOTEL DES FAMILLES

GENEVE

۱۱ ستمبر ۳۹ء

برادرم عابد صاحب۔ تسلیم   آپ کا خط مجھے اس دن ملا جب میں جرمنی سے بھاگ رہا تھا۔ اسی ڈاک سے ایک شفیق صاحب کا اور ایک خط بیگم صاحبہ کا ملا۔ ان خطوط سے ادھر کا حال تو اتنا معلوم ہو گیا کہ چند ہفتے صبر سے گذار سکتا ہوں۔ اس سے پہلے کسی

بندۂ خدا نے خبر نہ لی۔ شفیق صاحب نے مجیب صاحب، اکبر صاحب اور سعید صاحب کے مفصل، خطوط کا حوالہ دیا ہے جو مجھے نہیں ملے!

میری کہانی سنئے ۔ ۳ / جولائی کو وینس پہنچا۔ شہر پسند آیا، وہیں رہ پڑا۔ دو دن کی جگہ دس دن وہاں رہ گیا۔ بہانہ یہ تراشا کہ اطالوی زبان سیکھ رہا ہوں۔ واقعی سیکھا بھی تھا۔ لیکن سیکھنے میں جتنی دیر لگی بھلانے میں اس سے بہت کم لگے گی۔ ۱۸ / جولائی کو ویانا پہنچا۔ وہاں امتیاز آ گئے۔ ان کے ساتھ ایک ہفتہ کے لئے بوداپسٹ چلا گیا۔ بڑا ہی "گتھا ہوا" شہر ہے۔ واقعی خوبصورت۔ تقریباً ہر شخص جرمن بھی جانتا ہے۔ وہاں سے پھر ویانا واپس آئے۔ مگر ہوائی جہاز پر! یہ ارمان بھی کیوں رہ جاتا۔ ویانا سے پھر امتیاز تو چلے گئے اور مجھے ڈاکٹروں کے سپرد کر گئے۔ ڈاکٹروں نے وہ وہ معائنے کئے کہ معاذ اللہ۔ در گفتن نمی آید۔ قرار یہ پایا کہ آنکھیں اب جو کچھ ہیں ٹھیک ہیں۔ احتیاط رہے تو کام چلتا رہے گا آنتیں البتہ بہت خراب ہیں۔ پرانی پیچش ہے اور خوب ہے۔ اس کی وجہ سے جگر بھی خراب ہے اور گردے بھی متاثر ہو چلے ہیں۔ زیادہ ڈھیل کی گنجائش نہیں قاعدے سے تو حالت خراب ہونی چاہئیے تھی لیکن چونکہ یہاں سب کچھ بے قاعدہ رہا ہے اس لئے ابھی موقع ہے، علاج ہو سکتا ہے۔ خون کی جو حالت ہونی چاہئیے تھی اس سے بہت بہتر ہے۔ اس لئے علاج میں سہولت ہے۔ قلب بھی (رستم ظریفی ملاحظہ ہو!) بر جا ہے۔ دماغ کا معائنہ نہیں ہوا ورنہ شاید کچھ دلچسپ نتیجہ برآمد ہوتا علاج سے زیادہ پرہیز کی تاکید کی گئی۔ سات انجکشن تجویز کئے گئے اور حکم ملا کہ کسنجن چلے جاؤ۔ وہاں ۳ ہفتہ رہو۔ انجکشن لو، پرہیز کرو۔ اس کے بعد خون کا معائنہ کراؤ اگر انجکشن کی وجہ سے خون میں کچھ کمزوری آگئی ہو تو ۴ - ۵ ہفتہ کا وقفہ دے کر پھر انجکشن لینا ورنہ ۲ ہفتہ کا وقفہ کافی ہوگا۔ چنانچہ میں ۱۵ / اگست کو KISSINGEN پہنچا۔ چھوٹی سی جگہ ہے باشندے سب پردیسی، اور بیمار۔ چاروں طرف پھولوں کی بھرمار۔ یہ جگہ مجھے بہت پسند آئی۔ ویانا سے ڈاکٹر نے ایک مفصل وصیت نامہ ساتھ دیا تھا اور ایک اور ڈاکٹر کے نام تعارفی خط۔ انھوں نے اسی دن سے علاج شروع کر دیا۔ ایک مکان میں رکھ دیا جہاں بھٹیارن خود ڈاکٹر تھی اور ایک

ڈاکٹر کی بیوہ اور بڈھی! یعنی تجربہ کار۔ اس نے پرہیز کا پورا پورا انتظام کیا۔ چند ہی روز میں بین فائدہ محسوس ہونے لگا۔ لیکن فلک کج رفتار کو کیا کہیے، لڑائی کی خبریں آنے لگیں۔ آدمی، گھوڑے، گاڑیاں، موٹریں سب ضبط ہونے لگیں۔ ۲۵ اگست کو سب تیاری ہو چکی تھی۔ ہمارے نوکر سب فوج میں جا چکے تھے۔ بیمار ساتھی سب بھاگ نکلے تھے۔ ریلیں کم ہو گئی تھیں۔ مگر ہم تھے کہ ڈٹے رہے۔ اور کرتے بھی کیا۔ انجکشن پورے نہیں ہوئے تھے۔ طبیعت برابر صحت کی طرف مائل تھی۔ ہم نے طے کیا کہ فی الحال جنگ نہ ہو گی۔ اس اطمینان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۶ اگست کو خاکسار کے بطن سے (ایک زندہ وجود تولد ہوا!! یعنی) ایک عدد عظیم الشان کیڑا، طول جس کا کوئی ۹ انچ تھا، برآمد ہوا، پیچش کے علاوہ یہ بزرگ بھی سالہا سال سے (اندرون خانہ مقیم) موجود تھے انھیں گرفتار کیا اور ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ انھوں نے اس کا لاطینی نام بتایا جو مجھے یاد نہیں رہا اور کہا بہت اچھا ہوا کہ یہ نکل گئے۔ بہت پرانا ہے۔" خیر یہ بھی ہوا۔ ہم خوش ہوئے کہ علاج کامیاب ہو رہا ہے۔ اور جمے رہے۔ پہلی ستمبر کو انجکشن ختم ہو گئے۔ غسل جو تجویز کیے گئے تھے وہ بھی پورے ہو گئے۔ اور دو تاریخ کو اعلان جنگ برطانیہ نے کر ہی دیا۔ ہمیں اس روز تک بس یہ معلوم ہوا تھا کہ صلح کی بات چیت ہو رہی ہے۔ اور پوری امید تھی کہ پرامن طریقہ پر معاملہ یکسو ہو جائے گا۔ حالت جنگ کا اعلان ہمیں ۲ر کو سہ پہر میں سنایا گیا۔ اتوار کا دن تھا اسی وقت اسٹیشن گیا۔ معلوم ہوا کہ پہلی گاڑی جو مل سکتی ہے وہ صبح ۵ بجے ہے۔ واپس آکر حساب چکایا سامان باندھا۔ رات کو دس بجے جا کر سامان اسٹیشن پر دیا۔ اور ٹکٹ خریدا۔ صبح ۵ بجے روانہ ہو گیا۔ ریلوں کا انتظام کچھ یوں تھا کہ ایک حلقہ والا دوسرے حلقہ کی کوئی خبر نہ دیتا تھا۔ بس اس حلقہ میں گاڑیوں کا حال معلوم ہو سکتا تھا وہ بھی غیر معیّن طور پر (stuttgart) میں نے سوئٹزرلینڈ کا قصد کیا۔ کہا گیا کہ STUTTGART تک جا سکتے ہو، آگے معلوم نہیں۔ خیر STUTTGART کا ٹکٹ لیا۔ راستہ میں تین جگہ گاڑی بدلتی تھی۔ دو دفعہ بدل چکا تھا۔ تیسری جگہ پہنچنے سے پہلے ایک مقام پر بشارت ملی کہ یہ گاڑی آگے نہیں جائے گی، سب مسافر اتر جائیں

اتر گئے۔ ۸ گھنٹے وہاں پڑے رہے۔ چھوٹا سا اسٹیشن۔ ہوائی جہازوں کے ڈر سے تاریک۔ بس ہر گھنٹہ دو گھنٹہ میں ایک گاڑی گذر جاتی تھی جس میں سرحدی مقامات کے بڈھے بچے ہوتے تھے جنھیں اندرون ملک بھیجا جا رہا تھا۔ خیر یہ وقت بھی گذر گیا اور ہم STUTTGART پہنچے۔ وہاں کہا کہ ZURICH جانا ہے۔ معلوم ہوا کہ گاڑی ابھی جا رہی ہے سامان پوچھا، معلوم ہوا ساتھ نہیں آیا۔ اسی دریافت کرنے میں ZURICH کی گاڑی روانہ ہو گئی رات وہیں قیام فرمایا۔ قاعدہ سے سرکاری مہمان ہو جانا چاہیئے تھا، مگر مہمان نوازی نہ معلوم کیوں نہیں کی گئی دوسرے دن ZURICH کا ٹکٹ لے کر روانہ ہوا۔ جرمن علاقہ میں LAKE CONSTANCE کے کنارے فریدرش ہافن پر اترا وہاں سے اسٹیمر لینا ہوتا ہے رات کو پہنچا تھا دوسرے دن دو بجے دن کے اسٹیمر جانے والا تھا۔ راستہ میں معلوم ہوا تھا کہ اسٹیمر پھر چلنا بند ہو گئے آگے نہ جا سکو گے۔ مگر یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اسٹیمر پھر چلنے لگے ہیں۔ سہ پہر میں اسٹیمر پر پہنچا۔ جرمن پولیس نے کہا کہ تم کو سوئٹزرلینڈ والے جہاز سے اترنے نہ دیں گے۔ صبح ہی ۵۰ آدمی اس ساحل سے واپس بھیجے گئے ہیں! میں نے کہا آپ تو جانے دیں میں قسمت آزمائی کروں گا۔ مسکرائے، کندھے اچکائے، اور پاسپورٹ پر مہر لگا دی میں اسٹیمر پر بیٹھ ROMANSHORN پہنچا۔ اسٹیمر جس میں ۴۰۰ آدمیوں کی جگہ تھی اس پر عملہ کے علاوہ بس تین آدمی اور تھے۔ میں اور دو ڈیوڈ جو فوجی خدمت کے لئے جرمن سے اپنے ملک واپس جا رہے تھے۔ کپتان نے پوچھا کہ تم نے سوئس VISA لے لیا ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ کہا پھر کیسے چلے ہو۔ یہ جہاز اسی لئے تو خالی جا رہا ہے۔ کہ کل رات کے بارہ بجے سے ہماری حکومت نے باہر سے آنے والوں کے لئے بلا استثنا VISA کی قید لگا دی ہے اور اس کی سختی سے پابندی ہو رہی ہے۔ یہ گفتگو اس وقت ہوئی کہ جہاز چل چکا تھا۔ میں نے کہا اب میں تو چل کھڑا ہوا ہوں فرمایا کہ نہیں واپس جا سکتے ہو۔ پھر اس جہاز پر واپس ہو جانا اور جرمنی میں فلاں مقام پر جا کر VISA کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ میں نے کہا کہ حضرت اب یہ تو ہوتا نہیں۔ ایک دفعہ

برسنی سے نکل آنے کے معنی یہ نہیں کہ دوبارہ ان کی مہمانی کی آزمائش کروں۔ خیر اسی گفتگو میں ROMANSHOM پہنچے وہاں وہی پیش آیا جو کپتان نے کہا تھا۔ سرحدی پولیس نے کہا واپس جاؤ۔ میں نے کہا ناممکن۔ یہیں قید کر لو۔ کچھ دیر تو وہ اصرار کرتا رہا کہ حکم تو حکم ہے واپس جانا ہی ہوگا مگر جب میری طرف سے بھی انکار ہوتا رہا تو کہنے لگا کہ تم بات تو ٹھیک کہتے ہو جرمنی واپس جاؤ گے تو تمھیں وہاں قید کر لیں گے تمھیں واپس بھیجنا تو ناانصافی ہے۔ میں کیا آپ ہی سمجھئے۔ چنانچہ اس نے (برن) کو ٹیلیفون کیا۔ وہاں سے مجھے اجازت مل گئی۔ ادھر میں ZURICH پہنچا۔ وہاں برطانوی کانسل نے مشورہ دیا کہ جینیوا جاؤ۔ انگلستان جانے یا اٹلی سے ہندوستان واپس جانے کے متعلق وہیں سے زیادہ آسانی رہے گی۔ چنانچہ میں ۹ کو یہاں پہنچ گیا۔ یہاں ڈاکٹر گوکل سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اتفاق سے اسی ہوٹل میں ہیں جس میں میں آ کر ٹھہرا ہوں۔ اب یہاں اطمینان ہے۔ چند روز کی اس دوڑ بھاگ میں ذرا رنگ روغن ویسا نہیں رہا جیسا KISSINGEN میں ہو گیا تھا۔ مگر فی الجملہ اچھا ہوں۔ خوب سوتا ہوں، خوب کھاتا ہوں، اور ہضم کرتا ہوں۔ اور کیا چاہئے۔ وقفہ گذار کر پھر یہیں کہیں انجکشن لینے کا انتظام کروں گا۔ اور اگر اٹلی غیر جانبدار رہا تو انشاء اللہ اکتوبر کے ختم تک آپ لوگوں سے آ ملوں گا۔ مجھے امید ہے کہ روپیہ کی اور ضرورت نہ پڑے گی۔ لیکن آپ اگر ۲۰۰ پونڈ کا انتظام رکھیں تو اچھا ہے۔ شاید ضرورت پڑ جائے تو مرا تار ملنے پر آپ بھیج سکیں۔

اس خط کے مضمون سے سب احباب کو مطلع کر دیجئے گا۔ اور یوسف اور محمود کو بھی۔ مجھے یہاں پہنچ جانے کی سب سے زیادہ خواہش اس وجہ سے تھی کہ آپ لوگوں کی خیریت معلوم ہوتی رہے گی۔ دیکھئے۔ یہ قیاس صحیح نکلتا ہے یا نہیں +

کریٹو

مترجمہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب پی' ایچ' ڈی)

(انجمن ترقی اردو ہند سقراط کے چند منتخب مکالمات کا ترجمہ کرا رہی ہے ۔امید ہے
کہ یہ مجموعہ آئندہ سال شائع ہو جائے گا۔ ہم جناب مولوی عبد الحق صاحب قبلہ کی اجازت
سے شکریے کے ساتھ اس چھوٹے سے مکالمے کا ترجمہ قارئین جامعہ کی خدمت میں
پیش کرتے ہیں)

اشخاص مکالمہ

سقراط　　　　کریٹو

مقام ۔سقراط کا قید خانہ

سقراط　تم اس وقت کیوں آئے' کریٹو ؟ ابھی تو بہت سویرا ہوگا ؟

کریٹو　ہاں' بے شک ۔

س　ٹھیک وقت کیا ہے ؟

ک　پو پھٹ رہی ہے

س　تعجب ہے کہ قید خانہ کے محافظ نے تمہیں آنے دیا

ک　وہ مجھے جانتا ہے کیونکہ میں اکثر آتا رہتا ہوں' سقراط۔ اس کے علاوہ میں نے اس کے ساتھ کچھ سلوک بھی کیا ہے ۔

س　کیا تم ابھی پہنچے ہو ۔

ک　نہیں مجھے آئے تھوڑی دیر ہوئی ۔

س   تو پھر تم چپ کیوں بیٹھے رہے۔ فوراً جگا دیا ہوتا۔

ک   سقراط، مجھ سے تمہاری طرح یہ تکلیف اور پریشانی نہ اٹھائی جاتی ہرگز نہ اٹھائی جاتی۔ میں تمہاری پرسکون نیند کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے تمہیں اسی وجہ سے نہیں جگایا کہ میں چاہتا تھا، جہاں تک ہو سکے تمہاری تکلیف میں کمی ہو یوں تو میں تمہیں ہمیشہ سے خوش مزاج سمجھتا تھا مگر جس اطمینان سے تم یہ مصیبت برداشت کر رہے ہو اس کی مثال میری نظر سے آج تک نہیں گذری۔

س   بھئی کریٹو، جب انسان میری عمر کو پہنچ جائے تو اسے اس خیال سے کڑھنا نہیں چاہئے کہ موت قریب آ رہی ہے۔

ک   مگر اور بوڑھے بھی تو ہیں جو اسی قسم کی مصیبت میں گرفتار ہیں ان کا بڑھاپا انہیں کڑھنے سے نہیں روکتا۔

س   یہ سچ ہے، مگر تم نے یہ نہیں بتایا کہ اتنے سویرے کیوں آتے ہو؟

ک   میں تمہارے پاس ایک پیام لے کر آیا ہوں جو افسوس ناک اور تکلیف دہ ہے۔ غالباً تمہارے لئے تو نہیں مگر تمہارے دوستوں کے لئے خصوصاً میرے لئے نہایت افسوس ناک ہے۔

س   ہائیں! کیا وہ جہاز ڈیلوس سے آ گیا جس کی واپسی پر میں مارا جاؤں گا۔

ک   نہیں ابھی آیا تو نہیں مگر غالباً آج آ جائے گا۔ جو لوگ سینیم سے آئے ہیں ان کا بیان ہے کہ انھوں نے اسے وہاں چھوڑا تھا۔ لہٰذا سقراط کل تمہاری زندگی کا آخری دن ہے۔

س   اچھا کریٹو اگر خدا کی مرضی یہی ہے تو میں بھی راضی ہوں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایک دن کی دیر ہو جائے گی۔

ک   تم یہ کیوں سمجھتے ہو؟

س   میں بتاتا ہوں۔ مجھے جہاز کے پہنچنے کے دوسرے دن مرنا ہے نہ؟

ک ہاں حکام یہی کہتے ہیں

س مگر میرے خیال میں جہاز کل سے پہلے یہاں نہیں پہنچے گا۔ یہ مجھے ایک خواب سے معلوم ہوا جو میں نے کل رات کو بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ابھی سویرے دیکھا تھا جب کہ خوش قسمتی سے تم نے مجھے سونے دیا۔

ک اور یہ خواب تھا کیا؟

س مجھے ایک حسین و جمیل عورت کی صورت زرق برق لباس میں نظر آئی جس نے مجھے مخاطب کر کے کہا سن اے سقراط،

"آج سے تیسرے دن تو فتھیا کے زرخیز خطے کو جائے گا"

ک کیا عجیب خواب ہے سقراط،

س میرے خیال میں کریٹو، اس کی تعبیر کے بارے میں تو شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔

ک ہاں افسوس، تعبیر تو بالکل صاف ہے۔ مگر میرے پیارے سقراط، میں ایک بار پھر التجا کرتا ہوں کہ میری بات مانو اور یہاں سے نکل بھاگو اگر تم مر گئے، تو صرف یہی نہیں کہ میرا ایک دوست جاتا رہے گا جس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا بلکہ ایک اور خرابی ہے جو لوگ تم کو اور مجھ کو نہیں جانتے وہ سمجھیں گے کہ اگر میں روپیہ خرچ کرنے پر تیار ہوتا تو تمہیں بچا سکتا تھا مگر میں نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ اب بتاؤ اس سے بڑھ کر کوئی ذلت ہو سکتی ہے ـــــ کہ میرے متعلق یہ سمجھا جائے کہ میں روپیہ کو ایک دوست کی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں ؛ لوگ تو یہ کبھی نہیں مانیں گے کہ میں چاہتا تھا تم بھاگ جاؤ مگر تم نے انکار کر دیا۔

س مگر پیارے کریٹو، ہم عام لوگوں کی رائے کی پرواہی کیوں کریں؟ ہمیں تو صرف اچھے آدمیوں کا لحاظ رکھنا چاہیئے اور یہ ان معاملات کو اسی طرح دیکھیں جس طرح حقیقت میں پیش آئے۔

مگر سقراط عوام کی رائے کا لحاظ کرنا ہی پڑتا ہے اس لئے کہ جو کچھ آج کل ہو رہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے یہ لوگ جس شخص سے بدظن ہو جائیں اسے انتہائی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

کاش ایسا ہوتا، کریٹو، کہ عوام انتہائی نقصان پہنچا سکتے، کیونکہ وہ اس صورت میں انتہائی فائدہ پہنچانے کے قابل بھی ہوتے۔ اور اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے تھی! لیکن حقیقت میں وہ دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں کرتے اس لئے کہ وہ کسی شخص کو دانش مند بنا سکتے ہیں اور نہ بے وقوف ان کے سارے کام محض اتفاقی ہوتے ہیں۔

خیر میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ مگر یہ تو کہو سقراط کہیں تم میرے اور اپنے دوسری دوستوں کے خیال سے تو ایسا نہیں کر رہے ہو؟ تمہیں یہ خوف تو نہیں کہ اگر تم قید خانے سے بھاگ گئے تو جاسوس ہمیں دق کریں گے کہ ہم تمہیں اڑا لے گئے اور ہماری ساری املاک یا اس کا کچھ حصہ چھن جائے گا یا اس سے بھی برا انجام ہوگا؟ اگر تم ہماری وجہ سے ڈرتے ہو تو اس خیال کو دل سے نکال دو کیونکہ تمہیں بچانے کے لئے ہمیں یقیناً یہ اور اس سے بڑھ کر خطرہ برداشت کرنا چاہیئے۔ تو پھر مان جاؤ اور جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔

ہاں کریٹو، ایک خوف یہ بھی ہے جس کا تم نے ذکر کیا مگر صرف یہی نہیں ہے۔

تم اطمینان رکھو ــــــ ایسے لوگ موجود ہیں جو بہت کم خرچ پر تمہیں قید خانہ سے نکال لے جانے کو تیار ہیں۔ اب رہے جاسوس تو ان کا معاملہ بھی کچھ زیادہ نہیں ــــ تھوڑی سی رقم میں خوش ہو جائیں گے۔ میری دولت جو حقیقت میں بہت ہے تمہارے لئے حاضر ہے اور اگر تمہیں میری ساری پونجی صرف کرنے میں تامل ہو تو بعض اجنبی اپنا سرمایہ پیش کرتے ہیں کہ تم اسے کام میں لاؤ ان میں سے ایک سمیاس

تھیبی خاص اسی غرض سے ایک بہت بڑی رقم اپنے ساتھ لایا ہے سیبن وغیرہ بہت سے لوگ تمہیں بھاگنے میں مدد دینے کے لئے اپنا روپیہ خرچ کرنے کو تیار ہیں۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ تم ہمارے خیال سے تامل نہ کرو اور وہ بات نہ کہو جو تم نے عدالت میں کہی تھی کہ دوسری جگہ جاکر میری سمجھ ہی میں نہیں آئے گا کہ کیا شغل اختیار کر دوں تم جہاں کہیں جاؤ گے لوگ تمہیں عزیز رکھیں گے کچھ ایتھنس پر موقوف نہیں۔ تھسلی میں میرے دوست موجود ہیں۔ اگر تم ان کے پاس جانا چاہو تو تمہاری قدر اور حفاظت کریں گے اور کوئی تھسلی والا تمہیں نہیں ستائے گا اور میں نہیں سمجھتا سقراط تمہارے لئے یہ جائز ہے کہ جب تمہاری جان بچ سکتی ہے تو تم خود اسے ہلاکت میں ڈالو۔ تم تو اپنے دشمنوں کا مقصد پورا کر رہے ہو جو تمہیں جلد سے جلد برباد کرنا چاہتے ہیں اور پھر میں یہ بھی کہہ دوں کہ تم اپنے بچوں سے بے وفائی کر رہے ہو بجائے اس کے کہ تم ان کی پرورش کرتے اور انھیں تعلیم دلاتے انھیں چھوڑ کر جا رہے ہو اور اب انھیں خود ہی قسمت آزمائی کرنی پڑے گی اگر وہ اس انجام سے بچ گئے جو عموماً یتیموں کا ہوا کرتا ہے تو اس میں تمہاری کوئی کارگذاری نہیں ہوگی۔ ایسے شخص کو دنیا میں بچے پیدا ہی نہیں کرنے چاہئیں جو آخر تک ان کی پرورش اور تعلیم کا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار نہ ہو۔ لیکن معلوم ہوتا ہے تم وہ راہ اختیار کر رہے ہو جس میں زیادہ آسانی ہے وہ نہیں جس میں زیادہ خوبی اور مردانگی ہے اور جو تم جیسے شخص کے لئے مناسب ہے جسے دعویٰ ہے کہ وہ ہر بات میں نیکی کا لحاظ رکھتا ہے۔ مجھے سچ سچ شرم آتی ہے نہ صرف تم پر بلکہ ہم سب پر جو تمہارے دوست کہلاتے ہیں، جب میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ سارا قصہ محض ہماری کم ہمتی سے منسوب کیا جائے گا۔ ہمیں چاہیئے تھا کہ اس مقدمے کو دائر ہی نہ ہونے دیتے یا کچھ اور انتظام کرتے، یہ آخری حرکت یہ انتہائی حماقت تو سراسر ہم لوگوں کی غفلت اور بزدلی کا نتیجہ سمجھی جائے گی اور لوگ کہیں گے کہ اگر ہم کسی کام کے ہوتے

تو تمہیں بچا لیتے اور تم خود بھی بچ سکتے تھے اس لئے کہ کوئی مشکل ہی نہ تھی۔ دیکھو سقراط اس کے نتائج ہمارے لئے بھی اور تمہارے لئے بھی کس قدر افسوس ناک اور شرم ناک ہیں تو پھر فیصلہ کر ڈالو بلکہ یہ سمجھو کہ پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہو اس لئے کہ سوچنے کا وقت گذر گیا۔ اب صرف ایک ہی بات ہو سکتی ہے اور وہ آج رات کو ہو جانی چاہئے اگر ذرا بھی دیر ہوئی تو اس کی کوئی صورت یا امکان نہیں رہے گا۔ اس لئے میری التجا ہے

سقراط کہ تم راضی ہو جاؤ اور جو میں کہتا ہوں اس پر عمل کرو۔

پیارے کریٹو، تمہارا یہ جوش اگر صحیح ہو تو نہایت قابل قدر ہے لیکن اگر غلط ہو تو جتنا زیادہ شدید ہوگا اتنا ہی زیادہ خطرناک ہوگا۔ لہذا ہمیں سوچ لینا چاہیے کہ میں تمہارے کہنے پر عمل کروں یا نہ کروں۔ اس لئے کہ میری طبیعت ہمیشہ سے عقل کی راہ پر چلتی ہے جو غور کرنے کے بعد مجھے سب سے بہتر معلوم ہو۔ اس مصیبت کے پیش آنے کی وجہ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنے قول سے پھر جاؤں۔ جن اصولوں کی میں اب تک قدر اور عزت کرتا رہا ہوں اور اب بھی کرتا ہوں اور بجز اس صورت کے کہ ہمیں فوراً کوئی دوسرے ان سے بہتر اصول ہاتھ آ جائیں مجھے ہرگز تمہارے ساتھ اتفاق نہیں ہو سکتا چاہے جمہور کی طاقت مجھے کتنی ہی بار قید، ضبط املاک، اور موت کی سزا دے جس طرح بچوں کو ہوّے سے ڈراتے ہیں۔ اس مسئلے پر غور کرنے کا سب سے معقول طریقہ کیا ہوتا ہے؟ کیا میں پھر لوگوں کی رائے کے بارے میں تمہاری پرانی بحث کی طرف رجوع کروں؟ —— ہم یہ کہہ رہے تھے کہ بعض کی رائے کا لحاظ کرنا چاہئے اور بعض کا نہ کرنا چاہیئے۔ اب بتاؤ کہ یہ بات جو میری سزا کا حکم سنائے جانے سے پہلے کہی گئی تھی، ٹھیک ہے یا نہیں؟ کیا وہ بحث جو پہلے معقول تھی اب محض بکواس ثابت ہوئی —— محض بچوں کی سی مہمل گفتگو؟ یہ وہ سوال ہے کریٹو، جس پر میں تمہاری مدد سے غور کرنا چاہتا ہوں:- آیا موجودہ حالات میں ہمیں اپنا استدلال

کچھ مختلف نظر آتا ہے یا نہیں اور میں اسے تسلیم کروں یا نہ کروں؟ اس کا خلاصہ جس پر میرے خیال میں بہت سے مستند اشخاص متفق ہیں یہ تھا کہ جیسا میں ابھی کہہ رہا تھا۔ بعض لوگوں کی رائے کا لحاظ کیا جائے اور بعض کی رائے کا نہ کیا جائے اب سوچ کر بتاؤ کہ تمہیں تو کل مرنا نہیں ـــــ کم سے کم انسانی عقل کو اس کا کوئی احتمال نظر نہیں آتا ـــــ لہٰذا تمہاری رائے بے لوث ہوگی اور تم گردوپیش کے حالات سے دھوکا نہیں کھاؤ گے۔ تمہیں بتاؤ میری یہ بات صحیح ہے یا نہیں کہ بعض رائیں اور صرف بعض اشخاص کی رائیں قابل قدر ہیں اور باقی رائیں اور باقی لوگوں کی رائیں قابل قدر نہیں ہیں میں تم سے پوچھتا ہوں کہ میرا یہ دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟

ک یقیناً

س اچھوں کا لحاظ کرنا چاہیئے، بروں کا نہیں کرنا چاہیئے؟

ک اور کیا

س اور دانش مندوں کی رائے اچھی اور بے وقوفوں کی رائے بری ہوتی ہے؟

ک یقیناً

س اچھا ایک اور مسئلے میں ہم لوگوں نے کیا کہا تھا؟ کیا وہ شخص جو ورزش کا شغل اختیار کرتا ہے ہر ایک کی تعریف اور مذمت اور رائے کی پروا کرتا ہے یا صرف ایک شخص کی، خواہ وہ اس کا معالج ہو یا استاد۔

ک صرف ایک شخص کی۔

س اور اسے بہت سے لوگوں کی نہیں بلکہ صرف ایک شخص کی مذمت سے ڈرنا چاہیئے اور تعریف سے خوش ہونا چاہیئے؟

ک ظاہر ہے

س اور اسے اس طریقہ سے کام کرنا، ورزش کرنا، کھانا پینا چاہیئے، جسے ایک فرد

واحد یعنی اس کا استاد جو صاحب فہم ہے، مناسب سمجھتا ہے نہ کہ اور سب لوگوں کی رائے کے مطابق۔

سچ ہے۔

اور اگر وہ ایک شخص کی رائے کو نظر انداز کر کے اس کی خلاف ورزی کرے اور ان بہت سے لوگوں کی رائے مان لے جو بالکل نافہم ہیں تو نقصان اٹھائے گا یا نہیں؟

یقیناً نقصان اٹھائے گا۔

اور وہ نقصان کیا ہوگا کس طرف رخ کرے گا اور خلاف ورزی کرنے والے کی کس چیز پر اثر ڈالے گا؟

ظاہر ہے اس کے جسم پر اثر ڈالے گا۔ یہی چیز ہے جسے یہ نقصان برباد کر دیتا ہے

بہت ٹھیک۔ اب بتاؤ کرٹو، کیا یہ بات دوسری چیزوں پر صادق نہیں آتی جنھیں ایک ایک کر کے گنوانے کی ضرورت نہیں؟ کیا عدل و ظلم، حسن و قبح، نیک و بد کے مسائل میں جن پر ہم اس وقت بحث کر رہے ہیں ہمیں بہت سے لوگوں کی رائے پر عمل کرنا اور ان سے ڈرنا چاہیئے یا ایک شخص کی رائے پر جو صاحب فہم ہے؟ کیا ہمارا یہ فرض نہیں کہ تمام دنیا سے زیادہ اس سے ڈریں اور اس کا احترام کریں؟ اور اگر ہم اس کا ساتھ دیں تو کیا اپنے نفس کے اس جوہر کو برباد نہ کر دیں گے جو عدل سے بنتا اور ظلم سے بگڑتا ہے؟ آخر یہ جوہر وجود رکھتا ہے یا نہیں؟

یقیناً سقراط۔

ایسی ایک اور مثال لے لو: ۔ اگر ہم نافہم لوگوں کے مشورے پر عمل کر کے اس چیز کو برباد کر دیں جو تندرستی سے بنتی اور بیماری سے بگڑتی ہے تو زندگی کا لطف باقی رہے گا؟ اور یہ چیز جو برباد ہوتی ہے جسم ہی ہے نہ؟

ہاں۔

س اگر ہمارا جسم خراب اور فاسد ہو تو ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟

ک ہرگز نہیں۔

س اور کیا اس صورت میں زندگی کا لطف باقی رہے گا اگر انسان کا وہ اعلیٰ جوہر برباد ہو جائے جو عدل سے بنتا اور ظلم سے بگڑتا ہے؟ کیا ہم انسان کے اس جوہر کو، خواہ وہ کچھ بھی ہو، جس کا تعلق عدل اور ظلم سے ہے، جسم سے کم تر سمجھتے ہیں؟

ک ہرگز نہیں۔

س پھر کیا اسے جسم سے برتر سمجھتے ہیں؟

ک بدرجہا برتر۔

س تو میرے دوست، ہمیں اس کی پروا نہیں کرنی چاہیئے کہ عام لوگ ہمارے متعلق کیا کہتے ہیں بلکہ یہ سوچنا چاہیئے کہ وہ ایک شخص جو عدل اور ظلم کی ماہیت کو سمجھتا ہے کیا کہے گا اور حق کیا کہے گا۔ اس لئے جب تم نے یہ مشورہ دیا کہ ہمیں عدل ظلم بد و نیک، عزت و ذلت کے بارے میں عام لوگوں کی رائے کا لحاظ رکھنا چاہیئے تو گویا بسم اللہ ہی غلط کر دی ——— مگر ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ "عام لوگ ہمیں قتل جو کر دیں گے"

ک ہاں سقراط، ظاہر ہے کہ یہی جواب دیا جائے گا۔

س اور یہ ٹھیک ہے۔ پھر بھی مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ہمارا پرانا دعویٰ بدستور اپنی جگہ پر قائم ہے۔ مگر کیا میں ایک اور دعوے کے متعلق بھی یہی بات کہہ سکتا ہوں — کہ اصل میں زندگی کی نہیں بلکہ اچھی زندگی کی قدر کرنی چاہیئے۔

ک ہاں یہ بھی اپنی جگہ پر قائم ہے۔

س اچھی زندگی با عدل اور باعزت زندگی کا نام ہے۔ یہ دعویٰ بھی صحیح ہے؟

ک ہاں صحیح ہے۔

ان مقدمات کی بنا پر میں اس لیۓ پر بحث کروں گا کہ مجھے بغیر اہل ایتھنس کی اجازت کے قید خانہ سے نکل بھاگنا چاہیۓ یا نہیں۔ اگر میرے لیۓ بھاگنا صریحًا جائز ہے تو میں اس کی کوشش کروں گا ورنہ نہیں اور چیزیں جن کا تم ذکر کرتے ہو یعنی روپے کا سوال، بے عزتی کا ڈر اور بچوں کی تعلیم کا خیال میرے خیال میں محض عوام کے نظریات ہیں۔ وہ تو، اگر ان کے امکان میں ہو، لوگوں کو زندہ کرنے پر اسی طرح مستعد ہو جائیں جس طرح قتل کرنے پر مستعد رہتے ہیں —— بغیر کسی معقول وجہ کے۔ اب چونکہ یہاں تک ہمارا سارا استدلال تسلیم کیا جا چکا ہے اسکے بعد صرف ایک ہی سوال باقی رہ جاتا ہے آیا ہمارے لیۓ جائز ہے کہ ہم بھاگیں یا دوسروں سے اپنے بھاگنے میں مدد لیں؟ اور انھیں روپے کی یا شکریے کی شکل میں اس کا معاوضہ دیں یا در اصل یہ ناجائز ہے۔

اگر دوسری صورت ہے تو موت یا کسی اور مصیبت کو جو میرے نہ بھاگنے سے واقع ہو گی بحث میں لانا ہی نہ چاہیۓ۔

میرے خیال میں تم ٹھیک کہتے ہو سقراط، تو پھر ہم کس طرح آگے بڑھیں۔

آؤ ہم دونوں مل کر اس پر غور کریں۔ ممکن ہو تو تم میرے دعوے کو غلط ثابت کرو، میں قائل ہو جاؤں گا۔ ورنہ میرے پیارے دوست، اب مجھ سے یہ نہ کہنا کہ مجھے اہل ایتھنس کی مرضی کے خلاف بھاگ جانا چاہیۓ، تم جو مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہو اس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں لیکن اتنی بہتر رائے کے مقابلے میں تمہاری بات نہیں مان سکتا تو اب مہربانی کر کے میرے پہلے دعوے پر غور کرو اور جس طرح مناسب سمجھو جواب دو، اچھی بات ہے۔

کیا ہم یہ کہیں کہ ہمیں کبھی جان بوجھ کر بے انصافی نہیں کرنا چاہیۓ یا یہ کہ ایک طرح سے بے انصافی کرنا جائز ہے اور دوسری طرح سے ناجائز ہے یا بے انصافی کرنا ہر حالت میں برا اور باعث ذلت ہے جیسا میں نے ابھی کہا تھا اور تم نے مان لیا تھا؟ کیا ان

سب باتوں کو جو ہم پہلے چند روز میں تسلیم کر چکے ہیں رد کر دیں؟ کیا اس عمر میں زندگی بھر سنجیدگی سے گفتگو کرنے کے بعد ہم پر یہ انکشاف ہوا ہے کہ ہم میں اور بچوں میں کوئی فرق نہیں؟ یا عام لوگوں کی رائے کے باوجود چاہے نتیجہ اچھا ہو یا برا ہم اس پر زور دیں کہ جو ہم نے اس وقت کہا تھا وہ سچ تھا یعنی ظلم یا بے انصافی کا کام کرنے والے کے لئے برا اور باعث ذلت ہے؟ ہم یہ کہیں یا نہ کہیں؟

ک ضرور کہیں؟

س تو ہمیں کبھی بے انصافی نہیں کرنی چاہیئے۔

ک کبھی نہیں۔

س اور جب ہمیں کوئی نقصان پہنچائے تو اس کے بدلے اسے نقصان نہ پہنچائیں۔ جیسا کہ عوام کا خیال ہے۔ اس لئے کہ نقصان تو کسی کو پہنچانا ہی نہ چاہیئے؟

ک ظاہر ہے۔

س اور کریٹو، کیا ہم کسی کے ساتھ برائی بھی نہ کریں؟

ک ہرگز نہیں۔

س اور برائی کے بدلے برائی کرنا جو عوام کا اخلاقی اصول ہے ——— یہ انصاف ہے یا بے انصافی؟

ک بے انصافی۔

س اس لئے کہ کسی کے ساتھ برائی کرنا اور اسے نقصان پہنچانا ایک ہی بات ہے؟

ک بالکل ٹھیک ہے۔

س تو پھر ہمیں انتقام نہیں لینا چاہیئے یعنی کسی کے ساتھ برائی کے بدلے برائی نہیں کرنی چاہیئے خواہ اس نے ہمارے ساتھ کتنی ہی بدسلوکی کی ہو۔ مگر ذرا سوچ لو، کریٹو، کیا تمہارا واقعی یہی خیال ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ اس لئے کہ یہ رائے زیادہ آدمیوں کی نہ کبھی تھی اور نہ

ہوگی اور اس کے مخالفوں اور موافقوں میں کوئی بناتے اشتراک نہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان میں کس قدر شدید اختلاف ہے تو لامحالہ ایک دوسرے کو حقیر سمجھتے ہیں۔ تو اب بتاؤ کیا تم میرے پہلے اصول سے متفق ہو اور اسے تسلیم کرتے ہو کہ نقصان پہنچانا، یا انتقام لینا یا برائی کو برائی سے روکنا کسی صورت میں جائز نہیں؟ کیا ہم اسے اپنے استدلال کا مقدمہ قرار دیں؟ یا تمہیں اس سے اختلاف ہے؟ میں تو ہمیشہ یہی سمجھتا رہا اور اب بھی سمجھتا ہوں لیکن اگر تمہاری کچھ اور رائے ہوگئی ہو تو مجھے بتاؤ۔ اور جو تم اس سے پہلے خیال پر قائم ہو تو میں ایک قدم آگے بڑھوں۔

تم شوق سے آگے بڑھو اس کے لیے میں نے اپنی رائے نہیں بدلی ہے۔

تو پھر میں ان کی بات کو لیتا ہوں جو ایک سوال کی شکل میں ظاہر کی جا سکتی ہے ــ کیا انسان کو وہی کرنا چاہیے، جسے وہ حق مانتا ہے یا حق کو چھوڑ دینا چاہیے؟

اسے وہی کرنا چاہیے، جسے وہ حق سمجھتا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے تو اس کا عملی نتیجہ کیا ہے؟ میں اہل ایتھنس کی رائے کے خلاف قید خانے سے چلا جاؤں تو کسی کے ساتھ بے انصافی ہوگی یا نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان لوگوں کے ساتھ بے انصافی ہوگی یا نہیں جن کے ساتھ مجھے خاص طور پر اچھا سلوک کرنا چاہیے کیا یہ ان اصولوں سے غداری نہیں ہے جنھیں ہم قرین انصاف تسلیم کر چکے ہیں

بتاؤ کیا کہتے ہو؟

میں کچھ نہیں کہہ سکتا، سقراط، اس لیے کہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

تو پھر مسئلے پر اس پہلو سے غور کرو: ۔ فرض کرو کہ میں فرار ہونے پر تیار ہوں (تمہیں اختیار ہے اس عمل کو جو چاہو کہو) اور قوانین اور حکومت اگر مجھ سے باز پرس کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں۔ "بتاؤ سقراط یہ تم کیا غضب کرتے ہو؟ کیا تم اپنے ایک فعل سے ہم سب کو تباہ نہیں کر رہے ہو۔ کل قوانین کو اور ساری ریاست کو۔ جہاں تک تمہارے اختیار

میں ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ ریاست قائم رہے گی اور برباد نہ ہو جائے گی جس میں قانون کے فیصلے کوئی قوت نہیں رکھتے اور افراد انھیں پیروں تلے روند ڈالتے ہیں؟" ہم کیا جواب دیں گے، کریٹو، اس بات کا یا اسی قسم کی اور باتوں کا؟ ہر شخص، خصوصاً وہ جو فن خطابت میں ماہر ہو، تعزیری قانون کی حمایت میں بہت کچھ کہہ ڈالے گا۔ وہ ہدایت کرے گا کہ اس قانون کی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہیے۔ کیا ہم یہ جواب دیں" یہ تو ٹھیک ہے لیکن ریاست نے ہمارے ساتھ بدسلوکی کی ہے اور خلاف انصاف سزا دی ہے؟"

ک — بہت مناسب ہے سقراط۔

س — اس پر قانون پوچھے گا "کیا ہمارا تمہارا یہی معاہدہ تھا یا تم اس کے پابند تھے کہ ریاست جو سزا دے گی اسے برداشت کرو گے؟ اور اگر میں نے الفاظ کو سن کر حسرت کا اظہار کیا تو غالباً قانون یہ کہے گا "سقراط، آنکھیں پھیلا کر نہ رہ جاؤ، بلکہ جواب دو۔ تمہیں تو سوال کرنے اور جواب دینے کی عادت ہے بتاؤ تم کو ہم سے کون سی شکایت ہے جس کی وجہ سے تمہیں یہ حق حاصل ہو گیا کہ ہمیں اور ریاست کو تباہ کرنے کی کوشش کرو؟ کیا ہم تمہارے وجود میں آنے کا باعث نہیں ہوئے؟ تمہارے باپ نے ہماری مدد سے تمہاری ماں سے شادی کی اور اس طرح تم پیدا ہوئے کیا تمہیں ہم میں سے ان قوانین پر اعتراض ہے جو شادی سے متعلق ہیں؟ مجھے جواب دینا پڑے گا کہ نہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" یا ان قوانین پر جو بچوں کے پیدا ہونے کے بعد ان کی تعلیم و تربیت سے متعلق ہیں اور جو تم نے بھی حاصل کی ہے؟ کیا تعلیم کے قوانین نے تمہارے والد کو جو حکم دیا کہ تمہیں علوم موسیقی اور ورزش سکھائے جائیں وہ بے جا تھا"؟ میں جواب دوں گا بالکل بجا تھا۔" تو پھر جب ہم تمہیں وجود میں لائے اور ہم ہی نے تمہاری پرورش کی، تمہیں تعلیم و تربیت دی تو کیا تم اس بات سے انکار کر سکتے ہو کہ تم ہمارے بچے اور ہمارے غلام ہو جیسے کہ تم سے

پہلے تمہارے آباؤاجداد تھے؟ اور اگر یہ سچ ہے تو تم ہمارے برابر کے نہیں ہو اور تمہیں یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ تمہیں ہمارے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرنے کا حق ہے جیسا ہم تمہارے ساتھ کر رہے ہیں۔ اگر تمہارا استاد یا باپ ہی ہوتا اور وہ تمہیں مارتا یا برا بھلا کہتا یا تمہارے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی کرتا تو کیا تمہیں یہ حق تھا کہ تم بھی اسے مارو یا برا بھلا کہو یا اس کے ساتھ اور کسی قسم کی بدسلوکی کرو؟ ظاہر ہے کہ تم یہ کبھی نہیں کہو گے۔ کیا اس وجہ سے کہ ہم تمہیں ہلاک کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ تمہیں اپنے خیال میں یہ حق حاصل ہے کہ تم اس کے بدلے ہمیں اور اپنے ملک کو برباد کردو جہاں تک تمہارے امکان میں ہے؟ اے حقیقی نیکی کا دعویٰ کرنے والے کیا تم بناوٹ سے یہ کہو گے کہ تمہارا یہ فعل جائز ہے؟ کیا تم جیسے فلسفی کو یہ معلوم نہیں کہ ہمارا ملک ماں باپ اور سب بزرگوں سے زیادہ قابل قدر ہے اُن سے زیادہ مقدس اور محترم اور دیوتاؤں اور ذی فہم انسانوں کی نظر میں زیادہ عزیز ہے اور ہمیں چاہیئے کہ جب وہ خفا ہو تو اس کے غصے کو ٹھنڈا کریں، اس کی منتیں کریں اس سے بھی زیادہ نرمی اور ادب سے جتنی اپنے باپ کی کرتے ہیں، اسے سمجھا بجھا کر قائل کریں یا اگر وہ قائل نہ ہو تو اس کے حکم کی تعمیل کریں، جب وہ ہمیں قید کی یا تازیانے کی سزا دے تو اسے چپ چاپ برداشت کرلیں، اگر وہ ہمیں میدان جنگ میں زخم کھا کر یا جان دینے کے لئے بھیجے تو ہم وہاں چلے جائیں جیسا کہ ہمارا فرض ہے کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ دشمن کے آگے سر جھکا دے یا پیچھے ہٹ جائے یا اپنی صف کو چھوڑ دے بلکہ خواہ میدان جنگ ہو خواہ عدالت یا کوئی اور جگہ اس پر لازم ہے کہ وہی کرے جو اس کے ملک یا شہر کا حکم ہے، ورنہ پھر نیکی کے بارے میں ان کا جو نظریہ ہے اسے بدل دے اگر اسے اپنے باپ یا ماں کے ساتھ زیادتی نہیں کرنی چاہیئے تو اپنے ملک کے ساتھ تو اور بھی نہیں کرنی چاہیئے۔" ہم اس کا کیا جواب دیں کریٹو قوانین کا قول سچ ہے یا نہیں میرے خیال میں

سچ ہے۔

ک میرے خیال میں سچ ہے۔

س قوانین یہ کہیں گے "ذرا سوچو تو سقراط' کیا ہمارا کہنا ٹھیک نہیں کہ جو کوشش تم کر رہے ہو، اس سے ہمیں نقصان پہنچے گا۔ اس لئے کہ جب ہم تمہیں دنیا میں لاکر تعلیم و تربیت دے چکے اور تم کو اور دوسرے شہریوں کو ہر اچھی چیز جو ہمارے اختیار میں تھی تقسیم کر چکے اس کے بعد اسی آزادی کی صورت میں جو ہم نے ہر باشندۂ اتھینس کو دے رکھی ہے یہ اعلان بھی کر دیا کہ اگر سن بلوغ کو پہنچنے شہر کے طور طریق کو دیکھنے اور ہم سے واقف ہونے کے بعد وہ ہمیں پسند نہ کرے تو اسے اختیار ہے کہ جہاں جی چاہے چلا جائے اور اپنی املاک ساتھ لے جائے۔ ہم میں سے کوئی قانون نہ اسے منع کرے گا اور نہ اس کی راہ میں حائل ہوگا' ہر وہ شخص جو ہمیں اور ہمارے شہر کو پسند نہیں کرتا اور کسی اور شہر یا نو آبادی میں جا کر رہنا چاہتا ہے اسے اس کی اجازت ہے اور وہ اپنی املاک پر بدستور قابض رہے گا۔ لیکن جس شخص کو اس کا تجربہ ہے کہ ہم کس طرح عدالت اور ملک کا انتظام کرتے ہیں اور پھر بھی وہ ہماری ریاست میں رہتا ہے اس سے گویا ہم نے بالکنایہ یہ معاہدہ کر لیا ہے کہ جو کچھ ہم کہیں گے وہ کرے گا اور جو ہماری نافرمانی کرے وہ تہرے جرم کا مرتکب ہوتا ہے ایک تو اس وجہ سے کہ ہماری نافرمانی گویا والدین کی نافرمانی ہے' دوسرے اس لئے کہ ہم اس کے مربی ہیں' تیسرے اس لئے کہ اس نے ہم سے معاہدہ کیا ہے کہ ہمارے احکام کی تعمیل کرے گا نہ تو وہ ہمارے احکام کی تعمیل کرتا ہے اور نہ ہمیں قائل کرتا ہے کہ یہ احکام خلاف انصاف ہیں۔ ہم اس پر زبردستی نہیں کرتے بلکہ یہ اختیار دیتے ہیں کہ یا تو ہمارا حکم مانے ورنہ ہمیں قائل کر دے ——— ہماری طرف سے یہ موقع دیا جاتا ہے مگر وہ دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں کرتا۔

اس طرح کے الزام تم پر لگائے جائیں گے سقراط، جیسا کہ ہم نے کہا ہے اگر تم اپنے ارادے کو عمل میں لائے۔ تم ایتھنس کے دوسرے باشندوں کے مقابلے میں اور بھی زیادہ مورد الزام قرار پاؤ گے "۔ اب فرض کرو میں ان سے پوچھوں کہ آخر میں اوروں سے زیادہ مورد الزام کیوں ٹھہروں گا تو وہ فوراً جواب دیں گے کہ تم نے اوروں سے زیادہ اس معاہدہ کو تسلیم کیا ہے۔ وہ کہیں گے" اس بات کا صریحی ثبوت موجود ہے، سقراط، کہ تم ہم کو اور شہر کو پسند نہیں کرتے ایتھنس کے باشندوں میں تم سب سے زیادہ شہر میں رہے ہو اور چونکہ تم یہاں سے کبھی باہر نہیں جاتے اس لئے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ تمہیں اس سے محبت ہے۔ نہ تم ایک بار کے سوا کبھی کھیل دیکھنے استھمس گئے اور نہ کہیں اور بجز ان موقعوں کے جب قومی خدمت انجام دے رہے تھے۔ تم دوسرے لوگوں کی طرح سفر نہیں کرتے۔ تمہیں دوسری ریاستوں اور ان کے قوانین کو دیکھنے کا شوق نہیں۔ تمہاری محبت کا دائرہ تو بس ہم تک اور ہماری ریاست تک محدود ہے۔ تم ہمیں خاص طور پر عزیز رکھتے تھے ہماری حکومت سے راضی تھے۔ اسی شہر میں تم نے بچے پیدا کئے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ تم اس سے مطمئن تھے۔ اس کے علاوہ مقدمے کے دوران میں تم چاہتے تو اپنے لئے جلا وطنی کی سزا تجویز کر دیتے۔ ریاست اب تمہیں جانے کی اجازت نہیں دیتی مگر اس وقت دے دیتی۔ مگر تم نے یہ ظاہر کیا کہ تم موت کو جلا وطنی پر ترجیح دیتے ہو اور مرنے کے لئے تیار ہو۔ اب تم ان سب اعلیٰ جذبات کو بھول گئے ہمارے قوانین کا ادب کرنے کے بجائے ہمیں ستانے کے درپے ہو، اور وہ حرکت کر رہے ہو جو صرف ایک ادنیٰ غلام ہی کر سکتا ہے یعنی بھاگ کر جا رہے ہو اور ان سب معاہدوں سے پھرے جاتے ہو جو تم نے شہری کی حیثیت سے کئے تھے سب سے پہلے تو اسی سوال کا جواب دو:۔ کیا ہمارا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ تم نے نہ صرف قول سے بلکہ فعل سے ہمارے زیر حکومت رہنے کا معاہدہ کیا تھا؟ بتاؤ یہ

بات سچ ہے یا نہیں ؟" ہم اس کا کیا جواب دیں کریٹو ؟ کیا ہم اس پر مجبور نہیں کہ اس کی تصدیق کریں ؟

ک   اس کے سوا کوئی چارہ نہیں سقراط۔

س   تو پھر کیا وہ یہ نہیں کہیں گے "سقراط تم ان معاہدوں کو توڑ رہے ہو جو تم نے فرصت سے سمجھ بوجھ کر کئے تھے، عجلت یا جبر یا فریب کی حالت میں نہیں بلکہ ستر سال تک غور کرنے کے بعد۔ اس اثنا میں تمہیں یہ آزادی تھی کہ اگر تم ہمیں پسند نہیں کرتے یا ہمارے معاہدوں کو خلاف انصاف سمجھتے ہو تو شہر کو چھوڑ کر چلے جاؤ۔ تمہیں انتخاب کا موقع حاصل ہے خواہ لیکڈیمون چلے جاتے یا کریٹ جن دونوں ریاستوں کے نظم حکومت کی تم نے اکثر تعریف کی ہے یا کسی اور یونانی یا غیر ملکی ریاست میں۔ مگر تم اور سب اہل ایتھنس سے زیادہ ریاست سے، یا دوسرے الفاظ میں ان کے قوانین سے (اس لئے کہ بغیر قوانین کے ریاست کو کون پوچھتا ہے) اتنے خوش معلوم ہوتے تھے کہ تم نے اس کی حد سے باہر قدم نہیں رکھا۔ لولے لنگڑے اور اندھے بھی اس طرح جسم کو ایک جگہ نہ رہتے ہوں گے جیسے تم رہے اور اب تم بھاگنے پر آمادہ ہو اور اپنے معاہدے سے پھرے جاتے ہو۔ ہماری بات مانو تو یہ ہرگز نہ کرو سقراط کیوں شہر سے فرار ہو کر اپنے کو منہواتے ہو ؟

ذرا سوچو تو کہ اگر تم اس طرح کی غلطی کرو گے تو تمہارا یا تمہارے دوستوں کا اس سے کیا فائدہ ہوگا ؟ یہ بات کہ تمہارے دوست جلا وطن کر دئے جائیں گے اور حق شہریت سے محروم ہو جائیں گے یا اپنی املاک کھو بیٹھیں گے قریب قریب یقینی ہے اور خود تم سقراط، کسی ہمسایہ ریاست مثلاً تھیبس۔ یا میگارا میں چلے جاؤ جن دونوں کا نظم حکومت بہت اچھا ہے۔ دشمن کی حیثیت سے وہاں پہنچو گے ان کی حکومت تمہارے خلاف ہوگی اور سب وطن دوست شہری تمہیں قانون کی جڑ کھودنے

والا سمجھ کر بری نظر سے دیکھیں گے اور ججوں کے دل میں اس خیال کی تصدیق ہو جائے گی کہ ان کا تمہیں سزا دینا بالکل بجا ہے۔ اس لئے کہ جو شخص قوانین کا بگاڑنے والا ہے اغلب ہے کہ وہ انسانوں کے نوجوان اور ناسمجھ طبقے کا بگاڑنے والا بھی ہوگا تو پھر کیا تم خوش آئین شہروں سے اور خوش خصلت انسانوں سے دور رہو گے؟ کیا ان شرائط پر زندگی قابل قبول ہو گی؟ یا تم ان کے پاس جا کر بے باکی سے گفتگو کرو گے مگر تم ان سے کہو گے کیا؟ وہی جو تم یہاں کہا کرتے ہو کہ نیکی اور عدل اور رسوم و قوانین انسانوں میں بہترین چیزیں ہیں؟ کیا یہ بات مناسب ہو گی؟ ہرگز نہیں لیکن اگر تم خوش آئین ریاستوں کو چھوڑ کر کریٹو کے دوستوں کے پاس تھسلی چلے گئے جہاں بدنظمی اور بے اصولی کا دور دورہ ہے تو وہ لوگ تمہارے قید خانے سے فرار ہونے کا قصہ سن کر بہت محظوظ ہوں گے اور اس میں زیب داستان کے لئے بہت سی مضحک باتوں کا اضافہ کر دیں گے کہ تم نے کس طرح بکری کی کھال اوڑھ رکھی تھی یا کوئی اور بہروپ اختیار کر رکھا تھا جیسا کہ مفرور شکل بدلنے کے لئے کیا کرتے ہیں۔ لیکن کیا کوئی شخص یہ پوچھنے والا نہ ہوگا کہ تھوڑے دن اور زندہ رہنے کی حقیر خواہش کی بنا پر تمہیں اس بڑھاپے میں مقدس ترین قوانین کو توڑتے ہوئے شرم نہیں آئی؟ شاید کوئی نہ پوچھے اگر تم نے ان سب کو خوش رکھا لیکن اگر کبھی وہ خفا ہو گئے تو تمہیں بہت سی ذلت آمیز باتیں سننی پڑیں گی۔ تم زندہ تو رہو گے مگر کس حالت میں؟ —— سب لوگوں کے خوشامدی اور خدمت گار بن کر اور تمہارا شغل کیا ہوگا؟ —— تھسلی میں رہنا اور کھانا پینا گویا تم نے محض پیٹ بھرنے کی خاطر پردیس کا سفر اختیار کیا اور یہ تمہارے عدل وخیر کے اعلیٰ خیالات کہاں چلے جائیں گے؟ اگر تم یہ کہو کہ میں اپنے بچوں کی خاطر زندہ رہنا چاہتا ہوں —— ان کی تعلیم و تربیت کرنا چاہتا ہوں —— تو کیا تم انھیں اپنے ساتھ تھسلی لے جاؤ گے اور ایتھنس کی شہرت سے محروم

کر دو گے؟ یہی وہ احسان ہے جو تم ان پر کرو گے؟ یا تم اس خیال میں ہو کہ اگر تم زندہ رہتے خواہ ان سے دور ہی کیوں نہ ہو، تو ان کی تعلیم و تربیت بہتر ہو گی اس لئے کہ تمہارے دوست ان کی خبر گیری کریں گے؟ تم سمجھتے ہو کہ اگر تم تھسلی کے باشندے ہو گے وہ تمہارے بچوں کی خبر لیں گے اور اگر دوسری دنیا کے باشندے ہو گے تو وہ ان کی خبر نہیں لیں گے؟ حالانکہ اگر وہ لوگ جو اپنے آپ کو تمہارا دوست کہتے ہیں کسی کام کے ہیں تو وہ ان کی مدد کریں گے ——— یقیناً کریں گے۔

"لہٰذا سقراط، ہم جنھوں نے تمہاری پرورش کی ہے جو کچھ کہتے ہیں کان دھر کر سنو، ۔ زندگی اور بچوں کو مقدم اور عدل کو موخر نہ سمجھو بلکہ عدل کو سب سے مقدم سمجھو تاکہ عالم زیریں کے حاکموں کی نظر میں تمہارا عمل صحیح ٹھہرے۔ اس لئے اگر تم نے کریٹو کی بات مان لی تو نہ تم کو اور تمہارے متعلقین کو اس دنیا میں زیادہ خوشی اور پاکی اور نیکی میسر ہو گی اور نہ دوسری دنیا میں زیادہ سعادت حاصل ہو گی۔ اب تم بے گناہ دنیا سے جا رہے ہو مظلوم کی حیثیت سے نہ کہ ظالم کی۔ تمہیں انسانوں نے سزا دی ہے نہ کہ قوانین نے۔ لیکن اگر تم بدی کے عوض بدی کرو اور نقصان کے بدلے نقصان پہنچاؤ ان معاہدوں کو جو ہم سے کئے ہیں توڑ دو اور ان لوگوں کے ساتھ برا سلوک کرو جن سے تمہیں خاص طور پر اچھا سلوک کرنا چاہیئے یعنی اپنے، اپنے دوستوں کے، اپنے ملک کے اور ہمارے ساتھ، تو جب تک تم زندہ ہو ہم تم سے بیزار رہیں گے اور ہمارے بھائی یعنی عالم زیریں کے قوانین تمہیں دشمن سمجھیں گے اس لئے کہ انھیں معلوم ہو جائے گا کہ تم نے ہمیں برباد کرنے کی پوری کوشش کی ہے اس لئے تم ہماری بات مانو اور کریٹو کی نہ مانو۔"

یہ ہے پیارے کریٹو وہ آواز جو میرے کانوں میں آ رہی ہے جس طرح نے کی آواز صوفی کے کانوں میں آتی ہے۔ سچ پوچھو تو یہ صدا میرے کان میں اس طرح گونج رہی ہے کہ میں اور کوئی صدا سن ہی نہیں سکتا اور میں جانتا ہوں کہ اگر تم اور کچھ کہو گے تو بالکل بے کار

ہوگا۔ پھر بھی اگر کچھ کہنا ہو تو کہو۔

ک　مجھے کچھ نہیں کہنا ہے، سقراط۔

س　تو پھر مجھے چھوڑ دو کریٹو کہ میں خدا کی مشیت کو پورا کروں اور جدھر وہ لے جائے چلا جاؤں۔

"کاروباری" تعلیم کے خطرات

(سید وقار عظیم صاحب ایم اے۔ بی ٹی)

مضمون شروع کرنے سے پہلے ہی مجھے اس بات کا احساس ہے کہ مضمون میں کاروباری تعلیم کے جن خطرات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں ان سے کہیں زیادہ خطرناک میرے مضمون کی سرخی ہے اس لئے کہ پڑھنے والے مضمون کو پڑھنا شروع کرنے سے پہلے ہی یہ طے کر چکے ہوں گے کہ میں کاروباری تعلیم کے خلاف ہوں اور اس جگہ ایک ایک اس کی خرابیاں بیان کروں گا۔ اس لئے ناظرین سے سب سے پہلے تو یہ استدعا ہے کہ اس خیال کو ذہن سے نکال دیں۔ اس لئے کہ میرے خیال میں تعلیم کی نفسیاتی، اخلاقی، معاشرتی، تمدنی اور اقتصادی اور ہر اس قسم کی ضرورت کا حل اگر ہمارے پاس ہے تو صرف اسی قسم کی تعلیم ہے جس میں بچے مدرسوں سے اپنی نمایاں خصوصیات و ضروریات کے مطابق، زندگی کے مختلف کاموں میں شریک ہونے کے لئے تیار ہو کر نکلیں۔

کاروباری تعلیم صرف اس لئے سب سے اچھی نہیں کہ وہ بچوں کی ہر نفسیاتی اور فطری ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ ان کے جذبۂ عمل اور ذوقِ تعمیر کی تکمیل کرتی ہے۔ انھیں ایک آزاد فضا میں رہ کر اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق پلنے اور بڑھنے کا موقع دیتی ہے۔ ان میں شرکت عمل، ہمدردی، رواداری اور محبت کے جذبات کا صحیح احساس پیدا کرتی ہے۔ انھیں زندگی کے صحیح مفہوم سے آگاہ کرتی ہے۔ ان کی سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کی قوتوں کو بیدار کر کے، ان پر جلا کرتی ہے۔ بلکہ اس حیثیت سے سب سے اچھی ہے کہ وہ انسان کو فطرت کے صحیح راستے پر چلاتی ہے۔ اس کے تجربات میں عملی اضافہ کرتی ہے۔ اور انھیں اس کی زندگی کا جزو بناتی ہے۔ اپنے ذوق کے مطابق کاروباری تعلیم حاصل کرنے کے بعد، جو نوجوان زندگی کی راہوں میں قدم رکھیں گے اور اپنے مخصوص کاموں میں حصہ لیں گے، انھیں ایک تو اس لئے خوشی ہوگی کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس سے انھیں حقیقی دلچسپی اور فطری لگاؤ ہے۔ اور دوسرے اس لئے کہ انھیں زندگی میں اپنے مرتبے کا صحیح اندازہ ہوگا۔ وہ یہ سوچیں گے کہ نظامِ حیات کو مکمل

بنانے میں ان کا بھی تھوڑا بہت حصہ ہے۔ اور زندگی کا پہیہ اس وقت تک روانی کے ساتھ حرکت نہیں کرسکتا، جب تک اس میں ان کا بھی ہاتھ نہ لگے "خود آگاہی" اور "خود اعتمادی" کا یہ جذبہ اس کی انفرادیت کی تکمیل ہے۔ اور ہر سوسائٹی کے ہر فرد کی تکمیل کا لازمی نتیجہ ہے خود سوسائٹی اور اس کے نظام کی ترقی، تکمیل اور معراج۔

موجودہ زمانہ میں زندگی کی دوڑ بے حد دشوار ہے۔ اس کے ہر قدم پر ایک کانٹا، اور ہر منزل پر ایک نئی رکاوٹ ہے۔ اس لئے کوئی سوسائٹی اس وقت تک تیز رو قوموں کا ساتھ نہیں دے سکتی جب تک اس کے افراد میں خود اعتمادی کے ساتھ اس تگ ودو میں شریک ہونے کی صلاحیت نہ ہو۔ زندگی کے ہر شعبہ میں جو کچھ ہو رہا ہو تصور کے نزدیک اس سے بہتر ممکن نہ ہو۔ جب تک ہر شعبہ میں تکمیل نہیں، مکمل سوسائٹی کی تکمیل بھی غیر ممکن ہے لیکن ایک ایسی سوسائٹی میں جہاں ہر شخص صرف وہی کام کرتا ہے جس کے لئے وہ فطرتاً موزوں ہے، تو ہر شعبہ اتنی ہی ترقی کرتا ہے، جتنی تصور کے نزدیک ممکن ہے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے سوسائٹی کی ترقی اور بہبودی، زندگی کی دشوار دوڑ میں شرکت اور کامیابی کا امکان۔ اس لحاظ سے بھی "کاروباری" تعلیم کا تصور بہترین ہے۔

انفرادی اور مجموعی حیثیت سے، یا یوں کہئے کہ افراد کی ترقی اور قوم کی ترقی دونوں کے لحاظ سے "کاروباری" تعلیم تعلیم کے دوسرے طریقوں کے مقابلہ میں کہیں اچھی ہے۔ لیکن حقیقت میں تعلیم کو "کاروباری" نقطۂ نظر سے دیکھتے وقت تعلیمی رہنماؤں کے سامنے نہ تو شخصی تکمیل کا تصور ہوتا ہے اور نہ قومی۔ نہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ یہ تعلیم فطرت کے اصول کے مطابق ہے، نہ انھیں یہ خیال ہوتا ہے کہ اس میں نفسیات کے نکات پوشیدہ ہیں۔ ان کا مقصد تو صرف یہ ہوتا ہے کہ قوم کے افراد اس قابل ہو سکیں کہ وہ خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں اور ان لوگوں کو سہارا دے سکیں جو سوسائٹی کے موجودہ نظام میں ان کے ساتھ وابستہ ہیں، جن کے رشتے ان کے دم کے ساتھ ہیں۔ تعلیم کا عموماً یہی مقصد رہا ہے کہ قوم کا ہر شخص اسے حاصل کرنے کے بعد اپنی روزی کما سکے اور آرام سے زندگی بسر کر سکے۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ مقصد بہت اچھا ہے۔ اور ہم اپنے گرد وپیش "زندگی کے دن پورے کرنے والوں" کے ان گنتی ڈھانچوں کو دیکھ کر اس مقصد کے افادی پہلو کو اور بھی زیادہ قابل قدر سمجھنے لگے ہیں۔ اور بغیر سوچے سمجھے اس صاحب درد کے ہم آواز بن کر جو زندگی کے غمناک پہلوؤں اور افسردگیوں کو تعلیم کی خرابیوں کا نتیجہ سمجھتا ہے، پورے جوش کے ساتھ اس کے علم انقلاب کے نیچے آجاتے ہیں۔ لیکن کسی انقلابی تحریک کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس کے ہر پہلو پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

مانا کہ ہماری زندگی کی تمام تر خرابیوں کی ذمہ داری ہمارے موجودہ طریقۂ تعلیم پر ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے موجودہ طریقۂ تعلیم کا ڈھانچہ بھی شروع سے آخر تک "کاروباری" تصورات پر بنایا گیا ہے۔ ہمارے مدرسوں سے نکلنے والے بچے تعلیم کے ان بلند مقاصد سے بالکل محروم ہیں، جو قدیم زمانے میں تعلیم کے ساتھ وابستہ تھے۔ ان کی "انفرادی" صلاحتیں مردہ، ان کی شخصی قوتوں کا سرچشمہ خشک اور قوت فکر وعمل پابہ زنجیر۔ تعلیم ان میں فطری صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع دیتی ہے، نہ انھیں زمانہ کی ترقیوں کا ہمسفر ہونے کے قابل بناتی ہے، اور نہ ان میں قومی اور ملکی روایات کی جھلک باقی رکھتی ہے۔ یہ اس لئے کہ "تعلیم" یا "علم" میں بذات خود کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ خرابی کی صرف مقصد کی ہمارے موجودہ مدرسوں کی تعلیم کا مقصد صرف "کاروباری" ہے اور بے حد محدود حد تک "کاروباری" ہے۔ اسے زندگی کی حقیقتوں سے دور کا بھی لگاؤ نہیں، اور اسی لئے وہ بچے کی فطرت کے خلاف ہے۔ اسی لئے دنیا "بیکاروں" اور "ناموزوں" انسانوں سے بھرتی چلی جارہی ہے۔ ہمارے مدرسوں سے نکلنے والے بچے صرف اس قابل بنائے جاتے ہیں کہ دفتروں کے بابو بن سکیں۔ "دفتر کا بابو" کوئی حقیر چیز نہیں لیکن سوچنے کی بات ہے کہ دفتر کے بابوؤں کی تعداد بھی تھوڑی ہی سی ہے۔ اور خدا نے ہر شخص میں "دفتر کا بابو" ہونے کی صلاحتیں تو نہیں پیدا کیں۔

اس لئے اس کی کمی کو پورا کرنے کے لئے ہمیں اپنے نظام تعلیم کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ بیکاروں کی تعداد کم ہو اور کم ہوتے ہوتے بالکل باقی نہ رہے۔ ہمارا مقصد ہے کہ

دنیا میں ایسے آدمی نہ دکھائی دیں جو اپنے ماحول کے لئے "ناموزوں" ہیں یا جو اپنے آپ کو دنیا سے بالکل بیگانہ اور بے واسطہ سمجھتے ہیں۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ہر شخص وہ کام کرے جس کے لئے وہ موزوں ہے۔ ہر شخص دفتر کا بابو نہ بنے۔ بلکہ اپنی فطری دلچسپی کے مطابق زندگی کے دوسرے مشاغل میں حصہ لے۔ اور دوسروں کا ہاتھ بٹا کر، زندگی کے نظام کو مکمل بنانے میں مدد دے۔ یہ ہے سب سے اہم مقصد جس کی بنا پر ہم اپنے مدرسوں کو "کاروباری" بنانا چاہتے ہیں۔ یہ خوش قسمتی ہے کہ نفسیات، اور فطرت کے اصول مختلف حیثیتوں سے ہمارے ساتھ ہیں۔

ہر حساس دل چاہتا ہے کہ جلد وہ دن آئے جب ملک بھر میں اس طرح کے مدرسے زیادہ سے زیادہ تعداد میں کھل جائیں۔ اور ملک کا ہر بچہ ان میں جا کر آزادی کی فضا میں پروان چڑھے۔ کھیل کھیل کر زندگی کی ضرورتوں میں حصہ لینے کے قابل ہو۔ اپنی فطری صلاحیتوں کو ترقی دے اور جوان ہو کر زندگی کے سفر میں گامزن ہو۔ بے شک بڑا مبارک وقت ہوگا جب ہمارے ملک کی فضا اس طرح بارونق نظر آئے گی ـــــــ لیکن زیادہ حساس دل یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس مبارک وقت کا پیش خیمہ کچھ بدشگونیاں بھی ہوں گی۔ تصور کو ان پھولوں میں کانٹے چھپے ہوئے نظر آ رہے ہیں اور ہمیں انھیں کانٹوں سے بچنے کی ضرورت ہے۔ انھیں خطروں کی روک ضروری ہے۔

سب سے پہلا خطرہ تو یہی ہے جس کا ہم آج شکار ہیں۔ اس بات کی کوشش کی گئی کہ بچے انگریزی پڑھیں اور نوکریاں حاصل کرنے کے قابل ہوں۔ بچوں نے انگریزی پڑھی انھیں نوکری ملی قوم کو ایک سیدھا راستہ مل گیا۔ ایک بھیڑ ادھر گئی تھی اس لئے سب ادھر گئیں۔ اور یہ مرض ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا ہوا ہم تک آیا۔ "جب سب نے انگریزی پڑھ لی" تو ہر ایک کو نوکری ملنی بند ہو گئی۔ بظاہر یہی انجام مہلک ہے لیکن اس سے زیادہ یہ ہوا کہ جب مشرق کے دماغوں میں مغرب کے اصول ٹھونسے گئے، مشرق کی تاریخ کے بجائے مغرب کی تاریخ پڑھائی گئی۔ کالیداس، انیس اور غالب سے زیادہ شیکسپیر کی پرستش ہونے لگی۔ ہندوستان کے قدیم فلسفے کی جگہ برگساں، ہیگل اور سوپنہار کے فلسفیانہ نظریوں نے لے لی تو تعلیم کا اخلاقی تعمیری اور تمدنی

مقصد فوت ہو گیا۔ اور قوم کے بچے اپنے ملک کی معاشرتی اور تمدنی روایات سے بیگانہ ہو کر ایک ایسی دنیا میں رہنے لگے جو ان کی فطرتوں کے منافی تھیں۔ انفرادی اور شخصی ترقی کا خاتمہ ہو گیا اور اس سے قوم اور ملک کی ترقی کو بہت بڑا دھکا لگا۔

اس لئے اپنے مدرسوں کو افادی پہلو سے "کاروباری" بنانے کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کے بلند مقاصد بھی سامنے رہیں۔ زندگی صرف اس کا نام نہیں کہ انسان کچھ کما کر کھانے کے قابل ہو جائے مقررہ وقتوں پر کام و دہن کی لذت سیرابی کو اپنا مقصد سمجھے۔ سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اسکی کہ وہ زندگی کے تنوع کے مفہوم کو سمجھے۔ اسے اپنے گرد و پیش کی چیزوں میں حیات کی روح افزا کیفیتیں نظر آئیں۔ فطرت کی رنگینیاں اس کی زندگی کو زیادہ قابل رشک بنا سکیں وہ اپنی قومی اور ملکی روایات کا آئینہ دار ہو ان کا تصور اسے زندگی کو زیادہ قیمتی سمجھنے پر مجبور کرے۔

اس نقطۂ نظر کو چھوڑ کر بھی اگر ہم صرف افادی پہلو سے دیکھیں تو "کاروباری" تعلیم کا مقصد اتنا محدود نہیں ہونا چاہئے کہ مدرسوں سے نکلنے والے نوجوان ایک خاص قسم کا کام کرنے کی مشین بن کر نکلیں انھیں اپنے اوزاروں اور مشینوں کا غلام نہیں بن جانا چاہیئے۔ اوزار اور مشینیں ان کے لئے ہیں وہ اوزاروں اور مشینوں کے لئے نہیں اس لئے ضرورت ہے کہ جو کام وہ سیکھ کر نکلے ہیں، اس کے قومی پہلو سے بھی واقف ہوں۔ انھیں صرف یہ خیال نہ ہو کہ وہ ایک کام صرف روپے کمانے کے لئے کر رہے ہیں، بلکہ ان کے پیش نظر یہ خیال ہونا چاہیئے کہ انسانی زندگی میں ہمارے کام کی یہ اہمیت ہے اور اس لئے ہم یہ کام کر کے قوم، ملک اور انسان کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس لئے ہمیں مشین کے پرزوں کی طرح ایک خاص قسم کے چکّر کا شکار نہیں ہو جانا چاہیئے اس ترقی کرتے ہوئے زمانہ کو ضرورت ہے ایسے لوگوں کی جن میں اپنے مخصوص کام کی مہارت کے علاوہ، آزادیٔ عمل، جدّت، قوت فیصلہ، خود اعتمادی اور سب سے زیادہ اپنے آپ کو بڑھتے ہوئے زمانے کے ساتھ بدلنے کی صلاحیت ہو۔ ایسا نہ ہو کہ زمانہ آگے بڑھ جائے اور وہ ایک پرانی لکیر کے فقیر بن کر ایک خاص گھیرے میں محدود رہ کر کام کرتے رہیں زمانے

کی ضرورتیں ہر چیز کو تیزی کے ساتھ بدل رہی ہیں۔ خصوصاً مشین اور سائنس کے اس عہد میں زمانہ کی رفتار اتنی تیز ہے کہ سست فکر آدمی اس کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ جن میں ہر نئی ضرورت اور تبدیلی کا احساس اور اس کے مطابق اپنے آپ میں تبدیلیاں پیدا کرنے کی صلاحیت ہے، وہی اس زمانے کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ اس لئے بھی تعلیم کے نقطۂ نظر کو محدود بنانے سے کام نہیں چل سکتا۔ صرف اس لئے کہ سڑک پر لگا بجلی کا کھمبا ہماری ضرورتوں سے، آسمان کے تارے کے مقابلہ میں زیادہ قریب ہے، اگر ہم بجلی کے قمقمے کے حاصل کرنے کو اپنا مقصد بنالیں گے تو ہماری ہر قوت محدود ہو کر رہ جائے گی۔ اس لئے تعلیم میں مقصد کی بلندی کا پیش نظر رہنا ضروری ہے۔ ہر "کاروباری" تعلیم میں کم و بیش یہ خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس خطرہ سے بچنا بہت سخت ضروری ہے۔

ہماری تعلیم اس مقصد میں کیسے کامیاب ہو سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں۔ مدرسوں میں بچوں کو مادری زبان، قومی ادب، قومی تاریخ اور ملک کی قدیم روایات سے اچھی طرح واقف کرنے کے علاوہ، انھیں برابر فکر و عمل کا موقع دینا ضروری ہے۔ ان میں مختلف قسم کی اخلاقی قدروں کا صحیح احساس بے حد اہم چیز ہے۔ ان سب چیزوں سے سب اچھے مدرس واقف ہیں اور جو واقف نہیں بھی ہیں، وہ ان طریقوں پر عمل کریں گے جو ہمارے تعلیمی مفکر اس مقصد کی تکمیل کے لئے بنا رہے ہیں۔ لیکن مدرسے کے علاوہ، ایک دوسری چیز ہے جس کی مدد سے تعلیم کے بلند مقاصد کو زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ اور وہ ہے یونیورسٹی۔

مدرسے کا مقصد بہت بڑی حد تک یہ ہونا چاہیئے کہ وہ بچوں کو ان کی فطری ضرورتوں اور صلاحیتوں کے مطابق، زندگی کی کشمکش اور جنگ میں حصہ لینے کے لئے تیار کرے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کے بلند مقاصد کو بھی جاری رکھے۔ لیکن "کاروباری" تعلیم مدرسے میں ختم ہو جانی ضروری ہے۔ اتنے دن میں قوم کے بچوں کو اس قابل بنایا جا سکتا ہے جو کہ وہ قوم کی معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے میں شریک ہو سکیں۔ مگر کچھ بچے ایسے بھی ہوں گے جو فطرتاً فنون لطیفہ ادب و شعر، تاریخ

فلسفہ کے لئے زیادہ موزوں ہیں، انھیں بھی "کاروباری" تعلیم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دینا ایک دوسری ہلک غلطی میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس لئے ایسے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع ملنے چاہئیں۔ تاکہ وہ مدرسے سے نکل کر کالج اور یونیورسٹی کی زیادہ آزاد فضا میں اپنی فطری دلچسپیوں کو سیراب ہونے کا موقع دیں۔ یونیورسٹی کو "کاروباری" زندگی سے الگ رکھ کر اسے صرف علم و فن، ادب و شعر، فلسفہ و تاریخ کے نکات کا سرچشمہ بنانا چاہیئے۔

اشتراکیت

اجتماعیت کے ربط خاص کے ساتھ

(مترجمہ مولوی برکت علی فراق - بی اے جامعہ)

یہ مسٹر جوڈ کی کتاب An Introduction to Modern Political Theory کے ترجمے کا ایک باب ہے۔ یہ سیاسیات پر ایک مختصر مگر جامع رسالہ ہے۔ مصنف نے کوشش کی ہے کہ عام مطالعہ کیلئے مختلف سیاسی نظریے سلیس عبارت میں پیش کر دیں اور کامیاب بھی ہوئے ہیں یہ رسالہ اپنی جامعیت اور اسلوب بیان کی بابت بہت مقبول ہوا ہے

تمہید:-

ایک چھوٹے سے رسالے میں اشتراکیت کا پورا پورا بیان جو اس کے سارے نظام پر حاوی ہو، ذرا مشکل ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اول لفظ اشتراکیت سے جہاں نظریات کا ایک نظام مراد ہے وہاں اس سے ایک سیاسی تحریک کا مفہوم بھی نکلتا ہے۔ چنانچہ گو ہمارا خاص موضوع بحث اشتراکیت کا نظریہ ہی ہوگا مگر یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اس بحث میں اشتراکیت کی متعدد تحریکوں کا سرے سے ذکر ہی نہ ہو۔ دوسرے نظریات کا یہ نظام جسے صحیح یا غلط، اشتراکیت کہا جا سکتا ہے کلیتہً سیاسی نہیں ہے اور کلیتہً کیا خصوصی طور پر بھی نہیں یہ نظام بڑی حد تک معاشی ہے۔ پھر معاشی اور سیاسی نظریات باہم کچھ اس طرح ایک دوسرے سے متعلق ہیں کہ عملی طور پر ہمارے امکان سے یہ چیز باہر ہے کہ ہماری بحث اشتراکیت کے سیاسی پہلوؤں ہی تک محدود رہے۔

ایک تیسری مشکل یہ پیش آتی ہے کہ اشتراکیوں کے متعدد مذاہب میں جو آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں، ہر مذہب ایک دوسرے سے مقاصد اور طریق کار

میں نہایت خفیف اختلاف کی وجہ سے الگ رہتا ہے۔ ان مذاہب کی بعض حالات میں کافی اہمیت بھی ہے اور وہ نظریات جن کی یہ وکالت کرتے ہیں، بڑی خوبی سے واضح کر دئے گئے ہیں، یہاں تک کہ ان کے حامیوں کے ایک دوسرے سے الگ اور ممتاز القاب قائم ہو گئے ہیں، وہ اشتراکی نہیں ہوتے، بلکہ سنڈیکلسٹ، پنچایتی اشتراکی یا اشتمالی کہلانے لگتے ہیں۔ اشتراکیت کے ان ارتقائی مذاہب کا ذکر الگ الگ ابواب میں ہوگا۔ اشتراکیت کی بحث اس لحاظ سے بھی مختلف ہوگی کہ اس نظرئے تک پہنچنے کے لئے کیا راہیں اختیار کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر ہم اشتراکیت پر اس معنی میں بحث کر سکتے ہیں کہ یہ انفرادیت کے ردعمل کا ایک نتیجہ ہے یا اس معنی میں کہ یہ کارل مارکس کے نظریات کی ایک تفسیر ہے۔ غرض بحث کا ہر طریقہ جو اختیار کیا جائے گا، اشتراکیت کے مختلف پہلوؤں کی اہمیت پر دال ہوگا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر طریق بحث ایک مختلف تصویر پیش کرے گا۔ یہ بات غالباً ہر نظرئے کی بہ نسبت اشتراکیت میں سب سے زیادہ ہے کہ جو بھی اس کا حامی ہے، اس کے ذہن میں اشتراکیت کا ایک سب سے الگ مفہوم ہوتا ہے اور ہر مفہوم مطابق ہوتا ہے اس کے حامیوں کی افتاد طبیعت اور موجودہ نظام کی افراط و تفریط کے متعلق اس زاویۂ نگاہ کے جس کے ماتحت وہ حمایت کرتے ہیں۔ چونکہ اشتراکیت کے حامیوں کی تعداد کثیر ہے، اور ان میں بعض چھوٹے چھوٹے سیاسی رسالوں کے ملند پایہ مصنف ہوئے ہیں اس لئے اس موضوع پر تصنیفات کا ایک بڑا ذخیرہ ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے کہ اشتراکیت کے صحیح اجزا کیا ہیں۔ مختصراً یہ کہ اشتراکیت اس حسن کی مانند ہے جو ہر بوالہوس کی پرستش کی وجہ سے اپنی اصلیت کو کھو بیٹھا ہے۔

پھر چند ایسے مقاصد قائم کر لئے گئے ہیں جو بیشتر اشتراکیوں کے نزدیک خاطر خواہ ہیں، خواہ ان ذرائع کی نوعیت سے وہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں جن سے ان مقاصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اشتراکی تصورات کا ایک اور مذہب بھی ہے جسے اجتماعیت یا ریاستی

اشتراکیت (State Socialism) کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اس مذہب کا ابھی زیادہ زمانہ نہیں ہوا زوال ہو چکا ہے۔ یہ ایک ہی ساتھ ایک مرکزی نظریہ بھی ہے اور دوسرے نظریات کے لئے ایک مرکز آغاز بھی۔

بہر حال ہم اس عام اشتراکی خیال کو جو اشتراکیت کے ہر مذہب میں یکساں پایا جاتا ہے۔بنیاد بنا کر اس باب میں اشتراکیت پر بحث کریں گے۔ یہ اشتراکِ خیال جس حد تک ریاستی اشتراکیت میں پایا جاتا ہے، ہماری بحث میں بیشتر اسی سے تعلق رہے گا۔

سب سے پہلے اشتراکیت کے ان مقدمات پر غور کیا جائے گا جن پر نظام اشتراکیت کا انحصار ہے، پھر اس کے اجتماعی اور سیاسی فلسفے کا ایک خاکہ دیا جائے گا اور آخر میں چند تجاویز کو بیان کیا جائے گا جن سے اشتراکیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ حتی الوسع ہم اپنی بحث کے لئے انہی تجاویز کا انتخاب کریں گے جو خفیف تبدیلیوں کے ساتھ ہر مذہب کے نزدیک قابل قبول ہیں۔

۱۔ اجتماعی اشتراکیت کے مقدمات :-

(الف)۔ کارل مارکس کی تصانیف۔ کارل مارکس حقیقت میں اشتراکیت کا باوا آدم ہے (برطانوی اشتراکیت کے معاملے میں یہ دعویٰ کسی قدر تبدیلی کا محتاج ہے۔ مارکس یورپ کے لگ بھگ تمام اشتراکیین اور چند برطانوی اشتراکیین کے لئے مرکز ہدایات ضرور ہے۔ مگر دوسرے مذاہب اور خاص طور پر فیبین اشتراکیوں کے لئے ہاکن، اوین، اور رسکن بہ حیثیت ماخذ کے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں)

مارکس سے پہلے' واقعہ یہ ہے' بے شمار نظریہ ساز مفکر تھے جو جماعت کی موجودہ حالت سے بیزار ہو کر معاشرت کے مثالی نظامات گڑھا کرتے تھے جس میں ملکیت مشترک سمجھی جاتی تھی اور بے انصافی کا نام تک نہ تھا۔ یہ لوگ انھی ذہنی تعمیروں کے ذریعے اپنی بھڑاس نکالا کرتے تھے۔ افلاطون کی "ریاست" (Republic) بھی انہی مثالی معاشرتوں میں سے

ایک کہی جا سکتی ہے ۔ رابرٹ اووین کی طرح کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنے تصورات کو جامد شکل میں منتقل کرنے کی کوشش بھی کی ہے ۔ یہ نمونے کی بستیاں بساتے تھے جن کے بسنے والوں کو اسی خاص قسم کی زندگی گذارنے کی ترغیب دی جاتی تھی جو ان کے بانیوں کے نزدیک انسانی زندگی کا بہتر سے بہتر نمونہ تھی اس قسم کے تجربے بلا استثناء ناکام رہے ۔ اووین کو کسی حد تک مستثنیٰ کر کے مارکس سے پہلے اس قسم کے اشتراکی مصنفوں میں سے کسی نے سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور نہیں کیا تھا کہ جماعت کا جو معیاری نظام وہ پیش کرتے ہیں وہ وجود پذیر کیوں کر ہو سکتا ہے ۔ نہ اس مسئلے کو سلجھایا گیا کہ اگر وہ نظام قائم ہو جائے تو اسے باقی رکھنے کے لئے کیا طریق کار اختیار کیا جانا چاہیئے ۔ بیشتر مفکر جن میں اووین اور فارئے بھی تھے اسی اعتماد کے ساتھ جو ایک الہامی صاحب نظریہ کو اپنے اوپر ہو سکتا ہے ، یہ سمجھتے تھے کہ ان کا کام صرف یہ ہے کہ کل انسان کو اس بات کی طرف توجہ دلا دیں کہ جب تمام بنی نوع انسان ان کے تصورات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے خود بخود اپنی مرضی سے مجبور ہو جائیں گے اس وقت ان کی اسکیمیں اپنی مکمل صورت میں ظاہر ہوں گی ۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہوگا کہ ان تصوری معاشر کے بانیوں میں سے بیشتر کی زندگیاں ناکامیوں اور نامرادیوں سے پر ہیں ۔

غرض مارکس پہلا اشتراکی مصنف ہے جس کی تصنیف کو علمی کہا جا سکتا ہے ۔ جس قسم کی جماعت کی اسے تمنا تھی ، اس کا اس نے صرف خاکہ ہی نہیں تیار کیا ہے بلکہ نہایت تفصیل کے ساتھ ان مراحل کا بھی ذکر کیا ہے جن سے گذر کر اس کی تکمیل ہونی ہے ۔

مارکس کی تصانیف عام اس سے کہ مزدور پیشہ طبقے پر ان کا نہایت گہرا اثر پڑا ، پیچیدگی سے خالی نہیں ہیں اور ان کی صحیح تعبیر کے مسئلے پر بہت شدید اختلاف رائے ہے ۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ مختلف تعبیرات جن کے لئے ان تصانیف میں گنجائش نکل سکتی ہے ، اشتراکیت میں مختلف مذاہب کے قیام کا باعث ہوئی ہیں ۔

ہمارے موجودہ مقصد کے لئے صرف یہ کافی ہوگا کہ مارکس کے دو نمایاں اور اہم نظریات کی

تشریح کردی جائے۔ اوران پر جو حاشیہ آرائیاں اور تعبیریں ہوئی ہیں ان کو دوسرے ابواب کے لئے اٹھار کھا جائے۔ ان میں سے ایک ہے نظریۂ قدر (Theory of Value) اور دوسرا تاریخ کا مادی تصور (Materialistic Conception of History)

ا۔ نظریہ قدر زاید :۔

مارکس انیسویں صدی کی جامد معاشیات کے اس نظریے کو کہ "قدر کا ماخذ محنت ہے" مسلمہ طور پر تسلیم کرتا ہے۔ وہ اسی نظریے پر تحقیق کرتا ہے اور اسی کی بنیاد پر ایسے نتائج اخذ کرتا ہے جو قدیم معاشیین کے نتائج کے بالکل برعکس پڑتے ہیں مارکس کی تعبیر کے مطابق یہ نظریہ حسب ذیل ہے

سرمایہ دار جماعتوں کی دولت اصل میں اشیاء کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ یہ اشیاء قدر رکھتی ہیں اور یہ قدر اسی نسبت سے ہوتی ہے جس نسبت سے وہ اشیاء انسانی ضروریات کی تکمیل کی اپنے اندر صلاحیت رکھتی ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں ان کی قدر ان کے افادہ کے تناسب سے ہوتی ہے۔ ہم کسی چیز کے افادے کی مقدار اس کی صلاحیت مبادلہ کے مطابق متعین کرتے ہیں۔ چنانچہ مارکس اسی اصول کے مطابق ایک دوسرے کے مقابلے میں اشیاء کی قدر کو واضح کرنے کے لئے قدر مبادلہ (Exchange Value) کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ یہ قدر مبادلہ جسے عام طور پر قیمت کہا جاتا ہے، بازار کے حالات کے مطابق چڑھتی اترتی رہتی ہے لیکن یہ اتار چڑھاؤ اتفاقی ہوتا ہے خود اشیاء کی صلاحیت کو جس سے اس کی قدر یا یوں کہئے اس کی قدر مبادلہ متعین ہوتی ہے کو ختم کرنا تو کیا، کم بھی نہیں کرتا۔ یہ صلاحیت نام ہے اس محنت کی اوسط مقدار وقت کا جو اس چیز کی تیاری میں صرف ہوئی ہے۔ گویا محنت کے وقت کی مقدار جو اشیاء کی پیدائش کے لئے اجتماعی حیثیت سے لازمی ہے، قدر مبادلہ کا اصلی معیار یا پیمانہ ہے اور قدر ہائے مبادلہ کے غیر اہم تغیرات کے باوجود اپنی جگہ اسی طرح مستحکم اور اٹل ہے جس طرح فطرت کا کوئی مستحکم قانون۔"

مگر انسان کی محنت آپ سے آپ کوئی قدر پیدا نہیں کرسکتی۔ اس کے لئے اسے آلات

اوزار استعمال کرنے ہوں گے جن کے بغیر محنت اپنا کام ہی نہیں کر سکتی۔ ان آلات و اوزار میں مشینیں ہیں، کارخانے ہیں، بھاپ کی طاقت ہے، بجلی ہے اور اسی طرح کے بے شمار اور آلات۔

اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کے اوائل میں بے شمار ایجادیں ہوئیں جن کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ قدر کی پیدائش کے لئے ان آلات میں کارکردگی اور تعداد دونوں اعتبار سے غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے اور ان پر ایک نسبتاً چھوٹے سے طبقے کا جسے سرمایہ دار طبقہ کہا جاتا ہے، قبضہ ہے۔ سرمایہ دار ننگے بھوکے مزدوروں کی محنت کو خریدتا ہے اور اسے اپنی مشین اور خام اشیاء پر لگا کر ایسی اشیا تیار کرتا ہے جن میں مبادلہ کی قدر موجود ہوتی ہے۔ یعنی ایسی اشیاء جنھیں اتنی قیمت پر بیچا جا سکتا ہے جو مزدور کی اجرت اور کارخانے کے مصارف کے مجموعے سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اشیاء کی اس قدر مبادلہ اور مزدور کی محنت کی قیمت میں جو فرق ہوتا ہے، اسے قدر زائد (Surplus Value) کہتے ہیں، یہ قدر زاید مزدور کی محنت سے پیدا ہوتی ہے لیکن اس کا فائدہ اٹھاتا ہے سرمایہ دار آجر۔ یہ حقیقت میں وہ دولت ہے جو مفت کی محنت کے ذریعے پیدا ہوئی ہے۔

قدر زائد پر سرمایہ دار کا یہی غاصبانہ قبضہ ہے جو موجودہ صنعتی نظام کی صاف وصریح بے انصافی ہے اور جسے اشتراکیت کا ہر مذہب دور کرنا چاہتا ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ صنعتی نظام حقیقت میں یک غلامانہ نظام جماعت ہے جو صرف صورت ہی میں مختلف ہے۔ غلام بھی اپنے آقاؤں کے لئے قدر زائد پیدا کرتے تھے لیکن جبر کے ساتھ۔ موجودہ زمانے کا مزدور قدر زائد ایک آزادانہ معاہدے کے ماتحت پیدا کرتا ہے۔ لیکن چونکہ مزدور کے پاس دولت آفرینی کا اپنا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا اس لئے اس کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے کہ سرمایہ دار کے ہاتھ اپنی "شے" یعنی محنت بیچ دے۔ سرمایہ دار اس کے بدلے میں اسے سدر مق کے لئے تھوڑی سی اجرت دے دیتا ہے اور اس کی محنت سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے، اسے اپنی جیب میں رکھ لیتا ہے۔

(۲) تاریخ کا مادّی تصوّر :۔

اس کے بعد مارکس تاریخ سے اس بات کی تحقیق کرتا ہے کہ جماعت کس طرح ایک ایسے نہج پر منظم ہوئی جس میں ایک حقوق یافتہ چھوٹا سا طبقہ نہایت استقلال کے ساتھ قانون کی پشت پناہی کے ذریعے قدرِ زائد کو غصب کر رہا ہے جو نتیجہ ہے مزدوروں کی محنت کا۔ اس سوال کا جواب تاریخ کے مادی تصور کے ذریعے ملتا ہے۔ مارکس پہلا مفکر ہے جس نے اس بات کو غیر معمولی اہمیت دی کہ تاریخ میں جتنے واقعات رونما ہوتے ہیں، ان کا تنہا محرک معاشی حقائق ہوتے ہیں۔ دوسرے مفکرین ان واقعات کا محرک شخصی حوصلوں، شاہی درباروں کے اثرات، یا سیاسی غصب واقتدار کو ٹھہراتے ہیں، لیکن مارکس کا دعویٰ یہ تھا کہ کڑی سے کڑی ملاتے چلے جائیے تو آخر تمام سیاسی رجحانات کے پیچھے معاشی مصالح نظر آئیں گے جو ان تاریخی واقعات کا سبب بنے۔ گویا تاریخ کی اس تعبیر کی رو سے مینلا کا یونانیوں کو ٹرائے لے جاکر پاریس سے جو ہیلن کو اپنے ساتھ اڑا لے گیا تھا، بدلہ لینا مقصود نہ تھا بلکہ اس سے رومیوں کا یہ مقصد تھا کہ مشرق سے تجارت کرنے کے لئے ایک نیا راستہ دریافت کیا جائے۔ ہاں تو تاریخ کا تعین آخری مرحلے پر معاشی محرکات سے ہوتا ہے۔ اور انسانی جماعت کے ارتقا کی ہر منزل میں مادی ارتقا کی ایک منزل نظر آئے گی جس پر وہ ایک خارجی دنیا میں ہو کر پہنچی ہے۔

اس طرح ہر منزل جو معاشی محرکات کے زیرِ اثر آئی، اس میں ساتھ ہی ساتھ ایک مناسبِ وقت سیاسی نظام اور ایک طبقہ وارانہ ڈھیچر بھی موجود تھا۔ انیسویں صدی میں صنعتی انقلاب کے ذریعے معاشیات کو جو غیر معمولی فروغ ہوا، اس کے زیرِ اثر (۱) ایک حقوق یافتہ چھوٹا سا طبقہ الگ پیدا ہو گیا جو ذرائع دولت آفرینی پر قابض تھا اور (۲) ایک محروم الملک مزدوروں کا طبقہ الگ پیدا ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ صنعتی انقلاب سے پہلے بھی آجر اور مزدور تھے اور چھوٹے پیمانہ کے سرمایہ دار بھی تھے، گر جدید جماعت کے ساتھ جو خصوصیت ہے وہ ہے سرمایہ دار کا بہ حیثیت ایک طبقے کے اقتدار، ریاست کی ایسی ساخت جو اس اقتدار کو مؤثر بنائے، اور

مزدوروں کا پورے معاشی نظام میں سرمایہ داروں سے مقابلہ۔ یہ مہلک مقابلہ اور دونوں طبقوں کے مفادات کا تضاد جو اس مقابلے کا سبب ہے، سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان اس کشمکش اور جھگڑے کو آگے بڑھاتا جارہا ہے جسے عرف عام میں "طبقہ وارانہ جنگ" کہتے ہیں۔

لیکن جماعت کوئی قائم اور جامد چیز نہیں ہے۔ یہ ادلتی بدلتی رہتی ہے۔ جماعت کے ارتقا کی سرمایہ دارانہ منزل اسی تبدیلی اور گردش کے ماتحت جب وقت آجائے گا، ختم ہوجائے گی اور دوسری منزل آجائے گی۔ سرمایہ داری نظام کی مستقبل میں یہ شکل ہوگی کہ سرمایہ چند سے چند ہاتھوں میں مجتمع ہوجائے گا اور ایک طرف چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار بتدریج ختم ہوجائیں گے اور دوسری طرف محروم الملک مزدور روز افزوں بڑے پیمانہ پر منظم اور ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے جائیں گے۔ جب یہ صورت حال عروج پر پہنچ جائے گی تو مزدور طبقہ آگے بڑھے گا اور سرمایہ دار طبقے کو ختم کردے گا، اور جس طرح سرمایہ دار نے حقوق یافتہ خاندانی طبقوں کو جو پہلے صاحب اختیار تھے الگ کردیا یا اپنے اندر جذب کرلیا، اسی طرح یہ مزدور طبقہ سرمایہ داروں کو ذرائع دولت آفرینی سے محروم کردے گا۔

اس نظریئے کے مطابق کہ سیاسی واقعات کے پردے میں معاشی تغیرات کا عکس نظر آتا ہے، مزدوروں کا غلبہ اپنے ساتھ ساتھ جماعتی نظام میں بھی ایک تبدیلی لائے گا اور طبقات کے باہمی امتیاز کے خاتمے کا باعث ہوگا۔

اس نظریئے کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ اس نے مزدور پیشہ طبقے کے خیالات پر نہایت غیر معمولی اثر ڈالا، تو مبالغہ نہ ہوگا۔ مارکس کو اشتراکیت کے "باوا آدم" کا پیغمبرانہ خطاب اس کے جس اثر کے پیش نظر دیا جاتا ہے اس کو قائم کرنے میں اس کے نظریۂ قدرِ زائد کی بہ نسبت اس نظریے (تاریخ کی مادی تعبیر کا نظریہ) کو بہت زیادہ دخل ہے۔ اس کی جاذبیت کا راز یہ ہے کہ یہ مزدور پیشہ طبقے کو اس جدوجہد میں ان کی فتح مندی کی بشارت دیتا ہے۔ تاریخ کا تجربہ اگر اجتماعی ارتقاء

کے اٹل اصول کے مطابق کیا جائے جس کے زیر اثر سیاسی تغیرات (جن کے پیچھے معاشی تبدیلیاں کارفرما ہوتی ہیں) رونما ہوتے ہیں، تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وقت آنے پر سرمایہ دار طبقہ اپنے اقتدار سے محروم ہو جائے گا۔ پھر اس تمام کشمکش، طبقہ وارانہ جنگ، اور مزدور پیشہ طبقے کی تحریک کے کیا معنی؟ کیا یہ باتیں لازمی اور ناگزیر ہیں؟ کیا ارتقا تشدد آمیز اور ناگہانی تغیرات کے ذریعے واقع ہوتا ہے، یا کیا ہم اس پر قناعت نہیں کر سکتے کہ فطری ارتقا کی تدریجی رفتار ہی سے وہ جماعتی انقلاب جس کی ہمیں تمنا ہے آ جائے گا؟

ان سوالات کے جو مختلف جوابات دئے گئے ہیں، ان کی بنیاد پر اشتراکیت کے دو مذہب، انقلابی اشتراکیت اور ارتقائی اشتراکیت قائم ہو گئے ہیں۔ یہ دوسرا مذہب جسے بہ حیثیت مجموعی برطانیہ عظمیٰ میں اقتدار حاصل ہے، مارکس کی تصانیف کے حیاتیاتی پہلو پر زور دیتا ہے۔ جماعت چونکہ ارتقا پذیر اور حامل ارتقا ہے، اس لئے وہ ایک جان دار ہستی ہے، ایک باروح جسم جو ہر جان دار ہستی کی طرح پیدا اور فنا ہوتا ہے۔ حیات و ممات دونوں تدریجی رفتار کے پابند ہیں۔ انسان کے تدبر کے ذریعے انھیں قابو میں رکھا جا سکتا ہے، سہارا دیا جا سکتا ہے اور ان میں انسان کی کوششوں سے تازہ روح پیدا کی جا سکتی ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کی فطرت بدل دی جائے یا ان کے دھارے میں رکاوٹ پیدا کر دیا جائے اور نہ یہی ممکن ہے کہ ان کی رفتار تیز کر کے ان میں ناگہانی طور پر ہولناک قسم کے تغیرات پیدا کئے جا سکیں۔

غرض رفتار ارتقا نام ہے اصلاحات کے ایک سلسلہ کا جو جماعت کی تدریجی رفتار کو آنے والے انقلاب کی طرف لے جانے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ انقلاب انھی اصلاحات کے مجموعے کا ایک مرکب ہوگا۔ وہ کسی ناگہانی تبدیلی کا نتیجہ نہیں ہوگا جو ان اصلاحات کی بنیاد پر رونما ہوگی۔ ارتقائی اشتراکیت کا یہی مذہب جسے اجتماعی یا ریاستی اشتراکیت بھی کہتے ہیں، اس باب کے بقیہ حصے کا موضوع بحث ہوگا۔

بہت سے اشتراکی ایسے بھی ہیں جو مارکس کے نظریوں کی ایک بالکل مختلف تعبیر کرتے

ہیں مستقبل میں صورت حال جو کچھ بھی ہو، وہ بہر حال اس حقیقت کو اہمیت دیتے ہیں کہ موجودہ جماعت دو باہم متضاد طبقوں سے مرکب ہے، ایک صاحب ملک طبقہ اور ایک محروم الملک طبقہ جن میں آپس میں کوئی اشتراکیت مفاد نہیں ہے۔ ان کے درمیان ایک بہت گہری خلیج حائل ہے جسے صرف ایک ایسا انقلاب جو جماعت کی مکمل طور پر قلب ماہیت کر دے، پاٹ سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جماعت میں واقعات کی قدرتی رفتار ہی کے ذریعے تبدیلی اور ارتقا ممکن ہو، مگر اس اثنا میں مظلوم مزدوروں کی زندگیاں مصیبت و فلاکت میں بسر ہوتی ہیں، اور ان میں انتظار کا یارا نہیں ہے۔ لہٰذا جماعت کے آنے والے انقلاب کو جلد از جلد بروئے کار لانے کے لئے ہر ممکن طریقے اختیار کئے جانے چاہئیں۔ یہ انقلاب سیاسی اور معاشی نظام کو سرے سے بدل دے گا۔ اسے ایک ایسی جنگ کے ذریعے بروئے کار لایا جا سکتا ہے جس میں جنگ آزما مزدور پیشہ طبقہ تشدد اختیار کرے گا تاکہ سرمایہ داروں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے۔

مارکس کے نظریات کی یہ تعبیر جو اشتمالیت اور کسی حد تک سنڈیکلزم کی بنیاد ہے آئندہ کسی باب میں زیر بحث لائے جائے گی۔

یہودی

(پروفیسر بانکے بہاری لال صاحب پاٹھک)

ا۔ یہودی دنیا میں کب اور کس طرح پھیلے

بنی اسرائیل کا قومی وطن فلسطین ہے مگر آج وہ دنیا کے کونے کونے میں موجود ہیں۔ اس حقیقت سے انکار کرنا یا اس کے ثبوت میں کچھ خامہ فرسائی کرنا محض تضیع اوقات ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنے وطن سے کب اور کن حالات میں نکلے۔ یہودیوں کے مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ان کو جبراً وطن سے نکالا گیا' یا ان کو کسی بات سے مجبور ہو کر وطن چھوڑنا پڑا' اور یہ کہ پہلے تو وہ مشرق میں بابل کی طرف گئے بعد ازاں مغرب میں روم کی طرف چلے گئے' حقیقت یہ ہے کہ وہ وطن سے نکلے' اور کچھ تو مشرقی ممالک کی طرف چلے گئے باقی روم وغیرہ مغربی ممالک کی طرف۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یروشلم کی تباہی بلکہ مسیح کی پیدائش سے بھی بہت عرصہ پہلے یہودی ہر ملک میں موجود تھے' "ہجرت" سے پہلے بھی ان کے" بیاج گھر" میسو پوٹیمیا کے علاقے میں پائے جاتے تھے بابل سے رفتہ رفتہ وہ مشرقی ممالک میں بڑھتے گئے۔ مغرب کی طرف اس زمانے میں ان کا سراغ یونان کے جنوب مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ جزائر ہ یونیا میں ایشیائے کوچک میں' اور اگر مذہبی کتب پر یقین کیا جائے تو ہسپانیہ میں بھی' جہاں کہ وہ فنیقی جہاز رانوں کی معیت میں چلے گئے تھے۔ ملتا ہے۔

اس زمانے کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔ اس لئے ذرا بعد کے زمانے کے متعلق متعدد ذرائع سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ ہزار ہا یہودیوں نے اس بنا پر وطن چھوڑنے کا ارادہ کیا کہ وہاں کھیتی باڑی اور انگور کی کاشت میں بڑی مشقت درکار ہے اور فیصلہ کیا کہ آسان آسان

اور منفعت بخش پیشے اختیار کیے جائیں۔ اس موضوع پر آگے روشنی ڈالی جائے گی۔

ملک شام میں سیدون اور طارس کے مقاموں پر فینیقیوں کے پہلو بہ پہلو سب سے پہلے یہودیوں نے بستیاں بسائیں اور رفتہ رفتہ شام کے دوسرے شہروں بالخصوص انطاکیہ سلوشیا، لاوڈیشیا اور دمشق میں بھی پھیل گئے۔ وہاں سے آگے چل کر وہ ایشیائے کوچک میں جا پہنچے اور کاروانی راستوں پر یا ساحلی شہروں میں قیام پذیر ہوئے۔ مثلاً کاپے ڈوشیا فرجیا ترسوس اور طرائیس میں ۔۔۔ آیونیا میں وہ سمرنا افیسس ملٹ ہالی کارنیس اور کنیڈس کے مقامات پر بالخصوص پائے جاتے تھے، اس کے علاوہ ان کی نو آبادیاں سائپرس، روڈس، ڈیلوس، پردس، کرتیا، تھیسےلونیا، کورنتھ، سپارٹا اور ایٹی کا میں بھی پھیل چکی تھیں،

اٹلی میں روم کے مقام پر یہودیوں کے قیام کے متعلق سب سے پہلی قابل وثوق خبر ۱۳۹ء قبل مسیح کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شہر روم میں اس سے بھی کافی مدت پہلے سے آباد ہوں گے۔ کیونکہ وہاں ان کی ایک بہت بڑی مذہبی مجلس قائم تھی۔

شمالی افریقہ خصوصاً مصر کے شہروں میں بھی یہودی بڑی تعداد میں آباد تھے، اسکندریہ کی آبادی میں یہودیوں کی اقلیت سب سے زبردست تھی۔ اور یہ بطلیموس لاگی کی ہی رواداری حکومت کا نتیجہ تھا کہ مصر میں یہودیوں نے جس جگہ چاہا بلا مزاحمت آباد ہوتے چلے گئے۔

اس طرح بحیرہ روم کے گرداگرد یہودی بستیوں کا دائرہ مکمل ہوا۔ یہ بستیاں باقاعدہ تجارتی شاہراہوں سے ایک دوسری کے ساتھ مربوط تھیں گاہے بگاہے فلسطین سے یہودیوں کی ایک نئی لہر اٹھتی تھی اور ان نئی بستیوں میں پھیل جاتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ یہودی ساحلی علاقوں کے علاوہ اندرونی تجارتی شاہراہوں پر بھی آباد ہوتے گئے۔ سٹرابو لکھتا ہے کہ "مسیح کی پیدائش کے وقت شاذونادر ہی کوئی مقام ایسا ہوگا جہاں یہودیوں کی آبادی اور ان کا اقتدار نہ ہو" یہ الفاظ حرف بحرف صحیح ہیں۔

مندرجہ بالا حقائق سے دو باتیں ثابت ہوئیں ایک تو یہ کہ یہودی اپنے آبائی وطن فلسطین

سے نہایت قدیم زمانے میں نکلے، دوسری یہ کہ یہ ہجرت ان کی اپنی ہی رضا و رغبت سے واقع ہوئی۔ اس کے علاوہ کسی قوم نے ان کو اس بات پر بھی مجبور نہیں کیا کہ وہ آئیں اور ان کے وطن میں آباد ہوں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو یا جنوں سا سوار تھا جو پہلے تو ان کو ملک بہ ملک لئے پھرتا رہا پھر چند صدیوں کے بعد اس امر کا موجب ہوا کہ یہودی مورخ ہرزفیلڈ کے قول کے مطابق وہ میڈیا سے لے کر روم تک، پونٹس سے لے کر خلیج فارس تک، اور مقدونیہ سے لے کر زنگ و حبش تک سارے ممالک میں آباد ہو گئے۔ اور اس وسیع خطہ میں کوئی علاقہ کوئی تجارتی شہر ایسا نہ رہا جس میں یہودی نہ جا پہنچے ہوں،

۲۔ تجارت اور ساہوکارہ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل کے ساتھ دوسری اقوام نے کچھ اچھا سلوک نہ کیا، وہ جہاں جہاں گئے ان کا مقاطعہ کیا گیا، ان کو لوگوں سے ملنے جلنے نہ دیا گیا لہذا ان کے پاس کسب معاش تجارت اور سود خواری کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ رہا مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہوس زر اور طمع منفعت کی وجہ سے وہ سود خوار رہے، جہاں گئے لوگوں کا خون چوسنے لگے، لہذا لوگوں نے ان کا مقاطعہ کیا تجارت بذات خود کوئی بری چیز نہیں۔ بلکہ موجودہ تمدن کا ایک جز واہم ہے، ہمیں اگر ہم کوئی کلام ہے تو یہودیوں کی مخصوص طرز تجارت سے ہے۔

تاریخی حقائق یہ ہیں۔ کہ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں بلکہ اس سے بھی پیشتر فلسطین اور بابل کے درمیان تجارتی قافلوں کے راستے موجود تھے، حضرت سلیمانؑ آنے جانے والے سوداگروں سے ٹیکس وصول کرتے تھے، کیونکہ انھوں نے ان سوداگروں کی سہولت کے واسطے دمشق اور دیگر مقامات میں منڈیاں اور بازار تعمیر کروائے تھے، ان کے زمانے میں مصر کے ساتھ گھوڑوں کی تجارت وسیع پیمانے پر ہوتی تھی، نیز انہی کے زمانے میں فنیقیوں کے ساتھ مل کر بنی اسرائیل نے مشرق بعید کے پُر اسرار اور دولت مند شہر اوفر کا مشہور سفر

اختیار کیا۔

اس شاہراہ کے علاوہ، جو دمشق سے چل کر صحرائی کنعان میں سے ہوتی ہوئی، خلیج ایکو تک پہنچتی تھی، اور بھی تجارتی راستے موجود تھے، ایک سوٹوپولس سے سخم تک جاتا تھا، دوسرا بھی جنبیا میں ہو کر سخم اور پھر وہاں سے یروشلم پہنچتا تھا۔ یروشلم اور ایلات کی بندرگاہ کے درمیان بڑی آمدورفت رہتی تھی، تیسرا راستہ بندرگاہ ایاپ کو جاتا تھا، یہودی ان ہی تجارتی راستوں پر آباد تھے اور ازمنہ قدیم سے قافلوں کے ساتھ لین دین اور بیوپار کرتے تھے، ممکن یہ بھی ہے کہ ان میں سے بہت سے فلسطین کے اندرونی علاقے میں زراعتی اور صنعتی پیشوں میں مشغول ہوں گے۔ ورنہ بصورت دیگر ان کے لئے ضروریات زندگی اور سامان خورد و نوش حاصل کرنا قریب قریب ناممکن تھا۔

یہ جب وطن کو خیرباد کہہ کر باہر نکلے تو ان کی حریص نگاہوں کو جابجا حصول زر و مال کے زرین مواقع نظر آئے۔ ایران میں گئے، وہاں کے زراعت پیشہ باشندے بڑے سادہ طبع تھے، بس وہیں ساہوکارہ جما کر بیٹھ گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں مالا مال ہو گئے۔

کچھ عرصہ بعد وطن کو واپس جانے کی تحریک شروع ہوئی۔ بڑی بڑی پرجوش نظمیں لکھی گئیں۔ کہ اجڑے ہوئے وطن کو پھر سے بسانا چاہیئے۔ ایک طرف مال و دولت کے انبار، دوسری طرف فلسطین کا حوصلہ شکن ریگستان، جاتا کون؟ نتیجہ یہ ہوا کہ ماسوائے چند کنگلوں اور چند ناکارہ، بوڑھے ربیوں کے، جن پر ہر شخص دباؤ ڈال سکتا تھا اور کسی نے "اجڑے وطن" کا رخ نہ کیا، اور ان کی تجارت اور ساہوکارہ مشرق کی طرف بڑھنے لگا، اور وہ لوگ وہیں آباد ہوتے گئے۔ اب جو جو ان میں سے واپس وطن پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ویران سا، غیر آباد سا ملک ہے، جس میں اناج کی کاشت کرنے کے لئے بڑی محنت اور بڑے صبر و تحمل کی ضرورت ہے۔ سارا جوش وہیں بیٹھ گیا۔ وطن کی محبت پر طمع زر غالب آئی اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جلد ہی وطن سے واپسی کی تحریک بھی شروع ہو گئی۔

بعض لوگ یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ چونکہ بنی اسرائیل چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر اطراف و جوانب کے ممالک میں بکھر گئے جہاں ان سے کچھ روادارانہ سلوک نہ ہوا بلکہ الٹے ان کے خلاف متعاطعانہ قوانین وضع کئے گئے۔ لہٰذا ان کے لئے سوائے ساہوکارے کے کسب معاش کا اور کوئی ذریعہ نہ رہا۔ مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، یہود دوسرے ممالک میں گئے کیونکہ وہاں ان پیشوں کے لئے ان کو کافی گنجائش نظر آئی۔ یہ محض ایک اتفاقیہ امر ہی نہیں تھا کہ یہودی مشہور شہور تجارتی مرکزوں میں ہی آباد ہوئے۔ اگر ان کو یہ خواہش ہوتی کہ محنت مزدوری کر کے روزی پیدا کی جائے، تو اول تو وہ اپنے وطن کو ہی نہ چھوڑتی اور اگر چھوڑا بھی تھا تو بجائے پہاڑی جزیروں، ساحلی چٹانوں اور صحرائی قصبوں کے وہ کسی زرخیز خطے میں آباد ہوتے۔ مگر ہوس زر نے ان کو ایسا نہ کرنے دیا۔ یہ حقائق ناقابل تردید ہیں، اور ان کے جواز میں ہم جس قدر اور جس زمانے کے چاہیں ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر شمالی اسپین کا پہاڑی علاقہ جہاں باسک قوم آباد ہے، شہروں سے بالکل عاری تھا۔ سانچو پانچو دانشمند (۱۱۵۰ء) نے چاہا۔ کہ اس علاقے میں آمد و رفت سے رونق ہو جائے، اس غرض سے اس نے قدیمی گشٹائز کو ایک شہر بنا دیا۔ اور اعلان کر دیا کہ بیرونی ممالک کے جو لوگ اس شہر میں اپنی اشیا و اجناس فروخت کرنا چاہیں گے ان پر کوئی محصول یا ٹیکس نہیں ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین کے تمام علاقہ جات سے یہودی جوق در جوق اس شہر میں آنے لگے تاکہ اس سنہری موقعہ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ایران میں عباس صوفی مسند آرا سلطنت ہوئی تو دیکھا کہ باہم خانہ جنگیوں نے مملکت کو ویران کر دیا ہے۔ چاہا کہ اس کی مالی حالت کو بہتر بنائے۔ اس غرض سے اس نے بیرونی ممالک کے سوداگروں کو وسیع مراعات دیں نتیجہ یہ ہوا کہ اوروں کے علاوہ یہودی بھی بے شمار تعداد میں آن وارد ہوئے۔ یہی حال پولینڈ، بوہیمیا اور دیگر ممالک میں ہوا۔ ان حقائق سے یا تو ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے دل جذبۂ حب وطن سے عاری ہیں۔ یا یہ کہ ہوس زر نے

اس جذبہ کو کچل کر نفس کے کسی تنگ و تاریک کونے میں چھپا دیا ہے اور ان کی سرشت میں آوارگی بھر دی ہے کہ جہاں سود خواری اور تجارتی ہیر پھیر کا داؤ لگتا نظر آئے اسی طرف کو کھچ جائیں۔ امتداد زمانہ کے ساتھ یہ لت ان کی طبیعت میں راسخ ہو چکی ہے، یہ کہنا کہ خارجی دباؤ کی وجہ سے انھوں نے یہ عادات اختیار کیں محض بے بنیاد ہے۔ اینگلو سیکسن، سیکنڈ نیوین اور جرمن قوم کے لوگ بھی بیرونی ممالک میں گئے۔ عرق جبیں اور محنت بازو سے غیر آباد علاقوں کو آباد کیا، قابل زراعت بنایا اور انھیں اپنا وطن سمجھ کر لوگوں میں مخلوط ہو گئے۔ ان کے دوسرے بھائی جو وطن میں رہ گئے، حقائق ارضی و سماوی کے مشاہدات میں مصروف، کائنات کے سربستہ رازوں کی عقدہ کشائی کرتے رہے۔ مگر بنی اسرائیل اس اثنا میں عمدہ عمدہ تجارت خانوں اور منڈیوں کے انتخاب میں مصروف رہے۔

قرون اولیٰ میں بابل کا علاقہ، جسے آج کل عراق کہتے ہیں، تجارت کا مشہور مرکز تھا جہاں پر ہندوستان، چین اور دیگر دور دراز ممالک سے سوداگروں کے قافلے آتے تھے اور اپنے مال کے تبادلہ میں بابل والوں سے بحیرۂ روم کی منڈیوں کا مال لے کر واپس چلے جاتے تھے۔ اسی طرح بابل والے، ہندوستانی، چینی، ایرانی، کشمیری، ترکستانی مال بحیرۂ روم کی منڈیوں کو بھیجتے تھے اور خود اس عوض معاوضہ سے خوب نفع اٹھاتے تھے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ بابل میں بھی یہودی ساہوکاروں اور آڑھتیوں کا زور تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے سوداگر بھی انہی امراض میں گرفتار ہو گئے تھے۔ وہ بھی یہود کی طرح بدنام ہو گئے تھے۔ فنیقی جہاز راں بھی سوداگری کرتے تھے۔ یہودی اور فنیقی نسلی لحاظ سے ایک ہی اصل سے تھے۔ مگر جب کبھی لین دین یا بیوپار کے معاملہ میں مقابلہ آپڑتا۔ یہودی مغلوب الحسد ہو کر ان سے بھی برسرِ پیکار ہو جاتے۔

اسکندریہ میں بھی یہودی ساہوکار بڑے صاحب ثروت و اقتدار ہو گئے تھے۔ ملکی محاصل کے اجارہ دار ہونے کے علاوہ وہ چونکہ بادشاہ کو بھی سود پر قرض دیتے تھے اس وجہ سے دربار شاہی میں بھی بڑی بڑی اسامیوں پر قابض ہو گئے تھے۔ اس بڑھتے ہوئے

اسرائیلی اقتدار کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں ان کے خلاف جذبہ پھیل گیا۔ فسادات ہوئے جن میں یہودیوں کو بڑے بڑے نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ یہ حال ۱۰۶۶ء میں تھا۔ مگر تھوڑے ہی عرصے میں وہ پھر انہی پیشوں کی بدولت امیر کبیر ہو جاتے تھے۔

اسکندریہ کی طرح حبش میں بھی وہ بڑے مال دار و صاحب اقتدار تھے، اعمال رسل ۲۷۔۸ کے مطابق ملکہ کنادکی کا میر خزانہ ایک یہودی تھا، عرب میں، بحیرہ اسود کے گرد، اور یونان میں بھی ان کا بڑا زور تھا۔ یونان میں وہ غلاموں کی تجارت کرتے تھے۔

تالمود کا مقولہ ہے "ایک سو فلورنس تجارت میں لگانے والا گوشت کھاتا اور شراب پیتا ہے۔ مگر ایک سو فلورنس زراعت میں لگانے والا ترکاری اور نمک" یہودی ابتدا سے اس مشورے پر کاربند تھے۔

جب ربی الیعازر نے گوبھی اور چقندر کے کھیت کو دیکھا تو اس نے کہا "اے ترکاری چاہے تیری کتنی کاشت کی جائے تجارت کا رتبہ تجھ سے کہیں بلند ہے" جب وہ گیہوں کے کھیت میں سے گذرا اور لہلہاتی ہوئی بالیں دیکھیں تو وہ بولا "چاہے کتنا لہلہاؤ بیوپار تم سے افضل ہے"۔

اس فن دفریب، اس تاجرانہ ہیر پھیر کے خلاف خدائے بزرگ کے نبیوں نے بار بار آوازیں اٹھادیں (اس سلسلہ میں رسولِ عربی ؐ نے سب سے زیادہ اور موثر کام کیا۔ مولف) تالمود میں بھی جا بجا اس قسم کی تلقین موجود ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل نے ان ہدایات پر کبھی غور نہ کیا۔ ایک دفعہ بنی اسرائیل کو مشورہ دیا گیا کہ بجائے دھات کے وہ پتھر یا آبگینہ کے اوزان اور بٹے استعمال کریں۔ کیونکہ دھات گھس جاتی ہے اور نہ ہی ان کو نمک میں ڈالیں کیونکہ نمک ان کو کھا جاتا ہے۔ یہ حکم یا مشورہ ظرافت کی چاشنی سے خالی نہیں مگر یہودیوں کی ایمان داری کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے خلاف سخت ایجی ٹیشن کیا گیا۔ ہوزیا نے بھی لکھا ہے۔ "کنعان کے ہاتھوں میں جعلی اوزان ہیں، کنعان ایک دولت پرست ملک ہے"۔ دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے۔ جا بجا یہی بات ملتی ہے۔ جن جن قوموں میں یہود جا کر آباد ہوئے مفلس

ونادار ہوگئیں اور جب تک انھوں نے شور شر برپا نہ کیا یا وطن کو خیر باد نہ کہا اس بے رحم ساہوکار نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ دنیا کو یہ بتایا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کے خلاف یہ الزامات دشمنی یا حسد کی وجہ سے لگائے جاتے تھے مگر بیسویں صدی کی دنیا ان طفل تسلیوں میں کب آتی ہے جب یہودیوں کے قیام کا ہر جگہ ایک ہی سا نتیجہ نکلتا ہے۔ تو کیا ہم یہ فرض کریں کہ ہر قوم ان کی دشمن یا حاسد ہے؟ ہرگز نہیں۔ لازمی طور پر اس کی دیگر وجوہات ہیں، تاریخ عالم کے جاننے والے ہر قوم، ہر ملک، ہر شہر میں موجود ہیں، اور وہ جان سکتے ہیں کہ یہ وجوہات کیا ہیں۔

جب سانچو دانشمند کے اعلان کے بموجب یہودی باسک قوم کے علاقوں میں جا کر آباد ہو گئے۔ تو انھوں نے سیدھی سادھی تجارت کی تجارت کی بجائے وہی روپے کا لین دین بھی شروع کر دیا ضرورت مند کسان اور شہری قرض کے بوجھ تلے دبتے چلے گئے حتیٰ کہ ان کی جائدادیں اور زمینیں سب یہودیوں کے پاس رہن ہوگئیں اور ان کی حالت بہت خستہ وخراب ہوگئی۔ مگر اس بات پر پیچ وتاب کھا کر کہ باہر سے آئی ہوئی ایک چھوٹی سی قوم ہمیں یوں تباہ کرتی چلی جائے، ان کی غیرت نے جوش مارا اور وہ آمادۂ فساد ہوئے۔ شہر وکٹوریہ کے بلدیہ نے شاہ کے پاس جا کر داد وفریاد کی، کہ لوگوں میں یہودیوں کے خلاف جذبۂ نفرت پھیل رہا ہے ممکن ہے کشت وخون تک نوبت جا پہنچے۔ حفاظتی پیش بندی کر لینی چاہیئے۔ شاہ نے فوراً فوج بھیج دی اور اعلان کر دیا کہ آئندہ کوئی یہودی ساہوکارہ نہ کرے، ورنہ "سارے شہری برباد ہو جائیں گے اور ممکن ہے کہ ہمارے محنت سے بسائے ہوئے شہر کو چھوڑ کر کہیں ہجرت کر جائیں"۔ یہ واقعہ ۱۳۳۲ء کا ہے، عباس صفوی کے اعلان کے بعد ایران میں جا کر بھی بنی اسرائیل نے یہی وتیرہ اختیار کیا اور ایرانیوں کے خون کو اس طرح چوسا کہ وہ سخت قلاش ہو گئے۔ اس غاصبانہ لوٹ کھسوٹ اور رعایا کی داد وفریاد کا آوازہ شاہ کے کانوں میں بھی پڑا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر اعظم بے چارہ مدت تک اس الجھن میں پھنسا رہا کہ یہودیوں سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ تاکہ دوسرے غیر ملکوں کو ضعف نہ پہنچے" قسطنطنیہ میں بھی وہ

اسی طرح مال دار ہو گئے تھے"۔ ماؤرنیر لکھتا ہے" دولت یا تو قیصر کے ہاتھ میں ہے یا یہودیوں کے خصوصاً ان یہودیوں کے جو قسطنطنیہ میں رہتے ہیں، کیونکہ جہاں تک بیرونجات کا تعلق ہے، یہ کمبخت لوگ، عیسائیوں سے بھی نکمے ہیں۔ کھیتی باڑی سے ان کو سخت عار ہے اور چونکہ ان کی معاش کا مدار ہی سود خواری پر ہے، قسطنطنیہ سے باہر ان کا گذارہ مشکل ہے"۔ پاشا کو بھی یہودی قرض دیتے تھے۔ مگر اکثر جعلی سکوں میں۔ صیغۂ محصول کی بھی وہی مہتمم تھے، اور عیسائیوں سے بڑی سختی سے محصول وصول کرتے تھے، شام و مصر و فلسطین میں بھی محصولات کے اجارہ دار وہی تھے۔ سارگرید واپنے تاثرات ان الفاظ میں قلمبند کرتا ہے" طمع زر قسطنطنیہ کے اندر ایک پیشہ ور عورت ہے جس کے دلّال یہودی ہیں"۔

فرانس اور پرتگال کے متعلق ہم آئندہ لکھیں گے، جہاں تک ہسپانیہ کا تعلق ہے، وہاں یہ حالت تھی کہ یہودی" بے رحم غلام فروش" کہہ کر پکارے جاتے تھے۔ چونکہ وہ بہت امیر تھے اس لئے جہاں جاتے تھے لوگوں کو دبا لیتے تھے۔ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ کسی طرح وہ قوانین جو عیسائیوں کی محافظت کے لئے وضع کئے گئے ہیں ٹوٹ جائیں یاکم ازکم سپرد طاقِ نسیان رہیں اور استعمال میں نہ آئیں۔ حتیٰ کہ آخر کار حکومت کو سخت گیرانہ پالیسی اختیار کرنی پڑی، بہت سوں کو عیسائی بنا یا گیا، بہت سوں کو ملک بدر کیا گیا۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلا، اور صدیوں تک جائز شہری حقوق، اور ساہوکارے کے درمیان کشمکش جاری رہی، اور ایک مدت تک دونوں فریق ایک دوسرے کی مذہبی تنگ نظریوں اور تعصبات کا شکار ہوتے رہے۔ مشہور یہودی مورخ کیسر لنگ لکھتا ہے" بنی اسرائیل ازمنۂ قدیم سے دلّالی، آڑھت، اور ساہوکارے کا کام کرتے ہیں، وہ مورخین جو یہودیوں کے خلاف ہیں اسے سود خواری (WUCHER) کے نام سے تعبیر کرتے ہیں"۔ یہی مورخ اپنی تاریخ کے آغاز میں اس بات کا اقرار کرتا ہے" کہ یہودیوں کو دوسرے شہریوں کے برابر حقوق حاصل تھے بلکہ ان کو زیادہ مراعات حاصل تھیں"

مندرجہ بالا تاریخی حقائق اس بات کو اچھی طرح سے ثابت کر دیتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے دوسروں کی دشمنی یا جبر کی وجہ سے سود خواری کا پیشہ اختیار نہیں کیا، بلکہ ان کی سود خواری نے دوسروں کو ان کا دشمن بنا دیا۔ ایک اور جگہ یہی یہودی مورخ فخر سے لکھتا ہے "ازمنہ وسطیٰ میں ٹوڈیلا کے برابر غلاموں کی تجارت کہاں ہوتی تھی؟ اسپین کے یہودی قدیم زمانے سے غلاموں کی تجارت کرتے تھے، جزیرہ نمائے آئبیریا کے اندر کوئی مقام ایسا نہیں تھا جس میں ٹوڈیلا کے برابر غلاموں کی منڈی ہو۔ یہ منڈی بہت مدت تک قائم رہی اور جب تک کہ موروں نے آکر اس ملک پر اچھی طرح سے تسلط نہ جما لیا۔ اس منڈی میں یہودیوں کا بول بالا رہا۔ بعد ازاں یہ تجارت موروں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

اب رومؔ کو لیجئے۔ یہ شہر صدیوں تک سیاسی اور مذہبی مناقشات اور فسادات کا مرکز رہا۔ کئی فاتح آئے اور لوٹ مار کر کے واپس لوٹ گئے، یہاں بھی بنی اسرائیل نے اپنے گھناؤنے لچھنوں کو نہ چھوڑا۔ قیصر اور پوپ سبھی یہودیوں کے ہی بکھیڑوں میں پھنسے رہے۔ بالآخر انھیں مجبوراً یا تو یہودیوں کے حقوق و مراعات چھیننے پڑے یا سود خواری کے خلاف قوانین وضع کرنے پڑے، یا ان سے وہ بہت جسے دینے سے وہ انکاری تھے جبراً وصول کرنی پڑی اور ان کو اس بات سے منع کرنا پڑا کہ وہ عیسائی قوم کے بزرگوں کی ہتک کریں۔ یا کبھی ان کے تیوہاروں اور قومی رسوم کی ادائگی کے لئے ایک مجلس نگراں قائم کرنی پڑی، وغیرہ وغیرہ۔ رومؔ کے اندر مالدار یہودیوں کے پاس بڑی بڑی جاگیریں تھیں۔ جن میں وہ خود کام نہیں کرتے تھے بلکہ جیسا کہ فاگل شتائن رگیر لکھتا ہے "ان کی جاگیروں پر کھیتی باڑی کرنے کے لئے گالیائی اضلاع (موجودہ فرانس) سے غلام درآمد کئے جاتے تھے، چنانچہ غلاموں کی خوب تجارت ہوتی تھی۔" اٹلی کے دوسرے شہروں میں بھی یہودی بڑے صاحب ثروت و اقتدار ہو گئے تھے۔

کیسینیہ کے باشندگان کو خوف لاحق ہوا کہ مبادا سرمایہ کے زور سے یہود سارے شہر پر قابض ہو جائیں، انھوں نے ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کے خلاف جد و جہد کی جس کا نتیجہ

یہ ہوا کہ "یہودی سود خوار اس بات پر رضا مند ہو گئے کہ وہ ۲/۱ ۲ بیس فی صدی سے زیادہ سود نہ لیں گے، شہر کا منصف اس فیصلہ سے اپنی کامیابی پر بڑا خوش ہوا" لوآر نو میں بنی اسرائیل اتنے طاقت ور ہو گئے تھے کہ عیسائیوں کو ان کی وجہ سے بجائے اتوار کے ہفتہ کے روز چھٹی منانی پڑتی تھی، یہی حال بہت سے دوسرے شہروں کا بھی تھا،

وینس، جنوا، اور فلورنس ان باتوں سے مستثنیٰ رہے کیونکہ وہاں کے باشندے یہودیوں سے زیادہ چالاک اور سود خوار تھے۔ چنانچہ لمبارڈون کے خلاف بھی اسی قسم کے الزام لگائے جاتے تھے فرانس میں ان کے خلاف بھی قوانین وضع کئے گئے، یورپ کے رہنے والے بھی بسا اوقات عیسائیوں کی سی نہیں بلکہ "بتپسمہ یافتہ" یہودیوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ (لمبارڈون کو نفرت کی وجہ سے "بتپسمہ یافتہ یہودی" کہا جاتا تھا۔ اب یہ بات کہ ان کے خلاف بھی اسی طرح نفرت پھیلی جس طرح کہ یہودیوں کے خلاف، صاف ظاہر کرتی ہے کہ نفرت کسی قوم سے نہیں تھی بلکہ سود خواری اور بیوپاری ہیر پھیر سے تھی، جو قوم یا فرقہ ساہوکارے کا پیشہ اختیار کرتا تھا، لوگوں میں اسی کے خلاف جذبہ نفرت پھیل جاتا تھا اور یہ ایک قدرتی امر ہے)
بادشاہوں اور حکمرانوں کی طرف یہود کا رویہ یہ تھا۔ کہ جنگ و جدال کے واسطے ان کو قرضہ دیتے رہتے تھے۔ ان کی دیگر جائز و ناجائز ضروریات و خواہشات کو پورا کرتے رہتے تھے، ان کو فضول خرچی اور عشرت پسندی پر اکساتے رہتے تھے اور اچھی طرح سے گمراہ اور مقروض کر دینے کے بعد ان کو ایسا بنا لیتے تھے کہ بغیر یہودیوں کے ان کا گذارہ مشکل ہو جاتا تھا۔ ان "خدمات" کے عوض بھاری سود کے علاوہ جا و بے جا مراعات بھی حاصل کر لیتے تھے۔ ایسے حکمران بھی قدرتی طور پر یہود کی حمایت کرتے تھے۔ ان حالات میں ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ باشندگان ملک کو اپنے حقوق منوانے کے لئے کس قدر جد و جہد کرنی پڑتی ہوگی۔ اس زمانے میں یہود کے خلاف حکمرانوں سے کوئی بات منوا لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ضرورت پڑنے پر لاؤ لشکر سے بھی یہودیوں کی محافظت کی جاتی تھی۔ لوآرا کے مقام پر یہودیوں کی ہتک کرنے والوں کو اس سختی سے سزا

دی جاتی تھی گویا اس نے کسی معزز شخص کی عزت پر ہاتھ اٹھایا ہو، وہاں یہودی ساہوکاروں کو گرفتار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہاں ان کے تجارتی مال پر کوئی محصول نہیں تھا۔ ٹوڈیلا میں تو شاہ سانچو دانشمند نے ایک قلعہ یہودیوں کے سپرد کر دیا تھا۔ کہ اس میں حفاظت سے رہیں، اس کے علاوہ جو جائداد یہودیوں کو ورثہ میں ملتی تھی اس میں ۱/۱۰ دسوند نہیں لی جاتی تھی۔ جب کوئی یہودی کسی عیسائی کا مقروض ہوتا تو مؤخر الذکر کے لئے لازمی تھا کہ وہ شہادتیں پیش کرے جن میں سے ایک یہودی ہو۔ ۱۲۳۳ء میں ٹوڈیلا میں یہود کے خلاف سخت فساد برپا ہو گیا، لوگوں کو نیا آئین حکومت اور نئے حقوق دئے گئے تب کہیں یہ فتنہ فرو ہوا۔ مگر تھوڑے عرصہ کے بعد پھر وہی حال ہو گیا نوبت یہاں تک پہنچی کہ نوآرا کا شاہی خاندان بھی اس قدر مفلس ہو گیا۔ کہ ایک دفعہ انھیں شام کا کھانا بھی میسر نہ آیا اور انھوں نے یہودیوں سے غلہ ادھار لے کر گذارہ چلایا۔ اب اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ بنی اسرائیل کو اپنے محسنوں کے حال زار پر رحم آیا ہوگا۔ تو ہم سخت غلطی کریں گے انھوں نے الٹا اپنی شرح سود کو اور تیز کر دیا۔ یہودی مورخ کیسر لنگ اس امر کا اعتراف کرتا ہے "ہم اس امر سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس وقت یہودیوں کی شرح سود انتہا کو پہنچ گئی، لوگوں نے سب کچھ گروی رکھ دیا۔ کسان نے اپنا ہل، جاگیردار نے اپنی جاگیر، بادشاہ نے جواہرات، پشپ نے خاتم و نگین،

تمام ممالک میں یہی حال تھا۔ شاہانہ فضول خرچیاں اور بیرونی شان و شوکت ایک طرف، اور یہودیوں کی ناقابل تسکین حرص و آز دوسری طرف، لازم و ملزوم چیزیں ہو گئیں۔ بالآخر سوائے جبر و تشدد کے اور کوئی طاقت ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہ کر سکی، مگر اس کی قیمت لوگوں کو ادا کرنی پڑی، مارٹن لوتھر لکھتا ہے" لوگ کہتے ہیں کہ یہودیوں کے بغیر حکومت کو چارہ اس لئے نہیں کہ وہ بڑی بڑی رقمیں قرض دے سکتے ہیں۔ مگر یہ رقمیں آتی کہاں سے ہیں؟ اپنی گرہ سے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ خود لوگوں اور ان کے حکمرانوں کی جیب سے۔ روپیہ رعایا کا ہے مگر یہودی مفت ہی میں لوگوں کا خون چوستے ہیں۔ کیا وہ ہماری سادہ لوحی پر ہماری پیٹھ پیچھے ہنستے نہ ہوں گے؟"

بنیادی قومی تعلیم میں سیر کی اہمیت

(محمد نذیر صاحب - استاد تعلیمی مرکز - جامعہ)

(یہ مضمون گذشتہ مضمون (نمبر۱) کی فہرست کے نمبر۱ کی تشریح میں لکھا گیا ہے۔
اس میں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ بچوں نے مشاہدے کے لئے خود سوالات قائم کئے ہیں اور ان کا مشاہدہ اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ انھوں نے بہت غور و فکر کے بعد پروگرام بنایا ہے۔)

بنیادی قومی تعلیم میں بنیادی اور ضمنی حرفے کرانے کے سلسلے میں بچوں کو کئی مرتبہ تعلیمی مشاہدہ اور تعلیمی سیر کے لئے لے جانے کا موقع پیدا ہوگا۔ اس سے حرفوں کے کرانے اور سیر سے متعلق مضامین کے مطالعہ کرانے میں کافی مدد مل سکے گی۔

چھوٹے بچے سیر یا تفریح کا نام سنتے ہی ایک خاص دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ فطرتی طور پر اس کے شوقین ہوتے ہیں اس لئے کہ ایسا کرنے سے ان کی کئی ایک جبلتیں تسکین حاصل کرتی اور نشو و نما پاتی ہیں۔ گو ہمیں بچوں کی سیر کے فطری جذبے میں بظاہر کوئی مقصد معلوم نہیں ہوتا لیکن ایسا نہیں ہے۔ وہ اپنے طور پر بہت سی باتیں سوچ لیتے ہیں اور دوران سیر میں انھیں عملی جامہ پہناتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیر کرنے کے وقت جس قدر باتیں وہ سیکھتے ہیں ان کا اندازہ ہم کو نہیں ہو سکتا۔ لیکن پڑھائی کے دوران میں جب بچے اپنے کئے ہوئے مشاہدہ کا اعادہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ باتیں بچے کے مشاہدہ میں آگئی ہیں۔ بچوں کے اس قسم کے مشاہدے گو بے ترتیب اور بے مقصد ہوتے ہیں لیکن مدرسہ میں بامقصد پڑھائی کے دوران میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ جماعت کے کئی بچوں کی بیان کی ہوئی باتیں جب جمع کی جاتی ہیں تو استاد کی رہنمائی میں وہ باترتیب اور بامقصد بیان کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور اس طرح بچوں کی

تجسس اور رازجوئی کی فطری صلاحیتیں اپنے کئے ہوئے مشاہدے کے بعد استاد کی رہنمائی سے صحیح راستہ پر لائی جا سکتی ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک صحیح واقفیت میں اضافہ اچھے مشاہدے اور کامیاب تجربات کے ذریعہ ہوتا ہے۔ بچے کی قوت مشاہدہ کی جتنی اچھی تربیت کی گئی ہوگی اور جتنے کامیاب اور تخلیقی تجربات کئے گئے ہوں گے واقفیت اتنی ہی ٹھوس، وسیع اور پر از صحیح معلومات ہوگی۔ بچے سیر کرنے کے دوران میں جن دلچسپیوں کا اظہار کرتے ہیں انھیں تعلیمی مفاد کے لئے استعمال کرنا بہترین طریقہ تعلیم ہے۔ اس دلچسپی کو بامقصد بنانا اور بچوں کی آمادگی کا بغور مطالعہ کرتے رہنا اور مناسب وقت پر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا بنیادی قومی تعلیم کے استاد کے لئے بے حد ضروری ہے۔ مثال کے طور پر بچہ ہر آنے والے مہمان سے پیار کرنے لگتا ہے اور مراجعت کے وقت اس کے ہمراہ جانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ کیا ایک دو دن میں اس کو مہمان سے اتنی ہی محبت ہوگئی تھی جس کا اس نے اظہار کیا؟ نہیں بلکہ فوری دلچسپیوں کے ماتحت اسے تو اسٹیشن کا ہنگامہ، ریل کا سفر اور انواع و اقسام کے لوگ دیکھنے مقصود ہیں۔ کیونکہ وہ فطری طور پر ایسا کرنے کے لئے مجبور رہے۔ بچے کی اس قسم کی اپج اور فوری دلچسپیوں کو ایک خاص سلسلے میں منسلک کر کے اور بامقصد بنا کر زیادہ سے زیادہ تعلیمی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ میں ذیل میں اس بات کو درج کرتا ہوں کہ گتے کے کام میں کیونکر اکثر سیر کے لئے مواقع پیدا ہوتے رہے اور ان سے کس طرح تعلیمی فائدہ حاصل کیا گیا۔

جہاں جہاں بنیادی قومی تعلیم کے تجربے کئے جا رہے ہیں۔ وہ لوگ بخوبی جانتے ہوں گے کہ بچوں کو عملی کام میں کتنی دلچسپی ہوتی ہے اور وہ کہاں تک تخلیقی اور تعمیری سرگرمیوں میں مشغول نظر آتے ہیں اور یہ بھی کہ وہ اپنی قوت تجسس کی بنا پر سوالوں کی کس قدر بوچھار کرتے ہیں۔ ان کی اس قسم کی جبلتوں کو سیر کے ذریعے بہترین طور پر تسکین دی جا سکتی ہے۔

ان ضمنی کاموں یا بنیادی حرفوں کے لئے دو قسم کی سیر کرائی جاتی ہے۔ ایک وہ جس کا تعلق

کسی گذشتہ سبق یا کام سے ہے اور دوسری وہ جو بچوں میں کسی کام کے لئے تحریک پیدا کرنے کے لئے کی گئی ہو۔ گویا کبھی سیر کام کے سلسلہ میں اور کبھی کام سیر کے ماتحت کرائے جاتے ہیں۔

گتّے کے کام میں سیر کے لئے مواقع اور ان کی تیاری :-

استاد کام شروع کرانے سے پہلے بچوں کی تجاویز طلب کرکے سال بھر کا پروگرام مرتب کرے یعنی کون کون سے ماڈل تیار کئے جائیں۔ کون سا پہلے ہو اور کون کون سا بعد میں؟ اور اس کی تکمیل کے لئے کون کون سی اشیا درکار ہیں؟ اس طرح ایک طویل فہرست تیار ہو جائے گی۔ بچے کاموں کی فہرست مرتب کرانے کے دوران میں عملی طور پر سوچنے اور لکھائی وغیرہ کی کافی مشق کریں گے۔

مثال کے طور پر ابتدائی چہارم کے طلباء نے کثرت رائے سے فائل بنانا پسند کیا۔ اب استاد بچوں کی توجہ اس طرف مبذول کرا سکتا ہے کہ ہم اس کا سائز ایسا رکھیں جس میں نہ تو گتا ہی ضائع ہو۔ نہ ابری اور نہ کاغذ۔ اس کام کے لئے بچوں کو گتے اور ابری وغیرہ کی پیمائش کی ضرورت ہے۔ لیکن فل اسکیپ کاغذ کی ابری اور گتا کسی صورت میں بھی ایسا نہیں کاٹا جا سکتا کہ ان میں سے کوئی چیز ضائع بھی نہ ہو اور دیگر کاغذات اس میں بآسانی رکھے جا سکیں۔ اس وقت استاد کی رہنمائی کی ضرورت ہے' فرض کر لیجئے اس نے تحریک کے طور پر تبلا دیا کہ اخباروں۔ رسالوں اور رجسٹروں کے کاغذوں اور سائزوں میں فرق ہوتا ہے۔ بچے فوراً سمجھ جائیں گے کہ کاغذ محض ایک ہی قسم کا نہیں ہوتا بلکہ اس کی کئی ایک قسمیں ہیں اور کئی ایک سائز ہیں' اب ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس کے متعلق مزید واقفیت حاصل کی جائے۔ لہٰذا فوراً کاغذی کی دکان کا خیال آتا ہے۔ اس وقت اگر سیر کا پروگرام مرتب کیا جائے تو ایک لفظ سیر کی خوشی دوسرے حصول مقصد بچوں کے لئے بے حد دلچسپی اور خوشی کا باعث ہو جاتے ہیں۔ لیکن یوں ہی کاغذی کی دکان پر چلے جانا اور کاغذ کے مختلف سائز دریافت کرکے لوٹ آنا زیادہ مفید نہیں ہوگا۔ دیہاتی مدارس کے لئے تو ایسا ممکن بھی نہیں کہ بات بات پر سیر کا پروگرام مرتب کرتے رہیں اور آئے دن شہر آنے جانے کی

زحمت برداشت کریں۔ سیر کے لئے ایک دن نہیں بلکہ ہفتوں پہلے تیاری شروع ہونی چاہیئے سیر کے نام اور اس کی امید کی جو دلچسپی بچوں میں موجود ہے اس سے اس اثنا میں بے حد فائدہ اٹھایا جائے۔ کاغذ کے متعلق مختلف سوالات کئے جا سکتے ہیں مثلاً یہ کہاں بنتا ہے؟ کس چیز سے بنتا ہے؟ کیسے بنتا ہے؟ اس کے مختلف اوزان کا کیا حساب ہے؟ مختلف کاغذوں کے نام کیا ہیں؟ مختلف کاغذوں کے رنگ کیا ہیں؟ کاغذ کس کس کام میں لایا جاتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ

جب بچوں کے سامنے بہت سی چیزیں ہو جائیں تو ان کو یاد داشت کے طور پر لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس وقت ان مختلف عنوانوں کو ایک فارم کی شکل دی جا سکتی ہے جو ہر حال میں مفید ہے۔ اس سے تھوڑے وقت میں زیادہ واقفیت مل جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک کے دکان دار۔ کاریگر اور دیگر لوگ ابھی اس بات کو نہیں سمجھتے کہ بچوں کی اس قسم کی تعلیمی مشاہدہ میں مدد کریں۔ ان کی حسب ضرورت اور حسب استعداد واقفیت بہم پہنچا سکیں مختلف جگہوں پر اس قسم کی معلومات حاصل کرنے میں اگر دکان دار یا کارخانے والے کسی وجہ سے پوری واقفیت نہ بھی دیں تو اس قسم کی خانہ پری بنیاد کا کام دے سکتی ہے اور استاد جماعت واپس لاکر بچوں کو ان کے متعلق مفصل معلومات دے سکتا ہے۔

ذیل میں تعلیمی مرکز جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے درجہ ابتدائی چہارم کے طلبا رکی کاپیوں کا ایک ورق نقل کیا جاتا ہے۔ جو انھوں نے اپنی سیر کے ضمن میں کاغذ کے لئے تیار کیا تھا۔

اخباروں اور رسالوں کا کاغذ

نمبر شمار	نام کاغذ	وزن	سائز	قیمت فی پونڈ	تعداد کاغذ فی رم	کہاں کہاں سے آتا ہے	کس چیز سے بنتا ہے	کیفیت
(۱)	رف	۱۰ پونڈ	۱۸ × ۲۲	۲ر سے ۳ر تک	۴۸۰	ناروے سویڈن جرمنی زیکوسلواکیہ	بانس	
(۲)	"	" ۱۶	۲۶ × ۲۰	"	"		"	
(۳)	"	" ۲۱	۳۰ × ۲۰	"	"	"	"	کاغذ نمبر ۵ تا ۸ کاغذ نمبر ۱ تا ۴ کا دگنا سائز ہے
(۴)	"	" ۲۴	۲۹ × ۲۲	"	"	"	"	
(۵)	"	" ۲۸	۳۶ × ۲۲	"	"	"	"	
(۶)	"	" ۳۸	۴۰ × ۲۶	"	"	"	"	
(۷)	"	" ۴۸	۴۴ × ۲۹	"	"	"	"	
(۸)	"	" ۱۴	۲۷ × ۱۷	"	"	"	"	

اس نقشہ کی مانند کاغذ کے سلسلے میں بچوں نے کئی ایک دوسرے نقشے بھی تیار کئے تھے مثلاً فل اسکیپ کاغذ۔ ماؤنٹ پیپر۔ ڈرائنگ پیپر۔ رنگ دار کاغذ۔ رائٹنگ پیڈ پیپر۔ خاکی کاغذ مومی کاغذ۔ باریک کاغذ وغیرہ وغیرہ اور ان میں سے ہر ایک کے متعلق مندرجہ بالا عنوانوں کے ماتحت معلومات حاصل کی تھیں۔ اس قسم کی واقفیت مضامین کی مربوط پڑھائی میں بے حد مفید ثابت ہو سکتی ہے خصوصاً حساب میں اس قسم کے خاکوں کو دوران سیر میں پُر کرانے کے بعد اس پہ ایک طویل گفتگو کی ضرورت ہے۔ بچوں کی انفرادی۔ ٹوٹی پھوٹی اور ادھوری واقفیت کو جماعتی حیثیت دے کر مکمل کیا جا سکتا ہے اور اس کے بعد ایک مضمون مرتب ہو سکتا ہے۔ جس میں مقابلہ کی صورت پیدا کر دینے سے نتائج بہترین۔ خوشگوار اور کامیاب ہو سکتے ہیں۔ کاغذ کے متعلق بہترین واقفیت بہم پہنچانے کا اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ لہذا کاغذ کی تاریخ بیان کرنے کے بعد تاریخ اور جغرافیہ کے کئی ایک اسباق بچوں کو پڑھائے جا سکتے ہیں۔

آئیے ایک اور مثال پر غور کریں۔ بچہ چاقو سے گنا کاٹتا ہے لیکن برسات کا موسم ہونے کی وجہ سے چاقو زنگ آلود ہو کر کام کا نہیں رہتا۔ اس وقت اسے تیز کرانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بچے اس کو پتھری پر رگڑ رگڑ کر تیز کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن پھر بھی وہ پورے طور پر کام نہیں دیتا۔ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اسے سان پر چڑھا کر صاف اور تیز کیا جائے۔ استاد اس وقت چاقو کے متعلق زیادہ سے زیادہ گفتگو کرتا ہے۔ مثلاً اسے کون بناتا ہے؟ جب لوہار نے چاقو بنایا تو کیا اس نے سان پر چڑھایا ہوگا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ چاقو بنانے میں اور کس کس کاریگر نے مدد دی ہے؟ لوہار اور بڑھئی ہمارے لئے اور کون کون سی چیزیں بناتے ہیں؟ ہاتھ اور مشین کے کام میں کیا فرق ہے؟ لوہا کتنی قسم کا ہوتا ہے؟ چاقو کس طرح بنایا جاتا ہے؟ لوہے کی دیگر چیزیں کس طرح تیار کی جاتی ہیں؟ وغیرہ وغیرہ اس قسم کی گفتگو کے دوران میں بچے اپنے مشاہدے میں آئی ہوئی باتیں پیش کرتے ہیں اور سب کی بات اور استاد کا مشورہ مل کر ایک مکمل واقفیت کی صورت اختیار کر لیتا ہے اس وقت بچوں میں خواہ مخواہ یہ تحریک پیدا ہوتی ہے کہ وہ خود کاریگروں

کی دکانوں کا بغور مشاہدہ کریں۔ چنانچہ کئی ایک سمجھ دار طالب علم ایسا کرتے بھی ہیں لیکن جماعت کو اگر بحیثیت مجموعی دوران سیر میں ان باتوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی اجازت دے دی جائے تو دلچسپی کے ساتھ ساتھ حصول مقصد ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اس وقت پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے یعنی سیر کا پروگرام مرتب کرنا اور بآسانی معلومات حاصل کرنے کے لئے خاکے تیار کرنا وغیرہ اس قسم کے ایک سلسلے میں مرکز ہذا کے درجہ ابتدائی چہارم کے طلبار نے جو سیر کا پروگرام مرتب کیا تھا اس کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

(۱) بڑھئی کی دکان
(۲) لکڑی کا کارخانہ
(۳) لوہار کی دکان
(۴) ڈھلائی کا کارخانہ
(۵) لوہے کا سامان فروخت کرنیوالی دکان
(۶) لوہے کی کان
(۷) لوہے کی خراد
(۸) لکڑی کی خراد
(۹) گتّے کا سامان تیار کرنے والا کارخانہ
(۱۰) چاقو اور قینچی تیز کرنے والے کی مشین
(۱۱) کاغذی کی دکان

پروگرام مرتب کرنے کے بعد اس پر نظر ثانی کی گئی اور وہ باتیں نکال دی گئیں جن کا اس وقت عمل میں لایا جانا مشکل تھا مثلاً لوہے کی کان؛ گو بچوں کی دلچسپی زیادہ تھی لیکن جب روپے کی فراہمی کا سوال ان کے سامنے آیا تو انھوں نے معمولی غور و فکر کے بعد اس کو ملتوی کر دیا۔ باقی جگہیں دیکھنے کے لئے باری باری ہر ایک مد پر غور ہونے لگا۔ ہر ایک مد کے لئے کاپی کے الگ الگ صفحوں پر بچوں کے مشورے سے خاکے تیار کئے گئے جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ ان میں صرف عنوانات کو درج کیا گیا ہے۔ ٹِپّہ کرنے کا طریقہ تو آپ "اخباروں اور رسالوں کا کاغذ" کے خاکے میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

بڑھئی کی دکان کا مشاہدہ:۔

(۱) کس قسم کا لکڑی کا کام ہوتا ہے؟

(۲) کس اوزار سے کیا کام کرتے ہیں ؟
(۳) کس قسم کی لکڑی استعمال کرتے ہیں ؟
(۴) وہ لکڑی کہاں سے منگواتے ہیں ؟
(۵) کاریگر کتنے ہیں اور ان سے کیا کام لیتے ہیں ؟

لوہار کی دکان کا مشاہدہ :-

(۱) لوہے کا کس قسم کا کام ہوتا ہے ؟
(۲) کون سے اوزار کس کام کے لئے استعمال کرتے ہیں ؟
(۳) لوہا کہاں سے منگاتے ہیں ؟
(۴) کاریگروں کی تعداد کتنی ہے ؟
(۵) کونسا کاریگر کیا کام کرتا ہے ؟
(۶) کاریگروں کی مزدوری روزانہ کیا ہے ؟

لکڑی کا کارخانہ :-

(۱) کارخانے میں کون کون سی لکڑی موجود تھی ؟
(۲) یہ لکڑی کہاں کہاں سے آتی ہے ؟
(۳) مختلف لکڑیوں سے کون کون سی چیزیں بنتی ہیں ؟
(۴) پہاڑوں یا جنگلوں سے لکڑی کس طرح لائی جاتی ہے ؟

ڈھلائی کا کارخانہ :-

(۱) مشینیں کس سے چلتی ہیں ؟
(۲) لوہا کس چیز میں پگھلایا جاتا ہے ۔ اور پگھلانے کے لئے کیا کیا چیزیں استعمال کرتے ہیں ؟
(۳) پگھلے ہوئے لوہے سے کون کون سی چیزیں ڈھلتی ہیں ؟
(۴) لوہے کو کیسے پگھلاتے ہیں ؟

(۵) لوہا کہاں سے لاتے ہیں؟

لوہے کا سامان فروخت کرنے والی دکان کا مشاہدہ:۔

(۱) اس کی دکان میں کون کون سی چیزیں موجود تھیں؟

(۲) کون کون سی دیسی اور کون کون سی ولایتی چیزیں بک رہی تھیں؟

(۳) مختلف چیزوں کے نرخ کیا تھے؟

(۴) کارڈ بورڈ کے لئے کوئی اور کارآمد چیز جو اس کے ہاں موجود ہو؟

لوہے کی خراد کا مشاہدہ:۔

(۱) مشین کس چیز سے چلتی تھی؟

(۲) کتنے کاریگر کام کر رہے تھے؟

(۳) ہر ایک کو اجرت یومیہ کیا ملتی تھی؟

(۴) یہ مشین کس ملک سے منگوائی گئی تھی؟

(۵) اس مشین کی قیمت کیا تھی؟

لکڑی کی خراد کا مشاہدہ:۔

(۱) مشین کس چیز سے چلتی تھی؟

(۲) کتنے کاریگر کام کرتے تھے؟

(۳) ہر ایک کی اجرت یومیہ کیا تھی؟

(۴) مشین کی بناوٹ کیا تھی؟

(۵) کیا چیز بنائی جا رہی تھی؟

(۶) مشین کی قیمت کیا تھی؟

کارڈ بورڈ کا کارخانہ:۔

(۱) کس کس وزن کا کارڈ بورڈ استعمال کرتے ہیں؟

(۲) کس وزن کے گتے سے کون سی چیز بناتے ہیں ؟

(۳) گتا کہاں کہاں سے منگاتے ہیں ؟

(۴) کیا کیا چیزیں بناتے ہیں ؟

(۵) کس کس سائز کی بناتے ہیں ؟

(۶) کون سی چیز کس حساب سے بیچتے ہیں ؟

(۷) کس کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں ؟

(۸) کس اوزار سے کیا کام کرتے ہیں ؟

(۹) کاری گروں کی تعداد اور ان کے کام۔

(۱۰) کاری گروں کو کیا مزدوری دیتے ہیں ؟

چاقو اور قینچی تیز کرنے والی مشین کا مشاہدہ :۔

(۱) مشین کس سے چلتی تھی ؟

(۲) اس کو زمین پر کس طرح لگایا گیا تھا ؟

(۳) اس کی بناوٹ کیا تھی ؟

(۴) کتنے آدمی کام کرتے تھے ؟

(۵) ان کی اجرت یومیہ کیا تھی ؟

(۶) کون سی چیز تیز کی جا رہی تھی ؟

ان نقشوں کے پیش کرنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ہر جگہ ایسے ہی مواقع پیش آئیں گے۔ بلکہ یہ ہے کہ پیدا ہونے والے موقعوں کو کس طرح ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

یہاں تک تو میں نے تعلیمی سیر کی تیاری پر روشنی ڈالی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کو عملی جامہ کس طرح پہنایا جائے۔ کیونکہ ایسا کرنے میں بہت سی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اس لئے حفظ ماتقدم کے طور پر ان کو بھی کمرۂ جماعت ہی میں طے کر لینا چاہیے۔ اس قسم کی بامقصد گفتگو بچوں میں آزادی کی روح اور

قوت استدلال کی تربیت کا باعث ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر بڑھئی کی دکان کو لے لیجئے، شہر کے بازاروں یا تنگ گلیوں میں تمام جماعت کا بیک وقت گزرنا اور پھر اس کی چھوٹی سی دکان پر جمع ہو کر واقفیت حاصل کرنا کس قدر دقت طلب کام ہے۔ البتہ گاؤں میں اس قسم کی دشواری نہیں ہوتی۔ نیز ہمارے ملک کے کاریگر جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں چونکہ ناخواندہ ہیں لہذا وہ بچوں کی حسب استعداد واقفیت بہم پہنچانے سے بھی قاصر ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بچوں کو دیکھ کر بہت پریشان ہوتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ تمام باتیں لکھ کر نہ معلوم کیا کریں گے۔ کہیں پولس میں ان تمام باتوں کی رپورٹ نہ کر دیں یا تمام واقفیت حاصل کر کے کہیں خود کارخانہ نہ کھول لیں۔ جانے سے پہلے دوکان داروں اور کارخانہ داروں سے کسی با اثر آدمی کے ذریعہ بچوں کو ان باتوں کے متعلق دکھلانے کا مسئلہ طے کر لینا چاہیئے۔

اس قسم کی مشکلات پر اگر بچے پہلے ہی سے غور کر لیں تو ان کے لئے اس قسم کے مشاہدہ کے لئے جانا عملی طور پر مفید ثابت ہوگا۔ درجہ ابتدائی چہارم کے طلباء نے جانے سے پہلے جو تجاویز بورڈ پر لکھوائیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ بچوں کو اگر کسی با مقصد کام کے ماتحت سوچنے کا موقع دیا جائے تو ان کے لئے کس قدر مفید ہوتا ہے۔

آیئے بچوں کی ان تجاویز پر غور کریں جو انھوں نے مشاہدہ کرنے کے متعلق مرتب کیں۔

(۱) جماعت کے چھ گروپ بنائے جائیں۔ ہر ایک گروپ ایک ہی قسم کی مختلف دکانوں پر جا کر معلومات حاصل کرے۔ ان میں سے ایک لکھنے والا ہو ایک پوچھنے والا اور باقی غور سے سنیں۔

(۲) جماعت کے چھ گروپ بنائے جائیں۔ ایک لوہار کی دکان پر ایک بڑھئی کی دکان پر اور ایک ڈھلائی کے کارخانے وغیرہ وغیرہ میں بھیج دیا جائے۔ ان میں ایک سوال کرنے والا ہو ایک لکھنے والا اور باقی سننے والے ہوں۔ سیر کے بعد سب لوگ اپنی اپنی رپورٹ تیار کر کے جماعت کو سنائیں ان رپورٹوں کی مدد سے ہر ایک طالب علم اپنی اپنی کاپی مکمل کر سکتا ہے۔

(۳) جماعت چھ گروپ پر مشتمل کر لی جائے۔ ہر ایک گروپ تجویز کردہ پروگرام کے مطابق بڑھئی

لوہار وغیرہ کی دکان پر پہنچ جائے اور مشاہدہ کرے۔اس کے بعد لوہار کی دکان والا بڑھئی کی دکان پر بڑھئی کی دکان والا ڈھلائی کے کارخانے میں اور کارخانے والا فرنیچر ہاؤس میں علیٰ ہذا القیاس پہنچ جائے۔ گویا دائرہ بن جائے جو مکمل ہونے کی صورت میں تمام جگہوں سے معلومات حاصل کرسکتا ہے۔

(۴) ساری جماعت کو بیک وقت ہر ایک چیز دیکھنا چاہیئے۔کیونکہ دیکھنے اور سننے میں بہت فرق ہے۔

اس وقت جماعت میں چار تجاویز تھیں اور ہر خیال کا طالب علم اپنی تجویز کو اہمیت دے رہا تھا۔ چونکہ اس جماعت کو میں اور نگراں صاحب سیر کرانے والے تھے لہٰذا نگراں صاحب نے میری موجودگی میں ان چاروں تجویزوں کے تاریک اور روشن پہلوؤں پر تبصرہ کیا۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجویز نمبر ۱ کثرت رائے سے منظور ہوئی۔کیونکہ دہلی میں ایک ہی قسم کی اور ایک ہی جگہ پر کئی ایک دکانوں کا مل جانا نہایت آسان تھا اس لئے تجویز میں تھوڑی سی ترمیم کرکے تجویز نمبر ۲ کو بھی داخل کرلیا گیا۔یعنی ڈھلائی کے کارخانے یا لوہے کا سامان بیچنے والی دکان کا مشاہدہ ساری جماعت ایک ہی وقت میں کرسکتی تھی۔ پروگرام مکمل ہونے کی صورت میں اگلے دن کے لئے سیر کا اعلان ہوگیا۔

یہاں پہنچ کر استاد پر ایک اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔یعنی اگلے دن بچوں کو پیدل یا لاری میں سوار کراکے سیر کی غرض سے جانا مناسب نہیں۔بلکہ مجوزہ مقامات پر پہلے ہی سے پہنچ کر طے کرلینا استاد کا فرض ہے۔ایسا کرنے سے ایک تو کام باآسانی ہوگا۔دوسرے پروگرام میں کسی قسم کی مزاحمت نہ ہوگی۔بچے پابندیٔ وقت جیسی نیک عادت کی مشق کریں گے۔یہ کام استاد کے لئے بھی ذاتی طور پر سرانجام دینا مشکل ہے۔ممکن ہوسکتا ہے کہ استاد اس مقام ماحول یا اس علاقہ سے واقف نہ ہو۔لہٰذا اسے کسی بارسوخ آدمی کی مدد حاصل کرنی چاہیئے۔گاؤں کا استاد تو اپنے اثر ورسوخ کی بنا پر یہ کام انجام دے سکتا ہے۔اس جماعت کے پروگرام کی تکمیل میں بھی ایسا ہی کیا گیا۔ہم لوگوں نے اپنے طور پر پہلے سے ہی ایک علیحدہ پروگرام تیار کرلیا تھا جس کا فائدہ یہ ہوا کہ

وقت مقررہ پر اسکول سے چلے اور عین چھٹی کے وقت اسکول میں واپس پہنچ گئے۔
سیر کے ذریعے بچے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں بشرطیکہ سیر کے متعلق کوئی خاص تیاری عمل میں لائی گئی ہو لیکن کیا سیر کے خاتمے پر استاد کا مقصد پورا ہو گیا؟ نہیں بلکہ اب وہ وقت ہے جب استاد اس حاصل کردہ واقفیت کو کسی کام میں لا سکتا ہے۔ بچوں کی حاصل کردہ واقفیت گو دیرپا اور مضبوط ہے لیکن کسی خاص سلسلے میں منسلک نہیں وہ ٹوٹی پھوٹی اور بے ربط واقفیت ہے۔ اس کے علاوہ ہر ایک طالب علم یکساں واقفیت نہیں رکھتا۔ اس واقفیت کو مستقل اور باترتیب بنانے کے لئے ضروری ہے کہ کمرۂ جماعت میں اس قسم کے سوال کئے جائیں جن سے ان کی واقفیت کا اعادہ ہو۔ اور اسی تکرار میں وہ کوئی منطقی صورت اختیار کرلے۔ یا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ بچوں سے انفرادی طور پر سیر کا حال سنا جائے۔ سنانے والا بچہ استاد کی میز کے پاس کھڑا ہو کر اور جماعت سے مخاطب ہو کر گفتگو کرے۔ اس کے ٹوٹے پھوٹے جملے یا بھولی ہوئی باتیں استاد پوری کرتا جائے۔ اس طرح جماعت کے سامنے چند بچوں کی مدد سے سیر کی تمام کیفیت دوبارہ پیش کی جا سکتی ہے تیسرا طریقہ ڈرامہ ہے اگر وقت ہو تو اسی سیر کے اعادہ کے لئے کوئی ڈرامہ دیا سکتا ہے جس سے سیر اور سیر کے متعلقات اچھی طرح بچوں کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔
ہم نے اپنے پروگرام کے اختتام پر جو طرزِ عمل اختیار کیا ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔
میں نے اور نگراں صاحب نے مل کر یہ اسکیم تیار کی کہ بچوں سے دو قسم کے مضامین لکھوائے جائیں یعنی ایک تو وہ ہوں جو ہر ایک پیشہ ور اور مقام کی خصوصیات پر روشنی ڈالیں اور دوسرے وہ جو سرسری طور پر سیر کے متعلق ہوں۔ چنانچہ ذیل کے مضامین لکھوائے گئے۔
مضامین خصوصی:۔ بڑھئی۔ لوہار۔ لوہے کا کارخانہ۔ فرنیچر ہاؤس وغیرہ وغیرہ۔
مضامین عمومی:۔ سیر کی تیاری۔ دوران سیر میں کیا کیا دیکھا۔ سیر میں ہماری شرارتیں۔
چھوٹے بچوں کا ذخیرۂ الفاظ تو کم ہوتا ہی ہے لہٰذا ابتدائی چہارم کے طلبا سے مکمل طور پر اظہار خیال کی توقع کرنا مشکل تھا۔ لہٰذا ان کی واقفیت کو ترتیب دیتے وقت مختلف مضامین کے لئے

اشارات تجویز کر لئے گئے۔ تاکہ بچے ان کی مدد سے باآسانی مضامین لکھ سکیں۔ ذیل میں چند ایک مضامین کے اشاروں کے خاکے تحریر ہیں۔

I لوہے کا کارخانہ:۔

(۱) تیاری:۔ ا۔ موقع۔ ب۔ گفتگو۔ ج۔ پروگرام میں اس کو کس طرح شامل کیا گیا۔
د۔ تیاری (خاکے وغیرہ)
(۲) سیر کے قوانین۔
(۳) پروگرام کی تقسیم۔

II سیر:۔

ا۔ روانگی۔ ب۔ جو جو مقامات دیکھے گئے۔ ج۔ مختصر حال۔ د۔ شرارتیں۔ ہ۔ واپسی۔
مندرجہ بالا مضامین ہر ایک طالب علم نے لکھے۔ بچوں کی تحریر کے چند اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ تاکہ قارئین سمجھ سکیں۔ کہ بچے اس قسم کی رہنمائی میں کتنی آسانی سے اظہار خیالات اور برجستگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

لوہے کا کارخانہ:۔" ہماری جماعت کارڈ بورڈ کا کام کرتی ہے۔ ہم چاقو سے گتے کو کاٹتے ہیں ایک دن ہماری جماعت میں ذکر آیا کہ چاقو بنانے میں کن کن کاری گروں نے ہماری مدد کی ہے۔ ماسٹر صاحب نے بڑھئی اور لوہار کے متعلق اور بھی بہت سی باتیں بتائیں۔ دوران گفتگو میں یہ ذکر آگیا کہ یہ دونوں کاری گر ہمارے لئے اور کیا کیا بناتے ہیں تو ہماری جماعت نے بورڈ پر ایک لمبی فہرست لکھوا دی۔ جب ہماری جماعت میں سیر کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی تو ہم نے مناسب خیال کیا کہ لوہے کے کارخانے کو بھی اس میں شامل کرلیں۔ چنانچہ ہم نے اسے بھی پروگرام میں شامل کرلیا۔ سیر کے روز پونے نو بجے لاری میں بیٹھ کر باڑے ہوتے ہوئے پہاڑی دھیرج پہنچے جہاں لوہے کا کارخانہ تھا اور اس کا نام خراد کی مشین بھی ہے جو کہ بجلی کے ذریعہ چلتی ہے وہاں ایک سان کا پتھر تھا۔ وہ پرزوں اور اوزاروں کو تیز کرتا تھا۔ وہ پتھر بہت ٹھنڈا تھا۔ وہ مشین

لوہے کو چھیلتی تھی۔ کارخانہ کے ایک طرف لوہے کا کام اور دوسری طرف لکڑی کا کام ہوتا تھا۔"

سیر :-

دوران سیر میں ہماری شرارتیں :- (۱) سڑک پر دوڑتے تھے۔ (۲) دکانوں پر سے چیزیں خرید کر سڑک پر کھاتے تھے۔ (۳) لالہ سری رام کی دکان پر جب گئے تو لڑکوں نے چنے لاکر جگالی شروع کر دی۔ (۴) بغیر اجازت لوگوں کی چارپائیاں بچھاکر بیٹھ گئے۔ (۵) چاروں طرف گھومتے تھے (۶). لاری میں شور مچاتے تھے۔ (۷)۔ ماسٹر صاحب کا کہنا نہیں مانتے تھے۔

ہماری تیاری اور تجاویز جہاں تک تعلیمی لحاظ سے کامیاب رہیں وہ تو آپ ملاحظہ فرما چکے اب آخر میں صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ بچوں نے اس قسم کے مشاغل کو جاری رکھنے کے لیے قدرتی طور پر استاد کو مزید تعلیم کے لیے کتنے مواقع فراہم کر دیے۔ ذیل میں محض ان موقعوں کو قلم بند کرتا ہوں جن سے باآسانی تعلیمی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ ان کی تشریح اور تفصیل اگر پھر کبھی موقعہ ہوا تو ہدیہ ناظرین کروں گا۔

(۱) جب لاری پہاڑی پر سے گزر رہی تھی تو ایک بچے نے کہا۔ آہا جی! اب تو ڈرائیور صاحب کو بہت سا پٹرول پھونکنا ہوگا۔

(۲) ڈرائیور صاحب نے سڑک کے موڑ پر لاری آہستہ کر کے موڑی۔ فوراً ایک طالب علم نے کہا" ماسٹر صاحب!" ایک دن ڈرائیور صاحب نے جو تیز لاری موڑ دی تو ہم سب لوگ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے"۔

(۳) ماسٹر صاحب! لاری میں زیادہ پٹرول خرچ ہوتا ہے یا کار میں؟

(۴) بچے موٹر میں رفتار بتانے والی سوئی کو بغور دیکھ رہے تھے۔ جونہی لاری تیز یا ہلکی ہوتی وہیں ایک دوسرے کو رفتار بتانے لگتے۔

(۵) لاری کی اگلی سیٹ سپرنگ دار تھی۔ میں اس پر بیٹھا ہوا موٹر کی معمولی حرکت پر اچھل جاتا تھا۔ لڑکے آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ دیکھو! ماسٹر صاحب خوش ہو رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سپرنگ سے واقف ضرور تھے۔

(۶) ایک بچے نے بتایا کہ ایک دن ہم لاری میں سو گئے۔ جب ڈرائیور صاحب کو کسی نے اطلاع دی تو انھوں نے چلتی لاری ایک دم روک لی زور کا جھٹکا لگا اور ہم دھم سے دو سیٹوں کے درمیان آرہے۔ اس پر ایک زور کا قہقہہ ہوا ہم ندامت سے سر نہ اٹھا سکتے تھے۔

(۷) لوہے کے کارخانوں کا مشاہدہ کراتے وقت مستری صاحب نے بتایا کہ ہمارا انجن ایک ہارس پاور کا ہے۔

(۸) کاغذ کی دکان پر منیم نے بتایا کہ فلاں کاغذ ناروے اور سوئیڈن سے بن کر آتا ہے۔ کیونکہ وہاں جنگلات پائے جاتے ہیں۔ یہ کاغذ ایک قسم کی لکڑی سے بنایا جاتا ہے۔

(۹) ایک بچے نے دریافت کیا کہ ہماری لاری سے چنگی کیوں نہیں لی جاتی؟

(۱۰) اسکول کی لاری پر اگر لڑکے زیادہ ہوں تو چالان کیوں نہیں ہوتا؟

(۱۱) ماسٹر صاحب برف کا کارخانہ دکھا دیجئے۔

ارشادات جگر

(۱)

فتنہ روزگار میں امن ہے کیا قرار کیا
حاصلِ زیست غم سہی غم کا بھی اعتبار کیا

عشق کمالِ ہوش ہے، ہوش سے ننگ و عار کیا
سینۂ چاک چاک کیوں، دامن تار تار کیا

جان ہے کس شمار میں، جان پہ اختیار کیا
ہو چکے ان کے جب ہمیں، ان پہ کریں نثار کیا

فطرتِ شوق کی قسم، غیرتِ عشق کی قسم
دولت دو جہاں سہی، دولت مستعار کیا

تیری نصیحتیں بجا۔ یہ تو بتا کہ ناصحا
اور ہے عشق کے سوا مقصد حسن یار کیا

عشق خزاں مزاج سے، لطفِ جمال پوچھئے
جس کی نظر ہو خود بہار اسکے لئے بہار کیا

ناز سے مسکرا کے دیکھ چشم حیا اٹھا کے دیکھ
دل سے حریف کے لئے نیچی نظر کا وار کیا

سوز تمام چاہیئے رنگ دوام چاہیئے
شمع تہ مزار ہو، شمع سرِ مزار کیا

میں نے کیا ہی جرم عشق مجھ سے ہوئی خطائے شوق
خواہش عفو کس لئے بخششِ حسن یار کیا

منزلِ عشق میں جگرؔ غیر تو پھر بھی غیر ہیں
دل کا بھی اعتماد کیوں، اپنا بھی اعتبار کیا

۱۸ اکتوبر ۳۹ء

(۲)

وہی اس نظر میں ہیں کھپ جانے والے / جو سینوں پہ ہیں برچھیاں کھانے والے

شکن کاش پڑ جائے کوئی جبیں پر / پشیماں بہت ہیں ستم ڈھانے والے

بہ غور اپنی جانب بھی اے کاش دیکھیں / مرے حال پر رحم فرمانے والے

سراپا محبت بنے جا رہے ہیں / سلامت رہیں ان کو بہکانے والے

مری طاقت ضبط کی خیر یارب / کرم پر تلے ہیں ستم ڈھلنے والے

جو ہیں خاص چشم و چراغ محبت / وہ آنسو نہیں ہیں نظر آنے والے

ترے اک اشارے پہ ساکن کھڑے ہیں / نہیں کہہ کے سب سے گذر جانے والے

ترے حسن کا راز کیوں کر چھپاؤں / مرے دیدہ و دل پہ چھا جانے والے

محبت سے انکار کب تک کہاں تک
مرا نام بھی سن کے شرمانے والے

۱۵ر اکتوبر ۱۹۳۹ء

تنقید و تبصرہ

(تنقید و تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا چاہئیں)

ابو الخمر:۔ ٹالسٹائے کی مشہور تمثیل (THE FIRST DISTILLER) کا ترجمہ ہے، جسے حضرت مجنوں گورکھپوری نے کیا ہے۔

کتاب میں ٹالسٹائے نے اپنی مخصوص انداز میں شراب کے مہلک اثرات دکھائے ہیں ڈرامے کو شروع اس طرح کیا ہے کہ شیطانوں کا سردار۔ اپنے ماتحتوں سے ان کی کارروائیوں کی تفصیل دریافت کر رہا ہے۔ تمام شیطان اپنی اپنی کامیابی کی تفصیل سے بیان کرتے ہیں لیکن جس شیطان کے سپرد کسانوں کو ورغلانا ہے وہ نہایت مایوسی سے جواب دیتا ہے کہ میں ان کے پاک دلوں پر قبضہ نہیں کرسکا۔ سردار اسے سخت سزائیں دیتا ہے، تو وہ آئندہ اپنے فرائض کو زیادہ تن دہی سے انجام دینے کا وعدہ کرتا ہے اور اپنے سردار سے اجازت لے کر کسانوں کی دنیا میں جاتا ہے۔ اپنی عیاری سے انھیں شراب کا غلام بنالیتا ہے۔ ان کی زندگی بہشت سے دوزخ بن جاتی ہے۔

حضرت مجنوں نے ترجمہ بھی بہت دلچسپ انداز میں کیا ہے، زبان ستھری، بامحاورہ اور ادبی ہے۔

کتاب انوار بک ڈپو لکھنؤ سے ۶ میں مل سکتی ہے۔ لیکن اگر اس کی قیمت ۴ ہوتی تو زیادہ بہتر تھا۔

زندگی کے کھیل۔ حضرت ل۔ احمد اکبر آبادی کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ ہے، کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ کتاب عظیم اظہر، منڈولہ، آگرہ اور آر می پریس شملہ سے عہ میں مل سکتی ہے اس مجموعہ میں، بارہ افسانے ہیں، اور ان سب میں ہماری سماجی زندگی کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ل۔ احمد صاحب ایک کہنہ مشق ادیب اور افسانہ نگار ہیں اور ایک خاص قسم کے رنگین

طرز انشار کے مالک۔ اسی رنگینی کی جھلک افسانوں کے زیر نظر مجموعہ میں بھی جا بجا ہے۔
افسانے بعض بہت دلچسپ ہیں لیکن بعض میں انداز بیان کی طوالت کی وجہ سے دلچسپی کی کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔

حفیظ جونپوری:۔ یہ ایک ۲۴ صفحہ کا مختصر رسالہ ہے۔ جسے کاملؔ جونپوری نے مرتب کیا ہے شروع میں حفیظ جونپوری کا عکس تحریر ہے۔ دس صفحوں میں حفیظ مرحوم کے مختصر حالات ہیں اور کلام پر تھوڑا سا تبصرہ۔ لیکن دونوں کاموں میں تحقیق اور ذمہ داری سے کام نہیں لیا گیا ہے
کوئی ۴ اصفحات میں حفیظ کے کلام کا انتخاب ہے۔ انتخاب بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں حفیظؔ اچھے شاعر تھے اور ضرورت ہے کہ ان کے حالات اور ان کا کلام عام طور پر لوگوں کے سامنے آئے، کامل صاحب کو چاہئے کہ اس کام کو ذرا اور محنت اور ذمہ داری سے انجام دیں۔

حفیظ کا جو انتخاب اس رسالہ میں ہے اس میں بعض شعر اچھے ہیں ؎

وہ سخی ہے جو اہل حاجت کا
بھر دے دامن سوال سے پہلے

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

بھی جی چاہتا ہے منہ چھپا کر روئیے برسوں طبیعت خود بخود ایسی کبھی مغموم ہوتی ہے

پس پردہ:۔ منشی چندر بھوشن سنگھ کے افسانوں کا مجموعہ ہے، لکھائی اور چھپائی اچھی ہے کتاب پر جلد بھی بندھی ہوئی ہے، کتاب کی قیمت ۴ر ہے اور آزاد آفس کانپور مل سکتی ہے۔
مجموعہ میں کل سات افسانے ہیں۔ جن میں سے اکثر پر پریم چندر اور سدرشن کے رنگ کی جھلک ہے، لیکن پلاٹ اور فن کی دوسری نزاکتوں کے لحاظ سے وہ ان کے ہم پلہ

نہیں۔ کسی کی تمہید دلچسپ ہے تو کسی کا خاتمہ۔ طرزِ بیاں البتہ جگہ جگہ دلکش ہے اور سدرشن کا انداز بے حد نمایاں ہے۔ مثلاً

"گھمنڈی لال چپ تھے، راج رانی بڑبڑا رہی تھی، پتھر پیا دے پڑ رہے تھے۔"

"اتنے دنوں تک وہ پتھر کے نیچے دبی ہوئی دب گئی۔ اب اس کی چھاتی سے پتھر ہٹ گیا تھا اور آزادی کی ہوا نے اس کا رنگ نکھار دیا تھا۔"

"جنگل کی آگ پانی سے نہیں بجھتی"

سلسلۂ عصمت کے دو نمبر پیش نظر ہیں ۱۴۹ اور ۱۵۰

کپڑے کی چھپائی۔ مصنفہ اقبال احمد صاحب ۱۰ صفحات، لکھائی چھپائی معمولی، کپڑا چھاپنے کی صنعت کا حال اور اس کی مختلف ترکیبیں بیان کی گئی ہیں۔ چھاپنے کے طریقے رنگوں کے اقسام وغیرہ کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب ماہرینِ فن اور مبتدیوں دونوں کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ بڑے پیمانہ پر اس صنعت کو جاری کیا جائے۔ قیمت ۱۰ ار ملنے کا پتہ۔ عصمت بک ڈپو دہلی۔

دیہاتی گیت:۔ مصنفہ ڈاکٹر اعظم کریوی۔ تعداد صفحات ۸۲۔ چھ مختلف عنوانات کے ماتحت دیہاتی گیت جمع کئے گئے ہیں، اصل کے ساتھ صحیح اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے یہ گیت دیہاتی زندگی کی کیفیات نمایاں کرنے کے لئے نہایت اچھا ذریعہ ہیں، اگر اس قسم کے گیت وغیرہ بہت زیادہ جمع کئے جائیں تو نہ صرف ادبی حیثیت سے بلکہ تمدنی تاریخ کے لئے بھی بہت مفید ثابت ہوں گے۔ نیز اہلِ نظر کے لئے ان میں دلچسپی کا سامان بھی کافی موجود ہے۔ کیونکہ وہ فطرتِ انسانی کو بے نقاب حالت میں پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اعظم صاحب کی یہ دلچسپ کوشش ضرور قابلِ داد ہے۔ ایک بہت بڑی کمی کو انھوں نے پورا کیا۔ لکھائی چھپائی معمولی۔ قیمت آٹھ آنہ

جامعہ

زیرِ ادارت :- نورالحسن صاحب ہاشمی ایم۔اے۔(علیگ)

جلد ۳۳ - نمبر ۶	دسمبر ۱۹۳۹ سنہ ء	چندہ سالانہ صہ - فی پرچہ ۸/

فہرستِ مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی

نظریۂ انقلاب کے چند اہم پہلو

(محمد عبدالقادر صاحب ۔ بی ۔ ایس ۔ سی (آنرز) لندن لکچرار شعبۂ معاشیات ۔ جامعہ عثمانیہ)

دنیا ایک آزمائشی دور سے گزر رہی ہے ۔ سماج اب تک جن بنیادوں پر قائم رہا ہے انھیں ڈھایا جا رہا ہے اور نئی بنیادوں پر تعمیر کا کام شروع ہو گیا ہے ۔ آج کل ایک ایسا طبقہ موجود ہے (اور روز بروز لاکھوں اس طبقہ کے ہم خیال بنتے جا رہے ہیں) جو اس بات کی شدو مد کے ساتھ تلقین کر رہا ہے کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ سماجی نظام میں تبدیلیاں پیدا کرنے کے لئے باہمی گفت و شنید اور اصلاحی تدابیر کے طریقوں کو بحال رکھا جائے ۔ کیونکہ تبدیل شدہ حالات کے تحت یہ طریقے ازبس غیر موثر اور فرسودہ ہیں اور انقلاب ہی موجودہ دور کی گتھیوں کو سلجھا سکتا ہے ۔ دنیا میں جب اس خیال کے حامی کافی تعداد میں پیدا ہو گئے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ انقلاب کے سیاسی اور معاشی فلسفہ اور اس کے چند اہم جدید تاویلات کا جائزہ لیا جائے چنانچہ اس مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ نہ صرف انقلاب کے چند بنیادی اصولوں پر مختصر نظری بحث کی جائے بلکہ موزوں مثالوں کے ساتھ اس کے خاص خاص عملی پہلوؤں کو بھی واضح کر دیا جائے ۔ یہاں میرا یہ منشا نہیں ہے کہ کسی ایک انقلاب کو تفصیل کے ساتھ بیان کروں ۔ البتہ میں نے چند اہم انقلابوں کی طرف اشارے کئے ہیں تاکہ میرے موضوع کے ضروری عنوانات کی تفہیم میں آسانی ہو ۔ انقلاب کے پیدا کرنے کے بعد ہی انقلابی جماعت کو اپنی قوت مستحکم بنانے کے سلسلہ میں جن پیچیدہ ۔ دشوار گذار اور صبر آزما مرحلوں کو طے کرنا پڑتا ہے ۔ ان کا بھی ایک چھوٹا سا خاکہ کھینچا گیا ہے ۔ زیر بحث موضوع میں صرف سیاسی اور معاشی عناصر سے بحث کی گئی ہے ۔ اس سے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ مجھے مذہبی حکمیاتی اور فلسفیاتی محرکات کی اہمیت سے انکار ہے ۔ یہ تو مسلمہ امر ہے کہ انقلاب کے پیدا کرنے میں مذہبی تحریکات

حکیمانہ ایجادات اور فلسفیانہ تخیلات کا خاصہ حصہ ہوتا ہے۔ محض مضمون کی حد بندی کے خیال سے میں نے چند مقررہ عنوانات پر اکتفا کیا ہے۔

انقلاب کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لئے اس کے اور چند دیگر متجانس اصطلاحات کے درمیان تفریق ضروری ہے ورنہ ذہنی انتشار و پراگندگی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے عام بول چال میں ہمیں لفظ انقلاب کے علاوہ دو تین اور لفظوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے مثلاً بغاوت۔ بلوہ۔ شورش وغیرہ۔ گو ان سب میں چند مشترک عناصر پائے جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ہر ایک میں جداگانہ خصوصیات موجود ہیں۔ بغاوت (Rebellion) کا لفظ ہم اس وقت استعمال کرتے ہیں جب ارضی خود مختاری یا خط واری آزادی حاصل کرنے کی غرض سے رعایا کا ایک طبقہ شد و مد کے ساتھ حکومت کے خلاف اقدام کرے۔ چنانچہ بعض مصنفین نے سلطنت روما کے زوال کو صد ہا بغاوتوں کا ایک پیہم سلسلہ قرار دیا ہے یہ بغاوتیں مختلف اسباب کے تحت اور مختلف شدت کے ساتھ جاری رہیں۔ جن میں سے کچھ تو فوجی استبداد کی مخالفت میں تھیں اور کچھ انتظامی اور مالیاتی خرابیوں کو رفع کرنے کی غرض سے۔ جہاں تک دور جدید کا تعلق ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی بغاوتوں کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ ان میں بیشتر جذبۂ قومیت اور نظریہ قومی خود اختیاری (National Self Determination) کا اثر کارفرما رہا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بغاوت کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ مروّجہ حکومت کے بنیادی نظام کا قطعی استیصال کر دیا جائے۔

بلوہ یا دنگا (Riot) ایک عارضی لیکن تشدد آمیز اجتماعی فتنہ و فساد برپا ہونے کا نام ہے۔ خواہ یہ کسی خانگی فرد یا سرکاری حکام یا حکومتی اداروں کے خلاف ہو۔ لیکن اس مخالفت کا مقصد حکومت کی پائمالی یا مغلوبی نہیں ہوتا۔ یورپ میں پادریوں بادشاہوں۔ خاص خاص معاشی اور سیاسی اداروں کے خلاف اکثر و بیشتر ایسے بلوے ہوتے رہے ہیں۔

شورش (Insurrection) بھی اسی قسم کی تشدد آمیز تحریک کا نام ہے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ وسعت کے لحاظ سے مقابلتہً یہ ایک محدود چیز ہوتی ہے اور اس کا تعلق زیادہ تر مخالفت حکومت کی ابتدائی منازل سے ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کی حیثیت ایک مقامی انقلابی تحریک کی ہوتی ہے جو بہت ممکن ہے بعد میں چل کر مکمل اور باقاعدہ انقلاب کی شکل اختیار کرے لیکن فی الوقت اس کا مقصد اسی قدر ہوتا ہے کہ حکومتی مسلک میں چند ترمیمیں کروالی جائیں۔ یا چند حکام کی برطرفی عمل میں لائی جائے۔ لیکن یہ کوشش کبھی نہیں ہوتی کہ مروجہ حکومت کو تہ و بالا کر دیا جائے۔

مذکورۂ بالا بحث سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مندرجہ بالا تینوں قسم کی مخالفتوں (بغاوت بلوہ۔ اور شورش) میں ایک اہم مشترک عنصر یہ ہے کہ ان سب کا مقصد سماج کے سیاسی اور معاشی بنیادوں کو ڈھانا نہیں بلکہ ان کو برقرار رکھتے ہوئے چند تبدیلیوں کے لئے حکومت کو مجبور کرنا ہے۔ انقلاب کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس میں رائج الوقت سیاسی اور معاشی نظام کو تہ و بالا کرنے اور نئی بنیادوں پر ایک نئی عمارت قائم کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر انقلاب ایک تشدد آمیز اور مسلح کوشش ہے جو برسر اقتدار حکومت کے خلاف کی جاتی ہے تاکہ مملکت کے مسلمہ اور مروجہ مقاصد کا خاتمہ کر دیا جائے اور ان کے عوض مملکت کی بنیادیں انقلابی جماعت کے سیاسی اور معاشی فلسفہ پر قائم ہوں۔ یہ ایک ایسی تحریک ہوتی ہے جو نہ صرف ایک عظیم الشان اور سنسنی خیز واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اپنے نتائج کے لحاظ سے بھی اہم اور دیرپا اثرات کی حامل ہے۔

فطری طور پر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس قسم کی تحریک کوئی آسان چیز ہے جسے جب جی میں آئے شروع کر دیا جائے یا اس کے بھی کوئی خاص لوازم ہوتے ہیں جن کی عدم موجودگی میں انقلاب کا پیدا کرنا غیر ممکن بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انقلاب چند خاص حالات کا نتیجہ ہوتا ہے اور جب تک کہ یہ بدرجہ اتم موجود نہ ہوں انقلاب پیدا ہو نہیں سکتا۔ بہت

ممکن ہے کہ کچھ حالات ایسے پائے جائیں کہ ملک میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی جاتی ہو لیکن جب تک کہ سماج کی برائیاں پرامن اور اصلاحی طریقوں کے ذریعہ ناقابل علاج نہ بن جائیں اس وقت تک نہ انقلابی تحریک پنپ سکتی ہے اور نہ کامیاب انقلاب کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کی قبل از وقت تحریکات زیادہ سے زیادہ بغاوت۔ بلوہ۔ یا شورش کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں اور اس سے آگے بڑھنے نہیں پاتیں پس انقلاب کے پیدا کرنے میں صحیح موقع کی تلاش اور اس کا صحیح استعمال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

انقلاب اسی صورت میں ناگزیر ثابت ہوتا ہے جب سماج میں دو علیحدہ علیحدہ اور ایک دوسرے کے مخالف طبقے موجود ہوں یعنی ایک طرف تو قلیل التعداد لیکن ذرائع پیدائش پر قابض طبقہ اور دوسری طرف ایک کثیر التعداد لیکن مفلس اور نادار طبقہ اور پھر یہ کہ ان دونوں کے درمیان ایک وسیع خلیج تفریق حائل ہو چنانچہ انقلاب روس میں "پرولتاری" طبقہ نے اصل شاہی نظام کا خاتمہ کیا اور اپنے اغراض کے مطابق مملکت کی از سر نو تشکیل کر لی۔ اسی سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اختلافات بنیادی ہونے کے بجائے محض سطحی اور فروعی ہوں تو انقلاب کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ ایسی صورت میں مخالف گروہوں کے مابین مصالحت قائم ہونے کے زیادہ امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔

انقلاب کے پیدا ہونے کے لئے اختلافات کا محض موجود رہنا ہی کافی نہیں۔ بلکہ مظلوم اور زیر بار طبقہ کو اس کا بڑھتا ہوا احساس ہونا چاہیئے۔ یہی سبب ہے کہ کارل مارکس نے طبقہ داری شعور (Class Consciousness) پر بہت ہی زور دیا ہے لیکن ضروری ہے کہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ مجوزہ علاج کے سوا کوئی اور تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی تاریخ شاہد ہے کہ اقوام کی زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں جب زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات رائج الوقت معاشرتی نظام کے ذریعہ پوری نہیں ہو سکتیں۔ ایسی صورتوں میں معاشرتی نظام میں مقابلہ کی قوت کمزور ہو جاتی ہے اور بالآخر ترقی پذیر قوتوں کو فتح نصیب ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ انقلاب ایسی چیز نہیں جو دفعتہً نمودار ہو جائے۔ بلکہ یہ متعدد اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے جن کے پیدا ہونے اور رنگ لانے کے لئے بالعموم سالہا سال کی ضرورت ہوتی ہے۔ جاگیری نظام کے زوال اور "بورژوا" طبقہ کے آغاز ونشوونما کے لئے ایک مدت درکار ہوئی۔ اسی طرح "پرولتیاری" جماعت میں طبقہ واری شعور جو پیدا ہوا وہ نتیجہ ہے کئی سالوں کے مظالم اور مصائب کا جو مزدوروں کو اٹھانے پڑے۔

ایک اور اہم عنصر جو کامیاب انقلاب کے لئے ضروری ہے۔ وہ فوج کے طرزِ عمل سے متعلق ہے۔ مقتدر جماعت اپنی فوج کے ذریعہ انقلابیوں کے منصوبوں کو شکست دینے کی حتی الوسع کوشش کرے گی اور تاوقتیکہ خود فوج کا طرزِ عمل اپنے فرماں رواؤں کے ساتھ نہ بدل جائے انقلاب کی کامیابی کے بہت کم امکانات ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس کے لئے فوج میں خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہونی چاہیئے جو انقلابیوں کے ہم خیال ہوں اور جو حسب موقع مقتدر جماعت سے لڑنے کے لئے تیار رہوں۔ فوج کو بغاوت پہ ایسی وقت آمادہ کیا جا سکتا ہے جب خود فوج کو فرماں رواؤں سے سخت شکایتیں ہوں یہ چیز بہت ہی اہم ہے۔ کیونکہ بعض موقعوں پر فوج کی ذہنیت اور رجحانات کے متعلق غلط اندازے قائم کر لینے کی وجہ سے انقلابی جماعت کو ہزیمت اٹھانی پڑتی ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ موافق صورت حال کا پیدا کرنا دراصل اس چیز پر مبنی ہے کہ پہلے سے ہی فوج کو حکومت سے حقیقی شکایتیں ہوں اور اس سے انقلابی جماعت بر وقت اور صحیح فائدہ اٹھائے۔

فوج کے متعلق بحث کے ساتھ ہی "تشدد" کا مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے کوئی مقتدر جماعت اپنے ان اصولوں کو (جو کہ اس کے رگ وریشہ میں سرایت کر گئے ہوں) خیرباد کہنے کے لئے تیار نہ ہوگی تاوقتیکہ وہ ان کو بحال رکھنے کی کوشش نہ کر لے۔ اور اس غرض سے وہ ہمیشہ مسلح طاقت کو کام میں لاتی ہے۔ ایسی حالت میں مخالف جماعت بھی "ترکی بہ ترکی" جواب پر عمل کرتے ہوئے قوت کا جواب قوت سے دیتی ہے۔ دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ "تشدد"

اور قوت" کے استعمال کو بذاتہ غیر اخلاقی سمجھنا نہایت ہی غلط ہے۔ تشدّد کا استعمال اس حد تک جائز ہے کہ اس کے ذریعہ مظلوموں کو پنجۂ استبداد سے آزاد کر کے ایک بہتر نظام قائم کیا جا سکے۔ "قوت" اور "تشدّد" سے متعلق اصلی مسئلہ ان کے استعمال یا غیر استعمال کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ اس کو کس وقت استعمال کیا جائے اور کس حد تک۔

مذکورۂ بالا حالات کے علاوہ کچھ ایسے سامان بھی ہو سکتے ہیں جو انقلابی جماعت کے مقاصد میں مزید اعانت کا باعث بنیں۔ لیکن یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ لوازم انقلاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ناکام جنگ یا سخت اور تباہ کن قحط کی وجہ سے لوگوں میں بے چینی پیدا ہو سکتی ہے اور نتیجۃً انقلابی عمل میں آسانی ہو سکتی ہے۔ خصوصاً ان واقعات سے متوسط طبقہ کی وفاداری اور اطاعت شعاری کے جذبات متزلزل ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ طبقہ انقلابی جماعت کی مدد نہ کرے تو بھی اس کے غیر جانبدار رہنے کے زیادہ قرائن ہو جاتے ہیں۔ عوام کی بے چینی اور اضطراری کیفیت مقامی شورشیں اور دنگے عمارات عامہ پر یلغار سرکاری دستاویزات کا جلا دینا۔ ہڑتالوں کی کثرت احتجاجی جلوس وغیرہ طوفان انقلاب کی دیگر علامتیں ہوتی ہیں۔

انقلابیوں کا اصلی کمال مواقع کے صحیح استعمال اور پھر حکومت کی کل (جس کے ذریعہ حقوق قائم محفوظ رہتے ہیں) پر قبضہ جما لینے میں ہوتا ہے۔ نفسیاتی ماحول سے صحیح فائدہ بہت ہی اہم ہوتا ہے۔ اس لئے لینن نے بولشوک جماعت کو نومبر کی شورش کے وقت لکھا تھا کہ انقلابی ایسے موقع پر تاخیر سے کام لیں تو تاریخ ان کے فعل کو ہرگز معاف نہ کرے گی۔ انقلاب روس کے واقعہ میں ہمیں مواقع کے بر وقت استفادہ کی ایک بین مثال ملتی ہے۔ اس کے برعکس جنگ عظیم کے بعد انقلاب جرمنی مواقعوں کو کھو دینے کی ایک بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ "سوشل ڈیموکراٹس" (Social Democrats) نے اصلی مسئلہ کو نظر انداز کر دیا اور نظام قدیم کے ساتھ مصالحت کر لینا پسند کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جمہوریت جو جرمنی میں قائم

ہوئی زیادہ دیرپا ثابت نہ ہو سکی۔ پروفیسر لاسکی نے لکھا ہے کہ جرمانی جمہوریت کی شکست ہٹلر کے ذریعہ ۱۹۳۳ء میں نہیں ہوئی بلکہ اس سے پندرہ سال قبل "دستور ویمر" کے بنانے والوں کے ہاتھوں ہوئی یعنی جنگ کے بعد جو دستور جرمنی کے لئے مرتب ہوا اس میں جمہوریت کی آئندہ تباہی کے جراثیم موجود تھے۔

انقلاب کے اسباب کی تشریح کے بعد خود ان مسائل کا ذکر کرنا ضروری ہے جو دوران انقلاب میں پیش آتے ہیں۔ انقلاب کے آغاز پر جب مقتدر جماعت اپنی کمزور حالت کو محسوس کرتی ہے تو عوام کو چند رعایتیں عطا کرنے لگتی ہے۔ یہ چیز انقلابی محاذ میں تفرقہ اندازی کا باعث بنتی ہے۔ اس جماعت کا ایک حصہ ان عطا کردہ رعایتوں سے خوش اور مطمئن ہو جاتا ہے اور برسرِ پیکار فریق سے علیحدگی اختیار کر لیتا ہے اور اب ایک ایسی جماعت قائم کر لیتا ہے جو آئینی طریقوں پر اور "امن عامہ" پر زور دیتا ہے لیکن انتہا پسند انقلابیوں اور اس نئی رجعت پسند فریق میں برابر کشمکش جاری رہتی ہے۔ اگر آخر الذکر زیادہ طاقتور بنتی جائے تو ہر ایک مخالف انقلاب ـــــ (Counter Revolution) کے لئے راہ صاف ہوتی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اول الذکر اگر زیادہ طاقتور ثابت ہو تو پھر انقلابی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ لیکن انقلابیوں کے مسائل یہیں ختم نہیں ہو جاتے بلکہ دراصل دشواریوں کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ اس وقت جب انقلابی اپنی طاقت کو مستحکم بنانے میں مصروف رہتے ہیں رجعت پسند جماعت دوبارہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش شروع کرتی ہے۔ شاکی اور غیر قانع انقلابیوں کے جذبات کو بھڑکایا جاتا ہے اور ان کی مدد حاصل ہو جانے پر ملک میں دوبارہ ایک ایسی فضا پیدا کی جاتی ہے جس کے تحت بعض موقعوں پر انھیں ایک ایسا نظام قائم کرنے میں کامیابی ہو جاتی ہے جو قدیم نظام سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتا بلکہ جو ایک ترمیم شدہ حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ایسی صورت میں انھیں انتہا پسند انقلابیوں کے حملہ آور ہونے کا خدشہ ہمیشہ لگا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں ان انقلابیوں کو

جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کی اہمیت اصلی جنگ سے کہیں زیادہ ہوتی ہے یعنی انھیں ایک ایسے محاذ کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جس میں رجعت پسند اعتدال پسند اور ابن الوقت انقلابی ——— (Revolutionaries by Adoption) سب شامل رہتے ہیں طرفہ تماشا یہ کہ بیرونی حکومتوں کی مداخلت اور ان ملکی جماعتوں سے ان کا رشتہ قائم ہونے کا خدشہ ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اسی لئے انقلاب فرانس کے دوران میں ایک مجلس تحفظ عامہ ——— (Committee of Public Safety) قائم ہوئی تاکہ ملکی اور بیرونی رجعت پسند طاقتوں میں اتحاد نہ ہونے پائے۔

انقلاب کے بعد ہی ان مشکلات کا زمانہ ایک دور عبوری کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور فتوحات کو مستحکم بنانے کی خاطر "آمریت" کی ضرورت بھی پیش آتی ہے اور کسی قسم کی مخالفت روا نہیں رکھی جاتی۔ یہ دور آزمائش گزر جانے کے بعد خود اندرون ملک زندگی کے جملہ شعبہ جات کی ہیئت ترکیبی میں تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔ اور تھوڑی بہت رواداری سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ روس میں گو انقلاب ۱۹۱۷ء میں ہوا لیکن "معاشی نظم جدید" ——— (New Economic Planning) بعد میں قائم کیا گیا اور مخالفین کے ساتھ روادارانہ برتاؤ تو بہت بعد میں شروع ہوا۔

واقعاتِ حاضرہ کی تعلیم

(از جناب خواجہ احمد فاروقی صاحب)

مسز سروجنی نائیڈو نے ایک مرتبہ اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ :-

"ہندوستان کے عہدِ گزشتہ کی غلطی یہ تھی کہ اس نے اپنے آپ کو ماضی ہی میں محدود رکھا اور کبھی مستقبل کی طرف نظر نہیں دوڑائی۔ عہدِ موجودہ کی غلطی یہ ہے کہ اس نے ماضی کی طرف سے آنکھیں بند کرلی ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ معاملات کو سمجھنے کے لئے ماضی اور مستقبل دونوں ہی کے اوپر نظر دوڑانے کی ضرورت ہے لیکن اس سلسلہ میں حال کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس کو سمجھے بغیر ماضی و مستقبل کے واقعات کو صحیح طور پر سمجھنا محال ہے۔ اس میں ہمیں گزشتہ اور آئندہ حادثات کی جھلک نظر آتی ہے، ارتقا کی تمام داستانیں اسی میں پوشیدہ ہیں بلکہ یہ ایک ایسا جامِ جہاں نما ہے جس میں اگلے پچھلے سب واقعات نظر آتے ہیں۔

اس زمانے میں جب ماضی و مستقبل دونوں حال میں غرق ہوکر رہ گئے ہیں۔ ہماری اس سے بڑی بدقسمتی اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ ہم اپنے ماحول اور گرد و پیش کے حالات سے قطعاً بے خبر رہیں۔ انیسویں صدی کے آخر تک لوگوں کو ان تبدیلیوں کا مکمل احساس نہیں ہوا تھا جو رفتہ رفتہ تمام دنیا کو احاطہ کرتی جارہی تھیں، اور ہم ہندوستانیوں کو تو شاید آج تک ان تغیرات کا صحیح علم نہیں ہوسکا۔ اب دوری و نزدیکی کا سوال ہمیشہ کے لئے مٹ چکا ہے تمام ممالک ایک دوسرے کے ہمسایہ اور ایک بڑے کل کا جزو بن چکے ہیں اور یہ رشتہ اس قدر استوار ہوگیا ہے کہ اگر پیرس، وائنا یا ٹارنٹو میں کوئی نئی ایجاد ہوتی ہے تو وہ دو ماہ بعد ہندوستان میں بھی عام ہوجاتی ہے۔ اسٹریلیا یا کناڈا میں اگر گیہوں کا نرخ بڑھ جاتا ہے تو لائل پور کی ایک

بڑی آبادی بھوکوں مرنے لگتی ہے۔ روئی کی قیمت اگر بڑھ جاتی ہے تو الموڑہ اور آسام میں اس کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ آج چین و فلسطین کا معاملہ ہندوستان کا معاملہ ہے اور پولینڈ کا معاملہ تمام دنیا کا معاملہ۔ غرض اب گوشہ نشینی ناممکن ہو چکی ہے اور اپنے آپ کو دنیا کے معاشیاتی اور سیاسی بھنور سے نکالنا محال ہو گیا ہے۔ اب پیداوار کی تعداد اور اس کے طریقے بدل گئے ہیں مشین نے "بڑی" تجارتوں کے فروغ میں امداد دی ہے۔ نفسیاتی اور حیاتیاتی علوم نے انسانی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ صحت پہلے سے بہتر ہو گئی ہے اور موجودہ تباہ کن جنگ کا اثر جانبدار اور غیر جانبدار سب ہی پر یکساں پڑ رہا ہے ــــ لیکن ہماری بدنصیبی دیکھئے کہ ہمیں دنیا کی ان پیہم تبدیلیوں اور اس میں اپنے فرائض کا صحیح علم ہی نہیں۔ ہمیں "ہر دم رواں دواں" زندگی کا احساس ہی نہیں پیدا ہوا۔ ہماری زندگی کے ادارے اب بھی اسی جگہ پر ہیں، جہاں پہلے تھے، اور ہمارا تمام نظام معاشرت و سیاست پچھلی ہی منزل پر ٹھہرا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ زمانہ کی تبدیلیوں سے ہم آہنگ نہیں ہے اور ہماری ضرورتوں کے قدم بقدم نہیں چل رہا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اب اس میں گدلے اور رُکے ہوئے پانی کی سی بدبو آنے لگی ہے۔

ضرورت ہے کہ معاشرتی ورثہ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ زمانہ کے تغیرات کو صحیح طور پر سمجھا جائے۔ زندگی کی دوبارہ تنظیم کی جائے اور نظریات میں ضروری تبدیلیاں پیدا کی جائیں دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ ہمیں ماضی کی صحیح تعبیر، حال کی صحیح تفسیر اور مستقبل کی صحیح تیاری کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کام سب سے بہتر اسکولوں میں ہو سکتا ہے جہاں کہ نئی قوم تیار کی جا رہی ہے۔

لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام اس ضرورت کو پورا کرنے سے قطعاً قاصر ہے۔ آپ کسی ہندوستانی اسکول کے طالب علم کو لے لیجئے اور اس سے پوچھئے کہ جنگ عظیم کیوں ہوئی؟ یہ کیوں ناگزیر تھی؟ ورسائی کی صلح کیوں ناکام کوشش اور "صلح نما جنگ" کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی تھی؟ موجودہ جنگ کے اسباب کیا ہیں؟ صلح کس کا نام ہے اور جنگ

کس کو کہتے ہیں؟ تو وہ حیرت سے آپ کا منھ تکنے لگے گا۔ پھر یہ تو بڑے سوالات ہیں۔ ذرا اس سے اس گیہوں اور جو کے بارے میں پوچھیے جو وہ روز کھاتا ہے یا بینک کے بارے میں جو اسے روپیہ کے عوض چیک بک دے دیتا ہے یا دوکان دار کے بارے میں جو اس کی ضرورتیں فراہم کرتا ہے یا اسی پولسیمین کے بارے میں پوچھیے جو حفاظت و امن کا ضامن ہو تو شاید وہ ان سوالوں کے "غیر اہم" ہونے پر ہنس پڑے! لیکن اس کا الزام بچوں پر رکھنا بیکار ہے اس لیے کہ وہ ہمارے ہی آغوشِ تربیت کے پلے ہوئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ جو پڑھے لکھے کہلاتے ہیں، ان سوالات کا صحیح جواب دینے سے قاصر ہیں۔

ہمارے بہت سے اسکولوں میں ابھی تک شہریات کورس میں داخل نہیں ہے تاریخ بھی ۱۸۵۷ء یا ۱۹۰۵ء سے آگے نہیں پڑھائی جاتی۔ اسکول کا ماحول بھی عام طور پر ایسا نہیں ہوتا کہ طالب علم واقعات حاضرہ کے متعلق معلومات فراہم کرسکے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ علاءالدین اور اکبر کی فتوحات کے بارے میں بڑی تفصیل سے جانتا ہے لیکن گاندھی، جواہرلال، جناح، ہٹلر، مسولینی، اسٹالن، رزوولٹ اور چیمبرلین کے بارے میں بالکل ناواقف ہوتا ہے اسی طرح وہ ریگولیٹنگ ایکٹ کے بارے میں زیادہ جانتا ہے لیکن ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ اور "میثاقِ میونک" سے قطعاً نابلد ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بچے جب اسکولوں سے نکلتے ہیں تو انھیں باہر کی فضا بالکل دگرگوں نظر آتی ہے۔ وہ ذہنی بے مائگی کی وجہ سے اپنے آپ کو اسی ماحول میں بالکل اجنبی محسوس کرتے ہیں ہر چیز کو حیرت سے دیکھتے ہیں اور چپ ہو رہتے ہیں۔ یہ حال کی صحیح تعلیم نہ ہونے ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنے فرائض سے بھی بے خبر ہوتے ہیں اور فرداکی طرف سے بھی بے نیاز۔

واقعاتِ عالم کا تسلسل اور ان کا ارتقائی پہلو ذہن نشین کرانے کے لیے شہریات و تواریخ دونوں کو سائنٹیفک اور تاریخی نقطۂ نظر سے پڑھانے کی ضرورت ہے لیکن اسی کے

ساتھ ساتھ "واقعات حاضرہ" کا ایک کورس بھی اگر داخل نصاب کر دیا جائے تو وہ بے حد مفید ہوگا۔ اس کو پڑھاتے وقت اگر استاد تحقیق و تجسس کے جذبہ کو فروغ دے، طالب علموں کو کد و کاوش اور رد و قدح کے مواقع بہم پہنچائے اور ایمان داری کے ساتھ موافق اور مخالف رائیں پیش کر دے اور خود لڑکوں کو سوچنے اور سمجھنے کا موقع دے تو وہ بہت اچھے نتائج مرتب کر سکتا ہے۔ استاد کو چاہیئے کہ وہ علت و معلول کو پیش کر دے اور ماضی، حال اور مستقبل کے ربط کو ظاہر کرتا جائے اور اس طریقہ سے طالب علموں کی سائنٹیفک اور تاریخی نقطۂ نظر سے واقعات کو سوچنے اور پرکھنے کی عادت ڈلوائے۔

واقعات حاضرہ کی تعلیم جتنی دلچسپ ہے اتنی ہی مشکل بھی ہے۔ حال کی پیچیدگی طالب علموں کے لئے کافی دقت کا سبب بن سکتی ہے۔ اسی الجھاؤ کی وجہ سے اس تمام مواد کو باقاعدہ ترتیب بھی نہیں دیا جا سکتا۔ اس کا بھی اندیشہ ہے کہ لڑکے ہنگامہ خیز اور غیر اہم باتوں کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہو جائیں اور ان کے نسلی، مذہبی اور سیاسی تعصبات واقعات کی تہ تک پہنچنے میں حائل نہ ہوں۔ لیکن "واقعات حاضرہ" کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ان تمام دقتوں کو دور کرنا ضروری ہے اس لئے کہ ترقی کا انحصار ان شہریوں پر ہے جو اپنے گرد و پیش کے حالات سے کما حقہٗ باخبر ہیں اور ان کا عقلی طور پر جائزہ لے سکتے ہیں۔

واقعات حاضرہ کی تعلیم میں حسب ذیل تجاویز مفید ثابت ہوں گی:۔ بچوں کے اندر مختلف اخباروں اور رسالوں کے پڑھنے کا شوق پیدا کیا جائے۔ اور ان کے سامنے مختلف نقطہ ہائے نظر پیش کئے جائیں تاکہ وہ مختلف شہادتوں اور روایتوں کو جانچ سکیں اور ان کی تحلیلی قوتوں کو فروغ حاصل ہو سکے۔

بچوں کو اخبارات کے مختلف صفحات کی اہمیت بھی بتلائی جائے اور ان کو دیکھنے اور سمجھنے کا سلیقہ پیدا کیا جائے۔ طالب علموں کی فعالیت اور عملیت کو بھی کام میں لایا جائے اور بعض وقت انھیں کچھ کام کرنے کو دیے جائیں۔ کبھی کبھی اخبارات کے کچھ نقشے بڑے

پیمانہ پر بنائیں یا انھیں کاٹ کر اپنی کاپی پر چپکائیں۔ ابھی حال میں اسٹیٹسمین کی ۸ ر اور ۱۵ ر ستمبر کی اشاعتوں میں جو یورپ کے نقشے شائع ہوئے وہ طالب علموں کے لیے بڑے کار آمد تھے۔ بچوں میں اخبارات کی تصویریں بھی جمع کرنے کا شوق پیدا کیا جائے۔ اس کام کو تقسیم کر دینا بہت مناسب ہوگا کچھ لڑکے بڑے آدمیوں یا نئی ایجادات کے بارے میں اور کچھ ہندوستان کی خبروں یا بین الاقوامی سیاسیات سے متعلق تصاویر فراہم کریں۔

اخبارات کی تعلیم اور دیگر علوم میں تعلق باہمی بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات لڑکوں سے خبروں کا ایک کالم یا مقالہ افتتاحیہ لکھوایا جائے یا کسی کتاب پر تبصرہ کروایا جائے۔ اس سے لکھنے کے نئے ڈھنگ معلوم ہوں گے اور ان کے طرز تحریر پر "کتابی" رنگ غالب نہیں ہوگا۔

کبھی کبھی واقعات حاضرہ پر مباحثے منعقد کیے جائیں اور ریڈیو اور سینما کے ذریعہ جو خبریں حاصل ہوں ان پر تبصرے کیے جائیں۔ کچھ لڑکوں سے مقالے بھی پڑھوائے جائیں اور انھیں اس سلسلہ میں اخبارات کے تراشے رکھنے کا شوق دلایا جائے۔ ان تراشوں اور رسائل کی امداد سے مضامین بھی لکھوائے جائیں لیکن تحریروں اور تقریروں دونوں میں اس پر زور دیا جائے کہ طالب علم باقاعدہ سند پیش کریں۔ محض یہ کہہ دینا کہ "ہم نے اخبار میں دیکھا ہے" کافی نہیں ہے۔ اخبار، تاریخ، صفحہ اور مضمون نگار کے نام اور عنوان کا حوالہ ضروری ہے۔ کبھی کبھی اساتذہ اور باہر کے لوگوں کو بھی تقریروں کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ واقعاتِ حاضرہ کی تعلیم میں اسکول میگزین بھی بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ بہت سے اسکول قلمی رسالے ہر دوسرے یا تیسرے مہینے نکال سکتے ہیں اور اگر ان کا کام لڑکوں کے سپرد کر دیا جائے تو ان کے ذریعہ بھی گرد و پیش کے حالات سے بہت کچھ دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے۔

لڑکوں میں مہارت خصوصی کا بھی شوق پیدا کیا جا سکتا ہے۔ تمام کلاس کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کر کے ہر ایک گروہ کے سپرد ایک خاص حلقۂ عمل کر دیا جائے۔ مثلاً ایک کے

سپرد یورپ کی خبریں کر دی جائیں دوسرے کے سپرد ہندوستان کی اور تیسرے کے مقامی۔ اس سے بھی بہت مفید نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

واقعات حاضرہ کی تعلیم کے لئے اسکول میں بلیٹن بورڈ بھی ضروری ہے اسی کے ذریعہ لڑکوں میں مختلف رسائل اور اخبارات کے پڑھنے کا شوق پیدا کیا جا سکتا ہے ہر لڑکے کو اس کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنے نام کے آگے اسی مضمون اور رسالہ کا نام لکھ دے جو اس نے پڑھا ہے اور جس کو وہ چاہتا ہے کہ دوسرے بھی پڑھیں۔ اس سے لڑکوں کو مختلف اخبارات کے نام بھی معلوم ہوں گے اور انھیں پڑھنے کا بھی شوق پیدا ہوگا۔ ہفتہ کے مباحثہ کے لئے طالب علم مختلف موضوعات بھی تجویز کر سکتے ہیں اور ان کی اطلاع وہ مع اپنے نام کے بورڈ کے ذریعہ دے سکتے ہیں۔ ان مباحث میں تنوع ضروری ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ دو لڑکے ایک ہی مضمون کو منتخب کر لیں۔

واقعات حاضرہ کی تعلیم میں استاد کو حتی الوسع غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اس کے بیانات تعصب اور تنگ نظری سے پاک ہوں۔ اسے چاہیئے کہ واقعہ کو اس طرح پیش کرے کہ وہ ایک بڑے قصہ کا جزو معلوم ہو، تاریخ ارتقا کی ایک داستان نظر آئے، اور ماضی اور حال کا ربط خوب واضح ہو جائے۔ اسباب وعلل، نتائج واثرات پر زور دیا جائے لیکن واقعات حاضرہ کی تعلیم دیتے وقت کسی بات کو بھی "لفظ آخر" کے طور پر نہ پیش کیا جائے اور یہ نہ کہا جائے کہ یہ دائمی حقیقت ہے اور اس میں چوں وچرا کا امکان ہی نہیں۔

ملکۂ بہار

(صدیق احمد صاحب صدیقی۔ بی اے۔ آنرز (علیگ)

انگلستان کے مختلف قریوں اور دیہاتوں میں گھومنے کا شوق مجھے ہمیشہ سے رہا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سیاحت کے سلسلے میں آوارہ گردی کرتا ہوا میں ایک ایسے گاؤں میں جا پہنچا جو پختہ سڑک سے کئی میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہاں کے باشندوں کی سادہ تہذیب، ستھری اور قدیم معاشرت اُن دیہاتوں کے تمدن سے مختلف معلوم ہوتی تھی جو عین شاہ راہ پر واقع تھے۔ یہ غالبًا اس وجہ سے کہ یہاں کے ذرائع آمد و رفت محدود تھے۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ جی چاہا کہ رات وہیں بسر کی جائے۔ چنانچہ ایک چھوٹی سی دہقانی سرائے میں جا کر میں نے قیام کیا۔ موسم کی خاموش سنجیدگی اور میرا آوارہ گردی کا شوق! چائے پی کر نکل کھڑا ہوا۔ چند قدم چل کر سامنے گاؤں کا گرجا گھر نظر آیا۔ یہ مکانات سے ہٹ کر میدان میں واقع ہوا تھا۔ اس کا مینار جس پر کائی کی ایک موٹی تہ جم گئی تھی اور جو قرب و جوار کی سبز پوش وادیوں کے درمیان ایک شان امتیاز کے ساتھ کھڑا تھا، میرے لئے نہ صرف کافی جاذب توجہ ثابت ہوا بلکہ میرے احساسات نے بھی اس کی خاموش دعوت قبول کی اور میں بے تکلف اس کے احاطے میں داخل ہو گیا۔

عمومًا وہ دن جن کی صبح بارش میں غسل کر چکی ہو، شام کے وقت بہت دلفریب ہو جاتے ہیں اس روز بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ موسم بہت نکھرا ہوا اور صاف تھا۔ سپید بادلوں کے ہلکے ہلکے ٹکڑے غیر محسوس رفتار سے ہواؤں میں تیر رہے تھے۔ گویا کوشش کر رہے تھے کہ آسمان کی خونناک فشانیوں کو اپنے دامن میں چھپا لیں۔

آفتاب کی ترچھی کرنیں ایک الم انگیز خاموشی کے ساتھ مسکرا رہی تھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے

ایک مقدس عیسائی دنیا کی گناہ پروری پر اپنے آخری لمحات میں مسکراتا ہے اور اپنے خاموش زوال سے یقین دلاتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر وہ اپنے قدس کی تابانیوں کے ساتھ واپس آئے گا۔

موسم کے اس "موت آگیں" سناٹے نے میرے قدم پکڑ لئے اور میں ایک قبر کے پتھر پر جو نصف کے قریب دھنس چکا تھا بیٹھ گیا۔ شام کا وقت۔ قبرستان کی ویرانی اور آفتاب کی ڈوبتی ہوئی نبضیں! ماضی کے تمام مناظر آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔

بچپن کے معصوم احباب۔ دور افتادہ اعزا اور قبر میں سونے والے متعلقین ایک ایک کر کے یاد آنے لگے اور میں اس روح فرسا تخیل میں گم ہو گیا جس میں غم کی تلخی بھی مسرت چند روزہ کی حلاوت سے زیادہ شیریں معلوم ہوتی ہے۔

تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد گرجا کا گھنٹہ بجنا شروع ہوا۔ اس کی کرخت لیکن جھنکار پیدا کرنے والی سنجیدہ آواز میرے خیالات کی ہمنوائی کر رہی تھی۔ یہ غالباً کسی نئے مہمان کی آمد کا اعلان تھا جو یہاں کی برادری میں شریک ہونے والا تھا۔

فوراً ہی میری نظر ایک جنازہ کے جلوس پر پڑی جو گانوں سے قبرستان کی طرف آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ میت کے چوبی صندوق کو چند نوجوان لڑکیاں سنبھالے ہوئے تھیں اور ان کے آگے آگے ایک خوب صورت دہقانی دوشیزہ سادہ فراک پہنے سفید پھولوں کا ایک ہار ہاتھ میں لٹکائے متانت کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کسی ناکتخدا لڑکی کا جنازہ ہے۔ سوگوار والدین جو بظاہر گاؤں کے سفید پوش طبقے سے تعلق رکھتے تھے، میت کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ باپ کی ساکت نگاہیں، کھنچے ہوئے ابرو اور ستا ہوا چہرہ اس کی قلبی کش مکش کا کھلا ہوا اعلان تھا۔ "رنج اگر دل کی گہرائیوں میں محبوس ہو جائے تو خطرناک حد تک تکلیف دہ ہو جاتا ہے"۔ اس کی بیوی ایک ضعیف عورت۔ شوہر کے داہنے بازو کو پکڑے زور زور سے کراہتی چلی آ رہی تھی۔ اس کی تڑپا دینے والی چیخیں، اندرونی کرب دبے چینی کی علامت ماں کی بے لوث اور معصوم محبت کی پوری پوری آئینہ دار تھیں۔

میں بھی جنازہ کے ہمراہ گرجا میں چلا گیا۔ صفوں کے درمیان میں صندوق رکھ دیا گیا۔ دو سفید ہار اور سفید داستانے اس جگہ پر لٹکا دئے گئے جہاں وہ موت کی آغوش میں پناہ لینے والی لڑکی اپنی زندگی میں بیٹھا کرتی تھی۔

جنازہ کی دعا! موت کا روح شکن راگ!! والدین کی سوگوار محویت!!! کون تھا جو اس منظر کو دیکھ کر تڑپ نہ اٹھا ہو؟ کون خوش قسمت ہستی ایسی تھی جو اپنے کسی عزیز محبوب یا محبت کرنے والے دوست کو سپرد خاک نہ کر چکی ہو؟ اور پھر اس دعا کی اندوہناکی کا کیا ٹھکانا جو اس مجسمۂ حسن و معصومیت کے لئے کی جائے جس نے اپنی زندگی کے لہلہاتے ہوئے شباب میں دنیا سے منہ پھیر لیا ہو!

ان مسرت بھرے لمحات میں جب جسم کو انتہائی خاموشی کے ساتھ قبر کے سپرد کیا جا رہا تھا اور عناصر دنیا سے عاریتہً مانگے ہوئے حسین ذرات پھر واپس کئے جا رہے تھے اس لڑکی کی ہمجولیوں کا سسک سسک کر رونا! معاذاللہ۔ کتنا دلگداز سین تھا۔ ضعیف باپ اب بھی اپنے جذبات غم کو اس یقین سے دبانے کی کوشش میں تھا کہ جو لوگ دربار ایزدی میں پہنچ جاتے ہیں ان پر رحمت کی بارش زیادہ ہونے لگتی ہے۔ لیکن غم نصیب ماں جس کی نظروں میں صرف اپنی لڑکی کی آخری تصویر تھی اور جس کی نگاہیں محبت کے ظاہری حدود سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتیں، مسلسل آنسوؤں کی بارش کر رہی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ ایک غنچۂ ناشگفتہ جس کی ہر ہر پنکھڑی سے ہزاروں آرزوئیں لپٹی ہوئی ہیں، موت کی تیز و تند ہوا سے مرجھا رہا ہے۔ اس کے غم آلود بشرے اور گریہ پیہم کو دیکھ کر مجھے راحیل کے قلبی اضطراب اور روحانی اندوہ کا اندازہ ہو گیا۔

سرائے میں واپس آکر میں نے اس کے متعلق تفتیش کی تو پتہ چلا کہ یہ ایک معمولی حادثہ تھا جو آئے دن پیش آتا رہتا ہے۔

وہ ایک سادہ مزاج لڑکی تھی۔ حسین اور معصوم۔ شاید قدرت نے حسن کا انتہائی

بلند معیار مقرر کر کے اس کو بھیجا ہو ۔ گاؤں کے باشندوں کو اس پر ناز تھا تو کیا بے جا تھا؟ اس کا
باپ گاؤں کا ایک کھاتا پیتا کاشتکار تھا لیکن قسمت کے چکر میں پھنس کر اس کی دولت مفلسی
میں تحلیل ہو چکی تھی ۔ پھر بھی اس نے اپنی اکلوتی لڑکی کو گھر میں رکھ کر بہترین قسم کی تربیت دی تھی
گاؤں کی سادہ زندگی اور قدرت کی مشاطگی! گویا گلاب کی ایک کلی تھی کہ باغبان کے مصنوعی آلات
سے بے نیاز! کسی ویران پہاڑ کے خوشنما دامن میں پروان چڑھ رہی تھی گاؤں کا مقدس
پادری اس کو بچپن میں تعلیم دیتا تھا اور وہ اپنی سہیلیوں میں سب سے زیادہ ذہین اور سادہ
ہونے کی وجہ سے اس کی شفقت کا خاص مرجع رہ چکی تھی ۔ مہربان استاد ایک پدرانہ محبت
کے ساتھ اس کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھتا تھا گو اس کی تعلیم بہت وسیع نہ تھی لیکن پھر
بھی گاؤں کی ایک چھوٹی سی محدود سوسائٹی میں خاموش اور ستھری زندگی بسر کرنے کے لئے بالکل
کافی تھی ۔ وہ اس کو بجائے "شمع انجمن" بنانے کے "چراغ خانہ" بنانا زیادہ مناسب خیال
کرتا تھا ۔ اس کے والدین کی محبت نے گھر کے سخت اور گرانبار کاموں میں حصہ لینے کی اجازت
اس کو کبھی نہ دی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا سنجیدہ حسن اور مزاج کی لطافت آزادی سے ترقی
کرتی گئی اور وہ اس نوخیز پودے کی طرح شاداب ہونے لگی جو اتفاق سے کسی سخت قسم کے
جنگلی درختوں کے درمیان اُگ آیا ہو ۔

اس کی سہیلیاں بھی اس کے حسن کی غیر معمولی فوقیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں
لیکن ان کے جذبات ستائش میں رشک و حسد کی گنجائش نہ تھی ۔ اس لئے کہ اس کی دل کش
معصومیت، اور سادہ ادائیں، اس کی پرخلوص محبت اور سچی ملنساری تصنع اور بناوٹ سے
پاک تھی ۔

یہ گاؤں ایک چھوٹی اور قدیم بستی ہونے کی وجہ سے اب تک پرانے انگریزی چلن کا
علمبردار تھا ۔ دیہاتی رقص، موسم سرما کی محفلیں، اور موسم بہار کے طرب آمیز جلسے ابھی تک پرانے
رسم و رواج کے مطابق ادا کئے جاتے تھے ۔ اس کی ذمہ داری بڑی حد تک گاؤں کے اس

لکھیا پڑھی عائد ہوتی تھی جو تہذیب قدیم کا عاشق اور ان چند نیک سیرت سادہ لوح عیسائیوں میں سے تھا جو دنیا میں انسانی زندگی کی رگ رگ کو مسرت کی لہروں سے متلاطم رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی کے زیر نگرانی "جلسۂ بہار" کے عالیشان انتظامات ہوتے تھے۔ گاؤں کے بڑے سبزہ زار میں ایک آراستہ اور خوبصورت جھنڈا عین وسط میں نصب کیا جاتا تھا اور خاص "یوم بہار" کے دن ایک بڑا پنڈال بنا کر اس کو پھولوں اور جھنڈیوں سے سجایا جاتا تھا۔ گاؤں کی سب سے زیادہ حسین اور دوشیزہ لڑکی "ملکۂ بہار" کے نام سے منتخب کی جاتی اور وہی جلسے کی صدر ہوتی تھی۔ مختلف قسم کے دلچسپ مقابلوں میں کامیاب ہونے والے لڑکے اور لڑکیوں کو انعامات تقسیم کرنا اسی کے سپرد ہوتا تھا۔

بستی کا دلفریب محل وقوع اور اس کی شعر آفریں فضا، جلسۂ بہار کی پرخلوص اور سادہ رنگ صحبتوں میں مل جل کر کچھ اس درجہ دلکش ہو جاتی تھی کہ کوئی سنگ دل سے سنگ دل مسافر بھی ان حیات افروز مشاغل کو نظر انداز کر کے قدم آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔

چنانچہ ایک نوجوان فوجی افسر جس کا دستہ قریب کے ایک گاؤں میں مقیم تھا، ان خوش فعلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ گاؤں والوں کی ستھری اور خوش مذاق زندگی...... ابتدائے بہار کی زرخیز انگڑائیاں اور پھر ملکۂ بہار کی ساحرانہ شخصیت گویا اس فوجی کی خشک زندگی کو یکسر شباب و شعر میں تبدیل کر دینا ہی ان کا مقصد تھا۔

یہ ملکۂ بہار، جسے اگر میں "فتنۂ بہار" کہوں تو روا ہے، گاؤں والوں کا عزیز ترین سرمایۂ حسن سر پر پھولوں کا تاج رکھے، عنفوان شباب کی گھبراہٹ میں شرماتی اور مسکراتی، خزاں اور بہار کو زیر و زبر کرتی بادہ بچشم لڑکی اپنی معصوم سیرت اور سادہ خوش طبعی سے اس فوجی افسر کو اتنی جرأت دلا چکی تھی کہ وہ اس سے اپنا تعارف کرا سکے۔ اس نے رفتہ رفتہ اس بارگاہ حسن میں رسوخ حاصل کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ اس نوجوان فوجی افسر کی غیر محسوس محبت پاشیاں اپنا رنگ دکھانے لگیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں صداقت کی بو تھی کیونکہ بظاہر اس کا "طریقۂ کمند اندازی" بالکل

وہی تھا جو اکثر شہری حضرات گاؤں کی بھولی لڑکیوں کو اپنا گرویدہ بنانے میں استعمال کرتے ہیں اس کے انداز دوستی میں کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جو اس معصوم لڑکی کو چونکا سکے۔ حتیٰ کہ کبھی اس نے محبت کے عنوان پر گفتگو بھی نہ کی تھی لیکن بایں ہمہ اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض خاموش اعلانات' محبت کے ان بلند بانگ دعووں سے زیادہ دل نشین ہوتے ہیں جو زبان سے کئے جائیں اور غالباً کیوپڈ کا یہی وہ کاری تیر ہے جو نشانہ پر پہونچنے کے بعد بھی بے قرار رہتا ہے۔ آنکھوں کی چمک! آواز کی لچک اور وہ ہزاروں لطافتیں جو ہر ہر لفظ اور ہر ہر حرکت سے نمایاں تھیں' اس کی محبت کی پوری پوری آئینہ دار تھیں اور محبت کی یہی وہ خاموش جادو بیانیاں ہیں جو صرف محسوس کی جا سکتی ہیں بیان نہیں کی جا سکتیں۔

پھر اگر ان اداؤں نے ایک معصوم اور نوجوان دل کو شکست دے دی ہو تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ چنانچہ جہاں تک اس لڑکی کا تعلق تھا' وہ بغیر یہ سوچے کہ کل کیا ہوگا؟ محبت کر رہی تھی۔ اس نے کبھی غور ہی نہ کیا کہ جس جذبہ کی وہ پرورش کر رہی ہے وہ کہاں تک اس کے دوسرے خیالات اور احساسات پر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ مستقبل کے مبہم نتائج اس کی نظر سے بالکل پوشیدہ تھے۔ نوجوان افسر کی موجودگی میں اس کی محبت پاش نظروں اور روح پرور الفاظ نے کبھی غریب لڑکی کے خیالات کو اپنے مرکز سے ہٹنے ہی نہ دیا اور اگر کبھی وہ نظروں سے اوجھل ہوا بھی تو ماضی قریب کے حسین لمحات نے اپنا سکہ جما کر اس کو مستقبل سے پھر بے نیاز کر دیا۔ وہ اس کے ساتھ قریب کے سبزہ زاروں اور باغات میں روزانہ ٹہلنے جاتی تھی اس دوران میں وہ اس کو فطرت کی رنگینیوں پر درس دیا کرتا تھا اور کبھی کبھی شباب اور شعر کی سحر کاریوں سے بھی آشنا کراتا جاتا تھا۔

جنس لطیف کے کسی فرد کے احساساتِ محبت شاید ہی کبھی اتنے بے لوث رہے ہوں جتنے کہ اس حسین لڑکی کے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ ابتدائی ملاقات میں اس فوجی افسر کے ورزشی جسم اور مردانہ قد و قامت کے اثرات اس کے لئے جاذب نظر ثابت ہوئے

ہوں لیکن درحقیقت یہی وہ چیز نہ تھی جس نے اس کو مسحور کر رکھا تھا! اس کے جذبات محبت میں
پرستش کا عنصر غالب تھا۔ اس کے نزدیک وہ ایک مافوق الفطرت شخصیت کا حامل تھا اس کی
عمر میں پہلا اتفاق تھا کہ ایک حسین اور بااخلاق آدمی کی دوستی نے اس کے خفتہ احساسات کو بیدار
کردیا۔ مرتبہ اور دولت کے ذلیل امتیازات نے نہیں، بلکہ اخلاق اور طرز گفتگو، فہم اور شرافت
کی خوبو نے جو ایک دیہاتی اور شہری میں حد فاصل قائم کرتی ہیں اس لڑکی کو مجبور کردیا کہ وہ
اس کے سامنے سر نیازش خم کردے۔ اس کے ہر ہر لفظ پر وہ اس طرح کان دھرتی گویا جو
کچھ وہ کہہ رہا ہے، الہام خداوندی سے کم نہیں!

دورانِ گفتگو میں اگر کبھی اس کی شرمائی ہوئی آنکھ اس کے چہرہ پر پڑ بھی جاتی تو کچھ اس طرح گھبرا کر
وہ نظریں چرالیتی گویا اس کی فرومائگی اس فوجی افسر کے علوئے خیال کے آگے کوئی حقیقت نہیں
رکھتی۔ یہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ عورت کی محبت مرد کی برتری ہی پر مرکوز ہوتی ہے، اور یہی وجہ
ہے کہ بسا اوقات مرد اپنے اس ہتھیار سے کام لے کر محبت کے نازک ریشمین لباس کو
بوالہوسی کے کانٹوں سے تار تار کر ڈالتا ہے۔

بہرکیف وہ حسین لڑکی اس فوجی افسر کی خاموش پرستش میں محو تھی اور اس کو وہ بھی محسوس
کرچکا تھا۔ اس کے قلب کی گہرائیاں بھی جذبات سے لبریز تھیں لیکن یہ اتنے بے لوث اور
لطیف نہ تھے۔ اس کی محبت کی سنجیدگی صرف وقتی تھی، وہ اپنے ہم عمر افسروں سے "دیہاتی
فتوحات" کے ہیجان پیدا کردینے والے واقعات سن سن کر اپنے ضمیر کا توازن، اخلاقی درہم
برہم کرچکا تھا اور اس حسن اتفاق سے فائدہ اٹھا کر اپنے مردانہ پندار، کا ثبوت دینا چاہتا تھا۔
نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی تمام تر محبت فی الحقیقت یہیں تک محدود تھی یا اپنے نفس کو دھوکا دینے
کی غرض سے وہ یہ سوچ رہا تھا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر کسی عکس پذیر شیشے پر کیمرہ کا سیاہ پردہ
پڑا ہو تو جو شخص بھی اس کو اٹھائے گا اسی کی تصویر نقشِ اول بن کر اس پر ثبت ہو جائے گی۔
بعینہ یہی کیفیت اس افسر کے قلب کی ہوئی۔ اس کے احباب کی گفتگو اور ان کے عشق و محبت کے

افسانے اس کے قلب میں یہ صلاحیت پیدا کر چکے تھے کہ وہ جلد از جلد اس ذات کی تصویر لے لے جو پہلی مرتبہ تکلف کو برطرف کر کے اس کی نقاب کشائی پر آمادہ ہو —————— اس مہم کو اس معصوم لڑکی نے غیر اختیاری طور پر انجام دیا۔

ابتدا میں اس کی خواہش تھی کہ وہ اس لڑکی سے چند روز تک دلچسپی لے اور پھر جب یہاں سے کوچ ہو کر دوسری جگہ فوج کا قیام ہو تو وہاں کسی نئے شکار کی تلاش کرے لیکن چند ہی روز میں اس باعصمت لڑکی کی بے لوث محبت نے اس کے دل کو تسخیر کر لیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی شعلہ ریزی اب اسی کے جیب و دامن کو خاکستر بنانے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ جی تو چاہتا تھا کہ شادی کرے لیکن وہی رکاوٹیں جو اس قسم کی واقعات میں عام طور پر پیش آتی ہیں یہاں بھی پیدا ہو گئیں۔ اس کا بلند رتبہ، زندگی کا روشن مستقبل، خاندانی اعزاز اور پھر ایک خود دار باپ کی دولت پر آئندہ کامیابی کا انحصار! یہ سب فریب دینے والی حقیقتیں یکے بعد دیگرے اس کو مجبور کرنے لگیں کہ وہ شادی سے اپنا دامن بچائے۔ لیکن فریق ثانی کا مرکز ثقل بھی معمولی نہ تھا۔ ایک معصوم لڑکی کی الفت، اس کی نسوانی لطافتوں کی پاک سپردگی، اس کی پریشان کن نگاہوں میں تلاش محبت کا نظارہ اور پھر سونے پر سہاگہ اس کی فطری حیا! کون شخص ہے جو ان بے پناہ قوتوں سے مغلوب ہو کر کثافت روح کا ادنیٰ ترین نمونہ بھی پیش کر سکے؟ گو اکثر یہ اتفاق ہوا کہ اس کے احباب کی مکروہ گفتگو اور ان کی بد اخلاقی کی بدترین مثالوں نے اس کی نیت کو ڈانواں ڈول کر دیا لیکن پھر بھی ان تاریکیوں کو کبھی جرأت نہ ہو سکی کہ اس لڑکی کی پرنور محبت کے سامنے ایک لمحہ بھی ٹھہر سکیں۔ چنانچہ جب کبھی شام کو ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی تو وہ محسوس کرتا کہ دوشیزگی کی عفت ایک روشن اور مقدس فضا ہے جس میں گناہ کا تخیل اڑ کر بھی نہیں پہنچ سکتا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب انسان کے متضاد ارادے اور اس کے ضمیر اور نفس کی مختلف قوتیں

آپس میں ٹکرا کر تھک جاتی ہیں تو فطرت کی طرف سے ایک ناطق فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ خواہ وہ اس کے حق میں مفید ہو یا مضر۔ چنانچہ یہی واقعہ اس فوجی نوعمر افسر کے ساتھ بھی پیش آیا! ابھی وہ اپنے مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کرنے پایا تھا کہ ایک روز اس کے دستے کے متعلق یہ حکم آیا کہ وہ انگلستان چھوڑ کر فوراً براعظم یورپ کی طرف روانہ ہو جائے۔ یہ حکم کیا تھا گویا اس کی اندرونی کش مکش کی تکمیل تھی۔ چند منٹ تک اس کی تمام دماغی اور ذہنی قوتیں مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ لیکن بہرحال اس کو یہ اندوہناک خبر معصوم لڑکی تک پہنچانی تھی۔ کئی مرتبہ ارادہ ہوا کہ بتا دے لیکن نفسیات کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ ایسے مواقع پر جب محبت کا زمانہ اپنے شباب پر ہو، اور پھر شباب بھی کیسا؟ —— موت کے اندوہگین لمحوں کو اپنے دامن میں پوشیدہ کئے ہوئے —— ایک خبرِ بد سے عیش کی صحبتوں کو برباد کر دینا، قبل از وقت اعترافِ شکست سے کم نہیں ہوتا۔

معاملہ ٹلتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ دن آ ہی گیا جب ان کی محبت پرور صحبتوں پر مرگِ ناگہانی کا حملہ ہونے والا تھا۔ مجبوراً شام کو ٹہلتے وقت اس افسر نے چند ٹوٹے پھوٹے جملوں میں اپنی داستانِ محبت اور ساتھ ہی خبرِ جدائی بھی کہہ ڈالی۔

لڑکی کے خواب میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ کبھی اس کو اپنے محبوب سے جدا ہونا پڑے گا ظاہر ہے کہ ایسی خوش خیالی میں جب محبت کی دیوی اپنی تمام رنگینیوں سمیت ان کی پاکیزہ صحبتوں پر مسکرا رہی ہو، اس خطرناک اور اچانک خبر نے اس کے دل و دماغ کے ساتھ کیا کام کیا ہوگا۔ پہلے لمحے میں تو سکوتِ حیرت تھا لیکن فوراً ہی تمام صورتِ حالات اس کی نظر کے سامنے پھر گئی۔ ایک لرزتی ہوئی نگاہ سے اس نے اپنے رخصت ہونے والے دوست کو دیکھا اور پھر ایک معصوم بچے کی طرح سسک سسک کر رونے لگی۔ بہت ممکن ہے آپ اس اشکباری کو عورت کا آخری حملہ قرار دیں لیکن اس وقت وہ آنسو صرف قلبی راز کے آئینہ دار تھے اور بس!

نوجوان افسر اس تباہ کن منظر کی تاب نہ لا کر بے چین ہو گیا۔ اس نے لڑکی کو اپنی طرف کھینچ لیا اور اس کے نمناک صحیفۂ محبت پر اپنے کانپتے ہوئے لبوں سے چند مہریں ثبت کر دیں۔ لڑکی نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ اس قسم کی زندگی میں بعض لمحات ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں محبت کے کثیف اجزا غم کی دہکتی ہوئی بھٹی میں پڑ کر نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ اس کا یہ نظریہ ممکن ہے کبھی کبھی صحیح بھی ہو جاتا ہو لیکن کم از کم اس وقت تو یہ اس کی معصومیت کا فریب ہی ثابت ہوا۔ کیونکہ اس کے چہرہ کا تمتماتا ہوا حسن اور پھر اس کی بے اختیار سپردگی!! ایک فریب خوردہ انسان کو مغالطہ میں ڈال دینے کے لئے کم نہ تھیں۔ اس کو یہ یقین تھا کہ اس کی فوقیت کا سکہ لڑکی پر جم چکا ہے اور اب اس سے فائدہ نہ اٹھانا گویا قدرت کی عطا کی ہوئی نعمت کو ٹھکرا دینا ہے چنانچہ فوراً اس نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ اپنے گھر کو چھوڑ کر اس کے ساتھ چل کھڑی ہو اور اس کے غم و راحت میں برابر کی حصہ دار بنے۔

کہنے کو تو وہ کہہ گیا لیکن اس گاؤں میں اپنی اجنبیت محسوس کر کے اور اپنی اس خود غرض تجویز کی رکاکت کا خیال کر کے وہ اس درجہ خجل ہوا کہ پھر ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا وہ خاموش تھا اور اس کا دماغ، قلب کی تنگ ظرفی پر نالاں! لڑکی نے جب یہ الفاظ سنے تو پہلے تو وہ قطعاً یہ نہ سمجھ سکی کہ اس کا کیا مقصد ہے۔ وہ اپنا گھر کیوں چھوڑے؟ اپنے شفیق والدین کی معیت سے کیوں بھاگ کھڑی ہو؟ کیا صرف اس لئے کہ اس کو فوجی افسر سے محبت تھی؟ لیکن محبت تو زمان و مکاں کی قیود سے بالا تر ہوا کرتی ہے اور پھر محبت تو اس کو اپنے والدین سے بھی تھی۔ وہ بھی ایک معصوم محبت تھی اور یہ بھی ایک معصوم محبت!! پھر ایک کو دوسرے پر ترجیح کی وجہ؟

لیکن چند ہی لمحوں کے بعد اس کی نسوانی فراست نے اصل معاملے سے اس کو آگاہ کر دیا کہ فوجی افسر کی محبت "آرزوئے خام" سے بے نیاز نہیں۔ وہ زہر کی ایک تلخ گولی تھی جس پر شکر چڑھا کر وہ اس کو پیش کر رہا تھا۔ اس کے آنسوؤں کا ہر قطرہ جہاں تھا وہیں منجمد ہو کر

رہ گیا۔ وہ جوشِ الم میں ایک حرف بھی اپنی زبان سے نہ کہہ سکی۔ اس وقت اس کا دماغ رنج اور غصہ سے کھول رہا تھا۔ اس کی محبت نے اپنا رخ تبدیل کیا اور وہ اس طرح جھجک کر پیچھے ہٹی گویا اس کے سامنے ایک خطرناک زہریلا سانپ پڑا ہو۔ وہ اپنی روحانی کوفت میں دونوں ہاتھ ملنے لگی اور ایک نفرت آمیز نگاہ اس فوجی کے چہرہ پر ڈال کر اپنے گھر کی طرف اس طرح بھاگی گویا کہہ رہی ہو ؎

کہ عنقا را بلند ست آشیانہ!

افسر اپنی اس ذلیل حرکت پر پشیمان، حیرت میں غرق کیمپ کی طرف روانہ ہوا۔ یہ چند لمحات اس کی زندگی کی وہ خطرناک اور پریشان کن گھڑیاں تھیں جن میں مستقل مزاج سے مستقل مزاج اور تجربہ کار سے تجربہ کار آدمی بھی گھبرا کر خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ چہ جائیکہ ایک نوآموز اور غیرت مند شخص جس نے سوسائٹی کی اخلاق کُش لیکن دلفریب ترغیب سے متاثر ہو کر اپنے ضمیر کو پہلی مرتبہ اتنا سخت دھکا پہنچایا ہو۔ وہ جو کچھ بھی کر گزرتا وہ کم تھا لیکن روانگی کی ہلچل اور یار دوستوں کے ہنگامے نے اس کو بڑی حد تک باز رکھا اور وہ نہ طے کر سکا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ بہرکیف وہ اپنی فوج کے ہمراہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ نئی سرزمین کے دلکش مناظر، نت نئے واقعات جدید احباب اور حالات کی تبدیلی نے اس کے حال پر پردہ ڈالنا شروع کر دیا اور وہ حال، کی سرگرمیوں میں ماضی کے روح فرسا واقعے کو رفتہ رفتہ فراموش کرنے لگا۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی گزشتہ صحبتوں کی یاد، سپاہیوں کی نقل و حرکت سے بے نیاز ہو کر فوجی زندگی کی ہنگامہ خیز مصروفیت کو ایک طرف ہٹاتی ہوئی اس کے دل و دماغ تک پہنچ ہی جاتی۔ گاؤں کی ستھری معاشرت، جلسہ بہار کے رنگینیاں، ایک حسین لڑکی کی دوستی، اس کا شام کو نہر کے کنارے کسی کے بازو کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ ٹہلنا، اپنی لطیف محبت کا مرکز ایک مسافر کو بنانا اور پھر اس کی غلط فہمی، اپنی تنگ ظرفی کا ایک ناگوار پیرایہ میں اظہار، یہ سب خیالات

مل جل کر کچھ اس بُری طرح اس کو متاثر کرتے کہ وہ گھنٹوں شرم اور ندامت سے اپنا سر نہ اٹھا سکتا!

غریب لڑکی کو جو صدمہ اپنی محبت کی تباہی سے پہنچا وہ ناقابلِ بیان تھا۔ اس کے دل و دماغ کی تمام قوتیں جو ایک مرکز کی طرف مائل ہو چکی تھیں اب اس طرح ہچکولے کھانے لگیں جیسے ایک ڈوبتا ہوا جہاز سمندر کی بے پناہ موجوں پر زیر و زبر ہوتا ہے۔ ابتدا میں غشی اور بے ہوشی کے دورے پڑے لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ ان مسلسل حملوں کی تاب نہ لا کر صاحبِ فراش ہو گئی۔

اس نے اپنی کھڑکی سے فوج کو کوچ کرتے ہوئے دیکھا جس میں اس کا بے وفا دوست اپنی شاندار وردی پہنے ایک ہاتھ سے کرچ اور دوسرے سے باگ سنبھالے بینڈ کی آواز پر گھوڑا اڑاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے انداز نشست سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ بڑی زبردست فتح حاصل کر کے لوٹ رہا ہو! معصوم لڑکی نے ایک درد آمیز نگاہ سے اس کے چمکتے ہوئے خود اور لہراتے ہوئی کلغی کو دیکھا اور دل پکڑ کر بیٹھ گئی۔ بس ایک بجلی تھی کہ چمکی اور اس کے دل میں پیوست ہو گئی!!

یہ بیان کرنا کہ اس حادثہ کے بعد اس لڑکی کی کیا حالت ہوئی، ایک بے معنی سی بات ہے کیونکہ اس قسم کے اندوہناک واقعات جن میں ایک پاک محبت کا جذبہ آخر میں صرف فریبِ نفس ثابت ہو، اکثر 'المیہ' کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

فطرتاً یہی کیفیت اس کی بھی ہوئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ سوسائٹی اس کی خوش و خرم زندگی میں کوئی ناگہانی تغیر محسوس کرے۔ وہ اکثر اپنی سہیلیوں کی نظر بچا کر جنگل میں تنہا نکل جاتی اور ایک مجروح ہرنی کی طرح گھنٹوں اپنی بدبختی پر آنسو بہاتی رہتی۔ اس کا سفید اور ستا ہوا چہرہ صاف بتاتا تھا کہ اس کی شکستہ محبت دل کی ہر ہر رگ سے خون چوس چکی ہے۔ اکثر شام کو دودھ بیچنے والی لڑکیوں نے اس کو گرجا گھر کی تاریک برساتی میں کوئی غمگین راگ الاپتے ہوئے سنا تھا۔ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ دنیا کی تکالیف سے تنگ آ جاتا ہے تو ان سے پناہ حاصل کرنے کے لئے کسی

مافوق الفطرت ہستی کا سہارا تلاش کرنے لگتا ہے اور یہی وہ موقع ہے جب بتوں کی بے نیازی اس کو خدا کے آگے سر جھکانے پر مجبور کر دیتی ہے — اس لڑکی کی دنیوی مصروفیتیں بھی گرجا کی چہار دیواری میں محدود ہونے لگیں۔ عبادت میں اس کا استغراق بڑھنے لگا اور وہ رفتہ رفتہ مریم کی ایک مقدس چیلی معلوم ہونے لگی۔ جب گاؤں کے بڑے بوڑھے اس کو گرجا میں آتے دیکھتے — اس طرح کہ پوست و استخوان کا ایک نازک ڈھانچہ تقدس کے ہالے میں آسمانی پیکر بنا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ تو وہ نہایت سنجیدگی سے اس کو راستہ دیدیتے اور درمیان سے گذر جانے کے بعد اس پر اس طرح نظر ڈالتے گویا وہ ایک مایوسی و حسرت کا مرمریں مجسمہ ہے کہ دنیا میں عبرت دلانے کے لئے بھیجا گیا ہے۔

اس کو اس امر کا یقین ہو چکا تھا کہ وہ بہت تیزی سے اپنی موت کی طرف جا رہی ہے لیکن وہ سمجھتی تھی کہ قبر کا تاریک گوشہ ہی اس کو دوامی آرام پہنچا سکتا ہے — محبت کا وہ سیمیں رشتہ جو اس کی زندگی کا وزن سنبھالے تھا اب ڈھیلا ہو چکا تھا۔ وہ محبت کی بلند چوٹی سے ایک بار گر پڑنے کے بعد چاہتی تھی کہ اجل کی عمیق ظلمتوں میں گم ہو جائے۔ لیکن داد دیجئے اس کی شرافت نفس کی کہ اپنے دوست کے فریب محبت سے واقف ہو جانے پر بھی اس کے دل میں نفرت کا کوئی جذبہ موجود نہ تھا۔ یا ممکن ہے کہ چند لمحوں کے احساس کے بعد اس کی تمام چنگاریاں خاکستر ہو چکی ہوں۔ لیکن میرے خیال میں اس کے دل میں اتنی گنجائش ہی نہ تھی کہ نفرت یا غصہ کا کوئی جذبہ اس میں پرورش پا سکے۔

ایک روز جب اس کی حالت بہت نازک ہو گئی، تو اس نے ایک وداعی خط بہت ہی سادہ اور مختصر الفاظ میں اپنے دوست کے نام لکھا لیکن اس کی سادگی بھی بلا کا اثر رکھتی تھی۔ یہ تحریر اس کے دل کی فریاد تھی جس میں کوئی لے نہیں ہوتی! اس نے لکھا کہ وہ مرنے والی ہے اور اس کی موت کا باعث صرف اس کی ذات ہے۔ اس نے اپنی تمام جسمانی اور روحانی اذیتوں کا ذکر نہایت سادہ پیرایہ میں کیا جو اسے اس دوران میں جھیلنا پڑیں۔ اختتام میں اس نے جو جملے

لکھے وہ یہ تھے کہ:۔

"میں نے محسوس کیا کہ اس وقت تک میں آرام سے جان نہیں دے سکتی جب تک میں تمہاری فریب دہی کو معاف نہ کردوں اور اپنی پُرخلوص دعائیں تم تک نہ پہنچا دوں"

شباب کی قوتیں پہلے ہی اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھیں اب رفتہ رفتہ اس کی کمزوریاں بھی جواب دینے لگیں حتیٰ کہ وہ اپنے گھر سے باہر بھی نہ نکل سکتی تھی۔ اب اس کا مشغلہ صرف یہ رہ گیا تھا کہ وہ لڑکھڑا کر کھڑکی تک پہنچ جائے اور وہاں ایک کرسی پر بیٹھ کر سامنے کے میدان کا نظارہ کیا کرے —— وہی میدان جو چند روز قبل اس کی محبت کا جولانگاہ رہ چکا تھا۔

کبھی شکایت کا ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہ نکلا۔ نہ اس نے کبھی اس راز کا ذکر کیا جو اس کی روح کو گھُن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے محبوب افسر کا نام بھی کسی کو نہ بتایا البتہ کبھی کبھی تنہائی میں، جب جوشِ غم کی فراوانی ہوتی، وہ اپنی ضعیفہ ماں کی گود میں سر ڈال کر خاموشی سے رو لیا کرتی!

اس کے غریب والدین اس صدمے کو جس خاموشی سے برداشت کر رہے تھے وہ ناقابلِ بیان ہے۔ وہ اپنی امیدوں کے لہلہاتے ہوئے باغ کو مرجھاتا ہوا دیکھتے لیکن زبان سے اُف نہ کر سکتے تھے۔ اب بھی ان کو کبھی کبھی یہ امید ہوتی کہ شاید یہ غنچۂ پژمردہ از سرِ نو شاداب ہو جائے اور اس کے چہرہ کی وہ دمک جو کبھی محبت کی تنویر سے مالا مال تھی مستقل ہو کر اس کی آئندہ صحت کا یقین دلا دے۔ لیکن محبت کرنے والے امیدوں کی چار دیواریاں کھینچا ہی کرتے ہیں اور موت اپنا شکار چپکے سے دبوچ کر غائب ہو جاتی ہے۔

اسی دوران میں ایک اتوار کو سہ پہر کے وقت وہ اپنے والدین کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنی ماں کی گردن میں حمائل تھے۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور ہوا ہلکے ہلکے ملکوتے

لیتی ہوئی کمرے کو اس بھینی خوشبو سے مہکا رہی تھی جو دروازے پر لٹکے ہوئے گملوں میں سے نکل رہی تھی۔ اس کا باپ انجیل مقدس کا وہ باب سنا رہا تھا جس میں دنیا کی ناپائداری اور آخرت کی ان راحتوں کا ذکر تھا جو نیک بندوں کے لئے دائمی طور پر مہیا کی گئی ہیں۔

مضمون کی نوعیت اور اس کا ملہمانہ انداز بیان، پھر خود اس کے موجودہ حالات کی نفس مضمون کے ساتھ ہم آہنگی! یہ سب چیزیں کچھ اس قدر موثر ثابت ہوئیں کہ اس کا قلب ایک ابدی اطمینان محسوس کرنے لگا۔ اس کی نگاہیں اپنے دیہاتی گرجا گھر کی چوٹی پر لگی تھیں، شام کی عبادت کے لئے گھنٹی بج رہی تھی اور عبادت کرنے والے سادہ لوح دیہاتی ایک قلبی عقیدت کے ساتھ خاموش گردن جھکائے چلے جا رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ فضا کا ذرہ ذرہ اس مقدس سکوت میں غرق ہے جو صرف اتوار ہی کو گاؤں پر طاری ہوتا ہے۔ اس کے والدین لڑکی کے سنجیدہ چہرہ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ بیماری اور غم نے جو بعض چہروں کی توانائی اور تازگی زائل کر دیتے ہیں اس کے چہرہ کو ایک لاہوتی حسن بخش دیا تھا۔ اس کی ناتواں، نیلگوں آنکھوں میں دو آنسو تھرتھرا رہے تھے ——— کیا اسے اپنے فراموشکار کی یاد آئی؟ یا اس کے خیالات گرجا کی اس سرزمین پر منڈلا رہے تھے جس کے مقدس سینے میں وہ سما جانے والی تھی؟؟ یکایک ٹاپوں کی آواز آئی۔ ایک سوار مکان پر آ کر رکا۔ وہ کھڑکی کے سامنے اتر پڑا ——— بے چاری لڑکی نے ایک ہلکی چیخ ماری اور اپنی کرسی میں گر گئی ——— یہ اس کا منفعل دوست تھا ——— وہ جلدی سے گھر میں داخل ہوا اور اسے اپنے سینے سے لگانے کے لئے بڑھا لیکن اس کا لاغر جسم، اس کا پژمردہ چہرہ! اتنا حقیر مگر کتنا دلکش!! اس کے دل میں ایک دھچکا سا لگا اور وہ غم کا مارا اس کے قدموں میں گر پڑا ——— وہ کمزوری کی وجہ سے اٹھ نہ سکی ——— اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس نے بڑھانا چاہا۔ اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی جیسے اس نے کچھ کہا مگر اس کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ اس بے چاری نے کوشش کی کہ اٹھ کھڑی ہو لیکن نقاہت نے ہلنے بھی

نہ دیا۔ اس نے کوشش کی —— ایک آخری کوشش — کہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کو اٹھا لے لیکن وہ اپنی نصف درازی تک بھی نہ پھیلے تھے کہ گر گئے —— اس کے خشک لبوں نے ہل کر کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن بے سود! اس کی کمزور نگاہیں ایک سوگوار شیفتگی کے ساتھ اپنے دوست کے اشک آلود چہرہ پر مسکرائیں اور مسکرا کر ہمیشہ کے لئے اس میں جذب ہوگئیں!!

یہ ہیں وہ تفصیلات جو اس دیہاتی قصہ کے متعلق میں جمع کر سکا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ بہت معمولی ہیں اور ان میں کوئی ایسی جدت بھی نہیں ہے کہ میں خواہ مخواہ آپ کو مجبور کر کے سناؤں۔ ممکن ہے کہ یہ واقعہ اپنی تباہ کاریوں سمیت آپ کو فراموش کر دینے کے قابل معلوم ہو لیکن کم از کم میرے دل و دماغ پر اس کا اثر اس وقت بہت پڑا اور پھر خصوصاً اس لئے کہ ڈرامہ کا وہ آخری منظر جو غم کی تکمیل کر رہا تھا، میری نظروں کے سامنے گزر رہا ہے۔ بہرحال! بھول جائیے کہ یہ لوگ بھول جانے ہی کے قابل ہیں :-

ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

(تلخیص از واشنگٹن ارونگ)

سرمایہ داری کارل مارکس کی نظر میں

(ایم - ایم - جوہر صاحب)

عوام کے لئے اقتصادیات میں وہ دلچسپی نہیں ہو سکتی جو شاعری یا افسانہ میں ہے لیکن قحط کے زمانے میں عاشق عشق فراموش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بھوک کی شدت رُخ زیبا کا کل مشکیں، نگاہِ بدمست کو بھلا دیتی ہے اور انسان کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ اقتصادی دنیا میں داخل ہو کر قحط کی وجوہات سمجھے اور اس کے رفع کرنے کی کوشش کرے۔

عام گھرانوں کی یہ اقتصادی الجھنیں کہ صاحب زادے کی تعلیم کے لئے سرمایہ نہیں۔ بھائی کو معقول عہدہ نہیں ملتا، خاوند کی تنخواہ کم ہے، بہن اور بیٹی کی شادی نہیں ہوتی، رشتہ آتا ہے تو لڑکے والے منہ پھاڑ کر مانگتے ہیں، اور اسی قسم کی خانگی مشکلات کا سبب اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک کہ انسان اپنی سماج کے اقتصادی حالات نہ سمجھے۔ لیکن فی زمانہ ہر سماج کی اقتصادی حالت تمام دنیا کی اقتصادی حالت سے منسلک ہے۔ اپنی سماجی حالت کو دنیا کی عام حالت سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ خانگی زندگی کی کش مکش سماجی زندگی کا عکس ہوتی ہے اور کسی سماج کی زندگی تمام دنیا کی کش مکش کا پرتو ہوتی ہے۔ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔ کنوئیں کے مینڈکوں کی طرح گھر کی چار دیواری کو اپنی دنیا خیال کرنا موجودہ دور میں حماقت ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ تمام دنیا کی اقتصادی حالت پر جس کو سرمایہ داری کہتے ہیں، ایک نظر ڈالی جائے۔ بیسویں صدی میں جہاں اور بہت سی متضاد باتیں ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں قحط اور فراوانی اجناس بہ یک وقت موجود ہیں اور اس تضاد نے ایک مستقل شکل اختیار کر لی ہے۔ لیکن سرمایہ دار مصنفین اقتصادیات سرمایہ دارانہ نظام کو بہترین نظام مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر دنیا کی اقتصادی زندگی کی سطح

پر کچھ بدحالی دکھائی بھی دے رہی ہے تو وہ وقتی چیز ہے، کچھ عرصے کے بعد آپ جاتی رہے گی
نظامِ سرمایہ داری میں کوئی ایسی اصولی خامی نہیں ہے جس کی بنا پر یہ خیال کیا جائے کہ یہ
اوپری بیماری ایسی مہلک ہے کہ سرمایہ داری کی جان کے لئے خطرہ ثابت ہوگی۔ جیسے انسان
کو نزلہ زکام ہو جاتا ہے اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام میں خود سرمایہ داروں کی کوتاہ اندیشی سے
کبھی کبھی تشنج پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس سے گھبرا کر سرمایہ دارانہ نظام ہی
کو دفن کر دیا جائے۔

لیکن کسی حقیقت سے انکار کرنے سے وہ حقیقت بدل نہیں جاتی چنانچہ ۱۹۲۹ء میں جب
نفع کی شرح گری، کام کاج بند ہوئے اور دنیا کی تجارت موت کے کنارے آ لگی۔ انسان
بے کاری اور بھوک سے بدحال ہو گیا۔ سرمایہ دار اور مزدور طریق پیداوار کے دو کناروں پر
جمع ہو گئے لیکن ایک جگہ مل کر کام نہ کر سکے۔ میانوں میں تلواریں کھڑکنے لگیں تب سرمایہ دار
مفکرین چونکے اور چند نے اعتراف کر لیا کہ سرمایہ داری میں آشوب (CRISIS) ہوتا
ہے اور ہو رہا ہے۔ کچھ عرصے بعد سب ماہرینِ آشوب کی موجودگی کا اقرار، اس کے سبب
نوعیت اور نتائج پر غور و فکر کرنے لگے۔

لیکن کارل مارکس نے آج سے ایک صدی قبل سرمایہ داری کی ہر ارتقائی منزل کی تحلیل
کر دی تھی۔ اس نے ان تمام منازل کا مفصل ذکر کیا ہے جن میں سے سرمایہ داری گذرتی ہے
جہاں اُس نے سرمایہ داری کے بچپن اور نمو کا ذکر کیا ہے وہاں اس کی پیری کی درماندگیوں
نزع کی حالت اور موت کا بھی ذکر کر دیا ہے۔

مارکس کا تخیل روشن اور واضح ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ اقتصادی دور
اس کے پیشِ نظر تھا اور وہ آج کل کے حالات کو دیکھ کر اپنے اقتصادی نظریے تراش رہا
تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ سو سال قبل کے حالات موجودہ زمانے سے بالکل مختلف تھے لیکن چونکہ
مارکس نے سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کے صحیح قانون دریافت کر لئے تھے اس وجہ سے اِن

قوانین کی بنا پر جو نتیجے نکالے وہ بھی درست ہیں۔ اس نے ان قوانین کی بنا پر پیشین گوئیاں کی ہیں جن کی صحت کا ثبوت موجودہ اقتصادی حالات دے رہے ہیں۔ مارکسٹ کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ان نظریوں کی بنا پر نہ صرف سماجی زندگی کی پیچیدگیوں کو سلجھا سکتے ہیں بلکہ پیشینگوئیاں کر سکتے ہیں کہ آیندہ کیا ہوگا؟

اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ دعوے کہاں تک ٹھیک ہیں اور مارکس کا قیمت کا نظریہ کہ سماجی ضروری محنت جنس میں قیمت پیدا کرتی ہے کس حد تک آشوب کی علت و اسباب پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہاں ہم مارکس کے مختلف نظریوں سے بحث نہیں کریں گے۔ ان کی صحت وغیرہ کے متعلق ہم اپنے دوسرے مضامین میں مفصل بحث کر چکے ہیں۔ یہاں ہم اُن کو درست مان کر یہ بتائیں گے کہ وہ سرمایہ داری کے موجودہ دور کی کس خوبی سے تحلیل کرتے ہیں۔

یہ بہتر ہوگا کہ یہاں اجمالاً مارکس کے ان اقتصادی نظریوں کا ذکر کر دیا جائے جو نفسِ مضمون سے تعلق رکھتے ہیں۔

مارکس نے سرمایے کی دو قسمیں کی ہیں:-

(۱) زندہ سرمایہ

(۲) مردہ سرمایہ

(۱) زندہ سرمایہ کل سرمایے کا وہ جز ہے جو مزدور کو بطور اُجرت دیا جاتا ہے۔ یہ سرمایہ جنس میں قیمت پیدا کرتا ہے۔ جیسے جیسے کسی طریق پیداوار میں زندہ سرمایہ کم ہوتا جاتا ہے جنس کی قیمت گرتی جاتی ہے۔ اور نفع کی شرح کم ہوتی جاتی ہے۔ آیندہ اس مضمون میں جب ہم یہ کہیں گے کہ طریق پیداوار میں ' ز' کم ہو رہی ہے تو ہمارا یہ مطلب ہوگا کہ مشین مزدور کی جگہ لے رہی ہے۔

(۲) مردہ سرمایہ: یہ سرمایہ کا وہ جز ہے جو زندہ سرمایے کے علاوہ طریق پیداوار میں صرف ہوتا ہے۔ مثلاً مشین، خام اجناس، عمارت وغیرہ۔ مردہ سرمایہ جنس میں قیمت کا اضافہ

نہیں کرتا بلکہ جنس میں صرف اپنی قیمت منتقل کرتا ہے۔ آیندہ اس مضمون میں جب ہم یہ کہیں گے کہ "م" بڑھ رہا ہے۔ تو ہمارا یہ مطلب ہو گا کہ طریق پیداوار آلاتی ہوتا جا رہا ہے۔

یہاں ہم یہ بھی بیان کردیں کہ مارکس کے نفع اور قدرِ زائد کے نظریے کیا ہیں اور ان میں کیا فرق ہے۔

(۱) قدرِ زائد :- مزدور قدرِ زائد پیدا کرتا ہے۔ جب مزدور سے چھ گھنٹے کی اُجرت دے کر بارہ گھنٹے کام کرایا جاتا ہے تو گویا دوسرے چھ گھنٹے مزدور مفت میں کام کرتا ہے۔

اس بیگار کے وقت میں جو قیمت پیدا ہوتی ہے وہ قدرزائد کہلاتی ہے۔ سرمایہ دار جماعت اسی قدر زائد کے مختلف نام رکھتی ہے۔ ایک جز کو سود کا نام دے کر ہضم کرجاتی ہے۔ دوسرے جز کو نفع کہہ کر کھا لیتی ہے۔ تیسرے جز کو خطرے کا معاوضہ کہہ کر صاف کرجاتی ہے۔ ہم اس مضمون میں قدرزائد کی شرح سو فی صدی مانیں گے ہم یہ فرض کریں گے کہ مزدور کو چھ گھنٹے کی اُجرت دی جاتی ہے اور اس سے بارہ گھنٹے کام کرایا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کارخانے میں مزدوری کا بل سو روپے ہے تو سو روپئے قدر زائد ہوگی۔

(۲) نفع :- نفع کی شرح کا دارومدار اس پر ہوگا کہ کارخانے میں کل کتنا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ مثلاً اگر زندہ سرمایہ دس لاکھ روپئے ہے اور مُردہ سرمایہ تیس لاکھ روپئے ہے تو کل سرمایہ چالیس لاکھ ہوا۔ فرض کیجئے کہ دس لاکھ کی رقم بطور قدرزائد ملی تو کل چالیس لاکھ پر شرح نفع پچیس فی صدی ہوئی۔ لیکن اگر کسی کارخانے یا سماج میں زندہ سرمایہ دس لاکھ ہو اور مردہ سرمایہ نوے لاکھ ہو تو قدرزائد تو وہی دس لاکھ رہی۔ لیکن نفع کی شرح میں فرق آگیا۔ وہ دس فی صدی رہ گئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کسی سماج میں مردہ سرمایے کی مقدار زندہ سرمایے سے زیادہ ہو جائے تو اس سماج میں (اگر اور اقتصادی حالات بدستور رہیں) نفع کی شرح

کم ہو جائے گی۔

آئندہ آسانی کے لئے ہم اس مضمون میں زندہ سرمایے کو 'ز' کہیں گے اور مردہ سرمائے کو 'م' اور جب یہ کہنا مقصود ہوگا کہ کسی سماج یا ملک میں سرمایہ داروں میں آپس میں بڑے شدّ و مد سے مقابلہ ہو رہا ہے جس کی وجہ سے طریق پیداوار کو آلاتی بنایا جا رہا ہے۔ مشین مزدور کو برطرف کر رہی ہے، آلات و مشین کے ذریعے جنس سستی کی جا رہی ہے، مزدوری گھٹائی جا رہی ہے تاکہ جنس سستی ہو اور نفع کی شرح بھی نہ گرنے پائے تو ہم صرف یہ کہیں گے کہ طریقِ پیداوار میں 'ز' کم ہو رہی ہے اور 'م' بڑھ رہا ہے۔

اب ہم کارل مارکس کے دعوے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ جیسے جیسے سرمایہ دارانہ طریقِ پیداوار ترقی کرتا جائے گا نفع کی شرح گرتی جائے گی اور طریقِ پیداوار کی ترقی اور انفرادی نفع میں تضاد واقع ہوتا جائے گا۔ اس کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ 'ز' کے گھٹنے اور 'م' کے بڑھنے کا قانون (جو مارکس کی کاوش دماغی کا نتیجہ ہے) اس بات پر قادر ہے کہ موجودہ اقتصادی بدحالی (جس کو کرائسس کہتے ہیں) کے اسباب علل بتائے۔ اب ہم مارکس کے دعوے کی صحت پر نظر ڈالتے ہیں۔

یہ عام مشاہدہ ہے کہ سرمایہ داروں کے آپس کے مقابلے کی وجہ سے دنیا کی صنعت و حرفت بہت تیزی سے آلاتی ہوتی جا رہی ہے۔ یعنی 'ز' گھٹ رہی ہے 'م' بڑھ رہا ہے۔ دراصل صنعتی و حرفتی ترقی نام ہی اس کا ہے کہ 'ز' گھٹے اور 'م' بڑھے۔ 'ز' کی کمی اور 'م' کی زیادتی انسانی ترقی کے مترادف ہے۔ انسانی ترقی اس کے سوا کیا ہے کہ انسان کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ جنس پیدا کرے اور انسان کو زیادہ سے زیادہ فرصت حاصل ہو جس میں وہ اپنی جسمانی دماغی اور روحانی ترقی کی راہیں دریافت کر سکے۔

مارکس کا دعویٰ ہے کہ طریقِ پیداوار میں 'ز' کا گھٹنا اور 'م' کا بڑھنا نفع کی شرح کم کر دیتا ہے۔ البتہ کچھ عرصے کے لئے یہ ممکن ہے کہ باوجود 'ز' گھٹ جانے کے نفع کی شرح نہ گھٹے۔

یہ اس طرح ہوتا ہے کہ مزدور کو خوب نچوڑ کر اس سے قدر زائد زیادہ وصول کی جائے۔ فرض کیجئے کہ سرمایہ داروں کے آپس کے مقابلے کی وجہ سے نفع کی شرح ۵۰ فی صدی کم ہوگئی تو اس نقصان کو پورا کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ جنس کے دام بڑھائے جائیں لیکن وہ مقابلے کی وجہ سے نہیں بڑھ سکتے) دوسرے یہ کہ مزدور کی مزدوری کم کی جائے اور کام زیادہ لیا جائے۔ مزدوری کم کرنے سے کساد بازاری پھیلتی ہے اس لئے مزدور سے زیادہ کام کرا کے نقصان کو پورا کیا جاتا ہے۔ ایسی تیز کار مشینیں بنائی جاتی ہیں کہ ان پر ایک گھنٹہ کام کرنے سے مزدور کی اتنی قوت عمل صرف ہو جاتی ہے جو سست رفتار مشین پر تین گھنٹے میں صرف ہوتی تھی۔ لیکن مارکس کا خیال ہے کہ مشین مزدور کو نچوڑ کر قدر زائد میں اتنا اضافہ نہیں کر سکتی کہ 'ز' کی کمی سے نفع کی شرح میں جو کمی واقع ہوتی ہے اس کو پورا کر دے۔

جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے، مارکس کا اقتصادی اصول یہ ہے کہ 'ز' اور 'م' کی نسبت پر نفع کی شرح کا انحصار ہوتا ہے۔ 'ز' کے نسبتاً گھٹنے اور 'م' کے بڑھنے سے نفع کی شرح میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ مارکس کہتا ہے کہ 'ز' کا گھٹنا تین طریقوں پر ہو سکتا ہے ایک تو یہ کہ 'ز' واقعی گھٹ جائے۔ دوسرے یہ کہ 'ز' تو اسی قدر رہے لیکن 'م' بڑھ جائے۔ جس نسبت سے 'م' بڑھے گا اسی نسبت سے 'ز' گھٹ جائے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ طریق پیداوار میں 'ز' بڑھ رہی ہو لیکن 'م' اس سے زیادہ تیزی سے بڑھ رہا ہو تو بھی 'ز' نسبتاً گھٹ جائے گی اور چونکہ 'ز' قدر زائد پیدا کرتی ہے اور نفع کی شرح قدر زائد کی کل سرمائے سے نسبت کا نام ہے۔ اس لئے جب 'ز' کے گھٹنے سے قدر زائد گھٹے گی تو نفع کی شرح یقیناً کم ہو جائے گی۔ مثلاً کسی سماج کا زندہ سرمایہ ۲۰۰۰ سے ۳۰۰۰ ہو جاتا ہے اور اسی عرصے میں اس کا مردہ سرمایہ ۴۰۰۰ سے ۱۵۰۰۰ ہو جاتا ہے اس کے یہ معنی ہوئے کہ

پہلے سماج کا کل سرمایہ

'م' مردہ سرمایہ   'ز' زندہ سرمایہ   کل سرمایہ

(۱) ۴۰۰۰۰۰۰ روپئے + ۲۰۰۰۰۰۰ روپئے = ۶۰۰۰۰۰۰ روپئے تھا

قدرزائد ۲۰۰۰۰۰۰ روپئے نفع کی شرح ۳۳ ۱/۳ فی صدی ہوئی۔

اب 'م' مردہ سرمایہ   'ز' زندہ سرمایہ   کل سرمایہ

(۲) ۱۵۰۰۰۰۰۰ روپئے + ۳۰۰۰۰۰۰ روپئے = ۱۸۰۰۰۰۰۰ روپئے ہوگیا

قدرزائد ۳۰۰۰۰۰۰ روپئے۔ نفع کی شرح ۱۶ ۲/۳ فی صدی ہوئی۔

نمبر۱ میں 'ز' اور 'م' میں ۱/۲ کی نسبت ہے مگر نمبر۲ میں ۱/۵ کی نسبت ہے۔ اگر مان لیں
کہ 'ز' اپنے برابر قدر زائد پیدا کرتی ہے تو جب نمبر۱ میں زندہ سرمایہ ۲۰ لاکھ تھا تو
اسی قدر زائد بھی ۲۰ لاکھ ہوئی اور ۶۰ لاکھ پر نفع کی شرح ۳۳ ۱/۳ فی صدی ہوئی۔
طریق پر نمبر۲ میں نفع کی شرح صرف ۱۶ ۲/۳ فی صدی ہوئی۔ 'ز' کے گھٹنے سے نفع کی شرح
گھٹ گئی۔ لیکن یہاں ایک اور امر غور طلب ہے وہ یہ کہ نمبر۲ میں نفع کی شرح میں ۵۰ فی صدی
کی کمی واقع ہوگئی۔ لیکن مجموعی نفع ۲۰۰۰۰۰۰ روپئے سے ۳۰۰۰۰۰۰ روپئے ہوگیا
مارکس کہتا ہے کہ یہ سرمایہ داری کا ایک نہایت اہم پہلو ہے کہ سرمایہ داری میں یہ ممکن ہے کہ نفع
کی شرح گرتی جائے۔ لیکن اس کی کل مقدار بڑھتی جائے۔ جیسے جیسے نفع کی شرح گرتی جاتی
ہے سرمایہ دار کل سرمایے کو بڑھا کر مجموعی نفع زیادہ کرتا جاتا ہے۔ جوں ہی نفع کی شرح ۳۳ ۱/۳ فیصدی
سے ۱۶ ۲/۳ فی صدی ہوئی۔ سرمایہ دار نے فوراً ۱۲۰۰۰۰۰۰ روپئے زیادہ لگاکر نفع کی
مقدار کو ۲۰۰۰۰۰۰ روپئے سے ۳۰۰۰۰۰۰ روپئے کرلیا۔ نفع کی شرح تو کم
ہوگئی لیکن مقدار میں اضافہ ہوگیا۔ اگر یہ صورت حالات برابر قائم رہے تو سرمایہ دارانہ نظام
قائم رہ سکتا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ صورت قائم نہیں رہتی اس شکل میں سرمایہ دار
صنعت و حرفت میں برابر روپیہ لگاتا رہے گا اور مزدوروں کے لئے روزگار مہیا کرتا رہے گا
سرمایہ دار کا مطمح نظر صرف نفع کی شرح ہی نہیں ہے بلکہ اس کی کل مقدار بھی ہے۔ سرمایہ دار

اپنا نفع بڑھانے کے لئے اس پر مجبور ہے کہ طریق پیدا وار کو ترقی دے۔

لیکن فرض کیجئے کہ کل سرمایہ ۶۰۰۰۰۰ سے صرف ۸۰۰۰۰۰ ہوا لیکن "ز" اور "م" کی نسبت ۱/۵ ہو گئی یعنی ۱۶۰۰۰۰ (ز) ۶۴۰۰۰۰ (م) (ز) نے حسب قاعدہ اپنے برابر ۱۶۰۰۰۰ روپے قدر زائد پیدا کی یعنی

نمبر (۳) مردہ سرمایہ	زندہ سرمایہ	کل سرمایہ
۶۴۰۰۰۰ +	۱۶۰۰۰۰ =	۸۰۰۰۰۰

قدر زائد ۱۶۰۰۰۰ ہوئی نفع کی شرح ۲۰ فی صدی ہوئی نمبر ۱ اور نمبر ۳ کے مقابلے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نمبر ۳ میں کل سرمایہ بڑھ گیا۔ لیکن نفع کی شرح اور مجموعی نفع کم ہو گیا۔ نمبر ۱ میں ۶۰۰۰۰۰ روپے لگا کر ۲۰۰۰۰۰ روپے قدر زائد ملی تھی اور شرح نفع ۳۳ ۱/۳ فی صدی ہوئی تھی۔ نمبر ۳ میں کل سرمایہ تو زیادہ لگا۔ لیکن قدر زائد نفع کی شرح کم رہی۔ کون سا ایسا سرمایہ دار ہے جو ۲۰۰۰۰۰ روپے زیادہ لگا کر اپنے نفع میں ۴۰۰۰۰ روپے کی کمی کرے گا۔ جب کسی سرمایہ دار سماج میں زندہ اور مردہ سرمایے کی نسبت مثال نمبر ۳ کی سی ہو جائے گی تو اس سماج کا طریق پیدا وار فوراً مفلوج ہو کر رہ جائے گا۔ اس مثال سے یہ اظہار مقصود ہے کہ طریق پیدا وار کی ترقی کے ساتھ ساتھ نفع کی شرح کا کم ہونا لازمی ہے اور سرمایہ دار کے لئے یہ از حد ضروری ہے کہ کل سرمایے کو بہت تیزی سے بڑھائے تاکہ مجموعی طور پر نفع بڑھے۔ ۶۰۰۰۰۰ روپے کو بڑھا کر صرف ۸۰۰۰۰۰ روپے کرنے سے مقصد حل نہیں ہوتا۔ نمبر ۲ کی طرح مردہ سرمایہ ۱۵۰۰۰۰۰ روپے بڑھانا ہو گا تب کہیں مجموعی نفع بڑھ سکے گا۔

اب مارکس یہ بتاتا ہے کہ سرمایے کے بڑھنے کی کیا شرح ہونی چاہئے کہ طریق پیدا وار مفلوج ہو کر نہ رہ جائے۔ مارکس یہ کہتا ہے کہ سرمایہ اتنی تیزی سے بڑھنا چاہئے تاکہ "ر" بڑھ سکے۔ دوسرے الفاظ میں جس تیزی سے م/ز میں زنگرے اس نسبت سے تھوڑی زیادہ تیزی

سو سرمایہ بڑھنا چاہئے تاکہ نفع کی مجموعی مقدار زیادہ رہے اگر 'ز' آہستہ آہستہ گر رہی ہے تو کل سرمایے کی تھوڑی سی زیادتی نفع کی شرح کو سنبھالے رکھے گی۔ لیکن اگر 'ز' تیزی سے گر رہی ہے تو کل سرمایے کو بہت تیزی سے بڑھنا ہوگا۔ مارکس وہ شرح بیان کرتا ہے جس تیزی سے سرمایے کا بڑھانا لازمی ہے' اگر سرمایہ اس تیزی سے نہ بڑھے تو سرمایہ داری ترقی نہیں کر سکتی۔ فرض کیجئے کہ کسی سماج میں (ز کے گھٹنے سے) نفع کی شرح (ہر سال) آدھی رہ جاتی ہے۔ مثلاً پہلے سال نفع کی شرح چالیس فی صدی تھی، دوسرے سال بیس فی صدی ہوئی، تیسرے سال دس فی صدی ہوئی اور چوتھے سال پانچ فی صدی رہ گئی۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ اگر مجموعی نفع کو پہلے کے برابر رکھنا ہو تو ہر سال سرمایے کو دگنا کرنا ہوگا۔ اگر پہلے سال سرمایہ ۱۰۰ روپئے تھا تو دوسرے سال ۲۰۰ روپئے کرنا ہوگا۔ یہاں تک کہ چوتھے سال ۸۰۰ روپئے کرنا ہوگا۔ اس مثال میں نفع کی شرح ہر سال ½ رہ جاتی ہے اور اس نقصان کو پورا کرنے کے لئے ہر سال سرمایے کو دگنا کرنا پڑتا ہے یعنی نفع کی شرح کا مقسوم سرمایے کا مضروب فیہ ہونا چاہئے تب یہ مشکل حل ہوگی کہ مجموعی نفع کی مقدار برابر رہے۔ اس بیان سے یہ ثابت ہوگیا کہ اگر سرمایہ داری کو قائم رکھنا ہے تو سرمایے کو اسی نسبت سے بڑھانا ہوگا جس نسبت سے نفع کی شرح گر رہی ہو۔ ورنہ طریق پیداوار کی ترقی رک جائے گی۔

اگر سرمایہ اتنی تیزی سے نہ بڑھے گا تو نفع کم ہو جائے گا جیسا ہم نمبر ۳ میں ظاہر کر چکے ہیں اور سرمایہ دار کو کوئی لالچ نہ رہے گا کہ طریق پیداوار کو ترقی دے۔ مارکس کہتا ہے کہ ہر زمانے میں ایک خاص رفتار سے سرمایہ جمع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کسی وجہ سے اس رفتار سے سرمایہ جمع نہ ہو سکے تو نفع میں کمی ہونی لازمی ہے اور ایسا ہوتے ہی طریق پیداوار کا رک جانا لازمی ہے۔

اس بیان سے یہ ثابت ہوگیا کہ سرمایہ دارانہ طریق پیداوار میں سرمایہ جمع کرنا طریق پیداوار کو آلاتی بنانا اور نفع کی مجموعی مقدار کو بڑھانا لازمی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ لازمی باتیں

سرمایہ داری کو مفلوج کردیتی ہیں۔ اُن کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مشین انسان کی جگہ لے لیتی ہے۔ سرمایہ سمٹ کر چند ہاتھوں میں چلا جاتا ہے۔ سماج میں جنس خریدنے کی استطاعت نہیں رہتی۔ بازار میں اجناس کی بھیڑ ہوجاتی ہے، نفع غائب ہونے لگتا ہے۔ نفع کی شرح گرتے ہی سرمایہ اس تیزی سے جمع نہیں ہو سکتا جس کی طریق پیداوار کو ضرورت ہوتی ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طریق پیداوار میں آشوب ہوجاتا ہے۔

جس نے ۱۹۲۹ء سے آج تک کی اقتصادی بدحالی کا مطالعہ کیا ہے (جو سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کا عطیہ ہے) اس امر سے انکار نہیں کرسکتا کہ آشوب جنس کے بھیڑ ہوجانے اور نہ فروخت ہونے کو کہتے ہیں۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ مفکرین اس آشوب کو رفع کرنے کی کیا صورت بتلاتے ہیں۔ وہ اس آشوب کا علاج یہ بتاتے ہیں کہ عوام کی خرید کی طاقت سرکاری امداد، بے روزگاری کا بیمہ اور بڑھاپے کی پنشن دے کر بڑھانی چاہیئے تاکہ اس میں جنس خریدنے کی اہلیت پیدا ہو اور پھر طریق پیداوار نفع بخش ہوجائے لیکن یہاں سرمایہ دار مفکرین یہ بھول جاتے ہیں کہ جب نفع کی شرح گرتی ہے اس وقت سرمایہ دار کو خود سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ نفع کی مجموعی مقدار بڑھا سکے۔ اس وقت وہ غریب کی کب مدد کرسکتا ہے۔

آج کل سرمایہ دار کو سرمایہ جمع کرنے کی بہت سخت ضرورت ہے۔ ز، م کی نسبت بہت تیزی سے گر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ داری بجائے اس کے کہ عوام کی جنس خریدنے کی طاقت بڑھائے، مزدوری کو کم کرتا ہے اور جنسوں کی قیمت بڑھاتا ہے۔ ہر آشوب میں یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ دار مزدوری گھٹا دیتا ہے اور سرکاری امداد، بے روزگاری کا بیمہ اور بڑھاپے کی پنشن وغیرہ بند کردیتا ہے تاکہ سرمایہ جمع کرنے کی رفتار میں کمی واقع نہ ہو۔ ہم اس رفتار کا اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ نفع کی شرح کا مقسوم سرمائے کا مضروب فیہ ہونا چاہیئے۔ اگر سرمایہ اس رفتار سے جمع نہ ہو تو یہ سرمایہ داری کے لئے بہت ہی مہلک شکل ہے۔

مزدور کی اُجرت میں اضافہ اس فنڈ ہی کو ختم کر دیتا ہے جو نفع کی شرح گرنے پر صنعت میں لگایا جاتا ہے تاکہ نفع کی کل مقدار کو بڑھایا جا سکے۔

یہاں ہم نے سرمایہ داری کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی اگر سرمایہ دار عوام کو مالی امداد نہیں دیتے تو بازاروں میں جنسوں کی بھیڑ ہو جاتی ہے۔ قیمت گر جاتی ہے نفع کی شرح کم ہو جاتی ہے اور آشوب پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر امداد دیتے ہیں تو نفع کی شرح گر جاتی ہے۔ سرمایہ ضروری رفتار سے جمع نہیں ہو سکتا طریق پیداوار رک جاتا ہے۔ نفع کی شرح گرتے ہی سرمایہ دار کو طریق پیداوار کے چلانے کا کم لالچ رہ جاتا ہے۔ وہ طریق پیداوار سے روپیہ کھینچ لیتا ہے اور دبا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طریق پیداوار اور منڈیاں سکڑ جاتی ہیں، مزدور بیکار ہو جاتا ہے، جنس فروخت نہیں ہوتی اور آشوب پیدا ہو جاتا ہے۔

دراصل سرمایہ داری اسی وقت چل سکتی ہے جب سماج کا زیادہ حصہ افلاس زدہ رہے اور سرمایہ دار کوڑی کوڑی جمع کرتا رہے تاکہ "ز" کی گرتی ہوئی نسبت سے جو نقصان ہو اس کو کل سرمایہ بڑھا کر پورا کر سکے۔ جب سرمایہ دار مفکروں کے سامنے یہ تجویز پیش ہوتی ہے کہ آشوب کو رفع کرنے کے لیے سماج میں جنس کے خریدنے کی طاقت تقسیم کرنی چاہیے تو سرمایہ دار بہت ہراساں ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے سرمایہ داری کے چلنے کے لیے جو دوسری شرط ہے (کہ سرمایہ تیزی سے بڑھے) پوری نہیں ہو سکتی۔ ان کا ہراس درست ہے کیوں کہ اگر ان ماہرین اقتصادیات کی رائے پر جو سماج کی خرید کی طاقت بڑھا کر آشوب کو رفع کرنا چاہتے ہیں کبھی بھی بڑے پیمانے پر عمل کیا گیا تو یہ کوشش سرمایہ دارانہ نظام کو فوراً درہم برہم کر دے گی۔

سرمایہ داری کے لئے دو متضاد باتیں ضروری ہیں:۔

(۱) سرمایہ داروں کا انفرادی نفع کا تخیل اور آپس کا مقابلہ ان کو اس پر مجبور کرتا ہے کہ طریق پیداوار کو آلاتی بنائیں۔ یعنی "ز" کو کم کریں اور "م" کو بڑھائیں۔

(۲) طریق پیداوار کو آلاتی بنانے سے جنس کی بھیڑ ہو جاتی ہے، آدمی غریب ہو جاتا ہے

سرمایہ دار کو یہ ضرورت ہوتی ہے کہ "زر" بڑھے۔

سرمایہ داری بیک وقت یہ چاہتی ہے کہ "زر" گھٹے بھی اور بڑھے بھی۔ یہ متضاد باتیں کیسے ہو سکتی ہیں؟

آج کل سرمایہ داری نظام کا یہ پہلو کہ اس میں پیسہ پیسہ جمع کرنا پڑتا ہے، ایک بھیانک حقیقت ہو گئی ہے۔ لیکن سرمایہ داری کے ابتدائی زمانے میں یہی وہ خصوصیت تھی جو اس کو بام ترقی پر لے گئی تھی۔ شروع میں سرمایہ دارانہ مقابلہ کے قانون اور نفع کی شرح کے گرنے کے قانون نے سرمایہ دار کو مجبور کیا کہ سائنس آلات اور مشین صنعت و حرفت کو ترقی دے۔ دُنیا کے چپہ چپہ میں جا کر صنعت و حرفت جاری کرے اور اس کو آلاتی بنائے۔ سرمایہ داری دنیا کے ہر گوشے میں نہ صرف کلیں اور مشینیں لے کر پہنچی بلکہ اس تہذیب و تمدن کو بھی لے گئی جو ان آلات اور مشینوں کا پیدا کردہ تھا۔ بادی النظر میں یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ تہذیب و تمدن بھی کوئی ایسی چیز ہے جس کو مشین پیدا کرے۔ مگر کسی زمانے کا تمدن، تہذیب اور مذہب ہمیشہ اس زمانے کے طریق پیداوار کا عکس ہوتا ہے۔ سرمایہ داری ایک ایسا طریق پیداوار تھا جو دنیا نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور اس طریق پیداوار کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ انسان کو مجبور کرتا تھا کہ قدرت کی طاقتوں پر قابو پائے۔ کیونکہ اس طریق میں ان طاقتوں کے پھیلنے کے لئے بہت وسیع فضا تھی۔

اقتصادی مقابلے میں نفع کی شرح گرنے اور سرمایہ بڑھانے کے قانون ہی تھے جنھوں نے ذرائع رسد و رسائل کو اتنا عام کر دیا۔ کڑوروں فیکٹریاں جاری کر دیں۔ دلدلوں کو شہر دں میں تبدیل کر دیا۔ مارکس نے بارہا سرمایہ دار جماعت کا شکر سے ذکر کیا ہے اور کہا ہے "یہ سرمایہ داری ہی کی برکت تھی کہ اس نے بڑی تیزی مگر بے رحمی کے ساتھ قدرت کی سوئی ہوئی طاقتوں کو انسانی خدمت کے لئے لا کھڑا کیا" وہ سرمایہ دار جماعت کو TRUSTEES OF SOCIETY کے نام سے پکارتا ہے کیونکہ یہ وہ جماعت ہے جس کے خزانوں میں وہ تمام دولت جاتی ہے جو انسانوں

کے آپس کے تعاون سے کام کرنے کا نتیجہ ہے۔

لیکن آج سرمایہ دارانہ طریق پیداوار اپنا مشن پورا کر چکا ہے۔ سرمایہ داری نے انسان کی سست دستکاری کو ختم کر دیا ہے اور پیداوار کی طاقتوں کو اتنا وسیع اور طاقتور بنا دیا ہے کہ اب سرمایہ دارانہ نظام ان طاقتوں کے لئے تنگ ہو گیا ہے۔ جب تک سرمایہ داری کی چار دیواری مضبوط ہے اس وقت تک اگرچہ وہ طریق پیداوار کی طاقتوں کو مقید رکھ سکتی ہے لیکن وہ طاقتیں اپنے فطری رجحان کے مطابق وسیع ہونے کی کوشش میں چار دیواری سے ٹکراتی رہیں گی اور تصادم پیدا ہوتا رہے گا۔ جس کی وجہ سے سماج میں ابتری بڑھتی چلی جائیں گی۔

طریق سرمایہ داری میں 'ز' کے گرنے اور 'م' کے بڑھنے کا قانون سرمایہ دار ملکوں کو مجبور کرتا ہے کہ دنیا کے ہر گوشے میں جا کر دیکھیں کہ نفع کی شرح کہاں زیادہ ہے تاکہ وہاں فیکٹریاں کھولیں لیکن فی زمانہ یہ ظلم ہے کہ جہاں بھی کوئی کسی سرمایہ دار ملک میں پہنچتا ہے وہیں ایک حریف موجود ہوتا ہے جو اس کی دال گلنے نہیں دیتا۔ چنانچہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس ملک کا سرمایہ بیکار رہے اور کس کا نفع پیدا کرے۔ کیونکہ سرمایہ داری میں نفع کا مسئلہ حیات و موت کا مسئلہ ہوتا ہے اس لئے اس کا حل میدان جنگ پر ہوتا ہے۔

اب ہمیں دنیا کی اقتصادی اور سیاسی حالت کا اندازہ بہت صاف ہو گیا ہے کہ موجودہ ہنگامہ آرائی کا اصلی مفہوم کیا ہے۔ مارکس کا قیمت کا نظریہ ہی یہ تحلیل ممکن کرتا ہے کہ آج کل دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔

یہاں ایک اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ مارکس نے عرصہ ہوا یہ کہا تھا کہ جس تیزی سے طریق پیداوار میں 'ز' کم ہو رہی ہے اور 'م' بڑھ رہا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرمایہ داری ختم ہوا چاہتی ہے۔ لیکن سرمایہ داری کا بادل دنیا پر ابھی تک چھا رہا ہے اس لئے شبہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ مارکس کا نظریہ غلط ہو۔ اب اس پر غور کرنا ہے کہ سرمایہ داری اب تک کیوں

ختم نہیں ہوئی اس کی وجوہات ہم سلسلہ وار بیان کرتے ہیں۔

(۱) 'ز' اتنی تیزی سے نہیں گر رہی جتنا کہ مارکس کا خیال تھا۔

اگرچہ سماج میں 'ز' عام طور پر کم ہوگئی ہے لیکن اس کی کمی کو مزدور سے زیادہ کام لے کر پورا کیا جا رہا ہے مثلاً اگر دو آدمی چھ گھنٹے کام کرتے تھے تو ان کو برطرف کرکے دونوں کی اجرت سے ذرا کم پر ایک آدمی رکھا جو بارہ گھنٹے کام کرتا ہے یہاں 'ز' کی تعداد میں تو فرق آ گیا لیکن مقدار میں فرق نہیں آیا۔ محنت وہی بارہ گھنٹے کی رہی۔ البتہ دو مزدور کی بجائے ایک مزدور رہ گیا۔ انگلستان میں اب بھی 'ز' کافی ہے اور 'م' اس قدر نہیں بڑھا جتنا امریکہ روس اور جرمنی میں بڑھا ہوا ہے؛ اس پر بھی یہ حالت ہے کہ آسٹن کے موٹر کے کارخانے میں ۱۹۲۳ء میں ۵۵ آدمی ایک موٹر کی تیاری کے لئے درکار تھے لیکن ۱۹۳۲ء میں آٹھ آدمی موٹر بنا لیتے ہیں۔ یہ اس طرح ممکن ہوا کہ کارخانہ کو اور آلاتی بنایا اور ان آٹھ مزدوروں سے تگنا چوگنا کام لیا جانے لگا۔ یہاں اگر مزدوروں کو تعداد کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو 'ز' بہت گر گئی لیکن اگر محنت کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو اتنی نہیں گری

(۲) قدر زائد بڑھ گئی ہے۔

طریقۂ پیداوار جیسے جیسے آلاتی ہوتا جاتا ہے جنسوں کے دام گرتے جاتے ہیں جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مزدور کو زندہ رکھنے اور بال بچوں کو پرورش کرنے میں جن اجناس کی ضرورت ہوتی ہے اس کے دام بھی گر جاتے ہیں۔ نتیجتاً مزدور کی قیمت گرتی جاتی ہے

فرض کیجئے سو مزدور ایک ہفتے میں چار سو روپے کی قیمت پیدا کرتے ہیں ان کی اجرت دو سو روپیہ ہے اور پچاس فی صدی قدرِ زائد پیدا کرتے ہیں مگر صنعت و حرفت کی ترقی سے اور نتیجتاً جنس کے سستا ہونے کے باعث جن مزدوروں کو پہلے دو سو روپے ملتے تھے اب ایک سو پچاس روپے ملنے لگے۔ ظاہر ہے کہ اجرت کم ہو جانے پر بھی وہ چار سو روپے کی جنس پیدا کرتے رہیں گے اس کے یہ معنی ہوئے کہ اجرت گھٹ جانے پر سرمایہ دا

کو دو سو پچاس روپئے قدرِ زائد مل گئی ۔ جہاں یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے ۔ وہاں نفع کی شرح کے گرنے کا کم اثر محسوس ہوتا ہے ۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ 'ز' کی کمی اور 'م' کی زیادتی جہاں نفع کی شرح کم کرتی ہے وہاں زیادہ بھی کرتی ہے ۔ اس طریق پر سرمایہ داری کے لئے ممکن ہو جاتا ہے کہ کچھ عرصے اور آرام کا سانس لے لے ۔ مارکس کہتا ہے کہ 'ز' کے گھٹنے سے نفع کی شرح میں جو کمی واقع ہوتی ہے اس کو مزدور کو نچوڑکر اور اس کی اُجرت کم کرکے پورا نہیں کیا جا سکتا ۔ البتہ شرح کے گرنے کی رفتار کو کم کیا جا سکتا ہے ۔ مزدور کو نچوڑنے کی بھی ایک حد ہے جس کے بعد اس کو نہیں نچوڑا جا سکتا لیکن نفع کی شرح کے گرنے کی کوئی حد نہیں ۔

(۳) "م" کی قیمت اور حجم میں فرق ہے ۔

'م' کے حجم کی زیادتی اور 'م' کی قیمت کی زیادتی میں فرق ہے ۔ 'م' کی قیمت اس نسبت سے نہیں بڑھتی جس نسبت سے حجم بڑھ رہا ہے ۔ مشینیں اب مشینوں سے بنتی ہیں اس لئے ان میں قیمت کم ہوتی ہے ۔ لیکن بظاہر دنیا کی صنعت و حرفت میں 'م' بہت بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے اور یہ گمان ہوتا ہے کہ جب 'م' کی زیادتی اس قدر ہو گئی تو نفع کی شرح صفر ہو جانی چاہئے ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ 'م' کا حجم بڑھ رہا ہے اور قیمت کم ہو رہی ہے ۔ سماج میں 'م' 'ز' کی نسبت اتنا زیادہ نہیں ہوا کہ نفع کی شرح صفر ہو جائے ۔

نفع کی شرح اس طرح بھی بڑھائی جاتی ہے کہ دوسرے ملکوں سے مزدور کے استعمال کی جنسیں غلہ وغیرہ سستے داموں پر منگا لی جاتی ہیں جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مزدوری کم ہو جاتی ہے قدرِ زائد زیادہ پیدا ہونے لگتی ہے ۔ سرمایہ دار ملک غیر ترقی یافتہ ملکوں کے بازاروں میں اقتصادی لوٹ مچا کر بھی نفع کی شرح بڑھا لیتے ہیں ۔ لیکن یہ تدبیریں نفع کی شرح کو گرنے سے روک نہیں سکتیں ، صرف گرنے کی تیزی کو آہستہ کر سکتی ہیں ۔ عام طور پر یہ سوال ہوتا ہے کہ اگر آشوب کی رفتار آہستہ کی جا سکتی ہے تو کیا اس کو روکا نہیں جا سکتا ۔ مارکس کہتا ہے کہ نظامِ سرمایہ داری میں آشوب ہونا لازمی ہے ۔ سرمایہ دار مفکرین کہتے ہیں

کہ 'ز' اور 'م' کو اس طرح بڑھایا جا سکتا ہے کہ بازار میں جنس کی بھیڑ نہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ ذرائع پیداوار اور امیر طبقے کیلئے ہی جنس بنانی چاہیئے عوام کے لئے جنس بنانے کی ضرورت ہی نہیں لیکن جب جنس چند امیروں کے لئے ہی بنے گی تو ذرائع پیداوار بنانے سے کیا فائدہ اور امیر آخر کتنی جنس خرید لیں گے

دوسری بات سرمایہ دار مفکرین یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں ابھی تک اس قدر غیر ترقی یافتہ ممالک موجود ہیں کہ ان میں سرمایہ لگا کر سرمایہ داری کو از سر نو جوان کیا جا سکتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر سرمایہ دار ممالک تحفظ و حفاظت کی پالیسی ترک کر دیں اور ممالک میں آزادی کے ساتھ لین دین ہونے دیں تو سرمایہ داری میں آشوب نہیں ہوگا۔

کارل مارکس کے نزدیک یہ سب تجاویز بے کار ہیں کیونکہ یہ 'ز' کے گرنے اور 'م' کے بڑھنے کو نہیں روک سکتیں۔ سماج میں تھوڑے ہی عرصے میں اتنا سرمایہ پیدا ہو جائے گا کہ اس کو طریق پیداوار میں لگانے سے نفع کی شرح بجائے بڑھنے کے گھٹنے لگے گی مثلاً ۲۰۰۰ روپئے سے ۲۰۰ روپئے نفع ہوتا ہے تو شرح نفع ۱۰ فی صدی ہوئی۔ فرض کیجئے کہ سماج نے نفع کو اصل میں جمع کر کے ایک عرصے میں ۳۰۰۰ روپئے کر لئے اور مشین وغیرہ خرید لی یعنی 'م' اب ایک ہزار روپئے زیادہ ہو گیا۔ اور جنس ½ زیادہ پیدا ہونے لگی۔ لیکن 'ز' وہی رہی یعنی سماج میں جنس کی مقدار تو بڑھ گئی لیکن خرید کی استطاعت نہیں بڑھی لامحالہ جنس کو سستا کرنا پڑے گا۔ نفع کی شرح گر جائے گی۔ فرض کیجئے کہ نفع کی شرح ۶،۶ فیصدی ہو گئی اس کے یہ معنی ہوئے کہ ۳۰۰۰ روپے پر ۱۹۸ روپئے نفع ہوا پہلے ۲۰۰۰ روپے لگا کر ۲۰۰ روپئے نفع ہوتا تھا اب ۳۰۰۰ روپئے لگا کر ۱۹۸ روپئے نفع ہوا۔ اس صورت میں کون سی سرمایہ دار سماج ہے جو طریق پیداوار کو بڑھائے گی۔ مارکس کہتا ہے کہ کتنا ہی کچھ کیجئے لیکن سرمایہ دارانہ سماج میں ایک وقت ایسا آئے گا کہ سرمایے کا ذرا سا بڑھنا کل سماجی سرمائے کی نفع کی شرح کو گھٹا دے گا۔ مارکس کہتا ہے کہ سرمایہ اور مزدور دونوں موجود ہوں گے مگر ایک دوسرے کو استعمال نہ کر سکیں گے۔ کیوں کہ ان کے ملنے سے نفع کی شرح بجائے

بڑھنے کے گرنے لگے گی جس کو آشوب کہتے ہیں۔ نفع سرمایہ داری کی جان ہے اگر سرمایہ داری سے نفع کا تخیل مفقود ہو جائے تو وہ سرمایہ داری ہی نہیں رہتی۔ یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ جنس کی افزائش کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ انسانی ضرورت سے زیادہ بن گئی۔ ممکن ہے کہ لاکھوں انسان اس جنس کی ضرورت سے مر رہے ہوں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں جنس نفع کے لئے بنائی جاتی ہے اور جونہی کہ اس کے لین دین سے نفع غائب ہوا سرمایہ دارانہ اصطلاح میں وہ ضرورت سے زیادہ پیدا ہو گئی۔ سرمایہ داری کا مطمح نظر انسانی ضرورت کو پورا کرنا نہیں ہے بلکہ نفع کو بڑھانا ہے۔ سرمایہ داری کا یہ دعویٰ ہے کہ اگر ہر انسان اپنے نفع کی طرف دیکھے تو اس کا ضروری نتیجہ یہ ہوگا کہ سب انسانی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں گی اور سماج بہت ترقی کر سکے گی۔ سرمایہ داری کی حمایت میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اس نے انسانی خود غرضی کو طریق پیداوار کے ساتھ منسلک کرکے اس کو ترقی کا ایک سبب بنا دیا۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سرمایہ داری کا مطمح نظر نفع ہے۔ یہ بالکل اتفاقی امر ہے کہ طریق پیداوار میں حصہ لینے سے نفع پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر بغیر جنس بنائے نفع ہونے لگتا تو سرمایہ دار کبھی بھی جنس نہ بناتا۔ چنانچہ جب بھی جنس بنانے میں نفع غائب ہوتا ہے سرمایہ دار جنس بنانی بند کر دیتا ہے اور جب جنس تباہ کرنے میں نفع معلوم ہوتا ہے تو وہ اس کو تلف کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتا۔ آج کل روئی، قہوہ، چائے، نارنگیاں، گیہوں، مچھلی عام طور پر تباہ کی جاتی ہیں تاکہ نفع کی شرح نہ گرنے پائے۔ ہندوستان میں شکر اور سن کی پیداوار گھٹائی جا رہی ہے۔ حالانکہ لاکھوں ہندوستانیوں کو شکر دیکھنے کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ یہ معاملہ خام جنس کے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ فیکٹریاں تباہ کر دی جاتی ہیں تاکہ نفع کی شرح گرنے نہ پائے۔

مارکس مندرجہ بالا تدابیر کو ناپائیدار اور ہنگامی کہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس طرح نفع کی شرح بڑھانے سے نقصان ہوتا ہے کیونکہ جب دوبارہ آشوب ہوتا ہے تو اور زیادہ

سخت ہوتا ہے۔

سرمایہ داری کا نفع بڑھانے کا دوسرا طریقہ جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں قدر زائد کو زیادہ کرنا ہے۔ لیکن یہ سرمایہ دار کی آدھی فتح ہے۔ کیونکہ جب تک سرمایہ دار قدر زائد روپیے میں نہ بدل لے اس وقت تک اس کا مقصد حل نہیں ہوتا۔ لیکن قدر زائد بڑھانے سے سماج میں روپئے کی تقسیم میں کمی آتی ہے۔ یہاں بھی وہی تضاد کی شکل پیدا ہو جاتی ہے سرمایہ داری کی ساری خرابی یہ ہے کہ اس کا مطمع نظر نفع ہے۔ کچھ عرصے نفع کا بڑھنا اور طریق پیداوار کی ترقی دوش بدوش چلتی ہیں۔ طریق پیداوار کی ترقی کے ساتھ ساتھ نفع بھی بڑھتا ہے۔ لیکن ایک منزل پر پہنچ کر انفرادی نفع اور طریق پیداوار کی ترقی میں تضاد واقع ہو جاتا ہے۔ نفع کو بڑھائیں تو طریق پیداوار سکڑتا ہے اور اگر طریق پیداوار کو وسیع کریں تو نفع گرتا ہے۔

موجودہ زمانے میں طریق پیداوار میں مستقل تضاد کی شکل پیدا ہو گئی ہے۔ اب کوئی ایسا طریق پیداوار تخلیق کرنا پڑے گا جس میں پیداوار کی طاقتوں کی نشو ونما کے لئے وسیع فضا ہو۔ مارکس کہتا ہے کہ کسی طریق پیداوار کو زندہ رہنے کا حق اسی وقت تک ہے جب تک اس میں پیداوار کی طاقتوں کی نشو ونما کے لئے گنجائش ہے۔ سرمایہ داری اب اس پر مجبور ہو گئی ہے کہ طاقتوں کو بجائے بڑھانے کے گھٹائے؛ لہذا اب اس کو حق نہیں کہ پیداوار کی طاقتوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھے۔

کارل مارکس کا خیال تھا کہ اگر سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کو نہیں بدلا گیا تو دنیا میں اس قدر کشت و خون ہوگا کہ عجب نہیں کہ دنیا کا تہذیب و تمدن ختم ہو جائے۔ اگرچہ یہ مسئلہ بھی بحث طلب ہے کہ آیا ہمارا تہذیب و تمدن اس قابل ہے بھی کہ اس کی تباہی پر کف افسوس ملا جائے؟ بہر حال جب انسان ہی فنا ہو گیا تو اچھی بری تہذیب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں حیوانات کا زندہ رہنا اور نسل انسانی کا ایک غلط سماجی نظام کا شکار ہو جانا قابل افسوس ضرور ہے اس تباہی سے اگر کوئی نظام بچا سکتا ہے تو وہ سوشلسٹ نظام ہے۔

ملک الشعرا ذوق

(۱) غزلیات

ذوق کو آج کل کے معیار سے جانچنا درست نہیں اس لئے کہ وہ بالکل اپنے زمانے کی پیداوار تھے اس لئے انھیں اس عہد سے باہر نکال کے دیکھنا ان کی حق تلفی کرنا ہے۔ موجودہ معیار کے مطابق وہ شاعر نہیں تھے لیکن اپنے عہد کے بہترین شاعر سمجھے جاتے تھے محض اس لئے کہ اس زمانے کا معیار شاعری دوسرا تھا یعنی شعر میں ظاہری خوبیاں پیدا کرنا اور ان پر داد طلب کرنا۔

کچھ تو شاہ نصیر کی دلی سے غیر حاضری اور کچھ معرکوں میں دو بدو کامیاب مقابلوں نے

پیدائش ۱۷۸۹ء ۔ وفات ۱۸۵۴ء ۔ ایک غریب سپاہی شیخ محمد رمضان کے لڑکے تھے ۔ ابتدائی تعلیم ایک شخص حافظ غلام رسول کے سپرد ہوئی جن کو شعر گوئی سے شوق تھا۔ ان کے طلبا میں بھی اسی وجہ سے شوق پیدا ہوا ان کے ایک ہم عمر اور ہم سبق میر کاظم حسین بیقرار کی وساطت سے شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے ذوق نے غیر معمولی صلاحیت دکھلائی چنانچہ شاہ نصیر نے انھیں ٹالنا شروع کیا یہاں تک کہ شاگردی منقطع ہوگئی۔ خود اپنی غزلوں پر نظر ثانی کرنے لگے۔ غزلیں بے انتہا مقبول و معروف ہوگئیں۔ ظفر بادشاہ کی غزل شاہ نصیر ٹھیک کیا کرتے تھے وہ دکن چلے گئے۔ اس کے بعد میر کاظم حسین نے بنانا شروع کیا لیکن وہ بھی الفنسٹن صاحب کے میر منشی ہو کر باہر چلے گئے۔ چنانچہ بادشاہ کی غزلوں کی اصلاح کا کام ذوق کے سپرد ہوا۔ انہیں دنوں میں نواب الٰہی بخش خاں (غالب کے خسر) بھی ذوق کو نئی غزلیں دکھلانے لگے ان دونوں کی غزلیں بنانے میں آپ خود بھی بن گئے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً بیس برس کی تھی جب شاہ نصیر دکن سے واپس آئے تو مشاعروں میں اکثر ان سے معرکے ہوتے رہے تھوڑے عرصے میں اکبر شاہ ثانی نے ان کو خاقانی ہند کا خطاب دیا ظفر جب بادشاہ ہوئے تو بھی یہ موقعہ موقعہ پر قصائد کہتے رہے یہاں تک کہ تنخواہ انکی چار سے سو روپئے ہوگئی۔ ایک دفعہ گاؤں جاگیر میں ملا اور خطاب خان بہادری و ہاتھی معہ حوضہ دوسرے موقعوں پر۔ بعمر ۶۰ سال ۱۲۷۱ھ میں انتقال کیا۔

تصانیف :۔ ظاہر ہے کہ بہت کچھ کہا ہوگا مگر غدر میں سب تباہ ہوگیا۔ ان کے شاگردوں یعنی محمد حسین آزاد اور حافظ غلام رسول ویران وغیرہ نے کچھ کلام فراہم کرکے ۱۲۰۰ اشعار کا ایک دیوان ترتیب دیا ہے جن میں ان کے ۱۵ قصیدے اور ایک ناتمام مثنوی نامۂ جہاں سوز بھی ہے۔

شاگرد :۔ محمد حسین آزاد ۔ بہادر شاہ ظفر ۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف نواب مرزا خاں داغ ۔ حافظ غلام رسول ویران ظہیر الدین ظہیر ۔ شجاع الدین انور وغیرہ

ذوق کی شہرت اور شاعری کو چمکا دیا۔ سنگلاخ سے سنگلاخ زمینیں۔ محاوروں کا نگینوں کی طرح بٹھانا اور گرمی کلام نے لوگوں کے دلوں کو بہت جلد موہ لیا۔ یہاں تک کہ خاقانی ہند کے خطاب سے سرفراز کئے گئے اور کم سنی ہی تھی کہ بوڑھے بوڑھے لوگوں نے اپنے اشعار ان کو دکھلانے شروع کر دیے۔

ذوق اپنے زمانے کا بہترین نمونہ کہے جا سکتے ہیں۔ علوم متداولہ عقلی و نقلی میں ماہر جو اس زمانے کے شاعر کی خصوصیات اور ضروریات میں سے تھا۔ بحور و اوزان پر مکمل اس کے ساتھ ہی طبیعت میں جدت و اختراعِ بحور کا شوق۔ الفاظ کی قدر و قیمت سے بخوبی آگاہ کیونکہ سینکڑوں دیوان نظر سے گذر چکے تھے اور اس قدر کاوش سے مطالعہ کیا تھا کہ مختلف الفاظ کے محل استعمال سے بخوبی واقف ہو گئے۔ طبیعت میں گرمی تھی اور جو ممکن ہے اگر اس علم و فضل میں نہ گھرے ہوتے اپنا اصلی رنگ زیادہ واضح طور پر دکھاتی مگر جو اس قدر محصور ہو گئی اور اس قدر پابند کہ ذوق کی شعریت مفقود ہو گئی۔ مضامین زبان پر تھے اس لئے کہ اس زمانے تک کے خیالات اپنے گئے تھے خود اپنی طرف سے جدت مضامین اور خیالات میں نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے کہ پیالے کو اصل شے مانتے تھے نہ کہ اس کے اندر کی شے کو۔ پابند قیود شاعری تھے نہ کہ شاعر یعنی آزاد۔ اس لئے اگر کبھی واقعات نظم بھی کرتے تھے تو اس قدر صورت بگاڑ کر کرتے کہ وہ خارجی سی چیز ہو کر رہ جاتی[1] ایک نپی تلی چیز حقیقت سے بیگانہ۔ اصلیت سے الگ۔ لیکن قواعد شاعری سے مستحکم۔ اور یہ دقت اس زمانے کے ہر شاعر کو پیش آتی تھی کہ دل کو بڑی مشکل سے چھیڑ پاتے تھے۔ اور محض خارجی دماغی تعریفیں ہو کر رہ جاتی تھیں۔ اور اسی خارجی و دماغی تعریف کا ہر شاعر متمنی رہتا تھا۔ اگر کسی کے تصور نے قواعد دبا دو ساغر کے جھرمٹ میں اپنے دل کی بات نکال لی۔ یا شاعر نے اتفاقیہ یا دانستہ کہیں لگتی بات کہہ دی تو صوفی کو محفل میں حال آ جاتا تھا ورنہ شعرا عموماً برائے دل سیدھی سیدھی طور پر

---

[1] ملاحظہ ہو وہ غزل جو دوری وطن و جدائی پر شاہ علی شاہ کو سنائی۔ وہ غزل جو فضل حق کے لئے لکھی اور وہ غزل جو لشکر پہ کے لئے لکھی وغیرہ وغیرہ۔ یا بارہ ٹوپیوں والے معرکے پر۔

بیان کر دینا ایک بہت آسان بات سمجھ کر اس طرف کبھی مشغول نہ ہوتے تھے۔ تعریف اور طرۂ امتیاز و تمغۂ لیاقت اسی وقت تھا جب کہ اُسے علمیہ طور پر بیان کیا جائے۔ ورنہ یوں رونے کو تو ہر شخص مِن کر لیتا ہے اور کہنے کو ہر ایک کے منہ میں زبان ہے۔

ذوق کا زمانہ عموماً قدرت بیان کو سراہتا ہے نہ کہ ماجرائے بیان۔ صورت کلام نہ کہ کلام۔ اور اسی قدرت بیان وصورتِ کلام کی تعریف ہوتی۔ مشاعرے میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کیا کہا ہے بلکہ کس طرح کہا ہے۔ اور کس صورت وشکل کو دے کر۔ دقیق سے دقیق ردیف و قافیے انمل بے جوڑ قسم کے لیتے ہیں اور استاد وہی سمجھا جاتا ہے جو ان کو نباہ دے۔ خیالات و احساسات وجذبات سے کسی کو تعلق نہیں۔ گویا یہ شاعری کے لوازمات میں نہیں ہے شاعری ان کے نزدیک محض لفظی بازیگری ہے۔ اگر کسی میں جدت واپیچ او تصور ہے بھی تو طرز ادا کی پیچیدگیاں اختراع کرنے میں صرف کرتا ہے نہ کہ خیالات پیدا کرنے میں۔ خیالات کو یہ طبقہ محدود سمجھتا ہے اور طرز ادا کو لامحدود۔ اسی لئے طرزِ ادا ہی میں محض کاوشیں ہوتی ہیں نہ کہ تخیلات اور تصورات میں۔ خیالات وہی فارسی شعراء سے آئے اور بندھے ٹکے ہیں اس لئے ادھر کاوش غور وفکر کی گنجائش نہیں۔ ذوق کے یہاں یہ سب باتیں انتہائے کمال پر ملتی ہیں۔ یعنی یہ کہ ان کی گرمیِ طبع تشکیل میں مصروف رہی نہ کہ تعمیر میں۔ جسم میں نہ کہ روح میں اور یہ اس زمانے کا تقاضا تھا۔

ایک عالم[۱] شخص شاعر نہیں ہوا کرتا اور شاعری کے لئے علمیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ

---

[۱] وہ فرماتے تھے کہ میں نے ۵۰، دیوان اساتذہ سلف کے دیکھے اور ان کا خلاصہ کیا۔ خان آرزو کی تصنیفات۔ ٹیک چند بہار کی تحقیقات اور اس قسم کی اور کتابیں گویا ان کی زبان پر تھیں ..... شعرائے عجم کے ہزاروں شعر انہیں ازبر تھے اور گفتگو کے وقت وہ نہایت مشتاق ہو سند پیش کرتے تھے مجھے اس کا تعجب نہیں کیونکہ جس فن کو وہ لئے ہوئے بیٹھے تھے یہ سب اس کے لوازمات ہیں ہاں تعجب ہے کہ تاریخ کا ذکر کرتے تو وہ ایک صاحب نظر مورخ تھے تفسیر کا ذکر آتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ ابھی تفسیر کبیر دیکھ کر اٹھے ہیں خصوصاً تصوف میں ایک عالم خاص تھا کہ جب تقریر کرتے تو معلوم ہوتا تھا کہ شیخ شبلی ہیں یا بایزید بسطامی بول رہے ہیں۔ وحدت وجود اور وحدت شہود ان کا علم اشراق کا پرتو۔ پھر کبھی ابو سعید ابو الخیر تھے کبھی محی الدین عربی۔ پھر جب کہتے ایسی کانٹے کی تول کے کہتے تھے کہ دل پر نقش ہو جاتا تھا" اس کے علاوہ رمل نجوم، طب اور موسیقی کے واقعات کے لئے دیکھو دیوان ذوق مرتبہ آزاد۔

جو شعر کہہ کر کلیاں کر کے ذہن و زبان صاف کر ڈالتا ہو۵ اُس کا التزام شاعری معلوم۔ چنانچہ ہم ذوق کو صحیح معنوں میں شاعر نہیں کہہ سکتے۔ وہ محض فن شاعری یعنی شعر بنانا جانتا ہے لیکن اپنے فن میں اس قدر استاد ہے کہ اکثر ہم کو دھوکے میں ڈال دیتا اور ڈال سکتا ہے گویا وہ اصلی شاعر ہے۔ اصلی شاعری ان کے یہاں ڈھونڈے سے نہ ملے گی حالانکہ فنی شاعری سے ایک مصرعہ بھی خالی نہیں۔ کمال فن کے دھوکے اکثر اس جگہ نظر آجائیں گے جہاں شعر ایسا صاف بندھا ہے کہ رواں اور آمد معلوم ہوتا ہے فنی ارتقا ان کے کلام سے صاف ہویدا ہے یعنی ابتدائی غزلیں ایسی سانچے میں ڈھلی ہوئی اور چھینی سے تراشی ہوئی نہ ہوتی تھیں جیسی بعد کو ہو گئی تھیں۔ لیکن جو طرز انھوں نے شروع کیا تھا اس سے مرتے دم تک علیحدہ نہ ہو سکے۶ وہی الفاظ کی نشست کا خیال۔ محاوروں کو باندھنے کی کاوش اور قوافی و ردیف کا التزام الفاظ سے الگ ہو کر معانی کی طرف آجاتے اس قسم کا انقلاب اُن کے یہاں کبھی نہ ہو سکا۔ جوانی کا طرز رنگینیت کی طرف مائل ہے جو بعد کو پرہیزگاری کے سبب محض گرمی طبع ہو کر رہ جاتا ہے۔

صرف ذوق ہی ایسے شخص ہیں جو اپنے ماحول سے ہم آہنگ ہیں ورنہ اس زمانے کا کوئی شاعر ایسا نہیں جو اپنی کم نصیبی اور ناقدری کا شکوہ نہ کرتا ہو اور بھلا ذوق کر بھی کیسے سکتے تھے۔ ایک تو طبیعت قناعت پسند۔ دوسرے حوصلہ و اُمنگ بوجہ کم حبسی کے محدود۔ تیسرے یہ کہ استاد شاہ تھے اور درحقیقت اپنے عہد کے استاد مانے بھی جاتے تھے۔ محض دلی میں نہیں بلکہ باہر بھی۔ اس کے علاوہ خود پر اعتمادِ فنی تھا۔ اس لئے بے نیازی آگئی اور طبیعت غنی ہو گئی۔ آمدنی و جاگیران

---

۵ پاک رکھ اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے — کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے

۶ آخری غزل

کیا کہیں اس سے جو ہو ہم سے زیادہ جانا — وہ ارادہ ہے ہمارا بے ارادہ جانا

بو تا بڑھ بڑھ کے اتنا کیوں نشہ مستی غرور — گر برا بول اپنا قاضی کا پیادہ جانا

کرتا ہے جب نالہ اپنا عالم بالا کی سیر — ہے فلک پر کہکشاں کو خط جادہ جانا

آفتاب حسن کو کیا خاکساروں کا ہو درد — بافتادہ کا ہے درد از پا فتادہ جانا

لی سی معاش و طبیعت رکھنے والے کے لئے کافی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ سوائے ابتدائی ایک دو غزلوں کے کہ جب تک یہ بادشاہ کے نوکر نہیں ہوئے تھے اُن کے یہاں اُن کو اپنے زمانے سے کوئی شکایت معلوم نہیں ہوتی[1] اور بہادر شاہ محض شاہ شطرنج ہو لیکن اُن کے لئے سلطان سنجر سے کم نہیں اگر کبھی شکایت کی قسم کا کوئی جذبہ پیدا بھی ہوتا تو اس پر قناعت غالب آ جاتی اور دلی کی گلیاں زنجیر پا بن جاتیں[2]

اس کے علاوہ طبیعت پرہیزگاری اور تصوف کی طرف مائل۔ وظیفہ و وظائف میں مشغول رہنے والے دنیا بھر کی بہتری کے لئے دعائیں مانگنے والے۔ منکسر المزاج، قانع اور حلیم الطبع ایسا شخص ناصح بہتر ہو سکتا ہے بہ نسبت شاعر کے۔ شاعر کے لئے ہمیشہ ایک بے چین روح کی ضرورت ہے وہ ذوق کے یہاں مفقود تھی۔ اُن کے جوانی کے ولولے بھی شاعروں کے معرکوں میں صرف ہوئے نہ کہ وارداتِ شعری میں۔ شب ہجر کے مضمون بنانے میں نہ کہ شب ہجر کے تارے گنے ہیں۔ ان کی جوانی کی غزلیں دیکھئے۔ الفاظ رنگین اور بہت شگفتہ ہیں لیکن مضمون رنگین نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس پرہیزگار شاعر کا دیوان کا دیوان الٹ جائیے معاملہ بندی میں بھی ایسا شعر نہ نکلے گا جسے محض الفاظ و محاورہ ہی کے خاطر عریاں کہا جا سکے۔[3] اور اپنے عہد میں ذوق اس خصوصیت کے تنہا علمبردار ہیں۔ ورنہ اور سب کبھی نہ کبھی ضرور بہک جاتے ہیں۔ کچھ زمانے کا مذاق اور کچھ ان کا اپنا طریقہ کہ ارباب نشاط کے لئے بھی غزلیں لکھتے ہیں تو مضمون بندی کی نہ کہ ایسی جو گرما دیں اور تڑپا دیں۔ معاملہ بندی بھی کئی جگہ ہے لیکن وہ اُن کی ذاتی چیز نہیں۔

---

[1] ابتدائی دو غزلوں کے دو شعر

در مضمون ہیں ترے ذوق زبس بے بہا | کم کوئی اُن کا خریدار نظر آتا ہے
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا | قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ

[2] کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر | گرچہ ہے ملک دکن میں ان دنوں مضموں کی قدر

[3] سوائے ایک آدھ شاذ مثالوں کے وہ بھی محض لفظی رعایت کی خاطر (معاملہ بندی کے اشعار کا انتخاب عام اشعار کے انتخاب میں دیدیا گیا ہے)

گھبرانے لگا سینے میں دم اور زیادہ | گھبرا نا جو یاد آیا ترا ہو کے ہم آغوش
کل کے جو وصل کے عالم میں نظر میں پھرتے | آج تنہا خفقانی سے ہیں گھر میں پھرتے

ذوق کو الفاظ سے اور نشست الفاظ سے بے حد اور بچپن ہی سے شوق تھا[1] کچھ تو یہ کثرت مطالعہ
کے سبب تھا کچھ یہ کہ اُن کا زور طبع یا زور جذبات چونکہ خیالات کی طرف جاتا نہیں تھا اس لئے لامحالہ فراوانیٔ
الفاظ چاہتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جوانی میں نئی نئی اور طویل بحروں میں اپنا زور طبع
دکھلایا[2]۔ بلکہ لمبی بحروں میں کہنے کا شوق انھیں اخیر تک باقی رہا۔ ابتدا کے قصائد میں بھی فراوانیٔ الفاظ
کا خاص مظاہرہ اور اہتمام ہے[3]۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مشاعروں میں لمبی بحروں والی غزلیں پڑھ کر اور
الفاظ و نشست الفاظ کی شان دکھا کر اپنا سکہ جمانا چاہتے تھے اور جما لیتے تھے۔ بلکہ ایک خیال یہ بھی
ہو سکتا ہے کہ قصیدے میں سودا کا تتبع کرنے سے غزل میں بھی لفظی دروبست اور سلیقے میں مدد ملی
ہو۔ لیکن دراصل لمبی بحروں۔ سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف و قافیوں میں کہنے کی عادت انھوں
نے شاہ نصیر کی میراث و مقابلے میں پائی۔ اس کے علاوہ خواص اور عالی شعرا کی پہچان اور طغرائے امتیاز
یہی دقت پسندی اور مشکل گوئی تھی نہ کہ خیالات کی بلند پروازی جیسی کہ آج کل ہے اس لئے قدرت
کلام اور قوت بیان کی آزمائش اور پہچان اُسی وقت ہوتی اور ہو سکتی تھی جب اُن مل بے جوڑ
باتیں ملا دی جائیں۔ عوام اس سے عاری تھے۔ اس لئے وہی شعرا لائق ستائش و منزلت سمجھے جاتے
جو اس معیار پر آسانی سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے۔ حالانکہ ذوق کے زمانے میں مصحفی و انشار نہ رہے
تھے پھر بھی ناسخ کی غزلیں لکھنؤ سے برابر آیا کرتی تھیں اور ان پر غزلیں نہ کہنا ذوق اپنی کسر شان
سمجھتے تھے۔ غرضکہ قافیہ پیمائیوں کا برا ہو کہ اُن کا تمام دیوان اسی قسم کے دفتر سے بھرا پڑا ہے

---

[1] ابتدا کی غزل ہے

ان سے کچھ وصل کا ذکر اب لانا نہیں اچھا — وہ جو کچھ کہویں تو تم بھی کہے جانا اچھا
تم نے دشمن ہے جو اپنا ہمیں جانا اچھا — یار ناداں سے تو ہے دشمن دانا اچھا

بچپن کی غزلوں میں سے

دم ذبح تیغ جفا میں جب تری بہتا آب حیات ہو — تو شہید ناز کو کیونکہ پھر نہ حیات بعد ممات ہو

[2] تمنا نہیں ہے کہ امداد دل کو تپش کا نسخہ ہو کہ مزد قلق ہو — یہی حق ہے قاتل اگر حق دلا دے یہ بسمل ترے پاؤں پر جان بحق ہو
جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے گر اس میں زلف سرکش ہو — پھر زلف بنے وہ دست موسیٰ جس میں اژدر آتش ہو
کوئی ہے کافر کوئی مسلماں جدا ہر اک کی ہے راہ ایماں — جو اس کے نزدیک رہبری ہے وہ اس کے نزدیک رہزنی ہو

[3] سحر جو گھر میں بہ شکل آئینہ تھا میں تنہا نظارہ حیراں — تو اک پری چہرہ حور طلعت بہ شکل بلقیس ماہ کنعاں (وغیرہ)

اور گویا ایک جسم ہے [۵۱]

رعایت لفظی ذوق کے آرٹ کا خاص جزو ہے۔ کہیں کسی غزل کسی شعر میں اس سے چھٹکارا نہیں [۵۲]۔ اور ذوق کیا یہ بھی اس زمانے کے روایات میں سے ہے اور جس کو خصوصاً نصیر اور ناسخ نے بہت سراہا اور بڑھا دیا اور جو اتنا مرغوب زمانہ رہا کہ نہ صرف اسی زمانے میں اس کی گرماگرمی رہی (یہاں تک کہ مومن نے بھی بیشتر اور غالب نے اکثر اس کو اختیار کیا۔) بلکہ بیسویں صدی کے ربع اول تک اس کا قبول عام قائم رہا۔ ذوق کی صناعی کی بنیاد بہت کچھ اسی پر قائم ہے۔

---

۵۱ مشکل ردیف اور قافیے کی صرف ردیف الف سے چند مثالیں :- سراغ پا۔ چراغ پا۔ باہمدگر دونوں جدا۔ ہم سفر دونوں ہم دونوں جدا۔ تصویر دل میرا۔ شمشیر دل میرا۔ مقار زیر پا۔ ساغر زیر پا۔ آغوش نقش پا۔ روپوش نقش پا۔ طوفان چڑھا۔ بیابان چڑھا۔ تھوڑا اٹکا۔ روڑا اٹکا۔ منڈیر کا ٹھینگر کا۔ بغل میں مارا۔ اجل میں مارا وغیرہ۔ ذوق نے ناسخ کی غزل پر غزل کہی۔

شوق نظارہ ہے جب سے اس رخ پر نور کا ۔۔۔ ہے مرا مرغ نظر پروانہ شمع طور کا

ہے قفس سے شور اک گلشن تلک صیاد کا ۔۔۔ خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا

لچکے ہے یوں کمر تری وقت خرام ناز ۔۔۔ جنباں ہو جوں نسیم چمن سے سمن کی شاخ

مشہور یہ تھا کہ اس طرز پر کوئی نہیں کہہ سکتا ذوق نے سہ غزلہ کہا۔ ۳۸، ۵، اور ۲۱ اشعار کا

قافیہ پیمائی کی چند مثالیں :-

چھوڑا نہ ایک دانۂ اختر سحر تلک ۔۔۔ گردوں کو لگ گیا جو مزہ شب ٹھینگر کا

کوٹھے پہ ان کے خوب پہنچے آج رات کو ۔۔۔ تھا ہاتھ آگیا جو سہارا منڈیر کا

یا

جلد آ وعدہ دیدار پہ اے وعدہ خلاف ۔۔۔ کب تک اٹکا رہے دم آنکھوں میں تھوڑا اٹکا ۔۔۔ وغیرہ

اور جس غزل میں مشکل ردیف و قوافی نہ ہوتے تو ان کا جی شعر کہنے میں نہ لگتا۔ ایک آسان مصرعہ طرح پر شکایت کرتے ہیں۔

ذوق بازیچہ طفلاں ہے سراسر یہ زمیں ۔۔۔ ساتھ لڑکوں کے پڑا کھیلنا گویا ہم کو

۵۲ چند مثالیں

ہر اک سے ہے قول آشنائی کا جھوٹا ۔۔۔ وہ کافر ہے ساری خدائی کا جھوٹا

میں وہ شہید ہوں لب خندان یار کا ۔۔۔ ہنستا رہے چراغ بھی میرے مزار کا

ہم نے جانا تھا کہ قاصد جلد لائے گا خبر ۔۔۔ کیا خبر تھی جا کے واں خود بے خبر ہو جائے گا

شکل تو دیکھو مصور کھینچے گا تصویر یار ۔۔۔ آپ ہی تصویر اس کو دیکھ کر ہو جائے گا

دوسری چیز محاورے کا استعمال ہے[۵] عموماً محاوروں کا استعمال اس لئے کیا جاتا تھا کہ شعر عوام کی زبان پر رواں ہو سکیں جس کی وجہ سے مشہور ہوں۔ دوسرے ان میں خوب صورتی اور روانی پیدا ہو جائے۔ تیسرے اس لئے کہ خود محاورے محفوظ ہو جائیں اور اس طرح زبان کی خدمت ہو سکے اکثر یہ وجہ بھی ہوتی تھی کہ چونکہ عموماً محاوروں کا استعمال اور موزوں کر دینا بوجہ ان کی شہرت کے

(بقیہ صفحہ)

کیوں کہہ کے مکرتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا — کہہ جو تجھے کہنا ہو کہ میں کچھ نہیں کہتا
تھے دو گھڑی سے شیخ جی۔ شیخی بگھارتے — ساری وہ شیخی ان کی جھڑی دو گھڑی کے بعد
جب وہ پوچھے کہ ہے غش کون مری جتون پر — میں کہوں میں! تو کہے "میں کے چھری گردن پر"
قاصد لکھوں لفافے کو خط غبار سے — تا جانے وہ یہ خط ہے کسی خاکسار کا
در دِ دل سے لوٹتا ہوں کس کو میرا درد ہے — ہوں میں لفظ درد جس پہلو سے دیکھو درد ہے۔

چند لفظی صناعیاں۔

پیر مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوق — نامرد مرد۔ مرد جواں مرد ہو گیا
کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھہرے گا — ولیکن تو بھی گر جاہے کہ میں ٹھہر دل۔ نہ ٹھہرے گا
ہے وہ آزار محبت سے دل زار کو رنج — جس سے خود رنج کو آزار ہے آزار کو رنج
راحت و رنج زمانے میں ہیں دونوں لیکن — یاں اگر ایک کو راحت ہے تو ہیں چار کو رنج
جا بجا کوہ کے چشموں سے رواں ہیں آنسو — ہے جو ناکامی فرہاد کا کہسار کو رنج
مرتا ہوں انتظار میں کوئی بشر تو بھیج — خط بھیج یا نہ بھیج زبانی خبر تو بھیج
پھر کر ادھر ادھر بھی نہ اپنا گیا قلق — لفظ قلق کی طرح سے یونہی رہا قلق
منہ سے لگا ہوا ہے اگر جام مے تو کیا — ہے دل سے یاد ساقی کوثر لگی ہوئی

بندشِ الفاظ۔

زاہد یہ کیا کہا کہ نہ مل ان بتوں سے تو — دیتا ہے ایسی کوئی بھی مرد خدا صلاح
یارب ہو دل کی خیر کہ کچھ کرتے ہیں آج — چشم و نگاہ مشورہ۔ ناز و ادا صلاح
نے ذوق جانا ہوش و خرد کی صلاح پر — جو عشق دے صلاح وہی ہے بجا صلاح
ایسی کیا جلدی ہے جلدی کام ہے شیطان کا — سر پہ شیطان کے اک اور بھی شیطان چڑھا
یہ بھی ہو گا کہ شہید دل میں سلے گا، — پہن کر وہ جامہ بھی اگر کرے قرآن کا
یار نادان ست ہے دشمن دانا اچھا، — کافر کی شوخی دیکھو گھر میں خدا کے مارا

نکھے موئی پڑھے خدا۔ گھنگنیاں بھرے منہ میں بیٹھے رہنا۔ کسی شخص کا منہ دیکھ کر اٹھنا۔ زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔ حرام زادے کی رسی دراز ہے۔
نہ آدمی جو کہے بات سوچ کر تو کہے — خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری
ہوں میں لفظ درد جس پہلو سے دیکھو درد ہے — آپ کی یونہی خوشی ہے مہرباں یونہی سہی
مال موذی نصیب غازی ہے۔ مال عرب پیش عرب منہ کا لاکرنا۔ وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس۔

مشکل اور رقت آمیز ہوتا ہے اس لئے بیان پر قدرت رکھنے والے شاعروں کے تفاخر کو
ایک خاص سکون ہوتا جب وہ ایسی ٹھیٹھ نثر کو خوب صورت نظم کی شکل میں پیش کر سکتے۔
چنانچہ ذوق اور داغ اس امر میں خاص طور پر معروف ہیں۔ اُن کے شاگرد محاوروں کی فہرستیں
ان کو پیش کرتے تاکہ اُن کو یہ ماہرین فن شعر میں منتقل کر دیں۔ تاکہ محاورے محفوظ ہو جائیں اور
ان کے نام و کلام کے ساتھ ہمیشہ قائم رہیں۔ ذوق کے یہاں جذبات عموماً نہیں ملتے لیکن اکثر وہ
یہ کرتے ہیں کہ جذبات کی مثال یا مناسبت کے طور پر مناسب محاورہ پیش کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ
ہے کہ محاورے کا استعمال کلام کو بقائے دوام دینے کا ایک بڑا ذریعہ ہے مگر شرط یہ ہے
کہ اس طرح شعر میں نبھائے جائیں کہ یہ نہ معلوم ہو کہ شعر انھی کی خاطر کہا گیا ہے اور وہ
محض اوپر سے جما دئے گئے ہیں۔ ذوق کو محاورے استعمال کرنے کا شوق ابتدا سے مرتے
دم تک قائم رہا۔[۵]

کچھ تو طبعی مناسبت کی بنا پر اور کچھ اسی محاورہ بندی کے شوق کی طرح کہاوت، مثلوں
اور تجربے کی باتوں کو نظم کرنے کی خواہش چنانچہ ذوق کے یہاں خیالات کے ضمن میں یہ ایک اہم خصوصیت
پائی جاتی ہے کہ اکثر وہ اپنے تجربوں کو چند زندگی کے مسلمات کو دنیا کے تجربوں کو اور چند سیدھی

---

۵ حافظ ویران کی اسناد عاپر مرنے سے چند گھنٹے پہلے ذوق نے پاؤں تلے کی زمین نکل جانے کا محاورہ باندھا۔

زمیں کیا ہے فلک پاؤں کے نیچے سے نکل جائے ۔۔۔ ہماری خاک پر دکھلا دو رفتار سمند اپنی

جو دل سے اپنے دم آتشیں نکل جائے ۔۔۔ فلک کے پاؤں تلے سے زمیں نکل جائے

یا یہ مصرع

۱۔ ارے احسان مانوں سر میں تنکا اُتارے کا ۲۔ لگی جو مجھ سے کرے تو پئے لہو میرا
۳۔ کس وقت مرا منہ کو کلیجا نہیں آتا ۴۔ وہ کافر ہے ساری خدائی کا جھوٹا
۵۔ کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہہ گیا۔ ۶۔ چلتی گاڑی میں دیا عشق نے روڑا اٹکا
۷۔ وہ ساری شیخی جھڑی انکی دو گھڑی کے بعد ۸۔ یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے۔

سادھی زندگی کی نصیحتوں اور حقیقتوں کو نظم کر دیتے ہیں اس طرح اور ایسے موزوں سادہ الفاظ میں کہ لوگوں کی زبانوں پر رواں ہو سکے اور ایک کہاوت کی طرح مناسب موقعوں پر مستعمل ہو سکے[۵] اور اس طرح ہمیشہ قائم رہے۔ لیکن دراصل اس قسم کی ناصحانہ و بزرگانہ باتوں کو شاعری نہیں کہہ سکتے اور نہ ان میں کوئی شعری لطافت ہے۔ محض چند سیدھی سادھی زندگی کی حقیقتوں کو نظم کر دیتا ہے۔ سیدھی سادھی نثر کی طرح۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ بہت سی ان میں مثلوں کی طرح عوام کے زبان زد ہو گئی ہیں۔

۵ے
نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا — پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا
رہا پیڑھا مثال نیشں کژدم — کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا
ذوق اس بحر جہاں میں کشتی عمر رواں — جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارہ ہو گیا
جو کچھ کہ ہوا ہم سے وہ کس طرح نہ ہوتا — حکم ازلی ذوق یوں ہی ہو چکا تھا
موت نے کر دیا ناچار و گرنہ انساں — ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا
اے عیار پایا یار سمجھے ذوق ہم جس کو — جسے یاں دوست سمجھے اپنا آخر وہ عدو نکلا
منہ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے — گر انھیں آ کے خدا ساری خدائی دیتا
کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا — جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا
اے ذوق ہوش اگر ہے تو دنیا سے دور بھاگ — اس میکدے میں کام نہیں ہوشیار کا
نہ پکڑیں دامن الیاس گرداب بلا میں ہم — کہ بدتر ڈوب مرنے سے ہے جینا اس سہارے کا
اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر — آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا
حلاوت شرم و پائداری جہاں میں ہے ذوق رنج و خواری — مزے سے گذری اگر گذاری کسی نے بے ننگ و نام ہو کر
واں سے یاں آئے تھے لے ذوق تو کیا لائے تھے — یاں سے تو جائیں گے ہم لاکھ تمنائے کر
برق خرمن سوز ہے عالم میں نافہمی تری — ورنہ کیا کیا لہلہاتے کھیت ہیں ہر دانے میں
اس گلستان جہاں میں کیا گل عشرت نہیں — سیر کے قابل ہے یہ پر سیر کی فرصت نہیں
لیتے ہیں ثمر شاخ ثمر ور کو جھکا کر — جھکتے ہیں سخی وقت کرم اور زیادہ
صحبت عیسیٰ بنائے کیا گدھے کو آدمی — جس کے جوہر میں ہو نادانی وہ انساں کب بنے
کہیے نہ تنگ ظرف سے اے ذوق کبھی راز — کہہ کر اسے سننا ہو ہزاروں سے تو کہیے
ثبات کب ہے زمانے کے عزو شاں کے لیے — کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لیے
ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے بوقت مرگ — ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے
کتنے مفلس ہو گئے کتنے تونگر ہو گئے — خاک میں جب مل گئے دونوں برابر ہو گئے

حسن تعلیل[۵] اور ایک مصرعے میں ایک بات کہہ کر یا مسلمہ بنا کر دوسرے مصرعے میں اس کا ثبوت یا شہادت پیش کرنا یہ ایک طرز خاص تھا کہ متاخرین خصوصاً صائب کے مطالعے سے اس زمانے میں پیدا ہوا اور تمام اردو شاعری (کیا دلی و کیا لکھنؤ) پر محیط ہو گیا۔ جب شاعر دوسرا مصرع پڑھتا تھا تو وہی لطف آتا تھا جو ایک مسئلے کے حل کرنے میں آتا ہے۔ تخئیل کو آزادی تھی کہ جس قسم کے مسئلے یا مسلمے بنا کر پیش کرے اور تعریف کرنے والے یوں کہتے کہ بھئی واہ فلاں بات کا کیا ثبوت پہنچایا ہے۔ غرضکہ یہ طرز عام تھا اور مقبول تھا اور چنانچہ ذوق نے بھی اس کو برتا اور بہت کافی بہتات کے ساتھ۔ ایک شعر بہت مشہور ہے۔

حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے　　خط بڑھا۔ زلفیں بڑھیں۔ کاکل بڑھے۔ گیسو بڑھے

حسن تعلیل کی خوبی اور خوب صورتی اسی میں ہے کہ ثبوت یا وجہ شاعرانہ طور پر اس قدر لطیف ہو کہ واقعیت ٹپکے اور بالکل صحیح معلوم ہو۔ لیکن اگر تخئیل کی آزادی کی وجہ سے ایسا مسلمہ یا ثبوت پیش کیا جائے جو اصلیت سے بہت ہی دور ہو جائے تو وہ باوجود شاعرانہ لہذا قابل

جس انسان کو سگ دنیا نہ پایا　　فرشتہ اس کا ہم پایہ نہ پایا
آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے　　لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا
رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق　　اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت
سیراب نہ ہو جس سے کوئی تشنہ مقصود　　اے ذوق جو وہ آب بقا بھی ہے تو کیا ہے
بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے　　بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے۔
افسردہ دل کے واسطے کیا چاندنی کا لطف　　لپٹا پڑا ہے مردہ سا گویا کفن کے ساتھ
بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو　　زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو
اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا　　بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے
جو فرشتے کرتے ہیں کر سکتا ہے انسان بھی　　پر فرشتوں سے نہ ہو جو کام ہے انسان کا
اے صنم کیا پوچھتا ہے حال اس رنجور کا　　دل نہ اٹکائے کہیں اللہ بے مقدور کا
میں وہ شہید ہوں لب خنداں یار کا　　ہشیار ہے چراغ بھی میرے مزار کا
دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا　　آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا
جہاں باریک بیں وہ ناتواں ہیں اس قدر دیکھا　　ہلال انتیسویں کا سب کو منظور نظر دیکھا
حق نے تجھکو اک زباں دی اور دیئے کان دو　　اس کے یہ معنی کہے ایک اور سنے انسان دو

۵ۓ

معانی ہونے کے مرغوب و پسندیدہ نہیں ہوتا۔ بیسویں صدی سے جو نئے شعراء پیدا ہوئے انھوں نے اس طرز کو چھوڑ دیا ہے۔ بیشتر وجہ یہ ہے کہ ان کی قوت تخیل دوسرے میدانوں اور حقیقت کی طرف آزاد ہو گئی ہے۔ برخلاف اس کے متاخرین کی صرف اسی صنعت میں آزاد ہوتی تھی اس لئے گنجلک ہو جاتی تھی۔

بہت کچھ اسی طرح مقبول چیز رعایت لفظی تھی۔ چونکہ قادر الکلامی کے اس عہد میں معنی یہ تھے کہ الفاظ کے استعمال پر کامل قدرت ہو۔ اس لئے اس قدرت کا اظہار اس طریقے پر بہترین ہو سکتا تھا لہٰذا ہر شاعر اس صنعت سے کافی متاثر تھا اور اس کی بندش معیار لیاقت و لائق ستائش ہنر سمجھا جاتا۔ ذوق کا بیشتر کلام اس صنعت پر موقوف ہے اور اپنے عہد کے دیگر شاعروں کے مقابلے میں بہت اکمل طریقے پر۔ لیکن اگر یہ صنعت بغیر کسی خیال کے ہو تو محض لفظی گورکھ دھندا ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذوق کے اس قسم کے اشعار اب زیب طاقِ نسیاں ہوتے جا رہے ہیں، بہ نسبت مومن و غالب کے کہ ان کے یہاں یہی چیزیں بوجہ خیال کے زیادہ اُجاگر ہیں۔ رعایت لفظی چونکہ لفظی صنعت گری کا بہت بڑا جزو ہے اور اس میں شک نہیں کہ اکثر موقعوں پر شعر کو خوب صورت بنا دیتا ہے اس لئے ابھی تک اس کا رواج ہے حالانکہ گذشتہ کی فراوانی کے ساتھ نہیں پھر بھی ہے۔ لیکن اب مقصد اصلی یہی چیز نہیں ہوتی بلکہ اس کا درجہ

برہم اسے کیوں تو نے کیا چھیڑ کے پھر زلف — اے دل وہ ابھی چیں بہ جبیں ہو ہی چکا تھا

مسجد میں اس نے ہم کو آنکھیں دکھا کے مارا — کافر کی شوخی دیکھو گھر میں خدا کے مارا

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی — چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

جلتے ہوئے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق — اپنی بلا سے باد صبا اب کبھی چلے

چمن میں کہتے ہیں پھر موسم عیش و طرب آیا — بہاریں خوب لوٹیں گے اگر وہ غنچہ لب آیا

دیکھ گر دیکھنا ہے ذوق کہ وہ پردہ نشیں — دیدۂ روزنِ دل سے ہے دکھائی دیتا

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے — یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔

اس نے خط جو قلم سر سے لکھا ہم کو — لکھا ایمائے خموشی ہے یہ گویا ہم کو

زبان ریختہ کر دی زباں اہل ولایت کی — محبت ذوق کو از بسکہ ہے شاہ ولایت سے

دوسرا ہے اور محض اسی کے خاطر خیال کا خون نہیں کیا جاتا۔

روزمرہ[۵] بھی اسی طرح اُن اہل زبان کا خاص گُر ہے اور اس میں شک نہیں کہ شعر کی ظاہری خوبی روزمرہ کے مناسب استعمال سے نہایت درجہ بڑھ جاتی ہے۔ روانی الگ آجاتی ہے اس کے علاوہ عام پسند بھی ہو جاتا ہے۔ ذوق روزمرہ کے استعمال کرنے میں بادشاہ ہیں کبھی شعر کو بغیر اس طرح خوب صورت بنائے نہ چھوڑیں گے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ چونکہ اکثر و بیشتر مقصد محض روزمرہ کا استعمال ہی ہوتا ہے اس لئے خیال کی پروا نہیں کرتے۔ لیکن اگر کبھی خیال اس طرح کے خوب صورت سانچے میں آکر ڈھل جاتا ہے تو شعر اچھا اور بامزہ ہو جاتا ہے۔

تشبیہ[۶] اور استعارے ذوق کے عموماً بے مزہ، غیر فطری اور بیکار ہوتے ہیں۔ اگر کبھی کوئی اچھا نکل آیا تو اسے اتفاق سمجھنا چاہیئے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ وہ اول تو رعایتِ لفظی سے

---

۵ بیمار عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج — کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج
مٹ گئے جوہر وفا کے اُٹھ گئے سب اہل دل — اب وفا ہے نام کو اور باوفا کہنے کو ہیں
ستم کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہم وفا سمجھے — اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت کو خدا سمجھے
حکایت دل کی کہتا ہوں سمجھتے ہو شکایت ہے — تمھیں سمجھو ذرا دل میں کہ سمجھے بھی تو کیا سمجھے
سمجھ ہی میں نہیں آتی ہو کوئی بات ذوق اس کی — کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے
کیا مد نظر ہے تمھیں یاروں سے تو کہیئے — گر منہ سے نہیں کہتے اشاروں سے تو کہیئے
یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے — زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے
موذن مرحبا بر وقت بولا — تری آواز مکے اور مدینے

۶ جو کہو گے تم کہیں گے ہم بھی ہاں یونہی سہی — آپ کی یونہی خوشی ہے مہرباں یونہی سہی
دانت یوں چمکے ہنسی میں رات اس مہ پارہ کے — میں نے جانا ماہ تاباں پارہ پارہ ہو گیا
چھوڑا نہ ایک دانۂ اختر سحر تلک — گردوں کو لگ گیا جو مزا شب تھنگر کا
جھکائے ہر سر تسلیم ماہ نو؛ پر وہ — غرور حسن سے کس کا سلام لیتے ہیں
چاندنی دیکھے اگر وہ مہ جبیں تالاب پر — عکس رخ کی تاب پانی پھیر دے مہتاب پر
اس روئے تابناک پہ ہر قطرۂ عرق — گویا کہ اک ستارہ ہے صبح بہار کا
گذرتی عمر ہے یوں دور آسمانی میں — کہ جیسے جائے کوئی کشتی دخانی میں
بلبل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر — پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

تشبیہ یا استعارے بنانا چاہتے ہیں یا حسن تعلیل سے ثابت کرنا یا کسی اور لفظی صنعت سے حاصل کرنا شاہ نصیر کی طرح۔ ظاہر ہے جب مقصود بالذات صنائع لفظی ہوں گے تو تشبیہہ و استعارے کی خوبی معلوم۔ لیکن پھر بھی وہ اس قسم کے تشبیہہ اور استعاروں سے پرہیز کرتے تھے۔ مثلاً ع ہے کاٹنے کو دوڑتا کتا تفنگ کا۔ یا ع منیڈھا حلال کرتے ہیں دریائے نیل کا۔ جس سے کلام بالکل ہی بد مزہ ہو جاتا ہے۔

پرانے متروک الفاظ کا استعمال ذوق کے یہاں بہت ہی کم ہے بلکہ صرف ان کے بچپن اور جوانی کے اشعار میں پائے جاتے ہیں اور وجہ اس کی صرف یہی ہے کہ بول چال میں اپنے بچپن میں سنتے تھے وہی باندھ دیتے تھے مگر آخر کے کلام میں ٹک۔ یارو۔ جانِ من کے الفاظ چھوڑ دئے اور تقریباً تمام تر کلام کی زبان موجودہ کہی جاسکتی ہے اور سوائے بل بے۔ آئے ہے جائے ہے۔ آوے، جاوے، پرے، کھوینگے، کیونکہ بمعنی کیونکر۔ جٹ بمعنی جلدی وغیرہ معدودے چند الفاظ کے اور کوئی لفظ ابھی تک گوش پر گراں نہیں گذرتا۔ جملے کی ترکیبیں بھی ایسی ہیں کہ ابھی تک رائج ہیں۔ اور آئے ہے۔ جائے ہے کی ترکیب باوجود اس کے کہ متروک ہو گئی ہے نظم میں اب تک بھلی معلوم ہوتی ہے۔

(باقی آئندہ)

تازہ کلامِ جگر

عمر بھر روح کی اور جسم کی یکجائی ہو
کیا قیامت ہے کہ پھر بھی نہ شناسائی ہو

کوئی اتنا بھی نہ مصروفِ خود آرائی ہو
کہ تماشا رہے باقی نہ تماشائی ہو

مستیٔ حسن، غمِ عشق پہ یوں چھائی ہو
دل سے جو موج بھی اٹھے تری انگڑائی ہو

کیوں نہ گھر بیٹھے ہی یوں انجمن آرائی ہو
دل کے ہر گوشے میں کونین سمٹ آئی ہو

نالہ یوں کیجیے، یہ اعجازِ شکیبائی ہو
جیسے بیساختہ ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہو

پھر وہی رت، وہی ہم تم، وہی تنہائی ہو
پھر ہر اک چوٹ محبت کی ابھر آئی ہو

حسن و بیچارگیٔ حسن، الٰہی توبہ
میں تو مر جاؤں جو یوں عشق کی بن آئی ہو

وہ محبت ہی نہیں ہے، وہ قیامت ہی نہیں
جو کسی پائے نگاریں کی نہ ٹھکرائی ہو

آج سے ترکِ ملاقات بھی منظور مجھے
توبہ توبہ کہ ترے حسن کی رسوائی ہو

اے غمِ دید، ترا صبر مجھی پر ٹوٹے
بے ترے نیند بھی آنکھوں میں اگر آئی ہو

ہائے اس حصۂ گلشن کا مقدر، ہمدم
نہ بہار آئی ہو جس میں نہ خزاں آئی ہو

ہو گئی دل کو تصور سے ترے نسبتِ خاص
اب تو شاید ہی میسر کبھی تنہائی ہو

بھول جاؤں کہ مرا فرضِ محبت کیا ہے
اس طرح تو نہ مری حوصلہ افزائی ہو

ہائے اس عاشقِ دیوانۂ گلشن کی بہار
کہ جب آئی ہو بہ اندازِ خزاں آئی ہو

تو بھی جذبِ غمِ عشق کی تاثیر جگر
میں تمنا نہ کروں، خود وہ تمنائی ہو

تنقید و تبصرہ

(تبصرے کے لئے کتابوں کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

ہندوستان کی صنعت اور تجارت۔ ضخامت ۲۱۴ صفحے تقطیع $\frac{20\times26}{16}$ قیمت

ملنے کا پتہ مکتبہ سیفیہ مونگیر بہار

ہندوستان کے صنعتی اور تجارتی حالات کی مختصر تاریخ ہے جس میں اس ملک کی گذشتہ صنعتی ترقی اور اس کے اسباب زوال کی عبرتناک داستان بیان کی گئی ہے اور یہ تبلایا گیا ہے کہ برطانوی تسلط کے بعد حکومت کے طرز عمل اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی تباہ کن حکمت عملی سے ہندوستان کی معاشی زندگی کو کیا کیا نقصانات پہنچے اور کس طرح ہندوستان کی صنعت و حرفت کا ایک ترقی یافتہ نظام دیکھتے دیکھتے تباہ ہوگیا سرکاری یادداشتوں سے اور مستند کتابوں سے بکثرت اقتباسات جمع کئے گئے ہیں اور ان کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ معاشی ، مالی اور صنعتی پستی حکومت برطانیہ کی معاندانہ تجارتی پالسی کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب کے لکھنے سے مصنف کا مقصد یہ ہے کہ اردو داں طبقہ کو ملک کی سیاسی اور اقتصادی تاریخ سے آگاہ کیا جائے۔ تاکہ وہ ہندوستان کے موجودہ سیاسی اور معاشی مسائل کو سمجھ سکیں۔ اس لئے معاشی مسائل کے سیاسی پہلو کو واضح کرنے پر مصنف نے زیادہ زور دیا ہے۔

اردو زبان میں ایسا بہت کم مواد اس موضوع پر شائع کیا گیا ہے۔ منت اللہ صاحب رحمانی فاضل دیوبند مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس طرف توجہ کی۔ پوری کتاب دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہے اور شروع سے آخر تک پڑھنے کے قابل ہے۔

ہمیں امید ہے کہ اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی جس کے لئے مصنف نے مواد جمع کرلیا ہے بہت جلد شائع ہوگا۔ اچھا ہوگا اگر دوسرے حصے میں اقتباسات کے ساتھ کتابوں کا حوالہ بھی دے دیا جائے

تاکہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے مزید مطالعہ کے لئے اصل کتابوں سے مستفید ہوسکیں۔

(ش)

گیس کا دفاع۔ مرتبہ جناب سید ہادی حسین رضوی صاحب۔ ضخامت ۲۰×۳۰/۱۶ ، ۶۲ صفحات۔ قیمت

ملنے کا پتہ۔ امیریہ دار التصنیف والتالیف، محمود آباد ہاؤس قیصر باغ، لکھنؤ

جنگ انسانی زندگی کی تاریخ کا ایک اہم باب ضرور ہے، مگر ذاتی شجاعت و شہامت کے مظاہرے کی حیثیت سے انسان نے جب انفرادیت سے نکل کر اجتماعیت میں قدم رکھا تو اس کی یہ جنگی فطرت بھی اجتماعیت کے رنگ میں رنگ گئی مگر اس کی انتہائی اجتماعی شکل کو لیجیے تو بھی قوانین جنگ کا اطلاق صرف لڑنے والوں ہی تک محدود تھا۔ صنعتی تہذیب کی برکت سے اب اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ اور جنگ کے معنی اب یہ لئے جانے لگے ہیں کہ اس سے شہری آبادی کس حد تک تباہ اور برباد ہوئی ہے۔ اس تخیل کو جب فروغ ہوا تو اس کی راہیں بھی نکل آئیں۔ چنانچہ آج کل اس مقصد کے لئے زہریلی گیس کا استعمال بہترین طریقہ تسلیم کیا گیا ہے۔

زیر نظر رسالے میں اسی زہریلی گیس کے دفاع کی صورتیں بیان کی گئی ہیں، اور اس مہلک وبا سے بچنے کے لئے ہندوستان میں حفاظتی تعلیم کے فقدان کے پیش نظر" اس ملکی اور قومی خدمت کا احساس سب سے پہلے جناب راجہ صاحب محمود آباد کو ہوا" مصنف نے ممدوح ہی کے ایما سے اس کو ترتیب دیا ہے۔

کتاب کل ۱۶ عنوانات پر ختم ہوئی ہے۔ پہلے جنگ کی مختصر سی تاریخ دی گئی ہے۔ اس کے بعد آلات جنگ کے تدریجی ارتقا کی تاریخ کے سلسلے میں گیس کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلے چند صفحات میں گیس کے مختلف اقسام اور ان کے استعمال کا بیان ہے، اور بعد کے ابواب میں اس کے حملے کے بچاؤ کی مختلف صورتیں پیش کی گئی ہیں۔ فاضل مصنف نے کوشش کی ہے کہ بیان مختصر ہو اور مطالب جامع۔ ہندوستان کی موجودہ علمی اور تعلیمی کساد بازاری کے پیش نظر یہ سودا سستا بھی ہے

اور اچھا بھی۔ (ب۔ع۔ف)

دورِ انبساط۔ مولوی عبدالودود صاحب درد بریلوی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ نظامی پریس بدایوں نے چھاپا ہے۔ کتاب کا کاغذ اور چھپائی اچھی خاصی ہے لیکن کتابت کی بہت زیادہ غلطیاں ہیں۔ قیمت کہیں درج نہیں شروع میں درد صاحب کی تصویر اور پروفیسر عبدالشکور صاحب کا تعارف شامل ہے۔ تعارف میں شکور صاحب نے شاعر کے مختصر حالات بیان کئے ہیں اور لوگوں کو کلام سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مصلحتاً کسی مفصل تنقید اور تبصرہ سے پرہیز کیا ہے اور اپنی ناقدانہ ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مجھے اس کا احساس ہے کہ مولانا کا کلام اغلاط سے پاک نہیں۔ جا بجا لفظی اور فنی نقائص موجود ہیں"۔ آگے چل کر ان نقائص کی وجہ بتائی ہے اور کہتے ہیں" اگر فن شاعری میں اس قدر مطلق العنانی کو کام میں نہ لاتے تو یقیناً ان کے کلام میں اور زیادہ پختگی سنجیدگی اور پاکیزگی آجاتی۔ ان کے اشہب قلم کی روانی، تیز گامی ان رکاوٹوں کو قطعاً برداشت نہ کر سکتی تھی"۔ اس رائے کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تعارف کرانے والے کو خود اپنی رائے پر یقین نہیں۔ وہ اپنی ذمہ داری کو بھی محسوس کرتا ہے اور اسے کچھ لکھنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے کوئی ایسی بات نہیں کہتا جس سے اس کی گرفت ہو سکے۔

اس کی وجہ مجموعہ کلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہی معلوم ہو جاتی ہے۔ مجموعہ میں غزلوں کے علاوہ کم و بیش ۲۰۰ نظمیں ہیں۔ کچھ پر مذہبی عقائد کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ کچھ تاریخی اور قومی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں کچھ میں اخلاقی درس کی جھلک ہے اور کچھ "نیچرل شاعری" کے عام رجحان کے تحت میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن جہاں تک شاعرانہ لطف اور حسنِ کلام کا تعلق ہے، کسی نظم میں نام کو بھی نہیں لیکن اس مجموعہ میں شاعر نے "میری شاعری" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے، اسے پڑھنے کے بعد شکایت کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ شاعر کے نزدیک اگر شعر میں "بے ساختہ پن" نہیں تو وہ شعر نہیں لیکن بے ساختہ پن کا جو مفہوم شاعر کے ذہن میں ہے وہ عام مفہوم سے کسی قدر مختلف ہے۔

نگارشات۔ آغا محمد باقر، بنیرۂ حضرت آزاد مرحوم کے مضامین کا ضخیم مجموعہ ہے شیخ مبارک علی نے لاہور سے شائع کیا ہے۔ مجموعہ میں کل ۳۲ مضامین ہیں اور ۴۲۸ صفحوں پر مشتمل ہیں۔ مضامین ہر طرح کے ہیں۔ ادبی، تنقیدی اور اخلاقی۔ ہر مضمون کافی بڑا ہے اور انھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آغا صاحب نے ہر مضمون کے لکھنے میں کاوش اور محنت سے کام لیا ہے۔ خصوصاً ادبی، تنقیدی مضامین بہت محنت سے لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں سے "انشا پردازی" "قومی زبان" "اُردو اخبارات" خاص طور پر اچھے ہیں۔

تنقیدی مضامین میں تو بے شک کاوش سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ لیکن عام طور پر دوسری قسم کے مضامین میں توجہ اور محنت کو لکھنے والے دردسری سمجھتے ہیں۔ لیکن آغا صاحب کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ وہ کسی قسم کے مضامین لکھیں، انھیں اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالے بغیر قرار نہیں آتا۔ اور حقیقت بھی ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو شاید اپنے مضامین کو اتنا دلکش نہ بنا سکیں مثال کے طور پر دو ایک مضامین پر سرسری نظر ڈالیے۔

مجموعہ میں ایک مضمون ہے "سیر وسفر" مختصر سی تمہید کے بعد آغا صاحب نے مضمون کو مختلف حصّوں میں تقسیم کیا ہے ——— "سفر سقر کیوں تھا، سفر بعض امراض کا علاج ہے، سفر کی علامات، سفر کا بھوت، مسافر نوازی، بحری سفر، بحری سفر کی آسائشیں، تعلیم کی برکتیں، جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ، سفر تجربہ سکھاتا ہے، سفر وسیلۂ ظفر ہے، علمی سفر کا شوق، تعلیمی سیر وسیاحت میں اساتذہ کے فرائض، سیاحت کا شوق نہ ہونے سے ملک کو نقصان پہنچتا ہے"

اسی طرح ایک مضمون "شکار" پر ہے۔ اس میں پہلے شکار کی تدریجی ترقیاں بیان کی ہیں پھر غلیل کا ذکر ہے۔ نشانہ کی مشق، گراں بہا نصیحتیں، اڑتے پرندوں کا شکار، تیتر کا شکار، مرغابی کا شکار، ہرن کا شکار، رائفل کا شکار، بلم سے ہرن کا شکار، ٹورچ سے شکار، چکارے کا شکار، جنگل کا شکار، شیر کا شکار، حادثات کے عنوانوں سے شکار کی مختلف تفصیلیں بیان کی ہیں۔ بیچ بیچ میں واقعات اور لطیفے بیان کئے ہیں۔

یہی انداز مختلف مضامین کا ہے۔ طرز بیان کی بے تکلفی کی وجہ سے، ان کی طوالت بھی ایک لطف پیدا کرتی ہے۔

جواہرِ سخن۔ (مرتبہ محمد مبین صاحب چڑیا کوٹی۔ ہندوستانی اکاڈمی۔ الہ آباد۔ قیمت ۶/)

ہندوستانی اکاڈمی، الہ آباد کی طرف سے اب تک جواہر سخن کے نام سے ابتدائی دوروں کے شعرا کے تین انتخابات شائع ہو چکے ہیں۔ جنھیں ادبی حلقوں میں، بعض معمولی اختلافات کے ساتھ، عام طور پر قدر کی نظروں سے دیکھا گیا۔ اکاڈمی نے یہ سلسلہ اب تک جاری کر رکھا ہے۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی چوتھی کڑی ہے۔

مؤلف نے اس انتخاب میں جس دور کے شعرا کا حال اور کلام شامل کیا ہے، اسے اس نے دو حصوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ لکھنؤ کے شعرا اور دہلی کے شعرا۔ موجودہ انتخاب میں صرف لکھنؤ کے شعرا شامل ہیں۔ اس دور کے دہلوی شعرا کو پانچویں جلد میں شامل کیا جائے گا۔

اس مجموعہ میں کل ۵۰ شعرا کا ذکر ہے۔ اور پچھلی جلدوں کی طرح اس میں بھی مؤلف نے پہلے شاعر کے مختلف حالات دئے ہیں، پھر اس کے کلام کا انتخاب۔ جن شعرا کا کلام شامل ہے ان میں گویا، تلق، خنجر، خلیق، انیس، دبیر، عشق، مونس، نفیس، منیر، عام طور پر زیادہ مشہور ہیں۔ باقی شعرا سے اردو داں طبقہ عموماً واقف نہیں۔ اور اس لئے یہ مجموعہ اس لحاظ سے بے حد قابل قدر ہے کہ ایسے شعرا جو اب تک گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں، اس کی مدد سے منظر عام پر آگئے۔ اور اُن کے کلام کا منتخب حصہ ایک جگہ محفوظ ہو گیا۔

انتخابات میں صحت کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ اور اس کی ضرورت بھی بہت زیادہ ہے۔ رہا یہ سوال کہ انتخابات کیسے ہیں۔ تو اس چیز میں ہمیشہ سے اختلافات رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔ ہر شخص کا مذاق سخن جداگانہ ہے۔ اس لئے ایک شخص کا انتخاب ضروری نہیں کہ پورا کا پورا دوسرں کو پسند آجائے۔ جواہر سخن کے انتخابات، ان اختلافات کی روشنی میں دیکھنے کے بعد بھی اچھے خاصے معلوم ہوتے ہیں۔

کتاب بڑے سائز کے ۲۲۷ صفحوں پر چھپی ہے۔ قیمت عالہ ہے۔ اور ہندوستانی اکاڈمی، الہ آباد سے مل سکتی ہے۔

و۔ ع

سررشتۂ تعلیمات ریاست حیدر آباد دکن نے اپنی مجلس نصاب کتب شعبۂ تاریخ سے مندرجہ ذیل کتب تاریخ ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کے لئے مرتب کرائی ہیں۔

۱۔ تاریخی کہانیاں	تیسری	جماعت کے لئے
۲۔ " "	چوتھی	" "
۳۔ تاریخ دکن	پانچویں	" "
۴۔ ہندوستان کی تاریخ	چھٹی	" "
۵۔ تاریخ ہند حصہ اوّل	ساتویں	" "

یہ سب کتابیں غیر فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں، ہر دور کی تہذیبی پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے، زبان سلیس ہے اور معیار طلبہ کی لیاقت کے مطابق۔

پہلی دو کتابیں ابتدائی جماعتوں کے لئے ہیں۔ ان میں ایسے اشخاص کی زندگی کا حال پیش کیا گیا ہے جنھوں نے مختلف زمانوں میں ہماری ملکی اور قومی زندگی میں خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے اخلاق و عادات اور ان کی قومی حوصلہ مندیوں کو قصہ کے پیرایہ میں آسان اور سادہ زبان میں بیان کیا گیا ہے تاکہ بچوں کی اخلاقی زندگی اُن کی سیرت سے اثر لے۔ صرف ایسے حالات بیان کئے گئے ہیں جن کے ساتھ نوعمر بچوں کو قدرتی طور پہ دلچسپی ہو، جو ان کے حافظہ پر بار نہ ہوں اور جو ان کے اندر تاریخی ذوق کی تعمیر کریں۔

تیسری کتاب دکن کی تاریخ پر ہے، اس کتاب میں موجودہ تحقیقات کی روشنی میں تاریخی واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ انداز بیان دلچسپ ہے اور تاریخ کا تہذیبی پہلو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔

چوتھی کتاب میں ہندوستان کی تاریخ کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس بات کا خاص طور پہ

خیال رکھا گیا ہے کہ تاریخ صرف جنگوں کی داستان نہ بن جائے یا چند بادشاہوں کے حالات پر ختم نہ کر دی جائے بلکہ ہر دور کے تہذیب اور تمدن کی تصویر طلبہ کے سامنے آ جائے۔

ساتویں جماعت کی کتاب میں مغلوں کی آمد تک ہندوستان کی پوری تاریخ ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے، سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ اشخاص کی سیرت کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ ہر دور کے تہذیب، تمدن اور علوم و فنون کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔ مختلف فرقوں کے باہمی اتحاد وارتباط کو خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔

تمام کتابوں میں ہر سبق کے ختم پر سوالات اور مشہور تاریخیں دی گئی ہیں۔ سوالات ایسے ہیں جو طلبہ میں باتکے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا کر دیں گے۔ مجلس نصاب کتب شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس نے ایسے وقت میں جب کہ ہماری قومی زندگی کی تشکیل ہو رہی ہے، جدید طرز پر تاریخی تحقیقات کو غیر فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے مدرسوں کے نوعمر طلبہ کے سامنے پیش کر دیا۔ امید ہے کہ یہ کتابیں تمام ہندوستان کے مدرسوں کے لئے مفید ثابت ہوں گی اور یقین ہے کہ ان کے مطالعہ سے بچوں میں شروع سے رواداری کے جذبات نشو و نما پائیں گے اور وہ مختلف مذہبوں کے اصول کی قدر کرنا سیکھیں گے۔

تاریخ سلطنتِ خداداد (میسور)۔ یہ کتاب محمود خاں صاحب بنگلوری کی تصنیف ہے، ۶۵۶ صفحات پر مشتمل ہے، پہلا ایڈیشن اب سے چار سال قبل شائع ہوا تھا، اب مزید اضافہ کے ساتھ دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے بعد کی تاریخ سے عام ہندوستانی بڑی حد تک بے خبر رہے خصوصاً گذشتہ ڈیڑھ سو برس کی تاریخ اوروں کے قلم سے لکھی گئی، وہی ہمارے مدرسوں اور کالجوں میں پڑھائی گئی اور وہی ہمارے سامنے آئی۔ ظاہر ہے کہ ان لکھنے والوں کو ہماری قومی اور ملکی تاریخ کی خوبیوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اور ان کے اپنے اغراض و مقاصد اس کی اجازت کب دے سکتے تھے کہ تعصب سے دور ہو کر واقعات کو سچائی کے ساتھ پیش کر دیں۔

ان کی تو یہ کوشش رہی کہ بدصورتی اور بدوضعی کے جتنے لوازمات ہیں سب ہی بھر دئے جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس بدنما کارٹون کو ہم اپنی ہی تصویر سمجھنے لگے۔

تاریخ وہ سرمایہ ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل کو ورثہ میں ملتا ہے اور اسی سے قومیں بنتی ہیں اسلاف کے ایسے کارناموں سے جن میں قومی مقاصد اور قومی حوصلہ مندیاں نمایاں ہوں تاریخی روایات قائم ہوتی ہیں اور انھیں روایات میں سے قومی جذبہ کی سوتیں جاری ہوتی ہیں۔ سلطان فتح محمد خاں ٹیپو کی شخصیت ماضی کی ان شخصیتوں میں سے ہے جو دنیا کے لئے جوانمردی، عزم و ہمت، قومی حمیت، آزادی اور حرّیت کا اپنے اندر سبق رکھتی ہیں۔

اس بطل حرّیت کے حالات ہماری زبان میں آج تک اس اہتمام کے ساتھ نہ لکھے گئے تھے محمود خاں صاحب ہمارے شکریہ اور مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سلطنت میسور کی تاریخ پر ساڑھے چھ سو صفحے لکھ کر تاریخ اور ادب دونوں پر احسان کیا۔ واقعات کی چھان بین میں انھوں نے کافی جانفشانی سے کام لیا ہے۔ کتاب کو سلطنت میسور میں مسلمانوں کے آنے سے شروع کیا ہے اور سلطان ٹیپو کے عہد کے اختتام تک میسور کی مکمل تاریخ نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کردی ہے۔ ابتدا کے تقریباً دو سو صفحوں میں سلطان حیدر علی کے عہد کی تاریخ ہے، اس کے بعد ابوالفتح فتح محمد خاں ٹیپو سلطان کے عہد کے حالات و واقعات ہیں۔

مصنف نے اس زمانے کے سب سیاسی حالات کو بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اُس زمانہ میں جو پالیسی کارفرما تھی آج بھی ہندوستان کے اندر اور باہر وہی پالیسی کام کررہی ہے۔ ہندوستان کی سیاست میں بیرونی تسلط کے اثرات، سلطان ٹیپو کی قومی عزت اور حمیت اور سلطنت میسور کے زوال کے اسباب کا تفصیل سے ذکر کرکے انھوں نے اپنے اس خیال کو پوری طرح واضح کردیا ہے۔ ان کی کوشش رہی ہے کہ ایسے واقعات بیان کئے جائیں جو موجودہ حالات سے بہت زیادہ مناسبت رکھتے ہوں اور جن کی تفصیل سے کوئی ذہنی فائدہ مرتب ہو۔ "انتظام سلطنتِ خداداد" کے تحت میں تقریباً ساٹھ صفحات میں انھوں نے اس عہد

کی اقتصادی اور معاشرتی حالت بیان کرکے تاریخ کا یہ اہم مقصد کما حقہٗ انجام دیا ہے۔

کتاب کے آخر میں ایک باب "مزارِ سلطان پر عقیدت کے پھول" کے عنوان سے ہے۔ اس میں بعض مشاہیر ملک کی وہ نظمیں جو سلطان شہید کی یاد میں وقتاً فوقتاً لکھی گئیں۔ جمع کر دی گئی ہیں اور جو سلطان کی سیرت اور اس کے عہد کی سیاسی حالت پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔

حق تلفی ہوگی اگر مصنف کی محنت کی داد نہ دی جائے۔ انھوں نے بہت محنت سے تاریخی مواد جمع کیا ہے اور ایسے دور میں جب کہ قوم میں تاریخی تحقیق کا ذوق پیدا ہو رہا ہے اُن کی کتاب یقینی طور پر اس کی مستحق ہے کہ عام لوگ اس کا مطالعہ کریں اور مصنف کی تحقیق سے فائدہ اٹھائیں۔ (ق)

اقبال ۔ گو علامہ اقبال مرحوم کے کلام اور ان کے فلسفہ پر متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن اب تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس مقصد کی توضیح پوری طرح ہو چکی ہے جسے علامہ اقبال نے ملک کے سامنے پیش کیا۔ کاش اقبال کو بھی کوئی جانسن، باسویل یا حالی مل جاتا۔ ہم مایوس نہیں ہیں۔ اقبال کو مستقبل کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ اور ہم کو امید ہے کہ مستقبل ہی اقبال کی صحیح تفسیر بھی پیش کریگا۔

البتہ اب تک جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں اقبال کی زندگی پر مجموعی حیثیت سے بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ کتاب بھی ہے جسے محمد حسین خاں صاحب ایم، اے بی، ٹی (علیگ) نے مرتب کیا ہے۔ فاضل مؤلف نے اقبال کی مختصر سوانح عمری بیان کرکے جستہ جستہ ان عنوانات کو مع اشعار کے پیش کیا ہے، جو اقبال کے کلام میں نمایاں ہیں۔ مگر کتاب اتنی مختصر ہے کہ ہم اسے اقبال کے کلام اور فلسفہ کی "فہرست مضامین" سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتے۔ اس کے پڑھنے سے یہ تو معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبال کے کلام میں کس قسم کے موتی دستیاب ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ ان موتیوں کی قیمت کیا ہے۔ کتاب کی چھپائی ناقص ہے۔ اور قیمت ۱۲؍ ہے۔

خورشید اینڈ برادرز نمبر ۱۰۹۹ فراش خانہ دہلی سے مل سکتی ہے۔

رازونیاز۔ حبیب اشعرؔ صاحب دہلوی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ گو "عرض مصنف" میں شاعر نے کہیں تذکرہ نہیں کیا مگر اشعار کی سلاست اور مضامین کے ستھرے پن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حبیب صاحب نے اپنے کلام کا بہت مختصر حصہ شائع کیا ہے۔ کل اڑتالیس صفحوں کی کتاب ہے جس میں تمام تر غزلیں ہیں۔ آخر میں دو صفحوں پر "متفرقات" کے عنوان سے چند اشعار دیدئے گئے ہیں۔

کلام میں سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اشعار کی سادگی ہے۔ زبان بہت صاف اور سلجھی ہوئی ہے اور غالباً یہ مصنف کی کوشش کا کامیاب نتیجہ ہے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں

صاف ورنگین ودلاویز اشعار
کیا کہے گا کوئی اشعرؔ کی طرح

دائرۃ الادب محلہ رودگران دہلی اور منزل بک ڈپو پوسٹ بکس نمبر ۳ بلی ماران دہلی سے دستیاب ہوسکتی ہے۔ قیمت کتاب پر درج نہیں ہے۔

شمع ازل۔ اقبال کا اثر اردو لٹریچر پر جتنا گہرا پڑا ہے اس کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ اگر ایک طرف معنی پسند طبیعتیں اپنے غور وفکر میں گہرا فلسفیانہ رنگ اختیار کرنے لگیں تو دوسری طرف شعرا کے ایک بڑے گروہ نے بھی اس میدان کو اپنی جولانگاہ بنانے کی کوشش شروع کردی ہے۔ جس کی شاہراہ کا اقبال نے افتتاح کیا ہے، اور لطف یہ ہے کہ اس میدان میں اگر ایک طرف جوش کے ایسے مذہب کے باغی شاعر ہم کو نظر آتے ہیں تو دوسری طرف آثرؔ زبیری ایسے پرستاران مذہب بھی موجود ہیں۔ چنانچہ اس کتاب میں آثرؔ زبیری صاحب نے جتنی نظمیں لکھی ہیں ان سب کا موضوع مذہبی بزرگوں کے کارنامے اور اسلام کی اہم خصوصیات ہیں۔ جن کے انداز بیان میں اقبال کا اثر بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ "پیش لفظ" میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے اثر صاحب کی اس کتاب پر ایک نظر ڈالی ہے اور جستہ جستہ اشعار بھی پیش فرمائے ہیں۔

آثر صاحب نے بڑے کامیاب انداز میں ان مضامین کو "شعریت" کے رنگ وبو سے مالامال کیا ہے جن کی خشکی اردو کے تردامن شعرا کے لئے اکثر "وجہ اعتذار" بنی رہی۔ چنانچہ حضرت فاروق اعظم

کی فوجیں فارس فتح کرنے کے لئے روانہ ہوتی ہیں۔ اور شاعر اس روانگی پر خوش ہوکر "سامان نشاط" کے نام سے ایک نظم لکھتا ہے جس کی ابتدا ملاحظہ فرمایئے۔

لے کے آیا ہوں عجب شان سے سامانِ نشاط
داور حشر سے باندھے ہوئے پیمان نشاط
قلزم عیش کی اٹھتی ہوئی موجوں کی قسم
فرش سے عرش پہ جانے لگا سامان نشاط

اس طرح کی نظمیں آثر صاحب نے بہت پر اثر اور والہانہ انداز میں کہی ہیں۔ ایک آدھ جگہ ہنگامی اور مقامی سیاست سے بھی متاثر ہوکر کچھ فرمایا ہے لیکن ایسی نظمیں اس کتاب میں کچھ بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً "جنگِ حبشہ" "فرانس کے مظالم" "حرم لکھنؤ" "کاغذی اصنام" "دار المبلغین لکھنؤ" وغیرہ

آثر صاحب اگر اس قسم کی تمام نظموں کو ایک علیحدہ عنوان کے ماتحت کردیں تو کتاب کی ترتیب نسبتاً بہتر ہو جائے گی۔

صفحات کی تعداد ۲۲۶ ہے جس میں ۷۵ نظمیں ہیں۔ کتابت اور طباعت اچھی ہے۔

قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ۔ زبیر منزل۔ پاٹا نالہ۔ لکھنؤ

ص۔ ا۔ ص

معارف جمیل۔ "از قا آنیِ ہند" حکیم آزاد انصاری۔ ناشر محمد تراب علی خاں باز۔ بازار گھانسی حیدرآباد دکن۔ قیمت غیر مجلد عہ مجلد ۱۲ عہ

یہ حکیم آزاد انصاری صاحب کے کلام کا مجموعہ ہے۔ ابتدا میں تقریباً ۱۰۰ صفحے کا اپنا تعارف لکھا ہے: الطاف احمد مشہور نام۔ نظر حسین تاریخی نام۔ ابوالاحسان کنیت۔ آزاد تخلص۔ والد کا اسم گرامی

محمد حسن خلف امیر احمد۔ سکونت سہارن پور خاص۔ محلہ شاہ ولایت۔ نسلاً شیخ انصاری جس کا سلسلہ حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔"

اپنی خصوصیات شاعری یوں بیان کی ہیں۔

"ہر شاعر اور بالخصوص حقیقی شاعر کے کلام میں کچھ نہ کچھ خصوصیات ہوتی ہیں جن سے اس کا کلام دوسرے شعرا کے کلام سے ممتاز نظر آتا ہے۔ ہم بھی اسی پنجاہ سالہ کوشش و مشق سے اپنی شاعری میں بری بھلی چند خصوصیات پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ انھیں ہماری اختیار کردہ خصوصیات نے ہماری سعی و کوشش سے مل کر ہم کو اپنا رنگ خصوصی پیدا کرنے میں مدد دی ہے وہ خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ کلام کی اصلی ترتیب۔ ۲۔ سلاست و صفائی زبان۔ ۳۔ ندرت بیان
۴۔ تکرار الفاظ حسین۔ ۵۔ صنعتِ ترصیع و تقابل۔ ۶۔ صنعت ترصیع جدید کی ایجاد۔ ۷۔ شعر میں اصطلاحات علمیہ کا استعمال"

مثالیں یہ دی ہیں۔

۱۔ محبت میں بقا میری، محبت میں فنا میری — محبت ابتدا میری، محبت انتہا میری
اُسی بیم و رجا میں ہوں، اسی دُہری بلا میں ہوں — وہی تو اور جفا تیری، وہی میں اور وفا میری

۲۔ تو ہو اور تیری زلفہائے رسا — میری قسمت رسا نہیں، نہ سہی
آپ کا تو پتہ لگا لیا، لیکن — اب جو میرا پتہ نہیں، نہ سہی
زلفوں والو! یہ اندھیر — دہرے دہرے کالے ناگ
میرا سر اور تیرا در — دھن مری قسمت، دھن مرے بھاگ

۳۔ چارہ ساز زخم دل! درمانِ زخم اچھا کیا! — زخم کی سب لذتیں مجروح درماں ہوگئیں
مطرب نغمہ کار ہو۔ ساقیؔ بادہ بار ہو — زہرہ نوا نگار ہو۔ میکدہ زا بہار ہو

۴۔ آرزوئے بہار جنت ہے — آرزوئے بہار جلوۂ روح

جستجوئے دیار وحدت ہے | جستجوئے دیار جلوۂ روح

۵۔ نام خدا جدھر گئے دل میں اتر اتر گئے | خنجر آبدار ہو۔ دشنۂ تابدار ہو

رفع ملال چاہیئے کچھ تو خیال چاہیئے | روحِ تن فگار ہو۔ راحت جان زار ہو

۶۔ قدر و قیمت فصل طیار شباب | حسن و صحت نقد دستارِ شباب

عزم و ہمت خادم کار شباب | تاب و طاقت کفش بردار شباب

۷۔ پرستش کے قابل ہو، تحقیق ہے | تصوّر کے ہمراہ تصدیق ہے

وہ مجھ سے قریب اور میں اس سے دور | مری، جمع، بھی رشک تفریق ہے

دراصل آزاد انصاری صاحب پرانے رنگ کے شعرا میں سے ہیں۔ بیدل سہارن پوری اور حالی کے شاگردوں سے ہیں۔ کثرت مشق سے نشست الفاظ اور بندش پر اچھی قدرت بہم پہنچالی ہے معنویت کچھ تو اپنی حدود کی بنا پر اور کچھ مناسبت طبع لفظی خوبیوں کی طرف ہونے کی وجہ سے میسر نہ آئی۔ اگلے وقتوں کے لوگ ہیں ریاست حیدر آباد میں قدر ہے۔ جو مسلسل غزلیں چھوٹی بحروں میں کہی ہیں وہ کافی اچھی ہیں۔

یاد ایامے کہ عالم غیرت میخانہ تھا | نظم ہستی تخت نظم نرگس مستانہ تھا

جو جبیں تھی حاصل انداز محبوبانہ تھی | جو جبیں تھا صاحب انداز معشوقانہ تھا

وہ امنگیں تھیں کہ بے شغل طرب بنتی نہ تھی | وہ ترنگیں تھیں کہ بے بادہ کشی چارہ نہ تھا

دن کو فکر سرخوشی تھی اور بے باکانہ تھی | شب کو شغل میکشی تھا اور آزادانہ تھا

ایک جانب مطربوں کے نغمہ ہائے مست تھے | ایک جانب مغبچوں کا رقص سرشارانہ تھا

کون سی وہ رات تھی جو کیف کی حامل نہ تھی | کون سا وہ روز تھا جو لطف سرتاپا نہ تھا

جو عطا تھی بے حد و عد جو کرم تھا بے حساب | ہر سلوک دوست میرے ساتھ فیاضانہ تھا

کچھ نہیں معلوم کیوں مجرم نہ گردانا گیا | میں کہ جو مجموعہ افعال گستاخانہ تھا

اب کوئی کیونکر دکھا سکتا ہے کیا کیا لطف تھے | اب کوئی کیونکر بتا سکتا ہے کیا تھا کیا نہ تھا

ماحصل یہ ہے کہ میں تھا اور نشاط جاودان   مختصر یہ ہے کہ میں تھا اور غم جانانہ تھا
آہ آزاد! اب وہ ہم باقی نہ وہ لطف حیات   "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا"

غزلوں کے بعد کچھ نظمیں بھی ہیں جس میں "چاند سے جھڑپ" خاصی ہے۔ اردو رباعیات اور چند فارسی رباعیات کے منظوم ترجمے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ کاغذ، کتابت اور طباعت معمولی ہے۔

انتخاب الہلال۔ ادبستان۔ چابک سواران اسٹریٹ۔ لاہور۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین "الہلال" کا انتخاب ایک اشد ضرورت تھی جو ادبستان لاہور نے پوری کی ہے۔ اس انتخاب میں سترہ مضامین ہیں اور ایک نظم "تنزل اسلام کا سبب اصلی"۔

مولانا ابوالکلام صاحب کے طرزِ تحریر کے متعلق کچھ لکھنا یہاں پر بیکار ہے۔ انتخاب البتہ زائد تر مذہبی مضامین کا ہے۔ اگر اس میں سیاسی مضامین بھی شامل ہوتے تو بہتر تھا۔ ناشرین دوسری جلد میں اگر اس کا خیال رکھیں تو بہتر ہے۔ قیمت غیر مجلد ۱۲؍ مجلد عا؍

رسالہ جات

مسافر۔ ماہوار ادبی رسالہ ہے جو تھوڑے عرصے سے کوکب مرادآبادی کی زیر نگرانی اور میرامروہوی اور عادل ادیب صاحبان کی زیر ادارت مرادآباد سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ مضامین خاصے ہیں۔ کاغذ خراب لگا ہے۔ خدا کرے قائم رہے۔ چندہ سالانہ عہ؍

نور التعلیم۔ گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ کا ماہوار رسالہ ہے جو ناخواندہ بالغوں کے لئے نکالا گیا ہے۔ تعلیم بالغان ہندوستان کی جہالت مٹانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اگر اس طرح بہت سے اور رسالے نکلنا شروع ہو جائیں تو ملک کو بہت جلد فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

نگراں۔ ثناء اللہ خاں صاحب ایم، اے
قیمت سالانہ ایک روپیہ عہ؍

نقشہ جات

نقشہ جبش، نقشہ افغانستان و سرحدی صُوبہ نقشہ وزیرستان، یہ نقشے خالد کمپنی دہلی نے انگریزی اور اردو میں تیار کئے ہیں۔ علاوہ صفائی اور درستی کے الگ گوشہ میں ان مقامات کی آب وہوا، آبادی، مذاہب، زبانیں، پیداوار، معدنیات، ذرائع نقل وحمل اور مختصر تاریخ وغیرہ پر مفید اور مختصر معلومات بھی بہم پہنچائی ہے۔ نقشے بہت اچھے ہیں۔

جبش کے نقشے کا سائز ۳۴ × ۲۴ ہے اور قیمت ۱۰/ ہے۔

وزیرستان اور افغانستان وصوبہ سرحد کے نقشوں کا سائز ۳۰ × ۲۰ ہے۔

اور قیمت ۱۲/ اور ۸/ علی الترتیب ہے۔

انشائے سلمیٰ۔ (عصمت بکڈپو دہلی) لڑکیوں کو خط وکتابت سکھانے کے حق میں یہ رسالہ ایک اچھا رہنما ہے، اولاً کتابت اور اردو زبان کی خطوط نویسی پر ایک دلچسپ اور مفید نوٹ ہے، اس کے بعد خطوط کے مختلف نمونے پیش کئے گئے ہیں، آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ اور القاب وآداب کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے۔ مبتدیوں اور خاص کر لڑکیوں کے لئے خطوط نویسی کے باب میں یہ رسالہ ایک اچھا معلم ثابت ہو سکتا ہے۔ خطوط نویسی کے تمام ابتدائی اصول اور اصطلاحات اس میں شامل کر دی گئی ہیں۔ اس لئے ان حیثیات سے یہ خطوط نویسی سکھانے والی کتابوں میں ایک خاص درجہ اور بعض پر ایک مخصوص فوقیت رکھتا ہے۔ لکھائی چھپائی معمولی۔ قیمت ۶/

مضامینِ محمّد علیؒ

مرتبہ۔ جناب محمد سرور صاحب بی اے (آنرز) فاضل جامعہ ازہر

مولانا محمد علی کی سیاسی، مذہبی، ادبی اور اجتماعی زندگی کی سرگرمیوں کا نہایت دلآویز مرقع جس میں اُن کی شخصیت، وطن و ملت کے مسائل سیاسی اور اجتماعی تحریکات کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں، ہندوستان کے سب سے زیادہ ہنگامہ خیز دَور کی تاریخ اور خود مولانا کے گوہر بار قلم سے یہ خود نوشت سوانح عمری بھی ہے اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ بھی۔ مختصر فہرست مضامین ملاحظہ ہو:۔

۱۔ آپ بیتی: میرا مذہب اور سیاست ہیئۃ ذہنیہ
۲۔ مسائل ملی: سنت ابراہیمیہ اور سنت محمدیہ، اسلام اور اشتراکیت
۳۔ مسلمان اور متحدہ قومیت ہند۔
۴۔ مسلمان اور کانگرس
۵۔ انگریز اور ان کی سیاست
۶۔ مسلم یونیورسٹی
۷۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ
۸۔ شخصیات: حکیم اجمل خاں، داس
۹۔ مسلمان اور آزادی
۱۰۔ بادشاہت اور جمہوریت
۱۱۔ آخری تقریر
۱۲۔ بھائی رامجی میکڈانلڈ کے کچھ حالات

ضخامت ۔۔۶ صفحات مجلد قیمت ۶ر

مکتبہ جامعہ
دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ

قرولباغ - نئی دہلی

شاخیں

مکتبہ جامعہ
جامع مسجد - دہلی

مکتبہ جامعہ
لوہاری دروازہ - لاہور

مکتبہ جامعہ
امین آباد - لکھنؤ

مکتبہ جامعہ
پرنسس بلڈنگ جے جے ہسپتال
بمبئی نمبر ۳